ہندستانی مسلمان نمبر

Rs. 15/-

TONIC
TONIC
TONIC

cinkara
cinkara

آج کا ہندستانی مسلمان نمبر

With Best Compliments

from

Sir Saiyyad Ahmed Khan

Maulana Aazad
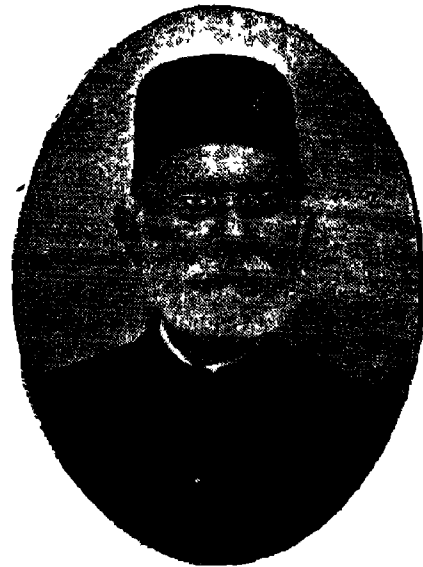
Maulana Haali

Shaikh Abdullah

Shamim Ahmed Shamim

Dr. Ishaq Jamkhanawala
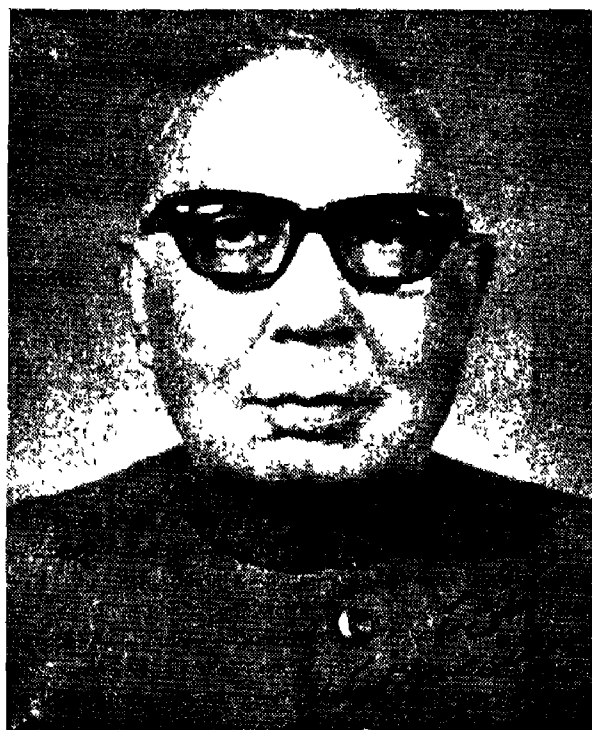
Hafız Yusuf Dehlvi

Shams Kanwal   Nashad Dehlvi   Sarwar Taunsvi

K. Ahmed Abbas

Bal Thakaray

Sultan Dosal

Salim Javed

Om Prakash Nami

Shamim Ahmed Shamim — Krishna Chandra — Salma Siddeeqee

Hameed Dalvai
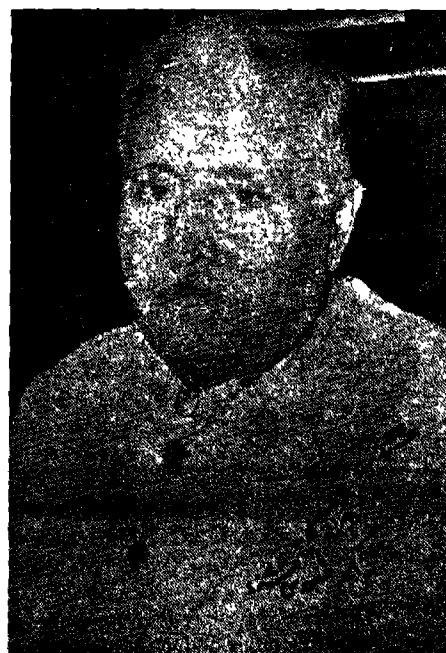
Diwan Anand Kumar
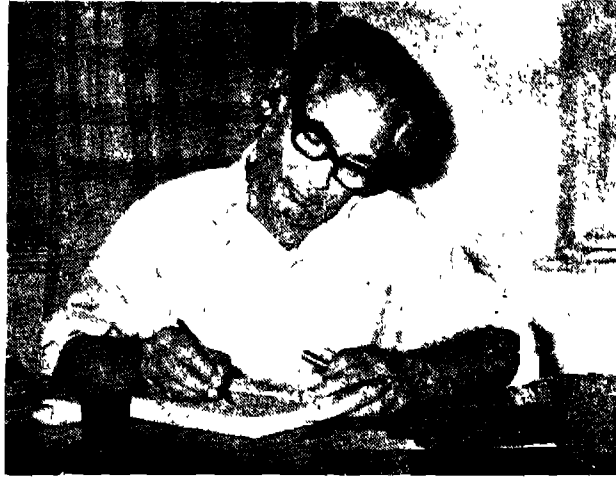
C. L. Kavish
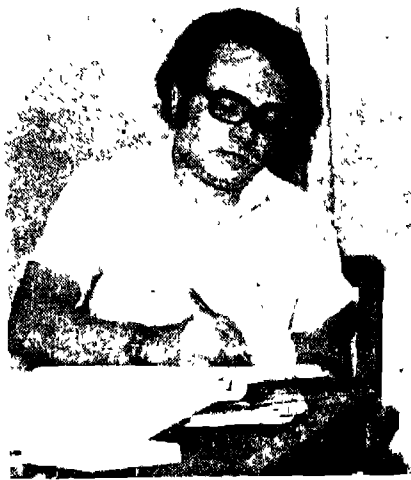
Husain Akrami
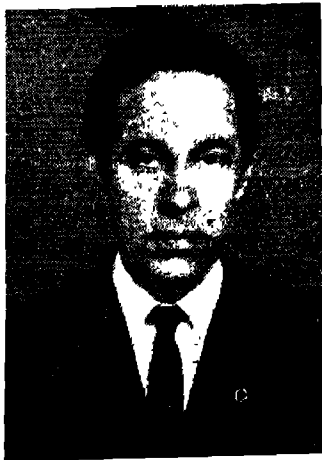
H H Khan
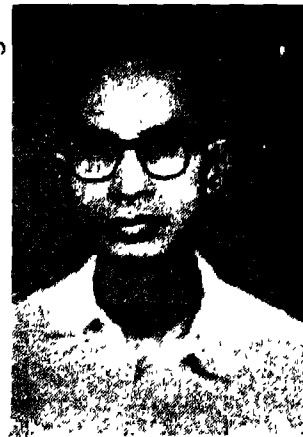
Fareed Phooliavı

Niyay Sharma

Sarwer Taunsvi

Khalid Irfan

Salma Siddeeqee

Shams Kanwal

Baigum Shehnaz Kanwal

Abdul Ghaffar

Sadiq Ali

Anwer Qamar

ہندستانی
مسلمان
نمبر
بمبئی
ایڈیٹر
شمس کنول
شریک ایڈیٹر
شہناز کنول
1975
اشاعت کا تیرھواں سال
فروری، مارچ، اپریل
دوسرا، تیسرا، چوتھا شمارہ
قیمت -/15 روپے
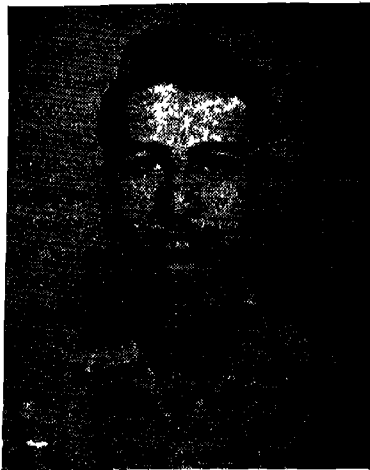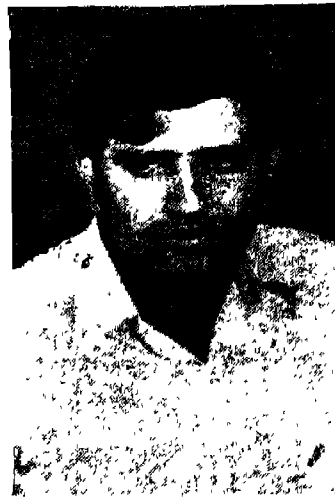
جموں وکشمیر ترقی کی نئی منزلوں کی جانب

ریاست جموں وکشمیر نے نئی زرعی اصلاحات نافذ کرکے پسماندہ اور پچھڑے ہوئے علاقہ جات کی ترقی اور کمزور طبقوں کی بہبودی کے لئے متعدد اقدامات کئے ہیں اور اقتصادی منصوبوں کو ایک نئی شکل دے کر فوری طور پر عوام کی دیرینہ ضروریات کو پورا کیا ہے نیز یہاں اقتصادی شعبوں میں نمایاں ترقی واقع ہوئی ہے۔

☆ چوتھے منصوبہ کے دوران ریاست میں بجلی کی پیداواری صلاحیت 30ء40 میگاواٹ سے بڑھ کر 93 میگاواٹ ہوگئی ہے اسکے علاوہ بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لئے ایک بیس سالہ پلان مرتب کیا گیا ہے۔

☆ چوتھے منصوبہ کے دوران 1200 سے بھی زائد دیہات کو بجلی کی روشنی سے منور کیا گیا ہے۔ پانچویں پلان کے دوران 3200 مزید دیہات کو بجلی فراہم کرنے کا نشانہ ہے۔

☆ 77-1966 سے لے کر اب تک ریاست میں پھلوں کی پیداوار میں 400 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

☆ اناج کی پیداوار جو 1950ء سے قبل صرف 3 لاکھ ٹن تھی گزشتہ سال بڑھ کر 10 لاکھ ٹن تک پہونچ گئی ہے۔

☆ چھوٹے پیمانے کے صنعتی یونٹوں کی تعداد جو 1969ء میں 2200 تھی چوتھے منصوبہ کے دوران بڑھ کر 4000 ہوگئی ہے۔

☆ ریاست میں اب صنعتیں قائم کرنے کے لئے ایک نئی فضا قائم ہوئی ہے اور یہاں سرکاری اور نجی سیکٹر میں بہت سے صنعتی پروجیکٹ قائم کئے جارہے ہیں۔

☆ ریاست میں سیاحوں کی تعداد کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے گذشتہ سال آٹھ لاکھ سیاحوں نے ریاست کی سیاحت کی جن میں ویشنو دیوی کی یاترا کرنے والے 4 لاکھ یاتری بھی شامل ہیں نیز لداخ کو پہلی مرتبہ سیاحوں کے لئے کھولا گیا ہے۔

JKAD-P-105/75

حق دو شخصوں کا محتاج ہے
ایک وہ جو اس کا اظہار کرے
دوسرا وہ جو اسے مان لے!

۔ خلیل جبران

باراں دیدہ دوراندیش بزرگ
کنارا سنڈی کیٹ کے سپلائی کئے ہوئے
روف ٹائلز
کوے لو
یعنی
کھپریل
پر اعتماد رکھتے ہیں
پتہ: کنارا ٹریڈنگ سنڈی کیٹ
ٹائلز، ٹمبر، ڈرائی فش ایجنٹ
4 - مستان ٹینک کراس لین، بمبئی 400008

ہندستانی مسلمان نمبر

یہاں نیرنگیٔ فکر و نظر ہے

مقالات

ملاقاتیں

نئی نسل کے قلم کار

اپنی بات

نظم
حصہ ۴

معاشرتی مضامین

سوانحی خاکے

نشانِ راہ

تحریکیں وجماعتیں

دانش کدے

تحریریں وتقریریں

سورج بھی تماشائی

گگن نما

ایک پرچہ : 150 بارہ پرچے : 18.00

ہندستانی مسلمان نمبر : 15.00

مطبوعہ: آج لیتھو پریس۔ بمبئی ۳

مقام اشاعت : 5واں فلور، سوب بیلس — 132 - کامبیکر اسٹریٹ بمبئی ۳

مالک، پرنٹر وپبلیشر: شمس کنول

ہمدم دواخانہ
دواخانہ ایک
دوائیں بے شمار
مقامی مریضوں کے لئے
طبی مشورہ مفت
ھندستان کے مستند دواخانوں کی قابلِ اعتماد یونانی دواؤں کا مرکز
159 ۔ ہارون منزل، بھنڈی بازار ناکہ، بمبئی ۔ 400003
نیک خواہشات
گگن کے ایک بہی خواہ کی جانب
سے

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا!

حسن اور دولت دونوں دل کش چیزیں ہیں اور انسان کو حوصلہ بخشتی ہیں مگر وہ الماس نگر سخت سنگین، سوکھا، سڑا، پامال ویرانہ تھا جہاں میں نے بارہ برس پہلے "گگن" کی بنیاد رکھی تھی اور بنیاد رکھنے میں مسعود علیم اور حفیظ جیسے دوستوں نے میرا ہاتھ بٹایا تھا، سامان نہیں تھا، ہمت تھی، نظر کے سامنے حسن نہیں تھا، ایک آدرش تھا، جیب میں دولت نہیں تھی، دل میں ایک لگن تھی، جیان چہ کل اور آج کے درمیان کا فاصلہ ناپنے بیٹھتا ہوں تو مجھے خود تعجب ہوتا ہے ؎

مجھ کو بھی خود یقیں نہیں شوق نے کیسے طے کیے   غم کے ہزار مرحلے ہجر کی ایک رات میں

دراصل محض دولت کافی نہیں بلکہ شوق ہو، جسکا ہو، لگن ہو اور تڑپ ہو یعنی وسائل سے زیادہ ولولے ہوں تب کوئی کام اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔

میرا الماس نگر سے کلیان میں منتقل ہونا "گگن" کی کامیابی کا پہلا قدم تھا مگر میں غریب وطن کلیان کے گرد و غبار میں دب کر رہ جاتا اگر غلام مصطفا نائک ایڈوکیٹ عظیم الدین رو ہے اور شیخ اقبال [illegible] میزبان صفت اور شریف النفس دوستوں نے میرے مشن سے اتفاق کرتے ہوئے میری زندگی کو سہولت نہ بخشی ہوتی ـــــــ بمبئی میں میرے [illegible] "گگن" کی مزید ترقی کا ثبوت تھی۔

اٹھا سکے نہیں سر آستاں سے   غضب ہے بارِ منت پاسباں کا

کہنے کو تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ "گگن" کا یہ "ہندستانی مسلمان نمبر" میرے پچھلے بارہ برس کی جد و جہد اور کاوش کا نچوڑ ہے، مگر نہیں، حقیقت یہ ہے کہ "گگن" اور "گگن" کا یہ کارنامہ بنائے تیرا، ابراہیم انصاری بی کام، خان فضل کریم مرزا، رامانند ساگر، ڈاکٹر صفدر آہ، شاہد علی خاں، حمید پٹھان، ریاض خان فضل احمد، انور اشفاق، حسین اکرمی، ہریش بسل، ایچ ایچ خان، لاج پت رائے، شبیر احمد راہی، ایس ایم ساگر، روشن لال ڈھیلر، یونس اگاسکر، فرید پھولیادی، خالد عرفان اور اور ڈاکٹر اسحاق عمانہ والا کی اس اعانت، حمایت، قوت اور توانائی کا خوش گوار نتیجہ ہے جو مجھ کو مسلسل حاصل رہی ہے۔

اردو رسالوں کو جو لوگ پامال کر رہے ہیں اُن میں رسائل فروش (نیوز ایجنٹ) پیش پیش ہیں۔ اردو دنیا کے ننانوے فی صدی ایجنٹ اخبارات نادہندہ، خیانتی، بددیانت اور بدمعاملہ ہیں مگر اس ایک فی صدی میں تین نام وہ ہیں جو ابتدا ہی سے مجھے اپنا معترف بنائے ہوئے ہیں یعنی تجمل حسین خاں (کلکتہ) کلیم بک ڈپو (احمد آباد) اور صفی احمد [illegible] (بمبئی) جن کی دیانت داری اور معاملے کی سچائی کی میں قسم کھا سکتا ہوں۔ ابتدا ہی سے ان تینوں خوش دہندہ ایجنٹوں کا "گگن" کو دلی تعاون حاصل رہا ہے۔ اور اسی طرح "گگن" کے مستقل مشتہرین میں طیب بھائی (حامی اینڈ کو) اور برادران عیسا خان اور موسا خان (بھارت موٹر اسکول) کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ان دونوں اداروں کی "گگن" نوازی ناقابل فراموش رہے گی۔

نہ پوچھ میری [illegible] دنیا کہ میری دنیا میں   خدا آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

ذہنی دیانت داری اور اپنے نصب العین پر ایمان ہی ایک قلم کار کو ابنِ وقت اور زمانہ ساز ہونے سے بچاتا ہے۔ قدرت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ابتدا سے آج تک میرا نظریہ کبھی نہیں بدلا اور میرا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ دولت کا لالچ یا جان کا ڈر انسان کو مصلحت شناس اور بزدل بنا دیتا ہے مگر میں نے آنکھ مچولی نہیں کھیلی، اپنے قلم کے رُخ کو نہیں موڑا اور آخر اپنی دنیا نہیں بنائی۔ یہ جانتے کے باوجود کہ جس فرقے سے میں مخاطب

ہوں اس کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے میں نے کلمۂ باطل کی تائید کبھی نہیں کی بلکہ میں ہر قدم پر اور ہر موڑ پر سیکولرزم، سوشلزم اور عالمی بھائی چارے کی حمایت کرتا آیا ہوں۔ چوں کہ میرا دل قارئین کے دل کے ساتھ ساتھ دھڑکتا رہا ہے اور میں آج کے انسان کے درد و کرب کی پوری ترجمانی کرتا رہا ہوں اس لئے مجھے اعتراف ہے کہ میری تنقید کے نشتر نے گہرے زخم ڈالے ہیں، مگر معالج دوائے تلخ تجویز کرتے ہوئے مریض کی پسند کو ملحوظ نہیں رکھا کرتا۔

انہیں پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ — مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

نقد و احتساب کا فرض انجام دینا میری عادت ہے اور اس عادت کی بنا پر میں نے بہتوں کو پایا ہے اور بہتوں کو کھویا ہے۔ جرمنی کے مصور شلی گل نے ایک بار کہا تھا: "میں جب بھی ایک پورٹریٹ تیار کرتا ہوں ایک دوست سے محروم ہو جاتا ہوں!" مگر میں نے بھی کسی کی خوشنودی یا ناراضگی کی کبھی پروا نہیں کی۔ یہاں تک کہ میں محسن کُش بھی ثابت ہوا اور میرے کئی محسنوں نے مجھ سے جواب بھی طلب کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو انسان پر آقانہ تصرف کرنے میں جو لطف آتا ہے وہ اور کسی بات میں نہیں آتا۔ انسان چاہتا ہے کہ سامنے کا انسان اتنا مجبور ہو جائے کہ وہ اپنا تن من سب اس کی نذر کر دے لیکن یہ بد ہزار سرفرازات بند کر دے جو سیّاں ہے وہ پیچھے سے منہ کبھی نہیں موڑے گا۔ غرضیکہ "گگن" کے تلے جو چلے اسے اگر تاروں کی چھاؤں ملے گی تو اسے تپتے ہوئے سورج سے بھی واسطہ پڑے گا۔

مجھے اس حقیقت کا احساس بھی ہے اور اعتراف بھی کہ میرے ذرائع اور وسائل بہت تنگ اور محدود رہے ہیں مگر یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بات یہ ہے کہ میں کسی کی انگلی پکڑ کر کبھی نہیں چلا، میں نے اپنی راہ الگ نکالی ہے اس لئے میں کسی دوسرے حلقے میں داخل ہی نہیں ہو سکتا دراصل منفرد راہ پہ چلنے والے کو گروہ بندی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ جس طرح میں اپنا نمائندہ آپ ہوں، اسی طرح "گگن" کو بھی میں نے نہ کسی انسان کے پیچھے چلایا اور نہ کسی تصوّر کے پیچھے بلکہ اور کبھی ہی بنا کر پیش کیا ہے

دیکھنا آپ کھڑے ہو گئے ہم اپنے بل پر — غیر سے چارہ نوازی کا تقاضا کیا!

یہ تو ظاہر ہے کہ اس وادی کے رہ نوردوں کے حصے میں پتھر زیادہ پھول کم آتے ہیں شاید اسی لئے (جس کا مجھ کو قلق ہے) میرے اکثر دوستوں اور بزرگ رشتے داروں نے میری فکر و نظر کی اس روش کو دنیا داری کے اعتبار سے خسارے کا سودا قرار دیتے ہوئے مجھ کو مصلحت پسند بننے اور دولت مند بن جانے کا مشورہ دیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے ان کے کسی ایسے مشورے پر آج تک عمل نہیں کیا۔

پچھلے بارہ برس سے "گگن" کے تلے میں یہی سب کچھ کرتا آرہا تھا۔ سوچا کہ ایک ضخیم اشاعتِ خاص کی صورت میں مختلف نظریات و خیالات کے مضامین پیش کئے جائیں تاکہ تنوع میں نئی بات دریافت ہو سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ نمبر کا اعلان کرتے وقت مجھے اس کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں کتنے بڑے کام کو ہاتھ میں لے رہا ہوں: "گگن" کی قائم کردہ روایت، معیار اور "گگن" کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے بلند پایہ معقول اور مستند مصنفوں سے ان کے نظریات کے عین مطابق ان کے مضامین کے لئے گزارش کی۔ اور اب مجھے یہ کہتے ہوئے تسکین اپنے آپ پر اور اپنے مشن پر فخر محسوس ہو رہا ہے کہ "گگن" ان بزرگ قلم کاروں کی نظرِ التفات کا مرجع بنا کہ جن کی ذات کو نورِ ہدایت کہا جا سکتا ہے۔ سبھی مضمون نگار حضرات کا تعاون مجھ کو میری توقع سے زیادہ حاصل ہوا۔ موضوع کی نزاکت کے اعتبار سے اس نمبر میں لکھنے والوں کا یک جا ہونا اجتماعِ ضدین ہے۔ چنانچہ ہر مکتبِ فکر کے نمائندوں کو اس طرح پہلے شاید ہی کسی اردو جریدے نے اکٹھا کیا ہو۔

نپولین نے کہا تھا: "کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کی عورتیں روشن خیال نہ بن جائیں" زیرِ نظر نمبر میں خواتین قلم کاروں نے بھی خاصا حصہ لیا ہے اور خوشی اس بات کی ہے کہ انھوں نے چلمن کے پیچھے سے باتیں نہیں کیں بلکہ مردانے میں آکر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے آنچل کو پرچم بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس قلمی تعاون پر میں مضمون نگار حضرات کا دلی طور پر شکرگزار ہوں۔

سرسیّد نے علی گڑھ کالج کے چندے کے سلسلے میں ایک بار اپنے "تہذیب الاخلاق" میں لکھا تھا:

قومی بھلائی کے چاہنے والوں نے مجھ ناچیز پر اس قدر بھروسا کیا کہ لاکھوں روپے چندہ مجھے دے دیا
نہ کبھی کسی نے پوچھا اور نہ جانا کہ روپیا جو دیتے ہیں کہاں جاتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ اپنی تمام زندگی میں
کسی امر پر میں اس قدر فخر نہیں کر سکتا جس قدر کہ اس اعتماد اور طمانیت پر فخر کرتا ہوں جو میری قوم اور
غیر قوم کے بزرگوں نے مجھ پر کیا۔"

یہاں بات لاکھوں کی تو نہیں مگر ہزاروں کی ضرور ہے۔ اور مجھے بھی فخر بھی ہے اور خوشی بھی کہ اس نمبر کے اکثر مشتہرین نے یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک اردو رسالے کا اڈیٹر و مالک ہوں) اپنا بل پیشگی ادا کر دیا۔ یہ اعتماد جو مشتہرین حضرات نے مجھ پر کیا اس کے لئے مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

دہلی کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ دوسرے شہروں کی رہ نمائی کی ہے چنانچہ دہلی سے جناب سرور تونسوی، جناب حافظ یوسف دہلوی، جناب ناشاد دہلوی، جناب دیوان آنند کمار جناب شمیم احمد شمیم، جناب افسر جمشید۔ اور بمبئی سے جناب سی ایل کاوش، پی این رنگین، مرزا اشفاق بٹ اور جناب آئی این ملہوترا کا تعاون اگر مجھے حاصل نہ ہوتا تو اس نمبر کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ خیالات کو شکل و صورت بخشنے کا اہم رول اُن خوش نویسوں نے انجام دیا جن کا تعاون جناب خلش جعفری کی عنایت و توسط سے مجھ کو حاصل ہوا۔ جب کہ جناب سردار عرفان نے صفحات (ضمنی سرورق) کو سجایا اور پھر اس طرح نمبر کو آب و تاب ملی۔ میں تمام خوش نویس حضرات کا اور خصوصی طور پر سردار عرفان صاحب کا شکر گزار ہوں۔

اس سلسلے میں اپنے ان تین ساتھیوں کا ذکر بھی میں ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے "گگن" کو اپنا پرچا سمجھا ہے اور اس نمبر کی تیاری میں میرا ہات بٹایا ہے یعنی صادق علی، عبدل غفار اور انور قمر نے وقت کی قید کو توڑ کر دن رات میرے ساتھ کام کیا ہے اور اس نمبر کے سلسلے میں ابتدا سے اختتام تک میرا ہمنوا بنے رہے ہیں۔ یہ تینوں خوش نفس و خوش فکر نوجوان قلم کار ہیں اور راہِ زندگی کے نئے مسافر ہیں اس لئے شکریے سے زیادہ شاباشی کے مستحق ہیں۔

غالب نے نواب رام پور کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا: "گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو مگر میں حضور عالی کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔" غالب اپنے ایک چاہنے والے کے بل بوتے پر بے فکر تھے اور قانع بھی میرے چاہنے والوں اور قدر دانوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے اس لئے میں اپنے اور گگن کے سلسلے میں اور بھی زیادہ مطمئن ہوں مگر جہاں تک "گگن" کے مشن کا تعلق ہے تو کعبۂ مقصود ابھی دور ہے اس لئے ؎

خاطر تو تم نے آج بہت کی مگر حضور
کل پھر یہی نگاہ، یہی گفت گو رہے

"گگن" زندہ صحبت باقی
ادب، احترام اور پیار کے ساتھ۔

نیاز کار
شمس کنول

ایک صاحب اپنے کمرے کی کھڑکیوں پر جمی ہوئی برف کھرچ رہے تھے
مگر کھڑکیوں کے شیشے صاف نہیں ہو پاتے تھے
ایک راہ گیر نے سمجھایا:
"کمرے کے اندر جاؤ،
کمرہ گرم کرو
باہر کی برف خود بخود صاف ہو جائے گی"

جن کو سب سے اچھا ہونا چاہیئے تھا،
وہ سب سے بُرے ہیں
دوسرے بگڑتے ہیں تو سنورتے بھی ہیں
مگر مسلمان بگڑ کر
سنورنے کا نام ہی نہیں لیتے۔

اس ساری خرابی کا سبب صرف یہ ہے
کہ مسلمانوں نے ہمیشہ بندوں کے حق پر
حقِ اللہ کو ترجیح دی ہے
جب کہ نماز روزہ محرکات میں سے ہیں،
عبادت نیکی نہیں ہے
رات دن محنت کر کے اپنی روزی آپ کمانا
شاہ و رعایا، امیر و غریب، آقا و غلام کے امتیاز کو مٹا دینا
نیکی ہے
اور خدمتِ خلق، حسنِ سلوک اور انسان دوستی
عبادت ہے
امیر و غریب کا امتیاز قائم رکھ کے۔
نیکیاں مشتبہ اور گناہ یقینی ہو جاتے ہیں
مسلمان اپنے آپ پر احسان کریں گے
اگر وہ مسجد میں چراغ جلانے سے پہلے
اپنے دل روشن کر لیں!

بھارت کے آئین کی چھبیسویں سالگرہ کے موقع پر

ہم چوکس رہنے کا عہد کریں

اپنے آئین کے ذریعہ ہم نے زندگی کا ایک خاص راستہ چنا ہے۔ یہ ہے پارلیمانی جمہوریت کا راستہ جس پر چل کر ہم اپنے دیش میں سب کے لئے سیاسی، معاشی اور سماجی انصاف کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہی کچھ لوگ، جنہیں یہ طرز زندگی پسند نہیں، اس پر وار کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ اس راستے پر چل کر ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ بلکہ وہ تو اس طرز زندگی کو سرے سے ختم ہی کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا راستہ کچھ اور ہی ہے۔

انتشار، بربادی، اور دوسروں پر کیچڑ اچھالنے اور دیش میں فاشزم لانے کا راستہ۔

آیئے ہم ایسے لوگوں سے خبردار رہیں

آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر دم چوکس رہنا لازمی ہے

دیکھئے! آئین پر آنچ نہ آئے

74/491 DAVP
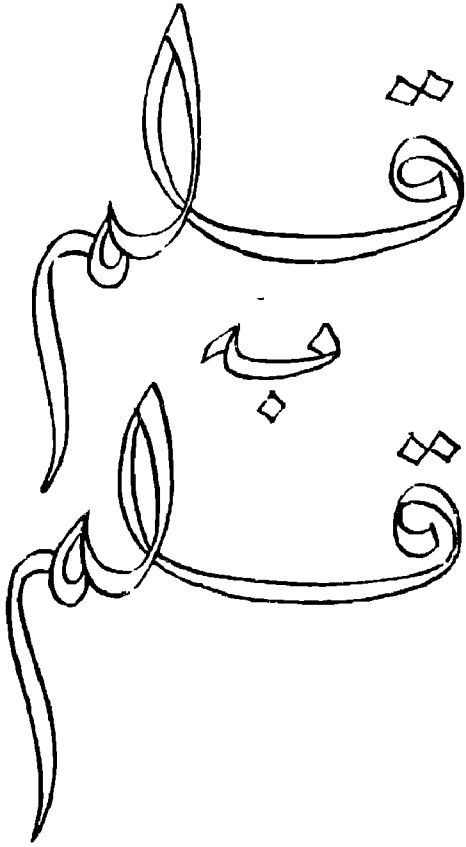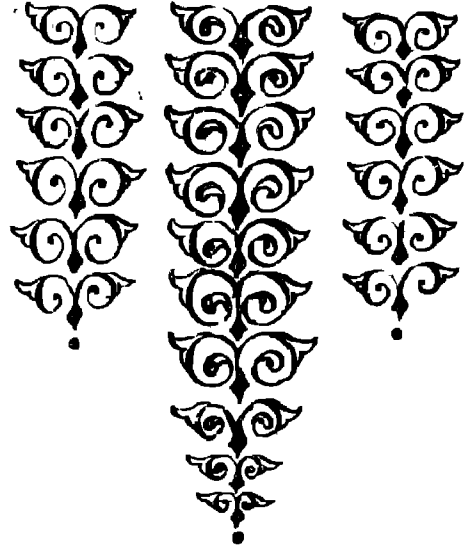
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحبِ نظراں ہے کہ نہیں !

ہندستانی مسلمان

ہندستان کی کل آبادی : 54 کروڑ 79 لاکھ
مسلم آبادی : 6 کروڑ 14 لاکھ
ہر ریاست کی کل آبادی میں مسلمانوں کی فی صدی تعداد اِس نقشہ میں دکھائی گئی ہے۔

جموں اور کشمیر
65.85
ہماچل پردیش
1.45
پنجاب
0.84
چنڈی گڑھ
1.46
ہریانہ
4.04
دہلی
6.47
راجستھان
6.90
اترپردیش
15.48
سکم
بھوٹان
اروناچل پردیش
آسام
24.03
ناگالینڈ
0.58
میگھالیہ
منی پور
6.61
تری پورا
بہار
13.48
مغربی بنگال
20.46
گجرات
8.42
مدھیہ پردیش
4.36
اڑیسہ
1.49
دیو
دمن
گوا
3.76
نگر حویلی اور دادرا
1.00
مہاراشٹر
8.40
آندھرا پردیش
8.09
میسور
10.63
19.50
تامل ناڈو
5.11
پانڈیچری
6.18
لکادیپ منی کوئے آئس لینڈ
94.37
جزائر انڈمان و نکوبار
10.12

آصف فیضی

اسلامی قانون سے متعلق نئے رجحانات

جب بھی میں نے شادی کو ایک ادارہ یا تنظیم سمجھا ہے تو ایک فرانسیسی ادیب کی کہی ہوئی یہ بات مجھ کو یاد آگئی ہے۔

"شادی کے رسم و رواج پوری دنیا میں مختلف ہیں مگر اس کے بعد کے تمام اعمال بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔"

اسلام میں شادی کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے میں عام انسانی شادی پر ایک منظر ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ ما قبل از تاریخ شادی سے متعلق ہمیں ذرا بھی علم نہیں ہے۔ لیکن تمام محققین کا یہ خیال ہے کہ شادی کے نام پر انسان کو چند عہد و فرائض میں باندھ دیا جاتا تھا اور پھر جلد ہی ایک عورت سے مستقل تعلق رکھنے کا رجحان عام ہوگیا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ [illegible] آتی ہے کہ دوسرے جانوروں کی بہ نسبت انسانی بچہ بلوغت حاصل کرنے میں سب سے زیادہ وقت لیتا ہے۔ اور اگر اس کے والدین اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانا چاہیں تو یہ کافی احتیاط طلب بات ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں عام طور پر 18 سال کی عمر میں بلوغت آجاتی ہے جبکہ انگلینڈ میں 12 سال میں۔ ابتدائی اسلام میں جب معاشرہ کافی [illegible] اور کم ترقی یافتہ تھا، بلوغی عمر کم تھی۔ حنفی مسلک میں 15 سال درج ہے جبکہ لڑکیوں کیلئے 9 سال اور لڑکوں کیلئے 12 سال کو بھی موزوں سمجھا گیا ہے۔

میرے خیال میں شادی کے دو اہم مقصد ہوتے ہیں اول بچوں کی پرورش اور نشو و نما۔ دوم ایک گھر کی بنیاد ڈالنا۔ ریورس (Reverend) کا کہنا ہے۔ "شادی کے دو اہم کام ہوتے ہیں یہ معاشرے کا بنایا ہوا وہ قانون ہے جس کے ذریعہ دو مختلف جنسوں کے درمیان رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اور پھر اسی کے ذریعہ قوم اور بچوں کے رشتوں کی بنیاد ڈالی جاتی ہے۔"

کیتھولک فرقہ کے مطابق "شادی کا بنیادی مقصد افزائش نسل اور تعلیم و تربیت ہے اور ثانوی مقصد امداد باہمی اور جنسی خواہش کا تدارک ہے، شادی ایک دو طرفہ معاہدہ ہے جس کے ذریعہ ایک مرد اور ایک عورت مستقل طور پر آپس میں کچھ لیتے ہیں اور کچھ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے جسم پر کچھ غیر معمولی حقوق رکھتے ہیں اور پھر اس سے قدرتی طور پر نسل بڑھتی ہے۔"

لیکن آج کے دور میں ایک تیسرا نکتہ بھی پیدا کیا گیا ہے اور وہ خاصی اہمیت کا حامل بھی ہے، بہت ہی ذہین ———— (Westermarck) جوڑا اس بات کو قبول کرتا ہے کہ شادی میں سب سے زیادہ دھیان میں رکھنے والی بات آپس میں میل جول ہوتی ہے جس سے ایک دوسرے کا ساتھ ایک لمبے عرصہ تک نباہنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ آج جب کوئی بیس سال نوجوان جوڑا ازدواجی زندگی کے بارے میں غور کرتا ہے تو آج کی کافی طبی ترقی کی وجہ سے اسے کافی لمبے عرصے تک ساتھ نباہنا پڑتا ہے جس سے دونوں ہی غیر معمولی بوجھ سے دب جاتے ہیں اور بے پناہ ممکنات کا شکار بنتے ہیں۔ اس بات کو یوں مختصر کیا جاسکتا ہے کہ شادی :۔ ۱- عام طور پر دو خاندانوں یا دو

فرقوں میں رشتہ داری کا سبب بنتی ہے۔ ۲۔ اپنی خاص گذر بسر کے لیئے مالی طور پر مددگار ہوتی ہے۔ ۳۔ دو فرد کی ذہنی طور پر ترقی کا باعث بنتی ہے۔ ۴۔ مذہبی طور پر روحانی اور ذہنی نشوونما کا بھی موجب بنتی ہے۔

قبیلے کے اندر ہی شادی کرنے کا رجحان بھی عام ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قدیم ہندو تہذیب میں گوت وواہ کا رواج تھا۔ عرب امراء میں، یا افریقہ کے ایک قبیلے مسائی میں یا ہوائی، پیرواور قدیم مصر میں، جہاں بادشاہ صرف اپنی بہن سے ہی شادی کر سکتا تھا، عربوں میں باپ کے بھائی کی لڑکی (بنت عم) کے ساتھ شادی کرنا بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ عرلوئیں یہ رشتہ عام تھا لیکن اب شریک حیات کافی تیزی سے یہ جگہ لے رہی ہے قدیم ہندو تہذیب میں اس رواج پر بہت سختی سے عمل ہوتا تھا کہ صرف ایک خاص حلقے میں شادی ہو، مذہبی بنیاد کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ خاص طور پر فرقہ کو۔

جبکہ دوسری جانب کچھ فرقے ازدواج خارجی پر عمل کرتے تھے یعنی اپنے حلقے سے باہر ہی شادی کرتے تھے۔ یہ شادیاں ماہرین عمرانیات (Sociologists) اور ماہرین علم الانسان (Anthropologists) کے ساتھ ساتھ دکیلوں کے لئے بھی کافی دل چسپی کا سبب بن سکتی ہیں چناں چہ شادی کی چار قسمیں ہوئیں۔ ایک زوجگی (ایک مرد ایک عورت) ۲۔ چند زوجگی (ایک مرد کئی عورتیں) ۳۔ چند شوہری (ایک عورت کئی مرد) ۴۔ گروپ شادی، جس میں مردوں کا ایک گروپ عورتوں کے ایک گروپ سے شادی کرتا ہے۔

جہاں تک قسم چہارم کا تعلق ہے تو اس کی مثال اتنی کم ہے کہ اس پر بحث نہ کرنا ہی فائدہ مند ہوگا۔ اور قسم سوم کا وجود صرف تبت کے چند فرقوں اور توڈوں میں ملتا ہے۔ چند شوہری شادی کا مکمل طور پر خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور پھر یہ نکتہ ہماری بحث سے بالکل مختلف ہے۔ اب صرف یک زوجگی اور چند زوجگی کے نکتے رہ جاتے ہیں جن پر اب ہم اپنا پورا دھیان دیں گے۔

یک زوجگی :- ہندوستان میں اب ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی اور یہودی یک زوجیت پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان بھی چند معروف حدود میں چند زوجگی پر عمل پیرا ہیں۔ پہلے ہندوؤں میں چند زوجگی کی اجازت تھی۔ لیکن حال ہی میں قانون کو بدل دیا گیا۔ اور اب قانون ان کو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا

قدیم عہد نامے (The Old Testament) کی رو سے یہودیوں کو چند زوجگی کی کھلی اجازت تھی۔ لیکن گذشتہ تین سو سالوں سے ان کا نظریہ بدلا ہوا ہے۔ اگر ہم تاریخی حقائق کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جدید دنیا میں یک زوجگی دراصل عیسائی کلیساؤں کی تعلیم کا نتیجہ ہے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ہی یک زوجگی کو خلاف قانون عمل سمجھتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مختصر طور پر کیتھولک فرقے کی تعلیم کا ذکر کر دیا جائے جس سے یہ معلوم ہوگا کہ کس طرح عام قانون اس سے متاثر ہوا ہے۔

عیسائیت میں شادی ایک تسلیم شدہ تنظیم ہے' Increase and Multiply ' عنوان کے تحت انجیل مقدس (Gen-1-28) میں کہا گیا ہے: "کسی بھی قانون کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اس کے فطری اور اصل حقوق سے بے دخل کر دے۔ اور نہ خدا کے بتائے ہوئے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

کنوارپن اور باعصمت ہونا بہت اچھی صفت سمجھی جاتی ہے اور عیسائیت کے تحت روح کی توانائی کیلئے بھی۔ اس کے علاوہ یک زوجگی کی تعلیم خاص طور پر دی گئی ہے۔ "ہر مرد اپنی ہی عورت رکھے، اور ہر عورت کا اپنا ہی شوہر ہو۔" عیسائیت میں شادی جو خاص طور پر شوہر اور بیوی کی محبت کا دو طرفہ معاہدہ ہوتا ہے ایک بنیادی خصوصیت رکھتی ہے یعنی وہ دو جسم ایک قالب ہوتے ہیں۔ عیسائی شادی کی رسم کے تین نہایت اہم جملے یہ ہیں شوہر کہتا ہے۔ "میں (رابرٹ) تمہیں (مابیل) اپنی بیوی کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں، آج اور آج کے بعد اچھے اور برے میں، امیری اور غریبی میں بیماری و صحت کی حالت میں، محبت اور پرورش کیلئے موت آنے تک، خدا کے حکم کے مطابق، میں اس کو حاضر و ناظر جان کر سچائی کے ساتھ عہد کرتا ہوں۔" بیوی بھی یہی عہد کرتی ہے اور ان الفاظ کا اضافہ بھی کرتی ہے، "..... محبت اور حکم ماننے کیلئے، موت آنے تک.....": والاخر۔ "اس انگوٹھی کے ذریعے میں تم سے شادی کرتا ہوں، میں اپنے جسم سے تمہاری عبادت کروں گا، اور دنیا کے سارے مال و متاع ....."

آپ بلاشبہ یقیناً میری اس بات سے پوری طرح متفق ہوں گے کہ یہ ایک پرجوش اور جذبات انگیز بیان ہے اور سچ آمیز عہد نامہ ہے

انگلش عوامی قانون اس کی مکمل طور پر عکاسی کرتا ہے مثلاً وین کاؤنٹ ریڈنگ (Viscount Reading) کا کہنا ہے، "انگلش قانون کے مطابق اور جیسا کہ عام عیسائی حکومتوں میں مانا جاتا ہے۔

Hyde v/s نے Judge ordinary (Lord Penzance) 'Hyde and Woodmansee' میں شادی کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے۔ "ایک عورت اور ایک مرد کی زندگی بھر کا رضامندانہ اختلاط، جو دوسروں سے بلکل غیر متعلق ہو" داصل شادی کا تو مقصد ہی ایک رنگی اور ۲۔ پائیداری ہے۔ دونوں ہی منفی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ (شائد) اسلامی اثرات کے تحت (code of (Maleitaea side Partida) کے مطابق تیرہویں صدی میں اور سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں بھی اسپین کے عیسائیوں میں داشتہ رکھنے کا رواج تھا لیکن اس استثنا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائیت میں نہ چند زوجگی اور نہ چند شوہریت ہی کی کبھی تائید کی گئی چند زوجگی اور آشنائی دونوں ہی عربوں، یہودیوں اور غیر خدا پرست میں کافی دنوں سے رائج تھی۔ کیتھولک چرچ کے مطابق شادی کے تین فائدے ہیں۔ ۱۔ علم و نشوونما کی بہتری کیلئے ۲۔ فرماں برداری اعتماد (شادی میں کئے ہوتے وعدے کا پابند رہنا۔) ۳ حلف برداری۔ (چرچ میں خدا کے سامنے حلف لینا۔)

یہ تشریح ضروری ہے کہ حلف برداری ایک عہدنامے کی صورت میں ہوتی ہے، مذہب کے دائرے میں انسانی عہدنامے کی طرح ہوتی ہے خدا کے سامنے ایک خفیہ اندرونی اور روحانی مضبوطی کا باعث ہوتی ہے۔

یہ تو تھی کلیسائی شادی لیکن ہمیں رجسٹرار کے سامنے کی گئی شادی کا بھی مطالعہ کرنا ہے۔ سول میرج (Civil Marriage) (رجسٹرڈ) داصل ازدواجی زندگی کیلئے ایک معاہدہ (Matrimonial Bond) ہوتا ہے۔ جو ایک سرکاری عہدیدار کے سامنے کیا جاتا ہے۔ اس میں مذہب کا عمل دخل بلکل نہیں ہوتا۔ اور نہ حلف برداری کا ہی کوئی کردار ہوتا ہے۔ اس کا ممتاز پہلو ہوتا ہے طلاق کا ممکن ہونا! جس کی تائید چرچ کسی بھی صورت میں نہیں کرتا۔

یورپ میں جو شخص مذہب سے بے بہرہ ہیں سول میرج

کر سکتے ہیں۔ وہی قاعدہ اب ہندستان میں سپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء کے تحت عمل درآمد ہے۔

اس ایکٹ میں اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ مذہبی طریقے سے کی گئی شادی کو بھی رجسٹرڈ کیا جا سکتا ہے۔ ملک میں مروجہ مذہبی رسومات سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اس قسم کا (اختیاری) قانون فریقین کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ کسی ترقی پذیر معاشرے میں چند زوجگی کو یک زوجگی میں بدلا جا سکتا ہے مثلاً ہندو مذہب کے طریقہ کی شادی اور مسلم نکاح کو قانونی طور پر یک زوجگی میں بدلا جا سکتا ہے۔ میں نے عیسائی قانون کے تحت شادی کے موضوع پر تفصیل اسلئے پیش کی کہ یورپ میں اور خاص طور پر انگلش قانون میں مذہب کو کافی عمل دخل ہے۔ نہ صرف قبولیت میں بلکہ طلاق دینے کی صورت میں بھی۔ چنانچہ اب یہ بات واضح طور پر سمجھی جا سکتی ہے کہ شادی کے ان بنیادی اصولوں سے جدید دنیا کس طرح فیضیاب ہوئی ہے۔ اور خاص طور پر ٹیونیشیا اور ترکی میں شادی کی جو صورت عمل میں آئی ہے وہ ابتدائی اسلام سے قطعی مختلف ہے اور آج کی جدید دنیا کے طریقے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔

اسلام میں شادی

اس عنوان کے تحت ہم اسلامی طریقہ شادی "نکاح" سے متعارف ہوں گے۔ اسلام نے شادی کو سب سے پسندیدہ عمل قرار دیا ہے ایک ابتدائی مصری تفسیر کے مطابق: " روایت ہے کہ پیغمبر نے کہا ہے کہ جو میری سنت پر عمل کرنا چاہتے ہوں وہ شادی کریں۔" قرآن اور حدیث کے ذریعے کہا گیا ہے: "شادی ایک پسندیدہ عمل ہے" پیغمبر کا یہ جملہ " لَا رَهبانِيَّةَ فِي الإِسْلَام۔" (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔) علی الاعلان شادی کرنے پر زور دیتا ہے۔ ایک جدید مصری مصنف (مفسر) بدران نے شاہ ولی اللہ کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ عیسائیت مجرد زندگی کو پاک عمل قرار دیتی ہے۔ جس سے مذہب کی اعلا قدروں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کیونکہ تمام پیغمبروں کی تعلیم یہ ہے کہ شادی بیک

کی روح سے مطابقت رکھتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ چند زوجگی جیسے عام رواج کی شکار عورتوں کے دکھ کو کم کرنے کے لئے دوسرے ممالک نے کیا کیا؟ پاکستان میں سن 1961 کے آٹھویں آرڈی نینس کے تحت چند صحت بخش اصول بنائے گئے ہیں۔

کوئی بھی Arbitration council سے اجازت لئے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ آربٹریشن کونسل میں تین ممبر ہوتے ہیں، ایک چیئرمین، جسے حکومت متعین کرتی ہے اور دو اشخاص دونوں فریقین کی جانب سے۔ عرضی کا طریقہ کار تحریری ہوتا ہے۔ Arbitration council کونسل کا فیصلہ مدلل ہوتا ہے کونسل تحریری فیصلہ بھی دے سکتی ہے۔ آرڈی ننس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ کیسے اور کن وجوہات کی بنا پر اس قسم کی اجازت دی جاتی ہے؟ میرے خیال میں اس کیلئے شرعی قانون کی پیروی کی جاتی ہوگی!

یہ کوئی خاص اطمینان بخش قدم نہیں ہے نہ اس نے ہندستانی قانون پر کوئی خاص اثر ہی ڈالا ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قانون پر وہاں کس حد تک عمل ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ ہندستان کیلئے ایک نئی راہ ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ مسلم فرقہ اس جانب متوجہ ہوگا اور اس سلسلے میں ہندستان میں جلد ہی کچھ اصلاحات کا نفاذ ہوگا۔

مشرق وسطیٰ میں صورت حال پھر بھی بہتر ہے۔ کم از کم کچھ ملکوں میں۔ ہم اس قانون کو اس کی تکمیل کے دو شیجوں پر مانتے ہیں۔ اول ترکی اور ٹیونیشیا میں جہاں مکمل یک زوجگی رائج ہے۔ ترکی میں کمال انقلاب کے بعد سول کوڈ کے نفاذ نے چند زوجگی کی مکمل طور پر ممانعت کر دی۔ لیکن جیسا کہ قانون سیکولر ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح ایک مسلم ملک میں ایک مذہبی قانون کی بجائے اس کا اپنا قانون رائج ہے۔ اگرچہ ٹیونیشیا میں Tunisian law پر اسلامی قانون غالب ہے۔ پھر بھی Personal status 1957 کے ذریعہ چند زوجگی کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے۔

مصر میں شیخ محمد عبدہ نے تجویز رکھی کہ جو شخص پہلی بیوی رکھتا ہے، دوسری شادی نہیں کر سکتا، جب تک کہ عدالت مطمئن نہ ہو جائے کہ وہ امام شافعی کی تعیین کی ہوئی دو[2] شرطوں کو مکمل طور پر پورا کریگا۔
۱۔ حقوق کی برابر تقسیم۔ ۲۔ مالی طور پر خود کفیل ہونا۔
مصری کابینہ نے ان اصلاحات کو منظور کر لیا تھا لیکن شاہ نے اسے ویٹو کر دیا۔ مصر میں کیا صورت حال ہے؟ یہ تو معلوم نہیں، لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب بھی ایسا مبارک موقع آئے گا تعلیم یافتہ طبقہ ایسی تبدیلی کو خوش آمدید کہے گا۔

شام میں یہ قاعدہ ہے کہ جب تک عدالت اس بات سے مطمئن نہیں ہو جاتی کہ مرد قرآنی مساوات پر عمل کرے گا تب تک اسے دوسری شادی کی اجازت نہیں ملتی یعنی ٹیونیشیا کے قانون کی رو سے چند زوجگی ممنوع ہے۔

مراقش کا مسلک code of Personal status ٹیونیشین قانون کی بہ نسبت کم سخت ہے۔ اس کیلئے دو[2] شرطیں ہیں۔
اول ۱۔ پہلی بیوی کی درخواست پر شوہر کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔
دوم ۲۔ اگر ایسی شادی عمل جامہ میں آگئی ہے تو پہلی بیوی یہ مسئلہ عدالت کے سامنے پیش کر سکتی ہے۔ اور پھر عدالت شوہر کے اس عمل سے بیوی کو پہنچنے والی تکلیف پر غور کرتی ہے۔

اسلامی سسٹم میں چند زوجگی کے قانون کو ہمیشہ ہی سے ایک کمزوری خیال کیا جاتا رہا ہے اور اسی لئے میں مختصر طور پر آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک عورت کی تکلیف کو کم کرنے کیلئے ایک ایشیائی ملک کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس سلسلے میں سنگاپور میں کی گئیں اصلاحات ان کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوں گی، جو ہمارے ملک میں اس قسم کی اصلاحات کرنے کے خواہش مند ہیں، چند زوجگی کے جنرل قانون کا بہترین علاج وہ ہے جو سنگاپور کی ایک سوشیل ورکر مسز ایم سراج نے کیا۔

قرآن کی آیت (35، سورہ 4) اور شیخ محمد عبدہ (مصر) کے مقولوں کی مدد سے انھوں نے (مسز سراج نے) اس بات کو یوں سمجھایا کہ قانون چند زوجگی کیلئے دو شرطیں پیش کرتا ہے

(الف) ایک سا برتاؤ (ب) خرچ کرنے کی طاقت (مالی حالت)۔
انھوں نے یوگوسلاویہ، لیبیا، ہرزے گووینا، پاکستان، شام، ٹیونیشیا، مراقش اور عراق کی چند زوجگی پر کنٹرول رکھنے کی کوششوں کا ذکر کیا۔ سنگاپور میں سن 1957ء کے بعد چند زوجگی پر پابندی لگانے کی سنجیدگی سے کوششیں کی گئیں۔ مسلم آرڈی نینس 1957ء نے ایک چیف قاضی کی ضرورت کا اظہار کیا۔ جو اس بات سے مطمئن ہو کر صورت حال واقعی ایسی ہے کہ دوسری شادی کرنی ہی چاہیئے۔ جیسا کہ پہلی بیوی کو یہ حق ہے کہ وہ ہر ہر پہلو پر غور کرے، اسی لئے دوسری شادی کا رواج کم ہو گیا۔ ہم آگے دیکھیں گے کہ ملایا میں 1967ء کے قانون بن جانے سے کس طرح طلاقوں کی واردات میں کمی واقع ہوئی ہے!

شوہر کے ذریعہ طلاق

چند زوجگی حالاں کہ ایک قبیح عمل ہے مگر اسلامی قانون میں ایک کم زور ترین چیز نہیں ہے۔ اگر ایک سوت اور ایک ناخوش مطلقہ میں کسی مسئلے پر اختلاف ہو جائے تو مجھے شک ہے کہ شاید ہی کبھی وہ ایک بات پر متفق ہو سکیں! ایک وکیل اور قانون کے ایک طالب علم ہونے کے ناتے مجھے یہ کہنے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہے کہ ہندستان کے محمڈن لاء میں یہ دونوں سب سے بڑی برائیاں ہیں اور اس سے بھی بڑی بڑے جیٹھ کار ہے کہ ہم دوسرے ممالک مثلاً ٹیونیشیا، مراقش اور سنگاپور سے کچھ سیکھنا ہی نہیں چاہتے! اکثر اس بات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ شوہر کو طلاق دینے کا لامحدود حق قانون کا ناقص ترین حصہ ہے۔

Professor J N D Anderson نے ٹھیک ہی کہا ہے،
"میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند زوجگی نہیں بلکہ طلاق دینے کا اسلامی قانون مسلمان عورت کی تکالیف کی اصل اور بڑی وجہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلم دنیا میں ایسے بھی حصے موجود ہیں جہاں طلاق کی واردات بہت ہی کم ہے، لیکن باقی دوسری جگہ یہ بات عام ہے۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے تو یقیناً مسلمان عورت ہمیشہ طلاق کے خوف کے سائے میں رہتی ہے۔ جمہوری نے کہ اخلاقی پر مبنی طلاق کو گناہ قرار دیا ہے لیکن یہ قول قانونی اثرات کے مقابلے میں کچھ بھی اثر نہیں رکھتا ہے۔"

سنگاپور کے مسلم آرڈی نینس 1957ء نے مسلم شادی کے رجسٹرار کی نگرانی میں ایک شریعت کورٹ کی تشکیل کی ہے۔ یہ شریعت کورٹ ضابطے کے متعینہ قانون سے عدالت کی رہنمائی کرتی ہے اور عدالت کے دو خاص کام ہیں: دونوں فریقین کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرنا یا طلاق کی اجازت دے دینا!

صلح وہ بڑا ذریعہ ہے جس سے سنگاپور کی عدالت اور اس کے افسران طلاق کی واردات کو کم کرنے کا موجب بن گئیں۔ عدالت عملی طور سے قرآن کی چوتھی سورے کی 35 ویں آیت پر عمل کرتی ہے:

"اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے، اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو، اور اگر وہ صلح کرا دینی چاہیں گے، تو خدا ان میں موافقت پیدا کر دے گا....."

عدالت میں ایک قاضی القضاۃ اور دو ممبران ہوتے ہیں جس میں ایک عورت ہوتی ہے۔ اس صلح کے کام کے علاوہ وہ رضامندی سے عمل میں آئی ہوئی طلاق کو بھی رجسٹر کرتی ہے۔ پہلے تو طلاق کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے تو اسے صرف طلاق دینے کی اجازت دینے کا اختیار ہوتا ہے۔ سنگاپور میں طلاق کی گھٹتی ہوئی شرح سے ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس تنظیم کے اس کام کا کتنا اثر ہوتا ہے، اور ہوا ہے۔

سن 1957 : 51.7 فی صدی - سن 1963 : 21.7 فیصدی
" 1961 : 21.8 " - " 1964 : 17.5 "

یہ قابل ذکر ترقی ایک ایسے ایشیائی ملک کا کارنامہ ہے جو نہ ہم سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور نہ زیادہ ترقی یافتہ ہی! اور امید کی جاتی ہے کہ ہندستان سمیت دوسرے ممالک بھی اس اچھے کام کی تقلید کریں گے۔

خاتمہ:- اتنے تھوڑے سے وقت میں ان دوسرے سوالات تک جانا ناممکن ہی ہے جو مضمون کی شروعات میں میرے ذہن میں تھے۔ لیکن میں ان خاص خاص نکتوں کی جانب اشارہ کرتا چلوں جن کی اصلاحات کرنا آج کے ہندستان میں بہت ہی ضروری ہے۔
اول: Conciliation Tribunal (مصالحتی تنظیم)

نسم کی تنظیم ہمارے ملک میں متعارف کروائی جائے، جیسا کہ قرآن میں بھی موجود ہے۔

دوم :- اس کا خاص کام طلاق ساری ہو، لیکن مرد کو دیئے گئے طلاق دینے کے اختیارات کو بھی کم کیا جائے اور یہ کام طلاق ساری عدالت کے ذریعے کیا جائے اور اس کی منظوری کے بغیر کسی بھی طلاق کو منظور نہ کیا جائے۔

سوم :- جس عورت کو بغیر اس کی غلطی کے طلاق دیا جائے تو اس کے لئے نان نفقہ قسم کا بندوبست کیا جائے۔

چہارم :- سب سے اہم یہ کہ ایسے مطلقہ جوڑے کے بچوں کیلئے مناسب سرپرستی اور سپردگی کا انتظام کرنا چاہیئے۔ طلاق جیسے سب سے المیہ واقعے کا سب سے زیادہ شکار بچے ہی ہوتے ہیں۔ مناسب کیسوں میں ماں کی سرپرستی کے حق کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

پنجم :- میں مسلمانوں کیلئے "یکسانی یک زوجگی" تجویز نہیں کروں گا۔ لیکن میں چند زوجگی کو ایک داشتہ رکھنے سے زیادہ برا سمجھتا ہوں کیوں کہ ایک داشتہ بھاگ سکتی ہے، لیکن ایک بیوی نہیں! یہ کبھی نہ ختم ہونے والی فہرست ہے۔ لیکن میں نے صرف ان ہی اصلاحات کو مدنظر رکھا ہے جن کو مناسب قانون کی مدد سے متعارف کیا جا سکتا ہے اور جو اسلامی قانون کی روح میں رچی بسی ہیں۔ ان اصلاحات کیلئے زمین صرف اسی صورت میں ہموار کی جا سکتی ہے جب عوام کی مناسب نمائندگی کی جائے اور عوام کو تعلیم سے بہرہ ور کیا جائے۔ ورد الاکھ چاہتے ہوئے بھی عام سول کوڈ کی بات کرنا احمقوں کی جنت میں رہنے کے برابر ہے۔

مسلمان عورتوں کی تعلیم
مسلم فرقے کی ترقی کی واحد ضمانت

مردوں نے عورتوں کو محض اسلئے تعلیم سے محروم رکھا کہ وہ اپنے حقوق سے واقف ہو جائینگی اور پھر معاشرے میں اپنے صحیح مقام کیلئے لڑیں گی۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ اللہ، قرآن اور حدیث کی تعلیم کے باوجود مسلم عورتوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا۔ معصوم مسلم عورتوں نے محض اپنی لاعلمی کی بنا پر یہ صورت قبول کی۔ ملاؤں نے صرف اپنے مفاد کیلئے ان کو اندھیرے میں رکھا۔ اور یہ صورت تب تک قائم رہے گی۔ جب تک مسلمان عورتیں تعلیم سے محروم رہیں گی۔ اسلئے مسلمان عورتوں کو اپنے حقوق کے حصول کیلئے تعلیم حاصل کرنا ہی چاہیئے۔ ہمیں تمام پرانے رسوم و رواج کو ترک کر دینا ہوگا۔ اس سے ہمارے ماحول میں بچوں کی تعلیم کے فروغ میں مدد ملے گی۔ ہم مسلمان عورتوں کیلئے یہ بہت ہی ضروری ہے کہ تعلیم حاصل کریں اور مردوں کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری پوری پوری مدد کریں۔ صرف اسی ایک قدم سے مسلم فرقہ کی ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔

میں اس بات کو بھی خاص طور پر اہمیت دیتی ہوں کہ ہم مسلم عورتوں کو مسلم پرسنل لا کی تفصیلات سے پوری طرح واقفیت ہو۔ اس سے ہمارا کیس مضبوط ہوگا اور اس میں دیگر سہولتوں کے حاصل کرنے میں مدد بھی ملے گی۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ نے انڈین پینل کوڈ کو اسلئے نافذ کیا تھا کہ اسکے ذریعہ شریعت کے قوانین میں ترمیم کیجا سکے۔ مثلاً انڈین پینل کوڈ کے ذریعہ برٹش سرکار نے غلاموں کی تجارت کے عرب رواج کو ختم کر دیا۔ اور اس جرم میں شریک لوگوں کیلئے سزا متعین کی۔ اس تبدیلی کے خلاف ایک مسلمان نے بھی لب کشائی نہ کی۔ لیکن آج کے جدید دور میں اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کیخلاف ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے اور اس سے نہ صرف مسلم قوم کی پسماندگی کو بڑھاوا ملتا ہے بلکہ مسلمان عورتوں کے ساتھ بے انصافی بھی ہوتی ہے۔

مسلمان عورتیں زیادہ تر غیر تعلیمیافتہ ہیں اور معاشی طور پر مجبور و منحصر۔ اسلئے وہ ہمیشہ اپنے سر پر طلاق کی لٹکتی ہوئی تلوار سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ اس خوف کے جذبے کے مفقود کرنے کیلئے میری رائے ہے کہ ایران، الجیریا، ٹیونیشیا اور مصر کیطرح ہندستان میں بھی Courts of Reconciliation (عدالتِ صلح و ملاپ) قائم کیجائے۔ سماجی تبدیلی کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون میں بھی تبدیلی کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح مسلم پرسنل لا میں بھی بنیادی طور پر تبدیلی لازم ہے۔ اور یہ کام بغیر کسی تاخیر کے انجام دینا چاہیئے۔ اور اس کی مخالفت کرنیوالوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے اقدام سے محض اپنی قوم ہی کا نقصان نہیں کر رہے ہیں بلکہ ملک کی ترقی میں بھی مانع آ رہے ہیں۔

(سلطانہ فیضی)

عامر عثمانی

اسلام پہلے بعد میں سب کچھ!

"تجلی" کے مطالعے سے آپ نے یہ اندازہ تو کر ہی لیا ہوگا کہ راقم نہ مفکر ہے نہ دانشور نہ سیاست داں بلکہ فقط ایک مولوی ہے جو عوام الناس کو ان کی ضرورت کے مطابق شرعی احکام بتانے کی کوشش کرتا ہے اور دینی و ملی مفاد کے پیشِ نظر نقد و تبصرہ کی کچھ ٹوٹی پھوٹی خدمات انجام دے لیتا ہے۔ ایسی معمولی حیثیت کے آدمی سے آپ کا یہ توقع کرنا حیرت ناک ہی ہے کہ وہ کسی ایسے پیچیدہ اور ذیلی در ذیلی مسئلہ پر دادِ تحقیق دے سکے گا جس پر دادِ تحقیق دینے کے لئے ایک مفکر کی گہری بصیرت، ایک مجتہد کی ژرف نگاہی اور ایک ماہر اجتماعیات کی سوجھ بوجھ درکار ہے۔ آپ نے چند سطور میں ایک ایسا سوال سمیٹ لیا ہے جو دشوار ترین ہونے کے علاوہ اتنے مفصل جواب کا طالب ہے کہ پوری کتاب کی نوبت آجائے۔ ناچیز — بلا تصنع — نہ تو اتنا زیرک اور بالغ نظر ہے کہ حق جواب ادا کر سکے۔ نہ آپ ہی یہ پسند کریں گے کہ جواب کے عنوان سے ایک پلندہ آپکو روانہ کر دیا جائے۔ بس یہ آپکے اصرار کا کرشمہ ہے کہ اپنی نااہلی کے باوجود کچھ نہ کچھ لکھنے پر خود کو مجبور پا رہا ہوں۔ ورنہ موزوں بات تو یقیناً یہ ہوتی کہ اس قدر وسیع الذیل اور دقیق سوال کا جواب آپ مشاہیر اہلِ علم و قلم سے لیتے۔

اس سادہ تمہید کے بعد میں اپنی بساط کے مطابق جواب کی کوشش کرتا ہوں۔

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دنیا اور اس کی زندگی اور اس کے نوع بہ نوع مسائل کے مطالعہ میں میرا بنیادی نقطۂ نظر کیا ہے۔ یہ اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ بنیادی نقطۂ نظر کا تعین جب تک نہ ہو جائے کسی بھی مسئلے کے بارے میں کوئی منضبط اور منظم فکر سامنے نہیں آسکتا۔ نہ کسی مفید اور کارآمد نتیجے تک پہنچا جا سکتا ہے سامنے کی بات ہے کہ مختلف امور و مسائل میں ضرورت و اہمیت کی درجہ بندی اور ترتیب کا انحصار ہر شخص کے بنیادی نقطۂ نظر، طرزِ فکر اور اندازِ مطالعہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک ہی چیز زید کے نزدیک دو کوڑی کی ہو سکتی ہے مگر بکر اسی کو لعل و گہر جیسی بیش و بہا تصور کر سکتا ہے۔ مثلاً عورت کی عفت و عصمت کا مسئلہ لے لیجئے۔ کچھ لوگوں کیلئے یہ جان سے زیادہ عزیز ہے، کچھ کے نزدیک اس کی کوئی غیر معمولی قیمت نہیں۔ یہ دو انتہائیں ہیں جن پر ایک ہی آدم کے دو بیٹے بنیادی نقطۂ نظر کے فرق کی بنا پر پہنچتے ہیں اور ان دو انتہاؤں کے مابین بہت سے اسٹیج ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے گویا مسائلِ حیات کے مطالعہ میں طرزِ فکر کے تفاوت نے مضمرات و ثمرات میں بھی تفاوت و رنگا رنگی پیدا کر دی۔ اسی لئے یہ بات بالکل ممکن ہے کہ اگر دس مختلف حضرات آپ کے سوال کا جواب عنایت فرمائیں تو ہر جواب دوسرے سے کلاً یا جزواً مختلف ہو۔

میرے نزدیک یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ اسلامی تعبیر کے مطابق یوں کہہ لیجئے کہ یہ دنیا ایک ایسا میدان ہے جہاں انسانوں کو کاشت تو لازماً کرنی ہے لیکن اپنی کھیتی وہ یہاں نہیں کاٹ سکیں گے۔ بلکہ مرنے کے بعد جس ابدی اور غیر فانی دنیا سے سابقہ پیش آتا ہے، وہاں کاٹیں گے۔ یہ دنیا جسے جنت بنانے کے خواب اپنے اپنے ظرف کے مطابق انسان ماضی بعید سے دیکھتا چلا آرہا ہے اور آج کے دورِ سائنس میں تو یہ خواب دعوؤں اور نعروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ کبھی کسی بھی دور میں گوناں گو آفات و حوادث اور آلام و افکار اور فتنہ و شر سے خالی نہیں رہی اور

نہ ہو سکتی ہے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی سطح پر بھی طرح طرح کے اذیتناک مسائل اور پریشان کن قضیے بفرق مراتب ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لہذا انسان کیلئے تمام تر اہمیت اس بات کی نہ ہونی چاہیئے کہ وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر زیادہ سے زیادہ عیش و راحت حاصل کرنے کی دھن میں لگ جائے اور سارا زور اس پر صرف کر دے کہ دنیاوی غم و اندوہ کا سایہ تک اس پر پڑنے نہ پائے۔ ہر لذت لازماً اسے حاصل ہو اور ہر اعتبار سے اس کی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔ اس کے بجائے اصل اور اساسی اہمیت اس بات کی ہونی چاہیئے کہ سو پچاس سال کی مختصر سی زندگی کے بعد جس طویل تر اور لامحدود زندگی سے واسطہ پیش آتا ہے اس کیلئے آرام و راحت کا کتنا اور کیسا سامان جمع کیا جا سکتا ہے۔

ہم مسلمان توحیات بعد الممات کا عقیدہ رکھتے ہی ہیں لیکن دوسرے بھی تقریباً تمام مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور پایا جاتا ہے مگر محض روایتی اور رسمی حیثیت سے اس عقیدے کا پایا جانا نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس پر اتنا ہی کامل یقین اور غیر متزلزل وثوق نہ ہو، جتنا اپنے وجود پر، آگ اور پانی کی خاصیتوں پر، رنج و مسرت کے احساسات پر اور زہر و تریاق کے فرق پر ہم سب کو ہے۔ یہ یقین و اذعان لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم دنیا کے صرف اس عیش و آرام کے طالب ہوں جس کی طلب اور جس کا حصول ہماری اخروی زندگی کیلئے نقصان دہ نہ ہو، اور اس عیش و آرام کو زہر قاتل سمجھیں جس کے نتیجہ میں ہماری اخروی فلاح و عافیت خطرے میں پڑ جائے۔

ایک سادہ سی مثال :-

اسلام نے خبر دی ہے کہ ضروریات زندگی کو اس نیت سے روک رکھنا کہ گراں فروخت کی جائیں حرام ہے۔ حرام اسلامی شریعت کی ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فعل پر وہ آقا اور مالک الملک ناراض ہو جائے گا جس کے قبضہ و اختیار میں سارا عالم ہے۔ اور جس کی چشم عنایت پر ہماری اخروی عافیت کا مدار ہے۔ اب غور کر لیجئے کہ اگر اس خبر کی صداقت پر ہمیں مکمل وثوق ہو تو کیسے ممکن ہے کہ ہم اس حرام کا ارتکاب کریں اور مخلوق خدا کی زندگی اجیرن کر دیں۔

مجھے توقع ہے کہ آپ بھی اور تمام جدید دانشور بھی اور ماڈرن مفکرین بھی میری اس [illegible] قرار دیکر بلا تکلف [illegible]

استہزاء فرمائیں گے۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ میں بہرحال تمام مسائل کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور یقین کامل رکھتا ہوں کہ یہی وہ واحد اور قطعی نقطۂ نظر ہے جو انسانوں کے مابین امن و عدل کی فضا اور چین کا ماحول پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں نہ صرف مرنے کے بعد والی زندگی کی فلاح مضمر ہے بلکہ حیات دنیاوی کیلئے بھی اس کی افادیت شبہ سے بالاتر ہے اس سے متصادم کوئی بھی نظریہ اور انداز فکر انسانیت کی کوئی حقیقی خدمت انجام نہیں دے سکتا اور وقتی طور پر اس سے کچھ مسائل سلجھ بھی جائیں تو کہیں زیادہ مسائل الجھتے چلے جائیں گے۔ انسانوں کے مابین عدل کا قیام، خیر کا فروغ اوصاف حمیدہ کا نشوونما، پاکیزہ جذبات کا پھیلاؤ اور امن کی پائیدار تعمیر کا اہم ترین کام صحیح طور پر انجام پا ہی نہیں سکتا۔ اگر انسانی اعمال و افعال کا محرک یہ خیال ہو کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا ہے۔ یہاں سے جا کر نہ کہیں اور زندہ ہونا ہے نہ حساب دینا ہے، نہ انعام پانا ہے نہ سزا بھگتنی ہے۔

ہم ہندوستانی مسلمان جن بے شمار مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے کسی کی بھی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے ارباب حل و عقد ہر ہر مسئلے کو اس کے اپنے دائرے میں رکھتے ہوئے حل کرنے کی جدوجہد برابر کرتے رہیں۔ لیکن اس سے بڑھکر ضروری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ان کے بنیادی نقطۂ نظر کا فساد اور کجی اور سقم دور ہو۔ جڑ میں پایا جانیوالا زہر جب تک زائل نہ ہوگا برگ و بار کی سمیت زائل نہ ہو سکے گی۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے جگر کی خرابی سے ایک شخص کا چہرہ زرد پڑ جائے ہاضمہ بھی برباد ہو جائے، اعصاب بھی کمزور پڑ جائیں۔ دل و دماغ بھی صحیح طور پر کام کرنا چھوڑ دیں، ضعف کے باعث کوئی محنت کا کام نہ ہو سکے۔ ان میں سے ہر ہر خرابی بلاشبہ اس کی مستحق ہے کہ دواؤں میں اس کا لحاظ رکھا جائے لیکن اہم تر بات یہ ہے کہ توجہ اصلاً جگر کی درستگی پر مبذول کی جائے۔ اور کسی بھی وقت اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوا جائے کہ جگر کی اصلاح کے بغیر مذکورہ عوارض میں سے کوئی بھی عارضہ دور کیا جا سکتا ہے

بارہا ایسا ہوتا ہے۔ اور اب تو کم و بیش معمول بن گیا ہے کہ جسم کے کسی بھی حصے میں اٹھنے والے درد کا وقتی علاج اسپرین اور مائیسین جیسی دواؤں سے کر لیا جاتا ہے اور یہ فکر نہیں کی جاتی کہ درد کی اصل وجہ کیا ہے [illegible]

بگاڑ بڑھتا جاتے اور مجموعی صحت کھوکھلی ہوتی چلی جاتے ۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے کسی بھی مسئلے کو اس کی بنیادی اور معنوی وجوہ سے الگ کرکے مستقل بالذات مسئلہ کی حیثیت دی جاتے اور کسی نہ کسی طرح اس میں کچھ سلجھاؤ پیدا کر دیا جائے تو یہ ایک ناپائیدار اور سطحی طریق کار ہوگا جس کے اثرات نہ دیرپا ہوسکتے ہیں نہ گہرے ۔ یہ میں بھی مانتا ہوں کہ درد کا فوری ازالہ اور تسکین کا عاجلانہ حصول بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے ۔ جو درد مریض کو تڑپا رہا ہو اس کے اصل سبب کو ختم کرنے کی تدابیر کے ساتھ ساتھ بلکہ بعض حالتوں میں ان تدابیر سے بھی قبل تسکین بخش دواؤں کی ضرورت ہے تاکہ کرب شدید سے نجات ملے اور جسم کی قوت مدافعت یکسوئی کے ساتھ اصل مرض سے لڑسکے ۔ اسی لیے میں اسے غلط نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کے مختلف ارباب بصیرت اور فعال حضرات اپنے اپنے حلقوں اور میدانوں میں اپنے اپنے وسائل و امکانات کے مطابق پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں حتیٰ کہ دس افراد اگر روزگار سے محروم ہیں اور محنت سے جان نہیں چراتے تو ان کیلئے روزگار کا بندوبست کرنا بھی فی نفسہ ایک مستحسن کام ہے جو محدود دائرے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے ۔ لیکن بڑا اور اساسی سوال ــــ جو بے شمار مسائل کا مصدر و منبع ہے ۔ یہ ہے کہ کیا حیات و کائنات کے بارے میں ہم مسلمانوں کا نقطۂ نظر اور سوچنے کا ڈھنگ وہی ہے جو اسے ہونا چاہیئے ۔ یا زبانی دعوۂ اسلام کے باوجود ہم ٹھیک اسی انداز سے سوچنے لگے ہیں جس سے وہ تمام لوگ سوچتے ہیں جنھیں موت کے بعد والی زندگی اور حشر و نشر اور حساب کتاب پر مطلق ایمان نہیں یا وہ نیم یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہیں ۔ یا کوئی قابل اطمینان علم ہی انھیں اس بارے میں حاصل نہیں ہے

یہ حکومت کچھ بنیادی پالیسیاں وضع کرتی ہے اور پھر تمام شعبوں کو ایسی ہدایات دیتی ہے جن کی تعمیل اس پالیسی کے روبکار آنے میں معاون ثابت ہو اور جن سے گریز اس پالیسی کو ناکام بنا دے ۔ اب اگر کوئی پالیسی ہی سرے سے غلط اور مضر ہے تو تمام شعبوں کے کارپرداز خواہ کتنی ہی تندہی اور دیانتداری کے ساتھ ہدایات کی تعمیل کریں نتائج نقصان دہ ہی نکلیں گے اور پالیسی اگر بجائے خود صحیح و مفید ہے لیکن اسے کامیاب بنانے والی ہدایات پر عمل نہیں کیا جاتا تب بھی کوئی مفید ثمرہ حاصل نہیں ہوسکے گا ۔ ضرورت ہے کہ پالیسی بھی اپنی جگہ مفید و صائب ہو اور اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی سرگرمیاں بھی دیانت داری کے ساتھ جاری رکھی جائیں ۔

میں جس بنیادی نقطۂ نظر کی بات کرتا چلا آرہا ہوں اسے مثالاً ایک پالیسی تصور فرما لیجئے ۔ گویا کردار و عمل کی تمام جزئیات سے ہٹ کر مسلمان کو اولاً یہ طے کرنا ہے کہ وہ کارگہ حیات میں جو بھی کام کرے گا وہ لازماً ایسا ہوگا جس کے نتیجے میں آخرت کا زیاں نہ ہو ۔ جو اسلام کے اصول و افکار سے ہم آہنگ ہو جسے اسلامی معیار اخلاق سے گرا ہوا ثابت نہ کیا جاسکے اور جس میں دنیاوی منافع کو اخروی نقصانات پر فوقیت نہ دی گئی ہو ۔ یہ طے کرنے کے بعد اسے تعمیری منصوبے بنانے ہیں ، مسائل کا حل ڈھونڈھنا ہے اور اپنی راہ کے ہر پہاڑ کو عزم و ہمت اور فہم و فراست کے تیشوں سے کاٹنا ہے ۔ اگر وہ اپنا بنیادی نقطۂ نظر تو ٹھیک کر لیتا ہے لیکن جہد و عمل کی راہ میں مردانہ وار آگے نہیں بڑھتا اور میسر وسائل کا دانشمندانہ استعمال کرکے نئے راستے نہیں بناتا تو محض بنیادی نقطۂ نظر اسے کچھ پہنچ نہیں کریگا زندگی کا میدان محنت کا پسینہ ، بازو کا زور اور فراست کی طراری چاہتا ہے محض فکر محض خیالات ، محض خواہشیں اور تمنائیں لاحاصل ہوا کرتی ہیں ۔ جب تک جادۂ عمل پر پیش قدمی نہ کی جائے ۔ اسی طرح اگر جہد و عمل کا بازار تو گرم ہو لیکن بنیادی نقطۂ نظر درست نہ ہو تو ہر ہر قدم منزل سے دور ہی لے جائے گا ۔ ضمنی کامیابیوں کے کچھ مراحل آئے بھی تو وہ فریب نظر ہوں گے اور عقیدہ و فکر کی خامی جونک بن کر ہر کامرانی کا خون چوستی رہے گی ۔

میرے نزدیک مسلمانوں کے زوال اور زبوں حالی کا قوی ترین اور حقیقی سبب پہلے بھی یہی رہا ہے ، اب بھی یہی ہے اور قیامت تک یہی رہے گا کہ مرنے کے بعد والی زندگی اور اس کے لوازمات کے بارے میں ان کا عقیدہ ابتداً ہلکا سا غبار آلود ہوا پھر اس غبار کی کثافت بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ اس کی حیثیت محض ایک روایت اور رسم کی ہوگئی ۔ اس میں وہ صلابت اور گیرائی اور تاثیر بالکل نہیں رہی جو عقیدے کی شان ہے ۔ عقیدہ صرف رائے یا فلسفیانہ نظریے کو نہیں کہتے وہ ایک ایسا جوہر سیال ہے جو رگ رگ میں لہو کے ساتھ دوڑتا ہے اور آدمی کی پوری نفسیات اس سے لپٹی رہتی ہے ۔ کوئی بھی آنکھ والا تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کرے یا آج کے مسلمانوں کی عام ذہنیت اور کردار پر ناقدانہ نظر ڈالے وہ بلا ریب اس نتیجے پر پہونچے گا کہ اوپر سے نیچے تک ، ایک عالم سے لے کر مولوی اور صوفی کے دولتکدے تک ، بازار ، کھیت ، مسجد ، خانقاہ اور درگاہ ہر جگہ دنیا طلبی ، نفس پرستی خود غرضی ، جہالت مرکبہ ، کبر و نخوت ، حرص و حسد اور بے عملی و بدعملی کی فصل بہار لہلہا رہی ہے ۔

مسلمانوں کی اکثر و بیشتر سرگرمیاں اور معمولات و مشاغل ایسے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں جو فکر آخرت سے بے نیاز اور صحت مند افکار سے محروم قوموں کا رنگ ہے۔

مسلمانوں کے مخصوص مسائل تو جو ہیں سو ہیں، بے شمار مسائل ہمارے ملک میں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً آج کا سب سے ابھرا ہوا مسئلہ روز افزوں گرانی اور اشیائے ضروریہ کی قلت ہے۔ اس میں مسلم سکھ ہندو عیسائی کسی کی تخصیص نہیں۔ بے شمار انسان اکھڑے اکھڑے سانس لے رہے ہیں۔ زندگیاں اجیرن ہو کر رہ گئی ہیں۔ حال تاریک اور مستقبل تاریک تر ہے۔

اس صورت حال کے سیاسی، اقتصادی وجوہ اور مادی و منطقی اسباب خواہ کچھ بھی تشخیص کئے جائیں مگر بنیادی ترین اور قوی سبب دولت پرستی کا وہ جنون ہے جو انسانوں کے سر و دل، پر سوار ہو گیا ہے۔ یہ جنون اپنی عین فطرت میں یہ تقاضے سموئے ہوئے ہے کہ آدمی خود غرض ہو، سنگدل ہو، اخلاق و مروت، رحم و راحت اور ایثار و خدمت سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ذاتی نفع اور لذت اور تعیش کی قربان گاہ پر وہ انسانیت، عدل، قناعت اور قربانی کے تمام میلانات کو ذبح کرتا چلا جائے۔

یہاں یہ بحث غیر ضروری ہوگی کہ اس جنون کو اپنے موجودہ مرحلے تک لانے میں کن کن عوامل نے کتنا کتنا کام کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور عرض کیا جائے گا کہ اس جنون کی گرفت صرف غیر مسلموں ہی پر نہیں مسلمانوں پر بھی مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور مسلمان بھی اسی کے زیر اثر ان تمام راہوں پر دوڑ لگا رہے ہیں جو آخرت فراموش اور دنیا پرست قوموں کی راہیں ہیں۔

دیکھئے، وہ کپڑے کی ایک شاندار دکان پر مسلمان تاجر بیٹھا ہے اس کے منہ پر داڑھی بھی ہے اور نمازوں کے وقت وہ مسجد بھی جاتا ہے بارہا اسے تسبیح پڑھتے بھی دیکھا گیا ہے گویا وہ عام فاسق و فاجر مسلمانوں سے ممتاز ایک "صالح" مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں بظاہر یہی حسن ظن رکھا جاسکتا ہے کہ اسے اسلام کے دیئے ہوئے عقائد و تصورات سے گہری وابستگی ہوگی۔ وہ زندگی کے تمام ہی شعبوں میں یہ لحاظ ضرور رکھتا ہوگا کہ کون سے کام آخرت کیلئے مفید ہیں اور کون سے نقصان دہ۔

مگر جب آپ بہت قریب سے مطالعہ کریں گے اور آپ کی نگاہ نقد اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں تک پہنچے گی تو منکشف ہوگا کہ اس کا حال بھی دوسروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ پچھلے سال اس نے ۲۰ ہزار میٹر کپڑا اوسطاً دو روپئے میٹر کے حساب سے خریدا تھا، آج اس کے دام آٹھ روپئے میٹر تک جا پہنچے ہیں۔ یہ قیمت رفتہ رفتہ بڑھی ہے اور اس نے اچھی خاصی دولت کمائی ہے۔ اب اس کے پاس اس میں سے پانچ ہزار میٹر موجود ہے۔ اور وہ دیکھ رہا ہے کہ گرانی ابھی اور اوپر جانے والی ہے۔ لہذا اب وہ آٹھ روپئے میٹر بیچنے میں بھی تامل کر رہا ہے۔ بہتیرے تھان چھپا اور سنگوا کر رکھ دیئے ہیں اور تہ دل سے منتظر ہے کہ کب دام اور بڑھتے ہیں اور کب وہ اپنے دو روپئے میٹر خریدے ہوئے کپڑے کو پندرہ سولہ روپئے میٹر فروخت کر کے اپنی جمع میں غیر معمولی اضافہ کرتا ہے۔ اس کی خدا ترسی کی یہ حالت ہے کہ ایک جانا پہچانا غریب آدمی اپنی بچی کے جہیز میں ضروری دو جوڑے دینے کے لئے اس کی دکان پر یہ توقع لے کر آتا ہے کہ یہ نمازی مسلمان ہے، میری غربت کو بھی خوب جانتا ہے، مجھے رعایت سے کپڑا دیدے گا۔ لیکن اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے جب وہ اس سے یہ جواب سنتا ہے کہ بھاؤ آج کل میں اور بڑھنے والا ہے لہذا یہی رعایت سمجھو کہ تمہیں آٹھ روپئے میٹر دے سکتا ہوں۔

دیکھا آپ نے، دو روپئے میٹر خریدا ہوا کپڑا یہ آٹھ روپئے دے کر بھی احسان جتلا رہا ہے۔ حالاں کہ اگر اسے اسلام کی اس یقین دہانی پر اطمینان قلب ہوتا کہ ہر بھلائی کا اجر کم سے کم دس گنا ملتا ہے تو یقیناً وہ پگھلے ہوئے دل کے ساتھ یوں سوچتا کہ یہ غریب نہ جانے کتنے وقت کے فاقے کر کے کچھ پیسے جوڑ لایا ہے۔ میں اگر اسے خرید کی خرید پر دیدوں تو اس کا بھلا ہو جائے گا اور مجھے کوئی نقصان بھی نہ ہوگا۔

یہی نہیں، اس "نیک تاجر" کے پڑوس میں کئی افراد پر مشتمل ایک گھر ہے جس کے مکین بمشکل دو وقت روٹی کھا سکتے ہیں۔ بارہا تو فاقہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ دوسرا گھر ہے جس میں ایک غیرت دار اور شریف مگر مفلس گھرانے کی جوان بچی محض اس لئے بن بیاہی بیٹھی ہے کہ شادی کے ناگزیر اخراجات کیلئے وہاں کچھ نہیں۔ تیسرا گھر ہے جس کا ایک ہونہار بچہ محض اس لئے تعلیم سے محروم رہا جا رہا ہے کہ اس کے غریب باپ یا بیوہ ماں کے پاس تعلیمی اخراجات کا بندوبست نہیں ہے۔

آپ اکثر و بیشتر یہ دیکھیں گے کہ اس نمازی تاجر کی ذرا بھی توجہ پڑوس کے ان مسائل کی طرف نہیں۔ اسے سرے سے یہ احساس

ہی نہیں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان مسائل کے رخ پر بھی اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، فرائض ہیں۔ اسے خدا نے اتنا پیسہ دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے کسی بھی آرام و راحت کو متاثر کئے بغیر اور بلا تنگی اٹھائے ان مفلوک الحال گھروں کی کافی امداد کر سکتا ہے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ اسے تو بس یہ فکر ہے کہ خود اس کی تجوری میں زیادہ سے زیادہ پیسہ کیوں کر آئے اور کاروبار اور زیادہ کیسے چمکے۔

غور کر لیا جائے کہ ایسا انداز فکر رکھنے والا آدمی اپنی عرفی صالحیت اور اصطلاحی عبادت گذاری کے باوجود کیا واقعی خدا کا خوف اور فلاح آخرت کی زندہ خواہش اور حساب آخرت کا خیال رکھنے والا کہیں سے ہے

رشوت ستانی کا جو شباب ہمارے ہاں آیا ہے وہ بھی جذبۂ دولت پرستی ہی کے برگ و بار میں ہے۔ سروے کیا جائے تو حال اس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ حرام خوری کے اس راستے میں بھی مسلمان کسی سے پیچھے نہیں۔ اسے جتنے بھی مواقع حاصل ہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھانے میں وہ نہیں چوکتا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بات غالب کثرت کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔ مستثنیات تو مسلم و غیر مسلم سب میں پائی جاتی ہیں ہوسکتا ہے مسلمانوں کے معاملہ میں استثناء نسبتاً زیادہ ہو لیکن سماجی زندگی کا ڈھانچا اور خدوخال اور ماحول غالب تعداد ہی کے کردار و افکار سے بنا کرتا ہے۔ افراد معاشرہ کی اگر زیادہ بڑی تعداد اخلاقی رذائل اور غیر انسانی بدیوں کو فروغ دینے میں منہمک ہے۔ تو تھوڑے سے مستثنیٰ افراد کی پرہیز گاری اور جزوی صالحیت اسی طرح بے اثر ہو کر رہ جائے گی جس طرح منوں اور ٹنوں غلاظت کے ڈھیر میں عطر کے چند قطرے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے بہت چھوٹے پیمانے پر بگاڑ کی مثالیں پیش کی ہیں غضب یہ ہے کہ بات صرف عوام تک محدود نہیں۔ اگر نکتہ رسی اور باریک بینی کے ساتھ ان حضرات کے اذہان و قلوب اور نفسیات کا تجزیہ کیا جائے جنھیں اہل علم اور جانے دین و مت خیال کیا جاتا ہے تو وہاں بھی عقیدہ و ہمت ملا تو مدقوق اور فالج زدہ لگا یا اسے سکیڑ کر بہت محدود کر لیا گیا ہوگا۔ ایک مولانا صاحب مغربی طرز کے پہناوے کو حرام کہتے ہیں، بجا کہتے ہیں کہ بجا طور سے یہ چیزیں ان کے نزدیک معاصی میں داخل ہیں۔ واقعی

ان کا خیال ٹھیک ہے۔ عقائد کی صحت اور کردار و عمل کی بلندی سے انھیں محبت ہے۔ بے شک ہونی ہی چاہیئے۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بلا تکلف اپنی اولادوں کو ان ہی اسکولوں اور کالجوں میں داخل کرتے چلے جا رہے ہیں جہاں داخل کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ اولادیں ان سانچوں میں ڈھل جائیں جن کا کوئی جوڑ مولانا صاحب کے معیار بلند سے نہیں ہے۔ پھر کوئی صاحبزادے اگر پڑھ لکھ کر کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتے ہیں تو مولانا سمیت سارا گھر اس پر فخر کرتا ہے خوشی مناتا ہے۔ حالاں کہ انھیں بخوبی معلوم ہے کہ بڑے عہدے داروں پر آج کل حرام کے کتنے دروازے چوپٹ کھلے ہوتے ہیں۔

سوچئے کیا یہ نفاق نہیں ہے۔ کیا جبہ و دستار اور تسبیح و مصلّٰی اور وعظ و خطابت کے منظر فریب غلافوں میں چھپا ہوا قلب و دین واقعی وہی قلب و دین ہے، جو اس یقین کامل کا سرمایہ دار ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر ہر فعل و عمل کا حساب دینا ہوگا اور ایک داعی۔ ایک سرپرست و ولی کی حیثیت سے انھیں جواب دہی کرنی ہوگی کہ اولاد کی پرورش تم نے کن خطوط پر کی اور اسے کس راستے پر ڈالا۔؟

میرا یہ مطلب نہیں کہ علوم جدیدہ کی تعلیم فی نفسہ مضر ہے یا اسے گناہ کے خانے میں رکھ دینا چاہیئے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ حالات نے اگر اسکول کالج کی تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دیدی ہو یا ناگزیر بنا دیا ہو تب بھی ایک سچا اور ذی فہم مسلمان یہ ضرور کرے گا کہ بچے کا ذہنی سانچہ پہلے اسلام کے رخ سے درست کرے۔ اس کے نمو پذیر قوائے ذہنی کو وہ سمت اور بنیاد مہیا کر دے جو اسے موم کی طرح کسی بھی دوسرے سانچے میں ڈھل جانے سے روکے۔ اور اسکول کالج کے نصابات اور ماحول و فضا کے اخلاق سوز اثرات و محرکات سے مقابلے اور جنگ کا جذبہ اس کے اندر کسی نہ کسی درجہ میں پرورش پاتا رہے تاکہ وہ مکمل طور پر ایسا جانور نہ بن جائے جسے آرائش جسم، راحت طلبی اور دنیا پرستی کے علاوہ کہیں کا ہوش نہ ہو۔ مگر کیا ہم یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

کردار و عمل سے گذر کر معتقدات کی حالت دیکھئے تو وہاں بھی کوئی خوش گوار صورت حال نظر نہیں آئے گی۔ جدید تعلیم کا حامل طبقہ چند صحیح عقائد کے پہلو بہ پہلو بہت سے غلط اور فاسد و باطل عقائد کو فکر و نظر کی بنیاد بنائے ہوئے ہیں۔ اور اسلام کی پیروی کے عوض

اسے اپنا تابع اور محکوم بنانے پر منحصر ہے۔ اس کی جدوجہد اور کاوش کا رخ کی سمت سفر ٹھیک وہی ہے جو کسی دنیا پرست کی ہونی چاہیئے۔

قدیم تعلیم کا حامل طبقہ بھی اپنے افکار و معتقدات کا کوئی خوش آئند اور دلکش منظر پیش نہیں کرتا۔ غلو، تشدد، تنگ نظری اور خود پرستی کے اوصاف تبیحہ اس کا طرۂ امتیاز بن گئے ہیں۔ اور اسی طبقے کے بہت سے کوتاہ فکر اور کج فہم حضرات نے تصوف و طریقت کے نام پر ایک نیا اسلام کھڑا کر دیا ہے جس نے قوم مسلم کا ذہنی قبلہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ درگاہوں کی چہل پہل، مزارات کے میلے، ہندوانہ دین کے عرس بے شمار، پیرزادوں، عقیدوں کی ریل پیل اور توہمات و شرکیات کی بھیڑ بھاڑ یہ سب اسی نئے خانہ ساز اسلام کی دین ہیں۔ اور ان میں دل چسپی لینے والا ذہن اسلام کی اساسی افکار اور اصل تعلیمات سے ہٹ گیا ہے۔

دین داروں کا جو طبقہ ان بدعات و خرافات سے علیحدہ ہے وہ کچھ اور قسم کی اخلاقی کمزوریوں کا ہدف ہے۔ منافست، حرص و حسد، خود غرضی، انانیت اور جہل مرکب۔ یہ اوصاف ہیں جو بڑی افراط سے ہر طرف پائے جا رہے ہیں۔ اور ان کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان مشترکہ مسائل کی گرہ کشائی کیلئے کسی ایک قیادت کے زیر سایہ جمع ہوں۔ اور اپنی بکھری ہوئی طاقت کو مجتمع کر کے دشواریوں کے پہاڑ کاٹ سکیں۔

ہندوستان سے باہر کی دنیائے اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو وہاں بھی کسی امید افزا حالت کا دیدار آپکو میسر نہیں آئے گا۔ ہم ہندوستانی مسلمان تو مجموعی حیثیت سے غریب ٹھہرے لیکن دنیائے اسلام کو تو اللہ نے تیل کے ذریعہ دولت مند بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود وہی بدترین نفاق اور فکری دو رنگی اور ننگی دنیا طلبی وہاں بھی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں وہ ممتاز و منتخب قوم جو خدا کی مرضیات کا مظہر بنا کر بھیجی گئی تھی اور عزت و عظمت اس کا طبعی حق تھا آج ایک ایسی قوم ہے جس نے اپنا امتیاز کھو دیا ہے جو بے شمار عقائد و اعمال میں اغیار کی مقلد اور تابع مہمل ہے، جس کے افکار کا اجتماعی بحیثیت مجموعی ان ایوانوں سے مشابہ ہے جن کے بنانے والے آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ اور دنیا ہی کو سب کچھ تصور کرتے ہیں۔ خدا کی باز پرس، گناہ و ثواب اور حیات بعد الموت کا عقیدہ یا تو ان کے پاس سرے سے ہی نہیں یا ہے تو برائے نام فقط رسمی و روایتی، غیر موثر اور معطل۔

ابھی حال ہی میں عرب ممالک کے مابین ایک سیاسی نوع کا جو اتحاد رونما ہوا۔ اور اس کے نتیجہ میں دوسری قوموں کو یہ محسوس کرنے کا موقعہ ملا کہ یہ ملت بیمار ابھی نزع تک نہیں پہنچی ہے اور اس کی خاکستر میں ابھی چنگاریاں باقی ہیں۔ تو ہمارے ملک کے سادہ لوح اور نیک دل مسلمانوں نے بڑے زور و شور سے اس قسم کی باتیں شروع کر دیں کہ سویا ہوا شیر جاگ اٹھا ہے، غفلت کا نشہ ٹوٹ گیا ہے، عظمت کے پرچم کھل گئے ہیں۔ امریکہ جیسی قوتیں خوف زدہ ہو گئی ہیں وغیرہ ذالک۔

مگر میں عرض کروں گا کہ محض سیاسی سطح پر معمولی سی خوش آئند تبدیلیاں اگرچہ قدر و قیمت کی حامل ضرور ہیں۔ مگر اس قدر نہیں کہ ان کے سہارے "بڑے سائز کے خواب" دیکھے جا سکیں۔ انہیں مکمل بیداری کا پیش خیمہ سمجھ لینا مبالغہ آمیز حسن ظن ہے کیوں کہ ان کی حیثیت محض ایسی کروٹوں کی ہے جو سوتے میں لی جاتی ہیں۔

مسلم قوم کو اس کی عظمت رفتہ کی طرف لیجانیوالی اور اس کا وقار لوٹانے والی بیداری اگر فی الحقیقت کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ہو سکتی ہے جس کو قلب و روح کی بیداری کہتے ہیں اس بیداری کا آغاز اس دن ہوگا جب مخلوق خدا کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکانے والے اور معاشرے کو جس رنگ میں چاہے رنگ دینے کا اختیار رکھنے والے مسلمان سربراہ اور قائدین اس نفاق کو ترک کرنے کا تہیہ فرمائیں گے۔ جو عقیدے اور عمل کی دو رنگی سے عبارت ہے۔ اور جس کا زہر دنیا کے ہر زہر سے زیادہ مہلک ہے جس نے اسلام اور غیر اسلام کے امتیازی خطوط کو کہیں دھندلا اور کہیں بالکل غائب کر دیا ہے۔

یہ بات کسی بحث کی طالب نہیں کہ نماز روزہ اور دیگر مصطلح عبادات انتہائی ضروری ہونے کے باوجود دوسروں کیلئے وہ وسیع و عمیق اثرات اپنے اندر نہیں رکھتیں جو اسلام کی عام اخلاقی تعلیمات میں پوشیدہ ہیں۔ سیاست، معاشرت، معاملت، ہر دائرہ زندگی میں اخلاق کا جو معیار اور کردار کا سانچہ اور انداز فکر کا جو رخ اسلام نے دیا ہے وہ بالیقین ایسا ہے کہ جب جس درجے میں اس کی نمود ہوگی اسی درجے میں دوسری اقوام اس سے متاثر ہوتی چلی جائیں گی۔ ہماری سب

سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ حیات و کائنات کے رخ پر مسلمانوں کا طرزِ فکر درست ہو۔ وہ دوسروں کے عیوب اور بدسلوکیوں پر تمام تر توجہ مبذول کرنے کے عوض اپنی خامیوں اور منافقتوں پر التفات فرمائیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے تمام کام چھوڑ کر اسی ایک کام میں فوراً لگ جانا چاہیئے۔ دوسرے کام مثلاً جان ومال، تہذیب، زبان، معاشرتی اقدار اور ملی ومعاشی حقوق کے تحفظ کی کوششیں بہرحال ضروری ہیں اور ان سے ذرا بھی غفلت نہیں برتنی چاہیئے لیکن جس طرح سانس لینے کا مشغلہ ایک مستقل اور مسلسل مشغلہ ہوتے ہوئے بھی ہمیں دوسری مصروفیات سے نہیں روکتا اسی طرح طرزِ فکر میں تغیر کی کوشش، نفاق سے گریز کا عزم اور اسلامی اخلاق سے پوری طرح وابستہ رہنے کا عزم کوئی ایسا کام نہیں جو یہ تقاضہ کرے کہ پہلے اسے کرو پھر کسی اور کام کو ہاتھ لگانا۔

آپ نے سوال کیا ہے کہ فلاں فلاں حقوق کے تحفظ کی خاطر ہندستانی مسلمانوں کو کون سا سماجی وسیاسی نظریہ اپنا کر کس راہ پر چلنا چاہیئے۔

میرا جواب یہ ہے کہ جہاں تک سماج کا تعلق ہے، ہمارے ملک میں کوئی بھی ایسا سماجی نظریہ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا جسے سنجیدہ مفہوم میں "نظریہ" کا نام دیا جاسکے۔ لے طیری قسم کی روایات، بے اساس افکار وعقائد اور الجھے ہوئے اوہام وتخیلات پر مبنی ایک سماج یقیناً موجود ہے مگر ایسی کوئی چیز موجود نہیں جسے عقل وعلم کی کسوٹی پر پرکھ کر اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ ہمیں ہمارا گوہر مقصود مل گیا ہے۔ حتیٰ کہ میرے نزدیک یہاں اسلام کا سماجی نظریہ بھی کردار وعمل کے رخ پر اپنے بہت سے امتیازی خط وخال مسخ کر چکا ہے اور مزید مسخ کرتا جارہا ہے۔ سود خواری، ضروریات زندگی کی ذخیرہ اندوزی، رشوت ستانی، شادیوں میں دھوم دھام، لڑکی والوں سے جہیز کا مطالبہ، ہمسایوں کے بُرے بھلے سے بے نیازی، ضروری تعلیم وتربیت سے لاپرواہی بدمعاملگی، بدعہدی، بدمزاجی، سامان تعیش کی حرص اور پیسہ کمانے کی دھن، یہ اطوار دادا صاف اسلامی نظریۂ معاشرت سے کچھ بھی جوڑ رکھتے ہیں؟ پھر رہا سہا بھرم ان شرانگیز سرگرمیوں نے کھو دیا جنھیں طریقت کے نام پر اختیار کرلیا گیا ہے جو توم کلیر اور اجمیر میں قبوری میلے لگاتی ہے [illegible] قوم میں مردہ لوگوں کے زندۂ جاوید اور غوث ودستگیر ہونے کا عقیدہ پایا جاتا ہو، جو قبروں پر ڈھولک اور ہارمونیم کے ساتھ قوالیاں اڑائے، جس کی درگاہوں میں مزارات کے ارد گرد آدم کے بیٹے رکوع وسجود تک سے گریز نہ کریں اور جس میں صدیوں قبل کے وفات یافتگان سے اولاد اور نوکری اور صحت مانگی جاتی ہو اسے بھلا اسلامی کلچر اور نظریۂ معاشرہ سے کیا سروکار ہوسکتا ہے۔ داڑھی یا لباس کی ایک خاص وضع یا باورچی خانے میں استعمال ہونے والے برتنوں کی مخصوص اقسام ذرا بھی نظریاتی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اگر ذہن وقلب میں اسلام کے مجموعی فکر ونظریہ کی نقش کاری نہ ہو۔

بے شک اسلامی تہذیب ومعاشرت کی بہت سی قدریں اور اصول وشعائر ابھی ہمارے ہاں زندہ ہیں۔ مقابلۃً ہم ان پر فخر بھی کرسکتے ہیں لیکن کوئی بھی مشین کارآمد اسی وقت ہوسکتی ہے جب اس میں تمام پرزے اپنی اپنی جگہ فٹ ہوں۔ اگر ہزار کل پرزوں والی مشین ہے تو اس سے کام نہیں چلے گا تو نو سو پرزے تو ٹھیک طرح سے جوڑ دیئے گئے ہوں مگر سو پرزوں کی جگہیں یا تو خالی ہوں۔ یا اس میں ادھر ادھر کے غیر موزوں پرزے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ مگر سو پرزوں کی جگہیں یا تو خالی ہوں یا انہیں ادھر ادھر کے غیر موزوں پرزے ٹھونس دیئے جائیں۔

اسی طرح اسلام کا سماجی نظریہ کتابوں میں اگرچہ کمل طور پر موجود ہے اور نقد ونظر کے سخت سے سخت مراحل سے کامیاب گذرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے مگر اینٹ اور پتھر کی دنیا میں وہ اپنے واجبی اثرات پیدا کرنے کا اہل نہیں رہا کیوں کہ وہ صرف کتابوں میں ہے، مسلمانوں کے کردار میں نہیں ہے وہ ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جس کی زبانی تعریفیں تو بہت کی جاتی ہیں لیکن آزمایا نہیں جاتا، یا آزمایا جاتا ہے تو ناقص انداز میں۔ اسی کا نام ہے نفاق۔ دورنگی۔ میں محض خوش عقیدگی کے طور پر نہیں بلکہ پوری طرح سوچ سمجھ کر یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو کسی نئے سماجی نظریئے کی جستجو ہرگز نہ کرنی چاہیئے بلکہ ان خامیوں اور نارسائیوں کے مداوے کی فکر کرنی چاہیئے جو اسلامی نظریۂ معاشرہ کو اختیار کرنے میں پائی جارہی ہیں۔ اس نظریئے کی نمود ہیئت اور فروعات کے اعتبار سے تو مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں یکساں نہیں ہوسکتی۔

ہر ملک اور زمانہ اپنا مخصوص مزاج و ماحول اور مخصوص تقاضے اور مخصوص خواہشیں اور حیثیتیں رکھتا ہے۔ روایات رکھتا ہے۔ ان کا لحاظ رکھنا ہی ہوگا لیکن یہ لحاظ غیر محدود نہیں اس کی حد بندی اسلامی ضوابط سے کرنی ہوگی اسلام کے بنیادی ضوابط اور خطوط اور اصول و احکام میں تبدیلی کا نہ تو مسلمانوں کو حق ہے نہ تبدیل شدہ چیزوں کو اسلامی نظریہ معاشرت کا حصہ مانا جاسکتا ہے۔

یا سیاسی نظریہ تو اس موضوع پر مجھ جیسا غیر سیاسی طالب علم کیا تحقیق دے سکے گا۔ یہ بڑا نازک اور دقیق مسئلہ ہے اور ملک کے موجودہ احوال میں سیر حاصل گفتگو بہت ہی مشکل ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان جو بھی نظریہ سیاسی اختیار کریں اس میں بہر کیف یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کے رہنما خطوط اور عقائد و نظریات سے انحراف نہ ہو۔ اسلام کو سیاست کے تابع نہیں بلکہ سیاست کو اسلام کے تابع رکھنا لازم ہے۔ کسی بھی اسلامی تعلیم کا خون کرکے پورا ایک ملک بھی فتح کر لیا جائے تو میرے نزدیک خسارے کا سودا ہے۔ اسلام پہلے اور سب کچھ بعد میں۔

آخر میں آپنے یہ قید بھی لگائی ہے کہ مسلمانوں کیلئے جو راہ منتخب کی جائے وہ لازماً ایسی بھی ہونی چاہیئے کہ اکثریتی فرقہ کو اس سے اختلاف نہ ہو۔

یہ شرط بڑی سخت ہے اور ناممکن العمل بھی آپ مثلاً "اردو" کے مسئلے پر نظر ڈالیں۔ اردو کو مناسب قانونی تحفظ ملنا چاہیئے اور اس کے ساتھ انصاف کیا جانا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا مطالبہ ہے جسے دنیا کا کوئی معقول آدمی نامعقول نہیں کہہ سکتا۔ یہ کوئی فرقہ پرستانہ مطالبہ بھی نہیں ہے کہ غیر مسلمین اس کی مخالفت پر قدرتاً مجبور ہوں۔ یہ ایک حق بجانب منصفانہ اور معقول ترین مطالبہ ہے۔ جسے صرف مسلمان ہی نہیں بہتیرے غیر مسلم بھی سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ لیکن کیا اکثریتی فرقہ کی ایک بڑی تعداد کو اس سے سخت اختلاف نہیں ہے۔ اور اس اختلاف کی وسعت و شدت کا کیا یہ عالم نہیں ہے کہ برسر اقتدار طبقے کے متعدد افراد مطالبے کی معقولیت تسلیم کرنے کے باوجود اسے ماننے کی طرح ماننے پر آمادہ نہیں۔ اور غیر مؤثر و غیر آئینی مراعات سے زیادہ وہ اس کی جھولی میں کچھ بھی نہیں ڈال سکے۔

اس مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ اکثریت میں ضم ہونے سے انکار کرتے ہوئے کوئی بھی معقول سے معقول تر راہ اختیار کریں، اکثریتی فرقے کے کچھ طبقات اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔

مخالفت سے بچنے کا کوئی طریقہ سوائے اس کے نہیں کہ مسلمان اپنی انفرادیت سے دستبرداری دیدیں۔ اور اپنے ان حقوق سے بے تعلق ہو جائیں جن کا تعلق ان کی ملی حیثیت سے ہے۔ چنانچہ بعض نام دنہاد مسلمانوں نے اسی ذہنیت کا مظاہرہ کیا بھی ہے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے جن امتیازات سے غیر مسلموں کو عناد ہے انھیں ختم ہی کر دیا جائے۔ انفرادیت پر مطلق زور نہ دیا جائے۔ مذہب کو بس گھر اور مسجد میں قید کر کے رکھا جائے اور اجتماعی و سیاسی سطحوں پر اسلامی اصول و اقدار کے انطباق کی روش ترک کر دی جائے۔ یہاں تک کہ پرسنل لا بھی ملک بھر کا یکساں ہو اور فقہ کا تمام دفتر بحر ہند میں ڈبو دیا جائے۔

فرمایئے کیا یہ طرز فکر قابل قبول ہے۔

پھر تاریخ عالم کا مطالعہ کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا کی کوئی عمدہ سے عمدہ تحریک اچھے سے اچھا سیاسی نظریہ بہتر سے بہتر سماجی مشن — مخالفتوں اور مزاحمتوں سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی موثر تحریک یا پروگرام یا دعوت برپا ہو اور اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ دو اور دو چار کی بھی شد و مد سے مخالفت ہوتی ہے۔ جب اس سے کسی گروہ اور طبقے کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ مفادات کا ٹکراؤ ایک ناگزیر عالمی اور دائمی حقیقت ہے۔ اس سے کسی طرح کسی زمانے اور کسی ملک میں بھی مفر نہیں۔

لہٰذا یہ خواب کبھی نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندستان کے مسلمان اپنی اسلامیت کو قائم رکھتے ہوئے کوئی بھی سیاسی راہ ایسی ایجاد کر سکیں گے جسے اکثریتی فرقے کے کچھ طبقوں کی مخالفت سے سابقہ پیش نہ آئے۔ مخالفتیں ہوں گی، قربانیاں دینی پڑیں گی۔ نقصانات سے واسطہ پیش آئے گا۔

تراش کر کوہ سنگ و آہن نکالنی ہوگی راہ منزل
بغیر شعلوں کا کھیل کھیلے نہ راہ دیگا کبھی زمانہ

ویسے ناچیز کی رائے یہ ہے کہ جب تک کسی واضح اور متعین سیاسی راہ کا فیصلہ ہو مسلمانوں کے فعال طبقے کو کم سے کم معاشرتی اصلاح میں تو سرگرمی دکھانی ہی چاہیئے۔ مثلاً شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کی اصلاح، جہالت اور توہم پرستی کی بیخ کنی، دولت پرستی کے جذبوں کی ہمت شکنی، وقت کی قدر و قیمت کی طرف مسلمانوں کا ذہن مبذول کرانا، اولاد کی تربیت پر خصوصی توجہ دلانا،

یہ سرگرمیاں چاہے سیاسی رخ پر کسی پیش قدمی کا مظہر نہ ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ سیاسی لائنوں پر وہی لوگ زیادہ بہتر کام کر سکتے ہیں جو باشعور ہوں۔ حقیقت پسند ہوں۔ سلیقے اور تمیز سے مرصع ہوں۔ ایثار و قربانی کی معنوی قدر و قیمت کا احساس رکھتے ہوں اور قومی و ملی مفادات ان کے نزدیک ذاتی و شخصی مفادات سے فائق و برتر ہوں۔

زہر جب اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی میں یا اور کسی ذاتی تقریب میں بہت سی دولت صرف کرتا اور دھوم دھام کا اظہار آمیز مظاہرہ کرتا ہے تو یقیناً وہ قومی و ملی مصالح کی بڑی شکست پر تعلّی ہے

مذہبی لوگوں کی بیوقوفی!

"مذہبی لوگوں کے بارے میں میرا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ میں نے اکثر ایسے لوگوں کو مذہب میں مبتلا پایا جن میں خاصی اخلاقی کمزوریاں ملتی تھیں۔

یہ لوگ خدا کو اس منطق سے قائل کرتے رہتے ہیں۔

"میں جتنی شادیاں کرتا اور طلاق دیتا ہوں اتنی ہی زائد رکعتیں نماز کی بھی تو پڑھتا ہوں" وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح امریکہ ہر چیز کی قیمت ڈالر میں وصول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا کفارہ نفلوں میں قبول کر لیتا ہے۔ مذہب بڑی سخت اور بڑی قابل قدر آزمائش ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کا مذہب۔ جس طرح کے مذہبی لوگ میرے پیش نظر ہیں۔ وہ اس درجہ بیوقوف ہوتے ہیں کہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب وہ اپنے اردگرد کے معمولی سوجھ بوجھ کے لوگوں کو دھوکہ نہیں دے سکتے، تو وہ خدا کو کیوں کر دھوکہ دیں گے، جس کی صفات کا اُن کو علم ہے۔ یقین ہو یا نہ ہو۔ ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نے اپنے سارے اختیارات ان بندوں کو ہمیشہ کیلئے منتقل کر دیئے ہیں جن کا وہ حق مارتے رہتے ہیں۔ ایسے معاملات میں وہ خدا کے ہاں جتنی عرضیاں بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو پڑھے بغیر عدالتِ مجاز کو واپس کر دیتا ہے۔ ان میں بعض ایسے معصوم بھی ملیں گے جو اس کوشش میں رہتے ہیں کہ خدا کو نہ سہی اُن فرشتوں ہی کو دھوکہ دے کر کار براری کر لیں جو ان کا اعمال نامہ مرتب کرنے کے لئے کاندھوں پر بٹھا دیئے گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آخرت میں پٹواری کے اندراجات کی بنا پر مقدمہ جیت لیں گے!"

رشید احمد صدیقی

شیخ محمد عبداللہ

صرف ایک ہی راستہ۔ سیکولرزم اور غیر فرقہ واریت

س: یہ بات آج تک مشہور رہی ہے کہ آپ کشمیر کو ایک خود مختار ملک بنا دینے کا منصوبہ بنا چکے تھے یا پاکستان سے الحاق کرنے والے تھے مگر دراصل وہ حقائق کیا تھے جن کی بنا پر آپ ۱۵ برس تک نظر بند رہے؟

ج: یہ الزام مجھ پر ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو عائد کیا گیا۔ اور اس کا مقصد میری ناجائز گرفتاری اور وزارت عظمیٰ سے میری غیر آئینی برطرفی کے لئے جواز بہم کرکے ملک کی رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ الزام لگانے والوں میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی کہ جو ۸ اگست تک مجھے سب سے بڑا محب وطن، قومی ہیرو اور سیکولرازم کا حرفِ آخر قرار دیتے رہے تھے۔ لیکن ۸ اور ۹ اگست کی رات کو یہ سب کچھ بدل گیا۔ اور میں غدار، پاکستانی، فرقہ پرست، امریکی ایجنٹ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ قرار پایا۔ یہ سوال مجھ سے پوچھنے کی بجائے اُن لوگوں سے پوچھنا چاہئے کہ جنہوں نے یہ سیاسی ڈرامہ اسٹیج کرکے کشمیری عوام کے اعتماد اور اُن کے اعتقاد کو بُری طرح مجروح کر دیا۔ افراد کی تاریخ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے مجھے اس بات کا غم نہیں کہ میری ذات کے ساتھ کیا ہوا لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ ہندوستانی حکومت نے اس غیر جمہوری اور غیر آئینی کارروائی سے نہ صرف کشمیری عوام کا اعتماد کھو دیا بلکہ ساری دنیا میں اپنی اخلاقی حیثیت کو مشکوک بنا دیا۔

جہاں تک اس الزام کی صحت کا تعلق ہے میں اپنی صفائی میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک آزاد ہوا تو ملک کی تقسیم کے اصول، آبادی اور جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا چاہئے تھا۔ اور پاکستان نے اسی بنیاد پر ریاست جموں کشمیر پر اپنا حق جتانا بھی شروع کر دیا تھا لیکن میں نے اور میرے ساتھیوں نے مذہبی بنیادوں پر کی گئی اس تقسیم کے فلسفے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جب پاکستان نے بزور بازو ہمیں اپنا مطیع بنانا چاہا تو میری قیادت میں ریاست کے لوگ اس جارحیت کے خلاف ڈٹ گئے۔ یہ وہ نازک لمحہ تھا کہ کشمیر کا مہاراجہ پاکستانی حملہ آوروں کی تاب نہ لاکر فرار ہو چکا تھا۔ اور پاکستان سے آئے ہوئے قبائلی حملہ آور سری نگر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ اس وقت ہم پاکستان کا حصہ بننا چاہتے تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایسا کرنے سے روک نہیں سکتی تھی لیکن دنیا جانتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ اس نازک ترین مرحلے پر ہم نے بے سر و سامانی کی حالت میں بھی پاکستانی جارحیت کا مقابلہ کیا۔ اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کی بجائے ہندوستان میں لے آئے۔ پاکستان کی بجائے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کرنا [illegible] اری فعل نہیں تھا۔ یہ ہمارے سیاسی [illegible] ریات اقتصادی پروگرام اور سیکولر آدرشوں [illegible] تھا۔ [illegible] آج بھی ان نظریات پر پوری طرح قائم [illegible] کشمیر کو خود مختار [illegible] کا سوال تو اس سلسلے میں میں نے ۱۹۵۱ء میں ریاستی آئین ساز اسمبلی کے سامنے اپنی تقریر میں خود مختار کشمیر کے متعلق اپنے نظریات واضح طور پر بیان کئے ہیں۔ اور میں انہیں یہاں دہرانا نہیں چاہتا۔

میرے خلاف کشمیر کو خود مختار بنانے یا اسے پاکستان کا حصہ بنانے کا الزام دراصل اس گہری سازش کا حصہ تھا کہ جو میرے اقتدار سنبھالنے کے بعد حکومت ہند کے بڑے بڑے ایوانوں میں منظم ہوئی، اور جس کی سربراہی براہ راست ہندوستان کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل کر رہے تھے۔ یہ لوگ سیکولرازم اور ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھنے کے باوجود بنیادی طور پر فرقہ پرست اور رجعت پسند تھے اور ان کی آنکھوں میں میرا وجود خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ یہ ہماری ترقی پسندانہ پالیسیوں سے بیزار تھے۔ ہماری زرعی اصلاحات، موروثی حکمرانی کے خاتمے اور اسی نوعیت کے دوسرے انقلابی اثرات سے خفا تھے اور شروع سے اس تاک میں لگے رہے کہ کس طرح جواہر لعل نہرو

اور میرے درمیان بدظنی پیدا کرائی جائے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے۔ اور میرے ہی چند ساتھیوں کی کچھ کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو ہم پر شب خون مار دیا اور ہندوستانی ریڈیو اخبارات اور دوسرے ذرائع سے ہم پر طرح طرح کے الزامات عائد کر دیئے۔ میں سولہ سال تک ان ناکردہ گناہوں کی پاداش میں نظر بند رہا! اور بالآخر جھوٹ، افترا اور اختراع کے بادل چھٹ گئے اور کروڑوں روپیہ خرچ کرنے کے باوجود میرے خلاف ایک بھی الزام ثابت نہ ہو سکا اور مجھے باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

س : اگرچہ آپ کشمیر کا الحاق پاکستان سے نہیں چاہتے اور ہندوستان سے بھی ناراض نہیں تو پھر بار بار آپ یہ کیوں فرماتے ہیں: "کشمیری عوام کو اپنی تقدیر بنانے کا حق حاصل ہونا چاہیے" آخر اصل آپ حکومت ہند سے کیا چاہتے ہیں؟

ج : معلوم ہوتا ہے کہ آپ کشمیر کی تحریک آزادی کی تاریخ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ورنہ یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہی نہ ہوتا، بہر حال اس میں قصور آپ کا نہیں، اُن حالات کا ہے کہ جن کی بنا پر ہندوستانی عوام کی اکثریت کو ہماری تحریک کے بنیادی اُصولوں، ہماری جدوجہد کے منتہائے مقصود اور ہمارے موجودہ سیاسی نصب العین کو سمجھنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں مختصر الفاظ میں آپ کے اس سوال کا جواب دے کر اس بات کی وضاحت کروں گا۔

کشمیر کی تحریک آزادی میں ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کا دن غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، اس تاریخ سے ہماری جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اور جب سے اب تک ہم چند بنیادی اُصولوں اور آدرشوں کی خاطر لڑتے آئے ہیں۔ ملک کی تقسیم کا سانحہ تو ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ لیکن اس سے پہلے بھی ہمارے سیکڑوں نوجوانوں نے اپنا لہو بہا کر کشمیر کی سرزمین کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ اور ہزاروں لوگوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال جیلوں میں گزارے تھے ہر قسم کی تعزیریں برداشت کی تھیں۔ اور اپنے مستقبل کے سہانے سپنے دیکھے تھے، جب سارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لئے لڑ رہا تھا تو ہم ڈوگرہ مطلق العنانیت کے خلاف برسر پیکار تھے۔ اور ہم نے "نیا کشمیر" کی شکل میں اپنے لئے ایک اقتصادی اور معاشی پروگرام ترتیب دیا تھا

ہم صدیوں کی غلامی اور استحصال سے آزاد ہو کر دنیا کے نقشے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلق العنانیت کے خلاف ہماری اس جدوجہد میں ہمیں ہندوستان کے سرکردہ رہنماؤں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں نے ہماری بھرپور مدد اور اخلاقی حمایت کی، ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر کے چالیس لاکھ کو اپنی قسمت بنانے، اپنی تقدیر سنوارنے اور اپنے خوابوں اور خاکوں میں رنگ بھرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ اور کسی راجے مہاراجے، بادشاہ یا وزیر کو ہماری جانب سے کوئی فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اپنے اس حق کو حاصل کرنے کے لئے کشمیری عوام نے قربانیاں دیں اور اسی کے حصول کے لئے ہماری جدوجہد آج بھی جاری ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا تو میں اور میرے ساتھی مہاراج کے خلاف "کوئٹ کشمیر" تحریک چلانے کی پاداش میں جیلوں میں نظر بند تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ہمیں رہا کیا گیا تو میں نے اپنی تقریروں میں یہ بات واضح کر دی کہ کشمیری عوام کے لئے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ مطلق العنانیت، جاگیرداری اور موروثی حکمرانی کے خلاف ان کی جدوجہد کا انجام کیا ہوتا ہے — اس وقت ہم پر دونوں جانب سے یہ زور ڈالا جا رہا تھا کہ ہم ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ لیکن ہم نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم حالات کے دباؤ یا مجبوریوں کی بجائے اپنے اصولوں اور آدرشوں کی روشنی میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے اور یہ فیصلہ کرنے کا حق صرف اس ریاست کے عوام کو ہے۔ مہاراج کو نہیں۔ خوش قسمتی سے ہندوستان نے ہمارے اس موقف کو تسلیم کر لیا۔ اور پاکستان کے حکمرانوں نے ہماری مجبوریوں اور بے سروسامانی سے فائدہ اُٹھا کر ہم پر حملہ کیا، اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم نے ہندوستان سے مدد مانگی۔ اور ہندوستان نے ہمارے بنیادی موقف کی صحت اور معقولیت کو تسلیم کر کے ہماری مدد کی، ہندوستان سے ہمارے تعلق کی یہی بنیاد ہے۔ لیکن ۱۹۵۳ء میں ہندوستان نے بھی پاکستان کی طرح ہمارے اس موقف کو نظر انداز کر کے طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان اور کشمیر کے تعلقات کی نوعیت کو بدلنے کی کوشش کی اور ہم نے اس کی مخالفت کی۔ ہم نہ ہندوستان سے ناراض ہیں اور نہ پاکستان

کے ساتھ کشمیر کا الحاق چاہتے ہیں لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ کشمیری عوام کو اپنے اصولوں اور آدرشوں کی روشنی میں اپنی تقدیر آپ بنانے کا بنیادی حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اور زور زبردستی، طاقت اور بلیک میل کے ذریعے انھیں کسی فیصلے یا سمجھوتے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ انھیں صدیوں سے عزت و آبرو کی زندگی گذارنے کے حقوق سے محروم کیا گیا ہے۔ اور جب تک یہ حقوق بحال نہیں کئے جائیں گے، ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ میں ہندستانی حکومت سے واضح پر یہ چاہتا ہوں کہ وہ کشمیری عوام سے کئے گئے وعدے پورے کرے اور میں کشمیری عوام کی جانب سے یہ یقین دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ وہ بھی اپنے وعدے اور معاہدے نبھانے کے لئے تیار ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کشمیر اپنی مرضی اور خواہش سے ہندوستان کا حصہ بنا ہے۔ فوجی طاقت اور سنگینوں کے بل بوتے پر نہیں۔

س: کیا آپ یکساں سول کوڈ کے حق میں ہیں؟ اور مسلم پرسنل لا کو قابلِ ترمیم خیال فرماتے ہیں؟ اس سلسلے میں یہ بھی عرض ہے کہ ہندستان میں مسلمان چور کے نہ ہاتھ کاٹے جاتے ہیں اور نہ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے لیکن مسلم علما ایسا اسلامی قانون رائج کرانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

ج: جی نہیں، میں ہندستان کے لئے یکساں سول کوڈ کے حق میں نہیں ہوں۔ ہندوستان اپنی روایات اور اپنی تاریخ کے اعتبار سے مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ اور یہاں آج بھی مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ مذہب کو ہماری زندگی میں جو اہمیت اور اولیت حاصل ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ یہ ایک مذہب ہی نہیں، ایک مکمل ضابطہ حیات کا نام ہے اور اس کا اپنا ایک اخلاقی اور معاشرتی نظام ہے۔ اس لئے میں ہندوستان میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے یکساں سول کوڈ نافذ کئے جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ جہاں تک مسلمان چور کے ہاتھ کاٹے جانے اور زانی کے سنگسار کئے جانے کا تعلق ہے ان قوانین کا اطلاق ان ممالک پر ہی ہو سکتا ہے کہ جہاں اسلامی طرزِ حکومت مروج ہو۔ اور ہندوستان کے مسلمان علماء ہندوستان میں اگر ان قوانین کے رائج کرنے پر زور نہیں دیتے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ جہاں تک مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا فیصلہ خود مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ اس میں کسی قسم کی بیرونی مداخلت سے مسلمانوں میں جائز شکوک و شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے

س: آپ کے خیال میں مسلمانوں کے معاملات کو مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیئے مگر ہندوستان کے سارے فرقوں میں مسلم فرقہ سب سے زیادہ جاہل ہے اور مسلمان عورتیں تو ایک فی صدی بھی پڑھی ہوئی نہیں ہیں تو پھر ان حالات میں کیا مسلمان اپنے معاملات آپ طے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ج: میں آپ کے اس بیان سے متفق نہیں ہوں کہ ہندوستان کے سارے فرقوں میں مسلم فرقہ سب سے زیادہ جاہل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ جہالت اور لاعلمی صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ہندوستانی عوام کی اکثریت اس کا شکار ہے۔ اگر آپ کی بات کو بھی صحیح مان لیا جائے، تب بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کو اپنے معاملات اپنے آپ طے نہیں کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کی جہالت اور ان کی ناخواندگی کو دور کرنے کے لئے بھی خود مسلمانوں کو منظم ہونا پڑیگا تاکہ دوسرے فرقوں کے لوگوں کے ساتھ آگے بڑھ سکیں۔ میرا ایمان ہے کہ اگر مسلمان اپنی وقف جائدادوں کا مناسب اور معقول انتظام کر سکیں تو تو ہندوستان کے مسلمان معاشی، تعلیمی اور اقتصادی میدان میں بہت آگے بڑھ سکتے ہیں، میں آپ کی طرح مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں اور مجھے امید ہے کہ ہندوستانی مسلمان رفتہ رفتہ اپنے خول توڑ کر باہر آنے میں کامیاب ہوگا۔

س: مسلمانوں کو متحد ہونے کے لئے ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہیئے مگر ظاہر ہے وہ مسلم لیگ کا پلیٹ فارم نہیں ہو سکتا اس لئے آپ کے خیال میں وہ کون سی جماعت ہوگی کہ جس میں شامل ہو کر مسلمان قومی دھارے میں بھی شامل ہو سکیں؟

ج: میں مسلمانوں کے سیاسی طور پر متحد اور متفق ہونے سے زیادہ اس بات کی اہمیت سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی تعلیمی پسماندگی، اقتصادی بدحالی اور بیروزگاری کو

دور کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کریں۔ جب تک مسلمان سماجی طور پر پسماندہ اور اقتصادی اعتبار سے کمزور ہوگا وہ کوئی موثر سیاسی طاقت نہیں بن سکے گا۔ لیکن اگر مسلمانوں کی ذہنی سطح اور اُن کی معاشی حالت بہتر ہو جائے تو وہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لئے بہت بڑا قیمتی سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک اوّلین اہمیت اس بات کی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی دور کرنے اور اُن کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لئے کچھ جامع منصوبے ہاتھ میں لئے جانے چاہئیں اور سیاسی تنگ نظری سے بلند ہو کر ان منصوبوں پر دیانت داری سے عمل کیا جانا چاہئے۔ اِس سلسلے میں باثروت اور پڑھے لکھے مسلمان بہت اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں اور اِنھیں اس میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک سیاسی سرگرمیوں کا تعلق ہے، میری ناچیز رائے میں مسلمانوں کو فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کی بجائے اُن کے خلاف متحد اور منظم ہو کر جدوجہد کرنا چاہئے کیونکہ میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ ہندو فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتی ہیں کہ جتنا مسلم فرقہ پرست جماعتیں۔

س : نہ اُردو کی کتابوں اور جریدوں کی تعداد اشاعت زیادہ ہے نہ اُردو آج کاروبار میں کام آتی ہے اور نہ سرکاری ملازمت کے لئے اُردو زبان کا جاننا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں کیا صرف قوالیاں اور مشاعرے کرکے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔؟

ج : اُردو کے مستقبل کے متعلق آپ نے جس مایوسی کا اظہار کیا ہے اُس سے میری مایوسی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ سیاست کی قربان گاہ پر چڑھا کر اتنی خوبصورت زبان کو قتل کیا جا رہا ہے اور ہم بے بسی کے ساتھ تماشا دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اردو ہماری مشترکہ تہذیب کی سب سے جاندار اور شاندار علامت ہے اور یہ اس ملک کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ ہم زبانوں کے معاملے میں بھی تعصب اور تنگ نظری سے بلند نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ زبان صرف اظہار کا سب سے موثر ذریعہ ہے، اور بس، میں اردو کی موجودہ کس مپرسی کے لئے صرف اُردو کے دشمنوں کو ہی نہیں اس کے ان حامیوں کو بھی دوش دیتا ہوں کہ جنھوں نے اسے مذہب کا درجہ دے کر اس کے خلاف تعصب اور گروہ بندی کی فضا قائم کرنے میں مدد دی۔ بہرحال میں اُمید رکھتا ہوں کہ ہندوستانی حکومت کے ارباب حل و عقد اور اس ملک کے دانشور اس زبان کو مرنے نہیں دیں گے۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑا تہذیبی سانحہ ہوگا

س : آپ متعدد بار فرقہ وارانہ فسادات کے بعد فساد زدہ علاقوں کا دورہ فرما چکے ہیں۔ آپ نے فساد زدہ انسانوں کو ڈھارس بندھائی ہے۔ تسلی دی ہے مگر یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے آگ لگنے کے بعد فائر بریگیڈ انجن کا موقعے پر پہنچ جانا' سوال یہ ہے کہ آپ آئے دن ہونے والے ان فسادات کے اسباب پر غور فرما کر مستقل سدّباب کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟

ج ۔ فرقہ وارانہ فسادات اتفاقیہ طور پر رونما نہیں ہوتے' اور اُن کے پیچھے نفرت اور تعصب کی ایک پوری تاریخ ہے۔ جس ملک میں صدیوں سے مذہب کو ذاتی اغراض' حقیر مقاصد اور ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ وہاں فرقہ وارانہ فسادات کا رونما ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں آئے دن جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں اُن کی تہہ میں باہمی نفرت' تشکیک' بے اعتمادی اور بدظنی کا وہ جذبہ کارفرما ہے جسے گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے منظم طریقے پر اُبھارا جاتا رہا۔ اور جس کا منطقی نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں برآمد ہوا۔ جو لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو مختلف' متضاد اور متصادم قومیں تصور کرتے ہیں وہ بالواسطہ نہیں بلکہ براہِ راست فرقہ وارانہ فسادات کے لئے زمین ہموار کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جس دلیل سے اُن کے دعوٰی کی تکذیب ہونا چاہئے تھی وہ اسی کو اپنے موقف کی صحت کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکیوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بدظنی کا بیج بونے والے' نہ ہندوؤں کے دوست ہیں اور نہ مسلمانوں کے، لیکن فسادات کی آگ میں جھلسنے والے اکثر مظلوم' نفرت اور عداوت کے ان ہی تاجروں کو اپنا مسیحا بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ہماری سیکولر قیادت کی ناکامی ہی نہیں۔ ہمارے قومی شعور کا بھی المیہ ہے۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا سدّباب صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ سیاسی سطح پر فرقہ واریت پھیلانے والی جماعتوں کا متحدہ طور پر

مقابلہ کیا جائے۔ اور سرکاری سطح پر ہر فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے والوں۔ فسادات کو ہوا دینے والوں۔ اور اس میں حصہ لینے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں۔ لیکن تجربے اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ حکومت نہ صرف فرقہ وارانہ جماعتوں سے سیاسی سمجھوتے کرتی ہے۔ بلکہ انہیں توقیر اور رتبہ بھی عطا کرتی ہے۔ اور جہاں تک فسادیوں کو سزا دینے کا تعلق ہے۔ یہ بات قابل غور ہے، کہ آج تک فرقہ وارانہ فسادات میں ملوث کسی شخص کو پھانسی تو کیا عمر قید کی سزا بھی نہیں ملی ہے۔ میں ایک فرد واحد کی حیثیت سے فرقہ وارانہ فسادات کے سدباب کے سلسلے میں کیا کچھ کر سکتا ہوں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اور میں نہیں جانتا کہ اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں

س :۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ہزار سالہ ماضی کو ملحوظ فرماتے ہوئے اور حال کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ مسلمانوں کو ان کے مستقبل کے سلسلے میں کیا نصیحت فرمائیں گے ؟

ج :۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ہزار سالہ ماضی، اسلام کی اس عظیم تاریخ اور ان عظیم روایات کا ایک حصہ ہے کہ جس نے اسلام کو دنیا کا سب ترقی پسند مذہب اور مسلمانوں کو دنیا کی سب سے متمدن اور مہذب قوم بنا دیا تھا۔ یہ تاریخ ہمارے لئے بیک وقت بصیرت اور عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جب تک اسلام ایک بھرپور نظام حیات، ایک مکمل فلسفۂ زندگی اور ایک مربوط اخلاقی ضابطے کی حیثیت سے قائم رہا، مسلمانوں کو دنیا بھر میں سربلندی اور فتح و کامرانی حاصل رہی۔ اور جوں جوں اسلام عمل سے زیادہ عقیدے، اور اعتقاد سے زیادہ رسوم اور رواج کا پابند ہوتا گیا۔ مسلمانوں کی اخلاقی طاقت اور سیاسی قوت دونوں ہی رُوبہ زوال نظر آنے لگیں۔ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اگرچہ مسلمان یہاں سب سے پہلے حملہ آوروں کی حیثیت سے آئے۔ لیکن مسلمان حملہ آوروں کی آمد سے پہلے، اسلام کا پیغام یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور عام لوگ اسلام کی تعلیمات اور اسلامی نظام کی خصوصیات سے متاثر ہونا شروع ہو گئے۔ تھے۔ اور مسلمان تاجروں نے مقامی لوگوں پر اپنے برتاؤ، حسن اخلاق اور ایمانداری کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ بعد میں سیاسی فتوحات اور اقتدار کی جنگ نے اسلام اور مسلمانوں کو اس درجہ خلط ملط کر دیا کہ مسلمان بادشاہوں کو کسی اعتبار سے اسلام کا نمایندہ کہنا غلط ہوگا۔ یہ اسلامی تاریخ کا وہ دور تھا۔ کہ جب مسلمانوں کے لئے سیاسی اقتدار اخلاق سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن جہاں تک مسلمان صوفیوں، بزرگوں اور عالموں کا تعلق تھا، وہ اقتدار سے بے نیاز رہے بے لوث اور اپنے بلند کردار سے ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بادشاہوں کے مقابلے میں ان ہی فقیروں کا ورثہ قابل قدر اور باعث افتخار ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے تاریخی سرمایے یا سیاسی ماضی سے لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی ہے، اور ان میں اچھے اور برے دونوں قسم کے مسلمان شامل ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے اشتراک سے ایک ایسی ملی جلی تہذیب اور ایک ایسا متنوع کلچر وجود میں آیا کہ جو ہندوستان کی تہذیب، تاریخ اور تمدن کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس مشترکہ تہذیب اور تاریخ کے وجود سے انکار نہیں کر سکتا اور جن لوگوں نے اس وقت حقیقت سے انکار کر کے اپنے لئے الگ ملک اور الگ سلطنت کا مطالبہ کیا۔ ان کے حشر سے ہندوستانی مسلمانوں کو سبق ہی نہیں عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ تاریخ کی بنیاد سے انکار کرنے، مذہب کی بنیاد پر الگ سلطنت کا مطالبہ کرنے والوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اجتماعی قوت اور سیاسی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ بلکہ پورے برصغیر میں باہمی منافرت، بے اعتمادی اور دشمنی کی وہ آگ بھڑکا دی۔ کہ جو آج بھی بجھنے نہیں پاتی۔ میں نہیں کہتا کہ الگ قومیت اور الگ سلطنت کا مطالبہ صرف کچھ مسلمان رہنماؤں نے ہی کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں میں بھی ایسے بے شمار لوگ موجود تھے، کہ جو مسلمانوں کے اس مطالبے کو اپنے عمل اور اپنے کردار سے تقویت پہنچاتے رہے۔ لیکن اس وقت برصغیر کی تقسیم کی "ذمہ داری" نہیں بانٹ رہا ہوں۔ اس تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ کہ جس سے ہندوستانی مسلمانوں کو بصیرت حاصل کرنا چاہیئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں میں مایوسی اور محرومی کا جو احساس پیدا ہوا ہے۔ اس نے ان کے اندر احساس کمتری کا اور

ایک قسم کے Persecution Complex کو جنم دیا
ہے۔ یہ تقریباً وہی حالات ہیں کہ جن سے مسلمان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی
کے بعد گذر رہے تھے۔ انگریز انہیں اپنا دشمن اور ہندو اپنا رقیب سمجھتے
تھے۔ اور مسلمان سیاسی زبوں حالی، اقتصادی بدحالی اور شکست
خوردگی کا شکار تھے۔ وہ ساری دنیا سے بیزار اپنے ہی خول میں بند
ہو گئے تھے، انگریزوں سے ناراضگی کی بنا پر انہوں نے انگریزی تہذیب
اور تعلیم سے بھی کنارہ کشی اختیار کی تھی، مایوسی اور شکست خوردگی کے
اس ماحول میں سر سید احمد خان نے مستقبل کے امکانات کا جائزہ لے
کر مسلمانوں کو عمل، جدوجہد اور آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اور تنگ نظر
ملاؤں کی سخت مخالفت کے باوجود سر سید مسلمانوں کو اپنے وجود کی
تاریکیوں سے باہر لا کر حقائق کی روشنی کا سامنا کرانے میں کامیاب ہو گئے۔
آج ایک بار پھر اسی مایوسی، شکست خوردگی، احساس گناہ اور بے
یقینیت کا شکار ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اس کے نام پر سیاسی
سودے بازی کی تھی، اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے، وہ قیادت سے بھی محروم
ہے اور اپنے مستقبل پر اعتماد کی سعادت سے بھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہر بہروپ کو
اپنا رہبر سمجھ کر اپنی منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ بہت سے سوداگروں
نے مسلمانوں کے اس احساس محرومی سے فائدہ اٹھا کر اسے مال تجارت
بنانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں مایوسی اور پریشانی
کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اگر مسلمان اپنے ماضی کا سائنسی تجزیہ کر کے اپنے
مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ تو تاریکی اور نا امیدی کے بادل
چھٹ جائیں گے اور انہیں ملک میں جائز مقام حاصل ہو جائے گا، اس
سلسلے میں میری یہ گذارش ہے، کہ سب سے پہلے مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں
کہ پچھلے پچیس برسوں میں دنیا بہت بدل گئی ہے۔ ہندوستان
بھی بہت کچھ بدل گیا ہے، یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی
کہ بہت سے مسلمان آج بھی ۱۹۴۷ء سے قبل کے ہندوستان میں
رہتے ہیں۔ وہ اسی طرح سوچتے ہیں، اسی انداز میں بات کرتے ہیں اور وہی
اصطلاحات وہی زبان استعمال کرتے ہیں، ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ انگریز
چلا گیا ہے۔ اور ہندوستان پر ہندوستانیوں کی حکومت ہے، یہ ایک
ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسے بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی

حقیقت سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ آج ہمارا مکالمہ انگریز سے نہیں،
اور انگریز کے ذریعہ نہیں، بلکہ براہ راست اپنے ہندو بھائیوں سے ہے۔ ہم
ان سے کیا چاہتے ہیں۔ ان سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ جب ہم ان سے یہ توقع رکھتے
ہیں کہ وہ ہمارے جذبات کو سمجھیں، ہمارے مسائل اور مشکلات کا ازالہ کریں
تو ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے ہندو بھائی بھی ہم سے یہی توقع
رکھتے ہیں۔ اس بنیادی مفاہمت کے بعد یہ بات بھی ذہن نشین کیجئے، کہ
اس ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ کہ جنہیں ہندوستان میں مسلمانوں کا
وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اور یہ کسی بھی بہانے مسلمانوں کی حوصلہ شکنی اور
دل آزاری کرنے پر تیار رہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے پچپن کروڑ کے اس وسیع
ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستانی
مسلمانوں کو یہ سوچنا چاہیئے۔ کہ اپنے عمل اپنے کردار اور اپنے گفتار سے
وہ اس "شرانگیز" اقلیت کو تقویت تو نہیں پہنچاتے، یہ مسلمانوں کے اپنے مفاد
میں ہے کہ وہ اس خاموش اکثریت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔
کہ جس نے ہندوستان کو ایک سیکولر ری پبلک بنانے کا فیصلہ کر کے
مسلمانوں کو آئینی طور پر وہی حقوق اور وہی درجہ عطا کیا ہے۔ کہ جو اس ملک
کی اکثریت کو حاصل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ فرقہ پرست ہندوؤں کے ہاتھوں
مسلمانوں کو قدم قدم پر مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن
میں مسلمانوں پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ فرقہ پرستی کا زہر کبھی بھی فرقہ
پرستی کے "تریاق" سے ختم نہیں ہوتا، مسلمانوں کو ردعمل کے طور پر نہیں،
بلکہ مثبت طور پر سیکولرازم اور غیر فرقہ واریت کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔
میں جانتا ہوں کہ یہ مشکل راستہ ہے۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے
لئے یہی ایک راستہ ہے۔ انہیں اکثریت سے ناراض ہو کر اپنے ہی خول
میں بند نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ تعلیمی، اقتصادی اور سماجی طور پر اپنے آپ کو
بہتر بنا کر اس ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس مقصد کیلئے
انہیں وہ تمام ذرائع بروئے کار لانا ہوں گے۔ جو ان کے پاس ہیں یا جو
پیدا کرنا ضروری ہیں۔ میں اس سلسلے میں تعلیم کو سب سے مقدم سمجھتا ہوں اور
میری خواہش ہے۔ کہ مسلمانوں کے پاس وقف کی جو بھاری املاک موجود
ہیں۔ انہیں صرف مسلمانوں کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ تاکہ ہندوستانی مسلمان
ذہنی طور آسودہ اور خوش حال بن جائے۔

جہاں تک مسلمانوں کی سیاست کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں۔ لیکن اس بات کے دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کہ فرقہ پرست سیاست مسلمانوں کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ اور مسلمانوں کو فرقہ پرست لیڈروں اور جماعتوں سے دور رہنا چاہیئے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں۔ کہ فرقہ پرست لیڈروں نے مسلمانوں کو جتنا نقصان پہنچایا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں مسلمانوں کے بدترین دشمنوں نے بھی کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ہندوستان میں فرقہ واریت اور سیکولرازم کے خلاف جو فیصلہ کن جنگ لڑی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ ہندوستانی مسلمان اس جنگ میں سیکولر طاقتوں کا ساتھ دیں تاکہ فرقہ واریت کو ہمیشہ کے لئے شکست فاش ہو جائے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعاون اور اشتراک کے بغیر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ خود فرقہ واریت کے زہر سے دور رہ کر اس جدوجہد میں اپنا بھرپور حصہ ادا کریں۔

شیخ محمد عبداللہ

ہم بھوکے مرتے ہیں

سرسید احمد خاں کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مغل بادشاہ اکبر شاہ کے وزیر تھے۔ حکومت مفلسی کا شکار تھی، بادشاہ مقروض تھا، اپنے خاندان کے اخراجات کا بھی کفیل نہ ہو پاتا تھا۔ قلعے کے شاہزادوں کو جب خرچ نہ ملتا تو وہ قلعے کی چھت پر چڑھ کر چلاتے تھے "ہم بھوکے مرتے ہیں، ہم بھوکے مرتے ہیں!" ملازمین کی بھی کئی کئی مہینے کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ خواجہ فرید نے شاہزادوں، بیگموں اور شاہی عملے کی تنخواہوں میں سے دس روپے فی سیکڑہ کم کر دیا۔ دیوان عام کی چھت گیری موٹے تانبے کی بنی ہوئی تھی جس پر سونے کا ملمع چڑھا ہوا تھا (یہ چھت گیری مرہٹا حملہ آوروں نے اکھاڑ ڈالی تھی مگر اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تھے)۔ اِن کا سونا الگ اتروا لیا گیا اور تانبے کو شاہی ٹکسال میں بیچ دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی قرض کا کئی لاکھ روپے ادا ہو گیا۔ مگر خواجہ فرید کو اپنی ہوشمندی کا اچھا صلہ ملا۔ شاہزادے اور بیگمات اپنی تنخواہوں میں کمی کی بنا پر ان سے ناراض ہو گئے اور آخر وہ مستعفی ہو گئے۔

مولانا محمد مسلم

کہ آجائے کوئی رہوار وحشت پر سوار اب بھی

اب سے تقریباً ۱۴ سال پہلے کی بات ہے اعظم گڑھ میں کچھ معروف مسلمان اکابر اور اہلِ فکر کا ایک اجتماع ہوا جس میں ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک لائحۂ عمل تجویز کیا تھا۔

یہ لائحہ عمل ایک مضمون کی شکل میں تھا اور شاید پرانے کاغذات میں اس کی نقل بھی دستیاب ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ مسلمانانِ ہند کو اس وقت ایک ہاری ہوئی بازی لڑنا ہے اور ایک ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کے لئے جتنی محنت جیسا صبر جس طرح کی تندہی اور لگن اور جس قسم کی بصیرت جو اتحادِ فکر اور جیسا استقلال ضروری ہے اُن سب صفات سے اپنے آپ کو متصف کرنے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تجزیہ تھا کہ مسلمانوں پر یوں تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے بعد ہی ورنہ ۱۸۵۷ء کے وقت سے تو یقیناً اس شکست کے آثار پیدا ہو گئے تھے مگر اس کی تکمیل ۱۹۴۷ء میں ہوئی جب کچھ پست حوصلہ افراد کی وجہ سے مسلمانوں نے اسی کو غنیمت سمجھا کہ اپنی آدھی آبادی اور اپنی تہذیب کے ممتاز ترین مراکز سے دستبردار ہو کر اور انھیں بے یار و مددگار چھوڑ کر شمال اور مشرق کے کچھ بکھرے ہوئے علاقوں کو اپنی پناہ گاہ بنالیں۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اگر واقعی اپنے اندر یقین ہے تو انھیں وہ بنیادی تصورات کو ہر وقت اپنے دل و دماغ میں مستحضر رکھنا اور اپنے عمل سے اُس کی گواہی دینا ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ اپنی صلاحیت اور استعداد کو اس حد تک بڑھائیں کہ اُن کا وجود پورے ملک اور سماج کے لئے ناگزیر ہو جائے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی افادیت کو عام کریں اور پورا ملک محسوس کرنے لگے کہ محبت، شفقت، مروت، انسانیت اور شرافت کے کسی صحیح پیکر کو دیکھنا ہے تو وہ مسلمان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ایک عملی منصوبہ بھی اس اجتماع میں پیش فرمایا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا کہ مسلمانانِ ہند کو چار دائروں میں بیک وقت کام کرنا چاہیئے۔

۱۔ اپنی پسماندگی دور کرنے کی کوشش

۲۔ خدمتِ خلق کے ذریعہ ہندو ماس کنٹیکٹ کا پروگرام

۳۔ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ اسلام کا تعارف

۴۔ سیاست میں حریفانہ مقام سے ہٹ کر ملک و سماج کو فائدہ پہنچانے والے امور کی بنیاد پر اپنے ووٹ کا استعمال اور معاہداتی سیاست کو اپنانا۔

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ چاہے کچھ مختلف رہے ہوں مگر ان کا مفہوم تقریباً یہی تھا جو میں نے اوپر مختصراً پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہم میں موجود نہیں ہیں اللہ تعالےٰ اُن کی قبر کو پُر نور کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ میرا اندازہ ہے کہ ملت کے درد سے جس طرح وہ تڑپتے رہتے تھے اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز اور مختلف ادوار کے اتار چڑھاؤ کے مشاہدے اور اپنے ذاتی مطالعے کی بنا پر اللہ نے اُن کو جو بصیرت عطا کی تھی وہ ہمارے دور میں شاذ شاذ ہی کہیں پائی جاتی ہے۔

اپنے اس نقشے کی وضاحت میں انھوں نے لکھا تھا کہ اگر ایک طرف مسلمان اپنے آپ کو تعلیمی اخلاقی اور اقتصادی طور پر اونچا اٹھانے کی مہم جد و جہد کریں دوسری طرف اپنی افرادی قوت کو (جن کے کروڑوں افراد کے پاس کوئی اجتماعی کام نہیں ہے) بے لوث اور بے غرض خدمتِ خلق کا کاموں میں لگا کر محلے محلے اور بستی بستی ایک اخلاقی ماحول بنا دیں۔ تیسری جانب

دعوت و تبلیغ [illegible] سطح پر یہ یا مسائل حاضرہ کے سلسلے میں
مذاکرات کی [illegible] کی صورت میں اسلام کا اس طرح تعارف
کرائیں کہ وہ ایک [illegible] اور ایک فرقے کا خادم بننے کی بجائے
انسانیت کی [illegible] سامنے آئے اور چوتھی جانب وہ ملکی
سیاست میں [illegible] کر خود وزیر اعظم یا وزارت یا سیاسی عہدوں
سے دور رہیں [illegible] ریاست اور سماج کو اخلاقی
طور سے بلند اور ایک فلاحی ریاست [illegible] کی راہ نکلے اور ان کے
دونوں کی تائید [illegible] نکات کی تائید کے
لیئے آمادہ ہوں [illegible] منصوبے پر عملدرآمد ہو سکے اور
[illegible] یا جائیں جس دائرے
میں کام کر رہے ہیں [illegible] تو کچھ نہیں کہ دس سال میں اس
ملک کا نقشہ بدل جائے۔

میرا ذاتی یقین ہے [illegible] مسلمانوں کے لئے شاید یہی نسخہ شفا
سب سے زیادہ [illegible] ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی
لڑائی ۱۸۵۷ء [illegible] بلکہ ۱۸۵۷ء ہی میں وہ یہ لڑائی ہار چکے تھے۔ اس
وقت ملک کی [illegible] مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور جب تک
وہ آگے [illegible] نہیں سکتا تھا لیکن مسلمانوں کا یہ
حال ہو گیا تھا [illegible] انگریز قوم کے آگے بے بس ہو گئے تھے
اور ان [illegible] اٹھ سکا تھا جو یہ سوچتا کہ اس وقت
کے ہندوستان میں [illegible] اخلاقی اعتماد حاصل کرنا چاہیئے
اور انگریزوں کو [illegible] جو صفات درکار ہیں ان کو پھر سے کیسے
حاصل کیا جائے [illegible] اس وقت جو مسلم لیڈر شپ ابھری اسکے
سامنے [illegible] کی علمی اور اصلاحی کوششیں اور ان کے نتیجے میں
ہندوؤں کا [illegible] محسوس کیا تھا کہ انگریزوں کے زیر سایہ ہندو فرقہ
ترقی کر رہا ہے اور اجتماعی زندگی میں نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کو
بھی انگریزوں کے زیر سایہ ترقی کرنا چاہیئے۔ یہی تخیل آہستہ آہستہ ابھرتا چلا گیا
یہاں تک کہ وہ مرحلہ آگیا جب مسلمانوں نے [illegible] کہ وہ اپنے لئے کچھ
تحفظات کا مطالبہ کریں اور پھر بالآخر ناکام ہو کر جداگانہ خطے کا ۱۹۴۰ء کے
لگ بھگ مسلم ملت کی اجتماعی کوششیں جن خطوط پر شروع کی گئی تھیں اُن کا
نقطۂ عروج پاکستان کا مطالبہ تھا۔

ممکن ہے کہ اس مندرجہ بالا تجزیے سے بعض لوگوں کو اتفاق نہ ہو لیکن اس
بارے میں شاید کم ہی لوگوں کو اختلاف ہوگا کہ مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد جو
بھی مساعی کیں ان میں یک دو مواقع کے سوا قائدانہ رول بہت کم اور دفاعی
رول زیادہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد تو ہماری تمام تر کوششوں کا محور دفاع اور
تحفظ ہی رہا ہے اور اسی ایک نقطہ کے گرد ہم سب گھومتے رہے ہیں حالانکہ
یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ دنیا میں جو گروہ بھی تحفظات کا خواہشمند ہوتا
ہے وہ خود بخود اپنے آپ کو دوسرے درجے کی شہریت کے مقام پر لاکر کھڑا
کر دیتا ہے لیکن جو گروہ اقدام کی پوزیشن اختیار کریں اور ملک کی مختلف
قوتوں اور عناصر کو مجبور کر دیں کہ وہ کسی نہ کسی حیثیت سے اپنی تحریک کا ہمنوا اور
ساتھی بنائیں اور اپنا تحفظ بھی یقینی بنا لیتا ہے اور ملک کا رُخ بھی آہستہ
آہستہ موڑ سکتا ہے۔

آج پھر ہم اس ملک اور خود اپنی ملّت کے ایک اہم موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں
اور حالات ہم سے سوال کر رہے ہیں کہ ہم اپنے لئے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں
دفاعی یا اقدامی۔ اگر ہمارا جواب یہ ہو کہ ہم صرف اپنا دفاع اور تحفظ چاہتے ہیں
تو پھر ہمیں اس کے لئے بھی آمادہ رہنا چاہیئے کہ ہم دھیرے دھیرے ایک
اعضاء بُریدہ لاشہ کی حیثیت اختیار کریں جس کے کبھی ہاتھوں پر حملہ ہو کبھی
پاؤں پر اور کبھی چہرے پر اور ہر حملے میں تھوڑا بہت جسمانی حصہ کٹتا چلا جائے۔
میرا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہم مسلمان اقدامی حیثیت سے اگر کام شروع
کریں تو وہ نہ صرف اپنے آپ کو محفوظ کر لیں گے بلکہ اس اپنے ملک میں قائدانہ
پوزیشن کے حامل بن سکیں گے۔

اس اقدامی مقام پر آنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک ایجابی دوسری منفی
ایجابی بات تو یہ ہے کہ ہم ملک اور سماج کے ایک ایک مسئلے سے اپنے آپ کو
متعلق کریں اور اسلام کے اس دعوے کا ثبوت پیش کریں کہ وہ انسانی مسائل کا
سب سے بہتر حل پیش کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام کی افادیت اور حسن کا صحیح
اظہار اسی وقت ہو سکتا ہے جو وہ ریاست سے لے کر سماج اور فرد سب کی
زندگی پر حاوی ہو مگر ایک ایسی ریاست میں جس میں ہم آباد ہیں اگر ایسی ہمہ جہتی
نقشہ پر عملدرآمد ممکن نہ ہو تو بھی اتنا تو بہر حال ممکن ہے کہ ہم شریک ملکت کی
حیثیت سے اپنا نقطۂ خیال نہ صرف پیش کرتے رہیں بلکہ اس کے لئے عوام
کو ہموا بنانے کی بھی کوشش کریں۔
منفی پہلو یہ ہے کہ اُن کے طرز عمل میں حریفانہ مزاج کی جھلک آنے پائے

جس اکثریت کے افراد کے دلوں پر انھیں دستک دینی ہے اُس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اقتدار کی ہوس نہیں اور وہ اکثریت سے کوئی چیز چھیننا نہیں چاہتے بلکہ اس ملک اور عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

میں موجودہ سیاست کو خارج از بحث نہیں قرار دے سکتا۔ اس ملک میں ہمیں ان معنوں میں شریکِ مملکت قرار دیا گیا ہے کہ ریاست کو چلانے والے ہاتھوں کے انتخاب میں ہم بھی اپنا ووٹ ڈال سکتے ہیں لیکن اس معاملے میں میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ووٹوں کے استعمال اور خود اپنے آپ کو امیدوار بنانے کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اپنے آپ کو امیدوار بنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم حریفانہ کشمکش کے اکھاڑے میں فریق بن جاتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے امیدواروں کو کامیاب کرنے کے لئے ہمیں یا تو کسی موثر پارٹی کا دامن تھامنا پڑتا ہے یا خود اپنی پارٹی تشکیل دینا ہوتی ہے۔ اگر پہلی کوشش کا ساتھ دیا جائے تو اس کا آپ ہی آپ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہم اس کی پالیسیوں کا خواہی نہ خواہی ساتھ دیں اور خود اپنے مشن کو آگے نہ بڑھا سکیں۔ رہی دوسری صورت تو اس طرح اگر کسی ایوان میں دس پانچ افراد آ بھی جائیں تو ان کی سعدی کا تو ضرور سامان فراہم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی کسی مسئلے پر وہ ملت کی واہ واہی حاصل کر لیتے ہیں مگر اجتماعی طور پر اکثریت کے ذہن کو موڑنا ناممکن نہیں ہوتا بلکہ شاید کچھ اور ضد ہی پیدا ہو جاتی ہے۔

ہاں اس کی جگہ اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ مسلمان اپنے ووٹوں کا اجتماعی طور پر استعمال کریں اور اپنی شرائط کھلے طور پر اکثریتی پارٹیوں کے سامنے پیش کر دیں اور پھر کھلے بندوں کسی پارٹی سے معاہدہ کر کے اس کا ساتھ دیں تو اس طرح اکثریت کے ہاتھوں اپنے مسائل حل کرانے میں انھیں آسانی ہو سکتی ہے۔ اب اس کا فیصلہ خود مسلمانوں پر ہے کہ اگر ان شرائط پیدا ہوا اس میں اگر ان کا دائرہ فکر عرب تھی ہو اور نگہ محدود ہو تو اس کے نتائج ایک طرح کے نکلیں گے اور ان کا تعارف ایک خاص قسم کا ہوگا اور اگر یہ دائرہ دوسرے شہروں اور دیہاتوں تک بھی وسیع ہو تو نتائج اور ان کا تعارف دوسری طرز کا ہوگا۔

آج کے ہندوستان کے بسنے والوں کے دل ایک دوسرے سے ٹوٹ رہے کھٹ رہے ہیں اور ان کی آپس کی دوریوں سے ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ اوپر کی سطح پر نیک لوگ آتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن کسی گروہ کو اگر کچھ نیک افراد کی مشروط تائید حاصل ہو جائے تو تصفیہ بات بھی چنداں مشکل نہیں کہ افراد کے انتخاب پر وزن ڈالا جا سکے اور اپنی مرضی کے نیک نفس افراد کو مجالس قانون ساز میں نمائندگی کرائی جا سکے۔

یہ مسلمانوں کے کام کا صرف ایک پہلو ہے باقی تین امور ان کے لئے اور زیادہ اہمیت رکھتے ہیں (۱) خدمتِ خلق کا پروگرام (۲) اپنے معاشرے کی اصلاح (۳) اور اسلام کا تعارف و تبلیغ۔ یہ تینوں امور اس لائق ہیں کہ ان پر مسلمانانِ ہند کے دانشور اور دردمند اصحاب اپنا نقشۂ کار بنا سکتے ہیں نیز جو کام ان میدانوں میں ہو رہے ہیں ان کے تجربات کو سامنے رکھ کر ان کو اور تقویت بخشی جا سکتی ہے۔

مسلمان اگر حریفانہ سیاست سے دستکش ہو جائیں تو یقیناً اسلام کی دعوت و تبلیغ کیلئے بھی راہیں کھل سکتی ہیں اور ملک پر وہ اپنا گہرا نقش بھی ثبت کر سکتے ہیں۔

موازنہ پارسی اور مسلمان

"دوسری تاریخ کو الہ آباد میں قیام کیا، تیسری اپریل کو ہم سب شام جبل پور پہنچے یہاں بیلوں کی ڈاک گاڑی میں کرایہ کی اور تین دن اور تین رات برابر چلے اور ناگ پور پہنچے۔ ناگ پور سے ریل پر سوار ہوئے اور آٹھویں تاریخ قریب دوپہر کے بمبئی پہنچے۔ الہ آباد سے بمبئی تک کیا کا ڈاک کیا چوکیات، کیا ریل، کیا گورنمنٹ کے اہل کاروں سے ہر ایک جگہ اردو میں گفتگو کی۔ سب لوگ ہر جگہ بخوبی سمجھتے تھے۔ بمبئی میں پارسی ہوٹل میں دو کمرے لئے۔ ہم وہاں نہائے دھوئے، کپڑے بدلے۔ بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے انھوں نے نہایت عمدہ طرح سے قومی ترقی شروع کی ہے مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سب سے پیچھے ہیں۔!"

(سرسید احمد خاں یورپ کے سفر پر جاتے ہوئے)

شمیم احمد شمیم

تقسیم ملک کے مابعد اثرات

ہندستانی مسلمان کی جان عذاب میں ہے اور وہ ایک
شدید قسم کے ذہنی کرب میں مبتلا ہے۔ تاریخ نے اسکے ساتھ ایک
ایسا بے رحم مذاق کیا ہے کہ وہ بغیر کسی گناہ کا ارتکاب کئے شدید
قسم کے احساس گناہ کا شکار ہے، اسکا دل اور دماغ ایک ایسی
نفسیاتی کش مکش کی آماجگاہ ہے کہ جس نے اس کی شخصیت کو
(SCHIQOPRENICK) بنا دیا ہے۔ اور وہ بیک وقت
دو ملکوں کا شہری دو مخالف قوتوں کا وفادار، دو متضاد فلسفوں
کا پرستار اور دو جسموں میں بٹی ہوئی ایک روح ہے مسلمان ہونے
کے ناطے اسے صرف برصغیر ہی میں نہیں تمام دنیا میں مسلمانوں کے
مفادات اور مستقبل سے گہری دلچسپی ہے اور پاکستان چوں کہ ایک
مسلمان ملک ہی نہیں بلکہ اسلام کے نام پر قائم کی جانے والی دنیا
کی پہلی مملکت ہے اس لئے پاکستان کے ساتھ اس کی گہری جذباتی
وابستگی اور روحانی عقیدت ناگزیر بھی ہے اور ناقابل فہم بھی جو
مسلمان ترکی میں خلافت کی بحالی کے لئے جان دینے پر آمادہ ہوا اسکے
لئے پاکستان کی بقا اور اس کی سلامتی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرنا کوئی
نئی بات نہیں۔ لیکن ہندستان اور پاکستان کی تاریخ اور تعلقات
کی روشنی میں ہندستانی مسلمان کے لئے پاکستان کے تئیں کسی قسم
کی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار کرنا چونکہ حب الوطنی کے تقاضوں کے منافی
سمجھا جاتا ہے اس لئے ہندستانی مسلمان عام طور پر اس جذبے
کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں ایک شدید قسم کے احساس گناہ
کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہندستانی مسلمان کی
اس گہری جذباتی عقیدت کی ایک اور معقول وجہ بھی ہے۔ اور وہ
ہے ان دونوں کا خونی رشتہ۔ برصغیر کی تقسیم نے صرف ایک ملک
ہی کے دو ٹکڑے نہیں کئے گھروں اور خاندانوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے
کر کے رکھ دیا اور فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناک اتھل پتھل نے دونوں
ملکوں کے درمیان باہمی نفرت، عداوت اور شک و شبہ کی اتنی اونچی
اونچی دیواریں حائل کر دیں کہ آج ۲۸ سال بعد بھی ماں بیٹے سے بھائی
بہن سے، بیوی شوہر سے اور بیٹا باپ سے ملنے کی حسرت میں تڑپ
رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ پاکستانی مسلمانوں کے آدھے سے زیادہ عزیز اور
رشتے دار ہندستان میں ہیں اور ہندستانی مسلمانوں کے بیشتر عزیز
واقارب پاکستان میں ہیں۔ اس صورتحال نے دونوں کو ایک
ناقابل بیان مصیبت ہی میں نہیں ملک کی اکثریت کی نگاہوں میں
ایک ناپسندیدہ دماغی کیفیت میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ یہ بات ان
لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جنھیں اس جذباتی کرب اور نفسیاتی
کشمکش سے کبھی دو چار ہونا نہیں پڑا ہے۔ ادھر مغربی پاکستان کی ساری
ہندو آبادی چونکہ مکمل طور پر اکھڑ کر ہندستان میں آباد ہو گئی ہے
اس لئے اس ذہنی عذاب سے نجات مل گئی اور اسے زیادہ سے
زیادہ اپنے مکان باغ باغیچے یا دوسری جائداد کا ہی ماتم کرنا پڑا
اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں مقیم ہندوؤں کو تقریباً ایسی
صورتحال کا سامنا کرنا پڑا کہ جس سے ہندستانی مسلمان دوچار

۲۷ سال سے دوچار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی حکمرانوں نے ان پر ہمیشہ ہندستان کی وفاداری اور ہندستان سے گہری جذباتی وابستگی کی تہمت لگائی۔ اور یہ وفاداری اور یہ وابستگی میری نگاہوں میں اتنی ہی ناگزیر اور قابل فہم تھی کہ جتنی ہندستانی مسلمانوں کی پاکستان سے دلچسپی، بنگلہ دیش بننے کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے لئے نفسیاتی مسئلہ ختم ہو جائیگا لیکن بنگلہ دیش کے اندرونی معاملات کا گہرا علم رکھنے والوں کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ بنگلہ دیش کے ہندوؤں پر جب کبھی بھی کوئی افتاد پڑتی ہے ان کی نگاہیں ہندستان کی طرف اٹھتی ہیں اور ان کی وفاداریاں اور ہمدردیاں اسی طرح بٹی ہوئی ہیں کہ جس طرح ہندستانی مسلمانوں کی۔ ہندستان اور پاکستان کے درمیان گذشتہ ۲۷ برسوں کے تعلقات کی تاریخ نے ہندستانی مسلمانوں کے لئے اس تکلیف دہ صورتحال کو اور زیادہ ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔ اور ہر مسلمان کو اپنے ملک سے وفاداری کا اعتبار دلانے کے لئے پاکستان سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار اور اعلان کرنا اگر ضروری نہیں تو عین مناسب سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں بے شمار ایسے ہندو موجود ہیں کہ جو پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوششوں میں تو پیش پیش ہیں لیکن پانچ چھ کروڑ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان نکلے جو کھل کر یہ بات کر سکے کہ ہندستان میں فرقہ وارانہ ذہنیت اور فسادات کو ختم کرنے کے لئے پاکستان کے ساتھ ہمارے تعلقات استوار ہونا بہت ضروری ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان پاکستان کا نام لیتے ہیں، ایک احساس گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ یا تو پاکستان کو گالی دے کر اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے، یا پاکستان کی ہر بات کی غلط تاویل کر کے اپنی وفاداری کو مشکوک بنا دیتا ہے اور جو لوگ یہ دونوں باتیں نہیں کر سکتے وہ رات کی تاریکیوں گھروں کی چار دیواریوں اور باہمی سرگوشیوں میں پاکستان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں بالفاظ دیگر یہ کہ پاکستان کے تئیں مسلمانوں کا رویہ اور رجحان بہرحال نارمل نہیں اور نہ موجودہ حالات میں ایسا ہونا ممکن دکھائی دیتا ہے۔

میں اس کی ذمہ داری نہ ہندوؤں پر عاید کرتا ہوں اور نہ مسلمانوں پر۔ یہ صورت حال تقسیم ملک کے اس غیر فطری آپریشن کا منطقی نتیجہ ہے کہ جس نے ایک ماں کے دو ٹکڑے کر کے یہ قانون نافذ کر دیا کہ ایک ہی جسم کے ان دو ٹکڑوں میں کوئی ربط کوئی رشتہ کوئی تعلق باقی نہ رہے جس طرح تقسیم کا عمل ایک غیر انسانی، غیر فطری اور وحشیانہ فعل تھا اسی طرح یہ قانون بھی ناقابل عمل اور ناقابل قبول ہے پاکستان کے ہندو (ان کی تعداد اگرچہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے) اور ہندستان کے مسلمان دونوں ہی قوم پرستی، حب الوطنی اور وفاداری کے تمام مسلمہ قوانین توڑ کر ہندستان اور پاکستان کے مفادات، مستقبل اور سلامتی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے اور میرا دعویٰ ہے کہ بنگلہ دیش کے ہندو بھی ہمیشہ ہندستان کے ساتھ ایک گہری وابستگی محسوس کرتے رہیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے ملک سے وفاداری اور اپنے پڑوسی ملک کی سلامتی سے گہری دلچسپی میں کوئی ایسا تضاد نہیں کہ اسے گناہ تصور کر کے اسکا ارتکاب کرنے والوں کو قابل گردن زدنی سمجھا جائے۔ جب ہم نے ملک کی تقسیم کے گناہ عظیم کو ایک تاریخی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہے تو ہمیں اس سے پیدا شدہ نفسیات اور نتائج کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کو ذہنی کرب روحانی عذاب اور نفسیاتی کشمکش سے آزاد کر کے ان میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنا ضروری ہے اور یہ جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ انھیں گناہ اور جرم کے احساس سے نجات دلائی جائے اس مقصد کے لئے پاکستان کے ساتھ ہمارے ملک کے تعلقات بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے حکمرانوں کو باہمی تناؤ کشمکش اور تصادم کی موجودہ فضا ہی راس آتی ہو۔ لیکن ہمیں اپنے طور پر موجودہ ناگوار ماحول کو خوشگوار بنانے میں پہل کرنا چاہیئے۔

ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ بے چینی ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور ان کے حالیہ مصائب اور مسائل کو اپنے ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے بہت سے بازاری ڈاکٹروں، بناسپتی مسیحاؤں اور سیاسی سوداگروں نے اپنی اپنی دکانیں سجا رکھی ہیں

ہر لیڈر اور ہر سیاسی جماعت ان کی بے چارگی اور بیماری کا فائدہ اٹھا کر نئے نئے نسخے تجویز کرتی ہے اور نیم حکیموں کی اس سچائی نے مسلمانان ہند کی جان خطرے میں ڈال دی ہے ان بازاری ڈاکٹروں میں سب سے خطرناک قبیلہ ان ڈاکٹروں کا ہے کہ جو مسلمانوں کے زخم بیچ کر اپنے لیے سیاسی اقتدار کی مسند سجا لینے میں اور اس مقصد کے لئے ہندستانی مسلمانوں کو ہمیشہ جذباتی طور پر ناآسودہ، سیاسی سطح پر ملک کی اکثریت سے بالکل الگ تھلگ اور ذہنی اعتبار سے بالکل پراگندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلا دلا کر ان کے مستقبل کو تباہ کرنے اور اپنے مقدر کو سنوارنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں ان کا مفاد اسی میں ہے کہ مسلمان اس موجودہ ذہنی کش مکش سے کبھی آزاد نہ ہوں تاکہ ان کی قیادت اور سیاست کو کبھی کوئی گزند نہ پہنچے اور وہ اطمینان سے زخموں کی تجارت کرتے رہیں یہ لوگ مسلمانوں میں فرقہ وارانہ رجحانات کو ہوا دیتے ہیں انھیں ملک کی اکثریت کے تئیں بدظن کرتے ہیں اور اپنے اعمال اور کردار سے ملک کی اکثریت کو مسلمانوں سے بیزار اور بدظن ہونے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو قومی یک جہتی کی تعلیم دینے کی بجائے انھیں علیحدگی پسندی کی ترغیب دیتے رہتے ہیں اور ہر رائی کو پہاڑ بنا کر ان کے معمولی مسائل کو بھی خطرناک اور لاعلاج بیماری کا رنگ دیتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو فرقہ پرست ہندوؤں سے زیادہ ان ہی مسیحاؤں سے زیادہ خطرہ ہے اور ان سے خبردار رہنے کی اہمیت کو، ضرورت کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

پاکستان کی حکومت اور پاکستانی لیڈروں کو بھی مسلمانان ہند کی مجبوریوں اور مصیبتوں پر ٹسوے بہانا زیب نہیں دیتا کیوں کہ ایک تو ان کی ہمدردی اور ان کی غم خواری مشکوک ہے اور وہ واضح طور پر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان سے اپنا سیاسی مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، دوئم ان کی غم خواری سے ہندستانی مسلمانوں کے مسئلے تو کیا حل ہوں گے ان کی نوعیت زیادہ پیچیدہ اور ان کا حل دشوار تر ہو جاتا ہے یہ پاکستان کے ارباب سیاست اور اہل اقتدار ہم پر بڑا کرم کریں گے کہ اگر وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر ہمارے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیا کریں لیکن مجھے ذاتی طور پر اس بات کی توقع نہیں کہ وہ اس کرم فرمائی پر آمادہ ہوں گے۔ کیوں پاکستانی حکمرانوں کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر ہندستان کے مسلمانوں کو ذہنی آسودگی اور جذباتی اطمینان حاصل ہوا تو پاکستان کی نظریاتی اساس ختم ہو جائے گی اور پاکستان کے عوام ان سے یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دونوں ملکوں کے درمیان نفرت، بدظنی اور بے اعتمادی کی موجودہ دیواریں کب تک حائل رہیں گی؟ ہندستان اور پاکستانی عوام کے درمیان آمد و رفت، افہام و تفہیم اور میل ملاپ کے عمل میں قدم قدم پر روڑے اٹکانے کی موجودہ کوششوں کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔

ہندستانی مسلمان کا مستقبل کیا ہے؟ اسے کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا قطعیت کے ساتھ کوئی جواب دینا ممکن نہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے اور وہ یہ کہ ہندستانی مسلمان کا مستقبل خود ہندستان کے ساتھ وابستہ ہے اگر سارا ملک تعلیمی پسماندگی، ذہنی پستی، اقتصادی بدحالی اور سیاسی افراتفری کے اس اندھیرے سے باہر نکل کر آگے بڑھنے میں کامیاب ہوا تو ہندستان کا مسلمان بھی خوش حال اور آسودہ ہوگا۔ کیوں کہ نئے ہندستان میں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ نفرت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی اسکے برعکس اگر ہندستان کی سیاسی قیادت اقتصادی محاذ پر ناکام ہو کر اس ملک سے بھوک، غربت، افلاس اور لاچاری مٹانے میں کامیاب نہیں ہوتی تو پچپن کروڑ ہندوؤں کے ساتھ چھ سات کروڑ مسلمان بھی ڈوب جائیں گے اس لئے ہندستانی مسلمانوں کا مستقبل گہرے طور پر اس ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے انھیں کیا کرنا چاہیئے یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن انھیں کیا کرنا چاہیئے یہ میں کہہ سکتا ہوں انھیں کسی قیمت پر بھی کسی مسلم فرقہ پرست جماعت کا آلۂ کار نہیں بننا چاہیئے۔ ہندستانی مسلمانوں کے لئے فرقہ پرست سیاست خودکشی کے مترادف ہے اور اسلام میں خودکشی گناہِ عظیم ہے۔!

غلام محمود بنات والا

ہندوستانی مسلمانوں کا تاریخی کردار

قوموں کی زندگی میں مشکلات و دشواریاں "آبِ نشاط انگیز" کا اثر رکھتی ہیں۔ اور ان کی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہیں۔ لہٰذا اگر عصرِ حاضر کا ہندوستانی مسلمان مشکلات میں گھرا ہوا ہے تو یہ کیفیت مایوسی و ناامیدی کی بجائے حوصلہ افزا لئے ہوئے ہے۔

تاریخ کی ہر کروٹ نے اہم قوموں کو نئی و پیچیدہ صورت حال سے دوچار کیا ہے۔ اور انھیں نازک و دشوار پوزیشن میں لا کھڑا کیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان بھی تاریخ کے اس نشیب و فراز سے گذرا ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے وہ کبھی بے خبر نہ رہا۔ نئے افکار سے معمور اور نئے جوش و نئی امنگوں سے مخمور اس نے ہر نئے زمانے کا جواب اپنے انداز میں دیا ہے۔ ہر دور کے بدلتے حالات نے اس ہندوستانی مسلمان میں ایمان کی چنگاری کو متحرک کیا ہے اور ایسے صاحبِ فکر و عمل عطا کئے ہیں کہ ہر دل پکار اٹھا ہے کہ ؎

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی۔

ہندوستانی مسلمانوں کا یہ واضح کردار ان پر وقتاً فوقتاً لگائے جانے والے علیحدگی پسندی کے ہر الزام کو مسترد کر دیتا ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کر دیتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہر زمانے کو انمول نیرنگیاں عطا کی ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کی نوعیت اور ان کے موقف کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پیچھے مڑ کر زندگی کے ہر موڑ پر ان کی ادا کیا رہی' اس کا ایک تجزیہ کیا جائے۔

"تاجر انگریز" کے جابرانہ و جارحانہ منصوبوں کے سامنے سراج الدولہ، حیدر علی اور سلطان ٹیپو سینہ سپر ہو گئے۔ حیدر علی کی ضرب کاری نے تو انگریزوں کو اس قدر بوکھلا دیا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دینے کے بارے میں سوچنے لگے تھے لیکن یکایک فرانس و انگلستان میں صلح ہو گئی۔ اور اس صلح کے نتیجے میں ہندوستان کی فرانسیسی فوج سلطان میسور کی امداد سے کنارہ کش ہو گئی' اچانک حیدر علی کا بھی انتقال ہو گیا اور انگریزوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ سلطان ٹیپو نے اپنے خون سے داستانِ حریت کو رنگین بنا دیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزی حکومت کے قدم مضبوطی سے جمنے لگے۔ یہ حکومت اپنے ساتھ جدید مغربی تہذیب کا چیلنج بھی لائی۔ نئے زمانے کا جواب جنوبی و شمالی ہند کے مسلمانوں نے مختلف انداز میں دیا۔ جنوبی ہند کے اونچے اور متوسط طبقوں کے مسلمان زیادہ تر تجارت پیشہ تھے۔ عرب سے تاجر ملابار اور ان علاقوں میں بس گئے تھے۔ یہاں انھوں نے اسلام کی روشنی پھیلائی تھی اور ہندوستانی سماج کا ایک جز بن چکے تھے۔ ان تاجروں کا رویہ "محتاط مصالحت" کا تھا۔ اپنی گہری مذہبیت کی وجہ سے مذہبی عقائد اور روایات پر وہ مضبوطی سے قائم رہے۔ لیکن انگریزی تعلیم اور مذہبی علوم کو بھی حاصل کرنے پر تیار ہو گئے۔

جنوبی ہند کے برعکس شمالی ہند کے مسلمان عموماً جاگیردار تھے یا سرکاری ملازم کی حیثیت سے شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ انگریزوں کی پالیسی ان کیلئے خصوصی طور پر سمِ قاتل تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیار کردہ رویے کی وجہ سے مسلمان جاگیرداروں کے ہندو

ٹھیکے دار موروثی زمین دار بن گئے اور مسلمان امراء کا یہ طبقہ ختم ہونے لگا۔ سرکاری ملازمتوں سے بھی مسلمان دھیرے دھیرے ہٹائے جانے لگے مسلمان علماء بھی انگریزوں کی پالیسیوں کا شکار ہونے لگے۔ انگریزوں نے شرعی عدالتوں کو ختم کر کے سول عدالتیں قائم کر دیں۔ ان عدالتوں میں قاضی و مفتیوں کی حیثیت سے مسلمان علماء کی بجائے انگریز افسر ہوا کرتے تھے۔

شمالی ہند میں مسلمانوں اور انگریزوں میں خصوصی طور پر ٹکراؤ ہوا۔ جنوبی ہند بھی اس سے کلیتہً علیحدہ نہ رہ سکا۔ اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے جنوبی ہند نے نادر نمونے پیش کئے ہیں۔ جن پر تحریک آزادی کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ہندستان کو دارالحرب قرار دیا۔ حضرت مولانا سید احمد بریلوی نے جہاد کا پرچم بلند کیا۔ اور جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے، اور مجاہدین کی طاقت منتشر ہو گئی۔

۱۹۵۷ء کی پہلی قومی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کا رویہ مسلمانوں کی طرف بیحد سخت اور ظالمانہ ہو گیا۔ انگریزوں کا عام طور پر خیال تھا کہ اس جنگ کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ لہذا مسلمانوں کی جاگیریں اور جائدادیں ضبط ہونے لگیں۔ سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو بے دخل کیا جانے لگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض سرکاری اعلانات میں وضاحت ہونے لگی کہ فلاں فلاں عہدوں کیلئے صرف ہندو لئے جائیں گے۔ انگریز مصنف پی۔ ہارڈی نے اپنی تصنیف "مسلم آف برٹش انڈیا" میں مسلم مسئلہ کو جس انداز سے پیش کیا وہ موجودہ حالات میں بھی ایک معنی خیز اہمیت رکھتا ہے وہ لکھتا ہے۔

"ہندستان میں مسلمان اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں
لیکن ایسی من مانی شرائط پر نہیں سیکولر معاملات
میں ان کا گفتار و کردار ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کے
انگریز جنٹلمین کی طرح ہونا چاہیئے ......
اور انھیں اکبر یا اورنگ زیب کی بجائے سموئل سمائلس
یا کوبڈن اور برائٹ کو تمثیل سمجھنا ہوگا۔"

پہلی جنگ آزادی کی "ناکامی" کے بعد علماء نے حالات کا از سر نو جائزہ لیا۔ اور فیصلہ کیا کہ "اپنی جدوجہد کو میدان جنگ سے ہٹا کر درس و تدریس کی طرف منتقل کیا جائے۔ ۱۸۶۲ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا دارالعلوم ندوۃ العلماء نے دین اسلام کو جدید دنیا کے سامنے موثر انداز میں پیش کرنے کے چیلنج کو کامیابی کے ساتھ نبھایا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی تحلیل کی جا چکی تھی اور ہندستان براہ راست ملکہ وکٹوریہ کے زیر اقتدار چلا گیا تھا۔ نواب عبداللطیف نے فتوے حاصل کئے کہ انگریزوں کے دور حکومت میں ہندستان دارالحرب نہیں اور جہاد لازمی نہیں۔ لیکن یہ تحریک اپنے مقصد کے لحاظ سے محدود تھی۔ سرسید احمدؒ اور ان کے قائم کردہ علیگڈھ کالج نے مسلمانوں کو انگریزی اور مغربی علوم کی طرف راغب کیا۔ اور مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے انھیں زمانے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ سرسید احمد کی تحریک نے تعلیمی، تہذیبی و سیاسی میدان میں ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔

سرسید احمدؒ کی تحریک کا ایک زبردست اثر یہ ہوا کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں میں محکومی کا شدید احساس پیدا کر دیا اور ان میں خودداری کی حفاظت کا خیال پیدا کر دیا۔ سرسید احمد کی انقلاب آفریں تحریک نے مسلمانوں کو عارضی طور پر انگریزوں کے نشانے سے ہٹایا۔ اور پھر مناسب وقت پر بہتر پوزیشن کے ساتھ زمانے کے دوش بدوش لا کر کھڑا کر دیا۔ مسلم لیگ کی تحریک ڈاکٹر اقبال کی ذہنی اور قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی عملی رہنمائی میں آگے بڑھتی رہی۔ یہ تحریک آزادی کے جذبے سے سرشار تھی۔ اور ہندستان کے مستقبل میں اس نے مسلمانوں کے مقام اور ان کے حقوق کو جمہوری و نیشنل مسئلہ کے طور پر پیش کیا۔

اسی زمانے میں ایک خفیہ تحریک بھی اٹھی۔ کہ افغانستان یا ترکی کی مدد سے انگریزوں کو ہندستان سے نکال دیا جائے۔ لیکن یہ ممکن العمل نہ ہوا

ترکی کے خلاف انگریزوں کے منصوبوں نے بھی ہندستانی مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دی اور انھیں اپنی جدوجہد میں متحد کر دیا۔

انگریزوں کے دور حکومت میں مسلمانوں کی مختلف تحریکیں کبھی ایک دوسرے کے قریب آئیں اور کبھی دور ہٹ گئیں۔ لیکن زمانے کے جواب میں ایک انداز واضح ہو گیا۔ اب جدوجہد کا رخ جنگ سے ہٹ کر سیاسی طریقہ کار کی طرف پھر گیا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد مسلم مسئلہ ان معنوں میں جزوی طور پر حل ہوا کہ اب اس کی زد میں صرف آزاد ہندستان کا مسلمان تھا۔ گو کہ یہ زد شدید بھی مسلمانوں کو ایک بار پھر بدلتے زمانے کے چیلنج کا سامنا ہوا۔ موجودہ بحران کو ۱۸۵۷ء کے آئینے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور پی ہارڈی کا پیش کردہ تجزیہ آج بھی ایک زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن موجودہ بحران ۱۸۵۷ء کے بحران سے کہیں زیادہ سخت ثابت ہوا ہے۔ آزادی کے بعد فسادات بام عروج پر پہنچ گئے۔ سارے ملک میں جاگیرداروں اور زمین داروں کا خاتمہ ہوا۔ اور ۱۸۵۷ کے بعد مسلمانوں کا جو بھی بچا کھچا جاگیردار طبقہ تھا اب مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ ان طبقوں کی معاشی حالت بھی تباہ ہوگئی۔ جو جاگیرداروں اور زمین داروں کے ساتھ وابستہ تھی۔ ترک وطن یا ترک وطن کا ارادہ رکھنے والوں کی جائدادوں کے بارے میں جو سخت قوانین نافذ ہوئے۔ انھوں نے کاروباری طبقوں کو انتہائی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ کیوں کہ اب کاروبار کیلئے قرض یا فراہمی سرمایہ کے امکانات ختم ہو گئے یہ قوانین بعد میں ختم کر دیئے گئے لیکن نئی معاشی پالیسیوں کی وجہ سے کاروباری طبقے کا انحصار حکومت پر پہلے سے کہیں زیادہ ہوگیا۔ اور اس صورت حال نے نت نئی مشکلات کھڑی کر دیں۔ سرکاری عہدوں و ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد روز بروز گرتی رہی اور معاشی بدحالی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہونے لگی۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا مسلمانوں کے مسائل کی فہرست میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ فسادات، معاشی تنزلی، تعلیمی پس ماندگی، [illegible] یونیورسٹی کا مستقبل، شرعی قوانین کی حفاظت، اردو کی حق تلفی و دیگر کتنے ہی مسائل سرفہرست ملیں گے

آج ہندستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ کی بنیادی نوعیت یہی ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت اور زمانے کے تقاضوں کو کس طرح ہم آہنگ کریں۔ اس ضمن میں خصوصی طور پر دو مسائل پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے کہ منجملہ دیگر یہ ہندستانی مسلمانوں کے موقف اور ان کی جدوجہد کے رخ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہندستانی مسلمانوں کا مذہبی و تہذیبی مستقبل اردو کے ساتھ خصوصی وابستگی رکھتا ہے۔ لہذا ہندستانی مسلمانوں کے مسائل کے حل کا ایک بڑا جز اس میں ہے کہ اردو پر اقتصادی و معاشی دروازے کھول دیئے جائیں۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے ہندستان کے موجودہ لسانی مسئلہ کو سمجھنا ہوگا۔

دستور ہند نے اردو کو بھی ایک ملکی زبان تسلیم کیا ہے لیکن آزادی کے بعد مختلف ریاستوں بالخصوص گہوارئے اردو یوپی میں اردو کو ابتدائی و ثانوی درجۂ تعلیم سے نکال کر اسے موت کی نیند سلادینے کی کوشش کی گئی۔ یہاں تک کہ گوپی ناتھ سنہا نے تو واضح الفاظ میں کہدیا

"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریاست یوپی کے ترقیاتی منصوبے کی پہلی آئیٹم اردو کی تباہی تھی۔"

۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم عمل میں آئی۔ اس تنظیم نو میں اردو کی قسمت میں کوئی علاقہ نہ رہا بلکہ وہ ہر ریاست میں غریب الوطن ہو کر رہ گئی۔ لسانی تنظیم نے اردو کی کس مپرسی میں اضافہ ضرور کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی مختلف ریاستوں میں "لسانی اقلیتوں" کے مسئلہ کو بھی شدت کے ساتھ ابھارا۔ اور اردو کو بھی ان لسانی اقلیتوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ اب ہندستان میں اردو کی قسمت ان لسانی اقلیتوں کی قسمت سے وابستہ ہو گئی ہے۔

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندستان کی کل آبادی میں اردو طبقہ ۵ فی صد ہے۔ اس پس منظر میں دنیا کے چند ایسے دیگر ممالک پر بھی ایک نظر دوڑائیں جنھیں زبان کے مسئلے سے پالا پڑا ہے سوئزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے لیکن تین سرکاری زبانیں رکھتا ہے۔ جرمن، فرنچ اور اطالوی زبانیں سرکاری زبانیں ہیں جبکہ آبادی میں ان کا تناسب حسب ذیل ہے۔

جرمنی	....	72.1 فیصد
فرنچ	....	20.3 "
اطالوی	....	5.9 "

کناڈا میں انگریزی اور فرنچ دو سرکاری زبانیں ہیں۔ بلجیم میں فلیمش اور فرنچ کو سرکاری زبانوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ سویت یونین میں تقریباً دو سو زبانیں ہیں جن میں تقریباً ۱۶ زبانیں اہم ہیں اور قوانین گزٹ وغیرہ ان سب سولہ زبانوں میں شائع ہوتے ہیں دستور ہند میں "لا مذہب" کا تصور اور مشترکہ سول کوڈ کی ہدایت ہندستانی مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت کیلئے سخت تشویش کا باعث ہیں

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پیداوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنایا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غرضیکہ ایک "سیکولر ملک" میں عدالتوں نے یہ "شان پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد، رواج و رسومات کی "آلودگی" سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری، سیکولر اور روادار ملک کے شایان شان ہوگا اور ایک سلگتے ہوئے مسئلہ کا معقول باوقار اور نیشنل حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے دھارے کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے تنہا مسائل نہیں ملکی مسائل کا اہم جز ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک، بدگمانی اور بداعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریڈم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ سیٹ میں چھپا ٹرانسمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود یہ واضح ہے

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

یہاں تاریک ہے وہاں دھندلا

... اسی دوران میں، میں سر تیج بہادر سپرو کو دیکھنے الٰہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بستر علالت بلکہ بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ تحریک کے ایڈیٹر گوپال متل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو [illegible] زبان ہے وہاں اسکے لئے کام کروں [illegible] یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آ کر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایک تقریر سے
اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور

24 فروری 1969ء

آل احمد سرور

ہندستانی مسلمان

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹوائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس داں سائنس اور روحانیت کا ملاپ کروانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا۔ قوموں کی تاریخ، افکار اور اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا، یا علماء یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر دین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سیکولر یا دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپرد کیا گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اور اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر فطرت، تسخیر کائنات، مشینی نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجودہ فکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے ہفتے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعصاب

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پیداوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اُس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غرضیکہ ایک سیکولر ملک، "میں عدالتوں نے یہ "شانِ پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد/رواج و رسومات کی "آلودگی" سے پاک کرے۔

ہندستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گذر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری، سیکولر اور روادار ملک کے شایانِ شان ہوگا۔ اور ایک سلگتے ہوئے مسئلہ کا معقول پائدار اور منصفانہ حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں دیکھتے ہیں وہ تاریخ کے دھارے کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ سے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید - ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے۔

ہندستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں، ملکی مسائل کا اہم جز ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک، بدگمانی اور بداعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریڈم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ سیٹ میں چھپا ٹرانسمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود یہ واضح ہے؛

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

یہاں تاریک وہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سرتیج بہادر سپرو کو دیکھنے الہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بسترِ علالت بلکہ بسترِ مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک" کے ایڈیٹر گوپال متل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا میں ہندستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے۔ پاکستان چلے جاؤ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو [illegible] وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ [illegible] یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولوی عبدالحق کی ایک تقریر سے

اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور

24 فروری 1969ء

آل احمد سرور

ہندوستانی مسلمان

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی بصیرت کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹوائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس داں سائنس اور روحانیت کا ملاپ کروانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے۔ میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا، قوموں کی تاریخ، افکار اور اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا، یا علما، یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ دین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکیڑ لیا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپر بن گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظرانداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اور اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر فطرت، تسخیر کائنات، مشینی نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجودہ فکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے پسینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعصاب

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پیداوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غرضیکہ ایک "سیکولر ملک" میں عدالتوں نے یہ "شان پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد/رواج و رسومات کی "آلودگی" سے پاک کرے۔

ہندوستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گذر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری، سیکولر اور روادار ملک کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک سلگتے ہوئے مسئلہ کا معقول پائدار اور منصفانہ حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے دھارے کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ۔۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید۔ ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں ملکی مسائل کا اہم جز ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک بدگمانی اور عدم اعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریڈم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ سیٹ میں چھپا ٹرانسمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود واضح ہے

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

یہاں تاریک ہے تو وہاں دھندلا

"اسی دوران میں، میں سر تیج بہادر سپرو کو دیکھنے الٰہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بستر علالت بلکہ بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی۔ اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک" کے ایڈیٹر گوپال متل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے۔ پاکستان چلے جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں۔ جہاں اردو پڑھی بولی اور لکھی جاتی ہے وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ کروں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایک تقریر سے
اقتباس ۔ اسلامیہ کالج لاہور
24 فروری 1961ء

آل احمد سرور

ہندوستانی مسلمان

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی تصیرات کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنسداں سائنس اور روحانیت کا ملاپ کروانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا - قوموں کی تاریخ، افکار اور اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا، یا علما، یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ مذہب جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سیکولر یا دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپر بن گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر فطرت، تسخیر کائنات، مشینی نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں۔ مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجود تبکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے مہینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعصاب

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پیداوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غرضیکہ ایک "سیکولر ملک" میں عدالتوں نے یہ "شانِ پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد، رواج و رسومات کی "آلودگی" سے پاک کرے۔

ہندستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گذر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری، سیکولر اور روادار ملک کے شایانِ شان ہوگا۔ اور ایک سلگتے ہوئے مسئلہ کا معقول پائیدار اور منصفانہ حق ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے دھارے کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ـــ

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید - ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے۔

ہندستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں، ملکی مسائل کا اہم جز ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہلِ وطن کے کچھ شکوک، بدگمانی اور بداعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریڈم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند - پاک جنگ کے دوران صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ سیٹ میں چھپا ٹرانسمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود یہ واضح ہے

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

[illegible]

یہاں تاریک وہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سر تیج بہادر سپرو کو دیکھنے الٰہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بسترِ علالت بلکہ بسترِ مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک" کے ایڈیٹر گوپال مِتل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا میں ہندستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے۔ پاکستان چلے جاؤ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی [illegible] زبان ہے۔ وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ کروں [illegible] یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آ کر از سرِ نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے۔

بابائے مولوی عبدالحق کی ایک تقریر سے
اقتباس ـ ۱۰ اسلامیہ کالج لاہور ـــ
24 فروری 1959ء

آل احمد سرور

ہندوستانی مسلمان

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی تعبیر کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹوائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائنس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کروانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال پیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا۔ قوموں کی تاریخ، افکار اور اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا، یا علماء یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ہر دین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سیکٹیریا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپر بن گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر فطرت، تسخیر کائنات، مشینی نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجودہ فکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے مہینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعصاب

شرعی قوانین کی منسوخی اور مشترکہ سول کوڈ کے نفاذ کا تصور آزادی کے بعد کی پیداوار ہے۔ تحریک آزادی کے دوران اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ آئین میں مذہب کی اصلاح کو مخصوص مفہوم پہنا دیا گیا ہے۔ آئین کی دفعہ (۱) ۲۵ مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ لیکن عدالتوں نے اس آزادی کو صرف ان عقائد و رواج تک محدود کر دیا ہے جو مذہب میں لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کو اس کا اختیار دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ان امور میں مداخلت کر سکتی ہے جن کی ادائیگی مذہب میں لازمی نہ ہو۔ غرضیکہ ایک سیکولر ملک، "میں عدالتوں نے یہ "شان پیغمبرانہ" اختیار کر لی ہے کہ مذہب کے ضروری اور غیر ضروری عناصر کی چھانٹ کرے اور ہر مذہب کو اس کے غیر ضروری عقائد، رواج و رسومات کی "آلودگی" سے پاک کرے۔

ہندستانی مسلمان ایک سخت آزمائش سے گذر رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے ہر نئے زمانے کا جواب اسی انداز میں دیا ہے۔ کہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ یہی جواب ایک جمہوری، سیکولر اور روادار ملک کے شایان شان ہوگا۔ اور ایک سلگتے ہوئے مسئلہ کا معقول پائدار اور منصفانہ حل ہوگا۔ جنھیں اس کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور جو زمانے کے تقاضوں کا جواب اپنی تہذیبی انفرادیت کی موت میں چاہتے ہیں وہ تاریخ کے دھارے کے بھی خلاف ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ہندستانی مسلمانوں کے مسائل صرف ان کے ہی مسائل نہیں، ملکی مسائل کا اہم جز ہیں۔ راہ کی دشواریوں میں اہل وطن کے کچھ شکوک، بدگمانی اور عدم اعتمادی بھی شامل ہے۔ اور یہ کیفیت کبھی کبھی انتہا پر بھی پہنچ جاتی ہے۔ اسی فضا کا نتیجہ تھا کہ کتنوں کو "انڈیا ونس فریڈم" کی اشاعت کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد بھی فرقہ پرست نظر آئے۔ اور ۱۹۶۵ء کی ہند-پاک جنگ کے دوران صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے صوفہ سیٹ میں چھپا ٹرانسمیٹر بھی نظر آیا۔ لیکن ان تمام تر دشواریوں کے باوجود یہ واضح ہے

سفینہ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہوگا

[illegible]

یہاں تاریک، وہاں دھندلا

اسی دوران میں، میں سر تیج بہادر سپرو کو دیکھنے الٰہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بستر علالت بلکہ بستر مرگ پر تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے۔ صرف زبان کام دیتی تھی اُس وقت انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آج کل اردو کا نام لینا بھی جرم ہے۔ اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے۔ "تحریک" کے ایڈیٹر گوپال متل جو اردو کے بڑے حامی ہیں لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی ۲۵ برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا میں ہندستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا کہ تم یہاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ میں نے کہا کہ میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی اور جہاں کی وہ زبان ہے۔ وہاں اسکے لئے کام کیوں نہ کروں [illegible] یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آکر از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی اردو کالج بنایا مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے؟

بابائے مولوی عبدالحق کی ایک تقریر سے
اقتباس۔ اسلامیہ کالج لاہور ــــ
24 فروری 1969ء

آل احمد سرور

ہندوستانی مسلمان

میں اکثر اپنے سے سوال کرتا ہوں کہ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقا کے ساتھ مذہب اور مذہبی انسان کی اہمیت کیوں کم ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ آج کے بیشتر مفکروں کے ہاں مذہب سے بیگانگی بلکہ بیزاری کا میلان نمایاں ہے۔ کیونکہ مادی وسائل میں ترقی علم و دانش کے عروج، سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ مذہب کے ہمہ گیر اثرات اور ان کی انسان کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ اب بھی کروڑوں انسان کسی نہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ اور لاکھوں اپنی زندگی کو اپنی تعبیر کے مطابق اس کے سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں۔ یا ڈھالنا چاہتے ہیں یا دانشور اور مفکر ایک مذہبی بنیاد ایک روحانی پیاس کی اہمیت تسلیم کرتے ہیں۔ یا کچھ مورخ ٹوائن بی کی طرح انسانیت کی تاریخ کا خاکہ مرتب کرتے وقت ایک مذہبی رنگ کو خاص اہمیت دیتے ہیں یا کچھ سائینس دان سائنس اور روحانیت کا ملاپ کروانا چاہتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ فکر و ذہن گو سائنس کی ترقی اور مادی خوشحالی کے جدید ترین نمونوں سے خوش نہیں ہے پھر بھی مذہب کی ضرورت اور اہمیت کا وہ احساس آج نہیں پایا جاتا جو آج سے سو سال بیشتر تھا اور نہ اب مذہب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آج کے سارے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہے میں نے انسانی تہذیب کے ارتقا۔ قوموں کی تاریخ، افکار اور اقدار کی تاریخ کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ (اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ مطالعہ بہت گہرا نہیں ہے) اس نے مجھے یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کیا کہ صنعتی انقلاب کے بعد انسان نے جو ترقی کی ہے اس میں مذہب کو بہت کم دخل رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر مذہب یا رواجی مذہب یا کلیسا، یا علما، یا برہمن اس ترقی کے مخالف رہے اور یہ ترقی ان کی مخالفت کے باوجود ہوئی ہے۔ اس وجہ سے مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ دین جب شریعت بنا تو جہاں اس نے قدرتی طور پر زندگی کے لئے ایک نظام اوقات بنایا وہیں اپنے آپ کو محصور بھی کر لیا۔ سکیڑ لیا اور دوسری طرف یہ شریعت یا قانون ایک خاص طبقے کی سپر بن گیا جس نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان قوانین کی روح کو نظر انداز کر دیا۔ اور ان کی ان منجمد تعبیرات پر اصرار کیا جو وقت کے بدل جانے کے ساتھ اپنی حیات بخش اور حیات آفریں صلاحیتیں کھو بیٹھی تھیں اس لئے انسان کی مادی ترقی تسخیر فطرت، تسخیر کائنات مشینی نظام کی سہولت، اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں حارج ہوتی تھیں۔ اس لئے میرے نزدیک موجودہ دور کے امراض کا علاج مذہب کے اس پرانے نسخے سے نہیں ہو سکتا جس کا نام شریعت ہے کیونکہ موجودہ دور کی برکتیں اور لعنتیں مذہب سے قرب یا بیگانگی کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ وہ قانون قدرت کے مطابق موجودہ فکر کی پیداوار ہیں ہر تحریک اپنے ساتھ کچھ برکتیں کچھ لعنتیں لاتی ہے بلکہ ہر حرکت کچھ عرصے بعد اپنی حد سے بڑھ کر زحمت ہو جاتی ہے اسی طرح کچھ برکتوں کے ساتھ ایک دوسری قسم کی زحمتیں پھیلی ہوئی ہیں مشین ہزاروں آدمیوں کے مہینے کے کام کو منٹوں میں کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے فرصت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور فرصت تفریح چاہتی ہے دماغ سوزی نہیں چاہتی۔ یہ تفریح چونکہ ذہن کو بیدار نہیں کرتی بلکہ سلاتی ہے اس لئے ایک قسم کی افیون بن جاتی ہے۔ جو بالآخر اعصاب

کو بے معنی ہیجانات کا عادی بنا دیتی ہے اس کا علاج فرصت کو کم کرنے یا تفریح کو کم کرنے میں نہیں۔ بلکہ ایسی بے معنویت کی حامل تفریحات کو عام کرنے میں ہے جو اقدار کے احساسات کو باقی رکھے اور اعصاب کو امراض کی طرف نہ لے جائیں۔

مذہب کے تین بڑے پہلو کیے جا سکتے ہیں۔ ایک عقائد دوسرا عبادات، تیسرا معاملات، ظاہر ہے کہ عقائد کے سلسلے میں بنیادی عقیدہ توحید رسالت کا ہے۔ ایمان کے لئے اقرار بالسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی بھی شرط ہے لیکن چونکہ دل کا حال ہم نہیں جانتے اس لئے سوائے اس کے کہ ہم اقرار باللسان کو مان لیں ہمارے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے یعنی جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے اور ہمیں اس قول پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے رہا عبادت کا معاملہ تو یہ عبادات دو قسم کی ہیں ایک انفرادی عبادات اور ایک اجتماعی۔ جس طرح عقیدے کے معاملے میں صدیوں سے مسلمانوں نے تکفیر کے ذریعہ ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کی ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے فرقوں کا آغاز ہوا اسی طرح عبادات کے معاملے میں افراط و تفریط ہوئی ہے اور امام کی داڑھی پر لاؤڈ اسپیکر کے بغیر نماز پر اصرار یا آمین بالجہر کی مخالفت اور موافقت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح عقیدے کے معاملے میں بنیادی شرط کو کافی نہیں سمجھا گیا اسی طرح عبادات کے سلسلے میں دین کی روح کے بجائے مفتی کے فتوے کو زیادہ اہمیت دے دی گئی ہے۔ رویت ہلال کا مسئلہ اس کا مزید ثبوت ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ عقیدے کے معاملے میں اگرچہ دنیوی زندگی کی سہولتوں پر اول اول نظر تھی مگر بعد کے شارحین نے ایک فارغ البال طبقے کے لئے عقائد اور عبادات کے ایسے قوانین بنائے کہ دنیوی زندگی کی مصروفیات میں خلل پڑنے لگا بچپن میں میں نے پڑھا تھا کہ حضرت معاذ بن جبل صبح کی نماز میں بڑی لمبی لمبی صورتیں پڑھتے تھے ایک صحابی رض جن کو کھیت پر جانا تھا نیت توڑ کر چلے گئے۔ ان سے پوچھا گیا معاملہ رسول اللہ تک پہونچا، آپ نے حضرت معاذ رض کو طویل صورتیں پڑھنے سے روکا۔

میرے نزدیک اسلام کی حیات بخش اور حیات آفریں طاقت کو ان مبصرین اور شارحین نے بہت نقصان پہونچایا کیونکہ ان کی نظر مذہب کے تیسرے پہلو یعنی معاملات پر اتنی گہری نہ تھی۔

معاملات کا تعلق صرف ایک مسلمان کے دوسرے مسلمانوں سے رشتے تک نہیں ہے بلکہ اس میں غیر مسلموں سے رشتہ بھی آجاتا ہے۔ معاملات کے سلسلے میں اسلام کے اصول عدل اور مساوات پر مبنی ہیں مگر عملی زندگی میں پہلے بادشاہت نے پھر فتوحات نے پھر رسم و رواج نے اس حسن سلوک پر ایسی گرد چڑھا دی کہ معاملات کے دور رس اثرات کو نظر انداز کر کے صرف عقائد اور عبادات کی صحت اور ایک خاص معیار کے مطابق صحت پر زور دیا گیا معاملات میں معاشرت معیشت کا پورا انتظام۔ سیاسی سماجی زندگی کے سبھی عنوان آجاتے ہیں۔ سماجی تبدیلیوں کے ساتھ اس تصور میں تبدیلی ضروری تھی مگر مجموعی طور پر اس تبدیلی کی مخالفت کی گئی اور جن لوگوں نے اس تبدیلی پر زور دیا انھیں کافر و زندیق کہا گیا۔ یہاں اس حقیقت پر زور دینا مقصود ہے کہ سامنتی یا جاگیردارانہ نظام کے تقاضے اور تھے اور صنعتی نظام کے اور سوشلسٹ نظام کے اور ہیں۔ لیکن تاریخ عالم کا یہ ایک تجربہ ہے کہ جس طرح مغرب میں کلیسا نے عام طور پر برسر اقتدار طبقے کا ساتھ دیا اسی طرح اسلام کی تاریخ میں بھی چند نفوس قدسیہ اور آزاد رایوں کو چھوڑ کر عام طور پر ایسے علماء برسر اقتدار طبقے کو حیلہ میسر آگئے جو بجائے بنیادی مسائل پر غور کرنے کے اور سماجی تبدیلیوں کا ساتھ دینے کے عام مسلمانوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے فقہ کے خاص اصولوں کی پابندی پر زور رکھتے رہے۔ اور دنیاوی معاملات میں قیادت کو بادشاہوں یا نوابوں یا فوجیوں پر چھوڑ کر مطمئن ہو گئے۔ دین کی سلامتی کے لئے اس کے دنیوی پہلو پر جو توجہ ضروری تھی وہ نہ ہو سکی۔ مثلاً جمہوریت کا موجودہ تصور اسلام میں نہیں ہے مگر جمہوریت کی روح موجود ہے۔ جب انقلاب فرانس کے بعد مساوات، اخوت حریت کا نعرہ بلند ہوا اور اس سے پوری دنیا متاثر ہوئی تو اس کی گونج تو اول اسلامی دنیا تک بہت دیر میں پہونچی دوسرے قدیم نظام تعلیم نے ذہن کو خرافات میں الجھے رہنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اور علوم دینیہ کی تحصیل ایک ایسا طبقہ کرتا تھا جو دنیوی علوم کے بڑھتے ہوئے سرمائے سے کما حقہ واقف نہ تھا۔ اس لئے جس طرح برہمن اپنی ذات کے اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے سنسکرت کی تعلیم کو عام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح علماء بھی علوم دینیہ کی تعلیم صرف ایک خاص طبقے کا اقتدار

کو باقی رکھنے کے لئے چاہتے تھے اس کا عام ہونا اور دینی علوم سے مربوط ہونا انھیں گوارا نہ تھا اپنے استاد کے تام اور رنگ زیب کا خط اس کی بہت اچھی مثال ہے ۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اپنے رسالے الانصاف فی بیان سبب الاختلاف میں ایسے علما و فضلا کے متعلق ایک عجیب بات لکھی ہے ۔

خلفائے راشدین کا مبارک دور ختم ہوگیا تو زمام خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو نہ اس امانت کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے ورنہ ان میں فتویٰ اور احکام شریعت سے گہرا لگاؤ تھا اسلئے وہ مقدمات فیصل کرنے کے لئے اور قضائے شرعی جاری کرنے کے لئے مجبور ہوئے کہ فقہا سے مدد لیں اور انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھیں ۔ جاہ پسند لوگوں نے جب دیکھا کہ ان فقہا کی بڑی عزت ہے اور وہ اپنے اعراض و استغنا کے باوجود ارباب حکومت کے مطلوب خاطر بنے ہوئے ہیں ۔ تو ان کے دلوں میں علم دین حاصل کرنے کا بھی شوق پیدا ہوگیا تاکہ اسے بازار میں لاکر عزت و شرف کا سودا کریں ۔ قیل و قال اور اعتراض و جواب کا بازار گرم ہو چکا تھا ۔ اور بحث و مناظرے کی راہیں ہموار تھیں ان فقہا کے لئے یہ چیزیں دلچسپی کا مرکز بن گئیں اور ایک مدت تک بنی رہیں ۔ یہاں تک کہ ایسے خلفا اور سلاطین پیدا ہوئے جو فقہی مناظروں کے دلدادہ تھے جنھیں اس وضاحت کے سننے کا بڑا شوق تھا کہ فلاں مسئلہ میں اولیٰ مسلک حنفی ہے یا مسلک شافعی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ارباب فن کلام اور دیگر کلام کے میدان تحقیق و جستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقہ کے معرکے میں اتر آئے ۔ ستم یہ کہ ان سب کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار و رموز کا استنباط کر رہے ہیں اس خیال کے تحت انھوں نے تصنیفات کا ڈھیر لگا دیا ۔ اور بحث و جدل کے

اسلئے ایجاد کر ڈالے افسوس کہ وہ ابتک اسی روش پر
چلے جا رہے ہیں معلوم نہیں کب تک چلیں اور مستقبل
میں کیا ہونے والا ہے ۔ (اقتباس از علی گڑھ تحریک)

میں دراصل اسی پر زور دینا چاہ رہا ہوں کہ یورپ نے ازمنہ وسطیٰ کی جن ذہنی پابندیوں اور فکر پر احتساب سے نشاط ثانیہ کے دور میں آزادی حاصل کرلی ۔ اسلامی دنیا نے یہ کوشش شاہ ولی اللہ، سرسید اور جمال الدین افغانی کے ذریعہ اپنے اپنے دائرے میں کی مگر مجموعی طور پر یہ احتساب یہ پابندی ابھی تک موجود ہے ۔ میرے نزدیک یورپ میں دور جدید صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس، مارکسی تعلیم روسی انقلاب اور بیسویں صدی کی ساری ذہنی و فکری ترقی اسی دور کی ذہنی آزادی کی رہین منت ہے جس نے ایک طرح حریت فکر پر پابندی کو ختم کیا ۔ دوسری طرف سماجی اور سیاسی زندگی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی فلاح کو قدر بنایا اور تعلیم رائج کی جو لوگوں میں خدمت خلق، محبت اور سماجی انصاف کو عام کرے ۔

اسلامی دنیا میں نشاۃ ثانیہ پورے طور پر کہیں نہیں آیا جہاں آیا وہاں چند ہی معاملات میں نشاۃ ثانیہ کے ثمرات ظہور میں آسکے ۔ دوسرے اسلامی دنیا نے صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی کہ نہ دینی علوم میں دل کھول کر حصہ لیا اسنے انجنیری، ڈاکٹری، جراحی سے کاروبار میں غیر مسلموں کی اجارہ داری قبول کرلی ۔ اپنے انجینئر، ڈاکٹر جراح اہل حرفہ پیدا نہیں کئے ۔ ان کے مقابلے میں دربار اور رفعت کو اہمیت دی ۔ زمینداری کو زمین دے کر وہ بے فکر ہوگئے ۔

اس زمین کے مناسب استعمال اور پیداوار کے بڑھانے اور کانوں کے استعمال پر پوری طرح توجہ نہیں کی آخر یہ کیا بات ہے کہ لوہے سے صرف ہل اور تلواریں بنائی گئیں ۔ اور سونے چاندی اور ہیرے نکال کر صرف دولت پیدا کی گئی ۔ زیر زمین معدنیات خزانے پر اس کی نظر کم گئی ۔ علما سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اسلام کی روح کو اور اس کی حیات بخش قوت کو عام کرکے عالم اسلامی دنیا میں زندگی کی رو دوڑا دیتے ۔ مگر وہ عموماً اس جاگیردارانہ نظام اور اس شہنشاہیت کی پشت پناہی میں لگے رہے ۔ جو رفتہ رفتہ بے وقت کی راگنی ہوتی جا رہی ہے ۔

میرے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد قدیم ہندوستان کے ذات پات میں جکڑے ہوئے اور تنگ حصاروں میں پناہ گزیں، لوگوں کے لئے ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھی جو نظام مسلمان اپنے ساتھ لائے تھے اُس میں نسبتاً علم کو عام کرنے اور سماج کی بہتر تنظیم کی صلاحیت تھی مگر جب یہ صلاحیت جاتی رہی تو قدیم ہندوستان اور ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان دونوں کو مغرب کے زیادہ فعال زیادہ ہمہ گیر زیادہ حیات آفریں زیادہ سماجی خیر اور دنیوی فلاح رکھنے والے نظریات نے جن کے پیچھے روشن خیالی کے دور کی روشنی کی کرن بھی اس پسماندہ جامد، تنگ نظر، اختلافات، رنجشوں، خود غرضیوں اور فرقہ بندیوں میں گھرے ہوئے نظام کو شکست دیدی یہ بات کسی غلامانہ ذہن یا مغرب سے متاثر ہو کر نہیں کی جا رہی ہے یہ اس وجہ سے کی جا رہی ہے کہ میرے نزدیک انسانی تہذیب ایک اکائی ہے۔ اس زمانے میں اس کی قیادت ایشیا اور افریقہ نے کی پھر یہ قیادت عربوں کے ذریعہ سے یورپ کو ملی اور آج تک یورپ اور امریکہ نے اس کارواں کی قیادت کی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ فکر کے دائرے میں بھی مغربی خلقے کا کارنامہ کیفیت و کمیت کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ علوم کے لحاظ سے اس کا سرمایہ تمام تہذیبوں کے سرمایہ پر فوقیت لے گیا ہے۔ فطرت کی تسخیر اور مادی وسائل کی فراوانی کے لحاظ سے اس کا جواب نہیں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس نے صدیوں کا کام برسوں میں کیا ہے۔

اگر صرف اسلامی علوم کو لیا جائے تو یورپ اور امریکہ نے اسلام پر جو تحقیق کی ہے وہ باوجود بعض فطری مجبوریوں کے مجموعی طور پر اسلامی مورخوں اور محققوں سے نہ بن سکی میرے نزدیک ان سب ترقیوں کا راز حریت فکر میں ہے اور جب تک اسلامی دنیا حریت فکر کو نہ اپنائے گی دنیا اور دین دونوں کے دائرے میں کوئی قابلِ ذکر ترقی نہ کر سکے گی۔

اس لئے میں سر سیّد کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ سر سید کی دوسری خدمات بڑی عظیم الشان ہیں۔ مگر میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس عقلیت کو جو روشن خیالی کے دور نے مغرب کو عطا کی تھی اپنا رہبر بنایا

[illegible] کا ہندستانی مسلمان [illegible]

علم کی جستجو اور عقل و علم دونوں کو فطرت میں سمو دیا۔ فطرت علم کا سرچشمہ ہے اور عقل کی کسوٹی، فطرت سمجھدار ہے اور فطرت مہربان ہے۔ اگر آدمی فطرت کی بات پر کان دھرے تو کبھی نہیں بہک سکتا۔

سر سیّد کی تحریک نے رفتہ رفتہ اپنے اثرات دکھائے مگر سر سیّد کی عظیم الشان ذہنی بیداری کی مہم کا بنیادی کام مسلمانوں کی ذہنی تربیت تھی۔ جس کے لئے روایتی مذہب پر انھیں کاری ضرب لگانی پڑی۔ لیکن وہ ایم، اے، او کالج کی زینت بن کر رہ گئی۔

ہندوستانی ذہنی مسلمانوں کے ذہن پر بیسویں صدی میں سب سے گہرے اثرات امیر علی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری اور اقبال کے پڑے ہیں۔ ان چاروں نے سر سید سے فیض حاصل کیا۔ مگر چاروں کا علی گڑھ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ ایم اے او کالج جس کی تعریف ہمارے رشید صاحب کرتے نہیں تھکتے۔ مسلمانوں کی قیادت اس لئے نہ کر سکا کہ سر سید نے پہلے اس کی خاطر تہذیب الاخلاق میں اخلاقی مسائل پر مضامین قلم بند کرنے کا وعدہ کیا اور پھر کالج کی مذہبی تعلیم اس طبقہ کے حوالے کر دی جس کی مخالفت وہ زور و شور سے اپنی تحریروں میں کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ مغربی علوم کی تعلیم اور انگریزی کے ذریعہ سے تعلیم کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے۔ مگر سر سید کا بنیادی کام پورا نہ ہو سکا یہ بنیادی کام ہندوستانی مسلمانوں کو ازمنہ وسطیٰ کے ذہن سے نکال کر روشن خیالی کے دور میں لانے کا تھا۔

اگر سر سید کے مذہبی خیالات کالج میں پڑھائے جاتے اگر ان کی تفسیر بھی دوسری تفسیروں کے ساتھ درس کا جز ہوتی ہے۔ اگر ان کے ابتدائی خاکے کے مطابق انگریزی کے مدرسے کے علاوہ اُردو کا مدرسہ اور عربی فارسی کا مدرسہ بھی ہوتا۔ اور اگر انگریزی کے مدرسہ کے صرف ایک مقصد کی فکر نہ ہوتی بلکہ دوسرے پر بھی توجہ ہوتی تو وہ ذہنی انقلاب عمل میں آ سکتا تھا جو سر سید کا حقیقی مقصد تھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ قدامت پرست مسلمانوں نے انگریزی تعلیم کے اوپری فوائد پر ہی توجہ کی اور صرف ملازمتوں کے حصول کا ہی ذریعہ سمجھا اگر وہ اور انگریزی ادب کے سارے افکار و اقدار کا خیر مقدم کرتے تو یقیناً یہ آتشِ نمرود اسی طرح گلزار بن جاتی جس طرح

حضرت ابراہیمؑ کے لئے بن گئی تھی ۔

بات یہ ہے کہ سائنس اور علوم جدید یا مشینی اور صنعتی کمالات سے واقف ہونا کافی نہیں ہے ان کی رُوح تک پہنچنا ضروری ہے ہندوستان میں عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں میں خصوصاً ایک دوشاخہ پن ہے ۔ یہ معلومات وسائل ہنر حاصل کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ اسکے بغیر چارہ نہیں مگر ان کے پیچھے جو ذہن ہے اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ۔

سرسید کو کالج کی خاطر اپنے مذہبی خیالات کی اشاعت ترک کرنا پڑی کالج کے قیام کے زمانے میں انھیں انگریز پرنسپلوں کو اور ان کی سیاست کو بھی قبول کرنا پڑا ۔ اس وقت کی یہ مجبوریاں سمجھ میں آتی ہیں مگر یہ حیرت کی بات ہے کہ آج بھی ہندوستانی مسلمان مذہب کے معاملے میں سرسید کا پوری طرح ہمنوا نہیں آج بھی اجتہاد جس کی ضرورت پر سرسید نے اتنا زور دیا تھا اور جس کو اقبال نے بھی اپنے فکر میں مرکزی حیثیت دی ہے ۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک خطرہ بن کر نظر آتا ہے ۔ مغرب جو صلیبی جنگوں کے اثرات کی وجہ سے اسلام کے ساتھ انصاف نہ کر سکا تھا آج مستشرقوں کے اثر سے اسلام کے آفاقی پیغام کی اہمیت کو محسوس کرنے لگا ہے ۔ شاخت، منٹگمری، واٹ برنارڈ لیوس اور کینٹ ول اسمتھ کے خیالات اس سلسلے میں قابلِ غور رہیں ۔

ہندو ذہن و عقائد شروع ہی سے لچکدار ہیں ۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہندوستانی مسلمان کیوں خوفزدہ اور اپنے حصار میں بند ہے ۔ نئے افکار سے خطرہ سارے مذاہب کو ہے صرف اسلام کو ہی نہیں ۔ اپنے اپنے چند سادہ عقائد اور عملی تعلیم کی وجہ سے ان نئے افکار کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے ہندوستانی مسلمان اس جدید دور میں اپنا خاصا اہم رول ادا کر سکتا ہے ۔ اور معاملات میں چند اخلاقی اور سماجی قدروں کو اپنا کر محنت اور خدمت خلق پر زور دے کر اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کر سکتا ہے مگر اول تو وہ علماء کی قیادت کے زیر اثر ہے دوسرے ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن سے چپکے رہنے کی وجہ سے تیسرے جاگیردارانہ مزاج پر اصرار کرنے کی وجہ سے ہر اس اصلاحی کوشش کی مخالفت کرتا ہے ۔ جو خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ وقت اور حالات کا تقاضہ ہے

اس سلسلے میں چند مثالیں دینا چاہتا ہوں

۱ ۔ عرب اسرائیل کی کشمکش میں اسرائیل کی فتح صرف امریکہ کی مدد کا نتیجہ نہیں بلکہ دراصل جدید ذہن اور ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی لڑائی ہے اور عربوں کی شکست مجموعی طور پر ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن کی شکست ہے

۲ ۔ ہندوستان میں سوشل ریفارم کا جو سلسلہ راجہ رام موہن رائے سے شروع ہوا اس کا قدرتی نتیجہ ہندو کوڈ بل تھا ۔ ہندوؤں نے جو [illegible] مسلمانوں سے بہت پیچھے تھے ۔ اتنی انقلابی تبدیلی کو قبول کیا ۔ مگر تعدد ازدواج کے متعلق علماء کے اثر سے ہندوستانی مسلمان ایسی ہر اس تحریک کی مخالفت کرتا ہے جو تعدادِ ازدواج پر تھوڑی سی بھی پابندی لگانا چاہے ۔ اس سلسلے میں ایک ذاتی گفتگو کا حوالہ دینا شاید بیجا نہ ہوگا ۔ جس زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم زندہ تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایگزیکٹیو کونسل کے جلسوں میں شرکت کے لئے یہاں آتے تھے تو اکثر مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا جب اخباروں میں یہ اطلاع آئی کہ پاکستان میں تعدادِ ازدواج پر پابندی لگائی گئی ہے ۔ اور اب دوسری شادی کرنے کے لئے ایک ٹریبونل سے اجازت لینی پڑے گی جس میں ایک ماہرِ قانون اور ایک عالم ہوگا ۔ تو میں نے مولانا سے کہا کہ آپ ہندوستان میں اس قسم کا قانون کب لائیں گے تو انھوں نے کہا آپ ان قوانین سے متفق ہوں مگر ہندوستان کی سیکولر حکومت کو اس کی اجازت نہیں دے سکتے میں نے بعض دوسرے اسلامی ممالک کا حوالہ دیا جہاں اس سے زیادہ ریڈیکل قوانین بنائے گئے ہیں مگر مولانا نے میری بات سننے سے انکار کر دیا ۔ اور کہا کہ مُسلم حکومتوں کو یہ حق ہے مگر غیر مسلم حکومتوں کو نہیں ۔ میرے نزدیک اگر ایک سیکولر حکومت مُسلمان دانشوروں، مسلم قانون دانوں، وکیلوں، علماء، سنجیدہ اور ذمہ دار اشخاص کے مشورے سے ایسا قانون بنائے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے ۔ قانون کے سلسلے میں ایک نکتہ اور اہمیت رکھتا ہے آج بھی ہندوستان کے بہت سے مسلمان شرع محمدی کی جگہ رواجی قانون پر چلتے ہیں ۔ تعلقہ داروں اور زمینداروں میں یہ میلان عام رہا ہے ظاہر ہے رواجی قانون شرع محمدی کے خلاف پڑتا ہے اور دولت کو چند مخصوص ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہے ۔ بڑے لڑکے کو زیادہ حق دیتا ہے ۔ اور لڑکی کو عام طور پر جائز حق سے بھی محروم رکھتا ہے ہماری عدالتیں اس رواجی قانون پر چلنے کی اجازت دیتی ہیں اور علماء

اس سلسلے میں کوئی احتجاج نہیں کرتے اسی طرح تعدد ازدواج کے سلسلے میں یا طلاق کے سلسلے میں بھی عام مسلمان کو اگر اجازت ہو کہ وہ یا تو شرع محمدی کی پابندی کرے یا ملک کے قانون کی تو ایسی صورت میں بیچ کی ایک راہ ہو سکتی ہے۔

اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہے۔ ماہرین اقتصادیات اب اس بات پر متفق ہیں کہ اگر آبادی کی تعداد یونہی بڑھتی رہی تو غذا کا وہ سرمایہ جو زمین میں حاصل ہوتا ہے ناکافی ہو جائے گا۔ دوسرے صاف ستھری ہوا اور کھلے ہوئے گھروں میں رہنے کا تصور خواب ہو جائے گا۔ اب بھی بڑے شہروں کے گھروں میں بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے آسمان نہیں دیکھا۔ دریا اور سمندر سے ناواقف ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھتا ہے لیکن نچلے طبقے میں چونکہ مالی پریشانی زیادہ ہے۔ اور زندگی کی سختیوں کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے تعلیم کی کمی اور سنجیدہ مشاغل سے محرومی ہوتی ہے۔ اس لئے تفریح صرف جنسی عمل میں ممکن ہے جس کا نتیجہ بچوں کی کثرت ہے۔ اور بقول اکبر

عاشقی قید شریعت میں جو آجاتی ہے۔
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

علما سے توقع یہ تھی کہ وہ وراثت، طلاق، تعداد ازدواج خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق قرآن کی روح سے استفادہ کرکے جدید حالات اور جدید مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرینگے مگر ان معاملات میں علما کوئی اقدام کرنے کو تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان طبقہ جو ان مسائل سے دوچار ہے مذہبی احکام سے غفلت برتتا ہے اور رفتہ رفتہ مذہب سے بیگانگی کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔ اور محض خالی خولی اسلام کا نام لیکر اپنی زندگی غیر مذہبی بنانے کا میلان ترقی کرتا جا رہا ہے۔ مگر ان کا حل کوئی نہیں نکالتا پاکستان میں جب جنرل ایوب خان نے اس سلسلے میں اقدام کئے تو علما نے سختی سے ان کی مخالفت کی اور عوام کے طبقے نے نئی نسل نے ان کا ساتھ دیا۔

چند روشن خیال علما کو چھوڑ کر مجموعی طور پر ہندوستان کے علما تقلیدی رہے ہیں انھوں نے اجتہاد کے مسئلے پر بالکل غور نہیں کیا۔ شبلی جب علیگڈھ کالج اور اس کالج سے مایوس ہوئے تو انھوں

نے ندوۃ العلما میں حریت پسند اور حالات زمانہ سے باخبر علما پیدا کرنے کی سعی کی مگر جیسا کہ [illegible] نے لکھا ہے۔ علما سے شبلی بری طرح پٹے اور ان کا یہ خواب کہ روشن خیال علما پیدا کرینگے پارہ پارہ ہو گیا دیوبند کے علما نے چونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزوں کی غلامی پر احتجاج اور سرسید نے مجموعی طور پر انگریزوں سے تعاون پر زور دیا اسلئے بہت لوگ دیوبند کے علما کو ترقی پسند اور سرسید کو آزادیٔ ہند کا مخالف سمجھنے لگے۔ حالانکہ دیوبند کے علما کا یہ سیاسی رد عمل سیاسی شعور پر مبنی نہیں تھا۔ ایک خاص مذہبی فکر کا نتیجہ تھا جسمیں انگریز اور اس کی ہر چیز سے تعاون مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے میرے نزدیک ہندوستانی سیاست میں جمعیۃ العلما کی قوم پرستی اور سیاست سے ہم آہنگی قابل تعریف ہے مگر اہم اس لئے نہیں کہ موجودہ سیاست کے پیچ و خم کو سمجھے بغیر اور موجودہ ذہن کے طریقۂ فکر اور اس کی زبان کو استعمال کئے بغیر اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو عالمی مسائل پیدا کئے ہیں ان سے پوری طرح آشنا ہوئے بغیر سیاسی رد عمل معنی خیز اور دور رس نہیں ہو سکتا میرے نزدیک تہذیبی تصور میں انقلاب کے بغیر ریاست میں کوئی بھی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ سرسید کے تہذیبی تصور میں دنیوی پہلو کا پورا احساس موجود ہے جو دین میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی معاملات اور اس تہذیبی تصور سے زندگی کے تمام شعبے یہاں تک کہ سیاست میں بھی انقلابی تبدیلیاں ممکن ہیں اس لئے سرسید کے بنیادی تصورات اور ان کے عملی پروگرام میں جو وقتی ضروریات کے مطابق فرق تھا۔ یہ بنیادی تصورات آج بھی ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ البتہ ان کے وقتی پروگرام کو گلدستۂ طاق نسیاں بنانا پڑے گا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ سرسید روشن خیالی کے فرد کے تصورات اور انیسویں صدی کی سائنس سے مرعوب تھے ان کی یہ ذہنی مرعوبیت ہمارے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ یہاں میرے نزدیک ایک منطقی غلطی ہے۔ عالمی سرمایۂ افکار بھی صرف ہمارا نہیں ہے دراصل افکار و علوم میں اس قسم کی دیواریں از منہ قدیم کے ذہن کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جو پھیلاؤ کے بجائے سکڑنے پر، نشر و اشاعت کے بجائے حفاظت، جذب و انجذاب کے بجائے ہر بیرونی اثر کو کاٹ کر پھینک دینے پر زور دیتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت کی ذمہ داری بڑی حد تک اس رکے ہوئے

ذہن نقاب و حجاب کی عادی طبیعت اور علیحدگی پسندی پر ہے جو ہر میل میں مصیبت دیکھتی ہے۔ ہر نئی تحریک کو خطرہ سمجھتی ہے۔ جیسے زندگی بلا دل کا ایک ہجوم نظر آتی ہے۔ جو ہمارے مسلمانوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی ہے

میرے نزدیک سر سید کے بنیادی افکار کی روشنی ابو الکلام آزاد نیاز فتح پوری اور اقبال کے اجتہاد دلچسپی کی معنویت واضح ہوگی۔ — اقبال صرف شاعر تھے انھوں نے تقدیر امم اور عالم اسلام کے مسائل پر جس طرح غور کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جدید دور کے امکانات سے واقف تھے۔ اور وہ روایت کا اس طرح استقبال کرنا چاہتے تھے کہ وہ اجتہاد کے لئے دروازے کھول سکے سر سید کی تفسیر اور اقبال کی الٰہیات کی تشکیل جدید۔ نیاز کی من و یزداں اور ابو الکلام کی سورہ فاتحہ کی تفسیر کو درسیات کی بنیاد بنانا چاہیے۔

کینٹ ویل اسمتھ نے آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے رول کی طرف اپنی کتاب — ISLAM IN MODERN HISTORY میں جو اشارہ کیا ہے وہ نہایت معنی خیز ہے۔ اسلام ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت نہ ہوتے ہوئے ہندوستان میں ایک اہم اخلاقی سماجی رول ادا کر سکتا ہے۔ تو اس سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔ دیکھنا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس ذریعے کی طرف کب متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کے لئے صرف اسلامی خیال اور آزادی تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنا ہی نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں کو سماجی خیر اور رفاہ عام کے لئے ایسے کام بھی شروع کرنے ہوں گے جو صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہ ہوں۔ عیسائیوں اور پارسیوں کے خیراتی اسپتال اور اعلیٰ تعلیم کے ہندوؤں عیسائیوں کے اداروں۔ کے نمونے پر مسلمانوں کو بھی بہت سے ایسے ادارے کھولنے پڑیں گے جو سب کے لئے ہوں۔

ہندوستان میں اسلام کیلئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کے تمام مسائل سے گہرا تعلق رکھے سبھی ہندوستانیوں کے دکھ سکھ میں حصہ لے۔ وہ صرف حقوق کا مطالبہ نہ کرے فرائض پر بھی دھیان رکھے۔ وہ نہ اسلام کے شاندار سرمائے کے کسی قابل قدر حصے کو چھوڑنے پر آمادہ ہو نہ ہندوستان کے شاندار ماضی کے قابل قدر حصے سے علیحدگی پر فخر کرے۔

کبھی کبھی دوسروں کے راستے پر چل کر بھی اپنا راستہ ملتا ہے۔ کعبے کو ایک راستہ ترکستان ہو کر بھی جاتا ہے — ●●

ترقی کے مخالف

سر سید کا کالج جب چل نکلا تو مخالفوں نے آپس میں سازش کر کے کالج کو ناکام بنانا چاہا وہ طلباء کے ان سرپرستوں کو جو علی گڈھ سے باہر رہتے تھے کبھی یہ جھوٹی خبر بھیج کر پریشان کرتے کہ علی گڈھ میں خوب بارش ہوئی ہے جس سے ہوسٹل کی چھت گر گئی ہے۔ اور کئی طالب علم مر گئے ہیں۔ کبھی یہ افواہ اڑاتے کہ کالج کمیٹی کی طرف سے نماز کے دوران میں باتیں کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اور پانچ وقت کی نماز کی جگہ تین وقت کی نماز کر دی گئی ہے اور اذان نہیں دی جاتی بلکہ گھنٹہ بجا کر نماز کے لئے بلایا جاتا ہے اور لڑکے جوتے پہنے نماز پڑھتے ہیں۔ اس جھوٹے پروپیگنڈے سے سر سید کو دکھ ضرور ہوتا مگر وہ سہہ جاتے۔ یہ افواہ بھی اڑائی کہ سر سید نے کالج اپنے رشتے داروں کو نوکری دلانے کے لئے کھولا ہے اور وہ خود کالج سے ایک بھاری تنخواہ وصول کرتے ہیں نواب محسن الملک جس دن دہلی پہنچے اسی دن وہاں سر سید کا لیکچر تھا۔ دہلی کے مولوی نے محسن الملک سے کہا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں لیکچر سننے کے لئے جانا سیدھے جہنم میں جانا ہے لیکچر سننے والوں کی بیویاں حرام ہو جائیں گی کسی نے کہا کہ ہاں تو جاؤ وہاں دکھائی آتا ہے

ظ۔ انصاری

کمیونزم اور ہندستانی مسلمان

اسلام کو دنیا [illegible] اور حل [illegible] کی یکجا نمائش کے لیے [illegible]
[illegible] رشتے اور جدا جدا تشخصات کے اظہار کے لیے تصوّر اور
[illegible] تضاد یا اختلافات کا حل ڈھونڈھنے کے لیے ایک دو نہیں
[illegible] میں۔ اور تین برّاعظموں (ایشیا، افریقہ اور
یورپ [illegible] مشرق و مغرب کے ڈانڈے اس نے ملا دیئے
مگر اپنے سیاسی اور سماجی اقتدار کی جو حدیں طلوعِ اسلام کے اوّل
ڈیڑھ سو برس میں پھیل چکی تھیں، آج بھی وہاں سے آگے نہیں بڑھا ہے بلکہ
سچ پوچھیے تو ملی اعتبار سے کچھ سکڑ اور سمٹ ہی گیا ہے۔ آج ۱۳۵۲ برس بعد
جو لوگ قوموں کے عروج و زوال کی داستان ٹھنڈے دل سے سننے یا
سمجھنے کے بجائے اس افسردگی یا پسپائی کے منظر کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں
نے اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا، بالفاظ دیگر ان کے اعمال خراب
ہو گئے، مسلمان در گور و مسلمانی در کتاب رہ گئی۔ اور اب پھر ضرورت
ہے اسی سادگی، پارسائی اور نظریاتی شدّت، حدت اور پاکیزگی کی طرف
الٹے پاؤں واپس چلنے کی۔ وہ غالباً یہ حقیقت بھول جانے پر راضی
ہیں کہ اسلام سے پہلے کے مذاہب میں تو اور بھی کثرت سے تبدیلیاں
ہو چکی ہیں، بدعتیں "پھیل گئی ہیں"، وہاں تو "اعمال خراب" ہونے کا سلسلہ
قبل اسلام سے چل رہا ہے پھر کیا سبب کہ ان کے "احوال" اتنے
خراب نہیں ہوئے۔ یہ نکتہ فی الحال اسی سوالیہ علامت پر چھوڑ کر ہم کمیونزم
سے رجوع کرتے ہیں۔

کمیونزم کے باضابطہ نظریے کو سامنے آئے اب سو سال ہوتے
ہیں۔ اور عملی طور پر وہ آج بھی ایک آئیڈیل ہے جس کی طرف بڑھنے
کی مختلف کوششیں جاری ہیں۔ انہی کوششوں کا نام کمیونسٹ تحریک ہے
البتہ طبقاتی انقلاب کے بعد اور کمیونزم سے پہلے کا مرحلہ جو سوشلزم یا
اشتراکیت قرار پایا تھا، روس اور چین — دنیا کے دو بڑے ملکوں کا
دعویٰ ہے کہ وہ سوشلزم کے اس مرحلے میں داخل ہو کر کامیابی سے گزر
رہے ہیں یعنی ہر شخص سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جا رہا ہے
اور کام کے مطابق اجرت دی جا رہی ہے۔ تعلیم، روزگار اور طبّی سہولت
فراہم کرنا اسٹیٹ کا فرض ہے اور زبان، نسل، عقیدے کی تفریق کے بغیر
یہ سہولتیں ہر ایک شہری کو میسر ہیں۔

کمیونسٹ تحریک نے جہاں جہاں انتظام حکومت سنبھالا، وہاں یہ
سہولتیں صرف دکھاوے کی نہیں بلکہ دراصل ہر شخص کی زندگی اور حقوق کا
ایک لازمی حصّہ بن چکی ہیں۔ اگر آدمی پیکن سے براہ ریل مشرقی برلن تک
چلا جائے تو اسے عام محنت کش کی زندگی میں قلبی اطمینان اور قناعت
کا احساس قدم قدم پر ہوگا۔ اور ہر ایک پنج سالہ پلان کے ساتھ ساتھ
لوگوں کی روزمرّہ زندگی کا معیار، ڈیل ڈول، چہروں کا رنگ، تعلقات
کا پیمانہ اور مطالعے کا پیمانہ پچھلے پانچ سال کے مقابلے میں بہتر نظر آئیگا۔
مغرب کے غیر کمیونسٹ ملکوں خصوصاً سویڈن اور ریاستہائے
متحدہ امریکہ میں بعض پیشہ وروں کا معیار زندگی (قوت خرید وغیرہ) یقیناً
چین ہی نہیں، روس سے بھی بدرجہا بلند ہے اور اسے بلند تر بنانے کے
لئے حکومتیں بھی کوشاں رہتی ہیں۔ انگلینڈ کی کوئلہ کانوں میں کام کرنے
والا ایک نیم خواندہ مستری یا بینک کا کلرک روس کے اوسط ڈاکٹر اور
انجینئر سے زیادہ تنخواہ پاتا ہے اور زیادہ قوت خرید رکھتا ہے۔ تاہم

زندگی کا وہ بنیادی اطمینان ۔ بنیادی ضروریات کی وہ ضمانت جس کے بغیر ذہن انسانی اپنی پوری کارگزاری نہیں دکھا سکتا جس طرح پیچ در پیچ رسہ کشی سے پاک کمیونسٹوں کی عملداری (REGIME) میں عام آدمی کو میسّر ہے ۔ افراتفری، کھینچ تان، شدید مقابلے، اور بے یقینی پر بسر کرنے والے غیر کمیونسٹ نظام میں نہ میسّر ہے نہ ہو سکتا ہے ۔ کوئی غیر کمیونسٹ ملک جتنا زیادہ صنعتی یا ترقی یافتہ یا دولت مند ہے وہاں صنعتی مسابقت ذاتی ترقی کی دوڑ اور دولت بنانے بٹورنے کے پیچیدہ عمل میں زک دینے اور زک اٹھانے کی فضا لے اتنا ہی زیادہ تناؤ دیا ہے اور عام زندگی میں اس تناؤ کا اثر انفرادی طور پر اعصابی ہیجان اور اعصابی تھکن میں ظاہر ہوتا ہے ۔

یہ نکتہ قابل غور بھی ہے اور تفصیل طلب بھی، تاہم پڑھنے والوں کی ذہانت اور شعور پر بھروسہ کرکے صرف اتنا جتانا کافی ہوگا کہ اعصابی ہیجان اور اعصابی تھکن دونوں کے نتیجے، علامتیں اور آثار اُن رسائل اخبارات، بلو فلمیں، "مار ا ماری سے بھرپور" ناولوں اور ڈرامے، ننگے (اخلاق سوز!) ڈراموں میں سنسنی خیز اور دہشت انگیز کارروائیوں میں انتقامی فلسفوں اور فیشنوں میں ابھر کر آرہے ہیں جنھیں اسلام سمیت کوئی بھی مذہب اپنانے کو تیار نہ ہوگا ۔

کمیونسٹ نظریے اور عمل دونوں کے نزدیک یہ جرم ہے کہ روپے کو مال میں اور مال کو پھر زیادہ روپے میں تبدیل کرکے (جلبِ منفعت) زیادہ مفاد حاصل کیا جائے جبکہ غیر کمیونسٹ سوسائٹی، خوش حالی کی کنجی اسی عمل کو قرار دیتی ہے امعد ہنرمندی، سائنسی قابلیت، ٹکنیکی ترقی اور حوصلہ آزمائی سب اسی سمت کو خود بخود رواں رہتی ہیں کہ آسائشوں کا بنیادی ذریعہ روپیہ (زر) زیادہ سے زیادہ آئے اور وہ کسی درمیانی ذریعے (تجارت، صنعت، بینکنگ، پبلسٹی، اسمگلنگ، جنگ وغیرہ) پر قدم رکھ کر مزید دولت سازی کے میدان میں کود جائیں ۔

اس عمل میں بعض افراد، خاندانوں اور گروہوں کی دولت بڑھتی ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ اپنا ردعمل بھی پیدا کرتی جاتی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ پیداوار کو اونچی (منافع بخش) قیمتوں کی سطح پر روکے رکھنے کے لئے تیار مال کی بربادی یا قوتِ پیداوار پر روک ۔ جو بالآخر عام نوعِ انسانی کے لئے ادبار اور بدنصیبی کا سبب بنتی ہے ۔

دقتوں کے ساتھ آنے والے معاشی سنکٹوں نے اور کرۂ ارض کے یکے بعد دیگرے کئی علاقوں میں خونریز جنگوں کا ایندھن فراہم کرنے کی تدبیروں نے غیر کمیونسٹ نظام کے اس ناسور پر سے پٹی کھول دی ہے سو اب یہ کھلی رہے گی ۔

غرض اس تمہید کی یہ کہ ہمیں اپنے موضوع کے سلسلے میں کمیونزم کی خوبیاں اور خامیاں گنوانے کے لئے فلسفے کی موشگافیوں میں پڑنے، "ازم" کو کریدنے اور پاسترناک یا سولزے نتسین کے ناولوں کو عینک بنانے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس بات کی کہ اپنے یہاں کے خاص تاریخی حالات سماجی بناوٹ اور تقاضوں کو نظر میں رکھ کر یہ جانچیں کہ کمیونسٹوں نے (چاہے وہ نرم ہوں، گرم یا معتدل) اپنے عملداری میں یا اقتدار میں عموماً مذہب اور اہل مذہب کے اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے اور اسکے کیا نتائج سامنے آسکے ہیں ۔

گفتگو ہندوستانی مسلمان کے اُن حالات پر ہونی چاہیئے جو سیکولر، پارلیمنٹری، ڈیموکریسی میں اُسے درپیش ہیں ۔ سیکولرزم کسی بھی مذہبی یا لسانی یا نسلی اقلیت کے لئے ایک مضبوط سفینے کے مانند ہوتا ہے کہ وہ بھی تیر سکے ۔ پارلیمنٹری جمہوریت حقوق کی نمائندگی کا اولین یا آخری ڈھانچہ نہیں ہے، جب تمام جدید پارلیمنٹوں کی مادرِ بزرگوار، انگلینڈ کی پارلیمنٹ پیدا نہ ہوئی تھی، اس وقت بھی مختلف مفادوں، نسلوں اور حلقوں کی نمائندگی کے کچھ طور طریقے رائج تھے اور اب اسکے جواب میں کمیونسٹوں کا نظامِ حکومت ہے جہاں پارلیمنٹ کی بہ نسبت پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) زیادہ طاقتور اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے ۔ مختلف نمائندگیوں کا توازن بھی وہی طے کرتی ہے ۔

ہندوستانی مسلمان عملی طور سے ہندوستانی ہے، رسم و رواج، آدابِ معاشرت، معیشت، زبان، نسل اور عقیدے میں بھی وہ بڑی حد تک (رچا ہے انجانے) ہندوستان کی دوسری تہذیبوں، رنگینیوں، اور حد بندیوں میں شریک ہو چکا ہے ۔ گھل مل جانے کا یہ عمل ملک کے کسی حصے میں گہرا ہے، کہیں اُتھلا ۔ کہیں رنگ پکا ہے، کہیں کچّا ۔ تاہم عمل جاری ہے ۔ اس کے حق میں یا اس کے خلاف کوئی فلسفہ

کوئی نعرہ پوری طرح کارگر یوں نہیں ہو سکتا کہ خود ہندوستانی سماج میں وسعت اور گہرائی دونوں اعتبار سے حد بندیاں یا دیواریں منڈیریں کھڑی ہیں، جو ناہمواری چار سو برس کی مرکزی سلطنتوں کی لگاتار کوششوں سے نہ ٹوٹی، وہ سیاسی پارٹیوں کے وقتی مصلحت والے نعروں سے اور ٹلپا وُں یا دھمکیوں سے نہیں ٹوٹنے والی۔ سماج کی یہ خاردار ناہمواری ہماری اور ہمارے بچوں کی زندگی میں، یوں بھی برقرار رہے گی کہ ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ نظام پچھلی صدیوں کا لبا سر پر اٹھائے اور بوسیدہ کا سٹیوم کی پوٹلی بغل میں دبائے ہوئے دندنا رہا ہے۔ یہاں پیاز اور لہسن تک سے پرہیز کرنے والے جینی بیوپار چمڑے، فرٹی لائزر اور ٹین بند مچھلیاں اکسپورٹ کرتے اور اس کے منافع سے مندر کھڑے کرتے ہیں اور ہریانہ کا سبزی خور جاٹ ملک کی سرحدوں سے باہر تک لڑنے مرنے بھیجا جاتا ہے۔ صبح سویرے گیتا کا پاٹھ کرنے والا اور چیونٹیوں کو شکر کھلانے والا، شانتی پورو کی، "دھکار" مارواڑی یا سندھی بلات سگے مندروں کی مورتیاں اٹھوا کر باہر پھینک دیتا ہے اور ان کی آمدنی سے سندھی زبان کے رسم خط کو ناگری میں تبدیل کرنے کے ٹرسٹ قائم کرتا ہے، نئے شاندار ہوٹل کھول کر کیبرے ڈانس کا اہتمام کرتا ہے اور خود رشیوں کے چرن چھوتا ہے مہاراشٹر میں گجرات کا سرمایہ اور بنگال میں مارواڑی کا سرمایہ دار پھلتا پھولتا ہے۔ یا گرم راجستھان کے بے کیف مزدور کشمیر میں سردی میں ٹھٹھرنے اور ڈیم بنانے جاتے ہیں۔ منافع خوری کے کلاس ستے ہوئے جال میں چھوٹی بڑی مچھلیاں سب ایک وضع کی نہیں اور بھی کئی دھاریاں ہیں "ٹائمز آف انڈیا" یا "انڈین اکسپریس" کے کروڑ پتی اخباری اداروں سے درجنوں پرچے شائع ہونے لگے لیکن، اردو کا ایک بھی اخبار، رسالہ یا کتاب شائع نہ ہو سکا تو اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ اس زبان سے شرح منافع کم رہے گی بلکہ وجہ تہذیبی تنگ نظری بھی ہے جسے بورژوازی (صنعتی سرمایہ دار) کی قوم پرستی میں شامل ایک طرح کی مذہبی عصبیت نے پانی دیا اور ماضی پرستی نے پروان چڑھایا ہے۔ کمیونزم کی تحریک غیر مذہبی ہونے کے ناتے بالکل دوسری انتہا پر کھڑی ہے اور جہاں وہ طاقتور ہوگی ان ناہمواریوں پر براہ راست ضرب پڑے گی۔

حالات کا پہلا البم ہمارے سامنے کھلا ہوا ہے تجربہ اور تجزیہ کر کے دیکھ سکتے ہیں کہ سیکولر اور پارلیمنٹری طرز کی جمہوریت عام سطح پر ایک ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک کی ترقی پسند پالیسی سہی لیکن اس کے پاس ہمارے درد کا درماں نہیں۔ یقیناً اس طرز حکومت کی تعمیر میں اُن پرانے آزادی پسند رہنماؤں اور نوجوان اشتراکیوں کا لہو پسینہ ایک ہوا ہے جو واقعی سیکولر تھے، جی جان سے ملک کے ہر طبقے کا ابھار اور سُدھار چاہتے تھے مگر جیسا کہ پوری انسانی تاریخ کی لوح پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ حالات اور ارادے ہی حالات اور ارادوں کی راہ کاٹ دیتا ہے۔ ہماری قومی تاریخ ہی میں وہ قوتیں بھی کبھی پس منظر میں کبھی منظر عام پر تنظیمی صورت اختیار کرتی رہی ہیں جو (SYNTHETIC) ملی جلی تہذیب کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں جنھیں "تدبھو" لفظ کے مقابلے میں "تت سم" پسند ہے جن کی تمناؤں اور ارادوں میں کسی ایسے منظر کی گنجائش نہیں جو "آلودہ" یا میلا ہو چکا ہو۔

سب سے مقدم بات ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اپنے انفرادی اور اجتماعی وجود کی حفاظت کی خاطر (کمیونزم نہیں بلکہ) یہ ہے کہ وہ ہر ایک صورتحال میں ان قوتوں سے اپنا رشتہ بنائے رکھیں جو ملک کو مادی اور اخلاقی اعتبار سے ان کے نہیں مستقبل کے ہندوستان کی طرف سیکولر ریاست کے صحیح نرمان کی جانب، کھلی اور ملی جلی ہموار معاشی اور تہذیبی زندگی کی سمت لے جانے والی ہیں۔ کام صرف ووٹ دینے سے نہیں چلتا۔ ذہنوں کی ڈھلائی بھی لازم ہے۔ ڈھلائی میں رکاوٹ پڑ گئی ہے کچھ تو معاشی اور انتظامی ڈھانچے میں بے ضابطگی اور بدنیتی سے اور کچھ اس کارن کہ ہندوستانی مسلمان آٹھ سو برس کی اپنی کمائی سے اپنے بہترین ذہنوں اور توانا ترین نوں سے محروم ہو گئے۔ ملک کی تقسیم ہندوستانی مسلمانوں کے زیادہ تر لائق اور ذی فہم فرزند اٹھا کر لے گئی اور ریگستانوں میں بھٹکنے کے لئے انھیں چھوڑ آئی۔

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پورے ملک میں کہیں مشترک ہیں، کہیں علاقائی، اور کہیں ہنگامی۔ بنگال اور آسام میں جہاں ان کی آبادی ۲۵ فیصد سے زیادہ ہے اور کھیتوں میں بکھری ہوئی ہے جو مسائل درپیش ہوں گے عموماً وہی ہوں گے جو غیر مسلم کاشتکار، چھوٹے زمیندار یا کاشتکار کو درپیش ہیں۔ وہاں ہندوستانی مسلمان ایک موثر اقلیت ہے۔ کیرالا میں اسے موثر اقلیت بنانے والا سبب بالکل مختلف

ہے۔ عیسائی آبادی اور مسیحی (ترقی یافتہ) ادارے موثر اقلیت ہونے کے باوجود دونوں مقامات پر مسلمانوں کے مسائل قطعاً یکساں نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ ان کی طبقاتی بناوٹ (اجزائے ترکیبی) یکساں نہیں۔ یوپی دہلی اور بہار میں کبھی وہ ایک ترقی یافتہ متمدن اقلیت تھے۔ اب ان کے "اشراف" پست حالت میں اور ان کے "اجلاف" اچھوتی ذات والے خلاً بنکر) انصان کے کسی نہ کسی مرحلے پر پہونچ چکے ہیں۔ بٹوارے نے ہندستانی مسلم سماج میں بعض اندرونی تبدیلیوں کو راہ دی ہے کاریگر طبقے نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی طرف قدم بڑھایا ہے، جاجمایا با دتارا ور زمینوں، جاگیروں اور اوقاف سے پالبستہ درمیانی طبقہ روٹی کو محتاج ہے۔ روزگار پیشہ کچھ اپنی بے حوصلگی اور اداسی اور کچھ سخت مقابلے کے تقاضوں کے باعث رفتہ رفتہ پیچھا جارہا ہے۔ کاریگر، دستکار اور آبائی پیشوں میں مشغول محنت کش طبقہ درمیانی ڈھائی سو برسوں کا بوسیدہ غلیظ لباس اتار کر نئے حوصلے، ہنر، محنت، اور تنظیمی صلاحیت کے ساتھ اٹھ رہا ہے۔ اگرچہ اسے اپنا گم شدہ رتبہ حاصل کرنے میں دو ایک نسلوں کے گزرنے تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تاہم ہندستانی مسلمانوں کی وہ آبادی جو ہر ایک تحریک میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ حاصل کرتی جارہی ہے، یہی لوگ ہیں۔ اور پیشوں کے اختلاف کے باوجود ان کے مسائل ہندستان گیر اور مشترک ہیں۔

اُن کا اصل مسئلہ نہ مسلم پرسنل لا ہے، نہ جار دعوات کی اونچ نیچ سے وابستہ ہے، نہ مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کسی غیر مسلم کاریگر یا حرفت پیشہ کا ہے، یہ کہ مال اور بازار کے درمیان ڈٹا ہوا زردار طبقہ فیصلہ کن طاقت سے محروم کیا جائے۔ سوشلزم کی دعویدار درمیانی بورژوا طبقے کی موجودہ عملداری کی خاص بیاض میں دو نسخے درج تھے: بڑے بینکوں کا قومیانا اور کوآپریٹو (امداد باہمی) کی طاقتور سوسائٹیوں کو بڑھاوا دینا۔ اس سستے دونوں نسخے آزمائے۔ حاصل ہمیں معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ فیصلہ کن انقلابی قدم اٹھانے والی حکومت جسے محنت کشوں کی تائید حاصل ہو، وہی اس سے آگے جاسکتی ہے کیمونزم کے نظریے کی عمل میں جہاں تک رسائی ہوئی ہے اس نے اتنا کرکے دکھائی ہی دیا ہے۔

[illegible] ہندستانی مسلمان [illegible]

ہندستانی مسلمان ان معنوں میں نسلی گروہ یا لسانی — مذہبی اقلیت نہیں ہیں۔ جن میں یورپ کے یہودی۔ مصر کے قبطی، عراق کے کرد، روسی فیڈریشن کے تاتاری یا امریکہ کے ریڈ انڈین۔ ان میں سے اکثر کے پاس ناموں اور چند رسموں کے علاوہ جداگانہ شناخت کا کوئی لیبل باقی نہیں ہے پھر بھی ایک ناہنجار ذہنیت کئی وجہوں سے جن میں سب سے بڑی وجہ تقسیم ملک کی مانگ اور اس کے نتائج ہیں مسلمانوں کو الگ شناخت کرنے، انھیں اشتعال انگیز مشورے یا ہدایات دینے اور ان سے سوتیلوں کا سا سلوک روا رکھنے پر اصرار کرتی ہے تو اس میں ہمارے ملک کی تاریخ کے اتار چڑھاؤ اور اس کی غرض مندانہ تعلیم کی بھی ضرور رنگی ہوئی ہے۔ کس ملک کی تاریخ میں حملہ آوروں اور فاتحوں کے فرزند مفتوحوں میں گھل مل نہیں گئے۔ ہم رنگ نہیں ہوگئے! یا مفتوحہ علاقوں کی تہذیب کے سرپرست یا علمبردار نہیں بن گئے؟ تیموریوں کی نوبت تو بعد کو آئی۔ چنگیز و ہلاکو کی دو نسل بعد ہی یہ منظر سامنے آچکا تھا اور پھر ہندستانی مسلمان بیشتر انہی مقامی باشندوں کی نسل اور معاشرت کا وارث ہے جن کی ایک شاخ دوسرے ہندستانی مذاہب میں پچھلے ناموں کے ساتھ چلی آرہی ہے۔ وادیٔ کشمیر کے اکثر مسلمان نسلاً کشمیری ہیں۔ پنڈت، یا کھتری۔ گجرات کے بوہرے، خوجے، کاٹھیاواڑ کے میمن، ہلائی اور کچھی، میوات کے میو، ہریانہ اور پنجاب کے رانگڑ راجپوت یوپی کے کنبوہ اور گاڑھے، مدھیہ پردیش کے امام شاہی (امام پنتھی) وغیرہ آج تک پچھلی برادریوں کی کچھ نہ کچھ وراثت سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو عقائد کے علاوہ رسوم میں زندہ ہے۔ پھر ان کو اقلیت کا احساس دلانے، شکست خوردہ یا مظلوم اقلیت کی چبھن اور کراد باقی رکھنے والے اسباب سوائے اس نودولتے سرمایہ دارانہ نظام کے کیا ہیں جو اپنی پیش رَو جاگیرداری کی گندگی تو سمیٹ لایا، اس کی عالی ظرفی سے محروم رہا جو مذاہب کے پردے میں پوشیدہ لوچدار انسانیت اخلاق، باہمی رواداری اور غیر عقائد کا احترام تو نہ اپنا سکا، اس کی تلخی اور علاحدگی پسندی کو ایک کارآمد ہتھیار کے طور پر لے بیٹھا۔ آج بھی اسی سے کام لے رہا ہے۔

کوئی اسٹیٹ محض سیکولرڈ یا کریٹک ہوکر صدیوں کے اس جالے کو نہیں اتار سکتی۔ البتہ وہ خود مذاہب اور اہل مذہب کی تنگ نظری کا

تعصب اور دھاندلی میں یوں غیر جانبدار ہو سکتی ہے کہ غیر جانبداری بھی
مجرمانہ غفلت بن جائے۔ یہ تیزابی اثر ایسا ملک کے تمام سیاسی معاشی
نظاموں میں صرف کمیونسٹوں کو مقدر ہوا ہے جو سماج کے ارتقا میں
پوشیدہ ترقی اور رجعت کی دھاراؤں کو پہچاننے پر قادر ہیں۔ ترقی کے
مادی نظریے کو روحانی ترقی سے متصادم نہیں پاتے اور سماجی تاریخ
کے سائنسی مطالعے نے یہ حقیقت ان کا جزوِ ایمان بنا دی ہے کہ ترقی
کا ہر ایک عنصر ہر ایک مظہر چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں ہو، اور ہر
ایک تدبیر بالآخر ان کی پشت پناہ بننے والی ہے۔

مذہبی نعروں، نسلی برادریوں اور گروہ بندیوں سے ہٹ کر اقلیت
اور اکثریت کے مسئلے کا فیصلہ کرنا ہے ان کے نزدیک اقلیت ایک ہے
دوسروں کی محنت سے منافع بٹورنے والوں کی۔ اور اکثریت
دوسری۔ باہمی محنت سے قدریں (VALUES) تیار کرنے والوں
کی رہی۔ گروہوں اور تہذیبی روایتوں کی شناخت (IDENTITY) تو
پچھلے پچاس سال کا برتاؤ معتبر گواہ ہے کہ یہ شناخت نہ صرف یہ کہ چھینی
یا مٹائی نہیں گئی بلکہ اس کا احترام کیا گیا۔ جن گروہوں کی عددی اقلیت
مرورِ زمانہ سے پامال اور کسی قابلِ ذکر شناخت سے محروم ہو چکی تھی انھیں
وہ تاریخ کے انبار میں سے تلاش کر کے دی گئی۔ جن کے پاس نہ رسم خط
تھا نہ ادب، نہ اشاعتی ادارے انھیں اسناد کی تلاش میں یہ سب
کچھ ملا۔ اور اتنا ملا کہ وہ اسے فخر کے ساتھ جتانے لگے ہیں۔ روسی مشرق
کے بوریات، اویغور اور کرغیز کس حال میں تھے، ہندستانی مسلمان تو
گمان بھی نہیں کر سکتا اس گراوٹ کا، اور اب؟ رنگ کچھ اور ہے۔

ملک کی عام مردم شماری میں بعض حقائق ابھرنے کے بجائے چھپ
جاتے ہیں، مثلاً یہ تو سب کو معلوم ہے کہ مسلمان یک زوجگی MONOGOMY
کو نہیں مانتے۔ مردم شماری کا کوئی خانہ یہ نہیں بتاتا کہ فی ہزار کتنے مسلمان
ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں، مسلمان کی شرح پیدائش
(BIRTH RATE) کے مقابلے میں شرح اموات (DEATH RATE) کتنی
زیادہ اور کیوں ہے؟ (۵) اسی طرح ہندستانی مسلمان کو آل انڈیا
پھیلنے پر کسی پارٹی پروگرام یا تبادلۂ خیال سے پہلے اعداد و شمار کی روشنی
میں یہ جانچنا چاہیے تھا کہ ہندوستان کے آرٹس اور کرافٹس دستکاری
اور پھولنے پھیلنے کی ترقیوں میں ان کا تناسب آبادی کیا ہے۔ مثلاً
پاور لوم کی صنعت، لکڑی کے کام، فرنیچر، ہینڈ لوم، پرنٹنگ، زری گوٹا،
نرمل اور بیدر کی نقاشی، شال، پیپر ماشی، مرادآبادی برتن جیسے پوری
نقشین کام۔ فیروزآبادی صنعت (چوڑی کی صنعت) جوتے کشیدہ کاری
چکن، ریشم، فولاد، چرم، دھات اور عمارت، گل کاری، منبّت کاری
اور پچی کاری میں ان کا کس قدر دخل ہے اور کیوں امتیاز حاصل ہے؟
اور اس امتیاز کے باوجود وہ مادی خوش حالی، سماجی فلاح اور ذہنی
بیداری میں کیوں پچھڑے رہے ہیں۔؟

کیا صرف نام کا مسلمان رہنا، پنج وقتہ نماز پڑھنا، مسلمانوں
کے درمیانی طبقے کی تہذیبی وراثت سے لو لگانا، اُجلا حریص ہونا یا سائنسی
تعلیم سے منہ موڑنا اس کا ذمہ دار رہا ہے؟ یا یہ سماجی ڈھانچہ جس میں
چھوٹا کاریگر اپنے ایک ہزار ہی سے کسی ایک آدھ کو اوپر بھیجتا ہے
اور باقی ۹۹۹ کو پست سے پست تر حالات میں رکھنے اور آخر کار پرولتاریہ
میں یعنی اس بے زر بے اوزار طبقے میں جو بڑے صنعتی کاروبار کے
ہاتھ صرف اپنی محنت بیچ سکے دھکیل دیتا ہے؟ یوں ہے تو کمیونزم
کے سوا کسی کے پاس اس کا توڑ نہیں۔

ہندستانی مسلمانوں کی کوئی بھی تفصیلی مردم شماری یہ بتانے
کو کافی ہوگی کہ وہ طبعاً، عادتاً، وراثتاً چھوٹے بڑے شہروں اور
مرکزوں سے متعلق رہے ہیں اور دیہاتوں میں چند صدیاں پہلے آئے
ہوئے اور مقامی پیشہ ور ہنرمندوں کی پیداوار ہی کے ترجمان
ہیں۔ انہی کی تعداد اور تناسب زیادہ ہے پھر قدیم سے ان میں
ارتکازِ دولت (A EEUMUHO TAON OF WEALTH) نہیں ہوا
ہے۔ مذہبی عقائد کو کسی حد تک اور سماجی رشتوں اور عادتوں کو بڑی
حد تک اس کی ذمہ داری جاتی ہے۔ ارتکازِ دولت نہ ہونے سے ان
میں ایک طرف تو مہاجنی ذہن پرورش نہیں پا سکا، دوسری طرف کسی بڑی
صنعت کاری کا بار نہیں اٹھ سکا۔

تیز رفتار سائنسی انکشافات کے ساتھ ساتھ بینکنگ اور
انڈسٹری کی جدید تنظیم کی لہر چلی اس میں وہ توازن کھو بیٹھے، اور
یوں وہ قومی دھارے سے کٹ جانے کا ایک بڑا سبب پیدا ہوا
حرفت پیشہ سے کثیر تعداد بیٹھے بیٹھے کھانے اور حکومت جتانے

والوں کی تھی یعنی زمیندار، وثیقہ دار، پنشن دار، شہری جائدادوں
کے مالک، اوقاف سے مالکانہ تعلق رکھنے والے۔ اور اُن کے سائے
میں پلنے والے ہنرمند، موسیقار، سازندے، مصور، شاعر،
پیش نماز، مرثیہ خواں، مولوی، واعظ، انجمن ساز وغیرہ۔

تعداد اور سماجی اہمیت کے لحاظ سے ان کے بعد سرکاری
ملازمت پیشہ (فوجیوں سمیت) مسلمانوں کی باری آتی ہے جو پہلی اور
دوسری جنگِ عظیم کے دوران (جب انگریزوں نے ان پر دستِ
شفقت پھیرنا شروع کیا) پورے مسلم انڈیا کا ایک فیصد سے زیادہ
نہیں رہے۔ اُن کی تعداد اور نسبت آبادی سرکاری ملازمتوں کے
دس گنا ہو جانے کے باوجود اس سے آگے نہیں بڑھی۔

مرکزی شہروں کی بڑی تجارت، خصوصاً امپورٹ ایکسپورٹ
میں ہندوستانی مسلمان تب تک حاوی رہا جب تک مال ولایت سے
آتا تھا۔ یہ قانون تجارت ہے کہ قومی آزادی کی اونچی لہر بڑے پیمانے
کی سودیشی صنعت کاری کی راہ ہموار کر دیتی ہے اور جوں ہی یہ راہ
تیار ہوئی امپورٹ کی اہمیت ایکسپورٹ کے سامنے گر گئی۔ بڑی
صنعتیں تو ان کے ہاتھ میں تھیں نہیں، ایکسپورٹ کیا کرتے مینیجنگ
ایجنسیوں کے فتنہ پرور نظام نے جو کنبہ پروری شروع کی۔ اور
دوسری طرف اونچے با اختیار عہدہ دار مسلمان بھی جو پرمٹ اور
لائسنس کی تقسیم میں کام آتے، سرحد پار کرتے گئے۔ دس بارہ سال
کے اندر مسلمانوں کا بڑا تاجر طبقہ بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ سندھ
اور پنجاب سے آئے ہوئے آزمودہ کار اور چابک دست بیوپاریوں
نے اُن کی آڑھتیں یا تو چھین لیں یا بانٹ لیں یا اندر کی گلی میں دھنا
دیں۔

کسی بڑے شہر کے SLUMS یعنی مضافات کی گندی بستیوں
میں گھوم پھر کر دیکھا جا سکتا ہے کہ بیشتر مسلمان وہی ہیں جو زمین،
جائداد، آڑھت، پنشن، وظیفہ یا بڑی سی دکان کھو کر اس حال کو
پہنچے ہیں۔ اور اب ان میں کوئی نو آبادی، یا کوا بسے ٹھو طرز کی
جدید بستی بسانے کا نہ حوصلہ ہے، نہ سکت۔

آبادی کے ایک ایک پرت کے تقاضوں کو الگ الگ اور
ایک ساتھ ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ درمیانی طبقے کی روز بروز کمزوری
اور اداسی کے اسباب کہاں کہاں ہیں۔ مسلم آبادی کے وہ کون سے
سیکشن ہیں جو بیزاری یا FRUSRATION کے شکار ہوئے ہیں اور
یہ بیزاری بات بن بات جھنجھلاہٹ اور اشتعال کی صورت اختیار
کر لیتی ہے۔ نادان دوستوں کے ایجی ٹیشن یا بہلاوے میں آجاتی ہے۔

آج کی سیکولر جمہوری حکومت پالیسی اُن کے حق میں بنا سکتی ہے
لیکن زنجیر کی آخری کڑی تک پہنچتے پہنچتے وہ صدا بصحرا ہو جاتی ہے
کیونکہ اس پالیسی پر عملدرآمد کرنے والوں کی مصلحتیں، بندشیں اور
ذہنی حدیں پالیسی سازوں سے مختلف ہیں۔

پھر پالیسی سازوں کی اپنی مصلحتیں اور مجبوریاں ہیں، انھیں
پارٹی کی مشین چلانے، اُسے حریف پارٹیوں کے مقابل الیکشن میں
آمادہ کرنے اور الیکشن کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر ناانصافیاں ٹال جانے
بدنیتی پی جانے اور برادری وار گٹھ بندھنوں کو تھپکنے کا ناگوار فریضہ
انجام دینا پڑتا ہے۔ جمہوریت پسند پارلیمنٹری نظام کی باگ ڈور
کتنے ہی نیک نیت (خدا ترس) لوگوں کے ہاتھ میں کیوں نہ ہو اس
سے ہندوستانی مسلمانوں کا بھلا نہیں ہونے والا۔ بھلا ہوگا اُس
نظام کے ہاتھوں جو پنجے کے دبے کچلے اور محروم کئے ہوئے
طبقوں کے بل بوتے پر کھڑا ہو۔ کیرالا اور بنگال میں کمیونسٹوں
کو محدود اختیارات والی کم عمر، ناآزمودہ کار حکومت ملی تھی، اس
تھوڑی سی مدت میں جو کچھ انہوں نے کر دکھایا وہاں کے مسلمانوں
کے دل جانتے یا پھر مخالفین کے ایجی ٹیشن ہی اس کا سراغ لگتا ہے۔

جیسے تیسے ترکیبوں اور تدبیروں سے دھرتوں کی اکثریت پر
نظر رکھنے والی جمہوریت کتنی بھی سیکولر کیوں نہ ہو جائے اُسے
خود اپنے وجود کی خاطر اصولوں سے انحراف کرنا پڑتا ہے۔ البتہ
وہ ڈکٹیٹرشپ جسے محنت کشوں کی مکمل جمہوری تائید حاصل ہو کیونکہ وہ
کے نظام فکر و عمل سے مطابقت رکھتی ہے اور وہی اس عدم توازن
کو ووٹ لُبھانے یا گانٹھنے سے بے نیاز ہو کر توازن میں بدل سکتی ہے۔

کیونزم کا نظریہ کتاب کے ورقوں سے اُچک کر جب ۱۹۱۷ء
کے انقلاب روس کی شکل میں نمودار ہوا تو اس سے مشرق کو تمام آزاد
مسلم ریاستوں (ایران، ترکی، افغانستان) کو ہی سب سے زیادہ

تقویت پہونچی اور اسلام کی روح، منشا، تاریخی مشابہت اور جغرافیائی نزدیکی نے مغرب کے سامراجی حلقوں کو سہما دیا کہ جمال الدین افغانی کی انقلابی فکر کی زیرِ زمین لہریں والگا سے ہم آغوش ہو جائیں گی۔ چنانچہ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کی ہر ممکن تدبیر کی جانے لگی۔ ہندستانی مسلمانوں اور علما کی اہمیت یوں بھی بڑھ گئی کہ بنگال سے لے کر افغانستان تک شیر شاہ والی سڑک کے علاوہ ایک دخنیہ سرنگ ۔ ایسی بن چکی تھی جس میں بنگال، بہار، خصوصاً پنجاب کے ہجرتی مولوی اور انقلابی نوجوان خاموشی سے گزر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے نثر میں، عزیز لکھنوی اور حسرت موہانی نے نظم میں انقلاب کو لبیک کہا۔ ہندستانی مسلمان کے لہو میں کرنٹ دوڑ گیا۔

اس کا توڑ یہی تھا کہ ہندستانی مسلمان کی دکھتی رگ، دینیت کو چھیڑا جائے، چنانچہ بالشویکوں کی غارتگری اور بے دینی کے سچے جھوٹے افسانے نہایت منظم طریقے سے پھیلائے جانے لگے۔

یہ سچ ہے کہ سائنسی دریافتوں اور تجربوں پر مبنی مارکس اینگلس کے فلسفیانہ خیالات کا تعلق دہریت کے مکتبِ فکر سے ہے، یہ بھی درست ہے کہ مذہبی عقائد خصوصاً منظم مذہبی نظام (کلیسائی) اور مارکسی عقائد میں غیب اور شہود کا رشتہ ہے وہاں کچھ بنیادی اسکان مان کر چلنا ہوتا ہے۔ یہاں ہر ایک بے ثبوت عقیدہ سوال اور انکار کی زد پر رہتا ہے۔ اس حقیقت کو بھی لفظوں میں نہ الجھانا چاہیے کہ فکر اور وجدان، گیان اور دھیان دونوں قوتوں کو تسلیم کر لینے کے باوجود مارکسی فلسفہ اسلامی (مابعد الطبیعاتی) عقیدوں میں سے کسی فقہی یا تاویلی بیان کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہاں نہ کوئی پیغمبر ہے، نہ کتابِ مقدس نہ حشر و نشر۔ تاہم اگر منشا کے اعتبار سے غور کیجئے تو تاریخی ارتقا کے جس مرحلے پر اسلام نمودار ہوا، اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی بہبود کی عملی تدبیریں سجھائیں۔ اس مرحلے سے کئی صدی گزر نے کے بعد آج جبکہ پیداواری قوتیں، سامراج، عالمی منڈی یہاں تک کہ مالیاتی اجارہ داری کا اقتصادی نظام حلقہ در حلقہ انسان کو جکڑ رہے ہوئے ہے۔ کمیونزم اسی سمت میں اشارہ کرتا ہے علمی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے، بلکہ کئی غیر ملکی علما نے لکھا بھی کہ کمیونزم (بالشوزم) اور اسلام دونوں کا مزاج ایک ہے۔

افراد کے وہ عقائد جو سماج کے تانے بانے سے براہِ راست نہ ٹکرائیں، کمیونسٹوں کے نظام میں جی سکتے ہیں، بلکہ اب تو خوش حال جی بھی رہے ہیں، مگر وہ عقائد جو عملی، اجتماعی اور سماجی حیثیت اختیار کر کے طبقاتی انقلاب کی راہ میں سائنسی فکر کے فروغ میں اشتراکیت کی ترقی اور اجتماعیت (COLLECTIVISM) کے فلسفے کی کارگزاری میں رکاوٹ بنیں۔ ہموار، بے استحصال سماج کی تشکیل میں حائل ہوں۔ وہ عقائد کمیونسٹ عملداری میں پنپ نہیں سکتے۔ مذہب افراد کے سینوں میں اور عبادت گاہوں میں رہے تو رہے، سڑکوں اور سرکاری اداروں میں نہیں ٹھہرتا۔

مگر سوال صرف ہندستان کا نہیں، دنیا کے کس حصے میں مسلمان اپنا سیاسی سماجی نظام منوا کر روبہ عمل لا کر جی رہے ہیں؟ اور کیا سائنس کی پیش قدمی سے قدامت پسندانہ مسلم عقائد پسپا نہیں ہو رہے ہیں؟ کہاں نہیں ہو رہے ہیں؟ بھاپ کی دریافت کے بعد سے آج تک مسلمانوں نے سائنس سے بے رخی کیوں برتی؟ پچھلے بیس[1] سال کے اندر کمیونزم کے فلسفے کی تعبیریں اور تاویلیں بھی کچھ جدا ہیں اور عملی تعبیر دینے والوں کی سوجھ بوجھ کے ساتھ اپنے یہاں ... اور باہر کے مسلمانوں سے ان کا برتاؤ بھی اور سوچنے کی بات ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے پاس ... پرستی، ... گزاری کے ... دھرا کیا ہے جو کمیونزم ان سے چھین لے گا ... لئے تو ساری دنیا پڑی ہے۔ وہ علم، وہ ہنر، وہ سارے حقوق جو مہذب دنیا مستقبل کی نسلوں کے لئے فراہم کر رہی ہے۔ ▲

---

[1] اقبال نے افسوس کیا ہے کہ تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند

یہ اشارہ ہے مجدد الف ثانی سرہندی کی تحریک کی طرف جنھوں نے عہدِ جہانگیری میں ہندو اور اسلام کی بدعتوں کے خلاف علم بلند کیا تھا اور شہنشاہِ وقت کو چیلنج کیا تھا کہ وہ اپنے مشرکانہ آداب اور عادات تبدیل کرے۔ افغانستان کے بعض قبائل نے اسی تحریک کی قیادت میں بغاوت کر دی تھی۔ یہ اقبال کا خیال ہے کہ مجدد الف ثانی کے بعد سے پھر کسی ساقی نے ہند کے

پھیلانے میں تجدید یا اجتہاد کی صلاحیت عام نہیں لگائی۔ اور پہلی تین صدیاں ایک ہی ڈھرے پر جمود کی حالت میں گزر گئیں۔ ہنوز کیا جائے تو جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ اور سر سید احمد خاں کی تحریکیں اس لحاظ سے عالمِ اسلام میں جدت اور بیداری کی لہر دوڑا گئیں۔ البتہ مسلمانوں نے پچھلے چھ سو سال سے دنیا کی تہذیب میں، علوم میں، ذہنی یا سماجی ارتقا میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں کیا۔ اسی لئے ہم نے شروع کی آٹھ صدیوں کا ذکر کیا ہے (ظا)

۲؎ کارل مارکس نے کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو (اعلان نامہ یا منشور) ۱۸۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ جب تک مارکس کی گہری نظر فلسفہ پر تو تھی، معاشیات پر نہیں تھی۔ فلسفہ، سائنس، تاریخ، معاشیات اور سیاسیات پر یکساں وسیع اور تفصیلی مطالعے کی نوبت بعد کو آئی جس کا حاصل اُس کی اور فریڈرک اینگلس کی مشترکہ محنت کا نتیجہ داس کیپٹل DAS CAPITAL (کتابِ سرمایہ) کی صورت میں ۲۰ سال بعد مکمل ہوا۔ تب تک کمیونزم ایک لفظ، ایک اصطلاح اور ایک آرزو تھا۔ باقاعدہ سائنسی نظریہ نہ تھا۔

۳؎ راقم الحروف نے اگر ایک بھی کتاب، رسالے، یا اخبار کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو صرف کھلی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ سڑک صاف کرنے والے میونسپل ملازم جن کی کلائی پر ۱۹۵۶ء میں گھڑی تک نظر نہ آتی تھی آج اپنے گھروں میں بڑے سائز کے ٹیلی ویژن سیٹ لگاتے ہیں اور عالمی خبروں پر تبصرے اور تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ حال کے ہی اعداد و شمار نے ڈیل ڈول، قد و قامت اور کتابوں کی نوعیت اور فروخت کا ترقی حساب لگا کر اوپر کے بیان کی تصدیق کر دی ہے (ظا)

۴؎ ادھر چند برسوں سے یہ ہوا چلی ہے کہ کمیونزم کی ساری برکتوں کا توڑ "اُن "مظالم" کو قرار دیا جاتا ہے جو گھر کے بھیدی روس کے ان قابلِ ذکر مصنفوں نے اپنے ناولوں میں بیان کئے ہیں اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ دانشوروں پر، اہلِ قلم، اہلِ علم پر اپنے طور سے سوچنے یا کہنے والوں پر یا دشمن کی سازش کے شکار ہو جانے والوں پر مختلف جیلوں حوالوں سے بڑا امن زندگی کے تمام ادوار سے چند مظالم ڈھائے جاتے رہے اور ہزاروں ہزار زندہ یا تے

اذیت ناک قید و بند کی حالت میں گل سڑ گئیں۔ اگر زیبِ داستاں کی خاطر کچھ مبالغہ بھی ہوا ہو تب بھی ان افسانوں کی چلمن سے بھیانک حقیقت کا روپ دکھائی دے جاتا ہے۔ لیکن کسی بنیادی اکھاڑ پچھاڑ کے دور میں، طبقاتی انقلاب کے نتیجے میں ایسے گنے چنے افراد کا (جو ہر ایک سماج میں مظلوم اقلیت ہوتے ہیں) کچلا جانا غیر قدرتی اسباب کے باوجود ایک حد تک قدرتی ہے وہ شخص جو مسلمانوں کی عالمی تاریخ سے باخبر ہواسے تو حق نہیں اٹھتا ان واقعات پر انگلی اٹھانے کا۔! (ظا)

۵؎ جیسے سنہ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی روداد اٹھا کر دیکھئے۔ قتل اور زخمی ہونے والوں سے قطع نظر وہ نفسیاتی ڈنک اہم ہے جو بالخصوص اقلیت کو اپنے معاشی اور سماجی وجود میں محسوس ہوتا ہوگا جس کے کارن حوصلہ پست، مایوسی عام اور دل جل کر رہنے کی اُمنگ ٹوٹتی رہے۔ یہ فسادات، جو دراصل POGRAMS (کسی فرقے کو گھیر کر مارنے) کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ صرف کشت و خون پر تمام نہیں ہو جاتے، بلکہ اکثریت میں ناگواری، اقلیت میں بیزاری اور کسی حد تک بے روزگاری اور SYNICISM کو بڑھاوا دیتے ہیں جو ہمارا سماج کی قیمتوں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر رہتے ہیں (ظا)

۶؎۔ ڈھائی سو برس سے مراد یہ کہ اٹھارویں صدی بے معنی اور بے سمت خانہ جنگیوں میں بسر ہوئی۔ اہم علاقے اور ان میں پنپتی ہوئی حرفتیں تاراج ہو گئیں۔ کاری گر بے خانماں ہوئے۔ سڑکیں غیر محفوظ اور تجارت کے فروغ کے لئے مخدوش ہوتی چلی گئیں۔ ۱۹ ویں صدی شروع ہوتے ہوتے ایسٹ انڈیا کمپنی کی صنعتی اور تجارتی لوٹ کو سیاسی اقتدار کی پشت پناہی نصیب ہو گئی اور ملکہ معظمہ کی حکومت ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ملک برابر کچے مال کی کھیتی اور تیار مال کی منڈی بنا رہا (ظا)

شرحِ پیدائش اور شرحِ اموات دونوں میں بے جوڑ اضافے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی یکے بعد دیگرے جسمانی اور ذہنی صلاحیت گرتی جا رہی ہے۔ اگر یہ کہ بایولوجی کے قانون کے بیان مطابق ہے (ظا)

شکریہ کامریڈ ثنائی ...

دشمنِ دنیا

مسلمان نے عقبیٰ کو دنیا پر اس طرح مسلط کر رکھا ہے کہ اس دنیا کو قابلِ اعتنا ہی تصور نہیں کرتے۔ مسلمان رہتے دنیا میں ہیں اور اس سے بیر رکھتے ہیں، ان کے گوشت و پوست کی ضروریات مادّی ہیں، خود انشراح اور تقویت کا انحصار جسم کی صحت پر ہے دُنیا مزرعۂ آخرت ہے اسی لئے دنیا میں صحت اور دیانت کی زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ معاش اور معاد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر ہمارے علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین کائنات کے قوانین پر تو غور نہیں کرتے جن سے ان کی دنیا درست ہو اور نتیجتاً عقبیٰ میں بھی فلاح حاصل ہو۔

یہ زمانہ خارجی حقائق کی حکمرانی اور عملی تجربے اور مشاہدات کائنات کا ہے، صنعت و حرفت کا ہے۔ محنت و اجتہاد اور ایجادات کا ہے، از کار رفتہ الہیات رد کردہ منطق اور فرسودہ فلسفہ کا نہیں جب تک مسلمان جدید تعلیم حاصل نہ کریں گے، اور اپنے بہت سے فضول اعمال اور خیالات کو ترک کر کے اپنا وقت توانائی اور روپیہ جدید تعلیم کے حصول میں صرف نہ کریں گے اس وقت تک ان کا ذلت اور پستی سے نکلنا دشوار رہے، مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کا مسئلہ تعلیمی مسئلہ ہے۔ اگر ان کی تعلیم صحیح اُصولوں پر ہو جائے تو باقی خود بخود حل ہو جائیں گے۔

(بابائے اردو)

گوپال متل

کمیونسٹ پارٹی اور ہندستانی مسلمان

بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کی وہ سیاسی پارٹیاں جن کا رجحان یمینیت کی طرف ہے، اقلیتوں سے عناد خصوصی رکھتی ہیں اور یساری پارٹیاں ان کی ہمدرد اور اُن کے حقوق کی محافظ ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ اس نظریئے کی تائید میں کچھ ثبوت پیش نہ کئے جا سکیں۔ تقسیم ملک کے بعد جو ہنگامہ غارت گری برپا ہوا اس میں پیش پیش یمینی گروپ ہی تھے۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے نواکھالی کے فسادات کے جواب میں رانچی میں مسلمانوں کے قتل عام کی جو اسکیم بنی اس میں کچھ یساری رہنما بھی شریک تھے۔ اب بھی اقلیتوں کو معمولی سے معمولی رعایت دینے کا بھی سوال اٹھے تو بعض یمینی گروپ اس پر بوکھلا اٹھتے ہیں۔ مثلاً یوپی میں انتخابات سے قبل اردو والوں کو جو معمولی سی رعایات دی گئیں وہ اگرچہ اردو والوں کے کم سے کم مطالبات سے بھی کم تھیں لیکن جن سنگھ نے ان رعایات کی بھی مخالفت کی۔ اور برسر اقتدار پارٹی پر مسلم فرقہ پرستی کو فروغ دینے کا الزام لگایا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب دلّی میں جن سنگھ کی حکومت تھی تو اپنے زمانۂ اقتدار میں اس پارٹی نے اگرچہ مسلمانوں اور اردو زبان بولنے والوں کو کوئی نئی سہولت نہیں دی لیکن ایسی کسی سہولت کو واپس بھی نہیں لیا جو ان کی پیش رو کانگریسی حکومت دے چکی تھی۔ اسی طرح کانگریس نے بھی یہاں دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد مسلمانوں یا اردو والوں کو تاحال کوئی نئی سہولت بہم نہیں پہنچائی۔ ویسے بھی جہاں تک اقلیتی مسائل کا تعلق ہے مرحوم ڈاکٹر رام منوہر لوہیا (سوشلسٹ)، سیٹھ گووند داس اور مرحوم ڈاکٹر سمپورنانند (کانگریس) اور شری اٹل بہاری باجپئی (جن سنگھ) کے موقف میں سرِمو فرق نہیں۔ پھر سوتنتر پارٹی بھی ہے جسے یمینیت کا الزام قبول کرنے سے خود بھی انکار نہیں۔ اس پارٹی نے اُس وقت تک اقلیتی حقوق کی حمایت

نہ کی ہے۔ یہ واحد پارٹی ہے جس نے یوپی میں اُردو کو ثانوی سرکاری زبان بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کی بنا پر یمینیوں اور یساریوں کے درمیان خطِ امتیاز کچھ زیادہ واضح نہیں رہتا۔ مسلم فرقہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے سوال پر خاصا برافروختہ ہے۔ جہاں سبھی یساری پارٹیوں نے مسلم پرسنل لا میں مداخلت کو قابلِ جواز ٹھہرایا ہے وہاں گرو گولوالکر نے اس قسم کی مداخلت کی مخالفت کی تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جن سنگھ کا نعرہ ہے۔ ہندی، ہندو، ہندوستان۔ لیکن مرحوم گولوالکر نے پنجاب کے ہندوؤں کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ پنجابی زبان کو اپنی زبان تسلیم کریں۔ اُردو کے معاملے میں تو یمینیوں اور یساریوں کے درمیان خطِ امتیاز خاص طور پر غیر واضح ہے۔ جن سنگھ والے کہتے ہیں کہ اگر اُردو والے اپنی زبان کے رسم الخط کو چھوڑ کر دیوناگری لپی اختیار کر لیں تو انھیں اُردو کے خلاف کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ بعینہٖ یہی مشورہ کچھ ترقی پسند ادیب بھی دے رہے ہیں جن کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی ڈھکی چھپی نہیں۔ ایک وقت اس معاملے میں بمبئی کا ترقی پسند گروپ متفق الرائے تھا لیکن جب اردو والوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا ہوا تو اس گروپ کے بہت سے ممبر ہمت ہار بیٹھے۔ بہرحال یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ لکھنؤ میں ان لوگوں نے ہندی کے ادیبوں کے ساتھ جس معاہدے پر دستخط کئے تھے اُن میں اُنھوں نے اردو کو ایک ضمنی اور ذیلی زبان مان لیا تھا۔ اس معاہدے کے خلاف مخالفانہ مظاہرے بھی ہوئے۔ خواجہ احمد عباس کا کہنا تھا کہ مظاہرین مسلم لیگی تھے لیکن یہ اُنھوں نے نہیں بتایا کہ مظاہرین کے سیاسی عقائد کا فیصلہ انھوں نے کس کشف کی بنا پر کر لیا کیونکہ مسلم لیگ تو ان دنوں یوپی میں تھی ہی نہیں۔ اگر کمیونسٹوں کے کچھ اور ذیلی اداروں کی کارگزاریوں پر نظر ڈالی جائے تو بھی یہی معلوم ہوگا کہ ان کے

موقف میں اور اُن لوگوں کے موقف میں جنھیں فرقہ پرست کہا جاتا ہے جو فرق ہے وہ بنیادی نہیں بلکہ ضمنی ہے۔ مثال کے طور پر سیکولر ڈیموکریسی کے محاذ کو لیجئے۔ اس محاذ پر کام کرنے والے جن کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی شک و شبہ سے بالا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو جو مشورہ دیتے ہیں اگر ان کا موازنہ اُن مشوروں سے کیا جائے جو اُنھیں ہندو فرقہ پرست دیتے رہتے ہیں تو صرف اتنا فرق نظر آئے گا کہ جہاں ہندو فرقہ پرست مسلمانوں کو ہندوانا چاہتے ہیں وہاں سیکولر ڈیموکریسی کے حامی انھیں ہندیانے پر اکتفا کریں گے۔ اس فرق کو ضمنی قرار دینے سے جو حضرات اختلاف کریں اُن کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہندیانے کا مطلب بالفعل یہ ہوگا کہ مسلم اقلیت اکثریتی فرقے کے آداب و رسوم کو اپنالے۔ یہ کوئی وہم یا گمان نہیں۔ آخر برسرِ اقتدار پارٹی بھی تو سیکولر نظام کی حامی ہے لیکن سرکاری تقاریب بالخصوص افتتاحی تقاریب کو دیکھنے کا جن لوگوں کو موقع ملا ہے اُن سے یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ اِن تقریبوں پر ہندو رسم و رواج کی گہری اور واضح چھاپ ہوتی ہے تو پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ ع

ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ

دراصل بات یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں برسرِ اقتدار آنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتی ہیں۔ جب یہ محروم اقتدار ہوتی ہیں تو ان کے پیش نظر دو مقاصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ جس طبقے یا فرقے کی انھیں ٹھوس تائید حاصل ہے اُسے مطمئن رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ جن طبقوں یا فرقوں میں انھیں کچھ خاص تائید حاصل نہیں اُنھیں فریب توقعات میں مبتلا کرکے اگر اُن کی تائید نہ بھی حاصل کی جا سکے تو کم از کم اُن کی مخالفت میں کمی لائی جائے ۔۔

فریب توقعات میں مبتلا کرنے کے لئے اِن فرقوں یا طبقوں سے جو وعدے کئے جاتے ہیں، اقتدار میں آنے کے بعد اُنھیں یا تو بھلا دیا جاتا ہے یا وہ فنی تاویل کی نذر ہو جاتے ہیں۔ کسی پارٹی کے حقیقی عزائم کا فیصلہ اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ برسرِ اقتدار آ جائے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی برسرِ اقتدار نہیں اور اسے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اپنے طور پر برسرِ اقتدار نہیں آ سکتی۔ اسے احساس ہے کہ اقتدار تک رسائی اسے حکمراں پارٹی میں نفوذ کرکے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ نفوذ کی حکمت عملی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو بات عام کانگریسی دبے دبے لہجے میں کہتے ہیں اسے کانگریس میں نفوذ حاصل کرنے والے کمیونسٹ زوردار لہجے میں کہیں ۔۔۔۔

سیکولرازم کی حمایت اور اقلیتی مفادات کے تحفظ کی بلند آہنگ باتیں اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں لیکن زیرک سیاسیئن کی طرح کمیونسٹ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اقلیتوں کی تائید پاسنگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور برسرِ اقتدار آنے کے لئے اکثریتی طبقے کی حمایت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ اُن کے رویئے میں دورُخا پن یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ اگر یہ پارٹی برسرِ اقتدار آجائے تو مسلم اقلیت کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہوگا۔ جیسا کہ سطور بالا میں کہا جا چکا ہے اُس وقت تک اقلیتوں کے بارے میں ہندوستان کے کمیونسٹوں کی پالیسی گو مگو کی پالیسی ہے لیکن ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کوئی ایسی پارٹی نہیں جس کی حیثیت صرف ملکی ہو۔ یہ ایک بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کی شاخ ہے۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے جن ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیاں برسرِ اقتدار آئی ہیں وہاں کی مسلم، مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے؟ وہاں اُنھوں نے مسلم اقلیتوں کو اکثریتی طبقے کا ہم رتبہ سمجھا ہے یا اس کے مقابلے میں حقیر اور فروتر؟ روس اہم ترین کمیونسٹ ملک ہے اس لئے سب سے پہلے ہم اسی ملک کی اقلیتی پالیسی پر نظر ڈالیں گے۔

زار کے زمانے میں روسی مسلم خطوں کے مقابلے میں اپنی برتری کا اعلان "بڑے بھائی" کی اصطلاح میں کیا کرتے تھے۔ ترکستان میں روس کے آخری گورنر جنرل کروپاٹکن نے ایک مقامی وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "روس میں جو متعدد قومیں آباد ہیں وہ ایک ہی ماں یعنی عظیم روس اور ایک ہی باپ یعنی عظیم شہنشاہ کی اولاد ہیں لیکن اس بڑے خاندان میں روسی، باقیوں کے بڑے بھائی ہیں۔"

مسلم خطوں کے باشندوں کو روسی اب بھی یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ مساوات کے تمام دعووں کے باوجود عملاً انھیں خود سے کمتر ہی سمجھتے ہیں اور ادیان خطوں کے کمیونسٹ اس معاملے میں روسیوں کی ہمنوائی پر مجبور ہیں جو روسیوں کا ذکر بھائی کی حیثیت سے نہیں "بڑے بھائی" کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے دورے پر آنے والے ایک روسی وفد کا لیڈر مادام یادگار ناصری ڈینو وا نے بھی اشالتی حد گذر جانے کے بہت دن بعد یعنی ۱۹۵۹ء میں ازبک قوم کے "بڑے بھائی" کے تئیں احترام و محبت اور

مخلصانہ وفاداری کا عہد لیا تھا (پراودا وستوکا۔ ۲ نومبر ۱۹۵۹ء)

یاد رہے کہ اپنے نوآبادیاتی دور میں ہالینڈ والے بھی اپنے آپ کو انڈونیشیا والوں کا بڑا بھائی کہتے تھے اور جب جاپان سامراجیت کی راہ پر گامزن ہوا تو اس نے بھی اپنے لئے ایشیائی قوموں کے بڑے بھائی کا لقب ہی اختیار کیا تھا۔

روسیوں نے ایسے جملہ انتظامات کر رکھے ہیں کہ ان کے بڑے بھائی کا منصب برقرار رہے۔ فوج میں مقامی باشندوں کی بھرتی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ داخلی اور خارجی دفاع کے لئے جو فوجیں ہیں وہ زیادہ تر روسیوں اور غیر ایشیائی نوآبادکاروں پر مشتمل ہیں۔ یہ نوآبادکار یا تو روسی ہیں یا یوکرینی۔ غیر ایشیائی نوآبادکاروں کی تعداد ۲۰۰,۰۰۰ تھی لیکن ۱۹۵۹ء میں یہ ۷,۵۰۰,۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۴ء میں جو اعداد و شمار شائع کئے گئے تھے ان کے مطابق وسطی ایشیا کی پانچ ری پبلکوں کی آبادی میں جنوری ۱۹۵۹ء اور جنوری ۱۹۶۴ء کے درمیان ۲۰ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں روس کی پوری آبادی میں کل ۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ وسطی ایشیا کی ری پبلکوں کی آبادی میں غیر معمولی اضافے کا سبب یہی تھا کہ وہاں غیر ایشیائی نوآبادکاروں کی یلغار بڑھ گئی۔

رہن سہن اور معاش کے معاملے میں بھی مقامی مسلمان باشندوں کا معیار روسی نوآبادکاروں کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ ۱۹۵۸ء میں پاکستان کے علماء کا ایک وفد روس گیا تھا۔ اس وفد کے ایک رکن مولانا راغب احسن کا بیان ہے کہ تاشقند کے تمام نئے اور اچھے علاقوں پر روسی قابض ہیں اور مسلمان عموماً گندی بستیوں اور مٹی کی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔

ان خطوں میں ترقی ہوئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ترقی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس ترقی سے فائدہ کسے پہنچ رہا ہے۔ مثال کے طور پر تعلیمی ترقی کو لیجئے۔ یہ ترقی ضرور ہوئی ہے لیکن اس سے فیضیاب ہونے والوں میں مقامی باشندوں سے زیادہ بیرونی لوگ ہیں۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے تعلیمی سال میں قازقستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب یہ تھا: روسی طلباء ۴۰،۴۳۹، قازق طلبا ۳۱۲۵۱۔ یہ بات قدرتی بھی ہے کیونکہ ذریعۂ تعلیم وہاں روسی ہے۔

انتظامی عہدوں میں بھی مقامی باشندوں کا تناسب عدم مساوات کی غمازی کرتا ہے ۱۹۴۸ء میں دودھ اور گوشت کے کاروبار میں قازقوں کے پاس انتظامی عہدے صرف ۳۶ فیصد تھے اور کپڑے کی صنعت اور ہلکی صنعتوں میں بالترتیب ۱۱،۶ اور ۲۰ فیصد نسبتاً تازہ اعداد و شمار بھی کچھ بہتر تصویر پیش نہیں کرتے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء کے قازقستانسکایا پراودا" کی اطلاع کے مطابق اس سال قازقستانی صنعتوں میں جو ماہرین ملازم تھے ان میں قازق صرف ایک تھا اور ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۹ء کے "پراودا وستوکا" کے مطابق ازبکستان کی ہلکی صنعتوں میں جو کارکن تھے ان میں ازبکوں کی تعداد صرف ۱۴ فی صد تھی۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جب انقلاب کے بعد مسلم خطوں کو از سر نو زیر کرنے کا مسئلہ درپیش تھا تو اس معاملے میں روسی کمیونسٹوں کے سرگرم ترین حامی روس کے ان طبقوں کے افراد تھے جو از روئے عقیدہ کمیونزم کے جانی دشمن تھے۔ یہ بات لینن کے معاون خصوصی سافاروو کو بھی تسلیم ہے جسے ۱۹۱۹ء میں تاشقند کی حکومت کو زیر کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ اپنی کتاب Kolonial naya Revolyutsiya میں جو ماسکو سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی وہ رقمطراز ہے:

"اس وقت جب ترکستان کی سوویت مسلمانوں کو ایک متحارب قوت سمجھ کر ان کی مخالفت کر رہی تھی تو اسے یورپی قوموں میں ایسے اتحادی میسر آ گئے جن کے بارے میں یہ قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کمیونزم کا ساتھ دیں گے۔ یہ لوگ آرمینیا کے بورژوا طبقے کے لوگ، دولت مند روسی کسان۔ زارشاہی کے افسر حتیٰ کہ روسی پادری تک۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے سماج کے یہ لوگ قدرتی طور پر کمیونزم کے سرخ جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ سابق زاری نوآبادکاری کے جھنڈے تلے متحد تھے۔ لیساری کمیونزم دراصل ان کے لئے روسی سرخ محافظوں، آبادکاروں اور افسروں کی طرف سے مقامی باشندوں کی لوٹ کھسوٹ جاری رکھنے کے مترادف تھا۔"

مذہبی اور ثقافتی امور کے بارے میں بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ کمیونسٹ مسلمانوں کو ظلمت کشی سے ہٹا کر ترقی پسندی اور روشن خیالی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بھی ایک واہمہ ہے۔ کمیونسٹ اُن کے مذہب اور ان کی تہذیب کو مکمل طور پر فنا کر کے انھیں اکثریتی معاشرے میں مدغم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں کوئی مسلمان تبھی قابل اعتبار ٹھہرتا ہے اگر وہ خدا پر ایمان سے مکمل طور پر دستبردار ہو جائے۔ اپنے تہذیبی ورثے سے مکمل بے تعلقی اختیار کر کے اور اپنے اسلامی نام سے بھی دستبردار ہو جائے۔ مثال کے طور پر سوویت جریدے "سائنس اور مذہب" کے ۱۹۶۴ء کے دسویں شمارے میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ "بہت سے مولوی تو یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ اسلام کے جو چالیس احکام ہیں ان میں اب اکتالیسویں حکم کا بھی اضافہ ہونا چاہئے۔ مولویوں کے

رویے میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ جبر ماحول کا نتیجہ ہے۔ مضمون نگار کے خیال میں سماجی ترقی اور قومی روابط کے بارے میں مسلمان مولوی جو بھی باتیں کہتے ہیں وہ اسلام کا جز نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کی ضد ہیں — مسلمان جو کچھ بھی کہتے ہیں اس لہجے میں کہتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کا فیصلہ خدا ہی کرتا ہے اس طرح وہ مارکسزم لینن ازم سے عوام کے ذہنوں کو دور لے جاتے ہیں — وہ لوگوں کے ذہنوں میں ماورائی طاقتوں پر بھروسہ کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں اور اس طرح سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ مضمون نگار کو یہ بھی شکایت ہے کہ مسلمان مولوی مسلمانوں کو بار بار یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ ان کے ہر فرد کو اپنے بچوں کے نام اسلامی رکھنا چاہئیں۔"

دوسرے کمیونسٹ ملکوں کا رویہ بھی سوویت روس سے مختلف نہیں ستمبر ۱۹۷۲ء میں لیبیا کے مفتی اعظم شیخ طاہر احمد الزاوی نے حکومت بلغاریہ کے بارے میں بیان دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف مخدوبانہ کارروائیاں کر رہا ہے۔ تنخواہوں کی عدم ادائیگی کی دھمکی دیکر وہ انہیں مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے اسلامی نام بدلیں اور بلغاروی قوم میں جذب ہونے کے لئے اسلام کو خیر باد کہہ دیں۔ جنوری ۱۹۷۳ء میں مفتی موصوف نے لیبیا کے اخبار "الفجر الجدید" میں ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ جن مسلمانوں نے اپنے نام تبدیل نہیں کئے انہیں بلغاریہ کی کمیونسٹ حکومت نے سخت سزائیں دیں جن میں موت کی سزا تک شامل تھی۔ ۲۲ مئی ۱۹۷۳ء کو لبنانی اخبار "الشمس" میں خود بلغاروی مسلمانوں کا یہ بیان شائع ہوا کہ انہیں اپنے مذہب کو خیر باد کہنے اور نام بدلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ پانچ سو مسلمان جنہوں نے ان احکام کے خلاف احتجاج کیا تھا، ۱ مئی ۱۹۷۰ء سے جیلوں میں بند ہیں

یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اگر برسر اقتدار آئی تو اس کا رویہ مسلم اقلیت کے تئیں باقی ملکوں کی کمیونسٹ حکومتوں سے مختلف ہوگا۔ در اصل کوئی بھی سیاسی پارٹی جس کی بنیاد کسی ادعائی نظریے پر ہو اقلیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتی ہندوستان جیسے ملک میں تو جو مختلف تہذیبی لسانی اور مذہبی اکائیوں کا ملک ہے اس قسم کی پارٹی کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے غیر معمولی تشدد سے کام لینا پڑے گا۔ اور اگر اس کی نوبت آئی تو جیسا کہ سالار دکے بیان سے ظاہر ہوتا ہے اس کی قدرتی حلیف بھی جماعتیں اور وہ گروہ نہیں گے جنہیں ان دنوں یہ پارٹی فاشسٹوں کا لقب دے رہی ہے۔

شخصی حکومت اور جمہوریت

شخصی سلطنتیں سازشوں کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔ قصر حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ ان میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔ ریاستوں میں دوگونہ مصیبت ہوتی ہے، ایک اندرونی، ایک بیرونی، خود مختار ریاستوں میں ایک بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی خواہ وہ کوئی ہو یہ کوشش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سرکار کو خوش کر لیا جائے۔ جس سے پیا خوش اسی کا راج۔ اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں، ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے۔ اس کشمکش میں کذب و افترا بہتان، مخبری غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے کام میں نہ لاتے ہوں۔ اب جمہوریت کا زمانہ ہے، کامیابی و ناکامی کا مدار تعداد پر ہے جدھر زیادہ ہاتھ اٹھ گئے وہی جیت گیا جہاں ہار جیت نہیں ہوتا، اخلاقی جرأت نہیں ہوتی جہاں ذاتی یا پارٹی کا مفاد مدنظر ہوتا ہے جہاں شہرت یا ہر دلعزیزی کی چاہت ہوتی ہے۔ جہاں جذبات سے زیادہ اور عقل و دانش سے زیادہ بحث ہوتی ہے جہاں خود اعتمادی اور قوت ایمانی کا فقدان ہوتا ہے وہاں تعداد ہی غالب ہوتی ہے!

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق

خواجہ حسن ثانی نظامی

مسلمان اور وطن دوستی

ایک نومسلم بھائی کا لطیفہ سنا تھا کہ ہونے کو تو وہ مسلمان ہو گئے روزہ نماز انھوں نے سب کچھ کیا مگر یہ عادت نہیں چھوڑی کہ گاؤں سے باہر نکلتے تو پیپل کے نیچے استھاپت مورتی کو ڈنڈوت ضرور کر لیتے۔ ایک روز گاؤں کے مسلمانوں نے ان کو یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ اور خوب خبر لی۔ مگر یہ صاحب نہایت معصومیت سے بولے کہ "خطا معاف! میں تو یہاں ڈنڈوت اس لئے کیا کرتا تھا کہ کیا خبر کبھی ان سے بھی کوئی کام پڑ جائے!!"

محترم شمس کنول صاحب کی فرمائش ہے کہ مضمون لکھو بعنوان "مسلمان اور وطن پرستی"۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مضمون ضرور لکھوں گا۔ مگر عنوان ہوگا "مسلمان اور وطن دوستی"

مسلمان تو خیر یوں بھی خدا کے سوا کسی کی پرستش کے قائل نہیں۔ لیکن جو لوگ قائل ہیں۔ وہی پرستار ہونے کا حق کونسا ادا کر رہے ہیں؟ ہاں اگر پرستش سے مراد محض شاعری ہے اور "کام پڑنے" والی پرستش ہے تو پھر بلاشبہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سارے ہندوستانی وطن پرست ہیں۔ اور جو ہماری اس وطن پرستی پر شبہ کرتا ہے اس کو دراصل کبھی کسی سے کوئی کام پڑا ہی نہیں ورنہ اس کو بھی ہماری طرح مجبوراً وطن پرست بننا پڑتا!

دوستی کا معاملہ البتہ جدا ہے۔ مگر دوستی کیا ہوتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے بھی ایک لطیفہ سنتے چلئے۔ کہتے ہیں ایک میاں جی اپنے ایک خاص دوست کے سوا کبھی کسی کو سلام کا جواب نہیں دیا کرتے تھے لوگ ان کو بد دماغ کہتے۔ مگر میاں جی کسی کی پرواہ نہ کرتے اور اپنے کام سے کام رکھتے۔ ایک روز بازار میں جا رہے تھے کہ اپنے اسی خاص دوست کو پٹتے دیکھا جس کو سلام کا جواب دیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً خود بھی میدان جنگ میں کود گئے۔ دوسری پارٹی مضبوط تھی۔ اس نے دوست کے ساتھ میاں جی کو بھی مار مار کر آدھ موا کر دیا۔ چار پائی پر ڈال کر گھر لایا گیا۔ بچوں نے کہا کہ ابا آپ کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ پرائے جھگڑے میں ٹانگ اڑائی۔ اپنی دھم کٹی بھولی بولے اس دوست کو سلام کا جواب دیا کرتا تھا۔ سلام کا مطلب ہوتا ہے تم سلامت رہو۔ بس جس کی سلامتی زبان سے مانگے اس کی سلامتی ہاتھ پیر سے بھی چاہئے۔ میں ایک کے سوا کسی کو سلام کا جواب اسی لئے نہیں دیتا تھا کہ کس کس کے لئے لڑتا پھروں گا؟ ایک کی سلامتی چاہی تھی سو اسی نے یہ حال بنا دیا!

ایمان داری کی بات یہ ہے کہ عبادت کی طرح سچی اور اصلی دوستی بھی مسلمان صرف ایک ذات سے رکھ سکتا ہے۔ اور اس ایک دوستی میں ایسی ایسی مشقتیں ہیں۔ ایسی ایسی افتادیں ہیں کہ کیا عرض کیا جائے بس اللہ دے اور بندہ لے۔ اس معشوق کے غمزے کسی اور طرف کا ہوش ہی نہیں آنے دیتے۔ چنانچہ دنیا کی جتنی بھی پسندیدہ اور محبوب چیزیں ہیں۔ ان کو احساس کمتری شدت کے ساتھ ہونے لگتا ہے۔ علالت اور الفاقت کے کچھ دعوے دار یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ فلاں کو اتنا کیوں چاہا اور فلاں کو اتنا کیوں نہ چاہا۔

وطن بھی دنیا کے ان محبوبوں میں سے ایک محبوب ہے جس کو بعض فلاں مندوں نے خواہ مخواہ سدا نے مقابلے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ اور کہتے

ہیں کہ اس کو اسی طرح چاہو جس طرح خدا کو چاہتے ہو۔ یا پھر خدا سے بھی اسی طرح کا تعلق رکھو جس طرح کا تعلق وطن سے رکھتے ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ خدا کے ساتھ بھی اسی طرح کا مسخرہ پن کرانا چاہتے ہیں جس طرح کا مسخرہ پن وطن سے روا رکھا گیا ہے۔

کسی کو بُرا لگے یا بھلا۔ ہم مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہیں ہم ڈنکے کی چوٹ یہ بات کہتے ہیں کہ ہماری عبادت اور پرستش کا سزاوار صرف وحدہ لاشریک اللہ ہے۔ اور حقیقی محبت بھی صرف اسی ایک ذات سے کی جا سکتی ہے۔

مگر اس ایک ذات کی پرستش صرف اس سے محبت کرنے کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم باقی سب کا حق ادا کرنا بھول جائیں۔ بچے کو ماں سے اور ماں کو بچے سے جو محبت ہوتی ہے۔ جو باہمی تعلق ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ ایک دوسرے کے لئے دکھ اٹھاتے ہیں۔ اور خدمت کرتے ہیں۔ وہ خدا کی عبادت اور خدا کی محبت کی راہ میں رکاوٹ کبھی نہیں بنتی۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں سمجھتا۔ ماں باپ سے محبت اور خدمت اور ان کے حقوق کا ادا کرنا چونکہ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی عین عبادت ہی سمجھنا چاہئے قرآن کہتا ہے کہ مسلمان اولاد کو اپنے بوڑھے ماں باپ کی کسی بات پر اُف بھی نہیں کہنا چاہئے۔ اور اس کی وجہ بھی بتا دی ہے کہ تمہاری ماں تمہیں پیٹ میں رکھتی ہے اور دکھ پر دکھ اٹھاتی ہے۔ اسی اصول کی بنا پر ہم اپنی مادر وطن سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اور اس کی خدمت کو اپنا فرض اور اطاعت خداوندی جانتے ہیں۔ کیونکہ اس ماں نے بھی برسوں ہمارا بوجھ اپنی چھاتی پر اٹھایا ہے۔ اسی کی گود میں کھیل کود کر اور پڑھ لکھ کر ہم پروان چڑھتے ہیں۔ اس کے [illegible] پاس بجھائی ہے۔ اس کی روٹی سے ہم نے بھوک میں پیٹ [illegible] اس کے در و دیوار نے ہم کو سایہ اور حفاظت بخشے ہیں اور اسی کے بسنے والے ہمارے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں — اور جس طرح بوڑھے ماں باپ کی باتوں سے بعض اوقات ہم کو تکلیف پہنچتی ہے مگر اُف کہنے کی مجال نہیں ہوتی ——— قرآن کے مطابق اسی طرح [illegible] بوڑھی دھرتی۔ اس پرانے وطن اس جنم بھومی سے بھی اگر کبھی [illegible] کوئی عارضی تکلیف ہم کو پہنچتی ہے تو میں قرآنی اصول سے اُف کرنا غلط جانتا ہوں۔ کیوں کہ جو دکھ اس ماں نے جھیلے

ہیں۔ جو مشقتیں ہماری خاطر برداشت کی ہیں۔ ان کے سامنے کسی عارضی تکلیف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور اس تکلیف کو برداشت کرنا اور مادر وطن کی خدمت بدستور انجام دیتے رہنا۔ گویا خدا کے حکم کی تعمیل ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وطن مکّے سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ حضورؐ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو مدینے کی طرف ہجرت کرتے وقت زبان مبارک پر آئے تھے۔ ارشاد ہوا تھا کہ

"مکّہ! تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن
تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"

ایک اور حدیث شریف بھی بیان کی جاتی ہے۔ جس میں حبِ وطن کو جزو ایمان بتایا گیا ہے۔ مگر اس روایت کی صحت پر اختلاف ہے اس لئے میں اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ تاہم ہجرت کے وقت جو ارشاد ہوا تھا۔ اس پر تو کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے اگر کوئی وطن دوستی کو مذہب اسلام کے منافی سمجھتا ہے تو اس کی عقل اور سمجھ پر ماتم ہی کرنا چاہئے۔ مگر ہم وطن کو بُت بنانا نہیں چاہتے اور اسلامی اخوت کو بھی بت بنانے کے خلاف ہیں اخوت اسلامی اور اخوت انسانی کے جوش میں اگر ہم گھر کا حق ادا کرنا بھول گئے تو یہ اخوت اسلامی اور اخوت انسانی بھی ایک "بُت" کا روپ دھار لے گی۔ اور اس کو اسلامی تعلیمات اور انسان کے فطری تقاضوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۱۹۶۵ء میں ہند و پاک جنگ ہوئی تو ایک مسلمان فوجی افسر ہندوستان کی طرف سے لڑتے ہوئے میدان جنگ میں کام آئے ان کی بیوی کو شوہر کی موت کے صدمے سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ مرنے والا دوزخ میں جائے گا۔ کیوں کہ ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ مسلمان کے ہاتھ سے مرنے والا جہنمی ہوتا ہے۔ میں نے ان خاتون سے پوچھا کہ بہن! ذرا یہ تو بتاؤ کہ اللہ میاں کے سگے کون کون سے ہیں؟ اور سوتیلے کون کون سے ہیں؟

میرے اس عجیب سوال پر وہ کچھ حیران سی ہوئیں اور تھوڑی دیر کے لئے رونا بھول کر کہنے لگیں کہ اللہ میاں کے لئے سگے اور سوتیلے

سوتیلے کا کیا سوال؟ پھر ذرا سوچ کر بولیں کہ جوان کو مانتا ہے اور اطاعت گزار ہے وہ سگا ہے اور سوتیلے ہیں!

میں نے کہا اچھا اب یہ بتائیے کہ ہندوستان میں جو یہ چھ سات کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ یہ اللہ کو اسی طرح مانتے ہیں یا نہیں جس طرح پاکستانی مسلمان مانتے ہیں اور یہ اسی طرح اللہ کے اطاعت گزار ہیں یا نہیں جس طرح پاکستانی مسلمان اطاعت گزار ہیں! ان ہندوستانی مسلمانوں کو آپ اللہ میاں کا سگا سمجھتی ہیں یا سوتیلا؟

بولیں۔ ہم لوگ سچے اور پکے مسلمان ہیں اور گمان یہی ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں اپنا سمجھتا ہے۔ میں نے پھر پوچھا کہ جنگ سے پہلے کیا برادرانِ وطن کا عام خیال یہ نہیں تھا کہ ہندوستانی مسلمان وفادار نہیں ہے اور کبھی وقت پڑا تو یہ دھوکا دے گا غداری کرے گا۔ اس کی ساری ہمدردیاں پاکستان اور اسلامی ممالک کے ساتھ ہیں۔ اور کیا یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اگر برادران وطن کی یہ بدگمانی ایک فیصدی بھی درست نکلتی تو پھر ان کروڑوں مسلمانوں کا اس ملک میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا مشکل کیا ممکن ہو کر رہ جاتا۔ اور ایسی تباہی مچتی کہ یاد رہتا۔ پھر بتائیے کہ آپ کے شوہر اور ان کے ساتھیوں نے برادران وطن کے شانہ بشانہ لڑ کر جان دی۔ اور یہ سمجھ کر جان دی کہ اگر اس وقت ہماری طرف سے ذرا سی بھی چوک ہوگئی تو اس کا خمیازہ کروڑوں آدمیوں کو بھگتنا پڑے گا۔ تو کیا انھوں نے کروڑوں مسلمانوں کی جان اور عزت و آبرو نہیں بچائی۔ اور کروڑوں سچے مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و حرمت پر اپنی زندگی قربان کر دینے والے کو آپ کے خیال میں کیا اللہ دوزخ میں ڈالے گا؟

فوجی افسر کی بیوہ کی سمجھ میں میری بات آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ لیکن ہندوستان میں رہنے والے ہر سمجھدار مسلمان کو یہ بات ضرور ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اپنے اور بھائی ہندوؤں کی جان بچانے کے ہمارے کچھ آدمی شعوری یا غیر شعوری طور پر بھینٹ چڑھ جائیں بلکہ اگر واقعی ہم سچے مسلمان ہیں تو ہم میں اتنی جرأت اور ہمت ہونی چاہئے کہ اگر کسی اسلامی ملک سے کوئی معرکہ درپیش ہو اور ہم ناحق پر ہوں تو پورے زور اور قوت کے ساتھ برادران وطن اور حکومت سے کہہ سکیں کہ بے انصافی سے بچو اور اگر اس کے برعکس غلطی اسلامی ملک کی ہو تو کسی پس و پیش کے بغیر کھلم کھلا مقابلے پر آئیں اور برادران وطن سے پہلے اپنا خون ملک کے دفاع میں بہائیں اس وقت ہماری کوئی ہمدردی حملہ آور مسلمان کے ساتھ نہیں ہونی چاہئے۔ حدیث شریف میں ایک روایت ہے کہ "اپنے مسلمان بھائی کا ساتھ دو چاہے وہ ظالم ہو چاہے مظلوم" سننے والوں کو بڑی حیرت ہوئی اور انھوں نے بے اختیار پوچھا کہ مظلوم کا ساتھ دینا سمجھ میں آتا ہے لیکن ظالم کا ساتھ کیوں دیا جائے؟ ارشاد ہوا کہ ظالم کا ساتھ دینا یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کو ظلم سے روک دو۔

اس واضح تعلیم کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ مسلمان وطن دوستی میں کسی سے پیچھے رہ سکتا ہے۔

آپنے ہمیں بھیڑیوں کے سامنے چھوڑ دیا

جب کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ملک کی تقسیم کو قبول کر لیا تو مولانا آزاد نے بحالت مجبوری خان عبدالغفار خان کو مشورہ دیا کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ راج گوپال آچاریہ اور سردار پٹیل صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے حق میں تھے اس پر بادشاہ خان نے کہا: توبہ! توبہ!! ہم پختونوں نے آپ کا ساتھ دیا، حصولِ آزادی کے لئے کتنی ہی قربانیاں دیں اور اب آپ نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم کو بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ آپ نے ہماری دوستی کا کیا صلہ دیا، اور کیا قدر کی۔ اگر ہم کانگریس چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تو انگریز حکومت ہمارے سارے مطالبات پورے کر دیتی مگر ہم نے اقتدار کی خاطر اپنے نظریات کو کبھی قربان نہیں کیا!

خاص گگن کے ہندستانی مسلمان قارئین کے لئے

خواجہ احمد عباس

مولا بخش کسان بھی ایک ہندستانی مسلمان ہے

کسی ہندستانی مسلمان کی بات ہو رہی ہے :

قائد اعظم محمد علی جناح بھی ایک ہندستانی تھے (زندگی کے آخری چند برس کے لئے وہ پاکستانی ہو گئے تھے) وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، کروڑوں مسلمان ان کو اپنا قائد اپنا لیڈر مانتے تھے لیکن اسلام کا ظاہری نشانیوں میں سے کوئی ان میں نمودار نہیں تھی۔ نہ ان کو کوئی نماز پڑھتے دیکھ سکتا تھا نہ وہ روزہ ہی رکھتے تھے۔ کیا ایسے مسلمان کا ذکر ب

چودھری خلیق الزماں بھی ایک ہندستانی مسلمان تھے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY) میں ہندستان کا وفادار شہری رہنے کی قسم سب کے سامنے کھائی تھی۔ ایک برس کے اندر اندر وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو لے کر پاکستان چلے گئے اور وہاں پاکستان کے وفادار رہنے کی قسم کھائی۔ وجہ بتائی کہ ہندستان میں اردو کا مستقبل ان کو تاریک دکھائی دیتا ہے اس لئے وہ ہندستان میں نہیں رہ سکتے۔ اردو (وہ زبان جو جناح صاحب نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے۔ انگریز صاحب لوگوں کی طرح صرف بول سکتے تھے) جو خلیق الزماں صاحب کے علاوہ موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، آنند نرائن ملا اور رگھوپتی سہائے فراق کی زبان بھی اور ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایک ہندستانی مسلمان تھے حالانکہ ان کی پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی تھی جو دینیات، عربی فارسی، اسلامی فلسفہ اور قرآنیات کے عالم فاضل تھے۔ وہ آخر تک قوم پرست رہے اور ان کے اسلام نے کبھی ان کو قوم پرست ہونے سے نہیں روکا۔

آغا خاں صاحب بھی ایک ہندستانی مسلمان تھے جو آخر وقت تک برطانوی سامراج کے وفادار رہے جو اپنا وقت زیادہ تر ہندستان کے باہر یورپ اور امریکہ کی سیرگاہوں میں بسر کرتے تھے اور جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ شراب جب ان کے مبارک ہونٹوں کو چھوتی ہے تو معجزہ ہوتا ہے اور وہ پانی بن جاتی ہے۔

محمد علی کریم چھاگلا صاحب بھی ہندستانی مسلمان ہیں جو اسلامی شریعت کے قانون میں تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ وہ کٹھ ملا بھی ہندستانی مسلمان ہیں جو کہتے ہیں کہ دوسرے اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں اور اصلاحات ہو جائیں لیکن ہندستانی مسلمان شریعت کے قانون کی پتھر کی لکیر میں کوئی تبدیلی برداشت نہیں کریں گے۔

راجہ صاحب محمود آباد بھی ہندستانی مسلمان اپنے آپ کو کہتے تھے کیوں کہ ہندستان میں ان کی آبائی جاگیر تھی اور دل سے پاکستانی ہوتے ہوئے بھی وہ پاکستان ہجرت کر کے نہیں گئے کیونکہ وہاں جانے سے ان کی جاگیر ضبط ہو جاتی۔ اور اس لئے مدت تک وہ عراق میں مقیم رہے۔

نانی حکو کا کھدر کا کفن

یہ سب ہندستانی مسلمان تھے۔

ہمارے محلے کی بوڑھی نانی حکو بھی ہندستانی مسلمان تھیں

جو اپنے پیشے سے ٹیچر تھیں ۔ وہ اشراف کی زبانی جلاہی کہلاتی تھیں جو پانچ وقت کی نماز پڑھتی تھیں، جو مہاتما گاندھی کی ایک تقریر سن کر اتنی متاثر ہوئی تھیں کہ اللہ اور رسول کے بعد مہاتما گاندھی کا نام ہی لیتی تھیں ۔ اور جنھوں نے ستر برس کی عمر میں اپنے کرگھے پر اپنے کفن کے لئے کھدر اپنے ہاتھوں سے بُنا تھا کیوں کہ انھیں مرنے کے بعد بھی انگریزی لٹھے کے کفن میں دفن کیا جانا منظور نہ تھا ۔

جب بھی ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں کوئی بحث چھڑتی ہے میں سوچتا ہوں کن ہندستانی مسلمانوں کی بات ہو رہی ہے ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے خوشحال گھروں کے مسلمانوں کی (جن میں سے کتنے ہی انجینیرنگ یا ڈاکٹری کی ڈگری لیتے ہی پاکستان "ہجرت" کرنے کی سوچتے ہیں) یا ان کسانوں، مزدوروں، غریب مسلمانوں کی جنھوں نے کبھی علی گڑھ کا نام بھی نہیں سنا اور جن کے لئے پاکستان صرف ایک جذباتی تخیل ہے جیسے مکہ یا مدینہ؟

ایک سانچے میں نہیں ڈھلے

ہندستانی مسلمان کسی ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے نہیں ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی اجتماعی بات کی جا سکے ۔

جتنی قسم کے ہندستانی ہیں اتنی ہی قسم کے ہندستانی مسلمان بھی ہیں ۔
لکھے پڑھے ہندستانی ہیں ۔ لکھے پڑھے ہندستانی مسلمان ہیں
اَن پڑھ ہندستانی ہیں ۔ اَن پڑھ ہندستانی مسلمان ہیں
سرمایہ دار ــ لکھ پتی کروڑپتی ــ ہندستانی ہیں ۔ سرمایہ دار ہندستانی مسلمان ہیں ۔

مزدور ہندستانی ہیں جو کم پگار اور اونچی قیمتوں کی چکی میں پستے رہتے ہیں، مہنگائی الاؤنس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں ۔ مزدور ہندستانی مسلمان بھی ہیں جو اسی طرح کم پگار اور اونچی قیمتوں کی چکی میں پستے رہتے ہیں اور اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں ۔

زمیندار ہندستانی ہیں جن کے پاس (زرعی انقلاب کے بعد بھی) بڑے بڑے فارم ہیں ۔ زمیندار ہندستانی مسلمان ہیں جن کے پاس آج بھی زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں ۔

ایسے ہندستانی سمگلر بھی ہیں جو لاکھوں روپے کا کالا دھن کماتے ہیں ۔ ان میں اگر کانتی یرکاش ہیرالال جیسے ہندو بھی ہیں تو حاجی مستان جیسے مسلمان بھی ہیں ۔ عیسائی بھی ہیں یہودی بھی ہیں ۔

کروڑوں ایسے ہندستانی بھی ہیں جو دو روپے روز بھی نہیں کما سکتے جو آدھا پیٹ کھا کر کسی گندی جھونپڑپٹی میں سو جاتے ہیں اور ان میں کافی تعداد ہندستانی مسلمانوں کی بھی ہے ۔

بمبئی شہر کے فٹ پاتھوں پر لاکھوں انسان ــ لاکھوں ہندستانی آسمان کے تلے "پتھر کی سیج" پر سو جاتے ہیں ۔ ان میں آپ کو ہر مذہب کے لوگ ملیں گے ۔ ہندستانی مسلمان بھی کافی تعداد میں ملیں گے ۔

کس ہندستانی مسلمان کی بات ہو رہی ہے، بھائی ؟

کروڑپتی حاجی مستان کی (جو لاکھوں روپے خیرات میں خرچ کر دیتا تھا) یا مدھیہ پردیش کے مولابخش کسان کی جو اپنے گاؤں میں آج بھی لکڑی کا ہل چلاتا ہے اور مٹی کے جھونپڑے میں رہتا ہے ۔

مسلمان جو تامل میں قرآن پڑھتا ہے

یہ مولابخش کسان تامل ناڈ میں پایا جاتا ہے تو تامل بولتا ہے قرآن شریف بھی تامل میں پڑھتا ہے... اگر اسے پڑھنا آتا ہے ۔

یہ مولابخش کسان آندھرا میں رہتا ہے تو تیلگو بھاشا بولتا ہے اور دھوتی باندھ کر ہل چلاتا ہے ۔ قرآن کو تیلگو میں پڑھتا ہے... اگر اسے پڑھنا آتا ہے ۔

یہ مولابخش کسان بنگال میں رہتا ہے تو بنگالہ زبان بولتا ہے کیرلا میں رہتا ہے تو ملیالم بولتا ہے... اور ملیالم میں قرآن پڑھتا ہے جو سڑک کنیا کماری تک جاتی ہے اس پر ہندستان کا آخری گاؤں "محمد پورم" ہے جو مسلمانوں کی چھوٹی سی بستی ہے جو صرف ملیالم بول سکتے ہیں ۔ اگرچہ ان کی چھوٹی سی ٹوٹی مسجد میں اذان اور نماز عربی میں پڑھی جاتی ہے ۔

کیا ہم کبھی اس ہندستانی مسلمان کے بارے میں بھی سوچتے ہیں جس کو میں نے مولابخش کسان کا نام دیا ہے ۔

ایسے لاکھوں مولابخش کسان ہندستان میں موجود ہیں ۔

اُن کی زندگی کے کیا مسئلے ہیں ؟

اُن کو اُن کے بال بچوں کو پیٹ بھر کے روٹی ملے ۔

ان کو۔ ان کے بال بچوں کو۔ تن ڈھکنے کے لئے کپڑا ملے۔
ان کو۔ ان کے بال بچوں کو۔ سر چھپانے کے لئے مکان ملے
ان کے بچوں کے پڑھنے کے لئے سکول ہوں۔ کتابیں ہوں، لائبریریاں ہوں، ان کے کھیلنے کے لئے میدان ہوں۔
ان کے بنیں تو ان کے بچوں کو ترقی کے سارے موقعے ملیں جو ہندستانی شہری کی حیثیت سے اُن کا حق ہے۔
اُن کے کھیتوں میں نہروں کا پانی آئے۔
اُن کے گاؤں میں ٹیوب ویل لگیں۔
اُن کے علاقے میں اچھی سڑکیں ہوں، آنے جانے کا انتظام ہو۔
اُن کے گاؤں میں بھی کبھی کبھی سنیما باہر کی دنیا کی رنگین جھلک دکھلانے آجایا کرے۔
اُن کے گاؤں کا بنیا (جو مسلمان بنیا بھی ہو سکتا ہے) قیمتیں بڑھاکر ان کو لوٹے کھسوٹے نہیں۔
جو اناج وہ پیدا کرتے ہیں اس کی منڈیوں میں مناسب قیمت ملے

مولابخش، رام دین، گوربخش سنگھ

یہ مولابخش کسان مولابخش مل مزدور بھی ہو سکتا ہے۔
وہ بمبئی میں بھی کام کر سکتا ہے، کلکتہ میں بھی، مدراس میں بھی، بنگلور میں بھی، وہ دلی کے پاٹن کے کارخانوں میں "کرخندار" بھی ہو سکتا ہے وہ کشمیر میں ایک کشتی چلانے والا بھی ہو سکتا ہے، بوجھ سر پر اٹھا کے چلنے والا قلی بھی ہو سکتا ہے۔

وہ جو بھی ہے جہاں کہیں بھی ہے اس کی بنیادی ضروریات، اس کی زندگی کے بنیادی مسئلے اور الجھنیں زیادہ تر اقتصادی ہیں، سیاسی ہیں سماجی ہیں اور اس لئے یہ سب وہی ضروریات، وہی مسئلے وہی الجھنیں ہیں جو اس کے سب ساتھیوں کو ہیں۔ چاہے ان کا نام رام لال ہو، کشن سنگھ ہو، جان ڈی سوزا ہو یا ڈیوڈ ابراہم ہو۔

ہندستانی مسلمان مولابخش کی مشکلوں کا ایک ہی علاج ہے سماجی اور اقتصادی انصاف جسے سوشلزم کہتے ہیں اس کو اور سب ہندستانیوں کو ساتھ مل کر اپنی مشکلوں کا حل اور علاج کھوجنا ہے۔ مولابخش، رام دین، اور گوربخش سنگھ کو ساتھ مل کر یہ کام کرنا ہے

ان سب کی منزل ایک ہی ہے۔ اس لئے راستہ بھی ایک ہی ہے۔
صرف ایک مولابخش کا (اور سارے مسلمانوں کا) ذاتی مسئلہ ہے اپنے خدا کی عبادت۔ اگر اس کو کوئی اللہ اور رسول کا نام لینے سے روکتا ہے، نماز پڑھنے کو منع کرتا ہے، رمضان کے مہینے میں زبردستی کھانا کھلاتا ہے، زکوٰۃ دینے سے روکتا ہے تب بے شک "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگانا چاہیئے تب بے شک ڈیڑھ اینٹ کی علاحدہ مسجد بنانا ضروری ہو جاتا ہے ہندستانی مسلمانوں کے لئے۔
لیکن فی الحال اس کا کوئی ڈر نہیں ہے ڈیڑھ اینٹ کی نہیں لاکھوں کروڑوں اینٹوں کی خوبصورت اور شاندار اور (اکثر) ویران مسجدیں اس ملک میں کھڑی نمازیوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

مسلمان حکمرانوں نے ہندستان میں کتنے عرصے حکومت کی۔؟

حکمران	مدت		حکمران	مدت
محمود غزنوی نے	۳۳ سال	★	محمد غوری نے	۳۰ سال
قطب الدین ایبک نے	۴ سال	★	شمس الدین التمش نے	۲۵ سال
رضیہ سلطانہ نے	۴ سال	★	ناصر الدین نے	۲۰ سال
بلبن نے	۲۰ سال	★	کیقباد نے	۴ سال
جلال الدین خلجی نے	۶ سال	★	علاؤ الدین خلجی نے	۲۰ سال
غیاث الدین تغلق نے	۵ سال	★	محمد تغلق نے	۲۶ سال
بہلول لودھی نے	۳۸ سال	★	سکندر لودھی نے	۲۸ سال
ابراہیم لودھی نے	۹ سال	★	بابر نے	۴ سال
ہمایوں نے	۱۱ سال	★	شیر شاہ سوری نے	۵ سال
اسلام شاہ سوری نے	۹ سال	★	جلال الدین محمد اکبر نے	۴۹ سال
جہانگیر نے	۲۲ سال	★	شاہ جہاں نے	۳۰ سال
اورنگ زیب نے	۴۹ سال	★	بہادر شاہ نے	۵ سال
جہاندار شاہ نے	۱ سال	★	فرخ سیر نے	۶ سال
محمد شاہ نے	۲۹ سال	★	احمد شاہ نے	۶ سال
عالمگیر ثانی نے	۷ سال	★	شاہ عالم نے	۲۷ سال
اکبر ثانی نے	۳۱ سال	★	بہادر شاہ ظفر نے	۲۰ سال

انور علی دہلوی

آئیے اپنی قسمت ہم خود بدل ڈالیں

آزادی کے ۲۷ برس بعد بھی دیش واسیوں نے آزادی کی سانس نہیں لی۔ آج دیش میں کوئی بھی انسان اپنے مقام پر سکھ اور چین کی زندگی نہیں بتا رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری سرکار جنتا کے سلسلے میں اپنا فرض پورا نہیں کر رہی؟ چناؤ کے وقت جو وعدے کئے جاتے ہیں کیا ان کا پالن کیا جاتا ہے؟ کانگریس سرکار نے 'غریبی ہٹاؤ' کا وچن کس حد تک پورا کیا؟ البتہ ہماری راشٹریہ سرکار نے اس سلسلے میں کچھ قدم ضرور اٹھائے۔ بینکوں اور جنرل انشورنس کا راشٹریہ کرن کیا۔ راجے نوابوں کے پریوی پرس ختم کر دیئے گئے ہیں اور بھومی دھر بنانے کے سلسلے میں بھی اپنی سمجھ کے مطابق کچھ کیا ہے۔

لیکن کیا ان سب باتوں کے بعد بھی دیش سے غریبی ہٹ گئی؟ جو دھن پہلے پونجی پتیوں کے خزانے میں جاتا تھا ان سدھاروں کے بعد کیا اس کا ایک پیسہ بھی غریب کی جیب میں آیا ہے؟ اور کیا دیش کی غریب جنتا اب آرام اور سکھ کی سانس لینے لگی ہے؟

دیش کی اس دشا کو دیکھتے ہوئے کیا مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بھارت میں کیول ان ہی کی ذات دکھی ہے؟ ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ ذاتیں مزے میں ہیں اور کیول مسلمان ہی دکھ درد کا جیون بتا رہے ہیں؟ جب کانگریس سرکار کسی کو بھی سکھی نہیں کر پائی تو پھر مسلمان ہی دکھوں کی دہائی کیوں دیں۔ کانگریس سرکار کسی کی سگی نہیں۔ اگر کچھ کرے گی تو سب کیلئے، ورنہ پھر سب کچھ اپنے ہی لئے۔

اگر مسلمان اپنا بھوشیہ سدھارنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے ہی رخ سے اپنے بیتے ہوئے اور آج کے دنوں کا جائزہ خود لینا چاہئے۔

جب سے بھارت دو بھاگوں میں بٹا۔ ایک بھاگ کا نام پاکستان اور دوسرے کا بھارت رکھا گیا۔ یہ برا اتفاق ہوا کہ ان دونوں ہی بھاگوں میں مسلمان کا جیون دوبھر ہو گیا۔ پچھلے ۲۷ برس میں یہاں اور وہاں مسلمانوں کی جس درد بھری کہانی نے جنم لیا اس کی مثال سنسار کا شاید ہی کوئی دوسرا فرقہ پیش کر سکے۔ غریب، مجبور، بے کس اور مظلوم ہندستانی مسلمانوں کے کنبے کے کنبے بٹ گئے۔ بیٹا ماں سے چھٹ گیا۔ بھائی بہن کی صورت کو ترس گیا۔ دیش کے اس بٹوارے پر کتنی جانیں بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس کی تو گنتی ہی مشکل ہے اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس الٹ پھیر اور لوٹ کھسوٹ میں کتنی دولت برباد ہوئی۔ رونے کی بات صرف یہی نہیں ہے بلکہ نہ بھلائے جانے والے اتیاچار تو وہ ہیں جو پاکستانی علاقوں (پنجاب، سرحد، بلوچستان اور خصوصی طور پر سندھ) میں پہلے سے بسے ہوئے مسلمانوں نے جا کے بسے ہوئے (مہاجر) مسلمانوں پر کئے۔ مرحوم صدر ایوب خان کے پاکھنڈی بیٹے گوہر ایوب نے تو مہاجرین کی بستیوں میں آگ لگوائی۔ لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کرکے یہ ایوب خان کا بچہ چنگیز خان بن گیا۔ آج بھی پاکستانی مسلمان بھارت سے پہنچے ہوئے مسلمانوں سے گھن کرتے ہیں جنہوں نے پاکستان بنوانے میں بہت بڑا پارٹ ادا کیا تھا۔ یہ مہاجرین ٹھیک طور سے آج تک آباد نہیں ہو سکے۔ جس اردو زبان کے نام پر پاکستان بنا اُسی دیش میں بھارتی مسلمانوں پر سندھ کے اکثر شہروں میں لاٹھی چارج کیا گیا۔ اور گولی چلائی گئی۔ اور ان کے وجود کو کچلا گیا۔ اور ان کی آواز کو دبایا گیا۔ یہ تو تھی کہانی پاکستانی مسلمانوں کی۔

اب بھارت کے مسلمان کی بگڑی ہوئی حالت کا اسباب سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دیش کی ۵۶ کروڑ کی آبادی میں کیول ۶ کروڑ ہونے کے باوجود ابھی تک سب سے الگ تھلگ زندگی گزار رہا ہے۔ اس میں اس کا دوش نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ ایسے جنونی لیڈر ہیں جو لیڈری کے بھوکے ہیں اور وہ لیڈری کی ہوس بھوک کی خاطر نہ صرف اپنے فرقہ کے دشمن بنے ہوئے ہیں بلکہ وہ سارے راشٹر اور دیش سے دشمنی کر رہے ہیں۔ ان کو اس سے مطلب نہیں کہ مردہ جنت میں جائے یا جہنم میں، ان کو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے، وہی ہیں جو مسلمانوں کو بھارتیہ کرن یعنی قومی دھارے میں شامل ہونے نہیں دیتے۔ ان ہی مفاد پرست، خود غرض اور چندوں کی صورت میں مسلمانوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھانے والے ان پیشہ ور لیڈروں نے پہلے ہی دلوں سے نفرت اور دشمنی کے جذبات کو بڑھاوا دیا ہے۔ نتیجے میں یہ ۱۹۴۷ء بھی بھارتیہ مسلمانوں کیلئے ۱۹۴۷ء بنا ہوا ہے۔ ۲۷ برس گزرنے کے بعد بھی وہ فرقہ وارانہ فسادات کی چوٹ سے نہیں بچ پا رہے ہیں۔ اور وہ آج بھی ریلوے پلیٹ فارم پر ایک مسافر کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوں کہ ان کے دیش دروہی لیڈروں نے ان کو وطنیت اور قومیت کے صحیح جذبات سے لاتعلق کر رکھا ہے اس لئے وہ ۶ کروڑ انسانوں کے اس ملک میں سب سے گھٹی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اور اپنے لئے وہ مقام بنانے یا پانے میں ناکام ہیں جس پر کہ ان کا ادھیکار ہے۔ تجارت ہو یا ملازمت، ہر بازار اور ہر دفتر میں وہ اپنے لئے تنگی محسوس کرتے ہیں۔

اب بھارت کے مسلمانوں کیلئے مکتی کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ پانے الگ نیست، ملک جدا نگ نیست کے مقولے پر عمل کریں یعنی اپنا مقدر وہ آپ بنائیں۔ وہ ایسے سارے وچاروں کو اپنے من سے نکال پھینکیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ بھارت میں ان کیلئے جگہ نہیں، بھارت کے ہر مسلمان کا یہ وشواش ہونا چاہیئے کہ وہ ۶۰ کروڑ کی بھارتی قوم ہی کا ایک فرد ہے یعنی ساری قوم ایک شریر ہے اور وہ اس شریر کا ایک حصہ ہے۔ مسلمان پہلے اپنے آپکو بھارتی سمجھے، بعد میں کچھ اور۔ وہ ایسے ان ڈھونگی لیڈروں سے بچے جو اقلیت و اکثریت کا ڈھونگ رچا کر ہندو و مسلمان کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مسلمانوں کے جو لیڈر وطن اور قوم کے معاملوں میں دھرم کو بیچ میں لا کر بھید بھاؤ پیدا کرتے ہیں، مسلمان ان کا سماجی بائیکاٹ کریں اور ہو سکے تو ان کو اپنی برادری سے نکال باہر کریں۔ ان کیلئے مسلم سماج میں کوئی جگہ نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان ۱۹۴۷ء سے پہلے کے دنوں کو اگر یاد کرنا نہیں چاہتے تو نہ سہی مگر آزادی کے بعد کے ان ۲۷ برس کا جائزہ وہ ضرور لیں کہ انھوں نے اپنے پڑوسی ہندوؤں سے الگ رہکر کیا کھویا اور کیا پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے بہت کچھ کھویا ہے۔ دنیاوی جاہ و ثروت سے ہٹ کر انھوں نے ہندوؤں کی نظر میں اپنا اعتماد کھویا ہے۔

بہرحال اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا، جب آنکھ کھلے مسلمان تب ہی سویرا سمجھے۔ قومی دھارے میں اپنے آپکو شامل کر لے، ان کو اپنا سمجھے جو اس کے کام آئیں خواہ وہ اس کے ہم مذہب نہ ہوں، ان غیروں کی خاطر اپنوں سے نہ بگاڑے جو اس کے کام نہیں آ سکتے خواہ وہ غیر اس کے ہم مذہب ہی کیوں نہ ہوں عمل ہی سے اپنے غیر بنا جاتے ہیں اور غیر اپنے۔ یہ بات مشکل نہیں ہے، مسلمان اپنا کھویا ہوا اعتماد اس طرح واپس لا سکتا ہے کہ شکوے شکایات اور مطالبات کئے بغیر قومی دھارے میں شامل ہو جائے یعنی اس کی سماجی زندگی پر اس کے اپنے فرقے کی چھاپ نہ ہو بلکہ اس کی سماجی زندگی ہندستانی تہذیب کی نمائندہ ہو۔ اگر مسلمان نے دل سے ہندستانی بننا چاہا تو بھارت کی قومی زندگی میں برابری کا درجہ حاصل کرنے سے پھر اسے کوئی نہیں روک سکے گا اور پھر وہ بھارت کا شاندار اور باعزت نا[گرک] بن جائے گا۔

مسلمانوں کی جان و مال کو دوسرے اس لئے نقصان پہنچاتے ہیں کہ وہ اس کو قومی سرمایہ نہیں سمجھتے لیکن جس دن مسلمان نے اپنے آپکو اور اپنی ہر شئے کو قومی تصور کروا دیا اسی دن سے خود بخود مسلمان کی جان و مال کی حفاظت کیلئے بہتر سے بہتر انتظامات ہونے لگیں گے۔ اور مسلمان کے اقتصادی حالات بھی سدھرنے لگیں گے۔

مگر مسلمان یہ یاد رکھیں کہ وہ اپنی نفرت سے دوسروں کی محبت حاصل نہیں کر سکتے، وہ دوسروں سے جب تک کٹ کٹ کر رہیں گے تب تک دوسرے بھی ان سے آ کر نہیں ملیں گے۔

مسلمانوں کو چاہیئے کہ ملک کو خوشحال اور ترقی یافتہ بنانے میں دوسروں کا برابر برابر ساتھ دیں تاکہ نتیجے میں ملک کی خوشحالی اور ترقی میں وہ بھی برابر کے حصہ دار بن سکیں۔

سید شاہ امیر اللہ نظامی

ہندوستانی مسلمان اور ان کے مسائل

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی جتنی متنازعہ فیہ ہے۔ ان کے مسائل بھی اتنے ہی متنازعہ فیہ ہیں۔ مسلمان برابر اس بات کی شکایت کرتے آرہے ہیں کہ ان کے مسائل پر توجہ نہیں کی جارہی ہے اور آزادی کے 27 سال بعد بھی حکومت انھیں حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور حکومت بھی تسلیم کرتی ہے کہ مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں انھیں حل ہونا چاہیئے۔ حکومت اس کا بھی اعتراف کرتی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں۔ لیکن جب تک ان مسائل کی نوعیت اور اصلیت کو جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ان کا حل ہونا بھی دشوار ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا تعلق جن مسائل سے جوڑا جارہا ہے وہ تاریخی ہیں یا فطری۔ یا حالات و سیاست کی پیداوار۔ ان مسائل کو جنم دیا گیا تھا یا وہ خود پیدا ہونے تھے۔ کیا آزادی سے پہلے بھی ان کا وجود تھا ان کا تعلق جذبات سے ہے یا ضرورت زندگی سے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان سوالات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا اور مسلمانوں کے مسائل کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی گئی مسلمانوں کے لیڈروں نے ان مسائل کی حقیقت کو خود مسلمانوں سے نہ صرف چھپایا بلکہ وقت ضرورت انھیں اچھال اچھال کر پیچیدہ اور ناقابل حل بنایا۔ ان مسائل کو حکمراں پارٹی نے اپنے سیاسی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنایا یعنی مسلم لیڈروں اور حکمراں پارٹی نے مسلمانوں کو اور ان کے مسائل کو سیاسی شطرنج کا مہرہ بنایا۔ جب بھی الیکشن آتا ہے مسلم لیڈر ان مسائل کو چھیڑ کر کوئی کنونشن یا کانفرنس کر کے اپنی قیمت یا کرسی وزارت ضبط کر لیتے ہیں ... حکمراں پارٹی ان کی حمایت و ہمدردی میں دو الفاظ کہہ کے اپنا اقتدار مضبوط و مستحکم کر لیتی ہے۔

مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ ان میں آج تک ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو سرسید کی طرح قوم کی صحیح رہنمائی کرتا۔ آنیوالے دور کی ضروریات سے واقف کرا کے ابھی سے انھیں تیار کرتا۔ قوم کو اندھی عقیدت اور تباہ کن جوش و جذبے سے نکالتا توہم پرستی سے نجات دلاتا اور ماضی کو چھوڑ کر حیات و مستقبل کی طرف بڑھنا سکھاتا۔ اور حکومت وقت کے رجحانات کو دیکھ کر سمجھاتا کہ کیا ہونے جارہا ہے اور قوم کو کیا کرنا چاہیئے۔ کہا جاتا ہے کہ لیڈر جس کو کہتے ہیں وہ صرف رہبر و رہنما ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ حکومت اور قوم کے درمیان رابطہ بھی ہوتا ہے مسلمانوں میں ایک لیڈر بھی ایسا نہیں ہوا ہے جو سرکار اور قوم کے درمیان رشتہ یا رابطہ بنے۔ مسلم لیڈروں کی ساری توجہ کرسی پر جا کر اور بنانے پر، اور دولت حاصل کرنے پر ہی رہی وہ مسلمانوں کو تباہی نہ سمجھ سکے کہ کیا کچھ ہونیوالا ہے۔

اردو کا مسئلہ

مثال کے طور پر اردو ہی کا مسئلہ لیجیے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اردو کو وہی درجہ ملے جو دوسری علاقائی زبانوں کو دیا گیا ہے۔ اس زبان میں اعلیٰ تعلیم ہو۔ اردو میں تعلیم حاصل کرنیوالوں کو ملازمتوں میں برابر کے حقوق ملیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ مطالبات بالکل حق بجانب ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی شنوائی کیوں نہیں ہو رہی ہے صرف زبانی جمع خرچ پر معاملے کو کیوں ٹالا جارہا ہے اور ایسی یقین دہانیوں پر جن پر عمل کی نوبت کبھی نہیں آسکتی مسلمانوں کو کیوں ٹرخایا جارہا ہے مسلم [illegible] مسلمانوں نے اس بات کی تہہ میں جانے کی کوشش کبھی نہیں کی کہ حکومت جب یہ تسلیم کرتی ہے کہ اردو کو اس کا

جائز حق ومقام ملنا چاہیئے۔ تو پھر دیتی کیوں نہیں۔ آخر وہ کون سی رکاوٹیں ہیں جن کو دور کرنا حکومت کیلئے مشکل ہے۔ کیا حکومت اردو کا مسئلہ حل کرنے میں نیک نیت نہیں ہے۔ اگر نیک نیت ہے تو کیا دوسری طاقتیں ایسی ہیں جو اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس مسئلے کو الجھا رہی ہیں اور حکومت ان سے خوفزدہ ہے اگر ایسی بات نہیں تو کیا حکومت نے اردو کے متعلق سے کوئی صاف اور واضح پالیسی اختیار کر رکھی ہے جس کے اظہار سے وہ پرہیز کرتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً ملی جھلی سی بات کر کے خاموش رہ جاتی ہے۔ غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ہیں۔ وہ فرقہ پرستوں سے ڈرتی ہے کیوں کہ انھوں نے اردو کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا ہے۔ اور مستقل کارکے سارے اختیارات کو مفلوج کر رکھا ہے۔ یہ طاقتیں حکومت کو جرات مندانہ قدم اٹھانے سے روکتی ہیں دوسری طرف حکومت کی بعض کاروائیاں دیکھکر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو کیلئے کچھ کرنے کے موڈ میں شروع ہی سے نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کیا ہمارے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین جنھوں نے ۲۰ لاکھ دستخطوں کے ساتھ راشٹرپتی راجندر پرشاد کو جو میمورنڈم، اردو کو اس کا جائز حق دینے کے بارے میں پیش کیا تھا اس پر خود صدر بننے کے بعد کچھ کاروائی کرتے۔ اردو کے سب سے بڑے شیدائی اور اس کاز کے سب سے بڑے مجاہد ہونے کے باوجود وہ خاموش رہ جاتے ظاہر ہے کہ صدر بننے کے بعد انھیں سرکاری پالیسی کا علم ہوا ہوگا۔ اور وہ خاموش ہو گئے ہوں گے۔ پنڈت نہرو کو سب اردو کا حامی سمجھتے ہیں لیکن انہی کے دور میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا جو اردو کا عظیم مرکز تھا ختم کیا گیا۔ اور وہ زبان بھی بچا نہ سکے۔ اندرا گاندھی نے ہر الیکشن سے پہلے اردو سے ہمدردی ظاہر کی۔ اور یقین دلایا کہ وہ اس کے لئے کچھ کریں گی مگر کامیابی کے بعد انجان بن گئیں۔ اردو کیساتھ انصاف کرنے کے بارے میں مرکز نے کئی سرکلر ریاستی حکومتوں کو روانہ کئے مگر اسے کو ہر جگہ ردی کی نذر کیا گیا۔ آج بہار میں، یوپی میں، آندھرا میں اور خود دہلی میں اردو کیلئے کوئی مقام نہیں۔

بہار حکومت کا تو یہ حکم ہے کہ سرکاری کاغذات پر سوائے ہندی کے کسی دوسری زبان میں نوٹ نہ لکھے جائیں۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ بہوگنا نے کہا ہے کہ وہ اردو کی ترقی کیلئے تو سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن اسے دوسری سرکاری زبان نہیں بنا سکتے۔ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ سیٹھی نے بھی اردو کے سلسلے میں معذرت کر دی ہے۔ ان اشاروں کے علاوہ اور بھی بہت سے اشارے ایسے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ایک طے شدہ پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ وہ یوں کہ دستور میں اردو کو تو کئی زبانوں میں سے ایک کا درجہ دیا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے خاتمہ کا بھی بندوبست کیا گیا جن صوبوں میں اردو کے لاکھوں پڑھنے، بولنے اور لکھنے والے تھے۔ وہاں سے اردو کو غائب کر دیا گیا ——— اور ہندی زبان کو رائج کرنے کیلئے ایسی تحریص و ترغیب دی گئی تو اردو بولنے والے ہندی کی طرف پلٹ پڑے۔ مسلمانوں سے ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ابتدا ہی سے اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا شروع کر دیا۔ اور ان لاکھوں اردو بولنے والے غیر مسلموں کو ساتھ لے کر متحدہ محاذ بنا کر لڑنے کی کوشش کبھی نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو پر مسلمانوں کی چھاپ پڑ گئی۔ اور بدقسمتی سے اس کیلئے آواز اٹھانیوالے بھی چونکہ مسلمان ہی تھے اس لئے اردو پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھ گیا۔ مسلمانوں کی جذباتیت، جوشیلی طبیعت اور غیر محتاط پن نے اکثریت کے دل میں بدگمانی پیدا کر دی۔ دوسری غلطی مسلمانوں سے یہ ہوئی کہ انھوں نے آنیوالے صحیح حالات کا اندازہ نہیں کیا۔ وہ علماء کی اور لیڈروں کی باتوں میں آ گئے اور اردو کو زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھ بیٹھے نتیجہ یہ ہوا کہ علماء نے اردو کو تجارت کا اور نئے سیاست کا اور سیاسی لیڈروں نے کرسی کا ذریعہ بنا لیا۔ چنانچہ جب کبھی اردو کا سوال آتا ہے تو علماء کہتے ہیں کہ اگر اردو باقی نہیں رہی تو مذہب بھی باقی نہیں رہے گا کیونکہ سیکڑوں سال کا دینی سرمایہ چونکہ اردو میں ہے اسلئے اردو کا تحفظ گویا دین کا تحفظ ہوگا حالانکہ مغلوں کے دور میں دین کا سرمایہ فارسی زبان میں تھا۔ اور تمام بول چال کی زبان فارسی ہی تھی۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ تو اس سرمایے کو خود علماء نے وقت کے تقاضوں کے تحت اردو میں منتقل کیا۔ سوال یہ ہے کہ جب دین کی ضروری باتیں عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئیں اور عقائد متاثر نہ ہوئے تو آئندہ زبانوں میں اس کی منتقلی مذہب کیلئے تباہی کس طرح ہوگی۔ مذہب کی تقدیس و تکریم میں کمی کیسے آجائے گی۔ علاقائی زبانوں سے مذہب کو خطرہ کیوں ہے۔ جب کیرلا میں ہندوؤں مسلمانوں اور عیسائیوں کی واحد زبان ملیالم ہے۔ ان کے مذہبی ذخائر ملیالم میں ہیں۔ پھر بھی ان کا مذہب اور ان کے عقائد متاثر نہیں ہوتے۔ کیرلا کا مسلمان دینی معاملات میں کسی اردو بولنے والے سے پیچھے نہیں۔ تمل ناڈو کا مسلمان جس کی گھر کی، بازار کی لین دین کی، کتاب کی اور وعظ و بیان کی زبان تمل ہے۔ اور وہ بھی اردو بولنے والے مسلمان سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ گجرات کا مسلمان بھی گجراتی زبان بول کر مسلمان رہ سکتا ہے اور اپنی اپنی زبان میں دینی

سہارے کو محفوظ کر سکتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے دیش کے مسلمان اس سلسلے میں جذباتی بن جائیں۔ علماء و لیڈران کا یہ فرض تھا کہ وہ علاقائی زبانوں کی اہمیت اور ضرورت بتاتے اور مسلمانوں کو ابھی سے ایک شاندار اور خوشحال مستقبل کیلئے تیار کرتے۔ عام مسلمانوں کو یہ بتانا بھی ان کا فرض تھا کہ جس زبان کو سرکار کی حمایت حاصل نہیں جس زبان کے مستقبل کو اندھیروں میں ڈال دیا گیا ہے جس زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے کیلئے ملازمتوں میں برابر کے مواقع حاصل نہیں جس زبان کو سرکار تسلیم نہیں کرتی ہے اس کیلئے سر کھپانا بیکار ہے چونکہ ریاستوں میں "فرزند وطن" کی تحریک زور پکڑ گئی ہے۔ ملازمتوں کیلئے علاقائی زبان جاننے کی شرط رکھی گئی ہے۔ سرکار کا پورا کام علاقائی زبان میں ہونا طے پا چکا ہے۔ تو مسلمانوں کا اردو کو سینے سے لگائے بیٹھے رہنا نادانی ہے۔ جب کیرلا۔ مہاراشٹر۔ گجرات۔ اڑیسہ۔ مدراس بنگال۔ پنجاب۔ راجستھان وغیرہ میں اردو کا کوئی سوال ہی نہیں وہاں کے مسلمان اپنا کام کئے جارہے ہیں تو پھر اسکو ملک گیر مسئلہ بنانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اگر مسلمانوں نے علاقائی زبانوں کو سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور اپنے بچوں کو ابھی سے اس کیلئے تیار نہ کیا تو وہ آگے چل کر ہر میدان میں پیچھے رہ جائیں گے اور ان کی پسماندگی آنیوالے زمانہ میں اور بڑھ جائے گی۔ محرومیت کا احساس ان میں مایوسی اور گھٹن پیدا کردے گا۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اردو کے سوال کو الیکشن کے زمانہ میں ابھارتے ہیں اور ووٹ لینے کے بعد انجان بن جاتے ہیں۔ اور مسلمان ہیں کہ اپنی آنکھوں پر ہمدردی اور عقیدت اور غلط جوش و جذبات کی پٹی کھولنا نہیں چاہتے۔

ملازمتیں اور نمائندگی

مسلمان ہمیشہ تعلیم اور ٹیکنالوجی کے معاملے میں غافل اور بداندیش رہے ہیں گذشتہ پچاس سال برابر وہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں۔ مسلم میں کمی کی وجہ ان میں جہالت ہے۔ اور جہالت غربت کو جنم دے رہی ہے دس سال سے برابر مسلمانوں میں حصول علم کی تحریک چلائی جاتی رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے بتایا جاتا رہا ہے۔ کہ اگر انھوں نے تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی تو بے موت مارے جائیں گے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی ہے لیکن وہ ذوق و شوق ابھی پیدا نہیں ہوا جسکے نتیجہ میں مسلمان آگے بڑھ سکیں۔ چنانچہ آئی اے ایس آئی پی ایس اور دیگر بڑے بڑے امتحانات میں مسلمان شریک ابھی نہیں ہوتے اور اگر ہوتے بھی ہیں تو ذہانت قابلیت اور دوسری صلاحیتوں کی کمی کی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں۔ مسلمان بجائے اپنی تعلیمی

قابلیت کو بڑھانے اور دوسروں سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنے کے سرکار سے رعائتیں حاصل کرنے اور ملازمتوں میں کوٹہ الاٹ کرانے کی کوششیں کررہے ہیں۔ وہ نیچی ذات والوں کی صف میں اپنے آپ کو لانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ اس زمانہ میں جبکہ تعلیم عام ہو چکی ہے۔ اور ہر جگہ "میرٹ" پر داخلہ ہو رہا ہے مسلمانوں کا تعلیمی معیار کو بڑھانے کی کوشش نہ کرنا افسوسناک بات ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم تعلیمی ادارے کچھ کریں بچوں کی تعلیم کا ٹھیک بندوبست کریں بچے پر انفرادی توجہ کریں محنت اور لگن سے پڑھائیں کوچنگ کلاسس کھول کر ان کی کوتاہیاں دور کریں اور بڑے امتحانات کیلئے خصوصی طور پر تیار کرکے اچھے نمبروں سے انھیں پاس کرانے کی کوشش کریں مسلمان بچوں کا درجہ اول میں پاس ہوکر سامنے کے دروازے سے ملازمتوں میں آنا اس سے کہیں زیادہ بہتر اور قابل فخر بات ہے کہ وہ رعائت کے پچھلے دروازے سے داخل ہوں۔ جس طرح لاڈ اور ماں باپ کے بچے محنت و مشقت سے جی چراتے ہیں اور زندگی میں جدوجہد کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اسی طرح وہ قوم جو رعائت اور کوٹے کے زینہ سے اوپر چڑھتی ہے اور کبھی اپنا مقام برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے ملازمتوں میں حصہ ملنا چاہیئے لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ پرائیویٹ جگہ ملازمتیں قابلیت کی بنیاد پر ملتی ہیں۔ اقلیت یا اکثریت کی بنیاد پر نہیں۔ وہاں قابلیت اور صلاحیت کو دیکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک یونیورسٹی کی ڈگریاں ہندوستان کے اکثر علاقوں میں اسلئے قابل قبول نہیں ہیں کیونکہ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ مسلمانوں کو از راہ ہمدردی عنایت کردی جاتی ہیں۔

سرکاری اداروں اور قانون ساز ایوانوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا معاملہ میرے خیال میں بالکل صاف اور سیدھا ہے کیوں کہ اگر یہ کہا جائے کہ عوامی اداروں اور ایوانوں میں مسلمانوں کی موجودگی ضروری ہے اور اس طرح سے مسلم مفادات اور حقوق کا تحفظ ممکن ہے تو یہ بالکل غلط اور بے ہودہ بات ہے مسلمانوں کے بے شمار ممبر پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں ہیں۔ مگر کیا مسلمان قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ان ممبروں نے ان کا کوئی ایک مسئلہ بھی حل کیا ہے کیا ان کی موجودگی سے مسلم مفادات کا تحفظ ہوا ہے کوئی معمولی سی معمولی چیز بھی ان لوگوں نے سرکار سے دلوائی ہے [illegible]

[illegible]

حکومت مسلمانوں کے ممبروں کو خاطر میں کب لاتی ہے۔ اور کسی

بارے میں ان سے مشورہ کب کرتی ہے۔ کئی قوانین ایسے پاس ہوتے ہیں۔ جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا اور ان میں بے شمار نقص تھے۔ مگر مسلمان ممبر اپنی کم علمی کی وجہ سے خاموش رہ گئے۔ مسلمانوں کے نمائندہ ممبروں نے آج تک سوائے وزارت کی کرسی حاصل کرنے کے۔ اپنے عزیزوں کو کوٹہ، پرمٹ، لائسنس الاٹ کرانے، رشوت لے کر تبدیلیاں کرانے۔ تھوڑی بہت جائیداد پیدا کر لینے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔ اپنے اعلیٰ اخلاق اور صفات کو دیکھکر خود مسلمانوں نے انھیں قوم فروش اور بے ضمیر لیڈر کا خطاب دیا ہے۔ جس کے وہ صحیح طور پر مستحق ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ نارائن سوامی جتنا کام مسلمانوں کا کر سکتے ہے محمد حسین نہیں کر سکتا۔ نارائن سوامی کی بات چلتی ہے، محمد حسین کی بات کوئی نہیں سنتا۔ اگر اسمبلی ممبر محمد حسین سرکار کے اعلیٰ عہدہ دار عبد اللطیف سے کچھ کرانا چاہے تو عبد اللطیف نہیں کرے گا۔ لیکن نارائن سوامی سب کچھ کر سکتا ہے اور کرا بھی سکتا ہے۔ اس حالت میں اگر مسلمان رضاکارانہ طور پر غیر مسلموں کو اپنا نمائندہ بنائیں۔ اور اس سے کام لیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور فرقہ واریت کی بنیاد ہی مٹ سکتی ہے۔

مسلم پرسنل لاء

مسلمان جس پرسنل لا کے تحفظ کی، اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرنے کی اور اسے جوں کا توں برقرار رکھنے کی تلقین و تائید کر رہے ہیں وہ دراصل مسلم پرسنل لا نہیں ہے۔ بلکہ ۱۹۳۷ء کا محمڈن لاء ایکٹ ہے جس میں خود علماء کے بیان کے مطابق کئی غلطیاں اور کوتاہیاں ہیں۔ اس ایکٹ میں کئی باتوں کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھے بغیر جوں کا توں رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے بعض فرقوں میں طلاق اور نکاح کی جو روایتیں چلی آ رہی ہیں ان کو بھی پرسنل لا میں جگہ دیدی گئی ہے۔ حالاں کہ ایسی باتوں کو تسلیم کرنا پرسنل لا کا اور شریعت کا مذاق اڑانا ہے۔ قرآن کے حکم کے مطابق مسلمان "ولی" نہیں کر سکتا کیونکہ ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ مگر مسلمان ولی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ترکہ میں سب کا حق مقرر کیا ہے لیکن اس حکم کو پس پشت ڈال کر ترکہ آپس میں تقسیم کر لیا جاتا ہے۔ جہاں تک طلاق کا مسئلہ ہے۔ خود علماء میں بعض بنیادی باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی کہ ایک نشست میں دی گئی تین طلاقیں ایک ہی طلاق کے برابر ہوں گی۔ یا تینوں طلاقیں پڑ جائیں گی اور حلالہ کے بغیر رجعت ممکن نہیں۔ پرسنل لا میں بیان کیا گیا کہ ایک مرد اس وقت تک دوسرا یا تیسرا یا چوتھا نکاح نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ تمام بیویوں کے ساتھ انصاف کرنے اور ان کا حق ادا کرنے کی شرط پوری نہیں کرتا۔ شریعت کہتی ہے کہ مرد کیلئے ایک ہی عورت کافی ہے۔ دوسری اور تیسری کے لئے ضرورت ثابت کرنا چاہئے اور شریعت نے جو اختیارات دیئے ہیں ان کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ جب یہ بات طے ہے کہ موجودہ محمڈن لاء میں غلطیاں ہیں۔ تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آگے بڑھ کر انھیں درست کریں۔ شریعت کے مطابق بنائیں۔ اور عورتوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں۔ وہ دلائیں۔ مردوں کے اختیارات جس کے متعلق وہ خود جانتے ہیں کہ ان کا غلط اور بے رحمانہ استعمال ہو رہا ہے کم کریں ورنہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جبکہ عورتیں خود آگے بڑھ کر اپنا حق حاصل کر لیں گی۔ اور مردوں کو منہ دیکھتے رہ جانا پڑے گا۔ اگر دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں علماء کرام نے قوانین میں صحیح توضیح کر کے انہیں عام فہم بنایا ہے۔ تو ہندستان کے علماء یہ کام کیوں نہیں کر سکتے۔ اور ایک خالص سماجی مسئلے کو سیاسی اور جذباتی بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔

ایک گذارش!

مذکورہ بالا مسائل پر جو آج کل ہر اجتماع، ہر کانفرنس ہر کنونشن میں زیر بحث آتے ہیں۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق روشنی ڈالی ہے اور ان مسائل کو جس نظر سے دیکھا ہے بالکل ویسا ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے سمجھنے میں غلطی کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میں نے حالات اور ماحول کا صحیح جائزہ لیکر ٹھیک کہا ہو۔ فیصلہ قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک آخری گذارش اس سلسلہ میں یہ ہے کہ مسلمان جب تک فرقہ پرستوں کے چنگل سے نہیں نکلیں گے۔ ان کی اشتعال انگیز باتوں کو سننا ترک نہ کریں گے اور کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت نہ ڈالیں گے۔ قدامت پسندی کے خول سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ نئے زمانے کی نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کو سمجھنے اور انھیں پورا کرنے کی عادت نہیں ڈالیں گے اس وقت تک وہ مشکلات و مصائب میں مبتلا رہیں گے اور وقت کا دھارا انھیں پیچھے کی طرف دھکیلتا جائیگا۔ اگر وہ وسیع النظری سے کام لیں اور دوسروں کو بھی اپنا ہم خیال بنائیں تو کوئی مسئلہ ایسا نہیں رہے گا جو حل نہ ہو۔

شریفہ طیب جی

توڑ یہ عہدِ شکن سلسلۂ بند بھی توڑ

مذہب اور اس کی قدریں ذاتیات سے تعلق رکھتی ہیں اگر کوئی نماز ادا کرتا ہے قرآن پاک پڑھتا ہے یا مندر میں جاکر کوئی پوجا کرتا ہے، اپنے گھر پر گیتا کا پاٹ کرتا ہے یا کوئی چرچ جاکر سروس میں شرکت کرتا ہے اور مقدس انجیل کی تلاوت کرتا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اس سے کسی کو کیا سروکار؟ علامہ اقبال کے بقول مذہب بیر نہیں سکھاتا۔ مگر پھر کیوں ہم فرقہ وارانہ منافرت کا شکار ہیں۔ دراصل شرپسند طبیعتیں اور خالی ذہن اپنے فائدے کی خاطر ذاتی معاملے کو عوامی مسئلہ بنادیتے ہیں۔ مفاد پسند پارٹیوں کی ایسی تخریبی کارروائیوں کو روکنا ہم عورتوں کے لئے مشکل ضرور ہے مگر آپس کی بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ نفرت کو ہم اگر چاہیں تو کم ضرور کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ابتدا ہم کو اپنے بچوں سے کرنا چاہیئے۔ بچوں کے ذہن کو "کافر ہندو" اور "ملیچھ مسلمان" جیسی تباہ کن باتوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا جائے بل کہ ابتدا ہی سے ان کے ذہن میں یہ نقش کردیا جائے کہ جو بھید بھاؤ اور تعصب پیدا کرتا ہے وہ مذہب نہیں ہے۔ مذہب تو میل محبت، بھائی چارے اور انسانیت کا سبق دیتا ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کو بتانا چاہیئے کہ جب کوئی پیدا ہوتا ہے تو وہ نہ مسلمان ہوتا ہے نہ ہندو، نہ عیسائی اور نہ سکھ یا پارسی۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں پہلے تو وہ انسان ہوتا ہے اور جسے تم مذہب کہتے ہو وہ مسجد، مندر یا گرجے کا نام نہیں مذہب تو پیار، رواداری، درگزر اور کسی غرض کے بغیر کسی کے کام آنے کو کہتے ہیں۔ ہر مذہب کی جڑ ایک ہی ہے اور کوئی ایک دوسرے کا دشمن نہیں۔ میری رائے ہے کہ ہم اپنے بچوں کو نماز یا پوجا سکھانے سے پہلے انسانیت کی یہ باتیں سکھائیں، دراصل انسانیت کی یہی تعلیم عبادت ہے اور یہی پوجا۔ اپنے بچوں کو عام اسکولوں میں داخل کرائیں۔ مسلمان بچوں کا مسلم اسکولوں یا اردو اسکولوں میں تعلیم پانا ان بچوں کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ اردو اسکول فرقہ پرستی کے جذبے کو فروغ دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان اور ہندو عورتوں کی تنظیموں کا علاحدہ علاحدہ قائم ہونا بھی غلط بات ہے اس سے آپس میں اتحاد پیدا نہیں ہوتا۔ بل کہ دوری بڑھتی ہے اور ہمارے بچے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی اچھائیوں کو سمجھ نہیں پاتے۔

ہمارا یہ توقع کرنا غلط ہوگا کہ ہمارے ایسے مسائل گورنمنٹ ہی حل کرسکتی ہے گورنمنٹ تو ہی یک جہتی کا پلان بنا سکتی ہے مگر اس کے پلان کو عملی جامہ ہم ہی پہنا سکتے ہیں۔ فیملی پلاننگ کی مثال لیجئے۔ اس سلسلے میں گو یہ بات خوشی کی ہے کہ نوجوان طبقہ خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں ہے مگر بزرگ اب بھی اس کے خلاف ہیں۔ اور بعض اوقات وہ اس حد تک مخالفت پر اتر آتے ہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں کو خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کرنے نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اولاد خدا کا تحفہ ہوتی ہے اور پیدا کرنے والے نے روزی دینے کا بھی وعدہ کیا ہے اور جو دولت مند ہیں ان کا دعوا ہے کہ وہ ایک کیا ایک درجن بچوں

کو پالنے کی سکت رکھتے ہیں، پھر فیملی پلاننگ کی کیا ضرورت ہے؟ بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم ہر قدم پر اپنے ہی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں، قومی مفاد کو نہیں۔ جب کہ قومی مفاد در اصل ہر فرد کا مفاد بن جاتا ہے۔ ایک بار میں نے ایک اعلا تعلیم یافتہ خاتون سے فیملی پلاننگ کے متعلق اس کی رائے معلوم کی اس نے بتایا کہ وہ اور اس کے شوہر تو فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں مگر ان کے بزرگ (اس خاتون کے بوڑھے ساس اور سسر) سختی سے فیملی پلاننگ کے مخالف ہیں۔ ان بزرگوں کا کہنا تھا کہ ان کے مذہب نے یہ پیشین گوئی کر رکھی ہے کہ جلد ہی آخری امام کا ظہور ہونے والا ہے اور نہیں معلوم کہ وہ کس گھر میں پیدا ہو۔ اس لئے اولاد کے پیدا ہونے کو روکنا مذہب کے خلاف ہوگا۔ اس بات کا میں نے یوں جواب دیا کہ جب یہ پیشین گوئی ہے تو حالات کچھ بھی ہوں وہ امام پیدا ہو کر رہیں گے کسی کے فیملی پلاننگ پر عمل کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں میں وہ بات یاد دلا دوں جو پاکستان (جسے ایک اسلامی ملک کہا جاتا ہے) کے مرحوم صدر ایوب خان نے اپنے دورِ حکومت میں کہی تھی: "اگر خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب زندہ رہنے کے لئے ایک پاکستانی دوسرے پاکستانی کو مار کر کھا جائے گا۔" یہ بات صرف پاکستان ہی پر صادق نہیں آئے گی بلکہ ہمارے ملک میں بھی یہ بات پیش آ سکتی ہے۔ جیسے زندہ رہنے کے لئے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔

چودہ سو برس پہلے جب اسلام کی ابتدا ہوئی تھی تب عورت کو کچھ حقوق دیئے گئے تھے جیسے تعلیم حاصل کرنے کا حق، شادی اور طلاق کا حق، اور وراثت کا حق۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری حالت کو سدھرتے رہنا چاہئے تھا مگر ہوا یہ ہے کہ الٹے ہمارے حالات بگڑ گئے ہیں۔ حضرت محمدؐ نے فرمایا تھا کہ مرد اور عورت دونوں کا فرض ہے کہ وہ تعلیم حاصل کریں مگر ہوا یہ کہ لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ ان کو روزگار حاصل کرنا نہیں ہے۔ ان کا مقام گھر کا باورچی خانہ ہے اور اپنے بچوں کی دیکھ بھال ان کا کام ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے تعلیم یافتہ شوہروں کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں اگرچہ لڑکوں کو تعلیم حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے مگر وہ بھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان کی مائیں جاہل ہیں یعنی یہ ایک تاریک چکّر ہے کہ ایک جاہل دوسرے کو جاہل بنے رہنے میں مدد دیتا ہے۔ باپ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے سکے اور یہ فرض اس ماں کا ہوتا ہے جو جاہل ہوتی ہے جو اپنے بچے کے لئے تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی، دراصل ایک تعلیم یافتہ ماں ہی اپنے بچے کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہے گی۔

اگر لڑکی ذہین اور ہوشیار ہے تو اکثر والدین اس کو پڑھانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر فائنل ورنا کیولر تک یا زیادہ سے زیادہ میٹرک تک۔ اور میٹرک کے فوراً بعد شادی کی بات طے کر دی جاتی ہے۔ ایک خاتون جن کی بیٹی ایس ایس سی میں زیر تعلیم تھی، بیٹی کی اچھی پڑھائی اور اس کے ذہین ہونے کا ذکر مجھ سے کرنے لگیں اور پھر یہ بھی کہنے لگیں کہ ان کے شوہر اس کی منگنی کر چکے ہیں۔ میٹرک کے بعد شادی کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ جب لڑکی پڑھائی میں اچھی ہے تو اسے آگے کیوں نہیں پڑھاتیں؟ بولیں کہ چاہتی تو میں بھی ہوں کہ میری بیٹی اعلا تعلیم حاصل کرے مگر میرے شوہر طے کر چکے ہیں کہ میٹرک کے بعد بیٹی کی شادی کر دی جائے۔ میں نے دریافت کیا کہ ایک جائز اور درست بات کے لئے بھی آپ شوہر کے سامنے اپنی آواز نہیں اٹھا سکتیں؟ "بہرحال میں عورت ہوں!" یہ اُن خاتون کا جواب تھا۔ عورت اس پوزیشن میں کیوں نہیں ہے کہ وہ ایک درست اور جائز کاز کے لئے بھی اپنے شوہر کے سامنے اپنی آواز اٹھا سکے؟ اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ بات کتنی ہی درست کیوں نہ ہو اگر وہ شوہر کی مرضی کے خلاف اس پر زور دے گی تو وہ گھر سے بے گھر کر دی جائے گی ـــــ بدنصیبی یہ ہے کہ ایسا کوئی قانون ہمارے ملک میں نہیں ہے کہ جو مرد کو روکے کہ وہ بیوی کو نہ ٹھکرائے اور

دوسری شادی نہ کرے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ملک میں اپنے شوہر کے ہاتھوں بیوی کا پٹنا، زدوکوب ہونا اور فاقے کرنے پر مجبور ہونا عام بات ہے۔ اکثر شوہر اپنی برائیوں، غیر ذمہ داریوں اور فرض ناشناسیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر اپنی بیویوں کو بدنام کرنے اور جھوٹے الزام لگا کر رسوا کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اس سلسلے میں یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ بیوی شوہر کی زیادتی برداشت کرتی ہے اگر نہ احتجاج کرتی ہے اور نہ کسی کے سامنے فریاد۔ اس ڈر سے کہ اگر اس کے شوہر نے اس کو چھوڑ دیا تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو کس طرح زندہ رکھے گی۔ چونکہ وہ غیر تعلیم یافتہ ہوتی ہے اس لئے اس کو اپنے پیٹ کی خاطر بڑے ادنا کام انجام دینے پڑتے ہیں۔ مسلمان عورت کو تو عموماً بے معنی اور بے تکے الزام دے کر طلاق دے دی جاتی ہے میں ایک ایسی جوان لڑکی کو جانتی ہوں جس کو شادی کے پندرہ ہی دن بعد طلاق دے دی گئی۔ وجہ صرف یہ بتائی گئی کہ اس کا سر بہت بڑے سائز کا ہے۔ طلاق کے بعد اس لڑکی پر کئی اور جھوٹے الزام لگائے گئے اور اس کو اس حد تک بدنام کیا گیا کہ اس کی دوسری شادی کا ہونا ناممکن ہو گیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ دوسری شادی کر سکتی ہے اور نہ اپنے گزارے کے لئے محنت مزدوری ہی۔

یہ صاف اور واضح بات ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جس فرقے کی عورتیں پس ماندہ ہوں گی وہ فرقہ بھی پچھڑا ہوا ہوگا۔ اور جو فرقہ اپنی عورتوں کے حقوق کی پوری پوری نگہداشت کرتا ہے اور مرد کے مساوی مرتبہ دیتا ہے اور عورتوں کا احترام کرنا جانتا ہے وہی فرقہ ترقی کرتا ہے اور خوش حال رہتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مرد اگر چاہتے ہیں کہ اُن کا فرقہ مجموعی طور پر تعلیم، اخلاق و کردار میں ترقی کرے۔ اُن کو چاہیئے کہ وہ آگے بڑھیں اور ہمارا مرتبہ بلند کرنے میں ہماری مدد کریں۔ ہم کچھ زیادہ نہیں چاہتے ہمارے چند مطالبے ہیں۔

(1) مساوات یعنی مرد کی برابری۔

(2) مرد کو ایک سے زیادہ شادی (دو، دو سے زیادہ نہیں) کی اجازت اسی حالت میں دی جائے کہ جب پہلی بیوی یا کورٹ اجازت دے دے۔

(3) شریعت کی رو سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کا شوہر اس کے ساتھ برا برتاؤ روا رکھتا ہے یا دوسری شادی کر لینے کے بعد وہ برے برتاؤ سے پیش آتا ہے تو وہ اپنے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اگر شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے تو اپنی اور اپنے بچوں کی گزر اوقات کے لئے اس سے خرچ لے سکتی ہے اور انکار کرنے پر وہ طلاق کا مطالبہ [illegible] ساتھ میں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے نان و نفقہ بھی مانگ سکتی ہے۔ ان شرائط کو مسلمان لڑکے [illegible] لڑکی کے نکاح نامے میں واضح طور پر درج ہونا چاہیئے۔

(4) شوہر کی موت کے بعد بیوی کو ورثے میں سے آدھی جائیداد ملنا چاہیئے۔

(5) اگر باپ کی زندگی میں بیٹے کی موت ہو جائے تو بیٹے کی بیوی اور بچوں کو باپ (سسر۔ دادا) کی جائیداد سے حصہ ملنا چاہیئے۔

(6) آخری بات یہ ہے کہ ہندستان کے تمام باشندوں کے لئے یکساں سول کوڈ بننا چاہیئے۔

ہم مسلمان عورتوں کے یہ مطالبے اگرچہ جائز ہیں مگر انقلابی ہیں ہر ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر انقلاب کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے مہاتما پھلے، مہارشی کاروے، اور سرسید احمد خاں کو اپنے اصلاحی اور انقلابی نظریات کی بنا پر بڑی بڑی مخالفتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ہے مگر وہ عزم کئے ہوئے تھے آخر ان کی فتح ہوئی ہمارے مطالبے جائز ہیں، اصلاحی ہیں اور انقلابی ہیں یقیناً ہمیں بھی جدوجہد کرنا ہے ہماری جدوجہد طول بھی پکڑ سکتی ہے لیکن ہمیں بھی اپنے بزرگوں کی طرح عزم سے کام لینا ہوگا اور آخر فتح ہماری ہوگی۔ کیفی اعظمی کی ایک غزل کے چند شعر پیش کر کے میں اپنا یہ مضمون ختم کرتی ہوں ؎

توڑ یہ بند شکن سلسلۂ بند بھی توڑ　　　تیری خاطر ہے جو زنجیر وہ سوگند بھی توڑ
طوق بھی ہے جو زمرد کا گلوبند بھی توڑ　　　توڑ پیمانۂ مردانِ خردمند بھی توڑ
برق طوفان چھلکنا ہے ابلنا ہے تجھے　　　میری غم خوار مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

سعید احمد اکبرآبادی

فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان

اگر ہم دنیا کے حالات کا جائزہ ذرا وسعتِ نظر اور دقتِ نگاہ سے لیں تو معلوم ہوگا کہ آج ہر جگہ دو ہی طاقتیں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما ہیں۔ ایک رجعت پسند طاقت اور دوسری ترقی پسند۔ ان کے روپ اور شکلیں صورتیں نوع بنوع اور رنگ برنگ ہیں لیکن بنیادی طور پر یہی دو طاقتیں جو جنگِ عظیم اول کے بعد سے مسلسل باہم گرمِ معرکہ آرا ہیں۔ اگر اسلام ایک فعال اور موثر طاقت وقوت کی حیثیت سے کہیں موجود ہوتا تو ثالث بالخیر بن کر اس قضیۂ نامرضیہ کا فیصلہ کر سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ واللہ غالب علی امرہٖ۔ ہندوستان جو اس قدر وسیع وعریض ملک ہے اور جہاں دنیا کے ہر مذہب و ملت اور ہر نسل کے لوگ رہتے ہیں وہ کس طرح الگ تھلگ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان دونوں طاقتوں کا رزم گاہ بنا ہوا ہے اور بہ نظرِ حالاتِ موجودہ یہ جنگ ابھی جلد اور بغیر کسی انقلابِ عظیم کے ختم ہونے والی نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ (فرقہ وارانہ) فسادات کو بھی اسی پس منظر میں دیکھیں اور اسی کی روشنی میں اپنے واسطے کوئی راہِ عمل متعین کریں۔ یہ جو کچھ ہے محض ایک سیاست کا کھیل ہے اور سیاست بھی وہ جس میں ملکی اور غیر ملکی سیاستوں کے دھارے آکر مل گئے ہیں۔ سنہ ۴۶ء کی بات ہے کہ کلکتہ میں بڑے زور کا ہندو مسلم فساد ہوا۔ میں اس زمانہ میں وہیں تھا۔ اس فساد کی شدت اور پھیلاؤ سے پریشان ہو کر میرے ایک نہایت معزز اور نامور مسلمان دوست جو شیاما پرشاد مکرجی سے خصوصی تعلق رکھتے تھے ایک دن اُن کے یہاں پہنچے اور بولے: "مکرجی صاحب! آپ نے میرے اوپر بڑی بڑی عنایتیں کی ہیں لیکن اب ایک آخری عنایت اور کر دیجیے اور وہ یہ کہ مجھ کو یہ مشورہ دیجیے کہ میں یہاں ہندوستان میں رہوں یا پاکستان چلا جاؤں؟" مکرجی نے یہ سن کر قہقہہ لگایا اور بولے: "ارے تم بھی ڈر گئے!" اور اس کے بعد کہا: "جو کچھ ہو رہا ہے محض سیاست کا ایک کھیل ہے ورنہ ہندو مذہب بھی دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا معاملہ کرنا سکھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس ملک پر آٹھ سو برس تک حکومت کر سکے۔ تم یہیں رہو اور دل مضبوط کر کے رہو۔ مجھ کو یقین ہے کہ مسلمان اس ملک میں عزت و آبرو اور اپنے کلچر اور مذہب کے ساتھ رہیں گے۔" ہر شخص جانتا ہے یہ شیاما پرشاد مکرجی ہندو مہاسبھا کے صدر اور اس کے بڑے پرجوش لیڈر تھے لیکن شاید آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو کہ یہی وہ مکرجی تھے جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں بڑے ارمان سے یونیورسٹی میں ایک مستقل شعبۂ اسلامی تاریخ و ثقافت (DEPARTMENT OF ISLAMIC HISTORY & CULTURE) کھولا تھا اور ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کو لکھنؤ سے بلا کر اس شعبہ کا اور عربی کا پروفیسر اور صدر بنایا تھا۔ اور آج بھی یہ شعبہ کلکتہ یونیورسٹی کا نہایت وسیع اور ترقی یافتہ شعبہ ہے۔ چنانچہ فرقہ وارانہ فسادات کا مذہب یا فرقے سے ہرگز کوئی تعلق

نہیں ہے یعنی عمومی حیثیت سے ورنہ یہ بہت ممکن ہے کہ اکثریتی فرقے کے جاہل اور نہایت غالی قسم کے بعض افراد مسلمانوں کو ملیچھ سمجھ کر بھارت کی سرزمین کو ان کے وجود سے پاک کرنے کو اپنا فریضہ ہی سمجھتے ہوں لیکن اس قسم کی عصبیت اور مذہبی غلط اندیشی ہندوؤں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہر مذہب میں اس قسم کے افراد کم و بیش ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کو ہی ملاحظہ فرمایئے وہ صرف ایک سیاسی تحریک تھی مذہب سے اسکا کوئی تعلق دور کا بھی نہیں تھا۔ لیکن کتنے بھولے بھالے اور جذباتی مسلمان تھے جو اس چکر میں آ گئے اور اس تحریک کی تائید کو ایک مقدس مذہبی حکم سمجھنے لگے۔ بہر حال اس قسم کے مذہبی دیوانے (FANA TIES) ہر مذہب و ملت میں ہمیشہ ہوتے آئے ہیں۔ اس لئے اگر ہمارے ملک کی اکثریت میں بھی ایسے افراد موجود ہیں تو یہ نہ کوئی عجوبہ بات ہے اور نہ انہونی! لیکن آج کی دنیا میں اس قسم کے لوگوں کا کوئی مقام اور مستقبل میں انکے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اصل محرکات صرف سیاسی ہیں اور سیاست نے بسا اوقات مذہب کو اپنے لئے آلہ کار کی طرح استعمال کیا ہے

میں اسی سلسلے میں اس ملاقات کا ذکر کروں گا جو چوبیس برس پہلے سورگیہ پرشوتم لال ٹنڈن سے ہوئی تھی۔ فسادات کے موضوع پر بہت دیر تک گفتگو ہونے کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا تھا: "لیکن یہ بھی بتایئے کہ مسلمان کیا کریں؟" ٹنڈن جی نے فرمایا تھا:-

اس وقت مسلمانوں کے لئے (اور خود ہمارے لئے بھی) سب سے زیادہ تشویش کی جو بات ہے وہ فسادات ہیں جو ایک لاوے کی طرح پھٹ پڑے ہیں اور جن سے مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصانات ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ حکومت کو بڑی قوت اور مستعدی کے ساتھ ان فسادات کو ختم کرنا اور فسادات کے اسباب و وجوہ پر کڑی نظر رکھنا چاہیئے۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے میرا مشورہ یہ ہے کہ مسلمان صبر و ضبط اور تحمل و برداشت سے کام لیں اور کم از کم دس برس کے لئے یہ عہد کر لیں کہ ہندو لیڈر یا ہندو اخبارات ان کو خواہ کتنا ہی برا بھلا کہیں، کیسی ہی جلی کٹی سنائیں، ملک دین اردو زبان کی مخالفت کریں اور ان کے خلاف دوسری اشتعال انگیز باتیں کہیں بہر حال مسلمان خاموش رہیں سنی ان سنی کر دیں اور انکی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیں کیوں کہ اگر انھوں نے جواب دیا تو جواب در جواب کا چکر چل پڑے گا اور اس کے باعث دونوں فرقوں میں جو خلیج حائل ہے وہ کم ہونے کے بجائے وسیع سے وسیع تر ہوتی رہے گی اور فرقہ پرستی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا اور چونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں اس بنا پر ان کی فرقہ پرستی تو ہندوؤں کو ایسا کچھ زیادہ نقصان پہونچا نہیں سکے گی۔ البتہ ہندو جو بڑی بھاری اکثریت میں ہیں اُن کی فرقہ پرستی مسلمانوں کو پنپنے نہیں دے گی۔

بہر حال جو کچھ ہوا سو ہوا۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ اب تعمیری جد و جہد کے لئے کمربستہ ہو کر عزم و ہمت کے ساتھ میدان عمل میں گامزن ہوں، اور اس کے لئے سب سے مقدم اور ضروری یہ ہے کہ وہ احساس کمتری کا لبادہ اتار پھینکیں خود اعتمادی پیدا کریں۔ فسادات کی شدت اور ان کے تسلسل سے بددل اور ہراساں نہ ہوں۔ انھیں سمجھنا چاہیئے کہ آج وہی تنہا اس ملک میں پریشان نہیں ہیں بلکہ افریقہ اور ایشیا کے نو آزاد ملکوں میں ملک و صنعت کو تو میانے کی جو تحریکیں بڑے زور و شور سے چل رہی ہیں انھوں نے کروڑوں انسانوں کو چشم زدن میں بے خان و مان بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ آگ روز بروز پھیل رہی ہے۔ جو لوگ آج آرام و چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کل ہوا کا رخ کیا ہوگا اور وہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان ہر اعتبار سے یعنی جائے پیدائش اور سکونت دونوں کے لحاظ سے ان کا وطن ہے اور اس بنا پر جس یقین اور بھروسہ کے ساتھ وہ اس ملک میں اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کر سکتے ہیں کسی دوسری جگہ نہیں کر سکتے۔ رہا اطمینان اور سکون نفس! تو

خون دل [illegible] متاع حیات   فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

نشتر خانقاہی

مسلمان اور حرفِ آخر

چند سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک شام عصر کی نماز کے وقت میں اپنے گاؤں کے مکان کے مردانے میں کچھ الجھا الجھا سا بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک تبلیغی جماعت میری طرف بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت میری ذہنی حالت کچھ ایسی تھی کہ میں اس اچانک حملے کیلئے تیار نہ تھا پھر بھی میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور ذرا الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ علیک سلیک کے بعد جوں ہی انھوں نے میرے لئے مسجد میں چلنے کا حکم صادر کیا تو ذرا سنبھل کر اور انتہائی نرم لہجہ میں، میں نے ان سے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کے پاس کچھ پیسے ہیں۔۔؟"

میرے اس عجیب سے غیر متوقع اور چونکا دینے والے سوال پر جماعت کے افراد نے پہلا تو حیرت کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پھر چند لمحے چپ رہ کر امیرِ جماعت نے مجھ سے کہا۔

"حضرت! آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لئے ـــ میں نے ان سے کہا۔ میرے پڑوس میں ایک غریب بیوہ رہتی ہے جو تین دن سے نمونیہ میں مبتلا ہے اور آج دوپہر سے اس کی حالت بہت خراب ہے۔ غربت اتنی ہے کہ دوا علاج کیلئے اس کے پاس پیسے نہیں۔ لاوارث اتنی ہے کہ ڈاکٹر تک پہنچانے کیلئے اس کے پاس کوئی آدمی نہیں۔ چلئے کچھ پیسے میں دیتا ہوں کچھ آپ دیں اور اسے ڈاکٹر تک لے چلیں، ہو سکتا ہے کہ آپ حضرات کی مدد سے اس کی جان بچ جائے۔"

میں نے دکھ کے ساتھ دیکھا کہ امیرِ جماعت کے چہرے پر بددلی بلکہ کراہت کی ایک لہر آئی اور اس نے ایک ایسے بے تعلق لہجہ میں، جس میں شرمندگی کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، مجھ سے کہا۔ "چلئے نماز کیلئے چلتے ہیں، عصر کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ نماز کے بعد مریضہ کے لئے دعا خیر کریں گے۔ خدا بڑا کارساز ہے اور حکیم مطلق ہے۔ شفا دے گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ میرے خون کی حدت بڑھ [illegible] ہے اور غصہ میری کنپٹیوں سے چل کر ریڑھ کی ہڈی تک اتر آیا ہے۔ میں نے کہا۔

"آپ جا سکتے ہیں لیکن یہ بتاتے جائیے، کیا انسانی جان ایک وقت کی نماز کے برابر بھی نہیں؟ تف ہے آپ پر اور آپکے تبلیغی مشن پر ـــ"

یہ واقعہ میں نے صرف اسلئے دوہرایا ہے کہ اس سے اس قوم کے اخلاقی اور ذہنی زوال کا ایک ترچھا رخ سامنے آتا ہے۔ اور یہ حقیقت پوری طرح کھل جاتی ہے کہ ارکانِ مذہبی، جو آدمی کو بہتر بنانے کا وسیلہ تھے مقصود بالذات ہو گئے ہیں۔ مسلمان صوم و صلواۃ اور حج و زکواۃ جیسے فرائض کو نیکی مان کر چلتا ہے۔ یہ نہیں مانتا کہ ان فرائض کی پابندی سے ذہن جن نیک کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے، دراصل نیکی وہ ہیں، یہ نہیں۔ یہاں گویا مذہب کی وہ اسپرٹ ہی ختم ہو جاتی ہے جو نماز روزے کے حیلے سے آدمی کو سچ مچ کا آدمی بنانے، دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونے، اور دوسروں کے کام آنے والا آدمی بنانے کیلئے پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح مذہب کے پردے میں نیکی کا ذہنی مفروضہ تو باقی رہ جاتا ہے اس کا عملی روپ باقی نہیں رہتا۔ آج اخلاقیات کی تاریخ میں مسلمان کی مذہبی پوزیشن یہی ہے۔

یہاں ایک گستاخانہ جملہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جی بھی نہیں چاہتا بلکہ یہ جملہ لکھنا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ اگر میں اس کو نہیں لکھوں گا تو اپنی بات آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ صاحب نے اپنے آپکو خاتم الانبیا اور اپنے کلام کو دنیا کا آخری مذہب کہکر جہاں اسلام کو اور ساتھ ہی اپنی نبوت کو تاریخی نقطۂ نظر سے ہمیشگی بخشش دی وہیں قانونِ ارتقاء نے اس میں کچھ ایسی پیچیدگیاں بھی پیدا کر دیں جن کا حل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ حرفِ آخر کا مطلب ہوتا ہے ارتقاء، پھیلاؤ، بڑھوتری، تغیر اور تبدل کی رفتار پر فل اسٹاپ لگانا۔ فل اسٹاپ تو لگ گیا لیکن فل اسٹاپ لگ جانے سے مذہب کے ڈھانچہ میں اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہن میں جس طرح کی Rigidness جس طرح کا تحجر پیدا ہوا۔ اس نے آگے بڑھنے، وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرنے اور تاریخ کے تقاضے کے مطابق اپنے آپکو ڈھالنے کی ساری صلاحیتیں مسلمانوں سے چھین لیں کسی آئین یا نظام حیات میں flexibility یا لچک موجود نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ایک دن اس کا مقدر یہ ہوگا کہ وہ یا تو آثار قدیمہ کا کوئی نقش بن جائے یا میوزیم میں رکھی ہوئی کوئی کرم خوردہ کتاب۔

راہول سانکرتائین نے اسلام کا سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے ایکبار یہ لکھا تھا کہ اسلام دراصل قبائلی عہد سے جاگیرداری عہد کی طرف اٹھا ہوا ایک قدم تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام جن دنوں معرضِ وجود میں آیا ان دنوں عرب کے چاروں طرف شہنشاہیت کا جاگیردارانہ نظام اپنی تمام تر سخت گیریوں اور اندرونی تضادات کے ساتھ موجود تھا۔ اس ماحول میں اسلام کا بظاہر جمہوری ڈھانچہ (اگرچہ اس کی بنیاد بھی جاگیرداریت پر تھی۔) یقینی طور پر لوگوں کیلئے کشش کا سبب بنا ہوگا۔ لیکن چونکہ فضا یا انسانی زندگی کا ارتقائی اسٹیج شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام حیات کے فروغ اور اس کے استحکام کیلئے پوری طرح سازگار تھا۔ اسلئے بعد کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جہاں جہاں بھی اسلام پہنچا تاریخ کے انھیں سوتوں میں جذب ہوتا گیا گویا اسلام بھی اپنے معاصر مذہبوں کی طرح جاگیرداری عہد کے عروج و زوال کی تاریخ ہے لیکن دیگر مذاہب میں اور ان کے ماننے والوں میں چونکہ مذہب اور نبوت کے "آخرالزماں" ہونے کے تصور سے Rigidness پیدا ہوتی ہے وہ نہیں تھی۔ اس لئے دیگر تمام مذاہب کے پیروکاروں نے کسی نہ کسی حد تک بلکہ بڑی حد تک اپنے آپ کو بدلتے ہوئے وقت کے مطابق ڈھال لیا لیکن مسلمان چونکہ آسمان سے اترے ہوئے "آخری نظام زندگی" پر بالکل آخری ہونے ... کسی بھی لحاظ سے ناقابل ترمیم ہونے پر ایمان لے آیا تھا۔ اسلئے ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔ اس طرزِ فکر نے جہاں اور بہت سی خرابیاں پیدا کیں وہیں علمائے دین کو مولویوں اور ملاؤں کو سب سے اعلیٰ درجہ دیدیا۔ اس طرزِ فکر کا منطقی نتیجہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے مستقل ڈھانچہ میں وقت کی ضرورت کے مطابق کسی ترمیم یا تبدیلی کی گنجائش تو تھی ہی نہیں، ایسے میں علمائے دین کی بن آئی اور انھوں نے جو کچھ بھی صحیح یا غلط، اچھا یا برا، ضروری یا غیر ضروری کہا اسے بھی اسی طرح حرفِ آخر مان لیا گیا۔ اگر اسلام کے نظام حیات میں تھوڑی سی لچک کی گنجائش بھی رکھی گئی ہوتی تو اس کا لازمی نتیجہ نکلتا تھا کہ پرانے اور دقیانوسی خیالات کے ذہن آپ ہی آپ رد ہوتے رہتے اور دنیا کی ارتقائی رفتار کا ساتھ دینے والے ذہن رہنمائی کا فرض انجام دیتے۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ دنیا اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور مسلم عوام کی رہنمائی وہ لوگ کرتے رہے جن کا فیصلہ ہی یہ تھا کہ اپنے آپکو چودہ سو سال پہلے کے احول سے آگے مت نکالو کہ یہ اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہے۔ ہمارے ہر عمل کا فیصلہ ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچا۔ جو ان قدیم دستاویزات کو اپنی بغلوں میں دبائے ہمیں ثواب و عذاب کے وہ نکات سمجھا رہے تھے۔ جن میں زمانے کا ساتھ دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ آج ہمارے اور عہد حاضر کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، اور یہ صدیوں کا فاصلہ اگر کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیا جائے تو اس طرز فکر نے ایک عام مسلمان کی ذہنی اور عملی زندگی میں جو خوفناک تضاد پیدا کر دیا اور اس تضاد نے مسئلوں میں جو شدت اور پیچیدگی پیدا کی ہے۔ اس کا حل کیا ہو۔ زمانے کے تقاضے دھکے دے دے کر ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ بدلو، اور دینِ آخر کا تحفظ کرنے والی مولویت کا دبدبہ ہمیں روک رہا ہے کہ دیکھو تبدیل نہ ہونے ورنہ جہنم کا دہانہ منہ پھاڑے بیٹھا ہے۔ اس کشمکش نے ایک ایسے تضاد کی صورت اختیار کر لی ہے کہ آج کا مسلمان ایک عجیب طرح کی دوعملی زندگی جینے پر مجبور ہے۔ مذہب کی ساری روایت پر عمل سے حل کرنا ہمیں رسول تک پہنچی ہے اور اس سے آگے آیت ہے۔ تعداد ازدواج، تقسیم ملکیت، تولیت، طلاق، ارث، تولید اور اسی طرح کے اور کتنے مسائل ہیں جو ظاہر ہے اسلام کے بنیادی ارکان میں تعینات ... کا درجہ نہیں رکھتے اور اگر ضرورت پڑے تو انھیں سوسائٹی کی بہتر تعمیر کے لئے تبدیل کرنے کی اجازت بھی ہونی چاہیئے۔ لیکن نہیں، جب کبھی ترمیم و اصلاح کی بات آتی ہے تو ہمیں رسول اور احکام الٰہی کے "حرف

آخر" کے ساتھ بندھے ہوئے مسلمان کا ذہن چیخ اٹھتا ہے کہ یہ پاپ ہے، گناہ عظیم ہے اسلامی معاشرہ میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔

کیوں؟ اسلامی معاشرہ میں یہ انتہا پسندی پیدا ہونے کا سبب کیا ہے محض یہ کہ تیرہ سو سال پہلے سے ہم یہ ایمان لے کر چلے ہیں۔ اور یہ ایمان ہماری رگ ریشے میں سرایت کر گیا ہے کہ ہمارا دینی نظام مکمل اور ناقابل ترمیم ہے۔ یہاں ایک زبردست ٹریجڈی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جس نظام زندگی کو ایمان کا درجہ دیتے ہیں، عمل کی دنیا میں اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کوشش نہیں کرتے۔ لہٰذا ذہنی اور عملی زندگی کے درمیان اتنا ہولناک خلا پیدا ہو گیا ہے کہ جب تک اس ذہن میں تبدیلی واقع نہیں ہو گی اس خلیج کو پاٹنے کی کوئی صورت نہیں نکلے گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اسلامی قوانین سب کے سب بدل دینے کے قابل ہیں یا ان کو بدل دینا چاہیئے۔ لیکن وہ تمام مفروضے، زندگی کا وہ تمام نصاب جس کے بہت سے فروعی اور فاضل گوشے مسلمان کی ارتقائی زندگی کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہیں ان کو توڑا جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی مرتے ہوئے بیمار کیلئے آکسیجن پلانٹ۔

اپنے معاشرے کی ہر چیز کو "حرف آخر" سمجھنے کی برائی نے جمود کی جو کیفیت پیدا کی ہے اس کا سب سے بڑا اور ناقابل تلافی نقصان مسلمان قوم کو یہ پہنچا ہے کہ جاگیردارانہ تہذیب کے بعد جس صنعتی تہذیب نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے، مسلمان نے اس سے اپنا تعلق قائم نہیں کیا۔ اور اس طرح اس کے عروج کی داستان شہنشاہیت کے عہد سے آگے نہیں بڑھی۔

آج کے ٹیکنیکل دور میں مسلمان سے زیادہ نان ٹیکنیکل قوم کوئی دوسری نہیں ہے۔ یہ بات میں صرف ہندستانی مسلمان کے بارے میں نہیں کہہ رہا۔ پورے عالم اسلام کے بارے میں میرا تجزیہ یہی ہے۔ عرب کے روایتی بہادر اسرائیل کے جنگ بازوں سے شکست کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ یہودیوں کے مقابلہ میں تعداد میں کم تھے یا ان کے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی۔ یا وہ خدا پر اتنا یقین نہیں رکھتے جتنا یہودی رکھتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سائنس کے اس عہد میں ان کا مزاج انتہائی غیر سائنسی، غیر منطقی اور انتہائی نان ٹیکنیکل ہے۔ دولت کی ان کے پاس فراوانی ہے لیکن جدید علوم کا فقدان ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ پچھلی جنگ میں لوگوں نے دیکھا ہے کہ سوویت روس کے وہ جنگی ٹینک جو یہودیوں کی گولہ باری سے ناکارہ ہو جاتے تھے، یہودی انھیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے اور اگلے چوبیس گھنٹوں میں اپنے ملک کے جنگی صنعت کے مراکز میں ان کی مرمت کر کے انھیں ان ہی کے مالکوں یعنی عربوں کے خلاف استعمال کرنے لگتے۔ جہاں ایک طرف ٹیکنیکل مہارت کا یہ عالم ہو اور دوسری طرف صرف اللہ کا نام، وہاں ہار جیت کا فیصلہ جنگ لڑنے سے پہلے ہی ہو جاتا ہے

یہ صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ جاگیرداری عہد کی آخری حد پر اپنی زندگی کے شب و روز ختم کر دینے والے مسلمان کا ذہن کتنا غیر منطقی، غیر سائنسی اور غیر ٹیکنیکی ہے۔ وہ اس نکتے کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ کہ آج جو قوم ٹیکنیکل طریقوں سے جینا نہیں جانتی وہ دراصل جی ہی نہیں سکتی۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی عورتیں تو کیا، عام طور پر مرد بھی اپنے اپنے گھروں میں بجلی کا سوئچ آن کرتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں انھیں بجلی نہ پکڑ لے۔ ظاہر ہے کہ اس حد تک قدیم ذہن وقت کے جدید ترین تقاضوں کا ساتھ کہاں تک دیگا اور کیسے دے گا۔

مسلمان کا مسئلہ دراصل سیاست کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ہے انسان کی ارتقائی زندگی کے منطق کا۔ جو لوگ سیاست کے وسیلے سے ہندستانی مسلمان کے مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل غلطی پر ہیں اور وہ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی جگہ دانستہ یا نادانستہ ان کے مسائل کو بڑھانے یا ان میں پیچیدگیاں پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

تقسیم کے فوراً بعد یہ بات طے ہو گئی تھی کہ سیاست کی بساط پر مسلمان بازی ہار گیا ہے۔ اور نہ صرف بازی ہار گیا ہے بلکہ کئی طرح کے معاشرتی، ذہنی، سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل کا شکار ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان مسائل کا حل انھیں بنیادوں کی تہہ میں تلاش کیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن مسلم قائدین نے نہ مسلمان کے معاشی مسائل کی طرف توجہ دی۔ نہ تعلیمی، تہذیبی اور نفسیاتی مسائل کی طرف توجہ دی۔ انھوں نے ہر مسئلہ کا علاج سیاسی داؤ پیچ میں دیکھا۔ نتیجہ جس کا یہ ہوا کہ مسائل بڑھتے گئے اور مسلم قوم دوسری قوموں سے الگ تھلگ ہو کر زوال کے آخری کنارے پر آ گئی۔ آج حالت یہ ہے کہ مسلم قوم نے سیاست اور مذہب کو ملا کر ایک ایسی "کاک ٹیل" تیار کر لی ہے کہ جس کے نشے نے اسے بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم

کردیا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ملک کے موجودہ جمہوری سیٹ اپ میں مسلمانوں کی جداگانہ "مذہبی سیاست" کی کیا اہمیت ہے؟ اب وہ اپنے ان مخصوص سیاسی ذرائع سے کیا فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ کیا اب اس کی کوئی توقع باقی ہے کہ اس ملک پر کوئی اور پاکستان جنم لے گا۔ یا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان کی اس مذہب آمیز سیاست کے بل بوتے پر اس ملک میں کوئی اسلامی طرز کا نظام قائم ہونا ممکن ہے؟ اگر نہیں تو اس سیاسی غلط کاری کا فائدہ کیا ہے؟

اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر ہم چاہتے کیا ہیں؟ تو اس کا ایماندارانہ جواب ہوگا کہ ہم بحیثیت ایک مسلمان قوم کے مطمئن خوشحال باعزت متمدن، شائستہ اور ترقی یافتہ زندگی جینا چاہتے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان چیزوں کو حاصل کرنے کیلئے مذہب کام آسکتا ہے یا سیاسی حربے؟ یا پھر وہ ذہن جو عقلیت پسند اور بیدار قومیں اپنے کو تعلیمی تہذیبی اور تمدنی بلندیوں پر پہنچانے کیلئے استعمال کرتی ہیں۔

اپنی ساری اجتماعی قوت پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں چند سیٹیں حاصل کرنے کیلئے لگا دینا زیادہ ضروری ہے یا یہ بات ضروری ہے کہ ہم اپنی قوم میں بہتر سائنس داں، بہتر کاری گر، بہتر انجنیئر، بہتر ڈاکٹر اور بہتر صنعت کار پیدا کریں۔ اور وہ پوزیشن اختیار کرلیں کہ ہمیں بھیک کی طرح سیاسی مراعات مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

مدت تک ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر غور وخوض کرنے کے

دیتی ہیں، یہ پابندی لگادی جائے کہ وہ اپنا نصاب تعلیم بدل دیں۔ اپنے یہاں ٹیکنیکی اور صنعتی شعبے قائم کریں۔ جب صنعتی یا ٹیکنیکی انداز پر ذہن کی پرورش ہوتی ہے تو دھیرے دھیرے سوچنے سمجھنے کے سارے طریقے بدل جاتے ہیں۔ فرار کی کیفیت زائل ہونے لگتی ہے تو قوم کا رجحان تعمیری کاموں کی طرف لگ جاتا ہے۔ اگر اس نہج پر کام نہیں کیا جاتا تو ظاہر ہے کہ سیاست کے ذریعہ مسلمان کے مسائل حل نہیں ہوں گے اور پوری قوم مسلم مبلغوں کے بتائے ہوئے "حرف آخر" کے دائرے میں کولھو کے بیل کی طرح گھومتی رہے گی۔

بعد میں ایمان داری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک واضح اور مکمل ذہنی تبدیلی کے بغیر سیاست کے راستے سے ان مسائل کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ اور جہاں تک ذہنی تبدیلی کا سوال ہے وہ آپ ہی آپ آسمان سے نازل نہیں ہوگی۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں ذہنی طور پر اپنے آپ کو تبدیل کرنا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اس ذہنی تبدیلی کو لانے کیلئے ہمیں سب سے پہلے اور سب سے بڑے کس محاذ پر جنگ کرنی ہے

میں سمجھتا ہوں کہ آج پوری قوم کو یہ فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ وہ اپنی جداگانہ سیاست سے ہمیشہ کے لئے تائب ہوکر اپنی ساری صلاحیتیں زیادہ مفید اور زیادہ تعمیری کاموں کی طرف لگائیں۔ سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت تو یہی ہے کہ تمام مذہبی اور نیم مذہبی درس گاہوں پر جو ہر سال ملاؤں کی ایک مکمل کھیپ تیار کرکے بازار میں بھیج

نہ بات بڑھانہ داڑھی

ایک مولوی نخشی متوکل علامہ اقبالؔ کے پاس اکثر و بیشتر آتے اور اپنی وراثت کے جھگڑوں سے متعلق ان سے مشورہ لیتے۔ مگر ہر بار کچھ وعظ بھی فرماجاتے۔ اقبالؔ سے یہ بھی کہتے کہ آپ عالم دین ہیں اور شریعت حقہ کے حامی ہیں۔ مگر آپ داڑھی نہیں رکھتے جو ایک اسلامی شعار ہے۔ ایک روز ان کی تلقین کا ایسا اثر ہوا کہ اقبال نے ان سے کہا کہ ہم آپ ایک معاہدہ کریں مسلمان کے چہرے پر داڑھی نہ ہونا بھی ایک شرعی نقص اور کوتاہی ہے اور اپنی بہن کو وراثت سے محروم کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک شدید قسم کی معصیت اور شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ لاؤ بات بڑھائیے میں داڑھی بڑھاتے لیتا ہوں بشرطیکہ آپ اپنی بہن کو وراثت سے محروم نہ کریں۔ مگر نہ مولوی صاحب کا بات آگے بڑھا نہ اقبالؔ کے چہرے پر داڑھی بڑھی۔

سی. ایل. کاوش

سیاست اور اقلیت

اس زمانے کی دو بڑی طاقتیں ۔ امارت اور سیاست!
اس دور کی دو بڑی لعنتیں ۔ امارت اور سیاست!

یعنی دھنوان اور سیاستداں ۔ ایک کے پیچھے بھانڈ چلتے ہیں ۔ دوسرے کے پیچھے ہاتھی۔ جن کے پاس یہ دونوں طاقتیں ایکساتھ آجاتی ہیں اُن کے سامنے مورخ کا قلم وقت کے رخ کو بدل دیتا ہے۔ منصف کی ترازو اُن کے اشارے پر قانون تولتی ہے اور مذہب کی کمر لچک جاتی ہے ۔ حکمران عموماً دولت مند بھی ہوتے ہیں ۔ اور سیاست داں بھی گورے امیر ایکسپلائٹرز ، بورژوا ، ظالم اور ڈاکو کہلاتے ہیں ۔ گورے سیاستدانوں کو حکومت کے بھوکے ، سنگدل ، چال باز اور عوام کا قاتل کہا جاتا ہے ۔ گویا دولت اور سیاست دونوں انسانیت کیلئے زہر ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض لوگ اپنے خلوص سے اس زہر کو تریاق میں بدل دیتے ہیں ۔ جیسے چانکیہ یا جیسے بھاما شاہ ۔ ایک جنگل میں رہتا ، بچوں کو پڑھاتا اور اپنا پیٹ پالتا ۔ دوسرے نے اپنی دولت دیکر ایک ٹوٹے ہوئے بہادر کو اکبر کے خلاف کھڑا کر دیا تھا ۔

آج دولت مند روپے اچھالتے ہیں ، ایمان داری کی حدود کو پھلانگتے ہیں ۔ سود بیاج کا جال پھیلاتے ہیں اور دنیا کے سرمائے پر قبضہ کرنے کو بزنس کہتے ہیں ۔ ویسے کاروبار کے اصول سے گاہک کو لوٹنا مقصد نہیں ہوتا ۔ مقصد ہوتا ہے واجبی دام لے کر اچھا مال دیکر گاہک کے کام آنا ۔ عرب کی تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں کہ دکان دار کی عدم موجودگی میں نوکر نے کپڑا بیچا ۔ گاہک لے کر چلا گیا ۔ دکان دار آیا ۔ نوکر نے کپڑا بیچنے کی اطلاع دی ، مالک فوراً گاہک کے پیچھے دوڑا میلوں پیچھا کرنے کے بعد گاہک تک پہنچا اور اسے بتایا کہ اس کپڑے میں کھوٹ ہے ، ملازم نے بھول سے آپ کو یہ کپڑا بیچ ڈالا ۔ دام واپس لے لو اور کپڑا دیدو ۔ گاہک نے کپڑا واپس نہ لیا اور کہا کہ ایمان داری کی کھوٹ بھی قبول ہے ۔ مگر آج کے سیاست دانوں نے ملک و قوم کی خدمت کے لئے اپنی بساط نہیں بچھائی ۔ بلکہ ان کی بساط سیاست ہے اپنی مطلب براری کے لئے اور ہر وہ اقلیت ان کی بساط کا مہرہ ہے ۔ جو اکثریت سے خائف رہتی ہے ۔ اور جس کو کسی بھی بات پر اکثریت کے خلاف صف آرا کیا جا سکتا ہے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کی سیاست اپنے جلو میں اکثریت لیکر چلتی تھی ۔ مگر اکبر کے زمانے میں تو اقلیت کو ساتھ لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ سرکار کا کہنا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی ہے ۔ لیکن اکبر نے مراٹھوں اور راج پوتوں میں کبھی دوستی نہ ہونے دی ۔ اور یہی اس کی سیاست تھی ۔ وہ اکثریت کے چنیدہ اشخاص کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھا جو ظاہر ہے اقلیت بن جاتے تھے ۔ مہارانا پرتاپ کا بھائی راجہ مان سنگھ چنیدہ اقلیت کا سردار تھا ۔ اس نے اکبر کی دہلیز پر اپنا ماتھا ٹیکا ، مذہب کی کمر لچک گئی ۔ اور اکثریت کی بیٹی جہیز میں ہندو دھرم کی آن لے کر اکبری خواب گاہ کی زینت بن گئی ۔ اکثریت نے اس نئے رشتے کو دھرم اور کرتویہ کا نام دیدیا ۔ ہندوؤں نے کہا کہ راجا وشنو کا انش ہوتا ہے ' دھرم نشٹ ہندوؤں نے مسلمان بادشاہ میں

وہ اَنش دیکھ لیا تھا اور اکبر نے اپنی اسلامی کلغی کو کھڑکی دار پگڑی میں چھپا کر مہابلی کی پدوی پالی تھی۔ مگر اکبر کی اولاد ہندو دھرم کی بیٹی کی کوکھ سے جنم پاکر اور شراب پی کر بھی مسلمان بنی رہی۔ پھر بھی اکبری رواداری کی لہر شاہجہانی دور تک رواں دواں رہی۔ اور آخر میں اورنگ زیبی چٹان سے ٹکرا کر مٹ گئی اور مہابلی کی پدوی پانے والا خاندان اپنے اختتام پر پہنچ کر رحمت اللہ علیہ بن گیا۔

اورنگ زیب کی پیشانی پر جہاں اسلامی پاکیزگی کی محراب نظر آتی ہے وہاں اپنے بھائیوں کے خون کا قشقہ بھی چمکتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ دراصل یہ سیاست تھی اور اس کا اسلامی جمہوریت اخوت مساوات اور شریعت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

سیاست کی آنکھ غرض مند اور خود غرض ہوتی ہے اور اُس کی مطلب براری کے راستے میں جو آتا ہے وہ اس پر فاتحہ پڑھکر آگے بڑھ جاتی ہے۔ سیاست باپ بیٹے میں، بھائی بہن میں اور دوست دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتی۔ سیاست کی تلوار اپنوں ہی کا لہو چاٹ کر زیادہ چمکتی ہے۔ اورنگ زیب نے تو اپنے لخت جگر کو بھی نہیں بخشا۔ اکثریت مرعوب ہو گئی۔ اقلیت مذہب کے نام پر بہک گئی۔ اور اپنے بادشاہ سے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ بادشاہت کو اسلام سے کیا تعلق۔ بس ہیبت نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ اور ذہن پر مہر لگا دی تھی سرمد کا واقعہ مذہبی نہیں قطعی طور پر سیاسی تھا۔ سیاست کی تلوار نے اللہ کے گھر میں، اللہ والوں کے سامنے، شرع کا نام لے کر اُس مجذوبِ اللہ کی گردن اڑا دی جس نے کہا تھا ؎

بالائے خوشے کردہ چنیں پست مرا
چشمے بدو جام بردہ از دست مرا
او در لعل من ست و من در طلبش
وزدِ عجبے برہنہ کردست مرا

اور اس کے بعد مغلیہ سیاست دم توڑنے لگی۔ لیکن بساط بچھی ہوئی تھی۔ شاطر چالیں برابر چل رہے تھے۔ اور انگریز خاموش تماشائی کی طرح آگر کھڑا ہو گیا۔ اور داؤ پیچ سکھانے لگا۔ مرا بیٹے پے در پے مغلوں کو شہ دینے لگے۔ ادھر پٹھانوں کے فیل بڑھنے لگے۔ ٹھگ پنڈاری پیادوں کا کام کرنے لگے۔ بازی زچ ہونے لگی۔ شاہی بساط پلٹنے لگی۔ شاہی مہرے دبتے دبتے قلعہ سے باہر گرنے لگے اور آخر قلعہ میں انگریز داخل ہو گیا اور اعلانچی نے اعلان کیا: "قوم خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم کمپنی بہادر کا!"

انگریز نے ہندستان کے مزاج کو سمجھا۔ ہندستانیوں کی کمزوری کو پرکھا۔ اکثریت اور اقلیت کو جانچا۔ پٹے ہوئے مہروں کو کھڑا کیا۔ مسلمانوں کی حکومت میں جو لوگ نان جویں کو محتاج تھے ان کے دسترخوان پر شاہی ٹکڑے بٹنے لگے۔ 1857ء میں اکثریت و اقلیت اپنے تفرقے مٹا کر ایک ہوئی۔ میرٹھ سے دباؤ پڑا۔ اور آزادی پسند انسانوں نے قلعہ پر آکر مہابلی کے خاندان کو پکارا۔ تو نعرہ انقلاب سن کر انگریز تو سہم گیا۔ مگر قلعۂ معلیٰ کے دروازے بند ہو گئے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک آزادی غدر کے نام سے بدنام ہو گئی۔ بادشاہ ملک بدر ہو گیا۔ اور شہزادے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ انگریز نے اس ملک پر حکومت کرنے کیلئے ایک نئی ترکیب پر عمل کیا۔ اس ترکیب کا نام انگریز کے ہاں ہو یا نہ ہو۔ مگر ہردیال نے اس کا نام Divide and Rule رکھا تھا۔ انگریز نے ہندو مسلمان ہی کو Divide نہیں کیا۔ بلکہ مسلمانوں اور مسلمانوں کے بیچ میں بھی کئی دیواریں کھڑی کر دیں۔ غدر کے بعد انگریز نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اپنے تشدد سے عوام پر اپنی ہیبت طاری کر دی۔ مگر تشدد بھی مسلمانوں کیلئے الگ نوعیت کا تھا اور دوسرے فرقے والوں کیلئے الگ۔ "ٹائمز آف انڈیا" کے ایک ایڈیٹر مسٹر ڈی لین کی تحریر کا ایک اقتباس جو مسٹر رسل کی ڈائری کے صفحہ 43 پر موجود ہے کافی لرزا دینے والا ہے:-

"زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی دینے سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا اور ہندستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، یقیناً عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبا ہے!"

۱۸۵۷ء کے بعد انگریز نے مسلم علماء سے فتوے لئے اور جن
علماء نے فتوے دیئے وہ انگریزوں کے دوست اور گماشتے
بن گئے۔ ۱۷؍جولائی ۱۸۷۰ء کو بھاگل پور کے اسسٹنٹ کمشنر
سید امیر حسین شاہ کے استفتا پر کہ ہندستان میں جہاد جائز
ہے یا نہیں جو فتویٰ علمائے کرام نے جاری کیا وہ یہ تھا:۔

' مسلمان رعایا کے پاس اپنے حاکموں سے لڑنے کیلئے
نہ تو طاقت ہے اور نہ ہتھیار ہی ہیں۔ اگر لڑائی شروع
کر دی گئی تو شکست ناگزیر ہے جس سے اسلام کی عزت
کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا جہاد واجب نہیں۔ ضروری ہے
کہ اگر جہاد کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور اسلام
کی برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کا امکان نہ ہو
تو جہاد ناجائز ہے!'

کلکتے کی محڈن سوسائٹی کی جانب سے ایک فتویٰ جاری ہوا تھا جس
میں جہاد کو بغاوت سے تعبیر کیا گیا تھا۔ جبکہ مجاہدین ہندستان کو
دارالحرب کہتے تھے اور ان ہی دنوں سرحد میں مجاہدین کی تحریک
زوروں پر تھی۔ دیوبند کے علماء مجاہدین کے ساتھ تھے۔ انگریز پٹھانوں
کے خلاف جنگ جاری کئے ہوئے تھا اور تب ہی مکے کے مفتیوں نے
فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالاسلام ہے۔

اور حد تو یہ ہے کہ اَطیعوا اللّٰہ و اَطیعوا الرسول من
الامر منکم کے مصداق انگریزوں کو ٹھہرایا گیا اور انگریزوں کو یہ مرتبہ
دینے والے اردو زبان کے مشہور انشا پرداز ڈپٹی نذیر احمد
بھی تھے، جو شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ ادیب بھی اور مصنف بھی۔
انھوں نے قرآن پاک کے ترجمے میں بھی انگریزوں کو پہلی دفعہ
'اولامر' قرار دیا۔ انھوں نے اپنے ترجمے کی ایک کاپی سر ولیم میور کو
انگلستان بھی بھجوائی اور سر موصوف ہی کی سفارش پر ان کو شمس العلماء
کا خطاب ملا۔ اسی ترجمے کی بنا پر ڈپٹی نذیر احمد کو ایڈنبرا یونیورسٹی
سے ایل ایل ڈی کی ڈگری بھی دی گئی۔ ؎۱

' شمس العلماء ' خان صاحب ' خان بہادر ' رائے بہادر '
وغیرہ جیسے خطابات انگریزوں کے دیئے ہوئے ضرور تھے مگر ان
کی ایجاد و دین' میں ان چنیدہ لوگوں کا دخل تھا کہ انگریز پرستی
جن کا شیوہ تھا۔ اور وہ لوگ اقلیت میں تھے۔ انگریز بھی اپنی بساط
پر اقلیت کے مہرے سجا کر بیٹھ گیا۔ اور ان مہروں کو تھپ تھپاتا بیٹھ گیا
اور ان مہروں کو بڑھاتا گیا۔ انگریز پرست ہی زمین دار بنے، جاگیردار اور
تعلقہ دار بنے اور اکثریت کے ان داتا کہلانے جانے لگے اور جنھوں نے
پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) میں حصہ لیا تھا۔ وہ اکثریت اس
چنیدہ اقلیت کے دورِ اقتدار میں ذلیل زندگی گزارنے لگی۔ جنگ
آزادی میں حصہ لینے والے پوربیے سائیس ہو گئے اور غدار رئیس
بن گئے۔ رئیسوں کے ہاں مصاحب اور بھانڈ پلنے لگے۔ سائیس ان
کی خدمت کرنے لگے اور رئیسوں کے بچے انگریزوں کے ہاں تربیت
پانے لگے۔ یعنی انگریز اپنی بساط کیلئے نئے مہرے تیار کرنے لگا۔
دراصل وہ ایسی کھیپ تیار کرنا چاہتا تھا جس کا ذہن اس کی مرضی کے
مطابق ہو۔ اور جو اس کی حکومت کو مستحکم اور مستقل بنا دے۔

ہر صوبے میں انگریز کی پالیسی کا انداز بدلا ہوا تھا۔ ۱۹۰۱ء
میں لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہوا۔ ۱۹۰۵ء تک لکھنؤ کے
ہندو مسلمان، شیعہ سنی مل کر محرم منایا کرتے تھے۔ اس وقت
کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے شیعوں سے کہا کہ یہ بڑے افسوس کی بات
ہے کہ محرم کی مجلسوں اور تعزیوں کے جلوسوں میں شیعہ بچارے تو
ننگے سر اور ننگے پاؤں ماتم کرتے ہیں اور سنی پگڑی باندھے یا ٹوپی
پہنے اور پان چباتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ شیعوں نے اس
انگریزی مشورے کے نتیجے میں اعلان کیا کہ ہماری مجلسوں میں
جو بھی آئیگا وہ ننگے سر آئے گا اور پان نہیں کھائے گا۔ اس
وقت کی مشرقی تہذیب میں ننگے سر باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا
سنیوں اور ہندوؤں نے احتجاج کیا کہ ننگے سر رہنا ہماری روایت
اور تہذیب کے خلاف ہے۔ شیعہ نہیں مانے، ہندو تو محرم میں
شریک ہونے سے گریز کرنے لگے مگر سنیوں کا ایک وفد انگریز
ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمدردی کا تو اظہار کیا مگر جواب
میں یہ بھی کہا کہ یہ شیعوں کا مذہبی معاملہ ہے اور انگریز سرکار،
کسی کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دے سکتی، بہتر ہ

؎۱۔ دیکھئے داستان تاریخ اردو'
مصنف: حامد حسن قادری۔ صفحہ ۴۹۸

ہے کہ سنی لوگ اپنی کربلا الگ بنالیں۔ آخر یہ بات اتنی بڑھی کہ مدح صحابہ جو سب مل کر کرتے تھے اس پر پابندی کا سوال پیدا ہو گیا۔ اور تبرا شروع ہو گیا۔ اور یہ بات اپنے نقطۂ عروج پر اس طرح پہنچی کہ ۱۹۰۸ء میں شیعہ سنی فساد ہو گیا اور مدح صحابہ قانوناً روک دی گئی۔

ادھر انگریز نے ایران کے حصے بخرے کر دیئے۔ ہندستان کے سنی مسلمان ایران کے معاملے میں اس لئے نہیں بولے کہ ایران ایک شیعہ حکومت تھی اور ہندستان کا سنی ہندستان کے شیعوں سے مدح صحابہ کے معاملہ میں ناراض تھا۔ مگر شیعہ بھی ایران کے معاملہ میں نہیں بولے کہ انہیں انگریز نے مدح صحابہ پر پابندی لگا کر خوش کر دیا تھا۔ دراصل اس طرح انگریز نے مسلمانوں میں ایک ایسی اقلیت پیدا کر لی کہ جسے وہ وقت آنے پر استعمال کر سکے اور آخر انگریز اقلیت کے اس مہرے کو 1937ء میں پہلی کانگرس وزارت بننے کے بعد اپنے کام میں لایا۔ کانگرس نے جب یوپی میں اپنی وزارت بنائی اور سنیوں کو مدح صحابہ کی اجازت ملی تو لکھنؤ میں پھر شیعہ سنی فساد پھوٹ پڑا — اسی زمانہ میں مولانا مظہر الدین اظہر (جو خود شیعہ تھے اور مجلس احرار کے اہم رہنما تھے۔) نے 'بساطِ سیاست' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ۱۹۰۸ء کے لکھنؤ کے واقعات اس وقت کے اخباری تراشوں کے حوالوں سے انگریز کی پوری کارستانی بے نقاب کی گئی تھی۔

وہ تھی یوپی کی سیاست جو انگریزوں نے شیعہ سنی مہروں کی مدد سے کھیلی۔ پنجاب کی سیاست میں انگریز نے قادیانیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میرزا غلام احمد جو احمدی فرقے کے بانی تھے وہ ایک درخواست میں لکھتے ہیں:-

'ہمارا جان نثار خاندان سرکار دولت مدار کا خود کاشتہ پودا ہے۔ ہم نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنا خون بہانے اور جان دینے سے کبھی دریغ نہیں کیا!'

پنجاب میں انگریزی سیاست نے جو اکھاڑ پچھاڑ کی اس کی ایک فہرست ایک بار 'چٹان' کے ایڈیٹر آغا شورش کاشمیری نے تیار کی تھی یعنی

(۱) بڑے بڑے زمیندار التزاماً پیدا کئے گئے۔
(۲) پیروں کی روایتی گدیاں نہ صرف بحال رکھی گئیں بلکہ مزید پیدا کی گئیں۔
(۳) سرحدی علاقوں میں جن مسلمانوں کے پاس کئی کئی ایکڑ زمین تھی ان کو سردار یا نواب کے لقب سے نوازا گیا۔
(۴) مسجد کے ملا کو زمینداروں، تعلقہ داروں اور نوابوں کے اشاروں پر چلنے پر مجبور کیا گیا۔ اسلام کی تاویلیں سرمایہ داروں کی مرضی کے مطابق ہونے لگیں جس نے انکار کیا اس کو فوج نے خدا کے گھر سے نکال باہر کیا۔

نواب جاورہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ روزہ بھی رکھتے تھے اور سگریٹ بھی نوش فرماتے تھے۔ ان کے پاس علماء کے دیئے ہوئے فتوے موجود تھے کہ سگریٹ پینے سے نہ روزہ ٹوٹتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے، جواز یہ دیا گیا کہ دھواں پیٹ میں نہیں پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ اگر دھوئیں سے روزہ ٹوٹتا تو عورتیں جو چولھا جلاتی ہیں اور چولھے کے دھوئیں میں سانس لیتی ہیں ان کا بھی روزہ ٹوٹتا۔ مگر دھواں ان کے بھی پھیپھڑوں ہی تک جاتا ہے۔ چنانچہ جب نیک بیبیوں کا روزہ نہیں ٹوٹتا تو نواب صاحب کا روزہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔

کچھ علماء بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ انھوں نے امارت کا بھانڈ بننا منظور نہ کیا اور سر سے کفن باندھ کر انگریز کی قبر کھودنے کیلئے تیار ہو گئے۔

1914ء کی جنگ میں پنجاب نے دل کھول کر فوجی بھرتی دی۔ پنجاب کی فوجی خدمات پر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے 'پنجاب کی مائیں تو انگریز بابا کیلئے بچے جنتی ہیں!' جتنی پیدا ہوا اور فوج میں چلا گیا۔ چنانچہ ہندستانیوں نے کٹ مر کر انگریزوں کو جتا دیا۔

سرحد کے علاقہ میں انگریز کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حریت پسند قبائلیوں کی پناہ میں آئے ہوئے تھے۔ وہ انگریزوں کو سرحدی علاقوں میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے بلکہ وہ پنجاب تک افراتفری پھیلاتے تھے۔ انگریز نے سرحدی شورش سے پنجاب کو بچانا چاہا۔ چنانچہ اس نے ۱۹۰۱ء میں پنجاب کو ایک الگ صوبہ قرار دیکر شمالی مغربی سرحدی صوبہ تشکیل دیدیا۔ وہاں انگریزوں کی اپنی مخصوص فارورڈ پالیسی تھی۔ پولیٹیکل ایجنٹ کو لاکھوں روپئے خرچ کرنے کے اختیارات ملے ہوئے تھے اور حساب دینے سے وہ مبرا سمجھا جاتا تھا۔ وہ قبائلی علاقے کے چند شرپسند پٹھانوں کو روپیہ دے کر سرحد کے ہندوؤں کو اغوا کرا دیتا،

گلگت کا ضلع متعلق مسلمان ہمیشہ۔۔

پولیٹیکل ایجنٹ اس کی تحقیق کرتا۔ فوج مارچ کرتی اور پھر انگریز اپنی رعایا کے تحفظ کا نام لیکر قبائلی علاقے میں آگے بڑھ جاتا۔

پنجاب میں مسلمان اور ہندو آبادی کے اعتبار سے تقریباً مساوی تھے۔ سرحد میں ہندو صرف ۳ فیصدی تھے۔ قبائلی علاقہ میں بھی ہندو اور سکھ موجود تھے۔ اور شیر و شکر کی طرح تھے۔ وہاں کسی بھی ہندو یا سکھ کو اپنی جان و مال کا خطرہ نہ تھا۔ مگر الٹی بات یہ تھی کہ انگریزی علاقہ میں ہندو کو خطرہ تھا۔ مطلب یہ کہ انگریز کی سیاست باقاعدہ اقلیت کے مہرے کو استعمال کرتی تھی۔ انگریز نے براہمن اور غیر براہمن کا فرق پیدا کر دیا تھا اور یہ فرق آج تک موجود ہے۔

۱۹۱۹ء میں واقعہ جلیان والا باغ کے بعد گاندھی جی بساطِ سیاست پر نمودار ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاست داں اقلیت کا استعمال کس ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ اب اقلیت ہی کوئی نہ رہے، جسے اپوزیشن کہتے ہیں۔ دراصل وہ اقلیت ہی ہوتی ہے اسی لئے گاندھی جی اپوزیشن کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اقلیت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے چورا چوری کے واقعہ پر انھوں نے اپنی ساری تحریک اسی لئے واپس لے لی تھی کہ چند لوگ گاندھی جی کے نظریئے کے مخالف ہو گئے تھے۔ محمد علی جناح کو انھوں نے کس کس طریقے سے راضی کرنے کی کوشش کی۔ حد یہ کہ ان کے قدموں میں سارے ہندستان کی حکومت رکھدی اور ان کو قائد اعظم بھی بنا دیا۔ اور جناح کے نہ ماننے پر بھی وہ ملک کی تقسیم پر راضی نہ ہوتے۔ اور حصول آزادی کے بعد کانگرس کو توڑنے تک کا مشورہ دیا۔ دراصل وہ جانتے تھے کہ — اقلیت، جمہوریت کو چلنے نہیں دیگی۔

گاندھی جی کا اچھوت سدھار بھی اقلیت کو اکثریت میں سمودینے ہی کا ایک طریقہ تھا۔

پاکستان میں جو حکومت بنی وہ مذہب کے نام پر بنی اور ہندستان میں سیکولر حکومت کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر — सत्यमेव जयते کا پچ دیکر غیر مذہبی حکومت کو ایک مذہبی رنگ بھی دیدیا گیا۔ مسلمان اوپر سے سہما ہوا تھا۔ بول نہیں سکتا تھا۔ مگر اس کے اندر دھکڑ پکڑ ہونے لگی اور امید و بیم کی وہ حالت آج بھی ہے۔ مسلمان جو تشدد کے

تھے ان میں کچھ کانگرس میں شامل ہو گئے اور کچھ نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ جو لیگ کے ساتھ تھے ان میں زیادہ تر پاکستان چلے گئے۔ باقی مسلم مذہبی و فرقہ پرست جماعتوں (جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، تعمیر ملت اور نئی مسلم لیگ) میں گھل مل گئے۔

اکثریت کے وہ لوگ جو کانگرس کے ساتھ نہیں تھے۔ بلکہ انگریز پرست تھے۔ آزادی کے بعد کانگرس میں گھسنے لگے۔ رائے بہادر مہر چند کھنا جو مرکز میں کانگرس کے وزیر رہ چکے ہیں۔ وہ کبھی انگریزوں کے بہت بڑے پٹھو تھے اور سرحد میں صاحبزادہ عبد القیوم کی وزارت کا ایک مہرہ تھے۔ آزادی کے بعد یا آزادی سے ذرا پہلے وہ کانگریسی بن گئے۔ جن کو کانگریس میں جگہ نہیں ملی۔ وہ ادھر ادھر کی پارٹیوں میں شامل ہو گئے۔

ہندستان کا طرزِ حکومت جمہوری ہے جس طرف کثرت رائے ہوگی، وہ پارٹی حکومت کی باگ ڈور سنبھال لے گی۔ اپوزیشن پارٹی اقلیت میں رہے گی۔ لیکن ہندستان میں چھ کروڑ ووٹ مسلمانوں کے ہوتے ہیں۔ کانگریس پارٹی کیلئے یہ مسلم اقلیت ایک زبردست مہرہ ہے۔ کانگریس کا غیر مذہبی ہونا بھی کانگریس کیلئے ایک زبردست جیت ہے ادھر کانگریس نے سوشلزم کا نعرہ بھی بلند کر رکھا ہے۔ اور کانگریس اپنے آپکو دھرم نرپیکش [illegible] بھی کہتی ہے۔ اور حکومت بھی اس بات کا دعویٰ کرتی ہے اور چونکہ ہندو مہا سبھا، شیو سینا اور جن سنگھ جیسی ہندو مذہبی جماعتیں اس حکومت کو ندھر یک کہتی ہیں۔ پاکستان ہندستان کی حکومت کو ہندو راج کہتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندستان میں ہندو اکثریت میں ہے۔ لیکن درحقیقت ہندو اکثریتی فرقہ نہیں، اقلیتی فرقہ ہے۔ اس لئے کہ بدھ مت، جین مت، سکھ مت اور دلت جاتیوں (اچھوت) کو ہندو نہیں کہا جا سکتا۔ ہندوؤں کے جو پہلے چار ورن (چار ذاتیں) برہمن، کشتری، ویش اور شودر تھے۔ ان میں سے شودر الگ ہو گئے۔ اب جو تین جاتیں ہیں اگر کبھی ان کی مردم شماری کی گئی تو مسلمان نہیں ہندو اقلیت میں ہوں گے۔

کانگریسی سیاست نے بھی اقلیت پیدا کرنے کے نارمولے

کو اپنے ہات سے جانے نہیں دیا۔ ہندستان میں لسانی تنازعوں نے بھی اقلیتیں پیدا کیں۔ پندرہ زبانوں کا مطلب ہے پندرہ اقلیتیں۔ عام چناؤ کے وقت کانگرس کے مقابلہ میں کھڑے ہونے والے زبان کو بھی ووٹ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بناتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپوزیشن کے ووٹ بٹ جاتے ہیں۔ اور کانگریس ہر ایک کے مقابلے میں جیت جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سے آج تک کوئی بھی دوسری پارٹی مرکز میں حکم راں پارٹی نہیں بن سکی۔ اور حالات بتا رہے ہیں کہ مستقبل میں بھی کسی دوسری پارٹی کے حکم راں بننے کا امکان نہیں۔

خاں چہ مسلمان اقلیت ہی کانگریس کی جیت ہے اور اسی لئے کانگریس مسلمانوں کو ہر طرح کی سہولت دیتی ہے۔ اردو زبان جو مسلمانوں کی نہیں ہے سرکاری پروپگنڈے نے اردو کے سلسلے میں مسلمانوں کو جذباتی بنا دیا ہے اور ہندؤوں کو متعصب۔ جمہوریت کا اصول ہے کہ سب برابر ہیں۔ اسی لئے جمہوری ملک کے قانون کا اطلاق بھی سب پر یکساں ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے جب ووٹ برابر ہے تو قانون برابر کیوں نہ ہوگا۔ مگر اس جمہوری اور سیکولر ملک میں ہندو، بدھ، جین، عیسائی، سکھ دو بیویاں نہیں رکھ سکتا۔ (حالاں کہ ہندو دھرم میں شادی کے سلسلے میں ہندو مرد پر کوئی پابندی نہیں ہے) مگر مسلمان بیک وقت چار بیویوں کا شوہر ہو سکتا ہے۔ ایسے ہندو بھی موجود ہیں جو محض دوسری بیوی رکھنے کی خاطر مسلمان ہو گئے اور دوسری بیوی کو بھی رہندو پہلی نے طلاق نہ لی' دوسری مسلمان نام رکھ کر کہنے کو مسلمان ہو گئی یعنی پتی رام داس سے عبداللہ ہو گئے اور پتنی نمبر دو سیتا سے فاطمہ بن گئیں۔ اور قانون ان کی طرف یوں دیکھتا رہ جاتا ہے جیسے جنگی قیدیوں کو رہا کر دینے کے بعد سورن سنگھ بھٹو کی طرف دیکھا کریں۔

مسلمانوں کو یہ ساری رعاتیں ان کے ووٹ کی طاقت کی وجہ سے حاصل ہیں۔

چوں کہ ہندستان میں جمہوری نظام ہے۔ جمہوری طرز حکومت شرفا کی نیک نیتی پر مبنی ہوتی ہے۔ جمہوری نظام شریف لوگوں کی جانب سے' شریف لوگوں کیلئے سب کی بہتری کی خاطر ہوتا ہے۔ یہ نیک سیاست دونوں کا سوچا ہوا طرز عمل ہے۔ مگر جب نیک سیاست دانوں پر امارت کی نظر پڑتی ہے تو نیکی کا چاند گہنانے لگتا ہے۔

امیر نوٹ اچھالتا ہے اور ووٹ خریدتا ہے۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ غریب کا ایمان بھی بازار میں نیلام ہو جاتا ہے اور بھوک کی مٹی کے نیچے دیانت داری دفن ہو جاتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ نے فرمایا تھا، ' یاخدا مسلمان کو فاقے سے بچائیو! فاقہ انسان کو کفر کے قریب لے جاتا ہے!' برنارڈ شا نے ایک جگہ کہا ہے ' Poverty is sin ' (مفلسی گناہ ہے)۔ اب گناہ گار کا ایمان کیا اور عزت کیا۔ عزت کو داغ لگنے کیلئے سفید کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے اور غریب کے تن پر کپڑا ہی نہیں ہوتا۔ کانگریس کا طرز حکومت تو ٹھیک ہے جمہوری ہے سیکولر ہے۔ مگر جب سیاستداں کے پیچھے امیر آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو سیاسی ایمان ڈگمگانے لگتا ہے۔ جمہوریت کا طریق نظام جو ہمارے دیش میں ہے وہ ہے تو بہت اچھا مگر وہ بہت قیمتی ہے۔ چناؤ میں حصہ لینے والا اگر خود کروڑ پتی ہو یا اس کی پیٹھ پر کوئی کروڑ پتی ہو تب ہی وہ انتخاب لڑنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ سچے نیتا کو بھی چناؤ کا خرچ برداشت کرنے کے لئے فائی نینسر کی ضرورت پیش آتی ہے اور فائی نینسر سود کے ساتھ اصل بھی وصول کرتا ہے اسلئے اب ہر سیاسی پارٹی میں امیر گھسے ہوئے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیاسی نیتاؤں کو انکے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے ورنہ پھر الیکشن کا خرچہ کون اٹھائے۔ گویا اس وقت امارت اور سیاست سازباز کئے ہوئے ہے۔ اور یہ سازباز اصولی طور پر جمہوریت کے منافی ہے اسمیں ہندو مسلم کا سوال نہیں' سوال ہے صرف امیر و غریب کا۔ تہذیب' زبان صوبائی تفرقات وغیرہ۔ سب سیاستدانوں کو گدی پر جانے اور امیر دیکھو اور زیادہ امیر بننے کے شریفانہ گر ہیں اگر سیاستداں سوشلزم کا نعرہ لگاتا ہے تو امیر کالی کرنسی کا ایک اور نیا بیوپار کھول دیتا ہے۔ اور اس بیوپار میں ہم سب شامل ہیں جنتا بھی اور نیتا بھی۔ اور ان کو اس مقام پر جو برقرار رکھے ہوئے ہے وہ ہے اقلیت نہ کہ اکثریت۔

پاکستان میں کوئی اقلیت نہیں ہے اسلئے قیام پاکستان سے آج تک وہاں تقریباً ڈیڑھ درجن پرائم منسٹر بدل چکے ہیں اور آج تک کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو پائی۔ مگر اب ضرورت نے وہاں بھی ایک اقلیت (احمدی) ایجاد کر دی ہے۔ اور اب یہ اقلیت پاکستانی بساط سیاست کا ایک ایسا اہم مہرہ ہوگا جس کی مدد سے بڑے بڑے کھیلوں کو مات دی جا سکے گی اور وہاں بھی سدا قائم رہنے والی ایک حکومت بن جائے گی۔ گویا جمہوریت کی تشبیہ ہوگی۔

سید انیس الرحمان

اقلیتوں کا مسئلہ

یہ ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ نہ یہ کسی خاص عہد ہی تک مخصوص رہا ہے بلکہ اس وقت بھی دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک موجود ہو جو ایک فرقے کی بستی ہو اور اس میں صرف ایک ہی نسل، زبان یا مذہب کے ماننے والے موجود ہوں۔ غرضکہ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی ملک کی جغرافیائی سرحدیں اور اس کے باشندوں کی نسلی، لسانی اور مذہبی سرحدیں بالکل یکساں رہی ہوں خاص طور پر آج کے مشینی دور میں جبکہ رسل و رسائل کی سہولتوں نے دنیا کو بہت زیادہ چھوٹا کر دیا ہے اس قسم کا مثالی حالت قائم رکھنا بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔

اس وقت دنیا کی ہر ریاست کو اپنے اندر کچھ ایسے لوگوں کو بھی جگہ دینی پڑتی ہے جو اس ریاست کے باشندوں سے مذہبی اور نسلی ہم جنسی نہیں رکھتے۔ لیکن پھر بھی جس ملک میں جو فرقہ اکثریت میں ہے وہ ملک اسی فرقے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر ملک اپنی اکثریت کے نام سے موسوم ہے اور اسی لئے ہندوستان بھی اپنی اکثریت یعنی ہندوؤں کے استھان (سنسکرت) یعنی ہندوستان کے نام سے مشہور ہے (اور یہ نام ہندو کو مسلمان ہی کا دیا ہوا ہے) اگرچہ اس میں اور بھی قومیں اور فرقے آباد ہیں۔

یورپ میں بعض ملکوں نے مسئلہ اقلیت سے تنگ آ کر اس سے چھٹکارا پانے کے لئے یہ دستور نکالا کہ ملک کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ لیکن پھر بھی وہ ایک مکمل اور متجانس ریاست بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے اور تقسیم کے جتنے بھی ٹکڑے کئے گئے ان سب میں مذہبی، لسانی اور نسلی اقلیت رہ ہی گئیں اور ان کے سارے جھگڑے بھی رہ گئے کیونکہ ہر ٹکڑے کو اپنے اندر کچھ نہ کچھ اقلیتوں کو جگہ دینی ہی پڑی۔ لیکن آخر یہ ٹکڑے بازی کس حد تک چل سکتی ہے کیونکہ اس قسم کے ٹکڑوں کی کچھ اقتصادی حدود بھی ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد یہ رائے ہوئی کہ حق خود ارادیت Self Determination کی بنا پر یورپ کی از سر نو تنظیم کی جائے تاکہ چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کو بھی اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کرنے کا موقع مل جائے۔ اسی بنا پر پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی جمہوریتیں قائم ہوئیں اور بلقان کو نصف درجن حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ لیکن یہ جمہوریتیں بھی کسی واحد قوم پر مشتمل نہ رہ سکیں بلکہ ان دونوں میں کافی جرمن اقلیتیں چھوڑ دی گئیں جن کی تعداد بیس فیصدی سے کم نہ تھی غرض کہ اس مسئلہ کا حل قطعاً کامیاب نہ ہوا۔

پچھلے زمانے میں اس کا سیدھا سادہ حل یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ جس مذہب کا ماننے والا ہوا کرتا تھا دوسرے فرقے بھی اسی مذہب کے ہو جاتے تھے۔ لوگ بھی قدرت کا فیصلہ سمجھ کر اسے منظور کر لیتے تھے۔ اس زمانے میں مثل مشہور تھی کہ جو دین [illegible] شاہ کا وہی دین رعایا کا (الناس علی دین ملوکہم) کسی مخالفت کسی احتجاج یا کسی فریاد کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بلکہ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ قدرت ہی اپنی تلوار کی قدرت سے دوسرے ملکوں پر حکومت کیا کرتی تھی اور اکثریت اس کے آگے قدرت کا ایک فیصلہ سمجھ کر سر تسلیم خم کر دیا کرتی تھیں۔ [illegible] سکندر، چنگیز خاں، تیمور اور ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت اسی قبیل کی تھی۔ وہاں تلوار تھی اور اقلیت و اکثریت کا کوئی جھگڑا نہ تھا۔

لیکن جب انقلاب فرانس کے بعد دنیا میں جمہوریت کی ہوا چلی۔ افراد کو شخصی آزادی کی ہوا نصیب ہوئی۔ زبان مذہب اور دوسرے نجی معاملات [illegible] [illegible] پریس، پلیٹ فارم وغیرہ کی آزادی اور [illegible] [illegible] بھی ابھر آئیں اور انہوں نے بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ لیکن حال میں [illegible] سے دنیا میں مختلف ملکوں میں [illegible] ہر ملک کے لئے اقلیتوں کا وجود ایک حقیقت بن گئی ہے۔ چونکہ اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ اقلیتوں نے [illegible] قدم بڑھایا [illegible]

کی طاقت کو بھی دھکا لگانے سے وہ باز نہ آئیں اور کھلم کھلا انھوں نے دشمنوں سے ساز باز کی۔

چنانچہ موجودہ عہد میں ایک ریاست کو نہ صرف اپنے بیرونی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے بلکہ اب اندرونی دشمنوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم کا تمام تر سبب ہی اقلیتوں کا مسئلہ تھا اور گذشتہ عالمگیر جنگ بھی پولینڈ کی سوڈٹن جرمن کی اقلیت ہی کے سوال پر چھڑی تھی۔ سوڈٹن جرمنوں نے مادر وطن سے غداری کر کے کھلم کھلا ہٹلر کا ساتھ دیا اور ہٹلر نے اپنی جرمن اقلیت کی محافظت کا بہانہ کر کے تلوار اٹھائی۔

بہرحال فرقہ وارانہ سوال یا اقلیت کا مسئلہ موجودہ عہد کا سب سے پیچیدہ اور اہم مسئلہ بن گیا ہے چنانچہ دنیا کی ہر حکومت نے ہر بین الاقوامی کانفرنسوں اور بھر انجمنوں نے اس مسئلہ کے حل پر کافی توجہ دی ہے۔ اس سے قبل بھی انیسویں صدی کے بعض صلحنامہ میں جو یورپین اقوام کے درمیان ہوئے اس مسئلہ کا ذکر موجود ہے اور اس کے حل کی کوششیں کی گئی ہیں۔ سب سے پہلے پیرس کے صلحنامہ میں (TREATY OF PARIS) ۳۰ مارچ ۱۸۵۶ء میں ہوا تھا اقلیتوں کی محافظت سے متعلق ایک دفعہ رکھی گئی اور یہ صاف طور پر اعلان کر دیا گیا کہ کسی ملک کے باشندوں کے کسی طبقہ سے صرف اس بنا پر کہ وہ نسلی لسانی یا مذہبی لحاظ سے مختلف ہے کوئی برا برتاؤ نہ کیا جا سکے اور نہ اُسے حقیر سمجھا جائے گا۔ غرض کہ اس صلحنامہ میں اقلیتوں کے مساوات کے درجہ کو تسلیم کیا گیا۔ اور مختلف ملکوں میں حکومتیں اقلیتوں کا خاص لحاظ رکھنے لگیں۔ اسی طرح عہدنامہ برلن (۱۸۷۸ء) میں بھی یہ اعلان کیا گیا کہ جرمن میں جو مختلف ریاستیں ہیں وہ اپنی اپنی اقلیتوں سے مذہبی رواداری کا برتاؤ کریں۔ اسی طرح انیسویں صدی کے آخر سیاسی دستاویزات میں افراد کی شخصی آزادی کو مانا گیا۔

لیکن بیسویں صدی اور خاص کر پہلی جنگ عظیم کے بعد پہنچتے مسئلہ اقلیت کی نوعیت ہی بدل گئی۔ یعنی اس سے پہلے کسی ملک کے افراد کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ جس طرح چاہیں رہیں جو زبان چاہیں استعمال کریں اور جس دین کی پیروی اُن کی مرضی ہو کریں لیکن اقلیتوں کو جماعتی حیثیت سے تسلیم نہ کیا گیا اور نہ ایک علیحدہ قوم کا درجہ دیا گیا۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد انھیں جماعتی شکل میں مانا گیا۔ یہاں تک کہ ان کا حق خود ارادیت بھی تسلیم کر لیا گیا۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب پیرس میں صلح کانفرنس صدر ولسن (امریکہ) کی صدارت میں بیٹھی تو اس نے قدرتی طور پر ایک ایسے مستحکم نئے نظام کی داغ بیل ڈالنا چاہی جس سے آئندہ اس قسم کے جھگڑوں کا امکان نہ ہو اور مستقبل میں ایسی ہولناک جنگوں کا سد باب ہو سکے۔ لیکن ظاہر ہے یہ کانفرنس بھی کوئی ایسی جادو کی لکڑی نہیں گھما سکتی تھی کہ یورپ کے سارے ملکوں میں صرف ایک ہی قوم کی ریاستیں بن جائیں اور اقلیتوں کا جھگڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے کیونکہ موجودہ دور میں عرب کی قدیم قبیلائی بستیوں یا یونان کے آزاد شہروں کا تصور ناممکن ہے جہاں صرف ایک ہی قبیلہ یا نسل کے لوگ رہا کرتے تھے۔ کانفرنس بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ جو بھی ریاست بنے گی وہ لازمی طور پر ایک سے زیادہ فرقوں پر مشتمل ہوگی لیکن اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کہ اقلیتیں بھی اپنے ملک کی اسی طرح ہی خواہ فرماں بردار اور جاں نثار ہوں جس طرح اکثریت ہوا کرتی ہے۔ یہ ضروری قرار پایا کہ اقلیتوں کو بھی اکثریت کے مساوی حقوق دیئے جائیں۔ یہ ساری باتیں اس لئے کی گئیں کہ اقلیتیں بھی اپنے وطن کو وطن سمجھیں اور بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے تمام فرقوں سے مل کر ریاست کو چلائیں۔ اور وطن کی ترقی کے لئے کوشاں ہوں۔

یہاں لفظ مساوات سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ اقلیتوں کو مساوات دینے کا مطلب یورپ میں سب سے پہلے یہ ہے کہ جس طرح اور لوگوں کو حق رائے دہندگی ہے، انھیں بھی یہ حق دیا جائے اور انھیں علیحدہ نہ سمجھا جائے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ شہری ہونے انھیں تمام شہری حقوق ویسے ہی حاصل ہوں جیسے اکثریت کو ہیں۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اقلیت کے ایک فرد کے لئے حکومت کے کاروبار میں ایک فرد کی آسانی سے یعنی جمہوریت یا صدارت کا دروازہ بھی کھلا ہو اور اس کی اہلیت میں اس کا مذہب یا نسل حائل نہ ہو۔

جمعیۃ الاقوام اور اقلیتیں

جمعیۃ الاقوام اپنے مقاصد میں کہیں ہی ناکام کیوں نہ رہی ہو لیکن یہی کیا کم ہے کہ دنیا میں پہلی بار باہمی جھگڑوں کو جنگ کے ذریعہ نہیں بلکہ صلح و مفاہمت اور گفت و شنید سے طے کرنے کے لئے اقوام عالم کی ایک انجمن عالم وجود میں آئی۔ بہرحال عالمی جنگ کے بعد جمعیۃ اقوام کا قیام عمل میں آنا تھا کہ یورپ کی تمام اقلیتوں نے اپنی اکثریت کی شکایتیں اس کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیں۔ یہ شکایتیں ۱۷ ممالک کے خلاف تھیں۔

چنانچہ جمعیت اقوام نے ان تمام ممالک کی حکومتوں سے مشورہ کیا اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق ایک دستاویز مرتب کی جس پر مندرجہ بالا ۱۷ حکومتوں نے اپنے دستخط ثبت کردیئے۔ یہ حقوق جن امور سے متعلق ہیں وہ تین عنوانوں کے تحت آتے ہیں۔

۱۔ زبان ۔ ۲۔ نسل ۔ ۳۔ مذہب۔ یعنی جمعیتہ الاقوام نے جو بھی تحفظات مقرر کئے وہ ان تین ہی امور سے متعلق ہیں۔ یہاں پھر ہمیں ہندوستان کے مسئلہ اقلیت اور یورپ کے مسئلہ اقلیت میں فرق نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ اقلیتوں کے تمام مطالبات صرف زبان و معاشرت مذہب اور نسل ہی تک محدود ہیں اور انھوں نے نہ یہ کہا کہ ہمارا انتخاب جداگانہ ہوگا یا اسمبلی یا مجلس آئین ساز میں ہمارے لئے اتنی نشستیں مقرر کردی جائیں یا پھر سرکاری ملازمتوں میں تناسب مقرر کردیا جائے

ہر حال جمعیتہ الاقوام نے ان تین قسم کے مطالبات (زبان، مذہب، نسل) کے سلسلے میں قوانین بنائے۔ اور پھر جمعیتہ کی رہنمائی میں مختلف قوموں نے اپنی اقلیتوں کی زبان، نسل، مذہب وغیرہ کے تحفظ کے سلسلے میں اپنے دستور میں حسب ذیل دفعات شامل کیں۔ مندرجہ بالا تین مطالبات کے علاوہ اقلیتوں کو شہری حقوق میں بھی مساوات دی گئی اور سبھوں کے بنیادی حقوق یکساں مانے گئے

چنانچہ ہم یہاں چاروں قسم کے حقوق ۱۔ شہری، ۲۔ لسانی ۔ ۳۔ نسلی ۔ ۴۔ مذہبی حقوق کے متعلق یورپین ممالک کے دستور سے دفعات نقل کریں گے۔ ان دفعات پر یورپ کے تمام ممالک متفق ہیں۔

شہری حقوق :- ۱۔ کسی ریاست کے آگے ہر شخص خواہ وہ کسی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو مساوی ہے اور سبھوں کے لئے ایک ہی قانون ہے ۔

۲۔ کسی شخص کو بھی بغیر مقدمہ چلائے قید نہیں کیا جاسکتا۔

۳۔ تمام لوگوں کو پریس پلیٹ فارم اور اجتماع کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ انجمنیں بناسکتے ہیں اور اجتماعی طور پر (قوانین کے احاطہ میں رہ کر) کام کرسکتے ہیں

۴۔ ملکی ملازمتوں کا دروازہ ہر اہل شخص کے لئے بلاتفریق مذہب و نسل کھلا ہوگا

۵۔ حق رائے دہندگی ہر شخص کو مساوی طور پر حاصل ہوگا اور وہ ریاست کے بڑے بڑے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔

۶۔ ریاست کا کوئی مذہب نہ ہوگا۔

مذہبی حقوق :- ہر فرد و بشر کو ضمیر کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ نجی طور پر یا برسر عام اپنے مذہبی رسم ادا کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

۲۔ قانون کے آگے تمام مذاہب برابر ہوں گے۔ خواہ وہ اکثریت کا ہو یا اقلیت

۳۔ کسی خاص مذہب کے لوگ اگر چاہیں تو اپنی مذہبی جائدادوں اور اوقاف کا انتظام خود کرسکتے ہیں۔ ریاست بھی حسب استعداد مختلف مذہب کے لئے اپنے بجٹ میں ایک مد رکھے گی جو ہر مذہب کے پیروؤں کی تعداد کے مناسبت سے ہوگی۔

۴۔ کسی کو اپنے مذہب کے معتقدات کے اظہار پر مجبور نہ کیا جائے اگر وہ ان کا اظہار کرنا نہیں چاہتا۔

۵۔ مسلم پرسنل لا، وراثت، طلاق، خلع وغیرہ کے مقدمات کا فیصلہ کسی مذہب کی مخصوص شریعت کے مطابق ہی کیا جائے گا۔ کسی مخصوص مذہب کے لوگ اگر چاہیں تو اس کام کے لئے اپنی علیحدہ عدالت بھی قائم کرسکتے ہیں۔

لسانی اور معاشرتی حقوق ۔ ۱۔ ہر شخص جو زبان چاہے استعمال کرے اور اگر ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوئی تو وہ اپنے صرفے سے اپنے بچوں کے لئے علیحدہ اسکول بھی قائم کرسکتے ہیں (بعض حکومتیں خود اس خرچ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں جیسے ٹرکی) ۲۔ لیکن ریاست کی ایک واحد زبان ہوگی جسے تمام اقلیتوں کو ریاست کے تعلقات کے موقع پر استعمال کرنا ہوگا ۔

نسلی حقوق :- ۱۔ کسی خاص نسل کے لوگ محض اس لئے کم تر نہ سمجھے جائیں کہ وہ اکثریت کی نسل سے نہیں ہیں۔ ۲۔ ہر نسل کو اپنی نسلی خصوصیات اور اپنے قومی تمدن کو محفوظ رکھنے اور اسے بڑھانے اور ترقی دینے کا حق حاصل ہوگا۔

غرضکہ یورپ میں مسئلہ اقلیت کی یہ نوعیت ہے اور اس طرح اسے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر پھر بھی یورپ کا یہ سب سے بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہی رہ گیا چنانچہ گذشتہ عالمی جنگ اسی اقلیت کے تحفظ کے بہانے شروع ہوئی اور اب عام طور پر دنیا میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اقلیت کا مسئلہ جس حد تک موجود ہے اسے اسی حد تک رہنے دیا جائے اور آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

چنانچہ جنوبی افریقہ میں ہندستانیوں کے ساتھ اکثریت کا موجودہ بُرا برتاؤ اسی بنا پر ہے کہ وہاں کی اقلیت کی آبادی نہ زیادہ بڑھنے پائے اور اسی لئے یہ تمام قیود لگائی گئیں ہیں کہ کہیں آگے چل کر کہیں یہ بھی اقلیت کا مسئلہ نہ بن جائے اسی طرح ہٹلر نے ایک واحد نسل (جرمن) کی شہنشاہیت کا خواب دیکھا اور دوسری نسلی اقلیتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اس طرح حل ہونے کا نہیں ہے اور نہ ملک کی تقسیم سے حل ہوا ہے۔ ملک کی تقسیم کا نتیجہ یورپ میں بھی آزمایا جاچکا ہے اور ناکام ہوا ہے۔ بلقان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے لیکن پھر بھی ہر ٹکڑے میں اقلیت کا مسئلہ موجود ہے۔

غرضیکہ یورپ میں اب تک اقلیتوں کا مسئلہ حل نہ ہوسکا حالانکہ یورپ انتہائی

چھوٹے ٹکڑوں مثلاً لوبیریا، اسٹونیا، سُوبیا، یوگوسلاویہ وغیرہ میں تقسیم ہو گیا۔ جس کا رقبہ ہندوستان کے ایک ضلع سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اقلیت کا مسئلہ حل نہ ہونا تھا نہ ہوا۔

روس کی مثال

روس میں کبھی کسی مذہبی بنا پر کسی قومیت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور نہ کسی علاقے کو روس سے علحدگی کا اختیار ان معنوں میں حاصل ہوا جن معنوں میں پاکستان بنا۔ لہذا اس چیز پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

"ریاست کو مذہب سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے، مذہبی گروہ ریاست سے متعلق نہ ہونے چاہئیں۔ ہر شخص کو آزادی ہونا چاہئے کہ وہ جو مذہب چاہے اختیار کرے یا لامذہب رہے جیسا کہ ایک سوشلسٹ عام طور سے ہوتا ہے —"

لینن کے بعد اس کے اُصولوں کا سب سے معتبر مفسر اسٹالین ہے۔ اسٹالین نے اپنی ایک کتاب میں قومیت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"ایک قوم ایک ایسا گروہ ہے جو مشترکہ تاریخی روایات رکھتا ہو۔ اور جس کی زبان، وطن، اقتصادی اور نفسیاتی ماحول میں مناسبت اور اشتراک ایک مشترکہ تمدن کی شکل میں ظاہر ہو۔" (مذہب کا کوئی ذکر نہیں) ان اصولوں کے پس منظر میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ زار کی سلطنت مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ زاروں کے عہد حکومت میں ہر علاقہ اور قوم پر روسی زبان روسی تمدن کو زبردستی عائد کیا گیا تھا۔ جب زار کی حکومت ختم ہوئی اور انقلاب روس نے دنیا کی تاریخ میں پہلی دفعہ مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم کی تو صدیوں کے بعد زار کے محکوم علاقوں اور قوموں کو آزادی نصیب ہوئی۔ پہلی انقلابی حکومت کی طرف سے لینن اور اسٹالین نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا۔

"روس کے مسلمانو! کریمیا اور دولگا کے تاتاریو! ترکستان اور سائبیریا کے کرغیز اور سارے قوم والو! ماورائے قاف کے ترک اور تاتاریو! تمہارے عقائد اور تمہاری رسوم تمہاری قومی تمدن اور معاشرت اب آزاد ہیں اور کوئی ان کو ٹھیس نہیں لگا سکتا۔ تمہیں اب معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارے اور دیگر اقوام کے حقوق اب انقلاب کی حفاظت میں ہیں۔ اٹھو اور اس انقلاب کی مدد کرو۔"

تاریخ شاہد ہے کہ لینن اور اسٹالین نے یہ وعدہ ایفا کیا۔ کے بعد دیگرے مختلف علاقوں کو حق خود ارادیت دیا گیا اور متحدہ مرکزی سوویت کی نگرانی میں مقامی جمہوری حکومتیں قائم کی گئیں مگر یہ خود ارادیت پاکستان کے مترادف نہ تھی صرف تمدنی، مذہبی اور ثقافتی معاملات میں ان علاقوں اور ریاستوں کو آزادی دی گئی تھی۔ سیاسی اور اقتصادی امور میں متحدہ مرکزی حکومت کو پورے اختیارات حاصل تھے اور اب بھی ہیں جب کبھی رجعت پسندوں نے اپنے اپنے علاقوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کرنی چاہی تو ان کو سختی سے دبا دیا گیا اور کسی ریاست کو یہ اختیار نہ دیا گیا کہ وہ اپنی بنیاد مذہب پر رکھے بلکہ اپنی کتاب میں اسٹالین نے "پان اسلامی" جذبے کی شدید مخالفت کی ہے اور "پان اسلام ازم" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ "پان اسلام ازم۔ یہ ترکی اور تاتاری اونچے طبقوں والوں یعنی خانوں، تاجروں اور ملاؤں کی وہ سیاسی تحریک تھی جو سب مسلمانوں کو ایک مشترک ریاست میں متحد کرنا چاہتی تھی۔

"پاکستان کی بنیاد نفرت اور شک پر ہے۔ سیاسی سماجی اور مذہبی اعتبار سے پاکستان بالکل ناکام ثابت ہو گا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنانا سامراجیوں کا کھلونا ہے۔ عرب کی ریاستوں کا حشر ہم سب کے سامنے ہے۔ اس لئے پاکستان ایک بہت بڑا حادثہ ہو گا۔"

(شیخ عبداللہ)

خلیش جعفری (مدیر انقلاب)

مُسلمان اور اِحساسِ کمتری

● میں نے اپنے ایک ہندوستانی دوست سے کہا: "میں زیادہ وطن پرست زیادہ دلیر اور انسانیت پر زیادہ یقین رکھتا ہوں کیوں کہ تقسیمِ ملک کے بعد بدترین حالات میں بھی میں مایوس ہو کر وطن سے فرار نہیں ہوا!"

● میں نے اپنے ایک مُسلمان دوست سے کہا: "مجھے اپنا شجرۂ نسب نہیں معلوم، میرے پردادا سے پہلے ان کے اجداد ہندو تھے یا آتش پرست میں یقین سے نہیں کہہ سکتا اور نہ میں نے کبھی اپنا فرضی شجرہ بنا کر اپنا رشتہ کسی امام یا کسی خلیفہ سے جوڑنے کی کوشش کی ہے!"

ظاہر ہے ان دونوں نے مجھے ایک لمحے کے لئے حیرت سے دیکھا ہمارے ملک میں آج کتنے مُسلمان ہیں جو اس طرح کی بات کر سکتے ہیں؟ یہ کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے۔ سچ بولنے کی جرأت، کی ایک کوشش ہے۔ اور اگر ہم سچ بولنے پر آئیں تو تلخ گولیاں تو بہت نگلنا پڑیں گی لیکن ایک ایسے موذی مرض سے نجات حاصل کر لیں گے جو آزادی کے بعد سے ہمارے سیاسی، سماجی حتیٰ کہ مذہبی جسم میں بھی ناسور کی طرح رِس رہا ہے۔ یہ موذی مرض ہے

احساسِ کمتری

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح کراچی میں اعلان کر رہے تھے کہ "پاکستان اِن سب کا وطن ہے جو یہاں رہتے ہیں" اور ۱۵ اگست کو لال قلعے پر ترنگا لہراتے ہوئے قائد ہندوستان جواہر لال نہرو نے اعلان کیا تھا: "ہندوستان اِن سب کا وطن ہے جو یہاں رہتے ہیں چاہے ان کا مذہب، ذات، رنگ، نسل، زبان کچھ ہی کیوں نہ ہو" لیکن ان اعلانات کے باوجود اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر انسانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا اور قتل و غارت گری کے سلسلے نے اس قدر المناک بنا دیا تھا کہ حساس انسان دو آنسو بھی نہ بہا سکتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے تو جیسے قدم اکھڑتے گئے تھے۔ ان کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے اور آزادی کے پچیس سال بعد بھی وہ اس سرزمین پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بات پُر اعتماد انداز میں نہیں کہہ پاتے!

گذشتہ ۲۵ برس میں مسلمانوں کے مسائل پر جتنی باتیں کہی گئی ہیں اور جتنا لکھا گیا ہے انشاءاللہ دنیا کے کسی اور مسئلے پر نہ کہا گیا ہوگا اور نہ لکھا گیا ہوگا۔ لیکن مُسلمان اپنے مسائل دوسروں کو سمجھانا تو درکنار خود ہی ٹھیک سے نہیں سمجھ پائے ہیں۔ کیا مُسلمانوں کے مسائل بس ملازمتوں میں مناسب نمائندگی، مُسلم یونیورسٹی، اُردو (جو صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے) فسادات سے نجات تک محدود ہیں؟

یہ کہنا بڑی سطحی سی بات ہوگی اور بدقسمتی سے ہم گذشتہ پچیس سال سے اسی طرح کی سطحی باتیں کرتے آ رہے ہیں اور اصل مسئلے کو نظر انداز کرتے رہے ہیں مُسلمان زمیندارانہ عہد کی روایات کو بہت عرصے تک سینے سے لگائے رہے اور اب تک وہ تاریخی طور پر خود کو ہندوستان کے مُسلم حکمرانوں کا وارث سمجھتے ہیں اسی لئے جب پچیس سال پہلے برِ اعظم کی نئی تاریخ کی ابتدا ہوئی تو ڈوبتے ہوئے مسلمانوں نے خود کو نہ صرف ماضی کے حکمرانوں سے کٹا ہوا پایا (جن سے انھوں نے فرضی رشتے جوڑ رکھا تھا) بلکہ ہندوؤں کے مقابلے میں خود کو کمتر محسوس کیا۔

بشن (مقصد) میں جتنے مخلص اور جتنے صاف گو اور جتنے انسانیت پسند ہوتے ہیں اتنے ہی یہ ریاکار انسانیت دوستی سے دور اور محنت کشوں سے بیزار ہوتے ہیں اس طبقے کے جو لوگ سیاسی یا سماجی زندگی میں ہیں وہ بظاہر بڑے عزت دار ہوتے ہیں۔ اخبارات میں ان کے نام اور سرگرمیوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں لیکن عوام سے ان کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں ہوتا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ عزت دار کتنے پانی میں ہوتے ہیں!! ظاہر ہے یہ طبقہ مسلمانوں کی رہبری کرسکتا ہے نہ اُن کے مسائل سے کوئی سروکار رکھتا ہے۔ ہاں وقت ضرورت یہ طبقہ مسلمانوں کے نام پر خود زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے لیکن اس طبقے میں بھی کچھ دردمند اور مخلص ہیں جو کچھ کرنے کی کوشش، کرتے ہیں، ویسے اِن کا دائرۂ عمل بھی محدود ہوتا ہے۔ کیونکہ آبادی کے اس جنگل میں کوئی کتنوں کا مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ؟!

پھر یہ طبقہ بھی اپنے سے بڑے صنعتی کاروباری یا تجارتی ایوانوں کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، برلا۔ ٹاٹا، مفت لال، ہندوستان ایڈ ہندرا اور دوسرے پچاس ساٹھ صنعتی ایوانوں کے مقابلے میں اس کے ادارے بونے ہی معلوم ہوتے ہیں۔!

دوسرا اہم طبقہ علماء کا ہے جسے قومی میدان میں سچا، بیباک، دلیر خوف رہبر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن عام مسلمانوں کو سب سے زیادہ اس طبقے نے مایوس کیا ہے۔ علماء گفتار کے غازی بن کے اپنی ساکھ ہی نہیں جمائے ہوئے ہیں اپنا مرغ پلاؤ بھی حاصل کرتے ہیں! پیشہ ور سازندوں کی طرح ان کے بھی ریٹ ہیں۔ جو جتنا گرم گفتار ہوتا ہے لوگوں پر اتنا ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اسی کے لحاظ سے اپنی فیس وصول کرتا ہے۔

سب سے بڑی قباحت فرقہ بندی ہے۔ جو علماء کو ایک دوسرے کے مسلک کے خلاف بولنے پر اکساتی ہے۔ علماء بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو قوم بہتر فرقوں میں بٹی ہوئی ہو اسے ایک لڑی میں کیسے پرویا جاسکتا ہے لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم کرواکے تمام فرقہ بندیوں کو ختم کر دیں۔ اور صرف مسلمان باقی رہ جائیں۔ یہ دراصل جان جوکھم کا کام ہے۔ کیونکہ کسی خاص مسلک کے ماننے والے کو یقیناً رسومات کی ادائیگی سے روکنے کی کوشش کرنا فساد کو دعوت [illegible]

دینے کے برابر ہے، کونڈے۔ عرس، فاتحہ، قبرپرستی، منتیں، مرادیں، تعویذ، گنڈہ، تعزیہ داری وغیرہ آج مسلمانوں کی اکثریت کے لئے اسلام کا جزو بن گئی ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگ ان رسومات کو انجام دیتے ہیں کہ انہیں اس سے روکنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ پھر ان رسومات کو بہت علماء کی حمایت بھی حاصل ہوتی ہے اس سلسلے میں صرف جماعت اسلامی کی جرأت مندانہ کوششوں کی داد دی جاسکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس معاملے میں عقل سلیم رکھنے والے تمام مسلمانوں کو تعاون بھی کرنا چاہیئے۔ (جماعت اسلامی کی سیاست اور دیگر نظریات کے باوجود)

اس سلسلے میں بھی یہ عرض کرنا باقی ہے۔ کہ ہر مسلک کا عالم احساس برتری کا شکار رہتا ہے جو دراصل احساس کمتری کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ وہ خود کو "افضل" اور دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے، حد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو سر عام بدعتی گردانے سے بھی گریز نہیں کرتا! علماء کی "زد" سے بچ کر یا دور رہ کر کیا عام مسلمان خود مذہب اسلام کی صحیح اقدار کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرسکتا۔ ؟ یہاں سوال پھر اس کی کم مائیگی بے چارگی اور کم علمی کا آجاتا ہے۔ اور یہی جڑ ہے۔ عام مسلمان کی کمزوری یا اس کے احساس کمتری کی!

ہمارے علماء شائد چاہتے بھی یہی ہیں کہ دینی اور دنیاوی دونوں معاملات میں عام مسلمان بڑی حد تک لاعلم رہے تاکہ ہر چھوٹے، بڑے معاملے میں ان کی "گرانقدر" رائے کا محتاج رہے۔ اور وہ جو فتوے صادر کرتے رہیں ان کو بلا چوں و چرا تسلیم کرتا رہے۔

اسی لئے آج کے مسلمانوں کا "استحصال" جس آسانی سے ہمارے علماء کرسکتے ہیں اس آسانی سے کوئی اور نہیں کرسکتا۔ بعض نے تو مذہب اور سیاست کے رشتے کو الوٹ بنا کر خوب فائدہ بھی اٹھایا ہے ہمارے علماء کے ساتھ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ آج کی خاصی پیچیدہ سیاسی، سماجی اور معاشی صورتحال کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے، اس لئے ان کی نصیحت کا سارا زور اس بات پر صرف ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں نے دین کو نظرانداز کر دیا ہے اور وہ دنیا کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔ اِن کے نزدیک دین صرف پانچ وقت اللہ کو یاد کرلینا ہے۔ ان

کے نزدیک دین صرف پانچ وقت اللہ کو یاد کرلینا ہے ؟! یقیناً یہ فرض ہے لیکن کیا اس سے دنیاوی مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے ۔؟

● ایک بڑے شہر میں مغرب کے وقت ایک نوجوان گریجویٹ اذان دے رہا تھا ۔ (کون ہے جو اسکو دعا نہیں دیگا ۔ اور اس کے جذبۂ دین کی تعریف نہ کریگا ۔) اذان ختم ہوئی تو میرے بزرگ دوست نے انکشاف کیا کہ یہ نوجوان پانچوں وقت اسی طرح اذان دیکر اللہ کے بندوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے ۔ لیکن ۔۔ اس نوجوان گریجویٹ نے اس عرصے میں کبھی ملازمت یا کاروبار کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں لی ۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ بے روزگار گریجویٹوں کے لئے سرکار کی بہت سی اسکیمیں ہیں اس نے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی اور جب بھی موقع ملتا ہے وہ آکر یہ شکایت کرتا ہے کہ مجھے ملازمت نہیں ملتی ۔ ؟ انھوں نے کہا کیا ملازمت تمہارے گھر کے دروازے پر آکر پیشکش کریگی کہ یہاں آجاؤ یہ جگہ خالی ؟!

یہ سچا واقعہ ہے اور کتنے ہی نوجوان ایسے ہوں گے جو یہ سوچتے ہوں گے ۔ کہ گھر بیٹھے آسمان سے ملازمت اتر کران کے پاس آجائے ! میرے دوست ذرا تیز قسم کے آدمی تھے ، اس لئے انھوں نے خاصی تلخی سے کہا کہ یہ عمر بھر اذانیں دیتا رہے گا ۔ اور دوسرے فرقے کے لوگ ملازمتیں حاصل کرتے رہیں گے ۔!

عام مسلمانوں کو تو چھوڑ یئے پڑھے لکھے مسلمان بھی اپنے ہندو واقف کاروں بلکہ دوستوں تک سے ۔ دل کی بات کہتے سے ہچکچاتے ہیں ' اور اکثر کہہ نہیں پاتے موضوع اگر فرقہ وارانہ فسادیا پاکستان کی سیاست ہے تو وہ اس احتیاط سے بات کرینگے جیسے ان کے ایک ایک لفظ کو تولا جانے والا ہو اور اپنی کہی ہوئی ہر بات کا ان سے جواب طلب کیا جانے والا ہو ۔!

ہم دراصل ہندوؤں کی زیادہ قربت سے ڈرتے ہیں ہم انہیں شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں ۔ لازمی طور پر وہ بھی ہم پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتے ۔ لیکن جہاں کہیں ایک دوسرے پر مکمل بھروسہ کرلیا جاتا ہے گھریلو تعلقات قائم ہوجاتے ہیں ایک دوسرے کے لئے ہر مصیبت برداشت کرنے ہر قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے ہم میں کوئی فرق نہیں ہے !

بمبئی ہی میں نہیں دوسرے شہروں میں بھی عام طور پر مسلمان ایسے علاقوں میں رہائش اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے ۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو ، کوئی ہندو بھی شاید خالص مسلم علاقے میں رہائش اختیار کرنا مناسب نہ سمجھتا ہو لیکن ملی جلی آبادی والے علاقوں میں ہم کیوں نہیں رہ سکتے ۔ ؟ فسادات کا کیا ہم اتنا گہرا اثر لیں کہ علیحدہ علیحدہ بستیاں بسانے کو ٹھیک سمجھیں ۔ دراصل یہاں بھی ہم ہندو اکثریت کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار رہیں ۔ اس لئے کہ ہمیں احساس ہوگیا ہے کہ حکمراں طبقے میں ان کی اکثریت رہے گی ۔

ہم مسلمان دراصل ایک عام غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ کہ ہندو کو ہم حکمراں طبقے کا فرد سمجھنے لگے ہیں ۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہندو خود ۔ ہماری طرح عام شہری ہے اور جو لوگ ہندوؤں کو جانتے ہیں ۔ ان سے قرب حاصل ہے ۔ ان کا اعتماد حاصل ہے ۔ وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہندوؤں کو حکومت سے ہم سے زیادہ شکایتیں ہیں ۔ آزادی نے انہیں نڈر بنادیا دلیر بنادیا اور وہ سرعام ہر بات کہہ سکتے ہیں : "ہمیں بزدل" کہ ہم سرعام تو دور کی بات اپنی محفل میں بھی چاروں طرف دیکھ کر اپنی بات کہتے تھے ۔ اب خیر سے آزادی کے تقریباً ۲۰ ۔ ۲۲ سال بعد ہمیں اپنی زبان ۔ واپس مل گئی ہے یعنی بولنے اور لکھنے میں اب ہم پہلے کی طرح ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ۔ آزادی کے بعد سے پاکستان ہماری سب سے بڑی کمزوری رہا ہے ۔ لیکن ہم نے کبھی اسکا اعتراف نہیں کیا ۔ آزادی کے بعد کے کچھ برسوں میں تو ظاہر ہے ۔ پاکستان کا نام بھی ہم دبی زبان سے لیتے تھے لیکن اب بھی ہم کھل کر یہ کہنے کی جرأت نہیں کرپاتے کہ پاکستان سے ہماری خصوصی دلچسپی اس لئے نہیں ہے کہ وہ مسلم ملک ہے اور اس کی تشکیل میں ہمارا بھی تھوڑا بہت ہاتھ رہا ہوگا ۔ بلکہ اس لئے ہے کہ وہاں ہمارے بیشتر خاندانوں کے کچھ لوگ چلے گئے تھے ۔ اور ہماری دلچسپی پاکستان سے ان لوگوں سے ہے ۔ وہ جو ہمارے بھائی ہوسکتے ہیں بہنیں ہوسکتی ہیں ۔ اور دوسرے قریبی عزیز ہوسکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہم میں سے بیشتر نے لاہور دیکھا ہے ، نہ راولپنڈی ، نہ کراچی ، نہ ہم وہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے باشندوں سے واقف ہیں اور نہ ہی ہمارا واسطہ وہاں کی کسی حکومت حکومت کے سربراہ یا کسی لیڈر سے رہا ہے ہمارے عزیز و اقارب کی وہاں موجودگی کے سبب ہی پاکستان سے دوستی

اور اچھے تعلقات کی جتنی شدید خواہش ہمیں ہے۔ اتنی پاکستانی حکمرانوں سمیت کسی کو نہیں ہے۔ ہم اس کا صحیح اور ٹھیک اظہار نہیں کر پائے ہیں اس لئے پاکستان نوازی کا لیبل بھی ہم پر چسپاں کر دیا جاتا ہے (بلا وجہ کے پاکستان نوازی ہمارے یہاں خاصی تعداد میں ہیں لیکن ان کی اکثریت جاہل ہے۔ اس لئے انہیں معاف کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ شائد کسی دن یہ سمجھ جائیں کہ جس مٹی سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ وہی ان کی آخری پناہ گاہ ہوگی۔

● ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح رہبری دانشور ہی کر سکتے تھے اور وہی کر سکتے ہیں، وہ ہمیں "ملا ازم" اور "احساس کمتری" کے تاریک غار سے باہر لوگ نکال سکتے تھے۔ لیکن جذباتی مسلمان جو صرف نعروں سے بہک جاتا ہے، کسی دانشور کی بات کو مشکل ہی سے تسلیم کر سکتا ہے اور ہمارے دانشور سیاسی دلال اور گندگی سے دور رہ کر خاموش تماشائی بن کر رہ گئے۔ شائد کسی دن یہ المیہ ختم ہوگا اور مسلمان احساس کمتری کے لبادے کو اتار پھینکے گا، اور اس کی سیاسی، سماجی، ثقافتی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔۔۔۔۔!

لیکن اس کے لئے اہم شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے مسائل کو الگ تھلگ کر کے پیش کرنا ترک کر دے، اس طرح ہوتا یہ رہا ہے کہ اکثریت مسلمانوں کے مسائل کو قومی مسائل نہیں علیحدہ سے کچھ مسائل سمجھتی ہے۔ اردو جیسے لسانی مسئلہ کو بھی فرقہ وارانہ سمجھنے لگتی ہے۔ فرقہ پرست ہندو لیڈر یہ الزام لگا کر اور غلط فہمیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ مسلمان خصوصی مراعات چاہتے ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کے مسائل کو معذرت خواہی کے انداز میں پیش کرنے کا طریقہ ختم کر کے انہیں ہندوستان کے شہریوں کے قومی مسائل کی حیثیت سے پیش کرنا ہوگا۔ ۔ "ہم "مسلمانوں کے مسائل" کے الفاظ ترک کر کے جس دن انہیں قومی مسائل بنا کر پیش کریں گے ہم خود میں بھی تبدیلی محسوس کریں گے اور حکومت اور اکثریت کے رویئے میں بھی"

چالاک، عیّار اور دُنیا دار عُلمار

ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن خیال علماء کی جو حالت منکشف ہوئی کیونکہ منتظمین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حُسنِ ظن تھا اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علماء کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہوگئی۔ مخالفینِ ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے تھے ان کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں۔ لیکن جو لوگ ندوے کے لئے سرگرم تھے ان کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ میں کوئی پانچ چھ مہینے تک ان سرگرمیوں کو قریب سے دیکھتا رہا۔ اس لئے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔

میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیا داروں کی سی کارروائیاں کی جا رہی ہیں، اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لئے ایک شاطر سے شاطر اور عیّار سے عیّار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لئے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں اور عوام پر اپنا اثر قائم کرنے کے لئے مصنوعی حالتیں اختیار کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلسِ وعظ میں کیوں کر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اس کے بعد واعظ نے جوں ہی فتوی کی ایک حکایت شروع کی دوسرے اصحاب نے سُنا کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلس میں بڑی رقت طاری ہوگئی اور اس قدر آہ و بکا ہوا کہ اسی پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اسی طرح کی بیسیوں باتیں روزمیں دیکھتا تھا اور میرے دل میں روز بروز اس طبقے کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد — آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۱۹

زرینہ ثانی

مسلم خواتین کے مستقبل کا انحصار

قبل از اسلام عورت کی حالت بیحد دردناک اور دلسوز تھی۔ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی عورت کسمپرسی کے عالم میں پڑی تھی۔ دل بہلانے کا وسیلہ، بازار میں خرید و فروخت کی جنس، گناہوں کی ماں، برائی کی جڑ، جوئے میں ہارنے جیتنے کی شے، مرد کی مصیبت کا سبب وغیرہ عورتوں کے خطاب و القاب تھے۔ اسلام کی ضیا پاشی نے عورتوں کو بھی مستفیض کیا اسے ذلت و خواری سے نکال کر بلندی و رفعت عطا کی۔ تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اسے حصہ ملا۔ عروج و کمال کا سبب بنی۔ گویا عورت کے حقوق کا تعین و تحفظ اسلام میں بخوبی کیا گیا ہے اسے جو حقوق دیئے گئے ہیں وہ عین فطرت کے مطابق ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس پسماندہ صنف کو وہ بلندی و رفعت، عظمت و شکوہ، جلالت و مرتبت عطا کی گئی کہ وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگی بلکہ اس کے قدموں کے تلے جنت کا مژدہ سنا کر مردوں کیلئے اسے قابلِ رشک بنا دیا گیا۔

مگر آج جب ہم یہاں مسلم خواتین کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ لگتا ہے جو حقوق ہم کو ملے ہم نے ان کی صحیح قدر و قیمت نہیں جانی اور نہ انہیں محفوظ رکھنے کے جتن کئے۔ ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب کم ہے۔ اور مسلم طبقہ بھی اسی بیماری کا شکار ہے۔ اسلام نے علم کے حصول کیلئے چین تک جانے کی ہدایت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف دینی علم ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے حصول کی تبلیغ بھی ہمارے مذہب میں کی گئی ہے۔ عورت کو اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ عورت کی تعلیم بعض وجوہات کی بنا پر زیادہ ضروری ہے، جب تک مائیں پڑھی لکھی باشعور یا سلیقہ نہ ہوں۔ ان کی آغوش میں بچوں کی پرورش اچھی طرح سے نہیں ہو سکتی۔ بچوں کیلئے آغوشِ مادر ہی پہلی درسگاہ ہے۔ اگر پہلی اینٹ صحیح نہیں رکھی گئی تو عمارت کی کجی لازمی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہمارے مستقبل کی درخشندگی کا انحصار بہت کچھ عورت کی تعلیم و تربیت پر ہے۔ عورت ذہین، باصلاحیت اور صائب الرائے ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان خوبیوں کو بروئے کار لانے کا اسے موقع دیا جائے پھر دیکھئے کہ یہ چنگاری کس طرح شعلہ بنتی ہے اور اپنی تابناکی سے مادرِ ہند کو کس طرح روشن کرتی ہے۔

جب ہم ہندستان کی تاریخ کے صفحات الٹتے ہیں تو ان اوراق پر مسلم خواتین کے زریں کارنامے بھی بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسلم خواتین عالم و فاضل رہی ہیں۔ مسلم خواتین نے اپنے تدبر سیاست دانی اور ذہانت سے ان مشکل مسائل کو حل کئے جہاں بڑے بڑے دانشوروں کے بھی پر جلتے تھے۔ مسلم خواتین کے سر پر حکومت کا تاج رہا۔ اور میدان جنگ میں فوج کی قیادت کی۔ رضیہ سلطانہ، نورجہاں، چاند بی بی، گلبدن، جہاں آرا، زینت محل وغیرہ نام غالباً ہر کسی کے حافظہ میں محفوظ ہونگے۔ جنگِ آزادی میں مسلم قائد اور رہنماؤں کی اچھی خاصی تعداد نظر آنے لگی۔ غور کیجیے تو یہی معشوق اس پردۂ زندگانی میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ کیوں کہ جب تک گھر میں عورتوں کا تعاون حاصل نہ ہوں، انسان سکون

اطمینان حاصل نہیں کر سکتا گھر جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ وہ ذہنی طور سے پراگندہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے پراگندہ دل و دماغ نہ خود کو سنبھال سکتا اور نہ زیست کی کشتی کا پتوار بن سکتا۔

آج کے دور پر نظر ڈالئے آپکو زندگی کے ہر شعبے میں دوسری خواتین کے دوش بدوش مسلم خواتین بھی نظر آئیں گی۔ ڈاکٹر، انجینئر، منسٹر، لیکچرر، سائنسداں، مصنفہ، مدیرہ، شاعرہ اور کچھ شعبوں میں بحیثیت آفیسر آپ انھیں پائیں گے فائن آرٹس اور کھیل کے میدان میں بھی مسلم خواتین کے نام نظر آتے ہیں لیکن اس بات کا اعتراف کرنے میں قطعی جھجک نہیں ہے کہ یہ تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم عمل جد وجہد اور تیزگامی سے کام لیں اور زمانہ جو کہ قیامت کی چال چل رہا ہے اس کے ساتھ دوڑ سکیں۔ اسی تیز رفتاری، تندہی، مسلسل جدوجہد سے ہمارے مستقبل کی تابناکی وابستہ ہے۔

آزادی کے بعد مسلم خواتین کو جتنی تیزی سے ابھرنا چاہیئے تھا وہ نہ ابھر سکیں۔ سچ پوچھئے تو اس کی راہ میں کئی دیواریں حائل رہی ہیں سب سے پہلی رکاوٹ مروجہ پردہ ہے۔ ہمارے مذہب نے پردے کا حکم ضرور دیا ہے مگر ہندستانی خواتین نے جو پردہ اختیار کیا ہے اس میں اسلامی اثرات سے زیادہ مقامی اثرات پائے جاتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ ہم نے ان اثرات کو اپنے مزاج کا جزو بنا لیا۔ لیکن جن کے یہاں سے یہ اثرات ہمارے یہاں در آئے انھوں نے غور وخوض کے بعد پردہ ترک کر دیا۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ جن کی تقلید ہم نے کی انھوں نے خود کو ان زنجیروں سے آزاد کر لیا۔ اور ہم گرفتارِ قفس رہ گئے۔ اسی مروجہ پردے کی وجہ سے مسلم خاتون آگے آنے سے جھجکتی رہی۔ یہی پردہ اس کی ترقی میں سدِ راہ رہا۔ پس پردہ ہونے کی وجہ سے اس میں جرأت و ہمت پیدا نہ ہو سکی۔ مشاہدے کا فقدان رہا۔ تجربے سے محروم رہی اور اخلاقی و اصلاحی رجحانات سے بے بہرہ! نتیجہ وہی ہوا جو لازمی تھا اور جو ہمارے سامنے ہے۔

جہاں تک مغربی تعلیم کا سوال ہے وہ اس میں کئی صدی پیچھے رہی۔ اس کی وجہ ہماری قدامت پرستی ہے۔ ملک آزادی سے قبل انگریزوں کی حکومت تھی۔ ہمارے بعض رہنماؤں نے مغربی تعلیم سے خود کو مزین کرنے کی تبلیغ کی تاکہ دنیا سنور سکے اور دنیا کے سنورنے سے آخرت بھی سنور جائے۔ مگر مخالفین نے اسے مغرب پرستی اور غلامانہ ذہنیت سے تعبیر کیا۔ اور یہ اثرات کافی دیرپا اور دوررس ہوئے۔ جب مردوں کا مغربی تعلیم حاصل کرنا بری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ تو عورتوں کیلئے مغربی تعلیم کا حصول بےحد دشوار تھا اس لئے وہ پیچھے رہی۔ ٹیکنیکل تعلیم کا بھی یہی حال ہے۔

میرے خیال میں فائن آرٹس کا شعبہ ہی ایسا شعبہ ہے جس میں مسلم خواتین کی تعداد اچھی خاصی رہی ہے۔ موسیقی، رقص، اداکاری میں ان کے جوہر چکے اس سلسلے میں ان کا نام چہار دانگ عالم مشہور ہوا اور آج بھی ان کے فن کا لوہا مانا جاتا ہے

ہمیں غور کرنا ہے کہ ہماری خواتین کیلئے کون سا لائحہ عمل پیش کیا جائے جس پر چل کر ان کا مستقبل محفوظ ہو سکے، بلکہ تابناک اور درخشندہ بھی بن جائے۔ سب سے ضروری چیز تعلیم ہے۔ تعلیم کے حصول کے وقت اسے نہ صرف اپنے ذہن کے دروازوں کو کھولنے کی ضرورت ہے، بلکہ دل کے دروازے بھی کھلے رکھنا ضروری ہے۔ تعلیم کا مقصد سروس یا شادی کیلئے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد صحیح معنوں میں انسانیت کی جلا اور اخلاقی اقدار سے آگہی حاصل کرنا ہے اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں خلوص و تندہی برتنا ہے۔ عورت کے فرائض بلند و عظیم ہیں لیکن بڑے پیچیدہ بھی۔ وہ کہیں بیٹی ہے تو کہیں ماں، کہیں بیوی ہے تو کہیں بہن۔ اور ان تمام حیثیتوں سے اس کے فرائض مختلف اور مشکل ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ لیکن جب ہم عورت کے جذبات اور احساسات پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ذکی الحس ہے، محبت و راحت کا پیکر ہے۔ اور شفقت و مروت اس کی فطرت ثانیہ۔ ان خوبیوں کی بدولت وہ اپنے فرائض کو ادا کر سکتی ہے۔ اگر وہ خود کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے اور دیانت کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک ہو جائے تو ہماری ملت کی فلاح و بہبودی، عروج و کمال یقینی ہے۔ تعلیم کی اہمیت کا ہمیں احساس نہیں جس کی وجہ جہالت

بھی جا سکتی ہے۔ یہ جہالت کیسے دور ہو؟ اس کے لئے ضرورت ہے اس بات کی کہ ایسی خواتین جنھوں نے تعلیم حاصل کی ہے جو دلسوز اور دردمند ہیں جو حقیقت میں حقیقت شناس بن چکی ہیں وہ آگے آئیں پسماندہ طبقوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس بیدار کریں۔ انھیں اپنی حالتِ زار سے آگاہ کریں۔ ان کی صلاحیت کو بروئے کار لانے پر اکسائیں۔ ان کے جوہر کو تابناک بنائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس طبقہ میں احساس کمتری زیادہ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں تعلیم یافتہ بہنوں کو بڑی کشادہ دلی اور وسعت قلبی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

جب ہم اچھے کام کرنے کیلئے پہلا قدم بڑھاتے ہیں تو تعریف و تحسین تو کم ہوتی ہے۔ نکتہ چینی اور گرفت زیادہ۔ لیکن قوم کے عروج کی خاطر ہمیں اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ جب پسماندہ طبقہ کی کچھ خواتین پڑھ لکھ جائیں تو اپنے طبقے سے نفرت نہ کریں۔ اور ان سے دوری بھی اختیار نہ کریں۔ بلکہ ان ہی میں شیر و شکر ہو کر ان کا دکھ درد محسوس کریں انھیں پیار و محبت سے اصلاح کی طرف متوجہ کریں یہ کام دشوار ضرور ہے مگر خلوص اور محبت یقین اور اعتماد کے آگے بڑی بڑی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ ہمارے یہاں پسماندہ طبقے کی حالت بیحد افسوسناک ہے۔ جس محلے میں یہ پسماندہ طبقہ رہتا ہے اس کی حالت خستہ۔ پانی کے نکاس کیلئے ڈرینیج [illegible] کی بجائے چھوٹی چھوٹی گندی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ بچے اسکول جا کر تربیت پانے کی بجائے آپس میں گالی گلوچ کر رہے ہیں۔ آپس میں پیار و محبت کے بجائے پتنگ اور کبوتر بازی پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ پان کھاتے ہیں اور دونوں لبوں کے گوشوں سے پان کی لالی جھانکتی ہوئی فریاد کرتی ہے! یہ ہے ہمارے پسماندہ طبقے کا محلہ۔ اگر ہم میں اپنی حالتِ زار کا احساس بیدار ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے یہاں کے کارپوریشن میونسپل اور اسی قسم کے ادارے ان کی طرف توجہ نہ دیں۔

اس سے پہلے لکھا جا چکا کہ مروجہ پردہ ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ خوش قسمتی سے ایسے خاندان کی لڑکیاں (جو پردے کے پابند ہیں) کالج یا یونیورسٹی جاتی ہیں تو عجیب تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اپنے محلے سے تو نقاب ڈالے نکلتی ہیں لیکن جہاں محلے کی سرحد ختم ہوئی رخِ روشن کو نقاب سے آزاد کر دیتی ہیں۔ اس سے ان کی شخصیت اور سیرت پر برا اثر پڑتا ہے۔ ریاکاری پیدا ہوتی ہے اور جھوٹ بولنے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ چھپ چھپ کر کام کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے جس کی وجہ سے غلط راہ اختیار کرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن آپ کھلی فضا دیجئے غلطیوں کے امکانات کم سے کم ہوتے جائیں گے۔ اسی پردے کی وجہ سے وہ دوسرے معاشرتی اور سماجی کاموں میں حصہ نہیں لے پائیں جہاں آگے بڑھنے کے مواقع ہیں۔ وہاں بھی پردہ، پردہ بنجاتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح اس مروجہ پردے سے دست بردار ہو جائیں۔ اگر ہماری بچیوں کو صحیح تعلیم دی گئی ہے اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ذہن نشین کرادی گئی ہے حیا کے زیور سے مزین کر دیا گیا ہے تو بے پردہ رہکر بھی شریف، باوضع اور رکھ رکھاؤ والی ہی ہوں گی۔ لیکن وہ ان اوصاف ہی سے محروم ہیں تو لاکھ پردے میں رکھیئے برائیاں غالب آ ہی جائیں گی۔

مسلم خواتین کیلئے ٹیکنیکل تعلیم کیلئے مزید سہولتیں فراہم کی جائیں۔ ڈاکٹری، انجینیرنگ، سماجی بھلائی وغیرہ کے شعبے میں ان کی تعداد کافی ہونی چاہیئے۔ تاکہ ہمارا معاشرہ سدھر سکے۔ اگر اس قسم کی تعلیم دی گئی تو ملازمت کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی آج کا دور اقتصادی لحاظ سے بیحد نازک ہے۔ یہ وہ دور نہیں کہ صرف مردوں ہی کے دوش پر کفالت کا بوجھ ڈال دیا جائے۔ ہماری سماجی ضروریات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ خرچ اور آمدنی میں توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں تعلیم کے بعد ملازمت کی جائے تو مضائقہ نہیں۔ بلکہ اس سے زندگی میں خوش گواری ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس دوہری ذمہ داری کو نباہنے کیلئے عورت کو دوہرے صبر اور محنت کی ضرورت ہوگی۔

اب آیئے فائن آرٹس کی طرف ــــ انسان کا سب کچھ اس کا جسم ہی نہیں۔ بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ جسمانی اور مادی ضروریات کے علاوہ بھی وہ کچھ چاہتا ہے۔ آپ اسے ذہنی تسکین کہہ لیجئے ــــ

جی ہاں روحانی بھی۔ اس تسکین کو وہ فائن آرٹس کے توسط سے حاصل کرتا ہے۔ آج اس مشینی اور سائنسی دور میں بھی انسان اس تسکین کا خواہاں ہی نہیں بلکہ اس کی جستجو میں سرگرداں بھی ہے۔ میرا خیال ہے مسلم طبقے میں اس شعبے میں صرف شاعری کو چھوڑ کر دوسرے آرٹس کو مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ آج بھی صرف اونچا طبقہ ہی اس سے محظوظ ہوتا ہے۔ عرض کر چکی ہوں کہ فائن آرٹس کے شعبے میں مسلم خواتین کا تناسب زیادہ ہی ہے اس لئے زندگی کے اس شعبے کی طرف سے تو اطمینان ہی ہے لیکن اس طبقے کی مسلم خواتین پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں لیکن اپنے دل میں ان خواتین کا خیال رکھیں جو تازہ ہوا میں سانس لینے کو ترس رہے ہیں۔ فنکار خواتین' ایسی خواتین کی مالی امداد کر سکتی ہیں کیوں کہ فائن آرٹس میں جنھوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ دولت ان کے در کی پاسبانی کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے فضول اخراجات کو برطرف کرکے کچھ مسلم بچیوں کی تعلیم و تربیت کیلئے وقف کر دیں تو یہ بھی ان کی تسکین کا سبب بن سکتا ہے۔

انٹرکیمونل میریج کے سلسلے میں' میں یہی کہوں گی کہ یہ صرف ان لوگوں کا حق ہے جو اعلیٰ سوسائٹی کے افراد ہیں۔ ایسی سوسائٹی میں اس قسم کی شادیاں معیوب نہیں سمجھی جاتیں اور نہ ان سے برے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن متوسط طبقے میں ایسی شادیوں کے نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ غیر مذہب کی لڑکی یا لڑکے کو خاندان والے قبول نہیں کرتے۔ اگر شادی ہو بھی جائے تو ان کے بچوں کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ پھر ایسی شادیوں پر کمیونل فساد بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ مسلم خواتین اس سلسلہ میں محتاط رہیں تاکہ ان کے مستقبل کی ترقی پر برے اثرات نہ پڑیں۔

ایسی خواتین جو مالی فکروں سے آزاد ہیں، میرا مطلب جو ملازمت کے جنجال میں گرفتار نہیں وہ وقت نکال کر سماجی اصلاح و بہبودی کے کام کر سکتی ہیں۔ غیر مسلم خواتین کے کئی ادارے ایسے ہیں جہاں غریب عورتیں دستکاری صنعت اور چھوٹی موٹی گھریلو چیزیں بناتی ہیں۔ انھیں فروخت کیا جاتا ہے اور اس طرح ان کی مدد ہمارے یہاں ایسے اداروں کی سخت ضرورت ہے۔ جو عورتیں اس قسم کی سوشل سروس کیلئے نکلیں انھیں میں بتا دوں کہ ہمارے یہاں سرمائے کی فراہمی مشکل مرحلہ نہیں۔ ڈھائی فیصدی زکاۃ اہل نصاب پر واجب ہے۔ لوگوں کو ایسے اداروں کی طرف توجہ دلائی جائے اور اہل نصاب فرداً فرداً دس دس پانچ پانچ روپے دینے کے بجائے ایسے اداروں کو دیں گے تو زیادہ مفید نتائج برآمد ہوں گے اور بہترین مصرف ہوگا۔ اسی طرح اوقاف سے بھی وقتاً فوقتاً مدد دی جا سکتی ہے۔

مسلم خواتین میں جو خرافات ہیں بند ہونے چاہئے۔ جو فضول خرچیاں ہیں اس کی مذمت کرکے انھیں روکا جائے تاکہ رقم کسی صحیح اور مفید مصرف میں لائی جا سکے۔ مختلف خواتین مل کر انجمنیں بنائیں جہاں گھریلو صنعت کی تربیت دی جا سکے اور جہاں غریبوں کی امداد کے مواقع فراہم ہو سکیں۔

اگر ہم میں دل سوزی ہے ملت کا درد ہے۔ ہم محنت اور خلوص سے کام کرنے کی طرف راغب ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا مستقبل تابندہ بلکہ تابندہ تر ہو سکے۔

حسین شاہین

ہندستانی مسلمانوں کے چند اہم مسائل

جن لوگوں نے دنیا کے مسلم ممالک کا دورہ کیا ہے یا دیگر مسلم ممالک کے مسلمانوں سے حج بیت اللہ کے دوران ملاقات کی ہے ان کا کہنا ہے کہ اکثر دینی امور اور دیگر مذہبی طور طریقے کے بارے میں ہندوستانی مسلمان دیگر ممالک کے مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں حتیٰ کہ بعض عرب ممالک کے مسلمان اور خصوصاً سعودی عربیہ میں جہاں آج سے تیرہ سو سال پہلے آفتاب رسالت (صلعم) اسلام کا پیغام توحید و عالمگیر برادری لیکر طلوع ہوا تھا، ہندوستانی مسلمانوں کو اکثر اسلامی عقائد اور ان پر عمل کے اعتبار سے خود کو مقابلہ میں مختلف اور زیادہ کٹر اور دقیانوسی سمجھتے ہیں۔

برصغیر ہند میں بنگلہ دیش کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد موجودہ خطہ پاکستان سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کے مسلمانوں کی آبادی کا شمار کیا جائے تو انڈونیشیا جس کی آبادی دس کروڑ سے کچھ زیادہ ہے، اس کا نمبر پہلا، بنگلہ دیش کا دوسرا اور ہندوستان کا تیسرا آتا ہے۔ گویا برصغیر کی کل آبادی، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کو ملا کر تقریباً بیس کروڑ ہوتی ہے، جو دنیا کے مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی سے زیادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند تک "مسلمانان ہند" سے مراد موجودہ تینوں ممالک یعنی ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں سے لی جاتی تھی جن کی کل تعداد تقسیم ہند کے وقت دس کروڑ تھی لیکن آزادی کے بعد ہندوستان میں تقریباً ۲ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ برصغیر ہند کی مسلمان آبادی کے اعداد و شمار دیکھنے کے بعد اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس خطے کے مسلمانوں کے مسائل نہ صرف ان کے اور ان کے ممالک کے لئے بلکہ عالم اسلام اور دنیا کے لئے بھی کس قدر اہمیت رکھتے ہیں؟

تاریخی نقطہ نظر سے ہندوستان میں مسلمان جن مسائل سے ۱۹۴۷ء کے بعد دوچار رہے ہیں وہ دیگر ممالک کے مسلمانوں کے مسائل سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نہ ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر ممالک میں مسلمان یا تو حاکم رہے ہیں یا محکوم۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کو یہ آئینی موقع ملا کہ تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہونے کے باوجود وہ اپنے ہم وطن ہندو اکثریت کے ساتھ ملکر ملک کا سیاسی اقتدار سنبھالیں۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی بھاری اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اور ہندوستانی حکومت لادینی یا سیکولر سمجھی جاتی ہے جس کی بنا پر اکثر مسلمان یہ اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر حکومت مسلمانوں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دے تو مسلمان اقلیت کی اپنی مذہبی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ لہذا مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ حکومت ہند مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل دے۔ لیکن مسلمانوں کے اس نظریہ کو حکومت کے تسلیم کر لینے کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمان ہندوستان کے دیگر فرقوں کے ساتھ آئینی لحاظ سے سماجی طور پر ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہونے کیلئے خود کون سا مناسب و معقول طریقہ کار اختیار کرنا چاہتے ہیں؟

مسلمانوں کے لئے یہ سمجھ لینا اشد ضروری ہے کہ انکے مذہبی معاملات میں حکومت سے دخل نہ دینے کے صرف اسی وقت کوئی معنی ہو سکتے ہیں جب کہ مسلمان اس بارے میں خود اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں۔ یا بہ الفاظ دیگر خود مسلمان اپنے مذہبی اور سماجی مسائل کے حل تلاش کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ سماجی ترقی کی راہ میں ملک کے کسی دوسرے فرقہ سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں باعزت شہری کی حیثیت سے رہنے کے لئے اپنے مذہب سے دستبردار ہونا ہوگا۔ ہاں ان کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ اپنے مذہبی عقائد اور اعمال کا از سر نو جائزہ لیں اور صحیح اسلامی تعلیمات کی اسپرٹ کی حقیقت کو فرسودہ روایات اور دیگر رسم و رواج کے خرافات سے الگ کرنے کی کوشش کریں تاکہ مسلمان دین و دنیا دونوں میں سرخروئی حاصل کر سکیں۔

ہم کو یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیئے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ ہر قوم اور مذہب کے پیرو صرف اپنے مذہب کی تعلیمات کا حوالہ دے کر یا اپنے بارے میں بلند بانگ دعوے کر کے نہیں بلکہ اپنے روزمرہ کے اعمال اور عادات سے پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے بھی یہ جاننا اشد ضروری ہوگا کہ اپنے اعمال سے انہوں نے دنیا کے غیر مسلم عوام اور خواص کے سامنے اسلام کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ کیسا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ مشہور ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر اپنے فرقے کے افراد کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے صدیوں پرانے تعصب اور ظلم سے نجات دلانے کے لئے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں اسلامی تعلیمات مساوات و اخوت سے متاثر ہو کر مذہب اسلام کی طرف راغب تھے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں موجود باہم اختلافات اور علماء کرام کی کفر بازیوں کو دیکھا تو گھبرا گئے چنانچہ اپنی زندگی کے آخری دور میں ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے لاکھوں پیروؤں سمیت بدھ مت کو اختیار کر لیا تھا۔ کسی دوست نے ڈاکٹر امبیڈکر سے اسلام قبول نہ کرنے کے بارے میں سوال پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ مسلمان فرقوں کے علماء کی کفر بازیوں کو دیکھنے کے بعد وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ خود مسلمانوں میں کون سچا مسلمان ہے اور کون کافر؟ اور اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرنا چاہے تو کون سا اور کس فرقہ کا اسلام قبول کرے؟

مسلم سماج میں عورت کا مقام

اسلام نے جہاں بنی نوع انسان کو وحدانیت اور عالمگیر برادری کی تعلیم دی، وہاں مسلم معاشرہ میں عورتوں کو مردوں کے ساتھ ایک باعزت مقام و مرتبہ بھی دیا لیکن حقیقت یہ ہے اور عملی طور پر عورت کا جو مقام مسلم سماج میں ہے اس کو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق نہیں کہا جا سکتا۔ بیشتر غیر مسلم اقوام اور خود مسلمان عورتوں کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان عورتوں کو مسلم سماج میں مردوں کے مقابلہ میں کمتر درجہ ملتا ہے۔ اگرچہ اسلامی تعلیمات کے مطابق عورتوں اور مردوں کے حقوق [illegible] "اصولاً" [illegible] رہتی ہیں، لیکن عملاً ان حقوق کے معاملہ میں مردوں کو "زیادہ برابر" "More Equal" اور عورتوں کو "کم برابر" "Less Equal" پایا جاتا ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض علماء کرام کے نزدیک مسلمان عورتوں کا مساجد میں آنا تک امت میں فتنہ و فساد کا موجب اور مذہباً ممنوع کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق عورتوں کا مساجد میں آنا اور نمازوں میں باجماعت طور پر شرکت کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ [illegible] حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کو جنہیں اس پر اعتراض ہوا کرتا تھا یہ تاکید فرمائی تھی کہ عورتوں کو مساجد میں آنے سے منع نہ کریں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان بعض روایات اور رسم و رواج کو اصل، اسلامی تعلیمات پر ترجیح دے کر اپنی عورتوں کو ان کے جائز مذہبی حقوق سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ہمارے شہروں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسی مسجد ہوتی ہے جہاں عورتوں کے لئے شرعی طور پر نماز باجماعت کا اہتمام ہوتا ہو حالانکہ آج کے حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ایک دو مساجد ضرور ایسی ہونی چاہئیں۔

حال ہی میں مجھے بمبئی شہر میں دو ایسے جلسوں میں شرکت کرنے کا

اتفاق ہوا تھا جو مسلمانوں کے تعلیمی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی مسائل پر غور و خوض کے لئے منعقد کئے گئے تھے۔ یہ جلسے خاص طور پر اس لئے قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں مسلمان عورتوں کے چند ناگفتہ بہ اور قابل رحم حالات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

ایک جلسہ جو خالص مذہبی قسم کا تھا چند پرجوش مسلم خواتین نے جشن میلاد النبی منانے کے لئے منعقد کیا تھا۔ حاضرین جلسہ میں مسلمان مرد عورتیں دونوں شامل تھے۔ جلسہ کی صدارت ایک مسلمان خاتون نے کی تھی۔ اور تقاریر کے لئے چند فاضل مقررین بھی مدعو تھے۔ جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن مجید اور حمد و نعت سے ہوا جسکے بعد ایک عالم و فاضل مقرر نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ مسلمان عورتیں آئندہ اگر کوئی مذہبی جلسہ منعقد کرنا چاہیں تو ان کے لئے یہ چاہیئے کہ شرعی پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ خواتین کے لئے دوسری اہم بات ملحوظ رکھنے کی یہ ہوگی کہ مردوں اور عورتوں کو مدعو کرنے اور مردوں سے تقریریں کروانے کی بجائے انہیں چاہیئے کہ ان جلسوں میں شرکت صرف عورتوں کی ہو جس میں عورتیں ہی تقریر کریں۔ فاضل مقرر نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ بھی فرمایا کہ انکی "صاف گوئی" سے متاثر ہو کر اگر منتظمین جلسہ آئندہ جلسوں میں تقریر کے لئے انکو مدعو نہ کریں تو انہیں اس بات کا کوئی دکھ نہ ہوگا۔

اپنے خطبۂ صدارت میں محترمہ صدر صاحبہ نے مولانا موصوف کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غیر مسلم اقوام کے اکثر لوگوں کو مسلمان عورتوں کے بارے میں عام اور خاص مسلمان مردوں کے خیالات و اعمال سے یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ اسلام میں عورتوں کا درجہ مردوں کے مقابلہ میں کمتر ہوتا ہے عام طور پر مسلمانوں کے اقوال و اعمال سے غیر مسلم اقوام میں یہ غلط فہمی بھی رہتی ہے کہ مذہب اسلام کی تعلیمات کے مطابق عورت کو زندگی کے ہر شعبہ میں کمتر درجہ ہی دیا جاتا ہے جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مسلمان مرد یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں نعوذ باللہ عورت کی کوئی روح تک نہیں ہوتی۔

صدر محترمہ نے مزید فرمایا کہ عام طور پر اسمگلنگ اور شراب کے ناجائز اور حرام دھندوں سے مسلمانوں کو منسوب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ بہت سے حاجی تک اسمگلنگ کے ناجائز دھندوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ خود بمبئی شہر میں اسمگلنگ کے مال کی خرید و فروخت کا ایک بازار حاجیوں کے مسافر خانہ سے بالکل متصل پایا جاتا ہے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے عمدہ عمل سے مقام حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

دوسرا جلسہ جس میں مجھے شرکت کرنیکا اتفاق ہوا تھا۔ اسمیں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے کئی مسلمان نمائندے بھی شامل تھے۔ جلسہ کی ایک خصوصی نشست میں مسلمانوں کی اقتصادی پست حالی اور چند سماجی مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک فاضل مقرر نے کہا کہ ملک کی آزادی کی ۲۶ سال بعد بھی مسلمان تعلیمی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے میدان میں بہت پیچھے پائے جاتے ہیں اپنی خستہ حالی کے اسباب پر مسلمانوں کو غور کرنا چاہیئے۔ بالخصوص مسلمانوں کو اس اہم مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے کہ عصمت فروشی کے دھندوں میں مسلمان عورتیں ملک کی مسلمان آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ جو پائی جاتی ہیں اس کی کیا وجوہ ہیں؟

آج سے تقریباً ۱۸ سال پہلے میرے ایک سردار جی دوست جو تقسیم ہند کے بعد صوبہ سرحد سے ہجرت کرکے ہندوستان آگئے تھے انہوں نے بھی لاہور، راولپنڈی اور دیگر مسلم اکثریت کے شہروں کا حوالہ دیتے ہوئے مجھ سے ایکبار یہی سوال پوچھا تھا کہ طوائفوں کی اکثریت مسلمان عورتوں پر کیوں مشتمل ہوتی ہے؟ اگرچہ میں نے سرچار کو چند اقتصادی وجوہ بتا کر اور دیگر ہمسایہ اقوام کے چند اعداد و شمار کا حوالہ اس وقت دیکر خاموش کردیا تھا مگر انکا یہ سوال آج تک میرے ذہن میں کھٹکتا رہا ہے۔۔ سوال کا موضوع باوجود اپنی اہمیت کے بہت کم ہی عام طور پر مسلمانوں کی بحث میں آتا ہے یا تو عام مسلمان اس موضوع پر سوچنا یا بحث کرنا اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں یا کبھی اس موضوع پر بحث ہوتی ہے تو بلا جھجک و تمام تلخ حقائق کی روشنی میں بحث نہیں کی جاتی عموماً مسلمان اس موضوع سے یا تو بے رخائی برتتے ہیں یا اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جس سے مسئلہ حل ہونیکی بجائے اور سنگین ہوجاتا ہے۔ چند اوقات احباب جن سے میں نے اس موضوع پر تبادلہ خیال کیا انکا کہنا ہے کہ تمام طوائف پیشہ ور عصمت فروش عورتیں نہیں ہوتیں۔ ناچ گانا ان عورتوں کا پیشہ ضرور ہوتا تھا لیکن ناچ گانوں کو ان طوائفوں نے علم بازاری سطح سے اٹھا کر ایک "فائن آرٹ" یا فن لطیفہ کے درجہ کو پہونچا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا جب شاہی دور تھا تو طوائفیں بادشاہوں، نوابوں، اور رئیسوں کے ایک خاص طبقہ کی عیش و عشرت اور تفریح کیلئے وجود میں آئی تھیں لیکن یہ طوائفیں بازاری پیشہ ور عورتوں سے مختلف ہوا کرتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اکثر مسلم امراء اپنی اولاد کو آداب شاہی کی تربیت کے لئے طوائفوں کے پاس بھیج دیا کرتے تھے لیکن یہ باتیں تو مسلمانوں کے شاہی حکومت کے دور کی تھیں بحکومت اقتدار ہندوستانی مسلمانوں سے چھوٹ جانیکے بعد یہ شاہی طوائفیں بازاری عورتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں

صاحبوں اور دوسرے سرمایہ داروں کی جہاں اپنی ذات کی بیویاں ہوتی ہیں وہاں ان کی داشتائیں دو طوائفیں ہوتی ہیں جو اپنے آپ کو "مسلمان" کہتی ہیں۔ اکثر ان طوائفوں کے نام نہاد "مسلمان شوہر" بھی ہوتے ہیں اور ان کے اپنے خاندان بھی۔ مگر ان طوائفوں کو اپنے صاحبی سرپرستوں سے اپنی عصمت فروشی کے عوض ماہانہ وظائف ملتے رہتے ہیں۔۔۔

بمبئی کی فلمی دنیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں آئے دن منعقد ہونے والی مجروں اور قوالیوں کی محفلوں میں مسلمان عورتوں کی شرکت پر نظر ڈالنے سے اس مسئلہ کی نوعیت اور حقیقت اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے۔ یہاں پر یہ بتادینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ میں نے اپنے چند دوستوں کو اس صورت حال پر شرم محسوس کرنے یا اظہار رنج و غم کرنے کی بجائے ایک طرح کی خوشی یا فخر کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں مسلمان پیشہ ور عورتیں بازار حسن میں غیر مسلم پیشہ ور عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ "دلکش اور نفیس" ثابت ہوتی ہیں جس کا سبب عوام میں مسلم عورتوں کی "مانگ" اور "مقبولیت" "مقابلتہً" دوسرے فرقوں کی عورتوں کے زیادہ ہوتی ہے!

یہ بات تمام مسلمانوں کے لئے باعث فکر و تشویش ہونی چاہیئے کہ جہاں مذہب اسلام عصمت و عفت، شرم و حیا اور ایک پاکیزہ زندگی کے بارے میں اپنے پیروؤں کو اس قدر اعلیٰ و ارفع تعلیم دیتا ہے وہاں مسلمان مردوں کی غفلت اور غلط کاریوں کی وجہ ان کی بدنصیب عورتوں کی ایک بھاری تعداد اس طرح غیر اسلامی ناپاک اور مذموم طور طریق پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ اور ہم مسلمان ان عورتوں کی بہتری اور اصلاح کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلم معاشرہ کا یہ ناسور ان کے شاہی دور کے قدیم و فرسودہ (Feudal) جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے جس کو صفحۂ ہستی سے مٹانا مسلمان کا پہلا فرض اولین سمجھنا چاہیئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ کے تمام سماجی اور اقتصادی پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی ان بھٹکی ہوئی اور مجبور عورتوں کی آبادکاری کی طرف توجہ دیں۔ ہم کو ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے سوچنا چاہیئے کہ ان عورتوں کی خستہ حالی اور اخلاقی تباہی و گمراہی میں ہم مردوں کی کتنی ذمہ داری ہے؟ ایسی عورتوں کی از سر نو آبادکاری اور مناسب و معقول تعلیم و تربیت کے لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ جا بجا درسگاہیں اور Rescue Homes یا بے سہارا عورتوں کو آسرا اور ٹریننگ دینے کے مرکز Women's Rehabilitation Trg centres قائم کریں جہاں ایسی عورتوں کو مسلم سماج کی تعمیر و ترقی میں کارگر رول ادا کرنے کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ ہندو سماج میں دیو داسی عورتوں کو مذہب کے نام پر چند خود غرض اور نفس پرست ہندوؤں نے صدیوں سے اپنی عیش و عشرت کا آلۂ کار بنا رکھا تھا لیکن ہندو سماج کے کچھ بیدار مغز قائدین نے کئی سماج سدھار منصوبوں کے تحت مسلسل جدوجہد کے بعد حکومت کی مدد سے ہندو سوسائٹی کو اس لعنت سے پاک کر دیا۔ اور دیو داسی عورتوں کو عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گذارنے کا موقع دیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلسل جدوجہد کر کے اپنی سوسائٹی کو اس سڑے گلے جاگیردارانہ نظام کی تمام لعنتوں سے پاک کریں۔ عورتوں کو ہر شعبہ میں ان کا وہ جائز و باعزت مقام ملنا چاہیئے جس کی اسلام ہم کو تعلیم دیتا ہے۔

خدمت خلق اور مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت ہی اہم کام جو کرنا ہوگا وہ ہے اپنے نیک کردار اور خدمت خلق سے اپنی ہمسایہ اقوام کا دل جیتنا۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کا مشن تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ عالمگیر انسانی برادری اور اخوت و مساوات، جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے، اس پیغام کو تمام انسانوں تک اسی وقت پہونچایا جا سکتا ہے جب کہ مسلمان اپنی دنیا میں الگ تھلگ رہنے کی بجائے بلا تفریق مذہب و ملت خلق خدا کی خدمت کرنے کی بھی سعی کریں۔ دیگر فرقوں سے اقتصادی تعلیمی اور سماجی ترقی میں پیچھے رہنے کے سبب، ان شعبہ جات زندگی میں خود کی ترقی کیلئے مسلمان ہر ممکن جدوجہد میں بلا شبہ حق بجانب ہوں گے۔ لیکن مسلمان جب تک اپنا دائرہ عمل وسیع کر کے اپنے آپ کو خدمت خلق کے لئے بھی وقف نہ کر لیں گے ان کا عالمگیر اسلامی مشن ادھورا رہ جائیگا۔ اس سلسلہ میں عیسائی مشنریوں کی خدمت مسلمانوں کے لئے مشعل راہ

ثابت ہو سکتی ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں کلکتہ کی افلاس زدہ اور گندی بستیوں میں نادارں، غریبوں، محتاجوں اور بیماروں کی بلا تفریق مذہب و ملت جس طرح بے لوث خدمت کرکے کیتھولک عیسائی خیری سسٹر ٹریسا (MOTHER TERESA) نے اپنے مذہب عیسائیت کے لئے ایک عزت و محبت کا مقام کروڑوں ہندو اور دیگر غیر عیسائی عوام کے دلوں میں پیدا کر لیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے خدمت خلق کا ایک عمدہ نمونہ اور سبق ہونا چاہئے۔ مدر ٹریسا سے ان کی خیر خصال خیر بعذبہ خدمت خلق صرف حضرت یسوع مسیح کی محبت کی خاطر کر رہی ہیں۔ کاش مسلمان بھی اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت کی خاطر جو رحمت اللعالمین کے لقب سے موسوم ہیں خود کو اسی طرح اپنے آپ خدمت خلق کے لئے وقف کر دیں؟

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی درسگاہیں اور شفاخانے مسلمانوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ تمام خلق خدا کی بھی بلا تفریق مذہب و ملت خدمت کریں تاکہ اسلام کی عالمگیریت خاص و عام پر آشکارا ہو سکے۔

جنوبی ہند کی ریاست تاملناڈو کے ایک تاریخی شہر ترچناپلی میں مجھے چند سال رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس شہر میں عیسائی خیریوں کا ایک بڑا ہسپتال ہے جہاں عیسائی اور غیر عیسائی مریضوں کا علاج ہوتا ہے یہاں کا یہ روزمرہ معمول تھا کہ ہر صبح ایک عیسائی پادری اپنے چرچ کے فرائض و عبادت سے فارغ ہو کر ہسپتال کے ہر مریض سے خود ملتا اور اپنی دعاؤں اور تسلی کی باتوں سے مریض کی دلجوئی کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر حسرت ہوتی تھی کہ کاش مسلمانوں کے مذہبی رہنما اور مساجد کے پیش امام بھی مصیبت زدہ خلق خدا کی خدمت کی طرف اسی جذبۂ ایثار سے دھیان دے سکتے؟

مجھے یہ احساس بڑی شدت سے ہوا کرتا تھا کیوں کہ ہر جمعہ میں اسی شہر کی جامعہ مسجد کے امام صاحب کے پرجوش اور ولولہ انگیز وعظ اور خطبہ بھی سنا کرتا تھا۔ ہر جمعہ فاضل خطیب صاحب تلوار ہاتھ میں لئے فلسفۂ شہادت و جہاد پر دھواں دھار تقریریں کرتے اور مسلمانوں کے دیگر فرقوں اور ان کے قائدین پر کفر کے فتوے صادر فرما کر سامعین کو ان "دشمنان اسلام" کے خلاف "جہاد" کی ترغیب دیا کرتے تھے۔

امام صاحب موصوف کا وقت نماز پڑھانے کے علاوہ عام مسلمانوں کو بھوت پریت سے نجات دلانے اور ان کی تعویذیں وغیرہ فروخت کرنے میں گزرتا تھا۔ کم و بیش یہی افسوسناک حال ہمارے اماموں کا ہندوستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر کا کہا جا سکتا ہے۔ آج سے کئی سال پہلے علامہ اقبال نے ہمارے اماموں کے بارے میں لکھا تھا ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام؟

ہماری مساجد کے اکثر و بیشتر امام آج بھی صرف "دو رکعت کے امام" ہی بنے ہوئے ہیں۔ انہیں قوم اور قوم کے سماجی اور مذہبی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہتا۔

قارئین کرام کو معلوم ہوگا کہ اسلام کے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اماموں کی تنخواہیں مقرر کی تھیں تاکہ امام دنیاوی ضروریات سے آزاد ہو کر دین و ملت کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ آج کل ملک کے بیشتر حصوں میں مساجد کے اماموں کی مالی حالت نہایت خستہ پائی جاتی ہے۔ اماموں کی تنخواہیں بالکل معمولی ہوتی ہیں کہیں کہیں تو اماموں کا گزر اوقات صرف خیرات پر ہوتا ہے جس کو قوم کی بدبختی کہنا چاہئے۔ اماموں کی تعلیم و تربیت بھی ناکارہ اور ناقص قسم کی ہوتی ہے۔ ہماری مساجد کے اماموں کے بارے میں یہ صورت حال مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہمارے اماموں کی باقاعدہ تعلیم و تربیت ہو تاکہ ہماری مساجد نہ صرف ہماری عبادت گاہیں رہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے عمدہ درسگاہیں اور سماجی خدمات کے مفید مراکز کا بھی کام دیں جیسا کہ اسلام میں مساجد کا صحیح مقام ہے اور ہونا چاہئے۔

ہمارے اماموں کی باقاعدہ تعلیم و تربیت کے لئے ٹریننگ اسکول کھولے جانے چاہئیں۔ جہاں ان کو قرآن، حدیث اور اسلامی فقہ کے ساتھ ساتھ ملک و ملت کے سماجی اور اقتصادی مسائل سے بھی روشناس کرایا جانا چاہئے تاکہ ہمارے امام صرف نماز پڑھانا ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کی تعلیمی سماجی خدمات بھی اچھی طرح انجام دے سکیں۔ تربیت یافتہ اماموں کی تنخواہیں مقرر ہونی چاہئیں تاکہ وہ دنیاوی ضروریات سے حتی المقدور اور مناسب حد تک آزاد رہیں۔

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا ایم ، بی بی ، ایس

کہاں ہیں کہاں ہیں سماجی کارکن

چند دن قبل کچھ دوستوں کے ہمراہ بمبئی سے تھوڑی دور ساحلی علاقے علی باغ (ضلع قلابہ، مہاراشٹر) جانے کا اتفاق ہوا مقصد زیادہ تر تفریح ہی تھا مگر اس میں علی باغ کے لوگوں کا اصرار اور ان کا خلوص بھی شامل تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ میں وہاں پہنچ کر ان لوگوں کو ایمادی باتوں کے متعلق کچھ باتیں بتلاؤں علی باغ ویسے تو ایک چھوٹی سی بستی ہے مگر ان کا ساحل پرکشش ہے اور وہاں کے لوگ خلیق اور زیادہ لوگ ہیں وہاں کے مسلمانوں کے جو بھی چھوٹے بڑے ادارے ہیں انھیں میں نے دیکھا اور مختلف مسلم جماعتوں اور با اثر مسلمانوں سے بھی ملا۔

جوں ہی میں بستی میں داخل ہوا تو مجھے ایک گندے علاقے میں لے جایا گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہی علاقہ ہے جس میں اس بستی کے مسلمان آباد ہیں۔ یہ جان کر مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا مسلم بستیوں کا ہر طرف یہی حال ہے۔ تعجب نہ ہونے کے باوجود میرا دل ضرور دکھا۔ صفائی اور پاکیزگی کا سبق اسلام نے ساری دنیا کو دیا مگر اسی کے پیرو کار گندے رہتے ہیں اور گندگی میں رہنے والے واقع ہوئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ جہالت ہے اور اس جہالت ہی کی وجہ سے غربت ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔

ہماری قوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں صحیح قسم کے 'سماجی کارکن' وہ کارکن جن میں کام کرنے کی صلاحیت ہو، ایک تڑپ ہو ایک لگن ہو اور درد ہو بہت ہی مشکل سے ملتے ہیں۔

دراصل ہمارے علماء کو چاہیئے تھا کہ وہ اس کام کو کرتے، بادی اپنے دین کا پیغام لیکر جہاں جہاں گئے اور جس بستی میں تبلیغ کی بجائے وہاں کے لوگوں کو صاف ستھرے طریقے سے رہنے کے آداب سکھائے اور حفظانِ صحت کے اصول بتائے۔ ہیلتھ سینٹر، شفاخانے، اسکول کالج اور ویلفیئر سینٹر کھولے، مگر افسوس! ہمارے مولوی صاحبان مرشد مسلم کے پیچھے دوڑنے دوڑتے سیٹھوں کے محلات میں داخل ہوگئے اور حریری پردوں کے پیچھے، نرم گدوں اور ریشمی تکیوں پر اپنے علم کا بوجھ اتار کر خرگوش کی نیند سو گئے۔ اور جب جاگے تو مریدین و معتقدین کی درخواست پر دنیا کو بھلا کر علم وعرفان کے وعظ دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمل کی دنیا میں خود پیر و مرید دونوں صفر رہے۔

معترضہ طور پر یہ انکشاف بھی ضروری ہے کہ مرید اپنے پیر کو اس وجہ سے خوش رکھنا چاہتا ہے کہ اول اس کو دنیا میں عیش و آرام ملے اور دوئم جب مرے تو جنت میں محل ملے جب کہ اپنے مرید کو خوش و رضامند رکھنے سے پیر کا منشا یہ ہے کہ اسے دنیا ہی میں وہ ساری سہولتیں میسر آجائیں کہ جن کا اللہ تعالیٰ نے جنت میں فراہم کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے، پیر کو جنت کی فکر بالکل نہیں ہوتی ابتدا ہی سے اپنے آپ کو وہ جنت کا مستحق سمجھے ہوئے ہوتا ہے۔

اب رہا سوال آج کے پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کا، تو یہ ہمارے مولویوں سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ انھیں یہ گمان ہے کہ یہ جدید (ماڈرن) ہیں، یہ احساسِ برتری کا بری طرح شکار ہیں۔ اور عام غریب مسلمانوں سے یہ اپنے آپ کو اکثر الگ اور دور رکھتے ہیں۔ انھیں اپنے غریب و کم نصیب مسلمان بھائیوں کا مذاق اڑانے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔

رہے وہ لوگ جن کو ہم سیاست داں کہتے ہیں۔ دراصل مسلم فرقے کا وہ گیا گذرا طبقہ جو قطعی طور پر ناکارہ ثابت ہو چکا تھا، اب لیڈر پیدا کر رہا ہے، یتیم، اپاہج، بے ہنرے، حروف شناس اور (پڑھے لکھے ہوئے) نمبری لوگ سیاست کے میدان میں آکر لیڈر بن جاتے ہیں، وہ لیڈری خلقِ خدمت کے لئے نہیں بلکہ وہ پیشے کے طور پر انجام دیتے ہیں، وہ مسلم فرقے کی جہالت، بے بسی اور مفلسی کا استحصال بڑی خوبی سے کرتے ہیں تھوڑے وقفے کے بعد چوراہے پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کی زبوں حالی پر دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں اور اپنے ان آنسوؤں کے سیلاب میں بھولے بھالے اور بے دست و پا مسلمانوں کو لے ڈوبتے ہیں اور وہ بے چارے اپنے اس ڈوبنے ہی کو اپنا بیڑا پار ہونا سمجھتے ہیں۔

اس تمہید سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف ایک ہی علی باغ نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کے دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی بُری حالت ہے جہالت، غریبی اور ناواقفیت کی بنا پر اُن کا کردار مسخ ہو چکا ہے، انسانی قدروں سے اُن کو کوئی لگاؤ نہیں۔ ان حالات میں ان مسلمانوں کے سدھار کے لئے ایسے سماجی کارکنوں کی ضرورت ہے جو ان میں رہ کر امدادِ باہمی کی بنیاد پر کام کریں، اُن میں گھل مل کر ایک خاموش انقلاب لائیں۔ اور یہ سب ہی ممکن ہے کہ جب سماجی کارکن ستائش و صلے کی تمنا سے بے نیاز ہو کر سماجی خدمت انجام دیں اور قطعی طور پر ایثار سے کام لیں اور بُرے سے بُرے حالات میں زندہ رہ کر دوسروں کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں اور اُن کی زندگی اس شعر کے مطابق ہو ؎

لوگ جس حال میں مرنے کی دُعا کرتے ہیں
میں نے اُس حال میں جینے کی قسم کھائی ہے

مختلف اوقات میں میں نے مسلمانوں کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا ہے اُن سے ملا ہوں، اُن سے باتیں کی ہیں، اُن کی کسمپرسی اور اُن کے حالات کا اندازہ کیا ہے۔ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی دوسروں سے کٹ کر زندگی گذارنے پر مجبور رہیں وہ دنیا سے اتنے ہی ناواقف ہیں جتنا کنویں کا مینڈک — اس سے بھی زیادہ مجھے جس چیز کا رہ رہ کر تکلیف دہ احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ۔

[illegible]

مسلم فرقہ الگ الگ گروہوں میں بٹا ہوا ہے۔ اور ایک گروہ دوسرے کا سخت دشمن ہے۔ ایک مسلمان جب کوئی قدم اُٹھاتا ہے تو دوسرا مسلمان اُس کے اقدام کو غلط قرار دے کر اس کی زبردست مخالفت کرتا ہے جب کہ مخالفت اُصولی بالکل نہیں ہوتی بلکہ محض حسد کی بنا پر مخالفت کی جاتی ہے اختلافات فروعی ہوتے ہیں، ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ حلال ہے دوسرا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ حرام ہے حالانکہ اس بات سے حلال یا حرام ثابت ہونے سے مسلم فرقے پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا تو شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ سماجی کارکن مسلمانوں کے ان چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ختم کر کے مفادِ مشترک کی خاطر آپس میں ایک کر دیں۔ سیاسی طور پر مسلمان ایک پلیٹ فارم پر آئیں یا نہ آئیں مگر اُن کو امدادِ باہمی کی تحریک سمجھا کر تعمیری کاموں کی جانب رجوع کیا جا سکتا ہے۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے مگر جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ تعلیم کی کمی کا سبب کیا ہے۔ تو پتہ چلا کہ چونکہ مسلمان ماں باپ خود پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ اس لئے اُن کو اپنی اولاد کے لئے بھی تعلیم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اس سے بھی بڑی وجہ غریبی ہے۔ محنت مزدوری کرنے والے ماں باپ چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اُن کے بچے اتنے بڑے ہو جائیں کہ روزگار کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹانے لگیں، تاکہ اقتصادی اُلجھن کسی حد تک تو سلجھے اور گھر کے حالات آسودہ ہو جائیں۔ غریب ماں باپ اس صبر آزما اور طویل دور کو برداشت نہیں کر سکتے کہ اولاد تعلیم حاصل کرتے کرتے جوان ہو جائے اور بارروزگار بننے اور گھر کے لئے سہارے کا باعث ہو — نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہات کے مسلمانوں میں تعلیم نہیں بلکہ غربت بڑھ رہی ہے۔

چنانچہ گندگی، اخلاقی گراوٹ، حسد، رقابت، گروہ بندی، بھائی چارگی میں کمی، اپنے علاقے سے بے تعلق رہنا اور وطن دوستی کا ثبوت نہ دینا دیہات میں بسنے والے مسلمانوں کی وہ خامیاں ہیں جو تعلیم کی کمی اور غریبی کی بنا پر ظہور میں آتی ہے۔

مگر ان خامیوں کے ذمہ دار مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ مسلم سماجی کارکن ہیں جو اپنے فرائض انجام دینے میں مخلص نہیں اگر درحقیقت ان مسلم سماجی کارکنوں کے دل میں اپنے فرقے کے لئے درد ہے تو چھوٹی چھوٹی صنعتوں

دست کاریوں اور حکومت کی بخشش کی ہوئی امداد باہمی کی اسکیموں کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائیں اور اُن میں تنظیم پیدا کریں تاکہ وہ اس حد تک خود کفیل بن جائیں کہ اپنے کم سن بچوں سے اپنے روزگار کا کام نہ کرائیں اسکول بھیج سکیں۔

مگر یہ سب باتیں اُسی وقت ممکن ہو سکتی ہیں جب مسلم سماج میں ایسے مخلص کارکن پیدا ہوں جو سماج سیوا کو اپنا مشن بنالیں۔

قوم کی بدذوقی

علامہ اقبال کو شکایت تھی: میری قوم کو اچھی کتابیں خریدنے کا شوق نہیں ہے!
یہ اُن دنوں کی بات ہے کہ جب اُنھوں نے خود اپنے صرفے سے شائع کروائی تھی۔ اُس کے پانچ سو نسخے بھی دو تین برس تک فروخت نہ ہو سکے تھے۔ بہت سے نسخے دوستوں کو خود تحفے کے طور پر دیئے یا دوستوں نے تحفے کے طور پر مانگ لئے حالانکہ اُس نسخے کی قیمت صرف ایک روپیا تھی۔ نوابوں کے ایک خاندان کا ذکر کرتے ہوئے اقبال ایک دن کہنے لگے۔ اُن کی ریاست کا منیجر جو میرا دوست ہے مجھ سے اسرارِ خودی کا ایک نسخہ بطور تحفہ لے گیا تھا۔ چند دن بعد پھر آیا اور دو تین نسخے پھر مانگنے لگا۔ کیونکہ نواب صاحب کے گھر میں جھگڑا پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک نسخہ کس کے لئے ہے۔ جھگڑا مفت بیٹھے پر پیدا ہوا، یہ کسی کو خیال نہ آیا کہ دو چار روپے کے دو چار نسخے خرید لئے جائیں۔

ایک روز تحریکِ خلافت کے قائد مولانا محمد علی علامہ اقبال کے مکان پر پہنچے اور فرمانے لگے: ظالم! تم نے لوگوں کو گرما کر اُن کی زندگی میں ہیجان تو پیدا کر دیا ہے اور خود یہاں سے اُٹھ کر کسی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے!' اقبال نے جواب دیا: تم بھی عجیب بے سمجھ انسان ہو، تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں قوم کا قوال ہوں، اگر قوال کو خود وجد اور حال آجائے اور وہ بھی ہو حق میں تہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے!

ایم۔ آر۔ اے بیگ

پہلے مسلمان یا ہندوستانی

آج کے ہندوستانی مسلمانوں کو جو مشکلات درپیش ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مسخ شدہ اسلام کو اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے مانے جا رہے ہیں۔ جہاں ہر بڑا مذہب پراگندہ ماحول کے ردعمل میں جنم لیتا ہے اور اپنے ہی ماحول کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتا ہے وہاں وہ دوسرے ماحول یا دوسری سرزمین کے حالات سے کبھی مطابقت حاصل نہیں کر پاتا۔ سماج کے اس قدرتی قانون سے اسلام بھی مستثنا نہیں ہے۔

جیسے ہندو مت ایک بادشاہت آمیز دھرم ہے اسی طرح اسلام سیاست آمیز مذہب ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی جمہوریت آمیز مذہب نہیں ہے۔ مسلم معاشرے کی بہت سی خامیوں میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس کے معاشرتی اصول انہی ملکوں میں کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں پائے جاتے ہیں اس کے اصول غیر مسلم اکثریت کے معاشرے سے میل نہیں کھاتے۔ دراصل اسلام یک طرفہ تماشا ہے وہ غیر مسلموں سے یک جہتی قائم کرنے میں مانع آتا ہے اگر مسلمان کا کسی سے اتحاد ممکن ہو سکتا ہے تو اسلام ہی کی شرائط پر یعنی اسلام بڑا موزوں مذہب ثابت ہوتا ہے اسلامی ملک کے لئے اس میں شک نہیں کہ اسلام نے عرب میں بڑا کام انجام دیا اور جب یورپ میں فاتح بن کر پہنچا تو وہاں بھی اپنا اثر چھوڑا مگر وہ جمہوری ہندوستان میں بھی کچھ کر سکے یہ ممکن نہیں۔ جو سوشل کوڈ اور قانون دویں صدی کے عرب کے لئے بنائے گئے تھے وہ آج کام نہیں دے سکتے۔

چنانچہ مندرجہ بالا حقیقت کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے لئے اسلامی طرز زندگی کا ایک قطعی نیا انداز ڈھالنا ہے۔ آج جو اسلامی طریق زندگی ہے وہ اسلامی دور حکومت کے عروج کی یادگار ہے اور دراصل یہ زندگی ان ملکوں سے ورثے میں ملی ہے جہاں مسلمان کبھی غیر معمولی اکثریت میں تھے۔ اور جہاں ان کے لئے اقلیت ہونے یا غیر مسلم ریاست کی رعایا بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جو طریق زندگی صورت پذیر ہوا وہ قدرتاً اور منطقی طور سے مسلمانوں کا تھا، مسلمانوں کے واسطے تھا اور سراسر مسلمان ہی اس کے عمل درآمد کا ذریعہ اور وسیلہ تھے۔ وہ ایک ذیلی ریاست معاشرہ اور مخصوص فرقے کا طریق کار تھا جس کا محور، مرکز صرف اُمتہ مسلمہ تھی۔

حضرت عیسا نے جس سرزمین پر جنم لیا وہ رومیوں کی نو آبادی تھی اور یہودیوں کو اس کا احساس تھا ایسے ہی ماحول میں جو سوال پیدا ہو سکتا ہے اس کا جواب پہلے ہی یوں دیدیا گیا: "قیصر کو قیصر کا واجب دو اور خدا کو خدا کا حصہ"! یہ جواب ریاست اور مذہب کو واضح طور پر ایک دوسرے سے علاحدہ کر دیتا ہے۔ مگر عربوں کے سامنے ایسا سوال آیا ہی نہیں۔ اس لئے اسلامی ہدایات میں ایسی ہدایت نہیں ملے گی کہ مسلم اقلیتیں کس طرح بسر کریں۔ اسلامی تاریخ میں ہندوستان پہلا ملک ہے کہ جہاں ۶ کروڑ سے زیادہ مسلمان اقلیت رہتی ہے۔ 'غیر محفوظ' اور 'مضطرب' اقلیت۔ یہ درست ہے کہ چند دوسری باتیں بھی مسلمانوں کو بے چین بنانے کی ذمہ دار ہیں مگر اس سارے خلجان اور اضطراب کا سبب کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہندوستانی

مسلمان ابھی تک وہ طریقِ زندگی تشکیل نہیں کر پائے جو اقلیتی پوزیشن میں مناسب و موزوں ہو؟

اسی سوال سے پھر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔

کیا یہ بات خود مسلمانوں کے مفاد میں نہیں ہے کہ وہ عرب و ایرانی اندازِ نظر کو اور اُس طریقِ زندگی کو جو خالص مسلم ممالک کے مسلمانوں کے لئے موزوں تھا اب خیرباد کہہ دیں۔ اور کیا یہ بات اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ثابت ہوگی؟

انڈونیشیا کی مثال لیجئے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت ہے۔ لیکن رامائن اور مہابھارت کی اساطیری روایات وہاں کے مسلمانوں کے لئے تحریک حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ ان مسلمانوں کے رقص، تھیٹر اور دوسرے فنون کی اساس رامائن اور مہابھارت ہی ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کے نام ہوتے ہیں دھرم سیتاکون (ایک مسلمان وزیر کا نام) اور گورید دھرم (ایک مسلمان قومی افسر کا نام)۔ کیا آپ دنیا کے دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں انڈونیشیا کے مسلمانوں کو کم تر کہیں گے؟ اور کیا ایسی کوئی بات ہندوستانی مسلمانوں کو کم تر بنا دے گی؟ ہندوستانی مسلمان اس حقیقت کو قطعی طور پر فراموش کئے ہوئے ہیں کہ ان کی بھاری اکثریت آریائی نسل سے تعلق رکھتی ہے یا پھر غیر سامی نسل سے یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک عرصہ ہوا کہ ایرانیوں نے اپنے یہاں سے عرب اثرات کو ختم کر دیا ہے اور ان پر اس کا کوئی بُرا اثر نہیں ہوا اور نہ ان کے مسلمان ہونے میں فرق آیا۔ تو پھر کیا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ وہ عرب و ایرانی عناصر کو اب اپنے اوپر مزید نہ لادے پھریں؟

شمالی ہندوستان کے اکثر علاقوں کا مسلم کلچر مشرقِ وسطیٰ کی روایات کے زیرِ اثر ہے۔ بنگال، مغربی ہند اور جنوبی ہند کا مسلم کلچر آریائی روایات کا حامل ہے۔ چنانچہ شمالی ہند کا مسلمان ایک نظر میں پہچان لیا جاتا ہے اور اس کی زبان سے دو چار لفظ سننے کے بعد اس کو پہچان لینا بالکل بھی مشکل نہیں مگر وہ یقیناً ایک دانش مند شخص ہوگا جو اسی طرح ایک بنگالی ہندو اور بنگالی مسلمان میں تمیز کر سکے یہی بات مغربی ہند اور جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے مسلمان اور ہندو کی ہے۔

بنگال، مغربی ہند اور جنوبی ہند میں شاید ہی کوئی غالب کی غزلوں کی داد دے سکے اور شمالی ہند میں ٹیگور سے محظوظ ہونے والے مشکل ہی سے ملیں گے۔ ماضی کی اتنی ساری تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزرنے کے بعد بھی اس آریائی مسلم کلچر کی بدولت ڈھاکہ کے بنگالی مسلمانوں اور کلکتے کے بنگالی ہندوؤں کے مابین خاصی خاصی تہذیبی قربت پائی جاتی ہے۔ ایک ہی مذہب کا پیرو ہونے کے باوجود ڈھاکہ کا مسلمان لاہور کے مسلمان سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت تک اپنے آپکو محفوظ و مطمئن محسوس نہیں کر پائیں گے جب تک کہ وہ یہ محسوس نہ کرنے لگیں کہ وہ ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اب یہ ان پر منحصر ہے کہ وہ سمجھ لیں کہ کون سا کلچر انھیں یہاں سے متعلق کر سکے گا یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہندوستان میں جو تین مسلم فرقے خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں وہ خوجہ، بوہری اور میمن ہیں اور جس کلچر سے یہ تینوں فرقے تعلق رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عموماً اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو خصوصاً واضح طور پر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اب بہت دنوں تک ذہنی طور پر مغل عہد میں نہیں رہ پائیں گے۔ انھیں اپنے آپ کو آریانا ہے اور جب تک وہ ایسا نہیں کر لیتے وہ اس سرزمین سے نہ وابستہ ہو سکتے ہیں اور نہ اس سرزمین پر ان کا کوئی حق ہے۔

هاجرہ بیگم

عورت کا رتبہ

ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو سماج میں عورت کا درجہ مرد سے نیچا ہونے کو صحیح خیال کرتے ہیں بلکہ اس کو فطری بات مانتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ عورت کی ذات مرد کے مقابلے میں قدرتی طور پر کمزور ہے اور عورت نہ صرف جسمانی اعتبار سے بلکہ ذہنی طور پر بھی مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ ناقص عقل ہوتی ہے اور دراصل اس دنیا میں عورت ہی ساری برائیوں کی جڑ ہے اور پھر ماں بننے کی مجبوری تو اسے اور بھی زیادہ مرد کا دست نگر بنا دیتی ہے چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد کی حفاظت میں اور مرد کے زیر سایہ رہے۔

گر کمیونزم میں یقین رکھنے والے کہتے ہیں کہ نہ ہمیشہ مرد عورت پر حاوی رہا اور نہ سدا عورت مرد پر غالب رہی۔ انسانی سماج جوں جوں بدلتا رہا ہے اور جہاں آقا اور غلام، راجا اور پرجا، زمین دار اور کسان، کارخانے دار اور مزدور کے رشتے بھی بدلتے ہوئے سماج کے ساتھ بدلتے رہے ہیں وہاں مرد اور عورت کے تعلق کی نوعیت بھی بدلتی رہی ہے۔ تاریخی حیثیت سے انسانی ترقی کے زمانۂ قدیم کو تین دوروں میں بانٹا گیا ہے یعنی عہد وحشت، عہد بربریت اور عہد تمدن۔

زمانۂ قدیم میں عورت کا کیا مرتبہ تھا یہ جاننے کے لئے اینگلس کی کہی ہوئی یہ بات سنیے، ”محنت کی تقسیم صرف مردوں اور عورتوں کے درمیان تھی۔ مرد لڑائی پر جاتے، شکار کرتے، غذا کے لئے کچا مال لاتے اور اوزار بناتے۔ عورتیں گھر سنبھالتیں، کھانا پکاتیں کپڑے تیار کرتیں۔ یعنی مرد اور عورت دونوں اپنے اپنے شعبوں کا پورا پورا اختیار رکھتے تھے۔ جنگل میں مرد کا بول بالا تھا اور گھر میں عورت کا۔ جہاں جو ساری ملکیت مشترکہ تھی اور عورت مرد کی محتاج نہیں تھی۔ اس وقت کے سماج میں سگی ماں کا تو پتا ہوتا تھا مگر باپ کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مرد کی بہ نسبت عورت کی قدر اور عزت زیادہ تھی۔“

دراصل ان تمام قوموں میں جنھوں نے کھیتی باڑی نہیں کی اور چرواہے نہیں بنے اور بھالے اور تیر و کمان پر جن کی زندگی کا دار و مدار رہا وہاں خاندان میں ہمیشہ عورت کا پلّہ بھاری رہا۔

کرتی یگ میں جب ہزاروں برس تک آریا لوگ گھومتے رہے اور کتنے ہی ملکوں سے گزرے۔ صحرا نوردی کی اس صورت میں نہ ذاتی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا تھا نہ غلام رکھنے کا اور نہ کسی سماج ہی کی بنیاد پڑ سکتی تھی جو کچھ پیدا کیا جاتا یا جو شکار کیا جاتا وہ اجتماعی محنت کا نتیجہ ہوتا اور ظاہر ہے کہ اس کا استعمال بھی اجتماعی طور پر کیا جاتا۔ اس لئے عورت بھی مردوں کے لئے ساجھے کی شے بن گئی اور عورتوں کے لئے مرد ساجھے کی چیز سمجھا جانے لگا۔ لیکن دورِ وحشت میں مجموعی طور پر مرد اور عورت کا رتبہ برابر ہی رہا۔

مگر انسانی زندگی کا معیار بدلا۔ انسان دودھ دینے والے جانور پالنے لگا۔ اون، کھال، گوشت اور اون کے بنے ہوئے کپڑے اس کی ملکیت بننے لگے۔ بات جب آگے بڑھی تو کرگھے اور دھات کی دست کاری نے پیداوار کو بڑھانے کا رجحان پیدا کیا۔ محنت کشوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ جنگ میں پکڑے ہوئے انسانوں کو غلام

بنا کر ان سے محنت کا کام لیا جانے لگا یعنی محنت کی یہ سماجی تقسیم تھی اس تقسیم سے سماج دو طبقوں میں بٹ گیا، ایک جانب آقا تھے دوسری جانب غلام یعنی استحصال کرنے والے اور استحصال ہونے والے۔ محنت کی اس پہلی غلط تقسیم سے سماج میں انقلاب آگیا۔ روزی، روزی کا ذریعہ، پیداوار اور ملکیت پر رفتہ رفتہ مرد کا قبضہ ہوگیا عورت کو صرف استعمال کا حق تھا یعنی عورت کی پوزیشن ثانوی بن کر رہ گئی۔ کام کی تقسیم سے عورت جو کبھی گھر کی ملکہ تھی جب مرد کے کام کے مقابلے میں عورت کے کام کی کوئی اہمیت نہ رہی تو اس کے وجود نے بھی اپنی اہمیت کھو دی۔

اقتصادی تبدیلی سے سماج بدلا اور سماج کی تبدیلی سے خاندانی رشتے بدل گئے۔ گھر کے اندر بھی مرد مطلق العنان بن گیا۔ مادری حق کا خاتمہ ہوگیا اور پدری حق کا رواج شروع ہوگیا۔ گروہ وار شادی کا رواج ختم ہوگیا۔ ایک مرد اور ایک عورت جوڑا بنا کر رہنے لگے۔ بیٹی پر باپ کا اختیار بھی بڑھ گیا وہ جس سے چاہے اس کو بیاہ دے اور بیٹی دینے کے عوض وہ چاہے تو دولت بھی لے سکتا تھا۔ الف لیلیٰ کی داستان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفہ کو روز ایک نئی دوشیزہ سے شادی کرنے اور کسی جرم کے ارتکاب کے بغیر اسے قتل کر دینے کا اختیار تھا یعنی مرد کو اپنی بیوی کی زندگی پر پورا اختیار تھا۔ بالکل ابتدا میں شوہر کی موت پر عورت ستی نہیں ہوتی تھی اس لئے کہ وہ کئی بھائیوں کی بیوی ہوتی تھی مگر جب وہ صرف ایک ہی مرد کی ملکیت قرار دی گئی تب اسے ستی ہونا پڑا۔

بربریت کے بعد وہ دور آیا کہ جب وہ طبقہ پیدا ہوا جو پیداوار میں تو ہاتھ نہیں بٹاتا تھا مگر اس نے بحیثیت مجموعی پیداوار کے سارے انتظام کو اپنے قبضے میں لے لیا اور پیدا کرنے والوں پر حکم رانی بھی کرنے لگا یعنی جاگیردارانہ دور آگیا۔ محنت کا جوا لاکھوں اور کروڑوں غلاموں کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا اور دوسروں کو لوٹ کر سلطنتیں جنم پانے لگیں۔ غلام، شودر، پنچ یا اچھوت کے خون سے حکمراں جب بہت زیادہ طاقت ور بن جاتا تو پھر اپنے ہی جیسے حکمراں سے جنگ کرتا اور اگر فتح ہوتی تو شاہنشاہ، مہاراجہ یا زار بن جاتا۔ اسی جاگیردارانہ عہد میں علوم و فنون بھی پیدا [illegible]

ہوتے اور مختلف مذاہب نے بھی جنم لیا۔ عیسائیت اور اسلام اسی دور کی دین ہیں۔ اس نظام میں اگرچہ عورت اطلس، زربفت اور کمخواب میں ملبوس، نیلم، پکھراج، لعل اور ہیروں سے سجی ہوئی شیش محل کی ملکہ نظر آتی ہے اور شاعر، رقاصہ، مغنیہ، ساقی غرضے کہ ہر طرح مرد کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے مگر وہ ایک کھلونا یا ایک سجی ہوئی گڑیا سے زیادہ کبھی کچھ نہ رہی۔ عہد وحشت میں وہ مادری تسلط کی حقدار رہی، بربریت میں اگرچہ اس کے کچھ اختیارات چھن گئے مگر اس کے کچھ حقوق برقرار بھی رہے۔ لیکن جاگیردارانہ نظام نے تو عورت کو لونڈی بنا دیا۔ جاگیردارانہ نظام میں مرد کے ہاتھوں عورت جتنی ذلیل ہوئی اتنی ذلت اس کی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ کسی ملک میں بچپن ہی سے اس کے پاؤں میں لوہے کے جوتے ڈال دیئے گئے کہ وہ چل نہ سکے۔ کہیں اس کی ناک میں نکیل اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں کسی نے گلے میں طوق ڈالا کہیں پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا اور کہیں اس کو شوہر کے مرنے پر زندہ جلنے پر مجبور کیا گیا۔ اس عہد کے ہر قانون بنانے والے نے اس بات پر زور دیا کہ عورت کو اپنے شوہر کی پوجا کرنا لازمی ہے چاہے وہ شرابی ہو، جواری ہو یا نکھٹو اور بدچلن ہو۔ اس لئے کہ پتی سوامی ہوتا ہے اور مجازی خدا ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ درگت بیوہ عورت کی بننے لگی۔ ستی کی رسم صرف ہندوؤں یا آریوں ہی میں نہیں تھی بلکہ مصر میں بھی جب فرعون مرتا تھا تو اس کی ساری بیویاں اس کے ساتھ زندہ دفن کر دی جاتی تھیں۔ مسلمان بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور حد یہ کہ آج کے مسلم گھرانوں میں بھی لڑکی کی پیدائش پر اتنی خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا جتنا کہ لڑکے کے پیدا ہونے پر خوشی منائی جاتی ہے۔

[4] خدا بخش اپنی کتاب 'INDIAN & ISLAMIC STUDIES' میں لکھتے ہیں:

> عورت کا رتبہ گرانے کا ذلیل کام سب سے پہلے ان کٹر اسلامی ملاؤں کا ہے۔ انھوں نے یہ مکروہ کام اس لئے نہیں کیا کہ وہ نسوانی کشش سے متاثر نہیں ہوتے تھے ان کے تو اپنے اچھے خاصے حرم تھے، بلکہ اپنی جنت کے

باہر وہ عورت کی کمزوری اور دنیاداری کا بے ثباتی کو حقارت سے دیکھنے کا ڈھونگ رچاتے تھے۔!

اگرچہ پہلے بھی عورت طوائف کے روپ میں موجود تھی مگر ... ری، داسی یا نیچ ذات کی عورت مجبوری سے کسبی بنتی تھی مگر جاگیردارانہ نظام نے باقاعدہ طوائف کا ادارہ قائم کیا۔ حسن بازار ہوئے اور مینا بازار منعقد کئے اور یہ ادارہ بھی برا ہوا کہ اس پیشے نے ایک ذات کو جنم دیا یعنی طوائف کی بیٹی طوائف بننے پر مجبور ہو گئی۔

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ عورت مرد کی محکوم تو رہی مگر اس لئے نہیں کہ وہ مرد کے مقابلے میں قدرتی طور پر (جسمانی یا ذہنی حیثیت سے) کم زور ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کو کبھی بھی سماج میں مرد کے برابر یا مرد سے برتر درجہ نہ ملتا۔ عورت کا مرد سے پچھڑا ہوا ہونے کا سبب یہ بھی نہیں ہے کہ مرد اس کو ذلیل کرنا چاہتا ہے یا تکلیف دینے میں اسے مزا آتا ہے یا مرد عورت سے نفرت کرتا ہے۔ عورت کے پچھڑے پن کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسمانی یا روحانی طور پر ناپاک یا گناہگار قرار دی گئی ہے بلکہ عورت پر مرد کے حاوی ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع، اوزار، آلات اور دیگر سامان پر مرد کا قبضہ تھا اور ان سے جو دولت بنتی تھی وہ مرد ہی کی ملکیت مانی جاتی تھی عورت کی نہیں۔ یعنی عورت دن رات محنت کرنے کے باوجود پیداوار کے ذرائع کی مالک نہیں ہو پاتی تھی اور جب سرمایہ داری نظام آیا تو اس نے غلام اور نیم غلام کو، پچھڑے ہوؤں کو اور حقوق سے محروم نیچ ذات کہے جانے والے لوگوں کو بھی صنعتی نظام کے ترقی یافتہ دور میں کھینچ لیا مگر عورت کو مزدوری دینے کے باوجود مزدور کے حقوق سے محروم ہی رکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ عورت کو اس مصیبت سے نجات کیسے ملے؟ اس کو اس کا حق کیوں کر ملے؟ اور وہ سماج میں برابری کا درجہ کیسے پائے؟

عورت کے سماجی پچھڑے پن کو دور کرنے کا کمیونسٹی نظریہ یہ ہے کہ آج کی ہندوستانی عورت کو اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ جو مقام یا رتبہ یا درجہ اسے ملا ہوا ہے۔ وہ باعزت مرتبہ نہیں ہے اور اس کی برابر حق تلفی ہو رہی ہے اور گھر اور باہر دونوں جگہ اس کی حالت بہت گری ہوئی ہے۔ آج کی ہندوستانی عورت کو بتایا جائے کہ جب تک سرمایہ دارانہ یا بورژوا نظام ختم نہیں ہوگا، نجی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں پیداوار کے ذرائع، کارخانے، زمین، مکان، مشین، بجلی پیدا کرنے والے پلانٹ، تیل، کوئلا اور دھاتوں کے ذخیرے، نقد دولت اور وہ سب چیزیں جو پیداوار کا ذریعہ ہیں چند سرمایہ پرستوں کے قبضے سے نکل کر یا ان سرمایہ داروں کی حکومت سے چھوٹ کر عوام کی ملکیت نہیں بن جاتیں اور سرمایہ داری نظام ایک سوشلسٹ نظام میں نہیں بدل جاتا تب تک محنت کش مزدور ہو یا کسان، کلرک ہو یا انٹلکچوئل مرد ہو یا عورت اس کی حالت نہیں سدھر سکتی۔ ہندوستانی عورت اور خصوصی طور پر ہندوستان کی مسلمان عورت کو باعزت رتبہ نہ پاؤ درجن شادیاں اور نصف درجن حج کرنے والا سرمایہ دار مرد دے سکتا ہے اور نہ اس سرمایہ دار کے دسترخوان کے ٹکڑوں پر پلنے والا ملا ہی اس کے انسانی حقوق اس کو بخش سکتا ہے۔ مسلمان عورت کو تو باعزت مقام سوشلسٹ نظام ہی میں ملے گا اور سوشلسٹ انقلاب کسان، مزدور، غریب اور متوسط طبقے ہی کے ذریعے آسکتا ہے۔

سوشلسٹ ملکوں میں ماں کا رتبہ :- منگولیا کی سوشلسٹ حکومت زچگی سے ۴۵ دن پہلے اور ۴۵ دن بعد کل ... کی چھٹی دیتی ہے مگر چھٹی کی تنخواہ نہیں کٹتی۔ حاملہ عورتوں کو رات کا کام یا اوور ٹائم کرنا منع ہے جس ماں کے ۲ بچے ہوتے ہیں اس کو سالانہ ۳۰۰ ٹگرک وظیفہ ملتا ہے جب تک اس کا بڑا بچہ ۱۶ برس کا نہ ہو جائے۔ اگر جڑواں بچے ہوں تو حکومت ایک ایک ٹگرک دونوں بچوں کو دیتی ہے۔ بلغاریہ میں بھی تنخواہ سمیت زچگی کی چھٹی ۱۲۰ دن سے ۱۸۰ دن تک ملتی ہے۔ ہر بچے کی پیدائش پر بلغاریہ میں ماں کو پہلے بچے پر ۲۰۰، دوسرے پر ۲۰۰، اور تیسرے پر ۵۰۰ لیوا وظیفہ ملتا ہے۔

اصغر علی انجینئر

فرقہ پرستی۔ تحقیقی جائزہ

ہندوستان کے خوب صورت سیکولر جسم پر فرقہ پرستی ایک کوڑھ کا سا دھبہ لگتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ سیاسی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس مضمون میں ان تمام وجوہات کا بیان تو مشکل ہے پھر بھی فرقہ پرستی کے فروغ کی چند وجوہات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا اور اس سلسلے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں کہ سیکولر کی منزل کے راستے میں سب سے بڑا روڑا صرف اور صرف فرقہ پرستی ہے۔

1857ء کی پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد برٹش حکمرانوں نے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی اپنائی۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے انھوں نے دونوں کے بیچ پھوٹ ڈالنے کی سوچی کہ ان کی مخالف طاقت کمزور ہو جائے اور وہی ننھا سا بیج آج ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ آیئے ہم تاریخ سے اسکا پہلا سرا ڈھونڈیں۔

1857ء کی جدوجہد آزادی ہماری سیاسی آزادی کا ایک اہم اور پہلا سنگ میل ہے۔ اس کے بعد کی تمام تحریکیں اسی سے متاثر تھیں یقیناً 1857ء کی جنگ آزادی ناکام ثابت ہوئی لیکن اس نے اس بیج کو بو دیا تھا جس کا پھل 1947ء میں آزادی کی صورت میں ملا اور اسی متحدہ جدوجہد نے جمہوریت کی سمت رہنمائی کی۔ اسی سے ملک کی مختلف قوموں کو ان کے فرائض کا علم ہوا۔ اور وہ اپنے حقوق سے واقف ہوئیں۔ اختیارات کی کرسی پر قبضہ کرنے کے لئے

ہندو، مسلم زمین داروں میں بٹ گئی۔ ہندوستان جیسے پس ماندہ ملک میں اس خود غرضانہ قدم کے لئے مذہبی جواز پیدا کیا گیا اور عوام کو مذہبی نعروں سے بے وقوف بنانے کی کوشش شروع کر دی گئی۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے ہم مذہبوں کی مشکلات کی جانب توجہ نہ کی۔ محض اس لئے ان کے معاشی مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہ کی کہ اس سے خود ان کے ذاتی مفاد پر ضرب پڑتی تھی۔ انھوں نے مذہب کے لبادے میں اپنی گندی سیاست کو چھپایا اور اس طرح متحدہ قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

برٹش سرکار سے قبل ہندوستان کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ کئی نواب کئی راجا تھے۔ ان کی رعایا اپنے حکمراں سے وفادار تھی۔ اس طرح رعایا کی وفاداری مذہب کی بنیاد پر تھی معاشی مسائل کو حل کرنے کی متحدہ کوشش ایک قوم کو جنم دے سکتی ہے مذہب کبھی بھی نہ تو معاشی و سیاسی مسائل حل کرنے کے قابل ہوا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔

حکمرانوں کی ذہنیت ایک ہی رہی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہ ہمیشہ عوام کو کچلنے کی کوشش میں رہے۔ عوام چاہے ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں۔ صرف چند فرقہ پرست مورخوں نے تاریخ کو اپنا حربہ بنایا۔ اور زمین کے لئے دو مختلف مذاہب کے حکمرانوں کی جنگ کو مذہبی رنگ دے دیا۔ سلطان علاء الدین خلجی نے مسلم زمین داروں کے خلاف بھی اتنی ہی سختی برتی جتنی سختی

ہندو زمین داروں کے خلاف برتی تھی۔ کیوں کہ اسے تو زمین سے مطلب تھا۔ لیکن فرقہ پرست ذہن کے مورخوں نے صرف ہندوؤں کے خلاف اس کے اقدام کا ذکر کیا۔ اسی طرح رانا پرتاپ اور شیواجی کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ دونوں ہی نے صرف اپنے علاقے کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی فوج میں بہت سے مسلمان بھی شامل تھے جو اپنے ہندو ساتھیوں کے ساتھ ساتھ جنگ میں شامل تھے۔ مغل اور افغان مذہبی طور پر ایک ہی تھے لیکن بابر کے خلاف جنگ میں کئی افغان افسر رانا سانگا کے ساتھ تھے اسی طرح رانا پرتاپ کی فوج میں اکبر سے مقابلے کے وقت بھی افغانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اسی طرح اکبر کی فوج میں بہادر راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور وہ کئی ہندو راجاؤں سے لڑے بھی۔ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ وہاں مذہب سے زیادہ سیاست کو اہمیت دی جاتی تھی۔

اگر ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مسلم اور ہندو حکمرانوں کے مفاد ایک ہی تھے۔ انھوں نے ذاتی مفاد ہی کے حصول کے لئے کئی بار آپس میں سیاسی سمجھوتے بھی کئے، جنگیں بھی کیں اور اپنے ہی مفاد کے لئے دونوں مذہبوں کے ماننے والوں کے بیچ خلیج بھی پیدا کرتے رہے۔

برٹش سے پہلے فرقہ پرستی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ معاشی طور پر ہر فرقہ خوش حال تھا اور تلوار کا راج تھا۔ اس لئے مذہب کی دال نہ گلی لیکن جب ووٹوں کے ذریعہ حکمراں چننے کا وقت آیا تو مذہب نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک پس ماندہ ملک میں بڑے لوگوں کے لئے مذہب زبان اور فرقہ الیکشن کے وقت بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں!

30 ر اپریل 1888ء کو الہ آباد میں انڈین نیشنل کانگریس کے جلسے میں مسٹر اے۔ او۔ ہیوم نے کہا تھا کہ ہم ہندستانی معاشرے کو ذہنی اخلاقی اور سماجی طور پر بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں نے آنے والے طوفان کا اندازہ کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں ہندو مسلم متحدہ قوت کا بھی تجربہ ہو چکا تھا اور وہ دوبارہ کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے اس لئے نفرت کا بیج بو یا گیا۔

اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ پہلا گروہ تعلیم کے میدان میں شہ سواری کر کے حکومت کے انتظامیہ میں داخل ہونا چاہتا تھا جبکہ دوسرا گروہ 1857ء سے قبل کی صورت کو واپس لانا چاہتا تھا۔ ذکر اول گروہ کی رہنمائی سر سید احمد خاں کر رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے متعلق بہت فکر مند تھے انہوں نے اسی لئے انگریز سرکار کی مدد سے مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی جانب سے سرکار کی بدگمانی دور کرنے کے لئے 1860ء میں ایک کتاب "ہندوستان کے وفادار مسلم" نامی قلم بند کی جس میں انھوں نے بیان کیا کہ بنیادی طور پر مسلمان انگریزوں کے وفادار ہیں اور انکے خلاف سرکار کو جو بدگمانیاں ہیں وہ سرکار ختم کر دے اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو ہندستان کی جدید تعمیر میں انگریز سرکار کا ہاتھ بٹانے کے لئے کہا۔ پھر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک انگریز سرکار کی حمایت میں تھی۔

دوسری تحریک اس کے بالکل مخالف تھی، مخالف برطانوی حکومت اور قوم پرست۔ یہ تحریک علمائے اٹھائی تھی۔ اور اس کی محرک تھی علما کی معاشی بدحالی۔ برٹش سرکار نے ہندستان میں مشینیں درآمد کیں اور کارخانے قائم کئے جس سے مسلم دست کار بے کار ہو گئے۔ مسلمانوں کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصہ دست کاروں، کسانوں چھوٹے چھوٹے دکانداروں، جولاہوں اور چھوٹی چھوٹی جائداد کے مالکوں پر مشتمل تھا۔ یہ سب ہی معاشی طور پر بہت پریشان ہو گئے مسلمانوں سے حکومت تو چھین ہی لی گئی تھی۔ اس معاشی بدحالی نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ اور وہابی تحریک نے جنم لیا۔ یہ تحریک مکمل طور پر خطرناک مخالف برطانوی تحریک تھی۔ پروفیسر ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ کے کہنے کے مطابق وہابی تحریک ہندستانی مسلمانوں کی پہلی منظم تحریک تھی۔ حالاں کہ اس تحریک نے مذہبی رنگ میں جنم لیا تھا۔ لیکن اسے سیاسی اور معاشی طور پر پوری پوری تائید حاصل تھی۔ بنگال کے پریشان مسلمان کسانوں میں یہ تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ علما نے عوام کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر اکسایا اور ہندستان کو "دار حرب" قرار دیا۔ اس مذہبی فتوے سے مسلمان انگریز سرکار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر 1857ء میں انھوں نے

ہندوؤں کے دوش بدوش انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ HAMS KOHM نے لکھا "1857ء کی بغاوت سے یہ معلوم ہوگیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف بڑے پیمانے پر اتحاد ہو سکتا ہے۔" رشید احمد گنگوہی نے فتویٰ دیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئے۔ وہابیوں نے نصرت الابرار نامی کتاب میں 100 سے زائد علماء صادر کیا ہوا فتویٰ شائع کیا یہ فتویٰ بھی کانگریس میں شامل ہونے کے لئے تھا۔ یہ محدود نظریئے کے مالک، اور اخلاق، سماج اور دنیاوی زندگی کو اہمیت نہ دینے والے علماء برٹش سرکار کی مخالفت میں زمیندارانہ سسٹم کے مخالف ہو گئے تھے۔

علی گڑھ تحریک ابھری اور انگریزوں نے اس میں شامل علاحدگی پسند لوگوں کو اکسانا شروع کیا۔ سرجان سرلیپ نے برٹش پالیسی اس طرح بیان کی "ان کا بڑھا ہوا سیاسی نقطہ نظر سے ہمارا بڑھاوا تھا۔ اس سے ہماری پوزیشن اور مضبوط ہوگئی۔ مسلمانوں کا اونچا طبقہ ہمارے لئے زحمت کی بجائے رحمت ثابت ہوا۔ حالانکہ یہ تھوڑی ہی تعداد میں تھے، لیکن تمام دوسروں پر بھاری تھے۔"

اس برٹش پالیسی کے اثر سے آہستے آہستے ہندو اور مسلمانوں میں نفرت بڑھنے لگی اور یہیں سے فرقہ پرستی کا بیج بویا گیا۔ اس طرح ہماری سیاست فرقہ پرستی سے آہستے آہستے گرانکار زہر آلود ہونے لگی۔ سیاسی فرقہ پرستی نے جس کا نام ونشان تک نہ تھا جڑ پکڑ لی یہ زبردست گہرائی تک پہونچ گیا اور پوری سیاست زہر آلود ہوگئی۔ برٹش پالیسی کے بہترین حربے "پھوٹ ڈالو حکومت کرو" نے ایک لمبے عرصے تک انگریزوں کو سود در سود منافع بخشا۔

اس کے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے میں تقسیم بنگال (1905) نے بھی ایک اہم رول ادا کیا۔ غرض انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت کی آگ کو ہوا دینے کی بھرپور کوشش کی۔ ایسے ماحول سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں کے حامی زمیندار اور آغاخان وغیرہ نے مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ یہ پورا عمل انگریزوں کی ایما پر کیا گیا تھا۔ میمورنڈم کا ڈرافٹ یوپی کے گورنر نے تیار کیا تھا۔ مسلم لیگ کی بنیاد کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ ڈاکٹر

سے آر ڈیسائی نے ٹھیک لکھا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر بیدار کرنے کا غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ ہندوؤں کی بیداری کے کئی سال بعد مسلمان بیدار ہوئے اور جب ان کی آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ہندو تجارت، صنعت وحرفت اور فنانس پر چھائے ہوئے ہیں ایسے موقعے پر انھیں چاہئے تھا کہ وہ خود کو اس کا اہل بناتے لیکن انھوں نے ہندوؤں کو اپنا مخالف سمجھ لیا اور اس موقعے کا مسلم لیگ نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دراصل ہندوؤں کو اپنا مخالف سمجھنے کی ذہنیت بھی مسلم لیگ ہی کی پیدا کردہ تھی۔ مشرقی بنگال، سندھ اور پنجاب میں کسانوں کی بڑی تعداد مسلمان تھی اور ان کے زمیندار ہندو تھے۔ اس عجیب وغریب صورت نے حالات کو اور پیچیدہ بنا دیا اور فرقہ پرستی کو خوب ہوا دی۔ اسی صورت کی پیدا کردہ تھی 1921ء کی موپلا بغاوت۔ "موپلا بغاوت" نامی کتاب کے صفحے 255 پر کرشنن نے لکھا ہے کہ موپلاؤں کی بغاوت ہندو زمینداروں اور سود خوروں اور انگریزوں کے خلاف تھی۔

مسلم لیگ کی ہمیشہ یہی مانگ رہی ہے کہ اسمبلی میں ان کو سیٹ ملے اور مسلمانوں کے لئے نوکری میں جگہ محفوظ ہو۔ آزادی کی جدوجہد میں انگریزوں کے خلاف اس نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ یہاں تک کہ کبھی آزادی کا نعرہ تک نہیں لگایا۔ وہ جدوجہد کے میدان سے دور ہی دور رہی۔ اسی کی دوسری شکل تھی ہندو مہاسبھا، اور ہندو ... وہ ہندو اقلیت کے لئے یہی کام کر رہی تھی۔ ... مختلف مذہب کے فرقہ پرست ہمیشہ ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ان کا مطلب بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ نوٹ کرنے کے قابل بات ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں نے تحریک آزادی میں کبھی بھی حصہ نہیں لیا۔ خلافت اور عدم تعاون کے عروج کے زمانے میں یہ دونوں ہی پارٹیاں تماشائی بنی رہیں۔ لیکن 1922ء میں چوری چورا کے واقعے کے بعد گاندھی جی نے فوراً ہی تحریک واپس لے لی اور اس طرح سیاست میں تھوڑی دیر کے لئے خلا پیدا ہو گیا۔ اس موقعے کا فرقہ پرستوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے محاذ سنبھال لیا اور پھر 1925ء سے 1930ء کے درمیان ہی بڑے بڑے فسادات رونما ہوئے لیکن پھر فیصلہ کن فسادات

ختم ہوگئے۔ اور 1930ء کے بعد ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر پہنچ گیا اور ہندو مسلمان متحدہ طور پر اپنے کندھوں سے انگریزوں کا جوا پھینک دینے کی کوشش کرنے لگے۔

1938ء تک مسلم لیگ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی اس کے پاس معاشی مسائل کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ وہ صرف نوکری میں محفوظ جگہ اور اسمبلی میں سیٹ کی باتیں کرتی۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مسلمانوں کی دوسری جماعتیں مثلاً جمعیتہ العلماء، احرار پارٹی۔ اور آل انڈیا مومن کانفرنس مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ 1937ء کے الیکشن میں مسلم لیگ مکمل طور پر ختم ہوگئی تھی شکست اس بری طرح تھی کہ وہ مسلمانوں کے 5 فی صدی ووٹ بھی حاصل نہ کر سکی تھی۔ کانگریس کو اکثریت حاصل ہوگئی تھی۔ ایسے موقعہ پر مسلم لیگ نے نعرہ بلند کیا کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے جس سے کانگریس مسلم لیگ اتحاد بھی متاثر ہوا۔ رفیع احمد قدوائی نے یوپی کی کانگریس منسٹری کی جانب سے زمین داری کے خاتمے کا بل پیش کیا۔ مسلم جاگیرداروں کے لیے یہ آنے والے طوفان کا سگنل تھا۔ وہ اس طوفان سے پناہ لینے کے لیے جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے۔ مسلم لیگ کے پاس کوئی معاشی پروگرام تھا ہی نہیں۔ زمین داروں کی شمولیت سے مسلم لیگ پوری طرح ان کے رحم و کرم پر ہوگئی۔ مسلمانوں میں ان کی مشکلات کا رونا رویا گیا اور مسلم اقلیت علاقے کے مسلمانوں کو ان کے ہندوؤں کے مقابلے میں خوف میں مبتلا کیا گیا۔ جب کہ مسلم اکثریتی علاقے کے مسلمان مسلم لیگ سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے، پنجاب میں سکندر حیات خان کی یونینسٹ، بنگال میں فضل حق کی پرجا کرشک پارٹی اور سرحدی علاقے میں بادشاہ خان کے اثرات نے مسلمانوں کو مسلم لیگ سے دور رکھا۔ ان پارٹیوں نے مسلم لیگ کے تقسیم کے پروگرام کو منظور نہیں کیا تھا اور نہ ان کی حمایت ہی کی۔ یہاں تک کہ تقسیم کے بعد بھی مشرقی بنگال میں فضل حق کی پرجا کرشک پارٹی نے بنگال کو متحدہ ہی رکھنے کی تحریک چلائی اور اس سلسلے میں کانگریس سے مدد مانگی لیکن شیاما پرشاد مکرجی کے احتجاج سے ڈر کر کانگریس نے تقسیم بنگال کو قبول کر لیا۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہو جانے پر اور برٹش انڈیا کی جنگ میں شمولیت کے خلاف کانگریس نے منسٹری سے احتجاجاً استعفاء دے دیا۔ جناح نے اس دن کو یوم نجات قرار دیا جنگ میں شمولیت کی وجہ سے پوری قوم مگن تھی۔ اور مسلم لیگی خوشی منا رہے تھے۔ جناح نے 1939ء میں دو قومی نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ چیز نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ 1923ء کے اجمیر سیشن میں ہندو مہاسبھا نے بھی ہندوؤں کو ایک مختلف تہذیب اور کلچر رکھنے والی قوم بیان کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ ہندوستان کو صرف مادر وطن ہی نہیں پاک وطن بھی سمجھتے ہیں۔ اور وہی ہندوستانی قوم کہلانے کے لائق ہیں۔ 1933ء ہی میں اس وقت کے ہندو مہاسبھا کے صدر بھائی پرمانند نے ہندو مسلم اتحاد کی تجویز کی بھی اور سوراج حاصل کرنے کی صرف اتنا ایک اور یقینی شرط ہونے کا مذاق اڑایا تھا۔ مہاسبھا کے مطابق مسلمان اور کرسچین کو ایک الگ درجہ دیا جا سکتا تھا اور اس طرح ان کو شہریوں کے حقوق بھی دیئے جا سکتے تھے لیکن انھیں ایک قوم نہیں مانا جا سکتا تھا۔ 1938ء میں بھائی پرمانند نے لکھا کہ مسٹر جناح کا دعوا ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ ہی کو ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر جناح کہتے ہیں کہ ملک میں دو قوم بستی ہیں۔ اگر مسٹر جناح کا کہنا صحیح ہے اور میرا خیال ہے کہ صحیح ہے تو کانگریس کا ایک قوم کا نظریہ شکست پا جاتا ہے اب صرف دو راستے رہ جاتے ہیں۔ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے یا ہندوستان ہی میں مسلمانوں کو ایک الگ حکومت بنانے کی اجازت دی جائے۔ 1937ء میں ہندو مہاسبھا کے احمد آباد کے سیشن میں تقریر کرتے ہوئے ڈی ساورکر نے بھی مسٹر جناح ہی کی طرح دو قومی نظریہ پیش کیا۔ مسٹر جناح کے دو قومی نظریے نے ملک میں ایک سیاسی طوفان برپا کر دیا تھا لیکن اس کا مقابلہ ہندو اور مسلمان قوم پرستوں نے مل کر کیا۔ آزاد مسلم کانفرنس مسلمانوں کی اکثریت کی ترجمان تھی۔ اس میں قوم پرست ذہن کا تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا۔ جی ایم سید اور اللہ بخش اس کے روح رواں تھے اس میں مجلس احرار، آل انڈیا مومن کانفرنس، آل انڈیا انصار ایسوسی ایشن جمعیتہ العلما اور کانگریس بھی شریک تھیں۔ کانفرنس میں 50,000 سے زائد

لوگوں نے شرکت کی اور اس کانفرنس نے دو قومی نظریے کی مکمل طور پر مذمت کی۔

یہاں ہم مسٹر جلال کے پیش کئے ہوئے نکتوں پر گفتگو نہیں کرینگے لیکن اس بات کی خوبی کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ اس تقریر میں انھوں نے بڑی خوبصورتی سے زمین داروں کی غرض کو چھپایا تھا اور صرف عام مسلمانوں ہی کی تکالیف کا ذکر کیا۔ جو زیادہ تر فرضی تھیں مسلم تاجر اور ہندو تاجر کے مقابلے اور ٹکراؤ کو بھی خوب صورتی سے چھپا لے گئے ورنہ مسلم تاجر کسی طرح بھی ہندو تاجروں کے مقابلے میں نہیں ٹک سکتے اور اسی لئے ان کے لئے ایک نئی اور علاحدہ مارکیٹ کا بندوبست کیا۔ اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ 1935ء کے دستور کی رو سے مسلمانوں کا صرف ۱۵ فی صدی ہی ووٹ دینے کے قابل تھا جو اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو معاشی طور پر خوش حال تھا اور باقی ۹۰ فی صدی کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ہماری تاریخ کی سب سے بڑی ٹریجیڈی یہ ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں میں سے صرف 50 لاکھ مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیا اور ملک تقسیم ہو گیا! اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرقہ پرستی کی طاقت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ تاریخی، نفسیاتی، مذہبی اور معاشی تمام اصولوں نے اس ایک فرقہ پرستی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اب صرف معاشی انصاف اور سوسائٹی کے تمام فرقوں کو ترقی کے لئے برابر کے مواقع فراہم کرنے والا سوشلسٹ سماج ہی اس عظیم ٹریجیڈی کے بخشے ہوئے زخموں کو بھر سکتا ہے!
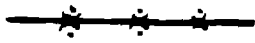
گائے کی قربانی

"یہ ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہندو مسلمان میں اس قسم کی دوستی و برادری اور محبت روز بروز بڑھتی جاوے اور سوشل حالت میں ایسی ترقی ہو کہ مسلمان بجز سجدوں کے اور ہندو بجز مندروں کے پہچانے نہ جائیں جس قدر سوشل برتاؤ اور باہمی محبت و ارتباط ہندو مسلمانوں میں ترقی پکڑ جائے ہم کو نہایت خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ دہلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے یعنی بقر عید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی خاطر سے بکرے اور بھیڑوں کی قربانی کی اور ہندوؤں نے محرم کے زمانے میں سبیلیں لگانے کا اور مسلمانوں کے ساتھ غم میں شریک ہونے کا اقرار کیا ہے۔ ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے"

سرسید احمد خاں۔ علی گڑھ گزٹ، 97-1888

سید شہاب الدین دسنوی

ہندستانی مسلمانوں کے بعض تعلیمی مسائل

ہندوستانی مسلمانوں کے خالص تعلیمی مسائل عام ہندستانیوں کے مسائل سے کچھ جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے۔ البتہ ان کے بعض مسئلے خصوصی نوعیت کے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان کے لئے بے چینی کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان میں پہلا مذہبی تعلیم کا اور دوسرا اردو کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔

اردو کی تعلیم بھی سارے ملک کے مسلمانوں کا مسئلہ نہیں کیونکہ کئی علاقے ایسے ہیں جن میں مسلمان نہ تو اردو بولتے ہیں نہ پڑھتے ہیں کیرل، تامل ناڈو، گجرات، کاٹھیاوار، بنگال اور آسام کے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت وہاں کی مقامی زبان بولتی ہے اور اسی میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ اس لحاظ سے انھیں اردو سے کوئی تعلق ہونا تو نہیں چاہیئے مگر دیکھا جاتا ہے کہ اکثر وہ بھی اردو کے حق میں آواز بلند کرکے اپنی جذباتی ہم آہنگی کا اظہار اتنی شدومد کے ساتھ کرتے ہیں کہ جیسے ان کی زبان اردو ہی ہو۔[1] ([1] ایک جلسے میں مسلم لیگ کے ایک بہت بڑے لیڈر اپنی تقریر میں کانگریسی حکومت پر الزام لگارہے تھے کہ وہ اردو کو ختم کرکے مسلمانوں کو غیراسلامی (DE-ISLAMISE) کررہی تھی، لیکن مزے کی بات یہ تھی کہ خود لیڈر صاحب اردو سے قطعی نابلد اور تقریر انگریزی میں کررہے تھے)

شمالی ہندستان میں کم وبیش اختلاف کے ساتھ عام لوگوں کی زبان ایک ہی طرز کی ہوتی ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ اور جس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زبان ہندی ہے یا اردو شہروں میں البتہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبانیں اردو یا ہندی کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ گویا اس علاقے میں تعلیم کے معاملے کے ساتھ ہی اردو زبان کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

ان دو طبقوں یعنی اردو داں اور قطعی غیر اردو داں کے علاوہ ایک تیسرا طبقہ ان مسلمانوں کا بھی ہے جسے ہم ذولسانی گروپ کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بمبئی شہر کو چھوڑ کر مہاراشٹر کے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو وہ پڑھے لکھے ہوں یا بالکل ان پڑھ مراٹھی اتنی ہی سہولت سے بولتے ہیں جتنی کہ اردو۔ البتہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اردو ہو یا مراٹھی، ان کی زبان قواعد کے اعتبار سے نادرست ہوتی ہے مسلمانوں کے ایسے طبقے کے لئے یہ بات بالکل ثانوی حیثیت اختیار کرلیتی ہے کہ ان کے بچوں کی تعلیم اردو میں ہو یا مراٹھی میں۔ ہاں جذباتی طور پر وہ اردو میں تعلیم دلانا زیادہ پسند کریں گے مگر مجبوری کے تحت مراٹھی اسکول جانا پڑا تو وہاں بھی بچے کو کوئی دقت نہیں ہوتی اس طرح یہ طبقہ گھروں میں اردو بولتا ہے اور تعلیم مراٹھی میں حاصل کرتا ہے اور کبھی تو کلاسیکی زبان کے تحت سنسکرت یا اودھ مگدھی سیکھتا ہے۔

جن علاقوں میں مسلمان مقامی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کرتے ہیں ان میں سیکولر تعلیم کی خاطر انھیں اپنے اسکول کھولنے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہے وہ دوسروں کے شانہ بشانہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں مسئلہ ان لوگوں کا پیدا ہوتا ہے جو اردو کو ذریعہ تعلیم بناکر یا اسے ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کی خاطر اپنے

اسکول کھولنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کی کبھی انھیں اجازت ملتی ہے کبھی نہیں ملتی ہے اور ملتی بھی ہے تو کئی طرح کی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر یہ دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا کہ ملک میں جب کبھی اردو کو اس کا جائز حق دلانے کی تحریک اٹھتی ہے تو نہ صرف شمالی ہندستان بلکہ جنوبی ہندستان کے غیر اردو داں مسلمان بھی ایسے مطالبے کی دل سے تائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ بجا طور پر وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ہندستانی زبان میں اسلام کا سب سے زیادہ مذہبی لٹریچر ملتا ہے تو وہ اردو ہے۔ اردو جاننے کے بعد ایک شخص بڑی حد تک دینی معلومات کی خاطر عربی اور فارسی سے مستغنی ہو جاتا ہے نیز اس کے رسم الخط کے ذریعے وہ قرآن مجید اور اس کے نسخے کو پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے اسی خیال کے تحت خصوصاً جنوبی ہندستان اور دوسرے علاقوں کے مسلمان اردو کے اسکول قائم کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

مسلمانوں میں اردو کی مقبولیت کا ایک دوسرا سبب اس کی شستگی اور لطافت ہے۔ عربی اور فارسی سے یگانہ ہو کر ہندستانی مسلمان اردو ہی کو اپنی تہذیب، شائستگی اور ثقافت کی علامت تصور کرنے لگے ہیں اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ یہ علامت ان میں پائی جائے۔ اس شوق میں اکثر یہ بات نظر انداز ہو جاتی ہے کہ کوئی زبان صرف زبان کی حیثیت سے ایک تعلیمی مقصد ہے اور اسے ذریعۂ تعلیم بنانے اور سرکاری زبان کی طرح استعمال کئے جانے کی آرزو رکھنا بالکل دوسری بات ہو جاتی ہے۔ ان دونوں باتوں کے دائرۂ عمل میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ ایک بار سر آغا خان نے پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ عربی کو قومی زبان بنائے جس تصور کے ماتحت پاکستان وجود میں آیا اسے دیکھتے ہوئے یہ مشورہ معقول تھا۔ ایک طرف باشندگان پاکستان اپنی آئیڈیولوجی سے قریب ہو جاتے دوسری طرف وہ سیاسی حیثیت سے عرب قوموں میں شمار کئے جانے کی وجہ سے ایک بڑی عرب برادری کے رکن بن جاتے مگر اس مشورے کی تائید میں کوئی آواز نہیں اٹھی۔ علما تک بھی خاموش رہے۔

کیا ہندستانی مسلمان تمبر

اردو میں اور اردو کے ذریعے تعلیم دلانے کا انتظام کرنے سے پہلے ذہن صاف ہو جانا چاہیئے کہ مقصد کیا ہے؟ اس معاملے میں اب تک جذبات سے زیادہ کام لیا جاتا رہا ہے اس سلسلے کئی ضروری اور اہم پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ جن علاقوں میں اردو بولنے والوں کی معقول تعداد بستی ہے وہاں اردو کے ذریعے تعلیم دلانے کا مطالبہ اور اس کے لئے کوشش کرنا درست ہے جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد قلیل ہو وہاں صرف ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھنے کا موقع اور سہولت فراہم کرنا کافی ہے اور اس کا سلسلہ ابتدائی جماعت سے لے کر اعلیٰ سطح تک ہونا چاہیئے۔ غیر اردو علاقوں میں جہاں لوگ عموماً اور مسلمان خصوصاً اردو ایک جدید ہندستانی زبان کے طور پر یا مذہبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے پڑھنا چاہتے ہوں۔ اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کافی ہے۔ ان کے لئے خط و کتابت کے ذریعے اردو کے کورس ہونے چاہئیں اور خصوصاً جنوبی ہندستان کی یونیورسٹیوں میں اردو میں سرٹیفکٹ اور ڈپلوما دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

مسلمانوں کا دوسرا اہم مسئلہ ان کی مذہبی تعلیم کا ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ بچوں کو قرآن مجید، دینیات کی کچھ کتابیں اور تھوڑی بہت فارسی پڑھانے کے بعد سیکولر تعلیم کے لئے اسکولوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اب حال یہ ہے کہ بچوں کو چار یا پانچ سال کی عمر ہی سے نرسری یا کنڈرگارٹن میں اور اس کے بعد اسکولوں میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں مسجدوں یا مکتبوں میں اسکول کے اوقات کے علاوہ ناظرہ قرآن مجید پڑھانے کا انتظام ہوتا ہے جن میں بچے سال دو سال گزارتے ہیں یا پھر یہ کام مکان ہی پر کر لیا جاتا ہے یہ صورت حال غیر تسلی بخش سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمان بجا طور پر محسوس کرتے ہیں کہ اگر ان کے اپنے اسکول ہوں تو سیکولر تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے لئے تھوڑا سا وقت نکالا جا سکتا ہے جن میں روزہ نماز، سیرت یا تاریخ اسلام، بزرگوں کے حالات وغیرہ جیسے مضامین پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مسلم اسکولوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں نادار مسلمان طلبا کی فیس کی

معاشی اور دوسرے تعلیمی اخراجات کی کچھ حد تک کفالت بھی ہو جاتی ہے اس سہولت کے بغیر شاید ان طلبا کا سلسلۂ تعلیم قائم رکھنا ممکن نہ ہوتا۔

مذہبی تعلیم کے بارے میں ہمارے ملک کی سرکاری پالیسی بدلتی رہی ہے کبھی ایسا محسوس ہوتا رہا کہ یہ بات پسند کی جا رہی ہے کہ بچوں کو اسکولوں میں مذہبی تعلیم دی جائے اور کبھی اسی مذہبی تعلیم کے نام پر سرکاری حلقے ناک بھوں چڑھاتے ہیں کبھی اس کی اجازت ملی بھی تو اسکول کے اوقات کے پیشتر یا بعد۔ ۱۹۵۵ء میں بمبئی میں بہت بڑے پیمانے پر کل ہند دینی تعلیمی کنونشن منعقد ہوا۔ اس کی کامیابی کی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں شاید پہلی بار مختلف مکاتب خیال کے مسلمان یکجا ہوئے تاکہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ اسکولوں میں دینی تعلیم کا انتظام کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی پشت پر مولانا ابوالکلام آزاد کا اشارہ تھا کہ اگر اس قسم کا مطالبہ کیا گیا تو حکومت اس پر ہمدردانہ طور سے غور کرے گی۔ مگر کنونشن کی کارروائی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ ایسا کرنا نہ صرف سیکولر حکومت کے اسپرٹ کی نفی ہوگی بلکہ یہ ایک خطرناک اقدام ہوگا جس سے فائدہ کم نقصان زیادہ ہونے کا خطرہ ہے۔ البتہ کنونشن نے یہ مشورہ ضرور دیا کہ مسلمان اپنے قائم کئے ہوئے اسکولوں میں یا اسکول کے اوقات سے باہر مسجدوں یا دوسرے مقامات پر دینی تعلیم کے مراکز کھولیں، باضابطہ نظام تعلیم ہو، اساتذہ کے لئے تربیتی کیمپ اور مراکز کی نگہداشت کا انتظام کریں۔ چنانچہ دہلی میں تعلیمی بورڈ قائم ہوا۔ کچھ کام ہوا بھی مگر رفتہ رفتہ یہ تحریک ٹھنڈی پڑتی گئی۔

چونکہ دینی تعلیم کے مسئلے کی اہمیت اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اس لئے مسلمانوں کو حالات اور خصوصاً بدلتے ہوئے حالات اس پر مسلسل غور کرتے رہنا چاہیئے۔ اس ضمن میں چار باتیں غور طلب ہیں: (۱) کیا پڑھایا جائے (۲) کہاں پڑھایا جائے (۳) کب پڑھایا جائے (۴) کون پڑھائے۔؟

یہ چاروں سوال اپنی جگہ بحث کے موضوعات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر مجلس مذاکرہ منعقد ہونی چاہیئے۔ تب ہم اپنی راہ متعین کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اردو کی تعلیم ہو یا دینی تعلیم کا مسئلہ ان کی اہمیت کے باوجود جو چیز کہ ہمارے انداز فکر کو الجھن میں ڈالتی رہی وہ دستور ہند کی بعض پیچیدگیاں تھیں۔ دفعات ۲۹ اور ۳۰ کی رو سے مذہبی لسانی اور ثقافتی اقلیتوں کو بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب، زبان یا ثقافت کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لئے ادارے (جن میں تعلیمی ادارے شامل ہیں) قائم کریں، اور حکومتوں کو بھی اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو ادارے اس طرح کے قائم ہوں ان کو سرکاری گرانٹ دینے میں کوئی امتیازی سلوک نہ برتیں بشرطیکہ وہ اور حیثیتوں سے اس کے حقدار ٹھہریں۔ اس صریح دستوری حق کو ریاستی حکومتیں اور بسا اوقات مرکزی حکومت دوسری دفعہ کا سہارا لے کر مسخ کرتی رہیں۔ اور ایسے احکامات نافذ کرتی رہیں جس سے ان اداروں کا اقلیتی کردار یا تو مجروح ہوتا رہا یا پھر وہ حق ہی سلب ہوگیا۔ اس غیر یقینی صورت کے تحت اقلیت اپنے اداروں کو غیر محفوظ سمجھتی رہی اور ایک طرح کی الجھن میں بھی گرفتار رہی۔ گذشتہ اپریل میں خوش قسمتی سے سپریم کورٹ کے ایک تاریخی فیصلے نے یہ الجھن دور کر دی۔ ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے عدالت نے دفعات ۲۹ اور ۳۰ کی جو وضاحت کی ہے اس کے بعد اب شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی۔ مذہبی اور لسانی اقلیتیں اب آزادی کے ساتھ اپنے تعلیمی ادارے قائم کر سکتے ہیں اور ان میں اپنا اقلیتی کردار برقرار رکھ سکتی ہیں۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اقلیتوں کے چارٹر کا درجہ رکھتا ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اس کا بغور مطالعہ کریں اور اس کی اسپرٹ کو سمجھنے کی کوشش کریں تلوار رکھنے کی اجازت کا حاصل کر لینا بڑی بات نہیں ہے لیکن تلوار کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ زنگ آلود بھی نہ ہونے پائے اور اس کی دھار بلا وجہ [illegible] نہ پہنچنے پائے بہت اہم بات جو عدالت کے فیصلے کی بنیاد ہے کہ سیکولر ہندوستان میں اقلیتوں کے حقوق اکثریت کے حقوق کے مساوی ہونے چاہئیں تاکہ ایک شہری دوسرے کے مقابلے میں نابرابری نہ محسوس کرے اس تحقیق کو عملاً بھی ایسی صورت دینی چاہیئے کہ شہری اور شہری میں فرق نہ ہونے پائے لیکن اس کے بعد یہ اقلیتی طبقے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس قیمتی حق کا استعمال کرنے میں کسی حد تک دور اندیشی اور دانشمندی کا ثبوت دیتا ہے وہ چاہے تو اس حق کے ماتحت اپنے آپ کو قطعی طور پر دوسرے شہریوں سے جدا کر کے اپنا جزیرہ الگ بنا کر زندگی بسر کر سکتا ہے یا فراست اور ہوش مندی سے اس کا حق استعمال کر کے دوسرے ہم شہریوں کے دوش بدوش کھڑا ہو کر مساوی درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ ●●

اے۔ بی۔ شاہ

مسلمان اور تعلیم

مسلمانوں کی معاشی و سماجی بدحالی کا سبب بڑا سبب تعلیمی پس ماندگی ہے۔ مدراس کے سابق چیف جسٹس مسٹر بشیر احمد سعید کے مطابق مسلم مردوں میں صرف ۱۰ فیصدی اور مسلم عورتوں میں ½ فی صدی سے بھی کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس طرح اوسطاً پورے فرقے میں چھ فی صدی سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ سنہ ۱۹۷۱ء کے مردم شماری کے مطابق ملک میں 29 فی صدی سے کچھ زیادہ لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ مرد 39.5 فی صدی اور عورتیں 18.70 فی صدی۔ اس طرح صاف ظاہر ہے کہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پس ماندہ ہیں۔

پھر بھی صورتِ حال کچھ اتنی بھی زیادہ خراب نہیں ہے۔ آزادی کے بعد کی نسل نے امید افزا نقشہ پیش کیا ہے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق پورے ملک کے کالجوں اور اسکولوں کے تقریباً 30 لاکھ طلباء میں سے دو لاکھ پچاس ہزار کے قریب مسلم طلباء ہیں یعنی تقریباً 9% اور یقیناً آئندہ سالوں میں صورت کچھ نہ کچھ بہتر ہی ہوگی۔ اب فکر کی بات صرف یہ ہے کہ کل ہندآبادی میں مسلمانوں کا جو تناسب ہے وہ تناسب کل طلباء اور مسلم طلباء کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔ امید ہے کہ یہ فرق آئندہ چند سالوں میں اور بھی کم ہو جائے گا۔ پھر مناسبت کے لحاظ سے مسلمان ٹیکنیکل اور پروفیشنل لائنیں کم ہی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے بجائے مسلم طلباء آرٹس اور سائنس کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسکول ہی کی سطح پر اُن کا ذہن سائنس اور حساب جیسے مضامین سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ اسے صرف عاقبت نااندیشی اور خلافِ دوراندیشی ہی کہا جا سکتا ہے۔ بے شک سائنس اور حساب "مشکل" مضامین ہیں۔ اور جب تک اسکول کے کرتا دھرتا دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اور مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاص توجہ نہیں دیں گے تب تک تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ فرقے آسان مضامین ہی اختیار کیا کریں گے مثلاً "اُردو" زبان والے بلکہ اُن کی حالت تو دوسری زبانوں کے اسکولوں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اسکول کے منتظمین اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے استادوں کو سائنس اور حساب کے بجائے اُردو، فارسی اور عربی پر زیادہ زور دینے کے لئے کہتے ہیں۔ نتیجے میں جب اُن کے طالب علم کالجوں میں جاتے ہیں تو نفسیاتی اور ذہنی طور پر وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ ان مضامین پر عبور حاصل کر سکیں۔ ایسے کورس میں ذہنی طور پر منظم ہونا اور ماضی کا تجربہ رکھنا نہایت ہی ضروری ہوتا ہے۔ اور ایسے کورس کے بغیر آئندہ زندگی میں اچھی نوکری حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ سرکاری یا پرائیویٹ نوکری میں مسلمانوں سے کسی بھی قسم کا امتیاز نہیں برتا جاتا بلکہ مسلمان خود ہی حال کے تقاضے سے بے خبر ہے اور اپنے نوجوانوں کو بھی بے خبر رکھے ہوئے ہے۔

اسکولی سطح پر تعلیم کی اہمیت دو طرح سے ہے۔ جو اپنی جگہ تو اہم ہیں ہی، ساتھ ہی ساتھ مسلمان کا تعلیم کے متعلق خیال اور اُس کی زندگی میں تعلیم کا مقام بھی متعین کرتی ہیں۔ مدرسے کی تعلیم صرف قرآن اور حدیث ہی تک محدود رہتی ہے اور جس سے بچہ جدید نظریہ (ماڈرن آؤٹ لُک) اختیار نہیں کر پاتا اور جدید تعلیم کی روشنی میں دنیا کو نہیں دیکھ پاتا۔ حالانکہ مدرسہ طرز کی تعلیم اپنے ابتدا کے وقت بہت اہمیت کی حامل تھی۔ مگر گذشتہ چہار صد سالہ کی آمد و رفت کے ذرائع میں ترقی کے بعد اس کا پورا کورس ہی ناقص نظر آتا ہے۔ جو چیز تعلیم تھی وہ رفتہ رفتہ مذہب بن کر رہ گئی ہے۔

مسلمان کی تعلیمی تنزل کا دوسرا سب سے بڑا سبب اس کی وہ ذہنیت ہے جو اسے علاقائی زبانوں سے دور رکھتی ہے اور یہ احساس دلاتی ہے کہ اُردو ہی

اس کی مادری زبان ہے، خواہ وہ ملک کے کسی بھی حصّے میں رہتا ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان اچھا مسلمان اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک وہ اردو نہ پڑھ لے۔ حالانکہ صرف اردو ہی کے ذریعے اسلام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے حصّوں میں مسلمان دوسری زبانیں بولتا ہے اور اُن پر فخر کرتا ہے۔ ہندستان میں بھی بہت پروپیگنڈے کے باوجود ۱۹۷۱ کی مردم شماری میں آدھے سے بھی کم مسلمانوں نے اردو کو اپنی مادری زبان بتایا ہے۔ یوپی کے علاوہ بہار حیدرآباد، اورنگ آباد جیسے علاقوں کے مسلمان، جہاں یا تو شمالی ہند سے بڑی تعداد میں آکر بس گئے ہیں یا پھر وہاں حکمراں رہے ہیں، اپنی مادری زبان اردو لکھواتے ہیں۔ اور ہندوستان کے بقیہ حصّے کے مسلمان اُسی علاقے کی علاقائی زبان کو مادری زبان کہتے ہیں۔ ورنہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ ۱۹۷۱ کی مردم شماری کے مطابق اُردو بولنے والوں کی تعداد ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ کس طرح ہے، جب کہ اسی رپورٹ کے بموجب مسلمانوں کی تعداد ۶ کروڑ ۱۰ لاکھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو آدھے سے زیادہ مسلمان کافر ہیں، یا پھر اسلام سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔ لیکن اس بات سے وہ بھی انکار کرتے ہیں جو اسلام اور اُردو کو ایک ہی دھاگے میں پروتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے ہمیں اپنے ذہن میں ایک بات رکھنی چاہئے کہ اس بابت میں سیاسی قائد اور علماء کیا کہتے ہیں؟ ہندوستان میں مسلمان حاصل شدہ تعلیمی سہولیات کا اُسی وقت پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے جب وہ علاقائی زبانوں کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے آدھے سے زیادہ مسلمانوں کی مادری زبان علاقائی زبانیں ہیں۔ اس تعلیمی اصول کے علاوہ دوسری علاقائی زبانوں کے ایک حصّے ہونے کے ناطے مسلمان بچوں کو یوپی اور بہار کے علاوہ کسی دوسری جگہ اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا ایک غلط بات ہے۔ ان ریاستوں میں بھی اگر تعلیم کو روزگار اور زندگی سے منسلک کر کے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے سے مسلمانوں کو صرف نقصان ہی ہوگا، نہ صرف نوکری حاصل کرنے میں بلکہ تعلیمی ترقی میں بھی۔ یہ سرکار کی پالیسی یا اکثریت کی مسلم دشمنی کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک عام سوجھ بوجھ کی بات ہے کہ جس علاقے میں جو زبان کثرت سے بولی جاتی ہے وہاں کے لوگوں کی زندگی اس زبان کا ایک اہم مقام بن جاتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر اس جگہ صادق آتی ہے جہاں جمہوری حکومت ہو۔ یہ نہ صرف خلافِ قانون بلکہ خلافِ حقیقت بات ہی ہوگی کہ ایک اقلیتی زبان جو یوپی اور بہار میں بھی ۱۵ فی صدی سے بھی کم تعداد کے لوگوں کے ذریعے بولی جاتی ہے، اور اس سے بھی کم تعداد کے لوگوں کے ذریعے دوسری ریاستوں میں، تو صرف تاریخی اہمیت ہی کی وجہ سے اُسے خاص اہمیت دی جائے۔ اگر سرکار یا چند سیاسی پارٹیاں اپنی خود غرضی کی وجہ سے یہ مانگ کرتی ہیں، تو وہ کیا کریں، سماج ایسی ناجائز و غیر جمہوری مانگ کو قبول نہیں کر سکتا! اگر اربابِ حل و عقد یہ غیر حقیقت پسندانہ اقدام اٹھاتے ہیں تو اس سے اقلیت اور اکثریت کے بیچ صرف ایک خلیج ہی پیدا ہوگی۔ اور یقیناً یہ بات اقلیت کے لئے ایک نقصان دہ بات ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی مذہب کے ماننے والوں نے اپنا رشتہ کسی خاص زبان سے نہیں جوڑا۔ سکھ مستثنیٰ ہیں، لیکن انھوں نے بھی پنجاب کے علاوہ کسی دوسری ریاست میں پنجابی کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی مانگ کبھی نہیں کی!

اگر مسلمان بچوں کو بھی اُسی ذریعۂ تعلیم کا پابند بنایا جائے جو ذریعۂ تعلیم دوسرے بچوں کا ہے تو اس سے مسلم و غیر مسلم میں آپسی میل جول بڑھے گا۔ سیاست کی لگائی ہوئی آگ بہت حد تک ٹھنڈی ہو جائے گی۔ آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا اس سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔ اگر مسلمان اور غیر مسلمان بچے ایک ہی کلاس میں بیٹھیں، ایک ہی زبان کے ذریعے تعلیم حاصل کریں، ایک ہی کھیل کھیلیں اور کبھی کبھار آپس میں جھگڑا بھی کریں (لیکن ایک ہی زبان میں!) تو اس سے دونوں فرقے کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان دونوں میں بنیادی طور پر کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہر جگہ انسان ایک ہی جیسا ہوتا ہے، خاص طور پر بچے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ہے باوجود اس کے کہ یہاں مختلف زبانیں ہیں، مختلف تہذیبیں ہیں، مختلف مذاہب ہیں، مختلف لباس ہیں، غرض ہر چیز مختلف ہے!

علاقائی زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے اور اُن کو اپنی مادری زبان قرار دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلم بچے اُردو نہ پڑھیں۔ سنسکرت اور اُردو کی طرح اُردو بھی ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے اور جو بھی اسے پڑھنے کی خواہش کرے گا اس کے لئے ممکن اور بہتر سہولت فراہم کرنی چاہئے۔ اردو کو اسکول اور کالج میں ایک اختیاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح سنسکرت، روسی، فرانسیسی، جرمن یا کسی بھی دوسری ہندستانی!

غیر ملکی زبان کا مقام ہے۔ فی حال ایسا نہیں ہے۔ اس ملک میں کئی ریاستوں کے سرکاری ماہرینِ تعلیم کو یہ غلط فہمی ہے کہ مسلمان یا تو اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھتے ہیں یا پھر پڑھتے ہی نہیں ہیں۔ مثلاً مہاراشٹر میں سہ لسانی فارمولے پر اس طرح عمل ہوتا ہے کہ اگر ایک مسلم طالب علم مراٹھی کو مادری زبان کی طرح اس کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے ہندی اور انگلش کو دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھنا پڑے گا۔ اسے ہندی یا انگلش کی جگہ اردو اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر وہ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرے تو اسے مراٹھی کی تعلیم ناموافق ملے گی۔ اس طرح اس کے لئے دو ہی راستے رہتے ہیں کہ یا تو وہ مراٹھی ذریعہ تعلیم سے تعلیم حاصل کرے اور اردو کو مکمل طور پر چھوڑ دے، یا پھر اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرے اور مراٹھی پر مکمل دسترس حاصل نہ کر سکے! اس سلسلے میں یہ ایک اطمینان بخش قدم اٹھایا جا سکتا ہے کہ مراٹھی کو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے بچے کو ہندی یا انگلش کی جگہ اردو لینے کی اجازت ہو۔ یہ ایک اچھا قدم ہے اور قومی یکجہتی کی بات کا مقتضی ہے کہ یہ تبدیلی کرنی ہی چاہئے!

اس کے علاوہ حکومت کو تعلیم کے ایک دوسرے پہلو پر بھی دھیان دینا چاہئے۔ ہندوستانی تعلیم محض ادبی اور علمی ہے، اور سائنس اور جدید زمانے کے تقاضے سے بہت بے خبر۔ مسلم تنظیموں کے اسکولوں میں تو اس سے بھی زیادہ لاپرواہی پائی جاتی ہے۔ اکثر پالیسی بنانے والے آزادانہ ذہن کے مالک، اور ان کے مشیر مسلمانوں کو خاص سہولت اور ان کے عام اور ٹیکنیکل اسکولوں کو خاص رعایت دی جانے کی بات کرتے ہیں۔ ان کو معلوم نہیں کہ اس قسم کی باتوں سے مسلمانوں میں دوسرے درجے کے شہری ہونے کا احساس پیدا ہو جائے گا، وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جائیں گے اور ان میں دوسرے سے مقابلے کی ہمت ختم ہو جائے گی۔ مسلم بچوں کو نہ تو اسکول کے لئے کسی خاص رعایت کی ضرورت ہے اور نہ نوکری کے لئے کسی خاص سہولت ہی کی! ضرورت یہ ہے کہ ان میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ بھی دوسرے ترقی یافتہ فرقوں کی طرح ترقی کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ ان کے ماحول ہی میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ کیوں کہ مسلم بچے جس ماحول میں پرورش پاتے ہیں وہ ماحول مقابلہ کرنے کے جذبے کو ابھارنے میں قطعی طور پر ناکام ہوتا ہے اور کام کرنے کی تربیت کے لئے بالکل بے کار۔ جدید زمانے سے بالکل الگ اور نامناسب — دوسری بات یہ ہے کہ مسلم فرقے کی اکثریت معاشی طور پر پس ماندہ ہے اور پس ماندگی تعلیمی میدان کی ترقی میں مانع ہے۔ خاص طور پر ٹیکنیکل اور پروفیشنل تعلیمی میدان میں۔ یہ دونوں مسائل بہ آسانی حل کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ مسلم قیادت اپنے وقت کو مناسب طور پر استعمال کرے اور اس سلسلے میں سرکار کو کسی قسم کی مداخلت کرنے پر مجبور کرنے کی حد تک غافل نہ رہے!

روٹی اور زبان

"جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے، ہندوستان کے بعض مسلمان اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہندوستان سے اردو ختم نہیں ہو سکتی۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں کے اس خیال سے میں متفق نہیں ہوں اور اپنے خیالات کا کئی بار ریاست میں بھی اظہار کر چکا ہوں، اور میری یہ قطعی رائے ہے کہ پچاس برس کے بعد اگر کسی ہندوستانی کو پاکستان سے اردو زبان میں لکھا ہوا خط ملا تو اس ہندوستانی کو خط پڑھوانے کیلئے بالکل اسی طرح سے کسی مسجد کے ملا کے پاس جانا ہوگا جس طرح آج کسی ہندو کو عربی زبان میں کوئی خط آتا ہے تو خط کو پڑھوانے کیلئے اسے کسی ملا کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔

کیونکہ وہ زبان دنیا میں زندہ نہیں رہا کرتی جس کا تعلق معاشیات سے نہ ہو یعنی پیٹ کیلئے روٹی اور زبان کا بہت بڑا تعلق ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج اردو زبان کے مرکز دہلی کے کسی محلے میں بھی کوئی ایسا غیر مسلم بچہ نہ ہوگا جو اردو پڑھ رہا ہو اور صرف ہندی پڑھتا ہے کیونکہ اس کے والدین جانتے ہیں کہ مستقبل میں صرف ہندی ہی معاش کا ذریعہ ہوگی (دیوان سنگھ مفتون)

پروفیسر ڈبلیو سی ۔ اسمتھ

ہندستانی مسلمان[1]

پاکستان کے نظریئے اور وجود میں ہندستانی مسلمانوں کی "خرابی" کی ایک صورت "مضمر" رہی ہے لیکن ان کی خرابی کا اس سے زیادہ اہم سبب خود ان کا اپنا ذہنی رجحان اور رویہ ہے پاکستان کی حکمت عملیوں کا اثر نسبتاً اُن پر کم ہوتا اگر وہ اپنے نظریئے اور برتاؤ کو درست کر لیتے۔ ہندستان کے مسلمان نے پاکستان کے وجود سے زیادہ نظریۂ پاکستان سے لگاؤ رکھا ہے اور تقسیم ملک کے بعد بھی یہ لگاؤ ختم نہیں ہوا ہے اور یہی لگاؤ ان کے جذباتی اور سماجی انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے جب تک ہندستانی مسلمان اسی طرز پر سوچتے رہیں گے اور اپنے رجحان اور رویئے سے پاکستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کو اس کا موقع دیتے رہیں گے کہ وہ انھیں "ہندوستانی مسلمان" نہ سمجھیں اس وقت تک ان کی پوزیشن غیر واضح بے رنگ اور مبہم رہے گی اور انجام کار ان کی ساری صلاحیتیں منتشر ہو جائیں گی۔

ہندستانی مسلمان کا مذہب، اسلام ہے۔ وہ چیز ہے جو حالات کی پیچیدگیوں میں ان کا سہارا ہے۔ ایک ایسا حقیقی سہارا جو عالم کس مپرسی میں ان کی ڈھارس بندھاتا ہے۔ لیکن ہندستانی مسلمان یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسلام ہی ہے جو انھیں پاکستان سے جوڑتا ہے اور اُس ہندستان سے الگ رکھتا ہے جو در اصل اُن کا وطن ہے۔ در اصل اِس میں اسلام کا فی نفسہٖ الزامات نہیں ہے بلکہ اسلام کی یہ وہ مخصوص تعبیر اور تشریح ہے جو 1940ء سے 1947ء تک مسلم لیگ عام مسلمانوں کے سامنے کرتی رہی ہے اور اسلام کی اس مصلحت آمیز تشریح کے اثر سے ہندستانی مسلمان آج تک نکل نہیں پایا۔ اب ضرورت ہے کہ نئے حالات کے مطابق اسلام کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جائے جس میں تقسیم ہند سے پہلے کا سا جذباتی رنگ نہ ہو بلکہ ایسی متحرک تحریک ہو جو ہندستانی مسلمان کو آج کے مسائل اور مواقع سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشے۔

ہندستانی مسلمان اپنی آج کی حالت کے لئے محض اسی لئے ذمے دار نہیں کہ انھوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی حالت کو ابتر بنانے میں ان مسلمان لیڈروں کا بھی ہاتھ ہے جو 1947ء کے بحرانی دور میں پاکستان چلے گئے تھے۔ پڑھے لکھے مسلمان، تاجر اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو با اثر مسلمان تھے ان کی اکثریت نے پاکستان کا راستہ لیا اور عام مسلمان بڑی حد تک کارواں سے بے یوسف بن کر رہ گئے مسلم لیگ کے اس ہجرت کی ہمت افزائی کی اور یہ نہ سوچا کہ رہ جانے والے مسلمانوں پر کیا گذرے گی۔

---

[1] پروفیسر اسمتھ کی کتاب "اسلام اِن ماڈرن ہسٹری" سے چند اقتباسات

یہ معاملہ اتنا زیادہ انتشار کا سبب نہ بنتا اگر ہجرت " (فرار) کا یہ سلسلہ جاری نہ رہا ہوتا۔ 1947ء میں جن مسلمانوں نے پاکستان کا انتخاب کیا۔ بہرصورت وہ ایک فیصلہ تھا، غلط یا درست مگر اُن کی بات بالکل الٹی ہے کہ جنھوں نے پہلے ہندستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور وفاداری کی قسم کھائی لیکن بعد میں بے وفائی کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا، وہ مسلمانوں کی بے چارگی، کس مپرسی اور اس تلخ احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ وہ بے رہنما ہو کر رہ گئے ہیں یہی نہیں بلکہ اس مسلسل " ہجرت " کا یہ اثر ہوا کہ جو مسلمان ہندستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری بھی مشکوک ہو گئی۔ اور بعض مسلمانوں کے اعمال اور شاخوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔ ایسے نوجوان مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے جنھوں نے ہندستان کی یونیورسٹیوں سے ڈگری لی اور ہندستان میں ملازمت تلاش کرنے کے بجائے پاکستان چلے گئے۔ کئی مسلم رہنماؤں نے (بعض مثالیں تو ایسی ہیں کہ انھوں نے اس ملک کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور قومی دار رتبے حاصل کیے) بعد میں ایسے موقعوں کی تلاش کی یا انھیں ایسے موقعے پیش کئے گئے کہ وہ فوراً اور اچانک سرحد پار کر گئے۔ ادبی اور مذہبی دنیا سے تعلق رکھنے والے بعض اشخاص نے بھی یہ کیا اور غالباً سب سے زیادہ ملک کے لئے مضرت رساں واقعہ وہ تھا کہ جب ہندستانی فوج کے بریگیڈیر جنرل انیس ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کر کے ذمے دار اور بڑے عہدے تک پہونچ جانے اور فوج کے خفیہ معاملات تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اپنی درخواست پر 1951ء میں ریٹائر ہوئے اور پھر پاکستان پہونچ کر حکومت پاکستان کے ملازم ہو گئے۔ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے رویئے سے ان مسلمانوں کی پوزیشن کتنی خراب کر دیتے ہیں جو ہندستان میں رہتے ہیں اور جنھیں ہندستان میں رہنا ہے بریگیڈیر انیس نے جو حرکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اب ہندستان میں کسی مسلمان کا بریگیڈیر ہونا مشکل ہے (اور حقیقت یہ ہے کہ چپراسی ہونا بھی مشکل ہے [1]) اردو کے مشہور شاعر جوش کی، ہجرت کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ ہندستان میں ان کے جانے کے بعد اردو کا مستقبل تاریک تر ہو جائے۔

حیدرآباد کا المیہ (1948ء) اور اس کے خلاف مسلمانوں کا جذباتی احتجاج اس کی واضح مثال ہے۔ یہ واقعہ مسلمانان ہند کی اس کوشش کا ایک اور ثبوت ہے کہ وہ جمہوری ہندستان میں اپنی نئی پوزیشن تسلیم کر لے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک شان دار ماضی کی دھندلی جاہ و حشمت سے متعلق ان کے جذبۂ خود داری کی چوٹ اور گزرے ہوئے زمانے کی اس یادگار کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی پُرجوش لیکن بے سود کوشش . . . حیدرآباد کے مسلمانوں کو حالات کی غلط تاویلات کی جو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے اسے کبھی نہ بھولنا چاہیئے . . . ایک مسلمان نے مجھ سے کہا: " جب مجھے معلوم ہوا کہ حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا ہے تو میں مسلمانوں کی حالت پر رو دیا، لیکن آخر میں ان کے تمام آلام و مصائب کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہت مفید ثابت ہوا۔ یعنی یہ کہ احمقانہ جذباتیت کا چراغ آخری بار بھڑک کر بجھ گیا اور وہ اس نتیجے پر پہونچے کہ انھیں زندگی کی حقیقتوں کا جیسی کچھ بھی وہ ہیں مقابلہ کرنا چاہیئے۔ "

ہندستان میں مسلم اقلیت کی کمزوری کا بنیادی سبب اسکا پاکستان سے (ذہنی اور جذباتی) تعلق ہے اور یہی وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے یہ مسلم اقلیت اس تعلق کو ختم کر دینے کے لئے

---

[1] اس میں شک نہیں کہ 1947ء کے بعد اکثر مسلمان غداری، بے وفائی اور وشواس گھات کے مرتکب ہوئے۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کو اپنی قومی حکومت کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے نہ ان سے انتقام لیا اور نہ انھیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا۔ انیس اور جوش کی دغا کے بعد دو مسلمانوں کو ملک کا سب سے بڑا عہدہ عطا کیا یعنی وہ صدر جمہوریہ بنائے گئے۔ مسلمان لطیف کو ہوائی فوج کا اعلیٰ ترین افسر مقرر کیا گیا۔ اور ایک اور مسلمان عبدالرؤف کو سب سے بڑے سرکاری صنعتی ادارے کا مہتمم اعلا بنایا گیا۔ اس کے باوجود ہندستانی مسلمان اگر اب بھی اس قومی حکومت کو ہندو حکومت ہی سمجھتے رہے اور ہندو کو اپنا دشمن گردانتے رہے تو پھر ایک دن درحقیقت یہ ہندستان جنت نشان انکے لئے اسپین بن جائے گا۔ ش ک

آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ رشتہ منقطع ہوچکا ہے۔ اس حقیقت کو یا تو جان بوجھ کر تسلیم نہیں کرتی یا اسے مان لینے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی مسلم اقلیت جتنی زیادہ غیر محفوظ رہی ہے اتنا ہی اس نے اس تعلق کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

دراصل یہ سارا معاملہ ہندستان کے مسلمانوں کی اس سیاسی حماقت کی المناک اور واضح شرح ہے کہ جس کے وہ حالت یاس اور عالم افسردگی میں مرتب ہوئے۔ یہی نہیں بل کہ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور پر اس بات کا اندازہ کرنے اور تسلیم کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ آج آنے والے زمانے میں اسلام کی مرئی اور غیر مرئی عظمت کو نئی شکل اور مختلف انداز میں ظاہر ہونا ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے جو پیچھے کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں یہ جان کر بڑی تکلیف ہوئی ہے کہ خدا اور انجمن اقوام متحدہ کو بھی اس بات سے قطعی دلچسپی نہیں ہے کہ اسلامی قدروں اور کارناموں کی وہی قدیم شکل برقرار رہے۔ ہندستان میں اسلام کے عظیم اور پرشکوہ مستقبل کی تعمیر ان کے ہاتھوں نہیں ہوگی جو مایوس کن نظام کے نمائندوں کی پرانی اور کھوکھلی جاگیروں کے خاتمے پر ماتم کرتے ہیں بل کہ یہ بڑا کام وہ لوگ انجام دیں گے جو اسلام کی آفاقی اور ابدی سچائیوں کی تلاش میں کوشاں ہیں اور اس بات کی جد و جہد کرتے ہیں کہ ان کا پورا اثر آج کے حالات پر پڑے۔

میرا یہ یقین ہے کہ مسلمانان ہند کی مادی اور روحانی فلاح و بہبود کا راز اس میں ہے کہ وہ خدا کے بھروسے پر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ ہندستان میں اپنے نئی اور بدلی ہوئی حالت کو تسلیم کریں اور اس میں خود اپنی قسمت بنانے کے لئے اپنی ذمے داریوں کو پہچانیں اور قبول کریں دوسروں پر بھروسا اور اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کریں، اور آزادی، ایمانداری اور تخلیقی توانائی کے ساتھ نئی قوم کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوں ••

پاکستان کی تخیل و تشکیل کا سہرا اقبال و جناح کے سر

دراصل پاکستان دو قومی نظریے کی تخلیق ہے۔ نظریہ پاکستان ڈاکٹر اقبال کے نظریات ملی اور مسٹر جناح کے سیاسی رجحانات کی تخلیق ہے۔ اپنے سیاسی مشن میں مسٹر جناح کو ڈاکٹر اقبال سے بڑی مدد ملتی رہی ہے۔ اقبال اپنی تقریر اور مراسلت دونوں ہی سے مسلمانوں کے لئے ایک الگ حکومت بنانے کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ 21 رجون 1937ء کو اپنے ایک خط میں ڈاکٹر اقبال مسٹر جناح کو لکھتے ہیں: "آپ ہی ہندستان میں وہ واحد شخص ہیں جس سے تمام قوم کو اس طوفان کے خلاف جو کہ شمال مغرب اور شاید سارے ہندستان میں آرہا ہے رہنمائی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے!" 7 راکتوبر 1937ء کو اپنے ایک دوسرے خط میں اقبال نے جناح کو پھر وہی بات لکھی: "ہم لوگ ایک امتحانی دور میں ہیں اور ہندستان کے مسلمانوں کو امید ہے کہ آپ کا خطبۂ صدارت (لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد) قوم کے مستقبل کے لئے اُن کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔" مارچ 1940ء میں مسٹر جناح نے جو تقریر کی وہ دو قومی نظریے کے حق میں تھی۔ اور اسی کی بنیاد پر پاکستانی تحریک عمل میں آئی۔ اس لئے پاکستان کی تخیل کے ذمے دار ڈاکٹر اقبال تھے اور تشکیل کا سہرا مسٹر جناح کے سر بندھا!

—— ڈاکٹر شان محمد

سرور تونسوی

زبانِ اُردو اور متعصّب اُردو داں

اردو زبان کی ابتداء کے بعد لکھنؤ اور دہلی کا جھگڑا شروع ہوا۔ خواجہ عشرت لکھنوی مّجان اردو ۱۹۲۰ء میں فرماتے ہیں جب دہلی اور لکھنؤ مد مقابل ہوئے تو دونوں میں رقابت پیدا ہوئی۔ دہلی کے رہنے والے شاعر تو ہمیشہ آپس میں لڑا کرتے تھے۔ لکھنؤ کی مخالفت پر آمادہ ہوئے اور یہ جھگڑا طول پکڑتا گیا۔ پہلے تذکیر و تانیث کا سلسلہ شروع ہوا۔ دہلی والے سانس کو مذکر بولتے ہیں۔ لکھنؤ والے کہتے ہیں س قافیے کے جتنے الفاظ ہیں سب مونث ہیں اور قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہم مونث بولیں جیسے ناس، آس، گھاس، چپراس، مٹھاس، مساس، سانس، اسی طرح اور بے شمار جھگڑے ہیں۔ دہلی والوں کا خیال تھا کہ اس جنگ میں ہمارا پلہ بھاری رہے گا اور لکھنؤ کو نیچا دیکھنا نصیب ہو گا مگر لکھنؤ وہ لکھنؤ نہ رہا تھا کہ جو اپنی مادری زبان میں کسی دوسرے کا محتاج رہتا۔ اس نے بھی خم ٹھونک کر مقابلہ کیا بالآخر پالا اسی کے ہاتھ میں رہا!! اب حضرات دیکھ سکتے ہیں کہ وہ اختلاف آج تک موجود ہے۔

حضرت منیر لکھنوی نے ایک فہرست تیار کی جس میں اُردو کو چار شعبوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہندو۔ مسلم۔ لکھنؤ۔ دہلی

مثلاً ہندو	مسلم	لکھنؤ	دہلی
پتا جی	وا۔ ابا جان ابا میاں	گڑھنا	گھڑنا
بجیا جی	(بڑی بہن) آپا	پنکھا جھلنا	پنکھا کرنا
جیجا جی	دولھا بھائی	ناپنا	ماپنا

حقیقت میں منیر صاحب نے ان چار شعبوں میں بہت غوطے کھائے ہیں اور اغلاط کے ڈھیر لگا دیئے ہیں۔ لیکن انتخاب کرنے پر کچھ الفاظ کام کے بھی نکل سکتے ہیں جیسے اوپر مثال میں ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اردو کے جنم داتا کون بزرگ تھے۔ ان کے صحیح حالات پر اس قدر پردہ ڈالا گیا ہے کہ وہ کسی سے اٹھائے نہیں اٹھتا۔ ان کی جائے پیدائش، حالات زندگی، تاریخ وفات کا صحیح اندازہ تو کیا معنی اصلی نام تک مسخ کر دیا گیا۔

اُن بزرگ کا اصل نام رائے بنوالی داس بھٹناگر۔ لقب دل رام تخلص ولی تھا۔

یہ اکبر اعظم کی سلطنت کے آخر دور میں جلوہ افروز ہوئے جب پوشش زبان اور رہن سہن میں مسلمانوں اور ہندو شرفا میں بظاہر کوئی اختلاف نہ تھا۔ مسلمان ہندی اور سنسکرت پڑھنے کے شائق تھے تو ہندو خاص کر کایستھ اور کشمیری برہمن عربی اور فارسی کے جیّد عالم و مسلمان زبان دانوں کے دوش بدوش پائے جاتے تھے۔

گیتا کا فارسی میں منظوم ترجمہ فیضی ہی نے سب سے پہلے کیا تھا وہ آج بھی موجود ہے فیضی سے پہلے گیتا کا کوئی ترجمہ نہیں۔

جہانگیر کے دورِ حکومت میں ہمارے بنوالی داس شاہی فیل خانہ کے داروغہ تھے ۱۶۱۹ء میں جہانگیر نے رائے کے خطاب سے نوازا۔

شاہجہاں کے عہد میں منصب ہزاری پر سربلند ہوئے عالمگیر کے عہد میں آپ کے اعزاز میں وہ لاثانی اضافہ ہوا کہ کسی دوسرے

دربادی کو میسر نہ ہوا۔ ذیل کے دو شعروں میں اپنا نام اور تخلص کا اظہار فرمایا ہے ؎

باد نون و الف زینوالی
رفت از پیش ماند صرف ولی
اسم بدنم نیست بجز بنوالی
در شعر تخلصم ولی است والی

ولی صاحب دیوان ایک ہی شاعر گزرا ہے۔ ان کی تصانیف مثنوی محیط المعرفت پربودھ چندر موسومہ گلزار حالی (فارسی) دیوان (ریختہ) دیوان فارسی گنج عرفاں۔ راجاؤں شاہان دہلی کی تاریخ وغیرہ آخری عمر ۱۰۶۱ھ میں وہ سب ساز و سامان اولاد ادم لکین کی تقسیم کر کے بھگوت بھجن میں محو ہو گئے تھے لیکن انھوں نے جہانگیر شاہجہاں اور عالمگیر تین کا ابتدائی دور یعنی مغلیہ بادشاہوں کا عہد حکومت دیکھا ۱۰۷۵ھ ہجری تاریخ وفات لکھی ہے لیکن معلوم نہیں کہ حضرت احسن مارہری نے کس بنیاد پر لکھا ہے کہ ۱۱۵۵ ہجری تک ان کا زندہ رہنا پایا جاتا ہے۔

حضرت احسن لکھنوی لکھتے ہیں۔

تاریخ دیکھ لیجئے اردو زبان کی
ویسی ہی یہ زبان ہے ہندستان کی
اُردو کو مسلموں کی زباں کہنے والے دوست
ہے ریختہ میں پہلی غزل چندربھان کی

چندربھان نام اور برہمن تخلص تھا۔

تعصب جسے میں پہلے کہہ چکا ہوں کوئی بیماری نہیں میں پوچھتا ہوں کہ کیا ذوق۔ غالب اور مومن کے عہد میں اور مصحفی، ناسخ، آتش کے دور میں کوئی ہندو شاعر نہ تھا۔ ضرور تھے لیکن تعصب کا بول بالا ہونے کی وجہ سے ان کے نام و کلام مفقود ہیں۔

اردو کے ساتھ جو بے انصافی اور ظلم ہو رہا ہے وہ بھی کوئی نئی تخلیق نہیں۔ مسلمان ہر قیمت پر اُردو کو فارسی عربی الفاظ کے جامے پہناتے رہے اور ہندی الفاظ متروکات کی زہر میں بجھی ہوئی چھری سے ذبح کرتے رہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ لفظ سدا خالص اُردو کا لفظ ہے جو صدیوں سے بنا ہے اس کے متروک کرنے کی وجہ فرماتے ہیں کہ صدا عربی میں آواز کے معنی پر ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا ہے ایسے سیکڑوں الفاظ ہیں انھیں بھی ترک کر دیجئے۔

مثلاً ارض (الف سے) یعنی زمین		اور عرض (عین سے) گزارش چوڑائی	
الیم	" رنج دینے والا	علیم	" جاننے والا
امارت	" حکومت	عمارت	" مکان
ثواب	(ث سے) نیکی	سواب (س سے) ٹھیک، صحیح	
ثمر	" پھل	سمر (س سے) کہانی	

لیکن پھول کا نام آج بھی سدا بہار ہی ہے اور ایک فرقہ بھی ہے جو سدا سہاگ کے نام سے مشہور ہے۔

لفظ خسم خاص اردو کا لفظ ہے۔ ہندی میں حرف خ نہیں۔ جان صاحب لکھنوی فرماتے ہیں ؎

اوّل خسم ہی کرنا نہ تھا جو کیا کیے
کرکے جو رنڈاپے چھوڑ دیا یہ برا کیے

محاورات نسواں میں لکھا ہے کہ لفظ سین اور بالتحتین صحیح ہے اسکو صاد ساکن سے لکھنا غلط ہے اس کے معنی دشمن کے ہیں اور تماشا دیکھئے کہ خواجہ عشرت لکھنوی اصلاح زبان اردو میں فرماتے ہیں

پہ (پر) کے بدلے۔ امیر مینائی۔ داغ۔ اور جلال کے اشعار پیش کر کے لکھتے ہیں۔ پہ کا استعمال اب اکثر فصحا نے ترک کر دیا ہے اسکے بدلے "پر" بولتے ہیں آخر میں جلال و داغ نے بھی ترک کر دیا تھا لیکن خود ان کا شعر ہے۔

آستانے کا ترے اوج بیاں ہو کس سے
مجھ کو پہنچا دیا گردوں پہ جبیں سائی نے

(جلوہ یا مئی جون ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۷)

پہ۔ داغ اور جلال تو کیا ترک کرتے آج تک تو ترک ہوا نہیں۔

ہندوؤں کی فارسی دانی کا یہ عالم تھا مرزا ہرگوپال تفتہ سکندر آبادی کی تمام تصانیف فارسی میں ہیں۔ غالب۔ مومن وغیرہ کے اُردو کلام موجود ہیں اور خود تفتہ صاحب کے شاگردوں کے کلام مع اصلاح اردو میں پائے جاتے ہیں لیکن تفتہ صاحب کا کوئی شعر اُردو کا نہیں ملا۔ حضرت منور صاحب نے جو ایک قطعہ اردو کا تفتہ صاحب کی طرف منسوب کیا ہے، وہ ہرگز مرزا تفتہ کا

نہیں۔ اس سے صرف ۵۹۴ اعداد نکلتے ہیں اور یہ غالب کی تاریخ وفات نہیں ہے

فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق
چھ لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی انکساری سے متعصبین کا اتنا حوصلہ بڑھایا کہ وہ بغیر جھجھک یہ کہنے لگے کہ اردو ہماری زبان ہے کثرت ہر چیز کی نقصان پہنچاتی ہے آخر ایسی بھی انکساری کیا کہ متعصب حضرات سر پر ہی چڑھ جائیں۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔

آج بھی اگر تمام ادبا و شعرا مل کر چاہیں تو ایک مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ تعصب، حسد اور احساس برتری کو بالائے طاق رکھ دیں میں ابھی ایک مثال منصفانہ فیصلہ کی پیش کرتا ہوں

محترم علام عشق آبادی تذکیر و تانیث کے تحت فرماتے ہیں۔
اس وقت تک تذکیر و تانیث کا کوئی فیصلہ کسی بزم یا مرکز ادب نے کیا ہی نہیں۔ ہر چند قواعد کی کتابوں کے مولفین نے سر مارا۔ قواعد بتائے مگر قواعد صرف کتابوں تک محدود رہے عام و عوام تو کیا بڑے بڑے اہل قلم اس معاملہ میں دھینگا دھینگی سے کام لیتے ہیں کیا مزہ ہے کہ نیچے دیئے ہوئے الفاظ جو شاعر ایک جگہ مذکر لکھتا ہے دوسری جگہ وہی مونث کہتا ہے۔ مثلاً ناسخ لکھنوی لکھتے ہیں ؎

بتی اس کے میل کی بتی اگر کی بن گئی — مذکر
ریزہ ریزہ میل صندل کا بُرادہ ہو گیا

بو تری زلفوں کی جاتی ہے جو اکثر کان میں
میل ہو جاتی ہے رشک مشک و عنبر کان میں — مونث

اسی طرح ابرو۔ فکر۔ بخیہ۔ بلبل۔ طوطی۔ قلم۔ قلمرو۔ مژہ۔ معدن۔ نال۔ نقاب۔ ہما۔ وغیرہ۔ اور بہت سے لفظوں کی تذکیر و تانیث کا یہ حال ہے کہ ایک ادیب مذکر کہتا ہے تو دوسرا مونث اب فیصلہ کون کرے بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں دہلی اور لکھنؤ کا فرق پیدا کیا جاتا ہے ایسے الفاظ کم و بیش ایک ہزار ہوں گے۔ اور چند الفاظ ایسے بھی ہیں جو واحد مذکر بولے جاتے ہیں اور بصورت جمع مونث مثلاً "لفظ" مذکر ہے لیکن لفظیں مونث ہے ؎

ناسخ لکھنوی

ہو طلب سے اس قدر نفرت کہ رہتا ہے خیال
آنہ جائے لفظ لب پر باب استفعال کا

رشک لکھنوی

وصل کی رات بنا نامہ شوق گیسو
شام لفظیں ہیں سپیدی ہے سحر کاغذ کی

اسی طرح در و مذکر، دردیں مونث اور مزار مذکر مزاریں مونث۔ ؏

وزیر لکھنوی

دو قدم جب مرا مزار رہا

میر تقی میر

جب ہم گئے، دو چار نئی دیکھیں مزاریں

بلبل۔ طوطی۔ چیل۔ بٹیر۔ تتلی۔ مینا کی تذکیر کچھ نہیں۔ لال کی مادہ کو اہل دہلی چپتی کہتے ہیں مگر اہل لکھنؤ لال ہی کہتے ہیں اور پپیہا کی مونث کچھ نہیں۔ ساری دنیا تو حشر کو مذکر کہتی ہے مگر میر تقی میر مونث لکھتے ہیں۔

خلق یکجا ہوئی کنارے پر
حشر برپا ہوئی کنارے پر

قامت ہزار فی ہزار مونث ہے لیکن آتش لکھنوی کو مذکر نظر آتا ہے ؎

قامت موزوں تصور میں قیامت ہو گیا
چشم کی گردش نے کار فتنۂ دوراں کیا

جان۔ کبھی مذکر سنا ہے؟ نہیں سنا تو میر تقی میر کی زبانی سنئے ؏

آج اُس مریض غم کا ہچکی میں جان گیا!

اب چند الفاظ ایسے کہ جو ایک معنی میں مذکر اور دوسرے معنی میں مونث ہیں۔

لفظ	معانی	تذکیر و تانیث
آب	پانی	مذکر
″	چمک رونق	مونث
بار	بوجھ۔ پھل	مذکر
″	نوبت۔ دخل مرتبہ	مونث
بحر	سمندر	مذکر
″	وزن شعر	مونث

لفظ	معانی	تذکیر و تانیث
تال	گُنڈ	مذکر
"	وزنِ موسیقی	مونث
چاند	قمر۔ بیٹیا	مذکر
"	کھوپڑی	مونث
چاہ	کنواں	مذکر
"	خواہش، محبت	مونث
چین	ملک کا نام	مذکر
"	شکن، سلوٹ	مونث
خلال	دانت کریدنے کا آلہ	مذکر
"	بازی میں مات کھانا	مونث
دار	گھر	مذکر
"	سولی	مونث
دال	حروفِ تہجی	مذکر
"	مشہور غلہ	مونث
دوپہر	۶ گھنٹے کا وقفہ	مذکر
"	وقتِ خاص دن کا	مونث
شام	ملک کا نام	مذکر
"	وقتِ غروب ہونے کا	مونث
عرض	چوڑائی	مذکر
"	گزارش	مونث
فصل	فاصلہ، دوری	مذکر
"	موسم، کتاب کا حصہ	مونث
بیت	گھر	مذکر
"	شعر	مونث
کان	گوش	مذکر
"	معدن	مونث
گذر	گذرنا۔ جانا۔	مذکر
"	بسرِ اوقات	مونث
مَد	علامتِ اشباع رس جزر کی ضد	مذکر
مد	حساب کی مد	مونث
مہر	سورج	مذکر
"	محبت	مونث
نال	ناف	مذکر
"	بندوق کی نال	مونث
نیاز	حاجت	مذکر
"	نذر	مونث
نون	حرفِ تہجی	مذکر
"	مچھلی	مونث

[illegible]

فیصلہ:۔ جتنے پرندے اور جاندار ہیں سب نر و مادہ ہوتے ہیں۔ بلبل نر بھی ہوتا ہے اور مادہ بھی۔ اسی طرح چیل۔ طوطی مینا اگر آپ کا بلبل نر ہے تو کہئے کہ بلبل چہک رہا ہے اور اگر مادہ ہے تو کہئے کہ چہک رہی ہے۔ اس میں لکھنؤ یا دہلی کے پچڑ لگانے کوئی وجہ نہیں۔ اب رہا سوال غیر جاندار چیزوں کا اس کے لئے قواعد میں کافی مواد ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پانچ فصیح عالم شعرا کی اسناد ہیں اور بس۔۔ (پھول۔ جون ۵۸ء)

اب آخر میں سب سے اہم سوال اُردو کی بقا کا ہے۔ مسلم کانفرنس یا نان مسلم کانفرنس سے مطلب حل نہیں ہو سکتا بلکہ بقول اکبرآبادی شعر

موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

یعنی تمام اہل قلم حضرات متحد ہو کر زبان اردو کا حق منوائیں۔ مدرسوں میں باقاعدہ اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو۔ سرکاری و غیر سرکاری محکموں، دفتروں، عدالتوں میں اردو کو وہی مقام ملنا چاہیئے جو پہلے تھا۔

اردو اہل قلم کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ آج جو اردو دشمن آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں جنگ آزادی کے وقت وہ کہاں سو رہے تھے۔ اہل اردو نے میدانِ جنگِ آزادی میں جو پارٹ ادا کیا وہ کیا اسی وقت کی امید پر کیا تھا۔ دشمنان اردو ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو سہی۔ گال بجانے اور ٹھوک بلونے سے اہل اردو کی حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ کوئی بھی اردو شاعر اور ادیب ایسا نہیں جس نے مادرِ وطن کے گیت نہ گائے ہوں اور

اپنی پوری قوت سے آزادی کے رہنماؤں اور پیرووں کی حوصلہ افزائی نہ کی ہوا ورنہ معلوم کتنے شاعروں نے فرنگی قید و بند اور دیگر صعوبتوں میں شانہ بشانہ رہنماؤں کا ساتھ دیا۔ حضرت علامہ عشق آبادی فرماتے ہیں ؎

پہنے والے ہیں جو نصف آستیں کی قمیص
وہ آستینیں چڑھائیں گے کیا زبان کیلئے

دشمنانِ زبانِ اُردو ہمارے سامنے آئیں ہم ان کو بتا سکتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اہل عرب تمام ساز و سامان سے زیادہ حفظ و قدر اپنی زبان کی کرتے ہیں یہ فعل ان کا قابل آفریں ہے ہمیں بھی ان سے یہ سبق لینا واجب ہے ہمیں بھی اپنی زبان کی قدر اور تحفظ کے لئے دشمنوں سے لوہا لینا پڑے گا۔

جب تک مدرسوں میں اردو پڑھائی نہ جائے گی یہ زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ہر بہی خواہ اُردو کا یہ اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے اسکولوں اور کالجوں میں مطالبہ کریں۔ تاکہ حکومت اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم دلانیکا انتظام کرے۔

حکومت کی طرف سے نااہل اردو مصنفین شعرا۔ ادبا کی جو ناجائز مالی امداد کی جاتی ہے۔ وہ بھی اردو کی بقا و حیات کے لئے خطرناک ہے۔ جیساکہ اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے جن مطبوعات اردو پر انعامات دیئے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر فنی غلطیوں سے پُر ہیں اور بعض کتابیں تو قابل ضبطی ہیں۔ اردو کی بقا کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ سرکاری امداد مستحق اور باشعور مصنفین کو دی جائے۔

حکومت کی طرف سے جو کتابیں اردو میں شائع کی جا رہی ہیں ان کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں اور یہ اس وجہ سے کہ نااہل مترجمین مصنفین اور مولفین کو بھاری بھرکم معاوضہ دیکر کتابیں تیار کرائی جاتی ہیں اور پھر اسے خوش مذاق اداروں کی معرفت چھپوائی جاتی ہیں جو چار گنا اُجرت چارج کرتے ہیں اور اکثر یہ کتابیں صحیح واقعات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ہیں اور حکومت کا یہ طرز عمل بھی اردو کی ترقی میں خطرناک ہے۔ ●●

اردو اور سیاست

”اس بڑے شہر (ناگپور) میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں سے بڑا معرکہ ہوا۔ وہ ہندی کے حق میں تھے اور ہم ہندستانی کی حمایت میں۔ میں نے بحث کیا کہ آپ ہندستانی فرمایئے“ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں نے کہا کہ نیشنل کانگریس کا ریزولیوشن ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی۔ کہنے لگے وہ ریزولیوشن بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ اس جلسے میں انڈین نیشنل کانگریس کے تین جیتے جاگتے پریسیڈنٹ موجود تھے، جو بت بنے بیٹھے تھے۔ ایک کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا، اور کسی نے میری کیا۔ کانگریس کے ریزولیوشن کی بھی تائید نہ کی۔ آخر میں حضرت مہاتما نے فرمایا۔ میں ہندی نہیں چھوڑ سکتا۔ تو میں نے کہا۔ ہم اُردو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم ہندی الفوا ہندستانی کے دھوکے میں نہیں آ سکتے۔ ہم لفظوں کو نہیں عمل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ——————— بابائے اردو مولوی عبدالحق

ظ۔ انصاری

اسلام اور مسلمان

جناب اصغر علی انجینئر کے چند انگریزی مقالوں کا مجموعہ 'اسلام اور مسلمان' کتابی صورت میں عنقریب شائع ہونے والا ہے اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے لکھا ہے۔ ظ۔ صاحب کا یہ دیباچہ چوں کہ 'گگن' کے مزاج کے مطابق ہے اور زیر نظر 'ہندستانی مسلمان نمبر' کے مقصد کو بھی پورا کرتا ہے۔ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین 'گگن' پسند فرمائیں گے۔ ش۔ک

مذہب عقیدے سے پیدا ہوتا ہے اور عقیدے کے بغیر محض رسم و رواج یا آبائی چلن اختیار کر لینے سے بھی۔ البتہ عقیدہ وہ ہے جو کسی مذہب کو، سماجی یا ذہنی رشتے کو قوت عطا کرتا ہے۔ قوت عقیدے میں ہے۔ عقیدے کی یہ قوت مذہب کی طرح لامذہبیت کے بھی کام آتی ہے۔ سائنس اور فنون کی ترقی میں بھی کارفرما ہوتی ہے۔ کوئی عقیدہ جس قدر سائنسی بنیادوں پر قائم ہوگا، اتنا ہی وہ نت نئی تبدیلیوں کے لئے آمادہ رہے گا۔ تبدیلی یا تجدید سے جس قدر منکر ہوگا اتنا ہی بے روح اور کھوکھلا ہوتا چلا جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُس عقیدے' بے پناہ قوت کا خزانہ ہونے کے باوجود کبھی بے پناہ تباہی اور زوال کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ مذہب کا عقیدے اور رسم و رواج یا طرز زندگی' دونوں سے گہرا رشتہ ہے۔ خود مذاہب کچھ لوگوں کے نزدیک غیب سے نازل ہوتے ہیں لیکن ارضی حالات کی ضرورت کے مطابق۔ اُن کی اصلاح کی خاطر۔ اور کچھ لوگوں کے نزدیک مذہب اُس آئیڈیالوجی (فکر و نظر کے مجموعے) کا نام ہے جو زمین سے ہی اُگتی ہے، خاص تاریخی حالات اس کا تقاضا یا جواز پیش کرتے ہیں اور تاریخی حالات محض مادّی سرگرمی اور پیداواری تعلقات کا نام نہیں بلکہ اُن سے وابستہ شعوری کوشش اور کشمکش بھی شامل ہے۔ جب طاقت اور ذہن کی باہمی آویزش اور آمیزش کے منظر پر کوئی بڑی شخصیت اُبھرتی ہے جو سماج کی تشنۂ تکمیل آرزو کو ویسا رُخ دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ دبی ہوئی، بے چین قوتوں کو زنجیر توڑ کر آگے بڑھنے کا موقع مل جائے، سماج اگلی منزل تک قدم بڑھائے ——— اور پھر بدلے ہوئے حالات سے دوچار ہو

مضامین کا یہ مجموعہ دوسرے مکتب خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔

ایک نوجوان راہرو، مارکسی سائنسی فکر کی قندیل لئے ہوئے 'اسلام کے آغاز اور مسلمانوں کے انجام کی تلاش میں' نکلا ہے؛ قصص الانبیا، معجزات گھڑی گھڑائی حدیثوں، کہانیوں، روایتوں اور درایتوں، تفسیر و تاویل، وسعت ذہن کی حاشیہ آرائیوں کے گھنے جنگل میں، تحقیق و تصدیق کا قدم اب تک جہاں پہنچا تھا، وہاں تک بھی سارے نشانات اعتبار کے قابل نہیں، اُن سے آگے بڑھنا یا ڈگر بنانا تو دُور کی بات ہے۔ روز نئے نئے علمی چیلنج آتے رہتے ہیں اور تلاش کے کسی ایک نتیجہ کو آخری نہیں کہا جا سکتا ——— البتہ واقعات اور عقیدوں کے سینے میں اُتر کر مادّی اور فکری بنیادوں کی کھوج اگر پیغمبرانہ عمل نہیں تو کم از کم اُس فرض کی ادائیگی ضرور ہے جو برسوں کی عبادت سے بڑی آزمائش اور صدیوں پُرانے عقیدوں سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے۔ اگر یہ فرض وقت وقت سے ادا نہ ہوتا رہے تو کوئی بھی دین رُکے ہوئے پانی کی طرح اپنی تاثیر کھو بیٹھے، حال کی ضرورت اور مستقبل کی افادیت دونوں سے محروم ہو جائے۔

ہمارے دَور کے ایک مصری عالم اور اسلامی مفکر محمد قطب نے اپنی

ایک اہم تصنیف کے آخر میں اسلام اور کمیونزم سے بحث کرتے ہوئے کمیونسٹوں کو للکارا ہے :-

"وہ اسی زبردست انقلاب کی جو اسلام نے عرب میں برپا کیا، کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ جزیرہ نمائے عرب یا اس قدر کی تمام اسلامی دنیا میں معاشی پیداوار کے ذرائع کی کسی ایسی تبدیلی کا نام نشان نہیں ملتا جسے وہ سبب قرار دیں دنیا کے اس خطے میں ایک مکمل نظام زندگی کے ساتھ رسول پاک کی آمد کا۔"

ہمارے یہاں جماعت اسلامی کے نقیب بھی کچھ اسی قسم کے سوال اٹھاتے رہتے ہیں۔ معاشی پیداوار کی سطح، ذرائع اور پیداواری تعلقات ـــــ پھر ان کا اجتماعی یا سماجی شعور سے سمبندھ، رسوم و رواج کی جکڑ بندی، تبدیلی اور بہتر نظام زندگی کے لئے حالات کا تقاضا ـــــ اسلام کی تاریخ میں انہی کڑیوں کی دریافت اس چیلنج کا جواب اور ان مضامین کا مقصد ہے۔

اگرچہ یہ مضامین آزادانہ اور جدا جدا موقعوں پر لکھے گئے، (اسی لئے الفاظ اور خیالات کی تکرار بھی باقی رہی) تاہم لکھنے والے کے نقطۂ نظر اور تلاش نے، منطقی فکر نے اور موضوع کے باہمی رشتے نے ان میں ایک مربوط نظریہ اور ہموار لہجہ ابھار دیا ہے۔ خصوصاً پہلے اور تیسرے مقالے میں (اسلام کی ابتدا اور اٹھان اور مسلم پرسنل لا اور مشترکہ سول کوڈ) جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یوں دیکھئے تو یہ کتاب نہ آمنّا و صدّقنا کے عادی اہل ایمان کے لئے ہے، نہ ان اہل علم و فضل کے لئے جن کی جیب میں ہر سوال کا آخری جواب پڑا رہتا ہے، نیت نہ دلآزاری ہے، نہ دل جوئی ـــــ بلکہ عقائد و جذبات سے بالکل بے نیاز ہو کر ماضی کی ان دھندلی مگر ٹھوس حقیقتوں کو اسرار کے پردے سے باہر لانے کی کوشش ہے جو عموماً انسانی تہذیب اور خصوصاً مسلم سماج کی ذہنی تربیت میں کام آسکیں۔ نتائج سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر مصنف کی نیت یا صلاحیت پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔

مصنف کے تعارف میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ :

ایک نہایت ہی مذہبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے عمر رسیدہ والد چھوٹے چھوٹے قصبوں میں والدی بوہرہ جماعت کے عامل رہے، جیسے تیسے گزر بسر ہوتی۔ مادری زبان گجراتی، ماحول کی زبان ہندی اردو، ابتدائی تعلیم کلاسیکی عربی اور جب کالج میں پہنچے تو سائنس مضامین سے علاوہ سول انجینیر ہوکر نکلے یونیورسٹی میں جرمن زبان اور ادبیات کے سنجیدہ مطالعے نے، معاشیات، فلسفہ اور تاریخ کی لگن نے عقائد کی بنیاد کو نہیں جھنجھوڑا، دیواریں البتہ ہلادیں۔ بمبئی میں ملازمت ملی۔ پھیلی ہوئی دنیا دیکھی۔ جماعت کی سماجی اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ شدید مذہبی ماحول میں پلنے والوں کی کڑی تنقیدی نظر سب سے پہلے اپنے مذہب پر ہی پڑتی ہے۔ یہاں نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک باغی گروہ بن گیا۔ چند سال انقلابی سوشلزم سے جدت اور حرارت لینے کے بعد، نعروں، جلسوں، اور جلوسوں کے بعد یہ گروہ تو بکھر گیا، ان کا مطالعہ جاری رہا۔

تاریخ عالم اور فلسفۂ اسلام کے علاوہ ادبی رجحانات اور ہنگامی موضوعات پر انھوں نے جی لگا کر کئی اچھے مضامین لکھے اور باوقار انگریزی اخبارات میں علمی کتابوں پر تبصرہ کرنے لگے۔ مضامین کا یہ مجموعہ انھی کا انتخاب ہے۔ اور کوئی دعوا کئے بغیر، دلیل ہے اس بات کی کہ مصنف نے جن ماخذوں کے حوالے دئے ہیں، ان کی تفصیلات پر اور ماخذوں کے ماخذ پر اس کی گہری نظر ہے، وہ مانگے کے پروں سے پرواز نہیں کرتا۔

چند غور طلب نکتے جو ان مضامین سے ابھریں گے یوں ترتیب دئے جاسکتے ہیں :

(۱) اہل علم کا یہ خیال اصلاح طلب ہے، کہ قرآن عرب کے وحشی بدوؤں میں اترا، اس نے قبائلی پسماندگی کو دور کر کے انھیں جاگیرداری نظام کی طرف بڑھایا۔ اسلام کی آمد سے پہلے مکہ اور خصوصاً قریش کا قبیلہ دولت مند تاجر و ساہوکار تھا۔ یہاں زراعتی سرگرمی اوّل تو تھی ہی نہیں اور تھی بھی تو اتنی نہیں کہ سماجی حالات پر اثر انداز ہوسکے۔ مکہ سماجی اخلاقیات کے لحاظ سے ترقی گروہ کی انفرادیت پسندی کا نمونہ تھا اور فرد واحد کے اختیار مطلق یا بادشاہی سے بالکل بیگانہ۔

۲۔ بدوی اخلاقیات میں سرکشی اور آزاد روی کے علاوہ جو پہلو اہم ہے، وہ ہے قبیلہ وارانہ ہیومنزم۔ یہاں نہ کوئی محدود ملکیت ہوتی ہے، نہ کوئی ایک فرد اس کا مالک۔

۳۔ بدوی معاشیات ضرورت کے وقت کارواں لوٹنے پر منحصر تھی ـــ مال غنیمت قبائل میں تقسیم ہوجاتا تھا اشتراکیت کا کوئی تصور تھا نہ ایثیت کا، نہ حاکم و محکوم کا۔

۴۔ اسلام نے قبائلی ہیومنزم کی مساوات و اخوت کا دائرہ وسیع کیا اور پورے میں دولت سمیٹنے، سامان ضرورت ذخیرہ کرنے اور سود خوری پر قدغن لگائی۔

اُن کی انفرادیت پسندی اور ذاتی املاک قائم رکھنے کا جواز تلاش کیا — اور دونوں کا اس طرح جوڑ بٹھایا کہ خانہ بدوش قبائلیوں اور بے بس بے حقوق غلاموں کا احتجاج بھی ظاہر ہو اور ایک باقاعدہ اسٹیٹ کے سائے میں تجارتی حلقوں کو، مجموعی سلامتی کی ضمانت کے ساتھ پیداواری قوت (منافع اور اقتدار) بڑھانے کا بھی موقع ملے۔

۵۔ ماحول کے جبر کے خلاف اُن نوجوانوں میں، جو تھوڑی بہت تعلیم یا تجارتی سرگرمی کی بدولت باہر کے حالات اور خیالات سے باخبر تھے، اسلام کو رُوح سمجھنے اور ایمان لانے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ چنانچہ مکہ سے ہجرت کے وقت ۴۰ برس سے کم عمر کے لوگ زیادہ تھے، یوں اسلام کو محروم طبقے یعنی غلاموں، بدوؤں کے علاوہ درمیانی طبقے کے نوجوانوں کی تائید بھی حاصل ہو چکی تھی۔

۶۔ قرآن کی مکی اور مدنی آیات کے رجحان، خطاب اور لہجے میں نمایاں فرق ہے۔ اوّل میں شدت اور مظلوموں کی حمایت، دولتمند جابروں کو تخویف اور مالکانہ اقتدار سے بیزاری کا رنگ ہے۔ مدنی آیات میں اخوّت، مساوات اور بشارت کا انداز ہے۔ مدینے کی آبادی کی طبقاتی بناوٹ مختلف تھی۔ یہاں زرعی پیداوار کا جما جمایا ماحول تھا اور طاقتوں کا توازن مکے سے مختلف۔ یہیں قبائل کی حد بندی توڑ کر یہود، کفارِ عرب اور مسلم کو ایک امت قرار دینے کی پہلی صدا بلند ہوئی اور علاقائی سلامتی کا وہ تصور کامیاب ہوا جس کی بدولت مختلف عرب (مسلم، یہود، نصاریٰ) مل کر اپنی ہمسایہ خوشحال سلطنتوں کا سامنا کر سکے۔ محمد عربی کی زبردست جہانبینی کا راز اس حکمت عملی یا سیاسی تدبیر میں بھی پوشیدہ ہے کہ اُنھوں نے قبیلہ واری، علاقائی، تجارتی اور ذہنی احتیاجوں کی الگ الگ لہروں کو ایک دھارے میں ملا کر انھیں، نہ صرف عرب قومیت کے متحدہ اظہار کی صورت دی، بلکہ اسے بین الاقوامی آئیڈیل دے کر اس قابل بنایا کہ روئے زمین کے ایک بڑے حصے تک آسانی سے پھیلتا اور دبے ہوئے خوابوں کی تعبیر بنتا چلا گیا

۷۔ عرب مرکز سے اٹھنے والی یہ تحریک دو سمتوں میں پھیلی؛ خوشحال با اقتدار اور ہوشیار بنی امیہ کے تہذیبی مرکز دمشق کی جانب اور ایرانی عراقی دستکاروں، ہنرمندوں، سپاہی پیشہ اور اہلکار طبقے کے کوفہ و بصرہ کی طرف۔ ایک پر بازنطینی سلطنت کے اور دوسرے پر ایرانی سلطنت کے اثرات اور رشتے ابھی باقی تھے۔ یوں بعد کی سیاست میں مکہ کے بجائے، ان مقامات کی اہمیت بڑھتی گئی جو اول بنی امیہ اور بنی عباس کے مرکز بنے اور آگے چل کر سنّی شیعہ کی تفریق میں ظاہر ہوئی۔ اس تفریق کے اوّلین مرحلے پر "خوارج کا ظہور دراصل خانہ بدوش عرب صحرائیوں کی سرکشی اور آزادی کا جارحانہ اظہار تھا جس نے 'قرآن' کے علاوہ کسی فرد یا خاندان کو امیر ماننے سے انکار کر دیا۔" انارکی کا یہ بدوی رجحان اس لئے بھی ناکام ہوا کہ اسلام کی تحریک نے ایک زبردست اسٹیٹ کی تشکیل کی راہ ہموار کر دی تھی۔

۸۔ فتوحات اور پیداوار کے ذرائع بڑھنے کے ساتھ اوپر کی آمدنی سے خوش حالی کا وہ ماحول بنا جس میں فلسفہ، فنون اور فقہ کی ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے سیاسی عروج کا زمانہ ہی اُن میں فلسفیانہ تحریکوں اور عقلی بحثوں کا زمانہ ہے۔ امام غزالی کا دور آتے آتے سیاسی سماجی قوت کا قلعہ ٹوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ عقلیت کی وہ شاخ جسے علماء اسلام نے یونانی فلسفے سے لے کر پروان چڑھایا تھا سوکھنے لگی اور غزالی نے آزادانہ فکر، فلسفہ اور منطق کے مقابلے میں وجدان اور عقیدے کی قوت پر زور دیا۔ مسلم علماء نے فلسفے پر تصوف کا غلبہ مان لیا اور یوں فکر پر قنوطی حاوی ہو گیا۔

۹۔ مسلمانوں کا پرسنل لا نہ ازلی ہے، نہ ابدی اور نہ مقدس۔ اقتضائے زمانہ کے مطابق ہی وہ مُدَوّن ہوئے اور تبدیل ہوئے۔ ترمیم یا تبدیلی سے انکار خود شریعت کے منشائے خلاف، مسلم سماج کے لئے نقصان دہ ہے۔ خود شاہ ولی اللہ دہلوی نے شریعت کے اسی مفہوم پر زور دیا ہے

۱۰۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں ان قدامت پرست علما کا اہم رول ہے جو مسلم متوسط طبقے کے بہ نسبت محنت کش عوام اور چھوٹی حیثیت کے لوگوں سے نزدیک اور اُنھی کے ابتدائی ترجمان تھے۔ سماجی نقطۂ نظر میں مصنف نے اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست پر علاحدہ سے کوئی مضمون نہیں لکھا تاہم فرقہ پرستی کا عالمانہ جائزہ لیتے وقت بعض ایسے نکتے اُٹھائے ہیں، اسی قدر متوازن رائے پیش کی ہے جو اس موضوع کی گئی تازہ تصنیفوں کی گرفت

میں نہیں آئی ـــــ یہ اس لئے کہ قرونِ وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ میں زیرِ زمیں بہروں اور گہری حقیقتوں کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا مرحوم ڈاکٹر محمد اشرف نے یہ بھاری پتھر اٹھایا تھا ـــ اب اصغر علی انجینئر اس کام کو آگے بڑھانے کی تیاری کر رہے ہیں۔

مضامین کا یہ مجموعہ محض علمی تحقیق نہیں، عملی اہمیت بھی رکھتا ہے کیوں کہ اس میں کم از کم تین مضامین کا آج کے ہندستانی ماحول اور مباحث سے گہرا اور براہِ راست تعلق ہے۔ غالباً انھی کی تحریک پر یہ سپردِ قلم بھی ہوئے "یک زوجگی" اور "بوہرہ بے چینی" کے سلسلے میں مجھے مصنف کی رائے اور لہجے دونوں سے واضح اختلافات ہیں جن کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ البتہ "پرسنل لا" کی تاریخ کا تسلسل دریافت کرنے میں مصنف نے جو دیدہ ریزی کی ہے، وہ قابلِ داد ہے اگرچہ انھیں داد کے بجائے بیداد ملنے کا اور خاص انھی مضامین پر شور اٹھنے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ یہی مقدر ہے ان

تمام دانشوروں کا، جو مقیدے کی ڈگر چھوڑ کر اپنی راہ تلاش کرنے نکلتے ہیں۔

یہ سطریں ایسے وقت پریس بھی جا رہی ہیں جب ہندستانی مسلمانوں کے نام پر کمائی ہوئی "اسلامی ریپبلک" پاکستان میں برِصغیر کے سب سے جوشیلے اور تعلیم یافتہ اور مولامنہ مسلم فرقے کو "غیر مسلم اقلیت" قرار دیا گیا ہے۔ آگے چل کر علمی تحقیق بتائے گی کہ اس مذہبی جنون کے پس پردہ کون کون سے مادی اور ذہنی مفاد کام کر رہے تھے مگر یہ افسوسناک واقعہ ایک تازیانہ ہے ان اہلِ علم اور اہلِ رائے حضرات کے لئے جو سمجھے بیٹھے تھے کہ عالمِ اسلام میں ذہنی وسعت اور بیداری کی تازہ لہر چل پڑی ہے۔ تیل کی سیاست کی کامیابی سے مسلمانوں میں مادی خود اعتمادی اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ اگر یوں ہے تو ہمیں مذہب، اعتقاد اور سائنسی جستجو کے درمیان پتھر ڈھونے ابھی باقی ہیں۔

وہ دُکھی تو میں کب سُکھی !

مولانا گرامی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ لاہور میں کسی دوست نے عقدِ ثانی کا مشورہ دیا، اور مولانا نکاح کر بیٹھے۔ چند دنوں کے بعد حرمِ اوّل یعنی محترمہ تُرکِ گرامی کو اطلاع ہوئی، وہ لاہور آ کر علامہ اقبال سے ملیں۔ علامہ نے اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ محترمہ اُن کے سامنے فرش پر بیٹھ گئیں اور کہا بیٹا اقبال! میں گرامی کی بدنصیب بیوی ہوں۔ اتنا کہا اور ہچکی بندھ گئی، علامہ نے اُن سے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ کوئی اولاد نہیں ہے اسلئے انہوں نے نکاحِ ثانی فرمایا ہے اور یہ شرعاً کوئی معیوب بات نہیں۔ اس پر تُرکِ گرامی نے جواب دیا: گرامی کے اگر اولاد نہیں تو میری بھی کہاں ہے۔ میں اس پیرانہ سالی میں کہاں جاؤں۔ علامہ نے اُن کو تسلی دے کر رخصت کیا اور خود گرامی سے جا کے ملے اور فرمایا، مولانا آپ جانتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عالمِ انسانیت پر کتنا احسان فرمایا ہے؟ گرامی بولے "حضرت اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے" علامہ نے پھر کہا کہ: یہ بھی آپ پوشیدہ نہیں کہ رحمتِ عالم نے صنفِ نازک کو کس قدر نوازا ہے، بولے فداہ ابی و امی، اس میں بھی کوئی شک نہیں، اس پر علامہ نے فرمایا: پھر خدا را بتائیے کہ بروزِ جزا آپ کی رفیقۂ حیات حضور کا دامن پکڑ کر فریاد کرے گی تو آپ کیا جواب دیں گے؟ مولانا کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے اور پھر قلم برداشتہ حرمِ ثانی کو طلاق لکھ کر بھجوا دی

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بنگال-اور بنگالی مسلمانوں کے مسائل

شمس صاحب کا حکم ہے کہ میں "گگن" کے مسلمان نمبر کے لئے بنگالی مسلمانوں کے مسائل اور اُن کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ مسلمانوں کے سلسلے میں کچھ لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے چونکہ "مسلم مسائل" کے سلسلے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہے اور پھر جب کبھی میں کسی "مسلم مسئلہ" کو لے کر سوچنے لگتا ہوں یا سوچنے کی کوشش کرتا ہوں تو ساتھ ساتھ "ہندو" بھی اُبھر آتے ہیں اور باوجود لاکھ جتن کے میں "مسلمان" اور "ہندو" دونوں کو جدا جدا نہیں کر پاتا۔ میں جتنا بھی غور کرتا ہوں، دونوں کے مسائل آپس میں آکر ایک ہی منزل پر مل جاتے ہیں۔ چاہے روٹی روزگار کا مسئلہ ہو، تعلیم کا مسئلہ ہو، گرانی یا قحط ہو، رہن سہن کا مسئلہ ہو، چاہے وہ مسئلہ سماجی ہو یا تہذیبی — سب اس طرح آپس میں آکر گلے مل جاتے ہیں کہ میں اُن کو الگ الگ کسی طور پر نہیں کر پاتا۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے ——— پھر میں خالص "مسلم مسائل" پر کیونکر لکھوں۔

میرے خیال سے ہندو مسلم عوام دونوں کے مسائل مشترکہ ہیں۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے سوال بنگال کے مسلمانوں کا ہو یا ہندوستان کے کسی اور صوبے کا ——— سب کو اسی سرزمین پر بسر کرنا ہے، اسی ملک کی تعمیر و ترقی، اسی ملک کی خوشحالی پر اُن کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ہندوستانی سماج نامی عمارت کے اہم ستون ہیں اور اگر ان میں سے کوئی ایک ستون بھی کمزور ہو تو سماج نامی عمارت دھڑام سے نیچے گر پڑے گی ——— بہرحال شمس کنول صاحب کے حکم کے مطابق بنگال کی تاریخی پس منظر میں جتنا بھی ممکن ہے ہندوؤں کے سلسلے میں کم کہتے ہوئے مسلمانوں کا ذکر خیر کرتا ہوں۔

علامہ اقبال نے کہا :-

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

سرسری نظر ڈالی جائے تو بات بھلی معلوم ہوتی ہے اور دل میں خوشی ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ چاہے مذہب بیر رکھنا سکھائے یا نہ سکھائے مذہب ہی بیر کی جڑ ہے۔ اور کسی مذہب کی تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے مذہب کی کمزوریاں بیان کی جائیں۔ اُس مذہب کو برا بھلا کہا جائے۔ مذہب تمام تر مشکلات اور تمام تر اختلافات کی جڑ ہے۔ دشمنی کی بنیاد مذہب نامی توی ہیکل بھوت پر ہے جو اکثر سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور اس طرح بولتا ہے کہ انسانیت کا خون کر دیتا ہے، گردن مروڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ہم جسے مذہب کہتے ہیں وہ صرف عبادت کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں ہے بلکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے لئے ان کا مذہب ایک مکمل تہذیب بن جاتا ہے جس تہذیب میں اس مذہب کو ماننے والوں کی زندگی بندھی ہوتی ہے۔ مذہب کا فلسفہ وہ ہے جس پر اس مذہب کے ماننے والوں کو عمل کرنے کی ہدایت ہے۔ روزمرہ کے مذہبی فرائض ہیں اور اس طرح مذہب زندگی کے ہر شعبے پر اپنا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ رسم و رواج کا ایک جال پھیلا ہوا ہے جس کے گورکھ دھندے میں مذہب کے ماننے والے بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں اور اس طرح سینکڑوں فرسودہ رسم و رواج کو اپنے کاندھے پر صدیوں سے لادتے چلے آ رہے ہیں۔ چونکہ ایک مذہب کے ماننے والے اس مذہب سے پیار کرتے ہیں۔ لہٰذا دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے (جن کو بھی اپنا اپنا مذہب پیارا ہے) اُن کے اختلافات بالکل فطری ہیں اور یہی اختلافات آپس میں

"بیر رکھنا" سکھاتے ہیں، لہٰذا عملی طور پر مذہب انسانی سماج کو تقسیم کرتا ہے، اختلافات پیدا کرتا ہے، بڑھاتا ہے۔ نفرت اور دشمنی کو ہوا دیتا ہے اور حقیقی معنوں میں بیر رکھنا سکھاتا ہے۔ چاہے یہ بات کتنی ہی تلخ کیوں نہ معلوم ہو لیکن یہ حقیقت ہے۔

آج سے نصف صدی قبل رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک مضمون "ہندو مسلمان" میں مذہب کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا ———— "جس ملک میں خاص کر مذہب کا بندھن ہی انسانوں کو باندھے رکھتا ہے، جہاں دیگر کوئی بندھن اُن کو ایک ساتھ نہیں رکھ پاتا، وہ ملک نہایت ہی بدقسمت ہے۔ اُس ملک میں مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہی اختلافات سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ درحقیقت "انسانیت" کا نام مذہب ہونا چاہیئے جہاں انسان کو بطور انسان ہی پہچانا جائے۔ جس ملک میں مذہب اس انسانیت پر چھا جائے اور انسانی عقل پر حملہ کرے، کیا اس ملک کو سیاست بچا سکتی ہے؟ تاریخ میں بار بار دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کسی عظیم قوم میں حیاتِ نو کی تعمیر کے لئے کوئی سیاسی انقلاب آیا ہے اس وقت اس انقلاب کے ساتھ ساتھ وہاں کے مذہبی خیالات اور اصولوں پر سخت چوٹیں پڑی ہیں۔ مذہب سے نفرت کے شعلے بھڑکے ہیں۔ انقلاب فرانس اس کی مثال ہے۔ سوویت روس بھی مذہبی فلسفہ اور اصولوں کا سخت مخالف ہے۔ حال میں اسپین میں بھی مذہب کے خلاف شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ میکسیکو کے انقلاب میں بار بار مذہب کے قلعے پر حملہ ہوا ہے۔ حالانکہ نئی ترکی میں مذہب کو ختم نہیں کیا گیا ہے پھر بھی سختی سے مذہب کی طاقت پر وار کیا گیا ہے اور مذہب کی طاقت بڑی حد تک ٹوٹ چکی ہے۔"

کارل مارکس کی باتوں کو غالباً آپ یہ کہہ کر اڑا دیں گے کہ وہ کمیونسٹ فلسفہ کا بانی ہے لیکن اتنا تو ماننے پڑے گا کہ مذہب کے نام پر ہی صدیوں سے انسان آپس میں لڑتے جھگڑتے آئے ہیں۔ مذہب کا نعرہ لگا کر، مذہب کی دہائی دے کر، مذہب کا سہارا لے کر قتل و خون کے دریا سب سے زیادہ بہائے گئے ہیں۔ مذہب نے ان کو "غازی" قرار دیا جو تلوار کے بل پر اپنے مخالف مذہب کے ماننے والوں کا خون بہا کے جہاد کیا ہے؟ صلیبی جنگ کی تاریخ آج کیا ہے؟ مذہب کے نام پر قتل و خون کی تاریخ ہی تو ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بھی مذہب کے نام پر خون کی ہولی بار بار کھیلی گئی ہے اور کھیلی جاتی ہے۔

بنگالی مسلمان کون ہے، پہلے اس کی تشریح ضروری ہے۔ عام طور پر کسی ملک کے سیاسی حدود ہمیشہ ایک نہیں رہتے۔ سرحدیں بدلتی ہیں۔ ملک بنگالہ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ مغل دور میں جس علاقے کو بنگالہ قرار دیا جاتا تھا، اُس میں صوبہ بہار، اور آسام کا بہت بڑا حصہ شامل تھا اس کے بعد بہار کا وجود عمل میں آیا۔ اور پھر ۱۹۰۵ء اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں ایک بار اور بنگال کی تقسیم عمل میں آئی۔ بہرحال اب ہم بنگالی مسلمان اُس کو کہتے ہیں جن کی مادری زبان بنگلہ ہے لیکن ان تمام کو بھی میں بنگالی مسلمان قرار دوں گا جو دو تین پشت سے سرزمینِ بنگال پر آ کر بس گئے ہیں۔ چاہے اُن کا آبائی وطن، دِلّی، اُتر پردیش یا بہار وغیرہ کیوں نہ رہا ہو لیکن وہ لوگ تجارت یا ملازمت یعنی روٹی روزگار کے سلسلے میں یہاں چلے آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہزاروں ایسے ہیں جن کے دادا پردادا باہر سے آئے تھے اور اُن کی موجودہ نسل نے کبھی اُن کے دادا پردادا کی سرزمین نہیں دیکھی ہے لہٰذا وہ بھی بنگالی ہیں اور ان کے مستقبل کا دار و مدار اِسی سرزمین کی خوشحالی ہی سے وابستہ ہے۔

ہندوستان کے دیگر کسی بھی ریاست سے بنگال (غیر تقسیم شدہ) میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل والے بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۵ فیصدی سے زیادہ رہی ہے اور آج جسے ہم مغربی (ہندوستان کا بنگال) کہتے ہیں اُس کی کل آبادی میں جہاں تقریباً ۳½ کروڑ ہندو ہیں وہاں لگ بھگ ایک کروڑ مسلمان ہیں[1] لہٰذا یہ صاف ہے کہ چاہے کھیتی باڑی ہو، تجارت ہو، ملازمت ہو، بنگلہ ادب یا تہذیب ہو یا بنگال کی سیاست، ایک لفظ میں بنگال کی زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔[2]

بنگال کی سیاسی قسمت ہندوستان کے دیگر صوبوں سے نرالی ہے۔ مسلمانوں کیلئے ایک "سرزمین" چاہیئے کا سوال لگ بھگ ۱۹۳۰ء میں سننے میں آیا لیکن یہ "سرزمین" کہاں ہوگی کا کسی کو علم نہیں تھا۔ لفظ "پاکستان" پہلے پہل مغربی حصے کے لئے ہی سننے میں آیا حتٰی کہ ۱۹۴۰ء کی لاہور کانفرنس میں بھی مسلم لیگ نے صاف الفاظ میں مسلمانوں کی سرزمین کا نقشہ پیش نہیں کیا اور نہ ہی لفظ "پاکستان" کا کہیں استعمال ہوا ہے۔ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو پر یہ واضح ہوا کہ

---

[1] ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق مغربی بنگال میں ۳ کروڑ ۴۹ لاکھ ۲۶ ہزار ۲۷۹ ہندو جن میں غیر بنگالی ہندو بھی شامل ہیں اور ۹۲,۶۴,۳۳۸ مسلمان ہیں۔ شمس۔ لسمی

[2] بنگلہ ادب میں مسلمانوں کا حصہ کیا ہے دیکھنے کیلئے میری تصنیف "مختصر تاریخ بنگلہ ادب" دیکھئے۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ مظفر۔ د

مسلم لیگ پاکستان چاہتی ہے اور اس پاکستان میں مکمل بنگال شامل ہوگا۔

۱۸۸۵ء میں جب کانگریس قائم ہوئی تب ہندو اور مسلمان ایک ہی پلاٹ فارم پر تھے اور دونوں مل کر ہی آزادی کی راہ پر آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ اگر جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شکست سے ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اسی بنگال کی سرزمین پر جمے تھے تو پھر آزادی کی جنگ کے سلسلے میں بھی بنگال ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے آگے رہا اور تحریک آزادی کی بنا بھی یہیں پڑی اور بنگالیوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ چالاک انگریز یہ سمجھ چکے تھے کہ بنگال کو کمزور کئے بغیر وہ ہندوستان میں ٹک نہیں سکتے لہذا ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کا پہلا قدم انگریزوں نے اٹھایا۔ لیکن اس زمانے تک بنگالی مسلمانوں کو انگریز ہندوؤں سے الگ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقسیم بنگال کے خلاف جو تحریک چلی تھی اس کے رہنماؤں میں اگر ہندوؤں میں سریندر ناتھ تھے تو ان کے ہمقدم عبدالرسول[1] بھی تھے۔ اگر اشنی دت بڑھے تو لیاقت حسین[2] نے ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر آزادی کا پرچم بلند کیا اور انگریزوں کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔

ہندو مسلم اتحاد کی کئی انمول مثالیں ہم تاریخ کے صفحات سے پیش کر سکتے ہیں۔ دونوں تہذیبوں کا ملاپ بھی کئی میدانوں میں ہوا ہے۔ ایک نے دوسرے پر اثر ڈالا اور اثر قبول کیا۔ نہ ہندو قدیم ویدک ہندو رہے اور نہ مسلمان عرب کے مسلمان۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ امر اپنی جگہ آج بھی درست ہے کہ لاکھوں ٹھوکریں کھانے کے باوجود ہم سنبھل نہیں پائے

خیر ——— ان دنوں انگریزوں سے یہ فوری طور پر ممکن نہیں ہوا کہ وہ بنگال مسلمانوں کو بنگالی ہندوؤں سے دور ہٹا لیں۔ لیکن انگریز تھک ہار کر بیٹھ نہیں گئے۔ وہ اپنے ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے۔ بنگال کی جنگ آزادی میں اس کے بعد جب "انوشیلن پارٹی" اور "جوگانتر گروپ" کا دور آیا اور سیکڑوں نوجوان انقلابی آگے بڑھے تو انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سرمایہ دار بھی کانپ اٹھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان انقلابیوں میں زیادہ تر ہندو آگے آگے رہے ہیں مثلاً کھودی رام، پرپھولیہ چاکی، ستن بوس، کنائی دت، بپن گھوش، پلاش داس اور بعد میں بی نیئے، بادل اور دنیش وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب انقلابی تحریک کے رہنما تھے۔ مسلمانوں میں ہمیں اس طرح کے بڑا کو انقلابیوں کا نام نہیں ملتا۔ بنگال کے مسلمانوں میں صرف تی تو میر ایک مسلم نام ہے جو نہایت بہادر بھی تھا اور انگریز دشمن بھی تھا لیکن انگریزوں کا منصوبہ تی تو میر کا کچھ بھی تعلق نہیں۔ دراصل وہ ایک ڈاکو تھا۔ ان ہندو انقلابیوں کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھ ایک سنہرا موقع آیا کہ وہ مسلمانوں کو دکھائیں کہ دیکھو تمام رہنما ہندو ہیں۔ تعلیمی میدان میں بھی ہندو آگے تھے۔ دونہ صرف

---

[1] عبدالرسول، بنگال کے ایک نامی گرامی بیرسٹر رہے ہیں

[2] تقسیم بنگال کے خلاف جدوجہد کرنے والے رہنماؤں میں مولوی لیاقت حسین کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے ۱۶ اور ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگال کے خلاف پورے بنگال میں تحریک اپنے شباب پر تھی ان دنوں مولوی لیاقت حسین خود ہزاروں والنٹیئرز کے ساتھ جلوس میں آگے آگے، رابندر ناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا ترانہ "بنگ لار ماٹی، بنگ لار جل" (بنگال کی مٹی، بنگال کا جل) گاتے ہوئے کلکتہ کے پارسی بگان میدان میں حاضر ہوئے اور اطراف سے ہزاروں لوگوں نے ان کی جئے جئے کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ان کو خوش آمدید کہا تھا۔ مادرِ وطن کے چاہنے والے میں ان کی مثال ملنا دشوار ہے۔ شری نارائن بندو پدھائے نے اپنی تصنیف "راہِ انقلاب" میں مولوی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔" ان دنوں پورے ملک میں کہیں کوئی تحریک نہیں تھی۔ اطراف میں جیسے سناٹا تھا۔ صرف مولوی لیاقت حسین تھے جو ہر روز شام کو اسکول کے طلبہ کی ایک ٹولی لے کر راستے راستے چندہ کرتے پھرتے تھے۔ Poor Student Fund لڑکوں کی یہ ٹولی وطن پرست ترانے گاتے گاتے آگے بڑھتی۔ دو چار راہ گیر بھی ساتھ ہو جاتے۔ راستے میں کوئی پولیس چوکی پڑنے پر مولوی صاحب "بندے ماترم" کا نعرہ لگاتے ہوئے اس پولیس اسٹیشن میں گھس جاتے اور پولیس کے ہندوستانی سپاہیوں اور افسروں سے بھی کچھ نہ کچھ چندہ لے کر ہی آتے۔ اور ان سے کہتے "تم لوگ بھی ہندوستانی ہو" اس کاز میں تم لوگ کیوں نہیں چندہ دوگے۔"

[3] اپریل ۱۹۱۱ء میں کلکتہ میں کانگریس کا جو خاص اجلاس ہوا تھا اس کے ایجنڈے میں تین باتیں تھیں جن میں سے دو کا تعلق مولوی لیاقت حسین سے تھا یعنی پہلا مولوی لیاقت حسین کی خدمات کا اعتراف اور دوسرا مولوی لیاقت حسین قحط فنڈ ——— اس اجلاس میں مولوی صاحب خود موجود نہ ہو سکے۔ چونکہ ان دنوں وہ ضلع بری شال کی جیل میں قیدی تھے۔ افسوس کہ اس مہان دلیر مجاہد کے سلسلہ میں تاریخ آزادی کے صفحات تقریباً خاموش ہیں اور ہم ان کی حالات زندگی سے آگاہ نہیں ہیں۔ اغلباً ۱۹۳۰ء میں مولوی صاحب

بنگال میں بلکہ پورے ہندستان میں) ہندا مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ حوف بیدار کرنا انگریزوں کے لئے آسان رہا ہے کہ تم لوگوں کا مقام کہاں ؟ انگریزی حکومت نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو زیادہ سہولتیں عطا کرنے کا ایک پلان بنایا۔ بڑے لاٹ صاحب نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کے لئے جداگانہ الیکشن اور اس طرح بنگال اسمبلی میں ان کی اکثریت میں آنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کا لالچ دیا۔ مشرقی بنگال کے زیادہ تر کاشت کار حالانکہ بنگالی مسلمان تھے لیکن وہاں کے زمیندار زیادہ تر ہندو تھے۔ کسانوں میں زمینداروں سے نفرت کا جذبہ ہوتا ہی ہے۔ چونکہ یہ طبقاتی کشمکش کا سوال ہے لیکن اسے طبقاتی جنگ کے بدلے ہندو مسلمان جنگ میں بدل دیا گیا اور اس طرح نفرت کی آگ بھڑکائی جا سکی۔ ہندو انقلابی رہنماؤں میں سے کئی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا اور باقی کو لمبی لمبی سزائیں دے کر جیل خانوں میں بھر دیا گیا۔ دوسری طرف بنگال کی اہمیت کو کم کرنے اور بنگال کو کمزور کرنے کے لئے کلکتہ کے بدلے (۱۹۱۲ء) دہلی کو انگریزوں نے پایۂ تخت قرار دیا۔ دارالسلطنت کی اس تبدیلی سے کلکتہ کی اہمیت گھٹ گئی اور مرکز پر بنگال کا جو اثر تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

لیکن پھر بھی بنگال کے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہی رہے۔ اب جو دو نئے مسلم رہنما افقِ بنگال پر ابھرے وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد[1] اور اے۔ کے فضل الحق[2]۔ مولانا آزاد تو ہمیشہ ہی فرقہ پرستی سے دور رہے ہیں لیکن فضل الحق کو بھی فرقہ پرست قرار دینا مشکل ہے۔ اُن کو بڑی مشکل سے مسلم لیگ نے اپنایا۔ ۱۹۳۵ء کے انتخابات میں بنگال اسمبلی میں کانگریس کے ۴۵ اور مسلم لیگ کے ۳۹ نمائندے تھے جبکہ کل مسلمان ممبران کی تعداد ۱۱۷ تھی۔ باقی مسلم نمائندے فضل الحق کی کرشک پرجا پارٹی کے نمائندے تھے

ضلع باقیشال میں پیدا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ آپ اپنی مادری زبان بنگلہ کے علاوہ انگریزی اردو اور فارسی بھی اچھی جانتے تھے۔ آپ کا نہایت مختصر ذکر شری نرہری کوبراج کی بنگلہ تصنیف "جدوجہد آزادی میں بنگال" کے علاوہ مغربی بنگال مسلم ریسرچ سوسائٹی کے ایڈیٹر جناب ایم عبدالرحمن صاحب نے اپنی تصنیف (Muslim freedom fighters of India) کے حصے سوم میں بھی کیا ہے۔

تی تومیر۔ ۱۷۸۲ء تا ۱۸۳۱ء بنگال کا ایک نامور ڈاکو جو لاٹھی گھمانے میں ماہر استادِ فن تھا۔ وہ ضلع ۲۴ پرگنہ مغربی بنگال میں پیدا ہوا۔ وہ انگریزوں پر خوب حملے کرتا تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنگ نے اس کے خلاف فوج بھیجی اور

اور دو چار آزاد ممبر بھی تھے۔ حالانکہ کرشک پرجا پارٹی والے بھی مسلمان تھے لیکن وہ مسلم لیگی نہیں تھے اور یہی پارٹی فضل الحق کی طاقت تھی۔ فضل الحق مسلم لیگ کی فرقہ پرستی سے نالاں تھے اور لیگ سے بہت زیادہ وہ انگریزوں کے دشمن تھے۔ ان کو کسانوں سے واقعی لگاؤ تھا۔ انھوں نے کسانوں کی بھلائی کے لئے چند قابلِ ذکر اقدامات کئے تھے۔ مثلاً پاٹ (پٹسن) کی قیمت کا مقرر کر دینا، مہاجن اور ساہوکار سے کسانوں کو بچانے کے لئے سود وغیرہ مقرر کر دینا، بھاری صنعتوں کا قیام، مزدوروں کی مزدوری مقرر کرنے کا قانون وغیرہ، چند ایسے اقدامات ہیں جن سے انگریز ان سے نالاں ہو گئے۔ محمد علی جناح چاہتے تھے کہ لیگ اُن کے اشارے پر چلے۔ لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں سہروردی کو اہم مقام حاصل تھا۔ لہذا اکثر لیگ کے نمائندے بڑے زمیندار یا رئیس تھے مثلاً نواب ڈھاکہ سر ناظم الدین اور نواب فاروقی وغیرہ۔ ۲ستمبر ۱۹۳۶ء کو پردیش کانگریس کمیٹی کے ہیڈ کوارٹر پر رہنما تریپورہ کے مولوی اشرف الدین چودھری نے یہ مشورہ دیا تھا کہ مشترکہ طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی اشرف الدین احمد کی تجویز ایک ترقی پسند اور حق بجانب تجویز تھی کل ہند کانگریسی رہنماؤں کو بھی اس کے معقول ہونے میں کوئی وہم و گمان نہیں تھا لیکن اُن میں چند کا خیال تھا کہ ایسے اہم مسئلہ پر جو کل ہند مسئلہ ہے اور جس کے فیصلے کا حق کل ہند کانگریس ہی کو ہے۔ وہ صرف پردیش کانگریس والے کریں تو یہ کل ہند کانگریس کے خلاف ہوگا۔ ہندا جواہر لال نہرو نے شرت چندر بوس سے سوال و جواب کرنا شروع کر دیا اور اسی جھگڑے کی وجہ سے بنگال میں مشترکہ وزارت کا مسئلہ ٹھپ ہو کر رہ گیا اور مرکزی کانگریس نے

کپتان کرنل صاحب سے جنگ میں بمقام نرکل باڑیا جب فوج نے اس کے بانس کے قلعے میں آگ لگا دی تب ایک کان کے گولے سے گھائل ہو کر تی تومیر چل بسا۔

[1] مولانا ابوالکلام آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

[2] فضل الحق :- پورا نام ابوالقاسم فضل الحق۔ پیدائش بمقام بریسال مشرقی بنگال ۱۸۷۳ء ایم۔ اے۔ بی۔ ایل سے کامیابی کے بعد وہ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے تھے بعد میں (۱۹۰۳ء) کانگریس میں شامل ہوئے۔ آپ کانگریس کے سکریٹری بھی رہے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس میں بھی شریک رہے۔ کلکتہ کارپوریشن کے میئر (۱۹۳۵ء) بھی بنے اور پھر کل ہند

اس طرح فضل الحق کو کھو دیا۔ اور فضل الحق مجبوراً مسلم لیگ کی طرف جھک گئے
دسمبر ۱۹۴۱ء میں اچانک لیگی وزراء نے استعفیٰ دے دیئے اور حق وزارت مشکل میں پڑ گئی۔ تب فضل الحق نے شیاما پرساد مکرجی، پرمتھ ناتھ بند وپادھیائے وغیرہ کو لے کر نئی وزارت قائم کی جس وزارت کو شرت چندر بوس کا تعاون حاصل تھا۔ ان حالات کے تحت فضل الحق کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کانگریس کی مخالفت کریں۔ اس بات کو مدّ نظر رکھ کر انگریزی حکومت نے مئی ۱۹۴۲ء میں حق صاحب کو کناڈا یا آسٹریلیا میں ہائی کمشنر بنا کر بنگال سے ہٹا دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ۱۷ جولائی کو بڑے لاٹ صاحب نے گورنر بنگال مسٹر ہاربرٹ کو لکھا کہ حق صاحب کو سمجھا بجھا کر گاندھی جی کے خلاف ایک بیان دینے کے لئے راضی کرو۔ لیکن حق صاحب اس کے لئے راضی نہیں ہوئے اور ۲۳ جولائی کو ہاربرٹ نے اپنی ناکامی کا جواب دہلی بھیج دیا۔ لہٰذا اب فضل الحق کو راستے سے ہٹانا، انگریزوں اور مسٹر جناح کے لئے ضروری ہو گیا تا کہ حق کی طاقت بنگال پر برقرار نہ رہ سکے۔ اس کے بعد حق۔ جناح خط و کتابت کا دور شروع ہوا۔ آخر کار فضل الحق کے لئے اتنی مشکلیں پیدا کر دی گئیں کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہونے پر تیار ہو گئے۔ لیکن جناح سے انھوں نے اپنے خطوط میں مطالبہ کیا کہ بنگال کا وزیر اعلیٰ کون ہوگا اس کا فیصلہ بنگال اسمبلی کے اراکین کریں گے۔ مسٹر جناح اس تجویز پر راضی نہیں ہوئے اور خواجہ ناظم الدین و سہروردی کو انھوں نے بنگال میں مسلم لیگ کو پروان چڑھانے کے لئے پورے زور و شور سے کام کرنے کا حکم دیا۔ مارچ ۱۹۴۳ء کے انتخابات میں کاؤنسل کے چھ سیٹ پر ہی لیگ نے قبضہ کر لیا۔ اس سیاسی حالت کے مدّ نظر فضل الحق نے کہا کہ جب قومی حکومت قائم ہو جائے گی تو وہ استعفیٰ دے دیں گے لیکن ۲۸ مارچ کو مسٹر ہاربرٹ نے ان کو گورنر ہاؤس میں بلا کر ایک طرح زبردستی ان سے استعفیٰ لے لیا۔ ۲۹ مارچ کو بنگال اسمبلی میں فضل الحق

نے یہ اعلان کیا کہ اسپیکر نے نئی وزارت کے قائم ہونے تک اسمبلی کو ملتوی کر دیا اور گورنر نے حکومت اپنے ہاتھوں لے لی۔ لیکن قومی حکومت قائم کرنے کے بجائے گورنر نے خواجہ ناظم الدین کو ایک ماہ کے عرصہ ہی میں لیگ وزارت قائم کرنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد ہی پہلے ناظم الدین اور پھر سہروردی کے عہد میں بنگال بھر میں فرقہ وارانہ فسادات نے زور پکڑا اور ساتھ ہی صوبے بھر میں قحط پڑا۔ بنگال کے اس قحط سے کتنے لوگ مرے اس کا درست اندازہ آج تک نہیں لگایا جا سکا۔

اس کے بعد سیاسی حالات نہایت تیزی سے بدلے۔ ۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۵ء زیادہ تر کانگریسی رہنما جیل میں تھے جس کا لیگ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران بنگال میں خواجہ ناظم الدین اور سہروردی گروپ کے اختلافات پروان چڑھے اور خواجہ ناظم الدین، لیگ کے رہنماؤں (محمد علی جناح، لیاقت علی) سے مشورہ کر کے کئی اراکین اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر سہروردی کو ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد جب پھر سے لیگ کو مشترکہ وزارت کے سلسلے میں سوچنا پڑا تب مجلس قانون ساز کے انتخابات میں سہروردی نے ناظم الدین کو ہرا دیا اور اس طرح وہ لیگ کے صدر ہو گئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں کرن شنکر رائے اور مولانا آزاد سے مشورہ لیا تھا۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ فضل الحق اسپیکر ہوں لیکن سہروردی اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

۱۶ اگست کو لیگ کی جانب سے Direct action "راست اقدام" کا نعرہ بلند کیا گیا جس کے نتیجہ میں تین دن تک کلکتہ میں دن رات فرقہ وارانہ فساد ہوا اور یہ شہر انسانی خون میں ڈوب گیا۔ اس خون کے دریا کو بہانے کی بڑی حد تک ذمہ داری خواجہ ناظم الدین اور انگریزی حکومت پر ہے۔ ناظم الدین کا مقصد صاف تھا وہ چاہتے تھے ہندوؤں کا قتل عام کر کے اس کی پوری ذمہ داری سہروردی پر ڈال دیں اور اس طرح سہروردی کو اپنے راستے سے ہٹا دیں

مسلم لیگ کے صدر بھی۔ متحدہ بنگال کے ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۳ء آپ وزیر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ نے کرشک پرجا (کسان مزدور) پارٹی کے نام سے ایک پارٹی قائم کی تھی۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد آپ پھر مسلم لیگ سے ہٹ گئے تھے اور ۱۹۵۴ء کے انتخابات میں مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کو شکست دے کر انھوں نے عوامی حکومت قائم کی تھی لیکن ان کی حکومت کو غیر قانونی قرار دے کر کئی وزراء کو سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا اور اس کے بعد فضل الحق سیاسی زندگی سے ہمیشہ کے لئے ہٹ گئے۔

۱؎ ایچ۔ ایس۔ سہروردی یا حسین شہید سہروردی کا خاندان کلکتہ کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان رہا ہے اس خاندان میں مولانا عبید اللہ عبیدی جیسے عربی، فارسی اور اردو کے عالم اور اردو و فارسی کا شاعر پیدا ہوا۔ محترمہ خجستہ اختر بانو، مولانا عبیدی کی دختر نیک اور شائستہ اختر، سر حسان سہروردی کی صاحبزادی دونوں کی اردو خدمات بھی کم نہیں ہیں۔ ان کی کئی تصانیف موجود ہیں۔ حسین شہید سہروردی مقام ڈھاکہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے مسلمان (۱۹۴۰ء) وائس چانسلر ہوئے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں یونیورسٹی کانگریس کے نمائندے ہو کر آپ انگلستان گئے تھے

ساتھ ہی اُنھوں نے انگریز افسران کی مدد سے فضل الحق کے خلاف بھی عدم اعتماد کی تجویز رکھی تھی۔

بہرحال ۱۹۴۷ء آگیا۔ وہ سال جو برِ اعظم ہندوستان کے لئے سب سے بدبخت سال نکلا۔ یکم مئی کو جواہر لال نہرو نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے صاف کہا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم عمل میں لائی جائے تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم لازمی ہے۔ اس زمانے میں بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو دونوں ہی یہ نہیں چاہتے تھے کہ بنگال کی تقسیم عمل میں آئے۔ سہروردی نے ان دنوں آزاد بنگال کی ایک تجویز رکھی تھی اور شرت چندر بوس نے بھی اُسی تجویز کی طرح ایک اور تجویز رکھی تھی یعنی دونوں چاہتے تھے کہ بنگال آزاد ملک بن جائے لیکن گاندھی جی کی موجودگی میں سہروردی اور بوس کی جو گفتگو ہوئی وہ آگے نہ بڑھ سکی۔ چونکہ مرکزی کانگریس "آزاد بنگال" کے خلاف تھی کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق "آزاد بنگال" محمد علی جناح کے کہنے پر نہیں چلے گا ——— اور آخرکار بنگال تقسیم ہو کر ہی رہا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء وہ دن ہے جس دن بنگالی قوم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ہندوستانی بنگالی بنا اور دوسرا پاکستانی بنگالی۔ یہاں سے دو بنگال کی کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ بنگالی مسلمان اُدھر بھی تھے اور اِدھر بھی۔ لیکن فرق یہ تھا کہ اُدھر مسلمان اکثریت میں تھے اِدھر ہندو ——— اور گزشتہ ۲۵ سالوں میں بار بار جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اس سے دونوں طرف کی اکثریت میں مزید اضافہ ہوا اور اقلیت میں اور کمی ہو گئی۔

لیکن کیا اس سے مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو گیا؟ نہیں ہوا۔ چونکہ مسلمانوں کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں تھا اور نہ آج یہ مذہبی مسئلہ ہے۔ اگر یہ محض مذہبی مسئلہ ہوتا تو تقسیم کے بعد اس کا حل ہو جاتا۔ اگر صرف ایک مذہب کا ہونا اتحاد کی جڑ ہوتی تو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان یعنی بنگالی مسلمان اور غیر بنگالی مسلمانوں میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوتا اور آج مشرقی بنگال، پاکستان سے کٹ کر آزاد بنگلہ دیش نہ بن جاتا۔ آزادی کے ۲۵ سال بعد سہروردی کا تجویز کردہ آزاد بنگلہ دیش نہ ہوتا حالانکہ آج ایک ہندوستان کے تین ٹکڑے ہو چکے ہیں اور آزاد بنگلہ دیش بنا ہے

لیکن یہ آزاد بنگلہ دیش سہروردی کا بنگال نہیں ہے۔ چونکہ ان کے منصوبہ میں مغربی بنگال بھی شامل تھا۔ گزشتہ ۲۵ سال میں ہندوستان کے تین ٹکڑے ہو گئے ہیں لیکن آج بھی بنگال دو ہی ہیں۔ مشرقی بنگال، جو ایک بالکل آزاد خود مختار ملک ہے اور مغربی بنگال نہ آزاد ہے، نہ خود مختار ہے اور نہ ہی ایک ملک ہے بلکہ وہ آزاد ہندوستان کا ایک حصہ ہے، ایک ریاست ہے۔ آج سے ۲۵ سال قبل دو بنگال کہنے پر ایک کا تصور ہندوستانی ریاست اور دوسرے کا تصور پاکستانی ریاست کے طور پر اُبھرتا لیکن آج دو بنگال کے معنی ہیں مغربی بنگال اور آزاد بنگلہ دیش۔ آپ شاید کہیں کہ بنگلہ دیش کو آزاد کرانے میں ہندوستان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ درست ہے، بجا ہے۔ ہندوستان نے بنگلہ دیش کی آزادی کے سلسلے میں ہر طرح مدد کی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آزادی دی نہیں جاتی بلکہ حاصل کی جاتی ہے اور اگر مشرقی بنگال کے عوام آزادی کے خواہاں نہ ہوتے تو کیا ہندوستان اُن کو آزادی تحفہ کے طور پر پیش کر سکتا تھا؟ ٹھیک یہی سوال آپ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سلسلے میں کر کے دیکھئے ——— اگر ہندوستانی آزادی کے لئے جدوجہد نہ کرتے، قربانیاں نہ دیتے تو کیا انگریز ہندوستان کو آزادی بخش دیتا۔؟ کوئی بیرونی طاقت آزادی بخش نہیں دیتی، جب تک کہ خود اس ملک کے لوگ آزادی کے لئے دل و جان سے جدوجہد نہ کریں۔ مشرقی بنگال کی یہ آزادی ایک اعلان تو ہے جو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ رہا ہے کہ مذہب مختلف مذہب کے ماننے والوں میں میل ملاپ کو بڑھانا تو دور کی بات ہے بلکہ خود ایک مذہب کے ماننے والوں کو بھی وہ اپنے جال میں طویل عرصہ تک قید کے طور پر نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ بات آج سورج کی طرح روشن ہے اور کوئی عقل کا اندھا ہی اس سے انکار کر سکتا ہے

اب جب بنگلہ دیش بن گیا تو پھر بنگالی مسلمان کا مسئلہ کیا ہے؟

پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ بنگالی مسلمان کہنے سے صرف بنگلہ دیش کے مسلمان نہیں بلکہ مغربی بنگال میں بھی بنگالی مسلمان ہیں اور پھر میں ان مسلمانوں کو بھی بنگالی مسلمان ہی تسلیم کرتا ہوں جو بنگال میں ہمیشہ کے لئے آ کر بس گئے ہیں یعنی بنگالی مسلمان

خواجہ ناظم الدین۔ ولادت ۱۸۹۴ء متحدہ بنگال کے محکمۂ تعلیم اور پھر محکمہ داخلہ کے سکریٹری تھے۔ بعد میں وزیرِ اعلیٰ بھی بنے۔ آپ نے علی گڑھ اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ متحدہ بنگال مسلم لیگ کے صدر بھی ہوئے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد پہلے مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ اور پھر (۱۹۵۱ء) پورے پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے۔ عرصہ دس سال تک آپ کلکتہ کے محمڈن اسپورٹنگ کلب کے صدر بھی رہے۔ ش۔ ر

انسان جب ڈرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو مذہب کے تابع کر لیتا ہے ۔ ٹیگور

تین طرح کے ہیں۔ ایک بنگلہ دیش کے بنگالی مسلمان، دوسرے مغربی بنگال کے بنگلہ زبان والے مسلمان اور تیسرے مغربی بنگال اور بنگلہ دیش کے غیر بنگلہ زبان والے مسلمان ـــــ اور ان تمام کے مسائل کو ہی میں "مسلمانوں کا مسئلہ" تسلیم کرتا ہوں۔

جب بنگالی مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے تب ظاہر ہے کہ اُن تینوں کے مسائل بھی جدا جدا ہیں۔ بنگلہ دیش کے بنگالی مسلمان اور مغربی بنگال کے بنگالی مسلمانوں میں چند باتیں مشترک ہیں۔ ان دونوں کی مادری زبان ایک ہے، ادبی ورثہ ایک ہے، بہت بڑی حد تک (مقامی رسم و رواج کے علاوہ) اُن کی تہذیب بھی ایک ہے۔ لیکن بنیادی فرق یہی ہے کہ دونوں کو دو مختلف سیاسی ماحول دو الگ الگ ملک میں رہ کر اپنے دن گزارنے پڑتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں وہاں کے بنگالی مسلمان اکثریت اور بھاری اکثریت میں ہیں اور مغربی بنگال کے بنگالی مسلمان یہاں کی سب سے بڑی اقلیت ہے۔ لہٰذا اکثریت اور اقلیت کے جو مسائل ہمارے سماجی ڈھانچے میں ہیں وہ موجود ہیں اگر بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو صرف یہ کوشش کرنی ہے کہ وہاں کے ہندو جو اقلیت میں ہیں (اندازاً لگ بھگ ۸۵ لاکھ ہندو آزاد بنگلہ دیش میں ہیں) اُن سے اُن کے تعلقات کیونکر خوشگوار ہوں تو مغربی بنگال کے مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی ہے کہ کس طرح وہ یہاں کی اکثریت (بنگالی ہندوؤں) سے اپنے بہتر تعلقات کو پروان چڑھائیں یعنی ان دونوں کے مسائل اس نقطۂ نظر سے جدا گانہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ زبان تہذیبی زندگی کا ایک اہم ستون ہے اور اس میں اتحاد پیدا کرنے کی بڑی قوت ہے جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ مشرقی بنگال میں بنگلہ زبان نے وہاں کی جنگ آزادی میں بنگالیوں کو متحد کرنے میں بڑا نمایاں کام انجام دیا ہے اور ایک طرح سے جنگ آزادی میں بنگلہ زبان کا مسئلہ ہی نہایت اہم رہا ہے۔ چونکہ جب اردو کو مشرقی بنگال کے بنگالیوں پر لاد دیا گیا تب بنگالی مسلمان اپنی زبان اور حقوق کی حفاظت کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے اور زبان کی جد و جہد سے کر آزادی کی جد و جہد تک پہونچے لیکن زبان ہی اتحاد کی واحد شئے نہیں ہے۔ چونکہ ہم ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں کہ لسانی ریاستوں کے قیام کے بعد آندھرا پردیش میں ایک تحریک "تلنگانہ تحریک" کے نام پر اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور اس تحریک سے وابستہ لوگ "علاحدہ تلنگانہ ریاست" کے حق میں ہیں حالانکہ تلنگانہ اور آندھرا دونوں علاقوں کی زبان تیلگو ہی ہے یعنی زبان ایک ہونے پر بھی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اور اُس اختلافات

کی اصل جڑ ہے معاشی غیر مساوات۔ لہٰذا اصل مسئلہ معاشی ہے، روٹی روزگار کا ہے، ترقی کی مساوی سہولتوں کا ہے۔ سیاست کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا اور نہ صرف کسی سیاسی پلاٹ فارم سے ایک قرار داد منظور کر دینے پر کوئی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ چونکہ سیاست میں "پارٹی مفاد" شامل ہوتے ہیں لہٰذا سیاست، ہندو یا مسلم مسائل کو صرف کوئی قرار داد پاس کرکے یا قانون بنا کر حل نہیں کر سکتی بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سیاست نئے نئے مسائل کو پیدا کرتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں اردو زبان کا مسئلہ ہمیشہ الکشن کے دنوں میں اتر پردیش اور بہار وغیرہ میں خاص اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک کے بعد دیگرے انتخابات ہوتے جاتے ہیں اور اردو کا مسئلہ "مسئلہ" ہی بنا رہ جاتا ہے اور سیاسی جماعتیں اس مسئلہ کو لے کر الیکشن کے میدان میں خوب اُچھل کود کرتی ہیں۔

مغربی بنگال کے غیر بنگلہ زبان والے بنگالی مسلمانوں کا مسئلہ سب سے زیادہ نازک ہے۔ بنگالی مسلمانوں اور بنگالی ہندوؤں میں اتحاد کا ایک ذریعہ مشترکہ مادری زبان بنگلہ ہے لیکن غیر بنگلہ زبان بولنے والے مسلمانوں کا دامن اس سہارے سے بھی خالی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مغربی بنگال میں ایک تو مسلمان ہی اقلیت میں ہیں اور اس پر غیر بنگلہ زبان والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے یعنی کوئی ۱۰ تا ۱۲ لاکھ ہیں اور ان میں کوئی ۳، ۴ لاکھ ایسے ہیں جو بنگال ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ باقی مسلمانوں میں سے زیادہ تر کا ابھی تک اُن کے آبائی وطن سے تعلق برقرار ہے اور وہ لوگ وطن آتے جاتے رہتے ہیں۔ تین چار لاکھ مسلمان جو یہاں کے ہو کر رہ گئے ہیں ان کی زبان اور تہذیب پر بنگلہ زبان اور تہذیب کے اثرات نے کچھ ایسا اثر ڈالا ہے کہ اُن کا ایک ادبی "طبقہ" وجود میں آگیا ہے جس طبقہ کی کچھ مخصوص خصوصیات ہیں۔ ان کی زبان کو باہر کے مسلمان "کلکتوی اُردو" کہتے ہیں۔[1]

غیر بنگلہ بولنے والے مسلمان زیادہ تر شہر کلکتہ اور اطراف کلکتہ کے صنعتی علاقوں میں آباد ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے حال ہی میں شری جوگ ناتھ مکھرجی نے (بنگلہ ہفتہ وار "امرت" مورخہ ۸ستمبر ۱۹۷۲ء) لکھا ہے ـــــ "کلکتہ میں اردو والوں کی آبادی تقریباً سات لاکھ ہے۔ دیگر ریاستوں سے جو لوگ یہاں

[1] جناب ابراہیم ہوش جو بنگال کے ایک ترقی پسند شاعر ہونے کے علاوہ روزنامہ "آبشار" کلکتہ کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ خاص کلکتہ کے باشندے ہیں اور کلکتوی اردو کے ایک نامور شاعر ہیں۔ کلکتوی اردو میں انھوں نے جو غزلیں اور نظمیں وغیرہ کہی ہیں اُس کا ایک مجموعہ بنام "جندگی کا میلہ" چند سال پہلے منظر عام پر آچکا ہے۔

آکر آباد ہو گئے ہیں ان میں اُردو والوں کی حالت سب سے خراب ہے۔ مٹیا برج، کھضر پور، جیت پور، بہو بازار، پارک سرکس اور راجا بازار کے محلوں میں ہی ان کی اکثریت ہے اور ان میں سے اسی (۸۰) فیصدی سے زیادہ لوگ بستی علاقوں (کے گندے ماحول) میں رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پان بیڑی کی دکانیں، ہوٹل، رسٹورنٹ، ٹھیل اور گوشت کی دکانیں، درزی وغیرہ کے کام پر ان لوگوں کی روٹی روزگار کا دارومدار ہے۔ گھوڑا گاڑی چلانا یعنی کوچوان کا کام اردو زبان والوں کا ایک اور بڑا پیشہ تھا لیکن اب کلکتہ میں گھوڑا گاڑیوں کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ لوگ کلکتہ کے لوگ ہی ہیں اور کہیں کے نہیں عظیم کلکتہ سے انتخاب میں کامیاب ہونے والے اسمبلی کے ممبران میں چار ہندی والے اور چار اردو زبان والے نمائندے شامل ہیں۔

بنگلہ زبان بولنے والے مسلمان پورے مغربی بنگال میں پھیلے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر کاشت کار ہیں اور دیہاتوں میں آباد ہیں لیکن اردو والے مسلمان صرف شہر کلکتہ اور دیگر صنعتی علاقوں میں بستے ہیں۔ اس طرح اگر بنگالی زبان والے مسلمانوں کا مسئلہ دیہاتی زندگی اور کھیتی باڑی سے متعلق ہے تو اردو والوں کا مسئلہ شہری زندگی کے مسائل ہیں۔ اردو والے زیادہ تر کرایہ کے مکانات میں رہتے ہیں۔ دیہاتی بنگالی مسلمانوں کے تعلقات ان کے پڑوسی ہندو بنگالیوں سے بڑی حد تک خوشگوار ہیں لیکن یہ شہری مسلمانوں کے تعلقات مقامی بنگالیوں سے نہ ہونے کے برابر ہیں جس کی وجہ سے جب کبھی فرقہ وارانہ جذبات بھڑکتے ہیں تو ان کو ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ جتنے بار فسادات ہوئے اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مسلمانوں اور ساتھ ہی پورے مغربی بنگال کے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے تاکہ اُن کے تعلقات بنگالی ہندوؤں سے بہتر ہوں اور ان کے پھلنے پھولنے اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے راستہ ہموار ہو۔

مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ یہ یاد رکھیں کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا عقلمندی نہیں ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی تہذیب و تمدن کی اچھائیوں کو کھو دیں بلکہ صرف یہی ہے کہ دانشمندی سے مقامی باشندوں سے اپنے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور خوشگوار بنانے کے لئے اقدامات کریں۔ ان مسلمانوں کے چند مخصوص مسائل ضرور ہیں مثلاً ان کی (تعلیم) اردو (تعلیم) کے مسائل ہیں۔ میں یہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ مغربی بنگال میں اُردو سے نفرت کا جذبہ پایا نہیں جاتا۔ چونکہ اردو کی ترقی و نشوونما سے مغربی بنگال میں بنگلہ زبان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اور نہ مستقبل میں ایسا ممکن ہے۔ زبان سے نفرت کا جذبہ لوگوں میں اسی وقت اُبھرتا ہے جب زبان کو سیاسی مسئلہ بنا دیا جائے۔ مغربی بنگال کے اُردو حلقوں میں جو اسکول اور کالج ہیں اُن میں اردو تعلیم کا انتظام ہے اور کلکتہ یونیورسٹی میں بھی اردو موجود ہے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ طلباء کو اسکول اور کالج میں داخلہ کے لئے دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ سوال صرف اردو والوں کا نہیں ہے بلکہ اسکول اور کالج وغیرہ کی ابھی بہت کمی ہے اور مزید سیکڑوں تعلیم گاہوں کی ضرورت ہے اس لئے اسے صرف اردو والوں کا مسئلہ سمجھنا یا اس نظر سے دیکھنا غلط ہوگا لہذا اُردو والوں کو چاہیئے کہ بنگالی عوام کے ساتھ مل کر وہ تعلیم کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کریں۔ اُردو کے علاقوں میں اُردو تعلیم کی مزید سہولتوں کا سوال بھی اسی میں شامل ہے۔ اگر صرف اُردو تعلیم کا مسئلہ چھیڑ دیا جائے تو کامیابی کے امکانات کم ہونگے چونکہ اس سے اکثریت کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے، تعلیم کو گاؤں گاؤں میں پھیلانے کے لئے جو اقدامات ہوتے ہیں، بنگالی عوام جو جدوجہد کرتے ہیں ان کے ساتھ کندھا ملا کر ہی اردو والوں کو بڑھنا چاہیئے تاکہ ان کی ہمدردیاں بھی ساتھ ہوں اور مسئلہ حل ہو جائے۔

ہمارے یہاں مختلف رسم و رواج کی پابندی ہی مذہب کے روپ میں قائم ہے۔ مسلمان اس سے مستثنے نہیں ہیں لیکن بنگالی مسلمانوں اور ساتھ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر نہ کریں یعنی جہاں تک ہو سکے مقامی سماج سے مل کر رہیں اور مقامی لوگوں کو اپنا بھائی سمجھیں، اور ساتھ ہی ان کی خوشی میں اپنی خوشی کا بھرپور اظہار کرنا سیکھیں یہ نہایت ضروری ہے۔ مشرقی بنگال کے حالات سے اردو والے مسلمانوں کو خاص کر سبق لینا چاہیئے۔ تقسیم کے بعد مشرقی بنگال میں جو اردو والے (خاص کر بہار اور اتر پردیش کے مسلمان) مسلمان جا بسے تھے وہ وہاں کے بنگالی مسلمانوں کو اپنا نہ سکے۔ انھوں نے عملی طور پر کچھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ ہی اصلی مسلمان ہیں، مذہب کے ٹھیکے دار ہیں، بلند تہذیب و تمدن کے مالک ہیں، حاکم ہیں۔ حالانکہ مشرقی بنگال کی اکثریت بھی مسلمانوں کی تھی لیکن یہ باہر کے مسلمان بہت جلد بنگالی مسلمانوں کی نظر میں کھٹکنے لگے اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے نفرت کی آگ تیز ہوتی گئی جس کا نتیجہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اردو والے مسلمانوں کو اس کی جو قیمت ادا کرنی پڑی ہے

اس سے ہم آگاہ ہیں۔ اس لئے مغربی بنگال کے مسلمانوں کو بھی یہ سبق لینا ہے کہ جیسا دیش ویسا ہی بھیس ہو۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ روم میں رہو تو رومی بن کر رہو۔ اپنی تہذیب کو، اپنی زبان کو، اپنے اصولوں کو، اپنے عقائد کو، دیگر مقامی لوگوں سے بلند یا بہتر سمجھنا نہ صرف غلط ہے بلکہ نادانی ہے، خطرناک ہے اور یہ اقدام نہ ہی اپنی زبان سے محبت ہے اور نہ ہی اپنی تہذیب و تمدن سے محبت کا اظہار ہے۔

مغربی بنگال کے مسلمانوں (خاص کر اُردو والے) میں بھی ایسی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اردو والے یہ مسلمان جو عرصے سے بنگال میں آباد ہیں، جن کی روٹی روزگار کا سوال اس سرزمین سے ہے، ان میں بھی بڑی حد تک بنگالی سماج، بنگالی تہذیب تمدن، بنگلہ زبان و ادب کے سلسلے میں جاننے کا جذبہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے لاکھوں اردو والے ہیں جو دو تین پشت سے یہاں آباد ہیں لیکن انھوں نے بنگالی بنگالی سماج کے سلسلے میں جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔

مقامی اردو کے اخبارات و رسائل، اردو کے ادبا و شعرا بھی اس طرف اردو والوں کے رجحانات کو موڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کلکتہ میں اردو کے شعرا کی کمی نہیں لیکن ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالئے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنگال میں رہتے ہوئے بھی بنگلہ تہذیب و تمدن کا انھوں نے کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا ہے۔ بنگالیوں کے تہوار (مثلاً درگا پوجا، بھائی پھوٹا وغیرہ) بنگالیوں کی تہذیبی سرگرمیاں مثلاً یوم ٹیگور، یوم نذرالاسلام، یوم نیتاجی بوس، وغیرہ سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ کیا اردو کے اخبارات و رسائل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یوم ٹیگور، یوم نذرل وغیرہ کے موقع پر ہر سال وہ ٹیگور اور نذرل کی شاعری پر مضامین نظم و نثر شائع کریں، جلسہ وغیرہ کریں اور اس سلسلے میں بنگالیوں سے تعلقات قائم کریں۔ بنگال کے اکثر اردو شاعروں نے درگا پوجا وغیرہ کے سلسلے میں جو جشن منائے جاتے ہیں، دھوم دھام ہوتی ہے، میلے ہوتے ہیں، جاترا اور ڈرامے ہوتے ہیں ان پر ایک بھی شعر نہیں کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی بھی اردو شاعر نے کلکتہ کا ذکر نہیں کیا۔ کیا ہے۔ اشک امرتسری مرحوم کی نظم "تب دیکھ بہارِ کلکتہ" یا حرمت الاکرام کی نظم "کلکتہ۔ اک لبابہ" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سمندر میں ایک قطرہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال کے یہ اردو شعرا بنگال میں نہیں بلکہ بہار اور اتر پردیش ہی میں ہیں۔ چونکہ ان کے کلام میں بنگال کی کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ آخر بنگال کے کسی شاعر نے مخدوم محی الدین کی طرح کوئی نظم "تلنگن" کے بجائے "بنگالن" کیوں نہیں کہی۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ بنگال میں رہ کر بھی بنگالی سماج سے دُور رہتے ہیں۔ یہ بات چاہے کتنی ہی تلخ ہو لیکن حقیقت ہے۔

اُردو اخبارات اور رسائل کو پڑھئے تو ایسا معلوم ہوگا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ کلکتہ میں ہزاروں پنجابی، سکھ اور اتر پردیش و بہار کے ایسے ہندو بھی آباد ہیں جو اردو جانتے ہیں لیکن کلکتہ کے اردو اخبارات میں ان کے مسائل، ان کی دکھ سکھ کی خبریں یعنی ان کے سلسلے میں کچھ شائع نہیں ہوتا۔ کلکتہ میں ہزاروں پنجابی ہیں جن کا خاص کر تعلق ٹرانسپورٹ سے ہے لیکن اردو اخبارات میں ان کے جو تجارتی مسائل ہیں پر مضامین شائع نہیں ہوتے۔ پنجابی لوگوں کی تہذیبی سرگرمیوں کے سلسلے میں کوئی خبر نہیں چھپتی۔ پنجابی حلقے میں اردو اخبارات کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔ کلکتہ کے سکھ ہر سال یوم گرو نانک دھوم دھام سے مناتے ہیں، طویل رنگ برنگی جلوس نکلتے ہیں۔ جلسے ہوتے ہیں لیکن مقامی اردو اخبارات ان طویل جلوسوں کے تصاویر اور ان کے جلسوں اور تقاریر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی برادری کی خبریں، ان کی دلچسپی کی خبریں شائع نہیں کی جاتیں نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں اردو جاننے والے، کلکتہ کے اُردو اخبارات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے بلکہ وہ لوگ روزنامہ "ملاپ" اور "پرتاپ" پڑھتے ہیں جو کلکتہ میں دوپہر کے بعد ہوائی ڈاک سے آتے ہیں۔ مقامی اخبارات اگر اُن کے مسائل سے دلچسپی لیں تو کیا یہ اردو جاننے والا طبقہ مقامی اخبارات کو اپنائے بغیر رہ جائے گا؟ کیا اس سے اُردو والوں کو فائدہ نہیں ہوگا؟ کیا اردو زبان کی تحریک میں ان اردو جاننے والوں کو نہیں لایا جا سکے گا؟ ہر سال یہاں کے اردو اخبارات اور رسائل عید نمبر اور عید قرباں نمبر شائع کرتے ہیں لیکن کوئی بھی "گرو نانک نمبر" "درگا پوجا نمبر"، "ٹیگور نمبر" یا "نذرل نمبر" نکالنے کے سلسلے میں سوچتا تک نہیں۔ اگر کوئی "گرو نانک نمبر" نکالے اور اس سلسلے میں مقامی پنجابیوں کے حلقے میں گھومے تو کیا پنجابی ان کا ساتھ نہیں دیں گے؟ کیا ٹرانسپورٹ کے کاروبار والوں سے اس سلسلے میں اردو اخبارات کو اشتہارات نہیں مل سکتے۔؟ "درگا پوجا" نمبر نکال کر کیا بنگالی ہندوؤں کے حلقے میں مقام پیدا نہیں کیا جا سکتا؟ سیکولرزم کا نعرہ بلند کرنے ہی سے کام نہیں ہوگا بلکہ مسلمانوں کو عملی طور پر بڑھنا بھی پڑے گا۔ مسلمان بھی سوچیں کہ سیکولرازم کے ہات کو مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے کیا کیا اقدامات کئے ہیں۔؟

اردو اخبارات اگر دعویٰ کریں کہ وہ حق گو و بیباک ہیں، نیشنلسٹ ہیں، سیکولر ہیں، قومی یک جہتی کے پاسبان ہیں، لیکن عام طور پر اردو اخبارات کے صفحات کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بین الاقوامی مسائل پر اخبارات مضامین شائع نہ کریں (چونکہ بنگلہ اور انگریزی اخبارات بھی کرتے ہیں) لیکن اردو اخبارات میں یہ بین الاقوامی مسائل عموماً وہی ہوتے ہیں جن کا تعلق "اسلامی ممالک" سے ہو۔ مقامی اردو اخبارات نے ان "اسلامی مسائل" پر جتنے صفحات آج تک سیاہ کئے ہیں ان کا مقابلہ اگر بنگلہ دیش کی جنگ آزادی سے کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی۔ بنگلہ دیش مغربی بنگال کا پڑوسی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ (بہ الفاظ دیگر چونکہ حکومت ہند بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کا ساتھ دے رہا ہے) اکثر انھوں نے اس جنگ آزادی کی مخالفت کی ہے بنگلہ دیش کی آزادی پر کسی اردو اخبار نے "بنگلہ دیش آزادی نمبر" شائع نہیں کیا[۵]۔ مغربی بنگال کے اردو ادبا و شعرا نے بنگلہ دیش کی آزادی کا کھلے دل سے سواگت نہیں کیا۔ جن دنوں لاکھوں مشرقی بنگال کے باشندے مغربی بنگال میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے ان دنوں یہاں کے اردو اخبارات والے پناہ گزینوں کے کیمپ کا دورہ کرنے خود سے نہیں گئے۔ ان سے دل ہمدردی کے مضامین نہیں لکھے بلکہ حالت یہ رہی ہے کہ خود حکومت ہند کو آخر کار اردو اخبارات کا ایک وفد لے کر دورہ کرنا پڑا ہے۔ بنگال کے اردو شعرا میں غالباً سالک لکھنوی ہی وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ایک نظم بنگلہ دیش پر کھل کر کہی، جو روزنامہ "آبشار" میں شائع ہوئی اور خود سالک صاحب اس کے گواہ ہیں کہ اس نظم کے شائع ہونے پر کتنی نظروں نے ان کو گھور گھور کر لال لال آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کتنے لوگوں نے ان سے کہا ہے کہ "یہ آپ نے کیا کیا"۔؟

ہمارا سماج طبقاتی سماج ہے۔ مسائل بھی طبقاتی ہیں۔ لیکن جب مسلمان اپنے مخصوص مسائل کے لئے نعرہ بلند کرتے ہیں تو ان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس نعرہ کا اثر الٹا نہ ہو۔ مثلاً ایک نعرہ ہے "مسلمانوں کو ملازمت دو" "سرکاری نوکری دو" نعرہ حق بجانب ہے لیکن کہنے کا انداز غلط ہے۔ کہنا یوں چاہئے کہ "بے روزگاری ختم کرو"۔ "سب کو روزگار دو" ظاہر ہے اس لفظ "سب" میں وہ بھی شامل ہیں۔ "بے روزگاروں کو روزگار فراہم کرو" اگر کہا جائے تو مسلمان بھی آجاتے ہیں۔ لیکن اگر "مسلمانوں کے لئے روزگار فراہم کرو" کہا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ کیا صرف مسلمان ہی بے روزگار ہیں؟ ہندو فرقہ پرستوں کو موقع ملے گا اور اس سے ہندو فرقہ پرست فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کسی بات کی مخالفت کرتے وقت اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ مخالفت کا انداز کیا ہو۔ اخبارات عام لوگ پڑھتے ہیں لہٰذا اخبار والوں کو چاہئے کہ وہ پڑھنے والوں کا شعور بلند کرنے کی طرف دھیان دیں ورنہ کبھی کبھی مخالفت کا اثر الٹا بھی ہوتا ہے۔ ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ چند سال پہلے کلکتہ کے ایک انگریزی سینما ہال میں ایک انگریزی فلم آئی تھی جس میں صلیبی جنگ کا ایک منظر تھا اور جنگ میں جب مسلمان ہار گئے تو میدانِ جنگ میں اسلامی پرچم آہستہ آہستہ گر گیا' بتایا گیا تھا۔ اردو کے اخبارات نے اس فلم کو "اسلام دشمن" اور اسلام کی توہین کہہ کر خوب خوب لکھا لیکن اس کا اثر الٹا ہوا۔ اردو اخبارات پڑھنے والے ایسے ہزاروں لوگ جو نہ انگریزی جانتے ہیں اور نہ کبھی انگریزی فلم دیکھتے ہیں وہ اس سینما میں ٹکٹ کے لئے گھنٹوں قطار لگائے رہے تاکہ دیکھیں "اسلام کی توہین" کیونکر ہوئی ہے۔ اور فلم ناکام ہونے کے بجائے خوب چلی۔ یعنی اردو اخبارات نے اس فلم کو مفت کی پبلسٹی دے دی۔ لہٰذا مخالفت کرنے کا انداز بھی سیکھنا ضروری ہے۔ کبھی کبھی اردو اخبارات میں کسی کتاب کے خلاف خوب لکھا جاتا ہے کہ فلاں کتاب اسلام دشمن ہے' اسلام کی توہین کی گئی ہے' مسلمانوں کے خلاف اس میں زہر ہی زہر ہے وغیرہ۔ لیکن یہ مخالفت بھی اس انداز سے کی جاتی ہے کہ اردو پڑھنے والے بازار میں اس کتاب کی تلاش میں چکر کاٹنے لگتے ہیں اور وہ کتاب بلیک مارکٹ میں بکتی ہے۔

مسلمانوں کے جاری کئے ہوئے اخبارات و رسائل کو خاص کر فرقہ پرستی سے آزاد ہونا چاہئے۔ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے زمانے کی مثال پیش کرتا ہوں۔ بنگلور سے ایک اردو ہفت روزہ "نشیمن" کلکتہ آتا ہے۔ یہ ہفت روزہ بنگلہ دیش کی مخالفت کھل کر کرتا رہا ہے اور ساتھ ہی ہندستانی حکومت کی بھی کہ اندرا گاندھی کی ذات پر بھی کیچڑ اچھالتا رہا ہے لیکن یہ دیکھا گیا اور سب ہی جانتے ہیں کہ کلکتہ میں اس ہفتہ وار کی اشاعت ان دنوں

۵۔ جی ہاں آپ نے درست فرمایا کسی اردو اخبار نے اپنے قارئین سے ڈر کر "بنگلہ دیش نمبر" شائع نہیں کیا۔ اردو رسائل میں صرف "عکس" نے "بنگلہ دیش نمبر" شائع کیا ہے ————— شمس ک

بہت بدل ہوئی ہے۔ آج کوئی مولوی یہ اعلان نہیں کرسکتا کہ وہ سب لوگ جو شریعت کے مطابق داڑھی نہیں رکھتے مسلمان نہیں ہیں یا وہ عورتیں جو اسکول کالج میں پڑھتی ہیں یا دفاتر وغیرہ میں مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں مسلمان نہیں ہیں۔ وہ آرٹسٹ جو تصاویر اُتارتے ہیں، وہ فوٹوگرافر جو فوٹو کھینچتے ہیں۔ وہ اداکار جو ناچتے گاتے ہیں، مسلمان نہیں ہیں۔ قدیم زمانے میں بھی صرف غریب اور کمزوروں کے لئے ہی مذہبی پابندیاں رہی ہیں۔ نوابوں اور بادشاہوں کے لئے کوئی مذہبی قانون، قانون نہیں رہا وہ رنگ رلیاں مناتے رہے وہ ایک کے بجائے ایک سو عورتوں سے دل بہلاتے رہے۔ چاہے وہ شادی شدہ بیوی رہی ہوں یا حرم خانے کی پریاں، لیکن سب ہی بیگمات تھیں۔ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان مذہب نے کمزوروں ہی کو دبایا ہے۔ ان ہی پر حکومت کی ہے۔

مذہب کے معاملے میں ہندوؤں کا ادب اتنا کٹر نہیں ہے اور نہ اتنا سخت ہے جتنا کہ آج بھی مسلمانوں کا ادب ہے۔ وید، اپنشد، راماین اور مہابھارت پر ہندو اہل قلم کھل کر مخالفت کرتے آئے ہیں۔ ہندوؤں کے ادب میں ایسے اہلِ قلم حضرات سے نفرت نہیں کی گئی ہے اور نہ ہی اُن کی تخلیقات کو نذرِ آتش کیا گیا۔ بنکم چندر، راجندر لال متر، ٹیگور اور مدھوسودھن دت نے ہندو مذہب کے کئی پہلوؤں پر سخت ترین چوٹیں کی ہیں۔ مدھوسودھن دت نے رام کے کردار کی کئی کمزوریوں پر کھل کر قلم اٹھایا ہے۔ چند نے رام سے لکشمن کے کردار کو بہتر قرار دیا، چند نے رام سے بالی کو، اور مدھوسودھن دت کی عظیم تخلیق میگھ ناتھ بدھ میں رام سے بہت بلند مقام پر راون اور اس کے بیٹے "میگھ ناتھ" کو رکھا گیا ہے۔ لیکن ہندو بنگالی ان کی تخلیقات کی قدر کرتے ہیں۔ ہندو مصنفین کو یہ اجازت ہے کہ وہ ہر کردار پر یا مذہب کے جس پہلو پر چاہیں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کریں۔ عیسائی مصنفین بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں ہیں۔ انجیل مقدس کے خلاف کئی یورپین اہلِ قلم نے کھل کر لکھا ہے۔ لیکن اب تک "اسلامی دنیا" میں یہ بات پائی نہیں جاتی۔ بنگلہ ادب کے نامور ادیب ستیہ سری ان نداشنکر رائے نے ایک مضمون میں لکھا کہ حال ہی میں لی بیا سے لوٹنے والے ایک بنگالی نے اُن کو بتایا ہے کہ وہاں علم حیاتیات (Biology) کے طلبہ ڈارون کا فلسفۂ ارتقا پڑھنے سے انکار کرتے ہیں اس لئے ڈارون کا فلسفۂ ارتقا درست تسلیم کرلیا گیا تو قرآن کی بات جھوٹ ثابت ہوجاتی ہے۔ مجھے اس کا علم نہیں کہ دیگر اسلامی ممالک میں علم حیاتیات کے طلبا کو ڈارون کا فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو واقعی ان کی سائنس کی تعلیم میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

چند سال ہوئے کہ میری نظر سے ایک اردو تصنیف "مضامین واسطے اصلاح مسلمین" گزری تھی جس کے مصنف کوئی ڈی۔ ایچ۔ احمد تھے۔ یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف احمد صاحب نے اس کتاب میں اظہارِ خیال فرمایا ہے کہ اس وقت تک مسلمان ہرگز ترقی نہیں کرسکتے جب تک کہ وہ فرسودہ روایات پر قائم ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ جب تک مسلمان ہر روز نماز کے پابند رہیں، روزہ رکھیں، اس وقت تک اُن کی ترقی ممکن نہیں ہے چونکہ بقول مصنف ان مذہبی فرائض کے ادا کرنے ہی میں مسلمانوں کا زیادہ تر وقت صرف ہوجاتا ہے اور مسلمانوں کو وقت میسر نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ترقی کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر قدم اٹھائیں۔ مصنف کے خیال کے مطابق مذہب کے سخت پابند ہونے کی وجہ سے مسلمان روز بروز پستی کی طرف جارہے ہیں۔ یہ باتیں احمد صاحب نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل لکھی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے ان کی کتاب کو جلا ڈالا یا نہیں، لیکن مصنف کی ہمت کی داد ضرور دینی پڑتی ہے کہ آج سے ایک صدی قبل انھوں نے ایسی ہمت کی ہے حالانکہ آج کے دنوں میں ایسے مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں جو ہر روز پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور ماہ رمضان المبارک میں روزہ پابندی سے رکھتے ہیں لیکن آج بھی اگر کوئی مسلمان اس طرح کی بات لکھ دے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اس کا درست اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

میری مذکورہ باتوں سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ میں مسلمانوں کو ان کے مذہب پر قائم رہنے سے روکنا چاہتا ہوں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو جہاں تک ہوسکے دنیا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہئے ورنہ آج بھی ترقی کے ہر میدان میں وہ ہندوؤں سے پیچھے ہیں اور اگر وہ بیدار نہ ہوئے تو وہ اور بھی زیادہ پیچھے چلے جائیں گے۔ آخر مسلمانوں میں کتنے نامی گرامی ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں، سائنس داں ہیں اعلیٰ تعلیمی لیاقت رکھنے والے کتنے ہیں؟ یہ بات خود مسلمانوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہئے۔ مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کیا ایسے قابل لوگوں کی ضرورت نہیں ہے؟ یا یہ کہ صرف ملّا یا مولانا ہی مسلمانوں کے تمام مسائل حل کردیں گے۔؟

ٹیگور نے اپنی ایک نظم میں مادرِ وطن کی دیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے ماں، تو اپنے پیارے بچوں کو پیار سے اپنے دامن میں چھپائے نہ رکھ بلکہ ان کو اپنی گود سے اتار کر دُور دُور ٹھوکریں کھانے کے لئے بھگا دے تاکہ وہ دنیا کی ٹھوکریں کھائیں، دنیا کو کھلی آنکھوں سے دیکھیں۔ دنیا سے سبق لیں اور تب ہی تیرے بچے اس لائق ہوں گے کہ وہ اس دنیا میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہ سکیں،

بسنت کمار چیٹرجی

ہندوستانی مسلمان کی ٹریجیڈی

ہندوستان کی تاریخ میں پاکستان کے قیام سے زیادہ عجیب خیز اور غیر معمولی واقعہ اور نہیں ہوا۔ یہ یقیناً بے حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ پاکستان کی مانگ اور اس کی تائید ان مسلمانوں نے کی جو مسلم اقلیتی علاقے سے تعلق رکھتے تھے اور تعلق رکھتے ہیں، یعنی وہ علاقے جو آزاد ہندستان میں شامل کئے گئے جبکہ بنگال کے اکثریتی مسلم علاقے کے مسلمانوں نے پچیس ۲۵ سال کے تلخ تجربے اور کافی قربانی کے بعد اب ایک آزاد بنگلادیش قائم کرلیا ہے۔ باقی ماندہ شمال مشرقی حصے (بچا کھچا پاکستان) میں اب اس ذہنیت کے لوگ مشکل ہی سے پائے جاتے ہیں یہ صورت ۱۹۴۶ کے جنرل الیکشن نے بنائی تھی

قدرتی طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہندستانی علاقے کے رہنے والے مسلمان (جنھیں اب ہم ہندستانی مسلمان کہیں گے) نے سیاسی طور پر خودکشی کیوں کی؟ یقیناً کوئی بھی سمجھدار شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے کے پاکستان میں تبدیل ہو جانے کے بعد بھی مسلم اقلیتی علاقے کے مسلمانوں کو تو بہرحال اسی ہندستان میں رہنا ہوگا۔ اور اسی حالت میں یا شاید اس سے بھی زیادہ خراب حالت میں، ہندوؤں کی زبردستی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اس نسبت سے وہ پاکستان بنانے کی صورت میں کس طرح چھٹکارہ پا سکتے ہیں؟ مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے نیشنلسٹ مسلم لیڈروں نے بارہا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن کسی نے بھی اس طرف ذرہ برابر توجہ نہ کی کیوں؟

کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ ہندستانی مسلمانوں نے اس وقت اپنے وقتی طور پر فائدے کے لئے بل کہ یہ کہہ کر اپنا پورا مستقبل صرف مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کیلئے قربان کر دیا تھا؟ دراصل اس وقت کے مسلم لیگی لیڈروں نے اس بات پر کان نہ دھرا۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ گزشتہ پچیس سالوں میں ہندستانی مسلمانوں کی جانب سے ان مسلم لیگی لیڈروں کے خلاف ایک لفظ بھی سننے میں نہ آیا۔ اور نہ انھوں نے اس حادثہ سے کچھ سبق ہی لیا، یہاں تک کہ بنگلہ دیش کے قیام کا معجزہ رونما ہو گیا۔

بنگلادیش آزاد ہونے کے بعد بھی ایک مسلم ملک ہی ہے لیکن اس کی جانب ہندستانی مسلمانوں کا ایسی سرد مہری کا سلوک کیوں؟

صرف یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی تائید و حمایت سے ظہور میں آیا ہوا پاکستان اب بھی ان کی حمایت کا مرکز بنا ہوا ہے پاکستان جس شکل میں ظہور میں آیا تھا اور جس شکل میں آج ہے یہ دونوں قطعی مختلف باتیں ہیں۔ دراصل ہندستانی مسلمانوں کیلئے پاکستان کا کوئی جغرافیائی حدود اربعہ نہیں ہے نہ کوئی دوسرا ملک یا ریاست ہے اور نہ وہ پاکستان جسے مسٹر بھٹو پھر سے بنانا چاہتے ہیں۔ دراصل یہ صرف خیال منفی غیر حقیقی اور علاحدگی پسندیت کی دلیل ہے۔ جس میں ماضی کے تاریخی ہندستان دس بیس یا کروڑوں کی تعداد میں قدرتی طور پر ساتھ میں رہیں اور وہ سب اس "اسلامی زمین" کی دیکھ بھال کریں اور (خیالی) ہندو فرمان روائی اور ظلم سے آزاد رہیں۔

اس طرح ۱۹۴۶ کے جنرل الیکشن میں تائید کردہ پاکستان کسی جغرافیائی حدود میں قید نہ تھا جو مسلم اکثریتی صوبے میں بنتا۔ بل کہ وہ ان کے فائدے اور خوش آئند مستقبل کی امید میں تھا۔ وہ ایسا خیالی

پاکستان تھا جو اسلام کی اس برصغیر میں حفاظت کرتا۔

لیکن پھر جو پاکستان وجود میں آیا وہ اصولی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے خیالی پاکستان سے قطعی طور پر مختلف نکلا۔ اور اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے نیا پاکستان ایک شاک ثابت ہوا۔ وشالی دلی کے مسلمانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ جمنا کے اس پار تو پاکستان کا وجود ہی نہیں ہے۔ راقم خود ایسے دھوکا کھائے ہوئے مسلمانوں کا ہم سبق دوست تھا۔ اور اس وقت ان کی گفتگو سننے کا اسے کئی بار موقعہ ملا۔) دوم۔ فسادات کی لہر اور اس سے بھی زیادہ خراب صورت اس خوف و دہشت کی لہر نے کی جو شمالی ہند میں تقسیم کے نتیجے میں اٹھی۔ اس طرح تقریباً مکمل طور پر مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ رہی سہی کمی ان لیڈروں نے پوری کر دی جنھیں ایسے موقع پر مسلمانوں کی ہمت بندھانا چاہئے تھی۔ آس دلانا چاہئے تھی۔ وہ ہجرت کر کرکے پاکستان جا بسے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی ذہنی کشمکش اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اور وہی کشمکش آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو قدرتی طور پر یہ سوچنا چاہئے تھا کہ ان خود غرض لیڈروں سے بڑھ کر ان کا کوئی دشمن نہیں ہے جو انھیں ایسی حالت میں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ لیکن بدقسمتی سے شمالی ہند کے مسلمانوں نے اس بات سے بھی کوئی سبق نہیں لیا جس طرح سکھ اور ہندو پاکستان چھوڑ کر چلے آئے تھے اسی طرح انھیں ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا تھا اور اپنے لیڈروں کی طرح پاکستان میں پناہ لینی تھی۔ اس کا خمیازہ شمالی ہند کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

یقیناً تمام مسلمان یہاں تک کہ صرف شمالی ہند ہی کے مسلمان بھی فوراً ہندوستان کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے۔ دراصل انھیں اس قسم کے حالات کا شکار نہیں ہونا پڑا۔ اس طرح کے حالات کا شکار ہندو اور سکھ عام طور پر مغربی پاکستان کے باشندے ہو گئے تھے۔ لاکھوں مسلمانوں کے چلے جانے کے باوجود کچھ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے۔ اب یہ ڈرے سہمے سے مسلمان اپنے ان لیڈروں کی طرف دیکھ رہے ہیں جو چلے جانے والے لیڈروں کی خالی جگہ کو پُر کر رہے ہیں۔

یہ نئی لیڈرشپ ان مولوی ملاؤں کی ہے جو پاکستان کی تشکیل سے قبل اپنی قوم پر ذرا بھی اثر نہیں رکھتے تھے اور اب یہی لوگ ڈرے ہوئے مسلمانوں کے مذہبی خوف سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور چونکہ یہ ماضی میں قومی تحریک میں جو موجودہ حکمراں جماعت نے چلائی تھی، شامل تھے، اس لئے اب اپنی قوم کے رہنما اور فلاسفر بھی بن گئے ہیں۔ اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ صرف ایک ہی سبق پڑھا سکتے ہیں اور وہ ہے مذہب کا۔ کیونکہ عام مسلمانوں کو مذہب سے جوڑے رہنے پر ہی ان کی دکانداری ہمیشہ ہمیشہ چل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ عام مسلمان خود بھی ڈرا سہما اور خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس لئے اسے بھی ملا کی اس خواب آور دوا کی نپی تلی خوراک سے بہت سکون ملتا ہے۔ اس طرح تقسیم کے صرف چند ہی سال بعد مسلمان کم از کم شمالی ہندوستان کے مکمل طور پر مذہب کی حفاظت میں آگئے۔

لیکن یہ قدم مسلمانوں کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ اس سے نہ صرف وہ آزاد ہندوستان کی نئی جمہوری قدروں سے کٹے رہے، بلکہ زمانے کی نئی تعلیم سے بھی دور رہے۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملکی زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے رہ گئے اور اس طرح ان کا یہ قدم بلاشک و شبہ ان کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔

ان قدامت پرست ملاؤں نے مسلمانوں کو صرف یہ سبق پڑھایا کہ اس بت پرست بھارت میں ان کا اسلام سخت خطرے میں ہے، اس لئے ان کا اولین فرض ہے کہ ہر قیمت پر وہ اپنے مذہب کو بچائیں! اور اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ خود سو فیصدی مسلمان بنے رہیں! حکومت بھی اس طرف سے آنکھ بند کئے رہی۔ کیونکہ وہ خود بھی دو قومی نظریے کو جھوٹا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح یہ اسلام قومی فائدے کے حق میں استعمال کیا گیا۔

دوسری جانب ملاؤں نے حکومت کی اس لاپرواہی سے فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے مذہبی پروپیگنڈے کے ساتھ ہی ساتھ کچھ غلط فہمیاں بڑے پیمانے پر اڑانا شروع کر دیں۔ اس قسم کا ایک پروپیگنڈا یہ تھا کہ اگر تمام مسلمان ملاؤں کے بتلائے ہوئے طریقے سے سو فیصدی مذہبی زندگی گزارنے لگیں گے تو اونچی جات کے ہندوؤں سے پریشان شدہ نچلی جات کے لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورا ہندوستان ایک مسلم اکثریتی علاقہ بن جائے گا۔ اور تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اس بے وقوفانہ قومیت کی تضحیک اڑانے والی مذہبی تجویز کے علاوہ

سیاسی اخبارات نے جمہوری کی بنیاد پر ایک اور تحریک چلائی جو دراصل داخلی اور خارجی خیالات کا آئینہ تھی۔ پہلی بات یہ کہ ہندستان کی تمام پچھلی قوموں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے خلاف منظم کر لیا جائے۔ (مسلمانوں میں یہ بات پھیلائی گئی کہ صحیح معنوں میں ہندوؤں کی آبادی ۶ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے جبکہ باقیماندہ ۹۴ فیصدی ہندوؤں کا حصہ دراصل شدر، ہریجن اور دوسرے پچھلے طبقات پر مشتمل ہے اور یہ سب ہی اونچی ذات کے ہندوؤں سے نبرد آزما ہونے کیلئے تیار ہیں۔) اور جیسا کہ ملاؤں کے مطابق مسلمان پیدائشی طور پر لیڈر اور حکمراں ہے اس لئے اسے ہی یہ کل ہند محاذ قائم کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح وہ سب سے بڑی اکثریت کی جمہوری نمائندے اس جمہوریت کی باگ ڈور سنبھال سکتے ہیں جو کسی بھی حالت میں قدرتی طور پر انہی کی ہے۔

ملاؤں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے بدظن کرنے کیلئے عیسائیوں کا حوالہ دینا شروع کیا کہ ہندو جو اقلیت کے خلاف غیر انسانی حرکات کا مظاہرہ کرتا ہے عیسائیوں کے ساتھ خلاف معمول نرم رویہ اس لئے رکھتا ہے کہ ایسا امریکا اور یورپ کی عظیم طاقتوں کی وجہ سے ہے جو عیسائیوں کے خلاف کئے گئے ظلم کا ہندوؤں سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

اس بے بنیاد تنگ نظری کے مطابق اب یہ ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح دوسرے مسلم ممالک بھی مسلمانوں کی اسی طرح پشت پناہی کریں۔ ملا کا مسلم ممالک کہنے کا یہ مطلب ہوتا ہے مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک۔

لیکن اسی وقت ایک عام مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ ان مسلم ممالک میں سے کتنی ایک کے ساتھ ہندستان کے خوشگوار تعلقات استوار ہیں اور وہ مسلم ممالک ہندستانی حکمرانوں کو ہندستانی مسلمانوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو وہ ان سے کوئی خاص امید نہیں رکھتا۔ اب آخر میں صرف پاکستان ہی رہ جاتا ہے جس کی تخلیق میں ہندستانی مسلمانوں نے اہم رول ادا کیا تھا۔ اور جس کا خود کا کردار بھی عام طور پر ہند مخالف ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ نہ صرف جغرافیائی طور پر سب سے زیادہ قریب واقع ہے بلکہ احساسات و خیالات کی بنا پر بھی ہندستانی مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب واقع ہے اور اس قربت کی بنا پر وہ (پاکستان) چاہتا ہے اور وہ ہندستان کو نسبتی کم زور اور پاکستان کو طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندستان کے ذہنوں میں دہلی زمانہ وسطیٰ کی حکمرانی کا خواب ہے۔

ہوا ہے۔ اس طرح ملاؤں کا یہ مذہبی پروپیگنڈا جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کرتا ہے۔

اس پس منظر کے بعد اب ہم ہندستانی مسلمان کا مسئلہ کشمیر کے متعلق نظریہ آسانی معلوم کر سکتے ہیں۔ ایک گروپ کی حیثیت سے ہندستانی مسلمان نہ تو کشمیر کے اندرونی حالات کے متعلق علم رکھتا ہے اور نہ اسے اس ریاست کی مسلم اکثریت سے کسی خاص قسم کی ہمدردی ہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ان کشمیری مسلمانوں سے بھی نفرت کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہونے کی وجہ سے کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیئے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اکثریت کا نکتہ صرف شکایت کرنے والوں کیلئے اٹھایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ کی طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ اور وجہ وہی ہے جو ابتدا میں بیان کی گئی ہے کہ صرف ہندستانی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے! اور یہ سوچا جاتا ہے کہ پاکستان کیلئے مثبت اور ہندستان کیلئے منفی طاقت کا توازن رہے۔ اور زیادہ تر ہندستانی مسلمان اپنی لاعلمی یا شرافت کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیر کے نکل جانے سے جو وہ چاہتے ہیں وہ ہو جائے گا۔ حیرت ہے آج بھی ایسے بے وقوف پائے جاتے ہیں۔

عملی سیاست کی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کشمیر بھارت سے علاحدہ ہوا، یا پاکستان میں شامل ہوا تو اس کا سب سے زیادہ اثر ہندستانی مسلمان ہی پر پڑے گا! کیوں کہ سیکولرازم کی جو اصولی عمارت بھارت ہی میں تعمیر کی گئی ہے اس کی بنیاد ہی کشمیر ہے اور جس سے مسلمانوں کو کئی فائدے حاصل ہیں۔ پھر بھی جیسا کہ ہندستانی مسلمان ذہنی اور روحانی تکلیف میں مبتلا ہیں اور جس طرح اب اور تب ہونے والے فسادات ان کے لئے نقصان کا موجب بن رہے ہیں، ان کو کشمیر کا بھارت میں شمولیت کا فائدہ نظر نہیں آتا۔ اور اسی لئے ان کا کشمیر کے متعلق بالکل مختلف خیال ہے لیکن عملی طور پر ہندستانی مسلمانوں کے ذہن میں کوئی اہم خیال نہیں ہے۔ (بنگلہ دیش کو اب ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ بہاری قومی زندگی میں شامل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ اس خیال میں مبتلا ہیں کہ انھیں شکست خوردہ پاکستان فاتح بنگلہ دیش کی بہ نسبت زیادہ دے گا۔)

کشمیر اور دوسرے ہندستانی مسائل کے متعلق ہندستانی مسلمانوں کا

نظریہ بہت حد تک سقراط کی زندگی کے متعلق نظریے سے ملتا جلتا ہے۔ جب سقراط کو زہر دیا گیا تو اس نے کہا کہ "وہ نہیں جانتا کہ موت اچھی ہے یا بری، وہ اچھی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ خود اچھی طرح جانتا ہے کہ زندگی بری ہے اس لئے وہ موت ہی کو اچھی کہے گا جو کہ دراصل بری ہے۔" یہی بات ہندستانی مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ کشمیر کا ہندستان سے نکل جانا ان کیلئے اچھا ثابت ہوگا یا برا۔ یہ اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ موجودہ حالات برے اور ناقابل برداشت ہیں اس لئے وہ بعد میں آنیوالے حالات کو اچھا ہی کہیں گے حالاں کہ وہ برے ہونگے۔

خودکشی کے اس نظریئے کے ڈانڈے اس خیال سے جا کر ملتے ہیں کہ ہندستان کے باہر کشمیر کا مطلب ہے کہ کبھی نہ کبھی کشمیر کا پاکستان میں شامل ہو جانا۔ اور اس طرح پاکستان فوجی اعتبار سے اور مضبوط ہو جائے گا۔ اور اسی نسبت سے ہندستان کمزور ہو جائے گا اور جیسا کہ یہ خیال ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کی حفاظت کیلئے پاکستان کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس طرح جیسا کہ دوسرے Alarmists خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس سے ہندستانی مسلمانوں کیلئے سخت مشکل پیدا ہو گی غلط ثابت ہوگا بلکہ ان کے لئے بہتر حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اس طرح ہندستانی مسلمانوں کا کشمیر کے متعلق نظریہ جو مکمل طور پر ناسمجھی اور بربادی والی بات ہے انھیں منطقی اعتبار سے کافی خوش گوار اور خوش نما نظر آتا ہے۔

اب ہم ہندستانی مسلمانوں کے خیالات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو بنگلادیش کے قیام کا رد عمل ہے۔ بنگلادیش کے قیام سے نہ صرف پاکستان کے نظریے اور اس کی طاقت کو نقصان پہنچا ہے بلکہ ہندستانی مسلمانوں کے سپنوں کی دنیا بھی تباہ و برباد ہو کر رہ گئی ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اگرچہ آزادی کے بعد بھی بنگلادیش ایک مسلم ملک ہی ہے۔ لیکن اس کے جمہوری اور سیکولر نظریئے کا بننے کے اعلان سے پاکستان کے نظریئے کو نقصان پہنچا ہے۔ جو کہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہنی فرار کیلئے بہترین پناہ گاہ تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے سنا بھی اور اپنے اخباروں میں پڑھا بھی کہ بنگلادیش کے قیام کے فوراً بعد سب سے زیادہ غیر محفوظ ہونے والا طبقہ کوئی اور نہیں بلکہ ان ہی کے ہندستانی بھائی (بہاری) ہیں۔ انھوں نے ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سوچا کہ ان کے بھائی بنگلادیش میں اس سے پہلے پاکستانی فوج کے ساتھ مل کر قتل عام میں برابر کے شریک تھے۔ اس کے باوجود انھیں وہاں کی شہریت اختیار کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ آج کا پاکستان اور مسٹر بھٹو کا پاکستان۔ ہندستانی مسلمانوں کیلئے کسی خاص کشش کا باعث نہیں ہے، خاص طور پر وہ مسٹر بھٹو کو تو قطعی طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کسی ایک آدمی کو پاکستان کے توڑنے کا مجرم ٹھہرا سکتے ہیں تو وہ ہے بھٹو۔ کیوں کہ بنگالیوں کی اکثریت اور مجیب الرحمان کے ہوتے ہوتے وہ پاکستان کے صدر نہیں بن سکتے تھے۔ یہ ایک کڑوی حقیقت ہے جسے ہندستانی مسلمانوں کو نگلنا پڑے گا۔ پھر بھی جیسا کہ وہ اب پاکستان سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ وقتی طور پر اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کیلئے بنگلادیش اور بنگا بندھو کو گالی دے رہے ہیں۔ وہ بنگلادیش کے دوست بن سکتے ہیں۔ اگر وہ پاکستان کی جانب سے نظریں پھیر لیں۔

ہندستانی مسلمانوں کے لیڈر سے یہ امید رکھنا کہ وہ اس نازک موقع پر ہندستانی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کریں گے محض ایک بھول ہے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملے سے لے کر مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی مخالفت تک ہر ہر واقعہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے لیڈر انھیں ابتک اسی اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں جس میں وہ گذشتہ ایک سو سال سے تھے اسلئے اب اس کام کو دوسروں کو کرنا ہوگا۔ اور ہندستانی مسلمانوں کو ملاؤں کے شکنجے سے رہا کرنا ہوگا اور اس کیلئے ضروری ہے کہ ہندستان کی اکثریت عوام کا نظریہ سچے معنوں میں سیکولر اور بلا لحاظ مذہب و ملت والا ہونا چاہیئے۔ اکثریت کا صحیح معنوں میں سیکولر ہوئے بغیر صرف دستور کے الفاظ کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔

اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جو امتیاز تفریق ہر میدان میں کیا جاتا ہے اسے بغیر کسی تاخیر کے یک سر ختم کر دینا چاہئے۔ مسلمانوں کو اسی طرح زندگی، جائداد اور عزت کی ضمانت دی جائے جس طرح دوسرے مذہب کے لوگوں کو حاصل ہے۔ کسی گڑبڑ یا فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر سخت اور فوری طور پر ایکشن لینا چاہئے اور بغیر کسی قسم کی پنچ کچاہٹ، جانب داری کے حق و انصاف پر مبنی ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے کسی فرقہ کی زبان، تہذیب اور دوسرے خاص معتقدات کیلئے مناسب اور معقول حفاظت کا بندوبست کرنا چاہیئے تعلیمی پالیسی ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے ملک کے کسی بھی حصے کے مسلمان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونی چاہیئے۔ مختصر طور پر ضروری ہے

کہ ہندستان میں بسنے والے مسلمانوں سے اس قسم کا برتاؤ کیا جائے کہ انھیں یہ احساس ہو کہ دنیا میں اگر ان کیلئے کوئی محفوظ ترین جگہ ہے اور جہاں انھیں ان کی قابلیت کے مطابق ہر قسم کی ترقی کا خاطر خواہ موقع حاصل ہو تو وہ ہے ہندستان کی مقدس سرزمیں۔

حال ہی میں اینگلو انڈین لیڈر مسٹر فرینک اینتھونی نے اپنے اینگلو انڈین بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دنیا میں صرف ہندستان ہی ایسا ملک ہے جسے وہ صحیح معنوں میں اپنا مادرِ وطن کہہ سکتے ہیں اور اسی طرح ہندستان کی سرزمین بھی ان سے ایک ماں ہی کی طرح پیش آئے گی۔ اسی طرح سکھ پارسی جینی اور بدھ مت کے دانش ور بھی یہی کہتے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ مسلمان بھی ایمانداری سے اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ یہی وقت ہے جب انھیں مردہ ماضی کو بھول جانا چاہیئے اور ماضی میں کی گئیں غلطیوں کو دفن کر دینا چاہیئے۔ (ترجمہ۔ صادق علی)

رُوگی مذہبیت

ہم اِس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں یہ مذہبیت روگی ہو چکی ہے۔ یہ سنی کو شیعہ سے لڑاتی ہے۔ وہابی کا دل حنفی سے میلا کرتی ہے۔ احمدی اور غیر احمدی میں لغرت ڈالتی ہے۔ غیر مسلموں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بناتی ہے۔ اس مذہبیت کے طفیل انسان، انسان کے خوں کا پیاسا ہو گیا ہے۔ میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ہم شاہ ولی اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر مسلمان بنیں۔ اِس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی آپس کی فرقہ پرستی مٹ جائے گی۔ بل کہ ایک مسلمان کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہو سکے گی کہ وہ غیر مسلموں کے ساتھ سیاسی اور معاشی معاملات میں پورا پورا تعاون کرے گا۔ اور ان دونوں میں وحدت الوجود کا مشترک دینی فکر اساسِ موالات بن سکے گا۔ پھر اِس ہندستانی کو میں آج کی دنیا کے بین اقوامی ترقی پسند انسانی تصور کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں اسے یورپ کے علوم، سائنس اور تنظیم کو اپنانے کی دعوت دیتا ہوں'

عبید اللہ سندھی

ضیا ہانی

اِحترام باہمی

ہندوستان' ایشیا کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس میں بھی کروڑہا انسان بستے ہیں جو اگر متحد و منظم ہو جائیں تو اپنی دیرینہ روایات۔ جرات و شجاعت کے بل بوتے ایشیا بھر میں ممتاز ترین حکومت کے وارث بن سکتے ہیں۔ جاپان۔ ایشیائی روس اور چین۔ ان تینوں میں سے کوئی سلطنت بھی اتنی طاقت ور نہیں بن سکتی جتنا آزاد اور منظم ہندوستان بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر لینی چاہئے کہ باہمی خانہ جنگی سے وہ نہ صرف اپنے ملک کی آزادی کا گلا گھونٹ رہے ہیں بلکہ ایشیا کی ترقی کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں جو ہمارے ملک کے لئے اذیت رساں اور نقصان دہ ہے۔

ہندو مسلم اتحاد' پر ایک نظر ڈالتے ہوئے میں قارئین نگار کی خدمت میں اپنے خیالات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ ان کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں

(۱) مذہبی اتحاد (۲) معاشرتی اتحاد (۳) لسانی اتحاد (۴) اخباری اتحاد

(۱) مذہبی اتحاد' ۔ ۔ ۔ ۔ سب سے اہم مسئلہ مذہبی اتحاد ہے ۔ ۔ ۔ ہندوؤں کے اندر مذہبی تعصب مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ ہندو آپس میں مذہبی اصولوں کی بنا پر منتشر و متفرق ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ذات کی تقسیم اور چھوت چھات کی موجودگی انہیں آپس میں ہی بیگانہ بنانے کے لئے کافی ہے گو مسلمانوں سے میل جول اور تعلیمی ترقی کے اثر سے ان میں کچھ نہ کچھ کمی پیدا ہو چکی ہے مگر جو قوم اپنے ہی بھائی بندوں سے ایسا خلاف انسانیت سلوک روا رکھتی ہو اُن سے مسلمان زیادہ توقع نہیں رکھ سکتے۔ مسلمانوں کے بھی فرقے ہیں ان میں بھی انتشار اور تفریق ہے لیکن وہ اس قسم کا نہیں جیسا ہندو قوم میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی باہمی اخوت ہمیشہ ذاتوں اور فرقوں کی تفریق پر چھا جاتی ہے اور مسلمان اس معاملے میں ہندوؤں کی نسبت بہت زیادہ محتاط ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی روش ہندوؤں کے متعلق قابل اصلاح ہے۔ مسلمانوں کو اس معاملے میں قرآن مجید سے استنباط کرنا چاہئے جس میں صاف اور واضح احکام موجود ہیں۔

اللہ پاک نے ہر قوم اور ہر ملک کی طرف رشد و ہدایت کے لئے "ہادی" بھیجے ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان جیسا پرانا اور وسیع ملک اس سے محروم رہا ہو۔ یقیناً ہندوستان میں بھی خدا کا پیغام اور شریعت ضرور نازل ہوئی ہوگی۔ یہاں بھی پیغمبر آئے ہوں گے مسلمانوں نے چودہ سو سال میں قرآن مجید کو نہیں بدلا اور نہ بدل سکتے ہیں لیکن شریعت کے دوسرے اصولوں میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا ہے کہ حقیقت کی تلاش میں اُلجھن ہونے لگتی ہے۔

بقول علامہ اقبال ؎

حقیقت روایات میں کھو گئی! یہ امت خرافات میں کھو گئی

اس لئے اگر ہندوؤں نے "دین الٰہی" میں ہم سے چار گنا یا دس گنا زیادہ وقت میں ہم سے کئی گنا زیادہ تحریف کر لی ہو تو یہ ناممکن نہیں۔ نہ معلوم ہندوؤں کا اصل مذہب کیا ہوگا اور اب اس کی مسخ شدہ صورت کیا رہ گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم ہندوؤں کو "بے دین" یا "کافر" کہیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی آیات کریمہ کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے

اللہ تبارک و تعالےٰ فرماتا ہے۔

"یہ تمہاری جماعت دراصل ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں۔ اس لئے صرف مجھ سے ڈرو۔ مگر لوگ ایک دوسرے سے کٹ کر الگ ہو گئے اور انہوں نے الگ الگ مذہب بنا لئے

ہیں۔ ہر ٹولی کے پاس جو کچھ ہے اس میں مگن ہے۔ (المومنون ۴ ۴۳)

دوسری جگہ فرمان الٰہی نازل ہوا ہے۔

جس قوم کے پاس آسمانی کتاب ہو اس سے جھگڑا نہ کرو مگر ہاں بہت اچھے طریقے سے اس قوم سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو ظالم ہیں اور ان سے کہو کہ جو احکام ہمارے اور تمہارے لئے نازل ہوئے ان پر ہمارا یقین ہے ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے ہم سب اسی کے سامنے جھکنے والے ہیں۔
(عنکبوت ۔ ۴ ۔ ۵)

تیسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔

یہ سب لوگ ایک ہی مذہب طریقے پر تھے۔ بعد میں اختلاف پیدا کر لیا۔ (یونس ۔ ۶ ۔ ۲)

چوتھی جگہ حکم باری تعالیٰ ہوا ہے

اے ایمان والو! کسی قوم پر نہ ہنسو ممکن ہے اس میں نیک آدمی ہوں اسی طرح عورتوں پر بھی نہ ہنسو ممکن ہے ان میں بھی نیک ہوں۔"
(الحجرات ۶ ۔ ۲)

گویا نیک اور پارسا مرد یا عورتیں صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری قوموں میں بھی ہوتی ہیں حالانکہ وہ دوسری قومیں مسلمان نہیں تھیں۔

پانچویں جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

کہو ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور ہماری طرف جو قرآن مجید نازل ہوا اس پر اور جو کچھ ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوا اس پر یقین رکھتے ہیں اور موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کے پاس جو احکام ان کے پروردگار کی طرف سے آئے ان پر یقین ہے ہم ان میں سے کسی کو جدا نہیں سمجھتے" (البقرہ ۲ ۔ ۲)

گویا یقین ان الہامی کتابوں اور پیغمبروں پر بھی یقین رکھنا چاہئے جنھوں نے خدائے واحد کی عبادت کی طرف بلایا۔ گو ان کا ذکر قرآن مجید میں نہیں کیا گیا۔۔

چھٹی جگہ فرمایا ہے۔ "ہر ایک قوم میں ایک رہنما ہوتا ہے" (رعد ۔ ۲ ۔ ۱)

ساتویں جگہ ارشاد ہوا۔

کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا پیغمبر نہ آیا ہو (فاطر ۳)

آٹھویں جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے

ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ احکام الٰہی بہتر طریق بیان کرے۔ (ابراہیم ۱)

گویا خدا کی الہامی زبان صرف عربی نہیں ہے بلکہ جس قوم کے پاس پیغام بھیجا اس کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ لوگ سمجھنے میں تکلیف نہ پائیں۔ چنانچہ ہندوستان میں جو پیغام بھیجا گیا ہوگا وہ اس ملک کے باشندوں کی زبان میں بھیجا گیا ہوگا۔

نویں جگہ ارشاد ہوتا ہے

اور بے شک ہم نے ہر قوم اور ہر جماعت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعہ سے یہی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور سرکش اور شیطانی قوتوں سے بچو۔ (نحل ۔ ۶ ۔ ۵)

دسویں جگہ لکھا ہے۔

اور کئی رسول ہیں جن کے حالات ہم نے تجھے پہلے ہی بتا دئے اور کئی رسول ہیں جن کے حالات نہیں سنائے (نساء ۴ ۳)

مندرجہ دس احکام قرآن مجید کی مختلف آیتوں سے لئے گئے ہیں جو تمام کے تمام واضح اور روشن ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) تمام قومیں ایک ہی جماعت کی مختلف شاخیں ہیں۔۔۔

(۲) ہر قوم میں عبادت صرف خدائے واحد کی مقصود تھی جس کا کوئی شریک نہیں

(۳) ہر قوم میں نیک مرد اور نیک عورتیں ہوتی ہیں

(۴) دنیا کے تمام پیغمبروں کو سچا سمجھو اور ان کی عزت کرو

(۵) خدا نے ہر قوم میں رہنما اور پیغمبر بھیجے ہیں

(۶) خدا نے پیغمبروں کو صرف عربی زبان ہی میں پیغام نہیں دیا بلکہ ہر اس زبان میں پیغام دیا جس قوم میں خدا کا حکم نازل ہوا۔

(۷) قرآن مجید میں بہت سے پیغمبروں کا ذکر موجود ہے اور بہت کا ذکر نہیں بھی کیا گیا۔ ان کی واضح احکام کی روشنی میں مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ گو ان کے پاس خدا کی بھیجی ہوئی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو ابتدا سے لیکر آج تک جوں کی توں موجود ہے جس سے ایک حرف اور ایک نقطہ بھی کم نہیں ہوا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خدا کے دوسرے مذاہب کا مذاق اڑائیں اگر ہزاروں برس کی دست برد سے دیگر مذاہب کی صورت مسخ ہو گئی ہو پھر بھی مسلمانوں پر واجب نہیں ہے کہ دوسروں کی تحقیر کریں۔ اللہ پاک نے قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہوئے ان سے ان کے دینوں کے مطابق حساب کتاب ہوگا جن پر وہ باپ دادا کے وقت سے قائم چلے آتے ہیں۔ گویا اللہ پاک نے غیر مسلموں سے بھی اپنا الہامی اور دینی تعلق کسی نہ کسی صورت میں قائم رہنے دیا ہے۔

جب صورت حال یہ ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے تو مسلمانوں سے براہ راست سوال کرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ دوسرے مذاہب کے متعلق ایسی نفرت و حقارت نہ پھیلائیں جس کے وہ مستحق نہیں ہیں تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کتنا فائدہ پہونچتا۔ ہندستان میں تبلیغ اسلام میں کتنی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں۔ دوسرے مذاہب والے کشادہ دلی سے اسلام کا مطالعہ کرتے اور جب دیکھتے کہ اسلام تو صرف پہلے دینوں کا مصدق ہے اور خدا کے ان احکام کو مصنف مجلّا حالت میں پہنچانے والا ہے جو ہزارہا سال کے عرصے میں انسانوں کی دست برد و ذاتی اغراض سے مستور ہو چکے تھے تو اس سے خدا کے آخری پیغام کی نشر و اشاعت میں زیادہ آسانیاں پیدا ہوتیں۔ مسلمان علماء نے کافر۔ کافر اور مشرک مشرک کا نعرہ بلند کرکے خدا کے دو دینوں کو ایک جگہ جمع ہونے سے روک دیا۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اس نازک دور میں مسلمانوں کو فرقہ بندی انتشار اور شرک و بدعت کے جھگڑوں (؟) سے فرصت نہیں۔ اس صورت میں مسلمانوں کا اَن پڑھ تو اَن پڑھ پڑھا لکھا طبقہ بھی کٹ حجتی کے مرض میں مبتلا ہے۔ انجام کار۔ کیا مسلمانوں کی کثیر تعداد۔ علانیہ شرک میں مبتلا نہیں؟ کیا قبروں۔ گنبدوں، مجسدوں اور پیروں فقیروں سے وہی کچھ نہیں مانگا جا رہا ہے اور اُن کی ویسی ہی پرستش نہیں کی جا رہی ہے جیسی خدا کی کی جاتی ہے؟ جب مسلمان شرک کرنے لگیں اور خدائے قدیر کے نام کو پسِ پشت ڈال کر غیر حق کے سامنے جھکیں۔ اسی طرح اگر ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریں بنانے میں ٹھوکر کھائی ہو اور اُن کے وسیلے سے پرمیشور تک رسائی چاہتے ہوں یا وسیلہ کے لئے رب کو قربان کر چکے ہوں تو انصاف سے بتلائیے کہ ہندو مشرکوں اور مسلمان مشرکوں میں خدا کے نزدیک فرق زیادہ رہ جائے گا یا دونوں اس کی نظر میں یکساں مجرم ہوں گے۔ میرے خیال میں تو مسلمان مشرکوں کو ہندو مشرکوں سے شاید زیادہ ہی سزا ملے۔

اللہ کا دین ایک ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان یا عیسائی سب اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں سے جو فطرت کے قوانین کی زیادہ پابندی کرتا ہے اس کی وحدانیت کا قائل ہے اور اس کے پیغمبروں کو برحق مانتا ہے وہ عروج اور ترقی پاتا ہے۔ حد سے بڑھنے اور اعمالِ بد کی سزا سب کے لئے یکساں ہے مسلمان خدا کے "آخری پیغام" کا حامل ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے!

اس لئے اُن کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں انھیں قولاً و فعلاً قرآن کے احکام پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں میں جو مذہبی تعصب ہے۔ ہندو جو مسلمانوں کے خلاف زہر اُگلتے ہیں۔ یہ تمام کا تمام بے اثر رہ جاتا ہے۔ اگر مسلمان قرآن مجید کے احکام کی متابعت میں ہندوؤں اور دوسری قوموں سے مصافحہ کرکے اور خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام بحث انھیں سنائیں۔ کیونکہ ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

(۲) معاشرتی اتحاد

قوموں کے میل ملاپ اور دل کدورتوں کو دور کرنے کے لئے معاشرتی اتحاد کی اشد ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے اور اس سلسلے میں ہمارے ملک نے بھی کسی قدر ترقی ضرور کی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے طرزِ معاشرت اور لباس و خوراک میں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ایک دوسرے کے قریب ہونے کی کوشش و سعی کی ہے۔ آج سے سو سال بعد لباس و طرزِ معاشرت، شکل و صورت میں دونوں میں بہت کم فرق رہ جائے گا اور شاید ہندو اور مسلمانوں کو شناخت کرنے کے لئے نام پوچھنے کی ضرورت پیش آیا کرے گی۔ یہ یک جہتی بھی ملکی ترقی کے لئے لازمی ہے لیکن اس مسئلہ کو مرورِ ایام کے سپرد کر دینا مناسب نہیں۔ اب بھی دونوں قوموں کا فرض ہے کہ وہ مناسب پیش قدمی کرتی رہیں۔

جب تک ہندستان سے چھوت چھات دور نہ ہو گی، ہندستانی کبھی ایک نہیں ہو سکتے، جو قومیں بدبودار حوار گندے اور اچھوتوں کو سیاسی وجوہ پر گلے لگانا چاہتی ہیں وہ صاف ستھرے۔ خوش پوش، خوش جمال مسلمانوں کو گلے لگانے سے گریز کرتی ہیں؟

کیا وہ خدا کی نظروں میں کبھی سُرخرو ہو سکتی ہیں؟
وہ اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب ہو سکیں گی؟

معاشرتی اتحاد کے لئے ہر شہر میں ہندو مسلم مشترکہ کلب کھولے جائیں دونوں قوموں کے سپوت کھانے پینے میں یک جائی اور یک رنگی کا بہترین منظر پیش کریں یہی چیز اتحاد کا سنگِ بنیاد بن جائے گی۔

(۳) اخباری اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے لئے اخباری اتحاد کی بھی اشد ضرورت ہے۔ دونوں قوموں میں نفاق کی آگ کو ہوا دینے میں اخبارات نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی لیڈروں کی نفاق انگیز تقریریں تو کبھی کبھی ہوا کرتی ہیں مگر اخبارات ہر روز تازہ ترین زہر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیتے ہیں

اس لئے جو لوگ چاہتے ہیں کہ ملک میں اتحاد قائم ہو انھیں چاہیئے کہ ملک کے اخبارات میں اتحاد کرائیں۔ اس غرض کے لئے اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس ہونی چاہیئے جس میں اس مسئلہ پر شرح و بسط سے بحث کی جائے اور وہ قواعد وضع کئے جائیں جن کے تحت عمل کردہ اتحاد کے لئے مفید بن سکتے ہیں۔ ایک ہندو دیوی کا فرار کی جگہ ایک عورت کا فرار اور ایک مسلمان بدمعاش کی گرفتاری" کی جگہ ایک بدمعاش کی گرفتاری لکھنے سے اخبار نویسی میں کچھ کمی نہیں رہ جاتی . . . .

(۴) لسانی اتحاد" . . . کوئی ملک اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک لسانی اتحاد نہ ہو۔ اگر ہندوستان میں مدراسی کی بات پنجابی نہ سمجھے تو بتلائیے کہ ہمارا ملک کہاں اور ہم کہاں۔ ہم ہندوستانی نہ ہوئے افریقی اور روسی ہوئے جو ایک دوسرے کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔ حالانکہ ہمارا رشتۂ وطن کا رشتہ ہے جو خون کے رشتے سے بھی قوی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان ہو جسے ہندوستانی سمجھ سکیں اور بول سکیں کیا ہندوستان میں اُردو کے سوا کوئی ایسی دوسری زبان ہے جسے سب سمجھ سکیں؟ گاندھی جی نے بھی شروع سے اس بات پر زور دیا۔

"ہندوستان میں لسانی اتحاد کی اشد ضرورت ہے" تاکہ ہندو مسلم اتحاد ایکتا اور قومی یک جہتی کے کاز میں ممد و معاون ہو سکے۔

یوں تو ہر ریاست میں اپنی" زبان" سرکاری زبان ہے اور آزادی کے بعد تمام ملک کی سرکاری زبان ہندی بن گئی ہے جس کا ہم احترام کرتے ہیں۔ لیکن جن ریاستوں میں اردو سرکاری زبان تھی وہاں اسے ثانوی درجہ دینے کے عوض سرے سے تمام دفاتر ہی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ بُرا ہو تعصب کا۔ حالانکہ اُردو جنتا میں اتحاد پیدا کرنے میں بڑی موثر ثابت ہو سکتی ہے۔

ہندو مسلمان دو آنکھیں

ہندوستان میں خدا کے فضل سے
دو قومیں اس طرح آباد ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے
سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے پر پڑتا ہے
ایک آب و ہوا میں دونوں شریک ہیں۔ مقدس
گنگا و جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں
ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان
پیدا کی ہے جو نہ ہماری زبان
تھی نہ اُن کی ۔۔۔۔ ہندوستان
ایک دلہن کے مانند ہے جس
کی خوب صورت اور رسیلی آنکھیں
ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر
وہ دونوں آپس میں اتفاق
نہ رکھیں گے تو وہ پیاری دُلہن
بھینگی ہو جائے گی۔ (سرسید احمد خاں)

اب سوال مستقبل کا ہے : ہندو وہ دھۂ مسلمان [illegible] جائے بند

کی صدائیں اگر کانوں کو بھلی نہیں معلوم ہوتیں تو اس ذہنیت کو ختم کرنا ہوگا۔ اگر اکثریت کے ذہن سے تعصب نفرت اور فرقہ پرستی ہم ختم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں خود اپنا مذہبی اور سماجی اداروں کے سیاست وغیرہ کی بنیادیں دوسروں کے تعاون پر رکھنا ہوں گی، مسلم لیگ، مسلم مجلس، جماعت اسلامی، وغیرہ کی موجودگی، راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ، ہندو مہا سبھا کے فروغ اور استحکام کا باعث بنتی رہیں گی، شہر کے مٹھی بھر سفید پوشوں اور پیٹ بھروں کی ضرورتیں خود غرضی، طمع، لالچ، خوشامد اور فرقہ پرستی اور بڑھتی ہوئی ہیں، ضرورت مند مسلمان وہ نوے فی صد ہندستانی مسلمان ہیں، جو شہروں میں مزدور اور دیہاتوں میں کسان ہیں، ان دونوں کو کہ جن کی تعداد پانچ کروڑ سے زیادہ ہے، تعلیم روزگار، مکان، علاج اور دوسری سہولتوں کیلئے کسانوں اور مزدوروں کی تنظیموں میں شامل ہو کر فعال بن کر اپنا وزن ڈال کر اپنی اہمیت قائم کر کے ہندستانی عوام کے مسائل کو اپنا مسئلہ بنا کر حل کرنا ہیں۔

آزادی کے پچیس برس بعد سب سے زیادہ بدحال مسلمانوں کا متوسط طبقہ ہے۔ جس کی سفید پوشی انگریزوں کی بخشش تھی، جس کے مصائب میں اضافہ تقسیم وطن کی تلخی ہے۔ اور تنگ نظر اور تنگ دل احیا پرست ہندوؤں کی تنظیمیں ہیں۔ اس طبقے کی فلاح کا انحصار ہے تعلیم تجارت صنعت اور ٹیکنیکل تعلیم کے حصول پر۔

انگریزی بین الاقوامی زبان ہے، جو بچے ذہین ہوں جن کے سرپرست اعلیٰ تعلیم دلا سکیں وہ اپنے بچوں کو انگریزی بھی سکھائیں ورنہ ہائر سکنڈری تک ہندی اور علاقائی زبان ہر مسلمان لڑکا اور لڑکی ضرور پڑھے۔

اُردو مسلمانوں کی ہزار سالہ بڑھتی ہوئی تہذیب کا جیا ہوا ورثہ ہے۔ اُردو کا علم و ادب کا ذخیرہ دنیا کی ہر اہم زبان کے شاہکاروں سے آنکھیں ملا چکا ہے۔

اسلئے جسے بھی اُردو سے محبت ہے وہ یہ دیکھے کہ اس کے گھر میں اسکی مادری زبان [illegible] ہر بچہ اور بچی بھی اُردو جانتا ہو۔ سب سے بہتر شام کو آدھ گھنٹہ اُردو ضرور پڑھائی

دنیا کا سیاسی ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ دنیا کی تہذیبی اور تمدنی خوبیاں سرعت کے ساتھ ایک عالمی کلچر ڈھال رہی ہیں۔ دوسروں کے ساتھ ہر سطح پر اتحاد میل جول ہمارے ذہن کے ان بند دریچوں کو کھول سکے گا جن پر صدیوں سے زنگ کی تہیں چڑھی گئی ہیں۔

جدید تعلیم، جدید تہذیب، جمہوریت، اشتراکیت، نظام اسلامی [illegible] تو غور کرنے کی یہ بات ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی نظام کیوں قائم نہ رہ سکا؟ سُنّی اور شیعہ کا اختلاف بارہ سو برس بعد بھی کیوں قائم ہے؟

بنو امیہ، بنو عباسیہ اور دور بادشاہت کے ہزار سالہ دور میں اسلامی نظام کیوں قائم نہیں ہو سکا؟

انگریزوں کے عہد میں کیوں قائم نہیں کیا جا سکا؟

اگر مکہ مدینہ، فلسطین، ترکی، مصر، ایران اور عراق میں نظام اسلامی برپا نہ کیا جا سکا۔ اور ارض اللہ یعنی خانۂ کعبہ پر شخصی موروثی اور مطلق العنان حکومت قائم ہے اور دنیا بھر کے مسلمان علما کے اضطراب میں کوئی حرکت نہیں پیدا ہوتی تو ہندوستان میں جہاں مسلمان ایک اقلیت میں ہیں۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور پر پچھڑے ہوئے اور تعلیمی میدان میں پسماندہ، ایک پوسٹ کارڈ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت سے ۹۹ فی صد مسلمان محروم ہیں کیوں کر نظام اسلامی برپا کر سکیں گے؟

ہندوستان کا بنیادی دستور بہترین اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔ آج اگر حضرت عمر اور حضرت عثمان ہمارے درمیان ہوتے تو وہ بھی ہندستانی دستور کو دنیا کے دوسرے دستوروں پر فوقیت دیتے۔ اچھے انسان بنئے، اچھے مسلمان بنتے جائیں گے۔ اچھا ہندوستان بنتا جائے گا۔

کر کے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی
[illegible] قائم یہ حسرت عزم امور تیرا
حسرت موہانی

تہذیب اور مذہب

آج کی زندگی میں ایک قانون اٹل ہے وہ یہ کہ جو قوم ذہانت کی قدر نہیں کرتی وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ آپ کی تمام تر دلاوری، معاشرتی بلندی، تیز فہمی، خشکی و تری پر برتری۔ غرض کوئی بھی امتیاز وقت کے تقاضوں کو نہیں بدل سکتا آج ہم یہاں ہیں، کل سائنس اس سے بھی آگے ہوگی۔ اس دوڑ میں پیچھے رہ جانے والے کو کبھی کہیں جگہ نہیں ملے گی۔

پاکستان کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس بدنصیب ملک میں جس کسی نے ترقی پسندی، اصلاح، دوستی اور محبت حتیٰ کہ اسلام کی صحیح تفسیر کرنے کی جسارت کی اُس پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے اور اُسے رسوا کیا گیا۔ ہر دور میں ہر مہذب اور ترقی پسند قوم کا یہ مشرب رہا ہے کہ نہ صرف اپنے دانشوروں کی عزت کرے، انھیں ہر قسم کی سہولتیں اور مراعات دے تاکہ وہ اپنے معاشرے کی خدمت پورے انہماک اور پوری دل جوئی سے کرسکیں، بلکہ ان قوموں نے باہر کے دانشوروں کو بھی سر آنکھوں پر بٹھایا اور بعض حالات میں باہر کے دانشوروں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی تاکہ اپنی قوم اور اپنا معاشرہ ان کی عقل و دانش اور فہم و فراست سے فیضیاب ہوں۔ دور کیوں جائیں — ہندستان نے روزِ آفرینش سے لے کر آج تک اپنے دروازے ہر قوم اور ہر مکتبِ خیال کے دانشوروں پر کھلے رکھے ہیں۔ اُن کی قدر و منزلت کی ہے اور انھیں سینے سے لگایا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندستان کی ترقی اور عظمت کا ایک راز یہی ہے۔

اس کے برعکس پاکستان میں دانشوروں کو اذیتیں دی گئیں۔ انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ خصوصیت سے مہاجر دانشوروں سے تو توہین آمیز اور مذموم سلوک کیا گیا اس کی مثال شاید ہی کسی مہذب معاشرے میں ملے۔

ان مہاجر دانشوروں اور فنکاروں میں شاعرِ انقلاب، آفتابِ موسیقی، رستمِ زماں، ملکۂ ترنم فوراً ذہن میں آجاتے ہیں کیونکہ جب یہ لوگ ہجرت کر کے گئے بھارت میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ یہ سب مسلمان تھے جس سرزمین نے انھیں اپنی قدر شناسی سے آسمانِ شہرت پر پہنچایا تھا اسی کو ٹھکرا کر انھوں نے احسان فراموشی تو کی تھی لیکن ان بدنصیبوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کے چلے جانے سے مردم خیز بھارت کا کچھ نہ بگڑے گا لیکن ان کی اپنی ذات اور خاندان ذلیل ہوں گے۔ پاکستان میں در در کی ٹھوکریں کھائیں گے اور گمنامی کے گوشے میں زندگی (بشرطیکہ اسے زندگی کہا جاسکتا ہو) کی گھڑیاں گنتے رہیں گے۔ ان بے چاروں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاکستان کا مسلمان ان مہاجروں کو اس سلوک کے قابل بھی نہیں سمجھے گا جو سلوک وہ غیر مسلموں سے کرتا تھا۔ پاکستان میں مقامی مسلمانوں کو کسی پر حکومت کرنی تھی۔ کس پر کرتا؟ ہندو سکھ وہاں سے چلے آئے تھے مقامی مسلمانوں کو "رعایا" کی ضرورت تھی اور مہاجر مسلمانوں سے بہتر یا بدتر "رعایا" اور کوئی نہ تھی کیونکہ یہ لوگ خود "رعایا" بننے کے لئے ان مسلمانوں کے حضور میں چل کر گئے تھے۔

پاکستان میں مقامی مسلمانوں نے مہاجر مسلمانوں سے جو سلوک کیا ہے وہ کسی بھی غیرت مند مسلمان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے بشرطیکہ وہ مسلمان اپنی آنکھیں کھولنے اور اس صداقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو کہ مذہب اور سیاست ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نہیں چل سکتے۔ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا خودکشی ہے۔ اگر مذہب سیاست کی بنیاد بن سکتا تو مشرقی پاکستان کے ساڑھے سات کروڑ مسلمان مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے الگ نہ ہوتے، عرب دیش ہم مذہب ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ ہوتے، عیسائی

ہوتے ہوئے کئی ملک آپس میں نہ لڑتے۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو پاکستان میں مہاجر مسلمان بالخصوص مہاجر مسلمان دانشوروں اور فن کاروں سے جو سلوک ہوا ہے اس کے وہ مستحق بھی تھے کیونکہ جو مسلمان دیا اس مقصد کے لئے کہ کوئی بھی شخص اپنے آبائی وطن کو ٹھکرا سکتا ہے، اپنی تہذیب کو ٹھکرا سکتا ہے، اسے دوسرے ملک کے خواہ وہ اسلامی ہی کیوں نہ ہو، مسلمان بھی شک اور حقارت کی نظروں سے دیکھنے میں حق بجانب ہیں

شاعرِ انقلاب خان شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی کو اسلامی مملکتِ خداداد پاکستان سے جو کچھ ملا ہے اُس کے بارے میں بہت کچھ یہاں چھپ چکا ہے اور خود انھوں نے بھی اپنی رسوائی اور تذلیل کا اعتراف کیا ہے۔ پاکستان والوں نے جوش کی خاندانی وضعداری کی پروا کی نہ ان کی شاعری کی، اُن کے پٹھان ہونے کی کوئی قدر کی نہ "فنا فی الاردو" ہونے کی جس کی خاطر وہ "اپنے خوابوں کی جنت" پاکستان میں گئے تھے۔ پاکستان میں اس مہاجر دانشور کا جو حشر ہوا ہے وہ قدرتی بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ اس بدسلوکی کی جو تفاصیل ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں وہ اس تبصرہ کے بغیر تشنہ رہیں گی جو پاکستان میں اُن کی خود نوشت سوانح حیات "یادوں کی برات" پر کیا گیا ہے۔ پہلے تو کسی پاکستانی اخبار یا جریدہ نے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور اگر کسی نے تبصرہ کیا بھی تو جوش کی تذلیل میں کوئی کمی کسر پوری کرنے کے لئے۔ مثال کے طور پر لاہور کے ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" نے یہ تبصرہ کیا : ۔

> "زیرِ نظر کتاب (یادوں کی برات) میں ترقی پسندوں کے امام اور شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنے، اپنے خاندان اور اپنے دوستوں وغیرہ کے حالات بیان کئے ہیں۔ جوش صاحب زندگی بھر جس ذہنی اور اخلاقی کوڑھ میں مبتلا رہے ہیں اسے وہ اس کتاب کے ذریعہ اس مملکتِ خداداد کی نوجوان نسل میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے نام پر قائم کی گئی ہے اور جس کی مخالفت وہ سکندر مرزا کے عہد میں پاکستان آنے تک پنڈت نہرو کے حلقۂ احباب میں شامل ہو کر کرتے رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اس کتاب پر لکھنے سے قلم کو اُبکائی آتی ہے"۔

جوش ملیح آبادی کے پایہ کے ایک اور عظیم مہاجر فنکار کی جو درگت پاکستان میں بنی ہے اُسے دیکھ کر جوش کو اتنا قلبی سکون ضرور ہوتا ہوگا اور ہونا چاہئے کہ وہ اس صف میں اکیلے نہیں۔ یہ دوسرے مہاجر مسلمان فنکار "آفتابِ موسیقی" استاد اسد علی خاں ہیں۔ پاکستان جانے سے پہلے ہندوستان میں استاد اسد علی خاں کا جو مقام اور مرتبہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ریاست بڑودہ کے درباری موسیقار "آفتابِ موسیقی" استاد فیاض علی خاں نے ۱۹۳۲ء میں اپنے بھتیجے استاد اسد علی خاں کو آل انڈیا میوزک کانفرنس میں شرکت کے لئے آگرہ بھیجا جہاں استاد اسد علی خاں نے اپنے فن کا لوہا منوالیا۔ اُن کے فن کے چرچے سُن کر آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر فیلڈن نے اُستاد اسد علی خاں کی قدردانی یوں کی کہ جدید ٹرانسمیٹر سے لیس آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کا افتتاح ان کے ساز و آواز سے کیا۔ اُستاد اسد علی خاں بیس سال تک آل انڈیا ریڈیو سے منسلک رہے اور انھیں علی گڑھ، بمبئی اور اُجین میں آل انڈیا میوزک کانفرنسوں میں تین بڑے تمغے عطا کئے گئے جو بہت کم ہندوستانیوں کو ملے ہیں۔

پاکستان میں اس عظیم فن کار کا جو حال ہوا اور ہو رہا ہے اس کا ذکر روزنامہ "حریت" کراچی کے کالم نویس شہریار جلیس نے نہایت درد ناک انداز میں کیا ہے۔ "خاندانِ موسیقی کے آخری چشم و چراغ" کے عنوان سے کالم نویس نے اپنے فیچر میں استاد اسد علی خاں کی بدحالی کے پردے میں ان تمام مہاجر فن کاروں کی بدحالی کی دل دوز تصویر کھینچی ہے جو نہ جانے کیسی کیسی امیدیں لے کر سیکولر ہندوستان کو چھوڑ کر اسلامی مملکتِ پاکستان چلے گئے تھے اور اب وہاں نہایت عُسرت اور اذیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فن کے قدموں میں زندگی کی بہاروں کا نذرانہ پیش کرنے والے استاد اسد علی خاں کے درخشندہ ماضی سے، جو ہندوستان کی قدر شناس، غیر متعصب اور سیکولر آب و ہوا میں گاتا اہراتا اور پروان چڑھتا رہا، اُن کے حال اور اس حال کی روشنی میں اُن کے مستقبل کا موازنہ کرتے ہوئے ابراہیم جلیس نے لکھا ہے کہ "آفتابِ موسیقی غروب ہو رہا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے شہنشاہ استاد اسد علی خاں، جن کے سینے میں فنِ موسیقی کی ایک ہزار سالہ تاریخ دفن ہے، زمانے کی ناقدری کا داغ لئے گمنامی کے اندھیروں میں آخری سانسیں لے رہے ہیں"۔

ابراہیم جلیس کے بیان کے مطابق ہندوستان کے بڑے بڑے اعزازات ٹھکرانے والے اس "خوددار" موسیقار کو پاکستان میں قائدِ ملت (نواب لیاقت علی) نے آفتابِ موسیقی کا خطاب بخشا تھا لیکن قائدِ ملت کی آنکھیں بند ہوتے ہی آفتابِ موسیقی کو ریڈیو، ٹی وی سے نکال باہر کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ فن کے ذریعہ روٹی تک کمانی مشکل ہو گئی۔ راولپنڈی سے استاد اسد علی خاں کراچی پہنچے۔ ایک جھونپڑے میں سر چھپایا۔ تلاشِ معاش کے سلسلہ میں ریڈیو پاکستان کراچی میں بیٹھے رہتے۔ کبھی کبھار انھیں ۔۔ روپے کا پروگرام ملا کرتا اور وہ بھی یوں کہ گویا اُن پر اعلیٰ حکام کا احسان تھا۔

ان ناقدری سے بیزار ہو کر اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ ڈرگ روڈ پر اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر میں مقید رہے اور مقید ہیں۔

یہ تو معلوم نہیں کہ آیا جوش ملیح آبادی بھی پٹھان ہونے ہوئے اتنے "خوددار" نکلے ہیں کہ نہیں کہ اپنے عزیزوں کو اُردو جس کے غم میں آپ بھارت چھوڑ کر پاکستان گئے تھے، پڑھانی بند کرادی ہے لیکن استاد اسد علی خاں کے متعلق روزنامہ "حریت" کراچی کے اس کالم نویس نے اپنے فیچر میں لکھا ہے کہ "استاد اسد علی خاں اپنی اولاد کو موسیقی سے بیزار کر رہے ہیں۔ اپنے سات بچوں میں سے کسی کو بھی اپنا موروثی فن نہیں سکھا رہے۔ استاد کا کہنا ہے کہ اگر اُن کے بچے یہ فن سیکھیں گے تو بھوکوں مریں گے۔ یوں لگتا ہے کہ فن موسیقی کا یہ قافلہ تھم گیا ہے اور آگے نہ بڑھ سکے گا۔ آج وہ ماضی کی حسین یادوں کو رہ رہ کر وقت گزارتے ہیں۔ ان کے اس خاندان میں اب کوئی آفتاب موسیقی طلوع نہ ہوگا۔"

پاکستانی فوجی حکمرانوں نے بنگلہ دیش میں دانشوروں کو جس طرح چن چن کر ذبح کیا اس کی تفصیل سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس قتل عام سے پہلے دانشوروں کو جس ذہنی اذیت، کوفت اور کرب میں مبتلا رہنا پڑتا تھا اس کے تصور ہی سے ذہن متزلزل ہو اٹھتا ہے۔ مسٹر فضل احمد کریم فضلی دانشوروں کے اس زمرے میں آتے ہیں جو ذہنی اذیت میں اس درجہ مبتلا ہوئے کہ بس مرتے مرتے بچے۔ مسٹر فضلی ایک سابق سینئر آئی سی ایس ہیں اور اُردو کے بلند پایہ شاعر۔ تقسیم ملک سے پہلے کے فلمی حلقے جانتے ہیں کہ فضلی برادران کے نام سے ایک فلمی ادارہ تھا جس کی کئی فلمیں مقبول ہوئی تھیں۔ وہ ادارہ بھی دراصل انہی فضلی صاحب کا تھا۔

"کون سی تھی وہ بلا جو میرے گھر آئی نہیں" کے عنوان سے مسٹر فضلی نے اپنی جو آپ بیتی لکھی ہے وہ پاکستانیوں کے اُس تعصب کی منہ بولتی تصویر ہے جو انھوں نے اپنے ہم مذہبوں سے روا رکھا ہے۔ یہ آپ بیتی جون ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی جس وقت بنگلہ دیش میں پاکستان کے صدر یحییٰ خاں کی فوجوں نے کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ آپ لکھتے ہیں:۔ "ان سانحوں کو لکھنے بیٹھوں جن سے دل میں زخم پڑے تو اچھی خاصی سوانح عمری بن جائے۔ اور اس کا یہ موقع نہیں۔ مگر شاید میرے تجربوں سے اوروں کا بھلا ہو اور وہ کچھ حفظ ما تقدم کر سکیں اس لئے ان کا مختصراً ذکر کئے دیتا ہوں۔ ان ناگفتنی باتوں میں سے صرف ان چند باتوں کا ذکر کروں گا جو چنداں ناگفتنی نہیں اور جو دانا عد ملازمت سے زیادہ جوجہ ڈالتی رہی ہیں ان میں خانگی زندگی اور صدمے اور انھیں شامل نہیں۔"

اس تمہید سے عیاں ہے کہ مسٹر فضلی جن ناگفتنی باتوں کا ذکر کرنے سے بچتے ہیں وہ سیاسی اور سرکاری حالات سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی آپ بیتی میں انھوں نے اس کی وضاحت بھی کر دی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں رہتا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد بھی حاجر دانشوروں کے ذہنوں میں پاکستانیوں کے بارے میں شکوک تو تھے مگر ان کی مسلمانیت نے ان شکوک کو زور اعتنا نہ سمجھا یا رکاوٹ نہ بننے دیا۔ مسٹر فضلی لکھتے ہیں کہ :۔ "پاکستان بننے کے بعد جب قائداعظم ڈھاکہ تشریف لائے تو وہاں کے آئی سی ایس افسروں کا ایک وفد اُن سے ملا جس کی قیادت کا شرف مجھے بخشا گیا۔ قائداعظم سے عرض کی:۔ "اب تک تو ہم اپنے فرائض بلا خوف و خطر اور بغیر رو و رعایت کے دیانت داری سے اس لئے انجام دیتے رہے ہیں کہ قواعد و ضوابط اور سکریٹری آف اسٹیٹ کا تحفظ حاصل تھا۔ اب خدا کے فضل سے پاکستان وجود میں آگیا ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم پہلے سے بڑھ چڑھ کر اس کی خدمت کریں اور فرض شناسی کی وہ روایت قائم کریں جو ملک کے استحکام و فروغ کا باعث ہیں۔ مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ اب صوبائی و مرکزی مجالس قانون ساز کے اراکین و وزرا' جن کی وزارت کا دارو مدار ان کے دوٹوں پر ہوگا' ہمیں اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیں گے۔ اگر ہم نے اُن کا آلۂ کار بننے سے انکار کیا تو ہمیں لینے نقصان پہنچائیں گے جن کا اندیشہ پہلے نہ تھا۔"

مسٹر فضلی کے بیان کے مطابق قائداعظم نے انھیں جواب دیا کہ آپ کی مشکلات دور کرنے کے لئے دستور میں ضروری بندوبست کیا جائے گا۔ فی الحال آپ اپنے فرائض پوری دیانت داری سے اپنے ضمیر کی روشنی میں سرانجام دیں اور اگر اس کی پاداش میں آپ کو تکلیف اٹھانی پڑے تو خندہ پیشانی سے اٹھائیں"۔

اس سے قطع نظر کہ ان آئی سی ایس افسروں کو مسٹر جناح کا یہ جواب بھی کچھ اسی قسم کا تھا کہ "چڑھ جا بیٹا سولی رام بھلی کرے گا" مسٹر فضلی لکھتے ہیں کہ میں نے اس ہدایت پر عمل شروع کر دیا اور جب تک خواجہ ناظم الدین مرحوم اور ان کے بعد نورالامین صاحب (دونوں بنگالی) صوبے کے سربراہ رہے مجھے دشواریاں تو پیش آئیں مگر ایسی نہیں کہ ضمیر کے خلاف کوئی بات کرنی پڑے۔ اس کے بعد جب میرا تبادلہ وزارت امور کشمیر میں کر دیا گیا تو وہاں میری آزمائشوں کا دور شروع ہو گیا جو بہت سخت تھا۔ بحمداللہ میرے پائے ثبات میں تو کوئی لغزش نہ آئی لیکن اس ثابت قدمی نے دل و دماغ روند کر رکھ دئے وہ تو یہ سمجھے

کہ اللہ نے مجھے شعرگوئی کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اس کی بدولت

ڈھل گیا شعر میں کچھ دل کا غبار

ورنہ سینہ مرا شق ہوجاتا

اور

امتحاں اور بھی ہونا ہے تو ہاں اور سہی

سیکڑوں غم ہیں جہاں ایک وہاں اور سہی

اور ہو طوقِ گراں اور ہو زنجیر کڑی

ناز برداریٔ آشفتہ سراں اور سہی

نیز

بند راہیں کہیں، حکمِ زباں بندی کہیں

یہ برادریوں بھی ہوتی ہے خداوندی کہیں؟

پاکستان کی وزارتِ امورِ کشمیر میں مسٹر فضلی کے اپنے بیان کے مطابق ان کی سخت آزمائشوں کے دور کے ذکر اور پھر ان اشعار سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے یعنی انھیں ان کے ضمیر کے خلاف بعض فیصلے یا رپورٹیں کرنے پر مجبور کیا گیا اور دوسرے یہ کہ مسٹر فضلی نے ضمیر کا دامن نہیں چھوڑا جس کا ثبوت مسٹر فضلی کے ان الفاظ سے ملتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مجھ پر بڑے سنگین الزامات تراشے گئے۔ میں نے مطالبہ کیا کہ ایک جج کے ذریعہ ان کی باضابطہ تحقیقات کرائی جائے۔ اس تحقیقات کے بعد میری بحمد اللہ باعزت برات ہوگئی لیکن یاروں کی ریشہ دوانیاں رنگ لائے بغیر نہ رہیں اور مارشل لا کے ان اختیارات سے جن کے خلاف انصاف طلبی کے جملہ دروازے بند کردئے گئے تھے، مجھے یہ بنا کے نااہل ملازمت سے برطرف کردیا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے [illegible] خصوصاً فضلی جیسے سینئر آئی سی ایس افسروں کو پاکستان کے روزِ قیام ہی سے [illegible] تھے اور وسوسے تھے اور اس کا ذکر انھوں نے مسٹر جناح سے کیا بھی تھا۔ مسٹر فضلی نے پاکستان بننے کے کچھ ہی دن بعد قبل از وقت پنشن کی خود باضابطہ درخواست کی تھی کہ مسٹر فضلی لکھتے ہیں " مزے کی بات یہ ہے کہ حکومت نے میری درخواست اس بنا پر منظور نہیں کی تھی کہ میری "قیمتی خدمات" کی حکومت کو بہت ضرورت ہے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اسی شخص کو جس کی خدمات اتنی قیمتی سمجھی گئی تھیں، یہ بنا کے نااہل برطرف کردیا گیا۔

مسٹر فضلی اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ " میرے دل نے کہا چلو

آئے دن کی کوفت سے تو نجات ملی کیونکہ

مانا کہ بڑی کام کی چیز ہے یہ آئی سی ایس

چاندی کا سہی، ہے تو مگر ایک قفس

اس قید کا کیا حال بتاؤں فضلی

دم گھٹنے لگا، رہنے دے ظالم بس بس

مگر یہ بھی میری خوش فہمی نکلی۔

یہ سمجھے تھے گزر جائے گا دورِ امتحاں اک دن

مگر یہ زندگی ظالم مسلسل امتحاں نکلی !

قائد اعظم کے ارشاد پر "ضمیر کی روشنی" میں فرائض سرانجام دینے میں مسٹر فضلی کو پاکستانی حکمرانوں نے جو سخت سزائیں دیں ان کا مزید ذکر کرتے ہوئے آپ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ :-

" یہ داستان طویل بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرسکتا ہوں کہ میں نے (سرکاری ملازمت سے تعلق ٹوٹ جانے کے بعد) اپنے اس دیرینہ شوق کی تکمیل کی طرف توجہ دی جس کے تحت میں نے بہت عرصہ پہلے "فضلی برادران" کی بنیاد ڈالی اور چند سال قبل امریکہ اور یورپ میں فلم سازی کے جدید ترین طریقوں کا مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا۔ یہ شوق تفریحی قسم کا نہ تھا بلکہ جذبۂ خدمتِ ملت اس کا اصل محرک تھا۔ مگر باوجود کوشش کے جب کوئی شخص نہ ملا جو اس کارِ عظیم میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار ہوتا تو یہ ناچیز ہی اللہ کا نام لے کر تنہا چل کھڑا ہوا اور اپنا سب کچھ داؤں پر لگادیا۔ گھر رہن رکھا اور قرضے بھی لئے۔ میں نے وطنِ عزیز کے بارے میں ایک ولولہ انگیز فلم "وقت کی پکار" کے نام سے شروع کی۔ فلم بن کر تیار ہوئی تو عام خیال یہ تھا کہ اتنی اچھی فلم اس سے پہلے پاکستان میں نہ بنی تھی۔

" لیکن ستم یہ ہوا کہ جب فلم سنسر کے لئے پیش کی گئی تو میرے کسی کرم فرما نے بورڈ کے سامنے حکومت کا وہ حکم پیش کرادیا جو اعلانِ تاشقند کے بعد جاری کیا گیا تھا اور جس کی رو سے ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈہ ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ بورڈ کے حکم سے ہندوستان کے خلاف جس قدر حصے تھے کاٹ دئے گئے اور فلم ناکام ہوگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرض خواہوں نے میرے خلاف مقدمے دائر کردئے۔ میں سب کچھ بیچ کر اور بے خانماں ہوکر بھی ان کے قرضے ادا نہیں کرسکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ ضرور میرا ہاتھ بٹائے گا جسے اللہ نے دولت بھی عطا فرمائی ہے اور نظر بھی۔ مگر کسی نے دستِ تعاون بڑھایا ہی نہیں حالانکہ لاہور تک کی بیشتر فلموں میں روپیہ لگانے والے عموماً کراچی کے ہی صاحبِ ثروت لوگ ہوتے ہیں۔

اس مہاجر مسلمان دانشور کے تئیں پاکستان کے مقامی حکمرانوں اور صاحب ثروت لوگوں کے جذبۂ انتقام، جذبۂ نفرت اور جذبۂ عناد نے اس شدت کے ساتھ عملی شکل اختیار کر لی کہ فضلی صاحب کو ۱۵ اور ۱۶ جنوری کی درمیانی شب کو دل کا دورہ پڑا۔ ۲۴ جنوری کو ان کی صاحبزادی کی شادی ہونے والی تھی اور گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

اب آپ ایک اور مہاجر مسلمان دانشور پر پاکستان میں مقامی مسلمانوں کے عتاب کی دردناک داستان سنئے۔ یہ صاحب برصغیر کے ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر عبادت بریلوی ہیں۔ ان کے خلاف پاکستانی اخبارات میں اتہام کا طوفان آ گیا ہے۔ ان کے خلاف الزام تراشنے کے لئے گڑے مردے اکھاڑے جا رہے ہیں جن کے مطالعہ سے عیاں ہوتا ہے کہ پاکستانیوں نے بنگالیوں کو مطیع رکھنے کے لئے جو ہتھکنڈے استعمال کئے وہ ہتھکنڈے اب دوسرے مہاجروں پر آزما رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خلاف تو باضابطہ مہم شروع کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ آپ پڑھیں گے ڈاکٹر صاحب کا قصور اتنا ہے کہ ایک سچا دانشور ہوتے ہوئے وہ سچ بولتے ہیں اور انھیں اس بات کی کبھی پروا نہیں کہ دروغ پرست باطل پسند اور شر پسند مقامی پاکستانی حق و صداقت کو ایک پل کے لئے بھی گوارہ نہیں کر سکتا اور اس کے لئے معصوموں کا خون بہانے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ پاکستانیوں کے لئے یہ چھوٹی سی بات ناقابل برداشت ہے کہ ایک مہاجر لاہور کے اورینٹل کالج کا پرنسپل کیوں بنا ہوا ہے۔

پاکستان کی ہر زبان کے سیاسی ہفت روزہ اخبارات میں سب سے زیادہ چھپنے والے اردو ہفت روزہ "زندگی" لاہور نے اپنے اداریہ میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خلاف تحقیقات اور مناسب کارروائی کی جائے۔ مہاجر دانشور کے خلاف مقامی پنجابی اشاعتی ادارہ کا یہ اخبار لکھتا ہے کہ:۔

"مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ ایسے ہی بھارت نواز دانشوروں کی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ اگر لاہور کی اتنی اہم درس گاہ پر بھی ایسے عناصر حکمرانی کرتے رہے تو اورینٹل کالج کہیں ڈھاکہ یونیورسٹی کا نقشہ تو پیش نہیں کر دے گا؟ سوال ملک کی وحدت اور سالمیت کا ہے، بھارت نواز عناصر کی سرکوبی کا ہے، تعصب کا زہر پھیلنے کا ہے۔ پنجاب میں تعصب کی آندھی اٹھانے کی کوشش معاف نہیں کی جا سکتی۔ کہیں تعصب پھیلانے والے ان حضرت اور ان کی قبیل کے دوسرے اصحاب کو بھارت کی پشت پناہی تو حاصل نہیں؟ ہمیں افسوس ہے کہ ابھی تک متعلقہ حکام نے اس مسئلے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا۔ ہم شیخ الجامعہ اور رئیس الجامعہ گورنر پنجاب جناب عتیق الرحمان سے گذارش ضرور کرتے ہیں کہ مذکورہ کالج کے معاملات اور اس کے پرنسپل کے افکار و نظریات کی تحقیقات کیا جلد از جلد اہتمام فرما کر مناسب کارروائی فرمائیں"۔

"زندگی" کے اداریہ کے اس اقتباس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر غیر مقامی یعنی مہاجر پاکستانی کے خلاف الزامات ایک سے تراشے جاتے ہیں۔ اُن پر بھارت نوازی کا بہتان تو بے سوچے سمجھے لگا دیا جاتا ہے اپنے تعصب پر پردہ ڈالنے کے لئے انھیں متعصب ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اس لئے الزام تراشی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور بے ساختہ یہ مصرع زبان پر آ جاتا ہے۔۔

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

اداریہ میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خلاف "بھارت نوازی" اور "تعصب" کا جو واویلا مچایا گیا ہے اسے درست ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریروں کے کچھ اقتباسات اسی اداریہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔ ان اقتباسات کو غور سے پڑھنے والے ہر قاری پر ان الزامات کا کھوکھلا پن عیاں ہو جائے گا پہلی بات تو یہ ہے کہ عبادت صاحب کی جن تحریروں کے اقتباس بطور ثبوت پیش کئے گئے ہیں وہ چوتھائی صدی پہلے کی تحریریں ہیں اور دوسرے یہ کہ ان تحریروں میں آزادیٔ تحریر کا حق استعمال کیا گیا ہے۔

تمام مہذب اور جمہوری نظام نے آزادیٔ تحریر و تقریر کے حق کو انسان کا پیدائشی حق تسلیم کیا ہے۔ ... ہیں" مارشل لا انعامات طلبی کے جملہ دروازے ... کا "سنگین جرم" ثابت کرنے کے لئے معاصر "زندگی" نے ان کی مندرجہ ذیل تحریروں کے اقتباس پیش کئے ہیں:۔

"اس تباہی کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ایک ساحر نے ایک کھیل کھیلا تھا ہم سب اس کی زد میں آ گئے۔ ایک جال بچھایا تھا ہم سب اس میں پھنس گئے۔ تقسیم، تقسیم کی تقسیم، ریڈ کلف ایوارڈ، باؤنڈری فورس، ملازموں کے تبادلے، یہ سب ایک ساحر کی شعبدہ بازی نہیں تو اور کیا تھا؟ ہمارے رہنما سب کی تہہ تک نہ پہنچ سکے انھوں نے مزاجِ یار کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ مزاجِ یار میں جو کچھ بھی آیا کرتا رہا۔ فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کے لئے حالات پیدا کئے گئے۔ وہ آگ بھڑکی کہ اس نے سب کچھ خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالا۔ مستقبل کا مورخ جب ان تمام چیزوں کو بے نقاب کرے گا تو آئندہ نسلیں اسے پڑھ کر کانپ اٹھیں گی۔ ان کے

ود ننگے ٹکڑے ہوجایا کریں گے اور سالہا سال تک ان کی آنکھوں سے خون بہتا رہے گا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ ہماری زندگی کی موجودہ عام الجھنوں کا سرچشمہ وہ فرقہ پرستی ہے جس کا زہر ہماری رگ رگ میں سرایت کرچکا ہے"۔ (ادب لطیف سالنامہ ۱۹۴۲ء)

اس تحریر کو پڑھنے سے عبادت صاحب کا اگر کوئی جرم ثابت ہوتا ہے تو یہ کہ انھوں نے فرقہ پرستی کی مذمت کی ہے اور اس زہر کی ہولناکیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے اس سے آئندہ احتراز کرتے ہوئے مشورہ دیا ہے۔ فرقہ پرستی کی بنیاد پر قائم اسلامی مملکت پاکستان میں واقعی اس سے زیادہ سنگین جرم اور کیا ہوسکتا ہے؟

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے دوسرا "سنگین جرم" یہ کیا کہ انھوں نے مولانا آزاد کا نام لے لیا۔ اس جرم کو ثابت کرنے کے لئے "معاصر زندگی" لاہور نے یکم جنوری ۱۹۴۹ء کے ماہنامہ "آج کل" میں عبادت صاحب کی اس تحریر کا حوالہ پیش کیا ہے:۔

"مولانا آزاد کی سیاست کو سمجھنے کے لئے کسی طرح کی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ وہ آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ وہ ہندستان کی متحدہ قومیت کے علمبردار رہے۔ ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ ہندو مسلم مسئلے کا حل آپس میں میل جول اور ایک دوسرے پر اعتماد ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی ساری زندگی گاندھی جی کے ساتھ گزار دی کیونکہ خود گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے ..... ٹھیک ہے کہ اس سیاست میں انھیں کوئی بڑی کامیابی نہیں ہوسکی کیونکہ ہماری تاریخ بعض ناسازگار حالات کے باعث قدامت اور رجعت کے ایسے طوفانوں کی تاریخ بن گئی جس نے معقولیت اور ترقی پسندی کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ..... بہرحال مجھے مولانا کی سیاست کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے کیونکہ میں خود کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور نہ مجھے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی ہے ..... لیکن اتنا مجھے ضرور کہنا ہے کہ ان کی نظر صدیوں آ[illegible] ہے یہی وجہ ہے کہ سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک دفعہ مولانا سے ملنے اور سیاسی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ "میں نے ایسا بالغ نظر اور دوررس اور دوربین سیاست داں نہیں دیکھا"۔

پاکستان میں مہاجر مسلمان دانشور ڈاکٹر عبادت بریلوی مقامی مسلمانوں کی آنکھوں میں اس لئے بھی کانٹا بن گئے ہیں کہ انھوں نے ادب اور ثقافت میں سیاست کو داخل نہ کرنے کی وکالت کی ہے۔ انھوں نے اس بات پر دکھ ظاہر کیا ہے کہ تقسیم نے جو سیاسی تھی، انسانیت کو بھی اس بُری طرح مجروح کردیا کہ اس کا بہتا ہوا خون بند ہونے میں نہیں آتا۔ انسانیت دوستی اور محبت کی فریاد کرنے والے عبادت بریلوی کو اس لئے مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ وہ مہاجر دانشور ہیں۔ اس سلسلہ میں "زندگی" نے ڈاکٹر عبادت کی مندرجہ ذیل تحریر ماہنامہ "نقوش" کے آزادی نمبر ۱۹۴۹ء سے نقل کی ہے۔

"صورت حال یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کے باعث ہماری سماجی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ تقسیم کے سیاسی نتائج سے مجھے مطلب نہیں لیکن تہذیب اور کلچر کو اس تقسیم نے بُری طرح زخمی کیا ہے۔ ایک ہی ملک کے رہنے والے ادیب ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دئے گئے ہیں۔ تقسیم جن اصولوں پر ہوئی ہے اُس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں رجعتی رجحانات زور پکڑ رہے ہیں زندگی کے بنیادی موضوعات کی طرف سے جس نے توجہ کسی حد تک کم کردی ہے۔ برخلاف اس کے اس صورت حال نے نفرت کے شعلوں کو ہوا دی ہے ...... ادب ہندستانی یا پاکستانی نہیں ہوتا، انسانی ہوتا ہے۔ وہ آج تک انسانی رہا ہے اور آئندہ بھی انسانی رہے گا۔ اس کو منزل کی طرف بڑھنا ہے وہ بڑھتا رہے گا۔"

پاکستان میں مہاجر مسلمان دانشوروں کے قاتلوں کے ان چند رہنماؤں کے ساتھ وہاں کے مقامی مسلمانوں کی اس بدسلوکی سے جو حقائق اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں یہ ہیں کہ علاقائی اور لسانی تعصب، مذہبی تعصب سے بھی زیادہ طاقتور اور اس لحاظ سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس نوع کا تعصب مذہب کو بھی، جسے مضبوط ترین رشتہ کہا جاتا ہے خاطر میں نہیں لاتا۔ جوش شاعر ہیں، اسد علی خاں موسیقار ہیں، فضلی آئی سی ایس ہیں اور عبادت ماہر تعلیم لیکن پاکستان نے ان میں سے کسی کو اپنا نہیں سمجھا۔ اپنا وطن چھوڑنا بہت بڑی قربانی ہے اور دوسرے ملک میں جاکر اپنے آپ کو وہاں کے حالات کے تابع کردینا اس سے بھی بڑی قربانی ہے لیکن ان قربانیوں کا صلہ پاکستانیوں نے دیا بھی تو یہ کہ ؎

دیکھ مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو

پاکستان کی بنیاد نفرت پر

میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گھٹی میں نفرت، بغض و حسد، کینہ، دشمنی اور حقارت کے جذبات بھرے پڑے ہیں، پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی مرہونِ منت ہے۔ پاکستان انگریزوں نے اس لئے بنایا کہ زندگی بھر کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فسادات ہوتے رہیں

خان عبدالغفار خان

حامد الانصاری غازی

ہم سب ہندستانی ہیں

"ہندوستان ہمارا وطن ہے اور ہم سب ہندوستانی ہیں۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ ہماری روح کا حقیقی تقاضا ہے، تاریخ کے سینے میں بہت سے زخم ہیں مگر ان زخموں کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں ہزار اختلاف ہو سکتے ہیں مگر آج ہم سب اس بات پر متحد ہیں کہ ہم سب ایک ہیں اور ہمارا یہ ایکا وطن کی جڑوں سے قائم ہے" ہندوستان ہماری زندگی کا قلعہ ہے اور یہ قلعہ قومی اتحاد کے فولاد سے تیار ہوا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کتنی سچائی سے کہا ہے۔

"ہندوستانی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کے ملے جلے کلچرل بندھن ہیں اور سیکڑوں برس کی ترقی کے نشان ہیں۔ یہاں چھ ہزار سال پہلے سندھ کا کلچر پھیلا۔ ایشیا کی اونچائیوں سے ان گنت فاتح سیاح، زائر اور طالب علم آئے اور ہندوستان کے جیون سماج اور آرٹ پر اپنا رنگ چڑھاتے رہے۔ لیکن یہ ان گنت آنے والے اس ملک کی مٹی میں جذب ہو کر رہ گئے۔ ہندوستان تھا جس نے سمندر کی طرح ہزاروں ندیوں کو اپنے سینے میں اتار لیا لیکن سمندر سمندر ہی رہا۔"

فلاسفر ڈاکٹر رادھاکرشنن نے اسی ایکتا اور وطنی یونٹی پر ایک بار کہا تھا:

"ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس ملک میں رنگا رنگ کثرت کے اندر وحدت کا باریک رشتہ موجود ہے۔ جو با خدا انسانوں، روحانی بزرگوں، فلاسفروں اور فن کاروں کی کوشش سے قائم ہوا ہے اور ہم سب ایک مشترک میراث کے مالک ہیں۔"

یہ تھا قدیم ہندوستان، تاریخی قوموں کا سمندر جہاں دراوڑ آئے آرین آئے، ہن بھی آئے۔ شمال سے عرب مسلمان افغان اور مغل آئے۔ مشرق کی اور سے زرد قوموں کے قافلے آئے اور اس ملک کی زندگی میں گھل مل کر شیر و شکر ہو گئے تاریخی قوموں نسلوں، مذہبوں اور زبانوں کے اس دیش کی محبت میں ہم مسلمان بھی پہلی صف میں کھڑے ہیں۔ ہماری تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ہم اپنے وطن کی محبت پر گواہی دیں اور اس کے اتحاد کا ترانہ گائیں۔

آج سے صدیوں پہلے ایک مانے ہوئے مسلم مورخ عبداللہ وصّاف نے ہندوستان کی بڑائی اور خوشحالی کا تذکرہ کیا ہے۔

ابوریحان البیرونی (۳۶۲ھ / ۹۷۲ء) نے ایک ہزار سال پہلے ہندوستان پہنچ کر اس ملک کی مذہبی، سماجی اور علمی حالت کو دیکھا اور کتاب الہند لکھ کر ہندوستان کا نقشہ ساری دنیا کو دکھایا۔

مورخ سید سلیمان ندوی کی یہ ریسرچ ہماری تاریخ کا جوہر ہے:

"عربوں کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان سے اُن کا تعلق چند ہزار برس کا نہیں حضرت آدم سے شروع ہے یہ ان کا پدری وطن ہے۔"

حدیثوں، تفسیروں اور اسلامی تاریخوں سے ثابت ہے کہ پہلا انسان اور پہلا اسلامی سلسلہ کا پیغمبر ـــ یعنی حضرت آدم جنت سے نکلے تو ہندوستان جنت نشان میں اتارے گئے ــــــــــ یہی نہیں جنت کی چار نہروں میں سے ایک نہر ہندوستان میں بہتی ہے۔ مورخ سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

"کیا اس چوتھے دریا کو گنگا سمجھا جائے۔"

ہند اور مسلمانان ہند کا یہی بندھن نہیں بلکہ مورخ آزاد بلگرامی (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان) میں لکھتے ہیں:

"حضرت آدم کے لئے خدا کی پہلی وحی اسی ملک میں نازل ہوئی۔ چونکہ نور محمدی حضرت آدم کی پیشانی میں امانت تھا اس لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابتدائی ظہور اسی سرزمین میں ہوا۔" اسی لئے حضور نے فرمایا: مجھے

ہندوستان کی طرف سے خداوندی خوشبو آ رہی ہے۔'
شاعر مشرق اقبال اسی بات پر جھوم گیا اور بڑی بے ساختگی سے پکار اٹھا ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

امام عالی مقام حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ نے ہمیں یاد دلایا۔
'ہندوستان بہت اچھا دیس ہے'۔ (اطیب ورِیحاً من الہند)
یہ ہے ہندوستان سے ہندوستانی مسلمانوں کا رشتہ۔

ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنے اسلام پر اور ایمان پر اتنا فخر ہے کہ کی کوئی مثال نہیں لائی جاسکی۔ ہمیں یہ سبق دیا گیا ہے کہ "وطن کی محبت کا سرچشمہ ایمان ہے"۔ (حب الوطن من الایمان)

ہم اپنے ساتھ اُردو زبان کے اس فخر کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے ملک کی ہو، قومی زبانوں کو یہ کہہ کر پیچھے چھوڑ دیا۔ ؏

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور خود آگے نکل گئی۔

یہ ہم مسلمان ہیں جو اس ملک کی خاک پر قبلہ رُخ ہوکر اور اللہ اکبر کا نعرہ بلند کر کے پانچ مرتبہ سجدہ کرتے ہیں اور مٹی صاف کئے بغیر سر اُٹھا کر پھر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے علاوہ کون ہے جسے یہ فخر حاصل ہے یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس ملک کی محبت سے دستبردار ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے۔

اگر ہمارے ہم وطن بھائی نہیں جانتے تو آج جان لیں کہ اگر ہم نے حب الوطنی کا دعویٰ کیا ہے تو تاریخ اس پر دلیل لانے کے لئے موجود ہے۔ مورخ لیعقوبی ۲۲۷ ہجری میں ہند آیا اور اُس نے کہا کہ ہند دانشمند فلاسفروں کا ملک ہے۔ عرب مورخ اور فلاسفر جاحظ نے سنسکرت زبان کے کمال پر اپنی کتاب میں ایک باب لکھا۔ ابن ندیم ۳۷۷ھ نے ہندوستان کی کتابوں کے نام دنیا کو بتائے۔

الموفق ۱۹۹۰ء نے ہندوستانی طبیبوں (ویدوں) کے نام دنیا کے سامنے پیش کئے۔

انھوں نے 'چانک' کی جوتیش کا ترجمہ کرکے انہیں محفوظ کیا۔ ابوریحان البیرونی نے ہندوستان کا نام کتاب لکھ کر روشن کیا۔ خوارزمی نے بھی اس کام میں اپنا حق ادا کیا۔ ابومعشر فلکی نے دس سال ہندوستان میں رہ کر سنسکرت سیکھی)۔

ملاّ مسیح نے رامائن لکھی، امیر خسرو نے ہندی زبان کو نکھارا اور سنوارا۔ فیروز شاہ نے سنسکرت کتابوں کے فارسی ترجمے کرائے۔ اکبر کے شہزادے دانیال نے سنسکرت کے لئے اپنا خزانہ کھول دیا۔

قاسم فرشتہ نے "اختیارات قاسمی" کتاب لکھی اور فارسی زبان میں ہندو علم طب (ویدک) کو زندہ کیا۔ کشمیر کے سلطان زین العابدین نے اکبر سے پہلے تبتی اور فارسی کے ہندی کو سرکاری زبان بنایا۔ اور مہا بھارت اور راج ترنگی کے فارسی ترجمے کرائے۔

حضرت امیر خسرو نے مثنوی نہ سپہر لکھی اور اس میں ایک باب میں ہندوستان کی عظمت کا اقرار کیا۔ جہانگیر مشہور سنیاسی اور عالم ویدانت جدروپ سے خود ملنے گیا۔ پہلے مسلمان فاتح محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد ہندوؤں کی آزادی کا اعلان کیا اور حکومت کے کاموں میں آزادی دی۔ ابراہیم شاہ عادل (۹۴۲ء) نے حکومت کا کاروبار ہندوؤں کو سپرد کیا اور فارسی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو ان تاریخی باتوں کے گواہ ہیں انھوں نے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے:

ہندوستان کی پوری تاریخ میں ہمیشہ مذہبی رواداری اور ایکتا کا رواج رہا ہے انگریزوں سے پہلے مغل بادشاہی میں ہندو مسلم رشتہ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اکبر کے عہد میں ہندو کمانڈر اور اعلیٰ عہدہ دار ۲۵ تھے۔ جہانگیر کے عہد میں ۴۶ شاہجہاں کے عہد میں ۱۱۲ اور عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں ۶۷ اول درجہ کے ہندو، فوج کے کمانڈر اور اوّل درجہ کے سرکاری عہدیدار تھے۔

اکبر کے نو رتن تو مشہور ہیں لیکن رائے ٹوڈرمل، شاہجہاں اور عالمگیر کے یہاں دو ہزاری منصب پر فائز تھے اور کانگڑہ کی فوجداری پر چار لاکھ سکۂ شاہی سے سرفراز ہوئے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ راٹھور چھ ہزاری منصب اور پانچ ہزار سوار پر مقرر ہوکر اورنگ زیب کے ساتھ قندھار مامور ہوئے راجہ جے سنگھ سوائے عالمگیر کے زمانہ میں منصب دو ہزاری پر قلعہ کھلنا پر دو ہزار سواروں کی کمان پر مامور ہوئے۔ جے سنگھ بھی عالمگیری دور کے کمانڈر تھے۔

بتر کھوج تیز مان عہد شاہجہانی ۱۰۵۵ ہجری میں سات سو کے منصب اور پانسو سوار کے کمانڈر تھے۔ بلخ اور بدخشاں کی مہم پر بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔

راجہ جیندر سین جادون مرہٹہ سردار فرخ سیر کے دربار میں سات ہزاری منصب اور چار ہزار سوار کے کمانڈر تھے۔ راجہ منوہر داس شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں پچاس ہزار روپیہ کی شاہانہ سخاوت کے ساتھ ۱۰۸۰ھ میں شولاپور کا قلعہ دار ہوا۔ بہادر مرہٹہ سردار نیبا سیندھیا ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ کی طرف سے سات ہزاری کمانڈر مقرر ہوا۔ اس خاندان کا منصب چالیس ہزار تھا اور تیس ہزار سوار کمان میں تھے۔ دو لاکھ روپیہ نقد انعام حاصل کیا۔

مسلمانوں کے عہد میں ہندو مسلم رشتہ کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ ٹیپو سلطان کا معتمد دیوان سردار پورنیا برہمن تھا۔ سراج الدولہ کا صدر دیوان موہن لال اور پٹنہ کا گورنر رام نرائن تھا۔ آصف الدولہ صدر دیوان اور وزیر اعظم جھاؤلال، نواب حافظ رحمت خاں روہیلہ کا وزیر اعظم راجہ مان رائے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر معتمد پیرزادہ عزیز الدین اور توپخانہ کا چیف کمانڈر الٰہی بخش تھا اور اسی کے نام سے توپخانہ موسوم تھا۔

جنگ آزادی کے مجاہدین علماء مولانا سید احمد شہید کا افسر توپخانہ راجہ رام راجپوت تھا۔

مختصر یہ کہ اس ملک میں ہندو مسلمان بار بار لڑے مگر ایک کے دل میں دوسرے کی جگہ رہی۔ ان کا ملک ایک تھا لباس ایک زبان ایک، ہزار سالہ تاریخ ایک رنگ ایک اس لئے وہ ہمیشہ ایک رہے۔ آخر پانچ ہزار میل دور سے انگریز آئے۔ اور کالے گورے کا فرق پیدا ہوا۔ یہی انگریز تھے جنہوں نے ہمارے اتحاد کی زنجیر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

"اختلاف ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا اور یہی ہمارا اصول ہے"۔ یہ تھا وہ اعلان جو ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن نے کیا جس سے معلوم ہوا کہ انگریز ہندو مسلمانوں کو لڑاتے تھے اور حکومت کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ یہ انگریز تھے جنہوں نے ہندوستان میں مذہبی اختلافات کو ابھارا جس سے ہندو مسلم تصادم شروع ہوا ورنہ یہاں مذہب اور کلچر کے معاملہ میں کسی قسم کی الجھن نہیں تھی۔ (ہندوستان کا اتحاد۔ نہرو ص ۳۲)

ہندو مسلم تعلقات کے سلسلہ میں دو باتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ایک یہ کہ ہندوؤں نے شمال سے آنے والے مسلم فاتحوں اور جنوب سے آنے والے یا خدا مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ برداشت کیا بلکہ اُن سے پوری رواداری برتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اسی طرح مسلمانوں کا وطن بن گیا جس طرح ہندوؤں کا وطن تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں نے حکومت کے کاموں میں ہندوؤں کو برابر کا حصہ دیا اور دونوں نے ایک دوسرے کے کلچر روایات زبان لباس اور آرٹ پر اثر ڈالا اس طرح پراچین ہندا اور نئے ہندوستان کا خمیر تیار ہوا۔

پنڈت سندر لال کا کہنا ہے کہ مغل زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے حقوق ایک تھے اُن میں مذہبی رواداری انتہا پر تھی۔ مسلمان صوفیا اور ہندو جوگی دونوں ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور مذہب کی بنا پر کسی سے کوئی فرق نہیں برتا جاتا تھا۔ سر جادو ناتھ سرکار جیسے فاضل مورخ نے یہ مانا ہے کہ مغلیہ حکومت میں ہندو مسلمانوں کی حالت یکساں تھی۔

ایک انگریز ڈبلیو ٹارنس تک نے یہ اقرار کیا ہے کہ شیواجی اور ٹیپو سلطان تک کے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک تھے۔

میجر باسو نے بھی اپنی تاریخ ہند میں صاف لفظوں میں اس بات پر اصرار کیا ہے:

"مسلمانوں نے انگریزوں کے برخلاف ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اُن کے زمانے میں ملک کے لوگوں کو ہر قسم کے حقوق حاصل تھے"۔

سر ولیم ہنٹنگ مشہور وائسرائے ہند کو بھی یہ ماننا پڑا: مسلمان ہم انگریزوں سے زیادہ مدبر تھے وہ اس ملک میں پہونچے اور اپنا وطن بنا لیا۔ فاتح و مفتوح ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور اُن کے فائدے ایک ہو گئے:

تاریخ کی ان سچی اور سیدھی گواہیوں سے ہمیں وہ زمانہ یاد آتا ہے جب ہندو مسلمان اس عظیم ملک سے سرحدوں میں زندگی گزارتے تھے اور باجا۔ گائے اور زبان کے مسئلوں پر لڑنے مرنے اور فساد کرنے سے بالکل بیگانہ تھے۔ اس کی صرف ایک وجہ تھی وہ خود ایک دوسرے سے بیگانہ نہ تھے اور کوئی اجنبی اور بیگانہ طاقت ان کے درمیان نہ تھی۔

پنڈت نہرو فرماتے ہیں ـــــــ "ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں ایک ایسی قوم کی حکومت ہوئی جس کی جڑیں کسی دوسری زمین میں

آگئی تھیں اور اس لئے یہ قوم ہمیشہ ہندوستان میں بیگانہ اور غیر بن کر رہی جس کا مقصد اپنا فائدہ کرنا اور ہندوستان کو ناجائز طریقوں سے لوٹنا تھا۔ اس قوم کا ہندوستان میں گھل مل جانا ناممکن تھا یہ اس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ اس اجنبی قوم اور اہلِ ہند میں ٹکر شروع ہوئی اور مسلسل جاری رہی اور پھر ہندو مسلم اختلاف کا زہر ہندوستان کے جسم میں داخل کیا۔"

پنڈت جی اور زیادہ کہتے ہیں :

"برطانیہ ہی نے مذہبی فرقہ وارانہ فساد پیدا کیا انہیں ابھارا جس سے ہندو مسلم ٹکراؤ سامنے آ گیا۔

ایک مسلمان فاضل سید عبدالباری ایم۔ اے عثمانیہ ممبر نفیس اکاڈمی حیدرآباد نے ہندو مسلم اختلاف کے بارے میں انگریزی ڈپلومیسی کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"ظاہری طور پر اقلیت کا مسئلہ ۱۹۰۹ء کی دستوری اصلاحات میں اُجاگر ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا بیج ایسٹ انڈیا کمپنی کے [illegible] نے سالہا سال پہلے بویا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کو [illegible] کرنا تھا اس لئے اُنہوں نے وہ اصول بھی تیار کئے جس سے اُن کی شہنشاہیت مضبوط ہو۔ ایک اجنبی قوم اس سے غافل نہیں تھی کہ ہندوستان میں اس کی بنیاد ہلا دینے والے عناصر موجود ہیں۔ اور مسلمان۔ مرہٹے۔ سکھ سوتے ملتے ہی اس کا تختہ اُلٹ سکتے ہیں۔ یہ لوگ ایک زلزلہ کی مانند برٹش شہنشاہیت کو ڈھا دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ انگریزی سلطنت کے لئے متحدہ قومیت سے زیادہ اور کوئی چیز خطرناک نہیں ہو سکتی [illegible] اس سلسلہ میں ۱۸۵۷ء غیر ملکی سامراج کے لئے خطرے کی پہلی گھنٹی تھی۔ انگریز خوب سمجھ گئے یا تو ہندو مسلم اتحاد برقرار رہ سکتا ہے یا سلطنت برطانیہ یہ دو الگ الگ چیزیں تھیں، ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ کر کے ۔۔۔ انگریزوں نے دونوں قوموں کے درمیان معاشی تنازعہ پیدا کیا اور اسی طرح ہمیشہ کے اچھے تعلقات بگڑ گئے۔ لارڈ کلایو نے اپنے مراسلہ میں لکھا: میر جعفر میر قاسم اور نواب ارکاٹ پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ انگریزی غلبہ کو آزادی سے بدلنے کے لئے ہر موقع سے کام لیں گے!

اس طرح مسلمانوں کی تباہی کا پلان اور ہندو مسلم اختلاف کا منصوبہ شروع ہوا۔ پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر سر جان مینارڈ کا بیان ہندو مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے وہ لکھتا ہے :

"انگریزی راج سے پہلے ہندو مسلمانوں میں کوئی مذہبی جھگڑا نہیں تھا۔ ہندو مسلم اختلاف نہ ہوتی تو ہماری حکومت قائم نہ رہ سکتی۔"

یہ ہے وہ تاریخی داستان جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کو ہندو مسلم فساد سے بدلنے کے لئے کس طرح بھر پور کوشش کی مگر واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء انہی سازشوں کا ایک جواب تھا اور اس بات کا اعلان کہ مغل سردار، مرہٹے، روہیلے ہندو اور مسلمان پیرتھ اور کانپور سے لے کر کلکتہ تک غلامی کے خلاف آزادی کے مورچہ پر ایک تھے۔ ان کی تاریخی غلطیوں اور انگریزی کوششوں کی وجہ سے ان میں فرق ضرور تھا مگر انگریزوں کو نکالنے اور ملک کو آزاد کرانے کے لئے ان کی رگوں کا گرم خون ایک ہی سمت حرکت کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے شہیدوں کا خون اس پر گواہ ہے کہ انہیں کو گوشت سے اور ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ کے پیچھے پر وقت کا وہ قافلہ گزر چکا ہے جو ہم ہندوستانیوں کے قومی اتحاد سے بنا تھا اور اگر ہم چاہیں تو اس اتحاد کو برقرار رکھ سکتے ہیں جس پر ہم سب کو فخر رہا ہے خواہ ہم ہندو ہوں یا مسلمان سکھ ہوں یا عیسائی اچھوت ہوں یا کم تعداد پارسی۔

عقیدت و نفرت

آغا شورش کشمیری

میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلی صدی میں دو عظیم علمی وجود پیدا کئے ہیں۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد، اول الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت ملی اور ثانی الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ نفرت، مسلمانوں نے علامہ اقبال سے جو عقیدت استوار کی ہے اس کا رشتہ دماغی نہیں قلبی ہے اور ظاہر ہے دل کی محبت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے مسلمان اقبال کے نام سے محبت کرتے ہیں لیکن اقبال کے کام کو صرف گانے اور گواتے ہیں۔ ع میرا یاراں غزل خوانے شمردند

کرشن چندر

قومی مزاج کی تشکیل

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستان میں صرف ایک کلچر ہے۔ ایک تہذیب ہے، ایک تمدن ہے اور اگر ہندی مسلمان کسی ایک مخصوص کلچر، تہذیب اور تمدن میں جذب ہو جانے سے انکار کرتے ہیں تو کوئی بہت بڑا گناہ کرتے ہیں۔ یا اس ملک کے بنیادی مفاد سے غداری کرتے ہیں۔

ہندوستان میں کلچر کے ایک سے زیادہ دھارے ہیں، ایک سے زیادہ تہذیبیں ہیں، ریت اور رسم و رواج ہیں۔ جو کہیں پر مل جاتے ہیں، کہیں پر علاحدہ ہو جاتے ہیں، کہیں پر حسین سنگم بناتے ہیں، کہیں پر اپنی منفرد شخصیت کا جادو جگاتے ہیں، کلچر، مذہب تہذیب، تمدن، ریت اور رسم و رواج کی یہی رنگا رنگی، اور بوقلمونی ہندوستانی شخصیت کا خاصہ ہے۔ ہندی مسلمان بھی اسی شخصیت کا ایک عنصر ہیں۔ وہ علاحدہ بھی ہیں اور گھلے ملے بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی مخصوص تہذیبی اور تمدنی زندگی کے مختلف تاثرات، مختلف شعبوں میں ہمارے سماج پر چھوڑے ہیں تو زندگی کے بہت سے شعبوں میں ملکی اور مقامی رنگ روپ بھی قبول کیا ہے۔

قبول و رد کا یہ عمل ہر ملک کی اقلیتوں میں جاری و ساری رہتا ہے اور اسی کو اس سلسلے میں حرف آخر سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس سلسلے میں اکثریت کو یہ حق دینا چاہیں گے اور یہی چاہتے بھی ہیں۔ فرقہ وارانہ تناؤ کی بنیادیں یہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ یوں بھی میں اسے غیر جمہوری اقدام کہوں گا۔ کلچر، تہذیب، تمدن مذہب اور رسم و رواج کے سلسلے میں داخلی عوامل زیادہ کام کرتے ہیں۔ خارجی کشمکش اور تصادم کے بل بوتے پر کسی اقلیت کے کلچر، اس کے مذہب اس کی تہذیب اور تمدنی زندگی کو دبانا نامناسب اقدام کے مترادف ہوگا۔ یہ اقدام کامیاب بھی نہیں ہوتا۔ اقلیت کی شخصیت چوٹ کھا کر ابھرتی ہے۔ اور اس میں علاحدگی پسند خیالات اور زیادہ بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں کی منفرد شخصیت کا تحفظ صرف ہندی مسلمانوں کا فرض نہیں ہے۔ اکثریت اس کے لیے برابر کی ذمہ دار ہے اور اسے اس ذمے داری کو قبول کرنا چاہیے۔

لیکن صرف کلچر، تہذیب، مذہب، تمدن کی حفاظت سے ہندی مسلمانوں کے سب کام پورے نہیں ہوتے۔ یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر کلچر کے رنگا رنگ دھارے ہیں تو اس کے برعکس ہماری قومی معیشت اور اس کے مسائل ایک سے ہیں اور یہ وہ مسائل ہیں جہاں ہندو اور مسلمان سکھ اور عیسائی سب کو یکجا ہو کر ان سے نپٹنا ہے۔ غریبی، جہالت، بے کاری، زراعتی اور صنعتی پسماندگی ایسے مسائل ہیں جو ہندو اور مسلمان میں کوئی تفریق

نہیں کرتے اور نہ ان مسائل کا علاج فرقہ وارانہ سیاست کے
بات میں ہے۔ ان مسائل کا علاج وہی سیکولر اور غیر جمہوری جماعتیں
کرسکتی ہیں جو غیر فرقہ وارانہ انسان دوستی، مساوات اور سائنسی
زاویہ نگاہ میں یقین رکھتی ہوں ایسی کسی ایک جماعت میں یا ایک سے
زیادہ تعداد میں شامل ہو کر ان مشترکہ مسائل سے عہدہ برا ہونے
کی کاوش اور جد و جہد کرنی چاہیئے۔ اس طرح جو لوگ ہندو
اور مسلمان اپنی قومی معیشت کے مسائل کو اکٹھے رہ کر اور کندھے
سے کندھا لگا کر حل کرتے جائیں گے تو دھیرے دھیرے ایک
قومی مزاج کی تشکیل ہوتی جائے گی اس منزل تک پہونچنے کے
لئے اکثریت اور اقلیت دونوں کے دلوں میں صبر، قوت برداشت
اور رواداری کی روح کا ہونا بہت ضروری ہے اب تک تعصبات اور
ایک بے روح زنگ آلود متعصب سیاست کی کارفرمائی نے اب تک اکثریت کو اقلیت
سے اور اقلیت کو اکثریت سے الگ اور جدا رکھا ہے۔ ●

تیرہ سو برس گزر گئے مگر...

مذہب کے معاملے میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال
کرکے دیکھو۔ اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک، شیعہ اور سنی کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے جس
کے واقعہ کو آج کچھ کم تیرہ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنھوں نے
لیا۔ حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ نہیں حق اوروں کا تھا ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھا جائے کہ انھوں نے
اپنا حق آپ کیوں نہ لیا۔ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا، اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے لے کر اس
وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں! اچھا جب یہ
صورت ہے تو آج تیرہ سو برس کے بعد اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا
ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں دوست
ہوں تو دشمنی ہو جائے۔ دنیا، جو مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ اس کا وقت کار ہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے
میں جا الجھے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند ٹکڑے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے، بہت خوب
تم ہی حق پر سہی۔ لیکن انھوں نے نے سکوت اور صبر کیا۔ پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور
سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی، اور بھٹیاروں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا
انسانیت ہے! کیا تہذیب ہے؟ اور کیا حسن خلق ہے۔؟

مولانا محمد حسین آزاد

مصنف :- ڈاکٹر ایشور ٹوپا   تلخیص : عبدالغفار

ہندستانی مسلم حکمرانوں کے سیاسی اصول

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے بہت پہلے تقریباً دو صدیوں پہلے آٹھویں صدی عیسوی کے آخر تک ہندوستان اور مسلم ممالک میں تجارتی علمی اور تمدنی میل جول کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ اُس زمانے میں عربوں کی تجارت چین تک پھیلی ہوئی تھی، اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھی اپنی تجارتی منڈیاں قائم کرلی تھیں۔

ملابار کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ایک بار عجمی درویشوں اور عرب سوداگروں کا تجارتی بیڑا طوفان آجانے کی وجہ سے ملابار کے ساحل سے آلگا۔ ملاباری راجا زمورین ان کی آؤ بھگت کی وہ اُن کے مذہب کے اُصولوں سے متاثر ہوا اور اسلام کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے ساتھ ہولیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے عرب کا زرّیں عہد خلافت دیکھا اور اپنے وزراء کے پاس مسلمانوں کو مذہبی مراعات اور مذہبی آزادی دینے کے لئے فرمان بھیجا۔ ہندوستان لوٹتے ہوئے زمورین کا سمندری سفر میں انتقال ہوگیا۔ مگر زمورین کی تعمیل کی گئی۔ اس طرح ملابار میں مسلمانوں کی آمد سے ایک نئے تہذیبی باب کا اضافہ ہوا اور رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کے ایک مخلوط کلچر نے جنم لیا۔

عین سے تجارت کے زمانے ہی میں مسلمانوں کا لنکا میں آنا جانا شروع ہو چکا تھا۔ لنکا میں ایک پہاڑی ہے جسے مسلمان حضرت آدم کا، بدھی گوتم بدھ کا اور شیومتی شیو کا نقش قدم کہتے ہیں۔ اس طرح لنکا میں ایک متبرک مقام کی وجہ سے تین مختلف تہذیبوں کا سنگم ہوا جس سے وہاں کی عام زندگی متاثر ہوئی اور ایک مخلوط تہذیب ظہور پذیر ہوئی۔

ساحلی علاقوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندرونی علاقوں میں بھی مسلمانوں کے قدم پہنچ گئے۔ اِدھر شمال میں ملتان سے لیکر کشمیر اور اُدھر کچھ سے لے کر گجرات تک کے علاقوں میں مسلمان پھیلنے لگے۔ ان کی آمد سے ہندستان میں تجارتی اور صنعتی ترقی ہوئی۔ اس لیے انھیں ہر قسم کی مراعات دی گئیں اور اپنی رعایا سمجھ کر اُن کے ساتھ انصاف، رواداری اور محبت کا برتاؤ کیا گیا۔ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو نہ صرف مذہبی آزادی اور اشاعت کی اجازت دی بلکہ خود اُنھوں نے اِسلام سمجھنے اور سیکھنے کی عملی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنے سفیروں کو مُسلم ممالک میں بھیجا، علمائے اسلام کو ہندستان آنے کی دعوت دی اور قرآن کے ترجمے کرائے۔

سلطان منصور کے زمانے میں عرب و ہند میں علمی اور تہذیبی تعلقات استوار ہوئے اور مسلمانوں نے ہندُستانی علوم کو سیکھ کر دنیا میں عام کیا۔ بُدھ پنڈتوں کا ایک وفد ہندستان کا بیش بہا علمی خزانہ لے کر عراق گیا تاکہ اُسے سلطان منصور کے دارِ ترجمے میں عربی زبان میں منتقل کیا جا سکے۔ ایک بڑی جماعت مسلم علما کی اُن بُدھ پنڈتوں کی شاگرد بن گئی اور ان میں سے بعض نے ناقابلِ فراموش خدمات، ہندُستانی علوم کی اشاعت میں انجام دیں۔ بُدھ پنڈتوں کے اُن شاگردوں میں سے ایک البیرونی تھا۔

جن ہندُستانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا وہ طب، نجوم، موسیقی، کیمیا، منطق، ہیئت، جغرافیہ اور ادب وغیرہ موضوعات پر تھیں۔ حساب کا علم بھی ہندستان سے عرب پہنچا۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی کی کاوشوں سے ہندی حساب عربی قالب میں ڈھالا گیا۔ جو بدھ متی پنڈت ہندستان سے گئے، ان کے نام ہیں : بھیلا، منکہ، بازیگر، قلبوقل، سندباد۔ احیائے خاندان برامکہ کے زمانے میں جن ہندُستانی اطبّا نے عربی زبان میں طب اور نجوم پر کتابوں کا ترجمہ کیا، اُن کے نام، باکھراجا، منکہ، داہر، انکہ، زنگل، اریکل، جبحر، عندی اور جباری ہیں۔ اِن ہندستانی علما اور اطبّا نے مسلم شاگردوں کو بڑی لگن سے ہندستانی علوم سکھائے اور ابراہیم رازی اور یعقوب بن طارق جیسے عالم اور محقق پیدا کئے۔ یہ علمی سلسلہ بغداد سے لے کر اسپین تک بڑھتا گیا۔ ہندستانی ودیا کے اکتساب اور استحصال میں جن عربوں نے نمایاں حصّہ لیا، وہ ہیں حسن بن صباح، احسن بن حبیب، فضل بن حاتم، تبریزی، احمد بن عبداللہ مروضی

عہد اشرافیہ اور ابوریحان بیرونی، جو ہند اسلامی علمی اشتراک کے سلسلے کا آخری بڑا عالم تھا اور ایک علمی و تہذیبی سفیر کی حیثیت سے یہ بھی اس کا مسلک تھا کہ ایک ملک دوسرے ملک والوں کو صحیح معنوں میں سمجھ سکے۔ البیرونی ایک سائنسی ذہن کا آدمی تھا اس کی ساری زندگی تحصیل علم میں گذری، جس وقت محمود غزنوی ہندوستان پر حملے کر رہا تھا، البیرونی بنارس میں پنڈتوں سے سنسکرت سیکھ رہا تھا۔ آخر میں اس کے استادوں نے اسے ودیا ساگر کا خطاب دیا۔ اس نے متنوع موضوعات پر اعلیٰ پائے کی کتابیں لکھیں۔ کتاب الہند کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ ہندی اور اسلامی تہذیبوں کا زبردست عالم اور محقق تھا، اس کا علمی ذوق غیر متعصبانہ تھا۔ وہ اس بات پر رنجیدہ تھا کہ محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے گی۔

چوسر اور شطرنج کے کھیل بھی ہندوستان سے عرب پہنچے۔ یعقوبی ہندوستان کی تاریخ میں لکھتا ہے کہ یہ دونوں دو فلسفیانہ دبستانوں کی تشریح کرتے ہیں، چوسر کا کھیل یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان دنیا میں جبر کے قانون کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے اور وہی کچھ پاتا یا کھوتا ہے جو اس کی قسمت میں ہوتا ہے، اس کے برخلاف شطرنج کا کھیل یہ بتاتا ہے کہ انسان جو کچھ حاصل کرتا یا کھوتا ہے اس کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

عربی عہدِ حکومت

مسلمانوں کے ذہن میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کا خیال سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں پیدا ہوا لیکن اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ایک وفد بھیجا گیا کہ ہندوستان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ وہ مہم کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تقریباً دو سو برس تک بری اور بحری دونوں راستوں سے ہندوستان فتح کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ بحری مہم میں عربوں نے سندھ فتح کر لیا۔ سندھ کی فتح یابی کے بعد محمد بن قاسم نے وہاں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان میں عربی حکومت دو سو برس تک رہی۔ عربی حکومت نے رعایا کے ساتھ رواداری برتی، حاکم و محکوم قوموں میں تہذیبی و معاشرتی تعلقات استوار ہوتے اور ایک نئی ہند عرب تہذیب نے جنم لیا۔ ہندی زبان، ہندی رسم و رواج اور ہندی زندگی کے تصورات پر اس مخلوط تہذیب کا گہرا اثر ہوا۔ عرب یہاں سے مہمیں اٹھاتے ہوئے قنوج تک پہنچے لیکن انہیں وہاں استحکام حاصل نہ ہو سکا اور انہیں واپس لوٹنا پڑا۔

۱۰ ویں صدی کے وسط میں ایشیا کے کئی ممالک کی سیاسی حالت میں کمزوری پیدا ہونے لگی، اس انتشار کے دور میں ترک فوجی افسروں نے سر اٹھایا اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کر لیں، اس طرح غزنی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

غزنوی حکمرانوں کے ابتدائی عہد میں شاہ کابل نے ان سے فوجی آزمائش اس لیے کی کہ ان کے سیاسی اثر اور تنظیم کو توڑا جائے، یہ تصادم ہندو مسلمانوں کا پہلا تصادم تھا، اس میں غزنویوں کو کامیابی ہوئی۔ غزنوی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ ایک مضبوط اور پائدار حکومت کے لیے سرحدی قلعوں پر قبضہ اور دولت کا حصول ضروری ہے۔ سلطان سبکتگین نے پہلے سرحدی قلعوں پر قبضہ کیا، پھر بلوچستان پر حملہ آور ہوا۔ راجہ جے پال اور افغان و ترک قبیلے ہندوستان کی سرحد کی حفاظت نہ کر سکے اور سبکتگین نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کی سرحدی قوت کو ختم کر دیا۔

غزنوی عہدِ حکومت

سلطان سبکتگین نے غزنوی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کیا۔ سلطان محمود نے غزنوی حکومت کی تعمیر کی۔ ۱۱ ویں صدی کے "نظام سیاست" میں دولت اور حکومت کو ہم نام شے سمجھا گیا۔ "دولت کے معنی سیاسی اقتدار اعلیٰ اور سیاسی اقتدار اعلیٰ بغیر دولت کے ممکن نہیں"۔ اسی اصول کے تحت محمود کی تربیت ہوئی، وہ غزنوی حکمرانوں میں سب سے زیرک ترین حکمران تھا۔

ہماری رعایا کا عام جذبۂ نفرت اور عدم اعتماد ہے۔ لیکن محمد تغلق نے آخر دم تک اپنے رویّے میں تبدیلی نہ کی۔ اُس نے رعایا کے لڑائی کے چیلنج کو قبول کیا اور ایک حاکم کی حیثیت سے لڑا۔

فیروز شاہی عہدِ حکومت

محمد تغلق کی موت کے بعد فیروز شاہ تخت پر بیٹھا۔ اُس نے سیاسی شورشوں کو اپنی حکمت عملی سے دور کیا اور ایک فرمان کے ذریعے دو کروڑ تنکوں کا 'رعایا کی جانب سے' دورِ تغلق کا بقایا معاف کر دیا۔ فیروز شاہ ایک انسان پرور حاکم تھا۔ اُس نے جہاں گیری کے بجائے جہاں بانی کے اُصولوں کو پیش نظر رکھا۔ اشوک کی طرح فیروز شاہ نے بھی ظلم و ستم اور جنگ و جدل کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ خدا کی حکومت کو زمین کے اوپر قائم کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا نظام حکومت اسلامی اُصولوں کی حد بندی میں جکڑا ہوا تھا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک میں بہت سے غیر شرعی ٹیکس لئے جاتے تھے، فیروز شاہ نے اُسے منسوخ کر دیا اور صرف شرعی ٹیکس قائم رکھے۔ یعنی:۔

خراج : قابل کاشت زمین کے مالک سے ½ حصّا زمین کی پیداوار کا محصول کی صورت میں لیا جاتا تھا۔

زکات : صرف مسلم فرقے سے لیا جاتا تھا، اس کی آمدنی بیت المال کے لئے وقف ہوتی تھی۔

جزیا :۔ یہ ایک قسم کا ٹیکس تھا، جسے اسلامی مملکت غیر مسلموں سے وصول کرکے، ان کے سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی حقوق کی حفاظت کرتی تھی۔

خمس :۔ خمس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ مفتوحہ علاقوں کے مالِ غنیمت کا ⅕ حصّا حکومت کو لینا چاہئے اور ⅘ حصّا فوج میں تقسیم ہونا چاہئے۔ "فتوحات فیروز شاہی" سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں میں فیروز شاہ کے علاوہ کسی نے اِس قانون پر عمل نہ کیا۔

فیروز شاہ نے زمین و لگان کے سلسلے میں پرانے قوانین و ضوابط کو منسوخ کر دیا اور نئی شرح زمین کی پیداوار کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے متعین کی۔ فیروز شاہ پہلا بادشاہ تھا جس کی حکومت پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ فیروز سے پہلے ہندوستان میں جو مسلم بادشاہ ہوئے وہ دراصل سیاسی قوتوں کی پیداوار تھے اور ہندوستان کے متضاد سیاسی حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا۔

اگرچہ فیروز شاہ ایک رعایا پرور اور امن پسند بادشاہ تھا، لیکن ایک مذہبی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تنگ نظر اور قدامت پرست تھا۔ علماء کا اُمورِ حکمرانی میں ضرورت سے زیادہ دخل تھا... محمد تغلق نے علما کی سیاست میں مداخلت کو روکا اور ان کے مذہبی اثر کو توڑا تھا۔ اُس کے زمانے کی مذہبی دنیا میں مختلف مکتبِ خیال کے علمبرداروں نے وحدت سے لے کر دہریت تک کے نعرے لگائے تھے، فلسفہ انا الحق کا پرچار بھی کیا تھا اور امام مہدی کی آمد کا اعلان بھی، لیکن محمد تغلق اُن فتنوں کو فرو نہ کر سکا تھا۔ فیروز شاہ نے اسلامی طرز کی حکومت تشکیل دینے کے لئے ملک کو تمام بداعتقادانہ رجحانات سے پاک کیا، جس کی لپیٹ میں ہندو بھی آ گئے۔ اُنھیں نئے مندر تعمیر کرنے کا اختیار نہ رہا۔ تغلق پور، صالح پور اور کوہانا میں ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کیا گیا۔

ہندستانی مُسلم راج، کا سرسری جائزہ

بعض مورخین کا یہ خیال تعصب، جہالت اور کوتاہ نظری پر مبنی ہے کہ مسلم حکمرانوں کا ہندو رعایا سے برتاؤ "اسلام قبول کرو یا جان سے ہاتھ دھوؤ" کا تھا۔ اسلام کی بطور مذہب توسیع و اشاعت صوفیوں اور درویشوں کی رہینِ منت ہے، جو دنیا کے مختلف گوشوں میں جا کر امن و سلامتی کا پیغام پہنچاتے رہے اور اسلامی تہذیب کی تشکیل کرتے رہے، مُسلم بادشاہ صرف بساطِ سیاست کے مہرے بنے رہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلم ممالک میں چند کو چھوڑ کر جتنے بھی خلفا ہوئے انھوں نے اقتدار کی ہوس اور اولوالعزمی کو اپنا شعار بنایا۔ اس کے علاوہ مسلم حکمرانوں کا باہمی افتراق و انتشار اور اُن کی آپس کی جنگیں ظاہر کرتی ہیں کہ ایک خدا، ایک مذہب اور ایک کتاب کے ماننے والوں کی اسلامی دنیا میں بھی یک جہتی اور اتحاد کا فقدان رہا اور حضرت محمدؐ کی وفات کے ۱۷ برس بعد اصلی اسلامی سیاست دنیا سے غائب ہو گئی۔

غرض کہ جتنی بھی مسلم مملکتیں وجود میں آئیں وہ اپنی علاقائی خصوصیات

محمود نے ہندوستان پر 17 حملے کئے، ان حملوں کا سب سے بڑا مقصد ہندوستان کی دولت لوٹنا تھا۔ اُس نے عظیم الشان مندروں کو خوب لوٹا جو خزانوں سے بھرے ہوئے تھے اور اُن مندروں کو ہاتھ بھی نہ لگایا جن میں دولت نہ تھی۔ تاریخ بیہقی سے اس کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اُس نے مُسلم علاقوں میں بھی اسی طرح غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا جس طرح ہندوستان میں۔ اِن باتوں سے پتا چلتا ہے کہ اُس کا مقصد اسلام کی توسیع تھا نہ کفر دشمنی۔ اُس کی مہموں میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ مذہبی نہ تھا بلکہ سیاسی، معاشی اور دُنیوی اغراض کی تکمیل کا تھا۔ وہ ایک جری سپہ سالار ضرور تھا لیکن ایک دُور اندیش سیاست داں نہیں۔ اُس نے غزنی کو ایک ممتاز تہذیبی مرکز بنایا لیکن ایک پائے دارِ حکومت قائم نہ کر سکا۔

غزنوی حکمرانوں کی سیاسی تربیت دراصل تُرکی روایات اور ماحول میں ہوئی تھی، اُن کے مزاج و طبیعت، تہذیب و معاشرت سب پر تُرکی اثر تھا۔ ہندوستانی ریاستوں سے محمود غزنوی کے معاہدے اُس زمانے کے عام سیاسی اصولوں کے تحت تھے نہ کہ اسلامی اُصولوں پر۔ غزنوی حکمرانوں کی فوج میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں، ہندوؤں اور جاٹوں کی پلٹنیں بھی تھیں، اُن میں بڑے بڑے فوجی افسر بھی تھے اور مسلم علاقوں پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجا جاتا تھا۔

غوری عہدِ حکومت

غوریوں میں سیاسی تنظیم اور دولت کی کمی تھی، اُنھوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے مذہب کا سہارا لیا۔ لشکری اتحاد اور عوام آزمائی کے لئے اُنھوں نے 'اسلام خطرے میں ہے اور جہاد فرض ہے' کے نعرے بلند کئے۔ ہندوستان پر حملوں میں اُن کو اکثر شکست اور بعض مرتبہ کامیابی حاصل ہوئی۔ دیسی ریاستوں سے اُن کے جو معاہدے ہوئے وہ ہندوستان میں مروّجہ شرائط پر مبنی تھے۔ غوریوں نے ہندوستانی رجواڑوں سے شادی بیاہ کے تعلقات بھی جوڑے۔ قطب الدین ایبک ایک جری سپہ سالار اور زبردست تنظیمی صلاحیت کا مالک تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے اپنا دارِ حکومت غزنی سے ہٹا کر ہندوستان میں منتقل کیا۔ قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کا زمانہ فوجی طبقے میں انتشار، باہمی رشک و حسد اور سیاسی رجحانات کے تضاد کا ایک نازک دور تھا۔ التمش کی راہ میں تُرک شیفتگی حائل تھی، وہ ایک حاکم کی حیثیت سے مسلوں کی چھان بین نہ کر سکا، صرف یہی کوشش کرتا رہا کہ تُرکی جماعت کے جذبات کو کہیں ٹھیس نہ لگے، اُس کے دورِ حکومت میں تُرکی فوجی طبقہ زیادہ دخیل تھا۔

بلبن کا عہدِ حکومت

التمش کے نراجی دور کے بعد غیاث الدین بلبن پہلا مسلم حکمران تھا جس نے مستحکم شہنشاہیت کو قائم کیا، مورخین اُسے بے رحم آمر بتاتے ہیں لیکن اُس نے آمرانہ اقتدار کو سیاسی شورشوں اور نراجی فتنوں کے سدِ باب کے لئے استعمال کیا۔ بادشاہت کے متعلق بلبن کا نظریہ تھا کہ "بادشاہت خدا کی طرف سے بندے کو دی گئی امانت ہے اور حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کے احکام پر عمل پیرا ہو کر رعایا کو حکومت کے ذریعے امن و انصاف اور تہذیبی رواداری کا پابند کرے۔" عملی ہونے کی حیثیت سے اُس نے اس پر عمل کیا اگرچہ اُس کی دلی آرزو تھی کہ ایک اسلامی حکومت قائم کرے لیکن حکمرانی کے اُصولوں اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے وہ مجبور ہو گیا کہ مذہب کا دخل سیاست میں نہ ہونے دے۔

کیقبادی عہدِ حکومت

بلبن کے تھوڑے عرصے بعد کیقباد کے زمانۂ بادشاہت میں ہندستانی تہذیب نے ایک اور کروٹ لی۔ اُس دور میں ہند اسلامی عناصر تہذیب کے میدان میں اپنے اپنے کمال کا اظہار کر رہے تھے اور ایک مِلا جُلا کلچر اپنی شکل نکھرتا دکھائی دے رہا تھا۔ امیر خسرو اُسی زمانے کی عدیم مثال ہستی ہے۔ کیقباد ایک عشرت پسند بادشاہ تھا، اُس کا کہنا تھا کہ زندگی کی خُشیوں اور مسرتوں میں ہر انسان برابر کا شریک ہے۔" اُس نے رعایا کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی۔ کیقباد کے زمانے میں بعض سیاسی مسئلوں پر بھی غور و فکر کیا گیا، جیسے حکومت کے فرائض، ملک کی خُشحالی اور رعایا کی فلاح و بہبودی کی تدابیر، حکومت کی تنظیم و استحکام کے طریقے، حکمرانی میں مشیروں کی ضرورت اور حکومت کے لئے دستور کی پابندی وغیرہ۔

5

خلجی عہدِ حکومت

کیقباد کے بعد خلجی بادشاہت کا دور شروع ہوا، جلال الدین خلجی ایک انصاف دوست بادشاہ تھا، گو جلال الدین کی تمام عمر میدان جنگ میں کٹی، لیکن اُس نے اپنی طبیعت پر جنگجویانہ اثر نہ آنے دیا، اُس نے اپنے نوجوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر بادشاہت کا مقصد ملک گیری اور غارتگری ہے تو وہ اِس قابل نہیں اور بادشاہت سے دست بردار ہونے کو تیار ہے۔ اُس کے سامنے باغیوں کو کبھی گرفتار کر کے لایا جاتا تو وہ پند و نصیحت کر کے اُنھیں رہا کر دیتا۔ اُس کے ایسے غیر سیاسی طرزِ عمل سے ظاہر ہے کہ وہ سیاسی قانون اور ضابطوں کو لغو اور غیر اہم سمجھتا تھا ...

جلال الدین کے قتل کے بعد علاؤالدین تخت پر بیٹھا جو ایک سیاسی سمجھ بوجھ کا سلجھا ہوا انسان تھا۔ اُس کے نزدیک دولت اور بادشاہت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے، اُس نے دولت کے بل پر شاہی تخت حاصل کیا، دولت لٹا کر عوام کی مخالفت اور دشمنی کو ختم کیا اور اُن کی خوشنودی حاصل کی۔ امیر طبقے کی دولت باغیانہ جذبات اور سازشیں پیدا کرتی تھیں، اُس نے اُن کی دولت چھین لی۔ اُس زمانے میں حکومت کے خلاف چھوٹی چھوٹی حریفانہ قوتیں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے علاؤالدین کا جبر و تشدد اور اُس کی سیاسی کارروائیاں حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھیں جس سے ملک میں امن و امان قائم ہوا۔

اُس کی غذائی پالیسی، سیاسی مجبوریوں کا نتیجہ تھی نہ کہ محض معاشی سدھار کے لئے۔ علاءالدین کی نظر میں مذہب اور سیاست دو علاحدہ علاحدہ دنیائیں تھیں، وہ مذہب کو حکومت کے کاموں میں خارج سمجھتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ فرقہ واریت کے فتنے کو صرف سیاسی تدبیروں سے دور کیا جا سکتا ہے، مذہب فرقہ واریت کے شعلے کو اور ہوا دیتا ہے۔

کیقباد کے زمانے میں جس "ہندو مسلم" کلچر کی ابتدا پڑی تھی، اُسے خلجی عہد میں فروغ حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ شاہی دربار اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا اثر و اقتدار بڑھتا گیا، یہاں تک کہ مبارک شاہ بادشاہ بنا تو ہندوؤں کا اثر حکومت پر حاوی تھا۔

تغلق عہدِ حکومت

اس کے بعد تغلق دور شروع ہوا۔ غیاث الدین کی رہنمائی

انصاف پسندی اور رعایا پروری اس کے حکومتی نظام کے اصولوں میں صاف نظر آتی ہے ..... غیاث الدین تغلق کے بیٹے محمد تغلق جیسا جدت پسند اور نئے خیالوں والا حاکم شاید ہی کبھی دلّی کے تخت پر بیٹھا ہو۔ وہ مختلف علوم و فنون کا ماہر تھا۔ اُس نے انتظامی اداروں کو نئے ڈھنگ سے چلانے کی کوشش کی، ملک کے ماحول اور لوگوں کی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنا چاہی اور بادشاہ اور رعایا کے رشتے کو مضبوط اور پائیدار بنانا چاہا لیکن اُس وقت کا قدامت پرست سماج اس کا ساتھ نہ دے سکا۔

اُس زمانے کا عام طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ اعلیٰ انسانی جوہر صرف اونچی سوسائٹی کے افراد میں مل سکتے ہیں لیکن محمد تغلق نے پسماندہ طبقوں کی سرپرستی کی اور اُنھیں اونچے منصبوں پر فائز کیا۔ اِس بنا پر اُس زمانے کی اریسٹوکریسی نے اُسے اپنا دشمن سمجھا اور اُس کے خلاف سازشیں کیں۔

محمد تغلق غیر ملکیوں کو بہت عزیز رکھتا تھا، اُنھیں اُن کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق عہدے، ملازمتیں اور سہولتیں دیتا تھا۔ محمد تغلق کے خلاف سازشوں میں رعایا کا بدیسیوں کے ساتھ جذبۂ نفرت بھی کام کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ بدیسیوں نے بھی نمک حرامی کی۔

اُس نے حکومتی مصلحت کے لئے راجدھانی دولت آباد منتقل کرنا چاہی لیکن دلّی کو اُجاڑنے اور دولت آباد کو بسانے کے سلسلے میں اُس کا اقدام دانشمندانہ نہ تھا۔ طبقاتِ اکبری میں تغلق کے نئے سکے کے اجرائی کے اقدام کو سراہا گیا ہے، جو اُس نے سیاسی و معاشی ضرورت کے تحت رائج کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے بے اعتمادی اور کم عقلی سے اُس کی بھی پذیرائی نہ کی۔ قحط سالی کے زمانے میں غیر ذمے دار، نااہل اور بددیانت انتظامیہ کی وجہ سے وہ لوگوں کو راحت و اطمینان نہ پہنچا سکا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی اور بغاوتیں سر اٹھانے لگیں، محمد تغلق نے بھی جبر و تشدد کا بازار گرم کر دیا۔ اُس نے کہا "میں باغیوں کو سخت سے سخت سزائیں دوں گا، تاکہ وہ لوگ مصائب برداشت کر کے اچھے راستے پر لگ جائیں۔" ضیاءالدین برنی نے اُسے تخت چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ شہزادوں یا شاہ زادوں میں سے کسی اہل ترین شخص کو حکومت سونپ دی جائے کیوں کہ تمام سیاسی بیماریوں میں سب سے بڑی اور ہولناک

میں ڈھل گئیں اور ان کا ارادہ اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کرنا رہا۔ مسلم بادشاہ اسلام کے نہیں وقت اور زمانے کے پابند رہے۔ اُن کی ملک گیری کی ہوس اور ان کے سیاسی منصوبے اُن ہی کے درمیان نفاق و دشمنی کے بیج بو گئے اور اُن میں لڑائیاں ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے اوراق سے خون کی بو آتی ہے۔

ہندستان کے چند مسلم بادشاہوں نے علما کی مدد سے اسلام کی توسیع و اشاعت کی کوششیں کیں لیکن درباری فضاؤں میں پلے ہوئے علما خود اسلام کی روح سے ناواقف تھے، اسلام کو بے جا سخت اور کڑے قانون کی طرح پیش کرنا اور اُس پر عمل کرانا اُن کا شیوہ رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ علما کے طبقے نے اکثر بادشاہوں کو بدنام اور اُن کی حکومتوں کو متزلزل کیا اور اُن کا دامن مظلوم انسانوں کے خون سے ہمیشا داغ دار رہا۔

ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے بُت پرستی کے خلاف ردِّ عمل ہوتا رہا تھا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ وحدت کا اُصول انسانی تہذیب اور روحانیت کی جان ہے، لیکن ہمارے پروہتوں نے مسلم علما کی طرح کبھی زمانے کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور لوگوں کو اصل راہ سے گمراہ کرتے رہے۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندستان میں مذہبی گروہوں میں تصادم بھی ہوا لیکن تلوار کبھی نہیں اُٹھی اور جبر و تشدد سے کبھی مذہب نہیں بدلا گیا، اِس کی وجہ یہ بھی کہ ہندستانی مسلم حکم ران روادار تھے لیکن ۷ ویں صدی سے ۱۱ ویں صدی تک برہمنی تحریک، سیاسی قوتوں کی مدد سے ملک پر مسلط رہی۔ اُس نے صرف دھرم شاستر کے مذہب قائم رکھا اور تلوار اُٹھائے بغیر بدھ اور جین مذہبوں کے دائرۂ اثر کو اس طرح ختم کیا کہ تاریخ انگشت بدنداں ہے۔

محمد بن قاسم کے بعد صرف فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں اسلامی اُصولوں پر رکھیں۔ اُن کے علاوہ جتنے بادشاہ گذرے اسلامی قوانین پر عمل پیرا نہ رہے۔ مندروں کی مسماری کا محرک بھی کفر دشمنی کا جذبہ نہ تھا بلکہ اکثر ایسا ہوا کہ یہ مندر حکومت کے لوٹے ہوئے خزانوں سے تعمیر ہوئے تھے، ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ یہ مقدس عبادت گاہیں بد اخلاقی اور بدکاری کا گہوارہ بن گئی تھیں، یا پھر زمانۂ جنگ تھا کہ وہ تباہ ہوئے۔ یہ وجوہ ان کی مسماری کا باعث بنے۔ اِس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دورِ حکومت میں غیر مسلموں کے ہاتھوں مسجدیں بھی ڈھائی گئیں اور ایسے ثبوت بھی ملے ہیں کہ مسلمانوں نے مندروں کے لئے مستقل اوقاف قائم کئے۔ ذمیوں سے جزیا وصول کرنے کے بعد بھی ان پر جبر و ستم روا رکھنا کہاں کا اسلامی قانون ہے، جیسا کہ چند مسلم حکم رانوں کے دورِ حکومت میں اِس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اِن تمام باتوں سے یہی نتیجا برآمد ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلم حکمرانوں کو اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، اِسی لئے ان کے مُسلم مورّخین ہمیشا گِلہ مند رہے کہ اُنھوں نے اسلام کے لئے کچھ نہ کیا۔

اسلام کے سب سے بڑے خادم صوفیائے کرام تھے، جنھوں نے بادشاہوں کے آتشیں غضب اور زمانے کی بے رحم جبروت کی کبھی پروا نہ کی اور شاہی سرپرستی کی چھاؤں سے دُور خانقاہوں کے ٹمٹماتے دِیوں سے لوگوں کے دل ایمان کی روشنی سے منور کرتے رہے۔ اسلام کی خدمات میں اُن کے کارہائے نمایاں تاریخ اسلام کے روشن باب ہیں۔

اب ہم ہندستانی مُسلم حکم رانوں کے سیاسی نظریات کی تاریخ کو فیروز شاہ تغلق کے بعد پھر شروع کرتے ہیں۔ تغلق دور کے بعد افغانوں کا زمانا آیا، افغانوں میں ملک گیری کی ہوس تھی اور وسیع النظری و بلند خیالی کی کمی تھی۔ افغان حکم رانوں میں ایک نمایاں ترین شخصیت شیر شاہ سوری کی ہے، وہ ایک عقلمند اور دور اندیش سیاست داں اور مدبّر تھا، اُس نے عوامی فلاح و بہبودی کے ایسے کام کئے کہ اُس کا نام تاریخ میں ہمیشا یاد رکھا جائے گا۔

مسلم حکم ران اب بدیسی نہیں رہے تھے۔ وقت کی رفتار نے اُنھیں ہندیا لیا تھا، اب اُنھیں ملک کے اغراض و مقاصد سے گہری دلچسپی اور وابستگی ہو گئی تھی، اُنھوں نے ہندستانی طرزِ زندگی کو اپنایا اور ہندستانی اُصول و نظریات، رسوم و رواج، جذبات و عادات اور تہذیب و معاشرت نے اُن کی زندگی کا سانچا بدل ڈالا۔ اُنھوں نے اپنی ساری توانائی اور دولت ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف کر دی اور لوگوں کی فن کارانہ صلاحیتوں کو درجۂ کمال پر پہنچایا۔ اُن کا تخت اسلامی تھا لیکن تخلات ہندی، ہندستان کی وسیع

تب رعایا نے بھی ایسے مثالی حکمرانوں کو ظلِ الٰہی اور دیوتا سمجھا۔

مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی و سیاسی خصوصیات

مغلوں کے عہد سے قبل سیاسی و سماجی قوتوں نے تصادم و تجارب کی منزلوں سے گذر کر اپنی شکل کو نکھار لیا تھا۔ مغل راج کا آغاز بابر سے ہوتا ہے، بابر زمانے کی سختیوں کی آگ میں تپ کر کندن بن کر نکلا تھا، اُس کی سیاسی بصیرت نے تاڑ لیا تھا کہ مغل راج کے استحکام کے لئے گہری اور مضبوط بنیادوں کی ضرورت ہے۔ اُس نے انسانیت کے اعلا اُصولوں پر عمل پیرا ہوکر اِس ملک کے اجنبیوں کا دل موہ لیا، گرو نانک نے بابر کو راج نیتی کے سبق دیئے اور جہاں گیری و جہاں بانی کے اُصول بتائے۔ بابر نے ہمایوں کے نام اپنی وصیت میں مستحکم مغل سلطنت کے قیام کی تدابیر بتائی ہیں۔ بابر کی وصیت کا ہر مغل حکمران کسی نہ کسی اعتبار سے پابند رہا۔

وصیت میں بابر نے لکھا ہے کہ ہندوستان قسم قسم کی تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ یہاں کے باشندوں پر تلوار کے بل پر حکومت کرنا چنداں مشکل نہیں، لیکن اُن کے دلوں پر انصاف، رواداری، دادرسی، وسیع النظری اور اُن کے فلاح و بہبودی کے کاموں ہی سے حکومت کی جاسکتی ہے۔ ایک ہندوستانی تہذیب کے مختلف عنصروں میں اتحاد قائم رکھنا ہی حاکمِ وقت کی دانشمندی ہوگی۔ اِس وصیت کی روشنی میں بابر ایک زبردست سیاسی مفکر نظر آتا ہے۔ ہمایوں کو سیاسی انقلاب کی وجہ سے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کا موقع نہ مِل سکا۔ بابر کا خواب اکبر نے پورا کیا۔

اشوک اور اکبر دو ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے اپنے دلوں میں ہندوستانِ اعظم Greater India کا نقشہ جمایا اور ہندوستانِ اعظم کی تعمیر شمشیر و سناں سے نہیں، انسانی اصولوں اور کلچری اثاثے پر کرنا چاہی۔ اکبر نے عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی خامیوں اور قدامت پرستیوں کو دور کر کے "صلحِ کُل" کے نظریے اور ترقی پسندانہ اُصولوں پر ہندوستانی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ اکبر اِس بات کو خوب سمجھ گیا تھا کہ انسانی و تہذیبی اتحاد کی جڑ دراصل صلحِ کُل میں مضمر ہے۔ اکبر مذہب کو کتابی چیز نہ سمجھتا تھا۔ اُس کے عبادت خانے میں مختلف مذاہب کے علما دراصل مذہبی دنیاؤں میں اتحاد کی تحقیق و تلاش اور مذہب سے انسان کے رشتے کی حقیقت پر غور و فکر کرتے تھے۔ اُس کا دینِ الٰہی اِن ہی جستجوؤں کا نتیجہ تھا، اکبر کے دِل میں حق کی تلاش کی سچی تڑپ تھی، اگرچہ دینِ الٰہی مقبول نہ ہوسکا لیکن اکبری عہد کے کلچر میں اُس کا نمایاں حصّہ تھا۔ دراصل اشوک نے عہدِ وسطیٰ میں اکبر کے روپ میں جنم لے کر قدیم ہندوستان کو نئے ہندوستان کے رنگ میں ڈھالا تھا۔

اکبر کی دیسی ریاستوں کو ایک مرکز پر لانے کی کوششیں ہندوستانِ اعظم کے خواب کے تعبیر کے لئے تھیں۔ راجپوتوں کی فوج میں بھرتی، ہندوؤں سے شادی بیاہ اور تعلقات کی استواری، ہندوستانی رسوم و رواج کو اپنانا، یہ سب اکبر کی وہ سیاسی حکمتِ عملیاں تھیں، جن کی بنا پر مغل حکومت کی حفاظت و استحکام میں ہندی فوجوں کی وفاداری اور جاں نثاری بھی اسی طرح مسلّم ہے جس طرح مسلم فوجوں کی۔ غرض کہ اکبری دور مغل تاریخ کا نہیں ہندوستان کی تاریخ کا درخشاں باب تھا۔ جہانگیر باپ کے اعلا اُصولوں کا حامل اور اُس کا دور اکبری عہد کے سلسلے کی آخری کڑی تھا، انصاف جہانگیری نقطۂ نظر سے "امن کے دھاروں کا ایک سنگم ہے"۔ وہ ایک عظیم منصف، ایک اچھا مصنّف، ایک پرستارِ فطرت اور ایک وسیع النظر، کشادہ دِل عشرت پسند بادشاہ تھا۔

شاہ جہانی عہد کی فنّی یادگاریں ہمیں بتاتی ہیں کہ اُس کے عہد میں کلچر اور آرٹ کا ملاپ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ شاہ جہانی دور نے اپنے سماجی پس منظر میں جمالیاتی، نفسیاتی اور تہذیبی و تمدنی قدروں کو جِلا بخشی۔ کلچر اور آرٹ اُسی ملک میں پروان چڑھ سکتے ہیں جہاں امن، خوش حالی اور اطمینان کی نعمتیں میسّر ہوں اور شاہ جہاں کے عہد میں ان نعمتوں کی فراوانی تھی۔

مغلیہ سلطنت اورنگ زیب کے دورِ حکومت سے متزلزل ہونا شروع ہوتی ہے، اورنگ زیب کے بارے میں ہندی مورخین کا کہنا ہے کہ وہ متعصب اور تنگ نظر حکمران تھا اور ہندوستانی روایات اور اداروں کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ مسلم مورخین اُسے ایک آئیڈیل مسلم بادشاہ تصوّر کرتے ہیں جس کا مسلک ہندوستان میں

اسلامی راج قائم کرنا تھا، لیکن اُس زمانے کی تاریخ کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کو پہلے بارہ برسوں تک مغلیہ دستور اور طریقوں پر برقرار رکھا، اس کے بعد کے بارہ برسوں میں علما کے نظامِ حکومت میں عمل دخل اور ان کے دباؤ کی وجہ سے حکومت کو اسلامی ڈھنگ سے چلانے کی کوششیں ہوئیں۔ اورنگ زیب کی اسلامی سلطنت کا تخیل اکبرِ اعظم کے تخیل کا تضاد تھا۔

اورنگ زیب ایک خشک، زمانا ناشناس اور روکھا پھیکا انسان تھا وہ ایک سچا مسلمان بھی نہ تھا، وہ ہندوؤں سے جبریہ وصول کرنے کے باوجود اُن کی جان و مال کی حفاظت نہ کر سکا۔ لیکن اورنگ زیب میں ایک چھپا ہوا سیاست دان بھی موجود تھا، یہ اُس کے مندروں کے لئے اوقاف قائم کرنے اور نمک حلال غیر مسلم افسروں کو اعزاز و مرتبہ بخشنے سے ثابت ہوتا ہے، وہ ملک گیری کو شاہی کا مسلک قرار دیتا تھا اور فوج کی قوت کو حکومت کی جان سمجھتا تھا۔

اگرچہ اورنگ زیب کی سیاسی اور انتظامی کارکردگیوں سے زمانا اور لوگ متاثر ہوئے لیکن ملک کی اندرونی بےچینی، غیر مسلم رعایا کی بےاعتمادی، افسروں کی نمک حرامی، سیاسی شورشیں اور اس کی مذہب پرستی اُس کی اور سلطنتِ مغلیہ کی دشمن بنی۔

ہمارے بدکردار بزرگ ۴

پھول والوں کے میلے کی تقریب سے جب حضرت جہاں پناہ (اکبر شاہ ثانی) قطب صاحب کی درگاہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ اکثر سواری جھولنے پر جاتی تھی۔ حضرت راگ سنتے اور زنانے بندوبست میں نہانے کا تماشہ دیکھتے، خواصیں کس کس خوبی سے آپس میں چھیڑتی لڑتیاں اور جھنڈ کے جھنڈ باہم لپٹ کر کنارے سے پانی میں گر پڑتیاں، کوئی مسکرا کے بالوں کو نچوڑتی، کوئی شرما کر انگیا مروڑتی، ایک ایک کرکے کرتی چاک کرتی۔ دوسری شرم سے انگلی دانتوں میں پکڑتی، کوئی پکارتی، بُوا یہاں میں نہ جاؤ وہاں بڑا زور ہے، کوئی للکارتی دوگانہ چڑھا بڑا دیکھو تو کیا تو ڈوبی غرض اِن پری پیکروں کی چھیڑ چھاڑ اور آپس میں اختلاط کی حالتیں جنہوں نے دیکھی وہی جانتے ہیں لکھنے سے فائدہ، سننے والے کب سچ جانیں گے!

شاہ جہاں آباد کی خبر

اخبار جامِ جہاں نما

اُردو ضمیمہ یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء

تلخیص: جیوت چاولا

مصنف: جی ۔ ایم سید

قومیت، دینی حکومت اور جہاد

سندھ کے جی ایم سید اپنے وقت میں ایک با اثر لیڈر رہے ہیں۔ مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' کے مطالعے سے وہ میدانِ سیاست میں آئے اور اقبال کی ملی شاعری سے متاثر ہو کر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ابتدائی قومی وزارتوں کے دور (1937ء) میں وہ صوبہ سندھ کی مسلم لیگ وزارت کے وزیر اعلیٰ رہے۔ سید صاحب نے مسٹر جناح کی قیادت میں مطالبۂ پاکستان کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ مگر قیامِ پاکستان کے تھوڑے ہی دن بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے نقصان دہ رہی اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان ہندوستانی ملا اور اقبال کے سامراجی و فرقہ وارانہ نظریات سے پہنچا ہے۔ 1947ء کے بعد مسٹر جناح سید صاحب کے مخالف بن گئے اور اسی مخالفت کے نتیجے میں شاید سید صاحب آج تک جیل میں ہیں۔ حال ہی میں اُن کی تصنیف کردہ دو کتابیں 'پاکستان جو ماضی، حال ء مستقبل' (پاکستان کا ماضی حال اور مستقبل) اور 'سندھ جی کہانی، سید جی زبانی' (سندھ کی کہانی، سید کی زبانی) سندھی زبان میں شائع ہوئی ہیں جو حکومت پاکستان نے ممنوع قرار دے دی ہیں۔ یہاں سید صاحب کی دوسری کتاب کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے جو جناب جیوت چاولا نے سندھی زبان سے اردو میں تیار کی ہے۔ ——————— مترجم

'قوم' لفظ کا اطلاق مختلف زمانہ اور ممالک کے لوگوں کے یہاں الگ الگ رہا ہے۔ اس مسئلے کے تاریخی پس منظر پر اگر نظر ڈالی جائے تو قومیت کا ارتقائی تصور کم و بیش ان دوروں سے گزرا ہے:

1. نسلی بنیاد والی قوم۔
2. شہری زندگی کی حکومت والی قوم۔
3. مذہبی اعتقادات کے گرد ہونے والی قوم۔
4. سامراجی حکومت والی قوم۔
5. وطن کی بنیاد پر جدید تخیل والی قوم۔

فلسفۂ قومیت کے ماہرین نے 'قوم' بننے کے لئے جن باتوں کا ہونا ضروری سمجھا ہے اُن میں سے چند یہ ہیں:-

(1) ایک ہی نسل (2) ایک جیسا رسم و رواج (3) ایک ہی زبان (4) احساسِ ہم جنسیت (5) تاریخی روایات (6) جغرافیائی حدود کا وطن

(7) ایک سے مذہبی اعتقاد (8) ایک ہی کلچر (9) ایک ہی سیاسی اور اقتصادی مفاد (10) قومی کردار

ان سب باتوں کا وجود ہر قومی تخیل والی قوم میں ہونا لازمی نہیں رہا ہے مگر ہر قومی تخیل والا گروہ حالات کے مطابق ان میں سے چند اہم باتوں کا حامل ضرور رہا ہے۔

۱۔ نسلی بنیاد والی قوم کسی زمانے میں ایک ہی نسل کے قبیلہ یا کنبے کے لوگوں کو قوم کہا جاتا تھا۔ جیسے بنی ہاشم، بنی امیہ، بلوچ، براہوی، پٹھان، راجپوت وغیرہ۔ گو اس قبیلائی قوم کی بنیاد نسل پر تھی۔ مگر ان میں ایک ہی زبان، رسم و رواج، تاریخی روایات، وطن، باہمی سیاسی اور اقتصادی مفادات اور قبیلائی مذاہب کی یکسانیت کی وجہ سے ہم جنسیت کا احساس رہتا تھا۔ مگر کافی وقت گزرنے کے بعد مختلف نسلوں کے ملاپ، بڑی حکومتوں کے قیام، قبیلائی مذاہب کی جگہ پر عالمگیر مذاہب کے پیدا ہونے اور دوسرے کئی اسباب کی وجہ سے چند معدود ممالک کی یہ نسلی قومیت اپنی یک جہتی اور عصبیت گنوا بیٹھی ہے۔

2۔ شہری زندگی والی قوم ایک زمانہ ایسا بھی تھا جس میں ایک خاص شہر کے آس پاس میں رہنے والے لوگ خود کو قوم کہتے تھے۔ اور اس بنیاد پر انہوں نے اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔ یونان کے شہر ایتھنس اور اسپارٹا، اٹلی کے شہر روم کے شہریوں نے شہریت کی بنیاد پر خود کو قوم کہا۔

ان کی اس قومیت کی ثانوی بنیاد ایسی باتوں پر بھی تھی جنہیں قبیلائی وحدت کی خصوصیات شمار کیا جاتا تھا۔ البتہ آگے چل کر مذہبی اعتقادات کی یکسانیت کی شرط کم ہونے لگی۔ اگرچہ حکیم سقراط جس کو ایتھنس کے شہریوں نے عقائد کے اختلاف کی بنا پر زہر کا پیالہ پلا کر مارا تھا۔ مگر اس کے پیروکار اس اختلاف کی بنا پر ایتھنس قوم سے خارج نہیں ہو جاتے تھے۔

3۔ مذہبی اعتقادات پر مشتمل قوم کوئی وقت ایسا تھا جب ایک ہی مذہب کو ماننے والوں کو اس اشتراک کی وجہ سے قوم تسلیم کیا جاتا تھا۔ جیسے ہندو قوم، یہودی قوم، عیسائی قوم، مسلمان قوم وغیرہ۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں میں اجتماعی زندگی پیدا کرنے میں مذہبی نظریات کے عقائد نے کافی حصہ لیا ہے۔

قبائل کی عصبیتوں اور اختلافات کو کم کر کے بڑی جماعت بنانے میں مذاہب نے کافی سہارا دیا ہے۔ یورپ میں قبیلائی اختلافات اور عصبیتوں کو کم کر کے موجودہ مستقل اقوام کو وجود میں لانے کے لئے دوسرے کئی اسباب کے ساتھ مسیحیت بھی ایک سبب بنی۔ عربستان کے مختلف قبائل کو ان کی صدیوں کی خونریزی سے نجات دلا کر اسلام نے اُن میں کافی اتحاد پیدا کر دیا۔ مگر جب مذہب اپنے محدود دائرے سے باہر نکلا اور اس نے بین اقوامی صورت اختیار کی تو اس نے اپنا اثر کھو دیا۔ وہ اتحاد کے بجائے انتشار کا باعث بنا۔

مگر کیونکہ ان مذاہب کے بانی ہزاروں برس پہلے پیدا ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں اُن کی جائے پیدائش کے معاشرے کے حالات کچھ اور تھے۔ زمانے اور معاشرے کی تبدیلی، مختلف ممالک کی ضروریات زندگی، الگ الگ ممالک کے رہنے والوں کی تاریخی روایات، کلچر وغیرہ کی بنا پر مذہبی عقائد اور عمل میں ٹکراؤ پیدا ہونا اور پھر الگ الگ فرقوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اس لئے اُن کی ابتدائی ہم جنسیت اور یک جہتی کم ہونے لگی۔ مذہب شروعات میں لوگوں پر عقلمندی اور خوشی سے اثر انداز ہوتا تھا، مگر بدلتے ہوئے حالات میں ان کا اثر ٹوٹنے لگا۔ تب مذہب پرستوں نے اپنے مذہب کی زندگی کے لئے طاقت کا استعمال ضروری سمجھا۔

(الف) ہندو مذہب کے بانیکاروں نے حکومت اور مذہب کو علاحدہ علاحدہ جاتیوں کے سپرد کر دیا۔ حکومت کھتری راجاؤں کے ہاتھ میں رہی اور مذہب کا کاروبار براہمنوں کے حوالے رہا۔

(ب) عیسائیوں میں پہلے مذہب کا سیاسی معاملات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ مگر جب مذہب کے ابتدائی اثر میں کمی محسوس کی جانے لگی تو مذہب کے سرپرستوں نے مذہبی نظام قائم کر کے پاپائے روم کے ذریعے سیاسی طور پر حکومتوں پر اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ بات مذہب کے استحکام اور

فروغ کے لئے کارآمد ثابت ہوئی

(ب) بدھ دھرم کا شروع سے سیاست سے واسطہ نہیں تھا اور مذہبی فروغ کے لئے تبلیغ اور تزکیہ نفس ہی کو کافی سمجھا گیا تھا مگر آگے چل کر جب شہنشاہ اشوک نے بدھ دھرم کو سیاسی طور سے شدت کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کی تو ردعمل میں براہمنزم نے زور پکڑا اور بدھ دھرم کو ہندوستان سے باہر نکال دیا۔

(ت) اسلام بھی ابتدا میں سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ سوائے مختصر سے مدنی دور کے مگر رسول مقبول کے انتقال کے بعد تین خلیفاؤں کے دور حکومت میں مذہب کو سیاسی طور سے بڑھاوا دینے کی کوشش کی گئی جس کا مابعد اثر یہ ہوا کہ مسلمان سینکڑوں فرقوں میں بٹ گئے۔

4۔ شہنشاہی بنیادوں پر بنی ہوئی قوم — اس قسم کی قوم کا تصور چند سامراجی حکومتوں کا پیدا کیا ہوا ہے جس طرح رومن سامراج نے اپنے ماتحت اقوام کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ عرب سامراج، جرمن سامراج، پرتگالی سامراج، پاکستانی اور پنجابی سامراج وغیرہ۔ یہ سب اپنے ماتحت اقوام کو ایک مخصوص ذہنی تربیت اور تعلیم کے ذریعے ان کے قومی وجود کو ختم کر کے اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے تسلط میں لانے کا جواز پیدا کرتے ہیں۔

عربوں میں بنی امیہ گھرانے نے اپنا سامراج پھیلانے اور مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے مختلف ممالک پر حملے کئے اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا۔ نام اسلام کا لیا مگر بنی امیہ کا رویہ اسلام سے دور بھی واسطہ نہیں تھا۔ جرمن اور پرتگالی سامراج کے واقعات تازہ ہیں جن کے طریقہ کار اور نظریات کا سب کو پتہ ہے۔ میں نے سامراج کی اس فہرست میں پنجابی مستقل مفاد کو بھی سامراج کا نام دیا ہے۔ یہ بھی بنی امیہ سامراج کی نقل میں اسلام کے نام پر سندھی، بنگالی، بلوچ اور پختون اقوام پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے مسلم قوم کا نظریہ پیدا کر کے ان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مسلم قوم کے تشکیل کا جواز نہ قرآن پاک سے ملتا ہے نہ حدیث سے کیونکہ اس قومی نظریہ کا مدار تشدد اور دھوکا بازی پر ہوتا ہے اس لئے اس کا اثر زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔

5۔ جدید تخیل والی وطنی قوم — اس قسم کی قوم کی بنیاد ایک وطن، زبان، کلچر، قومی کردار، تاریخی روایات، اقتصادی اور سیاسی مفاد پر رکھی جاتی ہے۔ یہ تخیل پچھلے تین سو برس سے یورپ میں اور 50 برس سے ایشیا، افریقہ اور امریکا میں رائج ہے چونکہ دنیا کے اکثر ممالک اس نظریے کو مانتے ہیں۔ اس لئے اقوام متحدہ نے اسی نظریۂ قومیت کو تسلیم کر لیا ہے اور اسی کی بنیاد پر اقوام کو بطور ممبر قبول کیا ہے۔

مذہبی قومیں

مورخوں کو معلوم ہے کہ کس طرح تجربہ کی کسوٹی پر ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں نے مذہبی قومیت کی بنیاد پر سیاست کو مذہب کے ساتھ ملا کر چلانے سے جو نقصانات پیدا ہوئے ان سے بیزار ہو کر اس سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ اسی طرح سے دنیا کے کئی مسلمان ممالک نے بھی کافی تجربوں کے بعد مذہبی نظریہ قومیت کو خیرباد کہہ کر جدید وطنی نظریۂ قومیت کے مطابق حکومت چلانے کا راستہ اختیار کیا ہے مگر اب تک مسلم ممالک میں صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جس کا پنجابی حکمران طبقہ پاکستان میں شامل دوسری اقوام پر اپنا سامراج قائم رکھنے کے لئے اس فرسودہ نظریہ کا راگ الاپتا آرہا ہے۔

اسلام ایک نیا اور الگ مذہب ہے یا پیغمبر اسلام نے قدیم مذاہب کے ارتقائی نچوڑ کے امتزاج کا نام اسلام رکھا۔

مہاجر، پنجابی اور مولوی کچھ ہی کہے مگر قرآن شریف کی چند آیتیں یہ واضح کر دیتی ہیں کہ اسلام نیا مذہب نہیں ہے۔

" (پیغمبر) انہیں کہو کہ ہم اللہ اور اس کی طرف سے جو ہم پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں (اس کے علاوہ) جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، یعقوب اور ان کی اولاد، موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں پر خدا کی طرف سے نازل ہوا [illegible] پر ایمان لاتے ہیں اور ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے، اس لئے ہم مسلمان ہیں۔"

" (پیغمبر) انہیں کہو کہ کیوں اختلاف کرتے ہو اللہ میں۔ وہ ہمارا اور آپ کا پالنے والا ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال اور آپ کے لئے آپ کے

اعمال۔ ہم اس راہ ہدایت پر مستحکم ہیں!"

"کیوں کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، یعقوب اور اس کی اولاد یہودی یا نصاریٰ تھے۔ آپ کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو۔ جو حقائق کو چھپاتا ہے وہ بڑا ظالم ہے آپ کی اولاد (ارادوں اور نیتوں) سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔"

قرآن پاک میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خدا کی طرف سے ہر ملک، قوم و زمانے میں پیغمبر بھیجے گئے، جو سب دینِ فطرت پر تھے۔ دینِ فطرت اور اسلام ایک ہی بات ہے۔ اسی طرح کثرت مذاہب کے پیچھے بنیادی وحدت ثابت کرنے کے لئے یہ آیتیں گواہی دیتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ پر غور کرنے کے بعد صاحبِ نظر کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نیا مذہب نہیں ہے بلکہ کل مذاہب کی بنیادی تعلیم کا امتزاج (synthesis) ہے۔ یہودیوں، نصاریٰ اور دوسرے مذاہب کے کارکنوں نے خواہ مخواہ جدا فرقے پیدا کر کے انسانی ذات میں تفریق ڈالی۔ اسلام ان فرقوں کو مٹا کر کل انسانی ذات کو ایک ہی پیڑ کی شاخیں ثابت کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔

رسول مقبول صلعم کی زندگی کے دو ادوار تھے۔ پہلا دور مکے والی زندگی کا تھا اور دوسرا مدینہ والی زندگی کا۔

یہ حقیقت ہے کہ مکے والی زندگی میں انھوں نے سیاست سے علاحدہ رہ کر عدم تشدد کی بنیاد پر اسلامی تعلیم کی تبلیغ کی۔ مگر جب مخالفین نے ان کو تنگ کیا اور تکلیفیں دینے لگے تو پہلے انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ان تکالیف سے بچانے کے لئے حبش بھیجا اور پھر جب مخالفین اُن کے قتل پر آمادہ ہوئے تو وہ خود بھی ہجرت کر کے مدینے میں رہنے لگے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہاں رہ کر وہ آرام سے اسلام کی تعلیم اور تبلیغ کرتے رہیں گے۔ مگر وہاں بھی انہیں اختلاف رائے کی بنا پر مخالفین کا سامنا کرنا پڑا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے عدم تشدد والی پالیسی کو عارضی طور پر بدل کر مدافعت کا طریقہ اختیار کیا۔ مکے کی زندگی میں پالیسی کی بنیاد قرآن کی ان آیتوں پر تھی۔

"مذہب (نظریہ یا اعتقاد) کے معاملے میں تشدد کا استعمال نہ کرنا چاہیئے۔"

"آپ اپنے لئے اپنے عقائد قائم رکھئے اور ہم اپنے عقائد پر قائم رہیں۔"

اِن دونوں آیات کی تشریح جدید زمانے کی زبان میں یہ ہو سکتی ہے کہ مذاہب، نظریات اور عقائد کے معاملے میں عدم تشدد اور بقائے باہمی سے کام لینا چاہیئے۔ مگر آنحضرت نے مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر عارضی طور پر قرآن کے اس حکم پر عمل کیا۔

"مخالفین سے سختی برتو اور آپس میں محبت اور نرمی کا برتاؤ کرو۔"

رسول مقبول نے دو طرح کے حکم دیئے۔ ایک کا واسطہ زندگی کے بنیادی اصولوں سے تھا جو دائمی تھے اور دوسروں کا واسطہ پیدا ہونے والے حالات کی بنیاد پر تھا، جو عارضی تھے اور جن کا بنیادی اصولوں سے براہ راست واسطہ نہیں تھا۔ ان کی رحلت کے بعد اُن کے جانشینوں نے اپنی اپنی سہولت اور طبعی رجحانات کے مطابق الگ الگ راستے اختیار کئے۔

کچھ نے ان کے مکے والی زندگی والی دائمی تعلیم عدم تشدد اور بقائے باہمی کو اپنایا اور دوسروں نے مدینے والے عارضی احکامات کو اپنے دنیوی مفاد کے لئے کارآمد سمجھ کر اس کی پیروی کی۔

پہلے اہلِ طریقت کہے گئے اور دوسرے شریعت کے پیروکار۔ پہلے کے ماننے والے حضرت علی تھے اور دوسرے کے حامی پہلے تین خلیفہ تھے۔

پہلے کا مقصد مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنا تھا۔

دوسرے کا مقصد مذہب کو سیاست سے ملا کر چلانا تھا۔

پہلے کا کہنا تھا کہ اسلام اتحادِ انسانی، امنِ عالم اور ترقی بنی آدم کا دین ہے اس کی تعلیم اور تبلیغ کے لئے زور، زبردستی کا استعمال احکامِ خداوندی کے خلاف تھا۔ انھوں نے اپنے عقیدے کی حمایت میں یہ آیت پیش کی۔

"لوگوں کو راہِ حق کی طرف دانائی اور نیک نصیحت کے ذریعے بلایئے۔ یہ راستہ بہتر ہے۔ خدائے تعالیٰ لوگوں کی نیک اور بُری [illegible] سے واقف ہے اس کو راہِ حق کے طلب گاروں کا علم ہے۔" رسول مقبول کی یہ حدیث پہلے نظریئے والے اپنے راہبر کی حمایت میں

پیش کرتے ہیں ۔

"دینی علم کا مرکز ہوں ۔علی اُس کو پہنچانے کا راستہ ہیں ۔"

جس کا مطلب یہ ہے کہ دروحق کی چابی حضرت علی کے پاس تھی ۔حضرت علی کا قبیلہ بنی ہاشمی چھوٹا تھا ۔اس لئے عربوں کی کثرت نے دنیوی اقتدار کو ترجیح دی ۔یہاں تک کہ رسول مقبول کی لاش مقدس دفن نہیں ہو پائی تھی کہ دوسرے نظریئے والے اقتدار کے حصول کے لئے فیصلے میں مشغول رہے ۔اور تدفین میں شریک نہ ہوسکے ۔انھوں نے حضرت ابوبکر صدیق کو رسول کا جانشین خلیفہ چُن لیا ۔

مسلمان اس وقت دو گروہوں میں بٹ گئے ۔ایک گروہ نے اسلام کے فروغ اور بقا کے لئے دنیوی اقتدار کو ضروری سمجھا ۔دوسرے گروہ ۔ نے اس کو غیر دینی اور بدعت سمجھا ۔

پہلے گروہ کی تشریح میں پہلے ہی بہت لٹریچر موجود ہے اس لئے میں یہاں دوسرے گروہ کا نقطۂ نظر پیش کرتا ہوں ۔اس موضوع پر مصری عالم علی عبدالرزاق نے ایک کتاب "الاسلام و الاصول الحکم" لکھی جو 1925ء کے قریب قاہرہ میں چھپی ۔جس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خلافت خالص دنیوی (سیکولر) ادارہ ہے اس کا مذہب اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔مصنف نے ثبوت میں یہ دلائل پیش کئے ہیں :

ا ۔ دین اسلام میں واضح طور پر کسی بھی قسم کی حکومت کا ذکر نہیں ہے ۔

قرآن شریف اور حدیث نے مسلمانوں کو آزادی دی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کی حکومت بنائیں ۔

2 ۔جس صورت میں قرآن میں خلافت کا ذکر نہ واضح طور پر اور نہ اشارہ ہی کی طور پر آیا ہے ۔اس لئے خلافت اسلام کے بنیادی اصولوں میں داخل نہیں ہے اس کو قدامت پسند مولویوں نے صرف فقہ کے ذریعے اعتقاد کا جز بنا لیا ہے ۔

مصنف مولویوں کی اس دلیل کو رد کرتا ہے جس کے ذریعے انھوں نے خلافت کو اسلام کا لازمی حصہ بنا لیا ہے ۔اس کا کہنا ہے کہ خلافت نہ کسی احکام الٰہی یا پیغمبر کے کہنے کے مطابق بنائی گئی ہے اور نہ مسلمانوں کی رائے عامہ کے مطابق وجود میں آئی ۔کیونکہ پہلے تین خلیفاؤں کے بعد خلافت ہتھیاروں کے زور پر قائم رکھی گئی ۔اور اس کو مسلم عوام کی رائے کا نمائندہ ہونے کا شرف کبھی بھی حاصل نہ ہوا ۔

3 ۔پیغمبر خدا کو رسالت کا مشن شخصی طور سے سپرد ہوا تھا ۔ان کو حکومت قائم کرکے اپنے جانشینوں کے ہاتھ میں دینے کا کام نہیں دیا گیا تھا ۔خلافت کو مذہبی حیثیت نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومت کا نظریہ ہی غلط اور خود ساختہ تھا ۔اگر خلیفہ کو دنیوی حاکم تسلیم کریں تو یہ دوسری بات ہے ۔مگر ابتدائی مسلمان حکومتیں کوئی منظم دستور ،عدالت ،مالیات ،پولس وغیرہ کے انتظامات سے محروم تھیں ۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو حکومت قائم کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا ۔اگر ان کا ارادہ ہوتا تو ضرور اس کے کچھ بنیادی اصول مقرر کرتے اور کچھ ہدایات چھوڑ جاتے ۔مصنف اس نظریہ کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ پیغمبر صاحب مسلمانوں کے کوئی دنیوی حاکم تھے ۔اُن کا دنیوی اختیار جو اُن کے روحانی مشن کا جز تھا ۔وہ پیغمبری منصب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دوسروں کو منتقل نہیں ہو سکتا تھا ۔مصنف کی رائے میں پیغمبر کے مشن کا لوگوں کے عقائد اور اخلاق کی درستی سے واسطہ تھا نہ کہ حکومت چلانے سے ۔

مصنف کا خیال ہے کہ چند عرب قبیلوں نے اپنی حکومت کے استحکام اور وسعت کے لئے حضرت ابوبکر کو پیغمبر کا جانشین ظاہر کر دیا مگر اس کے لئے کوئی مذہبی سند نہیں تھی ۔حضرت ابوبکر صدیق کے بعد حضرت عمر اور بعد میں حضرت عثمان خلیفہ بنے ۔

ان کے دور حکومت میں ان کے مقرر کئے ہوئے بنی اُمیہ قبیلے کے گورنر ایسا تسلط قائم کر گئے کہ جب حکومت کی باگ ڈور حضرت علی کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور آخر انھیں شہید کر دیا ۔

اس کے بعد امام حسین علیہ السلام کو شہید کر کے بنی امیہ گھرانے نے حکومت اپنے قبضے میں کرلی ۔

اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیوی اقتدار کے حامیوں نے یہ دونوں باتیں یہودیوں اور عیسائیوں سے سیکھی تھیں ۔

مسلمانوں کے الگ اور جینی ہوئی قوم کا تصور یہودیوں سے لیا گیا ہے ۔
خلافت کا یہ تصور عیسائیوں کے پوپ کے ادارہ سے نقل کیا گیا تھا ۔
اور ان دونوں باتوں کا روحِ اسلام سے کوئی بھی واسطہ نہیں تھا ۔
بنی اُمیہ، بنی عباس، ترک سب دنیوی حاکم تھے اسی طرح دنیا میں دوسری جگہوں پر بھی مسلمان حاکم تھے اُن سب نے مذہب کے نام کو استعمال کیا ۔ حکومت اُن کے ہاتھوں میں ہوتی تھی اور مولویوں کو محض خوش کرنے کے لئے رسول کی عدالتیں ان کے سپرد کردی جاتی تھیں ۔ اس کے علاوہ تعلیم، نماز، نکاح اور تجہیز و تکفین دینے کے کام بھی ان سے لئے جاتے تھے ۔ لیکن حکومت کے داخلی، خارجی اور انتظامی معاملات سے مولویوں کو دور ہی رکھا جاتا تھا ۔

اُس وقت حکومتیں بنو امیہ، عباسیوں، مغلوں، ترکوں اور ایرانیوں کے نام سے وابستہ ہوتی تھیں ۔ تاریخ میں کبھی بھی مسلمان قوم یا امت کے نام پر حکومت نظر نہیں آئے گی ۔ اور نہ حاکموں ہی پر مذہبی مولویوں کو برتری حاصل تھی ۔ مولویوں کی اکثریت بعض حاکموں کی تعریف میں مصروف رہتی تھی ۔ چاہے حاکموں کے کارنامے کیسے ہی بُرے ہوتے تھے ۔ چنگیز خان جیسے ظالم حاکم کو مولوی جیونی نے "جہاں کشائی" کا لقب دیا تھا ۔ تیمور لنگ کی بے انتہا خونریزیوں کے باوجود اسے "صاحب قرآن" کا لقب دیا تھا ۔
مولویوں نے اورنگ زیب کو، باپ کو قید کرنے، بھائیوں اور سرمد کو شہید کرانے کے باوجود بڑے فخر سے "عالمگیر" کہہ کر پکارا ۔
مسلمانوں کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کتنی بار مذہبی مجنوؤں کی طرف سے اسلامی حکومتیں برپا کرنے کی کوششیں ہوئیں مگر سب تاریخ کی کسوٹی پر ناکام ثابت ہوئیں ۔ مثال کے طور پر سوڈان میں مہدی سوڈانی، لیبیا میں شیخ موسیٰ، ہندوستان میں سید محمد میراں جونپوری اور سید احمد بریلوی سب نے احیا اسلام کے لئے جہادی کہلوانے کی کوششیں کیں مگر سب بے کار گئیں ۔ اس مسئلے کو پوری طور پر سمجھانے کے لئے مسلمانوں کے چند فرقوں میں چند مروجہ عقائد کی تشریح ضروری ہے

۱ ۔ خلافت 2 ۔ دینی نظام 3 ۔ مہدی 4 ۔ جہاد

یہ سب عقائد مذہب اور سیاست کو ملا کر چلانے والوں کی طرف سے ایجاد کئے گئے ہیں ۔ روحِ اسلام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ ان حضرات کی نیتیں کیسی بھی ہوں مگر تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں میں نفاق اور خونریزی کا باعث یہی عقائد بنے ہیں ۔ یورپ کے مشہور تاریخ داں آرنالڈ کا کہنا ہے :

"اگر مسلمان مذہب کی تبلیغ اور فروغ کے لئے تشدد کا استعمال نہ کرتے تو اسلام کی تعلیم اتنی دل فریب تھی کہ اس وقت انسان ذات کی اکثریت مسلمان ہوتی ۔"

اب آیئے اوپر ذکر کئے ہوئے چار عقائد کی افادیت سے بحث کریں ۔
۱ ۔ خلافت : خلیفہ کے معنی رسول کا جانشین، اسلامی جماعت کے نظام کا منتظم، فروغِ اسلام کا لیڈر لئے جاتے ہیں مگر یہ تینوں تصور غلط ہیں رسول کا جانشین کوئی نہیں ہوسکتا ۔ رسالت کا مشن شخصی طور پر سپرد کیا گیا تھا ۔ اس کو کسی دوسرے کے سپرد کرنے کی نہ رسول کریم کو اجازت تھی اور نہ انھوں نے کسی کے سپرد کیا ۔

پیغمبر کی وفات کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی سے جانشین مقرر کئے جن کے لئے کوئی مذہبی سند نہیں ہے ۔ البتہ اپنی تعلیم کی تبلیغ کے لئے چند دائرے قائم کرنے کی ممانعت نہیں تھی ۔ کیونکہ سیاست اور حکومت کے ذریعے طاقت کے استعمال سے ان کے فروغ کے لئے کوشش کرنے کی وجہ سے فائدے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا ۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے اسلامی جماعت کے نظام اور نظامِ حکومت کو ملا کر چلانے کی جو کوششیں کیں انھوں نے فرقہ بندی اور خانہ جنگی پیدا کردیں ۔
غرض کہ اسلامی حکومت کے نظام کا تخیل غیر اسلامی ہے ۔ اور نصاریٰ سے مستعار لیا گیا ہے ۔ نصاریٰ نے اپنی جماعت کے نظام کے لئے پوپ کے تحت ایک ادارہ قائم کیا ۔ بعد میں اس کو سیاست میں شامل کردیا ۔ اُن کا خیال تھا کہ اس کے ذریعے کرسچینٹی کو فروغ ملے گا ۔ مگر جب ان کو پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے خانہ جنگی

اور فرقہ بندی بڑھی ہے تو تجربے سے فائدہ حاصل کرکے سیاسی و مذہبی کاروبار کو الگ الگ کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی آج تک دیکھا دیکھی خلافت قائم کرکے سیاست اور مذہب کو ملا کر چلانا شروع کیا مگر اس کے نقصانات پر غور نہیں کیا۔ اور کچھ لوگ اب تک اس کی افادیت میں اعتبار رکھ کر مذہبی نظام حکومت کی گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ فروغ اسلام اولیائے کرام اور پختہ عالموں ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے مگر گمراہ مولوی اور نا اہل و فاجر حکام وقت کے ذریعے اسلام کی ترقی ناممکن ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تو اچھی خاصی ہے مگر ان کا اخلاق اور صلاحیت درست نہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر غور سے مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ خلافت نے مسلمانوں کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے جس سے سبق لے کر ترکوں نے آخراً اسے ختم کر دیا۔

۲۔ نظامِ دین

اس سے اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کی تعلیم اور تربیت کے لئے ادارہ قائم کرکے رسول مقبول کی چلائی ہوئی جیوتی کو جاری رکھا جائے مگر اس راہ میں مسلمانوں سے ابتدا میں جو غلطیاں ہوئیں اس وجہ سے یہ مقصد پوری طور سے حاصل نہیں ہو پایا۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب اور سیاست کے امتزاج سے خلافت قائم کی۔

دوسری غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ظاہری باتوں پر زیادہ زور دیا اور اخلاق اور تزکیہ نفس کو پیچھے ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اپنے اصل مقاصد اتحاد، امن اور ترقی انسانی میں کامیاب نہ ہوا۔ بلکہ ایک علاحدہ مذہب بن کر سینکڑوں فرقوں میں بٹ گیا۔

ہندو کا دینی نظام برہمنزم اور اچھوت پن لایا۔

یہودیوں کے دینی نظام نے قومی برتری اور وسطائی تصور پیدا کیں۔

عیسائی دینی نظام نے پوپ کی معصومیت اور شفاعت کا نظریہ پیش کرکے لوگوں کو پادریوں کا محتاج بنا دیا۔

مسلمانوں کے دینی نظام نے خانہ جنگی، فرقہ بندی اور تشدد کو فروغ دیا۔

مگر مولوی اب تک بغیر کسی سوجھ بوجھ کے نظام دین اور اسلامی نظام حکومت کا راگ گاتے چلے آ رہے ہیں۔

۳۔ مہدی (آخر الزماں)

یہ تصور مذہب کے زوال کے وقت مذہب کے ماننے والوں کو امید دلانے کی خاطر پیش کیا جاتا ہے۔ تقریباً ہر مذہب کی پیروی کرنے والوں میں یہ عقیدہ مروج ہے۔

۱۔ ہندو مذہب میں وشنو دیوتا کا اوتار لے کر آنے کا عقیدہ موجود ہے۔ اس کے مطابق کئی لوگوں نے اپنے کو وشنو کا اوتار کہہ کر ہندو دھرم کی رکھوالی کا دعویٰ کیا ہے۔

۲۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ زندہ ہیں اور عیسائیوں کے فروغ کے لئے پھر لوٹ آئیں گے۔

۳۔ مسلمانوں نے بھی اس تتبع پر یہ نظریہ ایجاد کیا ہے کہ آخری زمانہ میں مہدی پیدا ہو کر ساری دنیا کو اسلام قبول کرائیں گے۔ یہ اہلِ سنت کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کے مطابق کئی لوگوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کرکے احیاءِ اسلام کے لئے کوشش کی مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ شیعہ حضرات تو بارہویں امام کو غائب کرکے اس کے لوٹ آنے کی امیدیں لئے بیٹھے ہیں۔ دراصل یہ عقیدہ ہی غلط ہے اور لوگوں کی ہمت افزائی کے لئے ۔ اور انھیں مایوس کن حالات میں پُر امید بنانے کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔

۴۔ جہاد

یہ عقیدہ بھی کئی مذاہب میں مروج ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مذاہب کے فروغ کے لئے تشدد کا استعمال لازمی ہے۔ اس عقیدہ کو ماننے والوں کا خیال ہے کہ انسانوں کی اکثریت حیوانی صفات سے موصوف ہے اس لئے وہ ڈنڈے کے بغیر درست نہیں ہو سکتے۔

ہندو براہمنوں نے کھتری راجاؤں کا اصلاح کار بن کر ان کی معرفت ہندو دھرم کو عوام پر زبردستی تسلط کرنے کا خیال پیش کیا۔

عیسائیوں نے پوپ کو کل عیسائی حاکموں پر بالادستی دلا کر مذہبی فروغ کے لئے کوشش کی۔ صلیبی جنگیں اسی مقصد کے حصول کے لئے لڑی گئیں۔

مسلمانوں میں وہ کہ جن کا عقیدہ سیاست اور مذہب کو ملا کر چلانے کا تھا انھوں نے اپنے سامراج اور حکومت بڑھانے کے لئے اس نظریہ کے ذریعے جواز پیدا کرکے جنگیں کیں اور مولویوں اور ان کے ہم خیال لوگوں نے ان جنگوں کو جہاد کے مقدس نام سے پکارا۔

اسلام محبت اور امن کا پیغام لایا۔ اس کی تبلیغ کے لئے قرآنی احکام کے مطابق دانائی اور نیک مصلحت سے کام لینا ہے۔ زور زبردستی کا دخل نہیں۔ مگر مسلمانوں کے مستقل مفاد کے حاکم اور ان کے حواری مولوی جہاد کو اپنے ایمان کا جزو بنائے چلے آرہے ہیں۔

جس صورت میں مسلمانوں کی علیحدہ قوم کا نظریہ غیر اسلامی ہے اسی طرح اس کی بنیاد پر ایجاد کئے گئے عقائد بھی بے معنیٰ اور بے فائدہ رہیں گے۔

مسلم تاریخ پر نظر کر کے دیکھیں گے تو کتنے مسلمان بادشاہ اور خلیفہ اخلاق سے عاری تھے بعض زانی تھے بعض شرابی، بعض سفاک اور بعض غاصب تھے۔ اگر ان کو اسلام کا علمبردار مانا جائے تو خود اسلام ایک مضحکہ خیز مذہب بن جائے گا

کیا بنی امیہ، عباسیوں، ترکوں اور مغلوں وغیرہ مسلمان حاکموں کی جنگیں اور خونریزی جہاد یا اسلامی جنگیں شمار کی جاسکتی ہیں؟

اب ذرا ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں :۔

سب سے پہلے ہندوستان کے ایک حصے سندھ کو بنی امیہ سامراج کے ایک سپہ سالار محمد بن قاسم نے حملہ کر کے فتح کیا۔ سندھ کے راجہ ڈاہر کو لڑائی میں شکست دے کر کئی ہزار مرد اور عورتیں غلام بنا کر عرب میں بکری کے لئے بھیجی گئیں۔ لوٹ کے کروڑوں روپے امیہ بادشاہ کے خاص گورنر حجاج بن یوسف کو بھیجے گئے۔ اور سپہ سالار قاسم نے راجا ڈاہر کی بیوی سے شادی کی اور تاریخ کی ایک روایت کی بنا پر اس کی دو بیٹیوں سے بھی زنا کیا۔

حجاج اور اس کا سپہ سالار یزیدی خاندان کے حاکموں کے کارندے تھے۔ راجا ڈاہر نے سید گھرانے کے چند افراد کو جو حجاج بن یوسف کے ظلم سے بھاگ کر سندھ میں آئے تھے پناہ دی تھی۔ وہ باوجود برا ہمن ہونے کے بدھ دھرم والوں کی حفاظت کرنے والا عظیم مذہب حاکم تھا۔ سندھ دیس کی حفاظت کے لئے لڑتے ہوئے وہ سرنے کر شہید ہوا۔ مولوی، محمد بن قاسم کو غازی جلوہ اس کے حملے کو جہاد بنا کر پیش کرتے ہیں۔ سادہ دل لوگ اس بات پر یقین لے آتے ہیں۔

اس کے بعد سلطان محمود غزنوی نے اتر ہند پر کئی بار حملے کئے۔ لوٹ اور خونریزی کے ذریعہ بڑی دولت ہندوستان سے لے گیا۔ بے ایمان مولوی اس کو بھی غازی کا لقب دے کر اس کے ان حملوں کو بھی اسلامی فتوحات میں شمار کرتا ہے۔

بعد میں سلطان علاؤالدین خلجی نے ہندوستان کو اپنے حملوں سے فتح کیا۔ اس کو بھی مولویوں نے مشورہ دیا تھا کہ خود کو اسلام کا علمبردار کہلائے مگر اس نے انکار کیا۔ پھر بابر بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کر لیا اور مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس کے پوتے اکبر بادشاہ نے بھی لوگوں کو متحد کرنے اور اپنے خاندان کے سامراج کو مستحکم بنانے کے لئے مذہب کے نام کو استعمال کیا مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ اس کے بعد اورنگ زیب بادشاہ نے اسلام کے نام پر اپنے سامراج کو مضبوط کرنے کے لئے کئی جنگیں لڑیں۔ فتح بھی پائی مگر اس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے مغل سلطنت کی جڑیں اکھڑ گئیں

پاکستان نہ کوئی تاریخی ملک ہے اور نہ اس کا کوئی جغرافیائی وجود ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے برصغیر ہند کے بٹوارہ کی بنا پر پانچ ملکوں پر مشتمل ایک یونین ہے۔ دراصل " پاکستان " ایک پنجابی اختراع ہے۔

برصغیر ہند نے تاریخ میں گو کئی بار کچھ یکجہتی حاصل کی ہے مگر زیادہ تر سیاسی حیثیت سے بٹا ہوا رہا ہے۔ اس کے موجودہ بٹوارے کے چند اسباب میرے خیال میں یہ ہیں :۔

(1) برصغیر ہند میں مختلف آب و ہوا والے علاقوں، علیحدہ علیحدہ زبانوں، مختلف مذہبی اعتقادوں، الگ الگ نسلوں، رسم و رواجوں اور سماجی درجوں کے لوگ رہتے ہیں جن کو ارتقائی تاریخ کی چکی اب تک پیس کر پوری طور سے مخلوط نہیں کر پائی تھی۔

2۔ انگریز گو سارے برصغیر کو ملا کر ایک حکومت کے زیر اثر لے آئے تھے مگر متحدہ قوم بنانے کی ان کی کوشش اور ایک پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

3۔ ذہنی طور پر برصغیر ہند کے رہنے والے وہموں اور تعصبوں کے اثر سے ابھی تک آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے مذہب کے نام پر دھوکے میں آجاتے تھے۔

ہمارے لوگوں کی اکثریت غریب اور معصوم تھی جن کو نومولود مڈل کلاس کی اقتصادی رقابتوں نے گمراہ کر رکھا تھا۔

5۔ صحیح قومی تصور کی کمی تھی۔

ڈاکٹر محمد اقبال کو ہندوستان کے جدید زمانے میں مسلمانوں کی علیحدہ قوم کے نظریہ کا موجد کہا جاتا ہے اس نے ہندوستان کے براہمنوں، جرمن فلسفی نطشے اور ترکوں کو ترجیح دی۔ پنجاب سامراج کے لئے اس نظریے کی ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم دی۔ براہمنوں، جرمنوں اور ڈاکٹر اقبال کے قومیت کے نظریے میں فرق یہ ہے کہ جرمن قوم نے آریہ قوم کو بہترین نسل قرار دے کر دوسری اقوام کی راہبری کے لائق اپنے آپ کو کہا۔ اُن پر تسلط قائم کرنے کی آواز اٹھائی۔ سامی قوم کے یہودی راہ میں رکاوٹ بنے۔ یہاں اقبال مسلمانوں کو دنیا کی چنیدہ قوم وحدت قرار دے کر اور مذہب کو بنیاد بنا کر اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ اقبال کے خیال میں ان کی راہ میں ہندو رکاوٹ بنے۔ ہٹلر نے جب آریہ قوم کا نام لیا تو اس سے اس کا مقصد جرمن سامراج تھا کیونکہ آریہ سے واسطہ رکھنے والی اور بھی اقوام موجود تھیں۔

علامہ اقبال جب مسلم قوم کا نام لیتے تھے تو اس سے اُن کا مقصد پنجابی سامراج ہوتا تھا۔ ورنہ اور بھی کئی مسلمان تھے جو یہ راگ نہیں گا رہے تھے۔

یہ نظریہ سندھی، بلوچ، پختون اور بنگالی اقوام کو پنجابی سامراج کے زیر اثر لانے کی نیت سے ایجاد کیا گیا تھا۔

علامہ مشرقی اسلام کے بہترین عالموں میں سے ایک تھے۔ اُن کا کہنا تھا:

"دنیا کا ہر صالح آدمی مسلمان تھا اور ہر غیر صالح غیر مسلم تھا"

اس نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کا موجودہ بٹوارہ غلط تھا کیا استحصال اور غریب مظلوم ایک ہی جماعت میں ہو سکتے ہیں؟

کیا بد اخلاق اور اخلاق والے ایک ہی زمرہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں؟

قرآن کی یہ آیت ہے "جنتی اور دوزخی دونوں برابر نہیں ہیں۔ جنتی بہتر ہیں"

یہ نظریہ کسی بھی مسلم ممالک میں رائج نہیں ہے۔ عرب ممالک ایک ہی زبان، کلچر اور مذہب والے کویت، عمان، بحرین، عراق، لبنان، شام، جورڈان، سعودی عربیہ، یمن کے دونوں ملک، مصر، لیبیا، الجیریا، مراکو، سوڈان وغیرہ الگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ملک دوسرے کے ماتحت رہنا قبول نہیں کرتا۔

افغانستان اور ایران کی زبان، کلچر اور مذہب ایک ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے ماتحت رہنا تو چھوڑیئے وہ تو وفاق میں رہنا بھی قبول نہیں کرتے لیکن یہاں اسی نظریے کی بنا پر چار اقوام (بنگالی، سندھی، بلوچ اور پختون) کو زبردستی غلام رکھا جا رہا ہے۔ ان میں سے اگر کوئی انکار کرتا ہے تو ان کا بنگالیوں کی طرح خون بہایا جاتا ہے۔

یہ نظریہ پہلے ہندو مسلمان کے درمیان نفاق کا کارن بنا اور ملک کے بٹوارے کا باعث ہوا اور اب پاکستان میں رہنے والی مختلف اقوام کے درمیان نفاق اور نفرت پیدا کر کے خون خرابے کی وجہ بن رہا ہے۔

میرے ایک دوست کو سیاسی اختلاف کی بنا پر جیل میں رکھا گیا تھا۔ اس کو ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل نے جو ایک پنجابی تھا کہا "ہم سب مسلمان ہیں، ہمارا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، مذہب ایک ہے، ملک ایک ہے، پھر اختلاف کیوں کرتے ہو؟"

اس کے ملک پر بمباری کی گئی تھی۔ لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ اس لئے اس کا دل جلا ہوا تھا۔ وہ مسلمان تھا اور وہ بھی مسلمان تھے جنہوں نے ان کے اوپر ظلم ڈھائے تھے۔ اس ظلم کے بعد یہ نصیحت آمیز گفتگو تھی

میرے دوست نے سپرنٹنڈنٹ کو یہ جواب دیا

"آپ کا اور ہمارا خدا ایک نہیں ہے"

پنجابی شاعر نے کہا تھا،

"خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے"

اس نقطۂ نگاہ سے خدا بندہ کا محتاج بن جاتا ہے۔ مگر ہمیں، ہمارے بزرگوں نے دوسری طرح سے بتایا ہے۔ "اے میرے خدا میری باگ ڈور تو تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں تو بس محتاج ہوں۔ ہم احکم الحاکمین والے خدا کو مانتے ہیں۔ آپ محکوم خدا کو مانتے ہیں۔ اس لئے ہمارا خدا آپ کے خدا سے علیحدہ ہے۔"

"اسی طرح پیغمبرِ خدا کو آپ جس نظر سے دیکھتے ہیں، ہم اس سے الگ دیکھتے ہیں۔ آپ نے پنجاب سے پیغمبر پیدا کیا۔ ہم نے خدا کو بچا لیا۔ آپ رسول مقبول کو ایک گروہ کا لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اُن کو رحمۃ اللعالمین سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے اور آپ کے رسول کے متعلق عقائد میں فرق ہے۔ مذہب کے متعلق ہماری اور آپ کی رائے میں بہت فرق ہے۔ آپ کے اسلام کے مطابق نفرت جائز ہے، ہمارے یہاں کفر ہے۔ آپ کی مذہبی تشریح کے مطابق بلوچیوں کے حقائق پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ ہماری مذہبی تشریح کے مطابق ہر ایک بھائی اور برادر قوم کو مساوی حق ملنا چاہئے۔ اس لئے ہم پنجابی تصور کے اسلام کو نہیں مانتے۔

ایک ملک کے متعلق بھی ہم الگ رائے رکھتے ہیں۔ پاکستان ہمارے یہاں ایک ملک نہیں ہے مگر پانچ ملکوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں اگر ایک صوبہ دوسرے صوبے پر قابض رہنا چاہے گا تو دوسرے کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس سے الگ ہو جائے۔ جس طرح ایک گھر میں رہنے والے بھائی اختلاف کے وقت حساب کتاب دے کر الگ ہو جاتے ہیں۔"

الیاکر کر اس نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا: "آپ پنجابیوں نے ہم کو اتنا تنگ کیا ہے کہ اگر آپ بہشت میں ہوں گے تو ہم دوزخ میں جانا زیادہ پسند کریں گے آپ کے ساتھ رہنے سے غیر مسلمانوں کے ساتھ رہنا ہزار بار بہتر ہے۔"

ایک بار مولانا مودودی نے کہا تھا کہ "جیئے سندھ" (سندھ زندہ رہے) معنی "مرے پاکستان"۔ اب اس کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ اہلِ سندھ کے غیرت مند یہ سمجھنے لگے ہیں۔ جب یہ سامراجی گروہ "جیئے پاکستان" کا نعرہ لگاتا ہے تو اس سے ان کی مراد 'مرے سندھ' ہوتی ہے۔ اس لئے سندھ تب زندہ رہے گا جب یہ دھوکے کی دیوار ٹوٹے گی۔ شاہ باہو اور گرو نانک نے ہندو مسلم اتحاد اور محبت کا پرچار کیا۔ مگر علامہ اقبال نے ہندو مسلمانوں کو الگ کرنے کی تعلیم دی۔

شاہ باہو اور گرو نانک کی تعلیم نے سکھوں اور انگریزوں کے دورِ حکومت میں پنجابیوں کو متحد رکھا۔ اور انھوں نے 'دیساں وچ دیس پنجاب دا' کا کلام فخر سے گایا۔ اور اقبال کی تعلیم نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے روز بروز ایک دوسرے کا خون بہانے پر آمادہ کیا۔

سر فضل حسین کی دور رس نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ سکھ، ہندو اور مسلمان پنجابی متحد ہوں گے تو سارے ہندوستان پر حاوی ہو سکیں گے اس وجہ سے ہندوستان کی پوری فوج میں یہ ۵۴ فیصد تھے۔ اور سول سروس میں بھی ان کی تعداد کافی تھی۔

سر سکندر حیات ایماندارانہ طور پر اس پالیسی پر گامزن رہا مگر وہ دن پنجاب کے لئے نحس ثابت ہوا جس دن جناح صاحب اور اقبال کی ملی سیاست اور فلسفہ اس پر اثر انداز ہوئے۔ مرحوم مولانا غلام رسول مہر کا کہنا تھا "جناح صاحب کی سیاست اور اقبال کی تعلیم نے مسلمانوں کو اتنا نقصان پہنچایا ہے جتنا چنگیز خان اور ہلاکو نے بھی نہیں پہنچایا تھا۔"

ملک کے بٹوارے کا سب سے زیادہ نقصان کس کو ہوا ہے؟ اہلِ پنجاب کو۔ ملک بٹ گیا! انھوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ تین جنگوں میں پنجاب کا کتنا خون بہا ہے۔ مگر پھر بھی ان کو سمجھ آئے گی یا نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔

جنرل یحییٰ خاں کہتا ہے "گرو نانک کی تعلیم ملک اور لوگوں کے لئے مفید ہے۔" پتہ نہیں اس بات میں کتنی صداقت ہے کیا اسے معلوم ہے کہ گرو نانک کی تعلیم کے کیا معنی ہیں؟

پاکستانی حکومت لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے مذہبی بنیاد پر قومی نظریہ کا اظہار کرتی ہے۔ دنیا بھر میں، اقوام متحدہ میں پاکستانی قوم کہلاتی ہے یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ مسلم قوم کا کوئی وجود ہے اور نہ پاکستان ہی کے اندر رہنے والے ایک قوم ہیں۔ مسلمانوں میں 350 سے زیادہ فرقے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک خود کو حق پر اور دوسرے کو ناحق پر کہتا ہے۔ کچھ وقت ہوا کہ پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف ہوا چلائی گئی تھی۔ کہہ رہے تھے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔ فسادات ہوئے کئی جانیں گئیں۔ مارشل لا لگا دی گئی۔ جسٹس محمد منیر اور جسٹس رستم کیانی کی ٹریبونل نے کئی مولویوں کے بیان لئے اور ان سے پوچھا کہ مسلم قوم کیا ہے؟ کس کو کہتے ہیں؟ اور اسلامی نظام کیسا ہوتا ہے؟ جج صاحب اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ اکثر مولویوں نے ایک دوسرے کے خلاف باتیں کیں۔ سب کے خیال متضاد تھے۔ اگر سب کی باتوں پر یقین کریں گے تو پھر کوئی بھی آدمی مسلمان نہیں رہے گا۔

لاہور کا مشہور ترین دیال سنگھ کالج

دیال سنگھ ٹرسٹ کے زیر اہتمام لاہور میں ۱۹۰۹ء میں جاری کیا گیا تھا جہاں غیر تقسیم پنجاب کی ہزاروں ہستیوں نے اس کالج میں تعلیم حاصل کی اور اپنے ملک کا نام مختلف طریقوں سے روشن کیا۔

تقسیم ملک کے بعد لاہور کا یہ مایۂ ناز کالج اپنی سابقہ روایات کے مطابق ۱۹۴۹ء میں

دیال سنگھ کالج
کرنال

کی شکل میں عوام کے سامنے آیا اور گذشتہ ۲۵ سال سے یہ کالج اپنے ملک کی خدمت انجام دے رہا ہے اور پنجاب بھر میں یہ کالج اپنی سابقہ روایات کو بطریق احسن

زندہ رکھے ہوئے ہے

آزاد ہندستان میں یہ دیال سنگھ کالج کرنال کی اس ۲۵ سالہ سلور جوبلی کے موقع پر کالج کے چیرمین۔ ٹرسٹی۔ اور اسٹاف ممبران

عوام کی خدمت کا پھر حلف لیتے ہیں

عوام کے خیرخواہ ٹرسٹیان

دیال سنگھ کالج کرنال (ہریانہ)
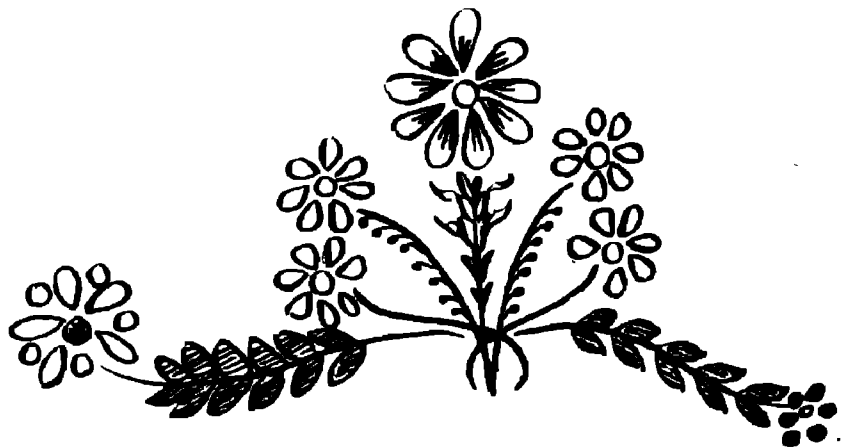
پھر ملاقات

پڑھے لکھوں کی صحبت تنہائی سے بہتر ہے۔

بال ٹھاکرے

پہلے ہندستانی بعد میں مسلمان

ایک جیپ کار، ایک اسٹین گن والا، ایک اسکوٹر، دو چوکیدار کی چار نگہبان آنکھوں اور ایک خوش گفتار کتے سے گزر کر بالا صاحب کے ڈرائنگ روم تک پہونچنا پڑتا ہے۔ مہاراشٹر کے اس عظیم رہنما کی یہ چوکسی اور یہ احتیاط دراصل موروثی ہے جو ان کو اپنے مورث اعلا چھترپتی راجا شواجی سے وراثت میں ملی ہے۔ مگر بالا صاحب بالکل ناریل ہیں باہر سے سخت اندر سے نرم۔ شری بال کیشو ٹھاکرے جرنلسٹ باپ کے گھر 23 جنوری 1927ء کو پونے میں پیدا ہوئے۔ ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے ان کے پیشے کی ابتدا (1943ء) بمبئی کے انگریزی روزنامے فری پریس جرنل سے ہوئی۔ 13 اگست 1960ء سے انھوں نے مراٹھی ہفت روزہ "مارمک" جاری کیا۔ جب بالا صاحب کے تجربے اور مشاہدے نے یہ بتایا کہ بمبئی کو محض نام کے لئے کاسموپولیٹن کہا جاتا ہے مگر مہاراشٹر کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے میں کاسموپولیٹن ازم کا ثبوت نہیں دیا جاتا۔ صرف یہی نہیں بل کہ ساؤتھ والا، جینٹلمین خود بھی آتا ہے اور ساتھ میں سندرم کو بھی لاتا ہے تو۔ 19 جون 1966ء کو انھوں نے مہاراشٹر کے بیٹوں کے تحفظ کے لئے شیو سینا کی بنیاد رکھی۔ بالا صاحب مانے ہوئے کارٹونسٹ ہیں ان کے کارٹون امریکہ کے سب سے بڑے اخبار نیویارک ٹائمز اور دنیا کے سب سے بڑے اخبار "آساہی شیمون" (جاپان) میں چھپ چکے ہیں اور اس سے بھی زیادہ جب لندن کی کیسل اینڈ کمپنی نے چرچل کی 47 سالہ سیاسی زندگی سے متعلق کارٹونوں کا انتخابی نمونہ "A CARTOON BIOGRAPHY" شائع کیا تو اس میں بالا صاحب کے بنائے ہوئے بھی تین کارٹون شامل کئے گئے۔ بالا صاحب پائپ نوش ہیں، کرکٹ اور باغبانی ان کی ہابی ہے۔ وہ خوش مزاج اور با اخلاق ہیں ــــ ایک ملاقات میں بالا صاحب سے میری جو گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہے ــ ش ک

س : جسے آپ قومی دھارا کہتے ہیں، مسلمان اپنے آپ کو اس دھارے میں کیسے شامل کرے ــ ؟

ج : دراصل مسلمانوں کو دنیاوی معاملات کے سلسلے میں اپنے مذہب کو درمیان میں نہیں لانا چاہیئے بل کہ ہر حال میں ملک و قوم کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ میں ہندو ہوں۔ ناستک نہیں ہوں مجھے اپنے دھرم سے پیار ہے مگر اس پیار کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر ہمارے کرشن جی نے 14 سو شادیاں کی تھیں تو مجھ کو بھی 14 سو ہی بیویوں کا شوہر ہونا چاہیئے۔ وہ زمانہ اور تھا، اس زمانے میں نسل کا بڑھنا ملک یا قوم کے لئے مضر نہیں تھا مگر آج کے زمانے میں فیملی پلاننگ ضروری ہے مسلمانوں کو چاہیے مذہب نے ایک سے زیادہ شادیاں کرنے اور

شمع : ہندستانی مسلمان نمبر

زیادہ سے زیادہ اولاد پیدا کرنے کی اجازت دی ہو مگر قومی حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مذہب کو نہیں نیشن کو اپنے سامنے رکھیں۔ مذہب قطعی طور پر ایک ذاتی معاملہ ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قومی مفاد پر اپنے مذہبی مفاد کو قربان کر دے۔ مذہب خود انسانیت کو دوسری ساری قدروں سے مقدم قرار دیتا ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ جب ہندستان اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کا مقابلہ ہوتا ہے تو ہندستانی مسلمانوں کی ہمدردی پاکستانی ٹیم کے ساتھ ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کی سرزمین پر جب ہندستان اور پاکستان کی ٹیم کا کسی دوسرے ملک کی ٹیم سے مقابلہ ہوتا ہے تو غیر کے مقابلے پر پاکستان کے جیتنے پر ہندستان کے مسلمانوں کو زیادہ خوشی ہوتی ہے اور جب ہندستان کی ٹیم کسی غیر ٹیم پر فتح پاتی ہے تو ہندستانی مسلمان پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں ہوتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہندستانی مسلمان اپنے ہندستان کی ٹیم کو اپنی ٹیم کیوں نہیں سمجھتا ہے؟ مجھے تو عابد علی پر فخر ہے وہ مسلمان ہو یا ہندو یا عیسائی، مجھے اس سے غرض نہیں میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہندستانی ٹیم کا کھلاڑی ہے اور اس کا قابل تعریف کھیل ہمارے ملک کے لئے عزت کا باعث ہے۔ قومی دھارا نہ کوئی دھرم ہے اور نہ تحریک بس ہندستانی جذبے کا نام قومی دھارا ہے اور جو اپنے عمل سے اور خلوص دل سے اپنے اس وطنی جذبے کا اظہار کرتے ہیں وہی قومی دھارے کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بتا دوں کہ میں مسلموں کا نہیں مسلم لیگیوں کا مخالف ہوں۔ آپ خود سوچئے کہ جنھوں نے ملک کا بٹوارا کرایا اور جو فرقہ وارانہ فساد کے بانی ہیں وہ اب اس ملک میں کیوں موجود ہیں؟ یہ بنات والا جیسے مسلم لیگی پاکستان کیوں نہیں جاتے؟ مسلم لیگیوں کو اس دیش میں رہنے کا کوئی حق نہیں — ہم ہندو، ہم شیو سینک جب کسی سے پیار کرتے ہیں تو دل سے پیار کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بناوٹ نہیں ہے۔ جو اس دیش کا سچا شہری ہے وہ ہمارا بھائی ہے جیسے کلیان والے صابر شیخ۔ ان کو بھی اس دیش میں رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ہمیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پیار سے اس ملک میں رہ سکتے ہو لیکن جھگڑا کر کے نہیں، مسلمان ہو کر نہیں بلکہ ہندستانی بن کر۔

س : اردو مسلمانوں کے لئے ایک نازک اور جذباتی مسئلہ ہے اس سلسلے میں آل انڈیا سطح پر مسلمانوں کی پالیسی کیا ہونا چاہیئے؟

ج : میں اردو کو پسند کرتا ہوں اردو ایک شاندار زبان ہے، انگریزی زبان کی بھی قدر کرتا ہوں۔ کسی زبان سے کسی کو بیر نہیں ہوتا چوں کہ مسلمانوں کا ذہن اچھا نہیں ہے اس لئے میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ اردو کے لئے بضد کیوں ہیں؟ کیا پھر کوئی پاکستان بنانے کا ارادہ ہے؟ مسلمان پہلے اپنے عمل سے اطمینان دلائے پھر ہم اردو کے حق میں کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی فرقہ پرستی کا آج بھی وہی انداز ہے جو 1947ء سے پہلے تھا۔ پچھلے دنوں جوگیشوری (بمبئی) میں مسلمانوں نے روٹی نہیں، مکان نہیں، ہم کو ہرا جھنڈا چاہیئے کا نعرہ لگا کر جو فساد برپا کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 27 برس گزرنے کے بعد بھی ہندستان کے مسلمان نے بدلے ہوئے حالات کو نہیں سمجھا۔ مسلمان کو جاننا چاہیئے کہ یہ اورنگ زیب کا زمانہ نہیں اور نہ اب انگریزی حکومت ہے یہ جنتا راج ہے، اب "دین دین" چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ ہندی کو قومی زبان سمجھا جائے اور مسلمان اپنے علاقے کی بھی زبان فروغ دیکھے ورنہ وہ اور زیادہ پچھڑ جائے گا۔

س : جس طرح مہاراشٹر میں مہاراشٹرین کو ملازمت نہ ملنے کی شکایت آپ کو ہے کیا آپ کے خیال میں عام طور پر مسلمانوں کو ملازمت نہ ملنے کی شکایت درست ہے؟

ج : میں یہ کبھی نہیں کہتا کہ مہاراشٹر مہاراشٹرین کا ہے جیسا کہ سمجھے ہیں وہ میری غلط ترجمانی کرتے ہیں (السٹریٹڈ ویکلی کے ایڈیٹر خوشونت سنگھ نے بھی اس سلسلے میں میری غلط ترجمانی کی ہے) میں تو انڈیا کو مانتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ مہاراشٹر کی گورنمنٹ کو چاہیئے کہ وہ مہاراشٹرین کے ساتھ رعایت سے پیش آئے۔ اگر مہاراشٹر کے لڑکوں کی خبر گیری حکومت مہاراشٹر نہیں کرے گی تو کیا پھر اتر پردیش یا پنجاب کی سرکاریں ان پر رحم کھائیں گی! — جہاں تک مسلمان کی کسی مانگ کا تعلق ہے اس کی بات الگ ہے وہ مسلمان ہو کر مانگیں گے نہیں بلکہ ہندستانی بن کر وہ جو چاہیں گے وہ ہو جائے گا۔ ہندستانی ہونے کی حیثیت سے مسلمان کو بہت سے حق ملے ہیں بلکہ ایک ہندستانی

مسلمان کا بھی وہی حق ہے جو ایک ہندستانی ہندو کا ہو سکتا ہے مگر یہ تعجب کی بات ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ہندستانی نہ مان کر اپنے حق سے خود محروم رہنا چاہتا ہے۔ یعنی افسوس ہے مسلمان کو اپنا حق لینا نہیں آتا۔

س : مسلم ممالک سے ہندستانی مسلمانوں کو جو ذہنی اور دلی تعلق ہے یا دوسرے لفظوں میں پاکستان اور عرب ممالک سے ہندستان کا مسلمان جس ہم دردی کا ثبوت دیتا ہے اس کے سلسلے میں آپ کی کیا ہدایت یا نصیحت ہے ۔؟

ج : دنیا کے کسی بھی انسان یا ملک سے ہم دردی رکھنے میں کوئی برائی نہیں بل کہ انسانیت کے ناتے ہمیں عالمی بھائی چارے پر زور دینا ہی چاہیئے مگر کسی بھی معاملے میں اپنے دیش پر کسی دوسرے دیش (چاہے وہ دوسرا دیش اپنا ہم مذہب ہی کیوں نہ ہو) کو ترجیح دینا بُری بات ہے۔ میں خود ہی ابھی یہ کہہ چکا ہوں کہ کھیل کود کے میدان میں بھی ہندستان کا مسلمان ہندستان دوستی کا ثبوت نہیں دے پاتا مجھے اس سلسلے میں مسلمانوں سے صرف اتنا کہنا ہے کہ پاکستان یا عرب ممالک سے ان کو جو ہم دردی ہے اس سے ان ممالک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا

البتہ نتیجے میں خود ہندستانی مسلمان اپنے ہندستانی پڑوسیوں کی ہم دردی سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے وجود کو مشتبہ بنا لیتا ہے مسلمان کو سمجھنا چاہیئے کہ خون، نسل، فرقہ، یا مذہب سب بعد کی باتیں ہیں پہلی بات دیش ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے مذہب کو حکومت سے الگ کر کے حکومت قائم کی سب کو فائدہ ہوا۔ کون ہے جو ترکی کی کامیابی سے انکار کرے۔

س : اگر قدرت آپ کو پھر سے زندگی شروع کرنے کا موقع دے تو آپ کیا بننا پسند کریں گے ۔؟

ج : ڈِکٹیٹر ! (راجا صاحب نے برجستہ جواب دیا)

س : کیوں ۔؟

ج : یہ گندگی، یہ غلاظت اور یہ ذلالت جو ہندستان میں بھری ہوئی ہے یہ جمہوری طریقوں سے دور نہیں ہوگی۔ ٹاؤن پلاننگ کی صورت میں جمہوری طرز حکومت سڑک کے بیچ میں سے مندر یا مسجد کو ہٹنے نہیں دیتی اور ٹاؤن پلاننگ کو ناکام بنا دیتی ہے ایسی حالت میں ڈکٹیٹر شپ ہی ٹاؤن پلاننگ کو کامیاب بنا سکتی ہے یہ تو کہنے کے لئے ایک مثال تھی در حقیقت یہ ہے کہ ہندستان جیسے ملک میں جمہوری طرز پر اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔

مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے

سرسید کا نظریہ تھا کہ انسان انسان ہے اور مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جس کو انسانی معاملات میں مخل نہیں ہونا چاہیئے۔ 1860ء میں جب مرادآباد میں زبردست قحط پڑا تو راجا جے کشن داس نے سرسیّد کو ایک ایسے ہندو کی تیمار داری کرتے ہوئے دیکھا جو اٹھنے بیٹھنے سے معذور تھا اور جس کے رشتے دار بھی اُس کی گندگی کی وجہ سے اُسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ راجا صاحب کی سرسیّد سے ملاقات نہ ہوئی تھی بل کہ وہ سرسیّد کی چند کتابیں پڑھ کر ان کو ایک متعصب مسلمان سمجھنے لگے تھے مگر جب اُنھوں نے سرسیّد کو ہندوؤں کی ایسی خدمت کرتے دیکھا تو ہمیشہ کے لئے سرسید کے دوست بن گئے۔

شمیم احمد شمیم

کئی سیکنڈوں کی ضرورت ہے

حسن وہ ہے جس کا اعتراف سوکن بھی کرے۔ شمیم کے مخالف بھی شمیم کے حسن تقریر اور حسن تحریر کے معترف ہیں۔ شمیم احمد شمیم تقریباً 35 برس پہلے سری نگر سے 40 میل دور ناسنور نام کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ کشمیر کا یہ گاؤں قادیانیوں کی مشہور بستی ہے۔ شمیم نے اسی قادیانی آب وہوا میں پرورش پائی۔ والد بزرگوار نے بیٹے کو گمراہ ہونے ... جب ردکا تو بستی کے قادیانیوں نے بزور بازو اپنی بات منوانا چاہی اور آخر انھوں نے شمیم کے والد محترم کا سماجی بائی کاٹ کر دیا تب مجبوراً وہ اپنے اہل عیال کے ساتھ ناسنور سے ہجرت کرکے شوپیان آگئے۔ مذہب کے حلقے سے نکل کر شمیم احمد یہاں شعر وادب کے دائرے میں داخل ہو گئے اور شمیم تخلص اختیار کیا۔ شاعری چوں کہ اپنے آپ سے برسر پیکار ہونے میں تخلیق پاتی ہے اور شمیم دنیا سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے اس لئے وہ شاعر تو نہ بن سکے البتہ خطیب اور صحافی ضرور بن گئے۔ کہتے ہیں کہ ہرنی تو پہلے ہی تیز گام تھی مگر جب اسے گھونگرو پہنا دیئے گئے تو پھر کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ کدھر گئی۔ شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں جب شمیم کو سیاسی تجربے حاصل ہوئے تو ان کی زبان شعلہ فشاں بن گئی ا... ل ... شمیم ... سان پر رکھی گئی مگر وہ پھر ایک بار مذہب کی زد میں آگئے اور 1947ء کے دنوں میں وہ بھول سے مسٹر جناح کو اپنی قوم کا نجات دہندہ سمجھنے لگے لیکن جلد ہی انھیں اپنے بھٹک جانے کا احساس ہوا اور وہ لوٹ آئے۔

سری نگر سے شمیم نے میٹرک کیا اور ایف۔ ایس سی بھی اور بی۔ اے علی گڑھ یونیورسٹی سے۔ ان دنوں وہ اشتراکی تھے۔ مگر 1956ء میں وہ جب علی گڑھ سے کشمیر واپس ہوئے تو کشمیری سیاست کا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا اور اسی بنا پر وہ حکومت کشمیر کے اردو ماہ نامے "تعمیر" کے اڈیٹر بنا دیئے گئے اور پھر دو ہی برس بعد وہ کلچرل آفیسر مقرر ہوئے مگر ان کے ارادوں نے پھر پلٹا کھایا اور وہ اپنی اس ملازمت سے مستعفی ہو کر علی گڑھ آگئے اور ایل ایل۔ بی۔ کرنے کے بعد انھوں نے سیاست کو قطعی طور پر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اپنے آزاد سیاسی نظریات کو تقویت پہنچانے اور اپنی سیاسی ذات کو بلند کرنے کے لئے انھوں نے 1963ء میں سری نگر سے ہفت روزہ "آئینہ" جاری کیا۔ 1967ء کے عام چناؤ میں کشمیر اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے اور 1971ء کے عام انتخابات میں وہ پارلیامنٹ کے لئے چنے گئے اور آج وہ ایک کامیاب پارلیامنٹری (پارلیامنٹ کے مباحثے میں مہارت رکھنے والے) ہیں

شمیم کو صحافت میں مہارت حاصل ہے یا فنِ خطابت میں کمال ؛ یہ جاننا مشکل ہے دراصل وہ ان دونوں خوبیوں کے حامل ہیں بلکہ وہ سیاسی دنیا کے منٹو ہیں، وہ چونکا دینے اور دھماکا پیدا کر دینے کے ٹیکنک سے واقف ہیں۔ شمیم پُرگو ہیں، خوش گو ہیں اور منہ پھٹ ہونے کی حد تک صاف گو ہیں۔ اپنے آپ کو منوانے کے فن سے واقف ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے ہیں اور تربیت دینا جانتے ہیں، اپنی شریکِ حیات کا احترام کرتے ہیں اور اس بات میں انھیں عزا نہیں آتا کہ ان کا کوئی دوست اپنی بیوی کی برائی اُن کے سامنے کرے۔ شمیم انتہائی متواضع انسان ہیں مگر حساس اتنے کہ ان کا کوئی دوست اگر ان کو کبھی نظر انداز کردے تو وہ اس کو مشکل ہی سے معاف کرتے ہیں۔ شمیم انتہائی روشن خیال، ترقی پسند اور حقیقت شناس قلم کار اور سیاست داں ہیں۔

ش۔ ک۔

س : آپ کے کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہونے اور آزاد رہنے میں کیا مصلحت ہے ؟

ج : میری حالت ایک ایسے کنوارے کی سی ہے جس سے ہر شخص یہی سوال کرتا ہے کہ آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اب شادی ایک ایسا پرسنل معاملہ ہے کہ ہر شخص کو اعتماد میں لے کر اس کے بارے میں ہر بات نہیں بتائی جا سکتی۔ اور میرے سیاسی کنوارے پنے کی بھی کچھ ایسی وجوہات ہیں کہ ہر گنوار سے ان کا ذکر مناسب نہیں۔ لیکن آپ کا شمار چونکہ میرے مہذب، محترم، معتبر اور مخلص دوستوں میں ہوتا ہے اسلئے آپ سے دل کی بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بات یہ ہے کہ میں مصلحتاً نہیں۔ فطرتاً آزاد طبیعت ہوں میں اپنے ذہن اور ضمیر، فکر اور سوچ، اپنے گفتار اور افعال پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ اور سیاسی پارٹیوں [illegible] تنگی میں سب سے پہلے اپنے آپ کو تنظیم پروگرام، قواعد و ضوابط، اصول و آداب اور مصلحت کا تابع بنانا پڑتا ہے۔ یکھوری کہنا پڑتا ہے جو پارٹی کی اکثریت کہتی ہے۔ وہی سوچنا پڑتا ہے جو پارٹی والے سوچتے ہیں۔ وہی کرنا پڑتا ہے جو دوسرے کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر آپکو اپنی انفرادیت کھوکر ہجوم کا حصہ بننا پڑتا ہے اور جب ایک بار آدمی مصلحت اور تقاضائے وقت کے نام پر اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی فیصلہ کر لیتا ہے۔ تو پھر بار بار اس قسم کے ناروا سمجھوتے کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ سیاسی جماعتوں کا مقصد بہر حیثیت اقتدار کا حصول ہے۔ اور اس مقصد کے سامنے دوسرے تمام مقاصد کی حیثیت ثانوی ہے۔ میں اس مقصد کو برا نہیں سمجھتا۔ اور نہ مولوی صاحبان کی طرح میرا یہ عقیدہ ہے کہ دنیاوی اقتدار کوئی ایسی ناپسندیدہ شے ہے کہ اس کے طلب گاروں کو عقبیٰ میں ہر ناز و نعمت سے محروم کر دیا جائے گا لیکن میرے نزدیک ضمیر، ذہن اور زبان کی آزادی بھی ایک بہت بڑی طاقت ہے اور مجموعی اعتبار سے سیاسی طاقت اور اقتدار سے بھی زیادہ محترم، معتبر اور مستحکم طاقت۔ اگر آپ مجھے میری خودستائی کیلئے معاف کریں گے تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ میں نے اپنے قلم اور زبان کی طاقت سے بارہا اقتدار و اختیار کے ایوانوں میں زلزلے بپا کئے ہیں۔ اور میں اپنے اس رول سے بخوبی لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مجھے بت پرستی سے زیادہ بت شکنی میں مزہ آتا ہے۔ اور میں اپنے گلے میں کسی پارٹی کی زنجیر ڈال کر اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ عظیم مقاصد کے حصول کے لئے فرد کو اجتماع کا حصہ بننا پڑتا ہے اور اقبال کے الفاظ میں قطرے کو گہر بننے کیلئے دریا میں غرق ہونا پڑے گا۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنماؤں نے جماعتوں یا تنظیموں کے ذریعہ ہی اپنے مقاصد کی تکمیل کی ہے۔ اور ہم سیاسی ارتقاء کے جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بھی جانتا ہوں کہ کسی مضبوط سیاسی جماعت کا رکن بننے سے میری بہت سی مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ اور میں ملک و قوم کیلئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ بقول غالب جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ میری افتادِ طبع دراصل میری عمر اور میری خام کاری کی علامت ہے۔ اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ میں زیادہ حقیقت پسند اور مصلحت شناس ہو جاؤں۔ لیکن جب تک ذہن اور ضمیر پر بزرگی اور تجربہ کاری کا سایہ نہیں پڑتا۔ میں اپنی جوانی کی نادانیوں سے مطمئن ہوں۔

س :- انتخابات کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ کئے گئے وعدے بھلا دیئے جاتے ہیں۔ اور مسلم اقلیت ہر بار ٹھگی جاتی ہے۔ مسلم اقلیت اپنے مطالبات منوانے کیلئے کون سا جمہوری طریقہ اپنائے؟

ج :- جب تک اس ملک میں پارلیمانی جمہوریت کا نظام قائم ہے مسلم اقلیت سے وعدے ہوتے رہیں گے۔ اور جس دن خدانخواستہ اس ملک سے جمہوریت کا جنازہ نکلے گا۔ اس کے بعد سے پھر کوئی جماعت مسلم اقلیت سے کوئی وعدہ نہیں کرے گی۔ وعدہ الیکشن کی بنیاد اور پارلیمانی نظام حکومت کا اہم ترین جزء ہے۔ اور اگر ہر جماعت انتخابات کے موقع پر مسلم اقلیت سے طرح طرح کے وعدے کرتی ہے۔ تو اس سے صرف مسلم اقلیت کی سیاسی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ آپکو شکایت ہے کہ انتخابات کے بعد مسلم اقلیت کے ساتھ کئے گئے وعدے بھلا دیئے جاتے ہیں۔

اور مسلم اقلیت ہر بار ٹھگی جاتی ہے میں پوچھتا ہوں کہ کیا اکثریت کے ساتھ کئے گئے سبھی وعدے پورے کئے جاتے ہیں اور کیا مسلم اقلیت کے ساتھ ساتھ ہندو اکثریت بھی ہر بار ٹھگی نہیں گئی۔ آزادی کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی اس ملک کی پچاس کروڑ جنتا کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ ہر صبح اس کے لئے امید، مسرت اور خوشحالی کا ایک نیا عنوان بن کے نمودار ہوگی۔ غربت، افلاس، بے چارگی، بیماری اور بیکاری کا خاتمہ ہوگا ملک سے رشوت ستانی، بدعنوانی، فرقہ واریت، اقتصادی استحصال اور سیاسی بے ایمانیوں کا قلع قمع ہوگا یہ وعدے پچھلے ۴۰ برسوں میں کم سے کم ۴۰ لاکھ بار دہرائے گئے۔ ہر بار ملک کی اکثریت نے ان وعدوں پر اعتبار کر کے کانگرس کو اقتدار اور اختیار سونپا۔ اور اقتدار حاصل ہوتے ہی کانگریسی نیتاؤں نے یہ سب وعدے بھلا دیئے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ مسلم اقلیت کے ساتھ ہوا ہے وہ ایک وسیع پیمانے پر ملک کی اکثریت کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں عہد شکنی اور وعدہ خلافی کے اس عمل کو اس کے وسیع پس منظر میں دیکھنا پڑے گا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ سرکاری اور پرائیویٹ ملازمتوں دونوں میں ہی امتیاز " برتا جارہا ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات نے ان میں عدم تحفظ اور بے اطمینانی کا احساس پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے ہی وطن میں " اجنبی " نظر آتے ہیں۔

انتخابات میں ان کے ووٹوں کی اہمیت کے پیش نظر سبھی جماعتیں ان سے زبانی ہمدردی کا راگ الاپتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی بنیادی مشکلات اور مسائل کو حل کرنے کیلئے کسی سیاسی جماعت نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ بے بسی اور بے کسی کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت یا حکمراں جماعت پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اور انھیں موجودہ صورت حال کو بدلنے کیلئے خود کو بدلنا پڑے گا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کو اپنی سوچ اور اپنا انداز فکر بدلنا ہوگا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں مسلمانوں کی ذہنی فکری اور سیاسی زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے ہندستان میں کوئی بنیادی فرق محسوس نہیں کرتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے کم از کم تیس چالیس برس پیچھے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس خلیج کو پاٹنا ہوگا۔ یہ موقع تفصیل سے بات کرنے کا نہیں لیکن یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو بدلے ہوئے حقائق اور بدلی ہوئی دنیا سے آنکھیں ملا کر اپنے منصب اور اپنے رول کا دوبارہ تعین کرنا پڑے گا۔ انھیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ انھیں جن مسائل کا سامنا آج ہے کیا وہ صرف مسلمانوں کے مخصوص مسائل ہیں؟ اور کیا سیاسی اور اقتصادی نوعیت کے پیچیدہ مسائل کو "مسلم اقلیت" سے مخصوص اور منسوب کر کے وہ ان سے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ بات کہنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ آپ جیسے آزاد خیال اور روشن خیال مسلمان نے بھی اردو زبان کے ساتھ روا رکھی گئی ناانصافیوں کو مسلمانوں کے کھاتے میں ڈال دیا۔ حالاں کہ اردو کے ساتھ جتنی زیادتیاں ہوئی ہیں وہ ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک نسل کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہیں۔ اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اردو کے مسئلے کو بھی مسلمانوں کے مسائل کے ساتھ الجھا کر اور پیچیدہ بنا دیا۔ آپنے پوچھا ہے کہ مسلم اقلیت اپنے مطالبات منوانے کے لئے کون سا جمہوری طریقہ اپنائے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کیلئے جمہوری طریق کار کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور اس ملک میں کسی اور فرقہ کو جمہوریت سے کوئی دلچسپی ہے یا نہیں مسلمانوں کے لئے آبرومندانہ طریقے پر زندہ رہنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اسلئے مسلمانوں کو جمہوریت کو مستحکم بنانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے۔

اور اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ مسلم اور ہندو فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف صف آراء ہو کر ملک کی ترقی پسند اور سیکولر جماعتوں میں شامل ہو جائیں۔ اور ان جماعتوں میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مسلمانوں کو درپیش مسائل کیلئے اکثریت کا اعتماد اور تعاون حاصل کریں۔ مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ وہ اس ملک میں تلوار کی نوک پر اپنا کوئی مطالبہ نہیں منوا سکتے۔ انہیں اکثریت کا اعتماد اور اعتبار حاصل کرنا ہوگا۔ اور خوش قسمتی سے اس ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو مسلمانوں سے کچھ زیادہ مسلمانوں کے ہمدرد اور غم خوار ہیں۔

س :۔ اس حقیقت سے شاید آپ انکار نہ کریں کہ مسلم اقلیت میں فرقہ پرستی کا عنصر خوب خوب موجود ہے۔ ظاہر ہے یہ نقصان دہ ہے۔ مگر یہ کیسے دور کیا جائے؟

ج :۔ فرقہ پرستی پر صرف مسلمانوں کی ہی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ پورا ملک اس خباثت میں مبتلا ہے۔ اور صرف مسلمانوں کی فرقہ پرستی دور کرنے کی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ پورے ملک کی فضا نہیں بدلتی۔ اور یہ فضا بدلنے میں جتنی ذمہ داری مسلم اقلیت پر عائد ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ ملک کی اکثریت کے رویے پر اس کا انحصار ہے۔ اقلیت کی فرقہ پرستی بنیادی طور پر احساس کمتری، عدم تحفظ کے احساس اور ذہنی — Complexes کو برقرار رکھنے کی جائز مگر بعض اوقات نامعقول کوششوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس کی ہئیت ترکیبی میں حقیقی مشکلات کے علاوہ فرضی اندیشے اور واہمے بھی بکثرت شامل رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہم و گمان کی یہ دنیا اتنی حقیقی اور یقینی بن جاتی ہے کہ اس میں بسنے والے اس کو ازلی اور ابدی حقیقت سمجھ کر ساری زندگی سایوں کے تعاقب میں گذار دیتے ہیں۔ یہ وہ منزل ہے کہ جہاں فرقہ پرستی طرزِ فکر ہی نہیں، طریقِ زندگی بن جاتی ہے۔ اور انسان موسموں کے تغیر و تبدل کو بھی فرقہ پرستی کی عینک سے دیکھنے لگتا ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کی فرقہ پرستی، بدقسمتی سے اب اپنی سرحدوں میں داخل ہونے لگی ہے۔ اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے دانش ور طبقے نے مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر کے اس صورت حال کو بدلنے کی کوئی کوشش نہ کی تو ہندستانی مسلمان ایک زندہ حقیقت کی بجائے ایک تاریخی داستان کا حصہ بن کر رہ جائے گا۔ صحت مند اور ترقی یافتہ سماج میں فرقہ پرست سیاست کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور ہندستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کے سب سے زیادہ نقصان یہاں کے مسلمانوں کو ہوا ہے ملک کی تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ سیاست کیلئے کوئی جواز تھا یا نہیں، اس پر بحث کی گنجائش ہے اور اس کے متعلق دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن تقسیم کے بعد مسلمانوں کیلئے فرقہ وارانہ سیاست زہر قاتل سے کم نہیں ہے اور مجھے حیرت ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اپنی لیڈری کی ہوس میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں مسلمانوں کی نئی نسل کو صرف جماعت اسلامی سے ہی نہیں، ہر فرقہ پرست جماعت سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہندستانی مسلمان فرقہ وارانہ سوچ کی "عیاشی" کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ فرقہ پرست جماعتوں کے زہر سے مسلمانوں کی نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندو اکثریت کو مسلمانوں کے تئیں اپنے رویے میں خوش گوار تبدیلی پیدا کرنا ہوگی۔ اسے مسلم اقلیت کے اندیشوں کو دور کرنا ہوگا۔ اور ان میں اعتبار اور اعتماد کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ روشن دماغ، ترقی پسند اور لبرل ہندوؤں کے اشتراک کے بغیر ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا ذہن صاف نہیں ہو سکتا۔

اس طرح تعلیم یافتہ، دور اندیش اور سیکولر طرز کے مسلمانوں کو تنگ نظر اور رجعت پسند ملاؤں کے سامنے ہتھیار ڈال کر گوشہ نشینی اختیار کرنے کے بجائے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی اصلاح کا بیڑہ اٹھانا چاہیئے۔ اس ملک کو اس وقت کئی سرسیدوں کی ضرورت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے سرسید مرحوم جیسا ایک بھی شخص مسلمانوں میں آج موجود نہیں ہے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ ان کی فرقہ پرستی ان کی تنگ نظری اور ان کی علیحدگی پسندی سب سے زیادہ ان ہی کو نقصان پہنچائے گی اور ملک کی ہندو اکثریت کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک کی اتنی بڑی اقلیت کو ترقی کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ کر یہ ملک آگے نہیں بڑھ سکتا۔

○ ○ ○

حمید دلوائی

رُوح کا زخم

نام حمید عمر خان دلوائی، نام دلوائی، وطن چپلون ضلع رتناگیری مہاراشٹر۔ 1952ء میں میٹرک کرنے کے بعد حمید بمبئی آ گئے ریلوے میں ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ ایک پرائیویٹ فیکٹری میں بھی ملازمت کی اور کچھ عرصے موٹر ڈرائیوری کا بھی کام کیا۔ جب سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی تو حمید دلوائی سوشلسٹ لیڈر سانے گروجی کی راشٹریہ سیوا دل کے ممبر بن گئے۔ اور مراٹھی اخبارات میں اکثر سیاسی مضامین لکھنے لگے اور پھر وہ 1962ء سے 1968ء تک اترے کے مراٹھی روزنامے 'مراٹھا' میں اسسٹنٹ اڈیٹر رہے۔ اسی اثنا میں انّا صاحب سہسر بڑھے کی ہدایت پر مسلم معاشرے کے حالات جاننے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا اور کرا ایس پر انڈین سیکولر سوسائٹی کی بنیاد رکھی مگر اس سوسائٹی سے مسلمانوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، تب انھوں نے مسلم ستیہ شودھک نام کی ایک جماعت قائم کی۔ دراصل یہ ایک مسلم ریفارمسٹ تحریک ہے۔ اسی تحریک کے تحت پونا میں مسلمان عورتوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلم پرسنل لا میں ریفارم کیا جائے۔ چپلون میں بھی مسلم خواتین کا ایک میلا لگا جس میں نوسے نمائندہ مسلم خواتین نے شرکت کی اور انھوں نے ایک سان سول کوڈ کا مطالبہ کیا۔ مسلم ستیہ شودھک ہی کی جانب سے 1973ء میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس کے ذریعے اسکولوں میں مراٹھی زبان کو میڈیم بنانے پر زور دیا گیا اور کہا گیا کہ اردو کو اختیاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اسی جماعت کی جانب سے دو جریدے بھی جاری ہیں۔ ایک انگریزی ماہنامہ "سیکولرسٹ" اور دوسرا مراٹھی سہ ماہی "مسلم ستیہ شودھک پتریکا"!

جناب حمید دلوائی کا "اندھن" نام کا ایک ناول اور "لاٹ" نام کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی مراٹھی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اس ناول پر انعام مل چکا ہے۔ ——— ش۔ک

اکثر اوقات یہ آواز اٹھتی ہے کہ سارے مسلمان ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں۔ سارے مسلمانوں کا ایک ہی جماعت میں آجانا ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجئے ایسا ہو بھی جائے تو وہ کون سے مسائل ہوں گے جو جماعتی طور پر مسلمان حل کرنا چاہیں گے۔؟ اگر ایک جماعت بنا کر وہ اپنے معاشی مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو معاشی مسائل سب کے لئے یکساں ہیں، ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا عیسائی روزی کا مسئلہ سب کے لیے ایک سا ہے۔

دراصل معاشی مسائل کا تعلق علاقے سے ہو سکتا ہے یا طبقے سے، فرقے سے بالکل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمان اگر اپنے روزگار کی پرابلم حل کرنا چاہتے ہیں تو وہ سب کے ساتھ مل ہی کر حل ہو سکتی ہے۔ روزی حاصل کرنے کے لئے دوسرے جس طرح کوشاں ہیں مسلمانوں کو بھی اسی طرح کوشش کرنا چاہئیے حکومت کی دی ہوئی سہولتیں بھی سب کے لئے ہیں۔ مسلمانوں کو بھی سب کے ساتھ اُن سہولتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہئیے۔

مسلمانوں کے مذہبی مسائل ضرور اُن کے اپنے مسائل ہیں مگر ان مذہبی مسائل کو حل کرنے کے لئے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی ضرورت نہیں ہے مذہبی باتوں کا تعلق چوں کہ جذبات سے ہوتا ہے اِس لئے اور ضروری ہے کہ دوسرے فرقوں کی مخالفت سے بچا جائے اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی حمایت حاصل کی جائے اور اپنی گذرگاہ بنائی جائے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہندستان کی آبادی میں مسلمان صرف تیرا چودہ فی صدی ہیں اور مہاراشٹر میں صرف ساڑھے پانچ فی صدی۔ ایسی حالت میں کیا وہ اکثریتی فرقے کے سامنے اپنا کوئی محاذ بنا کر اپنی بات منوا سکتے ہیں۔؟ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اپنی کوئی پارٹی دوسرے فرقوں کے لئے اشتعال کا باعث بنی ہے میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی، سیاسی ہوں یا مذہبی وہ مل جل کر ہی حل ہو سکتے ہیں۔ چیلنج دے کر نہیں۔ اور نہ علاحدگی پسند رجحان ہی اپنی بات منوانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان بھی دوسروں کی طرح کسی بھی سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے لئے آزاد ہے مگر ظاہر ہے کہ وہ مسلم لیگ جماعت اسلامی یا تعمیر ملت جیسی کوئی فرقہ پرست پارٹی نہ ہو۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان جس پارٹی میں شامل ہو، شامل ہونے سے پہلے وہ اُس پارٹی کے اغراض و مقاصد، مزاج و رجحان کو خوب سمجھ لے اور پھر اُس پارٹی میں ایک ممبر کی حیثیت سے رہے مسلمان کی حیثیت سے نہیں یعنی کانگریس پارٹی میں اُس کو کانگریسی ہونا چاہیے اور کمیونسٹ پارٹی میں کمیونسٹ۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کچھ مسلمان سوچے سمجھے بغیر سوتنتر پارٹی میں شامل ہو گئے تھے مگر جب مصر اور اسرائیل میں جنگ شروع ہوئی تو انھوں نے سوتنتر پارٹی کو خیرباد کہہ دیا حالانکہ یہ بات پہلے ہی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ سوتنتر پارٹی اسرائیل کی طرف دار ہے۔

اڈیٹر گگن جاننا چاہتے ہیں کہ قومی دھارا کیا ہے۔ اور مسلمانوں کے سلسلے میں میرا مشورہ کیا ہے ؟ در اصل بنیادی طور پر ایک قوم کا نظریہ یا ایک قوم کا تصور قائم کر لینا ہی قومی دھارے کے ساتھ چلنا ہے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایک الگ قوم نہ سمجھیں بلکہ وہ اپنے اس ملک ہندستان کو ایک قوم خیال کریں یعنی یہ ہندوستانی قوم، ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، جین، بودھ وغیرہ کتنے ہی فرقوں پر مشتمل ہے۔ کسی کے لئے بھی اپنے علاقے کو ملحوظ رکھنا بُرا نہیں ہے۔ مگر علاقے کے مفاد کو ملک کے مفاد سے ٹکرانا نہیں چاہیئے۔ یعنی علاقے کی بہ نسبت ملک کا مفاد اور فرقے سے زیادہ قوم کا مفاد اہمیت رکھتا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کا مسئلہ تو ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مگر ہندستان باشندوں کے کسی بھی مسئلے سے ہندوستانی مسلمان کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہمیکت مہاراشٹر کی تحریک سے مہاراشٹر کے مسلمان بیکل الگ رہے۔ پچھلے دنوں ریلوے ہڑتال سے بھی انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی غرض کہ ہر قومی تحریک سے مسلمان الگ تھلگ رہتا ہے۔ مگر جب پرشاد بٹتا ہے تو پرشاد لینے کے لئے مسلمان سب سے آگے نظر آتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ہندستانی مسلمان جل برابر اور رکھا برابر کے نظریئے پر عمل کریں۔

فلسطینی مسلمان مظلوم ہیں مجھے اُن سے ہمدردی ہے، اُن پر ظلم کرنے والے یہودیوں کی میں پرزور مذمت کرتا ہوں اور اسی طرح مجھے ان بنگلا دیشیوں سے بھی ہمدردی پیدا ہوئی تھی جن پر پاکستانی فوج نے ظلم ڈھائے تھے مگر اس بات کی کیا وجہ تھی کہ مظلوم فلسطینیوں کے لئے تو ہندوستانی مسلمان زار و قطار رو رہے ہیں مگر جب بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر کوئی ستم توڑتا ہے یا ویت نام کے انسانوں پر بمباری کرتا ہے تو وہ مڑ کر بھی نہیں دیکھتا اس سلسلے میں بھی میرا یہی کہنا ہے کہ ظالم اپنا ہم مذہب ہو یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو قابلِ مذمت ہے۔ ظلم اپنے سے ہو یا غیر سے بہر صورت ظلم ہے اور کسی بھی صورت میں اُس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ مسلمانوں میں مدر ٹیریسا کی طرح عوام کی سیوا کرنے والے کیوں نہیں پیدا ہوتے جس طرح رام کرشن آشرم میں ہر کسی کو شرن مل سکتی ہے مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ کیوں نہیں جو سب کو پناہ دے مسلم کو بھی اور غیر مسلم کو بھی۔

ہر دوسرے تیسرے برس، دنیا کے کسی نہ کسی مسلم ملک میں اسلامی

کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ اور ہر کانفرنس میں مسلمانوں کے تحفظ کے لئے زور دیا جاتا ہے کہ مسلم ممالک میں اتحاد و اتفاق قائم ہو۔ جب اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے تو پھر انسانیت کی حفاظت کے لئے غور کیوں نہیں کیا جاتا اور اس بات پر زور کیوں نہیں دیا جاتا کہ سارے عالم میں اتحاد قائم ہو۔ آخر یہ مسلمان ادارے دوسرے انسانوں سے اتنے بے نیاز کیوں رہتے ہیں۔ اور اسلام میں انسانی جذبے کی اتنی کمی کیوں ہے۔؟ جی ہاں! کہنے کو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے عمل سے اسلام کو نہیں ناپا جا سکتا مگر میرا کہنا یہ ہے کہ جس طرح عیسائیوں کے برتاؤ سے عیسائیت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح مسلمانوں کے عمل سے اسلام کو پرکھا جائے گا۔

بہر حال! میرا مشورہ یہی ہے کہ مسلمان اپنے سیاسی شعور کو بیدار کریں اور ملک کی جو غیر فرقہ وارانہ اور جمہوری سیاسی پارٹیاں ہیں اُن میں شامل ہوں اور انہیں پارٹیوں کے توسط سے اپنے مسائل حل کریں مگر مسلمان بن کر نہیں بل کہ اپنی پارٹی کا ایک ہندستانی ممبر بن کر—

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مذہبی مسائل پر زور نہ دیں بل کہ اپنے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ مذہبی مسائل کے حل ہونے یا نہ ہونے سے مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مسلم فرقے کے بگڑنے یا سنورنے کا سارا دارومدار اقتصادیات ہی پر ہے۔ اپنی اقتصادی حالت سدھارنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زراعت صنعت و حرفت اور تجارت کی جانب توجہ دیں اور اس سلسلے میں اُس کی اپروچ سائنٹفک ہو۔

یہ عام شکایت ہے کہ مسلمانوں کو ملازمت نہیں ملتی، یقیناً اُس کو ملازمت ملنی بھی نہیں چاہیے اس لئے کہ مسلمان نوجوان ریسرچ کرتا ہے غالب یا اقبال کی شاعری پر اور ملازمت چاہتا ہے بینک میں۔ اُس کی اپروچ نہ صنعتی ہوتی ہے نہ سائنسی، پھر آج کے صنعتی دور میں اس کو ملازمت کون دے۔ مسلمان نوجوان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہوتا ہے اور اس مزاج کے قدردان تھے واجد علی شاہ یا بہادر شاہ۔ افسوس! اس جمہوری عہد میں ایسے قدردانوں کا اب گذر نہیں۔ چنانچہ آج کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ شکوے شکایات نہ کریں بل کہ کام کریں اور سب کے ساتھ مل کر کام کریں۔

اس بات پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ بعض مسئلے علاقائی ہوتے ہیں اور بعض ملک گیر۔ مسلمانوں کا اپنے ہر مسئلے کو ہندستان گیر بنا دینا درست نہیں۔ جیسے مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اتر پردیش کے علاقے کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ سارے ہندستان کا نہیں۔ اسی طرح اُردو زبان کا مسئلہ صرف اتر پردیش اور بہار سے تعلق رکھتا ہے دوسرے علاقوں سے اس مسئلے کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ کسی ایک علاقے کے کسی مسئلے کو اٹھا کر سارے ملک میں انتشار پیدا کرنا اچھی بات نہیں۔

مختصر طور پر مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے مسلم اوقاف کو سرکاری کنٹرول میں آ جانا چاہیے تاکہ سو کروڑ روپے کے اوقاف سے دس کروڑ روپے سالانہ کی جو آمدنی ہوتی ہے وہ اسکولوں اور صنعتی اور ٹیکنیکل اداروں، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی پرورش و تعلیم پر صرف ہو اور مسلمان اپنے اوقاف سے جائز اور درست فائدہ اٹھا سکیں۔

مسلمان اپنی عورتوں کو برابری کے حقوق دیں اور یہ بات تب ہی ممکن ہو سکتی ہے جب وہ یک ساں سول کوڈ کو مان لیں۔

مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کے سارے ماننے والے مسلمان ایک قوم نہیں ہیں بل کہ وہ مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایک قوم مختلف فرقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ قومی اتحاد جہاں اور دوسرے طریقوں سے ممکن ہے۔ وہاں انٹرکمیونل میرج (بین مذہبی شادی) بھی قومی اتحاد کے لئے ایک اچھا ذریعہ ہے۔

اُردو زبان کے سلسلے میں بھی میرا یہی کہنا ہے کہ مسلمان اُردو کے معاملے کو اتنا زیادہ گمبھیر نہ بنائیں اور نہ اس سلسلے میں اُن کو زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ خوب سمجھ لیں کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملے گا۔ ہر ریاست میں اکثریت کی مادری زبان ریاست کی سرکاری زبان ہوگی۔ اور ہندی پہلے ہی سے قومی زبان ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندی سیکھیں اور ریاست کی سرکاری زبان۔ ورنہ وہ پہلے سے بھی زیادہ پچھڑ جائیں گے۔

جی ہاں! مسلمان مجھ سے بدگمان ہیں اور میں مسلمانوں کے لئے
ایک ناپسندیدہ شخصیت ہوں۔ سبب واضح ہے ؎

اک آئینہ سرِ راہ لئے بیٹھا ہوں
جرم ایسا ہے کہ ہر شخص سزا دے مجھ کو

میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹ بول کر یہ کہنے کے لئے تیار نہیں
کہ اُن کا ماضی بہت شاندار ہے۔ میں اعلانیہ طور پر کہتا ہوں کہ اُن
کا حال برا اور مکروہ ہے جب کہ اُن کو اپنی برائی سننے کی عادت نہیں
اب تک اُن کے ہر لیڈر نے اُن کی ساری غلطیوں کا ذمے دار دوسروں
کو قرار دیا ہے۔ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے مسلم فرقہ پرستی پر بے
دریے ضربیں لگائی ہیں اور اعلانیہ حملے کئے ہیں۔ اور مسلمان بادشاہوں
کی عیاشیوں اور غیر جمہوری طور طریقوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ اب
ظاہر ہے کہ نادان مسلمان مجھے اپنا دوست کیوں سمجھے گا — مگر مجھے
مسلمانوں سے اور مسلمانوں کے ہر جائز کاز سے ہمدردی ہے۔ وہ وقت
دور نہیں ہے کہ مسلمان جن پر تکیہ کئے ہوئے ہیں وہی اُن کو دغا دینگے
اور اُن کو جان لینا پڑے گا کہ اُن کے سچے محافظ وہ نہیں بلکہ ہم ہیں۔
آج کا مسلمان اگر ہماری سچائی کو تسلیم نہیں کرے گا تو آئندہ نسل ہماری
قومی خدمات اور سچی رہنمائی کا اعتراف ضرور کرے گی۔

دُنیا کے مسلمان

600 ملین

1	شمالی امریکہ	41000	
2	اوشیانا	11800	
3	جنوبی امریکا	50000	
4	برطانیا	100000	ایک لاکھ
5	افریقا	103000000	10 کروڑ 50 لاکھ
6	مشرقی یورپ	13576000	1 کروڑ 35 لاکھ 76 ہزار
7	سوویٹ یونین	24000000	2 کروڑ 40 لاکھ
8	مغربی ایشیا	113000000	11 کروڑ 30 لاکھ
9	پاکستان	55000000	5 کروڑ 50 لاکھ
10	چین	28000000	[illegible] کروڑ 80 لاکھ
11	بنگلادیش	72000000	7 کروڑ 20 لاکھ
12	ہندوستان	61400000	6 کروڑ 40 لاکھ
13	لنکا	821872	8 لاکھ 21 ہزار
14	ملیشیا	4500000	45 لاکھ
15	فلپائن	1732800	17 لاکھ 32 ہزار
16	انڈونیشیا	121000000	12 کروڑ 10 لاکھ

حافظ یوسف دہلوی

ترقی۔ قلتِ خرچ سے ممکن ہے کثرتِ آمدنی سے نہیں

محبت صرف عورت ہی سے نہیں ہوتی، انسان جس سے بھی اپنا دل لگا لے وہی محبوب ـــــ حافظ صاحب کو بھی اپنے کام سے عشق ہے اور یہی ان کی کام یابی کا راز ہے!

اُن کا اچھا سا نام محمد یوسف ہے دہلی کے مشہور تجارت پیشہ زرتے پنجابیان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے والدِ مرحوم شیخ محمد یعقوب اپنی برادری کے باعزت اور ـا لوگوں میں سے تھے۔ 6 دسمبر 1904ء کو حافظ صاحب پیدا ہوئے دو ہی برس کے تھے کہ ماں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ سوتیلی ماں نے مشرقی مزاج کے برعکس اُن کو بہت ہی پیار و محبت سے پالا اور تعلیم دلائی۔ 14 برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور پھر چمڑے کے آبائی کاروبار میں اپنے والد صاحب کا ہاتھ بٹانے لگے۔ 1921ء میں شادی ہوئی اور 1924ء میں مشفق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اگرچہ سوتیلی ماں اپنے عمل سے حقیقی ماں ثابت ہوئی تھیں۔ مگر ناجان صحن سعادت میں سوتیلے ثابت ہوئے۔ جہاں درجانے داد کا مطالبہ اُنھوں نے کچھ اس طرح کیا کہ معمولی سی بات نے جھگڑے کی صورت اختیار کر لی۔ حافظ۔ جب نے نفرت کا جواب محبت سے اس طرح دیا کہ جائیداد کے تقسیم ہونے پر جو کچھ اُن کے حصّے میں آیا وہ اُس سے بھی اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کے حق میں دست بردار ہو گئے اُن کی اس دریا دلی پر اُن کے ناجان کو بھی دِل خوش کن حیرت ہوئی۔

1937ء میں اپنی اہلیہ کی بیماری کے سلسلے میں حافظ صاحب کو دو برس تک نہر دلی میں رہنے کا اتفاق ہوا اور وہیں سے اُنھوں نے دسمبر 1939ء میں ماہ نامہ "شمع" جاری کیا۔ ایک پرچے کی قیمت چھ آنے تھی اور سالانہ قیمت ایک روپیا۔ یوں تو یہ رسالہ وقت گزاری کے لئے نکالا گیا تھا مگر جب ایک ہی برس میں تعدادِ اشاعت 6 ہزار تک پہونچ گئی تو حافظ صاحب اپنے آبائی کاروبار کو ترک کر کے "شمع" کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہوئے۔ مہینے میں پندرہ دن شہر در شہر گھوم کر ایجنسیاں قائم کرتے اور پندرہ دن گھر بیٹھ کر رسالے کی اشاعت کا انتظام سنبھالتے۔ 1947ء میں "شمع" کی اشاعت جب 25 ہزار ہو گئی تب باقاعدہ ایک دفتر بھی قائم ہو گیا ـــــ جون 1951ء میں "شمع" کی تعدادِ اشاعت جب 15 ہزار تھی تب حافظ صاحب کے بڑے صاحب زادے جناب یونس دہلوی نے شمع معمے شروع کئے۔ ماہنامہ شمع کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کی تعدادِ اشاعت ایک لاکھ تیس ہزار تک ہی ہے اور اُردو کی دنیا میں یہ ایک ریکارڈ ہے۔

اپنے خاندانی پس منظر اور زندگی کے انیک تجربوں نے حافظ صاحب کو ایک کڑھا ہوا انسان بنا دیا ہے اسی لئے اُنھوں نے امیرانہ غرور اور حاکمیت کو اپنے دل و دماغ پر کبھی غالب آنے نہیں دیا۔ اُن کو دیکھ کر، اُن سے مل کر فخریہ جو خیال دل میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ قدرت ہم کو بھی اُنہی جیسی بزرگی اور بڑا پن عطا کرے۔ ـــــــــ شخص کے

آج کے ہندستان میں حافظ صاحب کا شمار صفِ اول کے کام یاب مسلمانوں میں ہوتا ہے اور اپنے میدان میں وہ کام یاب

ترین انسان ہیں ۔ اسی لئے ایک ملاقات میں میں نے اُن سے چند سوالات کیئے تاکہ اُن کی بتائی ہوئی تجربہ شدہ باتیں ہم سب کے لئے اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی نسل نو کے لئے مفید ثابت ہوں ۔

س : اُردو رسالے کو کامیاب بنانے میں کن کن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے ؟

ج : رسالے ہی کو کامیاب بنانے کا سوال نہیں ، کسی بھی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے ایمانداری ، محنت ، لگن اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ میں یہ مانتا آیا ہوں کہ کاروبار کثرتِ آمدنی سے نہیں بل کہ قلتِ خرچ سے ترقی پاتا ہے ۔ اسی سلسلے میں آپ کو برسوں پہلے کا ایک واقعہ سناؤں کہ میں جب ''شمع'' کو دہلی سے منظور کرانے کے لئے الہ آباد گیا تو جس دن الہ آباد پہنچا اتفاق سے وہ اتوار کا دن تھا ۔ وہیلر کا آفس بند تھا ۔ میں دن بھر شہر میں گھومتا رہا اور ''شمع'' ہی سے متعلق دوسرے کام انجام دیتا رہا رات ہوئی تو کسی ہوٹل میں نہیں بل کہ شہر کی سرائے میں پہنچا جس کا نام گھوڑے والی سرائے تھا ۔ معلوم ہوا کہ ایک آنہ فی کھاٹ فی رات کرایہ ہے ۔ میں نے چار پیسے ادا کئے ۔ اپنی شیروانی اُتاری ، کھدری چارپائی پر سرہانے رکھکر سو گیا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب ضرورت ہو تب ہی اور جتنی ضرورت ہو اتنا ہی خرچ کیا جائے ۔ فضول خرچی کاروبار کو بری طرح متاثر کرتی ہے ۔ کفایت شعاری ہر پہلو سے ہونی چاہیئے ۔ شروع شروع کی بات ہے کہ میں شمع کے پرچے اپنے کندھے پر رکھکر ڈاک گھر لے جایا کرتا تھا ، اپنا کام آپ انجام دینے میں میں نے کبھی شرم نہیں کی چنانچہ ایک بار میرے ایک بھائی نے مجھ کو ٹوکا : تم جو کندھے پر یہ پرچے اُٹھائے پھرتے ہو اس سے تم کو نہ سہی مگر مجھ کو شرم آتی ہے ۔ ہم باعزت اور خوش حال لوگ ہیں کم سے کم تم کو اس بات کا تو خیال رکھنا چاہیئے ! ۔ میں اپنے بھائی کی یہ بات سُن کر ٹال گیا ۔ برسوں بعد جب پاکستان میں ہم دونوں ملے ۔ تو انھوں نے میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے کہا : ''مجھے فخر ہے کہ تم میرے بھائی ہو !'' میرا اپنے بھائی کے لئے باعثِ فخر ہونا دراصل یہ میری محنت کا انعام ہے ۔ یہ بھی بتا دوں کہ 27½ روپے کے سرمائے سے ''شمع'' شروع کیا گیا تھا اور آج جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی مہربانی کے ساتھ ساتھ محنت اور صبر کے ہتھیار مولے پر عمل کرنے ہی سے ہے ۔

پرچا وقت پر نکلے ۔ پرچے کی کامیابی کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے ، ''شمع'' ہی کے سلسلے میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ میں اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے کرسی پر بیٹھا رہا ہوں اور کاتبوں کو سامنے بٹھا کر کتابت کا کام مکمل کرایا ہے ۔

س : ہر کاروبار میں اکثر کٹھن موڑ آتے ہیں ، آپ بھی کبھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں کسی آزمائشی دور سے گذرے ہیں ؟

ج : جی ہاں ! کاروبار میں مالی پریشانیاں تو اکثر پیش آیا ہی کرتی ہیں ۔ ہمارے ادارے نے فلم ڈسٹری بیوشن کے سلسلے میں 50 ہزار روپیہ لگایا تھا ½1 لاکھ کا فائدہ ہوا ۔ مگر آگے ½2 لاکھ روپے کا نقصان ایک بار ہوا ۔ اور آٹھ لاکھ کا ایک بار ۔ اُن دنوں دفتر پر بھی ½2 لاکھ روپے کا قرض چڑھ گیا تھا مگر میں نے خدا کی ذات پر بھروسا رکھا ، ہمت نہیں ہاری ، بددل نہیں ہوا ۔ مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ حالات قابو میں آگئے ۔

س : (حسین عورت اور کامیاب مرد کے دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے ۔ وہ دوسروں کے حسد کا اکثر نشانہ بنتے ہیں مگر جو لوگ فطرتاً نیک ہوتے ہیں برے لوگ اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے جیسے صندل پر زہر اثر نہیں کرتا حالاں کہ سانپ اُس پر لپٹے رہتے ہیں) آپ کی ذات اور آپ کے کاروبار کے خلاف اکثر لکھا جاتا ہے اپنے خلاف پڑھکر یا سن کر آپ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے ؟ ۔

ج : مجھے خوشی ہوتی ہے اس لئے کہ میرے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے یا کہا جاتا ہے ۔ وہ حسد و بغض کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں میرا عقیدہ ہے اور تجربہ بھی کہ کسی کے بُرا چاہنے سے میرا بھلا ہوتا ہے یعنی میرا کاروبار اور بڑھ جاتا ہے ۔ البتہ اگر کوئی درست طور پر اور دیانت داری سے مجھ کو بُرا کہے تو مجھ کو فکر بھی ہو اور میرا روزگار بھی متاثر ہو ۔ اس سلسلے میں اُستاد ذوقؔ کا ایک بہت ہی اچھا شعر ہے ؎

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو ، تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا ، تو وہ کیوں حسود ہوتا

س : آپ کے خیال میں اردو زبان کا مستقبل روشن ہے یا تاریک ؟

ج : اُردو کا مستقبل روشن ہے۔ اُردو لشکری زبان ہے سب کی زبان ہے۔ اس لئے اُردو کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ ہمارے ادارے سے ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں پرچے شائع ہوتے ہیں اور آج بھی تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے اُردو زبان کے پرچے زیادہ کامیاب ہیں۔ اور اب تو حکومت بھی اُردو کی جانب متوجہ ہوئی ہے۔ اس لئے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

س : (عیال داری کا جہاد جنگ کے جہاد سے کم کٹھن نہیں ہوتا۔ اسی لئے صالح اولاد ...ن نیرہ اردیا جاسکتا ہے) آپ کے سب بیٹے آپ کے کام میں بھی معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ سعادت مند اور باادب بھی ہیں۔ پوتے پوتیوں کا بھی یہی حال ہے یہی نہیں بلکہ غیر گھروں سے آئی ہوئیں آپ کی بہوئیں بھی آپ کا بہت زیادہ پاس و لحاظ کرتی ہیں۔ آپ نے ان سب کو تربیت دینے میں کس بات کا خیال رکھا۔ ؟

ج : اپنے گھر کا بڑا ہونے کی حیثیت سے میں نے اپنے گھر میں اپنی محبت اور شفقت سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ جہاں میرے بیٹوں نے میرے تجربوں سے کام لیا وہاں کسی کی غلطی پر میں نے بھی اُن کو سب کے سامنے نصیحت کبھی نہیں کی۔ جب بھی میں نے اُن کو کوئی بات سمجھائی ہمیشہ تنہائی میں سمجھائی اور نصیحت کرتے وقت اپنے لب و لہجے کو نرم ہی رکھا۔

س : تقسیمِ ہند کے بعد بہت سے کاروباری مسلمان، خصوصی طور پر آپ کی پنجابی برادری سے تعلق رکھنے والے تاجر پاکستان چلے گئے مگر آپ نے پاکستان منتقل ہونا کیوں نہیں چاہا۔ ؟

ج : جی ہاں یہ درست ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد میرے پڑوسی بھی پاکستان گئے اور بہت سے میرے عزیز رشتے دار بھی — مگر مجھے تو اپنے اس دیس سے محبت ہے، میں یہیں پیدا ہوا ہوں اور یہیں مروں گا۔ میں نے تو اپنے بچوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ تم پاکستان میں اگر بسنا چاہتے ہو تو پاکستان جا سکتے ہو مگر میں تو ہندوستان ہی میں رہوں گا۔ آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ ابتدا میں جو لوگ وہاں گئے وہ کاروباری طور پر کامیاب بھی رہے۔ مگر ہمیں تو ہندوستان ہی

میں رہ کر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جب پاکستان بنا تو "شمع" کی تعداد اشاعت 25 ہزار تھی اور بعد میں یہ تعداد ایک لاکھ تیس ہزار تک پہنچ گئی۔

س : آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے محترم ہیں اور آج آپ جہاں دیدہ، تجربہ کار اور ایک کامیاب انسان کی زندگی بسر کر رہے ہیں، براہ کرم بتائیے کہ آج کا ہندوستانی مسلمان اپنی زندگی کو خوش حال کیسے بنائے ؟ آپ کا جواب مسلمان کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

ج : اگر محنت، ہمت، مستقل مزاجی اور لگن کے ساتھ کام کیا جائے دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے تو اللہ کا فضل شاملِ حال رہتا ہے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں اور کامیابی خود بڑھ کر قدم چوم لیتی ہے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ وہ محنت کرے۔ مستقل مزاجی سے ڈٹا رہے رکاوٹ کا پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ فضول خرچ نہ بنے، جوڑ رس بنے۔ کامیاب ہونے پر اپنے تکلیف دہ ماضی کو ہمیشہ یاد رکھے اور ترقی و دولت پا کر مغرور بھی نہ ہو۔ نہ کسی کی کامیابی پر اُس سے حسد کرے اور نہ اُس کی ترقی میں رکاوٹ بنے بلکہ یہ دھیان میں رکھے کہ ہر ایک اپنی قسمت کا کھاتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنے اس ملک سے محبت کرے اس کی حفاظت کرے اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ یعنی اس ملک کی ترقی اس کی اپنی ترقی ہے۔ اور اس ملک کی بقا اُس کی اپنی بقا ہے۔

> میں ہندوستانی مُسلمانوں سے
> کہتا ہوں کہ جب تک تم ہندوستانی
> نہ بنو گے،
> نہ تمہاری اپنے ملک میں عزّت ہوگی
> اور نہ اسلامی ملکوں میں تمہیں احترام
> کی نظر سے دیکھا جائے گا۔
> عبیدُ اللہ سِندھی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

قومی یک جہتی

کنور صاحب گرو نانک کی 14 ویں پشت میں سے ہیں۔ اُن کے جدِ امجد سر بابا کھیم سنگھ وائس رائے کی ایگزیکیٹو ر کے ممبر تھے اور متحدہ پنجاب کے سب سے زیادہ دولت مند انسان تھے۔ تقسیمِ ملک کے نتیجے میں کنور صاحب نے اپنے وطن عزیز کے ساتھ اپنی 22 کروڑ روپے کی جائیداد بھی چھوڑ دی۔ پنجاب کی سول سروس سے کنور صاحب کی ملازمت کی ابتدا ہوئی۔ پنجاب کے کئی اضلاع میں ڈپٹی کمشنر رہے، ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات بھی رہے اور ایک مدت تک دلّی میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہے اور اب ریٹائر ہونے کے بعد ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ درجنوں سماجی اداروں کے سرپرست، نگران، اور سربراہ ہیں۔ اپنی اردو شاعری، مشاعروں کی نظامت و صدارت کی بنا پر ادبی حلقوں میں بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ قومی یک جہتی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور خصوصی طور پر وہ ہند و مسلم اتحاد اور ہند و پاک ملاپ اپنے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ایک ملاقات میں مختلف موضوعات پر میری ان سے جو بات چیت ہوئی وہ ذیل میں درج ہے ——— ق۔ ک

س : کیا آپ مشاعروں کو اردو کی ترقی، ترویج و اشاعت اور فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کیوں اور کس لحاظ سے ؟

ج : جی ہاں ! میں مشاعروں کو بھی اردو زبان کی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اگرچہ مشاعرے کے سامعین میں اکثریت ان کی ہوتی ہے جو شعرا کے اشعار سے نہیں بلکہ ان کے ترنم سے محظوظ ہونے کے لئے آتے ہیں مگر ظاہر ہے جس زبان کے شعروں کو وہ ترنم سے سنتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں لازمی بات ہے کہ اس زبان سے بھی ان کی ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور کسی کے حق میں ہمدردی مفید ہی ہوتی ہے مضر نہیں۔ چنانچہ مشاعروں سے INDIRECT اردو زبان کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔

س : ہر مشاعرے کی اسٹیج سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ حکومت کی سرپرستی کے بغیر بھی اُردو ترقی کرے گی اور باقی رہے گی کیا آپ بھی اس بات سے متفق ہیں جب کہ انگریزی زبان نے صرف حکومت کی سرپرستی میں ترقی کی اور سنسکرت جب حکومت کی سرپرستی سے محروم ہوئی تو وہ ختم ہو گئی۔ ؟

ج : جی ہاں ! اس میں شک نہیں کہ حکومت کی سرپرستی کسی حد تک ضروری ہے مگر کلی طور پر نہیں۔ اگر زبان میں جان ہے تو وہ ضرور زندہ رہے گی۔ حکومت کی اعانت کسی زبان کو تقویت ضرور پہنچاتی ہے مگر زندہ اس کو اہلِ زبان ہی رکھتے ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں ہندی زبان مغلیہ حکومت کی سرپرستی سے محروم رہی مگر پھر بھی زندہ رہی۔

س : اُردو میں ہندی الفاظ ہوں ۔ اور کس لئے اس کا

بیک گراؤنڈ مسلم ہند ... ہے۔ کیا آپ اس کی تشبیہیں اور استعاروں کے پیش نظر اردو کو ہندو مسلمان سب کی زبان کہیں گے!

ج : اردو ہندوستان کی پیداوار ہے تاریخی طور پر اگر ہندوستان کی تہذیب پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں جو لوگ بھی آئے انھوں نے اپنے اثرات چھوڑے مغلوں کی تہذیب بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ مغل تہذیب کے بیک گراؤنڈ کا بھی اردو میں آنا لازمی تھا۔ مگر بعض تشبیہوں اور استعاروں کی بنا پر اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا درست نہیں۔ اگر اردو مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی تو بنگلا دیش نہ بنتا اور اب پاکستان میں اردو دشمنی کی جو لہر چل رہی ہے وہ نہ چلتی۔ اب پاکستان میں اردو مشاعروں کے بجائے پنجابی مشاعرے ہونے لگے ہیں چوں کہ اردو کا بیک گراؤنڈ فارسی ہے اس لیے ایرانی تہذیب کے اثرات اردو زبان پر پڑنا لازمی تھے۔

س : قومی یک جہتی پیدا کرنے کے سلسلے میں کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جو کارگر ثابت ہو۔؟

ج : دراصل قومی یک جہتی کے جذبے یا تحریک کو اب تک عام ہو جانا چاہیئے تھا مگر اس جذبے کے عام ہونے میں سیاست ہی مانع آئی ہے۔ یعنی کانگریسیوں کی فرقہ پرستی قوم میں یک جہتی پیدا ہونے نہیں دیتی۔ میرا مطلب کانگریس کے اصولوں سے نہیں بلکہ ان کانگریسیوں سے ہے جو اپنے دل سے نہیں بلکہ اپنے سر کی گاندھی ٹوپی سے کانگریسی بنے ہوئے ہیں ایسے کانگریسی سب سے بڑے فرقہ پرست ہیں یہ لوگ دھرم، ذات، فرقے اور علاقے کے نام پر ووٹ لیتے ہیں۔ الیکشن میں کامیاب ہوتے ہیں اور انسانوں کے درمیان تفریق پیدا کرتے ہیں۔ دراصل چناؤ کا جو طریقہ رائج ہے قومی یک جہتی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ میرٹھ میں جب میرا جشن منایا گیا تو اس کے جلسے میں میرے جذبۂ قومی یک جہتی کا بھی ذکر کیا گیا۔ میں نے جواب میں کہا کہ میری ایک بیٹی ہے، شادی شدہ ہے ظاہر ہے کہ اسکا شوہر سکھ ہے جو میرا داماد ہے مگر یہ جو سامنے شاکا ہزار خان بیٹھے ہیں یہ بھی میرے داماد ہیں ان کی بیوی کو میں نے اپنی بیٹی بنایا ہے اور باپ کا فرض بھی ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ جو قومی یکجہتی

پیدا کرنے کے سلسلے میں میری رائے تو یہی ہے کہ ہر بستی کے ہر محلے میں چند بزرگ اپنے پڑوسیوں کے بچوں کو اپنے بچے قرار دیکر ایک رشتہ قائم کرلیں اور رشتے کو نبھائیں تو قومی یک جہتی کا جذبہ پروان چڑھ سکتا ہے۔

س : تاریخ کے بعد شاید آپ وہ اردو شاعر ہیں جو فن کشتی سے بھی ذوق رکھتے ہیں آپ اس سلسلے میں کن کن پہلوانوں سے ملے اور کہاں کہاں گئے — ؟

ج : ہندوستانی کشتی میں فی زمانہ رحمٰن عرف گونگا کو میں مانتا ہوں وہ گاما سے بھی بڑا پہلوان تھا۔ گاما، گونگا اور رحیم بخش وغیرہ سب کی کشتیاں میں نے دیکھی ہیں۔ میں خود بھی کشتی لڑتا رہا ہوں۔ دراصل پچھلے 50 برس سے مجھ کو یہ شوق ہے ویسے کشتی سے میرا تعلق آبائی ہے۔ جی ہاں! جہاں تک پاکستانی پہلوانوں کا تعلق ہے وہاں کے دوسرے درجے کا پہلوان بھی ہمارے صف اول کے پہلوان سے زیادہ بہتر ہے اور حاوی ہے کشتیوں ہی کے سلسلے میں مجھ کو یورپ لنکا، اور روم کے اولمپکس میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

س : غالب صدی کے سلسلے میں جب آپ انگلستان گئے تھے تو وہاں آپ نے اردو کو کس حد تک مقبول پایا۔؟

ج : پنجاب (جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ) کے جو لوگ انگلینڈ میں موجود ہیں ان کو مشاعروں سے تو ضرور دلچسپی ہے مگر اردو زبان سے کوئی خاص لگاؤ نہیں بہ نسبت پاکستانیوں کو مشاعروں سے بھی زیادہ دلچسپی ہے اور اردو زبان سے بھی۔ اگرچہ ہندوستانی اور پاکستانی جو انگلینڈ میں مقیم ہیں ان میں آپس میں کوئی عناد نہیں۔ مگر غالب صدی سے متعلق ہمارے جلسوں میں وہ بہت کم شریک ہوئے۔ ویسے انگلینڈ کا جو پڑھا لکھا طبقہ (کالجوں کے اساتذہ) ہے وہ انگریزی ہی سے دلچسپی رکھتا ہے کسی اور زبان سے نہیں۔

س : جدید شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج : جلدی اور سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اگر جدید شاعری مقصدی تعمیری اور اصلاحی ہو تو قابل تعریف ہے مگر جو نوجوان طبقہ اس جدید ٹیکنیک کو اپنائے ہوئے ہے اسکے لئے اپنی شاعری کو تعمیری بنا دینا ٹیڑھی کھیر ہے جس شاعری کو آج جدید کہا جا رہا ہے اس میں نہ شعریت ہے نہ موزونیت، تعمیری جدید شاعری دراصل وہ ہے جو جوش ملیح آبادی کی ہے یعنی ترقی پسند شاعری کا بھی ایک مقام ہے مگر جدید کا بالکل نہیں۔ ●●

منو سمرتی اور مارکس ازم

دیوان آنند کمار جی مشترکہ پنجاب کے صفِ اوّل کے برہمن رئیس راجا نریندر ناتھ کے صاحب زادے ہیں۔ دیوان صاحب کے جد امجد دیوان مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ دیوان صاحب جب ولایت سے بار ایٹ لا ہو کر ہندستان آئے تو بیرسٹری کو پیشہ نہیں بنایا بل کہ فوج کا ایک اعلا عہدہ قبول کر لیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد پنجاب یونی ورسٹی میں زوالاجی کے استاد بن گئے۔ درس و تدریس میں دیوان صاحب کا رجحان اتنا بڑھا کہ نو برس تک پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آج کل دیال سنگھ کالج (دہلی) دیال سنگھ کالج (کرنال) دیال سنگھ لائبریری ٹرسٹ سوسائٹی، سادھو آشرم اور درجنوں عوامی اداروں کے پریزیڈنٹ، چیئرمین، نگراں سرپرست اور سربراہ ہیں۔ اسّی سالہ کشمیری نژاد دیوان صاحب شرافت، تہذیب و اخلاق رحم دلی، خدا ترسی انسان دوستی، اور ہندو مسلم بھائی چارے کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ میں جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو مشفقت سے پیش آئے اور علم و ادب اور سیاست کے موضوع پر بہت دیر تک گفت گو کرتے رہے۔ ش ک

س : حصول آزادی سے پہلے ہم سب اس سلسلے میں گاندھی جی سے متفق تھے کہ آزاد ہندستان کی قومی زبان نہ ہندی ہو اور نہ اردو، بل کہ ہندستانی ہو مگر ملک کی تقسیم نے اس نظریے کو متاثر کیا۔ اب لسانی مسئلے کا حل کیا ہو؟

ج : دراصل اس سارے جھگڑے کی جڑ ہندی زبان کی درسی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں نے اسکولوں اور کالجوں کے ماحول کا ناس کر دیا ہے۔ ہندی زبان کے معمولی رائٹروں نے رشوت دے دے کر اپنی کتابیں نصاب میں شامل کرالی ہیں اور اب وہ بڑی بڑی رقمیں رائلٹی میں پا رہے ہیں۔ ہندی کے ان نام نہاد رائٹروں نے جان بوجھ کر زبان کو کٹھن بنایا ہے۔ لفظ "اور" اگرچہ فارسی زبان سے تعلق نہیں رکھتا مگر ہندی کا رائٹر "اور" کی جگہ "اَتھوا" لکھے گا اسی طرح لفظ "بے بدل" میں "بے" بھی ہندی ہے اور "بدل" بھی لیکن ہندی کی درسی کتاب میں "بے بدل" کے بجائے "اَتلیت" لکھا ہوا ملے گا۔ چنانچہ ایسے ٹھونسے ہوئے غیر مانوس ہندی الفاظ نصاب کی کتابوں سے نکال دیئے جائیں تو پھر وہی زبان رہ جائے جو ہم اور آپ بولتے ہیں یعنی ہندستانی! سہ لسانی فارمولے کو بھی ختم کرنا ضروری ہے یعنی انگریزی جس کو اس فارمولے سے خارج کر دیا گیا ہے اس کو ضرور شامل کیا جائے۔ انگریزی، سنسکرت اور فارسی پر یہ فارمولا مشتمل ہو۔ جو سنسکرت پڑھے گا وہ ہندی بھی سیکھ جائے گا اور جو فارسی پڑھے گا اسے اردو بھی آجائے گی۔ اور انگریزی اس لئے کہ انگریزی دنیا کی زبان بن چکی ہے۔ روس میں روسی ضروری زبان ہے باقی دو زبانوں کو اختیاری حیثیت دے دی گئی ہے مگر غیر ملکی زبانوں میں 75 فی صدی روسی انگریزی ہی زبان سیکھتے ہیں۔ انگریزی نہ سیکھنا ایسا ہی ہے جیسے ہم نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں دے

ہیں اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی۔

س : کیا اردو کا موجودہ رسم خط اردو زبان کی ترقی اور اشاعتی کام میں رکاوٹ نہیں ہے؟

ج : اس رسم الخط سے زیادہ خوبصورت شارٹ ہینڈ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ ہندی کا ہر حرف پورا کا پورا لکھنا پڑتا ہے اس لئے ہندی لکھنے میں زیادہ وقت لیتی ہے۔ اردو جلدی اور کم وقت میں لکھی جاتی ہے۔ لندن میں میرے ایک انگریز پروفیسر تھے وہ اردو رسم خط کے متعلق کہا کرتے تھے، IT IS A WONDERFUL SHORTHAND اس لئے اس رسم خط کو مٹانا پاپ ہوگا۔

س : کیا اکثریتی فرقہ (ہندو فرقہ) کا یہ کہنا درست ہے کہ اقلیتی فرقہ (مسلم فرقہ) قومی دھارے کا ساتھ نہیں دیتا۔؟

ج : قومی دھارا ہے کہاں! نہ برہمن ساتھ ہے، نہ جاٹ اور نہ بنیا۔ پھر مسلمان کس طرح کس دھارے میں شامل ہو اور کس دھارے کو قومی دھارا کہا جائے۔ در اصل سب کو ایک دھارے میں بہا لے جانے والی بات کمیونزم والی بات ہے مگر یہ یاد رکھئے کہ کمیونزم اسلام اور ہندو دھرم دونوں کی فطرت کے خلاف ہے۔ کمیونزم کئی بار پیدا ہوا اور ناکام ہو کر ختم ہو گیا وجہ یہ ہے کہ جو حکومت عام ذات کے انسانوں کے بل پر بنائی جائے گی وہ ختم ہو جائے گی۔ بس منو کا دھرم ہی اشتراکی قانون ہے۔

س : بے روزگاری، مہنگائی اور غریبی کا خاتمہ کیسے ہو اور ملک خوش حال کیسے بنے۔؟

ج : بات یہ ہے کہ اشتراکیت ہمارے مزاج کے بالکل خلاف ہے جب کہ ہماری حکومت کا رجحان اسی طرف ہے۔ سماج کا شیرازہ بکھرنے پر کمیونزم آیا کرتا ہے۔ مگر ہمارے سماج کا شیرازہ بالکل نہیں بکھرا۔ لیکن ہاں ہماری حکومت ہمارے سماج میں ضرور انتشار پیدا کرنا چاہتی ہے گندم پر حکومت کا قبضہ، زمین کی تقسیم، کوئلے پر حکومت کا اختیار اور بینکوں کو قومیا لینا مریض ملک کے لئے پرہیز نہیں بد پرہیزیاں ہیں۔ ان نام نہاد اصلاحات سے غریبی بڑھی ہے بے روزگاری پھیلی ہے اور گرانی میں اضافہ ہوا ہے کسی ایک بات میں کمی نہیں ہوئی۔ اکبر نے ہندو عورت پر ترس کھا کر ستی کو بند کیا اور مسلمان ہو کر بند کیا۔ اگر آج بھی کوئی اکبر جیسی ہمت اور عقل کا حاکم ہو تو ہر بگڑی بات سدھر سکتی ہے۔ ہمت درکار ہے، کرسی قربان کر دینے کی ہمت۔

س : براہ کرم اُن چند کتابوں کے نام بتائیے جو آپ میں ذہنی انقلاب لانے کا باعث بنیں۔ یا جن سے آپ بے حد متاثر ہوئے۔؟

ج : دنیا کی دس کتابوں کو ٹاپ کی کتاب کہا گیا ہے، قرآن، انجیل گیتا، رامائن، توریت، مہابھارت، بھگوت، کنفیوشیس اور باقی دو کے نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہے۔ بھگوت نے مجھ کو ہر پہلو سے اپیل کیا ہے، گیتا اور مہابھارت، انسانی کردار کو بنانے اور سنوارنے میں مدد دیتی ہیں۔ فارسی زبان میں مجھ کو شیخ سعدی، اور حافظ شیرازی کے کلام نے متاثر کیا ہے مگر مارکس کا فلسفہ مجھے بالکل متاثر نہ کر سکا۔ بعد کے لکھنے والوں میں مولانا آزاد سے بہتر میں نے کوئی نہیں پایا۔ ان کے مقالے، حیدین، کو میں نے بار بار پڑھا ہے دیسے میں مولانا آزاد کے اخبار، الہلال، اور، البلاغ، بھی برابر پڑھتا رہا ہوں۔ ●●

مسٹر بیک کی پیش گوئی

کانگریس کا ۵ واں (۱۸۸۹ء) اجلاس بمبئی میں ہونا قرار پایا۔ اس اجلاس کی سب سے بڑی کشش برتانوی ہاؤس آف کامنز کے ممبر مسٹر برائڈ لا کی شرکت تھی جو اپنے ساتھ ایک اسکیم بھی لائے تھے۔ تاکہ کانگریس میں غور ہونے کے بعد وہ برطانوی ایوانِ عام میں پیش کریں اور سفارش کریں کہ ہندوستان جمہوری نظام قائم کیا جائے انگلستان واپس ہونے پر مسٹر برائڈ لا نے ہاؤس آف کامنز میں اپنا مسودہ پیش بھی کیا مگر ہندوستان میں علی گڑھ کالج کے استاد مسٹر بیک نے اس بات کی مخالفت کی اور اپنے ایک مضمون میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اگر جمہوری نظام قائم کیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ قتل عام ہوگا، ایک فرقے کے خلاف دوسرے کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھیں گے اور خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی۔

وی شنکر

مسلمان اور سرکاری ملازمتیں

پرتاب گڑھ (اترپردیش) میں پیدا ہوئے۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ شری وی شنکر ریٹائرڈ آئی۔سی۔ایس ہیں سردار پٹیل کے سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ اردو فارسی میں کافی حد تک دسترس رکھتے ہیں۔ خوش مذاق ہیں، خوش گفتار ہیں۔ مشاعروں کی صدارت و نیابت کے لئے بہت مشہور ہیں۔ اپنی اس ریٹائرڈ زندگی میں بھی کئی اداروں کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ ایک ملاقات میں ہندستانی مسلمانوں کے موضوع پر میری جو بات چیت ان سے ہوئی اُس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ ——— ش۔ک

س : سرکاری ملازمتوں میں تناسب کے اعتبار سے مسلمان بہت کم ہیں۔ کیا مسلمان خود سرکاری ملازمت کے اہل نہیں یا اس سلسلے میں حکومت ناانصافی سے کام لیتی ہے۔ ؟

ج : سوال حکومت کی ناانصافی کا نہیں ہے بلکہ بات اس طرح سمجھئے کہ پودا اگر خودرو ہے تو اسے کسی بھی پروٹیکشن کی ضرورت نہیں ہے لیکن خودرو پودے کو اگر آپ تحفظ بخشیں گے تو وہ مرجائے گا پنپ نہیں پائے گا۔ اگر پودے کو قدرتی طور پر اُگنے دیا جائے اور اسے اپنے ہی بل پر پنپنے کا موقع دیا جائے تو وہ ہمیشہ خود کفیل رہے گا اس کی بقا کے لئے زمانے کے سرد و گرم ضروری ہیں۔ انگریزوں نے دورِ حکومت میں اپنی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو اپنے سایہ عاطفت (PROTECTION) میں لئے رکھا۔ ہر معاملے میں دوسرے فرقوں پر انگریزوں نے مسلمان کو ترجیح دی، ہر علاقے میں اُس کو علاقے کی نہیں بلکہ اپنی زبان پڑھنے کا موقع ملا۔ اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمان کو اپنے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملی۔ انگریزوں کے عہد میں مسلمان کو پولس اور فوج کی ملازمت میں ساٹھ ستر فی صدی سے بھی زیادہ نمائندگی حاصل رہی ہے۔ انگریزوں کے دیے ہوئے ضرورت سے زیادہ پروٹیکشن کا بُرا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم فرقے کا پودا اپنے بل پر پنپنے کی قوت کھو بیٹھا۔ اور یہ عام بات ہے کہ جب کوئی کنواں کھود کر پانی نہیں پی سکتا تو وہ دوسرے پر یہ الزام لگایا کرتا ہے کہ فلاں مجھے پانی پینے نہیں دیتا۔ 1947ء کے بعد ہر فرقے کو آگے بڑھنے کا برابر ادما ایک سا موقع دیا گیا، مگر مسلمان کو بیساکھی (انگریز) کی مدد کے بغیر چلنے کی عادت نہیں تھی اس لئے وہ دوسروں کے ساتھ دوڑ میں ہار گیا۔ اکثر ملازمتیں انٹرویو یا تحریری مقابلوں ہی کے ذریعے ملتی ہیں اور ان دونوں کے لئے تعلیمی صلاحیت اور ڈگری کی لیاقت درکار ہوتی ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ تعلیم کے میدان میں مسلمان ہر دوسرے فرقے سے پچھڑا ہوا ہے۔ اگر مسلمان نوجوان تعلیم حاصل بھی کرتا ہے تو دینی کام نہ آنے والے مضامین لے کر۔ جدید علوم سے تو شاذ و نادر ہی کسی مسلمان نوجوان کو رغبت پیدا ہوتی ہے۔ بہرنوع ؛ اب بات بدل رہی ہے۔ آئندہ پندرہ بیس برس میں

مسلمان اپنی صلاحیت کے بل پر ملازمت حاصل کرنے لگیں گے۔

س : آج کے عوام میں یہ جو بے چینی، بدامنی، بدنظمی بے قراری اور بے اطمینانی پائی جاتی ہے اور حکومت کے ہر شعبے میں یہ جو کرپشن موجود ہے اسکا سبب اور علاج کیا ہے ؟

ج : دراصل بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ 1947ء کے بعد سے آج تک ہمارا قومی طریق تعلیم نہ بدلا اور نہ سدھرا۔ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلی بھی ہوئی اور ترقی بھی مگر وزارت تعلیم پچھلے 27 برس میں صحیح طور پر ہینڈل نہیں ہو سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکار نے تعلیم کا شعبہ بری طرح ہینڈل کیا ہے۔ آپ خود غور کیجیے کہ جب دھرم، آستھا، پریم ہٹ گئے، تو پھر زندگی کی بنیاد کس پر رہے گی! ہم اپنی اعلا قدروں کو اپنے تعلیمی نصاب سے بائی پاس کر چکے ہیں۔ اس کے معانی ہیں کہ ہم اپنی تعلیم و تربیت ہی ختم کر چکے ہیں۔ آزادی کے بعد سب سے بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ مندر، مسجد محض شو پیس بن گئے ہیں مدرسے، مکتب فیکٹریوں میں بدل گئے ہیں اور تعلیم علم نہیں، طلسم بن کر رہ گئی ہے ساری اتھل پتھل کا سبب یہی ہے۔ جب تک اس بگاڑ کو نہیں سدھارا جائے گا بات نہیں بنے گی۔

س : اردو زبان کے حال و مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ اسے کس طرح زندہ رکھا جائے ؟

ج : دراصل اردو کو نہ صرف مخالفوں نے بلکہ پرستاروں نے بھی MIS-UNDER STOOD (تعبیر غلط پیش کی ہے) کیا ہے اردو کو ادبی طور پر فروغ حاصل نہیں ہوا بلکہ عام استعمال کی صورت میں (بولی کی صورت میں) اس نے ترقی پائی ہے 19ویں صدی ہی میں اردو نے فارسی زبان کی جگہ لے لی تھی اور انگریز نے صرف انگریزی اور اردو ہی کو استعمال میں رکھا تھا یعنی انگریز نے اردو کو عام استعمال ہی کی زبان سمجھا تھا مگر یہ بھی برا ہوا کہ اردو لکھنؤ اور دہلی سے حیدرآباد اور لاہور پہونچ گئی۔ اہل پنجاب اور اہل دکن نے ہندستان کی اردو کو فارسی و عربی آمیز بنا کر کتابی زبان بنا دیا۔ اور اردو کا کتابی زبان بن جانا اردو کے عوامی ہونے میں رکاوٹ بن گیا۔ گو پنجابیوں اور حیدرآبادیوں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ ان کی اپنی اپنی مادری زبان موجود تھی اس لئے انھوں نے اردو کو معیاری بنانا ضروری سمجھا میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو کو جو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ اس کے زبان ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ بولی ہونے کی بنا پر وہ ہمہ گیر بنی۔ چنانچہ اس کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ اسے کتابی نہ بننے دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ زبان فروغ پائے۔ وہ ہندستانی فلموں کی زبان ہے۔ حصول آزادی کے فوراً بعد سیاست کے وار سے اردو مرنے لگی تھی مگر اب اس نے دوبارہ زندگی پائی ہے اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کو سیاست کے سائے سے دور رکھا جائے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ کوئی زبان محض بول چال کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتی ادبی اعتبار سے کالجوں اور اسکولوں میں اردو کا ہونا ضروری ہے یعنی اردو کی زندگی کے لئے حکومت کی سرپرستی لازمی ہے۔

س : آپ ایک قابل اعتماد سیکریٹری کی حیثیت سے سردار پٹیل کے ساتھ ایک عرصے تک رہے ہیں۔ اس لئے آپ کا فرمایا ہوا مستند ہوگا کیا واقعی سردار پٹیل مسلمانوں کے مخالف تھے!

ج : 1947ء کے بعد ایک ذمے دار ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض جس طرح انجام دیئے اس سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ متعصب تھے یا غیر متعصب۔ سردار نے 1947ء میں اپنے عہد میں ماہ نامہ "آج کل" کو بند نہیں کیا بلکہ اس کی تجدید کرائی اور جوش ملیح آبادی جیسے قوم پرست شاعر کو اس کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا۔ اسی سلسلے میں دفتری کارروائی میں کچھ دیر ہوئی تو محکمہ انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ کے سکریٹری کو اس کے عہدے سے ہٹا دیا۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ "آج کل" ایک اردو رسالہ ہے اور جوش مسلمان ہیں۔ مولی چند شرما نے 1947ء کے فوراً بعد سردار کو دھمکی دی کہ اگر اب آل انڈیا ریڈیو سے کسی بھی قسم کا اردو پروگرام نشر کیا گیا تو ہم دہلی کا یہ ریڈیو اسٹیشن اڑا دیں گے۔ سردار نے للکارا کہ ہمت ہے تو آ جاؤ۔ چنانچہ سردار کا مقابلہ کرنے کی کوئی ہمت نہ کر سکا۔ 1947ء کے بعد دہلی کے پہلے چیف کمشنر صاحب زادہ خورشید احمد تھے۔ ظاہر ہے وہ مسلمان تھے اور ان کو سردار ہی نے تعینات

کیا تھا۔ 1947ء میں دہلی کے فسادات میں فساد زدہ مسلمان نظام الدین میں پناہ لئے ہوئے تھے۔ قرب و جوار کے جاٹوں نے ان مسلمانوں پر حملہ کرنے کی کوشش کی، مگر سردار خود وقت پر پہونچ گئے اور وہاں کے پولس افسران کو ہدایت کی کہ اگر مسلمانوں پر حملہ ہوا تو میں آپ سب کو برخاست کر دوں گا۔ ایک سیاسی حلقہ اس بات پر بضد تھا کہ حیدر آباد سے اردو کو ہٹایا جائے اور نظام کو بھی برطرف کیا جائے مگر سردار نے اپنی زندگی میں کسی کی ایک نہیں سنی۔ ریاستی سمجھوتوں کے تحت سب سے زیادہ مراعات رام پور اور بھوپال جیسی مسلم ریاستوں کو دی گئیں۔ اور سنئے! راشٹریہ سیوک سنگھ کے جتنے آدمیوں کو انھوں نے جیل میں بھیجا اُن کی $\frac{1}{100}$ تعداد بھی مسلم لیگیوں کی جیل میں نہیں گئی۔ کیا اب بھی آپ سردار پٹیل کو ایک متعصب انسان یا مسلمان دشمن کہیں گے؟

البتہ 1947ء کے بعد سردار کا مسلمانوں سے اٹل طور پر یہ کہنا تھا کہ بیک وقت دو گھوڑوں پر سواری نہیں ہو سکتی، جو مسلمان پاکستان کی طرف دیکھتے ہیں بہتر ہے کہ وہ پاکستان چلے جائیں مگر جو مسلمان ہندستان کے وفادار ہیں ان کو یہاں ہر طرح سے تحفظ ملے گا اور اس ملک پر ان کا بھی وہی حق ہوگا جو ہندو کا ہے۔ دراصل سردار یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک انسان ذاتی طور پر اپنے مذہب پر بھی چل سکتا ہے اور سیکولر بھی رہ سکتا ہے۔

سرسیّد کے رفقاء و مخالفین

سرسیّد کے پہلے رفیق مولوی سمیع اللہ خاں تھے۔ مگر سرسید کے طرفداروں میں جو سب سے زیادہ مشہور ہوئے وہ مہدی علی خاں (نواب محسن الملک) تھے۔ سرسیّد سے جو سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ حالی تھے۔ شبلی بھی سرسید سے متاثر تو ہوئے مگر انھوں نے پوری طرح ان کی پیروی نہیں کی۔ نواب وقار الملک اور مولوی ذکاء اللہ بھی سرسید ہی کے گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرسید کے مخالفوں میں کان پور کے ڈپٹی کلکٹر مولوی امداد علی اور گورکھپور کے سب جج مولوی علی بخش پیش پیش تھے۔ سرسید کی مخالف فوج کے یہ دونوں زبردست جنرل تھے۔ سرسید کی کتاب "طعام اہل کتاب" کے جواب میں مولوی امداد علی نے "امداد الاحتساب" اور مولوی علی بخش نے "تائیدِ اسلام" لکھی۔ سرسید تحریک کے خلاف مولوی امداد علی نے مختلف شہروں سے 60 فتوے منگوائے جس پر ہر مسلک کے عالموں نے دستخط کئے تھے۔ مولوی علی بخش مکّے گئے اور وہاں کے مفتیوں سے سرسید کے خلاف فتوے حاصل کئے اور مدینے پہنچے اور وہاں وہ رسالے بانٹے جو وہ اپنے ساتھ ہندستان سے سرسید کے خلاف چھپوا کر لے گئے تھے۔ ان سارے فتووں کو ایک رسالے کی صورت میں شائع کر کے ملک بھر میں بذریعہ ڈاک مفت بھیجا گیا۔ اکبر الہ آبادی بھی سرسید کی تعلیمی تحریک کے مخالف تھے مگر سرسید کے خلوص اور مشن کے خوشگوار نتائج دیکھ کر بعد میں سرسید کے حامی بن گئے تھے اس کے ساتھ ساتھ "نور الآفاق" "نور الانوار" "لوحِ محفوظ" "امداد الآفاق" "تائیدِ اسلام" "شہابِ ثاقب" اور "تیرہویں صدی" جیسے درجنوں اخبار جاری تھے جو نہ صرف سرسید کی تحریک کی مخالفت کرتے تھے بلکہ اُن کو کافر، دجّال، نیچری، ملحد، اسلام دشمن کہہ کر گالیاں بکتے تھے۔ گالی گلوج سے بھرے ہوئے خط تو ان کو اکثر موصول ہوتے تھے اور کئی بار ان کو جان سے مارنے کی بھی دھمکی دی گئی تھی۔

ناشاد دہلوی

نامانوس زبانیں

پشاور میں پیدا ہوئے، زندگی کے بہت سے دن لاہور اور کلکتے میں گزارے۔ پچھلے 27 برس سے دہلی میں۔ اور اب قطعی طور پر دہلوی بن چکے ہیں۔ اردو کے شاعر ہیں اور انگریزی کے نثر نگار۔ جرنلسٹ بھی رہے اور ماڈل گرل بھی۔ کئی درجن انگریزی کتابوں کے مولف و مرتب ہیں۔ پبلیشر اور بک سیلر بھی ہیں۔ ناشاد صاحب کو حسین لڑکیاں اور خوبصورت فرنیچر کا بے حد شوق ہے۔ 1947ء کے فسادات میں لاہور سے لوگ اپنی جان بچا کر نہیں لا سکے مگر وہ ٹرک بھر کر اپنی لڑکیاں اور فرنیچر لے آئے۔ حسن، شراب، شعر اور موسیقی پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ خوش اخلاق ہیں۔ بذلہ سنج ہیں اور متواضع انسان ہیں۔ میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور کروڑوں باتیں ہوئیں، کچھ باتیں آپ بھی سنئے۔ ——— ت۔ ک

س: فن کار پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں مگر ہر انسان کی زندگی میں کوئی واقعہ، حادثہ یا کوئی موڑ ایسا ضرور آتا ہے جو اس کے اندر چھپے ہوئے فن کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ کون سی بات تھی جس نے آپ کو شاعری کی طرف مائل کیا؟

ج: کوئی واقعہ تو رونما نہیں ہوا اور نہ کوئی حادثہ پیش آیا البتہ غالب، داغ، اقبال، جگر، مومن، اصغر، میر تقی اور فانی بدایونی جیسے شعرا کا کلام میرے مطالعے میں اکثر رہتا تھا جب بھی میری طبیعت اداس رہتی یا کسی بنا پر میں غم زدہ رہتا مجھ کو شعری مطالعے سے سکون ملتا اور طبیعت بحال ہو جاتی۔ اب ظاہر ہے کہ جب مطالعہ زیادہ ہو گیا تو سمجھئے کہ تالاب چھلکنے لگا اور آخر میں خود شاعری کرنے لگا۔ اس حقیقت کے باوجود یہی ظاہر ہے کہ فطری ہی رجحان نے مجھے شاعر بنا دیا۔

س: ہر سماج کی کچھ قدریں ہوتی ہیں۔ وقت اور زمانے کے لحاظ سے وہ بدلتی بھی رہتی ہیں۔ اپنے سماج کی قدروں کا لحاظ کرنے والا ہی اچھا شہری سمجھا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں کیا فن کار کے لئے اچھا انسان ہونا ضروری نہیں ہے؟

ج: ایک شاعر، ایک ادیب، ایک مصور یا دوسرے الفاظ میں ایک فن کار کے لئے ایک اچھا انسان ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ انتہائی ضروری ہے۔ دراصل میرا تو یقین ہے کہ ایک فن کار جب تک اچھا انسان نہ ہو اچھا فن کار بن ہی نہیں سکتا۔ یا یوں سمجھئے کہ بدکردار فن کار کے فن کو بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کا فن عزت نہیں پا سکا۔ میں جب شعر کہتا ہوں تو سپریم کورٹ کی جانب منہ کر کے کہتا ہوں چونکہ مجھ کو اپنے متعلق شاعر ہونے کا گمان ہے اس لئے ہر لمحہ محتاط رہتا ہوں۔

س: قدیم اور آج کے شاعروں اور نثر نگاروں میں آپ کو کون سا شاعر اور کون سا نثر نگار پسند ہے؟

ج : قدیم قلم کاروں میں اکبر الہ آبادی کی نظم اور سر عبدالقادر کی نثر سے میں ہمیشہ متاثر ہوا ہوں بطور کلاسیکی اور مزاحیہ شاعر کے اکبر الہ آبادی میرا پسندیدہ شاعر ہے۔ مزاحیہ نثر نگاروں میں آج کل میں کنہیا لال کپور کو پسند کرتا ہوں کبھی زمانے میں پنڈت سدرشن اور منشی پریم چند کے افسانے بہت پڑھا کرتا تھا مگر آج کل اپنے دوست کرشن چندر کا ہر افسانہ پڑھتا ہوں۔ کرشن چندر آج کا سب سے اچھا افسانہ نگار ہے۔ آپ کے کہنے پر جب میں نے اپنی پسند کا ذکر کیا ہے تو میری ناپسندیدگی کا بھی حال جان جائیے۔ وہ یہ کہ جوش کو میں اچھا شاعر نہیں سمجھتا۔ اس کے یہاں لفاظی بہت ہے وہ صرف لغت کا شاعر ہے بطور انسان بھی وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہی حال فراق کا ہے۔ اس کے شعر میں ردیف قافیے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فنی اعتبار سے بھی فراق کا کلام زیادہ درست نہیں ہوتا بس یوں سمجھئے کہ فراق کے یہاں کانٹیٹی ہوتی ہے کوالٹی نہیں۔ پچاس شعروں میں ایک شعر کام کا نکلتا ہے۔ فراق کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" میں ہزار عیب ہیں ؂

ہر دے نے کیوں نوازا ہے مسٹر فراق کو
ہر ایک پوچھتا ہے سر بزم شعر گو
گل ہے نہ کوئی نغمہ ہے اسکے کلام میں
پھر اتنی دہسکی ڈال دی کیوں اسکے جام میں

س : کوئی ایسا واقعہ سنائیے جس نے آپ کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ متاثر کیا ہو۔؟

ج : جن واقعات نے تاثر چھوڑا ہے یا جن حادثات نے اپنی زندگی کا رخ بدلا ہے وہ تو بہت سے ہیں اور ان کو کہاں تک سناؤں۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جو واقعہ یا حادثہ مجھ کو پیش آیا اس کے نتیجے میں مجھ کو بھلائی ضرور ملی یا یوں کہئے کہ میں نے ہر بری بات سے ایک اچھی بات سیکھی اور ہر تکلیف کے بعد راحت پائی۔ بگڑی ہوئی بات کو بھی رائے گاں نہیں جانے دیا یعنی جیسے پھٹے ہوئے دودھ سے بھی سگھڑ عورت پنیر بنا لیتی ہے ویسے میں بھی ہر بدی کی جڑ میں نیکی ڈھونڈ لیتا ہوں ؂

جوتا پڑتے ہی وہ نازک سی کلائی دیکھی
ہر بری بات میں ہم نے تو بھلائی دیکھی

س : اردو زبان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔؟

ج : زبان اردو ہو یا ہندی۔ زبان کو عام فہم ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو خالص ہی رہنا چاہیئے اس میں ملاوٹ نہ ہو۔ اردو ایک مکمل اور جامع زبان ہے اردو کو گرانے اور ذلیل کرنے کے لئے اسے کم تر اور نامکمل زبان ثابت کرنے کے لئے ہندی کے الفاظ شامل کئے جاتے ہیں جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ حکومت وقت کو خوش کر کے اپنے پیٹ کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ جس طرح دودھ کے بعد مچھلی کھا کر کوڑھ پیدا ہوتا ہے اس طرح اردو کے جسم میں دوسری زبانوں کے الفاظ ٹھونس کر اردو کے حسن کو مسخ کرنا ہے۔ صرف یہی بات نہیں بلکہ وہ مسلمان بھی اردو زبان کے دشمن ہیں جو محض اپنی (جھوٹی) قابلیت کے اظہار کے لئے اردو میں عربی و فارسی الفاظ شامل کرتے ہیں اور اردو جیسی لطیف زبان کو بوجھل بناتے ہیں جس طرح ریڈیو سے ہندی میں خبریں سن کر ہندی والے بھی ہندی سے بدظن ہونے لگتے ہیں اسی طرح عربی و فارسی آمیز اردو بھی اکثر اردو داں حضرات کے لئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے ؂

وہ ہندی ہی کیا جس کو ہندو سمجھ لیں | وہ اردو ہی کیا جس کو مسلم بھی پڑھ لیں
کٹھن کر دو دونوں زبانوں کو اتنا | ہے محبوبہ کا میری دل سخت جتنا

کار آمد زبان

"کسی زبان کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ نثر لکھنے کے لئے ایک اچھا میڈیم ہے۔ ایک اچھی زبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ صنعت و حرفت، تجارت، سائنس اور ٹیکنولوجی کے لئے بھی کار آمد ثابت ہو" — اندرا گاندھی

سلیم خان
(سلیم جاوید)

یوگ ۔ ایک عبادت

کہتے ہیں کہ فلمی کہانی لکھی نہیں جاتی بیچی جاتی ہے یعنی فلم کی دنیا کا رائیٹر داستان نویس کم داستان گو زیادہ ہوتا ہے۔ مگر اس حقیقت کے برخلاف جناب جاوید اختر کے ساتھی جناب سلیم خان نہ بسیار گو ہیں اور نہ فضول گو لیکن وہ اور ان کے ساتھی جاوید آج کے مقبول ترین فلم رائیٹر ہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی۔ پولیس کے بیٹے سلیم خان 1935ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے، اندور میں تعلیم پائی، بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے۔ کے پہلے سال میں داخل ہوئے مگر فلمی شوق کی شدت 1958ء میں بمبئی لے آئی، ہیرو بننا چاہا، بارات، دیوانہ، پروفیسر اور راہو داد جیسی فلمی میں تھوڑا بہت کام بھی کیا۔ مگر بات زیادہ آگے نہ بڑھی تب انھوں نے فلم ایکٹر سے فلم رائیٹر بننے کی کوشش کی۔ جو رائیٹر اپنا مقام بنا چکے تھے بہت دنوں تک سلیم خان ان کے معاون بنے رہے۔ آخر وہ دن بھی آیا کہ سلیم خان اور جاوید اختر نے حقیقی معانی میں ہم قلم بن کر اپنی جوڑی بنالی اور مل کر فلمی کہانیاں لکھنے لگے ان کی پہلی کہانی "انداز" رشی کپور، ہیما مالنی، راجیش کھنا تھی اور پھر ہاتھی میرے ساتھی، سیتا اور گیتا، زنجیر، یادوں کی بارات، ہاتھ کی صفائی، اور مجبور جیسی کامیاب فلمی کہانیاں (منظر نامے اور مکالموں کے ساتھ) انھوں نے پیش کیں۔ ان میں 5 نے سلور جوبلی اور 2 نے گولڈن جوبلی منائی۔ 1964ء میں سلیم خان نے ایک مہاراشٹرین تعلیم یافتہ ہندو خاتون سے شادی کی اور اب وہ چار خوبصورت اور معصوم بچوں (ایک بیٹی تین بیٹے) کے شفیق باپ ہیں۔ فلمی دنیا میں رائیٹر کو منشی یا تیم سمجھا گیا ہے اور جو اداکار جتنا بڑا ہوا اتنے ہی بڑے اسکے نخرے ہوئے اور ہر نخرے والے اداکار نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ فلم کے مسودے میں دخل دے مگر سلیم جاوید نے اداکاروں کی اس مداخلت کو روکا ہے۔ قلم کو عزت اور قلم کار کو احترام بخشا ہے۔ اپنے فن اور پیشے کو مشترکہ بنا کر انجام دینے کے سلسلے میں سلیم خان کا کہنا ہے کہ وہ اس حدیث پر یقین رکھتے ہیں "وہ جب دو مل کر کام کرتے ہیں تو ان کے درمیان خدا ہوتا ہے اور جب دو الگ ہو جاتے ہیں تو ان کے درمیان شیطان آجاتا ہے!"
سلیم خان یوگ[1] (YOGA) کے طالب علم ہیں اُن کے کہنے کے بموجب ریاضت نے اس طریقے سے انسان کے ذہن و جسم دونوں کو صحت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل انہی کی زبانی سنیئے ———— ش ک

[1] ہندو فلسفے کے مطابق مراقبے اور ریاضت کا ایک مخصوص طریقہ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ عابد کی روح کائنات کی روح حقیقی سے متحد ہو جائے ——— ش ک

نہ میں یوگ کا استاد ہوں، نہ ماہر بلکہ میں یوگ کا ایک طالب علم ہوں۔ بات یہ ہوئی کہ 1955ء میں جب میں بمبئی آیا تو میری صحت بہت اچھی تھی مگر میں یہ بات اب کہہ رہا ہوں کہ میں ان دنوں خاصا صحت مند نوجوان تھا۔ لیکن ان دنوں مجھ کو اس بات کا نہ احساس تھا اور نہ میں نے اپنی اچھی صحت کی قدر ہی کی۔ میں 1966ء تک اپنے مقصد کی خاطر جدوجہد کرتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر میں چاہتا بھی تو دوڑ دھوپ کے ان دنوں میں اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ بمبئی کی زندگی کے جو پہلے دس برس گزرے ان کے ساتھ میری صحت بھی گزر گئی۔ جب بماری فلم ہاتھی میرے ساتھی ہٹ ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ میری مشکلات ختم ہو گئیں۔ مگر ایسا سمجھنا میری بھول تھی۔ دراصل مشکلات تو اب شروع ہوئی تھیں۔ فلمی دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب فلم کامیاب ہوتی تو جو فلم سے متعلق ہوتے ہیں کام ان پر برسنے لگتا ہے۔ ہاتھی میرے ساتھی کی کامیابی نے میری مصروفیت کو ہاتھی جتنا بھاری اور بڑا بنا دیا۔ نتیجے میں ذہنی کشاکش (TENSION) میں بھی اضافہ ہوا۔ سکون عنقا ہو گیا اور راتوں کی نیند حرام ہونے لگی آخر میں ڈاکٹروں سے رجوع ہونے لگا۔ جتنی دوائیں بڑھتیں اتنا ہی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا اور بڑھی ہوئی بے چینی دواؤں کے لئے اور زیادہ راہ کھولتی۔ اور پھر ساری بات جوتشی کا وہ لطیفہ بن گئی کہ تم پانچ برس تک تکلیف میں رہو گے۔ پانچ برس کے بعد؟ پھر تم اس تکلیف کے عادی ہو جاؤ گے! ذہنی پریشانی اور دوائیں، دوائیں اور ذہنی پریشانی۔ میں بھی ان دونوں باتوں کا عادی بن گیا۔

اور پھر کچھ دن بعد میں مکمل طور پر اپنے آپ کو مریض سمجھنے لگا اور میرے مرض کی جو علامتیں تھیں وہ وہی تھیں جو دل کے ایک مریض کی ہوا کرتی ہیں اور ایک دن اچانک مجھ کو محسوس ہوا کہ دل کے مرض نے مجھ پر حملہ کیا، نوبت بہ ایں جا رسید کہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اپنی جس صحت پر مجھ کو ناز تھا جب وہ اس حد تک مار کھا گئی کہ ہسپتال کے بستر پر پہونچ گیا تو پھر میری خود اعتمادی بھی رخصت ہو گئی۔

اسی اثنا میں کاوش صاحب نے مجھ کو یوگ سے متعارف کرایا۔ گو میں اُن دنوں بڑا مایوس تھا مگر زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا کہ اس طریقِ علاج کو بھی آزما دیکھوں۔ میں نے بمبئی دستا کر دیا کے یوگ آشرم میں پہونچ کر اپنی ساری الجھنیں بیان کر دیں۔ آشرم کے ٹیچروں نے میری تکلیف یا بیماری جاننے کے باوجود یہ تو امید ظاہر کی کہ یوگ کے ذریعہ میں دوبارہ صحت تو پالوں گا مگر انھوں نے پھر بھی یوگ کے طریقِ علاج کو معجزہ قرار نہیں دیا۔ آشرم کے ٹیچروں نے مجھ کو بہت سی ورزشیں بتائیں اور اُن کو کرنے کا طریقہ بتایا مگر ساتھ ہی ساتھ مجھ کو پابندی سے نماز پڑھنے کا بھی مشورہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جسمانی صحت کے لئے کسی قسم کی ورزش یا دوا سے زیادہ ضروری وہ عبادت ہے جو مریض کے مذہب (یا عقیدے) سے تعلق رکھتی ہو۔ مجھے ان کی ہدایت پر پہلے حد تعجب ہوا۔ مگر انھوں نے واضح کیا کہ طریق نماز یوگ کے آسنوں سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ یوگ اور نماز دونوں میں روحِ حقیقی (خدا) کو یاد کرنا ضروری ہے اسی لئے نماز کا پڑھنا جسم و ذہن دونوں کے لئے مفید ہے۔ یوگ آشرم کے استادوں کی اس وضاحت کے بعد اس دن میں اس نتیجے پر پہونچا کہ جو لوگ یوگ کو ایک ہندوانا عبادت، پرارتھنا یا ہندوانہ طریقِ علاج سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ یوگ کو اپنانے پر نہ کسی کا مذہب مجروح ہوتا ہے اور نہ کسی کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے بلکہ باسی ایمان تازہ ہو جاتا ہے اور کمزور ایمان کو قوت ملتی ہے۔

انسان جسم سے بعد میں مرتا ہے مگر ذہنی طور پر پہلے مر جاتا ہے میں بھی ذہنی طور پر مر چکا تھا مگر یوگ کے ذریعے آٹھ ہی دن کے اندر دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ مجھ میں توانائی آ گئی اور مجھ کو یوگ سے ہر طرح فائدہ پہنچا۔ میری یہ بری عادت رہی ہے کہ میں اپنے آپ کو کسی کام کا پابند نہیں بنا پاتا مگر یوگ کا یہ کمال ہے کہ اس نے مجھ کو اپنا پابند بنا لیا ہے۔

یوگ اب ہندوستان میں روز بروز مقبول ہوتا جا رہا ہے اس لئے نہیں کہ ہندوستانی اسے شرف قبولیت بخش رہے ہیں بلکہ یوگ کے عمل اور فلسفے کو امریکی اپنانے لگے ہیں وہاں نوجوانوں کی ذہنی ٹینشن کو دور کرنے کے لئے یوگ کو ضروری قرار دیا گیا ہے امریکی لوگوں کی اس قدر دانی کی بنا پر اب ہندوستانیوں کو بھی اپنی اس نعمت کی اہمیت کا احساس ہونے لگا ہے۔ دراصل یوگ کی ورزش سے جسم کے سارے اعضا کو فائدہ پہونچتا ہے۔ ●●
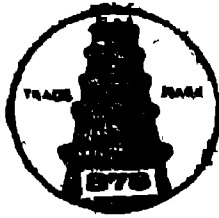
آنے والے سحر کی ضَو ہیں ہم

خرد کی غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
-اقبال
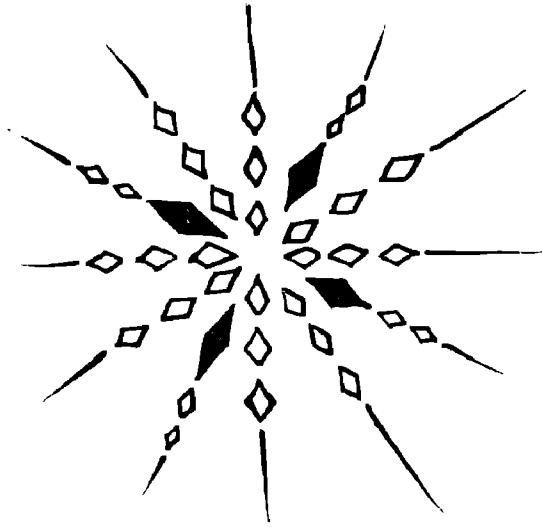
انسانی ذہن
ایک صحرائی چشمے کی طرح آزاد ہے
اُس پر تقلید کے بند مت لگاؤ

اس دور کا ہر انسان
سفر میں چاہتا ہے آرام
دینا آرام اور خدمت انسان
بلاتخصیص مذہب وملّت
دیتے ہیں سب کو مناسب سہولت
یاد رکھیے ہمارا نام
ہم ہی آئیں گے آپ کے کام
سنگم گیسٹ ہاؤس
ملن گیسٹ ہاؤس
آرام دہ، روشن، ہوادار اور کشادہ کمرے، چوبیس گھنٹے
ٹھنڈا و گرم پانی، فون، لفٹ کی سہولت اور دل خوش کن فوری سروس
تھرڈ فلور ڈی بلاک وسم اللہ بلڈنگ
چرنی روڈ جنکشن، گرانٹ روڈ، ممبئی نمبر 7
فون: 362872 — گرام: سٹی ہرٹ
سیکنڈ فلور بلڈنگ نمبر 200-202
تری و بنی ہاؤس کھیت واڑی بیک روڈ بمبئی نمبر 4
فون: 381007 —
384107 "

مجید مرزا تاباں

ہندوستانی معیشت میں مسلمانوں کا مستقبل

اب تک کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ تمام غیر سوشلسٹ ممالک میں اکثریت کے افراد کی فاشسٹ ذہنیت اقلیتوں کو نہ صرف ان کی زبان اور تہذیبی ورثہ سے محروم کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے بلکہ ذرائع پیداوار جیسے زمین، اوزار، مشینوں، پیشوں اور ملازمتوں کے مواقع بھی چھیننے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ وجہ واضح ہے۔ انفرادی بنیاد پر قائم سماج میں کچھ افراد کو محروم کرکے ہی دوسرے افراد کو زیادہ زمین، اوزار، مشینیں اور ملازمتوں کے مواقع بہم پہونچائے جا سکتے ہیں۔ امریکہ جیسے دولت مند اور ذرائع سے مالا مال ملک میں بھی نیگرو، میکسیکن، جاپانی، اطالوی اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا رہا ہے۔

لیکن ایک سوشلسٹ ملک میں جہاں ذرائع پیداوار زیادہ تر اجتماعی ملکیت کی حیثیت رکھتے ہیں پیداوار ایک دولت مشترکہ کا درجہ رکھتی ہے اور تمام افراد کی بہتر کارکردگی، بہتر ذرائع پیداوار میں شامل سمجھی جاتی ہے، اس طرح کے مسائل کے اٹھنے کا سوال بہت کم پیدا ہوتا ہے اس سماج میں ہر فرد کی زیادہ بہتر زندگی اور اس سے پیدا ہونے والی زیادہ بہتر کارکردگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان جمہوری سوشلزم کی طرف قدم بڑھا رہا ہے یہ بات ہندوستانی اقلیتوں کے لئے بہت امید افزا اور تسلی بخش ہے اس طرح ہندوستانی معیشت میں ان کا مستقبل ہر آنے والے دن کے ساتھ زیادہ محفوظ ہوتا جائے گا۔ جتنی تیزی سے ہم سوشلزم کی طرف قدم بڑھا سکیں گے اتنی ہی تیزی سے ہم اقلیتوں میں معاشی عدم تحفظ کے احساس کو کم کرتے جائیں گے۔ صنعتی اور کاروباری میدانوں میں ملک جتنی تیزی سے آگے بڑھتا جائے گا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ اب ذات اور مذہب کی بنیاد پر گروہ بندی کرنا غیر ضروری اور ناپسندیدہ طریقہ کار ہے اب گروہ بندی پیشوں کی شکل میں بہتر زندگی گذارنے کے لئے جدوجہد کر سکنے کی بنیادوں پر ہوگی۔

آزادی کے گذشتہ ۲۵ سال ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سوتیلے رہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ زمانہ دوسرے تمام شہریوں کے لئے بھی امتحانات کا، مستقبل کی امکانی سمت کے بارے میں ابہام کا اور مخالف سمتوں میں کام کرنے والی قوتوں کی زور آزمائی کا دور تھا۔ اب ملک اس دور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک سمت متعین ہوئی ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں جدوجہد کرنے کے خطوط واضح ہوئے ہیں۔ رجعت پسندی کو کئی محاذوں پر شکست دی جا چکی ہے اب وہ کتنے روپ بدل کر سامنے آئے گی، یہ بات آگے کے حالات پر اور ترقی پسند قوتوں کے ذریعہ عام لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر سکنے کی کوششوں پر منحصر ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آج تک مخالف سمتوں میں کام کرنے والے رجعت پسند عناصر متحد ہو کر ترقی پسندی کا راستہ روکیں۔ بہر صورت ملک میں سیکولر جمہوری سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے راستے میں ابھی تک بہت سی مشکلات حائل ہیں۔

اس عام صورت حال میں مسلمانوں کے اپنے کچھ خاص مسائل، مشکلات اور پریشانیاں رہی ہیں جو الگ سے توجہ چاہتی ہیں۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی جہالت، غربت اور پسماندگی کے اسباب کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد پڑھے لکھے اور اچھی کارکردگی رکھنے والے مسلمانوں خاص کر نوجوانوں کی بڑی تعداد بہتر مواقع کے خواب لے کر چند سالوں تک پاکستان جاتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محکمے، تعلیمی ادارے، دفتر، کارخانے اور مختلف اچھے پیشے ان مسلمان عناصر سے خالی ہوتے چلے گئے جو اپنے پیچھے

آنے والوں کی ایسی راہوں پر چلنے کے لئے رہنمائی اور امداد کر سکتے تھے اور ان تمام جگہوں پر مسلمانوں کا تناسب بتدریج کم ہو گیا۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کا تناسب بڑھتا گیا اور وہ رہنے سے متعلق اپنی راہوں پر پیچھے آنے والوں کی رہنمائی اور امداد کرتے رہے اور یہ اضافہ جاری رہا۔

زمین داری ۔ ۔ انحصار کرنے والے مسلمانوں اور ان کے مسلمان کارندوں نے کاشتکاری کی طرف سے عدم … تعلیم کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا پھر بھی اچھی جائیدادوں … سلسلہ جاری تھا۔ زمینداری کے خاتمے سے ان لوگوں کو … مشکلات میں پھنس گئے کہ ان کے لئے معیار اور سفید پوشی برقرار رکھنا مشکل ہو گیا … کو سنبھال بھی لیا ہو تو بھی اپنے بچوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دی۔ … دیہی سماج میں ان کی حیثیت غیر موثر ہوتی گئی جبکہ دوسرے لوگوں نے ایک طرف کاشتکاری، دوسری طرف تعلیم اور ملازمت اور تیسری طرف کسی قسم کی مقامی صنعت اور کاروبار سے اپنی حیثیت کو بہتر سے بہتر بنانے کا عمل جاری رکھا۔ اب ان حیثیتوں میں رہنے والے مسلمانوں کا فرق ہے … زیادہ تر مسلمان بے زمین ہیں یا کم زمین رکھنے والے ہیں جو دوسروں کی زمین میں شرکت سے کاشتکاری کرتے ہیں یا فاضل وقت میں مزدوری کر کے اپنی گزر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاشی بدحالی نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف سے لاپرواہی کو بڑھاوا دیا۔ تعلیم یافتہ افراد کے مقابلے میں مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لگے ہوئے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی حالت بہتر ہونے کی وجہ سے بھی ان لوگوں کی تعلیم کی طرف سے بددلی میں اضافہ ہوا۔ تمام پیشوں اور صنعتوں کو اونچی سطح پر کنٹرول کرنے والے زیادہ تر تعلیم یافتہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ اس بات پر نظر رکھنے کی ان لوگوں کو مہلت ہی نہ ملی اور وہ معاشی و سماجی طور پر پست تر ہوتے گئے۔

ایک خاص سبب جس کی وجہ سے مسلمان تعلیمی اور معاشی میدان میں پیچھے رہ گئے ہیں، یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں بکھری ہوئی ان کی بہت بڑی تعداد کی مادری زبان اردو ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری تعلیمی اداروں اور دفتروں سے اردو کے ہٹ جانے کے بعد اردو کے وہ تعلیم یافتہ لوگ جو ہزاروں کی تعداد میں منشی، حساب داں اور معلم کی حیثیت سے روزی کماتے تھے یکلخت جاہل اور بیکار ہو گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اداروں اور ملازمتوں میں داخلے کے سلسلے میں ہندی اور دوسری زبانیں نہ صرف اظہار خیال کا ذریعہ ہیں بلکہ اکثر خود ان زبانوں کا امتحان بھی … ہے وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے۔ دوسری زبانوں میں اظہار خیال اس روانگی، سلاست اور فصاحت کے ساتھ نہیں کر سکتے جس سے کہ اپنی مادری زبان میں کر سکتے ہیں وہ اپنے آپ کو لکنت زدہ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے مقابلوں میں بیٹھتے ہوئے سہم جاتے ہیں اور اگر بیٹھتے ہیں تو دوسری مادری زبان والوں سے مقابلہ کر سکنا مشکل ہوتا ہے۔ مسلمان ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں سیکھ رہے ہیں لیکن اپنی مادری زبان میں اظہار خیال کر سکنا ان کے لئے آسان ہی ہوتا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلہ کا یہ تہرا موقع حاصل نہ ہوتا۔ اب ذمہ دار لوگ اردو کے مختلف مسائل پر توجہ دے رہے ہیں اور امید کرنا چاہئے کہ ملک میں فاشسٹ جذبات پر حقائق کے غلبے کے ساتھ ساتھ اس نقصان کی تلافی ہوتی جائے گی۔

مسلمانوں کی اس معاشی بدحالی کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ فاشسٹ ذہنیت کے رجعت پسند لوگوں نے مسلمانوں کو ان کے اچھے کاروباری علاقوں میں فسادات کرا کے اقتصادی میدان میں لگاتار پیچھے ڈھکیلنے کی کوششیں کی ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ کوششیں منظم تھیں یا غیر منظم، لیکن ان کوششوں کے پیچھے ایک ہی قسم کی فاشسٹ ذہنیت کام کر رہی تھی یہ بات ناقابل تردید ہے۔ آج اگر یہ رجعت پسند، فاشسٹ قوتیں، مسلمانوں کو گلے لگانے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ صرف ان کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھ سکنے سے روکنے کے لئے ایسا کرتی ہیں۔ اگر عام مسلمان 'اپنے کچھ نام نہاد' ہمدرد ملت رہنماؤں کی کوششوں سے اس رجعت پسندی کے جال میں پھنس گئے تو یہ ایک افسوسناک بات ہوگی جس طرح وہ ملک کی پچھلی ۲۵ سالہ معاشی ترقی میں پچھڑ گئے ہیں' اس طرح وہ اس سوشلسٹ ترقی میں بھی پچھڑ جائیں گے۔

مسلمانوں کی اپنی کچھ عادتیں بھی اس بدحالی کا سبب ہیں۔ ان میں عام طور پر بچت کی عادت کم ہوتی ہے۔ وہ سرمائے کو خرچ کرنے اور ضرورت میں کام آنے والی چیزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اس لئے بددیانتی اور رشوت خوری کے معاملے میں مسلمان کافی احتیاط سے کام لیتے ہیں کیونکہ ان کے سماج میں اس آنے والی کمائی کا سودا گری کرنے والوں کی خاص وقعت نہیں ہوتی۔ لوگ چاہے سامنے کھل کر کچھ نہ کہیں لیکن ان کے دلوں میں ایسے لوگوں کا احترام نہیں ہوتا اور وہ آج بھی ان افعال کو معیوب سمجھتے ہیں یعنی مسلمانوں نے ابھی تک رشوت خوری اور بددیانتی کو اپنے سماج میں شرف قبولیت نہیں بخشا ہے۔ وہ ان کی سماجی زندگی میں ایسا معیوب مروج فعل ہے جیسے سود لینا یا جوا کھیلنا۔ اس کے علاوہ مسلمان ملازمین

بگڑ جانے کے زیادہ ڈر اور سرپرستی اور تعاون حاصل نہ ہوسکنے کے خوف کی وجہ بھی رشوت لینے اور بے ایمانی کرنے میں احتیاط برتتے رہیں۔

لیکن یہ باتیں کہ مسلمان عام طور پر زر پرست نہیں ہوتے اسود لینے رشوت لینے اور بے ایمانی کے اعمال کو آج بھی ان کے سماج میں معیوب سمجھا جاتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں ان کو زیادہ بہتر کارکنوں کی حیثیت میں آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ اس طرح وہ زیادہ وطن دوست، زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ ذمہ دار شہریوں کی حیثیت میں ابھر کر آگے آ سکتے ہیں۔

حالات ایسے ہیں جن سے امید بندھتی ہے کہ مسلمان جمہوری سوشلزم کے راستوں پر بہت تیزی سے گامزن ہوں گے۔ تعلیم کی کمی اور معاشی بدحالی کے نتیجے میں ان کی بہت بڑی تعداد بیڑی بنانے والوں، رکشا پولروں، آٹو موبائیل ڈرائیوروں اور مستریوں کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ طرح طرح کی بڑی اور چھوٹی صنعتوں میں کاریگروں اور مزدوروں کی شکل میں بہت سے مسلمان کام کر رہے ہیں۔ دیہی علاقوں میں بہت سے مسلمان بے زمین یا کم زمین والے کسان مزدور ہیں یا متوسط قسم کے پیشوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کی مالی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے اور وہ آ سکنے والی معاشی بدحالی کے خوف میں مبتلا ہیں۔ ان مزدوروں اور دیہاتی پیشے والوں کی اپنے اپنے علاقوں میں تنظیمیں ہیں یا بن رہی ہیں۔ کچھ تجربہ کار اور مضبوط ہیں، کچھ تجربے کر رہی ہیں۔ ان تنظیموں میں ہر ذات اور مذہب کے لوگ بلا امتیاز شریک ہوتے ہیں۔ ان سب کے یکساں مسائل ہوتے ہیں، یکساں ضرورتوں کا احساس ہوتا ہے، یکساں جدوجہد ہوتی ہے اور اس طرح ان لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع ملتا ہے کہ مذہب اور اس کے ارکان کی ادائیگی اپنی جگہ ہو سکتے ہیں لیکن معاشی زندگی کے یہ کڑے مسائل ہمارے سب ساتھیوں کے لئے اپنی جگہ ہیں۔ نہ یہ مسائل ذات اور مذہب دیکھتے ہیں اور نہ ان کو حل کرسکنے کی جدوجہد۔ سوشلزم کی دعوت ان پسماندہ غریب لوگوں کو زیادہ بہتر زندگی گزار سکنے کے لئے جدوجہد کی دعوت ہے۔ اگر کوئی پسماندہ طبقہ اس دعوت سے منھ موڑتا ہے تو وہ خود اپنی بھلائی سے منھ موڑتا ہے۔

مسلمانوں کو احساس کمتری ترک کر دینا چاہیئے۔ مایوسی اور بددلی کے بجائے اس نئے امید افزا سوشلزم کو قائم کرسکنے کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ شریک ہو کر اس راستے پر تیزی اور مضبوطی سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر چلنا چاہیئے۔ اپنے اپنے دائرۂ کار میں سوشلزم کو آگے بڑھانے والے کے لئے جدوجہد کرتے جانا چاہیئے۔ رجعت پسندی اور بے ایمانی کو بے نقاب کرکے شکست دیتے جانا چاہیئے۔

آج مسلمان معاشی طور پر اس سطح پر ہے جہاں سے ایک سیکولر سوشلسٹ نظام کی تعمیر ہی اس کو اوپر اٹھ سکنے اور زندگی کو بہتر بنا سکنے کے مواقع فراہم کرسکتی ہے۔ اس لئے اس جمہوری سوشلزم کی نئی سمت میں سماج کو لے جا سکنے اور زندگی کو بہتر بنا سکنے کے مواقع فراہم کرسکتی ہے اس لئے اس جمہوری سوشلزم کی نئی سمت میں سماج کو لے جا سکنے کی کوششوں میں مسلمانوں کو پورے شدومد کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیئے۔ اسی میں ان کی اور ان کی آئندہ نسلوں کی معاشی حالت کی بہتری اور سماجی ترقی کا راز مضمر ہے۔

اِنقلاب ایک سیلاب

"اِنقلاب ایک سیلاب ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ اس سے قومیں آباد بھی ہوتی ہیں اور برباد بھی۔ اس سے کون سی قومیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں، جو جاگ رہی ہوتی ہیں، جن قوموں میں بھائی چارہ باہمی پیار اور قوم پرستی ہوتی ہے اور جن قوموں میں پریم محبت اور اتفاق ہوتا ہے۔ انقلاب ایک سیلاب ہے اور جو قومیں بیدار ہوتی ہیں وہ سیلاب کے انتظار میں کھڑی رہتی ہیں اور جوں ہی سیلاب آتا ہے وہ سیلاب کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور اسے اپنی زمینوں کی طرف موڑ دیتی ہیں اس سے استفادہ حاصل کر لیتی ہیں اور جو قومیں خوابیدہ ہوتی ہیں جن میں بھائی چارہ، باہمی میل ملاپ اور قوم پرستی کا فقدان ہوتا ہے اور جو خود غرض ہوتی ہیں ان پر جب یہ سیلاب آتا ہے تو وہ قومیں بہہ جاتی ہیں۔ سیلاب ایسی قوموں کو بہا لے جایا کرتا ہے اور ان کی زمینوں کو بھی۔"

خان عبدالغفار خان

علاء الدین جینابڑے

علاقائی زبان اور مسلمان

اسد ش کا ہر ایک نوجوان علامہ اقبال کا یہ شعر گنگناتا ہے :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیکن علاقائی زبانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جس بے عملی، کاہلی اور سستی سے کام لیا جارہا ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عمل جدوجہد اور محنت و مشقت ہی سے زندگی میں بہار آسکتی ہے تو ہمیں چاہئے کہ ہم عمل کے میدان میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور یہ عذرِ لنگ نہ پیش کریں کہ جب دوسرے ہماری زبان نہیں سیکھتے تو ہم کیوں اپنے بچوں پر ایک زائد مضمون کی پڑھائی کا بار ڈالیں؟ یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محنت سے کام کریں اور اردو کو ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ذریعہ تعلیم رکھتے ہوئے بھی اپنی اپنی ریاست کی علاقائی زبان میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہمارے اردو میڈیم کے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لئے ضرورت پڑنے پر ایسے کالجوں میں بھی داخلہ لے سکیں جہاں کا ذریعۂ تعلیم علاقائی زبان ہے۔ اس طرح ہم ملک و قوم کی ترقی کے میدان میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانہ بشانہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

ریاستی حکومتیں تو یہی چاہیں گی کہ علاقائی زبانوں کو لازمی طور پر پڑھایا جائے۔ لیکن غالباً اس میں یہ دقت ہے کہ علاقائی زبانیں بولنے والے طلبہ کا پلڑا اقلیتی زبانیں بولنے والے طلبہ کے مقابلے میں بھاری رہے گا اور ایسی حالت پیدا کرنا مساویانہ سلوک کے منافی بات ہوگی۔ مہاراشٹر میں نئے نصابِ تعلیم کے نفاذ کے ساتھ حکومت نے ایس۔ ایس۔ سی۔ کے لئے مرہٹی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔ علاقائی زبانوں کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ایک مناسب و موزوں اقدام تھا۔ اقلیتی زبانوں کے وجود سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ لہذا اقلیتی زبانوں کی نمائندگی کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت مہاراشٹر نے اپنی اس پالیسی میں ترمیم کی اور مرہٹی کو پھر سے محض بطور ایک اختیاری مضمون برقرار رکھا۔

علاقائی زبانوں کی تعلیم کی اہمیت سے انکار کرنا ہوا کے رُخ سے بے اعتنائی برتنے کے برابر ہوگا۔ ریاستوں کی نئی تشکیل خالص لسانی بنیادوں پر تو نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے کئی لسانی ریاستیں وجود میں آئی ہیں اور ہر ریاست اپنی ریاستی یا علاقائی زبان کو سرکاری یا دفتری زبان کا درجہ دے چکی ہے یا دے رہی ہے۔ بعض ریاستوں میں یا ریاستوں کے بعض حصّوں میں اردو کو بطور علاقائی زبان تسلیم کئے جانے کے لئے سیاسی سطح پر اردو کے حامیوں کی جد و جہد چل ہی رہی ہے۔ ایک جمہوری نظام میں کسی زبان، کلچر یا مذہب سے بے انصافی نہیں ہوسکتی۔ اگر کہیں کوئی ایسی شکایت پیدا ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہوگی، مستقل نوعیت کی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ جمہوری نظام کی یہی خوبی اور خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس ملک میں کہ جہاں مختلف زبانوں، ثقافتوں اور مذاہب کے رنگا رنگ پھولوں سے بہار کی سی کیفیت ہے، وہ نظامِ حیات اپنایا گیا ہے کہ جس میں ہر پھول کے لئے اپنی شگفتگی و تازگی کے ساتھ چمن آرائی کا موقع ملے۔

اردو کی بقاء اور ترقی و ترویج کے مسئلے پر بحث کرنا اس مضمون کا مقصد نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ اردو پریس، اور اردو داں طبقہ جس میں خصوصیت کے ساتھ مسلمان ہیں، اس زبان کی بقاء و ترقی کے لئے

ہمہ وقت ہوشیار اور چوکنا رہتے ہیں، بلکہ ریاستی حکومتیں، مرکزی حکومت اور بعض سیاسی جماعتیں بھی اس زبان کی بقا و ترقی کو ضروری سمجھتی ہیں۔ حال ہی میں ترقی اردو بورڈ کی جانب سے بمبئی، حیدرآباد اور دہلی میں اردو کتابت کی تربیت کے لئے جو مراکز کھولے گئے ہیں وہ یقیناً ایک قابلِ قدر اور مستحسن اقدام ہے۔ حکومت اور ملک کا سنجیدہ طبقہ جانتا ہے کہ اس زبان میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی بہترین روایات محفوظ ہیں، علاوہ ازیں، علم و ادب اور دینیات کے خزانوں سے یہ زبان مالا مال ہے؛ اس کا مٹنا تاج محل، قطب مینار اور گول گنبد جیسی حسین و عظیم یادگاروں کے مٹنے سے زیادہ المناک ہوگا۔ اور اس زبان کو زندہ رہنا چاہئے اور وہ یقیناً زندہ رہے گی۔ لیکن اس زبان کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اردو داں طبقہ خصوصیت کے ساتھ مسلمان —

(۱) علاقائی زبانوں سے بے اعتنائی برتیں اور روزگار کے وسیع تر ذرائع سے استفادہ کرنے کی اہل نہ رہیں؛

(۲) علاقائی زبان سے بے اعتنائی برتیں اور اپنے پڑوسیوں کو خود ان کی زبان میں مخاطب کر کے میل ملاپ نہ بڑھائیں اور انہیں قریب سے سمجھ کر قومی یک جہتی کو تقویت پہنچانے کا باعث نہ بنیں؛

(۳) علاقائی زبانوں سے بے اعتنائی برتیں اور ان کالجوں میں داخلہ نہ لے سکیں جہاں ذریعۂ تعلیم علاقائی زبان ہوتی ہے۔

اس قسم کے کالج آج کل ہندوستان کے ہر شہر بلکہ ہر بڑے گاؤں میں بھی کھلتے جا رہے ہیں۔ اکثر مسلمان بچے ان کالجوں میں داخلہ اس لئے نہیں لے سکتے کہ میٹرک یا ایس۔ ایس۔ سی تک ان کی تعلیم کا میڈیم اردو رہا ہے اور اس کے ساتھ علاقائی زبان جو پڑھائی گئی تو اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی کہ اسے آگے چل کر ذریعۂ تعلیم اختیار کر سکیں۔

اردو ذریعۂ تعلیم کے ہائی اسکولوں میں انگریزی بھی بطور ایک مضمون ہی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن اس پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ طلبہ اس میں قدرے اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ لہٰذا انگریزی کو کالج میں ذریعۂ تعلیم بنا کر کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھا سکتے ہیں۔ لیکن آج کل نئی نئی یونیورسٹیاں قائم ہو رہی ہیں اور ان کے ساتھ کئی کالج کھل رہے ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم علاقائی زبانیں ہیں۔ ہمارے اردو میڈیم سے آنے والے طلبہ ان کالجوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے لئے آپ کتنے انگلش میڈیم یا اردو میڈیم کالج کھولتے رہیں گے؟ اگر بفرضِ محال ہر ضلع میں ایک ایک کالج بھی کھول دیا جائے تو بھی اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کو تعلیم مہنگی پڑے گی ان طلبہ کے مقابلے میں جنھیں اپنے ہی شہر یا گاؤں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولت رہے گی۔

کالج میں اردو ادب یا تاریخِ ادبِ اردو پڑھانا اور اس میں پی ایچ ڈی تک کی سہولت رکھنا اور بات ہے اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اس میں آرٹس، سائنس، کامرس، ٹکنالوجی اور قانون وغیرہ کی تعلیم دینا ایک بالکل الگ بات ہے۔ اوّل الذکر سہولت بعض کالجوں میں حاصل ہے اور جہاں نہیں ہے اس کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن مؤخر الذکر طریقہ تعلیم کو اپنانے سے پہلے کئی باتوں پر سوچ بچار کرنا ضروری ہے جن میں سے بعض کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ (یہاں یہ کہنا مقصود نہیں ہے کہ اردو زبان ان علوم کے لئے ذریعۂ تعلیم نہیں بن سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان اس قابل ہے اور اس میں بعض کامیاب تجربے کئے جا چکے ہیں)

عملی طور پر یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے موجودہ اسکولوں کا معیارِ تعلیم بلند کیا جائے اور مزید اچھے اسکول کھولے جائیں تاکہ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے طلبہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ لیکن ضروری ہے کہ ان اسکولوں میں علاقائی زبانوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے یعنی:

(۱) مسلمانوں کا ہر تعلیمی ادارہ اپنے مدارس میں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے علاقائی زبان کے حسبِ ضرورت تربیت یافتہ مدرس (ٹرینڈ ٹیچرس) ملازم رکھے؛ طلبہ کو علاقائی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لئے انعامات تقسیم کر کے ترغیب دے اور ایکسٹرا کلاسوں کا بندوبست کرے؛ نیز

(۲) طلبہ کے سرپرستوں کو چاہئے کہ علاقائی زبانوں کی ترویج کے لئے اگر کچھ ادارے ہوں گے تو ان کے خاص امتحانوں میں اپنے بچوں کو شریک کرائیں؛

> دعویٰ نہیں ہے اس کا کہ اہلِ زباں ہیں ہم
> ہاں یادگارِ قافلۂ رفتگاں ہیں ہم

انور قمر

قول و فعل کی بداعمالیاں[1]

قورمہ اور پراٹھا کھا چکنے کے بعد جب بریانی کی پلیٹ ہمارے سامنے آئی تو ہماری گفتگو بھی دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔ میں نے پوچھا "حال میں آپ نے کون سی اچھی فلم دیکھی؟" "فلم؟" وہ چونکا "میں رمضان کے دنوں میں فلمیں نہیں دیکھتا۔" "لیکن قبلہ ابھی ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ آپ روزے نہیں رکھتے تو فلم دیکھنے میں کونسی قباحت ہے؟" اس کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے شہد کی کوئی مکھی بوسہ دے گئی ہو۔ "آپ کیا جانیں رمضان اُلمبارک کا احترام، اس کی برکتیں، فضیلت، یہی تو مہینہ ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔" میں یہ جملہ مکمل طور پر نہ سن سکا۔ اور سن بھی کیسے سکتا تھا اس ہوٹل میں پہلے ہی بڑا تعفن تھا کہ اس کی باتوں سے آئی ہوئی وودھ کی بو نے میرا ایک پل وہاں بیٹھنا دوبھر کر دیا۔

میرے ملاقاتیوں میں شمالی ہند کے ایک صاحب ہیں جو دراز قد بارعب، بلڈ رستم چہرہ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک غرض کہ خوبصورت اور شریف آدمی ہیں۔ علی الصباح اٹھتے ہیں نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید فرماتے ہیں۔ دن نکلتے ہی روزی روزگار سے لگ جاتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ وہ اذان کا کبھی لبیک نہیں کہتے اور نہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔ نمازی جب تمام سنتیں اور نفلیں پڑھ کر مسجد کے داخلی دروازے پر چپلوں اور جوتوں کے ڈھیر میں اپنی چپلیں اور جوتے تلاش کرتے ہیں تو اس وقت یہ صاحب آ کھا حاضر ہوا، کہہ کر بڑی تیزی سے مسجد کے اندر چلے جاتے ہیں۔

ایک سوڈرن اور پڑھے لکھے دوست کی اسلام شناسی ملاحظہ ہو۔ یہ عید کے نمازوں کے پابند، قرآن شریف اور احادیث نبوی کا باقاعدہ مطالعہ کرنے والے، نماز کے فرائض سے بے بہرہ اور روزوں سے بے نیاز ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر فرماتے ہیں "اسلامی کتابوں کے پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچاؤ، صراط مستقیم پر چلو، جیو اور جینے دو کے مقولے پر عمل کرو۔ اپنے ضمیر سے اپنے عمل کا احتساب کیا کرو" "اور نماز زکات و حج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" جب ہم نے پوچھا تو انھوں نے فرمایا "خدا کو فیق دے تو حج ادا کرو۔ انکم ٹیکس سیل ٹیکس، واٹر ٹیکس وغیرہ وغیرہ ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد میں یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ زکوات بھی دی جائے۔" "اگر نماز؟" "جب جی چاہے نماز پڑھی جائے میں نے جب جب نماز پڑھی ہے تب تب اپنے آپ کو خدا کے حضور میں پایا ہے — اور قرآن کے مطالعہ نے مجھے ہمیشہ سکون بخشا۔"

کھار اور باندرہ کے لنکنگ روڈ پر راجستھانیوں کا ایک ہوٹل ہے اور اس ہوٹل کے اوپر ہے ایک گیسٹ ہاؤس اس گیسٹ ہاؤس کا ایک کمرہ — جی ہاں ایک کمرہ ایک حکیم صاحب نے اپنے رہنے سہنے اور طبابت کرنے کے لئے رکھ چھوڑا ہے عرت نہیں روز قبل کی بات ہے ایک چوڑی فروش نے اس حکیم پر یہ الزام لگایا کہ وہ حکیم اس چوڑی فروش کو موتی، ہیرے، چاندی اور سونا بہاں تک کہ کوکین بنانے کا نسخہ بتائے گا۔ اور آن واحد میں Millionaire ملینیر بنا دے گا۔ بیچارہ چوڑی فروش

[1] مسلمان = اسلام — (نماز + روزہ + زکات + حج) ؟

جو کہ اپنے کاندھوں پر چوڑیوں کا ذرنی شوکیس اٹھائے گلیوں گلیوں چوڑیاں لیلو ۔ فیشن ایبل چوڑیاں لیلو ، کی آواز لگاتا پھرتا تھا اور اپنے پسینہ کی تر روٹیاں کھاتا تھا اس حکیم کے مکرو فریب کا شکار ہو گیا۔ اور پانچ ہزار نقد بیوی کے زیورات اور اپنے متعلقین سے لئے ہوئے ہزاروں کی قرض سے ہاتھ دھو بیٹھا اس واقعہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان دنوں میں صلح وصفائی کرانے والوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے جب یہ دونوں حضرات باوضو ہو کر حلف اٹھا گئے حکیم نے یہ کہہ کر کہ اس چوڑی فروش نے ایک پائی بھی اسے کسی صورت میں نہیں ادا کی اور اس چوڑی فروش نے یہ کہہ کر وہ نہ صرف نقد پانچ ہزار بلکہ اپنا سرمایۂ ہستی اس حکیم کی نذر کر بیٹھا ہے ۔

ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔ مسلمان ہیں اور بمبئی ملاقاتی ہیں۔ کرلا میں رہتے ہیں اور پریکٹس کرتے ہیں کرنے کے فوراً بعد مشرق وسطیٰ کے کسی شیخ کے شیخ ڈم میں بڑی اونچی تنخواہ پر نوکر ہوئے چند ہی سال میں وہاں سے اتنا کچھ بچا لائے کہ یہاں پر اپنی ڈسپنسری ( ) کھول بیٹھے ۔ ایک روز دوران گفتگو فرمانے لگے ۔ ' یار یہ جو نسلم لگی ہے نا گپت گیان اس سے بڑا بھلا ہوا ہے ۔ پیسیوں ۷۰ کے مریض روزانہ علاج کے لئے آنے لگے ہیں لیکن میں بھی انھیں الو بنائے ہوئے ہوں ، بجائے پاورفل ڈوز دینے کے انھیں ( ) پینی سلین کا ویک ڈوز دیتا ہوں یعنی جو کام چھ انجکشن میں ہو جاتا ہے اسے میں بارہ سے بیس انجکشن میں کر رہا ہوں ۔ آخر اپنے کو بھی تو دھندا کرنا ہے ۔

عرب گلی بڑی بدنام جگہ ہے کیا کیا جائے کہ سعادت حسن منٹو کو بھی کچھ عرصہ کے لئے وہاں قیام کرنا پڑا تھا اور میں بھی وہاں بیس سال تک رہ چکا ہوں ۔ وہاں ایک نوجوان رہتا ہے اتفاق سے پندرہ روز پہلے میری اس سے بات چیت ہوئی ۔ پہلے موضوع ادب بنا پھر سماج اس کے بعد طوائفوں کے بارے میں ہم ایک دوسرے کو اپنے تجربات بتاتے رہے کہ بات مذہب تک جا پہنچی تمہارے نزدیک خدا کا کیا تصور ہے ؟ '

خدا ایک سفید ریش ، پُرجلال و پُرنور اور بڑی پُرحلم شخصیت کا مالک ایک سنہری تخت پر بیٹھا ہے اور اپنی نظر کے اشارے سے پوری کائنات کے نظام کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے ۔ ؟ '

مذہب اسلام ہی دنیا کا سب سے حقیقی ، و سائنٹیفک مذہب ہے ' ' تو پھر تم اس پر عمل کیوں نہیں کرتے ؟ '

' عمل ۔ عمل میں ضرور کروں لیکن ابھی میں اس کی روح کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں ۔ دراصل ان مولوی ملاؤں نے اس کی صورت مسخ کر دی ہے اور اس پر اتنی گرد اڑائی ہے کہ اصلیت کئی تہوں میں جا چھپی ہے ۔'

' اس کی روح کو سمجھنے میں تمھیں وقت لگے گا ؟ ' ' میں ابھی ستائیس سال کا ہوں ۔ تین بیس سال کے عرصے میں میں ضرور اس کی اصلیت کا سراغ لگا لوں گا ۔ پھر دو باتوں کا امکان ہے ایک تو یہ کہ میں پکا مسلمان ہو جاؤں اور دوسرے یہ کہ دہریہ ۔'

میرے محترم دوست ایک روز غریب خانہ پر تشریف لائے ایک طغرے کو دیکھ کر فرمانے لگے ' آج پتہ چلا ، آپ مسلمان ہیں ، حضرت یہ میرا نہیں میرے والدین کا گھر ہے میں یہاں نہیں کہیں اور رہتا ہوں ۔'

انسان آخر کب تک حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو بہلاتا رہے گا اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے کر سلاتا رہے گا ۔ اپنی سمجھ پر سے اٹھتے ہوئے پردے کو بار بار گراتا رہے گا اپنی آنکھوں میں نابینائی کا سرمہ لگاتا رہے گا ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ کسی مذہب کسی مسلک یا کسی ازم کو قسطوں میں نہیں بلکہ مکمل طور پر قبول کیا جاتا ہے اگر کوئی یہ کہے کہ فلاں مسلک یا فلاں ازم میں یہ یہ اچھائیاں اور یہ یہ برائیاں ہیں اس لئے ہم اچھائیوں کو اپنائے ہوئے ہیں اور برائیوں کو چھوڑے ہوئے ہیں لیکن یہ استثنا مذہب اسلام میں قطعی طور پر نہیں برتا جا سکتا ۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے محمدؐ رسول اللہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں اور مذہب اسلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے ظہور میں آیا ہے اور ان پر مکمل ہو چکا ہے تو پھر اس میں اپنی سہولت ' اپنی سستی ، اپنی کاہلی اور نا سمجھی یا دانشوری کی بنا پر اپنی اونچی سوچ

فکر کی وجہ سے یا دوسرے مذاہب والوں کا بھی تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ترمیم و تنسیخ کرنا یا اسے مکمل طور پر نہیں بلکہ قسطوں میں اپنانا درحقیقت اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔

مندرجہ بالا چھبیس مثالوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مذہب اسلام کے پیروؤں نے اپنی سمجھ بوجھ اپنی قابلیت اپنی بساط کے مطابق اس کی پیروی قبول کی ہے۔ ہر مثال ظاہر کرتی ہے کہ نہ تو رمضان کے روزے ترک کئے جا سکتے ہیں نہ نماز قضا کی جا سکتی ہے نہ زکوٰۃ سے کسی مسلمان کو مستثنیٰ سمجھا جا سکتا ہے نہ حرام روزی اسلام کی رو سے حلال سمجھی جا سکتی ہے اور نہ کبھی جھوٹی قسم کھائی جا سکتی ہے نہ کسی کا مال غصب کیا جا سکتا ہے نہ کسی مریض کا استحصال کیا جا سکتا ہے اور نہ خدا کو ایک بزرگ و برتر شخصیت کے روپ میں تصور کیا جا سکتا ہے نہ تو کلمہ پڑھنے کے بعد اپنے وجود کو دو کشتیوں پر سوار کرایا جا سکتا ہے اور نہ دس سے بیس سال کے طویل عرصے تک اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے تعیش پسندی اختیار کی جا سکتی ہے۔

دراصل ہر مسلمان کی زندگی اس کے رسول خدا اور خلفائے راشدین کی سی ہونی چاہئے۔ اسے فکر و اعمال میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے ان کے طرز عمل کو اپنانا چاہئے۔ جو حضرات اگر معصومیت سے اپنے اپنے طور پر اسلام کی پیروی کر رہے ہیں تو خدا کے یہاں ان کی بخشش ہو سکتی ہے اور اگر جان بوجھ کر اس مذہب کو اپنی سہولت یا خواہش کے اعتبار سے اپنائے ہوئے ہیں تو شاید ان ہی کا نار جہنم انتظار کر رہی ہے ایسے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلوانا چھوڑ دیں یا پھر اتنا دل و جگر پیدا کریں کہ مذہب اسلام میں ریفارم (اصلاح) کی ضرورت پر زور ڈالیں وقت پہلے ہی بہت بیت گیا ہے۔ زمانہ چال قیامت کی چل گیا ہے۔ یہ فیصلہ ہر شخص کو خود ہی کرنا ہے اور فوراً کرنا ہے۔

★

جو ایسا ہے وہ مسلمان نہیں

"دروغ گو، وعدہ خلاف، دغاباز، خیانت، کنجوس، لالچی، چغلخور، بے ایمان، رشوتی، سود خور، شرابی، غصہ ور، حاسد، چھچھورا، نمائشی، فضول خرچ، زانی، طعنہ زن، دشنام دراز، اور حرام خور یعنی اپنے کاروبار میں آٹے میں نمک سے زیادہ منافع کمانے والا۔ "مسلمان" دنیا میں نیکی کا پیام بن کر جیتا ہے، نیکی پھیلاتا ہے۔ اور اپنے مفاد کو قربان کر کے برائی مٹاتا ہے۔"

(حدیث)

عبدل غفار

اِس زہر بھری دنیا میں جنھیں اپنا بھی مرض معلوم نہیں

ہندوستان پر مسلمانوں نے ایک ہزار برس
تک حکومت کی ، اس عرصے میں یہاں کے ہندو ، مسلم حکمرانوں
کے محکوم رہے لیکن انھوں نے وقت کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا
اور زمانے کی پیشانی پر شکن نمودار نہ ہونے دی ۔ انھوں نے مسلمانوں کے
دوش بدوش ہندوستان کے ہزار شیوہ و رنگ ، کلچر میں وہ آب و تاب پیدا
کی اور اسے وہ اندازِ دلربائی بخشا ، جسے تاریخِ عالم کے دلکش باب سے
تعبیر کر سکتے ہیں انھوں نے ہر شعبۂ حیات میں اپنے یادگار نقوش چھوڑے
وہ اپنے ظلِ الٰہی اور جہاں پناہ کے لئے ہر آڑے وقت میں
سینہ سپر ہو گئے ، دشمن نے ملک کی جانب نگاہِ غلط انداز ڈالی تو
وہ شمشیر بکف نظر آئے ۔ اکثر مواقع پر جب ہندوستانی نظامِ معیشت و
معاشرت میں رخنے پڑ گئے ۔ اس وقت عقل و ہمتِ سلطانی کے
ساتھ ساتھ ہندو سیاسی مشیروں ، صلح کاروں ، اور وزیروں کے فہم و
تدبر نے بھی ملک کو سنبھالا دیا ۔ اس ملک کے نبض شناس ہونے کی وجہ
سے ان لوگوں کا ایک گروہ ہمیشہ مسلم حکمرانوں کا دستِ راست
بنا رہا ــــ وہ اسلامی رسوم و رواج ، اخلاق و عادات ، مسلک و
عقائد اور تہذیب و تمدن کے رنگوں میں رنگ گئے اور ان کی کشادہ
دلی ، وسیع مشربی اور خود سپردگی سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے بھی
ان کی تہذیب و تمدن کو گلے لگا لیا ، اور ہر ہر قدم پر ان کے خلوص و
خدمت کو سراہا اور نوازا ۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ مسلم حکمرانوں نے ان کی
کم نگاہی کا چلن اختیار کیا ، لیکن اس وقت بھی وہ اپنے 'ان داتا'
اور 'خداوند' کے گن گاتے رہے ۔

دراصل ہندوستان کی تاریخ کے صفحات سے
ہندوؤں مسلمانوں کے جس مشترکہ کلچر ، اتحاد و یگانگت کا بار بار حوالا
دیا جاتا ہے ، وہ عبارت تھا ! اکبر ، جودھا بائی ، مثنوی تحفۃ الہند ،
مٹیا برج ، دارا شکوہ ، نورتنوں ، پھولوں والے میلے ، کبیر ، امیر خسرو
محمد بن تغلق ، دینِ الٰہی ، میرزا مظہر جانِ جاناں اور درشن کے
جھروکے سے ــــ آج بھی اس تاریخ کو دہرایا جا سکتا ہے ۔
اور اندازِ گلستاں ، پیدا ہو سکتا ہے ۔ لیکن اس کے لئے دونوں طرف
آگ ہو برابر لگی ہوئی ۔ ورنہ محرومیٔ قسمت کی شکایت فضول ہے ۔

یہ دونوں فرقوں کے دلوں میں اخلاص و ہمدردی
ایثار و قربانی اور پیار و محبت کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی تھی کہ ......
دشمنوں نے ایک رات شاہ عالم ثانی کو قتل کر کے جمنا کے تٹ
پر ڈال دیا تو برہمن زادی رام کور رات بھر اپنے بادشاہ کا سر زانو پر
لئے بیٹھی روتی رہی ..... کہ ایک ہندو رانی کی راکھی پا کر اس
کے دشمن کا قلع قمع کرنے کے لئے ہمایوں میدانِ جنگ میں کود پڑا ۔
...... کہ جہانگیر اور جودھا کی شادی ہوئی تو شہنشاہ اکبر خود اپنی
بہو کے چنڈول کو کندھا لگا کر لایا .... کہ پشینے کے ایک
ایرانی سوداگر نے ایک برہمن زادے کی حسین آنکھوں پر فریفتہ ہو کر
اپنا ایمان بیچ دیا .... کہ قیدی خانِ خاناں ، جنگِ میواڑ
کے فاتح رانا پرتاپ کے مہر و کرم کو نہ بھول سکا اور چوبیس برس
بعد جب رانا نے اپنا سرِ اطاعت خم کرنا چاہا تو اکبر کے رتنِ خاص نے
اسے جنگ جاری اور خدا پر بھروسا کرنے کی ہدایت دی ......

کر اکبر نے جب دو راجپوتوں سے ان کی بہادری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کہا تو انھوں نے نیزے کی اَنیاں اپنے سینوں میں پیوست کر دیں۔

تاج محل، گرانٹ ٹرنک روڈ، دیوان خاص، حیدر آباد اور ایسے کتنے ہی نقوش، اس عہدِ پارینہ سے آج بھی زندہ ہیں۔

دستِ قدرت نے اس بے مثال کلچر کا سانچا ڈھالنے میں جس حسن کاری اور ہنرمندی کے کمال کا ثبوت دیا تھا، اسے پاش پاش کرنے میں بھی اپنے قوتِ بازو کا بڑی فراخی سے استعمال کیا۔ آج وہ کلچر صرف اساطیرِ کہن کا حصہ ہے۔

دریا میں ایک لہر جس طرح دوسری لہر کو مٹاتی اور فنا کرتی چلی جاتی ہے۔ وقت کے دھارے میں بھی نسل جدید نسل قدیم کو، تمدن موخر تمدن مقدم کو اور حکومتِ نو حکومتِ پیشین کو ختم کرتی گزر جاتی ہے۔ کل فرق مغل سے تاج حکمرانی اتار لیا گیا تو آج دستِ افرنگ سے زمام حکومت چھین لی گئی۔

انگریزی حکومت کی عمل داری کے خاتمے پر جن مسلم راہ نماؤں کی کوششوں کے نتیجے پاکستان کا قیام ظہور میں آیا، انھوں نے اپنے بے مثال تہذیبی رشتے اور اپنے عظیم تاریخی کردار کو فراموش کر دیا تھا، درحقیقت انھیں ان کی حکمرانی اور جہاں بانی کے خاتمے نے ایک طرح کے عدمِ تحفظ اور احساسِ کمتری سے دوچار کر دیا تھا۔ بہر حال ان کے دامنوں پر تقسیم ہند کے خونیں المیے کا داغ، آج بھی ہمارے سینے کا رستا ہوا ناسور ہے۔

جس سیاست اور جن حالات کے تحت ملک کی تقسیم عمل میں آئی تھی، اس کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کا باقی رہ جانا صرف گاندھی اور نہرو کا معجزہ نہیں بلکہ پوری ہندو قوم کی رواداری کی روشن مثال ہے۔ نفرت، تعصب اور فرقہ پرستی اور تنگ نظری کی فضا میں بھی ملک کی بہت بڑی اکثریت نے بڑی سمجھ داری سے کام لیا اور ہیجان و جذبات فرو ہو جانے کے بعد وہ طریقے اپنائے اور پالیسیاں اختیار کیں جو صحیح سمت میں تھیں،[1]

ہندوستانی مسلمانوں کی تنگ اور فرقہ واریت ہی کی وجہ سے سرزمینِ ہند آج تین حصوں میں تقسیم ہے۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے اعمال و کردار کے احتساب کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ البتہ آزادی کی گھڑی سے آج تک وہ کسی ستم رسیدہ اور دل شکستہ عاشق کی طرح حکومت کا شکوہ سنج رہا ہے وہ حکومت کی کم نگاہیوں، بے مروتیوں، ستم آزمائیوں اور جفاکشیوں کی ایک فہرست طولانی رکھتا ہے جب کہ خیرات کے گھوڑے کے دانت نہیں دیکھے جاتے۔ اور اس کی شکایتیں بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

کل ہندو ملوکیت اور شہنشاہیت کے دور میں زندگی بسر کر رہا تھا، آج مسلمان سیکولزم اور سوشلزم کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ کل ہندو اکثریت مسلم اقلیت کی محکوم تھی، آج مسلم اقلیت ہندو اکثریت کی محکوم نہیں۔ کل یوں بھی ہوا کہ ہندو ذمی کہلایا اور اسے جزیہ ادا کرنا پڑا، آج مسلمان پر اس قسم کا کوئی لیبل نہ چسپاں ہے، نہ وہ ایسا کوئی ٹیکس ہی ادا کرتا ہے۔ کل کا ہندو عہدِ وسطیٰ کے بندھے ٹکے ڈھرے پر گامزن تھا اور ایک غیر صنعتی دور میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا، آج کا مسلمان ایک صنعتی اور سائنٹفک عہد اور ایک جدید نظامِ معاشرت میں کاروانِ عمر طے کر رہا ہے۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ ان حقائق کے باوجود آج کا مسلمان اپنے اِترا نے کے لئے کس جواز کا سہارا لے رہا ہے؟

ایک مشہور دولت مند حسینا نے ایک مصوّر سے اپنی تصویر بنوائی، جب تصویر بن کر مکمل ہوئی تو حسینا نے مصوّر کو ڈانٹتے ہوئے کہا "پچھلی بار جب تم نے میری تصویر بنائی تھی تو وہ اس سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔" مصوّر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا، "میڈم! یہ بھی تو دیکھئے کہ آٹھ برس پہلے جب آپ نے تصویر بنوائی تھی تو میں کافی جوان تھا۔"

مرورِ زمانہ نے ہر شے کی صورت بدل دی ہے، لیکن ہندوستانی مسلمان آج بھی لذتِ خوابِ دوشینہ میں ڈوبے ہوئے، آئینۂ ایام میں اپنے عہدِ رفتہ کی ادائیں دیکھنے کے متمنی ہیں

---

[1] سیکولر ڈیموکریسی اپریل ۱۹۷۳ء میں شہباز حسین کی ایک تحریر سے ماخوذ ہے۔ ادنیٰ تغیر کے ساتھ۔ ... ع۔ع

اور دورِ جدید کی تبدیلیوں سے انجان رہ کر اور زمانے کے مزاج کو نہ پہچان کر اس حسینا کے سے بھولے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔

وہ آج کے سیکولر عہد میں عملی گرلہ ۔وہی ورسی کا اقلیتی کردار بحال رکھنا چاہتے ہیں ــــ گمبھیر معاشی بحران سے گھرے اور آبادی کے اضافے سے تنگ ملک میں یکساں سول کوڈ کے بل کے خلاف کن ونشن منعقد کرتے ہیں اور اپنے فرقے کے لئے چار شادیوں کے حق کا تحفظ چاہتے ہیں ــــ ۔۔

ان کی فرقہ پرستی کی انتہا ہے کہ آسام کے سیلاب یا بنگال و بہار کے مصیبت زدگان کے واقعات سن کر ان کا دل نہیں پسیجتا لیکن شام و فلسطین کے درماندہ حالوں کے لئے ان کا دستِ کرم دھن برسانے لگتا ہے اور وطنِ عزیز کی راہ میں خون بہانے والوں کے لئے "احسنت و مرحبا" کی صدائیں بھی بلند نہیں کی جاتیں۔ لیکن اسرائیل کے ہاتھوں پٹ کر کرنے والوں کے لئے باقاعدہ طبق دِ نسد کھیجے جاتے ہیں۔ وہ آج کے مشینی دور میں "دیونار سلاٹر ہاؤس" کی مخالفت میں طوفان برپا کر دیتے ہیں اور ان کی شہ پر غیر قانونی اور غیر سائنٹفک ذبحوں کا قیام فروغ پاتا ہے . . . . . . وہ تعلیم کے میدان میں سب سے پیچھے اور اسمگلنگ اور غیر قانونی تجارت میں سب سے آگے رہ کر سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں اپنے عدم تناسب کا رونا روتے ہیں۔ . . . وہ اپنے لئے مراعات اور سہولتیں حاصل کرنے کے لئے سیکولرزم اور سوشلزم کی دہائی دیتے ہیں اور پسِ پردہ "مسلم لیگ" مسلم مجلس، جماعت اسلامی اور جمعیۃ علماء جیسی فرقہ پرست اور متعصب پارٹیوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں . . . .

. . . . وہ مدعی ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو پستی اور تنزل کے گڑھے سے نکال کر، انھیں ان کا جائز مقام عطا کیا اور ان کے حقوق کی حفاظت کی، لیکن اس کے برعکس مسلم عورتیں دنیا کے کسی بھی فرقے کی عورتوں سے کہیں زیادہ جاہل، نابرابری، ستم آزمائی اور ہوس رانی کا شکار نظر آتی ہیں۔

وہ فرقہ پرست خیالات اور نظریات کی تبلیغ کو صحافت کی آبرو، ترقی پسندی، اور جدیدیت کے نام پر تنگ بندی اور انتشارِ ذہنی کے مرقعے سجانے کو ادبی ترقی، اور اردو کے "آؤٹ آف ڈیٹ" رسمِ خط کی تبدیلی یا اس میں اصلاح کی مخالفت کرنے کو اردو زبان کی خدمت کہتے ہیں۔

وہ شریعت اور اسلام کو ایک دوسرے کا مترادف گردانتے ہیں[1] اور ان کا دائرۂ شریعت کم معشوق سے زیادہ تنگ واقع ہوا ہے، جہاں شریعت میں ترمیم یا اصلاح کی بات ہوئی۔ انھیں اسلام کی بنیادیں ڈولتی نظر آتی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی ایسی شریعت نہیں پائی گئی، جس پر باتفاق سب کا عمل درآمد رہا ہو۔

ان کی رسوم و قیود کے خمار کی سرگشتگی ہنوز نہیں گئی اور وہ آج بھی بے شمار توہمات و خرافات میں مبتلا ہیں۔ ــ وہ اپنی آشفتہ حالی سے گلا مند تو ہوتے ہیں، لیکن اپنے تصورِ فہم کا احساس نہیں کرتے۔

ان کی گم راہیوں کا سب سے بڑا سبب مسلم علما ہیں، جنھوں نے انھیں نارِ جہنم کے شعلوں سے ڈرا کر اور جنت کے سبز باغ دکھا کر ہمیشہ اپنا اُلو سیدھا کیا اور انھیں مذہب کا نشہ گھول گھول کر اس حد تک پلایا کہ انھوں نے ذوقِ عمل کی کوتاہی کو بختِ نارسا کا نام دے دیا۔ وہ محرومیٔ قسمت کو نوشتۂ تقدیر اور ستمِ روزگار کو مرضیٔ مولا سمجھ بیٹھے، اور رنج و محن زمانا کو باعثِ نجاتِ اخروی اور تنزلِ قومی کو قربِ قیامت کی نشانی یقین کرنے لگے۔ یہ غلط بھی نہیں ان کا قومی تنزل، دوسروں کے لئے نہیں تو ان کے لئے ضرور قیامت کا پیغام ہے۔ ؎

اس زہر بھری دنیا میں جنھیں اپنا بھی مرض معلوم نہیں
اکثر وہ بزعم چارہ گری بیمار کی باتیں کرتے ہیں

★

بے نقدِ عمل جنت کی طلب کیا شے ہیں جناب واعظ بھی
مٹھی میں نہیں ہیں دام و درم بازار کی باتیں کرتے ہیں

---

[1] شریعت نام ہے فقہائے اسلام کے مرتب و مدون کئے ہوئے قوانین کا . . . ع ۔ خ

صادق علی

مسلمانوں کے معاشی مسائل

کیا مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کے معاشیاتی مسائل کے بیچ کسی قسم کا امتیاز کیا جا سکتا ہے؟

یقیناً نہیں! ہندوستان میں مسلمان معاشی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم انھیں نہ تو کسی خاص پیشے سے منسلک کر سکتے ہیں اور نہ کسی خاص آمدنی کے گروپ سے۔ اور نہ انھیں سرمایہ دار کسان یا مزدوروں کے گروپ میں متعین کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت معاشی نقطۂ نظر سے انھیں کسی خانے میں رکھنا بہت مشکل ہے مسلمانوں میں بھی دوسرے فرقوں کی طرح ایک گروپ صرف اپنے فائدے اور نقصان تک دلچسپی رکھتا ہے۔ مثلاً زمینوں اور بلڈنگوں کے مسلم مالکان کو مسلم مزدوروں کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔

مسلمانوں کی معاشی حالت مختلف جگہوں پر مختلف ہے۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے مسائل جنوبی ہند کے مسلمانوں کے مسائل سے قطعی طور پر مختلف ہیں۔ مسلمانوں کی معاشی حالت پر جب غور کرتے ہیں تو دوسری تکلیف یہ ہوتی ہے کہ معاشی حالت و مسائل قومیت کی بنا پر تقسیم نہیں کیے گئے ہیں۔

اس صورت میں قدرتی طور پر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا الگ سے جائزہ لینا مفید ہوگا؟ کیا اس سے ملک و قوم کی ترقی میں کسی قسم کی مدد ملے گی؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ گو معاشی طور پر مسلمان کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے لیکن پھر بھی وہ ایک خاص سماجی رتبے کے مالک ہیں۔

اگر مسلمانوں کے معاشی مسائل اور دوسرے فرقوں کے معاشی مسائل کی جڑ ایک ہی ہوتی تو دونوں کے درمیان فرق دریافت کرنا محض ایک سعی موہوم ہوتی۔ لیکن اگر ہم ذرا گہرائی سے اس بات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کچھ خاص تاریخی واقعات نے دوسرے فرقوں سے زیادہ مسلم فرقے پر اثر ڈالا وہ واقعات کیا ہیں؟ یہ سمجھنا بہت ضروری ہے۔

اول تقسیم نے مسلم فرقے کو منفی طور پر جتنا متاثر کیا اتنا کسی بھی دوسرے فرقے کو متاثر نہیں کیا۔ تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کو اور خاص طور پر شمالی ہند کے مسلمانوں کو ذہنی طور پہ ایک خلاء کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ جو لوگ انگریزی تعلیم سے ذرا بھی مانوس تھے، وہ ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور ان لوگوں سے جو نسل ذہنی قربت رکھتی تھی وہ ہندوستان ہی میں رہ گئی تھی۔ اس نسل کو غیر وفاداری کے عظیم سیلاب میں تھپیڑے کھاتے رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایسے غیر مستحکم حالات اور ناموافق ماحول میں جائداد رکھنا سیلاب میں مکان بنانے کے مترادف ہوتا۔ اگر ہم آزادی کے بعد پہلے دس پندرہ سالوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے بہت کم کارخانے اور ورکشاپ قائم کیے اور اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ ایک شخص اسی وقت گھر بناتا ہے یا کارخانے قائم کرتا ہے، جب اسے کچھ دن تو موجود رہنے کی امید ہو! تقسیم نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور رہی سہی کمی آئے دن کے فسادات نے پوری کر دی لیکن مسلمانوں کو یہ اعتماد دوبارہ قائم ہی کرنا پڑے گا۔ اور سیکولر ریاست کی بنیاد کو مضبوط دیکھنے کی خواہش مند لوگوں کو اس اعتماد کو برقرار رکھنے میں ان کی پوری پوری اور ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

دوم، تقسیم سے قبل کے دنوں میں مسلم قیادت نے دیہات سے منہ موڑ لیا تھا پھر بھی دست کاری اور گھریلو صنعتوں کو بڑھاوا اور حمایت ملنے سے مسلمانوں کو بہت حد تک مدد ملی۔

پھر بھی یہ مرہم اس زخم کا مداوا نہ بن سکا جو قیادت کے فقدان تعلیم یافتہ طبقے کی ہجرت اور زمین داری کے خاتمے کا نتیجہ تھا۔ سب سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ ایک بامقصد ان تھک۔ اور بے لوث قیادت کا فقدان!

سماجی سطح پر خاندان کی تقسیم بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ٹریجڈی ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں سماجی زندگی کا بنیادی ستون فرد نہیں بلکہ خاندان ہوتا ہے مشترکہ خاندان ہماری قومی زندگی کا ایک خاص پہلو ہے۔ تعلیم یافتہ اور باشعور لوگوں کی ہجرت ایک بڑے مسئلے کی پیداوار کا باعث بن گئی۔ مسئلہ لڑکیوں کی شادی کے لئے لڑکے اور لڑکوں کے لئے نوکری! معاشی اور نوکری پیشہ مواقع کے دائرے میں ایک منفی قوت کام کرتی ہے اگر گھر کا ایک فرد کسی اونچی پوسٹ پر فائز ہو جاتا ہے، یا سماجی لیڈر بن جاتا ہے، تو وہ گھر کے دوسرے افراد کو اس میدان میں لانے کا بہانہ بن جاتا ہے یہاں تک کہ نوکری کے مقابلے میں بھی اس کی امید زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ یہ کسی طرف داری کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ماحول ٹریننگ اور خاندانی سوچ سمجھ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو آدمی کو ترقی کرنے پر اکساتا ہے۔

مسلم آفیسروں کے رشتے دار ہمیں پرائیوٹ اور گورنمنٹ آفسوں میں ملتے ہیں لیکن اونچے عہدے پر مسلمانوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کی ذات سے بہت کم مسلمانوں کو فائدہ پہنچ پاتا ہے ملک و قوم کی معاشی حالت میں مسلمانوں کا حصہ ان کی آبادی کے لحاظ سے افسوسناک حد تک کم ہے۔

تقسیم کے فوراً بعد کے دنوں میں ہجرت اور جائیداد کی منتقلی کے قانون نے مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچایا۔ سرسری طور پر دیکھتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ اب ان کی بہت کم جائیداد رہ گئی ہے۔

انتظامیہ اور اسکولوں سے اردو کی بے دخلی نے بھی مسلم معاشی زندگی کو بہت حد تک متاثر کیا۔ پرانی اور نئی نسل کے بیچ کی کڑی ٹوٹ کر رہ گئی اس کے علاوہ مسلم گھرانوں اور عام اسکولوں کے بیچ ایک خلیج سی حائل ہو گئی۔

مجموعی طور پر ان تمام چیزوں کا مسلمانوں پر منفی اثر پڑا۔ وہ ذہنی پسماندگی اور عدم تحفظ کا شکار بن کر رہ گئے جس نے معاشی میدان میں ترقی کی راہیں مسدود کر کے رکھ دیں۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کا دو نقطہ نظر سے جائزہ لیا جا سکتا ہے:

کس حد تک خود مسلمانوں کی نااہلی انھیں معاشی میدان میں ترقی کرنے سے روک رہی ہے؟

کس حد تک مسلمان امتیاز برتے جانے کا شکار بن رہے ہیں؟ اور کس طرح ان کی معاشی حالت پر یہ اثر انداز ہوتا ہے؟

جہاں تک مسلمانوں کی اہلیت کا سوال ہے ہمیں اس کا جواب خود ان کی سماجی اور تعلیمی اہمیت سے اخذ کرنا ہوگا۔ اور اس راہ میں جو جو روڑے آئیں، انھیں ہٹانا ہوگا۔

جہاں تک امتیاز برتے جانے کا سوال ہے جیسے عام طور پر فرقہ پروری کہا جاتا ہے اس سلسلے میں کوئی خاص اعداد و شمار یا حقائق نہیں ہیں پھر بھی ہمدردی کے ناطے اور غیر سرکاری طور پر جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے، وہ بہت ہے۔ پھر بھی اس سلسلے میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

گو فرقہ وارانہ فسادات ملک میں عام نہیں ہیں لیکن اب اور تب ہونے والے یہ فسادات نہ صرف اس علاقے کے مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کر دیتے ہیں بلکہ دوسرے علاقے کے مسلمانوں کے دل بھی ان دیکھے خوف سے دہشت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں یہ تمام فسادات نئی نسل کے ذہن پر بھی بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔ بے شک معاشی ترقی کے لیے تحفظ ہونا بھی بہت ضروری ہے بلکہ اسا رکا [illegible] میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ [illegible] حقیقت سے [illegible] ان صرف چند خاص [illegible] ہی ہیں کما [illegible] رکھتے تھے اور تقسیم کی وجہ سے وہ میدان بھی ان کے ہاتھوں سے جاتے رہے۔ نئی نسل نے گھٹے گھٹے

ماحول ذہنی طور پر پراگندہ اور کم مواقع والے ماحول میں آنکھ کھولی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں پرانی نسل تھی وہاں تک بھی نہ پہنچ سکی۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میں مسلمان کیا کرے؟ یہ سوال خود مسلمانوں کے ہی سامنے رکھا جائے اور وہ آزادی سے اپنے بے لاگ نظریے کا اظہار کریں تو ہمیں تین قسم کے سوچنے والوں کے جواب ملیں گے!

پہلا طبقہ انہی فرقہ پرست لوگوں کا ہے، جو اب بھی ماضی میں بستے ہیں، اور اگر ان کے ہاتھوں میں تمام سیاسی اختیارات دے بھی دیئے جائیں تب بھی یہ غیر مطمئن ہی ہوں گے انھیں اس سے بالکل مطلب نہیں کہ مسلم فرقہ اس قابل ہے بھی یا نہیں۔ یہ طبقہ نہ تو مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور نہ کسی تعمیری ہی کام میں حصہ لیتا ہے۔ دوسرے فرقوں کے ساتھ مسلمانوں کا میل جول دیکھتے ہی یہ بھونکنے لگتے ہیں۔

دوسرا طبقہ قنوطی لوگوں پر مشتمل ہے۔ انھیں چاروں طرف ناامیدی اور مایوسی ہی نظر آتی ہے۔ یہ آدھے بھرے گلاس کو ہمیشہ آدھا خالی گلاس ہی کہتے ہیں۔

ان دونوں طبقات کے نظریات سے ایک یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ جب تک مسلمانوں کو سیاسی اقتدار نہیں مل جاتا ہے، وہ ترقی نہیں کر سکتے مسلمانوں میں اس قسم کی ذہنیت عام ہے اور یہی ذہنیت فرقہ کی علاحدہ پسندی کی آگ کو اور ہوا دیتی ہے۔ اسی لئے جو مسلمانوں کو ایک دھارے میں بہتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی قوم کی پستی کی وجہ کو سمجھیں اور ہر حالت میں مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے مواقع دینے میں مدد کریں۔

تیسرا طبقہ معاشی مسائل کو اہمیت دیتا ہے ملک کی معاشی زندگی میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہیئے؟ حالانکہ یہ طبقہ آج زیادہ نفوس پر مشتمل نہیں ہے لیکن اس کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا مستقبل اسی طبقے پر منحصر ہے یہ طبقہ اس نظریے کا حامل ہے کہ ملک کی تعمیر میں مسلمانوں کو بھی دوسرے فرقوں کے دوش بدوش ہونا چاہیئے لیکن ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ گول ہمارے پاس خود بخود نہیں آجائے گا بلکہ ہمیں اس تک جانا پڑے گا۔

مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے تین اہم مرحلوں کا پروگرام بنایا جا سکتا ہے:۔

۱) مسلمانوں کی خود کی پیدا کردہ ذہنی بیماری کی صحیح تشخیص۔
۲) ایسا شعبہ ڈھونڈھنا جس میں انکی اکثریت جذب ہو سکے۔
۳) ایسے دوسرے ذرائع ڈھونڈنا جن میں دوسرے فرقوں کے ہمراہ مسلمان بھی دوش بدوش حصہ لے سکیں اور اس طرح قوم کو مضبوط بنانے میں برابر کے مددگار ثابت ہوں۔

یہ بہت صحت مند نشانی ہے کہ ملک کا ذہین طبقہ بھی اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ مسلمانوں کو قومی زندگی میں برابر کا حصہ ملنا چاہیئے۔ اس طرح یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ قومی پریس بھی سنجیدگی سے مسلمانوں کے مسائل پر دھیان دیتا ہے۔ خود مسلمانوں میں یہ احساس جاگا ہے کہ انھیں نہ صرف اپنی حالت کو بہتر بنانا ہے بلکہ اس جمہوری ملک میں ملک کی بنیاد کو مضبوط بنانا ہے۔ آزادی سے کچھ پہلے اور فوراً بعد کی نسل بھی ان مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کوشاں ہے!

متفق ہونا جمہوریت کی روح ہے اور تعلیم، جہالت کا خاتمہ اس کے مضبوط ستون۔ معاشی میدان میں تنگ ذہنی اور مذہبی منافرت کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ اگر سوشلزم آیا تو جمہوریت کی فتح ہوگی جمہوری قوتوں کا مضبوط ہونا ہی مسلمانوں کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ لیکن مسلمانوں کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اکثریت اور اقلیت کے بیچ کی نفرت، شک، ڈر اور ایسی غلط فہمی کی خلیج کو پاٹ دیا جائے اکثریت اقلیت کے حفاظت کی ضمانت دے اور اقلیت اکثریت پر اعتماد رکھے یہ اعتماد اور بھروسہ ہمسری کے جذبے کو اور ابھارے گا۔

ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ فرقہ پرستی معاشی مسائل کو حل کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ دراصل یہ کوئی حل نہیں بلکہ خود ہی ایک مسئلہ ہے کبھی کبھی تو معاشی مسائل کی غلط فہمی سے فرقہ پرستی کو اور بڑھاوا ملتا ہے مسلمانوں کو اس ملک کی معاشی زندگی میں کس طرح ایک اہم مقام مل سکتا ہے؟ دو نظریے ہیں

لاتوں دستور کے مطابق ان کے لئے جگہیں محفوظ کردی جائیں جبکہ دوسرا طبقہ صرف اس سے مطمئن نہیں ہے بلکہ کچھ اور مراعات چاہتا ہے سب سے زیادہ افسوسناک یہ حقیقت ہے کہ اس نکتے پر بات کرنے کے لئے صرف سیاسی پلیٹ فارم ہی مخصوص ہو کر رہ گیا ہے اور عملی طور پر اس پر کسی نے بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔

کیا سرکار کی سرپرستی میں کچھ کیا جائے، یا سرکاری امداد سے، یا پھر کسی غیر سرکاری تنظیم کے زیر تحت۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ایک تنظیم قائم کی جائے جس کی تمام رپورٹیں حقائق اور اعداد پر مشتمل ہوں نہ کہ صرف خیالوں، شکایتوں اور حکایتوں پر مبنی ہوں اس قسم کی تنظیم کے قیام کے لئے سرکار کی سرپرستی ضروری ہے کیونکہ ایک غیر سرکاری تنظیم کو حکومت کے پروگرام دیلانوں کے متعلق معلومات کی فراہمی میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

صریحی طور پر ظاہر ہے کہ اس تنظیم کا کام صرف اعداد و شمار پیش کرنا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا کام ہوگا معاشی مسائل کے حل ڈھونڈنا اور مختلف شعبوں میں نئے مواقع فراہم کرنا اور بین الاقوامی مارکیٹ کے متعلق معلومات فراہم کرنے والے مرکز کی طرح کام کرنا اُسے جدید ٹیکنولوجی اور انتظام کے طریقے کے سلسلے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ مسلمانوں اور دوسری تنظیموں اور محکموں کے بیچ کی کڑی بننا ہوگا۔

اس کی اشد ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے کام کیا جائے اور یہ کام مسلمانوں کی کوشش کے بغیر کسی صورت میں بھی ممکن نہ ہوگا۔ یہی وقت کی پکار ہے۔ ابھی ورنہ کبھی نہیں ؎

زندگی کا رُخ بدلنے کے لئے
ایک مدّت کم ہے۔ اک لمحہ بہت

آدمی کی پہچان

مطلب پرست خود غرض انسان سے بچ کر ہی رہنا چاہئے۔ ترقّی کرنے والا انسان دوسروں کے عیبوں کی بجائے اپنی ہی کمزوریاں تلاش کرتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے پھونکنے سے آگ بجھا نہیں کرتی اور بھڑک جاتی ہے۔
وہ گائے سے سبق لیتا ہے جو گھاس کھا کر دودھ دیتی ہے، سانپ کی پیروی نہیں کرتا جو دودھ پی کر بھی ڈس لیتا ہے۔
نادان نہیں جانتا فضلِ رب سے جو لوگ ترقی کرتے ہیں وہ حجّام کی قینچی کی طرح عمل زیادہ، کام کم پر عمل نہیں کرتے بلکہ درزی کی قینچی بن جاتے ہیں جس کی آواز تو کم ہوتی ہے اور کام زیادہ۔

یوسف دہلوی

جمال خیر گل

مسلم نوجوانوں کا المیہ

اگر یہ کہا جائے کہ آج کا مسلمان ذہنی طور پر بیمار ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ کہنے کو تو مسلمان وحدانیت پر اپنا ایمان رکھتا ہے لیکن جب بات عمل کی آتی ہے تو اس کا ذہن طرح طرح کی حیلہ سازی کرتا ہے۔ نتیجتاً جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ اسے تباہی کے غار میں ڈھکیل دیتا ہے۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ اسلام نے نیت کو مقدم ٹھہرایا ہے۔ لیکن آج کے مسلمان کی نیت ہی صاف نہیں تو عمل میں برکت آئے کہاں سے؟

دینی اعتبار سے مسلمان اپنے آپ کو فوق الفطرت سمجھتا ہے۔ یوں تو گفتار سے وہ اسلام کو راہ نجات ثابت کرتا ہے لیکن جب عملی مظاہرے کا وقت آتا ہے تو اس میں ملک، قوم، خاندان، پیشہ اور حسب و نسب وغیرہ کی بات در آتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ آج کا مسلمان ان تمام برائیوں میں مبتلا ہے جسے مٹانے کے لئے خدا کو اسلام پیدا کرنا پڑا۔

روایتوں نے مسلمان کو کہیں کا نہ رکھا آج معاشی اعتبار سے وہ گرا ہوا ہے، تعلیمی اعتبار سے پچھڑا ہوا ہے تہذیبی اعتبار سے پسماندہ ہے اور روحانی اعتبار سے شدید ترین احساس کمتری میں مبتلا ہے احساس کمتری کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ جس شخص کے بارے میں ایسے گمان ہو جائے کہ "پہنچا ہوا ہے" تو اس کے آگے یہ روحانیت کا پرستار، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنا سر جھکانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

اگر ہم اپنی پسماندگی کا کھلے دل سے جائزہ لیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ ہمارے غور و فکر کا منبع حقیقت پر اپنا انحصار نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ تو آسمانوں سے بھی پرے اڑتا پھرتا ہے پھر جب جلد یا بدیر سچائی سے واسطہ پڑتا ہے تو غبارے کی مانند اچانک پھٹ پڑتا ہے اور نتیجتاً مایوسی و انتشار کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ بھی حضرت مسلمان کی بوالعجبی ہے کہ وہ کبھی اپنے آپ کو مورد الزام قرار نہیں دیتا۔ بلکہ ساری ذمہ داری گرد و پیش کے سر منڈھ دیتا ہے

جب تک مسلمان حال میں جیا اس نے ترقی کی لیکن جونہی اس نے حال سے رشتہ توڑا اور ماضی کے کارناموں سے ناتہ جوڑا اس کا زوال شروع ہوگیا۔ تاریخ کے صفحات اس امر کے شاہد ہیں کہ کسی بھی قوم کی تباہی و بربادی میں خارجی اثرات سے زیادہ اندرونی اسباب کارفرما رہتے ہیں۔

اس پر طرہ یہ کہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے اور جب کوئی مقصد ہی نہ ہو تو آدمی ٹامک ٹوئیاں نہ مارے تو کیا کرے جب ان ٹامک ٹوئیوں کا نتیجہ صفر برآمد ہوتا ہے تو مزید تاریکی پھیل جاتی ہے اور قیامت کا گمان ہونے لگتا ہے

اگر زندگی کا کوئی مقصد ہو تو انسان اپنے وسائل و ذرائع کو مجتمع کر کے بلند حوصلگی اور جد و جہد کے ساتھ اپنے مقصدِ حیات کو پانے کی سعی کرتا ہے۔ اگر یہ مقصدِ حیات تعمیری ہو تو نہ صرف فرد بلکہ سارے معاشرے کو نفع پہنچتا ہے ورنہ بصورت دیگر فرد خود ایسا فنا ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

اگر کسی معاشرے کو ترقی کرنا ہے تو یہ اس کے افراد کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف کریں کیونکہ معاشرہ افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور فرد کی مضبوطی معاشرے کے استحکام کا سبب بنتی ہے۔

آج ہمارا ذہن انتشار میں مبتلا ہے ایک طرف تو قدیم شکستہ اور کمزور قدریں سسک سسک کر دم توڑ رہی ہیں تو دوسری طرف نئی تہذیب تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اپنے قدم جما رہی ہے اس نئی تہذیب میں سب سے بڑی کشش یہی ہے کہ یہ پوچھنے کی اجازت دیتی ہے سوالات کرنے کی آزادی دیتی ہے اس کے برعکس قدیم قدروں کے پاس ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک بات کہی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس کی تمام قدریں Established ہیں اور اسے اپنانے ہی میں اپنی خیریت مضمر ہے تعلیمی اعتبار سے پچھڑے رہنے کے سبب ہم فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کونسی قدریں ہمارے حق میں مفید ثابت ہوں گی۔ لہذا ہم اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ پُرکھوں سے چلی آئی ہوئی روایتوں کو توڑنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں اور پھر بغیر احتجاج کئے چپ چاپ ان روایتی لاشوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے چلتے رہتے ہیں۔

زندگی جینے کے لئے ہے لیکن کیا زندگی کا تصور بغیر کسی مشکل، کٹھنائی، تکلیف در د وغم کے ممکن ہے زندگی جب تک رواں دواں ہے تب تک مشکلات بھی ساتھ لگی رہیں گی صرف عام آدمی ہی مصائب میں گھرا ہوا نہیں رہتا۔ بلکہ خواص بھی آلام میں مبتلا رہتے ہیں اور پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنھوں نے خوابوں کی دنیا میں رہتے ہوئے ایک الگ مملکت قائم کرلی، کیا ان کے پاس کسی قسم کے مسائل نہیں ہیں۔ روٹی روزی وہاں بھی تنگ ہے۔ ہنگامے وہاں بھی ہوتے ہیں، چور بازاری اور رشوت کا بازار وہاں بھی گرم ہے۔ فسادات وہاں بھی ہوتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ جہاں بھی انسان ہوگا۔ دشواریاں الگ الگ نام سے وہاں ضرور موجود ہوں گی۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ ہم خوابوں کی دھرتی سے نکل کر حقیقت کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھیں اور حالات کا صحیح تجزیہ کرکے ذہنی مزاج کو اس سے ہم آہنگ کردیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی کامیابی و کامرانی کے دور سے نہ گزریں۔

کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کا صحیح مصرف ہو صحیح منصوبہ بندی ہو ہم سیاست میں جتنی دلچسپی دکھاتے ہیں اس کی جو تھائی دلچسپی سے اگر ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ہمارے مسائل روز بروز کم ہوتے جائیں دراصل ہم اپنے مصائب کے خود ذمہ دار ہیں۔

نوجوان نسل کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے پاس صحیح رہنمائی کا فقدان ہے تعلیم کے میدان میں صحیح رہنمائی نہ ہونے کے سبب وہ آج نہ گھر کا ہے نہ گھاٹ کا۔ ہمارے کتنے والدین ایسے ہیں جو اپنے بچوں کی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں؟ کتنے والدین اپنے بچوں کی پڑھائی میں دلچسپی لیتے ہیں؟ کتنے ماں باپ ایسے ہیں جو بچوں کی مشکلات حل کرنے میں معاون ہوتے ہیں؟ کتنے اپنے بچوں کی جستجو کی صحیح پذیرائی کرتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو اپنے بچوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں؟

سچ پوچھئے تو بچہ اسکول اس لئے جاتا ہے کہ اتنی دیر گھر میں شانتی رہے گھر میں ادھم نہ مچی رہے اور ماں آرام سے کام کرسکے۔ ظاہر ہے کہ جب طرز فکر ایسا ہو تو بچہ کیا خاک پڑھے گا اور کیا مستقبل میں معاشرے کے لیے باعث رحمت بننے کی بجائے زحمت ثابت نہ ہوگا؟

ہمارے نوجوان جس قسم کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اس کا منتہا استادی اور شاگردی ہوتا ہے اس کے علاوہ دوسرے کسی میدان میں کچھ کر بھی لیا تو بس کلرک بن گئے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو دوسرے شعبوں کے بارے میں معلومات ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ معلومات کہاں سے حاصل کی جائیں [illegible] نہیں ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کی اکثریت درجہ سوم [illegible] کامیابی حاصل کرتی ہے جو اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ انھیں مسائل [illegible] بیٹھے [illegible] نہیں آتا بخدا اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کسی ایسے معالج کی جانب رجوع کریں گے جو یہ کہے کہ میں آپ کے نمونیہ کا صرف تیس فیصدی علاج کرسکتا ہوں اور بقیہ کا خدا حافظ ہے تو [illegible] صورت میں آپ ایسے خدا حافظ کہہ کر چلتے نہ بنیں گے۔ اسی طرح درجہ سوم میں بھی دراصل ذہن کی رسائی (Approach) کی نشاندہی کرتا ہے اب اگر آپ کو کہیں کام نہ ملے یا آپ کی کوئی قدر نہ کرے تو اس میں قصور کس کا ہے!

آج کل تعلیم کا روزگار سے جتنا تعلق ہے اتنا پہلے کبھی نہ تھا

سائنسی ترقی نے ہر شعبے میں آسانی کی خاطر اتنی پیچیدگیاں پیدا کردی ہیں
کہ متعلقہ شعبے کا صاحب تک صحیح علم نہ ہو کوئی شخص خوش اسلوبی سے
اسے انجام نہیں دے سکتا لہذا نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اندھا دھند
تعلیم حاصل کرنے کی بجائے منصوبہ بناکر تعلیم حاصل کریں تاکہ آگے
چل کر انہیں پچھتانا نہ پڑے۔

سب سے پہلے تو وہ یہ فیصلہ کریں کہ آخر وہ کیا کرنا چاہتے
ہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا ان
میں اتنی ذہنی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ پھر ان صلاحیتوں کو بروئے
کار لانے کے لئے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے گی۔ کتنا عرصہ
درکار ہوگا۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں یا تعلیم حاصل کرنے
پر کتنا خرچ آئے گا۔ سب سے خرچ ... یہ بھی ذہن نشین رہے متعلقہ علوم
فنون کی تکمیل کے بعد اس میدان میں ترقی کے مواقع باقی رہیں گے یا
نہیں۔ اگر آپ اپنے طور پر ان تمام امور پر غور نہیں کرسکتے آپ حکومت
کے قائم کردہ ادارے Vocational Guidence Bureau
سے مدد لے سکتے ہیں۔ جو خصوصاً آپ کی تعلیمی رہنمائی کے لئے قائم
کیا گیا ہے یہ ادارہ بمبئی میں دھوبی تلاؤ پر الفنسٹن ٹیکنیکل ہائی
اسکول کی عمارت میں اپنا کام کرتا ہے۔ بمبئی اور گرد و نواح کے
رہنے والے طالب علموں کو شخصاً معلومات فراہم کرتا ہے اور
بھارت کے دیگر شہروں اور غیر ممالک میں رہنے والوں کو بذریعہ
خط و کتابت صلاح و مشورہ دیتا ہے یہ ادارہ تعلیمی صلاح و مشورہ
کے لئے کسی طرح کی فیس نہیں لیتا لہذا نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے
تابناک مستقبل کے لئے اس ادارے کی خدمات سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ محض آرٹس، کامرس اور سائنس
کے چند مخصوص اور جانے پہچانے میدانوں میں ہی داخلہ نہ لیں۔
بلکہ ایسے شعبہ جات میں بھی دلچسپی لیں جہاں Demand
زیادہ ہے درج ذیل مختلف علوم و فنون کی ایک مختصر فہرست
دی جارہی ہے تاکہ اندازہ ہوسکے کہ آپ ان میدانوں میں جاکر
بھی نمایاں کام انجام دے سکتے ہیں۔

ایرونائیکل انجینئرنگ۔ سول انجینئرنگ۔ رورل انجینئرنگ
الیکٹریکل انجینئرنگ۔ میکانیکل انجینئرنگ۔ کیمیکل انجینئرنگ۔
میٹالرجیکل انجینئرنگ۔ مائننگ انجینئرنگ۔ انڈسٹریل انجینئرنگ
اگریکلچرل انجینئرنگ۔ پروڈکشن انجینئرنگ۔ ٹیکسٹائل انجینئرنگ
مرین انجینئرنگ۔ ریڈیو انجینئرنگ۔ ٹیلی ویژن انجینئرنگ
ٹیلی کمیونی کیشن " آٹوموبائل " ۔ سیلز انجینئرنگ
ایر کرافٹ مین ٹیننس انجینئرنگ " اوشنو گرافی۔

ٹیکنولوجی:-

کیمیکل ٹیکنولوجی، ڈیری ٹیکنولوجی، فوڈ ٹیکنولوجی
گلاس، ہینڈ سرامکس "، جوٹ "، لیدر "
آئل اینڈ فیٹ "، پیپر "، پینٹ اینڈ وارنش
پیٹرولیم "، پرنٹنگ "، شوگر "
ٹیکسٹائل "، پلاسٹک "، الکوحل "

اپلائیڈ فزکس، اپلائیڈ میتھمیٹکس، اینتھروپولوجی،
اسٹرونومی، بایوکیمسٹری۔ بوٹانی۔ کیمسٹری، کرمنولوجی اینڈ فورینسک
سائنس، جیولوجی، جیو فزکس، ان آرگینک کیمسٹری، میتھمیٹکس
انالیٹیکل کیمسٹری۔ میتھمیٹیکل فزکس۔ میتھمیٹیکل اسٹاٹسٹکس،
ملٹری سائنس، نیوکلیئر فزکس۔ نیوٹریکل میتھمیٹکس۔ فارماسیوٹیکل
کیمسٹری، فزیالوجی۔ سائیکلوجی۔ بیوکیمسٹری۔ زوولوجی۔ اسپکٹرو
اسکوپی۔ اوورسیئر (بلڈنگ اینڈ روڈ) ریفریجریشن میکانیکل ڈرافٹس مین
میوزیولوجی۔ آرکیالوجی، نیوٹریشن، ہائیجین اینڈ پبلک ہیلتھ۔
ان کے علاوہ میڈیکل میں آیورویدک، ایلوپیتھک یونانی
اور بایوکیمک

آرٹس و کامرس:-

چارٹرڈ اکاؤنٹنسی، کاسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹینسی،
انکم ٹیکس پریکٹشنر، سیلز ٹیکس پریکٹشنر، پرسنل سکریٹری۔ کمپنی
سکریٹری۔ بینک آفیسر، مینجمنٹ اکاؤنٹنسی، بزنس آرگنائزیشن
بزنس ایڈمنسٹریشن۔ مینجمنٹ ایگزیکیوٹیو، انڈسٹریل ایڈمنسٹریشن
اینڈ مینجمنٹ، پرسنیل مینجمنٹ، سیلز مینجمنٹ، ایڈورٹائزنگ
مینجمنٹ، فنانشیل مینجمنٹ، آفس مینجمنٹ، مارکیٹنگ مینجمنٹ
مارکیٹنگ ریسرچ۔ میٹریل مینجمنٹ، پرچیز آفیسر، ایکسپورٹ پروموشن
پریکٹیکل اینڈ اپلائیڈ سائیکلوجی، صحافت، رپورٹنگ، اسٹیج ریڈیو

ٹی۔ وی رائٹنگ کورس، پبلک ریلیشن۔ انٹرنیشنل لاء، فورین ٹریڈ (غیر ملکی تجارت) فورین افیئرس اینڈ ڈپلومیسی، فورین لینگویجز، فلم ٹورسٹ گائیڈ۔ قانون، لائبریری سائنس۔ سوشیل ورک۔ پبلک ایڈمنسٹریشن۔ کمپیوٹر، ہوٹل مینجمنٹ۔

جو لوگ میٹرک کے بعد یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کے لئے بھی نان یونیورسٹی کورسیز دستیاب ہیں مثلاً:

ایگریکلچر:۔

ایگریکلچر مارکیٹنگ، کاٹن ٹیکنولوجی۔ ڈیری ٹیکنولوجی فروٹ پریزرویشن۔ فروٹ ٹیکنولوجی، سوئل کنزرویشن ٹیکنک، ٹریکٹر ٹریننگ وغیرہ۔

آرکی ٹیکچر:۔

ٹاؤن اینڈ کنٹری پلاننگ، ٹاؤن پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ

آرٹ:۔

اپلائیڈ آرٹ، کمرشیل آرٹسٹ۔ ڈرامیٹکس، فائن آرٹ میوزیکل انسٹرومنٹ میکنگ وغیرہ۔

اے۔ وی ایشن:۔

ایئرہوسٹس، اسسٹنٹ فلائٹ پرسر۔ کمرشیل پائلٹ ایئرکرافٹ۔

مینٹیننس انجینئرنگ۔

ڈیفنس سروسیز

گورنمنٹ سروسیز

مرچنٹ نیوی:۔

ڈرائن، مرین انجینئرنگ

میونسپل اینڈ الائیڈ سرولسیز:۔

فائر فائٹنگ، میونسپل سرولسیز، پبلک ہیلتھ۔

ریلوے کیریئر۔

سوشل ورک

تعلیم و تدریس:۔

بیسک ایجوکیشن، کرافٹ ایجوکیشن۔ ایجوکیشن فار ہینڈی کیپڈ چلڈرن، فزیکل ایجوکیشن، پرائمری ایجوکیشن، پرائمری ٹیچنگ، سکنڈری ٹیچنگ، لنگا ٹیچنگ وغیرہ۔

ٹیکنیکل:۔

لوہار و انجن سازی۔ سیرامک، سینماٹوگرافی، فورمین شپ۔ اینڈ سپرویژن، امبرائیڈنگ، بک کیپنگ، ماچس سازی۔ گڑ اور کھانڈ سازی۔ ہینڈ میڈ پیپر۔ کھادی، نان ایڈیبل آئیل اور سوپ میکنگ۔ ولیج پوٹری (برتن سازی)

دیگر:۔

کیٹرنگ، ڈومیسٹک سائنس، ہیوم سائنس۔ فشریز، میٹرولوجی، ٹیلیفون ٹیلکس آپریٹر۔

اور جو لوگ کسی وجہ سے ثانوی تعلیم پوری نہ کرسکے ہوں اللہ عرف ۸ویں جماعت یا اس سے بھی کم پڑھ کر اسکول چھوڑ چکے ہوں انھیں بھی مندرجہ ذیل کورسیز میں داخلہ لینے کی اجازت ہے۔

ٹرینڈ مستری، ٹریسر، ہینڈ لوم ویونگ، کاٹن ویونگ (پاور لوم) کاٹن اسپننگ، اون ناٹنگ اینڈ ویونگ، آرٹی سن انڈسٹریل کیدر گڈس مینوفیکچر، آرٹی سن بنٹ ویر مینوفیکچر، لیدر ٹیکنولوجی، کرافٹ مین شپ کورس ان ریسٹورنٹ اینڈ کاونٹر سروس، کیننگ اینڈ فوڈ پریزرویشن، کمپوزنگ، پرنٹنگ، لیٹر پریس مشین ورک، لیتھو مشین ورک، خلاصی (سیلر، سکانو (کوارٹر ماسٹر) ٹیلرنگ اینڈ کٹنگ، ایمبرائیڈری اینڈ فینسی ورک۔

اس کے علاوہ دستکاروں اور کاریگروں کے لئے بھی تربیتی اسکیم جاری کی گئی ہے جہاں پر متعلقہ فن کے بارے میں تازہ ترین جانکاری مہیا کی جاتی ہے۔ فی الحال مندرجہ ذیل شعبوں میں تربیتی اسکیم کے تحت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

بلیک اسمتھی (لوہاری) کارپنٹری، الیکٹروپلیٹنگ، فیٹر، گرائنڈنگ وائرمین، مینٹننٹ، میکانک، مولڈر۔ پینٹر شیٹ میٹل ورکنگ، ٹرنر۔ وائر ریپیرنگ، ویلڈنگ (گیس الیکٹریکل پلمبنگ وغیرہ۔

آبائی پیشوں کے تحت بھی اس اسکیم میں مندرجہ ذیل شعبوں

میں تربیت دی جاتی ہے :-

گریڈ اینڈ سلور اسمتھی (سناروں کے لئے)، ان لے ورک (جڑاؤ کام) امبرائڈری اینڈ صندل ووڈ کارونگ، اسٹون کارونگ، انگریو نگ اور کارپیٹ ویونگ وغیرہ۔

علوم و فنون کی دنیا بہت ہی وسیع ہے یہ تو صرف ان علوم کی فہرست تھی جنھیں ہندوستان میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اگر خدا توفیق عطا کرے تو غیر ممالک میں بھی جا کر نت نئے علوم و فنون سے بہرہ ور ہو کر سارے عالم کو نفع پہنچایا جاسکتا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم صرف شکایت کرنے کی بجائے نیک نیتی سے، خلوص سے، لگن سے، محنت سے ان علوم و فنون کو حاصل کرکے نہ صرف اپنی زندگی کا معیار بہتر بنائیں بلکہ ساری مخلوق کو فیض پہنچائیں۔

نصف درجن زبانوں کا ماہر ایک مسلمان

مولوی عبدالرحیم گورکھپوری، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے ہم سبق تھے۔ کلکتے کے فورٹ ولیم کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر مارٹن کی صحبت میں رہ کر انگریزی اور لاطینی زبانیں سیکھیں۔ انگریزی میں تو ایسی استعداد پیدا کر لی تھی کہ ان کے متعلق مشہور تھا کہ پردے کی دوسری طرف وہ بٹھا دیئے جاتے تھے اور انگریزی میں وہ تقریر کرتے تھے اور اس جانب سے بڑے بڑے قابل انگریز بیٹھتے تھے اور مقرر کی شخصیت کی نسبت دھوکا کھا جاتے تھے۔ سب یہی کہتے تھے کہ یقیناً کوئی انگریز بول رہا ہے۔ در اصل ان کا لب و لہجہ حد درجہ فصیح اور مثل اہل زبان کے تھا۔ وہ لیٹن بھی بڑی فصاحت سے بولتے تھے، عربی، فارسی، ترکی، پشتو، اور دوسری ہندستانی زبانوں کے سلسلے میں بھی ان کا یہی حال تھا۔ تحفۂ عالم کے مصنف نے ایک ایسی محفل کا حال لکھا ہے کہ جس میں بیک وقت کئی عرب، ایرانی انگریز اور افغانی جمع تھے مگر مولوی عبدالرحیم عرب سے بالکل عرب کی طرح ایرانی سے ایرانی لب و لہجے میں، انگریز سے ٹھیک انگریز کی طرح اسی کی زبان میں باتیں کرتے تھے اور ساری محفل مولوی عبدالرحیم کی اس غیر معمولی ذہانت کی بنا پر محو حیرت تھی۔ ریاضی، فارسی، عربی اور انگریزی کی کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اپنی غیر معمولی ذہانت کی بنا پر دہریہ مشہور ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کو آج تک عبدالرحیم دہری لکھا جاتا ہے۔ سر سید احمد خان سے قبل جو مسلمان علماء انگریزی زبان کے طرف دار بنے ان سب میں مولوی عبدالرحیم مقدم ہیں۔

خالد عرفان

گہری اور مضبوط بنیادیں بلند اور مستحکم عمارتیں

ہندوستانی مسلمان ایک منفرد اکائی ہیں۔ ان کی اس انفرادیت میں ان کے مخصوص ماضی کا بھی اور اسی قدر مخصوص حال کا بھی بڑا ہاتھ ہے عموماً ماضی کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ شاندار ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ محض مفروضہ ہو لیکن تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب سے ہندوستان میں داخل ہوئے خواہ ان کی حیثیت ایک جابر سلطان کی رہی ہو یا خدا ترس درویش اور مردم شناس صوفی کی، ان کے ارد گرد دلگیر اور دلنواز عظمت و شوکت کا ایک ہالہ بنا رہا۔ اس عظمت و شوکت میں تاجرانہ شان کے ساتھ ساتھ رحمانی جود و کرم کے جلوے بھی شامل رہے ہیں۔ تاریخ پارینہ کے اوراق الٹنے کے بجائے میں یہاں محض چند ایسے اثرات و نتائج کی نشاندہی کرتے ہوئے آگے بڑھوں گا جن سے مسلمانوں کا حال متاثر ہوا ہے بلکہ جس کے پرتو سے مستقبل کا خاکہ بھی روشن ہو سکتا ہے۔

ایک محلے سے دوسرے محلے میں جا بسنے سے ایک فرد اور خاندان کو جتنے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل (اور گمبھیر بھی) مسائل سے ایک قوم کو اس وقت دوچار ہونا پڑتا ہے جبکہ وہ بوجوہ نقل مکانی کر کے کسی دوسرے ملک میں جا بستی ہے ان مسائل کی سنگینی اور بڑھ جاتی ہے جب کہ ایک طرف خود ان کا تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ بے حد گراں قدر ہو اور دوسری طرف مقامی تہذیب اور ثقافت بھی اسی قدر مالدار ہو۔ یہ سنگینی اور شدت اختیار کر جاتی ہے جبکہ دونوں قوموں کو اپنے اپنے اثاثہ کا شدت کے ساتھ احساس بھی ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ یہی کوشش کریں کہ دوسرا اپنے رنگ میں رنگ جائے۔

مسلمان ہندوستان میں چاہے فاتح کے روپ میں آئے ہوں۔ حاکم کی کرسی پر براجمان رہے ہوں یا ان کے اثر و رسوخ کی اشاعت میں بے تاج کے بادشاہ صوفی اور فقراء کا حصہ رہا ہو۔ موجودہ ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تعمیر میں دو مختلف اور مخالف نظریاتی اور عملی تہذیبوں کے درمیان تصادم و ٹکراؤ کا بڑا ہاتھ رہا ہے، جس کے نتیجہ میں ایک ایسی گنگا جمنی تہذیب یہاں مروج ہو پائی تھی جس میں ایک طرف مسلمانوں کی شان و عظمت کے رنگ جھلک رہے تھے تو دوسری طرف مقامی تہذیب کی روایاتی بیچ رنگیوں کے رنگ بھی جلوہ گر تھے۔ ممکن ہے اس ملی جلی تہذیب کے زیر اثر مسلمان اور مقامی باشندے سربسجود ہو کر ایک مثالی معاشرے کے قیام کا باعث بن سکتے تھے کہ برطانوی سامراجیت کے شکنجہ نے ان کو کس لیا اور نتیجہ میں نہ صرف اس تہذیب کی ہیئت بگڑ گئی بلکہ ان اقوام کو جو ایک نئی ہندوستانی تہذیب کے فعال معمار بن رہے تھے اپنے وجود اور اہمیت کا اس طرح اندازہ ہونے لگا کہ ان میں انانیت، خود پرستی، خود غرضی اور نفرت نے اپنا ڈیرا جما لیا۔ ان منفی جذبات کے زیر اثر جس طرح کا بگاڑ معاشرہ میں پیدا ہو سکتا تھا، اس کے نتیجہ میں نہ صرف ملک تقسیم ہوا، اپنوں سے اپنے بچھڑ گئے بلکہ خود آج ایک ملک میں بسنے والی اقوام کے درمیان بھی وہ باہمی ربط اور بھائی چارگی رہی ہے نہ ان میں قومیت ہی کا وہ تصور رہا ہے جو ایک جغرافی اکائی سے مربوط ہونے کی وجہ کسی خطۂ زمین کے باشندوں میں فطرتاً نہیں تو خارجی عوامل کے زیر اثر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا عوامل نے ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی اسی قدر متاثر کیا جس قدر کہ دوسری اقوام کو لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو علیحدہ پسندی اور غیریت کے احساس نے۔ جو اس وقت کے ملکی حالات کا تقاضا بنا دئے گئے تھے مسلمانوں کو، بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ اس بے پناہ نقصان کے باعث بھی ہندوستانی مسلمان اپنے طور پر آج ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں کے داخلے کے بعد سے ہی ترقی پذیر عناصر کا ساتھ دینے کے لئے جو انفرادی اور اجتماعی کوششیں کی گئیں اس سے غفلت برتنے یا مخالفت کرنے کی وجہ بھی مسلمانوں کو بحیثیت قوم جو نقصان اٹھانا پڑا ہے اس نے بھی ان کو ایک امتیاز بخشا ہے۔

ایک کثیر اقلیت ہونے کے ناطے آج ملک کی ترقی اور خوشحالی میں وہ ایک بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں یہ حیثیت بھی ان کا انفرادیت عطا کرتی ہے۔

مسلمانوں کے مسائل کے تعلق سے سوچتے ہوئے ہم کو مسلمانوں کی اس انفرادیت کو نظر انداز نہیں کرنا ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

انفرادیت کے ساتھ ہی ہم نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک اکائی سے بھی تعبیر کیا ہے۔ مسلم آبادی پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ علاقہ واری طور پر ہر صوبہ کے تقاضے اور ضروریات علیحدہ ہیں۔ اسی طرح ہر ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل بھی علیحدہ ہو سکتے ہیں خصوصاً اس لئے بھی کہ حکومت کی سطح پر بعض ریاستوں میں مسلمانوں کو بعض ایسی مراعات حاصل ہیں جو دوسری ریاستوں میں ان کو نہیں ملی ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود عام طور سے مسلمانوں کو جن مسائل سے دوچار ہونا ہے اور ان کے حل کے لئے جس طرح اجتماعی کوششیں کرنی ہیں اس سے ان کو ایک اکائی متصور کرنا ہی زیادہ صحیح اور مناسب معلوم پڑتا ہے۔ اور خود مرکزی حکومت بھی جب کبھی مسلمانوں سے منسوب کئے جانے والے مسائل کا ذکر کرتی ہے تو کسی علاقہ تک محدود کرنے کے بجائے کلی طور پر ملک کی سطح پر ہی سوچتی ہے اس طرح ان کے اکائی ہونے کی حیثیت ایک طرح سے دستوری بن جاتی ہے۔

آج جتنے بھی مسائل سے مسلمان دوچار ہیں ان کا بالراست بھی اور بالواسطہ بھی تعلق اس جذبۂ غیریت اور علیحدہ پسندی سے ہے جو سیاسی اغراض و مقاصد کی خاطر ان میں پیدا کر دیئے گئے تھے اور جو آج مسلمانوں کی ذات میں مستقل بن گئے ہیں

سیاست سے ہٹ کر بھی مسلمان اپنے آپ کو مذہب کے اعتبار سے ایک منفرد اکائی منوانا چاہتے ہیں اس سے پہلے کہ دیگر عوامل پر نظر ڈالی جائے مسلمانوں کی مذہبی حیثیت پر اجمالاً غور کر لینا مناسب ہوگا۔

آج دنیا میں مذہب کا تصور بالکل بدل گیا ہے۔ مذہب کو رجعت پرستی اور قدامت پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کو فی زمانہ غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جن اقدار کو آج بھی اخلاقی اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ قطعی طور پر مذہبی اقدار ہی ہیں۔ ممکن ہے نام بدل دیئے گئے ہوں لیکن ایک فرد اور افراد کے ذریعہ ایک قوم کی صالح تعمیر اور تربیت کے لئے مذہبی اقدار کو قبول کرنا، اپنانا اور ان کو مروج کرنا آج بھی اسی قدر لازمی اور ناگزیر ہے جتنا پہلے تھا یا آئندہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے مادی طور پر آج کا انسان اس قدر ترقی یافتہ اور خود مکتفی ہو گیا ہے کہ اس کے لئے آتما کو پرماتما سے مربوط کرنا ضروری نہ ہو۔ روح کو جگا کر خالق حقیقی کی ذات میں گم کر دینا محض زبانی دعوے ہوں، لیکن بذات خود ان مادی وسائل کو منصفانہ اور مشترکہ طور پر برتنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بھی ان اخلاقی اقدار کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی جن کے ڈانڈے مذہبی اقدار سے ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے مذہب کے نام پر مذہبی پیشوا مذہب کے پیروؤں کو لوٹ کھسوٹ رہے ہوں، اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہوں، لیکن اس بے جا اور غلط استحصال کے لئے مذہب کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا آج کا ہندوستانی مسلمان مذہبی پیشواؤں کے اس جابرانہ رویے سے کہیں زیادہ ایک منظم اور باترتیب استحصال کا شکار ہے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک مذہب کے صحیح مفہوم سے ہر مسلمان بچہ روشناس نہیں ہو جاتا۔ اس کے دل اور دماغ علم کے نور سے منور نہیں ہو جاتے اور مالی طور پر وہ مستحکم اور خود کفیل ہو کر اپنے آپ کو نہیں پہچان لیتا ممکن ہے یہ بات بھی صحیح ہو کہ اس طرح کی روشن ضمیری اور علم دوستی کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر بیشتر مولوی اور مُلّا عوام کو جاہل ہی بنا رہنے دیں اور ہر ایسے اقدام کی باہمی ملی بھگت سے مخالفت کریں جو علم کی روشنی کو بلا تفریق چاروں طرف پھیلانے کے لئے اٹھایا جائے ممکن ہے یہ بھی ایسی کوئی غلط بات نہ ہو کہ ریب ملاؤں کی بیخ کنی کے لئے کسی اتاترک کے طریق کار ہی کو اپنایا جانا ہو لیکن میری اپنی دانست میں آج کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ایسے طبقہ کو جس کو دانشور (Intellectuals) کہا جاتا ہے اور جو محض اپنے مضمون کی حد تک پڑھے لکھے نہ ہوں بلکہ جن کا شعور جاگ رہا ہو آنکھیں کھلی ہوئی ہوں اور جو اپنے ارد گرد کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں اور ترقیوں کی جانکاری رکھتے ہوں یہ امر ناممکن نہیں ہے کہ وہ مذہبی پیشواؤں کی ایسی کوششوں کا مقابلہ ہر محاذ پر کریں۔ اور اپنے پچھڑے ہوئے پسماندہ اور جاہل عوام میں صحیح مذہبی شعور پیدا کریں اور علم کی روشنی سے ان کے

ذہنوں کو جلا بخشیں۔ آج کے دور کو مقابلہ کا دور (Competitive Age) کہا جاسکتا ہے تعلیم، محنت اور اخلاق اقدار اس دور میں آگے بڑھنے، مقام بنانے اور ایک قابل احترام زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

صحیح مذہبی شعور کے ایک مفہوم کو سمجھنے میں، ممکن ہے، درج ذیل واقعات سے کچھ مدد ملے۔

معدودے چند پختہ ذہنوں کو چھوڑ کر ایک عام مسلمان دنیاوی اور دینوی دونوں نقطہ نظر سے اپنے آپ کو دیگر افراد عالم سے برتر اور بہتر سمجھتا ہے ایسا کوئی تصور اسلام جیسے حرکی اور حقیقت پرست و حقیقت پسند مذہب میں موجود نہیں ہے یہاں تو اعمال پر ہی سزا و جزا کا انحصار ہے محض زبانی طور پر کلمہ پڑھ لینے یا مسلمان کے گھر میں جنم لینے یا ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہنے سے کوئی بزرگ، برتر یا قابل احترام نہیں بن جاتا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ ہمیشہ عبادت گزار اپنی نجی اور دنیاوی زندگی میں نہایت کریہہ اخلاق کے حامل غلط قسم کے افراد ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست کی بہن کا نکاح کچھ اسی طرح کے ایک فرد کے ہوا تھا، جو نہ صرف پنج وقتہ نمازی ہیں بلکہ اشراق و چاشت اور تہجد کا اہتمام بھی کرتے ہیں سرکاری ملازمت کے باوجود حج پر جاتے ہیں اور اٹھتے بیٹھتے ان کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے اور زبان پہ نام خدا ہوتا ہے۔ ان کی بیگم جس قدر شریف تھیں یہ اسی قدر معاملات میں آلٹے تھے ان کی بیگم مدرسہ میں ملازم تھیں وہ بیگم کی پوری تنخواہ ہر مہینہ کی یکم کو ضبط کر لیا کرتے تھے۔ بیگم رقم حوالہ کرنے کے لئے تیار تھیں لیکن اس کا کچھ حصہ اپنے پاس خیرات کے لئے روک لیتی تھیں۔ اس پر شوہر نامدار ان کو سمجھاتے "نجات اور جنت حاصل کرنے کے لئے محض عبادت کافی ہے خیرات کا درجہ عبادت سے بلند نہیں، اس رقم کو ہم اپنے بچوں کے لئے ایک بینک میں جمع کرسکتے ہیں حساب ہم دونوں کے نام (Joint account) کی صورت میں ہے لیکن اس صورت میں صرف تمہارے روپے جمع ہوتے رہیں گے روزمرہ کی ازدواجی زندگی سے قطع نظر ہوا یہ کہ ان کے بے جا اور بیجا مطالبات کی تکمیل اور ظالمانہ برتاؤ نے بیگم کی جان لے لی جبکہ ان کی گود میں ایک ننھے پھول کر کھلے چند مہینے ہی ہوئے تھے۔ بچہ اپنے نانا نانی کے یہاں پل رہا تھا۔

پھل پھول رہا تھا۔ باپ نے پہلے تو اپنی مرحومہ بیوی کے زیورات ہتھیانے کی کوشش کی، پھر اس روپے پر اپنا حق جتانا شروع کیا جو مرحومہ کو اپنی ملازمت کی ابتدا میں نکالی گئی انشورنس پالیسی پر ملنا تھا اور جس میں Nominee ان کے والد بزرگوار ہیں۔ یہ مسئلہ تو آسکل امارت شرعیہ کے سامنے زیر بحث ہے اب ان کے پدرانہ محبت نے جوش ارا تو پولیس میں جھوٹی رپورٹ لکھائی کہ نانا نانی بچہ کو چھین لے گئے ہیں۔ معاملہ عدالت تک پہنچا دیا گیا جہاں خدا کے نام پر سچ بولنے کی قسم کھاتے ہوئے صریحاً جھوٹ بولا گیا کہ بچہ ابتدا ہی سے باپ کے پاس تھا نانا نانی چھین لے گئے۔ ان کے اس بیان کی تصدیق ان کے ایک قریبی رشتہ دار نے کی جو نام نہاد پرہیزگاری میں ان سے دس قدم آگے تھا۔ عدالت میں جب موصوف بطور گواہ حاضر ہوئے تو حاضرین حیران تھے کہ ان کی گز بھر لمبی داڑھی کا کیا بنا؟ پوچھا، تو سنا ہے دوستوں کو جواب ملا: "عدالت میں گواہی (جھوٹی!!) ناجائز ہے داڑھی کے ہوتے سرکاری عدالت میں کیسے آیا جاسکتا ہے!" اب پھر سے وہ مومن باریش بن گئے ہیں۔ اس طرح کی دوغلی چال، ریاکاری اور دوہری زندگی ایک عام مذہبی انسان کی روزمرہ زندگی بن چکی ہے جب کہ اپنے آپ کو برتر و افضل قرار دینے کے لئے تو مجسم اخلاق بننا ہے کہ اس دار مکافات میں دعوؤں سے اہم اور مقدم تو اعمال و افعال ہیں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ سے مولوی کے ذہن کے رخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مجھے چند سال پیشتر ایک بیرونی مقام کے ہائر سکنڈری اسکول میں منعقدہ سیرت نبوی کے ایک جلسہ میں تقریر کی دعوت دی گئی تھی انگریزی زبان میں اسوۂ حسنہ اور حیات طیبہ بیان کرتے ہوئے قرآنی حوالے کے ساتھ میں نے کہا تھا کہ حضور اکرم ہمارے آپ جیسے ہی ایک فرد تھے اور جس امر نے آپ کو ممتاز و موقر بنایا وہ وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ اسی وحی کے ذریعہ سے آپ نے پیغام الہٰی کو ہم تک پہنچایا۔ آپ اس پیغام کے Messanger تھے وغیرہ وغیرہ۔ میں تو تقریر کرکے چلا آیا لیکن ایک عرصہ کے بعد مجھے یہ معلوم کرکے بہت دکھ ہوا کہ مقامی مسجد کے امام صاحب نے Messanger اور حضور صلعم کے عام انسانوں جیسے ہونے والی بات پر گرفت کرکے کوئی ڈیڑھ مہینہ تک ہر جمعہ کے خطبہ میں اسی موضوع کے تعلق سے دھواں دھار تقریریں کیں اور انگریزی زبان میں سیرت

پاک بیان کرنے کو غلط کہا: — ان کی اصل گرفت انگریزی لفظ پر تھی جس کو ان کی دانست میں حضور اکرم کے ساتھ منسوب کرنا گستاخی اور غلط بیانی ہے اور گمراہ کن بات ہے۔

ایک عام مولوی اور ملا کی اس کوتاہ نظری، بے علمی، بے عملی اور بے شعوری کی وجہ اس طبقہ کو بالکلیہ صرف برائیوں کا حامل نہیں قرار دیا جا سکتا اگر اس طبقہ کے افراد اور مذہب سے بے تعلق افراد کے درمیان صرف اعمال سیاہ کے تعلق سے تناسب نکالا جائے تو موخر الذکر افراد ہی سبقت لے جائیں گے۔ اس کے باوجود یہاں سوال یہ ہے کہ آخر دس سے پچاس فیصد تک بھی یہ لوگ نیکی کی آڑ لے کر ذاتی مفاد کی خاطر کیوں ایک طرف اخلاقی اقدار کو پامال کرتے ہیں؟ اسی وجہ سے ان کا برائیوں میں الجھ جانا قابل گرفت ہی نہیں بلکہ قابل نفرین بن جاتا ہے۔ اس لئے محض ان کی کوتاہیوں، کمزوریوں اور برائیوں کی بار بار سخت سے سخت الفاظ میں نشاندہی کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ایک مثبت رویہ اختیار کرنا ہے جس سے ان افراد کی اصلاح بلکہ دوسری سطح پر ان کی شخصیت کی تعمیر ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے دو طریقے اپنائے جا سکتے ہیں۔ اوّل تو مسلمانوں کا دانشور طبقہ ان کے ہر رجعت پسند اقدام کا ڈٹ کر مقابلہ کرے دوم یہ کہ میری دانست میں دراصل ان افراد کی یہ حالت ہمارے مذہبی مدرسوں کے نظام تعلیم کا ایک کھوٹ ہے۔ برسوں کا پرانا نظام تعلیم آج بھی اسی پرانے اور روایتی طریقے پر قائم ہے جو صدیوں سے چلتا رہا ہے۔ بدلتے زمانہ کے بدلتے اقدار اور پیمانوں کے تحت آج تعلیمی نظام میں بار بار تبدیلی اور ترمیم ہوتی رہتی ہے اسی طرح کے ترمیم کی ان کے ہاں کے سلیبس میں سخت ضرورت ہے اس کے ساتھ آج ہونے والی سائنسی ترقی کی کم از کم بنیادی جانکاری بھی ان کے لئے لازمی بنانا ہے۔ ہر مکتب کے سلیبس میں جدید علوم کی باقاعدہ شمولیت سے نہ صرف مولوی کے ذہن میں وسعت کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے بلکہ جدید علوم سے آگاہ ہو کر وہ آج کے زمانے کے ذہنوں کو آج کے تقاضوں کے تحت بھی روشنی بخش سکیں گے۔ جس طرح جدید علوم کے طالب علم کے لئے بنیادی مذہبی معلومات نہایت اہم ہیں اسی طرح ایک مولوی کے لئے بھی جدید علوم کا پڑھنا ناگزیر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی اقوام کی شناخت بھی ان کے مذہب سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی اپنے مذہب کے ذریعہ ہی پہچانا جاتا ہے لیکن مذہب کے اس رول کے علاوہ مسلمان ایک ایسی قوت بھی بن سکتا ہے جو ان کو باہمی اکٹھا رکھ سکتی ہے لیکن افسوس کہ اتفاق اور یک دلی کی ضامن اس قوت کو ابتدا ہی سے اپنے ملک میں باہم کشمکش اور اختلاف کا ذریعہ بنا کر آپس میں سر پھٹول ہی نہیں کیا جاتا رہا بلکہ نوبت خون ریزی اور جان تلفی تک پہنچی ہے اور یہ سلسلہ ہے کہ سنّی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد، اسماعیلی، خارجی، دیوبندی اور بریلوی اسی طرح کے تمام فرقوں کو بکلیت مل کر ایک ہی جھنڈے تلے سب کا جمع ہونا ناگزیر ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بات مجذوب کی بڑ معلوم ہو لیکن اپنے تمام فروعی اختلافات کو مٹا کر اکائی بن جانے سے نہ صرف جان و مال کی حفاظت ہو سکتی ہے بلکہ ایک باعزت زندگی کی ضمانت بھی مل جاتی ہے۔

مذہب کی حقیقی سپرٹ کے شعور اور عمل کے ساتھ ملک میں ایک باوقار اور خود مکتفی زندگی گزارنے کے لئے دو امور کی طرف فوری اور مکمل توجہ دینی لازمی ہے ایک کی طرف تو میں نے ضمناً اوپر اشارہ کر دیا ہے یعنی بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم اوپر اٹھنے کے لئے تعلیم ایک لازمی کوالیفکیشن ہے حالانکہ فی زمانہ مسلمان تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ اور ان میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب آزادی سے پہلے کی بہ نسبت بڑھ رہا ہے لیکن عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اکثریت اپنے بچوں کے لئے تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتی ہے یا ان کے پاس تعلیم کا ایک ناقص تصور موجود ہوتا ہے۔ خط لکھ لینے اور اخبار پڑھ لینے کی حد تک پڑھ لینے کو تعلیم کہتے ہیں یا محض قرآن پاک کو کسی ملا کے پاس ناظرہ پڑھ لینے کو تعلیم کہتے ہیں۔ اور نہ ہی تعلیم کو محض روزی کا وسیلہ سمجھ کر حاصل کرنا ہے۔ ترقی کی دوڑ میں شانہ بشانہ چلنے کے لئے ہی نہیں بلکہ آگے نکلنے اور اپنی شخصیت کی صحیح نشو و نما کے لئے بھی تعلیم لابدی اور ناگزیر ہے اور اس کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ علم کی دولت کے ساتھ مادی

طور پر بھی جب تک مالی دولت نہیں حاصل ہو جاتی نہ ہی اپنی دنیا سدھر سکتی ہے نہ دین، مسلمانوں کے دین کی طرف توجہ نہ دینے یا کم توجہ دینے کے دیگر کئی اسباب ہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ یا تو مالی طور پر اپنے بچوں کی تعلیم کا بوجھ اٹھانے سے کہیں زیادہ اپنے بچے کو چھوٹی عمر ہی سے برسر روزگار لگا دینا افضل سمجھتے ہیں یا وہ اپنے بچے کو اعلیٰ یا صنعتی تعلیم دلانے کی قدرت نہیں رکھتے اس طرح ان کی مالی کمزوری دیگر تمام کمزوریوں کا باعث بنتی ہے قوم کے نوجوان یقیناً اس کی ریڑھ کی ہڈی ہیں جس کی مضبوطی پر ہی قوم کی توانائی، مضبوطی اور استحکام کا انحصار ہے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرنے والے افراد کی اقلیت اپنا پیٹ کاٹ کر ہزار تکلیفیں اٹھا کر اپنے بچوں کو تعلیم کی دولت سے مالامال کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ لیکن اس فرض کو محسوس کرتے ہوئے بھی مجبوری کے عالم میں دل مسوس کر رہ جانے والوں کی اور تعلیم کی اہمیت کو بالکل نہ جاننے والوں کی تعداد بھی خاصی کثیر ہے اس امر کی طرف مسلمانوں کو مکمل ہی نہیں فوری توجہ دینی چاہیئے اس معاملے میں ہمارے صاحب حیثیت اور مالدار احباب پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے ایک طرف تو وہ ایسے نوجوانوں کا ہاتھ پکڑ سکتے ہیں اور قوم میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب بڑھا سکتے ہیں دوسری طرف وہ ان تعلیم یافتہ افراد کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دے سکتے ہیں اس کے لئے ایسے ٹرسٹ قائم کئے جا سکتے ہیں جن کے ذریعہ صحیح تعلیم و تربیت کی سہولتوں کے ساتھ ایک پائدار مستقبل کی تعمیر کے سامان بھی بہم پہونچائے جائیں۔ اس ضمن میں ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ملازمتوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ ایسے پیشوں کو اختیار کریں جن میں نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں بلکہ ایک مرتبہ اپنے گھر کا چراغ جل اٹھنے کے بعد اس سے دوسرے چراغ بھی جلائے جا سکیں۔ آج بھی سابق کی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ تجارت، صنعت اور زراعت میں ترقی کے روشن امکانات نہ صرف موجود ہیں بلکہ دگنے اور تگنے ہو گئے ہیں۔ ابتدائی سرمایہ کی صورت میں پیدا ہونے والی عملی مشکل کا حل یوں نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت اور بینک سے ملنے والے قرض کی سہولت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور نہیں تو محولہ بالا ٹرسٹوں سے مدد لی جائے۔

ممکن ہے میری اس تجویز کو محض خیالی یا کتابی سمجھا جائے لیکن اگر افراد اور قوم کو بحیثیت منفرد اکائی کے آج کے سماج میں کوئی مقام پانا ہے تو ایسے چھوٹے چھوٹے مگر فعال اور باعمل یونٹوں کے قیام سے ہی کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ میرا یہ مشاہدہ ہے کہ کسی خاص مقصد کو (چاہے وہ غلط ہو کہ صحیح) لے کر جب بھی چند "دیوانے" آگے بڑھے ہیں وہ ضرور اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے ہیں بشرطیکہ وہی خلوص قائم رہا ہو جس سے کام کا آغاز ہوئی تھی اور آگے چلکر روپیہ کے بل بوتے پر وہ آسمان پر نہ اڑنے لگے ہوں۔

زمانہ کے اسٹیج پر مسلمانوں کو ایک خود مکتفی، خوشحال اور ترقی پذیر معاشرے (قوم) کے روپ میں لا کھڑا کرنے کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں میں ہمارے قومی ادارے نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں۔ ایسے اداروں میں مقامی انجمنوں سے لے کر ریاستی اور کل ہند ادارے بھی شامل ہیں ان اداروں کے مقاصد اور کام سے قطع نظر اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن بڑے بڑے مقصدوں کے لئے اتنے ہی بڑے دعوؤں اور شاندار طریقے سے کام کی ابتدا کی جاتی ہے چند ہی دن بعد دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے یا نہیں تو قوم کے نام پر ادارے کو چند گنے چنے افراد اپنے ذاتی مقاصد اور مفاد کے لئے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ایسی کمزوریوں کے علاوہ ایک بہت بڑی کمزوری جو میں نے اپنے بچانوے فیصدی قومی اداروں میں دیکھی ہے وہ ان کے سربراہوں، عہدہ داروں اور کارکنوں میں شامل افراد سے متعلق ہے۔ ان تمام آسامیوں کے لئے چن چن کر ریٹائرڈ افسروں کو ڈھونڈا جاتا ہے ممکن ہے ایک پچپن سالہ سے لے کر ساٹھ سالہ افسر کو دفتری کام کا بے حد تجربہ ہو، وہ بے حد مقبول آئی اے۔ ایس افسر رہے ہوں اور ان کے پاس ایسی مصروفیتوں کے لئے وقت کی کمی نہ ہو، لیکن ایک مرتبہ کرسی سنبھالنے کے بعد قومی اداروں کے دفتر اکثر ریٹائرڈ افسروں کی وقت گزاری کے کلب بن جاتے ہیں اور اگر کبھی بھولے سے برائے نام کوئی کام ہو گیا تو قوم پر کئے گئے اس احسان کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ اس کو خاندانی سند

کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

قوم اور نوجوانان قوم کے لئے کام کرنے کے لئے تھکے ماندے ذہنوں اور کمزور جسموں کے بجائے جوش ولولہ اور نئے عزائم سے بھرے نئے خون اور ہیجان خیالات کے حامل باحوصلہ اور باصلاحیت نوجوانوں کو ان اداروں سے منسلک کرنا بے حد ضروری ہے۔ اگر کارکن کی حیثیت سے ان نوجوانوں کو معقول مگر یقینی تنخواہ پر لگایا جاسکے تو نہ صرف ان سے خوب اور بہتر کام لیا جاسکتا ہے بلکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بے روزگاری کا مسئلہ بھی معقول اور جائز طور پر ہم حل کرسکتے ہیں۔ خود ان بوڑھے ریٹائرڈ افراد کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ وہ تو دنیا کے مزے لوٹ چکے ہیں۔ ان کے پیچھے تجربات، واقعات اور مشاہدات کی ایک دنیا ہے۔ اب اسی طرح کی ایک نئی دنیا سے واقفیت نئے خون کے لئے بھی ضروری ہے ویسے پس منظر میں رہ کر قابل احترام بزرگ وقتاً وقتاً اپنی پختہ رائے اور گراں قدر مشوروں سے اُن نوجوانوں کو نوازتے رہ سکتے ہیں جو نہ صرف ناتجربہ کار اور خام ذہنوں کے لئے نشان راہ بلکہ مہمیز ثابت ہوسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان بزرگوں کے ہاتھ ہی میں ہمارے قومی اداروں کی باگ ڈور تھما دینا نہ صرف غلط طریقۂ کار ہے بلکہ اپنی ترقی کی رفتار کو گھٹانے کے مترادف ہے۔

ان ہی قومی اداروں میں ایسا قومی اثاثہ ہے جس کو برباد کیا جارہا ہے جس کا استحصال کیا جارہا ہے جس پر بھی سابق سرکاری ملازموں یا غیر سرکاری بوڑھوں کی اجارہ داری ہے اور جہاں ایک سرکاری محکمے کے باقاعدہ قیام کے باوجود حکومت کی سطح سے لے کر شخصی سطح تک صرف دھاندلی ہی دھاندلی مچی ہوئی ہے۔ ایک لوٹ ہے جس میں سرکاری عہدہ داروں سے لیکر غاصب اجارہ دار تک برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ محکمہ ہے اوقاف کا، اور قومی اثاثہ ہے وہ بے حد و حساب جائداد جو کسی مسجد، درگاہ یا امام باڑہ سے متعلق ہے۔ ایسی جائداد کے وقف ہونے کی بناء پر اس پر کسی فرد یا افراد کی ذاتی ملکیت ثابت نہیں ہوتی لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یا تو ایسی جائداد پر کوئی فرد سانپ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھا ہے یا اس پر ایسے افراد حاوی ہیں جن کی نظروں سے اس جائداد کی آمدنی کا اصل مقصد بالکل اوجھل ہوگیا ہے۔ بعض جگہ اس کے نگہبان اپنا فرض اس طرح ادا کررہے ہیں کہ یا تو ملک فروخت کردی گئی ہے۔ رہن رکھ دی گئی ہے یا اس کو بیٹہ پر اٹھا دیا گیا ہے یا سازشوں کے درمیان اس کو غیر مستحق ہاتھوں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ بعض اور جگہ ملکیت کے بے شمار خود ساختہ دعویدار آپس میں اس طرح الجھ گئے ہیں کہ ان کے دعوے برسوں سے خود وقف بورڈ یا ریاستی عدالت میں چل رہے ہیں اور یہ سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا۔ بالفرض کہیں واقعی ٹرسٹ کی آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جارہا ہے تب بھی اس کا صرف صحیح امور کی بجائے ایسے غلط طور پر ہورہا ہے کہ جس سے قوم کے غریب اور ہونہار نوجوان تو ایک طرف خود ٹرسٹ سے متعلق خاندان کی صحیح ترقی ہورہی ہے نہ کفالت۔ ٹرسٹ سے تعلق رکھنے والے جاہل اور کاہل افراد کا انخلا تو ضروری ہے ہی لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ حکومت کی جانب سے تشکیل دیئے گئے ٹرسٹ بورڈ میں بھی سرے سے صحیح، مخلص، دردمند اور کام کرنے والے افراد نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو ان کی تعداد اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ اپنے طور پر کچھ نہیں کرسکتے۔

بیشتر ریاستوں میں وقف بورڈ کی رہنمائی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری وہاں کے کابینہ کے کسی مسلم وزیر کے سپرد ہوتی ہے اور اس مسلمان وزیر کو قوم سے زیادہ اپنی کرسی اور نوجوانوں کے مستقبل سے زیادہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی آئندہ زندگی کی فکر ہوتی ہے۔ اوّل تو عزت مآب وزیر وقف کے کسی معاملہ میں ذاتی دلچسپی نہیں لیتے اور مکمل ذمہ داری اپنے کسی سکریٹری کو سونپ دیتے ہیں اور اگر کچھ دلچسپی کبھی لیتے بھی ہیں تو اپنے مفاد کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ریاست اور ضلع کی سطح پر جو وقف بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے وہاں پھر سے چیرمین کی حیثیت سے کسی سابق افسر کو نامزد کیا جاتا ہے جس کی خصوصیات یہ ہوتی ہیں کہ اوّل وہ مسلمان ہوتا ہے۔ دوم وہ حکومت اور وزیر با تدبیر کا بیحد وفادار ہوتا ہے سوم اس کو کام سے زیادہ اجلاس اور دوروں کا بھتہ جمع کرنے کا فکر

ہوتی ہے۔ جن پیروں کے ارد گرد جو مجمع لگے رہتے ہیں ان کا بھی کچھ یہی حال ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو وقف بورڈ کے قیام، اہمیت اور فرائض بلکہ خود ان کی ذمہ داریوں کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ ان میں سے کچھ بیشتر سابق سرکاری عہدہ دار ہوتے ہیں یا ایسے سرمایہ دار اور بیوپاری جن کی وفاداریاں "غیر مشکوک" نہیں ہوتی ہیں اگر نام کی خاطر کسی عالم یا جانکار فرد کو کوئی مقام ملتا ہے تو وہ بے چارہ اکیلا ہوتا ہے اور اس کی آواز "واحد" ہوتی ہے ملک بھر میں۔ موجود صرف درگاہوں سے وابستہ جائداد کے صحیح استعمال سے اس قدر آمدنی ہوسکتی ہے کہ اس سے ملک بھر کے غریب مسلمانوں کے تمام مسائل با آسانی اور منظم و مترتب طریقہ سے حل کئے جاسکتے ہیں۔

پچھلے رمضان کی بات ہے میں نماز جمعہ کی یہاں کے ایک محلہ کی مسجد میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ نماز کے بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے نمازیوں سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لئے ٹھہر جائیں۔ ایک بچہ ان کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہے پھر انہوں نے دس گیارہ برس کے ایک لڑکے کو پیش کیا۔ اور میں اس ننھے مقرر کی سلاست و بلاغت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ قرآن پاک کی آیتوں، حدیثوں، اور دور اولیٰ کے واقعات سے زیادہ فارسی اور عربی کے الفاظ کے بڑی حد تک صحیح استعمال کے ساتھ اس لڑکے نے جو تقریر کی اس کا ماحصل تھا اللہ کے نام پر خیرات کرنے والے کا مقام اللہ اور اس کے رسول کے پاس نہایت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے اس زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس طرح حاضرین کے ذہن کو بہت کامیاب طریقہ پر تیار کرنے کے بعد خود مولانا نے فرمایا۔ "میں فلاں صوبہ کے فلاں مقام سے آیا ہوں وہاں بحمد اللہ ایک رہائشی دینی درس گاہ قائم ہے جس میں کوئی سو سوا سو بچوں کی رہائش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے اور یہ آپ حضرات کے دینی جذبہ اور آخرت میں مالا مال ہونے کے انتظام پر منحصر ہے مقدور بھر روپیہ دیتے جائیے۔" اس لڑکے کی رٹی رٹائی تقریر سے جو ایک تاثر قائم ہوا تھا وہ آن واحد میں پانی میں مل گیا مجھے اتنی ذہنی کوفت ہوئی کہ میں نے ان مولوی صاحب سے پوچھا اس ننھے بچہ کی زبان سے اتنی بڑی بڑی باتوں کے بعد آپ نے دست سوال کیوں دراز کیا؟ اس کا جو جواب ملا اس کو جانے دیجئے لیکن یہ واقعہ ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے بیشتر قومی ادارے صرف چندوں پر زندہ ہیں۔

اور زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یہ امر بھی نہایت افسوسناک اور افسوسناک ہے کہ ہمارے معاشرے میں جب بھی کوئی ادارہ قائم ہوتا ہے خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی یا سماجی اور قوم کے نام پر جب کوئی اجتماعی یا انفرادی کام کا بیڑا اٹھایا جاتا ہے تو قوم کے سامنے بے تکلف ہاتھ پھیلا دیا جاتا ہے یہاں تک کہ کسی ٹیکنیکل ادارے، اسکول یا کالج کے قیام اور انتظام کے لئے بھی بار بار دست سوال دراز کیا جاتا ہے۔ اگر کسی ہنگامی مقصد یا ضرورت کے تحت، ایسا اقدام ناگزیر ہے، تو اس غلط اقدام کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن ہر قومی یا غیر قومی کام کے لئے کشکول لئے پھرنا غلط بات ہے۔ اور اگر چندے ہی پر کوئی نیک کام انجام پانا ہے تو ایسے مقصد کے لئے جمع کئے ہوئے روپیہ سے شروعات کے ساتھ ساتھ، جائیداد کی صورت میں مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کرلینا چاہیئے۔ تاکہ اس سے آخر تک کام چلتا رہے ترقی کی جائے۔ اور قوم کے سامنے بار بار ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہ پڑے۔ اگر جائیداد نہیں حاصل کی جاسکتی تو اس روپیہ کو کسی صنعت تجارت، یا مالی طور پر مستحکم کمپنی کے شیئر خرید کر منافع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ آمدنی کے مستقل ذریعہ کے بغیر صرف خواص و عوام کے جود و سخا، نظر عنایت اور دست کرم کے بل پر قومی اداروں کی تشکیل یا قومی فلاح و بہبود کے کام اور ان کی شروعات کو میں بالکل غلط سمجھتا ہوں۔

درگاہوں کی بات چلی ہے تو میرے ذہن میں وہ سوال نامہ ابھر آیا ہے جو میں نے پچھلے دنوں کوالالمپور (ملیشیا) کے ایک اخبار نور الاسلام المعروف بہ Light of Islam میں پڑھا تھا۔ یہ ہماری کیسی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے بزرگ، ولی، صوفی اور فقیروں کا ایک غلط روپ باہر کے ملکوں میں بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان بزرگان دین کی صالح کوششوں اور بامثال زندگی سے اسلام کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ اس کارہائے نمایاں کی وجہ سے ان کے آگے ہمارے سر عقیدت سے جھک جاتے ہیں۔ اس کیلئے ہم نذرانۂ تشکر و سپاس ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے ان کو خدا کا درجہ (نعوذ باللہ) دے کر اپنی مرادوں، خواہشوں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے ان پر تکیہ کرنا

کتنی صریح غلطی ہے جو ہم سے سرزد ہوتی ہے۔ اصل ضرورت تو کوشش، ہمت اور تدبیر کی ہے۔

اخبار مذکور کی ۳۱ اگست ۱۹۷۳ء کی اشاعت کے دوسرے صفحہ کے پہلے کالم میں Do Not Ignore Allah کے عنوان سے خواجہ غریب نواز کی درگاہ شریف سے کسی صاحبزادہ اور سید کے بھیجے ہوئے ایک سرکلر کا حوالہ دیتے ہوئے اخبار نے درج ذیل سوال کئے ہیں:۔ All Praise go to Him

۱۔ کیا ہم ان حضرات سے دریافت کرسکتے ہیں کہ آیا خدا کی ذات عظیم ہے یا وہ مقدس شخصیت، جن کی اسلام کی ترویج میں ان کی کوششوں اور خدمت کی بنا پر ہم انکی عزت کرتے ہیں؟

۲۔ ہم کو یقین ہے کہ یہ صاحب نے دنیا کے مختلف مسلم ممالک کی ٹیلیفون ڈائرکٹریاں حاصل کرکے اور ان میں شامل پتوں پر سرکلر بھیج دیتے ہیں اور روپیہ منگواتے ہیں ان کو پتہ نہیں کہ ان میں سے کتنے ہی پتے بیکار ہو گئے ہیں۔

۳۔ آخر صاحبزادے صاحب جواب کے لئے رسٹامپ کوپن کیوں نہیں منگواتے؟ بنک ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر کیوں طلب کرتے ہیں؟ نیکی اور بھلائی کوششوں میں بنک ڈرافٹوں کا کیا کام؟

۴۔ ہزاروں، نیک اور معصوم افراد جو اتنا ڈھیر سارا روپیہ بھیجتے ہیں یہ حضرت اس کا کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ کبھی حکومت کو انکم ٹیکس بھی ادا کرتے ہیں؟

۵۔ قرآن مقدس کی تعلیمات کے مطابق کوئی فرد خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو دوسرے آدمی کے گناہوں کی مغفرت کا ذمہ دار نہیں بن سکتا۔ ان کو معاف نہیں کرا سکتا۔ بلکہ روزانہ کی نمازوں میں تو ہم اپنے پیغمبر صلعم کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں تو ایسے میں کیا کوئی مرحوم ولی چاہے وہ کتنے ہی متقی و پرہیزگار رہے ہوں ہمارے حق میں دعا کرسکتے ہیں؟

۶۔ ہم ان صاحبزادے کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ عوام کو غلط اور گمراہ کن راستے پر نہ ڈالیں، اس لئے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو صرف ایک اور ایک خدا کی عبادت اور بندگی کی تعلیم دیتا ہے۔

درج بالا حوالہ سے ہم میں پائی جانے والی ایک عقیدے کی بنیادی خامی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم میں بے عملی اور کاہلی ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ اپنے ایمان میں بھی خلل واقع ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ متمول اور حاجتمند احباب کا بے شمار روپیہ ضائع ہوتا ہے اور بس دو چار خاندانوں کی ناجائز روزی کا سامان بہم پہنچتا ہے۔ ان خرافات سے چھٹکارا قوم کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔

ان چند مسائل کے بعد اپنی توجہ چند ایسے امور کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کی نوعیت کچھ مختلف ہے ان کا تعلق ہمارے علاوہ اپنے اردگرد بسنے والوں سے بھی ہے اور اگر کسی طرح کی غلط فہمی ہمارے اردگرد بسنے والوں میں ہمارے تعلق سے پائی جاتی ہے تو اس کی بیشتر ذمہ داری اپنی ہے اور کم تر ان کی۔

ایسے مسائل میں اولیت "مسلم کلچر" کو ہے۔ میرا مطلب مسلم کلچر کے اس تصور سے ہے جو ہمارے اردگرد بسنے والوں کے ذہن میں بن چلا ہے۔ مسلم کلچر کے ساتھ ہی ان کے ذہن میں قوالی، مجرے، مخصوص لباس، پردہ، چار شادیاں، حرم، لونڈی، غلام، آداب تسلیم کے لکھنوی انداز جیسے امور ابھر آتے ہیں۔ اس غلط تصور کو پیش کرنے میں ہماری بیشتر فلمیں بھی ہیں جن پر مسلم سوشل کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ اس تصور کی ترویج کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ خود آج کے مسلم نوجوان کے ذہن میں اس تہذیب کا کوئی تصور نہیں ہے جو مسلم کہلاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مسلمان میں وہ اجتماعی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی جس کو نیشنل کیرکٹر سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں رہنے بسنے کے باوجود ایک عام مسلمان ذہنی طور پر دوسرے اسلامی ممالک سے اور زیادہ تر پاکستان سے قریب رہتا ہے یہاں تک کہ برطانیہ میں کھیلے جانے والے کرکٹ میچ میں بھی وہ مخالف ہندوستانی ٹیم کے بجائے مخالف پاکستانی ٹیم کی جیت پر زیادہ خوش ہوتا ہے اور ہار پر رنجیدہ۔ اپنے ملک میں ہونے والا کوئی عظیم واقعہ اس کو اتنا متاثر نہیں کرتا جتنا کہ پڑوس کے ملک میں ہونے والا ایک معمولی واقعہ۔ ممکن ہے یہاں کی ہندو اکثریت کے مسلمان کے تئیں سے چوکنے ہونے اور بدظن بنے رہنے کی وجوہ میں سے یہ بھی ایک

وجہ ہو۔ لیکن جہاں مجموعی طور پر دوسری اقوام کا اپنے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ ایسا رویہ ناقابل فہم اور قابل مذمت ہے وہیں مسلمان نوجوان کے اس ذہنی افلاس اور واقعاتی خامی کو دور کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ دراصل اس ذہنی حالت کی وجہ برسوں کا وہ فرقہ وارانہ ماحول رہا ہے جس نے دونوں طرف کے ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے۔ خام اور ابھرتے ذہنوں کے سامنے کسی قوم کے افراد کو ظالم، غاصب، غیر مہذب اور گندے بنا کر پیش کیا جائے اور دوسری جانب الکفار لا اعتبار جیسی مثالوں کو منسوب کرتے ہوئے شک شبہ اور حقارت کے جذبوں کی پرورش کی جائے تو وہی ہوگا جو آج ہم دیکھ رہے ہیں لیکن اب جبکہ علم کی جوت جل چکی ہے اور اس کی روشنی سے اندھیرے من روشن ہو رہے ہیں۔ باہمی منافرت کی تاریکیوں کو بھی یک لخت ختم ہونا ہے، مٹنا ہے۔ آج اسی رواداری پر عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعلیم ایک کا مذہب دیتا ہے تو دوسرے کی تہذیب کے خمیر میں جو گھلی ملی ہوئی ہے یہاں افسوس اس بات کا ہے کہ آج فرقہ وارانہ رواداری کو ایک دائمی قدر کے بجائے آئینی اور دستوری قدر سمجھا جانے لگا ہے۔ جس کو معمولی سے اشتعال پر تہ تیغ کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ جہاں آئین کو مقدس سمجھا جاتا ہے آئین کی پابندی کو مقدس نہیں قرار دیا جاتا۔ مشہور انگریزی ضرب المثل ہے "قانون داں ہی قانون شکن ہوتے ہیں" اور اس طرح قانون شکن افراد کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے ویسے قانون شکنی کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ خود حکومت کے افراد بھی اس کے مرتکب ہوں۔ اکثریتی طبقہ کی محدود نقطہ نظر کی حامل پارٹیوں کے ہاتھوں بھی ان قوانین کا قتل کیا جاتا ہے۔

دراصل رواداری کا جذبہ بھی خود بخود اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب آدمی اپنی سطح سے بلند ہو کر "انسان" بن جاتا ہے۔ یہاں مجھے شاعر مشرق ڈاکٹر اقبالؒ کے وہ اشعار یاد آ رہے ہیں جو میں نے عظمت آدمیت کے حوالہ میں کسی کتاب میں دیکھے تھے:

آدمیت احترام آدمی — باخبر شد از مقام آدمی
حرف بد بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلق خدا ست
بندۂ حق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل وائے دل

جملہ معترضہ کے طور پر اگر میں یہاں ایک معمولی سے تجربہ کے بارے میں بتاؤں جو مجھے آج سے پندرہ سولہ برس پہلے ہوا تھا تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں مجھے کورس کی ایک انگریزی کتاب میں انگریزی نظم "ابو بن ادھم" نے بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ میں نے اس نظم کا اردو میں ترجمہ کر کے اسی انسانوں سے محبت کے عالمگیر جذبہ کو اپنانے اور عام کرنے پر زور دیتے ہوئے اس کو بچوں کے ایک مذہبی رسالے میں بھیجا تھا۔ جواب میں مولانا مدیر نے کچھ اس طرح کی باتیں لکھی تھیں "دراصل آج انسان سے محبت کے روپ میں گمراہی پھیلائی جاتی ہے۔ اصل ضرورت مسلمان کو مسلمان بنانا ہے۔ وغیرہ" مسلمان کو مسلمان بنانے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن گمراہی کیسے پھیل رہی ہے؟ صحیح معنوں میں ایک مسلمان تو انسانیت کا پرستار اور پرچارک ہی نہیں اس کا عامل بھی ہوتا ہے انسانیت کے تقاضے پورے کرتے ہوئے وہ ایمان کے تقاضے بھی پورے کرتا رہتا ہے۔

نیشنل کیرکٹر کے سلسلہ میں ایک عملی مشکل کے ازالہ کی سخت ضرورت ہے۔ ممکن ہے ترغیب اور خود انکشاف کے ذریعہ مسلم نوجوان میں "قومی کردار" پیدا بھی ہو جائے۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر ملک میں اس کیرکٹر کے نام لیوا تو بہت سارے ہیں لیکن اس کی صحیح اسپرٹ کو اپنا کر اس پر پورے اترنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ خود سیکولر نظریات کے پردے میں جس قدر اپنے ہاں قدم قدم پر مذہبی رسومات انجام دیئے جاتے ہیں اس سے ان ہی نظریات کی نفی ہو جاتی ہے۔ مہورت کے وقت ناریل پھوڑنا اور جمعہ کے جمعہ ہر سرکاری دفتر میں پوجا اور پرساد کی بانٹ سے لے کر صدر جمہوریہ کے کرسی سنبھالنے کے وقت مذہبی رہنماؤں سے آشیرواد لینے یا نامزد صدر کے ہاتھ میں دیوتاؤں کی تصویر دے کر تصویر لینے کے جیسے نمائشی ڈھکوسلوں تک، سیکولر طریق کار کو طاق پر اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ مسلمان ہو کہ ہندو، ہر ہندوستانی کو گھٹی کے دودھ میں مذہب گھول کر پلا دیا ہوتا ہے۔ وہ مہد سے لے کر لحد تک کبھی اپنے آپ کو مذہب

سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا انٹلکچوئل ذہنیا اور یا اقتدار طبقہ سیکولرازم کے نعرے لگاتا رہے۔ ایک نظریہ حیات کے طور پر سیکولرزم، اس سیکولرزم سے بالکل علیحدہ ہے جو اپنے یہاں مروج ہے سیکولرزم کے اصل مفہوم کو مسخ کرکے، اس سے نام کی خاطر چپٹے رہنے یا حسب ضرورت اس کی توثیق کرتے رہنے کے بجائے یہ کہیں درست ہوگا کہ اس کو بالکل ختم کردیا جائے تاکہ کم از کم اس کی وجہ ہماری زندگی میں در آئی دورخی ختم ہوجائے اور زندگی مزید پیچیدہ ہونے کے بجائے بہی سے سہل تر بنتی جائے۔

سیکولرزم کی طرح ایک اور اصطلاح ہمارے معاشرے میں غلط طور پر مروج ہے۔ وہ ہے "قومی دھارے میں بہنا" اور "قومی یکجہتی"۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں ان کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ملک کی معاشرتی سماجی اور معاشی ترقی میں ملک کے تمام باشندے باہم ملکر ایک یونٹ کے طور پر کام کریں۔ ہر صحیح اور ترقی پسند سکیم میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں لیکن اس نعرے کی پشت پر یکھا جارہا ہے کہ اجتماعی مفاد کے بجائے واحد تہذیب، واحد کلچر، اور واحد معاشرت کو تمام باشندوں پر ٹھونسے کی کوشش کام کررہی ہے۔ دراصل اجتماعی مفاد کی بنیاد انفرادی مفاد پر مبنی ہوتی ہے اور انفرادی مفاد سے مراد ہر اس فرقہ اور گروہ کا مفاد ہے جن کے باہمی اجتماع سے "ہندوستانی قوم" کا تصور ابھرتا ہے۔ اس طرح باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کے تحفظ سے ہی آج کے ہندوستان میں وہ فضا پیدا ہوسکتی ہے جس کو سیکولر ہندوستان میں قومی یکجہتی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

آج کے ہندوستانی مسلمان کی وفاداریاں ممکن ہے تین جانب بٹی ہوئی ہوں۔ ایک طرف اس کا تعلق عظیم مسلم برادری سے ہو جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ دوسری طرف قومی سطح پر ایک سیکولر (نام نہاد) ریاست کی ترقی کی کوششوں میں اس کا امکان بھرہاتھ بٹانا ہو، اور تیسری جانب اس کے اپنے علاقہ کے سماجی اور معاشرتی تقاضے ہوں کہ اس کو اپنی طرف بلا رہے ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ مسلمان کے عقیدے کی مضبوطی ایک ایسی قوت ہے کہ جو اس کو اخلاقی جرأت کے ساتھ عملی طاقت بھی عطا کرتی ہے۔ اور جس کے صحیح استعمال کی وہاں بھی ضرورت ہے جہاں ملک دنیا میں ایک نئی اور مستحکم قوت بن کر ابھرنے کی طرف رواں دواں ہے۔

ہردم جواں، ہرآن رواں، ہرلمحہ بدلتی دنیا میں اپنے مقام کے لئے ملک میں پرانے اور نئے، روایت اور جدیدیت، نظریہ اور تجربہ کے درمیان ایک کشمکش چلی آرہی ہے۔ زرعی نظام صنعتی نظام میں بدل رہا ہے۔ وقتی طور پر اقتدار کی ہوس اور ذاتی مفاد کی وجہ، ممکن ہے زندگی کے ہر محاذ پر بے شمار در آئی ہیں لیکن آزادی کے بعد ملک نے جس خوش حال، خودکفیل معاشرے کے خواب دیکھے ہیں اس کے حصول کی ہر ترقی پذیر کوشش میں ہندوستانی مسلم نوجوان کو پوری طرح ہاتھ بٹانا اور حصہ لینا ہے اس کے لئے ممکن ہے اس کو اپنے آپ کو بڑی حد تک بدل دینا پڑے۔ لیکن مسلم نوجوانوں کو اپنے مقام اور فرائض کا صحیح احساس ہوجائے، وہ سودے کے لئے پرانے دام لیکر بازار میں جائے بلکہ ملک میں جاری سکہ رواں سے اپنے جیڑے کو پُر کرکے نکلے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں جس سمنٹ فولاد، چونے اور پانی کا استعمال کیا گیا ہے ان کی مقدار صحیح ہو تو وہ زمانے کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے زمانہ ساز بن سکتا ہے اور ملک ساز بھی۔

★★

ملّا عبدالقادر بدایونی کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو ابوالفضل، فیضی، اور نہیں معلوم اور کتنے عہد اکبری میں بھی دہری تھے۔ لیکن وہ جیسے دہری تھے، اس کا حال ہمیں معلوم ہے، عموماً ایسا ہوا ہے کہ جہاں ایک شخص نے شاہ راہِ عام سے باہر قدم اُٹھایا یا مذہبی عقائد کے باب میں استدلال و احتجاج کی کوئی نئی شکل اختیار کی، یا اس طرح کا مشرب، جیسا سرسید وغیرہ کا تھا، تو عام طور پر اُسے دہریت ہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ——— مولانا ابوالکلام آزاد
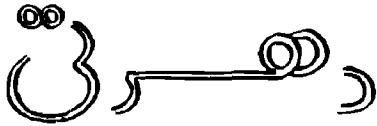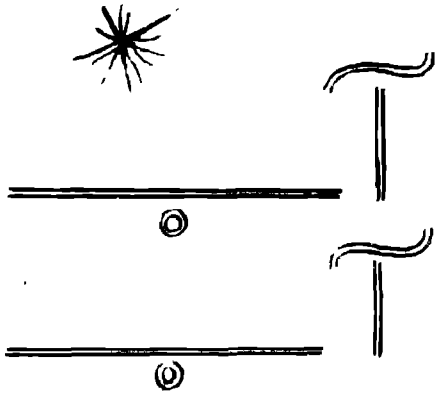
آب
آب
دھرتی
دھرتی
بجز اک خامۂ بے باک میرے پاس ہے ہی کیا
— شمس کنول

ہندستانی مسلمان بھائیوں

کے لئے

نیک آرزوئیں

آئی۔ این۔ ملہوترا (رتلام)

کی جانب سے

شمس کنول

کوئی شے مستقل نہیں تبدیلی کے سوا[1]

"کیا تم واقعی دل و جان سے مجھے چاہتے ہو؟"

"یقیناً ۔ ۔ !"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی ہوں ۔ ؟"

"بالکل ۔"

"کیا تمہارے خیال میں میرے لب گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہیں، میری آنکھیں شفاف جھیل جیسی اور میرے بال ریشم کی طرح ہیں ؟"

"ہاں میں تو یہی سمجھتا ہوں ۔ ۔ !"

"واہ ! تم کتنے سچے اور اچھے مرد ہو ۔ !"

ہندستان کا مسلمان بھی ایسے ہی "سچے اور اچھے" انسانوں کو پسند کرتا ہے جو اسے بہر اعتبار دنیا کی بہترین قوم قرار دے دیں۔
مگر کون نہیں جانتا کہ مسلمان ایک مریض قوم ہے، اس لئے اُس کی خوش نودی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ضروری ہے کہ اُس کو اُس کے مرض کا سبب بتایا جائے اور اُسے دوا نے تلخ پینے کی ترغیب دی جائے۔
"ے" تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ بات "ا، ب" سے شروع کی جائے۔

مسلمان اور تشدّد

عرب کے مسلمانوں نے جب دنیا کو فتح کرنے کا ارادہ کیا تو انکی پہلی نظر ملک ایران پر پڑی۔ اُن دنوں ایران کا بادشاہ خسرو دویم (یعنی پرویز، جو شیریں کا شوہر تھا) تھا۔ پیغمبر اسلام کی جانب سے اُسے قبولِ اسلام کی دعوت دی گئی مگر اُس نے مسلمان ہونا قبول نہیں کیا اور جو تحریر اس کو بھیجی گئی تھی وہ اس نے چاک کر دی تب مسلمانوں نے اپنی بات بزورِ بازو منوانے کا فیصلہ کیا مگر ان دنوں مسلمانوں کی فوجی قوّت بہت کم تھی ۔ آخر عہدِ فاروقی میں وہ وقت آگیا کہ ایرانی فوج رستم کی سپہ سالاری میں اور عرب فوج سعد بن وقاص کی قیادت میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی تھیں اور مغیرہ بن شعبہ اسلامی فوج کے قاصد بن کر یہ کہہ کر رستم کو للکار رہے تھے۔

"اللہ تعالٰے نے ہمارے درمیان اپنا رسول بھیجا۔ انھوں نے ہم کو توحید کی دعوت دی اور یہ کہ ہم کتاب اللہ پر عمل کریں، ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ آپ نے جہاد کا حکم دیا۔ جو شخص اسلام و توحید کی دعوت کو قبول کرے گا اس کے اور ہمارے حقوق برابر ہوں گے جو انکار کرے گا اس سے ہم جزیہ طلب کریں گے جو جزیہ دینے سے بھی انکار کرے گا اس سے ہم جنگ کریں گے میں تم کو بھی اس کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم انکار کرتے ہو (اپنی تلوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو یہ تلوار ہے۔ ہمارے تمہارے درمیان یہ تلوار فیصلہ کرے گی۔"

الاخبار الطوال صفحہ 121

---

[1] NOTHING IS PERMANENT, EXCEPT CHANGE

"البقیہ ال ال تس" (ص 166-105) میں درج ہے: "اندلس کے حکمراں المنصور محمد ال منصور نے آس پاس کے عیسائی ممالک سے جہاد کو فرض قرار دے دیا تھا وہ مسلسل جہاد میں رہتے تھے۔ حد یہ کہ عید کے دن بھی دوگانہ ادا کرتے ہی کسی عیسائی ملک پر چڑھائی کی نیت کرتے اور عید گاہ ہی سے جہاد پر روانہ ہو جاتے۔ فوج بھی ہر لمحہ تیار رہتی تھی۔ المنصور نے اپنی زندگی میں پچاس سے زیادہ لڑائیاں لڑیں اور نتیجے میں اندلس کو مال غنیمت سے بھر دیا اور دولت سے مالا مال کر دیا۔ 393ھ میں ایک جہاد کے سلسلے میں ان کا انتقال ہوا۔ المنصور جہاد کو اور جہاد کے نتیجے کی ہر بات کو اس حد تک متبرک سمجھتے تھے کہ میدان جنگ سے واپس آکر اپنے خیمے میں جب اپنے کپڑے جھاڑتے تو جو گرد گرتی اسے جمع کرتے اور پھر محفوظ کر لیتے۔ انھوں نے وصیت کی کہ جب میں مروں اور مجھے کفن پہنا دیا جائے تو میرے کفن پر میرا جمع کیا ہوا یہ سارا گرد و غبار چھڑک دیا جائے۔ چنانچہ ان کے مرنے پر ایسا ہی کیا گیا۔"

یہ دونوں تاریخی واقعے جہاں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام نے اپنی اشاعت کے لئے تشدد اختیار کرنے کی تلقین نہیں کی وہاں یہ بھی واضح ہے کہ مسلمان نے اسلام کو بزور بازو ہی پھیلایا ہے۔

اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے طاقت کا استعمال کرنا مسلمان کا کوئی دوش نہیں بل کہ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی تبلیغی مذہب کی اشاعت کے لئے REGIMENTAL - FORCE (عسکری قوت) کا ہونا ضروری ہے۔ عدم تشدد کے سب سے بڑے پرچارک گوتم بدھ نے اپنے مت کے پرچار کے لئے یہاں سے وہاں تک گشت کیا مگر ان کے مت کو اس وقت تک استحکام حاصل نہیں ہوا جب تک کہ اپنے وقت کے سب سے بڑے حکمراں اشوک نے بدھ مت کو اپنا دھرم نہیں بنا لیا۔ حضرت عیسیٰ کا انکسار اگرچہ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اپنے ایک رخسار پر طمانچہ کھانے کے بعد اپنے دشمن کے سامنے اپنا دوسرا رخسار پیش کر دینے کے لئے تیار رہتے تھے مگر وہ اپنی زندگی میں اپنے چند ہی حواری پیدا کر سکے۔ چنانچہ عیسائی مذہب کو عالم گیر مقبولیت انکسار سے نہیں بل کہ صلیبی جنگیں لڑ کر حاصل ہوئی۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہندستان میں اسلام کو اپنے اخلاقی عنصر کے بل پر فروغ حاصل ہوا۔ یہاں بھی اس کی اشاعت میں براہ راست یا بل واسطہ قوت و اقتدار ہی نے مدد پہنچائی ہے مثال کے طور پر سلطان قطب الدین ایبک کا ایک کلکٹر سید حسن مشہدی خواجہ غریب نواز کا مرید و مداح تھا اُس نے اپنے خواجہ کے مشن (تبلیغ اسلام) کو اپنے اقتدار سے بڑی مدد پہنچائی۔ وہابی تحریک ایک معمولی سی تحریک تھی مگر سعودی حکومت کے تعاون سے سارے عالم اسلام میں پھیل گئی۔ جب کہ کبیر نے طبقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے جی جان سے کوشش کی اور نظریۂ کبیر کی افادیت سے کوئی انکار بھی نہیں کر سکتا مگر یہ ایک بڑا اتفاق تھا کہ کبیر کو کسی حکمراں کا تعاون حاصل نہیں ہو سکا اور کبیر کی تحریک اس کی زندگی ہی میں ٹھپس پھنسا کر رہ گئی۔

آج کے سیاسی نظریے بھی طاقت اور دولت کے بغیر عام نہیں کئے جا سکتے۔ ہٹلر کی نازی پارٹی کو تب ہی کامیابی حاصل ہوئی جب جرمنی کے رُوہر (RUHR) صنعت کاروں نے ہٹلر کو مالی مدد دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی کا سبب ہی یہ ہے کہ اُس کو حکومت کا تعاون حاصل ہے اور سرمایہ داروں کی امداد۔

تحریر و تقریر اور ضمیر کی آزادی کے اس دور میں بھی اسلام کی تبلیغ میں مسلمان تشدد سے کام لیتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنی آنکھوں سے یوپی کے مغربی اضلاع (مراد آباد، سہارن پور، بجنور میرٹھ وغیرہ) میں ایسے مسلمان بزرگوں کو دیکھا ہے جو اپنے ہاتھوں میں دُرّے (بانس کی لکڑی کے دستے میں بندھی ہوئی دو دو گز لمبی تار) لئے ہوتے تھے اور چلتے پھرتے ان نوجوان مسلمان لڑکوں کی پیٹھ پر رسید کرتے تھے جو نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے بھی اپنے سلسلے میں ایک بار ذکر کیا تھا کہ قائم گنج کے جس اسکول میں وہ کبھی تعلیم پاتے تھے اس کے ہوسٹل میں رہنے والے لڑکوں کو نماز نہ پڑھنے پر کڑی سزائیں دی جاتی تھیں حد یہ کہ کھانا تک بند کر دیا جاتا تھا۔

اس بات کو زیادہ دن نہیں گزرے (اکتوبر 1971ء) کہ جمعیت علمائے پاکستان کے امیر مولانا عبداللہ نے اپنی حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ پانچ نمازوں میں سے ایک وقت کی بھی نماز چھوڑنے والے کو ایک ہفتے کے لئے جیل بھیج دیا جائے۔ مولانا عبداللہ کے اس

مطالبہ پر بہت حد تک عمل ہوا بھی یعنی پشاور میں ایک ہسپتال کے کینٹین کے مالک کو حکومت پاکستان نے اس لئے ایک ہفتے کی قید کی سزا دی کہ اس نے ماہ رمضان میں ایک مسلمان گاہک کو اپنے کینٹین میں کھانا کھانے کی اجازت دی تھی۔ مولانا مفتی محمود وزیر صوبہ سرحد کا یہ آرڈی نینس تھا کہ رمضان کے مہینے میں دن کے وقت تمام ہوٹل بند رہیں گے اور ہر قسم کی کھانے پینے کی چیزیں ٹھنڈے و گرم مشروب فروخت کرنے اور پانی پلانے تک کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ آرڈی نینس کی خلاف ورزی کرنے والے کو ۶ مہینے تک کی سزا دی جا سکتی ہے۔ انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کی اکثر مسلم ریاستوں میں بھی ماہ رمضان میں دن کے وقت کسی گھر سے دھواں اٹھنا گھر والوں کا جرم قرار دیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی اس ذہنیت نے کہ ہر مخالف نظریئے کو فنا کر دیا جائے اور ان کی اس دست درازی نے کہ جسے دنیا نے جہاد کی صورت میں دیکھا، اسلام کو تو فروغ بخشا مگر مسلمان کی گڈول کو سخت نقصان پہنچایا۔

اب تین واقعے سنئے۔

تین برس پہلے کی بات ہے کہ میری بیوی شہناز کو ایک بیماری کے سلسلے میں بمبئی کے ایک نرسنگ ہوم میں دس دن رہنا پڑا وہاں ان کی مخصوص تیمارداری کے لئے ایک فری لانس نرس کی خدمات عارضی طور پر حاصل کر لی گئی تھیں۔ وہ نرس جوان تھی، عیسائی تھی اور ڈپلوما یافتہ تھی، دس دن کے بعد نرسنگ ہوم کے ڈاکٹر نے شہناز کو گھر کی اجازت تو دے دی مگر یہ بھی مشورہ دیا کہ گھر پر کم سے کم دو ہفتے تک ایک نرس کو اپنی تیمارداری کے لئے اگر رکھا جائے تو بہتر ہے شہناز نے اسی نرس کی خدمات کو جاری رکھنا بہتر سمجھا۔ اس لئے اس سے دریافت کیا کہ کیا وہ گھر پر آکر نرسنگ کی یہ ڈیوٹی انجام دینے کے لئے تیار ہے؟ اس پر نرس نے پوچھا: "تم کدھر رہتا ہے؟" شہناز نے بتایا: "ہم یوں تو ہینس روڈ پر رہتے ہیں، مگر میری امی بھنڈی بازار میں رہتی ہیں، میں یہاں سے امی ہی کے گھر جاؤں گی ـــ!" ـــ "تم اگر اپنے گھر ہینس روڈ پر جائیں تو ہم تمہارے گھر ڈیوٹی پر آئیں گا مگر بھنڈی بازار میں نہیں۔ بات یہ کہ سب لوگ ہمارے پروفیشن کا اور ہمارا رسپیکٹ (RESPECT) کرتا ہے مگر میاں بھائی تو ہماری یونی فارم کا بھی رسپیکٹ نہیں کرتا۔"

یہ اس کرسچین نرس کا جواب تھا۔

میرے ایک بزرگ دوست ہیں، انتہائی ماڈرن، ریشنل اور ترقی پسند خیالات کے حامل مگر پیدائش سے مسلمان ہیں چند برس ہوئے کہ انھوں نے ایک ہندو خاتون سے شادی کی جو ڈبل ایم۔ اے۔ ہیں اور لیکچرر ہیں۔ شادی کے کچھ ہی دن بعد وہ اپنے ایک فیملی فرینڈ سے اپنے شوہر کے متعلق بڑی حیرت سے کہنے لگیں: "میں نے ان کے ہر کوٹ اور ہر پتلون کی ہر جیب دیکھ ڈالی مگر مجھ کو کوئی چاقو نہیں ملا۔ میں نے تو سنا تھا کہ ہر مسلمان اپنی جیب میں ایک چاقو ضرور رکھتا ہے۔!"

چند دن ہوئے میں نل بازار سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا مختلف قسم کے چھوٹے بڑے چاقو بیچ رہا ہے۔ وہ آواز لگا رہا تھا: "ارے مرغا کاٹو، بکرا کاٹو، ارے جس کا چاہے گلا کاٹو... !" یعنی اس کے خیال میں دنیا میں چاقو کا اور کوئی مصرف ہی نہیں۔

درخت اپنے پھل سے، انسان اپنے عمل سے اور مسلمان اپنی گڈول سے پہچانا جاتا ہے اور مسلمان کی گڈول مومن و کافر اور جہاد کی ضربوں سے بری طرح مجروح ہو چکی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے مسلمانوں کو سمجھاتے ہوئے ایکبار کہا تھا:

"دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں، خدا کا خود کیا مذہب ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں ہے ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں رکھتا اور سب کو ترقی کیوں دیتا؟ ایک مذہب جو حق ہے اسی کو رکھتا، باقی سب کو فنا کر دیتا مگر یہ بات نہیں ہے۔"

یعنی مسلمان اپنی ہی انگلی کی انگوٹھی کو سونے کی نہ سمجھیں، دوسرے کی انگلی کا چھلا بھی سونے کا ہو سکتا ہے۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تشدد آمیزی کا جو مودتی

ہندستان میں اور جہاد کی جو جذباتی خصلت مسلمان میں پائی جاتی ہے اس کو بدلا جائے جس طرح بادشاہ خان نے جاہل اور جنگ جو پٹھانوں میں سے تشدد کے رجحان کو دور کر کے اُن میں باہمی پیار اور محبت پیدا کر دی اسی طرح عام مسلمانوں کو بھی مذہب کے معاملے میں رواداری بنا کر ان میں بھائی چارے اور قومیت کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ سیاست کی بساط پر صرف ہندستان ہی کا مسلمان مات کھائے ہوئے نہیں ہے بلکہ سارے عالم کا مسلمان پٹ چکا ہے۔ جب تک وہ اپنی گذڑول نہیں بنائے گا تب تک دوسرے اس کے مسائل پر ہمدردی سے غور نہیں کریں گے۔

مسلمان اور جنگ آزادی

پچھلے سو برس سے یہ مقدس جھوٹ بولا جا رہا ہے کہ ہندستان کے مسلمان نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے یا مسلمان بھی آزادی کی جدوجہد میں اتنے ہی پیش پیش رہے ہیں جتنے کہ دوسرے فرقے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سو ڈیڑھ سو برس میں مسلمانوں نے تحریک آزادی میں بس برائے نام ہی حصّہ لیا ہے۔ جس طرح چند مسلمان اپنے ساتھ لے کر جن سنگھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ وہ ایک فرقہ پرست جماعت نہیں ہے، اسی طرح ہر بستی سے ایک دو غیر فرقہ پرست مسلمانوں کے نام گنا کر ہندستان کے سارے مسلمانوں کو قوم پرست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جب کہ بات غالب کثرت کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔

بات پھر "ا، ب" سے شروع کیجیے۔

بہادر شاہ کو جنگ آزادی کا پہلا ہیرو دیکھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک نہایت کم زور اور اوہام پرست انسان تھا اس کا منشا محض یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کا تخت محفوظ رہے چناں چہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ فیروز بخت کے مشورے پر بہادر شاہ شیعہ ہو جانے پر تیار ہو گیا تاکہ اودھ کے شیعہ نوابین سے اس کو دولت بھی ملے اور ان کی مدد سے اس کی بادشاہت بھی برقرار رہے ہندستان کے مسلم علما نے انگریز کے خلاف جنگ ضرور کی مگر حب وطنی کے جذبے کے تحت نہیں اور نہ انھوں نے اپنے کسی سیاسی شعور کی بنا پر انگریزوں کو ہندستان چھوڑنے پر مجبور کیا بلکہ وہ ابتدا سے مغربی تہذیب کی مخالفت اور انگریز دشمنی میں آج تک مبتلا ہیں مسلم علما نے مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کی اس حد تک مخالفت کی کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے معقول عالم بھی سرسید سے لڑائی بعض میں مبتلا تھے۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ علی گڑھ کالج کے تحت اپنی ہی مرضی سے دینیات کی تعلیم کا انتظام کریں تو انھوں نے جواب دیا کہ پہلے سرسید مدرسے کے کاموں سے دست بردار ہو جائیں۔ اس پر سرسید نے یہ کہہ کر اطمنان دلانا چاہا کہ وہ خود دینیات کی کمیٹی کے ممبر نہیں بنے ہیں۔ مگر مولانا نانوتوی اس کے باوجود اپنا تعاون دینے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ دراصل دنیا کے ہر مسلمان عالم کا ہر ترقی پسند تحریک کے خلاف ایسا ہی رویہ رہا ہے۔ ترکی کے شیخ اسلام نے بھی فتوا دیا تھا کہ جو لوگ مصطفیٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کو قتل کریں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ شیخ ہند مولانا محمود حسن بھی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے اور وہ اپنی مخالفت کو اس طرح پھیر کر بیان کیا کرتے تھے:-

> "میرے اکابرِ سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کُفر کا فتوا نہیں دیا۔ ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومتِ وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔"

اپنے مقالے "میرا عقیدہ" میں مولانا عطا اللہ شاہ بخاری نے فرمایا تھا:-

> "اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لئے سوّروں سے بھی اتحاد کرنے میں گریز نہ کروں کیوں کہ ان کی زندگی سے <u>اسلامی تہذیب و تمدن</u> اور انسانیت کی موت ہو جائے گی اور ان کی موت سے <u>اسلام اور مسلمان</u> زندہ ہو جائیں گے۔ مجھے ایک چیز سے محبت ہے وہ ہے قرآن مجید، ایک چیز سے نفرت ہے وہ ہے انگریز!"

مولانا حسین احمد مدنی بھی اپنی تقریر میں اکثر یہ فرمایا کرتے تھے:

"سکتا اگرچہ میرے مذہب میں نجس ہے مگر وہ انگریز کی طرف منہ کر کے اگر موتیں گے تو میں اس کا منہ چوم لوں۔"[10] ایک مولوی عبدالعزیز بھی تھے ان کو انگریزوں سے اتنی نفرت تھی کہ راہ میں اگر انگریز نظر آجاتا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے۔

یہ حقائق واضح کرتے ہیں کہ مسلم علماء انگریز کے دشمن تھے مگر اس لیے نہیں کہ انگریز نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا بلکہ اس لئے کہ انگریز اپنے ساتھ جو تہذیب لایا تھا اس سے وہ فرسودہ تہذیب مٹ رہی تھی جس کے نمائندہ مسلم علماء تھے اور انگریزی تعلیم مسلم نوجوانوں کو وہ شعور بخش رہی تھی کہ جس کی مدد سے مسلم نوجوان مسلم علماء کے بیجا کنٹرول سے آزاد ہونے لگا تھا۔ مسلم علماء کے ہاتھ سے جاتی ہوئی اجارہ داری مسلم علماء کو انگریزوں کے خلاف چراغ پا کئے ہوئے تھی ورنہ مسلم علماء نہ سیاسی شعور رکھتے تھے نہ ان میں حب وطنی کا جذبہ تھا اور نہ ان کو ہندوستان کی آزادی سے کوئی دلچسپی تھی وہ تو محض انگریز کے دشمن تھے۔

یہ ذکر غیر ضروری نہ ہوگا کہ مسلمان مولویوں سے گاندھی جی کا کردار بہتر ثابت ہوا۔ گاندھی جی نے انسان سے نہیں، انسان کے برے فعلوں سے نفرت کی ان کی زندگی کا نصب العین ہی یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے قبضے سے اپنے مادرِ وطن کو نجات دلائیں یعنی ایک طرح وہ انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن تھے مگر انھوں نے بھول کر بھی انگریزوں کی ذات سے نفرت کا اظہار نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں کبھی جھنجھلاہٹ ہی کا ثبوت دیا۔

جہاں تک ہندوستان کے عام مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے بھی اپنے ملک ہندوستان کو آزاد کرانے میں کوئی نمایاں رول انجام نہیں دیا۔

مولانا الطاف حسین حالی سر سید کے پولیٹکل کارنامے کے عنوان سے مئی 1898ء کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ میں لکھتے ہیں :۔

"انڈین نیشنل کانگریس جو درحقیقت کوئی باغیانہ یا خلافِ قانون مجمع نہ تھا مگر مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کے لحاظ سے ان کا اس میں شریک ہونا سر سید کے نزدیک خلافِ مصلحت تھا، جس وقت سر سید نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے روکا تو باستثنائے معدودے چند تمام ہندوستان کے مسلمان، کیا سنی، کیا شیعہ، کیا وہابی اور کیا غیر وہابی، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھ، کیا وہ لوگ جو سر سید کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعت کثیر جو ہر بات میں ان کی مخالفت کرتی تھی، سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے ہمیشہ صرف اس بنا پر علاحدگی اختیار کی کہ سر سید احمد خاں کے نزدیک ان کا شریک ہونا مناسب نہ تھا اور لاکھوں مسلمانوں نے ان کا غذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے ظاہر کرنے کو ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔"[11]

متحدہ ہندوستان میں سات لاکھ گاؤں تھے اور کئی ہزار شہر اگر ہر گاؤں اور ہر شہر میں برائے نام ایک ایک مسلمان بھی قوم پرست ہوا تو گنتی کے لحاظ سے وہ کئی لاکھ ہو جاتے ہیں مگر ظاہر ہے کہ من حیث القوم چند لاکھ کسی شمار میں نہیں آتے۔ مولانا حالی نے 1898ء کی حالت بیان کی تھی ملا واحدی دہلوی 1905ء میں دہلی کے مسلمانوں کی سیاسی حالت کا یوں ذکر کرتے ہیں :

"مجھے خوب یاد ہے کہ 1905ء میں ان کی (انڈین نیشنل کانگریس کے مسلمان ممبر) تعداد صرف 7 تھی۔ انھیں لیڈر کہلانے کا فخر تو حاصل تھا باقی بے روی ان کی کوئی مسلمان نہیں کرتا تھا گویا وہ خود ہی راعی اور خود ہی رعایا تھے۔ سات میں سے پانچ بل کہ چھ کے اب نام بھی مٹ چکے ہیں۔ ساتویں مولانا حسرت موہانی تھے جو استقلال اخلاص اور للہیت کی وجہ سے زندہ رہے اور زندہ رہیں گے۔ مجھے دلی کے سید رہنما۔"[12]

اب 1914ء سے 1920ء تک کی بات سنئے کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے ایک خطبے میں مجبور ہو کر ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ کہنا پڑا :۔

محو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی حکومت سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو خود اس نے اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے فرض کر لیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور بطون طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک ہتھیار بن رہی۔ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسخرہ انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتی تھی نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتی تھی، ایک معمول جو مسمرائزر کے ارادے پر زندہ ہو ایک وجودِ شل جو صرف زمین کے لئے بار ہو، ایک درخت جو ہوا کے لئے ہوا کا منتظر ہو ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دیئے ہل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔ اور پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی، جو آہ تم آہ! کہ مسلم تھی۔"

1935ء میں جب سیاسی اعتبار سے سارا ہندوستان بیدار ہو گیا اور 1937ء میں صوبائی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا ان دنوں بھی مسلمان فرقہ پرست تھا اور ان فرقہ پرست جماعتوں بالخصوص مسلم لیگ کے ساتھ تھا جو آزادیٔ وطن کی راہ میں روڑا بنی ہوئی تھیں چنانچہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں غیر کانگریسی ہی وزارتیں قائم ہوئیں۔

آزادیٔ وطن کے لئے جو کوشش جاری تھی وہ 1945ء سے 1947ء تک اپنے عروج پر پہونچ گئی۔ ہر سیاسی پارٹی میدان میں آ گئی اور ہر فرقے نے اپنے رجحان سے یہ واضح کر دیا کہ وہ حصول آزادی کے لئے کس حد تک مخلص ہے۔ چنانچہ اس وقت کے ننانوے فی صدی مسلمان نے مسلم لیگ کے پرچم تلے آ کر یہ ثابت کر دیا کہ اسے ہندوستان کی آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

1946ء کی بات ہے کہ میں مراد آباد کے گورنمنٹ انٹر کالج کا طالب علم تھا اور ان دنوں شہر مراد آباد میں جو اسٹوڈنٹ کانگریس قائم تھی اس کا میں صدر تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس اسٹوڈنٹ کانگریس کے ممبران کی کل تعداد 250 تھی جب کہ 250 میں صرف 3 مسلمان تھے اس بات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ چھوٹے بڑے کسی بھی عمر کے مسلمان کو تحریک آزادی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہ خود قوم پرست تھے اور نہ کسی دوسرے کو قوم پرست یا محبِ وطن دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم کالجوں کے (بقول جوش ملیح آبادی) "عشوہ فروش لونڈے" آزاد جیسے مردِ حق کو خسرو لوائے کہتے تھے اور مولانا مدنی جیسے بزرگ کے عمامے پر ہاتھ ڈالتے تھے۔

اسی لئے مولانا سید طفیل احمد منگلوری (مصنف "مسلمانوں کا روشن مستقبل") ایکبار یہ لکھنے پر مجبور ہوئے تھے:-

"یہ بدیہی امر ہے کہ 1858ء سے لے کر اب تک جب انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل ہونے کا مطالبہ کیا جاتا تو ہر موقع پر رجعت پسند مسلمان آڑے آتے اور نت نئے مطالبات پیش کر کے حکامِ وقت کی امداد کرتے رہے

اور آزادیٔ ہند کی راہ میں سنگِ گراں نہیں بل کہ فیلِ
کوہِ گراں ثابت ہوئے۔ !"

اور سچ تو یہ ہے کہ ابتدا سے آج تک ہندستان کے مسلمانوں کے غیر قوم پرستانہ رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تقسیم ملک کے مابعد اثرات بھی ان میں سیاسی شعور پیدا نہیں کرسکے۔ غرض کہ جو لوگ آج (شاید کسی مصلحت سے) مسلمانوں کے سیکولر مزاج کا ذکر کرتے ہیں اور اس بات کا دعوا کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر جنگِ آزادی میں حصہ لیا ہے وہ مولانا آزاد جیسے مردِ حق کی اس تقریر کو جھوٹ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو انھوں نے 15 اگست 1947ء کے بعد دہلی کی جامع مسجد کے منبر سے کی تھی:-

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں ہیں سے پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہات قلم کردئے۔ میں نے چلنا چاہا اور تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہ راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بل کہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسا کیا تھا وہ تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سُنی اور ان سُنی برابر کردی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کرسکتے۔ انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالاں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے۔ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوا ہوا کرتا ہے!"

ہندو سماج 5 ہزار برس پرانا ہے۔ لچک، قوتِ برداشت، رواداری اور درگزر کرنے کی عادت ہندو سماج کا مزاج ہے اور ہندستان کا سیکولر آئین اسی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ ہندو کی فراخ دلی سے اور آئین کی بخشی ہوئی مساوات سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہندستانی مسلمان اپنے ماضی کی ساری سیاسی لغزشوں سے تائب ہوکر قومی دھارے میں شامل ہوجائے۔ قومی دھارے میں شامل ہونے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کا جواب مولانا آزاد کی زبان میں یہ ہے: "آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لئے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے۔!"

اردو صحافت
مسلم لیڈری
مولوی ـ ملّا

آزاد ہندستان کے ان 27 برس میں مسلمانوں کے ساتھ اردو صحافت، مسلم لیڈری اور مولوی ملّاؤں نے سب سے زیادہ دشمنی کا ثبوت دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو صحافت (آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد) کبھی بھی ہندستانی مسلمانوں کی صحیح راہ نمائی نہیں کرسکی۔ اردو صحافت کی تاریخ میں "پیسہ اخبار" "الہلال" "زمین دار" "ہمدرد" "خلافت" "مدینہ" "الامان" "دعوت" "انصاف" "احسان" "شہباز" "آزاد ہند" "عصرِ جدید" "الجمعیت" "یارمن" "ریاست" "پیام" "سیاست" "انقلاب" "منادی" "نظام گزٹ" "انصار" "انجام" "منشور" "تنویر" "قومی آواز" "نجات" "مسلمان" "پاسبان" "نوائے وقت" "زمزم" "ہمدم" "حقیقت" "حق" "ہندستان" "قومی اخبار" "اجمل" "خلافت" وغیرہ کو بڑی اہمیت اور نام وری حاصل رہی ہے مگر ان اخبارات میں "انجام" "منشور" "تنویر" کی فرقہ پرستی اور "زمین دار" کی نامعقولیت نے اردو داں مسلم قارئین کو جتنا متاثر کیا ہے اتنا "الہلال" "مدینہ" اور "قومی آواز" کی صحیح مگر کم زور آواز متوجہ نہیں کرسکی۔ ہر زمانے میں اردو زبان میں فرقہ پرست اخباروں کی تعداد کہیں زیادہ رہی ہے۔ ایک بار کسی نے

علامہ تاجور نجیب آبادی سے پوچھا گیا کہ ہندوستان میں کتنے قوم پرست اخبارات گن سکتے ہیں؟ علامہ نے مزاحیہ انداز میں اس کو مختصر کرتے ہوئے جواب میں فرمایا تھا: صحیح معانی میں قوم پرست اردو اخبارات ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ روزنامہ "ہند" (کلکتہ) "ریاست" (دہلی) اور "پارس" (لاہور) اخبارات قوم پرست ہیں!" واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان کی ساری تاریخ میں چند ہی اخبار بمشکل تمام "الہلال"، "ہمدم"، "ریاست"، اور "قومی آواز" وغیرہ جیسے چار پانچ اخبار قوم پرست رہے ہیں اور انھوں نے حب وطنی کا ثبوت دیتے ہوئے تحریک آزادی کا ساتھ دیا ہے ورنہ اکثر اردو اخباروں نے فرقہ پرستی، منافرت، ملک دشمنی، غداری اور پھکڑپن کے وہ مظاہرے کئے ہیں کہ اردو زبان کو اپنی زبان کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں جو اپنے وقت کے سب سے بڑے اردو صحافی مانے گئے ہیں ان کی ذہنیت اور ان کے قلم کا معیار یہ تھا کہ ؎

بھارت میں بلائیں دو ہی تو ہیں اک ساورکر اک گاندھی ہے
اک جھوٹ کا چلتا جھکڑ ہے اک مکر کی اٹھتی آندھی ہے

دوسرے اردو صحافیوں نے بھی ایسے کردار کے پختہ ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ بجنور کا "مدینہ" اخبار ہمیشہ جمعیت علما کا ترجمان اور قوم پرست اخبار رہا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی، بدر ہلالی، نصر اللہ خاں عزیز، ابوالعیث ندوی، مولانا مودودی، ماہر القادری اور مولانا عثمان فارقلیط کبھی نہ کبھی "مدینہ" کے ادارے سے وابستہ رہے ہیں۔ مگر "مدینہ" کی ادارت چھوڑتے ہی ہاتھ سے گئی کوئی مسلم لیگی بن گیا اور کوئی جماعت اسلامی میں چلا گیا۔ مولانا فارقلیط تقریباً بیس برس تک جمعیت علما کے آرگن "الجمعیت" کی ادارت بھی فرماتے رہے اور جماعت اسلامی کے ایک روزنامے کے لئے شذرات بھی لکھتے رہے اور جب "الجمعیت" کی ادارت سے سبک دوش ہوئے تو مسلم لیگی ہفت روزہ "نئی دنیا" کے مدیر اعلیٰ بن گئے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت کا معیار اور گرا ہے۔

کہتے ہیں کہ ریلوے پلیٹ فارم پر قلی گیری کرنے کے لئے بھی ایک بیج (BADGE) درکار ہوتا ہے مگر فلم کا ڈائرکٹر اور اردو اخبار کا اڈیٹر بننے کے لئے کسی ڈپلوما یا سارٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں۔

اخبار کی پالیسی کے متعلق مولانا حسرت موہانی کا کہنا تھا: "یقین یا عقیدہ عام انسان سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف مصلحت یا لالچ کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں مادہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔" اس نظریے پر چلانا آج کل ادھر حسرت موہانی کے سوا شاید ہی کوئی اردو اخبار نویس عمل پیرا رہا ہو۔ ان دنوں اردو اخبار جاری کرنا مشن نہیں روزگار ہے وہ بھی سرکاری اشتہارات اور کاغذ کے سرکاری کوٹے کے بل پر چلنے والا روزگار۔ جب اخبار محض ذریعہ روزگار ہوگا تب قلم کی آبرو اور صحافت کی حرمت کے پاس و لحاظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ پچھلے ۲۲ برس میں فی ہزار ۹۹۹ اردو اخبارات نے مسلم پرسنل لا، علی گڑھ یونیورسٹی، اسرائیل و عرب جنگ، بنگلا دیش، فیملی پلاننگ، اور اردو زبان سے متعلق غلط تجزیے اور غلط ویوز دے کر اپنے مسلم قارئین کو گمراہ کیا ہے اور ان کو ایک ترقی پسند راہ دکھانے کے بجائے رجعت پسند ڈگر پر ڈالے رکھا ہے۔

آج کی اردو صحافت دردناک حد تک نیم تعلیم یافتہ قلم کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے اکثر اردو مدیران فن ادارت سے اس حد تک نابلد ہیں کہ وہ اکثر اوقات اپنے اڈیٹوریل کے کالم میں سرکاری خانوں کے اشاعتی شعبوں یا پریس ان فارمیشن بیورو سے آیا ہوا ہینڈ آؤٹ (یا اپنے کسی قاری) کا کوئی مراسلہ ہی شائع کر دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے ایسے اردو مدیران کی تحریروں میں عالمی اپیل تو کیا قومی اپیل بھی نہیں ہوتی۔

اسی بات کا ایک دوسرا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اردو اخبار کو جب تک فرقہ پرستی کا ٹچ نہ دیا جائے وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور زندہ رہتا ہے تو سسک سسک کر۔ اردو کا قوم پرست اخبار "قومی آواز" تیس پینتیس برس پرانا ہو چکا مگر آج بھی اس کی تعداد اشاعت تین چار ہزار سے زیادہ نہیں۔ چند ہی برس میں "اردو سیکولر ڈیموکریسی" کا جو انجام ہوا وہ معلوم ہی ہے۔ دراصل ترقی پسند یا قوم پرست اخبار کو زندہ رہنے کے لئے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اخبار کی پالیسی سے متفق نہ ہونے کی بنا پر کاتب سے اخبار فروش تک کوئی بھی تعاون نہیں کرتا، اخبار

فروش دوسرے اخباروں کے بنڈل کے نیچے اس طرح دبا کر رکھتا ہے کہ نہ گاہکوں کو نظر آئے اور نہ وہ خریدیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہندو اور مسلم فرقہ پرست جماعتوں نے مسلم اخبار بین طبقے کے ذہن کو اس حد تک مسخ کر دیا ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے رنگ کے سوا دوسرا کوئی رنگ پسند ہی نہیں کرتا۔

اردو اخباروں کی زد سے جو مسلمان بچ جاتے ہیں وہ سوشل ورکروں کے ہتے چڑھ جاتے ہیں۔ سوشل ورکر بننا آج کے مسلمان کا محبوب مشغلہ ہے۔ دراصل اس مشغلے کے پردے میں روزگار کے مسئلے کو حل کیا جاتا ہے ان سوشل ورکروں کا نہ اپنا کوئی سیاسی نظریہ ہوتا ہے اور نہ کوئی ازم الیکشن کے زمانے میں یہ جدھر رخ کرتے ہیں ادھر اپنے حلقے کے غریب مسلمانوں کا بھی منہ موڑ دیتے ہیں۔ اگر مسلم فرقے کو مرکزی قیادت حاصل ہوتی تو مسلم فرقہ ان سوشل ورکروں کی زد سے بچا رہتا۔

مسلمانوں کا آج تیسرا بڑا دشمن مولوی ملّا ہے۔ یہ (خصوصی طور پر پچھلے 27 برس میں) ہر اس بات کی مخالفت کرتا ہے جو مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہو سکتی ہے جیسے مسلم پرسنل لا میں ترمیم، خاندانی منصوبہ بندی مسلم یونی ورسٹی کا قومی کردار، مسلمان عورت کا سماج میں مساوی مرتبہ، مسلمان عورت کا پردے سے باہر آ کر مرد کے دوش بدوش چلنا، وراثت میں عورت کا حصہ وغیرہ وغیرہ۔ مولوی مسلم معاشرے میں ایسی اصلاحات کی مخالفت دو وجہ سے کرتا ہے۔

(1) وہ نفسیات (PSYCHOLOGY) جنسیات (SEXUALOGY) اور عمرانیات (SOCIOLOGY) سے ناواقف ہے

(2) ذاتی غرض۔ مذہبی و نیم مذہبی معاملات کی اجارے داری اگر اسے حاصل رہے گی تو وہ باروزگار رہے گا ورنہ نہیں۔ مولوی نے انگریز کی مخالفت اسی لئے کی تھی کہ مسلم معاشرے پر جو کنٹرول اسے حاصل تھا مغربی تہذیب کی آمد سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی آج کی قومی حکومت کا بھی مولوی اسی لئے مخالف ہے کہ آج اس کو اپنا وجود خطرے میں نظر آ رہا ہے۔

بہر نوع! اب مولوی مسلم معاشرے کے لئے زیادہ دن تک دشمن بن کر نہیں رہ سکتا۔ اب وہ چراغ سحری ہے ایسی حالت میں اسکا ہات پاؤں مارنا قدرتی بات ہے۔ مولوی کی یہ آخری نسل ہے جو پروان چڑھ رہی ہے کیوں کہ اب ہر مولوی کی اولاد انگریزی تعلیم پا رہی ہے، کوٹ پتلون پہنتی ہے اور داڑھی مونچھ صاف رکھتی ہے اور قرآن رٹ کر حافظ بننے کے لئے تیار نہیں اور نہ مکتبوں کے لئے چندے بٹورنے کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے وہ آمادہ ہے۔

فرقہ وارانہ فسادات

یہ کڑوی حقیقت گلے سے مشکل ہی سے اترے گی کہ ہندستان میں فرقہ وارانہ فسادات کے ذمے دار خود مسلمان ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فساد کی ابتدا مسلمان ہی کی جانب سے ہو مگر اپنی عاقبت نااندیشی کی بنا پر مسلمان جو حالات پیدا کرتا ہے وہ اسی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے گویا ایک عقیدے کے طور پر یہ طے کر رکھا ہے کہ انھی کی انفرادی و اجتماعی ذات مجموعہ محاسن ہے اور غیر مسلموں کی مجمع معائب یہی ذہنیت یا طرز عمل تمام فتنوں اور فسادوں کا اصلی سبب ہے۔ ہر مسلمان کے دل میں یہ خواہش دبی ہوتی ہے کہ ہر کوئی مسلمان ہو جائے بل کہ سارا جہان مسلمان ہو جائے اور مسلمان کے سوا کوئی نظر نہ آئے اس خواہش کے نتیجے میں مذہبی جلسے اور تبلیغی اجتماعات برپا ہوتے ہیں۔ نودولتیے مسلمان (جن کو ہر پہلو سے ثواب کمانے کا بڑا شوق ہوتا ہے) ایسے جلسوں کے بانی منتظم بنتے ہیں۔ تقریر و تحریر کے ذریعے مذہبی تبلیغ کی آزادی انگریز کے زمانے میں بھی تھی اور آج بھی ہے (حالاں کہ فرقہ وارانہ فسادات انگریز کے عہد میں بھی ہوتے تھے اور آج بھی ہوتے ہیں) اور آزادی کے ساتھ برسر عام یہ کہنا کہ دین صرف اسلام ہی ہے ضمنی طور پر یہ واضح کر دینا بھی ہے کہ دوسرے سارے دین یا دھرم جھوٹے ہیں۔ جب مسلمانوں کا ایک ذمے دار مذہبی پیشوا چوراہے پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا ہے کہ جنت صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہے اور اپنی ہزار نیکیوں کے باوجود گاندھی جی (چوں کہ وہ کافر تھے) بھی جنت کے مستحق نہیں ہیں تو کیا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان نفرت کی ایک دیوار کھڑی نہیں ہو جاتی؟ اور پھر یہ نفرت ایک نہیں بل کہ بہت سے اختلافات اور فسادات کو راہ دکھاتی ہے پاکستان بننے کے بعد سندھ سے جو ہندو مہاراشٹر میں منتقل

ہگن ٹاک منتشانی مسلمان نمبر

ہوئے وہ ضلع تھانہ کی بستی الہاس نگر میں آ کر بسے۔ چند برس کی جدوجہد کے بعد جو سندھی اپنے روزگار میں ترقی کر گئے وہ ان کوارٹروں کو چھوڑ کر الہاس نگر سے شہر بمبئی میں آ بسے۔ ان خالی کوارٹروں کو بمبئی سے گئے ہوئے چند مسلمان گھرانوں نے بسا لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں الہاس نگر کا وہ خالی اور ویران حصہ جو ریلوے اسٹیشن سے ملحق تھا مسلمانوں سے بھر گیا۔ یہ وہی الہاس نگر کی بستی ہے جو دو لاکھ سندھیوں پر مشتمل ہے۔ بمبئی کے جو لوگ الہاس نگر کے ویرانے میں جا کر بسے ان میں ایک میں بھی تھا۔ پانی اور بجلی سے خالی ویرانے میں بسنے والے چین سے سانس بھی نہ لے پاتے تھے کہ ایک رات چند مسلمانوں نے ایک میٹنگ کی اور مجھے بھی بلا بھیجا۔ بات یہ تھی کہ ایک رسید بک لئے ہوئے وہ میرے کوارٹر پر پہنچے اور ان میں سے ایک صاحب نے فرمایا:

"ہم سب مسلمانوں نے یہاں ایک جماعت قائم کی ہے۔ اس کا نام ہم نے اتحاد المسلمین رکھا ہے تاکہ عید بقر عید کے موقعے پر نماز کا انتظام کیا جائے اور محرم میں وعظ وغیرہ کا۔" میں نے انھیں سمجھانے کے انداز میں جواب دیا: "یہ سندھیوں کی بستی ہے۔ سرکار نے ان ہی کو یہاں رہنے کا حق دیا ہے۔ یہ سندھیوں کی کھلی ہوئی سماحت ہے کہ یہاں مسلمانوں کے بسنے پر انھیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ نے اگر اپنی مسلمانیت کا ڈھنڈورہ پیٹنا شروع کیا تو ان میں جھنک پیدا ہو جائے گی اور پھر آپ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ رہی عید بقر عید کی نماز کی بات تو کلیان اور امبرناتھ یہاں سے ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہیں، نماز وہاں بھی پڑھی جا سکتی ہے۔" لیکن وہ مسلمان ہی کیا جو معقول بات مان جائے۔ میری بات کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ بس نتیجہ سن لیجئے کہ ڈیڑھ برس بعد الہاس نگر کے اسی مسلم علاقے میں جب بڑا فساد ہوا اور آتش زنی اور لوٹ مار سے کئی مسلمان گھرانوں کو کافی نقصان پہنچا۔

ہوتا یہ ہے کہ بیشتر مولوی ملا اور واعظ مسلمان بستیوں میں پہنچتے ہیں۔ ثواب کمانے کی خواہش میں بستی کے دولت مند مسلمان ان ملاؤں کی آؤ بھگت کرتے ہیں اور دیتے ہیں۔ وعظ و تبلیغ کے جلسے منعقد ہوتے ہیں اور ہر جلسے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ ہمارے فرقے کے عقائد و اعمال حق

گگن کا ملتانی ...

فرقے کے عقائد و اعمال سے بہتر ہیں اور یہی فیصلہ دو فرقوں کے درمیان نفرت پیدا کرتا ہے۔ دربار اکبری کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد نے اکبر بادشاہ کے متعلق ایک بات کہی تھی اس کا یہاں محل ہے وہ سنئے:-

"اسے یہ یقین تھا کہ ہر مذہب میں حق پرست اور صاحب معرفت لوگ ہوتے ہیں۔ نیک نیت بادشاہ جو سب سے اعلیٰ رتبے کی بات سمجھتا تھا وہ یہ تھی کہ پروردگار رب العالمین ہے اور قادر مطلق ہے اگر سارا حق ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتا اور وہی خدا کو پسند ہوتا تو اسی کو دنیا میں رکھتا باقی سب کو نیست و نابود کر دیتا۔ لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک مذہب نہیں، سب اسی کے مذہب ہیں!"

اردو اور مسلمان

اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہندوستان کے مسلمان جہاں کہیں دوسری علاقائی زبانیں بولتے ہیں اور کئی علاقائی زبانیں ان کی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ آج اور ہمیشہ شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے اردو کو اپنی ہی زبان کہا ہے۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی نے "فرہنگ آصفیہ" کے تبصرے (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 1887ء) میں فرمایا تھا:-

"دوسری شرط یہ تھی کہ ڈکشنری لکھنے والا شریف مسلمان ہو کیونکہ خود دہلی میں بھی فصیح اردو صرف مسلمانوں ہی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی سوشیل حالت اردوئے معلیٰ کو ان کی مادری زبان نہیں ہونے دیتی۔ کمال خوشی کی بات ہے کہ ہماری ملکی زبان کی پہلی ڈکشنری جس پر تمام آئندہ ڈکشنریوں کی بنیاد رکھی جائے گی ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس میں دونوں ضروری شرطیں موجود ہیں۔"

غیر مسلموں نے اردو کو اپنی مادری زبان بنا کر کبھی نہیں سیکھا محض دفتری اور کاروباری ضرورت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اردو زبان پڑھیں۔ غیر مسلم اردو کو اپنی مادری زبان کا مرتبہ دے بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ ان کی تہذیب و تمدن اور مذہبی و ادب سماجی روایتوں اور قدروں کا تعلق اردو زبان سے بالکل نہیں تھا۔ اسی لئے دنیاداری اور کاروباری مصلحت کی بنا پر غیر مسلم مرد اردو زبان سیکھتے تھے اور اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے مذہبی رسم و رواج کی بقا کے لئے اپنی خواتین کو اپنی مادری زبان (ہندی) ہی سکھلاتے تھے۔ اسی لئے پنجاب میں ہندی کو عورتوں کی زبان کہتے تھے۔ اردو کس حد تک مسلمانوں کی زبان ہے یہ بات جناب سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے سنئے :-

"خاص طور پر مسلمانوں کو تو بہت ہی صدمہ ہوا کیوں کہ اردو کے خاتمے سے نہ صرف یہ کہ ان کا سماجی و ثقافتی نقصان تھا بلکہ ان کے عقیدے اور مذہب کے مستقبل کا بھی سوال تھا، اردو زبان ہی اسلامی ثقافت و تہذیب سے رابطے کا تنہا ذریعہ تھی، اس زبان میں ہندوستانی مسلمانوں کا سارا مذہبی لٹریچر ہے اس کا رسم خط عربی رسم خط سے قریب تر ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے اس زبان سے مسلمانوں کی محرومی کا مطلب ان کی قومیت ملی امتیازات اور مذہبی سرمائے کی بربادی تھی۔۔۔!"

1947ء کے بعد بساط پلٹ گئی۔ چوں کہ مسلمانوں نے اپنے مطالبۂ پاکستان کو تقویت پہنچانے کے لئے اردو کو اپنی زبان قرار دیا تھا (اور ان کا یہ اظہار درست بھی تھا) اس لئے پاکستان بنتے ہی ہندوستان کی اکثریت نے بھی اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا کہ اب ہندوستان میں اردو کا کوئی مقام نہیں ہے۔ جمہوریت میں گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے ایک ہزار میں نو سو ننانوے (بلکہ ایک لاکھ میں ننانوے ہزار نو سو ننانوے) مسلمانوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ پاکستان بن گیا، اب ہندوستان کی اکثریت اردو کو ہندوستان میں وہ مقام دینے کے لئے تیار نہیں جو اس کو 1947ء قبل ہندوستان میں حاصل تھا

عذر یہ ہے کہ یوپی جو اردو کا گڑھ رہ چکا ہے وہاں صرف ساڑھے دس فی صدی اردو داں (یا اردو بولنے والے، مگر ضروری نہیں کہ وہ اردو زبان لکھنا پڑھنا جانتے ہوں) پائے جاتے ہیں (جب یوپی کا یہ حال ہے تو دوسری ریاستوں کا حال معلوم) اس لئے اردو کو کوئی سرکاری درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اب دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو جمہوریت کا یہ فیصلہ مان لینا چاہیئے۔

1947ء کے بعد اس سلسلے میں مسلمانوں نے ایک پلٹا کھایا یعنی 14 / اگست 1947ء کی رات گزرتے ہی ہندوستان کا مسلمان اردو کو سب کی زبان کہنے لگا مسلمانوں کی اس سیاسی مصلحت (یا ریاکاری) کا وہ چند غیر مسلم بھی ساتھ دینے لگے جو صحافی ادیب، افسانہ نگار یا شاعر ہونے کی بنا پر اردو کے ذریعے اپنی روزی کمانے کے لئے مجبور تھے یا بوڑھے ہو جانے کی بنا پر ہندی یا کوئی دوسری نئی زبان نہیں سیکھ سکتے تھے اور اپنی تھوڑی سی بقیہ عمر کی خاطر اپنی ساری پچھلی زندگی کے علمی و ادبی کارنامے کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے لئے تیار نہیں تھے

اس سلسلے میں کسی غیر مسلم اردو داں کرشن چندر، آنند نرائن ملا یا کسی رگھوپتی سہائے فراق کے نام لینے کا مطلب ہے اپنے کاز کو مصنوعی تقویت پہنچانا۔ آج کے ہندوستان میں جو غیر مسلم اردو داں پائے جاتے ہیں وہ 1947ء کے بعد اردو داں نہیں بنے بلکہ انھوں نے اپنی روزی کی خاطر 1947ء سے قبل تب اردو زبان سیکھی تھی جب پاکستان کے قیام اور نقل آبادی کا علم کسی کو نہیں تھا اور 1947ء سے قبل کشمیری و پنجابی غیر مسلم اردو نہ پڑھتے تو اور کیا پڑھتے اور یوپی کا کائستھ بچہ اگر اردو فارسی نہ سیکھتا تو پھر کیا کرتا!

چوں کہ فراق صاحب نے اردو زبان پڑھی ہے اور اردو زبان میں وہ شاعری کرتے ہیں تو کیا محض اس بنا پر اردو کو فراق صاحب کی مادری زبان کہا جائے گا؟ سروجنی نائیڈو یا دھیا بھی انگریزی زبان کے شاعر ہیں اور سروجنی نائیڈو انگریزی زبان کی شاعر بھی تھیں اور مشہور مقرر بھی مگر دونوں میں سے کسی ایک کی بھی مادری زبان انگریزی نہیں بن سکی۔

سوال یہ ہے کہ اس کا جواب نان مسلم اردو رائٹرز کانفرنس کے شہرت یافتہ شری رام لال دیں تو اچھا ہو) کہ اردو کے سلسلے میں جن

غیر مسلم اردو داں حضرات کا نام بار بار لیا جاتا ہے اور بڑے فخر سے لیا جاتا ہے کیا وہ آج اپنے بچوں کو بھی اردو پڑھا رہے ہیں؟ میری یہ بات سن کر جناب شمیم احمد شمیم نے مجھ کو جواب دیا تھا: "تم غیر مسلموں کی بات کرتے ہو! آج تو مسلمان بھی اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھا رہے ہیں!"

اردو اور سیکولرزم

اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کا مزاج کبھی سیکولر نہیں رہا۔ اس لئے اردو زبان کو سیکولرزم سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو نے ہندوستان میں ضرور جنم لیا مگر اس کا مزاج ہمیشہ مسلمانی ہی رہا اس کی ساری تشبیہات اور کیفیات، تمام جذبات اور استعارات، واقعات اور حالات سرزمین ایران و عرب سے لئے گئے ہیں۔ نرگس، سنبل، بنفشہ، بلبل، قمری، صحرا، محل، بام، چلمن، ناقہ، نامہ بر وغیرہ سب ایران و عرب ہی کی دین ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بہار جیسا کوئی موسم نہیں ہوتا جب کہ اردو شاعری بہار و خزاں کے ذکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو پاتی جس طرح گنتی کے چند وطن پرست مسلمانوں کا نام لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان کے بچے بچے نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اسی طرح ہزاروں اور ہزاروں اردو نثر نگاروں اور شاعروں میں سے صرف نظیر اکبر آبادی کی چند نظموں اور اقبال کے "شوالے" کا ذکر کر کے اردو کو سیکولر زبان ثابت کرنا بچکانہ بات ہے۔ اس لئے بقدر نمک بل بل CONTRIBATION (حصّہ) سے اردو کو سیکولر زبان نہیں کہا جا سکتا۔

اردو کو سرکاری زبان بنائے جانے کے موضوع پر میں نے جب کسی غیر مسلم (غیر اردو داں بھی) ہندوستانی سے بات کی ہے اس نے اپنے اس اندیشے کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے کہ جنگ آزادی کے دنوں میں اردو زبان نے اپنے ہزاروں اور ہزاروں اردو اخبارات کے ذریعے دو قومی نظریے کا پرچار کیا ہے، یہ اردو ہی ہے جس نے مسلمان کو آج تک سیکولر بننے نہیں دیا اور اس اردو ہی نے پاکستان بنایا ہے اگر اردو کو پھر بڑھاوا دیا گیا تو پھر ایک پاکستان بن جائے گا۔

اب مندرجہ بالا بات کی تائید میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وہ بات سنئے جو انھوں نے اردو زبان سے متعلق بلوچستان کے ایک سالانہ جلسے میں 27 مارچ 1948ء کو اپنے خطبۂ صدارت میں فرمائی تھی:-

"اردو نے ہر مسلم تحریک کی مدد کی ہے۔ وہابی تحریک کو اس نے مدد دی۔ سرسیّد کے مشن کو اس نے چمکایا۔ خلافت کا پیغام گھر گھر اس نے پہنچایا۔ لیگ کی آواز اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچائی۔ پاکستان کا پروپیگنڈا جس برق رفتاری اور قوّت سے اس نے برّ اعظم کے کونے کونے تک میں کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں جو نیا ولولہ اور جوش اور ایک نئی زندگی پیدا کر دی ہمارے اس زمانے کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں!"

جو کچھ اوپر کہا گیا اس کے ثبوت میں ایک بات اور عرض ہے کہ کسی انگریزی روزنامے میں یا کسی بھی علاقائی زبان کے روزنامے میں "جواہرالقرآن" یا "احوال و معارف" یا "محراب و منبر" قسم کے کالم کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر کوئی بھی اردو روزنامہ (جب کہ ہفت روزہ یا ماہ نامہ کی بہ نسبت روزنامہ زیادہ عوامی ہوتا ہے) اپنے (مسلمان) فرقے کی مذہبی نمائندگی کئے بغیر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔

شری گوپال متل، جوش ملیح آبادی، سردار دیوان سنگھ مفتون) اور بابائے اردو مولوی عبدالحق اپنے اس اندیشے کا اظہار کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں اردو زبان کا روزگار سے تعلق ختم ہو چکا ہے اس لئے اب اسکا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ روزنامہ "ملاپ" کے اڈیٹر شری رن بیر کا بھی یہی کہنا ہے:-

"آج پنجاب میں جو لوگ سرکاری ملازم رکھے جاتے ہیں

---

[1] اگر ایک کروڑ میں کوئی ایک غیر مسلم راندر ساگر اپنے بچوں کو اردو پڑھائے تو اس سے بات نہیں بنتی، بات غالب کثرت کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔ (ش ک)

ان کے لئے ہندی جاننا لازمی ہے۔ انگریزی جاننا بھی، اردو جاننا لازمی نہیں ہے۔ اگر وہ اردو جانتے ہیں تو ٹھیک ہے، نہیں جانتے تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ تمہیں سرکاری ملازمت نہیں ملے گی۔ اردو جاننا یا نہ جاننا ملکا، ایسا ہو گیا ہے جیسے موسیقی کا علم یا لاعلمی ہو۔ کوئی آدمی اگر گا سکتا ہے تو اسے ملازمت میں ترجیح نہیں ملتی۔ اگر نہیں گا سکتا تو کوئی اسے ملازمت حاصل کرنے سے روکتا نہیں۔ یہ اس کا اپنا شوق ہے۔ شوق کے لئے وہ اردو سیکھتا ہے تو اچھا ہے نہیں سیکھتا تو کوئی یہ نہیں پوچھتا: "آپ اردو کا شوق کیوں نہیں فرماتے؟" ایسی حالت میں لوگ اردو سیکھنے میں وقت کیوں خرچ کریں گے۔ ان حالات میں میرا خیال ہے کہ اردو کا مستقبل نہ ہونے کے برابر ہے۔ ۱"

یہ واقعہ ہے کہ ہزار اردو بورڈ قائم کئے جائیں اور سرکار کروڑوں روپے نہیں کروڑوں ڈالر کیوں نہ خرچ کرے جب تک سرکاری ملازم کے لئے اردو جاننا لازم نہ ہوگا اردو کا مستقبل نہ ہونے ہی کے برابر رہے گا۔

مگر اندھیری گھٹا میں ستارے فنا نہیں ہوتے سرکاری سہاروں سے بے نیاز ہو کر اردو والے خود چاہیں تو مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کر کے اردو کے مستقبل کو روشن بنا سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ جذباتی نہیں معقول پسند بنا جائے۔

رسم خط کی تبدیلی

اردو زبان کے تحفظ کے لئے اردو کا عربی کے بجائے دیوناگری رسم خط میں لکھا جانا بہت ضروری ہے اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اردو رسم خط غیر سائنٹی فک ہے۔ اردو رسم خط، رسم خط ہی نہیں ہے بلکہ شارٹ ہینڈ ہے اسی لئے اس کے سیکھنے میں کسی بھی دوسرے رسم خط (خصوصی طور پر دیوناگری لپی) کی بہ نسبت زیادہ مشکل پیش آتی ہے اور ساری زندگی صرف کرنے کے بعد بھی کوئی اردو داں اپنے اردو داں لڑکے کو صحیح املا نہیں کہہ سکتا۔ اردو رسم خط زندگی کا سارا وقت صرف کرنے کے بعد بھی مکمل طور پر نہیں سیکھا جا سکتا جب کہ دیوناگری لپی چند گھنٹے میں سیکھی جا سکتی ہے اس لئے کہ اردو حرف حاصل لفظ ہوتا ہے اور ہندی حرف سُر۔ اسی لئے بھکے کو کہنا ہے کہ ہندی رسم خط دنیا کا سب سے زیادہ سائنٹی فک رسم خط ہے۔

(2) اردو کا یہ ناقص اور نامکمل رسم خط مسلمانوں میں ناخواندگی کے اضافے کا باعث بنا ہوا ہے۔ ہندوستان میں جو اردو کے علاقے (یوپی اور بہار) کہے جاتے ہیں وہاں ناخواندہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ (1971ء کی مردم شماری کی رو سے یوپی کے ضلع رام پور میں ناخواندہ اشخاص کی تعداد ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے) جنوبی ہند کے مسلمانوں میں نسبتاً تعلیم زیادہ ہے اس لئے کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں بلکہ جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں سے کوئی ایک ہوتی ہے بات یہ ہے کہ جہاں تک اردو حروف پہچاننے کا سوال ہے اردو زبان سیکھنے والا بچہ بہت تھوڑے وقت میں اردو حروف پہچاننے لگتا ہے مگر جب ان کو لکھنا سیکھتا ہے اور جوڑ ملانے کی منزل میں پہنچتا ہے تو اس کا جی اچاٹ ہو جاتا ہے

(3) اردو زبان کا یہ عربی رسم خط اردو اخبارات کی تعداد اشاعت میں کمی کا باعث ہے۔ ہندوستان میں اردو اخبارات و جرائد کی تعداد اگرچہ ہزاروں تک پہونچ چکی ہے مگر افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے سارے اردو اخباروں اور رسالوں کی مجموعی تعداد انگریزی کے کسی ایک اخبار یا رسالے یا جنوبی ہند کی کسی ایک علاقائی زبان کے جریدے کی تعداد اشاعت سے زیادہ نہیں ہے۔ اردو میں گنتی کے دو ماہ ناموں، دو ہفت روزہ اور چار روزناموں کی تعداد اشاعت کو تسلی بخش کہا جا سکتا ہے آج ہی کے دور میں اردو اخبارات کی تعداد اشاعت میں کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ 1947ء سے پہلے اور انگریزوں کے راج سے بھی پہلے یعنی غدر (1857ء) سے بھی قبل 1845ء کے لگ بھگ جب اردو کے مقابلے میں نہ فارسی تھی، نہ انگریزی اور نہ ہندی ہی ان دنوں "صادق الاخبار" اردو کا سب سے بڑا ہفت روزہ تھا اور اس کی تعداد اشاعت صرف 200 کاپیاں تھیں۔ ذرا آگے بڑھئے، تاسی لکھتا ہے: "1856ء میں اخباروں اور رسالوں میں سب سے زیادہ مقبول اور کثیر اشاعت اخبار لاہور کا

کو دو رہ تھا۔ لیکن اس کے خریداروں کی تعداد 349 سے زیادہ نہیں تھی۔ انگریزوں کے عہد میں جب نہ کانگریس برسراقتدار تھی اور نہ اردو دشمن جن سنگھ کا وجود تھا اردو کو انگریز کی حمایت حاصل تھی اور بھوپال اور حیدرآباد جیسی مسلم ریاستوں کی امداد بھی ان دنوں بابائے اردو مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو لئے بیٹھے تھے۔ انہی دنوں انھوں نے انجمن کے جریدے " اردو " کے متعلق بڑی حسرت سے لکھا تھا کہ ان دنوں " اردو " کے سالانہ خریداروں کی تعداد صرف 3 ہے۔ آج کے اردو جریدوں کی تعداد بھی چند سو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اکثر اردو رسالوں میں مؤنہ کے نام قارئین کے خطوط نام دپتے کے ساتھ شائع ہوتے ہیں بہت سے اردو ہفت روزہ اخبارات و ماہانہ رسائل انھی پول پر اعزازی طور پر اپنی کاپیاں بھیج کر اپنی تعداد اشاعت بتاتے ہیں اور خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں۔ سب واضح ہے کہ قارئین مسلمان ہیں اور ناخواندہ ہیں اور دوسری وجہ دینی سبب کہ اردو رسم خط طریق طباعت کو مشکل بنائے ہوئے ہے۔

(4) ترکی کے مصطفا کمال پاشا نہ ماہر تعلیم تھے اور نہ ماہر لسانیات مگر اپنے زمانہ کی سیاست کو سمجھتے تھے اور ان کو اپنی قوم کے مستقبل سے دلچسپی تھی چنانچہ جب انھیں یہ احساس ہوا کہ خانقاہوں میں بسنے والے صوفی اور حجروں میں رہنے والے ملا ملک کی زبان میں جو ادب تخلیق کرتے رہے ہیں وہ ادب اب آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے اور اب وہ قوم کے لئے گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے۔ ترکی زبان کی ہر کتاب کو تو ضائع کر دینا ممکن نہ تھا اس لئے کمال پاشا نے اپنے ملک کا رسم خط بدل دیا اور اس طرح پرانے ادب کی زہر آلود تعلیم سے نئی نسل محفوظ ہو گئی۔ آپ یقین کیجئے کہ اردو کی سو کتابوں میں سے ننانوے کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں اور اب ان کا مطالعہ گمراہ کن ثابت ہو رہا ہے مثال کے طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی لکھی ہوئی کتاب " حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت " سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

مولانا (مولانا محمد الیاس) کا اخلاق کے متعلق نظریہ

" ... جب تک جناب محمد علیہ السلام کے قدموں کے نیچے نہ آئیں وہ اخلاق نہیں کئی بار سید احمد سلسلہ کے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمت اللہ علیہ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تھے ایک دعوت میں میں بھی تنہا اور حضرت کے پاس بیٹھا تھا صاحب دعوت دیر تک کسی انگریز افسر کی خوش اخلاقی کا تذکرہ اور اس کے حسن اخلاق کی تعریف بڑے ذوق اور ذوبیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا (شیخ الہند) نے کچھ دیر تک تو صبر و ضبط سے سنا مگر طبیعت پر بہت گرانی ہوئی۔ مجھ سے آہستہ سے فرمایا کہ کیا کافر کے بھی اخلاق ہوتے ہیں؟" [1]

اسی گمراہ کن معلومات اور زہر آلود درس کی بنا پر کیا یہ کتاب پھونک دینے کے قابل نہیں۔ اسی کتاب سے ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو:-

" مولانا (مولانا محمد الیاس) نے فرمایا کہ آج تک غیر محرم نے میرے جسم کو مس نہیں کیا۔ صرف ایک مرتبہ ایک عورت بیمار تھی، میں گیا تو نزع کی سی کیفیت تھی اس نے جلدی میں میرے ہاتھ میں اپنے ہاتھ دینا چاہے میں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے، صرف میرے پورے اسکے ہاتھ لگ گئے " [2]

سچ تو یہ ہے کہ آج کے سائنٹفک عہد میں اردو کی تقریباً ہر کتاب نہ صرف بے کار بلکہ مضر بن چکی ہے۔ ساری کتابوں کو ضائع کر دینا تو ممکن نہیں ہے البتہ رسم خط بدل کر آج کی اور آنے والی نسل کا

---

[1] بمبئی کے منڈھی مارکیٹ کے غیر مسلموں کے اخلاق کا موازنہ اگر نل بازار کے مسلم دکان داروں کے رویے سے کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ مومن با اخلاق ہوتا ہے یا کافر! — ش ک

[2] یہاں وہ مشہور بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی انتہائی شقی القلب ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ہمارا مولوی علم جنسیات سے نہایت حد تک نابلد ہے۔ قابل رحم ہے وہ قوم کہ جس کی راہ نمائی ایسے مولوی کریں! — ش ک

اردو زبان کی آؤٹ آف ڈیٹ اور گمراہ کن کتابوں سے تعلق قطع کیا جا سکتا ہے۔

(5) اردو زبان کے پرجوش اور معصوم حامی اردو کو ایک ہندستان گیر زبان قرار دیتے ہیں جب کہ اردو زبان ہندستان گیر نہیں ہے اردو بولی ضرور ہندستان گیر ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کو ہندستان گیر بنایا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فارسی و عربی زبان کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ سے اردو کو پاک کیا جائے۔ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کے استعمال کے سلسلے میں عرب و ایران کی تاریخ کو نہیں بلکہ ہندستان کے مزاج کو ملحوظ رکھا جائے معترضہ طور پر یہ بھی کہنا ہے کہ آج پاکستان کے اردو شعراء میں اپنی تخلیقات میں ہندی الفاظ داخل کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی اردو کو آج پنجابی، سندھی اور پشتو جیسی عوامی زبان کا سامنا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اردو روزناموں کے مواد میں عوامی اپیل ہو اور اردو قاری کو اردو اخبار مسلم فرقے ہی کا ترجمان نہ محسوس ہو۔

(6) اس سلسلے میں دنیا کی تاریخ اور قوموں کی نفسیات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ آزاد ملک اپنی ہی زبان اور اپنے ہی رسم خط کو اپنائے رکھتے ہیں۔ چین و جاپان نے اپنی مادری زبان اور اپنے رسم خط کو کبھی نہیں بدلا۔ اب ہندستان آزاد ہے قدرتی بات ہے کہ وہ بھی اپنی ہی زبان اور اپنے ہی رسم خط کو ترجیح دیگا اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی حقیقت یہ بھی ہے کہ مفتوح قوم اپنی فاتح قوم کو دل سے کبھی پسند نہیں کرتی، مفتوح قوم کو فاتح قوم کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور زبان و رسم خط سے بھی عناد ہوتا ہے، ترکوں، مصریوں اور ایرانیوں نے بھی عرب قوم کی کسی چیز کو کبھی پسند نہیں کیا۔ مسلمان مصریوں کو اپنے غیر مسلم آبا و اجداد فرعونوں پر اور مسلمان ایرانیوں کو اپنے زرتشت بزرگوں پر آج بھی فخر ہے اس لئے بھی انھوں نے عربی زبان پر اپنی زبان کو اور عربی رسم خط پر رومن رسم خط کو فوقیت دی۔ اس لئے جو ہندستانی ہیں وہ کسی بھی رسم خط کی بہ نسبت اپنے دیوناگری رسم خط ہی کو ترجیح دیں گے چنانچہ ہندستان کے مسلمانوں کے قومی مفاد کے لئے یہ بات بہتر ہوگی کہ وہ اپنی زبان اردو کے عربی رسم خط پر دیوناگری رسم خط کو ترجیح دیں۔

یہاں میں خصوصی طور پر نوجوانوں سے مخاطب ہوں وہ یہ کہ رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں ہمارے بزرگ مخالفت کریں گے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی مخالفت کی پروا نہ کی جائے۔ اس مشرقی تہذیب نے ان کو ہمیشہ (گستاخی معاف) منافقت اور ریاکاری کا سبق دیا ہے کون نہیں جانتا کہ ہندستان کے (خصوصی طور پر دیوبند کے) ہر مولوی نے سرسید کی انگریزی تحریک کی واضح طور پر مخالفت کی تھی مگر آج ہر مولوی (خصوصی طور پر دیوبند کا) اپنی اولاد کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ انگریزی پڑھا رہا ہے۔ اور سرسید کا جادو ہر مولوی کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج بھی جو حضرات اردو زبان کے بڑے حامی بنے ہوئے ہیں انہی کے بچے اردو زبان سے نہ صرف تعلق توڑ چکے ہیں بلکہ وہ کان وینٹ میں تعلیم پا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا پیشہ (براہ راست یا بالواسطہ) اردو رسم خط سے تعلق رکھتا ہے۔ رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں ان کی مخالفت ایک لازمی بات ہوگی مگر ان کا احتجاج ان گھوڑا تانگے والوں کے احتجاج سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا جو اپنے شہر میں بس سروس کے آنے پر اپنے روزگار کی دہائی دے کر شور مچایا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ چند مٹھی بھر اشخاص کے مفاد پر سارے شہر کے انسانوں کے آرام و سہولت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

ہندی اور علاقائی زبان

ڈاکٹر شان محمد اپنی کتاب "سرسید، تاریخی و سیاسی آئینے میں" میں لکھتے ہیں

"راجا رام موہن رائے کی کوششوں سے ہندوؤں نے مسلمانوں سے پہلے انگریزی تعلیم کو قبول کر لیا تھا 1824ء میں سرکار نے کلکتے میں جب ہندوؤں کے لئے ایک سنسکرت کالج کھولنا چاہا تو موہن رائے نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ ان کو سنسکرت نہیں بلکہ انگریزی کالجوں کی ضرورت ہے۔ اس

مات کے گیارہ سال بعد جب مسلمانوں کو یہ معلوم ہوا کہ
سرکار اسکولوں میں انگریزی تعلیم دے گی تو انھوں نے
اس کی مخالفت میں ایک درخواست بھیجی جس پہ ۸ ہزار
مولویوں کے دستخط تھے یہی وجہ تھی کہ ان دنوں
انگریزی اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد ایک فی
صدی بھی نہ تھی اور 1871ء میں گورنمنٹ سروس
میں جب کہ ہندوؤں کی تعداد 711 تھی تب مسلمان
سرکاری ملازموں کی تعداد صرف 92 تھی۔"

افسوس! آج کے مسلمانوں میں ایک بھی راجا رام موہن رائے
نہیں جو دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی قومی حکومت سے
یہ کہے کہ ہمیں نہ اردو ترقی بورڈ کی ضرورت ہے اور نہ اردو میڈیم
کے اسکول ورکار ہیں بلکہ ہمیں تو اپنے بڑھاتے ہیں جن کی ان کو لاٹ! وہ ہندی کالجوں کی صورت ہے۔

۲۵ برس گزر چکے ہیں سیدھے سادے مسلمانوں کے عاقبت
نااندیش لیڈروں نے اردو میڈیم کے اسکولوں کے ذریعے اپنی
ایک پوری نسل کو گونگا بہرا بنا دیا ہے۔ اردو میڈیم اسکولوں کے
پڑھے ہوئے مسلمان بچے جب ہندی یا انگریزی میڈیم کے کالجوں
میں داخل ہوتے ہیں (اول تو داخلہ ملنا ہی مشکل ہوتا ہے) تو ان کی
سمجھ میں کچھ نہیں آتا اور وہ چند ہی دن میں بھاگ کھڑے ہوتے
ہیں۔ بس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان بچے ہندی پڑھیں،
انگریزی زبان سیکھیں اور اپنی ریاست کی علاقائی زبان۔ مسلمانوں
کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ سرکار اردو کے سلسلے میں جو سہولتیں دے
رہی ہے یہ سب اس کی رائج نیتی ہے اور یہ ساری نوازشیں مسلمان
جیسی بڑی اور با سنگ کا کام دینے والی اقلیت کی خوشنودی حاصل
کرنے کے لئے ہیں۔

غیر کی آگ میں مسلمان

شاید دنیا میں ہندوستان کا مسلمان ہی وہ واحد فرقہ ہے کہ
جس نے غیر کی آگ میں جلنا سیکھا ہے۔ جب طرابلس کے مسلمانوں
کا اپنا مسئلہ پیدا ہوا، جب جنگ بلقان چھڑی، جب ترکی نے
ایک نئے دور میں قدم رکھا، جب ایران میں جنگ ہوئی اور جب
جنگ [illegible] ہندوستانی مسلمان [illegible]

عراق اپنی الجھن میں الجھا تو ہندوستان کا مسلمان غیروں کی آفت و
مصیبت میں پڑ کر سوختہ ہونے لگا۔ اپنی غلامی کو بھول کر اپنے مظلوم
دکھ اور کتاب خوں چکاں کی ساری طاقت سے اس نے دوسروں
کی تائید و حمایت کی۔ جب رونے کے لئے کسی غیر کا کوئی سانحہ سامنے
نہیں آیا تو وہ عام دنوں میں منظر پیش کرے بلالے مدینے مجھے! گا گا کر
رونے لگا۔ 1947ء سے وہ پاکستان کو بھی مقدس سمجھنے لگا ہے یعنی
آزادی سے پہلے وہ تھا برہنہ تلوار، آزادی کے بعد بن گیا ذوالفقار!
اس بات کا عبرت ناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ جن غیروں کی محبت
کی آگ میں ہندوستان کا مسلمان ایندھن بن جاتا ہے وہ غیر ہندوستان
کے مسلمانوں کے وجود تک سے بے خبر رہتے ہیں ؎

میری جو پوچھتے ہو تو دیتا ہوں اُن پہ جان،
ان کا یہ حال ہے کہ ادھر دیکھتے نہیں

اگر کبھی دیکھتے بھی ہیں تو ہنس کر کہتے ہیں: "کیا تمہارے اپنے مسائل
نہیں ہیں جو ہماری فکر پڑی ہے۔" معترضہ طور پر ایک بات سنئے کہ
جب شیخ ہند مولانا محمود حسن حجاز میں ترکی کے گورنر جمال پاشا
سے ملے اور جمال پاشا سے دریافت کیا کہ ہم ترکی کی کس طرح مدد
کریں؟ "آپ ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے، اپنے ملک واپس
جائیے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہندوؤں کے تعاون سے
ہموار کیجئے اور اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کیجئے!" ایک
سیاست ناشناس ہندوستانی مولوی کو ترکی کے عظیم مدبر کا یہ برجستہ
اور واضح جواب تھا۔ مولانا محمد علی جوہر ہندوستان میں خلافت تحریک
کے ہیرو تھے مگر ترکی میں جب انھوں نے مصطفےٰ کمال پاشا سے ملاقات
کرنا چاہی تو اتاترک نے مولانا محمد علی کو ایک دقیانوسی اور جدید سیاست
سے ناآشنا ملا سمجھ کر ملنے سے انکار کر دیا۔

مگر اتنی ساری ناقدری اور اتنی بہت سی ٹھوکروں کے باوجود ہندوستان
کے مسلمان کو آج تک عقل نہیں آئی وہ پاکستان (جس کے وجود نے
ہندوستانی مسلمانوں کی پیشانی پر کلنک لگا دیا) کی ہمدردی میں بنگلہ
دیش کی آزادی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں اور حکومت سعودی
عرب کی خوشنودی کی خاطر بادشاہت کا وکیل بن کر دن رات جمہوری
قدروں اور عوامی اقتدار کی مذمت کرنے میں لگا ہوا ہے جمعیت علمائی

ندوی، دیوبندی، اور جماعت اسلامی کے ملاؤں کے لئے مولانا آزاد کی بیان کی ہوئی اس بات میں بڑی عبرت ہے:

"اسلام نے "بادشاہ" کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کر دیا ہے اور صرف ایک رئیس جمہوریت (پریذیڈنٹ آف دی پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے لئے بھی خلیفہ کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معانی نیابت کے ہیں گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے اس سے زیادہ وہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظام حکومت کے لئے شوریٰ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "وامرہم شوریٰ بینہم" چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن مجید میں ہے۔ شوریٰ کے معانی باہم مشورے کے ہیں یعنی جو کام کیا جائے جماعت کی باہم رائے اور مشورے سے کیا جائے۔ شخصی رائے اور حکم سے نہ ہو۔"

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بادشاہ چاہے مسلمان ہو وہ کتنا ہی نیک اور انصاف پسند ہو اور چاہے اس نے اپنی رعایا کی فلاح کے لئے کتنے ہی کام کئے ہوں، اس کی اچھائی تو تسلیم کر لی جائے گی مگر اس کا وجود ناجائز و ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر کوئی شخص ہمارے گھر پر قابض ہو کر بہت اچھا انتظام کرے اور سلیقے سے ہماری گرہستی چلائے تو اس کے حسن انتظام کی وجہ سے اس کے قبضۂ بے جا کو بجا یا جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غیروں کی غیر ضروری طور پر تعریف و توصیف سے کوئی فائدہ نہیں سوائے اس کے کہ اپنوں کی نظر میں اپنے وجود کو مشتبہ بنایا جائے اور اپنے حق کو اپنے ہات سے دے دیا جائے۔

ہندستانی مسلمان ہندستان میں پیدا ہوتا ہے یہیں کی آب و ہوا میں پرورش پاتا ہے یہیں کماتا ہے، کھاتا ہے، اپنی اولاد کے لئے شیش محل اور لال قلعے تیار کرتا ہے، جامعہ ملیہ، دارالعلوم مسلم یونیورسٹی جیسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھتا ہے اور پھر جامع مسجد اور تاج محل جیسی مقدس اور خوبصورت یادگاریں چھوڑ کر ہندستان ہی کی پوتر مٹی میں دفن ہو جاتا ہے اس کے باوجود اس کا اپنے ہندستان کی بہ نسبت کسی دوسرے استھان کو زیادہ پاک سمجھنا دانشمندی نہیں بلکہ اس کے سارے تاریخی کردار کو مسخ کرنے والی بات ہے۔ عقل کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے یہی ثابت کرے کہ "سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا" اسی بات میں اس کے سارے مسائل کا ایک حل مضمر ہے یعنی جس طرح 1857ء کے بعد انگریز کے سامنے مسلمان کے لئے قابل اعتماد ثابت ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح 1947ء کے بعد ہندو کے سامنے اس کو اپنا اعتماد بحال کرنا چاہئے۔

اسلام اور ہندستانی مسلمان

اسلام کبھی ایک بہت بڑی سچائی تھی مگر آج وہ سچائی منجمد ہو چکی ہے جب کہ سچائی کو متحرک ہونا چاہئے۔ ہندستانی مسلمان خدا کو مانے یا نہ مانے۔ اس سے زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ مافوق فطرت طاقتوں پر اعتماد کرنے سے اپنی خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور تخلیقی صلاحیت بھی کام کرنا بند کر دیتی ہے۔ توہمات جذبات اور غیر عقلیت کے بل پر اپنی زندگی کو نہ اپنے کام کا بنایا جا سکتا ہے اور نہ دوسرے کے کام کا۔ عقل کی راہ نمائی میں سائنٹفک طریقے سے جو مسئلہ حل کیا جاتا ہے وہی قابل قبول ہوتا ہے اور وہی قابل عمل بھی۔ جاہل مولوی نے معصوم مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ 14 سو برس پرانی بات آج بھی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ دنیا میں اس سے بڑی غلط فہمی دوسری کوئی نہیں ہو سکتی۔ ڈزرائیلی نے کہا تھا: "خدا کو بھی یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ ماضی کو واپس لے آئے" یقیناً وقت اور فاصلہ بڑی سے بڑی حقیقت کو بدل دیتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دنوں میں دوسروں کے عقیدوں کے بتوں کو توڑ دینا ایک مسلمہ حقیقت تھی مگر کبھی کا یہ کار ثواب آج جرم ہے۔ اخلاقی بھی اور قانونی بھی۔ کبھی حضرت مغیرہ بن شعبہ نے اپنی تلوار کھینچ کر اپنے مقابل رستم کو اسلام کی دعوت دی تھی مگر آج ایسا عمل ممکن نہیں۔ چنانچہ ہندستان کے مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ وہ اسلام جو 14 سو برس پہلے تھا موجودہ حالات میں بالکل نہیں چل سکتا اور وہ آج کے بوجھوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان اسی

یہ حال رہے تو ہر مدد گار کے چاہنے پر بھی مسلمان ترقی نہیں کر سکیں گے

اسلام اور معاشی مسائل

یہ بات اسلام ہی پر موقوف نہیں بلکہ جو مذہب بھی روٹی کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا وہ موجودہ حالات میں انسان کے ساتھ نہیں چل سکتا یعنی وہ مذہب آج ناکام ہے کہ جس کے پاس معاشی مسائل حل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور ناکامی کی پہچان یہ ہے کہ جو مذہب اپنے ماننے والوں کو روٹی دینے میں ناکام رہتا ہے وہ صدقے خیرات، زکات، بیت مال، دان یا چیریٹی پر زور دے کر انہوں ہی کو بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ بھولے مسلمان کو جاننا چاہیئے کہ آج کی ٹیکنالوجی نے وہ صورتیں پیدا کر دی ہیں کہ معذور سے معذور انسان کو بارو زگار اور خود کفیل بنایا جا سکتا ہے۔ خیرات گھر یا یتیم خانے قائم کرنے کی بہ نسبت زیادہ بہتر یہ ہے کہ معذور انسانوں کو روزگار فراہم کرنے والی فیکٹریاں کھولی جائیں محض ثواب کمانے کی خاطر انسانوں کو خیرات و زکات کا عادی بنانا انتہائی خود غرضی ہے اور ایک غیر انسانی حرکت ہے۔

قرآن برحق مگر...

اس میں شک نہیں کہ مسلمان کا قرآن برحق ہے مگر مسلمان کو فراخ دلی سے اور اپنے کھلے ذہن سے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ قرآن کے باہر بھی بہت کچھ ہے اور وہ بھی حق ہے۔ دنیا میں مسلمان ہی صاحب حق نہیں ہے بلکہ کچھ دوسرے انسان بھی صاحب حق ہیں۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کا مولوی، ہندوستان کے مسلمانوں کو عالمی حالات و واقعات کی صحیح رپورٹ (اپنی بے خبری اور بدخواہی کی بنا پر) ہی نہیں دیتا چنانچہ جب کوئی کافر کاروباری مصلحت کی بنا پر نام کمال بن جاتا ہے تو مولوی اس تاجرانہ دھرم بدلنے کو عالم اسلام کا سب سے بڑا معرکہ قرار دیتا ہے اور نیک دل مسلمان خوشی سے بغلیں بجانے لگتے ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بس اب ساری دنیا مسلمان ہوئی جاتی ہے حالانکہ انہیں نہیں معلوم کہ آج کل ہرے کرشنا ہرے راما کی جو عالمی تحریک جاری

ہے اس سے متاثر ہو کر ایک ایک وقت میں بیس تیس ہزار اشخاص اس مسلک کو اپنا رہے ہیں۔ اس حقیقت کے قطع نظر آج اسلام (یا کسی مذہب) کے کمال یا زوال، ترقی یا تنزل، فتح یا شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آج مقابلہ محنت اور سرمائے کا ہے، فتح محنت کش کی ہوگی یا سرمائے دار کی۔ ان دونوں کے تصادم کا جو نتیجہ ہوگا وہی انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرے گا مقابلے کے اکھاڑے میں اسلام (یا کوئی بھی مذہب ہے ہی) نہیں۔ اس لئے اس کی فتح کی امید ہی کرنا غلط ہے۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام فیلڈ میں اس لئے نہیں ہے کہ اسلام (اور دوسرا ہر کوئی مذہب) معاش کا مسئلہ حل کرنے میں بہت پہلے ناکام ہو چکا ہے اس لئے اب وہ آوٹ آف ڈیٹ ہے۔

کوئی شے مستقل نہیں

کہتے ہیں کہ کوئی شے مستقل نہیں تبدیلی کے سوا۔ شکسپیئر نے اس بات کو اس طرح بدل دیا ہے: "چیزیں نہیں بدلتیں بلکہ ہم بدل جاتے ہیں!" بہر صورت انسان کی فطرت تغیر پسند واقع ہوئی ہے اگر وہ اپنی تغیر پسندی کو روکتا ہے تو بیکن کے بقول: "جو نئی باتوں کو قبول نہیں کرتا وہ نئی نئی برائیوں کو دعوت دیتا ہے!" بہر نوع جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ یہی فطرت کا قانون ہے اور یہ قانون ہر شے پر نافذ ہے۔ کوئی مذہب ہو یا مسلک، کوئی ازم ہو یا سیاسی نظریہ۔ ہر نیا خیال ایک نہ ایک دن پرانا ہو جاتا ہے۔

دنیا کے لوگوں کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ سوشلزم (اشتراکیت) ایک نیا خیال ہے یعنی انسان کی معاش کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بہترین فارمولا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ مستقبل میں یہ فارمولا پرانا، ناقابل عمل اور غیر مفید بن جائے گا۔ مگر اشتراکیت آج کی سیاست کی آخری ترین شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نصف سے زیادہ دنیا اس کو اپنائے ہوئے ہے اور اس سے تمام اٹھارہی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اشتراکیت سے بہتر اور کوئی راہ نہیں۔ ہندوستان کی ہر سیاسی و مذہبی پارٹی بعض

مکمل طور پر) کسی نہ کسی حد تک فرقہ پرست ضرور ہے اور اس کی فرقہ وارانہ سیاست ہندوستانیوں کے اور خصوصی طور پر مسلمانوں کے معاشی مسائل (اور دوسرے مسائل بھی) کے حل ہونے میں مانع آتی ہے اس لئے آج کے ہندوستانی مسلمان کو صرف اور صرف اشتراکیت ہی کے سائے میں پناہ مل سکتی ہے

تم وقت کے دھاروں کا رکو گے سفر کب تک

ہندستانی مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ کی طرح آج بھی ہندستان کا مولوی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں خان عبدل غفار خاں کی زبان میں مولوی سے یہی کہنا ہے :۔

"یہ آدمی (پادری) جو تم دیکھ رہے ہو فرنگیوں کا ملّا ہے اور یہ بھی دیکھئے کہ اس قوم نے ترقی کی ہے تو اس کے ملّا نے بھی ترقی کی ہے اور یہ قوم جو بنگلوں میں رہتی ہے موٹروں میں گھومتی ہے اور سیر کرتی ہے تو اس کا ملّا بھی بنگلے میں رہتا ہے اور موٹروں میں پھرتا ہے اور ہم لوگ جب خود ذلیل و خوار ہیں اور ترقی یافتہ نہیں ہیں تو ہمارا ملّا بھی ذلیل و خوار ہے۔ اس لئے ملّا صاحب! آپ اگر یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ اگر ہم لوگوں نے ترقی کرلی تو آپ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے اور اگر ہمارا حال برا ہے تو آپ سوچیے کہ ہمارے ساتھ آپ کا بھی حال برا رہے گا۔ آپ کے ہاتوں میں ہر وقت یہی ٹوکری ہوتی ہے اور آپ گلی کوچوں میں روٹی وظیفے مانگتے پھرتے ہیں۔ اپنی موجودہ زندگی اور اس انگریز ملّا (پادری) کی زندگی پہ کچھ سوچ بچار کیجئے اور دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے!"

مولوی کوئی نئی بات سوچنے کے لئے اس لئے تیار نہیں کہ اس کو اپنے روزگار کے چلے جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ محض اس کا ڈر ہے ورنہ اگر وہ سوشلزم کا ساتھ دے اور سارے مسلمان سوشلزم کی راہ پر چل کر اپنے حالات سدھار لیں تو مولوی کے حالات بھی خود بخود سدھر جائیں گے مل کر باعزت روزگار کے بہتر مواقع اسے حاصل ہو سکیں گے اور پھر وہ اپنے آج کے اس ذلت آمیز پیشے (جمعرات کی روٹیاں، امیروں کے دسترخوان کے ٹکڑے، مکتبوں اور مدرسوں کے نام کے چندے عطیے، اور نذرانے) کو بھی ترک کر سکے گا اور بادشاہ خان کے بقول ایک پادری کی سی باعزت اور خوش حال زندگی گزار سکے گا۔ اسی لئے بہتر ہے کہ مولوی مسلمانوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے مسلمانوں کی خاطر نہ سہی کم سے کم اپنی ہی خاطر۔

"میں" کو "تو" "ہم" بنا

بات ختم کرنے سے پہلے مسلمانوں کو جو مشکل درپیش ہے اس کا بھی اعتراف کرلینا چاہیئے دراصل آج کے ہندستان میں وہ اپنے آپ کو ADJUST (کھپا) ہی نہیں کیا پا رہا۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ماضی میں نہ کبھی جمہوریت سے واسطہ پڑا اور نہ سیکولرزم سے، وہ تو حاکم رہا یا محکوم۔ برابری کی سطح پر اس نے رہنا سیکھا ہی نہیں مسلمان نے اب تک جو زندگی گزاری وہ مصنوعی زندگی تھی۔ اب اسے حاکم و محکوم کے رشتے سے ہٹ کر فطرت کے تقاضے کے مطابق دوسروں کے ساتھ EQUAL TERMS (برابری کی صورت میں) پر یعنی مساوی حیثیت سے رہنے کی کوشش کرنا چاہیئے ؎

تری قوم ہے تری آبرو، اسی آبرو کو تلاش کر
کبھی "تو" سے "آپ" بھی بن ہی جائے گا پہلے "میں" کو "تو" "ہم" بنا
مٹے دیر و کعبہ کی کش مکش، یہی شیخ کعبہ تو کام کر
کہ صنم کدے کے پجاریوں کو شریک بزم حرم بنا

"میں نے کبھی حق بات کہنے میں
تامل نہیں کیا
میں سیاہ کو سفید کہنے سے
انکار کرتا ہوں"
مولانا آزاد

اکبر الٰہ آبادی کی روح ناشاد دہلوی کے قالب میں

مشہور زماں تصنیف "اردو شاعری کے ارتقا میں شعرا کا حصہ" کے قابل مصنف و مؤلف

جناب پروفیسر بی۔ ایس۔ سری واستو آف الٰہ آباد یونیورسٹی کی رائے گرامی

" دیوان ناشاد کی بہت سی نظمیں پڑھ کر محظوظ ہوا۔ ان کا کلام واقعی طنز و ظرافت کا چھلکتا ہوا جام ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادی کی روح کو جب اپنے تنگ عرصۂ حیات میں اپنے محدود مزاحیہ کلام سے تسکین نہ ہوئی تو شریعت اسلام کو بالائے طاق رکھ کر ہندو نظریہ کے مطابق دوبارہ حضرت این۔ بی۔ سین ناشاد کے قالب میں نمودار ہوئے اور پھر ظرافت و تمسخر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تخلیقات و جذبات کا اظہار دل کھول کر بے باکانہ کرنا اپنی شاعری کا نصب العین بنایا۔ اس مجموعہ میں غالباً کوئی نظم ایسی نہ ہوگی جو شعریت و جاذبیت سے معرا ہو۔ دل نہیں چاہتا کہ ایک بار ہاتھ میں کتاب لے کر اسے جلد چھوڑ دیں۔

دیوانِ ناشاد ہر اچھے کتب فروش سے طلب کیجئے یا براہ راست پتہ ذیل سے طلب فرمایئے

قیمت: دس روپے

نیو بک سوسائٹی پوسٹ بکس نمبر ۲۵ نئی دہلی

تری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے
انجمنِ خیال
یونانی فلاسفروں نے شعر و شاعری کو خیالی باتیں کہا ہے،
مگر جب یہ عمل و تعمیر کی تلقین کرنے پر آتی ہے
تو قوم کا دامن موتیوں سے بھر دیتی ہے!

نیک خواہشات
(اسٹینڈرڈ راج کمپنی کلیان کے مالک اور انٹیریئر ڈیکوریٹر)
شیخ اقبال حسین
کی جانب سے

مدوجزر اسلام

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

سبب یا علامت گر ان کو سجھائیں تو تشخیص میں سو نکالیں خطائیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں یونہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں
طبیبوں سے ہر گز نہ مانوس ہوں وہ
یہاں تک کہ جینے سے مایوس ہوں وہ

یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفاں بپا ہے گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہلِ کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہلِ کشتی

سکھائی انھیں نوعِ انساں پہ شفقت کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسایہ سے رکھتے ہیں وہ محبت شب و روز پہنچاتے ہیں اس کو راحت
کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

ڈرایا تعصب سے ان کو یہ کہہ کر — کہ زندہ رہا اور مرا جو اسی پر
ہوا وہ ہماری جماعت سے باہر — وہ ساتھی ہمارا نہ ہم اُس کے یاور
نشاں راہ منزل کا اک اک دکھایا
بنی نوع کا ان کو رہبر بنایا

زمانہ میں ہیں ایسی قومیں بہت سی — نہیں جن میں تخصیص فرماں دہی کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہوگی — کہ گھر گھر پہ یاں چھا گئی آ کے پستی
چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں
مگر ایک ہم ہیں کہ بے بال و پر ہیں

وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں — ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں — طبیعت میں عادت میں فطرت میں خو میں
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت — نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت — خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں دوستی آشکارا
غرض کی تواضع غرض کی مدارا

نہ اہلِ حکومت کے ہمراز ہیں ہم — نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم — نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں

سیاحت کی گوں ہیں نہ مردِ سفر ہیں — خدا کی خدائی سے ہم بے خبر ہیں
یہ دیواریں گھر کی جو پیشِ نظر ہیں — یہی اپنے نزدیک حدِّ بشر ہیں
نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارہ — کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

مشقت کی ذلّت جنھوں نے اٹھائی — جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
حکومت ملی ان کو صفار تھے جو — وہ قطبِ زماں ٹھہرے عطّار تھے جو
جفاکش بنو گر ہو عزّت کے خواہاں
کہ عزّت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

بس اب وقت کا حکمِ ناطق یہی ہے — کہ جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے
دلوں سے مٹاتی ہے نقشِ عداوت — جہاں سے اٹھاتی ہے رسمِ بغاوت
مقید بھی کرتی ہے اور یہ رہا بھی
بناتی ہے آزاد بھی باوفا بھی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے — ہنر پر جہاں پیر و برنا فدا تھے
تمدن کے میداں میں زور آزما تھے — وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے
اس امید پر کوششیں تھیں یہ ساری
کہ ہو قوم کے دل میں عظمت ہماری

جنھیں ملک میں اپنی رکھنی ہو وقعت — جنھیں سلطنت کی ہو مطلوب قربت
جنھیں تھامنی ہو گھرانے کی عزّت — جنھیں دین کی ہو نہ منظور ذلت
جنھیں نسل و اولاد ہو اپنی پیاری
انھیں فرض ہے قوم کی غم گساری

الطاف حسین حالی

زمانہ دیر سے چلّا رہا ہے اے مسلمانو!   کہ ہے گردش میں میری غیب کی آواز پہچانو
وہ ناصح اور ہونگے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے   اگر میری نہ مانوگے تو پچھتاؤ گے نادانو
مری بازی کا منصوبہ گیا کب کا پلٹ یارو!   خبر تم کو بھی ہے کچھ اے مری چالوں سے بیگانو
گئے وہ دن کہ ثروت باپ دادا چھوڑ جاتے تھے   بس اب ثروت ہے مزدوروں کا حصہ اے تن آسانو
گئے وہ دن کہ لاکھوں بے ہنر یاں عیش کرتے تھے   ہوا ہے بے ہنر جینا بھی اب مشکل مری جانو!

نصیحت میری مانو اب بھی اپنی ہٹ سے باز آؤ
پھری جس وقت دیکھو میری چتون تم بھی پھر جاؤ

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی آباری   جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ ان کو   کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں   نہ چل سکتی ہے اب بے علم تجاری نہ معماری
جہاں علم و تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر   تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئے گی پسند ان نوکروں کی خدمت و طاعت   جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز   نہ فصادی نہ جرّاحی نہ کحالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا اک زیور
ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر

کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر اور نہ آہن گر نہ بازی گر نہ سوداگر

ہندسہ چاہئے مزدور اب اور راج اقلیدس
بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور

گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بئے کا گھونسلہ اور آدمی کا گھر

یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج اک کام ہے اعلیٰ توکل ہے اس سے اعلیٰ تر

نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آ کر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام اُن کا مٹا دوں گا

●

جھٹ پٹے کا وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا

ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آسان گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا

علامہ اقبال

ساقی نامہ

ذرا دیکھ اے ساقیِ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کی غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنّا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تُو اس کو سیّار کر

مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

سمجھتا ہے تُو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

●

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

اقبال

اکبر الہ آبادی

اکبر الہ آبادی ہمیشہ مغربی تہذیب کا مذاق اڑاتے رہے اور سرسید کو بھی خوب برا بھلا کہتے رہے مگر جب سرسید کی تحریک چل نکلی اور علی گڑھ کالج نے کافی ترقی کر لی تو وہ بھی سرسید کے خلوص سے متاثر ہوئے اور اُن کے حامی بن گئے۔

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح — بے علم ہے اگر تو وہ انساں ہے ناتمام
تعلیم گر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال — پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سیّد کے دل میں نقش ہوا اِس خیال کا — ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سہیں — لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی — کالج ہوا درست بصد شان و احتشام
سرمایہ میں کمی تھی سہارا کوئی نہ تھا — سیّد کا دل تھا درپئے تکمیلِ انتظام
آخر اٹھا سفر کو وہ مردِ خجستہ پے — احباب چند ساتھ تھے ذی علم و خوش کلام
قسمت کی رہبری سے ملی منزلِ مراد — فرماں روائے ملکِ دکن کو کیا سلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیان کی — خوبی سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آ گیا حضور کو حالت پہ قوم کی — پھر کیا تھا موجزن ہوا دریائے فیضِ عام

آخر سرسید سے اکبر اتنے متاثر ہوئے کہ سرسید جیسے "نیچری" کے ہاتھوں وہ اپنے آخری وقت میں مسلمان ہو گئے ؎

اب کہاں تک بُت کدے میں صرفِ ایماں کیجئے — تا کجا عشقِ بتاں میں سُستِ پیماں کیجئے
ہے یہی بہتر علی گڑھ جا کے سیّد سے کہوں — مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے

سر سید کا جب انتقال ہوا تو اکبر نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا ؎

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبرؔ
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

●

مسلمانوں بتاؤ تو تمہیں اپنی خبر کچھ ہے — تمہارے کیا مدارج رہ گئے اس پر نظر کچھ ہے
اگر کچھ ہے تو سوچو دل میں بھی اسکا اثر کچھ ہے — حریفوں کی تسلّی باعثِ سوزِ جگر کچھ ہے
تمہیں معلوم ہے کچھ رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو — اُٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو — خواصِ خشک و تر سیکھو، علومِ بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

مولانا محمد علی جوہر

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

ہے کس کے بل پہ حضرتِ جوہر یہ روکشی
ڈھونڈیں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد

فضا الٰہ آبادی

●

ستم اور جور کی جس وقت ہوتی ہے فراوانی
دلوں سے محو ہو جاتی ہے جب تہذیبِ انسانی

غنا کا نشہ ہو جاتا ہے جب سرمایہ داروں کو
ٹھکانہ جب نہیں ملتا کہیں قسمت کے ماروں کو

کسی گوشہ میں جب تسکین و آسائش نہیں ملتی
غریبوں کو زمیں پر کوئی گنجائش نہیں ملتی

تو فطرت قوم میں کرتی ہے صف شکن پیدا
دلِ حق بیں میں ہوتی ہے شجاعت کی کرن پیدا

غریبوں بے نواؤں بیکسوں کا راہبر ہو کر
نکلتا ہے مجاہد خلق میں سینہ سپر ہو کر

مجاہد قوتِ باطل کے آگے خم نہیں ہوتا
چلی جائے بلا سے جان اس کو غم نہیں ہوتا

صدائے خاتون
بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کے خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحاں میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دین احمد کے رستے
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی
پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعوی کروں گی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
طاہر مراد آبادی

جوش ملیح آبادی

پیرانِ سالوس

قبروں پہ مریدوں کو جھکاتے رہیے ڈھولک پہ سفیہوں کو نچاتے رہیے
اللہ اگر روٹھ رہا ہے روٹھے کیا اس سے غرض عرس مناتے رہیے

پرہول شکم، عریض سینے والو خوں، قوم تہی دست کا پینے والو
تم اہلِ خرد سے کیوں نہ رکھو گے عناد خیرات پہ احمقوں کی جینے والو

اے شیخ کبھی تو رنج اٹھایا ہوتا اس دل پہ کبھی زخم تو کھایا ہوتا
اس طرح لگاتا نہ دمادم ضربیں بابا! دل اگر کہیں لگایا ہوتا

ہم دیکھ کے مہوشوں کو کیا کہتے ہیں اتنا ہی کہ بس صلِّ علیٰ کہتے ہیں
لیکن یہ غلامِ زر، بہ ایں ریش دراز موقع ہو تو ہر بت کو خدا کہتے ہیں

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے انساں کو بہر طور دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گناہ جو احمق بے روح نمازوں میں لگا دیتا ہے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ

پاکستانی عوام سے خطاب

لاکھ چاہا تھا کہ ایسے میں بھی خاموش رہوں
بے نیازِ اثرِ چشم و لب و گوش رہوں
عادیٔ درگزر و زود فراموش رہوں
وقفِ مینا صفتِ بادۂ سرجوش رہوں

لیکن افسوس! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا
صاف گوئی کے سوا کوئی بھی چارا نہ رہا

سب سے پہلے مجھے کہنا ہے کہ اے پاکستان
تیری دھرتی نے مجھے جنم دیا میں قربان
میں بھی خواہ ترا ہوں، مجھے بدخواہ نہ جان
میں اگر تیرا برا مانگوں تو کٹ جائے زبان

تجھ میں، میں نغمہ سرا تھا، تو چمن تھا میرا
کس طرح تجھ کو بھلا دوں، تو وطن تھا میرا

مجھ کو پیارے ہیں دل و جاں سے سوا تیرے عوام
اُن کی ہمت میں شجاعت میں نہیں کوئی کلام
وہ پھلیں پھولیں ہنسیں کھیلیں رہیں شاد مدام
اُن کی خدمت میں بصد عجز سلام اور پیام

ہر گلی کوچے میں، ہر پیر و جواں تک پہنچے
"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

اُن سے کچھ بغض نہ کینہ، نہ کدورت ہے مجھے
اُن سے کچھ رنج نہ وحشت ہے نہ نفرت ہے مجھے
اُن سے سچ کہتا ہوں میں اب بھی محبت ہے مجھے
ہاں! مگر اُن کی حکومت سے شکایت ہے مجھے

اُن کو کینے، نہ کدورت ہی نے برباد کیا
اُن کو خود اپنی حکومت ہی نے برباد کیا

وہ حکومت کہ جو خود بیں رہے مغرور رہے
وہ حکومت، جو حقائق سے بہت دور رہے
وہ حکومت، کہ جو ناواجب و دستور رہے
وہ حکومت کہ جو بیگانۂ جمہور رہے

وہ حکومت نہیں ہوتی ہے بہی خواہِ عوام
جس کا منشا ہو کہ سب بن کے رہیں اُسکے غلام

نفع ذاتی کے طلبگار تھے یحییٰ کہ ایوب
عیش و عشرت کے پرستار تھے یحییٰ کہ ایوب
امن سے برسرِ پیکار تھے یحییٰ کہ ایوب
چین کے حاشیہ بردار تھے یحییٰ کہ ایوب

سبز باغ اُس نے ہر اک بار دکھایا ان کو
چین نے اپنے اشاروں پہ نچایا ان کو

اب ذرا غور سے سن لو کہ یہ کیا ملک ہے چین　　اسکا مولا ہے نہ معبد ہے نہ مذہب ہے نہ دین
اس میں تقویٰ نہ عبادت نہ عقیدت نہ یقین　　اس میں ہے ذکرِ خدا جیسے کہ ہو بھینس کو بین

چین کو تم نے رہِ دیں کا مسافر سمجھا
اہلِ بھارت کو مگر ملحدِ کافر سمجھا

ہم کسی دین سے ہوں صاحبِ کردار تو ہیں　　ہم ثنا خوانِ شہِ حیدرِ کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں محمدؐ کے پرستار تو ہیں　　یعنی مجبور ہیں احمدِ مختار تو ہیں

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

میری نظروں میں تو اسلام محبت کا ہے نام　　امن کا آشتی کا مہر و مروت کا ہے نام
وسعتِ قلب کا اخلاص و اخوت کا ہے نام　　تختۂ دار پہ بھی حق و صداقت کا ہے نام

میرا اسلام نکو نام ہے بد نام نہیں
بات اتنی ہے کہ یحییٰ کا وہ اسلام نہیں

سُن اے یحییٰ کہ مجھے تجھ سے بھی کرنا ہے خطاب　　راہِ شمشیر و سناں سے نہ گیا پا بہ رکاب
منزلِ اول و آخر تری طاؤس و رباب　　لیکن ہشیار کہ نزدیک ہے اب روزِ حساب

روز و شب ساغر و مینا سے تجھے کام رہا
تیرے ہاتھوں میں تو قرآں کی جگہ جام رہا

بانگلہ دیش میں کیا روپ دکھایا صد حیف　　بنتِ حوّا کے تقدس کو مٹایا صد حیف
اس کی عصمت کو سرِ راہ لٹایا صد حیف　　قتل لاکھوں کو کھلے عام کرایا صد حیف

"بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے تم نے"
ماؤں کی گود میں بچّے بھی نہ چھوڑے تم نے

لوٹ، شب خون، زنا، جبر، تشدّد، اُفتاد　　قتل، غارتگری، آتش زنی، ہڑبونگ، فساد
غیریّت، بغض، ضرر، رنج، تعصب، بیداد　　اور ستم یہ ہے کہ ان سب کو دیا نام جہاد

لفظ جو پاک تھا، ناپاک بنایا تم نے
اُس کی تقدیس کو مٹّی میں ملایا تم نے

نہ مساجد ہی کو بخشا نہ صنم خانوں کو　　قتل چُن چُن کے کیا دیش کے فرزانوں کو
جانے کیا حکم دیا فوج کے بلوانوں کو　　قتل کرتے تھے مسلمان مسلمانوں کو

اور اس پر ہے یہ دعویٰ کہ مسلمان ہو تم
شکل انساں کی سہی، اصل میں حیوان ہو تم

ہو مسلمان تو روایات کہن یاد کرو ~~~ خیبر سے احمد مرسل کا چلن یاد کرو
خدمتِ خلق کی وہ اُن کی لگن یاد کرو ~~~ منزلِ کرب و بلا، دار و رسن یاد کرو

"بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا"
سخت مشکل ہے مگر مردِ مسلماں ہونا

صاحبِ عزم و عمل، مردِ مجاہد وہ مجیب ~~~ صبح صادق کا موذن وہ بہاروں کا نقیب
نہ کوئی اُس کا مقابل نہ کوئی اس کا رقیب ~~~ ہیچ ہیں اُس کی نظر میں وہ ہوں سندکہ صلیب

اس کا پیدائشی حق ہے کہ وہ آزاد رہے
اک نئے دیس کا خالق ہے تمہیں یاد رہے

تم نے چاہا تھا۔ کہ وہ نیند سے بیدار نہ ہو ~~~ تم نے چاہا تھا، کہ وہ حق کا طلب گار نہ ہو
تم نے چاہا تھا۔ کہ وہ مالک و مختار نہ ہو ~~~ تم نے چاہا تھا، کہ وہ برسرِ پیکار نہ ہو.

سر کہ ایثار ہو جس میں وہ کہاں جھکتا ہے
چند تنکوں سے کہیں سیلِ رواں رُکتا ہے

پھر میں اب تجھ سے مخاطب ہوں اے پاکستان ~~~ تری دھرتی نے مجھے جنم دیا میں قربان
میں بھی خواہ ترا ہوں مجھے بدخواہ نہ جان ~~~ دوست دُشمن میں، دعا ہے کہ تجھے ہو پہچان

اس لئے تم سے یہ کہتا ہوں کہ ہمسائے ہو
اور ہمسائے بھی ایسے ہو کہ ماں جائے ہو

•

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی ~~~ اپنی اپنی روش پہ نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ ~~~ موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اکبر الہ آبادی

نیاز حیدر

مولوی
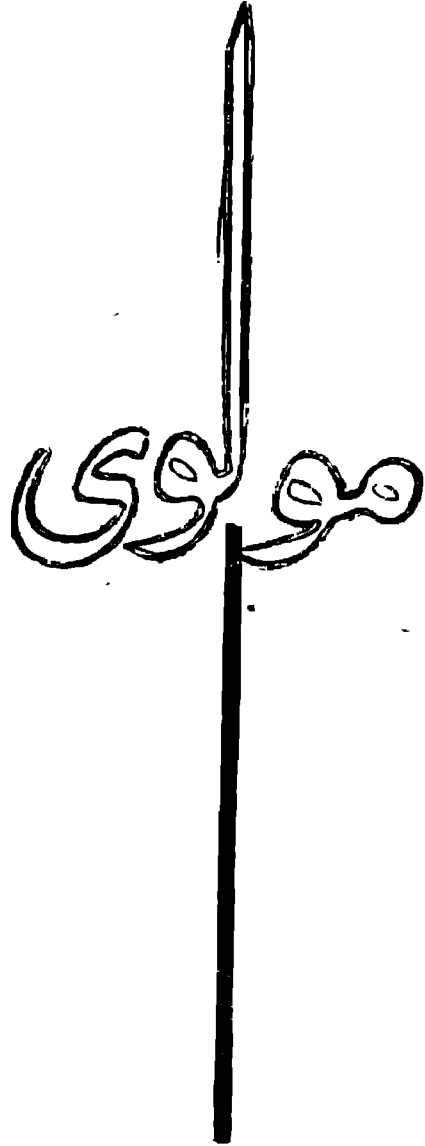
سر پہ مذہب کے اُصولوں کی پگڑی باندھے ہوئے
ایک مولانا ملے تحت الحنک باندھے ہوئے
کاسۂ ابہام پر تفسیرِ شک باندھے ہوئے
فرقِ انسانی کو ہے اب تک سنک باندھے ہوئے
پیچ ہیں ایسے مُدوّر آپ کی دستار کے
بیٹھتا ہے جیسے کالا سانپ کنڈل مار کے
گھومتی ہے ہاتھ میں تسبیح اور ہلتے ہیں لب
چلتے پھرتے، بیٹھتے اٹھتے، مسلسل روز و شب
قورمہ، حلوا، غرض ہر حال میں ہے شکرِ رب
ہے خدا اُن کا مُسبب وہ خدا کے ہیں سبب
.. فاتحے کی دعوتوں میں باوضو رہتے ہیں وہ
بانگ سن کر مرغ کی لاتقنطو کہتے ہیں وہ
اِس قدر پاکیزہ جُبّہ، دے کفن کو بھی جو مات
چھوڑ کر داغِ جبیں اُجلی ہیں اُنکی سب صفات
نیک نظریں، نیک ہے داڑھی کی جنبش نیک ذات
پاؤ گے مشغولِ تقویٰ روزِ روشن ہو کہ رات
روح کی طاقت بڑھائیں شغلِ مالِ وقف سے
پائیں دسترخوان کی خوشبو کروڑوں میل سے

نشتر خانقاهی

اثنائے سفر میں

میں سنگ اور صحرا کی پگڈنڈیوں سے نکل کر جو اس روشنیوں
کی نگری میں پہنچا تو دیکھا کہ میرے قوائے بدن اسقدر مضمحل ہو چکے ہیں
کہ میں اپنے گھٹنوں کے بل بھی سرکنے پہ قادر نہیں ہوں۔

میرے سامنے میرے بچے ہواؤں کی پوشاک پہنے ہوئے
اس طرح بے نیازانہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہیں کہ میں جیسے
کبھی راہ پیما نہیں تھا —!

میں اپنے زمانے کی بولی میں کہتا ہوں: اے میرے بچو!
مرے پاس آؤ، اور اک بار تم میری انگلی پکڑ کر مجھے
پھر سے دھرتی پہ چلنا سکھاؤ —!

کربلا سے جو تجھے پہونچا ہے وہ پیغام دے
یعنی عزم کارہائے دیں کو استحکام دے
کلمۂ طیب کے منشا اور معنی کو سمجھ
پھر اخوت کا زمانے بھر کو اذنِ عام دے

ثاقب رتلامی

بن اتالیقِ جہاں درسِ رفاہِ عام دے
فرضِ انسانی ہے یہ پہلے اسے انجام دے
آہ نالوں سے نہ یوں ماتمکدے تعمیر کر
کام وہ دنیا میں کر جو حشر کے دن کام دے

مشورہ ایسا نہ کوئی تجھ کو عقلِ خام دے
تو خودی کے زعم میں اغیار کو دشنام دے
ورنہ یہ دنیا ہے اسے ثاقب کہیں ایسا نہ ہو
پاک ناموں کو ترے کوئی برا سا نام دے

محبت کے دنوں میں دنیا رشکِ فردوس بن جاتی ہے
مگر حالتِ فراق میں دوزخ اپنا آتش فشاں منہ کھول دیتا ہے

وہ لیلیٰ بنی
اور وہ مجنوں ——— اور پھر
دونوں کا عشق بوئے گل کی طرح رسوائے زمانہ ہوگیا

حسن و عشق کی روح افزا داستان

ایسٹ مین کلر

لیلیٰ مجنوں

الفت بھرا کنول **رشی کپور** ——— گلشن محبوب **رنجیتا**

ڈینی ☆ رنجیت ☆ افتخار ☆ اچلا سچدیو ☆ اسرانی ☆ پینٹال ☆

گیت ☆ ساحر لدھیانوی سنگیت ☆ مدن موہن

ہدایت کار

ایچ ایس رویل

فلم ساز: ڈی لکس انٹرنیشنل

صنعت کا عالم
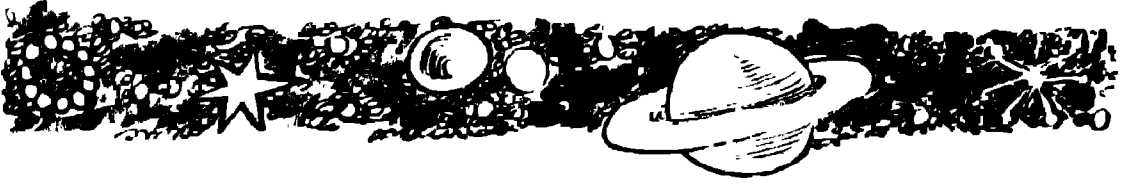
تہذیب و تمدن کا معمار انسان ہے
بازار و محل اور لباس نہیں
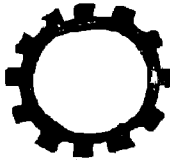
"پہچان" اور "بے ایمان"
جیسی ناقابل فراموش، حیرت انگیز
سلور جوبلی فلموں کے خالق
سوہن لال کنور
کی جانب سے
قارئین "ہندستانی مسلمان نمبر" کو
غالب کا پیغام
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں
سوہن لال کنور کی
آئندہ پیش کش
سنیاسی
جو تیزی سے تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے
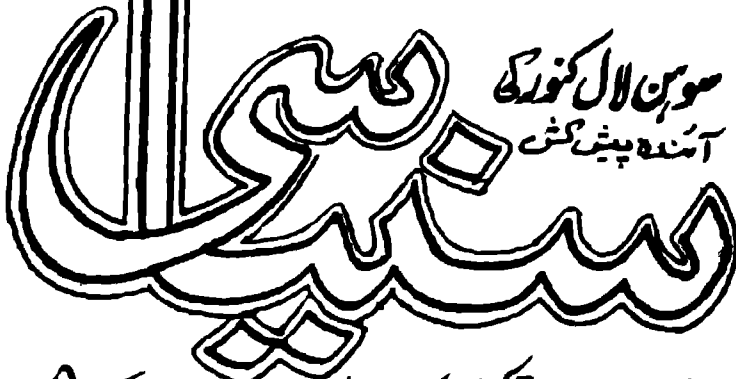
کے ۔ ایم ۔ یوسف

جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا حصّہ

بنگال کے آخری نواب مرزا محمد سراج الدولہ نے اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں برٹش حکومت کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے لئے جان توڑ کوشش کی۔ انگریزوں کی کلکتے میں قلعہ بندی کرنے پر سراج الدولہ نے کلکتے پر حملہ کیا اور ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو فورٹ ولیم فتح کر لیا۔ لیکن صرف سات ہی مہینے بعد کلائیو نے شہر فتح کر لیا۔ اور سراج الدولہ کو علی نگر کا علاقہ برٹش گورنمنٹ کے حوالے کرنا پڑ گیا۔

انگریزوں نے سراج الدولہ کی جگہ ایک انگریز پسند شخص کو نواب بنانا چاہا۔ اور اس کے لئے ان کی نظر نواب کے غیر وفادار جنرل میر جعفر پر پڑی۔ جب ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان جنگ میں کلائیو اور سراج الدولہ کی فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، تو غدار میر جعفر اور رائے درلبھ نے نواب کے ساتھ دھوکے بازی کی۔ جب کہ میر مدن اور موہن لال کی قیادت میں مٹھی بھر مسلم فوج نے انگریزوں کا جی داری سے مقابلہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز فوج کی پوزیشن کمزور پڑ گئی اور کلائیو کو منگرویو کے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایسے موقع پر سراج الدولہ کو میر جعفر نے فوج کو پیچھے ہٹانے کا مشورہ دیا۔ جب کہ موہن لال کی فوج کامیابی و کامرانی سے قریب تھی۔ اسے یہ حکم ملا اور اسے اس کی خواہش و مرضی کے خلاف پیچھے ہٹنا پڑ گیا۔ اس طرح برطانوی فوج کو کامیابی مل گئی۔

شیرِ میسور:۔ میسور کا ٹیپو سلطان جو انگریز حکومت کا سخت دشمن تھا، ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ جب ٹیپو کی موت کی خبر برطانوی کمانڈر جنرل ہارس کو ملی تو وہ خوشی سے چلا اٹھا کہ "اب ہندستان ہمارا ہے"۔ میسور کی تیسری اور چوتھی جنگ ٹیپو ہی نے لڑی تھی۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو ہندستان سے باہر نکالنے کے لئے فرانسیسیوں اور دوسری قوموں سے خط و کتابت بھی کی تھی۔ اس نے کابل، قسطنطنیہ، روس اور ماریشس تک اپنے ایلچی بھیجے۔ لارڈ ولزلی کو ٹیپو کے اس پلان کا علم ہو گیا اور اس نے آخری حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ یکم ستمبر ۱۷۹۸ء کو نظام حیدرآباد نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لیا۔ اور مرہٹوں نے فتح ہونے کی صورت میں اپنا حصہ بھی مقرر کر لیا۔ ٹیپو کی فوج میں کئی میر جعفر تھے پھر بھی اس کی فوج نے کمال بہادری سے دو ماہ تک انگریز فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن ۱۷۹۹ء میں ٹیپو مارا گیا۔ جس کے بعد اس کی دارالسلطنت سرنگاپٹنم کو انگریز فوج نے اپنے جوتوں سے روند ڈالا۔ اور ایک قتل عام برپا کر ڈالا۔ میسور کی شکست اور ٹیپو کی شہادت سے انگریزوں کی راہ کا ایک بہت بڑا روڑا ہٹ گیا۔

آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر ایک کمزور ضعیف شخص ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ایک نشان تھا۔ اس پہلی جنگ آزادی میں ہزاروں ہندو اور مسلمانوں کی قیادت ظفر اور اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل نے کی تھی!

بغاوت کچل دی گئی، دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ نے اپنی کتاب "ہندستان میں اکتالیس سال" میں یہ دل دوز بیان درج کیا ہے کہ ستائیس ہزار باغی مسلمانوں کو پھانسی دے

دی گئی۔ اور قتل عام میں مارے گئے لوگوں کا کوئی حساب تو کئی شمار نہیں!
صحیح یا غلط، برطانوی حکومت نے اسے ایک اسلامی بغاوت قرار دے دیا تھا۔ ہنری میڈ نے لکھا: "موجودہ صورت میں اسے سپاہیوں کا بلوہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ یہ سپاہیوں کی بغاوت سے شروع ہوئی۔ لیکن جلد ہی اس کی فطرت ظاہر ہو گئی۔ دراصل یہ ایک اسلامی بغاوت تھی!"
مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں، نائدے مند پیشوں اور تجارت سے نکال باہر کیا گیا۔ سر ولیم ہنٹر نے "انڈین مسلمان" میں لکھا ہے کہ "کلکتے میں اب مشکل سے کوئی مسلمان ایسا ملے گا جو سرکاری ملازمت میں چپراسی یا پوسٹ مین سے اونچی پوسٹ پر ہو!"

گورنر جنرل لارڈ ایلن برو نے سومناتھ کے مندر کا دروازہ کھولتے وقت بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ آخر کار 8 سو سالہ بے عزتی کا بدلہ لے ہی لیا گیا۔ ایک دوسرے گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹنک نے تو یہ تجویز رکھی کہ "تاج محل" کو توڑ دیا جائے اور اس کے سنگ مرمر کو بیچ ڈالا جائے!"

اٹھارہویں صدی کے عرب مصلح شیخ محمد بن عبدالوہاب کی "وہابی تحریک" کو رائے بریلی یوپی کے سید احمد کی حمایت حاصل ہوئی اور پٹنہ وہابی تحریک کا ایک مرکز بن گیا۔ 1857ء میں بھی وہابیوں نے باغیوں کی کھل کر حمایت کی تھی۔ وہابیوں کی دوسری تحریک 1835ء میں ابھری اور پورے بنگال میں پھیل گئی۔ اس کا بنیادی مقصد انگریز سرکار کو اکھاڑ پھینکنا تھا۔ یہ کل ہند پیمانے پر کام یابی سے سرکار کے خلاف لوگوں کو ابھار رہی تھی۔ تمام بنگال، بہار، پنجاب میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری شروع ہوئی بعد میں معلوم ہوا کہ اس میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے لوگ شامل تھے۔
1864ء اور 1871ء کے درمیان پانچ مقدمے ہوئے جس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو یا پھانسی دی گئی یا سزائے موت یا عمر قید ہوئی۔

بہت سے مشہور علماء جن میں مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی مظہر کریم دریاآبادی شامل تھے، کو برطانوی حکومت کے خلاف جذبات بھڑکانے کے جرم میں انڈمان جزائر میں عمر قید کی سزا کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ اکثر وہیں پر انتقال کر گئے۔
ان مقدمات کے دوران برٹش حکومت کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنگال کے قائم مقام چیف جسٹس جان پیکسٹن نورمان کو ایک مسلمان نے 20 ستمبر 1871ء کو قتل کر دیا اور لارڈ مایو کو شیر علی نامی مسلم نوجوان نے انڈمان کے جزیرے میں 8 فروری 1872ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

سن 1885ء بمبئی کے کانگریس سیشن میں رحمت اللہ ایم سیانی اور ایم اے دھرم سی بھی شامل تھے۔ لندن ٹائمز کے اس بیان نے کہ "ایک بھی مسلمان نے شرکت نہیں کی تھی۔" دروغ گوئی کی انتہا کر دی تھی
1886ء کے کلکتہ کے سیشن میں مدراس، بمبئی، شمال مغربی سرحدی صوبہ، اودھ اور بنگال سے مسلم وفود نے شرکت کی تھی۔
1887ء کے مدراس میں منعقدہ کانگریس سیشن کے صدر تھے بدرالدین طیب جی، اور اس میں 8 مسلم وفود کے علاوہ مختلف جماعتوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی تھی۔ اس سیشن میں میر ہمایوں جاہ نے کانگریس کو 5000 روپے عطیہ دیا۔ الہ آباد کے سیشن میں 222 اور 1889ء کے بمبئی کے سیشن میں 254 مسلم وفود نے شرکت کی تھی۔ 1896ء کے کانگریس سیشن کی صدارت رحمت اللہ سیانی نے کی تھی۔ لکھنؤ سیشن میں مسلمانوں کے 30 سے زیادہ وفود نے شرکت کی تھی۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو ترغیب دی تھی کہ وہ اس قومی تحریک سے خود کو علاحدہ کر لیں اور گورنمنٹ کی ناراضگی کو ختم کریں۔ ان کی دانست میں اس وقت ان کے لئے وہی ایک راستہ تھا۔
علماء کی رہنمائی میں مسلمانوں کی بڑی تعداد نے کانگریس کی پوری پوری حمایت کی تھی 1888ء مولانا رشید احمد گنگوہی علی گڑھ کے لطف اللہ اور مغربی ایشیاء کے کئی مشہور علماء نے مسلمانوں کے لئے یہ فتوا دیا کہ انھیں کانگریس میں شامل ہونا چاہیئے۔ اسے مولانا محمد لدھیانوی نے چھپوایا اور شائع کیا۔
16 اکتوبر 1905ء کو بنگال کی تقسیم کی گئی اور لارڈ کرزن نے فلر کو نئی ریاست کا لفٹیننٹ جنرل بنایا۔ سن 1906ء

کے کانگریس سیشن میں نواب زادہ خواجہ عتیق اللہ نے اس بات پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "یہ بالکل غلط بات ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان تقسیم بنگال کے حامی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ہی مسلمان ایسے ہیں اور وہ بھی صرف اپنے مقصد کے لئے اس کی حمایت کرتے ہیں۔" مشہور جیورسٹ اور مورخ امیر علی نے مرکزی نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی جانب سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ بنگال بولنے والے طبقے کا کوئی بھی حصہ بنگال سے الگ نہ کیا جائے!

پورے بنگال میں عوامی مظاہرہ کیا گیا۔ سر سریندرناتھ بینرجی اور عبداللہ رسول کی صدارت میں کئی جلسے منعقد ہوئے۔

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کی مخالفت میں انڈین مسلمان ایسوسی ایشن کی جانب سے کلکتہ کے ایک جلسے میں ڈالی گئی۔ جلسے کی صدارت مولوی غلام احمد خان نے کی تھی۔ 36 ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں صدر کی حیثیت سے نواب سید محمد کو منتخب کیا گیا۔ اور محمد علی جناح نائب صدور میں سے ایک تھے۔

سن ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان نے عام مسلمانوں میں یورپی ممالک اور خاص طور پر برطانوی حکومت کے خلاف غصے کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ اس جنگ سے ترکی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں ترکی کا جرمنی سے اتحاد کرنا تھا کہ روس، فرانس اور برطانیہ نے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جواہر لال نہرو کے مطابق "ترکی کی ہمدردی نے عام مسلمانوں کو حکومت کے خلاف کھڑا کر دیا" مسلمانوں نے چندے جمع کئے اور ان کے کچھ لیڈروں نے قسطنطنیہ جا کر ترکی قوم پرست لیڈروں سے ملاقات کی۔ مولانا محمد علی نے ترکوں کی حمایت میں کلکتہ سے ایک انگریزی روزنامہ "کامریڈ" نکالا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے پہلے "الھلال" اور پھر "البلاغ" کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا ظفر علی خان نے لاہور سے "زمیندار" کا اجرا کیا۔ ان مخالف برطانوی اخبارات کو عوامی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی۔ نتیجے میں بہت جلد ہی "کامریڈ" "الہلال" "البلاغ" پر سرکاری قانون کا نزلہ گرا۔

سن ۱۹۱۳ء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نے اپنے ہونہار شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی جو پہلے سکھ تھے کو دوسروں کے ساتھ کابل روانہ کیا تھا تاکہ وہ راجہ مہندر پرتاپ کی انقلابی پارٹی اور جرمنی، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چین، برما، جاپان، فرانس اور امریکا بھی وفود بھیجے۔ پروفیسر برکت اللہ کے ہمراہ پانچ آدمیوں کا ایک وفد جاپان گیا۔ مولانا مقبول الرحمٰن چین اور برما گئے۔ چودھری رحمت علی فرانس گئے۔ مولانا محمود الحسن کو حجاز کے انگریز پرست حکمراں نے مدینہ میں گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالے کر دیا۔ مولانا کو ان کے دوسرے ساتھیوں مثلاً مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کے ہمراہ ۱۹۱۷ء میں دفعتہً قید با مشقت کا حکم کیا ہوا۔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نگرانی میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ جہاں سے انقلابیوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی جاتی رہی!

۱۹۱۹ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس کے صدر تھے مہاتما گاندھی۔ خلافت تحریک کا مقصد تھا۔ ترکی کی حمایت کرنا اور ہندوستان کو آزاد کرانا۔ اس تحریک کے خاص ممبر تھے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا حسرت موہانی۔

۱۹۲۰ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس نے مہاتما گاندھی کی عدم تعاون تحریک کی پوری طرح حمایت کی۔ اس سلسلے میں علی برادران نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ 'مہاتما گاندھی کی جے' 'محمد علی شوکت علی کی جے' 'ہندو مسلمان کی جے' کے نعروں سے ملک کی فضا گونج اٹھی۔ اس قسم کا منظر اس سے قبل اس ملک نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۱۹۲۳ء کے کانگریس سیشن کی صدارت کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ملک کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ رکھا۔

تحریک خلافت کے دوران جمعیۃ العلماء ہند ایک منظم و موثر قوت کی شکل میں ابھری۔ اس کی بنیاد فرنگی محل کے مولانا عبدالباری، مفتی کفایت اللہ، مولانا آزاد اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے ڈالی تھی۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی سیاسی و مذہبی معاملات میں رہنمائی کرنا

اور تمام مسلمان مذہبی لیڈروں کو ایک مشترک پلیٹ فارم پر لاکر ملک کے لئے لڑانا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں اس جماعت نے کانگریس کی مکمل حمایت کی تھی۔ یہ جماعت کانگریس کے پروگرام سے پوری طرح متفق تھی۔

1920ء میں ناگ پور میں منعقدہ کانگریس میں جب گاندھی نے تحریک عدم تعاون پیش کی، تو جمعیۃ العلماء ہند نے ایک فتوا شائع کیا، جس میں مسلمانوں سے تمام اسکولوں، کالجوں اور عدالتوں کا بائی کاٹ کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ اور غیر ملکی حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات و اعزازات کو واپس کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس فتوے پر 500 مذہبی علماء نے دستخط کئے تھے جن میں کئی ایسے علماء تھے جو اسلامی قوانین و اصول پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ 1921ء میں خلافت کانفرنس نے یہ تجویز پاس کی کہ مذہبی رو سے موجودہ حالات میں برطانوی فوج میں نوکری جاری رکھنا، فوج میں بھرتی ہونا، یا کسی کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اکسانا، بالکل غلط ہے۔ مسلم عوام کو عموماً اور علماء کو خصوصاً فرض ہے کہ اس مذہبی حکم کو ملک کے ہر مسلم گھر میں پہنچا دیں۔

1920ء میں مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ عبدالمجید، اور مولانا آزاد نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی تاکہ مسلمانوں میں قومی جذبے کی تعلیم پھیلے۔

1921ء میں مالابار کے موپلا مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت چھ مہینے تک جاری رہی جس میں تقریباً 2300 موپلا مارے گئے، 1000 زخمی ہوئے اور 5000 کے قریب گرفتار کئے گئے۔ ایک سو موپلاؤں کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بھر دیا گیا۔ اور کالی کٹ سے مدراس لے جایا گیا، مدراس میں معلوم ہوا کہ آدھے سے زیادہ لوگ دم گھٹنے کی وجہ سے مر گئے۔

بدقسمتی سے موپلاؤں کا ہندوؤں سے تصادم ہو گیا۔ اور سامراج کی "تقسیم کرو، اور حکومت کرو" کی پالیسی کامیاب رہی۔ 1921ء کے بعد ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، ہندوؤں نے تجدید مذہب کے لئے شدھی، اور سنگھٹن کا رواج شروع کیا جبکہ مسلمانوں میں تبلیغ اور تنظیم نے خوب زور پکڑا۔ 1922ء میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس کا ایک خاص سیشن طلب کیا گیا اور اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ 1926ء میں ہندو مسلم ٹکراؤ اپنے عروج تک پہنچ گیا، جب صرف چھ ماہ کی مدت میں 25 سے زائد فسادات برپا ہوئے!

1927ء کے کانگریس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ اس سیشن میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا کہ "مسلمان ہندوؤں پر بھروسہ کرتے ہیں اور ہندو مسلمانوں پر، لیکن دونوں برٹش گورنمنٹ پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔" انہوں نے سامعین سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے دستوری مسئلے کو جانچنے والے سائمن کمیشن کا بائی کاٹ کریں۔ مسلم لیگ کے ایک گروپ نے محمد علی جناح کی قیادت میں کانگریس کی حمایت کی۔ اس مسئلے پر جناح اور سر محمد شفیع کے دوران ایک اختلاف رونما ہو گیا تھا۔ بیک وقت لاہور اور کلکتے میں بالترتیب سر محمد شفیع اور مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کے دو سیشن منعقد ہوئے۔ کلکتے کے سیشن نے اتفاق رائے سے سائمن کمیشن کو ہندوستانی عوام کے لئے ناقابل قبول گردانا۔ جب کہ لاہور سیشن نے مسلمانوں سے کمیشن سے تعاون کرنے کی اپیل کی۔ کمیشن کے تین مسلم ممبران میں سے دو نواب سر ذوالفقار علی خان اور سر عبداللہ سہروردی نے لاہور لیگ سیشن کی پر زور مخالفت کی اور علاحدہ الیکشن کرانے کا مطالبہ کیا۔

1930ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سب سے پہلے جمعیۃ العلماء ہند شامل ہوئی اور پھر پنجاب کی احرار پارٹی، شیعہ پولیٹیکل پارٹی اور شمال مشرقی سرحدی صوبے کے خدائی خدمت گاروں نے خان عبدالغفار خان کی قیادت میں اس تحریک میں زور و شور سے حصہ لیا۔ جب 32-1931ء میں کانگریس نے Non-rent-Campaign نامی تحریک چلائی تو غفار خاں نے سرخ پٹھانوں نے ایک اہم رول ادا کیا۔

1937ء کے بعد محمد علی جناح اور مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک عجیب شکل میں ابھرے۔

1940ء کے لاہور کے لیگ سیشن نے پاکستان کی تجویز منظور کر لی۔ اس کے فوراً بعد ہی کچھ قوم پرست مسلم لیڈروں نے دہلی میں سندھ میں اللہ بخش کی صدارت میں ایک نئی تنظیم آزاد مسلم کانفرنس

منعقد کی۔ اس میں تقریباً 75000 لوگوں نے شرکت کی اور جس نے ایک متحدہ آزاد ہندستان کی مانگ کی مکمل حمایت کی۔ پھر بھی مسلم لیگ کو رفتہ رفتہ قوت حاصل ہوتی گئی۔

مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، آصف علی، خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں قوم پرست مسلمانوں نے "ہندستان چھوڑ دو" تحریک میں حصہ لیا۔ مولانا حسین احمد مدنی کی قیادت میں دیوبند کے علماء نے کانگریس کی پوری حمایت کی۔ مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمان نے پورے ملک کا دورہ کیا اور اپنے ہم مذہبوں کو پاکستان کی مانگ کے نقصانات سمجھائے۔

جب 1943ء میں سبھاش چندر بوس نے سنگاپور میں آزاد ہند گورنمنٹ اور آزاد ہند فوج کی تشکیل کی تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد برٹش انڈیا فوج سے نکلکر نیتاجی کے ساتھ ہو گئی جنرل شاہنواز خان، عبدالرشید بیگ، عنایت وغیرہ آزاد ہند کے نہ بھلائے جانے والے افسران ہیں۔

30 مارچ 1946ء کو برٹش وزیر اعظم نے ہندستانی ریاست کے سکریٹری لارڈ پیتھک لارنس کی سرکردگی میں ایک کیبنٹ مشن کا تقرر کیا جس کا کام تھا ہندستانی لیڈروں سے معاملہ طے کرنا۔ کانگریس کی نمائندگی کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی جبکہ تقسیم کے حامیوں کی نمائندگی محمد علی جناح نے کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک جید عالم، محب وطن اور اعلیٰ مدبر تھے۔ الہلال (1912) اور البلاغ (1915) کے ذریعہ مولانا نے ہندستانی مسلمانوں کو دو صلاح دی۔ اول مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور خود میں مذہبی وسماجی اتحاد واتفاق پیدا کرنا اور دوم خود میں آزادی کی سچی روح پیدا کرنا اور کانگریس کی آزادی حاصل کرنے کی قومی تحریک میں حصہ لیں 1942ء کے رام گڑھ کے سیشن میں مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندستانی مسلمانوں کی قومیت کا بڑے واضح الفاظ میں ذکر کیا تھا

قیادت کا حق

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، سیکولرزم ہی اس ملک کی خصوصیت ہے اور اسی حق کے تحت عوامی معاملات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد کسی فرقے کے معاملات کا تنقیدی جائزہ لے اور وہ فرد اس فرقے سے تعلق نہ رکھتا ہو تو اس فرد کو محض اس بنیاد پر تنقید کرنے سے نہیں روکا جاسکتا کہ وہ اس فرقے کا فرد نہیں ہے۔ ایک ہندو کو بھی چھوت چھات یا گاؤکشی کے مسئلے پر بولنے کا پورا حق ہے۔ یہ حق صرف شنکراچاریہ ہی کو حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح مزدوروں کے کاز کے لئے ایک غیر مزدور بھی جدوجہد کر سکتا ہے۔ گاندھی جی کو شاستروں اور پرانوں کا عالم نہیں مانا گیا مگر پھر بھی وہ زندگی بھر اچھوتوں کے حق کے لئے برابر لڑتے رہے اور کوئی اس سوشل جنگ کے سلسلے میں ان کو چیلنج نہیں کر سکا۔ اگرچہ ابراہیم لنکن نیگرو نہیں تھا مگر کوئی بھی اس کو نیگرو لوگوں کے حق میں آواز اٹھانے سے نہیں روک سکا۔ آج اسلام اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، روح معدوم ہو چکی ہے۔ فرقہ جات واضح ہیں، مسلمان جاہل ہے اور غریب ہے۔ چنانچہ نام نہاد مسلم علماء کا ایک بڑا گروپ ہے جو مسلمانوں کی غریبی اور جہالت کو اپنے مقصد میں ایکسپلائٹ کر رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اب اسلام اور مسلمانوں کی فلاح کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں وہ خواہ کسی بھی فرقے، مذہب یا نظریے سے تعلق رکھتے ہوں ان کو فلاحی کام سے روکا نہیں جاسکتا۔

اے۔ بی۔ شاہ

مرتب: عزیز الرحمان جامعی لدھیانوی دھلوی

مسلمانانِ ہند کی تین سو باسٹھ 362 سالہ قربانیوں کا تاریخی جائزہ

1585 — 1947

آغازِ تحریک حرّیت ملک و ملّت
حضرت مجدّد الف ثانی سرہندیؒ 1563ء

شاہ ولی اللہؒ اسکول

شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالعزیز۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ عبدالغنی۔ سیّد احمد شہیدؒ
شاہ اسمٰعیل شہید۔ سراج الدولہ۔ ٹیپو سلطان شہید۔

پہلی جنگِ آزادی:— 1857ء بہادر شاہ ظفر جلا وطنی، شہزادوں کا قتل۔ زینت محل کی جنگ، مولانا شاہ عبدالقادر لدھیانوی مسلح بغاوت کے رہنما، مولانا شاہ فضل حق چودھری، مسلح بغاوت کے رہنما، لال قلعے کی تبدیلی، جامع مسجد کی تجویزِ فروخت، بیگمات کی بے حرمتی اور حضرت محل کا مقابلہ۔

شہدائے 1857ء:— نواب عبدالرحمان خانؒ، نواب مصطفےٰ خان شیفتہ، نواب مظہر الدولہ، نواب فرخ آباد، نواب محمد حسن خان، نواب [illegible] دہلوی، نواب اکبر خان بنگش، نواب میر خان شہید، نواب محمد حسین خان، نواب مجید الدین خان، نواب محمد خان، نواب معز خان، نواب احمد قلی خان، نواب عظیم اللہ خان رسالدار، صفدر جنگ

نواب صفدر یار جنگ۔ نواب شرف الدولہ، نواب تفضل حسین خان، نواب غضنفر حسین خان، نواب نظام الدین خان، نواب محمد علی خان نواب عبداللہ خان، نواب خان بہادر خان، جنرل کالے خان، میجر محمد حسین خان، قاضی فضل اللہ دہلوی، میجر خُرم خان میواتی، مولانا احمد شاہ مدراسی، مولانا احمد اللہ فیض آبادی، مولانا رضی اللہ بدایونی، مولانا امام بخش صہبائی، نواب اصغر یار جنگ، صوفی محمد حسن امروہی، میاں امیر خوش نویس، میر پنجہ کش خوش نویس، قاضی لطیف اللہ کاشمیری، مرزا عاشورہ بیگ، میر احمد حسین خان میکش، جنرل بخت خان، مرزا ماہ رخ، داروغہ محمد بخش، دیوان حکمت اللہ، مولوی محمد باقر، بیر علی شاہ، نواب امان اللہ خان، حکیم عبدالحق دہلوی۔ ڈاکٹر غلام رسول، ڈاکٹر امراؤ علی، مرزا اسد اللہ، مرزا احمد بیگ، مرزا نواب کرنالوی، مرزا نوشیر علی،

مرزا مغل بیگ فقیر، منشی غلام رسول دہلوی، نواب اعظم خان، سید اکبر زماں، سید کرم علی، میر کاظم صاحب، حکیم محمد رضا شہید چودھری حشمت خان۔ عباس مرزا دہلوی، خان غلام محمد خان، شیر علی خان۔

بیگمات: بادشاہ بیگم زینت محل، نواب بیگم حضرت محل اور باقی بیگمات اودھ اور دہلی جن کی تعداد ایک سو کے قریب تھی یا شہید ہو گئیں یا جلا وطن ہو کر ختم ہو گئیں۔

شہدائے ترک موالات: خان صاحب اشفاق اللہ خان کاکوری، غازی حبیب نور پشاوری غازی عبدالرشید پشاوری،

پھانسیاں: سن 1857ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو سزائے موت دی گئی، چالیس لاکھ خدائی خدمت گار جنگ آزادی کی تحریک میں قربانیاں دیتے رہے۔ تین سو خدائی خدمت گار اپنے سینے پر گولیاں کھا کر قصہ خوانی بازار میں شہید ہوئے۔

نظربندیاں: سن 1857ء میں تین ہزار مسلمان انڈمان میں نظربند کئے گئے۔ سن 1914ء کی جنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسرت موہانی مولانا ظفر علی خان کے علاوہ تین ہزار مسلمان نظربند کئے گئے

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

قیدی: مولانا اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی 1857ء مفتی عنایت احمد کاکوروی (1857ء) منشی کریم علی (1857ء) مولانا ولایت علی (1857ء) مولانا محمد میاں منصور انصاری (1919ء) مولانا شاہ عبدالعزیز لدھیانوی (1857ء) مولانا شاہ عبداللہ (1857ء) مولانا شاہ محمد لدھیانوی (1857ء)

مقدمہ ہائے سازش: لدھیانہ:۔ 1858ء۔ مولانا شاہ عبدالعزیز، مولانا شاہ عبداللہ۔ جناب چودھری محمد شفیع صاحب پنجابی دہلی کو عمر قید ہوئی۔ جیل میں انتقال ہو گیا۔

پٹنہ:۔ 1865ء مولانا احمد اللہ صادق پوری کو موت کی۔ راوی کی سزا بعد کو عمر قید میں تبدیل اور کالے پانی میں موت ہو گئی۔

انبالہ:۔ 1864ء۔ مولانا محمد یحییٰ صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، قاضی میاں جان، میاں عبدالغفار مولانا جعفر تھانیسری۔ کالے پانی کی سزا ہوئی اور سب کے سب انڈمان میں موت کی نیند سلا دیئے گئے۔

مالوہ: 1870ء۔ مولوی امیر الدین کو عمر قید، کالے پانی کی سزا، جائداد ضبط۔

راج محل: 1870ء۔ راجہ ابراہیم منڈل کو عمر قید، جائداد ضبط۔

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

پٹنہ: 1871ء: کل سات ملزم تھے جب انہوں نے سنا کہ ہم کو پھانسی دی گئی تو خوشی اور مسرت سے ان کے چہرے چمک رہے تھے۔

دیوبند تحریک آزادی کا مرکز: شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا (1901ء سے 1920ء تک) سیاسی تحریک کے مقتدا، شاہ عبدالرحیم رائے پوری (1910ء سے 1919ء تک) مجاہد وطن مولانا عبید اللہ سندھی (1910ء سے 1944ء تک) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (1917ء سے 1957ء) سیاسی لیڈروں کے رہنما حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری (1919ء سے 1960ء) سیاسی تحریک اور علماء کے قائد علامہ انور شاہ کشمیری (1920ء سے 1932ء) حاجی امداد اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی۔

شہداء و مجاہدین آزادی سن 1857ء اور جلیانوالہ باغ 1919ء تا 1947ء

مفتی صدر الدین آزردہ، دہلی، مولانا محمد منیر سہارنپوری،

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کرانہ۔ ڈاکٹر وزیر خان بہادر۔ نواب ولی خان
بلند شہر۔ امین پردھان گوجر۔ بلند شہر۔ مولانا فیض احمد خان۔ منشی
ذوالفقار الدین۔ سید محمود شاہ۔ شیخ مسیح الدین بدایوں۔ جنرل نیاز احمد
خان، مولانا کافی، مولانا وہاج الدین۔ مولانا نواب محمود خان، شاہ
غلام کھولن، مراد آباد۔ نواب غلام قادر خان، شاہزادہ فیروز
خان، شاہجہان پور۔

جلیان والا باغ اور 1919 تا 1922 کے دیگر مجاہد

ڈاکٹر سیف الدین کچلو، امرتسر۔ خواجہ فیروز الدین ایڈووکیٹ لاہور۔
حافظ محمد اکرم۔ میاں معراج الدین۔ ملک عبداللطیف، پہلوان
تھا چیچڑ، لاہور۔ مسٹر جشن الدین۔ میاں فیروز الدین، امرتسر۔
شیخ عطا محمد ایڈووکیٹ۔ جسٹس دین محمد گوجرانوالا۔ شیخ محمد حیات
چلہ، ماسٹر محمد شفیع خیاط۔ حکیم عبدالحمید، میاں سراج الدین پراچہ،
مہر علیم الدین، لاہور۔ غلام حسین امرتسر۔ رشید (بم کیس) تاج الدین
(بم کیس)۔ روشن لال (بم کیس) لاہور۔ مسٹر محمد رور، کامریڈ احسان الٰہی
میرٹھ سازش کیس۔ لاہور۔ جنرل ولی محمد خان۔ حکیم محمد یعقوب سیالکوٹ
بیگم شیخ عبدالقادر جہلم۔ ڈاکٹر نذر محمد جہلم۔ حکیم نور الدین، لائل پور
مولانا عبدالقادر قصوری۔ اقبال شیدائی لاہور۔ پروفیسر برکت اللہ
بھوپال۔ مولانا محمد اسحاق مانسہرہ۔ شیخ فضل احمد، چنیوٹ۔
حاجی دوست محمد چنیوٹ۔ مولانا اسمٰعیل سجادہ نشین، راولپنڈی،
مولانا عارف ہسوی، دہلی۔ عبدالعزیز انصاری ایم اے۔ دہلی،
مولانا خدا بخش اظہر، امرتسر۔ سحر گل خان جڑانوالہ، راجہ غلام علی خان
جڑانوالہ۔ ملک امیر خان، گجرات۔ ڈاکٹر امام الدین میرپور۔ ملک لعل دین
قیصر، کامریڈ محمد وارث، کامریڈ عزیز۔ مہندی داد انسپکٹر۔ دادا امیر
حیدر۔ شوکت عثمانی۔ مولانا عبدالمجید سالک۔ مولانا اختر علی خان لاہور
میر عبدالستار کاشمیری شملہ۔ چاچا محمدی امرتسر۔ مولانا سید حبیب لاہور
ملک لال خان۔ گوجرانوالا۔ غازی عبدالرحمن عرف ماتا لدھیانہ۔ خواجہ
عبدالرحیم عاجز امرتسر۔ ڈاکٹر محمد عالم لاہور۔ مولانا حفیظ اللہ لدھیانہ
چودھری قادر بخش وزیرآباد۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش ہوشیارپور
خان صاحب عبدالغفور، لدھیانہ۔ مولانا محمد یحییٰ، لدھیانہ۔ ڈاکٹر محمد
یاسین، لدھیانہ، حکیم سکندر خضر امرتسر۔ کامریڈ عبدالباری لائل پور

مجاہدین آزادی (1929 تا 1947ء)

راؤ عبدالغفار خان انبالہ۔ خواجہ علاء الدین لدھیانہ۔ محمد یامین تاثر
امرتسر۔ منشی احمد دین امرتسر۔ مسٹر مظہر جمیل، لدھیانہ، فضل الٰہی فرزان،
لاہور۔ پہلوان معراج الدین لدھیانہ۔ غازی عبدالعزیز لدھیانہ،
برکت علی، لدھیانہ، بابا محمد ترک امرتسر۔ مولانا عبدالغنی ڈار، امرتسری
میاں افتخار الدین، لاہور۔ سالار معراج الدین لاہور۔ خواجہ غلام محمد
لاہور۔ احمد یار خان رزمی لاہور۔ غازی عبدالرحمان ایڈووکیٹ امرتسر،
مرزا غلام نبی جانباز، امرتسر، محمد اشرف عطا، لاہور، بابا عبدالغنی لاہور
بیگم غلام محمد لاہور۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر لاہور، جہانگیر خان ایڈووکیٹ
راولپنڈی۔ مبارک ساغر، بٹالہ۔ راؤ عبدالغنی، رہتک، مولانا محمد
علی بابلوی، جالندھر۔ حکیم عبدالغنی، راولپنڈی۔ غازی عبدالرحمان،
وزیرآباد۔ مولانا لال حسین اختر بٹالہ۔ منظر علی سوختہ، کانپور۔ مولانا
محمد اسمٰعیل سنبھل، سید سجاد ظہیر۔ سید علی ظہیر۔ مولانا عظمت اللہ۔
تصدق احمد خاں شیروانی، لکھنؤ۔ رفیع احمد قدوائی۔ شفیق الرحمن
قدوائی۔ بارہ بنکی۔ عبدالمجید۔ علیگڑھ۔ مولانا حمید احمد سہارنپور
مولانا اختر اسلام، مراد آباد۔ ڈاکٹر زید احمد۔ ڈاکٹر محمد اشرف الہ آباد
مولانا ابوالحسن۔ مولانا حمد اللہ احرار۔ زید الحق انصاری غازیپور
مظفر حسین وزیر یوپی، الہ آباد۔ غازی منے خان، لکھنؤ، مولانا
عبدالقیوم، مولانا اسماعیل ذبیح، کانپور۔ مولوی فضل حق بنگال،
پروفیسر ہمایوں کبیر کلکتہ، محمد حارث، مولانا شوکت علی۔ عابد علی بھائی۔
کامریڈ مہر علی۔ میر شکر اللہ بمبئی۔ مولانا سبیا بالی، مدراس۔ شیخ عبداللہ
اللہ رکھا ساغر۔ ڈاکٹر امام الدین چودھری۔ غلام عباس کشمیر، منشی
عبدالقدیر۔ کلثوم بی عرف ارونا آصف علی۔ مصطفٰے خان عباسی
بابا محمد رستم۔ چودھری عبدالستار۔ سالار عبدالجبار، میر مشتاق احمد
مسٹر آصف علی، دہلی۔ پروفیسر اسماعیل وحشی۔ مولانا مظہر الحق بیرسٹر
عبدالقیوم انصاری بہار۔ سید انیس الرحمن بہار۔ مولانا عبدالوہاب
دربھنگہ۔ پروفیسر عبدالباری۔ ڈاکٹر سید محمود۔ پٹنہ۔ اکبر خان پشاور
کامریڈ محمد عثمان خان آخازئی۔ سید لال شاہ پشاور۔ عاشق حسین خان
ارباب عبدالغفور پشاور۔ خان غلام محمد لوند خوڑ۔ سردار عبدالرب نشتر

خان اللہ داد خان، مولانا فضل ربی، ڈاکٹر خان صاحب، سیف کاشمیری
پشاور، شہباز خان، خان لالہ رُخ، خان مہر گل، خان نصیب خان
خان عجب خان، آزاد قبائل۔ پیر غلام محمد شہید۔ عبدالمجید سندھی، سندھ

آل انڈیا کانگریس کے مسلم صدور:۔

بدرُالدین طیب جی۔ (مدراس)۔	1887.
محمد رحمت اللہ سیانی (کلکتہ)۔	1896
نواب سید محمد بہادر (کراچی)	1913
سید حسن امام۔ (بمبئی)	1918
حکیم اجمل خان (احمد آباد)	1921
مولانا ابوالکلام آزاد (دہلی)	1922
مولانا محمد علی جوہر (کوک ناڈہ)	1923
ڈاکٹر مختار احمد انصاری (مدراس)	1927

مولانا ابوالکلام آزاد (رام گڑھ) عرصۂ صدارت:
(1940 تا 1946)

1888ء میں علمائے لدھیانہ نے کانگریس میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔

جمعیۃ العلماءِ ہند

قیام: 1919ء بانی: مفتی کفایت اللہ
پہلے صدر:۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن:	1920.
مولانا ابوالکلام آزاد:	1921
مولانا حبیب الرحمان دیوبندی:	1922
مولانا سید حسین احمد مدنی:	1923
مولانا سید محمد سجاد بہاری:	1925
مولانا سیّد انور شاہ کاشمیری:	1927
مولانا سید محمد سلیمان ندوی:	1929
مولانا ابوالکلام آزاد:	1931
مولانا عبدالحق مدنی:	1937
مولانا شاہ معین الدین اجمیری:	1930
مولانا سید حسین احمد مدنی:	1940

دیگر مسلم جماعتیں

"خلافت کمیٹی" (1919ء) بانی مولانا محمد علی جوہر
"جامعہ ملیہ اسلامیہ" (1920ء) بیادگار شیخ الہند
"کابل کانفرنس" (1922ء) بانی مولانا عبیداللہ سندھیؒ
"خدائی خدمتگار" (1924ء) بانی خان عبدالغفار خان
"مومن کانفرنس" (1925ء) بانی محمد عاصم۔ بہار
"مجلس احرار" (1929ء) بانی مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی
"کشمیر نیشنل کانفرنس" (1930ء) بانی شیخ محمد عبداللہ
"شیعہ پولیٹیکل کانفرنس" (1935ء) بانی سر سید وزیر حسن
"انجمن وطن بلوچستان" (1934ء) بانی عبدالصمد خان اچک زئی
"پرجا کرشک پارٹی" (1934ء) بانی مولوی فضل الحق بنگال
"آل انڈیا مسلم مجلس" (1940ء) بانی شیخ جان محمد جاپان

جنگِ آزادی کی اُردو زبان کے مسلم روزنامے

زمیندار (لاہور) انقلاب (لاہور) احسان (لاہور)
شہباز (لاہور) احرار (لاہور) نشیمن (لاہور)
وکیل (امرتسر) پاسبان (امرتسر) الجمعیۃ (دہلی)
انصاری (دہلی)، ہمدرد (دہلی)، ہمارا دَور (دہلی)
ملت (دہلی)، حقیقت (لکھنؤ)، اجمل (بمبئی) الہلال (بمبئی)
ساتھی (پٹنہ)، آزاد ہند (کلکتہ)

ہفت روزہ:۔ الہلال (کلکتہ) لسان الصدق
(کلکتہ) حرّیت (دہلی)، روشنی (دہلی)، افضل (سہارن پور)
بے باک (سہارن پور)، انیس (لدھیانہ) خدائی خدمتگار (پشاور)
اردوئے معلےٰ (علیگڑھ)، روزنامہ آزاد اجراء 1933ء

سہ روزہ:۔ انصاری (دہلی) احرار (سہارنپور)
مدینہ (بجنور)، زمزم (لاہور)، ابنائے دارالعلوم (دیوبند)
ہماری آواز (کانپور)

ماہنامے:۔ معارف (دہلی)، شاہراہ (دہلی)، پیشوا (دہلی)،
مولوی (دہلی)، دین ودنیا (دہلی)، محشرِ خیال (دہلی)، ساقی (دہلی)

خاتونِ مشرق (دہلی) پیامِ تعلیم جامعہ (دہلی) القاسم، دیوبند، استقلال (دیوبند) دارالعلوم (دیوبند) العدل (گوجرانوالہ) ادبِ لطیف (لاہور) کلیم (الٰہ آباد) الندوہ لکھنؤ، نئی زندگی (الہ آباد) الفرقان (بریلی) جامعہ (بہار) نقیب (اعظم گڑھ)

مجلس احرار ہند کے ہائی کمان

1919 — 1947

جو اکثر و بیشتر نظر بند و اسیر رہے :- مولانا بشیر احمد پسروری صوفی عنایت محمد پسروری۔ چودھری افضل حق۔ مولانا سید محمد غزنوی مولانا مظہر علی اظہر (پنجاب) شیخ حسام الدین (دہلی) غازی عبدالرحمان امرتسری۔ ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا فیروز الدین، چودھری عبدالعزیز بیگو والا۔ قاری عبدالرحمان نکودری، چودھری شیر الزمان ایم ایل سی۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان، مولانا احمد علی شاہ مفسر قرآن۔ مفتی محمود احمد سرحدی۔ مولانا محمد صاحب (ڈیرہ اسمٰعیل خان) مولانا عبدالرحیم پوپلزئی۔ مولانا عبدالقیوم پوپلزئی (پشاور) مولانا محمد اسماعیل امیر جماعت اہل حدیث۔ مولانا سید عبدالغفار غزنوی۔ خواجہ احمد دین سیالکوٹی۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ حکیم عبدالغنی (راولپنڈی) حکیم عبدالسلام ہزاروی، حکیم نور الدین لائلپوری۔ میاں قمر الدین لاہوری، مولانا قمر الدین لاہوری۔ مولانا محمد صدیق (کراچی) مولانا گل شیر (پنجاب) مولانا تاج محمود۔ مولانا محمد قاسم، مولانا احسن عثمانی (یوپی) آغا شورش کاشمیری۔ مولانا سراج الدین (دہلی) صاحبزادہ سید سلیمان (پنجاب) سید علی رضوی (بہار) چودھری محمد شفیع سالار ناظم احرار، حافظ علی بہادر خان۔ شیخ احسان احمد شجاع آبادی۔ صوفی شیر محمد لدھیانوی۔ محمد حسن چغتائی بہاولپوری۔ علامہ محمد ارشد بہاولپوری۔ علامہ تالوت ملتانی۔ حکیم آفتاب احمد امروہی۔ مولانا محمد علی جالندھری۔ مولانا خلیل الرحمان لدھیانوی۔ مولانا نوشت علی (بنگال) حافظ محمد شتاق لدھیانوی بدرالدجے (بنگال)، خان ... علی سہارنپوری۔ مولانا عبدالواسع لدھیانوی۔ سید عنایت اللہ کشمیری۔ مولانا سمیع اللہ تاسی۔

جمعیۃ العلماء کے ہائی کمان

1919 — 1947

جو اکثر و بیشتر نظر بند و اسیر رہے :- مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی۔ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سلامت اللہ (یوپی) مولانا ابو الوفا ثناء اللہ (امرتسر) پیر محمد امام شاہ (سندھ) مولانا اسد اللہ شاہ (سندھ) سید محمد فاخری (الٰہ آباد) مولانا محمد انیس نگرامی۔ مولانا غلام نظام الدین (یوپی) مولانا محمد ابراہیم (سیالکوٹ) مولانا سید کمال الدین (یوپی) مولانا قدیر بخش (یوپی) مولانا مولا بخش (امرتسر) مولانا تاج محمد (سندھ) مولانا محمد ابراہیم (دربھنگہ) مولانا عبدالحلیم (بہار) مولانا محمد اکرم خان (بنگال) مولانا منیر الزماں (بنگال)۔ مولانا محمد صادق (کراچی) مولانا محمد داؤد (امرتسر) مولانا سید اسماعیل (امرتسر) مولانا عبداللہ (پنجاب) مولانا آزاد سبحانی (یوپی) مولانا سید حسین احمد مدنی (یوپی) مولانا حبیب الرحمان (لدھیانوی) مولانا عزیز گل (سرحد) مولانا معین الدین (اجمیر) مولانا انور شاہ کشمیری۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ حکیم اجمل خان (دہلی) مولانا عبدالماجد (بدایوں) مولانا حسرت موہانی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا محمد سجاد۔ مولانا رکن الدین۔ مولانا خدا بخش۔ مولانا حبیب الرحمان (دیوبند) مولانا عبید اللہ (سندھ) مولوی محمد صادق۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹ، مولانا بقاء اللہ پانی پتی مولانا عرفان سرحدی۔ (بمبئی) مولانا منظور النبی (سہارنپور) مفتی نثار احمد (کانپور) مولانا احمد حسن (امروہی) ڈاکٹر انصاری (دہلی) مولانا احمد اللہ پانی پتی۔ مولانا احمد علی مفسر قرآن (لاہور)

اسیرانِ فرنگ مجلس احرار

1929 تا 1947

صوفی عنایت اللہ پسروری، حکیم عبدالحفیظ دہلوی، راؤ محمد کامل خان (یوپی) مولانا عزیز الرحمان جامعی (لدھیانوی)

مولانا شاہد شیروانی، علی گڑھ، کامریڈ محمد بشیر علی گڑھ، کوثر میرٹھی یو۔پی، علامہ انور صابری، دیوبند، عبدالغفور انوری، ملتان۔ مولانا محمد احمد کاظمی۔ الہ آباد۔ حاجی محمد فاروق آل کلکتہ والے، دہلی۔ نواب زادہ نصر اللہ خان ڈیرہ غازی خان۔ خان محمود علی خان سہارن پور۔ میاں قمر الدین، لاہور۔ میر عبدالقیوم، لائل پور۔ میر احمد حسین دہلوی۔ علامہ ارشد بہاول پور۔ علامہ طالوت بہاولپور حکیم آفتاب احمد امروہوی۔ خان عزیز احمد خان، بریلوی۔ محمد حسن چغتائی۔ بہاول پور۔ مولانا عبداللہ فاروقی دہلوی۔ ڈاکٹر محمد عمر سکھر سندھ۔ خان محمد اکبر خان بلوچستانی۔ بلوچستان۔ شیخ محمد رسیع لکھنوی مولانا حامد الانصاری غازی۔ قاضی مختار احمد کانپوری۔ خواجہ محمد اعظم لدھیانوی، خواجہ محمد یوسف لدھیانوی۔ ملا عبدالرحمان لدھیانوی مولانا محمد چراغ گوجرانوالا۔ مفتی محمد عبداللہ لدھیانوی۔ شیخ عمر الدین پبلک لوٹ ہاؤس، لدھیانہ۔ چودھری علی محمد فروٹ مرچنٹ لدھیانہ

اسیرانِ فرنگ مجلس جمعیۃ العلماء

1929 تا 1947

مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی ملیح آبادی مولانا بشیر حسینؒ بجنوری۔ مولانا نورالدین بہاری، مولانا عبدالصمد رحمانی مونگیر۔ مولانا سید فخر الدین مراد آبادی۔ مولانا سید محمد میاں دیوبندی مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری۔ مولانا عبدالوہاب آروی (بہار) مولانا عبدالماجد دہلوی۔ مولانا شاہد فاخری الہ آبادی۔ مولانا اسمٰعیل سنبھلی۔ مولانا منت اللہ بہاری۔ مولانا محمد قاسم شاہجہاں پوری مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی۔ مولانا عبدالحق مدنی۔ مولانا وحید الدین قاسمی شیر کوٹی۔ مولانا عمر دراز بیگ مرادآباد۔ قاری محمد طیب دیوبند۔ مفتی عتیق الرحمٰن دہلی۔ مفتی نثار احمد کانپوری۔ مولانا عبدالمنعم، بمبئی۔ مولانا سیف الدین، بمبئی۔ حکیم ابو یوسف اصفہانی بمبئی۔ محمد جمیل بیرسٹر، میرٹھ۔ سیٹھ محمد میاں حاجی، حاجی موسیٰ خان شیروانی علی گڑھ۔ قاری عباس حسین، یوپی، مولانا شاہ ذوالحسین مولانا عبدالقدیر بدایونی۔ خان بہادر جان محمد دہلوی، کلکتہ۔ حافظ رحمت الٰہی متکلف، دہلوی۔ حافظ عبدالعزیز کونسلر دہلی۔ سیٹھ محمد یعقوب، مدراس۔

شاعر اور صحافی ۔ ادبی اور قلمی مددگار

قاضی نذر الاسلام۔ فیض احمد فیض لدھیانوی، شوق غلام مصطفےٰ تبسم۔ ڈاکٹر تاثیر، لاہور۔ پطرس بخاری، لاہور۔ مولانا مظہر علی اظہر۔ م۔ حسن لطیفی لدھیانوی، شعری بھوپالی۔ اقبال سہیل اعظمی۔ اعظم لدھیانوی۔ حامد اللہ افسر لکھنوی۔ اسلم رامپوری۔ خباب ابن رحمت جالندھری۔ بسمل سعیدی۔ یورش کاشمیری۔ وزیر علی آزاد لدھیانوی۔ سیماب اکبرآبادی۔ اختر شیرانی، لاہور۔ حفیظ جالندھری۔ مولانا گرامی جالندھری۔ شاد عارفی رامپوری۔ کامریڈ ترمی لاہوری۔ ن۔ م۔ راشد، دہلی۔ معین احسن جذبی۔ قتیل شفائی، لاہور۔ احمد ندیم قاسمی لاہور۔ مسٹر عبدالحق لدھیانوی۔ شورش بخاری لاہور۔ مجید لاہوری۔ سلام مچھلی شہری۔ علامہ شفیق جونپوری علامہ طالوت ملتانی۔ محی الدین ملک لدھیانوی۔ ظفر اقبال لاہور۔ احمد مشتاق لاہور۔ انیس الرحمٰن لدھیانوی۔ غلام ربانی تاباں دہلی۔ اسد ملتانی، ملتان۔ ماہر القادری ماہر پور۔ مولانا احمد سعید دہلی۔ مولانا شفیع الدین نیر جامعی۔ مولانا حالی۔ حکیم اجمل خان شیدا۔ عبدالرحیم عاجز امرت سری۔ مرتضیٰ میکش لاہوری۔ انعام اللہ خان ناصر طفیل ہوشیار پوری۔ ابوزر بخاری ملتانی۔ وامق جونپوری۔ آغا حشر کاشمیری بمبئی آل احمد سرور، علی گڑھ۔ احسان دانش، لاہور۔ کوثر ہاشمی کانپور، علامہ حسین میر کاشمیری۔ احسن عثمانی۔ یوپی۔ عبدالحمید عدم لاہور۔ اکبر الہ آبادی۔ الطاف مشہدی۔ ڈاکٹر عابد حسین عابد۔ سردار جعفری۔ نشور واحدی۔ نشتر جالندھری۔ اختر الایمان ٹونک۔ علامہ انور صابری وقار انبالوی، انبالہ۔ امین گیلانی امرت سر۔ نکہش صدیقی، حاجی لق لق لاہوری۔ تجلی اعظمی۔ مولانا حسرت موہانی۔ علامہ اقبال لاہور۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا ظفر علی خان۔ جوش ملیح آبادی احسن پھوپھوندی، کوثر میرٹھی۔ عبدالکریم وزیرآبادی۔ ساغر نظامی ساحر لدھیانوی۔ مرزا غلام نبی جانباز۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا غلام رسول مہر لاہور۔ عبدالمجید سالک لاہور۔ اظہر امرتسری۔ مولانا عثمان فارقلیط۔ یوپی۔ کامریڈ عبدالباری لاہور۔ شاہ معین الدین ندوی۔ عبدالمجید انصاری، اظہر شاہ کاشمیری۔ کامریڈ عبداللہ ملک۔

محمد وارث کامل، یوپی - مولانا عبدالباقی، سید عبداللہ بریلوی
نصراللہ خان عزیز - حافظ علی بہادر خان - حیات اللہ انصاری -
علامہ بدر جلالی - یوپی، محمد اشرف عطا، لاہور - رئیس عظیم آبادی پٹنہ
سلیمان صابر، یو۔پی - مولانا عبدالرزاق، رحیم قاسمی - قاضی عبدالغفار
رئیس امروہوی - قاضی زین العابدین، مولانا سلطان الحق، دیوبند،
ڈاکٹر ذاکر حسین - عبدالرحمٰن - چراغ حسن حسرت، ابوسعید بزمی
بھوپال - قاضی عدیل عباسی - قاضی احسان اللہ - ہلال احمد زبیری دہلی -
ناز انصاری دہلی - مولانا سید حبیب - کوثر چاند پوری - ابواللیث ندوی

ابوالاعلیٰ مودودی - مولوی سجاد ن پوری - اسرار احمد آزاد یوپی
وقار انبالوی - ڈاکٹر عابد حسین دہلی - عزیز حسن بقائی - دہلی -
ذکریا اسعدی، یوپی - ملا رموزی بھوپال - ریاست علی ندوی -
مولانا حامد الانصاری غازی - شوکت علی فہمی، سید محمد جعفری - دہلی،
حارث جاسی، بمبئی - امیر اصغر علی عباسی - بمبئی - نیاز فتح پوری
عبداللہ یوسف علی - ظہیر دہلوی - دہلی، سجاد ظہیر لکھنوی - امین احسن اصلاحی
چودھری افضل الحق، مولانا سعید اکبرآبادی، مولانا منظور نعمانی، سید نذیر محمد عاقل
مولانا تاجور نجیب آبادی - عزیز الرحمٰن جامعی، لدھیانوی - فیض احمد فیض لاہور

ہندستانی مسلمان کے دو رُخ

مصطفیٰ زیدی مرحوم (تیغ الہ آبادی) کے والد لخت حسنین یمین بھنیڑا ضلع بجنور (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے بعد میں الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی، سی آئی ڈی انسپکٹر تھے۔ خلافت کی تحریک کے دنوں میں لخت حسنین نے جہاں دوسروں کو گرفتار کیا وہاں مولانا محمد علی کو بھی انھوں نے گرفتار کر لیا مسلمانانِ الہ آباد نے اپنی ناراضگی کا اظہار ایک نظم کی صورت میں کیا۔ اس نظم کے دو مصرعے تھے ؎

محمد کا دشمن علی کا عدو   کہاں کا ہوا لختِ حسنین تو

حکیم صادق علی خان کے بیٹے حکیم محمود خان (حکیم محمد اجمل خان کے والد) اور حکیم مرتضیٰ خان جو خاندانی مسلمان تھے۔ جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو ان دونوں بھائیوں نے لوگوں کے ساتھ بڑی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ سارے اہل محلہ، اقربا و احباب بلا امتیاز امیر و غریب تقریباً 500 آدمیوں کو اپنے گھر میں رکھا اور جب تک یہ ہنگامہ فرو نہیں ہوا اس وقت تک ان کی ہر طرح کی خبر گیری اور خاطر مدارات کرتے رہے۔ ایک دن کسی مخبر کے مخبری کرنے پر وہ سب لوگ جو حکیم صاحب کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انگریزی سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کوتوالی چلے گئے۔ حکیم مرتضیٰ صاحب کو بھی اپنے مہمانوں کے ساتھ تین دن تک کوتوالی کی حوالات میں قید رہنا پڑا۔ پھر بڑی مشکل اور کوشش سے ان سب کو رہا کرایا۔ خود بھی چھوٹے اور پھر سب کو اپنے ساتھ لے کر ریاست پٹیالا چلے گئے اور اپنے بڑے بھائی محمد خان کی جگہ مطب کرنے لگے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی میں حکیم محمود خان اپنے مرحوم والد حکیم صادق علی کی جگہ مطب میں بیٹھ گئے۔

تاریخ ہندوستان

6 ہزار برس قبل مسیح سے 20 ویں صدی عیسوی تک

- ہندوستان میں 6 ہزار برس قبل مسیح آریوں کی آمد۔
- ہندوستان پر وسطی ایشیا کے ہنوں کا وحشیانہ حملہ 520 قبل مسیح میں۔
- سکندر کا حملہ 326 قبل مسیح میں یعنی پہلے یورپی حملہ آور کی آمد۔
- ہندوستان کی پہلی آزاد حکومت چندرگپت موریہ، 323 قبل مسیح میں جس نے یونانی فوج کو ملک سے نکال باہر کیا۔
- ہندوستان پر دوسرا غیر ملکی حملہ 305 قبل مسیح میں۔ حملہ آور یونانی جنرل سلیوکس تھا جو ناکام رہا۔
- ہندوستان میں پہلی عوامی حکومت، عہدِ اشوک 373 قبل مسیح۔
- آریوں اور یونانیوں کے بعد غیر ملکی نسل، کشن کی آمد 120ء میں یہ نسل چین سے آکر ہندوستان پر حکم راں ہوئی۔
- ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت مختلف حکومتیں:۔
  1. دہلی میں تزار راجپوت
  2. اجمیر میں چوہان راجپوت
  3. قنوج میں راٹھور راجپوت
  4. بہار میں پال راجپوت
  5. بنگال میں سین راجپوت
  6. مالوہ میں پرمار راجپوت
  7. بندھیل میں کھنڈ چندر راجپوت
- عربوں کا پہلا حملہ 712ء میں۔
- افغانوں کے حملے، عہدِ محمود غزنوی میں 997ء سے 1030ء تک۔
- مغلوں کی آمد و فتح۔ 1522ء میں
- ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، عہدِ جہاں گیر میں۔ انگریز سفیر ٹامس رو جس نے انگریزوں کی تجارتی کمپنی کے لیے حقوق حاصل کیے۔ 1615ء میں۔
- ہندوستان میں عوامی سوسائٹی کا عہد۔ 1500ء سے 1538ء تک۔
- احمد شاہ ابدالی کا حملہ۔ 1761ء میں

  پانی پت کی جنگ

  تیسری جنگ

  افغان مرہٹہ جنگ
- پرتگالیوں کی آمد (واسکوڈی گاما) 1498ء
- گوا پر پرتگیز قبضہ۔ عہدِ البوقرق 1510ء
- ڈچ کی آمد۔ ڈچ کمپنی 1602ء
- انگریزوں کا اقتصادی حملہ، کپتان ہاکنس نے سورت میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ 1608ء
- ہندوستان میں پہلی انگریز نوآبادی مدراس شہر جسے راجا چندر گری کی زمین پر آباد کیا گیا۔ 1649ء میں
- بمبئی میں انگریزوں کا قبضہ۔ 1668ء

- کلکتہ۔ ہندستان میں تیسرا انگریزی شہر جس کی بنیاد دریائے ہگلی کے کنارے ڈالی گئی۔
- ڈوپلے وہ فرانسیسی مدبر جس نے ہندستان میں فرانسیسی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 1754ء سے 1791ء تک
- ہندستان کی پہلی جنگ آزادی، 1756ء میں کلکتے پر سراج الدولہ کا حملہ اور قبضہ۔
- ہندستان کی غلامی کی ابتدا، 23 جون 1757ء، پلاسی کی جنگ اور میر جعفر کے لڑکے میرن کے ہاتھوں شیر بنگال سراج الدولہ کی شہادت۔
- غیر ملکی غلامی پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ جو میر قاسم، شجاع الدولہ لکھنؤ اور شاہ عالم دہلی کا متحدہ محاذ بنا کر کیا گیا، جنگ بکسر 1764ء
- عہدنامہ الہ آباد۔ بنگال، بہار، اڑیسا پر انگریزوں کی حکومت کی شروعات 1765ء
- دوسری جنگ آزادی۔ میسور کا سپہ سالار حیدر علی جس نے نواب کرناٹک کی حیثیت سے میسور کے محاذ پر جنگ آزادی کا مورچہ لیا۔ کرنل بیلی اور بکسر کے فاتح میجر منرو کو شکست دی 1782ء۔
- ہندستان کی غلامی کی ابتدا۔ پہلا انگریز گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز 1774ء سے 1785ء تک۔
- تیسری جنگ آزادی۔ میسور کی چوتھی جنگ سرنگاپٹم، جس میں ٹیپو سلطان شہید ہوئے۔ اس جنگ میں ٹیپو نے نظام، بمبئی اور مدراس کی انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا۔
- مراہٹوں اور انگریزوں کی جنگ، جس میں سندھیا اور بھونسلا انگریزوں سے لڑے، 1803ء سے 1805ء تک۔
- پہلا فوجی غدر۔ مدراس ویلور کی جنگ آزادی۔ دیسی سپاہیوں نے بغاوت کر کے ایک سو انگریز افسروں اور سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ اس بغاوت کا الزام انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے لڑکوں پر لگایا 1806ء
- انگریزوں کے خلاف دوسری بغاوت۔ ٹراونکور کے وزیر نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی۔ کچھ انگریز سپاہی قتل کیے گئے مگر ناکام ہونے پر وزیر نے خودکشی کرلی۔ بندھیل کھنڈ کے سوائیوں نے بھی اسی زمانے میں بغاوت کی۔ 1808ء
- کمپنی کا نیا چارٹر۔ اس کی رو سے ہندستان کو مشنری (تبلیغ) کے ذریعے عیسائی بنانے اور مشنری اسکولوں کے لیے ایک لاکھ روپے کی منظوری کا منشور انگریز کمپنی کو حاصل ہوا۔ نتیجے میں سارے انگریزوں کے لیے ہندستان کی تجارت کھول دی گئی 1813ء 1809ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ اور انگریزوں کی صلح۔ سکھ حکومت کی ابتدا 1839ء میں۔
- جنگ پونا۔ پیشوا باجی راؤ نے مرہٹا سرداروں کی مدد سے انگریزوں کی پونا ریذیڈنسی پر حملہ کیا اور اسے جلا ڈالا۔ بھونسلے اور ہلکر نے بھی انگریزوں پر حملہ کیا مگر ناکام رہے۔ 1815ء
- سکھوں کی پہلی جنگ آزادی۔ 1839ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھوں نے انگریزوں پر حملہ کیا مگر ناکام رہے۔
- ہندستان کی پہلی جنگ آزادی۔ آزادی کے لیے کئی جنگ لڑنے کے بعد 10 مئی 1857ء کو میرٹھ سے پہلی جنگ آزادی کا معرکہ گرم ہوا۔ دہلی۔ کانپور، لکھنؤ اور جھانسی جنگ آزادی کے مرکز بنے۔ مگر یہ جنگ ہندستانی ہار گئے۔
- ملکۂ انگلستان وکٹوریا کا فرمان۔ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ، ریاستی آزادی۔ مذہبی آزادی، عہدوں میں نسلی برابری، باغیوں کو معافی اور اقتصادی ترقی کا وعدہ۔ انگریزی تاریخ میں اسے پہلا اعلان آزادی قرار دیا گیا۔ پہلی نومبر 1858ء
- حکومت برطانیا کی جانب سے ہندستان کا پہلا وائسرائے لارڈ کننگ۔ 1858ء سے 1862ء تک۔
- انڈین نیشنل کانگریس۔ ملک کی آزادی کے لیے سب سے بڑی قومی جماعت کا قیام 1885ء میں
- آزادی کی پہلی قسط۔ منٹو مارلے ری فارم، ہندستانیوں کو حکومت میں کچھ اختیارات دیئے گئے، مسلمانوں کو علاحدہ حق نیابت دیا گیا اور لارڈ سنہا کو وزیر ہند کی کونسل میں لیا گیا 1905ء سے

1910ء تک

○ پایہ تخت کلکتے سے دہلی منتقل ہوا۔ دہلی دربار کے نتیجے میں۔ 12 دسمبر 1911ء

○ 1914ء کی بڑی جنگ میں مہاتما گاندھی کی فوجی خدمات کی بنا پر اُن کو انگریز سرکار سے قیصر ہند کا تمغا ملا۔ 1915ء

○ بنارس ہندو یونیورسٹی قائم ہوئی 1914ء

○ اعلانِ خودمختاری۔ مانٹیگو وزیرِ ہند نے 20 اگست 1917ء کو حکومتِ برطانیہ کی جانب سے انگلینڈ کی پارلیامنٹ میں یہ اعلان کیا: "سرکارِ برطانیہ کا مدعا ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے انتظام میں زیادہ سے زیادہ حصہ دینا اور قدم بہ قدم چل کر ذمے دار حکومت عطا کرنا ہے۔ البتہ ہندوستان برطانوی کامن ویلتھ کا ایک حصہ رہے گا۔"

○ رولٹ ایکٹ۔ انگریز سرکار نے آزادی کی سازشوں کا سراغ لگانے کے لیے رولٹ کمیٹی مقرر کی اور رولٹ ایکٹ پاس کیا۔ اس ایکٹ کو ناکام بنانے کے لیے گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر جنگ آزادی شروع کی۔ اسی برس جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا۔ 13 اپریل 1919ء

○ تحریک عدم تعاون کی ابتداء ستیہ آگرہ، انگریزی ملازمتوں، انگریزی کالجوں، کونسلوں، خطابوں اور انگریزی کپڑے کا بائیکاٹ۔ 20 اگست 1921ء

○ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت مانٹیگو چیمس فورڈ ری فارم کی صورت میں انگریز سرکار نے ہندوستانیوں کو آزادی کی دوسری قسط دی۔ صوبائی و مرکزی اسمبلی و کونسل میں، مزید نمائندگی ملی۔ ایک کے بجائے تین ہندوستانی وزیر مقرر ہونے لگے۔ 1919ء

○ پنڈت نہرو نے لاہور کانگریس کے اجلاس میں صدر کی حیثیت سے

○ مکمل آزادی کے مطالبے کا اعلان کیا۔ 1929ء

○ سول نافرمانی۔ نمک ستیہ آگرہ۔ مارچ 1930ء

○ پہلی گول میز کانفرنس لندن۔ نومبر 1930ء

○ گاندھی اَروِن سمجھوتہ۔ مارچ 1931ء

○ دوسری گول میز کانفرنس لندن ستمبر 1931ء

○ تیسری گول میز کانفرنس لندن نومبر 1932ء

○ برطانوی وائٹ پیپر۔ مارچ 1933ء

○ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ۔ اس کے ذریعے صوبائی خودمختاری اور مرکزی فیڈرل حکومت کا اعلان 1935ء

○ صوبائی آزادی۔ صوبوں میں خودمختار وزارتی حکومتوں کی ابتدا۔ پہلی اپریل 1937ء

○ وزیرِ ہند کا اعلان۔ "ہندستان دولت متحدہ برطانیہ میں آزاد اور برابر کے رکن کی حیثیت سے شریک ہوگا اور ہندستانی خود اپنی دستور ساز اسمبلی میں اپنا دستور مرتب کریں گے۔"

○ اسٹفورڈ کرپس مشن۔ اسٹفورڈ کرپس کی آمد اور ہندستانی لیڈروں سے گفت و شنید۔ 1942ء

○ بیان ملک معظم انگلستان۔ نمائندہ اسمبلی اور آزادی کا وعدہ 8 اگست 1942ء

○ انڈین نیشنل کانگریس کی "ہندستان چھوڑو" کی تحریک۔ 9 اگست 1942ء

○ دوسری بڑی جنگ کا اختتام۔ 14 اگست 1945ء

○ ویول مشن۔ 1945ء

○ کیبنٹ مشن کی آمد 1946ء

○ عبوری مرکزی حکومت 1946ء

○ تقسیمِ ہند۔ 14 اگست 1947ء

○ آزادیٔ ہند۔ 15 اگست 1947ء

○ آزاد دستورِ ہند کا نفاذ، جمہوریۂ ہند۔ 26 جنوری 1950ء

○ پہلے جمہوری عام انتخابات۔ 1952ء

○ دوسرے عام انتخابات۔ 1957ء

○ اعشاریہ سسٹم کے تحت نئے سکوں کا اجراء۔ پہلی اپریل 1957ء

○ ناپ و تول کے میٹرک سسٹم کی ابتدا۔ پہلی اکتوبر 1958ء

○ گوا کی آزادی 1961ء

○ تیسرے عام انتخابات 1962ء

○ چین کا جارحانہ حملہ 1962ء

○ ہندستان پاکستان جنگ 1965ء اور 1971

○ چوتھے عام انتخابات 1971ء

کرار حسین

ہندوستانی مسلمانوں کے تیوہار

کسی قوم کی زندگی میں تیوہاروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے قوم کی روح کو بیدار کرنے میں تیوہار ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان تیوہاروں اور جشنوں سے نہ صرف اس کی بنیادی تحریک کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ کس کس موقعے پر کیا کیا تبدیلی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ کسی ناممکن اصول پر مبنی نہیں ہوتا۔ خدا کے متعلق اس کا عقیدہ سادہ مگر اعلا ہوتا ہے۔ اس کا سجدہ بغیر کسی زر و جواہر کے بھی پرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کے مذہب میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔ اس کے تیوہار کم ہیں۔ انھیں نہایت سادہ مگر متاثر کن انداز میں منایا جاتا ہے یہ ایک اتفاقیہ بات نہیں ہے کہ ایک مسلم کا عقیدہ اس کی عبادت کا طریقہ۔ اس کے تیوہار سب ہی امن کی تلقین کرتے ہیں۔ انہی تمام ذرائع سے اسلام کی روح نے ایک ملت کو جنم دیا۔ اور قومیت و رنگ و نسل پر وحدت کی مہر لگادی۔

اسلامی تیوہاروں کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انھیں قمری سال کے حساب سے منایا جاتا ہے شمسی سال اور موسم ایک ہی ساتھ چلتے ہیں۔ اسی لئے ہندؤں اور عیسائی تیوہار موسم کے اعتبار سے بھی منائے جاتے ہیں۔ عربوں میں آں حضرت سے قبل قمری شمسی سال کا رواج تھا۔ مہینہ چاند کے نظر آنے پر شروع ہوتا تھا لیکن ہر تیسرے سال میں ایک مہینے کا اضافہ کرکے اسے شمسی سال کے برابر کردیا جاتا تھا لیکن حضورؐ نے یہ طریقہ ختم کرکے صرف قمری سال کو قائم رکھا۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ تیوہاروں کے منانے پر ان کی روحانی معنویت پر زور دیا جاتا ہے۔

محمد صلعم کے زمانے میں بھی مسلمانوں کو کئی فتوحات ہوئیں، اور خوشیاں منائی گئیں لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک فتح کو جشن یا تیوہار کا درجہ نہیں دیا گیا۔ سب سے اہم تیوہاروں میں سے ایک عید الاضحیٰ ہے۔ یہ تیوہار دراصل قربانی کے عہد کی سالانہ تجدیدی رسم ہے۔ جب کہ عید الفطر اس شکرانے میں منائی جاتی ہے کہ خدا نے انھیں روزے رکھنے کے قابل بنایا۔

اسلامی تیوہاروں کی تیسری نمایاں خوبی یہ ہے کہ انھیں منانے میں مذہبی رسوم اور سماجی رواجوں کو بڑے منظم طریقے سے ادا کیا جاتا ہے اخلاقی حد کو ذرا بھی مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ کسی قسم کی بدتہذیبی ہی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ نہ ناچ گانے کی محفل جمتی ہے اور نہ شراب کباب اور جوئے کی مجلس۔ اس طرح اسلامی خوشیاں بھی مقدس درجہ رکھتی ہیں۔

مذہبی تہواروں کے لئے اسلامی لفظ ہے عید جو یا تو عربی لفظ جس کے معنی ہیں واپس یا آرامائی لفظ تہوار سے اخذ شدہ ہے

عید الضحیٰ: دو عیدیں ہیں۔ بڑی عید عید الضحیٰ یا ہندوستانی بقرعید ہے۔ اسے اسلامی کیلنڈر کے آخری مہینے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو منایا جاتا ہے مسلمان اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عیدگاہ جاکر نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ دو رکعات اور خطبے پر مشتمل ہے۔ اور اسلامی عبادت ہی کی طرح سادہ ہوتی ہے۔

پھر قربانی ہوتی ہے قربانی سنت مؤکدہ علی الکفایہ (ہر ایک کے ذمہ

مسلم پر فرض ہوتی ہے، جو ایک قربانی کے قابل جانور خرید سکتا ہو، اگر قربانی کرنے والا اکیلا ہو تو اس مقصد کے لئے ایک بکری یا بھیڑ خرید سکتا ہے، اور اگر زیادہ لوگ ہوتے ہیں تو اونٹ یا بیل خریدنے ہیں قربانی ادا کرنے کے لئے تین دن کا وقفہ ہوتا ہے، جو ایام تشریق کہلاتا ہے۔

ذبح کرنے والا خدا کا نام لیتا ہے، (تسمیہ)
اور جانور کا منہ قبلہ کی طرف کرتا ہے۔ تکبیر اور مخصوص دعا پڑھتا ہے اور جانور کو ذبح کر دیتا ہے قربانی کرنے والا ایک حصہ اپنے لئے رکھتا ہے اور باقی حصہ دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے، پھر ایک دوسرے کے گھر جا کر عید کی مبارکباد دی جاتی ہے۔

یہ تیوہار حج کا ایک حصہ ہے اس لئے حج کے لئے بھی کچھ کہنا چاہیئے یہ سالانہ مقدس سفر کعبے (مکّے) کے لئے ہوتا ہے جن میں استطاعت ہو ان کے لئے فرض ہوتا ہے (ومن استطاع الیہ سبیلا) دیوانوں، غلاموں اور غیر محفوظ عورتوں کے لئے استثناء ہوتا ہے حج سے متعلق کچھ رسوم یہ ہے۔

۱) احرام:۔ مکّہ پہنچنے پر یہ لباس زیب تن کیا جاتا ہے اس حالت میں حاجی دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے، اور پرہیز برتتا ہے۔ اور مکمل طور پر خدا کا ہو رہتا ہے۔

۲) طواف:۔ کعبے کے سات طواف اور حجر اسود کو بوسہ دینا۔

۳) سعی:۔ مقام ابراہیم پر نماز کے بعد صفا اور مروا کے درمیان سات مرتبہ آنا اور جانا۔

۴) منا کی وادی میں تھوڑے قیام کے بعد عرفات کو جانا۔

۵) شیطان کو سات پتھر مارنے اور وادیٔ منا میں قربانی ادا کرنے کے بعد عرفات کو واپسی۔

جدّہ اور دوسرے اسلامی ممالک کے درمیان جہاز کے ذریعے آمد و رفت ہوتی ہے۔ دوسرے حجاج کرام جہاز ریلوے یا کارواں کی شکل میں جاتے ہیں۔

خانۂ کعبہ ابراہیمؑ نے تعمیر کیا تھا ان کے ساتھ ان کے فرزند اسماعیلؑ بھی تھے۔ اسلام کے پیغمبر محمدؐ ان ہی کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآن مجید میں ایک واقعہ درج ہے کہ کس طرح خدا نے ابراہیمؑ کو ان کے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دے کر آزمایا۔ اور کس طرح ابراہیمؑ اس آزمائش میں کامیاب اُترے اور ان کی یہ قربانی بارگاہ ایزدی میں قبول ہوئی۔ اور ان کے فرزند کو بچا لیا گیا۔ اسی لئے قربانی کی قبولیت نیت پر ہوتی ہے۔ اس پر نہیں کہ کس چیز کی قربانی دی گئی ہے۔

ماقبل از تاریخ کعبہ میں تین سو سے زائد بت تھے اور تجارت کا ایک مرکز ہونے کی وجہ سے وہاں ہر سال ایک میلہ لگتا تھا۔ محمدؐ کی مدینے کو ہجرت کے بعد ہی کعبہ اسلامی دنیا کا قبلہ بن گیا اور ہر نماز میں اس کی جانب رخ کیا جانے لگا۔ فتح مکہ کے بعد اسے بتوں سے خالی کر دیا گیا۔ اور حج کا مرکز قرار پایا۔ وہی طریقہ آج بھی رائج ہے۔

اب حج ایک عظیم انسانی نشانی بن گیا ہے اس سے ہمارا ذہن ابراہیمؑ کے اس خیال کی طرف جاتا ہے کہ پوری ملّت کے لئے ایک مرکز ہو اور خدا کا نام لیا جائے۔ ہر سال تاریخ اسلام ایک لمحے کے لئے ٹھہر سی جاتی ہے اور مستقبل کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے اپنے آغاز کی جانب ایک نظر کرتی ہے اور ماضی سے اپنا اتحاد اور مضبوط کرتی ہے۔

ان ہی رسوم کی بنا پر ہم میں قربانی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ایک ہفتے کے لئے پوری دنیا اپنے تمام اختلافات کو بھول کر اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو جاتی ہے۔ خدا کو اس طرح حاضر و ناظر جاننے کا جذبہ یقیناً بہت مضبوط اور پرانا لیکن پھر بھی تازہ تجربہ ہے!

عید کی نماز اور قربانی سے کرّہ ارض پر پھیلے ہوئے تمام مسلمان حج کی روح کو محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح یہ حج پوری ملّت کو ایک مرکز پر متحد کرتا ہے۔ اسی بنا پر مسلم تہواروں میں اسی عید کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

عید الفطر:۔ عید الاضحٰی کے بعد عید الفطر کی اہمیت ہے اس عید کو رمضان کے روزے ختم کرنے کے بعد منایا جاتا ہے۔ علی الصبح سے غروب آفتاب تک کچھ بھی کھایا پیا نہیں جاتا۔ ناک کان، منہ اور آنکھ کو بری چیزوں سے بچایا جاتا ہے شب میں عشاء بعد نماز میں قرآن کا ایک حصّہ پڑھا جاتا ہے اس طرح پورے مہینے میں قرآن ختم کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ اب یہ صرف ایک رسم بن کر رہ گئی ہے اسی لئے امام بڑی تیزی سے تلاوت کرتا ہے جس سے مقتدیوں کو برابر سمجھ میں نہیں آتا۔ مہینے کے آخری دس دنوں کو خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا ہے اور کچھ مسلمان اعتکاف میں بیٹھتے

ہیں۔ سترھویں رمضان کو محمدؐ کے داماد اور چچا زاد بھائی چوتھے خلیفہ اور شیعوں کے عقیدے کے مطابق پہلے امام حضرت علیؓ کو ایک خارجی نے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ تین روز بعد ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس روز شیعہ حضرات خاص طور پر ماتم کرتے ہیں۔

پہلی شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے۔ یہ روزے ختم ہونے کے شکرانے میں منایا جاتا ہے۔ اس کی نماز عید الضحیٰ کی نماز ہی کی طرح ہوتی ہے لیکن اس کی نماز ادا کرنے سے پہلے ہر مسلمان پر فرض ہوتا ہے کہ وہ فطرہ ادا کرے۔ نئے کپڑے پہننا۔ دوستوں سے ملاقات کرنا۔ رمضان کے مہینے میں پوری اسلامی دنیا ایک روحانی اور اخلاقی تہذیب کے مرکز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہر مسلمان استقلال ثابت قدمی اور انسان دوستی کا سبق پڑھتا ہے۔ اور عہد کرتا ہے کہ وہ پورا سال اسی طرح گذارے گا۔

محرم :- گو کہ یہ ایک تیوہار نہیں ہے لیکن عام طور پر اسے ایک تیوہار ہی کی حیثیت سے منایا جاتا ہے۔ یوم عاشورہ کو اب خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ خود محمدؐ کے زمانے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی سوائے اس کے کہ اس دن روزہ رکھنا چاہیے۔ محمدؐ کے زمانے میں یہ کسی بھی حیثیت سے منایا جاتا تھا اب تو اس کے پورے معنے ہی تبدیل ہو گئے ہیں اور ایک نئے واقعے نے پرانی بات کو بھلا دیا۔ یہ واقعہ محمدؐ کی وفات کے 50 سال بعد ظہور پذیر ہوا۔

محمدؐ کے بعد ان کے صحابیوں میں سے بالترتیب ابوبکر، عمر، عثمان، علی کو خلیفہ مانا گیا۔ انھوں نے اسلام کو اسی شکل میں رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی اور محمدؐ کے نقش قدم پر برابر چلتے رہے تیسرے خلیفے ہی کے زمانے میں کچھ شرارتیوں نے سر اٹھایا۔ اور علی کے زمانے میں اتنے طاقت والے ہو گئے کہ وہ نہ ان کی زبان ہی سے ڈرے اور نہ تلوار سے!

معاویہ کے بعد خلافت ختم ہو گئی اور اس کی جگہ بادشاہت نے لی۔ علی کے بڑے لڑکے حسن کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی رو سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے لئے نامزد کیا۔ یزید ایک نا اہل شخص تھا یزید 61 ہجری 680 عیسوی میں خلیفہ بنا۔ علیؓ کے دوسرے بیٹے حسین (حسن کو خفیہ طور پر زہر دے دیا گیا تھا) نے بیعت نہیں کی۔ کوفے کے لوگوں نے ان سے مدد چاہی۔ اور ان کی آواز پر انھوں نے لبیک کہا۔ وہ اہل و عیال اور چند احباب کے ساتھ کوفہ روانہ ہوئے جب وہ صحرائے عرب عبور کر کے عراق پہنچے تو معلوم ہوا کہ کوفے والوں نے ان سے غداری کی۔ وہ اپنے چھوٹے سے قافلے کے ہمراہ دریائے فرات کے مغربی ساحل پر واقع کربلا نامی مقام پر مقیم ہو گئے اموی فوج نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ اور انھیں فرات کے پانی سے محروم کر دیا۔ جس سے قافلے والوں کو بے حد تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمنوں کے سردار سے ملاقات پر حسین نے تین شرطیں رکھیں کہ انھیں مدینے جانے دیا جائے یا سرحد پر مقیم ہونے دیا جائے یا یزید سے ملاقات کرنے دی جائے لیکن دشمنوں نے ایک بھی بات نہیں مانی۔ اور کہا کہ انھیں مجرموں کی طرح یزید کے پاس لے جایا جائے گا۔ اور پھر اموی دربار میں انصاف ہوگا۔ ان ظالموں سے حسین نے یہ آخری التجا کی کہ ان کے بے یار و مددگار اہل و عیال کو چھوڑ دیا جائے اور ان کی جان لے لی جائے لیکن اس بات پر بھی ظالموں نے کان نہ دھرا۔ حسین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر کوئی جانا چاہے تو چلا جائے۔ کوئی نہ گیا۔ آخری جنگ شروع ہو گئی ایک ایک کر کے حسین کے حامی شہید ہونے لگے آخر میں پیغمبر کے نواسے سمیت تین شخص رہ گئے۔ حسین بڑی بہادری اور جواں مردی سے لڑے۔ لیکن آخر بے ہوش ہو کر گر پڑے اور زخمی شیر پر بھیڑیے ٹوٹ پڑے۔

گبن (Gibbon) نے کہا تھا کہ سخت سے سخت دل والے آدمی کی آنکھ بھی کربلا کی واردات کو پڑھ کر پرنم ہو جاتی ہے۔" اسے اس لئے کم اہمیت نہ دی جانی چاہیئے کہ یہ اسلام کا ایک تاریخی واقعہ ہے یہ گہرے معنی اور لافانی قیمت کا حامل واقعہ ہے۔ یہ اصول کی فتح ہے طاقت پر!

اس واقعے کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ کی جاتی ہے۔ اسلام کے دو بڑے فرقے شیعہ اور سنی الگ الگ طریقے سے مناتے ہیں۔ ایک اس سے دلیری کا سبق لیتا ہے، دوسرا اس کے طربیہ رخ کو اہمیت دیتا ہے۔ شیعہ عام طور پر ماتم کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں جلوس بھی نکالا جاتا ہے۔ جس میں کبھی کبھی ایک گھوڑا (حسین کے گھوڑے ذوالجناح کی یاد میں) بھی ہوتا ہے۔ علم اور تعزیے بھی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ تعزیے آرٹ

کے نظرسے کافی اعلا ہوتے ہیں اسے یا تو تالاب یا دریا میں بہا دیا جاتا ہے یا کربلا نامی مقام میں، جو اسی مقصد کے لئے ہوتا ہے، دفنا دیا جاتا ہے۔ کربلا نامی مقام پر ہی حسین نے جنگ کی تھی۔ جلوس کے شرکا ننگے پیر اور ننگے سر مرثیہ خوانی کرتے ہیں اور سینہ کوبی کرتے ہیں، اور کبھی کبھی خود کو زخمی بھی کر لیتے ہیں۔ اس موقع پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کے یہ مرثیے دنیا کے کسی بھی ادب کے مقابلے میں اپنی نوعیت کی بالکل مختلف تخلیق ہیں۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جہاں مسلم فرقے کا ایک حصہ تعزیہ کو بدعت اور باطل، گناہ قرار دیتا ہے یہاں تک کہ بت پرستی کی مثل مانتا ہے وہیں بہت سے ہندو تعزیے کو بڑی عقیدت سے دیکھتے ہیں۔ آزادی سے قبل گوالیار اسٹیٹ میں مرہٹہ راجا کی سرپرستی میں تعزیہ نکالا جاتا تھا اور اس کے تمام اخراجات ریاست برداشت کرتی تھی۔

شبِ معراج:- معراج کا مطلب ہے پہنچنا۔ رجب کی 27 ویں شب کو حضرت محمد صلعم عرش پر تشریف لے گئے تھے۔ حالتِ سفر کے متعلق مختلف خیال ہیں کچھ کا خیال ہے کہ یہ آسمانی سفر تھا اور کچھ اسے روحانی سفر قرار دیتے ہیں عام طور پر یہی نظریہ ہے کہ انھوں نے جسمانی طور ہی پر بیت المقدس اور پھر وہاں سے ساتوں آسمانوں کا سفر کیا تھا۔

رجب کی 27 ویں تاریخ کو مسلمان روزہ رکھتے ہیں اور سنت نمازیں ادا کرتے ہیں۔ شب برأت۔ شعبان کی 14 ویں شب کو منایا جانے والا یہ ایک عجیب تہوار ہے۔ مفسروں نے حدیث سے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے اسے لیلۃ القدر کہتے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ پھر بھی کچھ کا خیال ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ اس رات فرشتے زمین پر اترتے ہیں۔ اور ہر شخص کے لئے آئندہ سال کے لئے چیزوں کا حصہ مقرر کر دیتے ہیں۔ مسلمان زندوں اور مردوں کے لئے نمازیں پڑھتے ہیں۔ قبروں کی زیارت کرتے ہیں اور مرحوم کی مدح کو ایصالِ ثواب کے لئے خیر خیرات کرتے ہیں۔ حلوہ بنایا جاتا ہے اور دوسروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

[illegible]

معلوم نہیں کس طرح اس شب کا تعلق جنگِ احد سے کر دیا گیا ہے، جب کہ جنگِ احد رمضان کے مہینے میں لڑی گئی تھی۔ جنگِ احد ہی میں حضورؐ کے چچا امیر حمزہ شہید ہوئے تھے اور خود حضورؐ کے دو دانت شہید ہوئے تھے۔

بچے آتش بازی چھوڑتے ہیں۔ کچھ لوگ آپس میں آتش بازی کا مقابلہ کرتے ہیں۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے بارہویں امام مہدی کی ولادت اسی روز سن 869ء میں ہوئی تھی۔

عیدِ میلاد:- آں حضرتؐ کی پیدائش کی ٹھیک تاریخ تو معلوم نہیں۔ حالاں کہ بہت سی تاریخیں کہی جاتی ہیں لیکن اکثریت کی رائے دو تاریخ پر متفق ہے 12 ویں اور 17 ربیع الاوّل۔ سنی 12 ویں ربیع الاول کو پیغمبرؐ کی تاریخ پیدائش مناتے ہیں اور ہفتے بھر وعظ کرتے ہیں جب کہ شیعہ 17 ویں تاریخ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجلس میلاد منعقد کی جاتی ہے جس میں حضورؐ کے حالاتِ زندگی بیان کئے جاتے ہیں۔ کچھ حقیقی، کچھ خیالی۔ مصلح ان مجلسوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ جگہوں پر جلوس بھی نکالے جاتے ہیں۔

عرس اور زیارت گاہیں:- تیوہاروں کے متعلق یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر اس میں درگاہوں اور زیارت گاہوں پر منعقد ہونے والے سالانہ عرسوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ عام طور پر عرس کسی بزرگ کی تاریخ وفات کو منعقد کیا جاتا ہے۔ ہندو حضرات بھی اس کے بڑے معتقد ہوتے ہیں اور بڑے اعتقاد سے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

عرس کے موقع پر مزار پر تلاوت قرآن کی جاتی ہے اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ درگاہ پر سماع یا قوالی ہوتی ہے چشتی اور سہروردی حضرات کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اسی لئے ان کی درگاہوں پر قوالی کا خاص طور پر انتظام ہوتا ہے نقشبندی بزرگ حضرات موسیقی کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے عرس میں موسیقی کا پروگرام نہیں ہوتا۔

حضرت معین الدین چشتیؒ 1165ء میں پرتھوی راج کے

علیہ میں اجمیر آئے۔ 1236ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا عرس 5 سے 14 ویں رجب تک منعقد ہوتا ہے۔ ہندوستان میں منعقد ہونے والے تمام عرسوں میں سب سے بڑا عرس اجمیر ہی کا ہوتا ہے ملک کے کونے کونے سے لوگ اجمیر کے عرس میں شریک ہوتے ہیں۔

بابا فرید گنج شکر (وفات 1265ء) کا مقبرہ پاک پٹن پنجاب میں واقع ہے۔ ان کا عرس 5 سے 7 محرم تک منعقد ہوتا ہے ان کی درگاہ میں بہشتی دروازہ نامی ایک دروازہ ہے اور ایسا عقیدہ ہے کہ جو اس دروازے سے گزرے گا وہ ضرور بہشت میں داخل ہوگا۔

بابا کے دو نائب تھے۔ دلی کے حضرت نظام الدین (وفات 1325ء) جو بہت مشہور اور ہر دلعزیز تھے اور پیران کلیر کے مخدوم علی احمد صابر (1291ء) جو بہت مزاج اور غصہ ور تھے۔ 17 ویں ربیع الاول کو نظام الدینؒ اولیاء کا عرس منعقد ہوتا ہے، جب کہ سہارن پور کے نزدیک پیران کلیر نامی مقام پر 7 سے 13 ویں ربیع الاول تک مخدوم کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ مخدوم اولیاء کو شمالی ہند میں بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

غوث اعظم محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی (1166 – 1077) کو سنی مسلمان سب سے بڑا اولیاء مانتے ہیں حالاں کہ انھوں نے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی قدم نہیں رکھا۔ پھر بھی بہت سے گھروں میں گیارہویں ربیع الثانی کو ان کے نام کی نیاز کی جاتی ہے۔ ان کا عرس اسی دن منعقد ہوتا ہے۔ اس دن کو گیارہویں شریف بھی کہتے ہیں۔ کئی جگہ جلوس بھی نکالا جاتا ہے جلوس میں پنجہ شریف لے جایا جاتا ہے۔ مٹھائیوں پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ اور پھر اسے دوسروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (ترجمہ: صادق علی)

شکریہ

انگریز جب اس ملک میں آیا ہے، شکریے کا لفظ بے معنی ہوگیا ہے۔ انگریز بات بات میں "تھینک یو" (Thank you) کہہ دیتا ہے۔ نوکر پانی کا گلاس پیش کرے تو "تھینکس" (Thanks) گلاس واپس ہو تو "تھینکس"، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کسی مشین سے نکل رہا ہے، جس میں دلی جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ پہلے شکریے کا لفظ ہماری زبان میں نہیں تھا۔ پچھلی صدی کے آخر میں انگریزی کے اثر سے ہماری زبان میں آیا۔ بیورلی نکلس جس نے (VERDICTON INDIA) لکھی ہے، ہندوستان کی سیاحت کے دوران میں جگہ جگہ پوچھتا تھا کہ "تھینکس" کے لیے تمہارے یہاں کیا لفظ ہے؟ کسی نے جواب دیا۔ "عنایت"۔ کسی نے کہا۔ "مہربانی"۔ پرنس اعظم جاہ سے جب پوچھا تو انھوں نے بتایا۔ "شکریہ" دوسرے لوگوں نے تائید کی۔ اس نے کہا، یہ بڑا اچھا لفظ ہے۔ غالباً شکریہ شکر یا (SUGAR) سے نکلا ہے، جبھی اس لفظ میں بڑی مٹھاس ہے۔

—— بابائے اردو مولوی عبدالحق

ڈاکٹر اے حلیم

ہندستانی موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ

"میں اس علم (موسیقی) کی توانائی کو ٹھیک طور سے بیان نہیں کر سکتا یہ فن کبھی کبھی اُس بات کا اظہار کر دیتا ہے جس بات کو ادا کرنے کے لئے زبان قاصر ہوتی ہے۔ جس بات کو کہنے کے لئے زبان کو الفاظ نہیں ملتے وہ بات بات کی حرکات سے ساز و سامانِ موسیقی ادا کر دیتے ہیں۔ ان باتوں کی حرکات سے آدمی خوش بھی ہوتا ہے اور غمگین بھی۔ اس موسیقی سے ساری دنیا کو فتح کیا جا سکتا ہے۔" ابوالفضل۔ آئینِ اکبری ص ۶۹۰

جب ہندستان میں مسلمان فاتح کی حیثیت سے آئے تو اپنے ساتھ جو ساز لائے وہ یہاں کے قدیم سازوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اسی طرح راگوں میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں تھا۔ مثلاً شعبۂ مخالف رام کلی ہی کی دوسری شکل تھی۔ اسی طرح عراق بھیراون کی، دلدار اسرار پوربیا اور مالوہ کی، مغلوب بھاس کی، قندھاری عراق مالکوس اور پوربیا کی۔ نور و ضلالت پنچم کی۔ یہ صرف ایک ثبوت ہے کہ تہذیبی طور پر آنے والے مسلمان اور ہندستانیوں میں کئی چیزیں مشترک تھیں اس کے ساتھ ساتھ کچھ فرق بھی تھے۔ مسلمانوں میں موسیقی کو روحانی اہمیت ذرا بھی نہیں تھی، نہ اُس کے استعمال میں، نہ اُس کی بنیاد میں اور نہ اس کے اختیار ہی میں۔ مسلمانوں کے نزدیک موسیقی صرف خوش رہنے کا ایک ذریعہ تھی۔ وہ ہندستانیوں کی طرح اس کا سلسلہ نہ تو عبادت سے جوڑتے تھے اور نہ اس میں اس کا استعمال ہی کرتے تھے۔ مسلمان ہندستان میں ایرانی، عربی سازوں کے ساتھ آئے تھے، مثلاً رباب، چنگ، طنبورا، شہرود (اس کی بدلی ہوئی شکل ہے سرود) قانون، عود، نے، دف، نقارہ، ڈھول۔ یہاں کے ساز تھے وینا، سارندہ (اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے سارنگی)، مگودھی بانسری۔ مسلمانوں نے اپنے قیام کے فوراً ہی بعد یہاں کے سنگیت میں شامل ہو گئے۔ نئے ساز بنائے۔ کچھ تبدیلیاں کیں، نئے راگ بنائے۔ بادشاہ و امرا کے گھروں کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجانے کا رواج مسلمانوں ہی کا ایجاد کردہ ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم پڑتا ہے کہ سب سے پہلے علاؤالدین خلجی (1296-1316) کے زمانے میں ہندستانی موسیقی میں مسلمانوں نے تبدیلی کرنے کی پہلی کوشش کی۔ اُسی کے دور میں فتح دکن کے بعد اس کے دربار میں بہت سے ہندو گویّوں اور سنگیت کاروں نے شاہ کی سرپرستی حاصل کی۔

علاؤالدین ہی کے دربار میں امیر خسرو بھی تھے، جنھوں نے دہلی کے لگاتار سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس سلسلے میں ایک قصہ عام طور پر مشہور ہے کہ تلنگانہ کے ایک سنگیت کار گوپال نائک نے اُن کو یہ چیلنج دیا کہ وہ بھرے دربار میں ان کا مقابلہ کریں۔ گوپال نائک کی پالکی کو اٹھانے کے لئے اُن کے دو ہزار شاگرد اپنی خدمت پیش کرتے تھے۔ امیر خسرو کو فوراً ہی یہ چیلنج قبول کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب گوپال نائک ریاض کرتے وہ اُن کے تخت کے نیچے چھپ کر سات دن تک وہ اسی طرح اپنے دو شاگردوں صمد اور نیاز کے ساتھ چھپ کر سنتے رہے۔ آٹھویں دن اُن کے پاس آئے اور اُنھوں نے بغیر کسی غلطی کے گوپال نائک ہی کے انداز میں گا کر بتایا۔ وہ گوپال نائک کے گیت کے بولوں کا جواب اپنے قول سے دیتے اور اُسی تان اور تال کے ساتھ۔ اُس کے بعد اُنھوں نے اپنا فن پیش کیا اور ہر خاص و عام سے داد وصول کی۔ اُنھیں ہندستانی سنگیت پر اتنا عبور حاصل ہو چکا تھا کہ کم از کم گیارہ راگ اُن ہی کے ایجاد کردہ ہیں جن میں کئی راگ آج بھی نائک کے ناموں سے مشہور ہیں۔ امیر خسرو کے ایجاد کردہ راگ میں سازگری، یمن، عشاق، موافق غانم، غارا، زلف، فرغانہ، سرپردہ، صنم اور فردوست خاص طور پر مشہور ہیں۔ انھوں نے ڈھولک کی جگہ پکھاوج کا استعمال کیا اور نئے راگ و تال ایجاد کئے مثلاً خمسہ، سواری، فردوست، پہلوان، جاٹ، پشتو، قوالی، جلد تلالا، جھوا، بل فاختہ

چند ایک کا خیال ہے کہ ستار بھی انھیں کا ایجاد کردہ ہے۔ انھوں نے ہندستان
عرب۔ ایران کی ملی جلی سنگیت کا بیج بویا جس نے ہندستانی کلاسیکی سنگیت
سے برابر کا مقابلہ کیا۔

ہندستانی سنگیت کے لئے پندرہویں صدی کافی مبارک ثابت ہوئی
یہ تجدید بادشاہوں کی سرپرستی اور نئے راگوں کا نتیجہ تھی۔ ابتدا میں گوالیار
کے راجا مان سنگھ اور آخیر میں بھگتی تحریک نے کافی مدد کی۔

مسلم بادشاہوں نے اس بات سے بالکل لاپروا ہوکر کہ اس بارے
میں مذہب نے کیا فرمایا ہے، موسیقی کی کھل کر اور بھرپور سرپرستی
کی۔ اور ان ہی کی سرپرستی کی وجہ سے یہ فن عوام، سنتوں اور فن کاروں میں
مقبولِ عام ہوگیا۔ کشمیر کا سلطان زین العابدین (1416 - 1467ء) تو اس فن کا
اس حد تک دیوانہ تھا کہ اُس کے رباب اور بین سونے کے بنوانے کا حکم دیا
اُسی کے دور میں شاعر و سنگیت کار لودی بھٹ نے سنگیت پر مانک نامی
کتاب لکھی تھی۔ وہ بھی سنگیت کا دیوانہ مشہور تھا۔ اسی لئے گوالیار کے راجہ
سین نے سنگیت کے متعلق کئی کتابیں اُسے بھیجیں، اُس کی وفات کے بعد
اس کا بیٹا کرت سنگھ بھی لودی بھٹ کو یوں ہی نوازتا رہا۔ جونپور کا آخری بادشاہ
حسین شاہ شرقی اس فن میں طاق تھا۔ عام خیال ہے کہ سنگیت میں خیال اسکول
اُسی کی ایجاد ہے۔ حسین شاہ ایک ذہین موجد تھا اس نے خود کئی راگ ایجاد
کئے (ایک مورخ یوں راقم ہے: "وہ بے مثال فن کار تھا اور ہندوستان میں
چہار طرف اس کی دھوم مچی تھی پورے ہندستان میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا"۔
اس کی ایجادات میں بارہ شیام بھی شامل ہیں (گور شیام، ملہار شیام، بھوپال
شیام وغیرہ) اس کے علاوہ چار ٹوڈی جس میں سے جون پوری کا حسینی ٹوڈی
بہت مشہور ہے، جون پوری نامی اساوری اور مشہور حسینی کانڑا بھی اسی کی
ایجاد کردہ ہیں۔ سنگیت کے ایک محقق کا خیال ہے کہ فارسی 'زانگولا' سے
انھوں نے ہندستانی سنگیت میں 'جنگلا' نامی راگ کا تعارف کروایا۔

لودی خاندان کے دوسرے شہنشاہ سلطان سکندر لودی (1489 - 1517ء)
یوں تو بہت مذہبی آدمی تھا اور مذہبی اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنا گناہ سمجھتا
تھا لیکن وہ موسیقی کے سلسلے میں تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتا اور اپنے
ہی بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرتا۔ اُس کے دربار میں دو عظیم سنگیت کار
تھے۔ روح اللہ اور سید ابن رسول۔ ہر رات میں یہ محفل جمتی۔ سلطان کے چار
غلاموں میں سے ایک قانون بجاتا دوسرا چنگ، تیسرا طنبورا اور چوتھا بین، ان کے
علاوہ دس شہنائی نواز تھے۔ سکندر لودی کے پسندیدہ راگ تھے: - مالی گورا،
کلیان، کانڑا (جسے بعد میں اکبر نے درباری نام دیا) اور حسینی کانڑا۔
دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی موسیقی کی سرپرستی میں پیچھے نہ رہیں۔ مالوے کا
آخری راجا باز بہادر اور اُس کی بیوی روپ متی دونوں ہی سنگیت کے رسیا تھے۔ مالوہ
ریاست میں اب بھی وہاں کی عورتیں روپ متی کی دھنیں گاتی ہیں۔

گجرات کا بادشاہ بہادر شاہ (1526 - 1537ء) بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔
اُس کے دربار میں نائک بخشو تھا، جو راجہ مان سنگھ کے زمانے سے مشہور تھا۔ بخشو
بہت اچھی آواز کا مالک تھا۔ وہ بیک وقت دو آوازوں میں گاتا تھا۔ احمدآباد میں اپنے
قیام کے دوران اُس نے بہادری ٹوڈی، نائکی کانڑا اور نائکی کلیان نامی راگ
ایجاد کیا۔ مراتِ سکندری، میں درج ہے کہ نائک بیجو بھی بہادر شاہ کے
دربار میں تھا اور جب ہمایوں نے گجرات کو فتح کرنے کے بعد قتلِ عام کا حکم دیا
تو اُس نے فارسی میں ایک غزل سنائی جو

کسے نہ ماند کہ او را بہ تیغ ناز کشی مگر تو زندہ کنی عالمے و باز کشی

اور اس سوز سے گائی کہ ہمایوں نے قتلِ عام کو روکنے کا حکم دے دیا۔ اسی طرح
بہادر شاہ کے دربار میں نائک گوپال نامی سنگیت کار بھی تھا۔ یہ نائک بیجو،
کا شاگرد تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود سوم (تخت نشینی 1537ء) کے زمانے
میں عوام میں موسیقی کا شوق اس قدر بڑھ چکا تھا کہ ہر گھر سے موسیقی کی آواز آتی
ہوئی سنائی دیتی تھی۔

گوالیار کے راجاؤں نے بھی موسیقی کے فروغ کے لئے بہت کچھ کام کئے۔
خاص طور پر راجا مان سنگھ تونوار (1486 - 1517ء) نے فارسی اور ہندوستانی
راگ آپس میں اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ اُن کی اصل معلوم ہی نہیں پڑتی
تھی۔ اس لئے اُس نے اس وقت کے مانے ہوئے سنگیت کاروں کو جمع کیا
جس میں ملتکا نہکہ نائک بخشو، نائک بھانو اور نائک پانڈے بھی شامل تھے۔ اور
خود راجا کے درباری سنگیت کار شلون نائک کرن، نائک محمود — نائک لوہنگ بھی
شریک تھے۔ ان لوگوں نے سنگیت کے متعلق معلومات اکٹھا کیں اور اس کا نام
رکھا 'مان کوتوہل' (مان کی جستجو)۔ موجودہ دھرپد راگ کا ترتیب کار مان سنگھ ہے
مان سنگھ کے اس کارنامے سے سنگیت کی دنیا میں گوالیار کو ایک خاص مقام
حاصل ہوگیا ہے!

ہندستانی سنگیت کی ترقی میں پندرہویں اور سولہویں صدی کے چشتیوں اور بھگتی
تحریک کا بڑا ہاتھ ہے۔ چشتی محفل میں سازوں کا استعمال ممنوع تھا۔ اس لئے

امیر خسرو کے شاگرد صمد اور نیاز حضرت نظام الدین کی خانقاہ میں قوالی گانے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں گائی ہوئی قوالی دوسرے ہی دن دلی کی گلیوں میں سُنی جاتی تھی۔ اسی طرح میرا بائی (میواڑ کے رانا کنبھ کے بیٹے راجہ بھوج کی بیوی) بابا رام داس، سورداس، سوامی ہری داس نے اپنی بھگتی تحریک کے پرچار کے لئے سنگیت کا بہت سہارا لیا۔

مغلوں کی دلچسپی نے موسیقی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا وہ نہ صرف تُرک تھے بلکہ وسطِ ایشیا کی نئی تہذیب بھی لائے۔ مغل سلطنت کا بانی بابر نہ صرف خود ایک اچھا موسیقار تھا بلکہ اس فن کا ایک اچھا نقاد بھی تھا۔ بابر نے اپنی تصنیف میں ایران ہی کے موسیقاروں کا ذکر کیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ہندستان میں آنے کے بعد اُسے جنگ سے کم ہی فرصت ملی۔ ہمایوں کو موسیقی سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ اکبر کی تخت نشینی کے موقعے پر دُھرپد کی موجودگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ہندستان آنے کے بعد مغل سنگیت کی طرف سے بالکل ہی غافل نہیں ہو گئے تھے۔

شیر شاہ سوری کے جانشین اسلام شاہ سوری نے موسیقی کی بہت سرپرستی کی تھی، اُس کے دربار میں مبارک خاں، بابا رام داس اور مہا پاتر جیسے سنگیت کار تھے، جس میں آخرِ ذکر بعد میں اکبر کی سرپرستی میں آ گئے۔ جس پر اُسے اُڑیسہ کے راجا مکند دیو کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ سکندر سُور بھی سنگیت کا رسیا تھا اُس نے تان سین کو اپنے دربار میں آنے کی پیش کش کی تھی جو اُس وقت راجہ رام چند بھٹ (ریوا) کے دربار میں ملازم تھا۔ عادل شاہ سُور دوم نے ہندی میں سنگیت کے متعلق ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔

اکبر کی عظیم سرپرستی نے موسیقی کی تاریخ میں اس کے عہد کو ایک سنگِ میل بنا دیا ہے۔ ابو الفضل نے اڑتیس کے قریب سنگیت کاروں اور سازندوں کے نام دیئے ہیں۔ کئی سنگیت کار کشمیر، تبریز، گوالیار اور مشہد سے آئے تھے۔ ابو الفضل یوں رقم ہے: "اعلیٰ حضرت خود بھی موسیقی کے شوقین تھے اور موسیقی کے شوقین حضرات کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ دربار میں ہندی، ایرانی، تورانی اور کشمیری سنگیت کار اور سازندے موجود تھے۔" تان سین کے متعلق ابو الفضل نے لکھا ہے کہ گذشتہ دو ہزار سال میں اُس جیسا سنگیت کار پیدا ہی نہیں ہوا۔ راجا رام چند نے بہت دل برداشتہ ہو کر تان سین کو اکبر کے پاس جانے کی اجازت دی تھی۔ اور پہلی ہی نشست میں اکبر نے دو لاکھ روپے نقد انعام میں دیئے تھے۔ اکبر کھڑا کا رسیا تھا۔ درباری نام اُسی کا دیا ہوا ہے۔ برندابن کے سوامی ہری داس کے شاگرد تان سین نے اکبر کی خدمت میں آنے کے بعد شائرِ اسلام قبول کر لیا تھا۔ تان سین نے میاں کی ملہار، میاں کی سارنگ اور میاں کی ٹوڈی ایجاد کر کے کلاسیکی سنگیت میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے سُور شہنشاہیت ختم ہونے کے بعد بابا رام داس نے بیرم خاں کی سرپرستی حاصل کر لی تھی، وہ دُھرپد کے ماہر تھے۔ دربار میں تان سین کے بعد اُن ہی کا رتبہ تھا۔ مالوے کے بادشاہ باز بہادر کو اکبر کی خدمت میں آنے کے بعد دو ہزاری کے منصب سے نوازا گیا، پورے ہندستان میں اُن کا مقابل نہ تھا۔ سبحان خاں، سری گیان خاں، چتر خاں ولد سبحان خاں، سرود خاں میاں لال، تو ترنگ خاں ولد تان سین، نائک گرجو (گرجو کی ملہار کا موجد) پرمنڈل خاں شہاب خاں بنکر تھے ان کے علاوہ باقی لوگ ہندستانی اسکول میں تھے فیضی محمود خاں دھاڑی، داؤد خاں دھاڑی، ملا اسحاق دھاڑی، رحمت اللہ خاں، آگرے کے رنگ سین بابا رام داس کے اندھے بیٹے سورداس پور بین خاں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی اسکول کے نمائندے تھے مشہد کے استاد دوست، خراسان کے شیخ دادان، مشہد کے میر سید علی، ھرات کے بیرام قلی، اور استاد یوسف، مشہد کے استاد ہاشم، محمد حسین، استاد محمد امین تاش بیگ اور استاد شاہ محمد۔

جہاں گیر بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اُس نے اپنی تصنیف میں بیان لال کا تذکرہ کیا ہے۔ حفیظ نادر علی کو جہاں گیر اکثر و بیشتر تحفے تحائف سے نوازتا تھا۔ تان سین کا انتقال جہاں گیر کے عہد کے سولویں سال میں ہوا اور اُسکی جگہ اُس کے بیٹے بلاس خاں کو ملی جو بلاس خاں ٹوڈی کا موجد تھا۔

شاہ جہاں کا عہد کافی پُر امن رہا۔ اس نے دوسرے فنون کی طرح موسیقی کی طرف بھی کافی توجہ دی۔ شاہ جہاں کے دربار کے ایک سنگیت کار فقیر اللہ (سیف خاں) نے راگ درپن میں ۳۰ سے زائد سنگیت کاروں اور سازندوں کو استعمال کیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ تان سین سے بھی عظیم تھا۔ شاہ جہاں کے زمانے میں گانے کے فن کے ساتھ ساتھ الفاظ اور زبان پر بھی کافی زور دیا جانے لگا۔ ہندستانی اور ایرانی سنگیت گھل مل چکی تھی اور ہندستانی سنگیت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ اکبر کے عہد میں ایران کے آدھے فن کار تھے جب کہ شاہ جہاں کے عہد میں صرف دو فن کار ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اُس کے عہد میں ہندستانی سنگیت اپنے عروج پر تھی۔ اسی زمانے میں دھرپد اور خیال کو مختلف گردانا گیا۔

دھرپد میں بھگوان کرشن کا حال بیان کیا جانے لگا۔ اس طرح اس کا تعلق اندر سے ہوگیا۔

شاہ جہاں کے عہد میں مرنا دا کے شیخ بہاؤالدین بھی گذرے ہیں۔ انھوں نے پچاس سال کی عمر تک ریاضت کی۔ یہ امرت بین بجانے میں لاجواب تھے۔ انھوں نے خیال نامی ایک ساز ایجاد کیا تھا۔ ان کے شاگرد شیر محمد اور میاں ڈھونڈو مشہور سنگیت کار اور سازندے تھے۔ شاہ جہاں کے دربار میں سب سے زیادہ قابل تھے لال خاں جنھیں 'فن کا سمندر' کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ دھرپد کے مانے ہوئے استاد تھے۔ وہ تان سین کے بیٹے، بلاس خاں کے شاگرد اور داماد تھے۔ شاہ جہاں نے انھیں کئی خطابات اور انعامات و اکرامات سے نوازا۔ اُن کی وفات کے بعد اُن کے بیٹے، خوش حال خاں کو 'فن کا سمندر' کا خطاب ملا۔ بازید خاں، محمد حسین اور اُن کے بیٹے سیل سین دھرپد کے ماہر تھے۔ شاہ جہاں نے شجاع کے ساتھ سدری خاں اور گل خاں کو بنگال روانہ کیا تھا۔ کیرانا کی سنگیت کار نے قوالی گانے کا ایک بالکل ہی الگ انداز ایجاد کیا تھا۔

تخت نشینی کے دس سال بعد تک اورنگ زیب ایک عام بادشاہ ہی کی طرح تھا۔ اُسے بھی تمام چیزوں کا شوق تھا۔ خاص طور پر موسیقی کا۔ اس کی تخت نشینی کے جلوس میں خضر آباد سے موسیقار اور سازندے شریک تھے۔ تخت نشینی کے جشن میں بھی موسیقی اور ناچ رنگ کا پروگرام شامل تھا۔ اسے نہ صرف موسیقی کا شغف تھا بلکہ وہ خود بھی موسیقی کا ماہر تھا۔ لیکن امام شافعی کی تعلیم کی وجہ سے ۱۶۶۸ء سے وہ ان تمام چیزوں سے پرہیز برتنے لگا تھا۔ اگر کوئی موسیقار موسیقی سے توبہ کر لیتا تو وہ اسے خلعت سے نوازتا۔ زمین داری سے سرفراز کرتا۔ شہنشاہیت کی سرپرستی میں پلنے والی موسیقی کے لئے اورنگ زیب کا دورِ حکومت بہت بُرا زمانہ ثابت ہوا۔ بادشاہ کے دربار میں بھی ممنوع ہو گئے۔ المختصر موسیقی کا جنازہ اُٹھ گیا۔ موسیقاروں کو دوسرا روزگار ڈھونڈنا پڑ گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 'نغمات الاسرار' نامی کتاب کی کئی جلدیں موجود ہیں جو مرزا محمد (وفات ۱۶۵۵ء) کے فرزند میر احمد کی تصنیف کردہ ہیں۔

حالانکہ ۱۸ویں صدی کو موسیقی کی تاریخ میں سنہرا زمانہ مانا جاتا ہے، لیکن اس زمانے کے موسیقاروں کا نام عام طور پر معلوم نہیں ہے۔ شاہ جہاں کے زمانے ہی میں نہ صرف فنِ تعمیر، فنِ مصوّری اور فنِ خوش خطی کو عروج نصیب ہوا بلکہ فنِ موسیقی نے بھی ترقی کی کئی منازل طے کیں۔ بلخ، بدخشاں، قندھار کے ہندستان سے اخراج کی وجہ سے وہاں سے موسیقی کی درآمد حالانکہ بند ہوگئی لیکن ہندستانی سنگیت ہی میں کئی نئی راہیں نکالی گئیں۔ اور اس کی محرک تھی راجاؤں اور نوابوں کی وہ دلچسپی جو انگریزوں کی آمد کی وجہ سے تھی کہ اب انھیں کسی قسم کی فکر نہیں تھی۔ اس لئے جس طرح وہ کبھی جنگ یا دوسرے کام میں دلچسپی لیتے تھے، موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔

بہادر شاہ (۱۲-۱۷۰۷) نے تو شاہِ بے خبر کا خطاب ہی حاصل کر لیا تھا، وہ دن بھر سوتا اور رات بھر جاگتا۔ یہ موسیقی کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں عظیم سنگیت کاروں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ نعمت خاں ولد نرلی خاں دھرپد، خیال اور ترانے کا ماہر تھا۔ نعمت خاں نے بیسازی قوال اور لالہ بنگالی کی مدد سے بے شمار گیتوں کی دُھنیں بنائی تھیں۔ اُس کے بعد وہ جہاں دار شاہ اور محمد شاہ (۴۸-۱۷۱۹) کے دربار میں بھی شامل رہا۔ اُس کا تخلص تھا سدا رنگ۔ آج کے مشہور خیال کی تقریباً ۷۰ فی صد دُھنیں یا تو محمد شاہ (پیا سدا رنگیلے) نے ترتیب دی ہیں یا نعمت خاں نے۔ اس کے علاوہ دوسرے موسیقار تھے شیخ معین الدین (شاہ جہاں کے دربار کے موسیقار شیر محمد کے پوتے) اور فیروز خاں (نعمت خاں کے شاگرد و داماد) بلکہ فیروز خاں نے تو اپنے استاد سے بھی زیادہ مہارت حاصل کر لی تھی۔ وہ دھرپد، خیال اور ترانے کا مانا ہوا استاد تھا۔ مغل دور کے خاتمے کے بعد دہلی سیاست کا مرکز بن کر رہ گیا۔ اس لئے فن کاروں اور موسیقاروں نے یا تو مختلف ریاستوں میں پناہ لی یا پھر مرہٹا حکمرانوں کی سرپرستی میں ۔ آخر ذکر نے سنگیت کی اتنی زبردست سرپرستی کی کہ اُس کے نتیجے میں آج شمالی اور شمال مغربی ہند سے زیادہ سنگیت کا رواج اسی علاقے میں ہے۔ اودھ نے موسیقی کو بھی اسی طرح اپنا لیا جس طرح مغلوں سے اُن کا رہنے سہنے کا ڈھنگ دوسرے طور طریقے، لباس، عدالت اور حکمرانی کا طریقہ اپنا لیا تھا۔ 1857 تک لکھنؤ نواب وزیر کی سرپرستی میں رہا۔ اس وقت رام پور شمالی ہند میں موسیقی کا مرکز بنا رہا۔ آصف الدولہ کے دَور میں پٹنہ کے محمد رضا خاں نے ۱۸۱۳ میں 'نغماتِ آصفی' نامی کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں ہندستانی راگ اور راگنیوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اس سے شمالی و جنوبی ہند کے درمیان بآسانی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اس سے مختلف راگوں کی اصلیت کے متعلق برسوں پُرانے سوالات بھی ختم ہو گئے۔

مغلوں کے دور کے خاتمے ہی سے وہ سنہرا دور ختم ہو گیا۔ اور خیال اور دھرپد جیسے راگوں کے سمجھنے والے بھی کم رہ گئے۔ اسی لئے لکھنؤ میں ٹھمری اور ٹپا جیسی

دھنیں بنائی گئیں۔ ٹھمری کو پریم راگ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں محبوب اور محبوبہ کے جذبات کا بیان ہوتا ہے۔ ٹپا کا موجد تھا سوری، جس نے اصل میں اونٹوں کے قدموں کی آواز سے یہ دھن تیار کی تھی۔ یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے کہ ٹھمری اور ٹپا محض دھنیں ہیں، اور ان خاص اصولوں کی پابند نہیں ہیں جس طرح دھرپد اور خیال۔ اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ (1857ء) کو نہ صرف موسیقی کا شوق تھا، بلکہ اُسے اس میں مہارت بھی حاصل تھی۔ واجد علی شاہ نے موسیقی کو مقبول عام کر دیا۔ اور لکھنؤ کو ہندوستان کا دینا بنا دیا تھا۔ 'ناجو' نامی تصنیف کردہ کتاب میں اُس نے اپنے دربار میں گائے جانے والے خیال اور دھرپد کا ذکر کیا ہے۔

۱۹ویں صدی میں موسیقی کے فن کو ایک بہت بڑا دھچکا پہنچا، نہ صرف مغل دور کے خاتمے سے، بلکہ پہلی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے قیام اور اُن کی لاپرواہی سے بھی۔ موسیقاروں کی علم موسیقی کو دوسروں سے بچا کر رکھنے کی عادت کے علاوہ موسیقی کی کسی خاص ترتیب کی غیر حاضری نے موسیقی کو بہت نقصان پہنچایا۔ میرا خیال ہے کہ اس جانب سب سے پہلے کلکتے کے مہاراجا سریندر ناتھ ٹیگور نے توجہ کی جس سے پُرانے بھولے بسرے راگوں نے پنر جنم لیا۔

۱۹ صدی سے آزادی تک وہاں کے حکمرانوں کی دل چسپی نے رام پور کو شمالی ہند کی موسیقی کی دنیا میں ایک خاص مقام عطا کر دیا۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اس فن کی جنّت بنا دیا۔ اس فن کے لئے رام پور کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس دربار نے فن کاروں کی ایک لمبی چوڑی فہرست بنائی ہے جس میں نواب کلب علی خاں، شہزادہ سعادت علی خاں، نواب حامد علی خاں، رضا علی خاں، وزیر خاں بینکر، پیارے صاحب دھرپد، مستا خاں خیالی، علی رضا خاں، فدا حسین سرودی، بندہ صادق، استاد مشتاق خاں، صادق علی خاں بینکر، احمد خاں تھرکوا اور اچھن شامل ہیں۔ غرض رام پور نے اس فن کا ایک خراب حالت میں منظیم سرپرستی کی۔

گزشتہ اور موجودہ صدی کے سنگیت کاروں کی فہرست جون پور کے محمد علی خاں (تخلص پیرنگ) اور بمبئی کے پنڈت وی۔ این۔ بھٹ کھنڈے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ راجا نواب علی خاں کی تصنیف 'معارف النغمات' میں درج ہے کہ محمد علی خاں دھرپد کے لاثانی ماہر تھے۔ معارف النغمات میں لکھنؤ کے نواب چھمّن صاحب، سہارن پور کے اچّن خاں، مراد آباد کے نذیر خاں، لکھنؤ کے امیر خاں اور رضا خاں جیسے مانے ہوئے دھرپد کے استادوں کا نام بھی درج ہے۔ اس فہرست میں لکھنؤ کے نواب جانی صاحب کا نام ضرور شامل کرنا چاہئے جو بہت مشہور سنگیت کار بھی تھے اور Theorist۔ آگرے کی زہرہ بائی جو پچھلی ہی نسل کی تھیں۔ سنگیت کی دنیا پنڈت بھٹ کھنڈے کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انھوں نے اپنی تحقیق، تحریر، تقریر اور تعلیم کے ذریعے شمالی ہند کی موسیقی کی موجودہ شکل کو ترتیب دیا ہے۔ یہ محض ان ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت Scientifically طور پر دس ٹھاٹ میں مرتب ہو گئی۔ ان کی پوری زندگی سنگیت کی خدمت ہی میں گذر گئی۔ ان کی تحریر کردہ کتابیں سنگیت پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے لکھشن گیت دراصل کلاسیکی سنگیت کی جدید قواعد ہیں۔ یہ لگن ہی کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی سنگیت نے پُنر جنم لیا۔ اور پنڈت جی نے اپنی زندگی ہی میں بڑودہ (۱۹۱۶) اور لکھنؤ (1926) میں منعقدہ آل انڈیا میوزک کانفرنس کی کامیابی کو دیکھ لیا تھا۔

موسیقی عیاشی کی چیز ہے اور زیادہ تر امراء کی سرپرستی میں پلی بڑھی۔ فی حال سنگیت عہدِ تجدید سے گذر رہی ہے جہاں اس کا شہنشاہیت و ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آل انڈیا میوزک کانفرنس عوام میں سنگیت کا شوق اُبھارنے کی کوشش کر رہی ہے اور سنگیت کار اور عوام کے بیچ کی خلیج کو پاٹ رہی ہے ساتھ ہی ساتھ صحت مند مقابلے کی روح کو بیدار کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا کام یہ کر رہی ہے کہ سنگیت کے متعلق علاقائی زبانوں میں کتابوں کا انتظام کر رہی ہے۔ جو اس سلسلے کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اب تک لکھشن گیت و سنگیت پدّتی کی چھ جلدیں اور راجہ نواب علی خاں کی معارف النغمات کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اس کے علاوہ دوسری کتابیں بھی معہ نشانات کے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ قدم بڑا اچھا اُٹھایا گیا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی رفتہ رفتہ موسیقی کی تعلیم کا انتظام کیا جا رہا ہے مثلاً گوالیار کے مارس میوزک کالج کو بھٹ کھنڈے یونیورسٹی کی طرح بنایا جا رہا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی نے میوزک فیکلٹی قائم کر دی ہے جو فی حال سنگیت میں ڈپلوما اور ڈگری دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کئی یونیورسٹیوں اور امتحان کے بورڈوں نے سنگیت کو انٹر تک ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کر لیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کسی خاص انداز میں گائے ہوئے گیت کا گراموفون ریکارڈ بنا لینے کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے

پھر بھی دلی بمبئی اور لکھنؤ کے ریڈیو اسٹیشنوں کے سنگیت کے پروگراموں نے سنگیت کی جتنی مدد کی اتنی مدد کسی اور نے نہیں کی۔ وہ نہ صرف عوام کو ذہنی طور پر سنگیت کی طرف مائل کرتے ہیں بلکہ سنگیت کو برے اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گانے بجانے والوں کو معاوضہ بھی ملتا ہے اور سماجی رتبہ بھی۔

حال کے سنگیت کاروں کے ذکر کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔ استاد فیاض خاں شمال اور شمال مغربی ہند میں خیال کے سب سے بڑے اور مانے ہوئے کلاکار رہے ہیں۔ انھیں آفتابِ موسیقی سے نوازا گیا تھا۔ وہ پنڈت کرشن راؤ رتن جھنکر (ماریس کالج آف ہندوستانی میوزک لکھنؤ کے پرنسپل اور بمبئی کے استاد ولایت خاں کے استاد تھے۔ اس کے علاوہ اسد علی اور لطافت علی بن بھی اُن کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ لاہور کے عبدالواحد خاں، کولہاپور کے اللہ دیا خاں، رائے گڑھ کے محمد خاں، دلی کے امیر خاں خیال کے مانے ہوئے ماہروں میں سے تھے۔ عورتوں میں دلی کی شمشاد بائی کا ستارہ اونچا ہو رہا ہے۔ بمبئی کی روشن آرا بھی ایک قابل فن کارہ رہی ہیں۔ گوالیار کے شنکر گندھرب مقیالیہ کے پرنسپل پنڈت کرشنا راؤ، حدو طان خسرو خاں کے خاندان کے انداز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جے پور کے کرامت علی خاں بھی دھرپد کے مانے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ دھرپد کے فن میں آگرے کے تصدق حسین خاں، پنجاب کے مبارک علی خاں، اندور کے اللہ بندے خاں کے فرزندان رحیم الدین خاں اور نصیر الدین خاں بھی ماہر ہیں لیکن رحیم الدین ان سب میں ایک بالکل ہی مختلف انداز میں دھرپد گانے والے مانے گئے ہیں۔ ستار بجانے والوں میں جے پور کے حیدر حسین، لکھنؤ کے یوسف علی خاں، کلکتے کے مرحوم عنایت خاں کے بھائی واحد خاں اور بیٹے ولایت خاں اور کلکتے ہی کے مشتاق حسین بھی ستار کے عظیم فن کار مانے گئے ہیں۔

سرود بجانے والوں میں علاؤالدین خاں کا نام سرِفہرست ہے۔ یہ عظیم فن کار اور علم کا خزانہ تھے۔ وائلن بجانے میں ان کا ثانی نہیں تھا کئی ساز اور راگ کے موجد ہیں۔ سرود ہی کے میدان کے صفِ اول کے فن کار ہیں۔ حافظ علی خاں سرودی، علاؤالدین اور حفیظ علی خاں دونوں ہی رام پور کے وزیر خاں کے شاگرد ہیں۔ شہنائی نواز روز بروز کم ہی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ فن ہے بھی بے شک بہت مشکل۔ فی الحال بڑودہ کے بابو خاں اور بنارس کے بسم اللہ خاں ہی اس میدان کے ہیں جب کہ بین بجانے والوں میں صرف رام پور کے صادق علی خاں ہی صفِ اول کے فن کار نظر آتے ہیں۔ علاؤالدین کے فرزند اکبر علی خاں سرود نواز ہیں۔

فلموں میں محمد رفیع، طلعت محمود کو جو شہرت حاصل ہوئی اتنی ہی بیگم اختر نے غزل کے میدان میں ملکۂ غزل بن کر پیدا کی۔

(ترجمہ : صادق علی)

عزیزن طوائف

کانپور کی ہندو اور مسلمان عورتیں اس وقت اپنے گھروں سے نکل نکل کر گولہ بارود ادھر ادھر لے جانے، فوجیوں کو کھانا پہنچانے اور ٹھیک انگریزی قلعہ کی دیوار کے نیچے توپچیوں کو مدد دینے کا کام کر رہی تھیں۔ ان سب عورتوں میں اس وقت کانپور کی ایک طوائف عزیزن کا نام بہت مشہور ہے۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ یہ عزیزن ہتھیار باندھے ہوئے گھوڑے پر چڑھی ہوئی بجلی کی طرح شہر کی گلیوں اور چھاؤنی میں دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی وہ گلیوں کے اندر تھکے ہوئے اور گھائل سپاہیوں کو دودھ اور مٹھائی بانٹتی تھی اور کبھی انگریزی قلعہ کی ٹھیک دیوار کے نیچے لڑنے والوں کے حوصلے بڑھاتی تھی۔

سن ستاون : از پنڈت سندر لال

خواجہ عبدالغفور

مسلمان اور مزاح

دوسروں پر ہنسنا اُن کی کمزوریوں کا مذاق اڑانا فقرے کسنا پھبتی اڑانا ٹھٹھا مخول کسی کو گرتے دیکھ کر اس کی ہنسی اُڑانا یہ سب گھٹیا مذاق ہے اس سے ہنسنے والے یا اس کا ساتھ دینے والے کچھ دیر تو مزہ اُڑا لیتے ہیں لیکن جو ہدفِ ملامت بنتا ہے، جس کی سُبکی ہوتی ہے اُس کے لئے تو یہ سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ خود ہنسنے والے کچھ زیادہ دیر تک اس سے لطف و انبساط نہیں حاصل کر پاتے۔

طنز و کنایہ تضحیک کسی کی پگڑی اُچھالنا کسی کو نشانہ مذاق بنانا کچھ اچھے ذوق یا آداب و تہذیب کے معمولی معیار پر بھی نہیں اُترتے۔ سب سے اچھا مزاح وہ ہے کہ جو کوئی خود اپنے آپ کو چھیڑ کر یا اپنے آپ پر طنز کے وار کر کے دوسروں کو ہنسی کا موقع عطا کرے۔ اپنی کمزوری کو آشکارا کرنا اپنی حماقت یا غلطی کو دوسروں کو سنا کر ہنسانے کے لئے بڑے دل گردہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے علاوہ خود اعتمادی بھی لازمی ہے۔ اگر آپ کی صلاحیت کسی میں ہو تو اس سے بڑا آدمی کوئی نہیں ہو سکتا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے" میں جب خود پر ہنستا ہوں تو دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے "۔

یہی بات کچھ ہمیں ہندوستان کے دانشور مسلمانوں میں بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ بالخصوص اردو کے ممتاز ادیب اور شعراء نے ہمیشہ اپنے جوہر خود بر داشتہ ظرافت میں دکھائے ہیں۔ مسلمانوں نے واعظ، محتسب، زاہد، ناصح، شیخ، پارسا، رند اور صوفی کو نشانۂ ملامت اور ہدفِ طنز و استہزاء بنایا۔ باوجود اس کے کہ مسلم معاشرہ میں ان کا بڑا ادنیٰ مقام ہے اور بالعموم اس قسم کی گستاخیاں روا نہیں گردانی جاتی ہیں۔ ان شخصیتوں سے ہٹ کر خود اپنی مقدس عبادت گاہوں کے تعلق سے بھی گلفشانی کی ہے جیسے کعبہ، دیر و حرم، مسجد حتیٰ کہ رضوان فرشتے مسیحا بھی اُن کے وار سے نہ بچ سکے۔ مسلمانوں نے کبھی کسی اور مذہب کی یا اس کے پیرو کی ذرہ برابر بھی دل شکنی نہ کی بلکہ "لکم دینکم ولی دین" پر سختی سے عمل پیرا رہے۔

اس قسم کے طنز و مزاح میں حضرت غالب کا مرتبہ سب سے ارفع و اعلیٰ ہے انھوں نے فرشتوں پر کس خوبی سے چوٹ کی ہے۔ ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا!

اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے بھی کبھی جھجکے اور نہ اپنے عاصی اور گنہگار ہونے پر پردہ ڈالا۔ یہی نہیں اپنے گناہ گار ہونے کا برملا اظہار کیا۔ ؏ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب، شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہر مسلمان کی عبادت حصولِ جنت کے لئے ہوتی ہے لیکن انھوں نے اس کا بھی تمسخر اُڑایا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اور اسی جنت کو اپنے ایک شعر سے کس طرح سب کے دلوں سے زائل کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

واعظ کی ہستی قابلِ احترام اور اس کا درجہ معتبر و اعلیٰ ہوتا ہے لیکن سب ہی اساتذہ نے واعظ بے چارہ پر بھی ستم آزمائی کی ہے۔ غالب فرماتے ہیں

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

کہاں ہے خانہ کا دعلہ غائب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

جا پڑی بنتِ عنب پر جو نظر واعظ کی
رال داڑھی پہ گری منہ میں بھر آیا پانی

حضرت مومن بھی واعظ کی مٹی پلید کرتے ہیں ؎

واعظ کی بزم وعظ میں کیا بھیڑ بھاڑ تھی
اتنے میں رند آئے تو میدان صاف تھا

ریاض فرماتے ہیں ؎

کم بخت نے شراب کا ذکر اسقدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

ریاض نے جنت میں ملنے والی پاک و صاف شراب اور واعظ دونوں ہی کی خوب مٹی پلید کی ہے

واعظ نہ خود پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہارے شراب طہور کی

حضرت اکبر الہ آبادی واعظ و عاشق کا فرق کس قدر نازک خیالی سے بتاتے ہیں ؎

فرق کیا واعظ و عاشق میں بتائیں تم سے
اس کی حجت میں کٹی اس کی محبت میں کٹی

مسلمانوں کا زاہد بطور خود بڑا خشک مزاج ہوتا ہے اور اپنے زہد و تقویٰ کے زعم میں دوسروں کو ہیچ سمجھتا ہے۔ واعظ بذات خود چاہے کچھ ہو لوگوں کو موقع بے موقع وعظ اور لکچر سے پریشان کرتا ہے۔ ان کے سوا محتسب وہ شخصیت ہے کہ جو نہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے نہ اپنے نماز روزوں کا اعلان کرتا ہے بلکہ یہ ایک خدائی فوجدار ہوتا ہے کہ جو ہر ایک کی خامیوں پر نظر رکھتا ہے اور ان کو برائیوں سے روکنے پر تلا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے بیزارگی کے عالم میں جگر مرادآبادی فرماتے ہیں

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

اسی خیال کو حضرت داغ اپنے خاص رنگ میں اور طرح پر فرماتے ہیں ؎

محتسب توڑ کے شیشہ نہ بہا مفت شراب
ارے کم بخت چھڑک دے اسے میخواروں پر

فیض صاحب محتسب کو برا بھلا نہیں کہتے مگر اس کو کچھ ایسے انداز میں یاد فرماتے ہیں کہ اس کی شخصیت کا پول کھل جاتا ہے ؎

[illegible]

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا مے کا خم کا پیمانہ کا نام

اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اور اپنی پاکبازی کے گھمنڈ میں زاہد ہر دم یہی اعلان کرتا ہے کہ وہ شراب خواری سے بہت دور ہے اس پر کس قدر بامعنی طعنے کے تیر چلائے جاتے ہیں ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

زاہد کو اپنے تقدس پر بڑا ناز ہے لیکن اس کی تقدیس کا حضرت داغ نے کس خوبی سے سیدھے سادے لفظوں میں مذاق اڑایا ہے۔ ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

واعظ زاہد محتسب کے ساتھ حضرت شیخ بھی کانٹوں میں گھسیٹے جاتے ہیں اور وہ بھی اس لطیف انداز میں کہ شاید وہ اپنا منہ چھپانے میں ہی اپنی خیر سمجھیں

حضرت درد فرماتے ہیں ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیے
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

امیر مینائی اپنی صفائی میں حضرت شیخ سے مخاطب ہو کر کیا خوب حجت پیش کرتے ہیں ؎

[illegible] یارے پلا دے تو پھر کہنا نہ پیجئے
زاہد نہیں [illegible] کچھ دل نہیں

عرش ملسیانی [illegible] حرام کر دیا ؎

بس اسی دھن میں رہا مر کے ملے گی جنت
تجھ کو اے شیخ نہ جینے کا قرینہ آیا

شیخ جی سے اکتا کر بھاگنے کی انتہا ہے کہ ان سے چھٹکارا پانے کے لئے فیض کو دوزخ بھی قبول ہے۔ ؎

خیر دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی۔

اکبر الہ آبادی نے اپنے زہر خند سے شیخ کا کردار خوب واضح کیا ہے ؎

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ مسلمان پارسائی کا دعویٰ کر سکے البتہ رندی تو عام ہے ان کا ملاحظہ فرمائیے۔

جگرؔ

شب کو مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

اسلامی نقطۂ نظر سے توبہ و استغفار کے ساتھ اگر کوئی راہِ راست کو اختیار کرے تو وہ صحیح معنوں میں مسلمان اور جنت کا حقدار ہو سکتا ہے لیکن مومنؔ فرماتے ہیں

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اسی کیفیت کو سکندر جہاں بیگم ضیاؔ نے اسطرح پیش کیا ہے

جی میں تو فکر بتاں اور لب پہ ہو ذکر خدا
اے دلِ بے تاب تجھ سے پارسائی ہو چکی

امیرؔ مینائی عالم سکر و نشاط کو اپنی بدمستی سے اسطرح منسوب کرتے ہیں

مسجد میں بلاتے ہیں ہمیں زاہد نافہم
ہوتا جو ہوش تو مے خانہ نہ جاتے

خواجہ حیدر علی آتشؔ کا پیام ملاحظہ فرمائیے

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب
بس ہو چکی نماز مصلے اٹھائیے

اکبرؔ الہ آبادی کا مشاہدہ کچھ اور ہی ہے

زمانہ کہہ رہا ہے سب سے پھر جا
نہ مندر جا نہ مسجد جا نہ گرجا!

علامہ اقبالؔ نے بھی طنز کے میدان میں قدم رکھا تو خود اللہ تعالےٰ سے جھگڑا کھڑا کیا اور اُن سے نہایت ادب کے ساتھ شکوہ و شکایات کا دفتر کھول دیا۔

اساتذہ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُنھوں نے کبھی اور سے کے اختلافات کو دیکھا اور نہ کسی کو مخالف سمجھ کر اُس سے تخول کیا بلکہ اُن سب کے طنز و استہزاء کے وار اپنے ہی مقلدین اور معتقدین جیسے زاہد واعظ محتسب شیخ صوفی پر ہوا کئے۔ خود کو رند ریا کار گردانا۔ جنت، حور، شرابِ طہور، فرشتے، رضوان، مسجد، کعبہ و حرم کے تعلق سے بے باک تمسخر اور تخول کیا۔ انتہا یہ ہے کہ مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہئے کی صدا بھی لگادی۔ اس قسم کا مزاح کسی اور زبان میں نہیں ملتا اور کسی مذہب کے پیروؤں نے کھلم کھلا اپنے تقدس مآبوں یا مقدس چیزوں پر اس طرح بے باک حملے نہیں کئے۔

شاعری کے ان نمونوں سے ہٹ کر دیکھئے تو نثر میں بھی مسلمانوں نے مزاح کا رنگ اور چوکھا پایا ہے۔ خود مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں بڑی چابکدستی سے گل افشانی کی ہے۔ دیگر اساتذہ میں میر امن کی داستان باغ و بہار، رجب علی سرورؔ کے فسانۂ عجائب، داستانِ امیر حمزہ، بوستانِ خیال میں فریبی اور عیار لوگوں کی چالاکیوں پر مزاح کس انداز میں بتائی گئی ہیں۔ اسی طرح ہجورؔ کی کتاب نورتن میں ظرافت کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ شہباز نے مذہب و ملت کے نام پر کی جانے والی برائیوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔

مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت نے کبھی یہ گوارا نہ کیا کہ آپس میں ایکدوسرے پر کیچڑ اُچھالا جائے۔ جب کبھی ظرافت کی رگ پھڑکتی ہے یہ کوئی کردار کھڑا کر دیتے ہیں۔ اُس کی بوکھلاہٹ اس کی ڈینگیں اس کی حماقت اور اُس کی کم فہمی پر لوگوں کو ہنسایا جاتا ہے۔ شیخ چلی ایک ایسا زبردست کردار ہے کہ آج بھی ایک مفکر مدبر ایڈمنسٹریٹر رہبر و رہنما شخصیت میں اس کی جھلک صاف و صریح نظر آتی ہے۔ یہ بڑے بڑے دعوے کرتا ہے ہوائی قلعے بناتا ہے۔ ریت پر محل تعمیر کرتا ہے خوش فہمی کا شکار رہتا ہے۔ اُس کی حکایتوں میں ہر کوئی ایک خود کی شخصیت کو پنہاں دیکھتا ہے۔ لال بجھکڑ وہ عقل کا اندھا ہے کہ جو اپنے آپ کو دانا و بینا پیش کر کے سب کام اوندھے کرتا ہے۔ یہاں بھی ہر آدمی اپنی کمزوریاں دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ وہ اس سے منسوب نہیں بلکہ کسی اور کی بپتا ہے۔

تیس مار خاں اور پائے خاں بھی ایسے ہی کردار ہیں اور وہی کیفیات پیش کرتے ہیں۔ دراصل یہ ایک نیک جذبہ ہے کہ کسی اور کو موردِ لعن و طعن بنانے کے بجائے ایک خاص کردار کی تخلیق کی اور اُس کو نشانۂ ملامت بنایا مگر لطف و لطافت کے ساتھ۔

پچھلے دور میں سماج جیسی کوئی چیز نہ تھی۔ زندگی دربار اور شہنشاہوں کے محلوں کے گرد گھومتی تھی۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی عیاشی لطافت بہتا تھا۔ اُس کے لئے راجہ بیربل اور ملا دو پیازہ کے کردار کھڑا کر کے اُن کی آپس کی چشمک اور نوک جھونک کرائی جاتی ہے لیکن اُن کا وار کسی اور پر نہیں ہوتا بلکہ آپس میں ہی گتھم گتھا دکھائی دیتے ہیں۔ اُن سے ہٹ کر

ترکی سے ایک کردار کو درآمد کیا گیا۔ ملا نصیرالدین کے نام سے اور ان کو ترکی بہ ترکی حمد و نعت کرتے ہوئے بتاکر بڑا ہی لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔ ان سے ہٹ کر بھی ہم نے خاص خاص کرداروں کی تخلیق سے اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ جیسے اسپ زعلی تاج کے چچا چھکن سرشار کے خوجی عظیم بیگ چغتائی کی خانم منشی سجاد حسین کے حاجی بغلول شوکت تھانوی کے منشی جی و قاضی جی، ابن اسلم کے مرزا جی اور دیگر معروف اور غیر معروف ادیبوں کے ایسے بے حساب کردار ہیں جیسے صاحب لق لق جعفر زٹلی مرزا بندو فی احمق الدین وغیرہ وغیرہ بطور خاص ذکر کے قابل ہیں۔ ملا رموزی نے تحریف نگاری کی تو انھوں نے کلام مجید کے لفظی ترجمے کی نقالی کی اور اس کو گلابی اُردو کا نام دے دیا۔

حضرت امیر خسرو نے پہیلیوں میں کافی مزاح پیدا کیا ہے لیکن اُن کی الٹول شاعری کی صنف بہت خاص ہے جس میں وہ اُلٹی پُلٹی بے جوڑ باتوں میں ربط پیدا کر کے اُن کو پُر معنی بنا دیتے تھے۔ روایت ہے کہ وہ ایک بار کسی قصبہ سے گذر رہے تھے اور انھیں پیاس لگی۔ کنویں پر پنہاریوں سے پانی مانگا۔ یہ اُن کو جان گئیں اور پوچھا آپ ہی امیر خسرو ہیں جن کے گیت مقبول ہیں۔ انھوں نے ہاں کہا تو سبھوں نے فرمائش کی کہ ہم ایک ایک لفظ کہتے ہیں آپ سب کو جوڑ کر کوئی اچھا سا شعر موزوں کیجئے۔ ایک نے کہا 'کھیر' دوسری نے کہا 'چرخہ' تیسری نے 'ڈھول' چوتھی نے 'کتا'۔ حضرت امیر خسرو کا پیاس سے بُرا حال تھا مگر ان پنہاریوں نے مانا نہیں۔ آخر کار انھوں نے بڑی خوبصورتی سے ان سب کو اس طرح جوڑ دیا۔

کھیر پکائی جتن سے اور چرخہ دیا چلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

ہندوستانی مسلمانوں کے مزاح کی یہ کچھ مثالیں تھیں۔ لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے خلفاء راشدین کی زندگی میں بھی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں مزاح کی جس کار گزار آتی ہے اور باتوں باتوں میں پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ ایک بار کسی بڑھیا نے آنحضرت سے پوچھا —— "کیا مجھ بڑھیا کو جنت میں داخلہ ملے گا؟" سرکارِ دو عالم نے مسکرا کر فرمایا "ہرگز نہیں" یہ بڑی پریشان ہوئیں اور اُن کی آنکھوں سے آنسو نکلنے والے تھے کہ حضور اقدس نے فرمایا۔ تمہیں معلوم نہیں روز حشر میں نہ کوئی بڈھا ہوگا اور نہ بچہ سب ایک سے ہوں گے۔ تم میری اُمت سے ہو جنت کی تمہیں کوئی فکر نہ ہونی چاہئے۔

مال غنیمت کی تقسیم کے وقت کسی تاجر نے التجا کی کہ اُس کے کاروبار کے لئے اُسکو ایک اونٹ عنایت ہو۔ رسول خدا نے بآواز بلند فرمایا "اس کو ایک اونٹ کا بچہ دے دیا جائے"۔ اُس شخص نے انتظار کئے بغیر کہا "حضور اقدس مجھے سامان لادنے کے لئے اونٹ چاہئے"۔ سرکار دو عالم نے مسکرا کر کہا "کیا بڑا اونٹ، اونٹ کا بچہ نہیں ہوتا۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ سے ایک صحابی نے دریافت کیا "بزدل کون ہے؟" جواب دیا جو جنگ میں ہمیشہ شکست کی سوچتا ہے"۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب بیت المال کا سارا اثاثہ تقسیم کر چکے تو کسی نے کہا "اب کیا ہوگا"۔ آپ نے جواب دیا "ہمارا کام بیت المال خالی کرنا ہے اور اللہ تعالےٰ کا کام اس کو بھرنا ہے۔ ہم اپنا فرض بجا لائیں تو اس کی فیاضی سے کیسے محروم رہیں گے"۔ حضرت علیؑ کی خدمت میں ایک شخص آیا جس کو کیمیا اور سونا بنانے کا خبط تھا اور اس نے حضرت سے اس کی ترکیب پوچھی۔ حضرت علی نے فرمایا: "شمع کی لو کو منجمد کرو سونا بن جائیگی"۔ اس خوبی سے اشارہ کر دیا کہ فضول باتوں کا سوچنا وقت برباد کرنا ہے۔

ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ جن میں طنز و مزاح کا شہکار اور کوئی دوسرا نہیں بلکہ خود اور اپنے والے ہوتے ہیں اور یہ ایک قوم اور ملت کی صحت کی نشانی ہے۔

احتیاط

"میں نے اونچی ایڑی کی سینڈلیں اس لئے پہننا چھوڑ دیں کہ میرے اور شاہد لطیف کے قدموں کا باہمی فرق کم نہ ہو جائے اور وہ بڑے معلوم ہونے لگیں — میں نے لکھنا کم کر دیا تاکہ میری شہرت سے وہ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ میں نے اچھے لباس پہننے چھوڑ دیئے تاکہ لوگوں کی نظریں مجھ پر کم پڑیں"۔ (عصمت چغتائی)

امداد صابری

ہندستان میں خبر رسانی کے ذریعے

ابتدا سے ــــــــ آج تک

جب سے آدم نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے خبر رسانی کا سلسلہ برابر جاری ہے ابتدائی دور میں مسافروں، تاجروں اور قافلوں کے سفر پہلا خبر رسانی کا ذریعہ ہے جب کوئی مسافر یا تاجر اور قافلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تو وہاں پہنچ کر اپنی جگہ مقام و قصبہ یا شہر کے حالات اور خبریں بیان کرتا تھا۔ اور جب واپس آتا تو ان مقامات کے حالات و خبروں سے اپنے لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔

جب حضرتِ انسان نے ترقی کی طرف توجہ دی اور تنظیمی شکل میں آئے اور راجا پرجا کے پھندوں میں پھنس گئے تو عہد برہمنی میں خبریں پہنچانے اور خبریں حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا، راجا ملکی نظام چلانے کے لئے تین یا پانچ گاؤں کے درمیان ایک حفاظتی مکان (سرائے) بنواتا تھا جس میں اس کے اہل کار اپنی ڈیوٹی انجام دیتے تھے۔ اور حسب ذیل طریقہ خبر رسانی کا ذریعہ بنتا تھا۔

"گاؤں میں کچھ واردات ہو تو گاؤں کا مالک دس گاؤں کے مالک سے کہے اور وہ بیس گاؤں کے مالک سے کہے۔ بیس گاؤں کا مالک سو گاؤں کے مالک سے کہے اور وہ ہزار گاؤں کے مالک سے کہے۔"

اسی زمانے میں دوسرے ملکوں کے حالات جاننے کے لئے دوت یعنی سفیر جایا کرتے تھے جن کی ڈیوٹی منو مہاراج نے یہ مقرر کی تھی:۔

"دوت (سفیر) دوسرے راجاؤں کی دل کی بات اپنی مملکت کے لئے معلوم کرے۔ دوت کے اختیار میں صلح یا جنگ ہے۔ دوت بگڑے کو ملاتا ہے اور ملے ہوئے کو بگاڑتا ہے سب اہل کاروں میں دوت ہی راجہ کی بات اور اشارہ، آثار، قیافہ سے راجا کے کام کرنے کے لائق سب کام جانے۔"

ملک اور سرکاری افسران کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے مخبر بھی مقرر ہوتے تھے۔ منو مہاراج کا ارشاد ہے:۔

"وزیر اعظم گاؤں اور نگر وغیرہ کے مالکوں کو بے مطلب بھی وقتاً فوقتاً اپنی قوت سے دیکھتا رہے اور مخبروں کے ذریعے سب کے دل کی بات جانے، راجا کے اکثر عہدہ دار دوسرے کے مال پر قبضہ ناجائز کر لیتے ہیں اس واسطے ان سے رعیت کی حفاظت کرے۔"

اسی طرح شہروں کے حالات جاننے اور خبریں حاصل کرنے، دوسرے راجاؤں کی سیاسی پوزیشن سے باخبر رہنے، دشمنوں کے ملکوں اور ان کی فوجوں کے حالات جاننے، رعایا کی خواہشات سے آگاہ ہونے کے لئے جاسوس و مخبر مقرر کئے جاتے تھے جو سبھاؤں، کنوؤں، شراب خانوں، غلہ فروشوں، چوراہوں، جنگلوں، باغوں اور کاریگروں کے کارخانوں وغیرہ کی خبریں تک راجا کو پہنچاتے تھے۔

چور، ڈاکوؤں، جیب کتروں، اٹھائی گیروں، غرض ہر قسم کے مجرموں اور تمام جرائم و مقدمات کی تحقیقات کے لئے مخبر و جاسوس مقرر ہوتے تھے، جن کو چوروں کا جاسوس کہا جاتا تھا، جو چوروں اور بدمعاشوں کو اس بہانے سے پھانستے تھے کہ تم ہمارے گھر چلو تم کو لڈو کھلا کر ایک ایسے برہمن سے ملوائیں گے جو انسانی اسکیموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی تدبیریں جانتا ہے۔

راجہ، وزیر اعظم اور اپنے رشتہ داروں پر بھی جاسوس و مخبر مقرر کرتا تھا جو ان کے ذریعے ان کی طاقت اور ارادوں سے باخبر رہتا تھا۔

راجہ سفیروں، جاسوس اور مخبروں کی خبریں شام کو عبادت کے وقت خلوت گاہ میں سنتا تھا۔

چندرگپت کے دور میں محکمہ تفتیش و خبر رسانی نے اور آگے قدم بڑھایا، سلطنت کے اہم محکموں شاہی درباروں اور بڑے بڑے ذمہ داروں اور عوام کی ہر نقل و حرکت پر حاوی ہو گیا تھا اور ان کی نگرانی کرتا تھا، بادشاہ کو ان کی خبریں پہنچاتا تھا۔ جن کو یونانی اہل قلم نے مستقل اور مستہم لکھا ہے اور ان کا ذکر اشوک کے فرامین شاہی ملازمین یعنی پلیسانی یا اخبار نویس کے نام سے کیا ہے۔ جاسوسوں کے متعلق قواعد و ضوابط مقرر تھے جس میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ حکومت کے نظام کو درست طریقے سے چلانے کے لئے خفیہ خبریں حاصل کرنا ضروری ہیں۔

فاحشہ عورتیں بھی جاسوسی کے فرائض انجام دیتی تھیں، یہ فاحشہ عورتیں دربار کی ملازمہ ہوتی تھیں ناظم اور نائب ناظم کے حکم کے مطابق شاہی چتر کے سونے کے آفتابے اور پنکھے اٹھاتی تھیں اور جب کبھی بادشاہ تخت پر بیٹھتے یا رتھ یا پالکی پر سوار ہوتے تو اس کے ہم رکاب رہتی تھیں۔ ان فاحشہ عورتوں کے بارے میں آئین خبر رسانی میں ایک مخصوص باب ہے۔

فاحشہ درباری عورتوں پر ہی جاسوسی منحصر نہ تھی بلکہ بازاری پیشہ ور اور چھاؤنی کی فاحشہ عورتوں کو بھی جاسوسی کرنے پر لگایا جاتا تھا جو بازار کی چھوٹی موٹی باتیں تک افسران بالا تک پہنچاتی تھیں۔

مخبروں کو کئی کئی زبانیں آتی تھیں وہ بھیس بدل کر مخبری کرتے تھے کمال کا بھیس بدلتے تھے۔ جاسوس خط رموز استعمال کرتے تھے اور خفیہ خبریں پہنچانے میں کبوتروں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ خفیہ پولس محکمہ جاسوسی کی نگرانی میں ہوتی تھی وہ ان کی تمام رپورٹوں کی جانچ اور پڑتال کرتی تھی۔

عہد قدیم میں غیر ملکوں یا دور دراز مقاموں سے خبریں حاصل کرنا اور ان میں خبریں پہنچانے کا بار زیادہ تر جانور ہی اٹھاتے تھے۔ چنانچہ انجیل مقدس کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاک جو صوبہ داروں، ناظموں، منصب داروں اور ہر فرقہ کے چودھریوں کو بادشاہ کی طرف سے بھیجی جاتی تھی اس کو گھوڑے، تانگے، خچر، سانڈنی، اونٹ لے جاتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ افریرس نے یہودیوں کو قتل کرنے اور اس کے بعد عیسائیوں کے قتل کرنے کے فرمان اسی ڈاک سے روانہ ہوئے تھے۔ اس فرمان پر بادشاہ کی انگوٹھی کی مہر لگائی جاتی تھی یہ ڈاک سلطنت کے ایک سو ستائیس صوبوں میں روانہ ہوتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب ممالک اکثر قبیلوں میں تقسیم تھے۔ اسلامی ابتدائی دور میں ڈاک کے مذکورہ طریقہ پر باقاعدہ عمل نہیں کیا جاتا تھا جب حکومت کا نظام مضبوط ہو گیا تو حضرت امیر معاویہ نے پہلے سرکاری ڈاک اور خبر رسانی کا باقاعدہ محکمۂ برید قائم کیا۔ اس کا طریقہ نظام یہ تھا کہ ملک بھر میں تھوڑی تھوڑی مسافت پر تیز رفتار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ سرکاری ہرکارے منزل بمنزل انھیں بدلتے ہوئے ایک مقام کی خبریں دوسرے مقام پہنچاتے اور لے جاتے تھے۔

قدیم ایران میں بادشاہ ایرج کے عہد کے عہد میں اس قسم کے لوگ خبریں حاصل کرنے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے جن کو بادشاہ کی آنکھ اور کان کہا جاتا تھا۔ جو سلطنت کے ہر کونے سے جا کر بادشاہ کو وہاں کے حالات و واقعات سے باخبر کرتے تھے۔

عباسیوں نے اس طریقہ کو اہم سمجھ کر اس پر عمل کیا اور اس کو "حکومت کے ستون" سے تعبیر کیا۔ غزنویوں کے ہاں بھی ایسا ہی محکمہ بنا ہوا تھا جن کو غوریوں نے جاری کیا۔ قطب الدین ایبک کے ہاں واقعہ نویسوں کا اسٹاف تھا۔ شمسی بادشاہوں کے زمانہ میں اس محکمہ کے مخبروں کے علاوہ بادشاہ خود راتوں کو گشت لگا کر رعایا کی حالت حالات اور ملک کی کیفیت سے آگاہ ہوتا تھا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"شمس الدین التمش بادشاہ رات کو بھیس بدل کر شہر میں گشت لگاتے تھے، غریبوں کے گھر جاتے اور غیر آباد مقامات کے حالات کی خبرگیری کرتے تھے اور ان میں بلا کر ان کی امداد کرتے تھے۔"

بلبنوں نے بھی اس محکمے کو بہت اہمیت دی۔ اس محکمہ کا حکم القطاعی مانا جاتا تھا۔ برید کی ذمہ داری بہت اہم سمجھی جاتی تھی۔ اس اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر کوئی محکمے کا آدمی غلط رپورٹ کر دیتا تھا تو اس غیر ذمہ داری کی وجہ سے اس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ چنانچہ غیاث الدین بلبن نے یہی کیا۔

ملک نعیق بدایوں کا صوبہ دار تھا اس نے ایک فراش کو مار ڈالا۔ تھوڑے دنوں کے بعد سلطان غیاث الدین بدایوں آیا، فراش کی بیوی نے فریاد کی۔ اس نے ملک نعیق کو اس قدر درے لگوائے کہ وہ دوسری دنیا کو سدھار گیا اور جس برید نے خبر نہیں دی اس کو دار پر کھنچوا دیا۔

علاءالدین خلجی کی اصلاحی کامیابی بھی اس برید اور جاسوسی محکمے پر منحصر تھی نرخ غلہ اور منڈیوں کے مصالح کی خبر بادشاہ کے پاس پہنچانے کا کام ان تین اہل کاروں کے ذمے تھا (۱) شحنہ منڈی (۲) برید منڈی (۳) جاسوسان منڈی۔ اگر ان تینوں کی خبروں میں آپس میں کوئی فرق پڑتا تو شحنہ منڈی کی کم بختی آ جاتی تھی اور باز پرس ہوتی تھی۔

بازاروں کے حالات جاننے کے لئے جاسوس مقرر تھے اگر بازار کے متصدّی بادشاہ کو خبر د اطلاع دیتے تو جاسوسوں کی رپورٹ پر ان کو سزا ملتی تھی۔

نرخوں کی دیکھ بھال کے لئے بادشاہ اس قدر مستعد تھا کہ وہ ان جاسوسوں اور مخبروں اور بریدوں پر بھی اعتماد نہیں کرتا تھا، نوجوان لڑکوں کو روپیہ دے کر فروخت دیکھنے کے لئے بازاروں میں بھیجتا تھا اگر مقررہ قیمت پر فروخت نہ کرتے تو سزا دی جاتی تھی بہت کم سزا یہ تھی کہ ناک کان کاٹ لئے جاتے تھے، جتنا کم تولتا اتنا ہی گوشت اس کے کولہے کا کاٹتے تھے اور اس کے سامنے پھینک دیتے تھے۔

چنانچہ ایک مرتبہ اناج مقررہ نرخ کے خلاف آدھی پیسل زیادہ فروخت کردیا تھا تو محکمہ برید کی اطلاع پر محتسب کے دُرّے لگوائے گئے۔

جس مقام و ملک میں لڑائی ہوتی تھی وہاں بھی بادشاہ ڈاک چوکی بٹھاتا تھا۔ روزانہ کی خبریں اس کو بھیجی جاتی تھیں، چنانچہ جب تلنگانہ پر مخالف کی زیادہ فوج کی وجہ سے ڈاک چوکیاں اٹھالی گئیں تو بادشاہ کو خبریں پہنچنا بند ہوگئیں جس کی وجہ سے اس نے سمجھا کہ حالات امید افزا نہیں ہیں تو گھبرا کر حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی خدمت میں، دو امیر قاضی غیاث الدین بیانوی اور ملک قرا بیگ کو بھیجا اور دعا کے واسطے التجا کی اس وقت بادشاہ کو فتح نصیب ہوئی۔ یہ ہی محکمہ برید تھا جس نے علاء الدین خلجی کو قتل ہونے سے بچایا اور دشمنوں کی اسکیم سے اس کو مطلع کردیا تھا، اس کی کارگزاری سنئے۔

علاء الدین نے جن مغلوں کو موقوف کردیا تھا وہ بے کار رہتے تھے اپنی جان سے عاجز آگئے تھے انھوں نے ارادہ کیا کہ بادشاہ روزانہ سیرگاہ جاتا ہے اور شکرہ اڑاتا ہے اس وقت سب کی نظریں اوپر ہوتی ہیں کسی کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے دو تین آدمی جاکر بادشاہ کا کام تمام کردیں چونکہ مخلوق بادشاہ کے اصلاحی کاموں اور ٹیکسوں سے تنگ اور ناخوش ہے اس کے ختم ہونے سے وہ خوش ہوگی۔ بادشاہ کو اس اسکیم کی خبر مخبروں نے پہنچائی بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے ملک میں ایک ہی دن میں نو مسلم مغل قتل کردیے جائیں اور ان کا نام تک باقی نہ رہے چنانچہ بیس تیس یا سولہ ہزار مغل قتل ہوئے۔

جنگ کا دارومدار بھی اسی محکمہ کی خبر رسانی پر تھا، ڈاک چوکی کے ذریعہ سامانِ حرب منگایا جاتا تھا اور جنگ کی خبریں روانہ کی جاتی تھیں، اگر ڈاک چوکی میں کچھ خرابی پیدا ہو جاتی تھی تو اس سے فوج میں بدگمانیاں پھیل جاتی تھیں اور دشمنوں کو فوج میں انتشار پیدا کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

چنانچہ ولایت تلنگ کی جنگ میں کچھ کامیابی کی صورت نظر آنے لگی تو رائے رددر دیو صلح پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن غیاث الدین کا امیر جنگ الغ خاں صلح پر آمادہ نہیں ہوا اور قلعہ ارنکل پر قبضہ ہونے لگا، ہفتہ میں دو مرتبہ دہلی سے خبریں آیا کرتی تھیں وہ ایک ماہ تک نہیں آئیں اور ڈاک چوکی کے سلسلے میں خرابی پیدا ہوگئی تو عین اسی وقت الغ خاں کی فوج کے منافقین نے یہ اڑا دیا کہ بادشاہ فوت ہوگیا، اس سے فوج میں اضطراب اور کم ہمتی پیدا ہوگئی، فوج منتشر ہونے لگی منافقین چاہتے تھے کہ الغ خاں کو بھی ختم کردیں۔ دشمنوں کو جب فوج کے اس انتشار کی خبر پہنچی انھوں نے قلعہ کا حصار توڑ کر فوج کو غارت و تباہ کرنا شروع کردیا اور الغ خاں کے قتل کے ارادے کرنے لگے۔ اتنے میں ڈاک چوکی (جس کو الاغ کہتے تھے) کے ذریعہ دہلی سے خبر آئی کہ بادشاہ زندہ سلامت ہے، منتشر فوج میں جان پڑگئی اور متحد ہوگئی۔ الغ خاں نے دشمنوں کو شکست دی، منافقین ملک مل، افغان عبید شاعر جب دہلی لائے گئے تو ان کو ہاتھیوں سے کچلوا دیا گیا۔

علاء الدین کا محکمہ برید ملک پر اس قدر حاوی ہوگیا تھا اور خبر رسانی اور جاسوسی نے اس قدر فروغ حاصل کرلیا تھا کہ جاسوس محلوں کوچوں اور گھروں تک میں مقرر تھے۔ بادشاہ خلق کے اچھے بُرے کاموں اور حالات سے واقف ہوتا تھا، مخبروں کی اتنی کثرت تھی اور اس قدر دیانت دار تھے کہ جو امیر اپنے گھر میں بیوی بچوں سے باتیں کرتے تھے اس تک کی رپورٹ بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی جس کی وجہ سے امرا اور عوام نے اس قدر احتیاط برتنی شروع کردی تھی کہ دن میں گھروں میں بات چیت نہیں کرتے تھے، بلکہ آدھی رات گزرنے کے بعد اور کھانا کھانے کے بہت دیر بعد گفتگو کرتے تھے۔

محمد شاہ تغلق نے بھی اس محکمہ میں کافی ترقی کی۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے:

"سیوستان سے ملتان تک دس دن کا راستہ ہے اور ملتان سے دارالخلافہ دہلی تک پچاس دن کا، جو خبر اخبار نویس بادشاہ کو لکھتے ہیں وہ اس کے پاس ڈاک سے پانچ دن میں پہونچ جاتی ہے، ڈاک کو اس ملک میں برید کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک برید الخیل گھوڑے کی دوسری برید الرجال پیادوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک کو الاق کہتے ہیں۔ ہر چار کوس کے بعد گھوڑا بدلتا ہے۔ یہ گھوڑے بادشاہ کی طرف سے رہتے ہیں۔ پیدلوں کی ڈاک کا یہ انتظام ہے کہ ایک میل میں جس کو کرہ کہتے ہیں چوکیاں ہرکاروں کی

ہوتی ہیں، اس چوکی کو دوان کہتے ہیں۔ ہر ایک تہائی میل کے فاصلے پر ایک گاؤں آباد ہوتا ہے۔ گاؤں کے باہر ہرکاروں کے لئے برجیاں بنی ہوئی ہیں ہر ایک برجی میں ہرکارے کمر کسے بیٹھے رہتے ہیں ہر ایک ہرکارے کے پاس ایک چھڑی دو گز لمبی ہوتی ہے جس کے سرے پر تانبے کے گھنگرو بندھے ہوتے ہیں جب شہر سے ڈاک چلتی ہے تو وہ ایک ہاتھ میں خط اور رکھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے تمام طاقت خرچ کر کے وہ دوڑتا ہے دوسرا ہرکارہ اس گھنگرو کی آواز سن کر تیار ہو جاتا ہے اور خط لے کر فوراً دوڑتا ہے اس طرح جہاں خط پہنچانا ہوتا ہے پہنچا دیتے ہیں۔ یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے جلدی جاتی ہے کبھی کبھی سنگین مجرم کو بھی چارپائی پر لاتا تھا اسی طرح جو کی یہ چوکی ہرکارے لے جاتے ہیں۔ دولت آباد دریائے گنگ سے چالیس دن کے فاصلے پر ہے۔ اخبار نویس ہر مسافر کا حال تفصیل وار لکھتے ہیں کہ اس کی صورت ایسی ہے لباس ایسا ہے۔ نوکر ساتھی اور جانور اس کے ساتھ اتنے ہیں) اس کی حرکات و سکنات اس قسم کے ہیں الغرض کوئی بات نہیں چھوڑتے۔ ملتان سے دہلی جانے کا راستہ پچاس روز ہے۔ میرے آنے کی خبر (ہرکارے کے ذریعہ پانچ روز میں پہنچ گئی تھی) ملتان کا اخبار نویس سمرقندی ہے جس سے میری ملاقات ہوئی۔"

ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ ہر ایک چھوٹے اور بڑے امیر کے پاس بادشاہ کا ایک غلام رہتا تھا۔ جو بادشاہ کو امیر کے حالات سے باخبر رکھتا تھا اور اسی طرح لونڈیاں جو کچھ امیر کے گھر میں ہوتا تھا اس کی خبر بھنگنوں کو دیتی تھیں اور یہ بھنگنیں مخبروں کے افسر کو پہنچا دیتی تھیں اور وہ بادشاہ کو پہنچا دیتا تھا۔

چنانچہ ایک امیر اپنی عورت کے ساتھ رات کو سو رہا تھا اس نے اپنی بیوی سے جماع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا عورت نے اس کو بادشاہ کی قسم دی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ امیر نے اس کی بات نہیں مانی۔ اس کی یہ خبر رات ہی کو بادشاہ کے پاس پہنچ گئی۔ بادشاہ نے صبح ہی اس امیر کو بلوایا کہ تو نے ایسا کیا ہے جس کے جرم میں بادشاہ محمد تغلق نے امیر کو قتل کرا دیا تھا۔

فیروز شاہ گھوڑوں کے علاوہ اونٹوں سے کام لیتا تھا چنانچہ فیروز شاہ جب لکھنوتی سے دہلی روانہ ہوا اور راستہ میں جنگلوں میں بھٹک گیا اور بڑی مشکلوں کے بعد صحیح راستہ پر آیا۔ تو اس وقت بادشاہ نے فوجیوں کے رشتہ داروں کی پریشانی دور کرنے کے لئے اپنے لشکر میں اعلان کیا کہ ہر شخص اپنی خیریت کی اطلاع اپنے رشتہ داروں کو دینے کے لئے دولت سرائے شاہی تک اپنے خطوط بھجوا دے چنانچہ فوجیوں نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ خطوط جمع ہو گئے تو ان کو ایک اونٹ پر لاد کر دہلی بھجوا دیا گیا جہاں سے فوجیوں کے رشتہ دار اپنے اپنے خطوط لے گئے۔ فیروز شاہ کے خبر رسانی کے وزیر اعظم خاں تھے۔

خاص خبروں اور خاص خطوط بھیجنے کے لئے بادشاہ اپنے خاص آدمیوں کو مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا جلال الدین رومی کے خط کے جواب کو لانے کے لئے بادشاہ نے اپنے معتمد امیر کو روانہ کیا۔ مولانا جلال الدین رومی شاہی دربار سے اپنے گھر پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کی خانقاہ میں ان کے خط کا جواب پہونچ گیا

شیر شاہ کو جب یہ علم ہوا کہ اعمال رشوت لے کر لوگوں کو زیادہ زمینیں دیتے ہیں تو حکم دیا کہ پرگنہ کے متعلق جو فرمان بھیجے جائیں وہ میرے پاس لائے جائیں، وہ خود ان فرامین کو ایک خریطہ میں بند کر کے مہر لگا کر کسی بڑے معتمد آدمی کے حوالے کر کے پرگنہ بھیج دیتا تھا۔

اسی طرح سلیم شاہ سوری نے جب کہ مرزا کامران کے لئے اپنے خیموں کے پاس ایک خیمہ لگوایا تھا تو اس نے ان کے حالات سے آگاہ ہونے کے لئے کیرک خواجہ سرائے اور غلام بھیجے تھے۔

برید کا عملہ صحیح خبر پہنچانے سے نہیں چوکتا تھا کسی کی رعایت نہیں کرتا تھا۔ خواہ افسر ہو یا عام آدمی ہو اس کے نزدیک سب برابر تھے جہات حکومت کے خلاف دیکھتے انجام سے بے خبر ہو کر اس کی اطلاع بادشاہ کو بھیج دیتے تھے۔

"چنانچہ فیروز شاہ کے دو ہوشیار و وفادار عامل مخبروں نے دربار میں آ کر بادشاہ سے کہا کہ ششگانی سکہ میں عمال نے دو حبہ نقرہ کم کر دیا ہے بادشاہ اس کی تحقیقات کروائیں، فیروز شاہ نے یہ معاملہ خان جہاں وزیر اعظم کے سپرد کیا۔ وزیر نے کہا کہ اس معاملہ کی پوشیدہ تحقیقات ہونی چاہیے اور مخبروں کو قید میں ڈال دینا چاہیے۔ چنانچہ وہ قید کر دیئے گئے دار الضرب (ٹکسال) کا انچارج کجر شاہ کو وزیر اعظم نے بلایا اس سے حقیقت پوچھی تو اس نے تحقیق کرنے کے بعد بتایا کہ ایک حبہ نقرہ کم ضرور ہے۔ وزیر اعظم نے مشورہ دیا کہ سکہ شاہی کی دھاک بٹھانے کے لئے زرگروں کو تیار کر کے کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے سکہ شاہی وزن میں پورا

اترے۔

گجرشاہ کو زرگروں نے کہا کہ انگیٹھی والوں کو کہو کہ وہ جب بادشاہ کے پاس انگیٹھی لے جائیں تو انگیٹھی کے درمیانی حصہ کو خالی کرکے چند نقرہ اس میں ڈال دیں اور انگیٹھی کے دہانے میں موم لگا دیں۔ گجرشاہ نے انگیٹھی والے کو بھی تیار کرلیا۔ بادشاہ کے سامنے زرگر اور انگیٹھی والے پیش ہوئے۔ زرگروں کو برہنہ کرکے لنگوٹ بندھوا دیا۔ وزیراعظم نے بادشاہ کو باتوں میں مصروف رکھا اس عرصہ میں زرگروں نے چند دانہ نقرہ کے بوتہ میں ڈال کے گلا کر وزن کیا تو وہ مقررہ وزن کے برابر نکلے۔ بادشاہ نے دونوں مخبروں کو جلا وطن کردیا مورخین لکھتے ہیں کہ چند ماہ بعد گجرشاہ کو اس الزام میں نہیں بلکہ اس پر دوسرا الزام لگا کر معزول کردیا تھا۔

سکندر لودھی کا محکمہ برید بھی بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ خبریں اس دانائی اور قابلیت سے حاصل کرتا تھا کہ کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ کس نے اس کی خبر بادشاہ کو پہنچائی۔ گھر گھر کے خاص خاص واقعات و حالات بادشاہ کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ بعض اوقات بادشاہ بھیس بدل کر محلوں اور بازاروں میں گشت لگاتا تھا اور رعایا اور اپنے امراء کے حالات معلوم کرتا تھا۔ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ کوئی جن بادشاہ کو سارا حال بتا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا گمان و اعتقاد یہ تھا کہ بادشاہ کے پاس ایک طلسمی چراغ ہے جس کو وہ روشن کرتا ہے اور جن حاضر ہو کر روئے زمین کے خاص و عام اور دوسرے ملکوں کے فرماں رواؤں کے پوشیدہ حالات بادشاہ کو بتا دیتا ہے۔ دور اور پرے کے خزانے اور دفینے بادشاہ کو لا کر دیتا ہے۔

سکندر لودھی قاضیوں پر بھی اپنے جاسوس و مخبر مقرر کرتا تھا۔ جو بادشاہ کو ان مقدمات کی ایک ایک لمحہ کی خبر دیتے تھے اس خدمت پر خاص جوان غلام مامور ہوتے تھے۔

اسی طرح جب لشکر کسی مہم پر پہنچتا تو ہر روز اس کو دو فرمان بھیجتا ایک صبح کے وقت جس میں یہ حکم ہوتا کہ لشکر سفر کرنے کے بعد کہاں قیام کرے اور دوسرا حکم ظہر کی نماز کے بعد بھیجتا کہ لشکر قیام کے بعد کیا کام کرے۔ سراؤں میں گھوڑوں کی ڈاک تیار رہتی تھی۔

شیرشاہ نے سڑکوں پر ستر سو سرائیں بنوائی تھیں۔ پہلے گاؤں سے ڈاک جاتی تھی لیکن ان سراؤں کے بننے کے بعد ڈاک سراؤں سے جانے لگی۔ ہر سرائے میں ڈاک کے گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ ڈاک کے کل گھوڑے تین ہزار چار سو تھے۔

بنگال کی خبریں تین روز میں رہتاس پہنچتی تھیں۔ بنگال سے رہتاس ایک ہزار پانچ سو کوس تھا۔ ہر سرائے میں گھوڑوں کے ساتھ ایک نقارہ رکھا رہتا تھا۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جب بادشاہ کے لئے دسترخوان بچھایا جائے تو نقارہ بجایا جائے اس نقارہ کی آواز سن کر سلسلہ وار سراؤں میں نقارے بج جاتے تھے۔ اس وقت سراؤں میں مسلمانوں کو پکا ہوا کھانا اور ہندوؤں کو آٹا گھی ملتا تھا اس ڈاک میں ہر روز بادشاہ کے پاس نیلاب، آگرہ اور بنگال کی سرحدوں کی خبریں آتی تھیں اس ڈاک میں ایک حسین طشت دار ایک دن میں تیس کوس گیا۔ واقعات مشتاقی میں لکھا ہے کہ یہی حسین طشت دار تین رات دن چل کر گور سے چتوڑ پہنچا۔ جب وہ سو جاتا تو چارپائی پر لیٹ جاتا اور گنوار اس کو کندھے پر اٹھا کر چلتے۔ جب آنکھ کھل جاتی تو پھر گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔

یہ قدرتی بات ہے کہ حکومت میں اچھے اور برے امراء و افسر و حاکم ہوتے ہیں جہاں چہ شیرشاہ کے زمانے میں ایسے مقربان اور امراء بھی تھے جو اپنی مصلحت سے بادشاہ کو ایسے حالات سے آگاہ نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے جو بدعنوانیاں عدالت وغیرہ میں ہوتی تھیں اس کو بادشاہ دور کرسکتا تھا! اس لئے شیرشاہ نے جو قانون نافذ کر رکھے تھے ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ لشکر اور امراء پر اپنے معتمد مخبر مقرر کرے اور ان کے پوشیدہ حالات معلوم کرکے بادشاہ کو باخبر رکھے تاکہ بادشاہ ان کی غلط کاریوں کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

ان مخبروں کی وجہ سے شیرشاہ کے پاس امراء کی شکایتیں بہ آسانی مل جاتی تھیں۔ مثلاً شیرشاہ نے مالوہ کی جاگیر شجاعت خان کو دی کہ وہ یہ جاگیر سپاہیوں میں تقسیم کردے۔ شجاعت نے اس جاگیر میں سے ایک حصہ خود لے لیا اور باقی سپاہیوں کو تقسیم کردیا تھا۔ سپاہیوں نے اپنا ایک وکیل اس ناانصافی سے آگاہ کرنے کے لئے بادشاہ کے پاس روانہ ہی کیا تھا کہ اس سے پہلے اس جھگڑے کا حال مخبروں نے بادشاہ کو لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے شجاعت خاں کو لکھا ایسی حرکت نہ کرے سپاہیوں میں جاگیر کا بقایا حصہ بھی تقسیم کردے ورنہ تجھ کو سزا دینی پڑے گی۔

ڈاک چوکی کا اس زمانہ میں اتنا زور تھا کہ راجہ بھی اس طریقہ کو رائج کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ مرزا کامران سلیم شاہ کے مخبروں کی نگرانی میں کسی زمیندار کی معرفت کسی راجہ سے سازش کرکے ڈاک چوکی میں بر قعہ اوڑھ کر فرار ہو گیا تھا۔

مغلیہ دور میں نیوز ایجنسی کا انچارج ایک وزیر بریدالممالک ہوتا تھا جو تمام صوبوں کی خبریں حاصل کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ہر صوبہ کا برید خطوط کے ذریعہ مرکز میں خبریں روانہ کرتا تھا۔

اس عہدہ پر قصدر، تجربہ کار اور قابل اعتماد لوگ لگائے جاتے تھے بعض اوقات معزز، متقی، دیانتدار اور غیر جانب دار لوگ اعزازی طور پر برید کے فرائض انجام دینے کے لئے بھیجے جاتے تھے ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ باوجود باغی اور رذمہ دار افسران کے منع کرنے اور اثر ڈالنے پر بھی برید نے مرکز کو اطلاع دی۔ برید کے اختیارات بہت وسیع ہوتے تھے۔ ہر ملک کے چھوٹے بڑے مسئلے اور چھوٹے بڑے انسران کی حرکات و سکنات کی وہ رپورٹ کرتا تھا۔ سرکاری افسروں کی حرکتوں، تجارت، زراعت، سکہ وغیرہ کی تحقیقات کر کے دیانت دارانہ رائے لکھ کر بھیج دیتا تھا۔ فوجی معائنوں کے وقت اس کا جانا ضروری تھا تاکہ بادشاہ فوجی حالات سے پوری طرح آگاہ ہو جائے برید کو جو اطلاع پہنچتی وہ عنوانات کے ماتحت جمع کر کے سلسلہ وار مرکز میں براہ راست بادشاہ کو روانہ کر دیتا تھا۔ سلطنت میں جو غیر ملکی لوگ آتے تھے اس کے بارے میں اور بازاروں میں جو غپ شپ ہوتی عوام کے خیالات و جذبات پائے جاتے وہ بھی روانہ کرتا تھا امراء اور بادشاہوں کی موت کی خبریں بھی ڈاک سے جاتی تھیں چنانچہ شاہجہاں اور عالمگیر کو ان کے والد کے انتقال کی خبر ڈاک سے ملی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں واقعہ اور خبر رسانی کی شکل یہ تھی:۔

"تجربہ کار جہاندیدہ اور با اثر لوگ اخبار نویسی کے لئے مقرر کئے جاتے تھے جن کی تعداد ہر بڑے مقام پر موجود تھی جن کو تبنگی کہا جاتا تھا ان میں سے روزانہ سلسلہ بتنگی اپنا کام انجام دیتے تھے۔ چودہ دن کے بعد نوبت (پوری اطلاعات) بادشاہ کو روانہ کی جاتی تھیں۔

بادشاہ نے بھی واقعہ نویسی کے لئے دارالحکومت میں لوگوں کو مقرر کر رکھا تھا۔ دارالحکومت میں ایک دن تبنگی کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ ان چودہ تبنگیوں میں سے اگر کوئی کسی ضروری کام کی وجہ سے نہیں آسکتا تھا تو ان میں سے ایک کی ڈیوٹی لگا دی جاتی تھی جس کو کوتل کہتے تھے۔

جب اس روزنامچہ کی تصحیح ہو جاتی تھی تو بادشاہ کے پاس روانہ کئے جاتے تھے اگر وہ اس کو پسند کرتا تو راحد ھانی کا تبنگی ہر واقعہ اور ہر سانحہ کی خبر کی نقل کر کے اس پر اپنی مہر لگا دیتا تھا اس کے بعد اس پر مہر عرض اور پرواچی کی مہر لگتی تھی جس نے بادشاہ کو رپورٹ سنائی تھی۔ اس کی بھی مہر ثبت کی جاتی تھی، اس رپورٹ کو تعلیقہ کہتے تھے اور لکھنے والے کو تعلیقہ نویس کہتے تھے۔

ان واقعہ نویسوں کو کیسی کیسی خبروں سے اپنی رپورٹ مرتب کرنی پڑتی تھی وہ حسب ذیل ہیں۔

"بادشاہ اور امراء کیا حکام، ان کی حرکات خورد نوش، بیداری، خواب نشست وشبستان اقبال میں جانا۔ بارگاہ خاص میں خرامش کا ذکر شکار کی تمام حالت جانوروں کا ذبح ہونا کوچ و مقام، رہنموئی، نذر دلآویز تحنی، دانش کی باتوں کا سننا خیرات، روزینہ، ماہوار تنخواہوں کا منصب، دشمنوں کے حال، معافی زمین، خراج کا گھٹنا بڑھنا، اجارہ بیع، تحویل پیش کش، ارسال، لفافہ فرمان، عرائض کا آنا، جواب کا دیا جانا، ملازمت رخصت، تعین کی مدت، چوکی میں نہ آنا، جنگ و فتح، صلح، روشناس جس کو بادشاہ پہچانتا ہو یعنی بڑے آدمی کا مرنا، جانوروں کی شرطوں کی ہار جیت گھوڑوں کا مرنا، بادشاہ کے مجرموں کا معاف کرنا، دربار عام کی سرگزشت کتخدائی، ولادت، چوگان بازی، چوسر، شطرنج، گنجفہ، اس کے علاوہ حوادث آسمانی، اور زمینی، سال کی فصلیں۔

ڈاک اکبر کے عہد میں اس طرح بھیجی جاتی تھی۔

ہر گاؤں میں پانچ میل کے فاصلے پر گھوڑے اور چند ہرکارے مقرر کئے جاتے تھے جہاں یہ لوگ رہتے تھے اس کو ڈاک چوکی کہتے تھے، سرحد کی امراء کی ضروری عرضداشت اور فرمان اسی چوکی سے چلتے تھے سوار شدہ ہرکارہ اس کو دوسری چوکی پر پہنچا دیتا تھا۔ چنانچہ شب و روز کی راہ طے کر کے یہ ہرکارے آگرہ سے احمد آباد ڈاک پانچ روز میں پہنچا دیتے تھے۔ اور جن کو بادشاہ خبریں پہنچانے کے لئے متعین کرتا تھا وہ جلدی خبریں پہنچا دیتا تھا۔ چار ہزار ہرکارے اس کام پر مامور رہتے تھے جو گھوڑے پر سوار ہو کر ڈاک پہنچاتے تھے اور جو ہرکارے پیدل ڈاک لے جاتے تھے وہ سات سو میل دس روز میں طے کرتے تھے۔

۹۹۱ھ میں بادشاہ نے راجہ جے مل کو جو بہار تھا اس کو گھوڑے کی ڈاک میں بھیجا تھا جس کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا تھا اسی طرح اکبر بھی ایک دفعہ از راہ شوق دو روز میں گھوڑے کی ڈاک پر دو سو میل کی مسافت طے کر کے اجمیر سے آگرہ گیا تھا۔

دوسرے صوبوں میں کتنی تعداد میں واقعہ نویس تھے اس کا اندازہ دارالسلطنت کے واقعہ نویسوں سے لگا لیجئے۔ اس کی حالت یہ ہے

ڈاک چوکی میں دو تین ہزار آدمی ہر روز روزنامچہ لکھ کر بھیجتے تھے۔ عدالت خانہ کچہری اور چبوترہ میں یہاں تک کہ گلی کوچوں اور بازاروں میں جاسوس مقرر تھے جو افواہیں عوام میں سنتے وہ تحریر میں لاتے، اکبر کے واقعہ نویسوں میں انعام اللہ ابن شہباز خاں نے تمام عمر واقعہ نویسی میں گزاری۔

جب کہ اتنی بڑی تعداد میں ظلم وستم اور بدعنوانیوں کو مٹانے والے مخبر، جاسوس اور بریدہوں اس عظیم الشان منظم حکومت میں بڑے بڑے ذمہ دار حاکموں سے حسب ذیل انسانیت سوز اور شرمناک افعال سرزد ہو جاتے تھے۔

ا۔ مرزا جانی بیگ ارغوان جو اکبر کے دور میں منصب سہ ہزاری اور جہانگیر کے دور میں منصب ہفت ہزاری حاصل کئے ہوئے تھے اور اکبر و جہاں گیر کے زمانہ میں سندھ اور ملتان کا صوبیدار تھا ان کی حرکات خبیثہ یہ تھیں:

" وہ شراب ہی نہیں پیتے تھے بلکہ ہر روز ایک باکرہ عورت سے مباشرت فرماتے تھے، تمام مقامات سے ان کے لئے باکرہ عورتیں جمع کی جاتی تھیں، ٹھٹے میں کوئی رنڈی ایسی نہ تھی جس سے ان کا تعلق نہ ہو"

۲۔ اسماعیل خاں برادر خورد خاں جہاں مالوہ اور کالپی کے جاگیردار اور پہلے منصب سہ ہزاری و پانصدی اور ۴۲ھ میں منصب پنج ہزاری یافتہ تھے

بارہ سو عورتیں ان کے پاس تھیں جب وہ دربار میں جاتے تو ان عورتوں کے ازار بندوں کو قفل لگا جاتے تھے، آخر ان عورتوں نے عاجز آکر اُن کو زہر دے کر مار ڈالا"

تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحات ان کے اعمالِ بد کی سزا کے تذکرہ سے خالی ہیں۔

جہاں گیر کے دور میں طامس رو اور ہاکنس سفیر برطانوی درباری واقعہ نویسوں کا تعجب خیز الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں۔ بہت سے واقعہ نویس ہوتے ہیں جو سب باتیں لکھتے ہیں یہاں تک کہ عورتوں کے ساتھ جو باتیں ہوتیں، وہ بھی لکھتے تھے جب بادشاہ کا انتقال ہو جاتا تو ان خبروں سے بادشاہ کی تاریخیں مرتب کی جاتی ہیں۔

واقعہ نویس اگر غلط مات لکھتا تھا تو اس کو سخت سزا دی جاتی تھی۔

چنانچہ جب دربار جہاں گیری میں ایرانی سفیر آیا تو بادشاہ نے اس کو شراب کا جام دیا۔ غلط فہمی کی وجہ سے درباری واقعہ نویسوں نے جام شراب دینا ایلچی سے منسوب کر کے لکھ دیا۔ بادشاہ نے جب روزنامچہ دیکھا تو غصہ سے بے آپے ہو گیا۔ اس نے کسی پر جرمانہ کیا کسی کو کوڑے لگوائے بعض کو لات گھونسے مارنے کا حکم دیا جس میں مجروح بھی ہوئے اور ایک آدھ مر بھی گیا۔

جہاں گیر نے خبر پہنچانے کا ہندوستان میں یہ نیا طریقہ ایجاد کیا تھا۔

جہاں گیر نے جب یہ سنا کہ خلفائے عباسی بغدادی کبوتر وں کو نامہ بری سکھاتے تھے تو بادشاہ نے کبوتر بازوں کو حکم دیا کہ ان کبوتروں کو یہ کام سکھائیں ان کبوتر بازوں نے جوڑے ایسے آموختہ کئے کہ مانڈو سے وہ پرواز کرتے تو ایک پہر میں بارش کی صورت میں دو پہر میں برہان پور میں پہنچ جاتے تھے بعض کبوتر چار گھڑی میں پہنچتے تھے۔

عالمگیر نے ڈاک و خبر رسانی کا محکمہ باقاعدہ اور مکمل بنا رکھا تھا۔

کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جس میں سوانح نگار جگہ جگہ مقرر نہ ہوں وہ جزئیات و کلیات صوبیداروں اور حکام کو پہنچاتے تھے، کوئی صوبیدار شہزادہ یا امیر کسی شخص کو اس کے جرم یا قہر و عتاب کی وجہ سے قتل نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہ ہی حاکموں، صوبیداروں کی عرائض اور واقعہ نگاروں کی رپورٹوں سے اس کی حقیقت معلوم کر کے شریعت کے مطابق سزا دیتا تھا۔ خاص طور پر اپنے لڑکوں کے اعمال و حرکت اور چال ڈھال سے باخبر رہتا تھا۔ آٹھوں پہر خفیہ نویس اور جاسوس ان کے پیچھے لگائے رکھتا تھا جب ان کو فوج کے ساتھ روانہ کرتا تھا تو ان کے ساتھ اتالیق مقرر کرتا تھا (تاریخ ہندوستان، ہشتم ص ۴۷۸)

بنگال، دکن، سورت، جونپور، ملتان، مراد آباد، گلشن آباد، جنیر، لاہور، دارالسلطنت وغیرہ میں واقعہ نویس مقرر تھے مآثر عالمگیری کے مؤلف نے اپنی تاریخ میں ان کا تذکرہ کیا ہے البتہ ان کے نام نہیں لکھے ہیں جن کے نام لکھے ہیں وہ یہ ہیں۔ (۱) عبدالرحمٰن (دکن) (۲) خدمت گزار خاں (۳) عنایت اللہ خان (۴) فضل الٰہی بن مرشد قلی خاں (۵) سعادت خان (۶) محمد ساقی مستعد خاں (۷) محمد محسن

واقعہ نگاروں کے تین محکمہ تھے۔ واقعہ نگار، خفیہ نویس (معتمد خفیہ) اور جاسوس۔

شاہزادوں کو خبریں مہیا کرنے کے لئے بادشاہ نے واقعہ نویس مقرر کر رکھے تھے ڈاک چوکی کے مشہور داروغہ محمد شریف برادر ابوالفتح، قابل خاں اور فاضل خاں تھے۔

واقعہ نویس کی غلطی پر عالمگیر جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا دیتا تھا۔ عبدالرحمٰن واقعہ نویس نے جو رقم بہادر خاں مرزبان سے وصول کی تھی اس کا صحیح اندراج نہیں کیا تھا اس غلطی پر اس کو برطرف کر دیا۔

مغلیہ دور کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان کے زیادہ مؤلف واقعہ نویس ہیں اور جو بھی تاریخ لکھی گئی ہے وہ واقعہ نویسوں کے بغیر مدد کے نہیں لکھی گئی ہے۔

تزک جہانگیری میں جہانگیر لکھتا ہے (۱) میں نے کتاب خانے کے متصدیوں کو حکم دیا کہ دوازدہ احوال کی ایک جلد مرتب کراؤ اور متعدد نسخے خاص لوگوں اور تمام شہروں میں بھجوانے ہیں تاکہ ارباب دولت اس سے اپنا دستور العمل بنائیں۔ ایک واقعہ نویس مرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی نے جہانگیر نامہ قلمبند کر کے مجھ کو پیش کیا جس کو میں نے اپنے بیٹے شاہجہاں کو دے دیا۔

(۲) مآثر عالمگیری کا مصنف محمد ساقی مستعد خاں عالمگیر کا واقعہ نگار تھا جو بعد میں عالمگیر کے زمانہ میں انشا نظارت پر مامور ہو گیا تھا اور بادشاہ نے ان کے صاحبزادہ کو ان کی جگہ وقائع نگاری پر لگا دیا تھا۔

شیواجی کی حکومت میں بھی واقعہ نویس تھے جو رپورٹوں کا ذخیرہ رکھتے تھے یہ سلطنت کے فرمان و احکام اور سلطنت کے حالات مرتب کرتے تھے اور انتظام خبرداری اور جاسوسی بھی کرتے تھے شیواجی کو ہر ایک محکمہ اور ہر قلعہ اور ہر حلقہ کی خبریں پہنچائی جاتی تھیں۔ دشمن کے لشکر، راستوں، دروں کی اطلاع، خبر، جاسوس اور مخبر پہنچاتے تھے۔

مغلیہ بادشاہوں کے آخری دور میں بھی خبر رسانی اور ڈاک کا طریقہ باقاعدہ تھا۔ چنانچہ سراج الدولہ کے بارے میں ڈاکٹر سرن اپنی تصنیف مغل پالیسی میں تحریر کرتے ہیں۔

• وقائع نویس بخشی کے ماتحت ہوتے تھے اس صوبہ میں صوبیدار سے لے کر معمولی اہلکار تک کے اعمال کی رپورٹ درج ہوتی تھی جو براہ راست بادشاہ کے حضور میں پیش کی جاتی تھی خفیہ اطلاع کا وقائع نویسی سے علیحدہ شعبہ ہوتا تھا۔ یہ کام سوانح نویس، خفیہ نویس یا پرچہ نویس انجام دیتے تھے وہ ملک کے چھوٹے چھوٹے ہوئے حالات بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دیتے تھے۔ اس محکمہ کی اہمیت اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ صوبیدار اور دیوان بھی اس سے

ھلن گا ہندستانی مسلمان ہمر

کانپتے تھے۔ حیدر علی نے بھی ہر محلے میں خفیہ نویس مقرر کر رکھے تھے جو تمام حالات سے اس کو باخبر رکھتے تھے۔

خبریں اور ڈاک پہنچانے کا طریقہ مملکت نظام میں ڈاک کے جدید نظام سے قبل تک جاری تھا۔ ڈاک کے مقررہ اوقات کے علاوہ بھی ضروری احکام و خبریں اسپیشل طور پر روانہ کی جاتی تھیں جو بہت جلد پہنچتی تھیں اس کو "کھونگرو" "ٹپہ" کہتے تھے۔ اس کی فیس چار آنہ کوس کے حساب سے لی جاتی تھی۔

ڈاک پہنچانے کے جو منارے پرانی حکومتوں نے بنائے تھے اس کی یادگار اب بھی دہلی میں موجود ہے۔ پرانے قلعہ کے مشرقی دروازے کے سامنے دکھائی دیتا ہے جو خاص محل اور عظیم گنج کے بیچ میں ہے بلکہ عظیم گنج کی سرائے سے بہت پاس شمال کی طرف کوئی دو سو قدم پر کوس منارے کے چار حصے ہیں نیچے کا حصہ ہشت پہل ہے جس کا دور ۲۹ فٹ ہے جو ۱۶ مربع اور دو فٹ اونچے پختہ چبوترے پر پتھر اور چونے کا بنا ہوا ہے۔ بیٹھک کا ہشت پہل حصہ ۸ فٹ اونچا ہے کل بلندی اندازاً ۲۴ فٹ ہوگی۔ اوپر کا سرا گول ممٹی پر ختم ہوا ہے اس طرح کے مینارے کوس کوس بھر کے فاصلے پر تھے۔

قلعہ کا آخری اخبار نویس مامراج تھا جو بہادر شاہ کے زمانے میں اخبار نویسی کی خدمت انجام دیتا تھا اور اہم خبریں سانڈنی سوار لے جاتے تھے۔

انگریزوں نے ہندستان آنے کے بعد ابتدا میں خبریں پہنچانے کے لئے مغلیہ طریقے پر عمل کیا جوں جوں قدم جمتے گئے تبدیلیاں ہوتی گئیں ۱۸۴۷ء میں گھوڑوں اور پیدلوں کی جگہ بگھی سے ڈاک بھیجی شروع ہوئی اس کا ٹھیکیدار ملی دھر سوداگر تھا جس نے بگھیاں بنوائیں اور ان سے ڈاک بھجوانی شروع کر دی۔

جہاں جہاں ریلیں بنیں وہاں ریل سے ڈاک جانے لگی، موجودہ دور میں ہر جگہ خبریں حاصل کرنے کے لئے ایک سا انتظام ہے ہر ملک اور ہر بڑے مقام میں خبریں حاصل کرنے کے لئے رپورٹر ہوتے ہیں جو مختلف نیوز ایجنسیوں کو خبریں فراہم کرتے ہیں، وہ ایجنسیاں عام طور سے وائرلیس، ریڈیو ٹیلیفون تار برقی، ہوائی جہازوں اور ریلوں سے خبریں حاصل کر کے اپنی مشینوں کے ذریعہ بڑے بڑے اخباروں میں پہنچاتی ہیں۔ خبریں سننے اور پڑھنے کا ذریعہ زیادہ تر اخبار ہیں یا ریڈیو ہے۔

حکومتوں کی خبریں حاصل کرنے کا وہی پرانا طریقہ ہے۔ جیسے پولیس، خفیہ پولیس حکومت کے لئے متعلقہ خبریں فراہم کر کے حکام کو پہنچاتی ہیں۔

غدر سے قبل کے اخبارات کی فہرست

سنہ	اخبار کا نام	اڈیٹر کا نام	مقام	زبان	شکل اشاعت
1724	انڈین گزٹ	سرکاری	کلکتہ	انگریزی	ہفتہ وار
1781	بنگال گزٹ	جیمس آگسٹس ہکی	"	"	"
1818	اڈگ درشن	ڈاکٹر کیری	"	بنگالی	ماہانہ
1818	سماچار درپن	ڈاکٹر مارشمن	"	"	ہفتہ وار
1821	سمباد کمودی	راجہ رام موہن رائے	"	"	"
1821	بمبئی سماچار	فردون جی مرزبان	بمبئی	گجراتی	"
1822	جام جہاں نما	منشی سدا سکھ	کلکتہ	اردو فارسی	"
1822	مرآۃ الاخبار	راجہ رام موہن رائے	"	فارسی	"
1823	شمس الاخبار	منشی رام ٹھاکر	"	اردو فارسی	"
1826	اودنت مارتنڈ	پنڈت جگل کشور	"	ہندی	"
1831	آئینہ سکندر		"	فارسی	"
1833	ماہ عالم افروز	مولوی تاج الدین	"	"	"
1834	لدھیانہ اخبار	مشنری	لدھیانہ	"	"
1835	سلطان الاخبار	سید رجب علی لکھنوی	کلکتہ	"	"
1836	دہلی اردو اخبار	مولانا محمد باقر	دہلی	اردو	"
1836	زبدۃ الاخبار	احمد علی	آگرہ	فارسی	"
1837	سید الاخبار	مولوی سید محمد	دہلی	اردو	"
1837	خیر خواہ ہند	پادری جعفر	مرزا پور	اردو	ماہانہ
1841	سراج الاخبار	سید لال علی	دہلی	فارسی	ہفتہ وار
1844	احسن الاخبار		بمبئی	"	"
1845	گل رعنا کریم الاخبار	مولوی کریم الدین	"	اردو	ماہانہ و ہفتہ وار
1845	قران السعدین	دھرم نرائن	دہلی	"	ہفتہ وار
1845	عمدۃ الاخبار		مدراس	"	مہینہ میں ۳ بار
1846	فوائد الناظرین	ماسٹر رام چندر	دہلی	"	ماہانہ و پندرہ روزہ
1847	محب ہند	ماسٹر رام چندر	"	"	ماہانہ

سنہ	اخبار کا نام	اڈیٹر کا نام	مقام	زبان	شکل اشاعت
1846	مارتنڈ اخبار	مولوی نصیر الدین	کلکتہ	اردو فارسی	ہفتہ وار
1846	شملہ اخبار	شیخ عبداللہ	شملہ	دیوناگری	"
1846	صادق الاخبار	جمال الدین	دہلی	اردو	"
1840	فوائد الشائقین	بیرکھو دیال	"	"	"
1847	اسعد الاخبار	قمر الدین	آگرہ	"	"
1848	سدھاکر اخبار	تارا موہن متر	بنارس	اردو ہندی	"
1848	گوالیار اخبار	لکشمی پرشاد	گوالیار	" "	"
1848	بنارس اخبار	گوبند رگھوناتھ تھتے	بنارس	"	"
1848	عمدۃ الاخبار	لچھمن پرشاد	بریلی	اردو	"
1849	مالوہ اخبار	دھرم نرائن	اندور	اردو ہندی	"
1849	المحقائق	موتی لال	آگرہ	اردو	ہفتہ میں ۲ بار
1850	کوہ نور	منشی ہرسکھ رائے	لاہور	اردو	ہفتہ وار
1850	خورشید عالم	منشی دیوان چند	سیالکوٹ	اردو	"
1851	نور علی نور	مولانا محمد حسن	لدھیانہ	"	"
1851	جام جہاں نما		میرٹھ	"	"
1851	باغ و بہار	مہاراجہ بنارس	بنارس	"	"
1852	مفتاح الاخبار	مولوی محبوب علی	میرٹھ	"	"
1851	قطب الاخبار		آگرہ	"	"
1852	زائرین ہند		بنارس	"	پندرہ روزہ
1852	معیار الشعراء		آگرہ	"	ماہانہ
1852	جامع الاخبار	سید رحمت علی	مدراس	"	مہینہ میں ۳ بار
1853	نور الابصار بدھی پرکاش	منشی سدا سکھ	آگرہ	اردو ہندی	ہفتہ وار
1853	آفتاب ہند	بابو گوبند رگھوناتھ	بنارس	اردو	"
1853	فتح الاخبار		علی گڑھ	"	"
1853	صادق الاخبار	مصطفیٰ خاں	دہلی	"	"

185[illegible]	نورمشرقی نورسحری		دہلی	اردو	ہفتہ دار
1853	وکٹوریہ پیپر	دیوان چند	سیالکوٹ	"	"
1853	[illegible]	منشی دیوان چند	لاہور	"	پندرہ روزہ
1853	کشف الاخبار	منشی امان علی	بمبئی	"	ہفتہ دار
185[illegible]	صادق الاخبار	سید محمد صادق	دہلی	"	"
1856	مفرح القلوب	محمد شفیع	کراچی	فارسی	"
1856	مظہر الاخبار	محمد خواجہ بادشاہ	مدراس	اردو	مہینہ میں ۳ بار
1856	سحر سامری	منشی گھرنرائن عیاش	لکھنؤ	اردو	ہفتہ دار
1856	طلسم لکھنؤ		"	"	"
1856	مفید خلائق	شیونرائن	آگرہ	"	"
1857	خلاصۃ الاخبار	متھراداس	دہلی	"	"
1857	اخبار سند حسین		کراچی	"	"
1857	طلسم حیرت		مدراس	"	مہینہ میں ۳ بار

آج کے ہندوستان میں اُردو داں

اترپردیش	78,91,714
بہار	41,49,245
مہاراشٹر	27,25,737
آندھرا پردیش	25,53,753
میسور	20,34,982
مغربی بنگال	8,32,847
مدھیہ پردیش	7,40,185
تامل ناڈو	6,15,503
گجرات	5,94,670
راجستھان	509,673
اڑیسہ	2,12,891
ہریانہ	205,909
دہلی	1,53,251
میزان	2,33,23,518

اردو کے سب سے زیادہ آباد اضلاع

پورنیا (بہار)	9,66,610
مرادآباد (اترپردیش)	6,55,268
حیدرآباد (آندھرا پردیش)	5,33,939
دربھنگا (بہار)	5,12,290
سہارنپور (اترپردیش)	4,51,119
میرٹھ (")	450,712
بمبئی (مہاراشٹر)	40,,616
بجنور (اترپردیش)	3,88,515
مظفرپور (بہار)	3,75,083
بستی (اترپردیش)	3,50,135
بریلی (")	328,231
موتی ہاری (بہار)	3,09,874
رام پور (اترپردیش)	3,04,112

دُنیا کے مسلم ممالک

رقبہ ـــــ آبادی ـــــ زبان

اَل جزائر

رقبہ : 23,81,743 مربع کلومیٹر

آبادی : 1 کروڑ 95 ہزار

تعداد مسلم : 90 لاکھ 50 ہزار

دیگر : 10 لاکھ 50 ہزار

پایہ تخت : اَل جیریس

زبانیں : فرانسیسی، عربی

افغانستان

محل وقوع : وسطی ایشیا

رقبہ : 6 لاکھ 50 ہزار مربع کلومیٹر

آبادی : 1 کروڑ 9 لاکھ 94 ہزار

پایہ تخت : کابل

آبادی کابل : 2 لاکھ 63 ہزار

مسلم : 99 فی صدی

زبانیں : پشتو، فارسی اور مقامی بولیاں

برآمدات : قراقلی کھالیں، خشک میوہ، بادام، تازہ پھل، اون، کپاس، قالین، غالیچے وغیرہ

معدنیات : کوئلا، لوہا، سونا، چاندی، تانبا، مینگنیز، نکل، گندھک جست، گریفائٹ، اسبسطس، ابرق، چشم سفید، تیل، رنگین پتھر

ترکی

محل وقوع : یورپ، سرکاری زبان، ترکی

رقبہ : 2 لاکھ 96 ہزار 503 مربع میل

آبادی : 2 کروڑ 90 لاکھ 59 ہزار

مسلم : 99 فی صدی

پایہ تخت : اَن قرہ (انگورہ)

مراکش

محل وقوع : افریقہ

رقبہ : 10 ہزار 50 مربع کلومیٹر

آبادی : 1 کروڑ 16 لاکھ 28 ہزار 232

مسلم : 98 فی صدی

سرکاری زبان : عربی (اور فرانسیسی بھی بولی جاتی ہے)

صومالیہ

محل وقوع : افریقہ

رقبہ : 2 لاکھ 70 ہزار کلومیٹر

آبادی : 45 لاکھ

مسلم : سو فی صدی

پایہ تخت : مقدیشو

سرکاری زبان : صومالی (عربی، اطالوی اور انگریزی بھی بولی جاتی ہے)

سوڈان

محل وقوع : افریقہ

رقبہ : 25 لاکھ 8 سو مربع کلومیٹر

آبادی : 13 لاکھ
مسلم : 82 فی صدی
پایۂ تخت : خرطوم
سرکاری زبان : عربی و انگریزی

ماریطانیہ

محل وقوع : شمالی مغربی افریقہ
رقبہ : 4 لاکھ 19 ہزار مربع میل
آبادی : 7 لاکھ 25 ہزار
مسلم : سو فیصدی
پایۂ تخت : نوکشوط
زبان : عربی و فرانسیسی

نائیجر

محل وقوع : افریقہ
رقبہ : 12 لاکھ 67 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی : 31 لاکھ 27 ہزار 565
مسلم : 85 فی صدی
پایۂ تخت : نیامی

اُردن

محل وقوع : مشرق وسطا (جزیرہ نمائے عرب)
رقبہ : 96 ہزار 610 مربع کلومیٹر
آبادی : 18 لاکھ 60 ہزار 693
مسلم : 91 فی صدی
پایۂ تخت : عمان
سرکاری زبان : عربی

سینیگال

محل وقوع : افریقہ
رقبہ : 2 لاکھ 14 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی : 32 لاکھ 50 ہزار
مسلم : 95 فی صدی
پایۂ تخت : ڈکار

سرکاری زبان : فرانسیسی (عربی اور دوسری علاقائی زبانیں بھی رائج ہیں)

ایران

محل وقوع : مغربی ایشیا
رقبہ : 6 لاکھ 28 ہزار مربع کلومیٹر
آبادی : 520 لاکھ 67 ہزار 800
مسلم : 98 فی صدی
پایۂ تخت : تہران
زبان : ایرانی (فارسی)

لیبیا

محل وقوع : افریقہ
رقبہ : 6 لاکھ 85 ہزار مربع میل
آبادی : 12 لاکھ 50 ہزار
مسلم : تقریباً سو فی صدی
پایۂ تخت : بیضہ
سرکاری زبان : عربی

لبنان

محل وقوع : مشرق وسطا
رقبہ : 10 ہزار 400 مربع کلومیٹر
آبادی : 17 لاکھ 50 ہزار
مسلم : 57 فی صدی
پایۂ تخت : بیروت
زبان : عربی، انگریزی اور فرانسیسی

سعودی عرب

محل وقوع : جزیرہ نمائے عرب (ایشیا کا مغربی سرا)
رقبہ : 10 لاکھ مربع میل
آبادی : 1 کروڑ 10 لاکھ
مسلم : سو فی صدی
پایۂ تخت : ریاض
سرکاری زبان : عربی

یمن

محل وقوع : جزیرہ نما عرب
رقبہ : 75 ہزار مربع میل
آبادی : 50 لاکھ
مسلم : 99 فی صدی
پایۂ تخت : صنا
زبان : عربی

کیمرون

محل وقوع : افریقہ
رقبہ : 4 لاکھ 75 ہزار 394 مربع
آبادی : 45 لاکھ 12 ہزار 181
مسلم : 55 فی صدی
پایۂ تخت : دوالا
زبان : بانتو سواحلی عربی اور فرانسیسی

کویت

محل وقوع : مغربی ایشیا
رقبہ : 15 ہزار مربع کلومیٹر (5 7 ہزار مربع کلومیٹر غیر جانبدار)
آبادی : 5 لاکھ
مسلم : 99 فی صدی
پایۂ تخت : کویت
سرکاری زبان : عربی

مصر

محل وقوع : مشرق وسطیٰ
رقبہ : 10 لاکھ مربع کلومیٹر
آبادی : 3 کروڑ
مسلم : 91 فی صدی
پایۂ تخت : قاہرہ
سرکاری زبان : عربی

انڈونیشیا

محل وقوع : ملیشیا سے نیوگنی تک جنوب مشرقی ایشیا اور آسٹریلیا کے درمیان
رقبہ : 9 لاکھ 4 ہزار 345 مربع کلومیٹر
آبادی : 9 کروڑ 70 لاکھ 85 ہزار
مسلم : 85 فی صدی
ہندو : 6 فی صدی
عیسائی و دیگر : 11 فی صدی
پایۂ تخت : جکارتہ

پاکستان

محل وقوع : ایشیا
رقبہ : 2 لاکھ 10 ہزار 403 مربع میل
آبادی : 6 کروڑ 50 لاکھ
مسلم : 68 فی صدی
پایۂ تخت : اسلام آباد
سرکاری زبان : اردو اور انگریزی

بنگلا دیش

محل وقوع : ایشیا
رقبہ : 55 ہزار 126 مربع میل
آبادی : 7 کروڑ 50 لاکھ
مسلم : 6 کروڑ 50 لاکھ
ہندو، بدھ اور عیسائی : 1 کروڑ
پایۂ تخت : ڈھاکا
سرکاری زبان : بنگلا اور انگریزی

○ مسلم آبادی کے لحاظ سے دنیا میں پہلا بڑا ملک انڈونیشیا، دوسرا بنگلا دیش اور تیسرا ہندوستان ہے۔

○ ○ ○

"میں نہ ایتھنز کا رہنے والا ہوں اور نہ یونانی۔ میں تو دنیا کا شہری ہوں" سقراط

اردو کے آٹھ سو برس

آریائی رشتے سے سنسکرت اور قدیم فارسی (ژند) ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔ ہندو سماج جب چار ذاتوں میں تقسیم ہوگیا تو براہمنوں نے اپنی زبان سنسکرت کی پاکیزگی کو محفوظ رکھنے کے لئے شودروں سے سنسکرت میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا بل کہ اپنی زبان کے تقدس کو اتنا بڑھایا کہ سنسکرت کو دیو بانی یعنی زبان الاہی قرار دیا اور اس زبان کا اتنی بلند آواز سے بولنا یا پڑھنا کہ شودر کے کان تک پہنچے پاپ سمجھا گیا۔ چناں چہ براہمنوں نے شودروں اور عام لوگوں سے جس زبان میں بات چیت شروع کی اسے پراکرت کہا گیا۔ جس طرح سنسکرت آراستہ پیراستہ، مصفّا، مقدس شے یا مہذب لوگوں کو کہتے ہیں اسی طرح پراکرت طبیعت سے خارج کی ہوئی چیز کو یا غیر مہذب انسان کو کہتے ہیں۔ چوں کہ پراکرت میں بے شمار الفاظ سنسکرت کے موجود ہیں اور تقریبن گرامر بھی وہی ہے اس لئے پراکرت کو سنسکرت ہی کی بیٹی سمجھا گیا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ہندستان کے ہر علاقے کی اپنی ایک بولی تھی اور جو وہاں کے لوگوں کی بول چال کی ضرورت کو پورا کرتی تھی سنسکرت لکھنے پڑھنے اور خواص کی زبان تھی۔ پراکرت عام زبان تھی اور ہر علاقے کی زبان اپنے علاقے کے تعلق سے بھاشا کہلاتی تھی۔ متھرا کے علاقے کی برج بھاشا کو "آب حیات" والے مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کی ماں کہا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اردو اس ہندی بھاشا کی بیٹی ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی گئی ہے یعنی اردو کو مغربی ہندی کی ایک شاخ بھی کہہ سکتے ہیں مگر آج کی جو اعلا ہندی ہے وہ اردو ہی سے پیدا ہوئی ہے وہ اس طرح کہ جب اردو سے فارسی و عربی الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت الفاظ رکھ دیئے جاتے ہیں تو وہ شدھ ہندی بن جاتی ہے اور اسی ہندی میں نثر کی اعلا اور معیاری کتابیں تصنیف کی جاتی ہیں۔ اپنے ماخذ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اردو ہندی ایک ہی زبان ہیں بس دونوں کی پرورش مختلف طریقے سے ہوئی ہے۔ اردو کو پالنے پوسنے والے چوں کہ مسلمان رہے ہیں اس لئے اپنی مذہبی و تہذیبی قدروں کی بنا پر وہ اردو میں فارسی و عربی الفاظ، ترکیبیں، تلمیحیں اور استعارے شامل کرنے پر مجبور رہے اور انھوں نے اردو کو اس حد تک فارسی و عربی آمیز بنا دیا کہ وہ غیر ملکی زبان معلوم ہونے لگی اسی طرح ہندی سنسکرت سے جا ملی اور نتیجے میں ہندی اور اردو میں مشرق و مغرب کا سا بُعد پیدا ہو گیا۔

دیسی ہندی یا اردو پر فارسی اس لئے بھی اثر انداز ہوئی کہ فارسی فاتح مسلمانوں کی زبان تھی اور ہندی مفتوح قوم کی مفتوح پر فاتح ہمیشہ اثر انداز ہوتا ہے بل کہ فاتح مفتوح پر دانستہ اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اکبر جیسے سیکولر بادشاہ کے عہد میں بھی اپنے آقا کی خوش نودی کی خاطر ہندو وزیر مال ٹوڈرمل

نے حکم جاری کیا تھا کہ ہر سرکاری ملازم کے لئے فارسی سیکھنا ضروری ہے۔ جب دربار کی زبان فارسی قرار پائی اور روزگار کے لئے فارسی زبان کا جاننا لازمی ہو گیا تو فارسی دیسی زبانوں پر بھی اثر انداز ہوئی اور علمی قابلیت کے اظہار کے لئے بھی عربی و فارسی الفاظ کا استعمال بڑھ گیا اور اس طرح ہندوستان کی اردو مصنوعی والدین کی گود میں پلنے لگی

اردو کی وجہ تسمیہ

17 ویں صدی سے یورپی سیاح ہندوستان میں آنا شروع ہوئے۔ انھوں نے شمالی ہند کی زبان کو "اندوستان" پھر "اندستانی" اور پھر بعد میں "ہندستانی" کہنا شروع کیا۔ 18 ویں صدی کے مورخوں نے لاطینی زبان میں اس کو "لنگوا اندستانی" کا بھی لکھا ہے اور بعض انگریز تاریخ داں اس زبان کو "مورز" (MOORS) بھی کہتے تھے 1787ء میں سب سے پہلے جان گل گرائسٹ نے اردو کو "ہندستانی" کہا مگر بعض جگہ اس نے "ہندستانی" کے لئے "اردو" لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو "ہندی" بھی کہا گیا یعنی جو لوگ عربی و فارسی نہیں سمجھتے تھے ان کے لئے "ہندی" زبان استعمال کی جاتی تھی۔ ریختہ (مختلف الفاظ سے ملی جلی) اردو کو تب کہا گیا جب وہ بول چال کی منزل سے نکل کر ادبی اعتبار سے معیاری بننے لگی اور دیسی الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے شامل ہونے لگے۔ بازار اور جاہل فوجیوں کی اردو اور ادبی اردو میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے بھی معیاری زبان کو ریختہ کہا گیا۔ مگر زبان کے عام ہو جانے پر ریختہ کا لفظ خارج ہو گیا۔ بعض مورخین نے "اردو" کو سنسکرت زبان کا لفظ قرار دیا ہے مگر زیادہ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ "اردو" ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی فوج یا کیمپ یا لشکر کی بولی کے ہیں۔ چنانچہ اردو وہ زبان ہے جو سنسکرت، بھاشا، عربی، فارسی، ترکی، اور انگریزی وغیرہ سے مل کر بنی ہے۔ شاہ جہاں کے لشکر میں ہر ملک کا آدمی موجود تھا۔ ان کی آپس کی بات چیت، میل جول اور بازار سے خرید و فروخت کرنے کے سلسلے میں جب ہر زبان کے الفاظ خلط ملط ہوئے تو ایک نئی زبان پیدا ہوئی جس نے اردو نام پایا۔ جب اردو خاصی معیاری ہو گئی تو شاہ جہاں نے اس کو "اردوئے معلیٰ" کا بھی نام دیا۔ "اردو" نام بہادر شاہ ظفر کے عہد میں زیادہ مقبول ہوا۔

اردو کا رسم خط

اردو زبان کا رسم خط وہی ہے جو عربی و فارسی کا ہے حروف بھی تقریبا وہی ہیں۔ وہ آوازیں جو عربی و فارسی میں نہیں پائی جاتیں ان کے لئے ہندی سے چند حروف لیے گئے ہیں جیسے ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ اور ڑھ۔ ان آوازوں کو شکل دینے کا طریقہ یہ ہے کہ ت۔ د۔ ر۔ پر چھوٹے سائز کی ط بنا دی جاتی ہے۔ پہلے ط کی جگہ چار نقطے (::) لگا دیا کرتے تھے۔

اردو نے کیا لیا اور کیا دیا

ہندی بھاشا نے اردو بننے کے لئے ان چیزوں کے نام جو عرب و ایران سے ہندوستان میں آئی تھیں ویسے کے ویسے ہی لے لئے۔ جیسے لباس میں فرغل۔ لبادہ۔ کرتا۔ قبا۔ چغا۔ آستین گریبان۔ پائجامہ۔ ازار۔ عمامہ۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ۔ تکیہ گاؤ تکیہ۔ برقع۔ پوستین وغیرہ۔ کھانے کے سلسلے میں دسترخوان چپاتی شیرمال۔ باقرخانی۔ پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ۔ متنجن۔ فرنی ماقوتی۔ حریرہ۔ حلیم۔ لوز۔ مربّی۔ اچار۔ فالودہ۔ گلاب۔ بیدمشک خوان۔ طبق۔ رکابی۔ تشتری۔ کف گیر۔ چمچہ۔ سینی۔ کشتی۔ چائے جوش وغیرہ۔ متفرقات میں حمام۔ کیسہ۔ صابون۔ شیشہ۔ شمع۔ شمع دان فانوس گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ (کپڑے کی بھری ہوئی گول گدی جس پر روٹی رکھ کر تنور میں لگاتے ہیں) مشک۔ نماز۔ روزہ۔ عید۔ شب برات۔ قاضی۔ ساقی۔ حقہ۔ نیچہ۔ چلم۔ تفنگ۔ بندوق گنجفہ۔ پستہ۔ بادام۔ منقا۔ شہتوت۔ بیدانہ۔ خوبانی۔ انجیر سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ۔ اور بھی عربی و فارسی کے الفاظ ایسے ہیں کہ جو کثرت استعمال سے اپنا مستقل مقام بنا چکے ہیں جیسے دلّال۔ فراش۔ مزدور۔ وکیل۔ جلّاد۔ صرّاف

مسنز ا نصیحت ۔ کماں ۔ توشک ۔ چادر ۔ صورت شکل ۔ چہرہ ۔ طبیعت ۔ مزاج ۔ برف ۔ فاختہ ۔ قمری ۔ توتا ۔ کبوتر ۔ بلبل ۔ پر دوات ۔ قلم ۔ سیاہی ۔ جلاب ۔ رقعہ ۔ عینک ۔ صندوق ۔ کرسی تخت ۔ لگام ۔ رکاب ۔ زین ۔ تنگ ۔ پوزی ۔ نعل ۔ کوتل ۔ عقیدہ وفا ۔ بے وفا ۔ جہاز ۔ بادبان ۔ تہمت ۔ پردہ ۔ دالان ۔ تہ خانہ ۔ تنخواہ ملاح ۔ تازہ ۔ غلط ۔ صحی ۔ رسد ۔ کاریگر ۔ ترازو ۔ شطرنج وغیرہ ۔

مگر بہت سے عربی و فارسی اور ترکی الفاظ جب اردو میں آئے تو کسی حد تک ان کی صورت بھی بدلی اور بہت حد تک معانی بھی جیسے

فیلسوف : جسے عربی میں حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلاسفر کہتے ہیں مگر اردو والے فلسفی کو دغاباز اور مکار کے معانی میں بھی استعمال کرتے ہیں ۔

ابا ۔ اماّ : اَب اور اُم سے نکلے ہیں ۔

خصم : عربی میں مقابل کو یا دشمن کو کہتے ہیں مگر اردو میں یہ لفظ شوہر جیسے عزیز رشتے کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔

اخلاص : عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں ۔ اردو میں پیار یا محبت کو کہتے ہیں ۔

خیرات : عربی میں نیکیوں کو کہتے ہیں ۔ اردو میں خیرات کے معانی چیریٹی یا دان کے ہیں ۔

تکرار : عربی میں دوبارہ کہنے یا کرنے کو کہتے ہیں اردو میں جھگڑے کو کہتے ہیں ۔

طوفان : عربی لفظ ہے مگر فارسی میں کسی شے کی زیادتی کو کہتے ہیں ۔ مگر اردو والے اس لفظ کو تہمت کے معانی میں بھی استعمال کرتے ہیں ۔

خفیف : عربی میں ہلکی چیز کو کہتے ہیں مگر اردو والے تخفیف کرنا ۔ شرمندہ کرنے کے معانی میں بھی استعمال کرتے ہیں ۔

مصالح : مصلحت کی جمع ہے ، عربی زبان میں نیکیوں یا بھلائیوں کو کہتے ہیں مگر اردو میں عمارت کے تعمیری سامان (چونا ، گارا ، مٹی) کو اور سالن میں پڑنے والی چیزوں (مرچ دھنیا ادرک ، پیاز ، لہسن ، وغیرہ کو کہتے ہیں ۔

خاطر : عربی فارسی میں دل یا خیال کے معانی میں استعمال کرتے ہیں مگر اردو میں تواضع کے معانی میں بولتے ہیں اور اس طرح بھی کہتے ہیں یہ کام تو ہماری خاطر ضرور کیجئے ۔ !

افراتفری : اصل میں یہ افراط و تفریط جیسے دو لفظوں سے بنا ہے اور معانی ہیں انتہائی بہتات اور انتہائی کمی ۔ مگر اردو میں جلدی یا ہل چل کے معانی میں بولتے ہیں ۔

قلانچ : ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کے فاصلے کو کہتے ہیں ۔ اسی لئے کپڑا ناپنے کے گز کو بھی قلانچ کہتے ہیں مگر اردو میں چوپائے کی چوکڑی یا چھلانگ کو کہتے ہیں ۔

آکا : ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں ۔ اردو والے آکا یار دوست کو کہتے ہیں ۔

قبورق : ترکی میں محفوظ شدہ چیز کو کہتے ہیں ۔ مگر اردو میں جو شے سرکار ضبط کرلے اُسے (قرق) کہتے ہیں ۔

مشاطہ : عربی میں مشط کنگھی کو کہتے ہیں ۔ فارسی میں مشاطہ اس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کراتی ہے جیسے ہندستان میں نائن مگر اردو میں مُشاطہ (میم پر پیش) اس عورت کو کہتے ہیں جو لڑکے یا لڑکی کے لئے رشتہ تلاش کرے ۔ مشاطہ کو انگریزی میں MATCH - MAKER کہتے ہیں ۔

مُرغ : فارسی میں پرندے کو کہتے ہیں اردو میں مرغا فاؤل (FOWL) کو کہتے ہیں ۔

چِغ : ترکی میں باریک پردے کو کہتے ہیں اردو والے چق بولتے ہیں اور بانس یا سرکنڈے کی تیلیوں کے پردے کو کہتے ہیں

کتّا : ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں اردو میں موٹے کو بولتے ہیں ۔ ہٹا کٹا اردو محاورہ ہے ۔

روزگار : فارسی میں زمانے کو کہتے ہیں مگر اردو میں نوکری یا ملازمت کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ۔

بہت سے الفاظ کے معانی بھی بدلے اور صورت بھی بدلی جیسے

روپاک یا دست پاک : رومال
خیر و صلاح : خیر سلا
شوربہ یا سورابہ : شوروا
کیسہ : کھیسا

کاگل : کہگل
ھاون دستہ : ہام دستہ
بزاز : بجاز
بزاوہ : بجاوہ
تاربافی : ٹاٹ بافی
زردی آکہنا : زری کوتا
طعن و تشنیع : تانے تشنے
زق زق. بق بق : بک بک جھک جھک
قیوّرق : قرتی

سنسکرت زبان کے بھی بہت سے الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے مگر ملنے کے ساتھ ساتھ ان کی شکل و صورت بھی کافی بدل گئی جیسے :

چورن : سنسکرت لفظ ہے معنی ہے آٹا۔ بھاشا میں چورن کہنے لگے اور اردو میں چورن یعنی پسی ہوئی دوا۔ اسی لئے کوئی ہوئی چیز کے نیچے جو باریک اجزا رہ جاتے ہیں اس کو چورا کہتے ہیں۔

پشٹ : یہ سنسکرت کا لفظ ہے اردو کا لفظ پسنہاری (آٹا پیسنے والی عورت) اسی سے بنا ہے۔

آٹ : ہندی اور اردو دونوں میں آٹا کہتے ہیں۔

وارتا : یا ورت ۔ اردو میں بات بن گئی۔

چتردھر : سنسکرت کا یہ لفظ اردو میں آکر چودھری بن گیا۔

چندر : سنسکرت کا چندر اردو کا چاند ہے اور چاندنی یعنی چاندنی۔

گرڑھ : اردو میں گھر بن گیا اور فارسی کا کدہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔

ھست : اردو میں ہاتھ یا ہات

ھستی : سنسکرت میں اردو کے ہاتھی کو ہستی کہتے ہیں۔

بارد : سنسکرت میں بارد، ہندی بھاشا میں بادر اور اردو میں بادل یعنی ابر۔

دُل : ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں اردو میں دال (غلے کی) بنانا یا دَلنا کہتے ہیں

کشیر : دودھ یا چھیر۔ اردو میں دودھ اور چاول سے تیار ہونے والی کھیر کو کہتے ہیں۔

گانڈا : اردو میں گنا بن گیا مگر گنڈیری میں ڈ باقی رہی

ماش : یا ماکھ، ہندی میں ماس مگر سنسکرت کا ماش اردو میں مینا بن گیا۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں جب انگریزی زبان نے فروغ پایا تو اردو زبان نے بھی اس سے اثر لیا اور اردو میں انگریزی کے خوب خوب پیوند لگ گئے۔ اب کسی کو مشکل ہی سے یقین آئے گا کہ "کمرہ" اطالوی لفظ ہے۔ "نیلام" پرتگالی۔ "پادری" لاطینی اور "بوتام" فرانسیسی لفظ ہے۔ لالٹین (لین ٹرن) اسٹام (اسٹامپ) بکس (باکس) درجن (ڈزن) پستول (پسٹل) اردلی (آرڈلی) ملام (میڈم) بگھی (بگی) بسکٹ، بٹن، سروس، اسٹیشن، ٹکٹ ریل، انجن، بوتل (باٹل) بش، گلاس، موٹر، سائیکل، مشین پولیس وغیرہ سیکڑوں انگریزی الفاظ اردو میں بکھرے ہوئے ہیں۔

کہتے ہیں انسان کے جذبات پہلے کام کرتے ہیں دماغ بعد میں۔ شعر کو انسانی جذبات تخلیق کرتے ہیں اور نثر دماغی فکر کا نتیجہ ہوتی ہے اسی لئے انسان قافیہ پیمائی اور تک بندی پر عمل کر کے شعر پہلے کہہ لیتا ہے تحریر کا فن ایجاد ہونے سے پہلے شعر ہی ایک موثر میڈیم اور زندہ قوت تھا چنانچہ دنیا کے سارے ادبوں کی ابتدا شعر ہی سے ہوئی۔ اردو ادب کی شروعات امیر خسرو کے کلام سے ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں ہی نے اردو زبان میں شعر کہا، اردو زبان میں غزل کہی۔ مگر ولی دکنی پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ محمد شاہ کے عہد میں جب ولی دہلی پہنچے تو دہلی کے امراء ان کے ساتھ بڑی سرد مہری سے پیش آئے۔ دہلی کے صوفی شاعر گلشن نے ولی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی شاعری کی دکنی اردو کو فارسی الفاظ سے "ریختہ" کر کے فصیح بنائیں۔ چنانچہ 1722 میں جب ولی دوبارہ دلی پہنچے اور اپنا نظر ثانی کیا ہوا کلام دلی والوں اور اہل دربار کو سنایا تو ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور وہ ریختہ کے موجد قرار دیئے گئے۔

شاید اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب "قصہ چہار درویش" جو دراصل فارسی "نوطرز مرصع" کا اردو روپ تھی۔ مترجم تھے میر محمد عطا حسین خاں تحسین، یہ لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ (1798ء) کے عہد کی بات ہے۔ کلکتے کے فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گل کرائسٹ نے چاہا کہ ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں جو انگریز حاکموں اور ہندستانی رعایا کے مابین میل جول پیدا کرنے میں مدد دیں اور وہ میل جول ملکی انتظام کے سلسلے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔ اسی لئے جان گل کرائسٹ کے زیر انتظام 1799ء میں میر شیر علی افسوس نے "باغ اردو" اور 1805ء میں "آرائش محفل" لکھی۔ میر امن دہلوی نے 1802ء "باغ و بہار" لکھی اور "اخلاق محسنی" کا ترجمہ کیا۔ جان گل کرائسٹ نے خود انگریزی زبان میں "قواعد اردو" تیار کی۔ 1803ء میں للو جی لال کوی نے "پریم ساگر" تصنیف کی محمد شاہ کے عہد میں "بیتال پچیسی" جو سنسکرت سے بھاشا میں ترجمہ کی گئی تھی 1805ء میں مظہر علی نے اسے عام فہم اردو کا روپ دیا۔ میر انشا اللہ خاں نے 1807ء میں "قواعد اردو" اردو میں لکھ کر پہل کی۔ اور اردو کی مقبولیت دیکھ کر 1807ء میں مولوی شاہ عبدالقادر نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ مولوی اسمٰعیل نے بھی چند اسلامی رسالے اردو میں لکھے۔ وہ اہل قلم جو انگریزوں کے لئے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں ترجمہ کرنے اور آسان اردو میں نئی کتابیں تصنیف کرنے کے لئے جمع کئے گئے تھے ان میں سید محمد حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی، میر امن، حفیظ الدین احمد، اکرام علی، مرزا علی لطف وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ابتدائی عہد میں مرزا رجب علی بیگ سرور کی نثر مقفیٰ میں "فسانۂ عجائب" تصنیف کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

جان گل کرائسٹ ہی کی کوششوں سے 1835ء سے اردو سرکاری دفتروں کی زبان بننے لگی اسی سن سے اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی اور دہلی سے ایک اردو اخبار جاری ہوا اردو ہی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھانے کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور 1842ء میں دہلی میں ترجمے کے لئے ایک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی۔

ڈپٹی نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر سے واضح طور پر اردو ناول نویسی کی ابتدا ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے "آب حیات" لکھ کر تنقید اور تبصرہ نگاری میں پہل کی۔ پریم چند سے اردو افسانہ شروع ہوا۔ سرسید نے اردو نثر کے تکلف و تصنع کو دور کر کے زیادہ نیچرل بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں مولانا حالی کی قومی نظموں اور نیچرل شاعری اور تنقیدی مضامین، علامہ شبلی اور مولانا ذکاء اللہ کی تاریخی تصانیف، مولوی چراغ علی اور نواب محسن الملک کے اخلاقی و پولی ٹیکل اور تعلیمی لیکچروں نے سرسید کے کاز کو اور زیادہ تقویت پہنچائی۔ اودھ کے دربار میں اردو ڈرامے نے جنم لیا جو آغا حشر کشمیری کے عہد میں بہت زیادہ ترقی پا گیا۔

اردو کی اشاعت کا ذریعہ

ہندستان میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت بھگتی یا تصوف کے ذریعہ ہوئی۔ دفتری زبان فارسی تھی اور عوام کی زبان بھاشا تھی یا وہ زبان تھی جو بعد میں اردو کہلائی چنانچہ صوفیوں نے اپنے بھگتی مشن کے لئے عوام ہی کی زبان کو اپنا میڈیم بنایا۔ دکن کے اردو شعرا ہوں یا دہلی کے اردو شعرا، اردو کے ابتدائی دور کے تمام شعرا صوفی تھے اور انھوں نے اپنے مشن کی جو تبلیغ کی اس کے نتیجے میں اردو کو فروغ حاصل ہوا دکن کے بہمنی حکمراں بھی اردو کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے وہ چونکہ شیعہ تھے اور ماہ محرم میں مجلسیں منعقد کرتے تھے اس لئے اپنی مجلسوں کی جانب عوام کو رجوع کرنے کی غرض سے انھوں نے فارسی مرثیوں کی جگہ اردو (دکنی اردو) مرثیوں کو رائج کیا۔ فراق، سراج اور مینائی جیسے اردو شاعروں

ؔ ایک شاعر جو فضلی تخلص کرتے تھے انھوں نے محمد شاہ کے عہد (1145ھ) میں ایک مجلس لکھی تھی اسکا دیباچہ ظاہر ہے نثر میں تھا چنانچہ اس دیباچہ کو بھی اردو کی پہلی تصنیف کہا جا سکتا ہے۔

نے شاہی دربار کی ہمت افزائی پر اردو زبان میں بہت سے رسالے لکھے اور نتیجے میں اردو عوام میں مقبول ہوتی گئی۔ عیسائی پادریوں کی تصانیف نے بھی اردو زبان کو آگے بڑھایا خصوصی طور پر وہ پادری جو بنگال کے سیرام پور کے علاقے میں رہتے تھے انجیل مقدس کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرتے تھے اور عوام تک انجیل کا پیغام پہنچاتے تھے اردو زبان بھی عیسائی تبلیغ کا ذریعہ بنی 1809ء سے 1814ء تک انجیل کے جو ترجمے ہوئے وہ زیادہ تر اردو ہی میں ہوئے اور اس کے ساتھ ساتھ عیسائی تبلیغ کے لئے بہت سے رسالے اور کتابچے اردو ہی زبان میں تصنیف کئے گئے۔ یہ مناظروں کا بھی عہد تھا مسلمانوں کے مذہبی مناظرے پادریوں سے ہوتے، ہندوؤں سے ہوتے اور آپس میں بھی ہوتے مناظروں سے پہلے اور بعد میں رسالے تصنیف ہوتے اور عوام میں ان کو تقسیم کیا جاتا۔ نتیجے میں اردو زبان کی بھی اشاعت ہوتی۔

اردو زبان پر غیر ملکی اثرات

اردو زبان اگرچہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ہندستانی ہے مگر اس کا مزاج قطعی طور پر غیر ملکی ہے۔ قواعد، علم و عروض، تلمیحات استعارات، تراکیب اور محاورے، ہر لحاظ سے اردو نثر و نظم کا مزاج ایران و عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ جن قدروں کا اردو زبان کے ذریعے پرچار کیا جاتا ہے وہ اسلامی ہیں یعنی جن باتوں کو اس ملک سے کوئی تعلق نہیں وہ تمام اردو نثر و نظم کی اساس ہیں۔ اردو نثر نگاروں اور شاعروں نے خود ہندستانی ہونے کے باوجود بہادری کے سلسلے میں ہمیشہ رستم و سہراب کو یاد کیا جب کہ یہ بھیم و ارجن کا دیس ہے۔ حسن و جمال میں لیلا یاد آئی یا شیریں مگر ہیر یا سوہنی کو کبھی یاد نہیں کیا۔ دجلہ و فرات یاد رہے مگر آنکھوں کے سامنے بہنے والی گنگا و جمنا یاد نہ آئیں۔ آب زمزم کو تو متبرک سمجھا۔ لیکن گنگا جل کی خوبیوں پر کبھی غور نہ کیا اور نہ کبھی مجنوں کے بجائے رانجھا یاد آیا۔ بلبل، سنبل، بنفشہ، مشک، ریحان، کبک دری، نحو محشر، فتنۂ قیامت، بہار، خزاں، نسیم، صبا، سکندر یونانی ارسطوئے ثانی، یوسف ثانی، حاتم، عنقا، ہما، ساقی، سرو قمری، شمشاد، نرگس، غازہ، گل گونہ، مانی و بہزاد۔ راہ ہفت خواں کوہ الوند، کوہ بے ستون، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں سیحوں، فردوس بریں، طوطی کی چہک، بلبل کی نغمہ سنجی، ایران توران، خراسان اور امرد پرستی جیسی چیزیں یا باتیں نہ ہندستان میں پائی جاتی ہیں اور نہ ان کا ہندستان کی سرزمین سے کوئی تعلق ہے۔ اردو قلم کار جو اردو کو ہندستان کی اور ہر فرقے کی زبان کہتے رہے ہیں انہوں نے بھول کر بھی اپنے وطن کی ایک حسین چیز کی بھی قدر نہیں کی جبکہ اپنے وطن عزیز میں بھونرا بھی تھا اور کنول کا پھول بھی۔ مور بھی تھا اور ہنس بھی، میگھ جامن کی ٹہنیاں، شیشم کی چھاؤں، کھرنی کی شاخیں۔ فالسے کے پیڑ، چاندنی کی بیل۔ کمرک کے درخت عشق پیچہ۔ نیم کے پتوں کی سبزی، آم کا بور، مولسری کے پھول، بھونرے کی آواز، کوئل کی کوک، کوکلے کے بول، مور کی جھنکار پپیہے کی پکار، چنبیلی کا جھرمٹ، سارس اور بگلوں کی قطار، بادل کی کڑاک، بجلی کی چمک، بسنت رت کا سماں اور کیا کچھ نہیں تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب (نثر و نظم) میں مصنوعی رنگ پیدا ہوگیا اردو شاعری فارسی و عربی ادب کا محض چربہ بن کر رہ گئی اور قافیہ پیمائی نے اسے ایک رسمی چیز بنا دیا۔ نثر محض خطابت کہلائی اور تاثیر ختم ہوگئی۔ اردو شاعری کا اگر ہندی شاعری سے موازنہ کیا جائے تو ہم جنس پرستی کی بنا پر اردو شاعری غیر فطری ہے اور چوں کہ ہندی شاعری میں عورت عاشق بن کر اپنے پتی کے فراق میں گریہ کرتی ہے اور اخلاقی اعتبار سے پتی ورتا ہونے کا ثبوت دیتی ہے اس لئے ہندی شاعری نیچرل ہے تہذیبی و اخلاقی اعتبار سے اردو شاعری قابلِ تعریف نہیں مغربی شاعری کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اردو شاعری کا دائرہ بہت ہی محدود نظر آتا ہے۔ مغربی شعراء جن قدرتی مناظر سے متاثر ہوتے ہیں وہ اردو شعرا کے لئے باعثِ کشش نہیں بنتے اردو شاعری رونے دھونے (حزن و یاس) کی شاعری ہے یا خوشامد پسندی (قصیدہ خوانی) کی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان کا شاعر عمل کی دنیا کا انسان نہیں ہوتا۔ غرضے کہ غیر ملکی اثرات نے اردو کو ایک ہی فرقے کی زبان بنا دیا ہے اور اردو مخصوص

مذہبی قدروں اور تہذیب و تمدن کی ترجمان بن کر رہ گئی ہے۔
سہولت کی خاطر اردو کی تاریخ کو اگر تین دور میں بانٹ دیا جائے تو ہر دور کا خلاصہ یہ ہوگا۔

پہلا دور : اردو اس ہندی بھاشا یا کھڑی بولی سے نکلی ہے جو کبھی دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی امیر خسرو (1325 - 1255ء) ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ ولی دکنی پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں ولی کی دکنی اردو دراصل ہندی، تامل، تلگو اور اسلامی اصطلاحات کا مرکب تھی۔ ولی جب ریختہ میں کہنے لگے تو ان کا کلام صاف، سادہ اور فصیح ہوگیا۔ صوفیائے کرام کے ذریعے اردو ہندستان کے ہر گوشے میں پہنچی یہاں تک 18 ویں ہی صدی میں اردو جہانگیر آباد (ڈھاکہ) اور مرشد آباد تک پہنچ گئی۔ مدراس اور میسور میں قطب شاہی عہد سے اردو کا چلن شروع ہوا۔ گجرات میں ابتدا میں اردو کو گجری کہتے تھے۔ اردو کے اس سے پہلے دور سے جو اردو تصنیفات تعلق رکھتی ہیں ان میں خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ "اخلاق و تصوف" ہے جس کو اردو کی قدیم ترین (1308ء) نثری کتاب سمجھا جاتا ہے۔ قاضی محمد صالح کی مثنوی "اخلاق حسنہ" کا بھی قدیم اردو کتابوں میں شمار ہوتا ہے جو 1707ء کی تصنیف ہے بعض اہل دکن شہر حیدرآباد کے بانی محمد قلی کو اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہتے ہیں اس کے درباری شاعر اسداللہ وجہی نے "قطب مشتری" لکھی جو دکنی اردو میں پہلی مثنوی مانی گئی ہے۔ اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں جو "سب رس" تصنیف کی اس کو اہل دکن اردو نثر کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ قدیم شعری تصانیف میں خواجہ سید محمد حسینی کے تصنیف کردہ (1706ء) رسالے "معراج عاشقین" "شکارنامہ" "ہدایت نامہ" "سہ بارہ" اور ان کے صاحب زادے سید محمد اکبر حسینی کے رسالے "نشان عشق" اور نظامی کی ایک عشقیہ مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ" کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ولی ویلوری کی بھی دو مثنویاں اہم ہیں۔ جو 1119ء سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسرا دور : 1780ء میں لارڈ ولزلی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے بچوں کے لئے کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ ڈاکٹر جان گل کرائسٹ کو اس کا پرنسپل مقرر کیا۔ گل کرائسٹ کو علم و ادب اور تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا انھوں نے ایک ادبی انجمن بنائی جو میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، للا نہال چند لاہوری، مرزا علی لطف، مرزا کاظم علی جوان، مظہر علی ولا، اور سری للو لال کوی پر مشتمل تھی۔ للو لال ہندی نثر میں کہانیاں بھی لکھتے تھے اور اپنے ساتھی قلم کاروں کو ہندی سے اردو ترجمہ کرنے میں مدد بھی دیتے تھے اس انجمن نے جو کتابیں تیار کیں ان میں باغ و بہار، توتا کہانی، آرائش محفل، باغ اردو۔ گل زار دانش۔ نثر بے نظیر، گل بکاؤلی وغیرہ اہم ہیں۔ اس دور کی اردو پہلے دور سے کافی بدل چکی تھی۔ پہلے بے ربط جملوں، بے جوڑ فقروں اور مشکل تلفظ والے لفظوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ دکنی الفاظ کی بھر مار ہوتی تھی اور لفظوں کو بے موقع اٹھا بٹھا کر اور مطلب کو غیر ضروری طور پر الٹ پھیر کر واضح کرنے کی کوشش سے عبارت ناقابل فہم بن جاتی تھی دوسرے دور کے مصنفین نے الفاظ کو تراش خراش کر مترنم بنایا۔ اور جملوں کو سادہ اور سلیس بنادیا اور صحیح معانی میں اردو ایک زبان بن گئی مگر اسی دور میں رجب علی بیگ سرور (لکھنوی) نے زبان کو "اردوئے معلا" سے "اردوئے مطلا" بنادیا اور تکلف و تصنع سے آراستہ کر دیا۔ اسی دور سے مقفا و مسجع کی بدعت شروع ہوئی۔ سرور کے فسانہ عجائب کا طرز دوسروں نے بھی اپنایا اور حد یہ ہے کہ مرزا غالب جو خود اردو نثر میں ایک طرز نو کے موجد ہیں سرور کی پیدا کی ہوئی بدعت کو اختیار کر بیٹھے۔

تیسرا دور : اگرچہ یہ دور مرزا غالب کے ان خطوط سے شروع ہوتا ہے جو اردوئے معلا کے نام سے شائع ہوئے اور آج تک اپنی طرز کی بنا پر سب سے جدا اور سب سے ممتاز ہیں اور اب تک اس سلسلے میں غالب نے اپنا حریف پیدا ہونے نہیں دیا۔ مگر یہ اردو زبان کا اصلاحی دور ہے اور غالب کے اسی دور پر سر سید اسکول آف اردو کی بنیاد رکھی گئی۔ سر سید کی دور بین نگاہ نے یہ تاڑ لیا تھا کہ سرور کی مقفا نثر مستقبل میں مقبولیت

ہوگی۔ اس لئے انھوں نے مرزا غالب کی نثر کو نمونہ بنا کر اردو زبان کو سلیس، عام فہم اور سادا بنانے کی کوشش شروع کی چنانچہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اسی سلیس اور سادا زبان اردو میں ایسی یادگار کتابیں تیار کیں جو اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ بن گئیں۔ اس تیسرے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھی پروفیسر ذکاء اللہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک مولوی چراغ علی۔ مولانا شبلی، مولانا حالی اور سرسید کے ہم عصر محمد حسین آزاد، پنڈت رتن لال سرشار، مولانا عبدالحلیم شرر وغیرہ نے اردو زبان کو سادا، سلیس، عام فہم بنایا اور زبان کو عالمانہ بیان بھی عطا کیا۔ زبان کو اس طرح صاف ستھرا بنا کر اس میں اصلاحی، مذہبی سوانحی، تاریخی اور علمی کتابیں لکھی گئیں۔

اس تاریخ اردو کا ماحصل یہ ہے کہ اردو کی عمر آٹھ سو برس ہو چکی ہے مگر اس کا دامن ابھی تک ٹیکنیکل، سائنٹفک اور جدید علوم سے خالی ہے۔ اردو پر جاگیردارانہ دور کی ذہنیت بدستور حاوی ہے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کا عرفان بھی اسے ابھی حاصل نہیں ہو سکا ہے اسی لئے اردو ادب کا آج کے عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں۔

اردو کی اس سدابہار کس مپرسی کا سبب ؟

برسوں پہلے "آب حیات" کے صاحب رائے مصنف شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے کہا تھا: "خاتمہ کلام

اس فقرہ پر ہوگا کہ کوئی پرندہ اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اردو کے بازو فارسی بھاشا اور سنسکرت وغیرہ ہیں، پھر وہ بیچاری انگلینڈ، روم یا یونان کے محلوں پہ کیوں کر جا بیٹھے۔ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اسی قدر زیادہ ہوتی ہے جس قدر شے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے!" کہنے کو یہ کتنا ہی کہا جائے کہ اردو عوام کی زبان ہے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو بادشاہوں، نوابوں (مغل عہد کے آخری چند بادشاہ اور لکھنؤ کے نوابین اور انگریزی دور حکومت کے مسلم والیانِ ریاست) کے سایۂ عاطفت میں پلی اگر اردو زبان نے کچھ ادب تخلیق کیا تو زیادہ سے زیادہ بادشاہ کی شان میں چند دیوان پیدا کر دیئے نہ کوئی جوہر پیدا ہوا اور نہ کسی نے اس طرف توجہ کی۔ اردو دلّی میں روشن ہوئی تھی، دلی کی بادشاہت کا چراغ گل ہوتے ہی سے بھی بجھ جانا چاہیئے تھا مگر قوالوں اور کوٹھے والیوں نے اس کی لو کو ابھارے رکھا اور آج بھی مشاعرے باز اور فلم والے برائے نام اردو کا چراغ روشن کئے ہوئے ہیں۔ جو زبان تفریح طبع اور دل لگی کا سامان بن جائے اس سے کسی سنجیدہ مقصد کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔!

چلتی ریل میں انگریزی لکھیے مگر اردو نہیں

یہ عجیب بات ہے چلتی ریل میں انگریزی لکھئے تو دقت محسوس نہیں ہوگی لیکن اردو لکھئے تو لکھا نہیں جاتا اور حرکت چلنے نہیں دیتی جو لوگ ساری رسم الخط کے مخالف ہیں وہ اگر چاہیں تو اپنے دلائل میں اس نئی دلیل کا بھی اضافہ کر لیں۔ بات یہ ہے کہ عربی رسم الخط میں دوائر بنتے ہیں محض اوپر نیچے ہونے والی لکیریں نہیں ہوتیں جیسے کہ لاطینی ہینڈ رائٹنگ میں ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اول الذکر بغیر کاملہ سکون کے لکھا نہیں جا سکتا۔ حرکت سے دوائر کے زاویے بگڑ جاتے ہیں۔ مگر لاطینی خط پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ ہاتھ کتنا ہی ہلے لکیریں کھنچتی ہی چلی جائیں گی۔

تـ نگن

مسلم قیادت

مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے (1894ء) علی گڑھ کے اجلاس میں نواب محسن الملک نے فرمایا تھا: صاحبو! ـ قوم کی ترقی کا آغاز ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ پہلے کوئی عالی دماغ مستقل مزاج جس کا دل ودماغ ایسے کام کے لئے بنایا گیا ہو قوم کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور ایک ایک دو دو آدمی اس کی باتیں سمجھنے اور اس کے کہنے پر چلنے اور اس کی تائید کرنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ایک ایسا مختصر گروہ بن جاتا ہے اور وہ لوگ اپنے خیالات پھیلانا اور اپنی جماعت کو بڑھانا شروع کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا اثر ساری قوم پر ہوجاتا ہے اور قوم ترقی کے درجے پر پہونچ جاتی ہے مگر صاحبو! بغیر خیالات کے بدلنے اور بغیر کسی شخص کے پیشوا ہونے اور بغیر کسی ایک منضبط اور مستعد لوگوں کی جماعت قائم ہونے کے، اگر کسی قوم کی کبھی [illegible] ہوئی ہو تو مجھے اس کی نظیر بتایئے!

اگر آپ جھاڑی میں چھپے ہوئے خرگوش کو بھگایئے تو وہ کھیت در کھیت دوڑے گا۔ میلوں کی مسافت طے کرے گا اور پھر اسی جھاڑی میں آ چھپے گا۔ 1857ء کے بعد سرسید نے مسلمان کے جمود کو توڑا اس نے ترقی کی خاصی مسافت طے کی مگر 1947ء کے بعد مسلمان وہیں آ کھڑا ہوا جہاں سے وہ 90 برس پہلے چلا تھا۔ آج اسے پھر ایک پیشوا کی ضرورت ہے، اسے پھر ایک سرسید درکار ہے۔

زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی صحیح لیڈر شپ (درست راہ نمائی) کے بغیر راہ راست پر نہیں آتی جس گھر کی نئی پود جرائم کی مرتکب ہوتی ہے جس کے کنبے کے بچے اطاعت اور فرماں برداری کے جذبے سے محروم ہوتے ہیں، اور جو خاندان اخلاقی قدروں سے ناواقف ہوتا ہے وہاں دراصل درست قیادت ہی کی کمی ہوتی ہے۔ اسی محلوں میں سڑکیں ٹوٹی پھوٹی ہوں گی۔ گلیاں کوڑے کرکٹ سے بھری ہوں گی اور فضا تعفن آمیز ہوگی جہاں فرض شناس لیڈر نہ ہوں گے وہی تنظیم اپنا وجود کھو بیٹھے گی جس کی قیادت کمزور ہوگی اور اسی فوج کے قدم اکھڑ جائیں گے جو اپنے قائد سے محروم ہو چکی ہوگی آج کے ہندوستانی مسلمان کی پریشان حالی، پراگندگی اور انتشار کا سبب ہی یہ ہے کہ مسلم فرقہ صحیح اور پرخلوص لیڈر شپ سے محروم ہے یعنی ہندوستانی مسلمان کو پھر ایک سرسید درکار ہے۔

آزادی کو آئے ہوئے اگرچہ 27 برس ہو چکے مگر مسلمانوں کو ابھی تک کوئی قائد ہی نصیب نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب العین ہی نہیں ہے۔ مسلمان آگے بڑھنا تو چاہتے ہیں مگر انہیں یہ پتا نہیں کہ جانا کہاں ہے، انہیں نہ منزل کا علم ہے نہ راستے کا۔ کچھ ہیں جو وقت کی سوئی الٹی گھما کر چودہ سو برس پہلے کے زمانے کو واپس لانا چاہتے ہیں اپنے لئے اور ان کے لئے بھی

جو مسلمان باقی ہیں، بعض حال سے بے خبر ہیں، مستقبل کی فکر نہیں، بس اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہیں اور فخر سے اپنا سینہ پھلا لیتے ہیں۔ بعض مسلمانوں کو صرف یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ "پرسنل لا" کو نعرہ بنا کر اسمبلی کی سیٹ حاصل کی جائے یا میونسپل کاونسلری کے لئے "بندے ماترم" کو موضوع بنایا جائے ایک گروہ وہ ہے جو مذہب کی آزادی کے لئے کوشاں ہے اور پھر ایسے مسلمانوں کی تعداد تو کافی ہے جن کو یہ فکر پڑی ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی قدروں کی شدھی ہونے پائے اور اگر ہو سکے تو دوسروں کی سبھیتا کو مشرف بہ اسلام کر لیا جائے غرضے کہ یہ انتشار برکت نہیں پیدا ہونے دیتا اور نتیجے میں مسلمانوں کو کوئی قائد نہیں مل پاتا

جب کسی قوم کا واقعی کوئی نصب العین ہوتا ہے تو اُسے اپنے راستے کا بھی پتا ہوتا ہے اور اپنی منزل کا بھی۔ اور وہ اپنے راہ نما کو بھی پہچانتی ہے اور اپنے راہ زن سے بھی چوکنی رہتی ہے ہندو فرقہ کا ایک متفقہ نصب العین ہے وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جب کرشن مینن نے اسے گم راہ کیا تو اس نے اُس کو اس حد تک بھلایا کہ بس مرنے ہی پر یاد کیا اور جب مرارجی ڈیسائی اور کامراج جیسے جگادری نیتا بھی اعتماد کھو بیٹھے تو اسی ہندو فرقے نے ان کی پیٹھ پر ایسا ہاتھ رسید کیا کہ جب جب پُروا چلتی ہے تو یہ دونوں اپنی کمر میں درد محسوس کرتے ہیں۔

مگر مسلمان کی تو بات ہی الٹی ہے۔ تقسیم ملک کے مابعد اثرات نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ مسلمان کے لئے اتنی ہی ضرر رساں ثابت ہوئی جتنی یزید کی فوج حسین کے لئے ہلاکت ثابت ہوئی تھی۔ مگر آج بھی مسلم لیگ آشفتہ حال مسلمانوں کی گود میں خوب پھل پھول رہی ہے۔ حیدر آباد کی اتحاد المسلمین نے ہندستان کے نصف مسلمانوں کو تباہ کر دیا لیکن یہ مجلس آج بھی نہ صرف برقرار ہے بلکہ اس کے پلیٹ فارم سے حیدرآباد کی مسلمان چناؤ میں حصہ لیتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ دراصل نیک و بد میں امتیاز نہ کرسکنے کی بنا پر۔ مسلمان صحیح قیادت سے محروم ہے۔

مسلمان کی زندگی انفرادی زندگی ہے اور انفرادی زندگی انسان کی نہیں حیوان کی ہوتی ہے، ترقی یافتہ قوم کے ہر فرد کی زندگی اجتماعی زندگی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات پر قوم کے وجود کو ترجیح دیتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے جذبے کے بغیر کسی قوم نے آج تک ترقی نہیں کی۔ جس قوم کے افراد میں قربانی اور تیاگ کا جذبہ نہیں ہوتا وہ ہمیشہ پچھڑی رہتی ہے۔ یوں کہنے کو آج ہندستان کی ہر مسلم بستی میں لیڈروں کی کھیپ کی کھیپ موجود ہے مگر ان کو نہ اپنے فرقے سے پیار ہے نہ قوم سے وہ تو زندہ باد سننے، ہار پہننے جلسوں میں صدر یا مہمانِ خصوصی بننے اور ان راستوں سے دولت پیدا کرنے کے لئے لیڈر بنتے ہیں۔ جو اپنی جیب سے چارمینار سگریٹ اور چائے کی ایک پیالی نہیں پی سکتے لیڈر بنتے ہی چند برس میں بے کار سے صاحب کار بن جاتے ہیں ان کے فلیٹ میں ٹیلی فون بھی آ جاتا ہے اور ٹی وی بھی ملک و قوم کے نام پر لیڈر بنتے ہیں۔ مگر لیڈر بنتے ہی عیش کرنے کو زندگی کا ماآل سمجھنے لگتے ہیں۔ ع گر گولی ان دونوں کو مارو، ڈٹ کے قوالی سنو!

آج کے مسلم راہ نماؤں کا موازنہ ذرا اُس انجینیر سے تو کیجئے جس نے نہر سوئز تیار کی تھی، لوگوں کا اصرار تھا نہر کا نام اس انجینیر کے نام پر رکھا جائے مگر وہ چاہتا تھا کہ اس نہر کو کنال آف فرانس (CANAL OF FRANCE) کہا جائے۔ اسی لئے بہادر یار جنگ نے ایک بار کہا تھا: "قائد وہ نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن کر نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتا ہے بلکہ قائد وہ ہے جو بنیاد کا پتھر بن کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے سینے پر عمارت کے قیام اور اسکے استحکام کی ضمانت قبول کرے۔"

مسلمان کی شجاعت میں تو شک نہیں مگر اس نے اپنی حکمت کا شاذ ہی ثبوت دیا ہے۔ لیڈر کو باہمت اور بہادر تو ہونا چاہیئے مگر ایک لیڈر کے لئے بہادری سے زیادہ تیز فہمی ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ لیڈر کا خلوص بھی اپنی قوم کے اتنا کام نہیں آتا جتنا کہ اس کی فہم و فراست کارآمد ثابت ثابت ہوتی ہے۔ فہم و فراست کے ذیل میں مصلحت اندیشی بھی آتی ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اگرچہ اپنی ساری زندگی سیاسی جد و جہد میں گزاری اور اس میں بھی شک نہیں کہ وہ مجسم خلوص تھے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سیاست کے رموز و نکات سے ناواقف تھے۔ سیاست میں قدم قدم پر حالات کو دیکھ کر وقتی وقتی پروگرام میں تبدیلی

کرنا پڑتی ہے کبھی مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں اور کبھی مقابل کی بخشش ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے مگر مولانا حسرت موہانی اپنے نظریے اور پروگرام کو اٹل بنائے رکھتے تھے ان کی یہ معصومیت تھی کہ وہ گاندھی جی کے اس عمل پر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ وطن پرست گاندھی وطن دشمن انگریز سے مصالحت کے لئے کیسے تیار ہو جاتا ہے۔ گاندھی جی درحقیقت انگریزی راج کو ہندوستان کے لئے ایک تباہ کن بات سمجھتے تھے۔ اور کامل آزادی ان کا نصب عین تھا مگر سیاسی حالات کا مدوجزر تھا کہ کبھی وہ درجہ نو آبادیات کی تجویز منظور کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور کبھی اروِن سے معاہدہ کرنے پر لیکن دوسری بڑی جنگ جب شروع ہوئی تو حالات کا رخ بدل گیا اور گاندھی جی کا نعرہ " ہندوستان چھوڑ دو " سارے دیش میں گونج اٹھا اور آخر گاندھی جی نے انگریز کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اصل حسرت موہانی کی طرح " آتش نمرود " میں بے خطر کود پڑنا سیاست نہیں بلکہ گاندھی جی کی طرح صبر و تحمل کے ساتھ منزل کی جانب کترا کترا کر چلنے کو سیاست کہتے ہیں۔ بوقت ضرورت اپنا رخ تو بدلا جا سکتا ہے مگر منزل نہیں، منزل بدلنے کا مطلب ہوتا ہے اپنا کردار اور اپنا نصب عین بدل دینا۔ جب کوئی لیڈر بار بار اپنا نصب عین بدلتا ہے تو وہ اپنی قوم کا اعتماد کھو دیتا ہے اور قوم سمجھ جاتی ہے کہ اس کا فلاں لیڈر خود اعتمادی سے محروم ہے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ خود اعتمادی بڑے کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے۔ ہنی بال کو اپنے اوپر اعتماد تھا کہ وہ کوہ الپس کی برفانی چوٹیوں سے اپنی ساٹھ ہزار پیدل فوج اور ہاتھیوں کے بہت سے دستوں کو گزار کر دشمن پر حملہ کر سکتا ہے چنانچہ اپنے اسی اعتماد کے بل پر اس نے قیامت خیز موسم، ہواؤں کے باوجود پہاڑی چوٹیوں کو طے کیا، دشمن پر حملہ کیا اور فتح پائی۔

لیڈر شپ کے لئے صبر و تحمل اور ضبط نہایت ضروری ہے اسی سلسلے میں ایک واقعہ سنئے۔ خلافت تحریک کے دن تھے کلکتے میں خلافت کی سب جیکٹ کمیٹی کا اجلاس جاری تھا ایک پنجابی لیڈر اپنی تقریر میں مولانا محمد علی کو کسی سلسلے میں برا بھلا کہنے لگے مولانا سے ضبط نہ ہوا اور وہ غضب ناک ہو کر اس پنجابی مقرر کو گالی دینے لگے۔ پاس ہی سامعین میں سے ایک پنجابی نوجوان نے کھڑے ہو کر مولانا کو جوابی گالی دی اور چاقو نکال کر ان پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھا کہ فوراً ہی خان عبدل غفار خاں اور ان کے چند پٹھان ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کرایا اور مولانا محمد علی کو اس پنجابی نوجوان سے چھٹکارا دلایا۔ انہی دنوں کلکتے میں کانگریس سب جیکٹ کمیٹی کا بھی اجلاس ہو رہا تھا۔ اگلے ہی رات کانگریس کے جلسے میں جب گاندھی جی تقریر کر رہے تھے تو راجا نام کے ایک نوجوان ہندو لڑکے نے مداخلت کی اور گاندھی جی کی شان میں ایک نازیبا بات کہی مگر گاندھی جی کو بالکل غصہ نہیں آیا بلکہ وہ ہنس دیئے اور پھر تقریر کرنے لگے۔ اس لڑکے نے کئی بار کھڑے ہو کر گاندھی جی کی شان میں گستاخی کی مگر گاندھی جی نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور زرا برا نہیں مانا۔ خان عبدل غفار خاں اس جلسے میں بھی موجود تھے۔ وہ گاندھی جی کی اس اعلا ظرفی اور اخلاق کی پختگی سے بہت ہی متاثر ہوئے۔ اگلے ہی دن خان عبدل غفار اپنے چند ساتھیوں کو لے کر مولانا محمد علی کی قیام گاہ پر پہنچے اور گاندھی جی کے ساتھ جو ناخوش گوار واقعہ پیش آیا تھا اور جس کو انھوں نے بڑی خوبی سے ٹال دیا تھا اُن کو سنایا اور پھر اُن سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنے اندر صبر و ضبط کا مادّہ پیدا کریں۔ " اچھا! جنگلی پٹھان محمد علی کو سمجھانے آئے ہیں! " یہ غضب آلود مولانا محمد علی کا جواب تھا۔

مولانا محمد علی اور گاندھی جی کی لیڈر شپ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا ایک ناکام اور کامیاب لیڈر شپ میں پایا جاتا ہے اور وہی فاصلہ آج بھی مسلم لیڈر شپ اور ہندو لیڈر شپ کے درمیان موجود ہے۔

نطشے کا کہنا ہے: " پبلک لائف گراں تر ہے۔ لیڈر کے بے رحم کاروں میں تھوڑے دن کے بعد سرد مہری بڑھنے لگتی ہے اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ لیڈر کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے۔ ان مشکلوں سے گزرنے کے بعد بھی کوئی لیڈر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کو اپنے مقصد میں کامیابی

حاصل ہو ہی جائے گی !"

جو لیڈر غیر مخلص ہیں (جیسے کہ مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں) ان کے لئے لیڈری پھولوں کی سیج ہے، ایک پیشہ ہے اور منافع بخش کاروبار ہے مگر جو راہ نما دردمند ہیں ان کے لئے قوم کی راہ نمائی کرنا کانٹوں بھری راہ پر چلنا ہے اسی سلسلے میں نواب محسن الملک کا کہنا تھا :۔

"اے میرے بھائیو ! کیا آج تک کوئی بڑا کام بغیر طعنوں کے برداشت کرنے اور دل فگار باتوں کے سنے کہیں دنیا میں ہوا ہے۔ صاحبو ! قومی اصلاح اور قومی ترقی کوئی آسان کام نہیں ہے بل کہ اس دنیا کے تمام کاموں میں اور سب سے زیادہ مشکل نازک اور تکلیف دہ ہے حقیقی اصلاح اور سچی ترقی، دینی اور دنیوی اصلاح اور معاش اور معاد کی فلاح، یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے۔ مگر دنیوی اصلاح اور دنیوی ترقی بھی ایسی مشکل ہے کہ اس کے لئے بھی خدائے تعالیٰ خاص لوگوں کو پیدا کرتا ہے اور اس کے لائق انکے دل و دماغ بناتا ہے مگر پیغمبر ہوں یا مصلحان قوم خدا نے سب کے لئے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ان کی کوشش کو منزل مقصود تک پہونچنے میں بہت سے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اوّل ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور ایک ناممکن کام کے خیال سے وہ دیوانے ٹھہرائے جاتے ہیں پھر ان پر طعن و طنز ہوتے ہیں پھر ان پر تہمتیں کی جاتی ہیں اور ان کے ارادے بدنیتی پر محمول کئے جاتے ہیں پھر ان کے مقاصد میں غلط بیانیاں کی جاتی ہیں۔ پھر کچھ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان کے کاموں کی عظمت اور قدر کا خیال ہونے لگتا ہے اور آخر مفید سمجھ کر لوگ مدد دیتے ہیں اور اس کی کامیابی دیکھ کر تعجب کرتے ہیں اور خود ہی کہنے لگتے ہیں کہ پہلے ہم کیوں ایسا نہ سمجھے اور کیوں اوّل ہی اس کام میں شریک نہ ہوئے !"

(خطبۂ صدارت: مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڑھ۔ 1894ء)

1857ء کے بعد مسلمانوں کا جو حال تھا، 1947ء سے اسی حال میں وہ پھر مبتلا ہیں۔ پچھلے 27 برس میں ہندستان کے مسلمانوں میں کئی بار حرکت پیدا ہوئی مگر آج تک ان کا کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا جو حال اسے مستقبل کی جانب ہوتا اور اس بات کی دلالت کرتا کہ اب مسلم فرقے کے بہتر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ تلخ حقیقت یہ ہے کہ 27 برس گزر گئے مگر مسلمانوں میں اس ملک کی ایک عظیم اقلیت ہونے کی حیثیت سے آج تک اپنے مسائل و امور کا صحیح اور سنجیدہ شعور پیدا ہی نہیں ہوا اور اس کا سبب یہی ہے کہ پچھلے 27 برس سے ہندستان کی مسلم اقلیت ایک صحیح قسم کے لیڈر سے محروم ہے۔

آج بھی ہندستانی مسلمانوں کے لئے ایک سرسید جیسے حکیم، وقت شناس مستقل مزاج، مخلص اور باعزم لیڈر کی ضرورت ہے جو حالات کی خصوصی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی طرز پر کام کرے جس پر 1857ء کے بعد سرسیّد نے کیا تھا، یعنی وہ ایک طرف اخباروں رسالوں، کتابوں سینما، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اُن تلخیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں، دوسری طرف ملک کا دورہ کرے مسلمانوں کی ہمّت بندھائے، ہندوؤں سے میل بڑھائے غیر فرقہ وارانہ جلسوں میں تقریریں کرے۔ عید بقرعید پر غیر مسلموں کو اپنے یہاں مدعو کرے، ہولی دیوالی پر دوسروں کے یہاں جا کر ان کی خوشی میں شریک ہو، وہ اپنا رشتہ حکومت سے بھی قائم کرے اور عوام سے بھی۔ حکومت کی ہر اچھی بات کو فراخ دلی سے سراہے، تائید کرے، حمایت کرے، تعاون کرے، فلاحی کاموں میں حکومت کا ہات بٹائے مگر حکومت کے غلط اقدام پر تنقید بھی کرے اور خیر خواہ بن کر اپنے فرقے کی درست اور جائز ترجمانی کرے، مسلم اقلیت کو یہ ذہن نشین کرادے کہ یہ ملک ہماری جنم بھومی ہے اور یہ حکومت قومی حکومت ہے جہاں تک زبان کا مسئلہ ہے سرسید نے

حاکموں کی زبان انگریزی کو مقدم سمجھا تھا چنانچہ آج کے سر سیّد کو چاہیئے کہ وہ آج کی سرکاری زبان ہندی کی حمایت کرے اور مسلمانوں کو تاکید کرے کہ وہ اس زبان میں زیادہ سے زیادہ کمال پیدا کریں۔ آج کا وہ مسلم قائد جو سر سید کی جگہ لے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلم اقلیت کے لئے ایک دس سالہ پلان بنائے اور طے کرے کہ اس مقررہ مدت میں کتنے مسلمان نوجوانوں کو انجینیئر، ڈاکٹر، پلیڈر، ٹیچر، لیکچرر، صنعت کار، تاجر، انگریزی اور ہندی کے صحافی، ادیب، مصنف بنانا ہے کتنے تعلیم یافتہ اور ذہین مسلم نوجوانوں کے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا ہے کتنے مسلمان لڑکوں کو ترقی یافتہ ممالک جاکر جدید علوم اور ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنا ہے اس مدت میں مسلمانوں کے لئے کتنے کارخانے کتنے مل اور کتنے بینک کھل جانے ہیں اور اسی مدت میں مسلم معاشرے کے برے رسم و رواج کو بھی ختم کرنا ہے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ممبر بنے مسلمانوں کی خدمت منسٹر یا عہدیدار رہ کر کی جا سکتی ہے ایوان میں پہونچ کر نہیں غرضیکہ آج کے سر سید کو ایک مسلم اقلیت کے لئے کئی محاذ پر کام کرنا ہوگا۔

مگر آج کے مسلمانوں میں جو بھی سر سید کی جگہ لے گا اسے پہلے ہی سے یہ جان لینا چاہیئے کہ اس کی قیادت سے جن نام نہاد مسلم لیڈروں کے مفاد پر ضرب پڑے گی وہ اسے حکومتِ وقت کا ایجنٹ اور ہندوؤں کے ہاتھ بکا ہوا کہیں گے مگر اسے اس تاریخی حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں جب بھی کسی نے اپنی قوم میں انقلاب لانا چاہا ہے اس نے اپنی ہی قوم سے پہلے گالیاں کھائی ہیں اور انہوں ہی کے ہاتھوں صدمے برداشت کئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غریب عوام روایت پرست اور امراء مفاد پرست ہوتے ہیں۔ عوام قوم کی خاطر اپنے اندھے عقیدوں اور فرسودہ رسم و رواج کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور امرا غریب عوام کے لئے اپنے مفاد کو ترک کرنا نہیں چاہتے اس لئے دعوتِ انقلاب قبول کرنے کے لئے مشکل ہی سے کوئی تیار ہو پاتا ہے اور الٹا یہ ہوتا ہے کہ داعیٔ انقلاب کے بانی کو قوم اپنا سب سے بڑا محسن تسلیم کر لیتی ہے مسلم قائد کی ضرورت کے تحت ۵۰ برس پہلے علامہ شبلی نے جو کہا تھا جو آج بھی حال کے مطابق ہے۔ ؎

گئے وہ دن کہ ہم محتاج تھے عبرت دلانے کے
ہمارا حال خود عبرت فزا ہے آج سرتاسر
گیا وہ وقت جب تھا بس اسی کا نام ہمدردی
کہ دو آنسو بہالیں قوم کی درماندہ حالت پر
ضرورت ہے اگر ہم کو تو بس ہے ان بزرگوں کی
کہ جن میں خیر سے کچھ کر دکھانے کے بھی ہوں جوہر
فقط باتیں ہی ہوں کچھ کام بھی بن آئے باتوں سے
کہیں جو کچھ وہ منہ سے کر دکھائیں اس سے کچھ بڑھ کر
نہیں گر یہ تو بس اک گرمیٔ صحبت کے ساماں ہیں
یہ قومی مرثیے، یہ وعظ، یہ اسپیچ، یہ لکچر
طلب اور سعی سے کچھ کام بن آئے تو بن آئے
فصاحت اور بلاغت کا بس اب چلتا نہیں منتر
تمہیں جو کام ہیں درپیش گو مشکل سے مشکل ہیں
مگر کرنے پہ آجاؤ تو آساں سے ہیں آساں تر

لیڈر کی پہچان

"بڑا آدمی وہ ہے، جس کی آواز سیکڑوں ہزاروں تک پہنچتی ہے، اور دنیا میں سب سے بڑا وہ ہے جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچتی ہے جس کا پیام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔

بابائے اردو
مولوی عبدالحق

ڈھونڈا ہے آسماں نے جنہیں خاک چھان کر
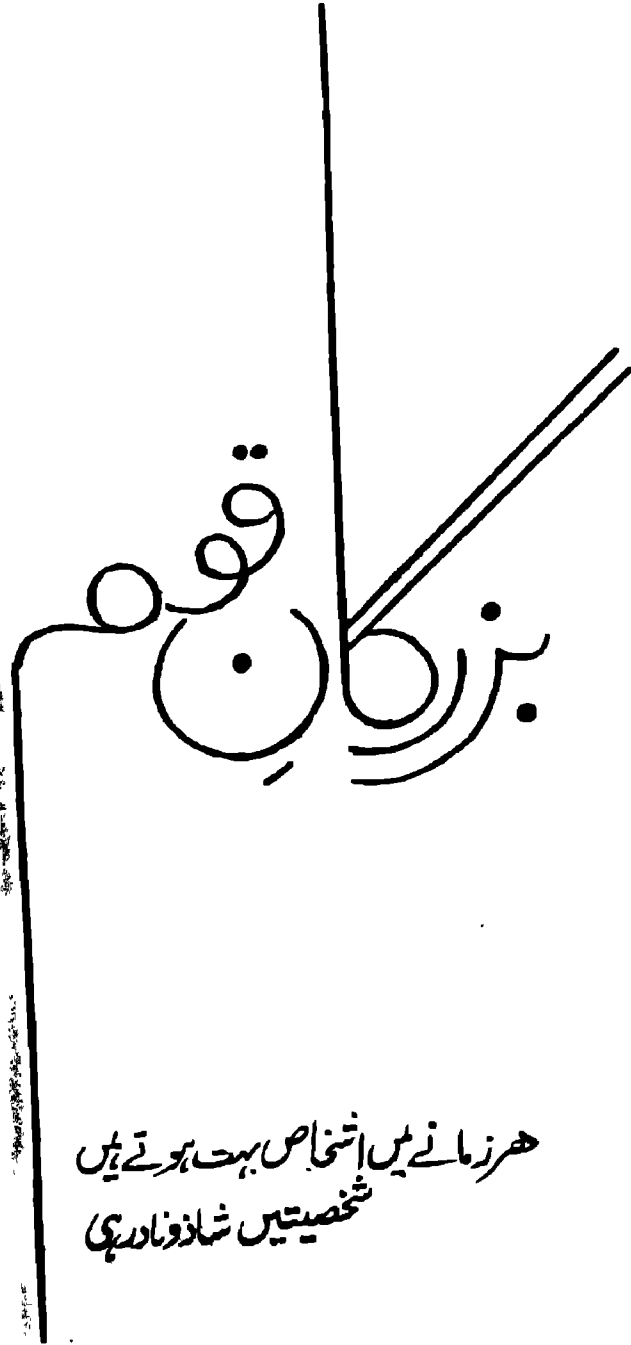
ہر زمانے میں اشخاص بہت ہوتے ہیں
شخصیتیں شاذ و نادر ہی

فلمساز اومی اروڑا
کی
ایک انتہائی جذباتی سنسنی خیز سوشل فلم
بدنام
بہن بھائی کے پاک رشتے کی جذباتی کہانی
ایثار و محبت، عزم و یقین کی داستان
ناظمہ — بلدیو کھوسا — ریتا — جے شری ٹی — لکشمی چھایا
کہانی — مکالمے — اسکرین پلے — گیت و سنگیت
چندر کانت کاکورکر — ایم جی حشمت — رام کیلکر — گنیش
ہدایت کار
دلیپ بوس
جاری کردہ: گیتا شری فلمز، بھارت نگر بمبئی-400007

بانیٔ اسلام

مکّے (عرب) کے قبیلۂ قریش کے ہاشمی خاندان میں 20 اپریل 571ء کو پیر کے دن حضرت محمدؐ پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ تھا اور والدہ کا آمنہ۔ حضرتؐ کی پیدائش سے قبل والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادا عبدالمطلب نے پوتے کا نام محمدؐ رکھا۔ محمدؐ جب 6 برس کے ہوئے تو والدہ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا اور پھر ایک برس بعد دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ چچا ابوطالب نے حضرت محمدؐ کی پرورش کی۔ بارہ برس ہی کی عمر سے چچا کے ہمراہ دور دور ملکوں میں جانے کا موقع ملا۔ اس طرح اُن کو عیسائی اور یہودی علماء کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مزاج، عادات اور طبیعت کے اعتبار سے محمدؐ ابتدا ہی سے دوسرے بچوں سے بہت مختلف تھے۔ کھیل کود سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بکریاں چراتے یا گھر پر رہتے، صبر و شکر کا جذبہ بھی زیادہ تھا۔ اور بت پرستی سے بھی کوئی رغبت نہیں تھی۔ 25 برس کی عمر میں خدیجہ نام کی ایک شریف اور متمول تاجر بیوہ خاتون سے شادی کی۔ پھر مکّے کے قریب غارِ حرا میں جا کر خدا کی عبادت کرنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت محمدؐ چالیس برس کے ہوئے تو 22 فروری 610ء کو آپ پر وحی نازل ہوئی اور آپ نے اپنی نبوت کا اعلان کیا اور اسی دن سے آپ نے تبلیغ شروع کر دی۔ قریش نے آپ کی سخت مخالفت کی۔ مخالفوں نے جسمانی تکلیفیں بھی پہنچائیں اور مال و دولت کا بھی لالچ دیا مگر محمدؐ نے اپنی راہ نہ بدلی۔ جب زیادہ رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں تو وہ 25 ستمبر 622ء کو مکّے سے مدینے ہجرت کر گئے اور وہاں تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ حضرت محمدؐ کی اس ہجرت سے سنہ ہجری کی ابتدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور مدینے کے مسلمانوں نے مکّے والوں سے کئی لڑائیاں لڑیں جن میں بدر اور اُحد اہم ہیں۔ آخر آنحضرتؐ نے 10 ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر مکّے پر چڑھائی کی اور مکّے کو فتح کر لیا۔ ہجرت کے دس برس بعد حضرت محمدؐ نے آخری حج کیا اور اس موقع پر اُنھوں نے جو خطبہ دیا وہ اسلام کی تعلیم کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔ حج کرنے کے دو مہینے بعد وہ بیمار ہوئے اور تیرہ دن بخار میں مبتلا رہ کر 63 برس کی عمر میں 27 مئی 632ء کو وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ حضرت آدم سے 6155 برس بعد اور حضرت ابراہیم سے 2½ ہزار برس بعد پیدا ہوئے تھے۔

حضرت محمدؐ نے جاہل اور جنگجو عربوں میں جس طرح تنظیم پیدا کی اور اُن کو انسانوں کی طرح رہنا سکھایا وہ تاریخ انسانی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

مولانا ابواَل کلام آزاد

نام محی اَلدین احمد، تاریخی نام فیروز بخت، کنیت ابواَل کلام اور تخلص آزاد۔ 11 نومبر 1888ء کو مکے کے محلے قدوہ متصل باب اسلام میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے مورثِ اعلیٰ شیخ بہلول دہلوی اکبر کے عہد میں علوم دینیہ اور فلسفے کے امام مانے جاتے تھے۔ دوسرے اسلاف میں شیخ جمال اَلدین (اکبر کے عہد میں) اور شیخ محمد (جہانگیر کے زمانے میں) مشاہیر علماء و صوفیہ میں شمار ہوتے تھے۔ اور اُن کے نانا مولوی منور اَلدین شاہ عالم اور اکبر ثانی کے دربار میں وزیر تعلیم تھے۔ دادا مولانا محمد ہادی دہلی کے ایک خاندانِ علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کی والدہ محدث شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی مدینہ کی بھانجی تھیں اور اُن کے والد مولوی خیر اَلدین قادری نقش بندی جید عالم، صوفی، مصنف اور مشہور پیر تھے۔ اور اُن کے لاکھوں مرید تھے۔ قصور (پنجاب) سے تعلق رکھتے تھے بعد میں دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ 1857ء میں دہلی کی تباہی سے دل برداشتہ ہو کر مکے چلے گئے جہاں اپنے مریدوں سے گیارہ لاکھ روپے فراہم کر کے نہر زبیدہ کی مرمت کرائی اور آخر اپنے مریدوں ہی کی خواہش پر 1898ء میں ہندوستان واپس ہوئے اور کلکتے میں سکونت اختیار کی۔ گھر ہی کی چار دیواری میں مولانا آزاد کی تعلیم شروع ہوئی۔ مولانا کی مادری زبان عربی تھی۔ عربی و فارسی کا چودہ برس کا پورا کورس (درس نظامی) انھوں نے صرف 4 برس میں مکمل کر لیا۔ دس گیارہ برس ہی کی عمر سے انھوں نے شعر و شاعری اور مضمون نگاری شروع کر دی تھی۔ اور 'مخزن'، 'خدنگِ نظر'، 'احسن اَل اخبار' اور 'تحفۂ احمدیہ' جیسے جرائد میں اُن کے مضامین چھپنے لگے تھے۔ 1903ء میں انھوں نے پہلی تقریر کی تھی۔ اور پھر 1904ء میں انھوں نے انجمن حمایتِ اسلام (لاہور) کے اجلاس میں خطبہ پڑھا تھا اور 'اَل مصباح' وہ پہلا (ہفت روزہ) اخبار تھا جو (1900ء کے آخری دنوں میں) مولانا نے ایڈیٹ کیا۔ 1902ء میں انھوں نے اپنا پہلا رسالہ 'لسان اَل صدق' جاری کیا۔ بعد میں وہ 'الندوہ'، 'وکیل' اور 'نیرنگِ عالم' کے بھی ایڈیٹر رہے۔ 1905ء میں مزید تعلیم کے لیے قاہرہ گئے۔ اور اَل ازہر یونیورسٹی میں درس لینے کے بعد 1907ء میں ہندوستان واپس آئے۔ 1909ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔

1912ء میں مولانا نے کلکتے سے ہفت روزہ اخبار 'اَل ہلال' جاری کیا۔ اس کا انداز نرالا اور مجتہدانہ تھا۔ اس اخبار کے بارے میں شیخ ہند مولانا محمود اَل حسن نے فرمایا تھا: 'ہم سب اصلی کام بھولے ہوئے تھے۔ 'اَل ہلال' نے یاد دلایا۔' اقبال کی 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بے خودی'، 'اَل ہلال' ہی کی صدائے بازگشت تھی۔ دو ہی برس میں 'اَل ہلال' کی تعدادِ اشاعت 25 ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ 1914ء میں حکومت نے 'اَل ہلال' کی ضمانت ضبط کر لی، مگر مولانا نے نام بدل کر (اَل بلاغ) اُسے جاری رکھا۔ 1915ء میں حکومت کا پھر عتاب نازل ہوا اور مولانا بنگال سے جلا وطن کر دیے گئے۔ اور پھر 1916ء میں رانچی (بہار) میں نظربند کر دیے گئے۔ 1920ء میں جب رہا ہوئے تو دہلی میں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اور کانگریس میں شامل ہو گئے۔ تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا، گرفتار ہوئے اور دو برس کے لیے قید کر دیے گئے۔ ایک برس قبل رہا ہوئے اور جمعیت علماء ہند کے لاہور کے اجلاس میں صدر منتخب ہوئے اور اسی اجلاس میں اُن کو امام اَل ہند تسلیم کیا گیا۔ ستمبر 1923ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس (دہلی) کے صدر منتخب ہوئے۔ 1925ء میں خلافت کمیٹی کے اجلاس (کان پور) کے بھی صدر رہے۔ 1930ء میں کانگریس کے قائم مقام صدر بنے، پھر گرفتار کر لیے گئے اور 1932ء تک جیل میں رہے۔ 1937ء میں کانگریس پارلیامنٹری سب کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔ 1940ء میں پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور 1946ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ حصولِ آزادی کے سارے مرحلے اُنہی کی قیادت میں طے ہوئے۔ یعنی کانگریس کے خصوصی ترجمان کی حیثیت سے 1942ء میں انھوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس سے بات چیت کی۔ 9 اگست 1942ء کی 'ہندوستان چھوڑو' تحریک کی تجویز بمبئی میں اُنھیں کی صدارت

میں کانگریس نے منظور کی اور اسی سلسلے میں وہ گرفتار ہوئے اور تین برس تک قید رہے۔ وہ قید ہی میں تھے کہ 1943ء میں اُن کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ 1945ء میں رہا ہوئے اور وائس رائے لارڈ ویول کی منعقد کی ہوئی شملا کانفرنس میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ 1946ء میں برتانوی کیبنیٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں شریک ہوئے۔ عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے ممبر بنے۔ آزادی حاصل ہونے پر 15 اگست 1947ء سے حکومت ہند کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ 1947ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس (لکھنؤ) کی صدارت کی۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پہلے عام انتخابات (1951ء) میں گوڑگاؤں کے حلقۂ انتخاب سے کام یاب ہوکر وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ 1955ء میں پارلیامنٹ میں دوبارہ کانگریس کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے۔ 1956ء میں یونیسکو کی 9 ویں کانفرنس (دہلی) کی صدارت کی۔ 1957ء کے عام چناؤ میں گوڑگاؤں کے حلقے سے پھر کام یاب ہوئے اور وزارتِ تعلیم کے عہدے پر برقرار رہے۔ 22 فروری 1958ء کو دہلی میں انتقال فرمایا۔

مولانا آزاد جامع صفات اور ہشت پہل نگینہ تھے۔ زبردست عالم، انشا پرداز، سیاست داں، بلند پایہ خطیب فارسی و عربی داں اور اردو میں ایک مخصوص طرز تحریر کے وہ موجد تھے۔ ادبِ عالیہ میں اُن کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے۔ اُن کی تصانیف میں "ترجمان القرآن" شاہکار ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی بلکل منفرد تفسیر ہے۔ اس کے ذریعے مولانا نے اسلام کی حقیقی تعلیم کو روایت سے ہٹ کر فطری اور عقلی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ 'غبارِ خاطر' مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے جو ادبیات کی دنیا میں بلکل نرالا ہے۔ مولانا کو تقلید سے نفرت تھی اُن کا خیال تھا کہ انسان کی ذہنی ترقی کی راہ میں تقلیدی عقائد رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں اور جو کچھ ہم پڑھ لیتے ہیں دنیا میں اس سے کہیں زیادہ کچھ موجود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابتدا میں وہ حکومت الٰہیہ کے حامی تھے مگر عملی سیاست میں ڈگمگن بکا اقتدار سے تانی مسلمان ...

آنے کے بعد وہ جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے ایک مستحکم ستون ثابت ہوئے۔ وہ سر سید احمد خاں کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں سے اس لئے ممتاز تھے کہ حق گوئی بے باکی اور جرأت میں کوئی سیاسی شخصیت اُن کے ہم پلّہ نہیں تھی۔ اُن کا ایک دماغ کئی سو دماغوں کا نچوڑ تھا۔ آج کی صدی میں اس دنیا میں مولانا سے بڑا مفکر پیدا نہیں ہوا۔ وہ اسلام کے مفکرِ عظیم تھے۔ دینی علوم پر اُن کی بڑی گہری نظر تھی۔

مگر اُن کے سلسلے میں مسلم لیگیوں نے بدویت اور بربریت کی ساری روایتیں دوہرادیں اور ہر مسلم لیگی مولانا آزاد کے سامنے ہمیشہ ابوجہل بن کر آیا۔ مسلمانوں نے جتنی گالیاں مولانا کو دی ہیں اسلام کی تاریخ میں شاید اتنی گالیاں کسی اور بھلے مسلمان کو نہیں دی گئیں۔ اسی بنا پر ایک بار حضرت شیخ عبدلقادر رائے پوری نے کہا تھا: "مسلمانوں نے حسین احمد اور ابوالکلام سے سبّ و شتم کا جو برتاؤ کیا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں حسین احمد کا تقوا اور ابوالکلام کا صبر انھیں لے نہ ڈوبے!" — اکثر مولوی ملّا اور مولانا عبدل ماجد دریا آبادی کی سی ہلکی طبیعتیں بھی مولانا سے حسد کا شکار رہی ہیں۔ لیکن 'الہلال' کے زمانے میں مولانا نے یہ عہد کیا تھا: "اگر کوئی مناظرانہ طرق پر میرے خلاف لکھے گا تو اس کو کبھی جواب نہیں دوں گا اور نہ اس کی تحریر سے اپنے نفس کو آلودہ کروں گا۔" مگر انسان تھے اور گوشت پوست کے بنے تھے اس لئے انھیں آخری دم تک یہ قلق رہا کہ وہ اس عہد و عمل کے آدمی نہ تھے۔

مولانا خوش پوش تھے۔ 1920ء سے کھدّر پہننا شروع کیا تھا اور جو وضع اپنالی تھی وہ آخر وقت تک برقرار رہی۔ خلوت پسند تھے اور سخت مزاج، عوامی انسان بلکل نہ تھے۔ سگریٹ نوش تھے اور مے نوش بھی مگر ملحوظ رہے کہ شراب بچّے کو شریر بناتی ہے، بے وقوف کو وحشی اور جی نیئس کے لیے آبِ حیات ہے۔ مولانا آزاد کی طبیعت میں استغنا، مزاج میں أنا اور چہرے پر بے نیازی آخر دم تک مسلط رہی۔ وہ پچھلی صدی کے عظیم مسلمان تھے۔

ابوالفضل

شیخ مبارک کا بیٹا فیضی کا بھائی ابوالفضل ۱۴ جنوری ۱۵۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اپنے بھائی فیضی کے ساتھ مغل بادشاہ اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی اور اپنے بہت سے حریفوں کو شکست دے کر اکبر کے وزیروں میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا۔

ابوالفضل کے باپ شیخ مبارک شیخ علائی کے مرید تھے علائی اپنے آپ کو مہدی کہتے تھے مسلمان علما کے حکم سے اُن کو سزا ہوئی مبارک علما سے بدظن ہو گئے۔ باپ کے نظریے کو فیضی اور ابوالفضل نے بھی قبول کیا۔ وہ بھی ملاؤں کے کٹرپن سے ہمیشہ بے زار رہے چناں چہ ابوالفضل نے ملاؤں کی اجارہ داری توڑنے اور اُن کی پیدا کی ہوئی رکاوٹوں کو ختم کرنے کے لئے اکبر کو ایک نئے مذہب کی تحریک شروع کرنے کا مشورہ دیا، اگرچہ تحریک ابوالفضل کی تھی مگر اکبر دین الٰہی کا بانی کہلایا۔

ابوالفضل عالم، دانش ور، مدبّر، سیاست داں، صلح کل پسند، مناظر، مردم و زمانہ شناس، زیرک اور آزاد مشرب انسان تھا۔ "آیت الکرسی" کی تفسیر لکھ کر اکبر کی قربت حاصل کی اور صرف ۳۲ برس ہی کی عمر میں اکبر کا وزیر اعظم بن گیا۔ مختلف مذاہب کے سلسلے میں اُس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مذہبی بحث و مباحثہ کے وقت وہ بڑے سے بڑے عالم کی پیش کی ہوئی دلیل رد کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا کرتا تھا "فلاں حلوائی، فلاں نانبائی یا فلاں جفت ساز کا قول ہمارے لئے حجت نہیں" غرضیکہ ملایانِ فرعون صفت کے لیے وہ موسیٰ ثابت ہوا۔ اِسی لئے عبداللہ ازبک کہا کرتا تھا: "میں اکبر کی تلوار سے اتنا خائف نہیں ہوں جتنا ابوالفضل کے قلم سے"۔ لیکن وہ بڑا قدر شناس بھی تھا، ادیبوں، شاعروں اور دوسرے فن کاروں کو دربار سے اکثر انعامات دلواتا تھا۔ اُس کی تصنیف "اکبرنامہ" اُس کا لازوال کارنامہ ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا اور جس میں عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ "اکبرنامہ" کا تیسرا حصہ "آئینِ اکبری" ہے جس سے اکبر کے نظم و نسق کا علم ہوتا ہے۔ چار ہزار فوج کے سپہ سالار ہونے کا مرتبہ بھی اسے حاصل تھا۔ چوں کہ ابوالفضل اکبر کے مزاج میں بے حد دخیل تھا اس لئے ولی عہد جہانگیر اُس سے بدظن تھا اور کہا جاتا ہے کہ ۱۶۰۲ء میں جب کہ وہ دکن کی ایک مہم سے واپس آرہا تھا جہانگیر کے اشارے سے ایک بندیلے نے اُسے قتل کردیا۔ گوالیار سے آٹھ دس میل کی دوری پر انتری میں اُس کی قبر موجود ہے جس پر ہر جمعرات کو لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ ابوالفضل ڈیل ڈول میں معتدل تھا مگر رنگ کالا تھا۔ وہ متین اور بُردبار تھا۔ اُس کے تین بیویاں تھیں، ایک ہندستانی، ایک کشمیرن اور ایک ایرانی۔

حکیم اجمل خاں

حکیم اجمل خاں ۱۱ فروری ۱۸۶۳ء کو پیدا ہوئے۔ حکیم صاحب کا خاندان صدیوں تک مغلیہ دربار سے وابستہ رہا۔ وہ انقلابی ذہن رکھتے تھے ان کی زندگی کے دو نصب العین تھے انگریز سے ہندستان کو آزاد کرانا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہم سب اِس ملک کے باشندے ہیں اِس لیے ایک قوم ہیں اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ قرآن و حدیث گائے کی قربانی کو ضروری قرار نہیں دیتے۔ اِس لیے محض ضد میں آکر گاؤکشی کا مرتکب ہونا اچھا فعل نہیں۔ وہ عورتوں کے پردے کے حامی نہیں تھے۔ انھوں نے مدرسہ طبیہ کے تحت ایک زنانہ شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ اِسی طرح انھوں نے طبیہ کالج میں یونانی اور ویدک طریقۂ علاج کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر فنی رواداری کے ساتھ ساتھ قومی وسعت نظری کا بھی ثبوت دیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ آخر عمر میں انھیں دو کاموں سے زیادہ لگاؤ رہا، طبیہ کالج کے ذریعے دیسی طب کو فروغ دینے کا کام اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرکے ہندستان کو آزاد کروانے کی کوشش۔ اگرچہ حکیم صاحب کی دہلی سے باہر جانے کی ایک ہزار روپے فیس تھی۔ مگر وہ غریبوں کا علاج مفت کرتے تھے اِسی لیے انھوں نے نظام حیدرآباد کا ملازم ہونا اور صرف ایک فرد کا پابند ہونا گوارا نہیں کیا۔ انھیں حکومت کی جانب سے 'حاذق الملک' کا خطاب اور قوم کی جانب سے 'مسیح الملک' کا اعزاز حاصل تھا۔ گاندھی جی انھیں 'خاموشی کا دیوتا'، جواہر لال نہرو اُن کو بے تاج

کا بادشاہ، اور لارڈ ہارڈنگ اُنھیں 'میگ نیٹ آف انڈیا' کہتے تھے اور دلّی کے عوام اُنھیں دلّی کی آبرو سمجھتے تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب تھے، اچھے خطیب تھے، شاعر تھے، شیدا تخلص فرماتے تھے اور جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی پہلی صف سے تعلق رکھتے تھے۔ 26 دسمبر 1927ء کو ان کا انتقال ہوا۔ حکیم صاحب دہلی کے طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ کے بانیوں میں سے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا 1863ء میں تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر، اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالحق تھا۔ بچپن میرٹھ میں گزرا۔ تعلیم میرٹھ، کان پور اور سہارن پور کے مدرسہ مظاہر علوم میں ہوئی۔ زندگی کا نصف دوم درس تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزرا۔ تھانہ بھون میں مولانا کی خانقاہ اُن کے آخری دم تک دینی علوم کا سرچشمہ بنی رہی۔

مولانا کا بچپن بڑی آسودگی سے گزرا، اُن کے والد گھی چپڑی روٹی شکر سے لگا کر اپنے ہاتھ سے اُن کو کھلایا کرتے تھے۔ مولانا جب کسی مٹھائی کی فرمائش کرتے تو اُن کے والد اتنی زیادہ مٹھائی منگواتے کہ مولانا کھاتے کھاتے سیر ہو جاتے۔ بچپن ہی میں ان کو ہزاروں روپے اپنے ہاتھ سے خرچ کرنے کا موقع ملا اور نتیجے میں اُن کے مزاج میں آسودگی پیدا ہو گئی اس لئے وہ زندگی میں نہ کسی دولت مند سے مرعوب ہوئے اور نہ کسی کی شان و شوکت نے اُن پر اثر ڈالا۔

مولانا اشرف علی کو دینی علوم پر عبور حاصل تھا اور خصوصی طور پر فقہی مسائل سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ بڑے اچھے واعظ تھے۔ اُن کی 800 تصانیف میں 'ترجمۂ قرآن' معیار کے اعتبار سے اور خواتین کی اصلاح سے متعلق 'بہشتی زیور' مقبولیت کے لحاظ سے قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ہندستان کے کئی ہزار مسلم علما میں سے وہ چند عالم جو تمام معاملاتِ زندگی میں احکامِ شریعت اور سنتِ نبوی پر چلے ہیں مولانا اشرف علی اُن میں سے ایک تھے۔ 20 جولائی 1943ء کو انھوں نے وفات پائی۔ انھوں نے اپنی کسی تصنیف کے حقوق اپنے نام محفوظ نہیں کئے۔ اُن کی طرف سے اجازت تھی کہ معاوضہ یا رائلٹی دیئے بغیر کوئی بھی اُن کی تصنیف شائع کر سکتا ہے۔ اُن کی دو بیویاں تھیں مگر اولاد کوئی نہیں تھی۔ طبیعت میں اس حد تک نفاست اور مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ اگر کسی کا ننگا پیٹ دیکھ لیتے تو فوراً قے ہو جاتی۔

احمد بخش گاما

احمد بخش گاما 1882ء میں امرت سر میں پیدا ہوئے۔ ریاست دتیا میں گاما کے باپ درباری پہلوان تھے مگر گاما چار ہی برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ چچا نے پرورش کی اور خاندانی فن کشتی ہی کی تعلیم دی۔ 1908ء میں گاما مہاراجہ پٹیالا کے درباری پہلوان مقرر ہوئے۔ گاما کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب لندن کے جان بُل کلب نے ورلڈ چیمپین شپ آف ریسلنگ کے لیے کشتیوں کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کیا تو 10 ستمبر 1910ء (سنیچر) کو لندن کے شیفرڈس بش اسٹیڈیم میں گاما کا مقابلہ روسی پہلوان زبسکو سے ہوا۔ تین گھنٹے تک دونوں نبرد آزما رہے آخر گاما کو فاتح قرار دیا گیا اور گاما کو رستمِ ہند سے رستمِ زماں بنا دیا گیا۔ اٹھارا برس بعد پھر گاما اور زبسکو کا مقابلہ ہندستان میں ہوا اور یہاں صرف ڈھائی سیکنڈ میں گاما نے زبسکو کو پچھاڑ دیا۔

گاما نے دو شادیاں کیں۔ پہلی سے 5 لڑکے پیدا ہوئے جو کم سنی ہی میں مر گئے، دوسری سے چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ گاما قطعی طور پر غیر تعلیم یافتہ تھے۔ وہ بمشکل تمام اپنا نام 'گاما' لکھ سکتے تھے۔ کسی نے اُن سے پوچھا تھا: 'آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟' 'پاکیزہ زندگی!' یہ اُن کا جواب تھا۔ وہ 23 مئی 1960ء کو اختلاجِ قلب میں مبتلا ہو کر لاہور میں انتہائی مفلسی کی حالت میں انتقال کر گئے۔

احمد رضا خاں بریلوی

روہیل کھنڈ کے مشہور مفتی، عالم و مصنف احمد رضا خاں (ولد مولوی نقی علی خاں ولد مولوی رضا علی خاں) 1855ء

میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ چار ہی برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر لیا اور پھر اپنے والد سے سارے علوم درسیہ حاصل کیے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے والد کے جانشین بنے اور فتوا نویسی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سید آل رسول مارہروی کے مرید ہونے کے بعد اور اُن سے سندِ حدیث لے کر اپنے والد کے ہم راہ مکے چلے گئے اور یہاں کے علما سے فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کا درس لیا

مولوی احمد رضا خاں مسلمانوں میں بریلوی مسلک کے بانی ہیں اور 75 سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

سید احمد شہید بریلوی

حضرت سید احمد 1786ء میں رائے بریلی (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے لیے شاہ عبدالعزیز کے پاس دہلی پہنچے۔ شاہ صاحب نے سید صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور روحانیت کے پیشِ نظر اُن کو طریقت کی تعلیم دی۔ تعلیم مکمل ہونے پر بڑے بڑے علما نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اُن میں مولانا اسماعیل شہید اور مولوی عبدالحیٔ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کچھ دن بعد مسلم عوام کی عقیدت اُن سے اتنی بڑھی کہ وہ جہاں جاتے مخلوق اُن پر ٹوٹ پڑتی اور کسی کا دوپٹا لے کر اُسے دست بدست دور تک پہنچا دیا جاتا۔ دوپٹے کا ایک سرا سید صاحب کے ہاتھ میں ہوتا اور اس طرح بیک وقت بہت سے لوگ دوپٹا پکڑ کر بیعت ہو جاتے۔ سید صاحب کا مسلک ہمہ گیر تھا۔ اہلِ سنت بھی اُس سے تعلق رکھتے تھے اور حدیث کو اپنا ماخذ ماننے والے بھی، حنفی بھی اور محمدی بھی۔ غرض کہ سید صاحب نے اپنی تعلیم سے عیاشی، لستہ بازی، شرک و بدعت کو بہت حد تک ختم کیا اور بہت سے قحبہ خانے توڑے۔ سید صاحب علمِ تصوف کے ساتھ فنِ سپہ گری کے بھی ماہر تھے۔

مغلیہ حکومت کے کم زور ہوتے ہی جب جلد صوبے آزاد ہونے لگے تو پنجاب میں بھی سکھوں (مہاراجا رنجیت سنگھ) کی حکومت قائم ہو گئی۔ انھوں نے مسلمانوں پر زیادتیاں شروع کر دیں۔ مسلمان مذہبی اور بنیادی حق (اذان دینے کی اجازت نہیں تھی، قرآن اور مسجدوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی) سے محروم کر دیے گئے۔ چناں چہ سید صاحب نے 1826ء میں ایک جمعیت کے ساتھ سکھوں پر جہاد کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ انگریزی سرکار غیر جانب دار بن گئی۔ حیدرآباد سندھ اور درۂ بولن کی راہ سے افغانستان میں داخل ہوئے اور پھر درہ خیبر سے گزر کر سید صاحب نے 21 دسمبر 1826ء کو پنجاب پر حملہ کیا۔ چار برس کی جنگ کے بعد جون 1830ء میں سید صاحب نے پشاور فتح کر لیا۔ شرعی احکام جاری کر دیے گئے۔ سرحدی مسلمانوں کو مذہبی آزادی دلانے میں 6 برس کی مدت صرف ہوئی اور جب تسلط قائم ہوا تو سید صاحب کے ساتھی اقتدار پرستی اور جاہ طلبی کی رقابتوں میں مبتلا ہو گئے اور آپس میں خوں ریزی ہونے لگی۔ سید صاحب نے بد دل ہو کر دسمبر 1830ء میں وہاں سے ہجرت کی۔ راہ میں سکھوں سے مڈبھیڑ ہوئی اور اُن کو شکست دے کر سید صاحب نے بالاکوٹ پر قبضہ بھی کر لیا مگر اس کے بعد سکھوں سے ایک دوسرے معرکے میں سید صاحب مئی 1831ء میں شہید ہو گئے۔ خلیفہ محمد اسماعیل بھی وہیں شہید ہوئے۔

آصف علی

1888ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کے اسٹیفنس کالج اور لندن لنکنس ان میں تعلیم پائی اور وہیں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینے کے سلسلے میں کئی بار جیل گئے۔ 20 برس تک دہلی کی میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ 1928ء میں الہ آباد کے ایک ہندو بنگالی خاندان کی خاتون ارونا گنگولی سے شادی کی۔ نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے سرگرم رکن اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے۔ 1935ء میں دہلی کے حلقے سے ہندو مسلمانوں کے مشترکہ ووٹوں سے بھاری اکثریت میں کام یاب ہو کر ایم۔ ایل۔ اے بنے۔ 1942ء سے 1945ء تک 'ہندستان چھوڑو' تحریک میں حصہ لینے کی بنا پر جیل میں رہے۔ اس تحریک کے بعد اُن میں اور ارونا میں ذہنی و نظریاتی اختلاف پیدا ہو گیا۔ 1946ء میں انگریزی حکومت کے عبوری دور میں، مرکزی حکومت میں وزیر ریلوے بنے۔ 1947ء میں امریکا میں ہندستان کے سفیر رہے۔ 1948ء سے 1952ء تک ریاست اُڑیسہ کے گورنر رہے۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی ہندستان کے سفیر

رہے۔ برن میں اپنے قیام کے دنوں میں اُس ہندستانی وفد کو جو یو۔
این۔ او۔ میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا، انھوں نے اکثر مفید مشورے دیے۔
دہلی میں 2 اپریل 1953ء کو اُن کا انتقال ہوا اور 7 اپریل 1953ء
کو دہلی میں نظام الدین اولیا کے قبرستان میں اُن کو دفن کیا گیا۔
اسمبلی بم کیس کے سلسلے میں مسٹر آصف علی نے شہید بھگت
سنگھ کی وکالت کی۔ آزاد ہند فوج کے قیدیوں کے مقدمے میں بھی وہ
وکیل تھے۔ اور پنجاب کے انگریز گورنر کو جب گولی سے مارا گیا تب بھی
وہ دفاعی وکیل بنے۔ شکار اور اسکیٹنگ اُن کے پسندیدہ شغل
تھے۔ وہ انگریزی زبان کے صحافی اور اردو زبان کے شاعر تھے اور
اُن کی آواز بڑی باریک تھی۔

آصف فیضی

آصف علی اصغر علی فیضی (اے۔ اے۔ اے۔ فیضی) ۱۰
اپریل 1899ء کو مہاراشٹر کے ہل اسٹیشن ماتھیران میں پیدا
ہوئے۔ اُن کی چچی بیگم جنجیرہ نے اُن کی پرورش کی۔ لندن کی کیمبرج
یونی ورسٹی میں تعلیم (ایم۔ اے۔، ایل ایل۔ بی) پائی۔ کیمبرج اور
میک گل یونی ورسٹی میں وہ کچھ عرصے وزٹنگ پروفیسر بھی رہے اور
وہ پہلے ہندستانی ہیں جنہیں وہاں ریسرچ کرنے کا موقع ملا۔ 1938ء
تک (12 برس تک) انھوں نے بمبئی میں بیرسٹری کی۔ بمبئی میں گورنمنٹ
کے لا کالج میں استاد رہے اور پھر اُسی کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے۔
1947ء میں بمبئی پبلک سروس کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے اور پھر 3
برس تک یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے۔ جموں و کشمیر یونی
ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ مصر میں ہندستان کے سفیر بنے
اور 1962ء میں اُن کو کامن ویلتھ فیلوشپ ملا۔ اب تک یہ اعزاز
صرف چار اشخاص کو ملا ہے۔ اور نٹیل ریسرچ کے سلسلے میں بمبئی
کی ایشیاٹک سوسائٹی کی جانب سے اُن کو سلور میڈل عطا ہو چکا
ہے۔ وہ آج بھی قاہرہ اور دمشق کی عربک اکاڈمی کے آنریری ممبر ہیں۔
آصف فیضی دنیا کے بڑے بڑے رسائل میں تقریباً ۹۰
مضامین لکھ چکے ہیں۔ وہ 15 کتابوں کے مصنف ہیں جن میں
"آؤٹ لائنز آف محمڈن لا" اہم ہے۔ اسلامک لا پر اُن کی کئی
کتابیں ہارورڈ یونی ورسٹی اور مغربی ممالک کی دوسری کئی یونی ورسٹیوں
کے نصاب میں شامل ہیں۔ بین الاقوامی طور پر اسلامک لا میں وہ
ایک مستند عالم مانے جاتے ہیں اور وہ دنیائے اسلام کے چند بڑے
عالموں میں سے ایک ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے اُن کو پدم بھوشن
کا اعزاز مل چکا ہے۔ وہ پائپ نوش ہیں۔

آغا حشر کشمیری

آغا کے والد کشمیری شالوں کی تجارت کرتے تھے بعد
میں بنارس جا کر آباد ہو گئے۔ آغا محمد شاہ حشر کشمیری امرت
سر میں 3 اپریل 1879ء کو پیدا ہوئے۔ آغا صاحب کی
ابتدائی تعلیم بنارس میں ہوئی۔ والد چاہتے تھے کہ بیٹا دینی تعلیم
حاصل کرنے کے بعد اُن کے ساتھ تجارت ہی میں لگ جائے۔
1896ء میں جب وہ 17 برس کے تھے، بمبئی سے پارسی الفریڈ
تھیٹریکل کمپنی بنارس پہنچی۔ انھوں نے جب اس کے تماشے دیکھے
تو ڈرامے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُن کی پہلی ڈرامائی تصنیف
(1897ء) "آفتاب محبت" تھی جسے بنارس کے ایک کتب
فروش نے ۵/ روپے میں خرید کر شائع کیا۔ 1901ء میں گھر
بار چھوڑ کر بمبئی آ گئے اور کاؤس جی کھٹاؤ کی کمپنی الفریڈ تھیٹر میں
4/ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ اُن کا پہلا ڈراما جو اسٹیج
ہوا وہ "مرید شک" تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں تقریباً ساڑھے
تین درجن ڈرامے تصنیف کیے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے ترجمہ کرنے
میں وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔ اسی لئے انھیں انڈین
شیکسپیئر کہا گیا۔ اُن کے جن ڈراموں کو زیادہ مقبولیت حاصل
ہوئی وہ یہ ہیں: "پہلا پیار"، "یہودی کی لڑکی"، "رستم و
سہراب"، "سلور کنگ"، "سیتا بن باس"، "خون کا خون"،
"پاک دامن"۔ حشر نے اپنی ایک تھیٹریکل کمپنی بھی کھولی مگر
نقصان کے باعث بند ہو گئی۔ حشر نے اگرچہ باقاعدہ تعلیم حاصل
نہیں کی تھی مگر جیسے جیسے ضرورت پیش آتی گئی وہ ہندی، فارسی
سنسکرت اور انگریزی سیکھتے گئے۔ انھوں نے نہ صرف اردو ڈرامے
لکھے بلکہ ہندی دھارمک ڈرامے بھی لکھ کر کامیابی حاصل کی۔

حشر کی شخصیت متضاد خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ ڈراما نویس تھے، شاعر تھے، ادیب، خطیب، واعظ تھے اور کامیاب مقرر اور مناظر تھے اور میلاد خوب پڑھتے تھے مگر متعصب نہیں تھے۔ ہر مذہب کی بنیادی باتوں سے واقف تھے اور ہر مذہب کا احترام کرتے تھے۔ بیوی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ خدا اور رسالت سے بے حد ڈرتے تھے۔ ایک بار افریقا کی ایک تھیٹر کمپنی نے ایک برس کے لیے 8 لاکھ روپے کی پیش کش کی تھی، انھوں نے جانا بھی چاہا مگر ماں نے اجازت نہیں دی چنانچہ نہیں گئے۔ اُن کو طوائف سے بھی نفرت تھی۔ انھوں نے اپنے ڈرامے میں جب بھی طوائف کا کردار پیش کیا اُس کو سماج کا ناسور ثابت کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ بے تحاشہ فضول خرچ تھے شراب روزانہ پیتے تھے۔ ہر بات پر گالی بکتے تھے۔ تھیٹر ایکٹریس مختار بیگم کو اپنی داشتہ بنائے ہوئے تھے، اُس کو بہت چاہتے تھے مگر گالی اس کو بھی دیتے تھے۔

دراصل اُردو اسٹیج کا سب سے اہم واقعہ آغا حشر کا ظہور ہے اُردو کے اسٹیجی ڈراموں کے سلسلے میں جو مقبولیت اور شہرت حشر کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہیں ہوئی وہ 14/- روپے ماہوار پر ملازم ہوئے اور انھوں نے 5 ہزار روپے ماہوار تک تنخواہ پائی۔ حشر ایک آنکھ سے ڈھیرا تے تھے ۔۔۔ 1935ء میں جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے میں ڈوم ڈھاڑی قسم کے بازاری لوگ زیادہ تھے شریف اور پڑھے لکھے کم۔ اُن کو جب میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا تو مختار بیگم دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور ان کی قبر سے لپٹ کر کہنے لگی، "آغا جی! تم چلے گئے اب میں کس سے لپٹوں گی!"

اور تھوڑے ہی دن بعد مختار نے قمر الزماں نام کے ایک نوجوان سے بیاہ رچالیا۔

سر آغا خاں

سلطان محمد شاہ آغا خاں 2 نومبر 1877ء کو ٹھیکری (کراچی) میں پیدا ہوئے اور 18 اگست 1885ء کو وہ اپنے اسماعیلیہ فرقے کے امام حاضر مقرر ہوئے۔ 1902ء میں انھوں نے شاہ برطانیہ ایڈورڈ ہفتم کے جشنِ تاج پوشی میں شرکت کی اور 1903ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل آف انڈیا کے ممبر مقرر ہوئے۔ سر سید احمد خاں کی ترغیب پر وہ ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں داخل ہوئے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ریسپشن کمیٹی کے چیرمین مقرر کیے گئے اور 1909ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دہلی اجلاس میں صدر منتخب کیے گئے۔ 1911ء میں انھوں نے الہ آباد میں ہندو مسلم یونٹی کانفرنس منعقد کی اور 30 لاکھ روپے علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کے لیے جمع کیے۔ 1921ء میں مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ 1928ء میں جو آل انڈیا آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی انھوں نے اُس کی صدارت کی۔ 1930ء سے 31ء میں برٹش انڈین ڈیلی گیشن کے چیرمین کی حیثیت سے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن میں شرکت کی۔ 1932ء میں ورلڈ ڈس آرمامینٹ کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔ 1932ء سے 1937ء تک وہ لیگ آف نیشنز میں ہندوستانی وفد کے لیڈر رہے اور 1937ء میں وہ لیگ آف نیشنز کی اسمبلی کے صدر بن گئے۔ جارج ششم کے جشنِ تاج پوشی میں وہ برطانوی ہندوستان کی جانب سے نمائندۂ اول کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

آغا خاں کو عالمی شہرت حاصل تھی اور حکومت برطانیہ کی جانب سے اُن کو "سر"، "ہز ہائی نس"، "کے سی آئی ای"، "جی سی آئی ای"، "جی سی ایس آئی"، "جی سی وی او"، "پی سی"، ایل ایل ڈی (کینٹب) جیسے خطابات اور اعزازات بھی ملے تھے۔ انگریز حکومت نے اُن کو گیارہ توپوں کی سلامی کا بھی مرتبہ عطا کیا تھا۔ آغا خاں نے اپنے عہد میں اپنی سربراہی کی تین جوبلیاں منائیں۔ تیسری جوبلی (ڈائی منڈ) کے موقعے پر وہ ہیروں میں تولے گئے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں چار شادیاں کیں۔ اُن کی پہلی بیوی (شاہ زادی بیگم) اُنھی کے خاندان کی تھیں، دوسری (شاہ زادی کتیرلسی) اٹلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان ہی کے

بطن سے پرنس علی خاں پیدا ہوئے تھے، تیسری (انڈری کیرن) فرانسیسی نژاد تھیں جن سے صدرالدین پیدا ہوئے تھے۔ انڈری کیرن کو بعد میں آغا خاں نے طلاق دے دی تھی اور جو تھی (لا براڈ سے) بھی فرانسیسی خاتون تھیں اور جن کو "ماتا سلامت" کہا جاتا تھا۔

آغا خاں اپنے اعلا نسل کے ریس کے گھوڑوں کی بنا پر بھی شہرت ہو رہے۔ انھوں نے زندگی میں تین بار ڈربی جیتی۔ دنیا کے مال دار ترین لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے ماننے والوں کی تعداد انہی کے عہد میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ انھوں نے جولائی 1957ء میں وفات پائی۔ اُن کے بعد اُن کے پوتے پرنس کریم خاں اسماعیلیہ مسلم فرقے کے 49 ویں امام مقرر ہوئے۔

اکبر

اکبر ولد ہمایوں ولد بابر ولد عمر شیخ مرزا، ولد ابو سعید مرزا، ولد سلطان محمد مرزا، ولد میران شاہ، ولد امیر تیمور ــــ ہمایوں جب واپس ایران جا رہا تھا تو [illegible] 2 [illegible] میں عمر کوٹ سندھ میں [illegible] بانو کے بطن سے جلال الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں جو خود نجوم کا ماہر تھا، بیٹے کا زائچہ دیکھتا تو خوشی سے اُچھلتا کودتا، تالیاں بجاتا اور کہتا کہ اس بچے کا زائچہ تو امیر تیمور کے زائچہ پر بھی فائق ہے۔ اکبر ۴ برس ۴ مہینے اور ۴ دن کا جب ہوا تو ہمایوں نے بسم اللہ کرائی۔ ملا عصام الدین ابراہیم استاد مقرر ہوئے۔ مگر کافی دن گزر گئے اکبر نے کچھ نہ پڑھا، کبوتر بازی میں لگا رہا۔ ہمایوں نے پھر ملا بایزید، ملا عبدالقادر، ملا پیر محمد، میر عبداللطیف اور شیخ مبارک کو یکے بعد دیگرے موقع دیا کہ وہ اکبر کو لکھنا پڑھنا سکھائیں مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ بیرم خاں اکبر کو امورِ سلطنت سکھانے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ ہمایوں کے انتقال کے وقت اکبر صرف 13 برس کا تھا چنانچہ بیرم خاں ہی نے حکومت کا کام سنبھالا۔ البتہ اکبر کو اپنی حکومت کو مستحکم بنانے میں 19 برس لگے اور اس نے اپنی حکومت کو ہندوکش سے گوداوری اور بنگال سے گجرات تک پھیلا دیا۔ علمائے اسلام کی دنیاداری، اجارہ داری اور جاہ پرستی کی بنا پر وہ ہمیشہ اُن سے متنفر رہا۔ اکبر نے صلح کل اور کامیاب پولیٹکل حکمراں کی حیثیت سے اُس نے اپنے وزیر ابوالفضل کی تجویز پر

گگن کا ہت ستانی مـ [illegible]

دینِ الٰہی جیسے ایک سیکولر مذہب کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اکبر غیر تعلیم یافتہ تھا مگر وہ عقل کو اعتقاد کا غلام بنانے کا قائل نہ تھا۔ اسی لئے اس کو معراج اور معجزوں پر یقین نہ تھا۔ وہ ایک آزاد مشرب انسان تھا۔

اکبر نے ہندوؤں سے جزیہ اور ہندو یاتریوں سے ٹیکس لینا بند کر دیا تھا۔ دربار میں سجدہ کرنے کے رواج کو بھی ختم کر دیا تھا۔ اس نے بہت سی مذہبی اور کلاسیکی کتابوں کے فارسی ترجمے کرائے، اُس نے فارسی زبان کو ہندوستانی رنگ دیا اور عربی کو بھی اُس نے ہندوی بنا دیا یعنی اس نے ث، ص، [illegible] جیسے عربی حروف کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا۔ وہ "عبداللہ" کو "ابداللہ" لکھنے کے حق میں تھا۔ اُس نے فقہ جیسے [illegible] علم کی تعلیم کو بڑھاوا دینا پسند نہیں کیا بلکہ اس نے وقت اور ضرورت کے مطابق حکمت، طب، ریاضی، تاریخ اور داستان نویسی کی تحصیل کو ضروری سمجھا۔ اُس کا طرزِ نظام قطعی طور پر سیکولر تھا۔ اور اس کی اسی سیکولرزم نے اُس کو رواداری کا یہ سبق دیا تھا کہ وہ اپنی [illegible] کا بھی خیال [illegible] اور حقہ نہیں کھاتا تھا اور اس کی گوشت خوری بھی برس میں صرف تین چار مہینے رہتی تھی۔

اکبر نے 64 برس کی عمر میں 1605ء میں وفات پائی۔ یہ ایک بڑا اتفاق ہوا کہ اس کے تینوں بیٹے مراد، دانیال اور جہانگیر اُس کے [illegible] وارث ثابت ہوئے۔

اکبر کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ اُس کے دربار میں مختلف ممالک کے گویّے موجود تھے جن میں 36 گویّے تو بہت ہی اہم تھے۔ اکبر خود بھی گویّا تھا اور نقارہ بجانے میں ماہر تھا۔ البرشاعر بھی تھا۔ اور فارسی میں شعر لکھتا تھا۔ وہ بہادر، جنگ جو اور ہوشیار سپہ سالار تھا۔ میلوں پیدل چلتا تھا۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈالنا اُسے پسند تھا۔ دلیر ہونے کے باوجود منصف ورحم دل تھا۔ اکثر شگفتہ رہتا تھا، پُر شکوہ اور باوقار حاکم تھا۔ مگر مزاج سادہ پایا تھا۔ اکثر تخت سے اتر کر نیچے فرش پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ غریبوں سے گھل مل کر باتیں کرتا تھا۔ اُس کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اُس نے ہزاروں ہاتھی، گھوڑے، شیر، چیتے، بیل، گائیں پال رکھی تھیں۔ ہرن، کبوتر، باز، بہری وغیرہ پال رکھے تھے اور اُن کے پیارے پیارے نام رکھ چھوڑے تھے اور ہر ایک کو اُس کے نام سے پکارتا تھا۔ شکار کھیلتا تھا مگر شکار کو بُتوں کا شغل بھی کہتا تھا۔ اگرچہ

خدا نے کئی شادیاں کی تھیں مگر وہ عام مرد کے لئے بیک وقت، کئی بیویاں پسند نہیں کرتا تھا اور نہ مہر کے لئے وہ بڑی رقم پسند کرتا تھا۔ کم خوراک تھا، ایک وقت کھانا کھاتا تھا اور رات میں وہ صرف تین گھنٹے سوتا تھا۔ کبھی کبھی بھیس بدل کر میلا دیکھنے بھی چلا جاتا تھا۔

اکبر کی کئی ایجادات قابلِ ذکر ہیں۔ اس نے ہاتھی پکڑنے کا ایک آسان طریقہ ایجاد کیا۔ پولو کے لیے ایک روشن گیند ایجاد کی تاکہ شام گزر نے پر رات میں بھی کھیل جاری رہے۔ چار ایوان کے نام سے بحث و مباحثے کے لئے علماء دین کی ایک انجمن قائم کی۔ اوقات کو تقسیم کیا یعنی معمولات کو گھڑیوں میں بانٹ دیا۔ گنگ محل کے نام سے بچوں کا ایک گھر بنایا یہ جاننے کے لئے کہ بچے کی زبان سے پہلا کلمہ کیا نکلتا ہے اور وہ اپنے مذہب کا کس طرح اعلان کرتا ہے۔ ترکستان کی نقل میں مینا بازار کی بھی اس نے ابتدا کی۔ مردم شماری شروع کروائی۔ بڑے بڑے شہروں میں ہندو مسلمانوں کے لیے قیام گاہیں بنوائیں مسلمانوں کی قیام گاہ کا نام خیر پورہ اور ہندوؤں کی قیام گاہ کو دھرم پورے کا نام دیا گیا۔ کشمیر کی جھیلوں کے لیے ہاؤس بوٹ بھی اکبر ہی کی ایجاد ہے اس نے ایک جہاز بھی بنوایا تھا جو دریائے راوی میں تیرتا تھا۔ اکبر جوتے کو بھی چرن داس کہتا تھا۔

علوم و فنون کی سرپرستی کرنے اور اپنی حکومت کے مثالی نظم و نسق کی بنا پر اکبر کا شمار دنیا کے چند بڑے مطلق العنان حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ ہندستانی قوم اکبر جیسے سیکولر حکمراں، کبیر جیسے سچے صوفی اور غالب جیسے آفاقی شاعر پر فخر کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال 9 نومبر 1877ء (جمعہ) کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن موضع چکو، پرگنہ ادون (تحصیل کول گام، کشمیر) تھا۔ آباو اجداد براہمن تھے اور گوت کے اعتبار سے سپرو تھے۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال نے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ سیالکوٹ سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اقبال لاہور آ گئے اور 1899ء میں یہاں سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ 1905ء میں لندن گئے اور کیمبرج یونی ورسٹی سے بی۔ اے کیا اور پھر 1907ء میں جرمنی چلے گئے اور وہاں کی میونخ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی۔ 1908ء میں لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1903ء میں اقبال لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ اور وہ لندن یونی ورسٹی میں بھی چھ مہینے تک عربی کے پروفیسر رہے۔ ہندستان واپس آنے کے بعد 22 اکتوبر 1908ء سے انھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کی۔ 1911ء میں وہ پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

شعر و سخن کی جانب اقبال کا رجحان ابتدا ہی سے تھا اس لیے داغ کے شاگرد ہے اور 1896ء میں پہلی بار لاہور کے ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ 1915ء میں لاہور سے "اسرارِ خودی" کی اشاعت ہوئی اور 1924ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام 'بانگِ درا' شائع ہوا۔ اقبال پنجاب اور الہ آباد یونی ورسٹیوں میں کے عربی اور فلسفے کے امتحانات کے ممتحن بھی رہے۔ انگریزی میں چھوٹی چھوٹی تصانیف کے ساتھ ساتھ انہوں نے 'فلسفۂ ایران' کے موضوع پر ایک مفصل رسالہ بھی لکھا۔ لندن کے قیام میں اقبال نے پین اسلامک سوسائٹی کے جلسوں میں شرکت کی اور بہت اثر لیا۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبت نے بھی اقبال کے جذبۂ قوم پرستی کو جذبۂ فرقہ پرستی سے بدل دیا۔ چنانچہ انگریز حکومت اُن پر مہربان ہونے لگی۔ پہلی جنوری 1923ء کو اُن کو 'سر' کا خطاب ملا۔ 1926ء سے 1929ء تک وہ پنجاب مجلس لیجسلیٹو کے ممبر رہے اور 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ (الہ آباد) کے صدر منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کے اسی اجلاس میں خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ اکثریت کے صوبوں میں ایک آزاد حکومت کا نظریہ پیش کیا گویا پاکستان کا یہ پہلا مطالبہ تھا۔ 1931ء میں انھوں نے مؤتمر عالم اسلامی (فلسطین) میں۔ ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس (لندن) میں اور 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اور 1933ء میں وہ روم میں مسولینی سے بھی ملے۔ دسمبر 1933ء میں لاہور کی پنجاب یونی ورسٹی

نے انھیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔

9 نومبر 1914ء کو اقبال کی والدہ امام بی بی کا انتقال سیالکوٹ میں ہوا اور ان کے والد نے 17 اگست 1930ء کو وفات پائی۔ اقبال نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی مختار بیگم 21 اکتوبر 1924ء کو اور دوسری بیوی سردار بیگم (والدہ جاوید) 1935ء میں انتقال کر گئیں۔ جنوری 1934ء سے اقبال کی علالت شروع ہوئی جب کہ عید کی نماز کے بعد انھوں نے گرم سویاں دہی میں ملا کر کھائیں۔ نزلہ اور کھانسی کے بعد دمے کا مرض لاحق ہو گیا۔ اور آخر ایک طویل علالت کے بعد 21 اپریل 1938ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ موتیا بند سے اُن کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔

اقبال کی شاعری کو تین زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا زمانہ وطن پرستی، دوسرا تصوف، اور تیسرا فرقہ پرستی ۔۔ مگر اقبال اردو زبان کے صف اول کے شاعر ہیں۔ اُن کی تصانیف میں "اسرار خودی"، "الوار بے خودی"، "ارمغان حجاز"، "جاوید نامہ" "پیام مشرق"، اور "زبور عجم"، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اقبال تخلیہ پسند تھے اور انتہائی سخت مزاج تھے۔ حقہ نوشی اُن کا محبوب شغل تھا۔ اپنا کلام سنانے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے تھے مگر مشاعروں میں اپنا کلام ترنم سے سناتے تھے۔ نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال سے اُن کو 500 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

امیر خسرو

وصال 18 شوال 725ھ کو دہلی میں ہوا۔ پیدائش کے سنہ میں اختلاف ہے 652ھ (1253ء) کے لگ بھگ سمجھیے۔ جنم بھومی ہندوستان۔ پٹیالی ضلع ایٹہ یو پی۔ مکمل نام خسرو ابوالحسن بن امیر سیف الدین محمود شمسی تھا۔ شاعر، ادیب، موسیقار، موجد، سپاہی، درباری، فقیر۔ حضرت امیر خسرو سب کچھ تھے بقول مولانا شبلی پچھلے سات سو برس میں ہندوستان نے ان جیسا جامع کمالات آدمی اور کوئی پیدا نہیں کیا۔

باپ دادا ترک تھے۔ ننھیال ہندوستانی۔ ہندوستان اور ہندوستانیت سے انھیں جو عشق تھا وہ شاید ماں کا ورثہ تھا کہ ہر کی تو وہ پیر نے پوری کر دی جو پریم کی مورت تھے اور کسی کو پرایا اور غیر سمجھنا اُن کے ہاں جائز ہی نہ تھا۔ روایت ہے کہ حضرت امیر خسرو نو برس کی عمر میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہوئے تھے۔ شعر اس سے بھی پہلے سے کہتے تھے۔ علم و فضل اور شعر گوئی نے انھیں کم عمری ہی میں سلطان بلبن کے لائق ولی عہد شہزادہ محمد خاں کے دربار میں پہنچا دیا اور اس کے بعد سلطان محمد تغلق تک ہر بادشاہ نے ان کی قدردانی کا حق ادا کیا۔ لیکن امیر خسرو نے عجیب طبیعت پائی تھی۔ دن دربار میں گزرتا تھا تو رات فقیر کی چوکھٹ پر گزرتی تھی۔ سرکاری نوکری قصیدے لکھواتی تھی تو درویشی کی خودداری اشعار میں برملا یہ اعلان بھی کراتی تھی کہ بادشاہوں کی تعریف کرنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے حق کی خاطر دربار میں جان تک کی پروا نہ کی۔

حضرت امیر خسرو بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ اہل ایران ان کے سوا اور کسی ہندوستانی کی فارسی دانی کے آج تک قائل نہیں ہیں۔ حضرت امیر خسرو کا سب سے بڑا کارنامہ شاید یہ ہے کہ انھوں نے مختلف دیسی اور بدیسی زبانوں کے الفاظ ملا کر ایک نئی زبان ایجاد کی۔ وہ اس کو "ہندوی" کہتے تھے۔ اردو اور ہندی اسی "ہندوی" کے سنورے ہوئے دو روپ ہیں۔ موسیقی میں بھی بہت سے راگ راگنیاں اور ساز خاص حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔ نثر میں غیر منقوط عبارت ان کا کمال ہے۔ عام پسند ایجادات میں دو سخنے، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے، پہیلیاں، وغیرہ بھی انھیں کی دین ہیں۔ نظم و نثر میں وہ ہر صنف سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔

حضرت امیر خسرو کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ہندوستان اور ہندوستانیت کے حسن سے آگاہ کیا گل و بلبل، دجلہ و جیحوں کی روایات کی جگہ کوئل اور پپیہے، چمپا اور چنبیلی، گنگا جمنا کے ذکر کی بنیاد ڈالی۔ ہر دیسی چیز کا بدیسی سے مقابلہ کر کے دیسی کو بہتر بتلایا۔ حد ہے کہ ستی اور بت پرستی تک کے بارے میں کہا کہ محض ان کے بُرے پہلو کو نہ دیکھو۔ اچھے پہلو پر بھی نظر ڈالو اور وفاداری عقیدت گزاری کے سبق لو۔ انھوں نے مسلمانوں میں ہندوستان کے موسمی تیوہاروں کو بھی مقبول بنایا۔ چنانچہ انہی کی

وجہ سے آج بسنت کا موسمی تیوہار ہندستان اور پاکستان کی تقریباً سب چشتی درگاہوں میں منایا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ کلام اور راگ راگنیاں گائے جاتے ہیں جو حضرت امیر خسرو نے خاص اسی موقع کے لیے تصنیف کیے تھے۔

ملا جامی نے حضرت امیر خسرو کی ۹۹ تصنیفات بیان کی ہیں مگر افسوس کہ ان میں سے بہت سی آج کل نایاب ہیں۔ ان کا ہندوی کلام بھی بہت کم محفوظ رہا ہے اور فارسی کلام کو ایڈٹ کرنے اور شائع کرنے کا بھی کوئی خاص اہتمام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ ہندستان سمٹ رہا ہے، ہندستانیت بکھر رہی ہے اور سمیٹنے والے، ایک کرنے والے کی طرف سے ہم بالکل غافل ہیں۔

حضرت امیر خسرو کا آخری کلام ایک ہندی دوہا ہے۔ ان کے پیر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا وصال ہوا تو وہ بادشاہ کے ساتھ بنگال میں تھے۔ پیر کی سناونی سنی تو دیوانوں کی سی حالت ہو گئی کپڑے پھاڑتے، آنسو بہاتے دہلی پہنچے۔ دوسرے پیر کے مزار کو دیکھ کر یہ دوہا کہا اور اسی دن جان دے دی۔

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارو کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چودیس

محبوب سیج پر سو رہا ہے اور چہرے پر گیسو بکھرے ہیں۔ چل خسرو! تو بھی اپنے گھر چل۔ چاروں طرف رات چھا گئی ہے!

(خواجہ حسن ثانی نظامی)

امیر علی

امیر علی 6 اپریل 1849ء کو ولندیزوں کی بستی چنسرا (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ ان کا شجرۂ نسب حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے۔ امیر علی کے والد سید سعادت علی خاں نے انھیں ہگلی کالج میں داخل کرایا جہاں سے انھوں نے ایم۔ اے۔ (تاریخ اور اقتصادیات میں) اور بی۔ ایل۔ کیا اور پھر وہ کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے مگر تھوڑے ہی دن بعد حکومت ہند کے وظیفہ پر قانون کی مزید تعلیم کے لئے وہ ولایت چلے گئے۔ ہندستان کے وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے ولایت جا کر قانون کی تعلیم حاصل کی۔ 1873ء میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور پھر کلکتے میں پریکٹس کرنے لگے۔ 1874ء میں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ 1875ء میں انھیں کلکتے کے پریسیڈنسی کالج میں اسلامی شریعت کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ 1876ء میں انھوں نے مرکزی قومی اسلامی انجمن قائم کی اور 25 برس تک اس کے صدر رہے۔ اس انجمن کے ذریعے وہ مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے سہولتیں دلوانے کی کوشش کرتے تھے۔ 1876ء سے 1904ء تک وہ ہگلی کی امام باڑا کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ 1878ء میں وہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ بھی بنا دیے گئے مگر انھوں نے سرکاری ملازمت پر اپنی وکالت کو ترجیح دی اور ملازمت ترک کر کے اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ 1883ء تک وہ صوبہ بنگال کی قانونی کونسل کے ممبر رہے پھر وہ وائسرائے لارڈ رپن کی قانونی کونسل میں بھی مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر رہے 1887ء میں انھیں سی آئی ای کا خطاب دیا گیا۔ 1890ء میں وہ کلکتے کی ہائی کورٹ کے جج مقرر کیے گئے۔ سید محمود (سر سید احمد خاں کے لڑکے) پہلے مسلمان تھے جو (الہ آباد ہائی کورٹ) جج بنے اور امیر علی دوسرے مسلمان کہ جن کو یہ عہدہ ملا۔ 14 برس تک ججی کے عہدے پر فائز رہ کر جب انھوں نے پنشن پائی تو وہ انگلستان چلے گئے اور برک شائر میں اپنا مکان بنا کر وہیں سکونت اختیار کر لی مگر وہاں بھی انھوں نے ہندستان کی خلافت کمیٹی کی انگریز نمائندگی کی۔ انھوں نے لندن میں مسلم لیگ کی شاخ بھی قائم کی۔ 23 نومبر 1909ء کو انھیں پریوی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر فائز ہونے والے وہ پہلے ہندستانی تھے۔ یہ انہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ہندستانیوں کو وائسرائے کی انتظامی کونسل اور صوبائی انتظامی کونسلوں میں نمائندگی کا موقع ملا۔

وہ پہلے ہندستانی تھے کہ جن کے مضامین لندن کے جریدے 'نائنٹینتھ سنچری' میں شائع ہوئے اور وہ سارے یورپ میں صف اول کے انشا پرداز مان لیے گئے۔ 'سیرت نبی'، 'سپرٹ آف اسلام'، 'اخلاق اسلام'، 'عرب سرسینوں کی مختصر تاریخ'، 'شرع محمدی کا خلاصہ'، 'شریعت احمدی' اور 'قانون شہادت' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے قانونی تعلیم اور تجارت پسند کرتے

تھے۔ اُن کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کی ترقی عورتوں کی دماغی تربیت پر منحصر ہے۔ وہ عورتوں کو مردوں سے بھی اونچے درجے پر دیکھنا چاہتے تھے۔

آنرایبل جسٹس مولانا سید امیر علی کی بیگم انگریز تھیں اور ہندوستان کے وائس رائے لارڈ کرزن کی سالی تھیں۔ (مناظر عاشق ہرگانوی)

میر انیس

میر خلیق کے بیٹے اور میر حسن کے پوتے میر ببر علی انیس 1802ء میں فیض آباد (اتر پردیش) کے محلہ گلاب واڑی میں پیدا ہوئے۔ دوسرے بھائی کی پیدائش کے بعد والد اپنے پورے کنبے کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ انیس نے اپنے والد ہی کے سائے میں تربیت پائی۔ وہ فیض آباد ہی میں تھے تب ہی سے شعر کہنے لگے تھے پہلے حزیں تخلص کرتے تھے لکھنؤ آنے پر اور ناسخ کی ہدایت پر حزیں سے انیس ہو گئے۔ ابتدا میں غزلیں کہیں پھر اپنے والد کے کہنے پر مرثیہ کہنے لگے۔ اُن کی شاعری حسن و خوبی کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ شکوہِ الفاظ، چستیٔ بندش، تلازم و تشبیہات، مناظرِ قدرت کی عکاسی اور پھر اہلِ بیت کے مراتب کا پاس و لحاظ انیس کی شاعری کے جوہر ہیں۔ انیس خلقی شاعر تھے۔ شاعری اُن کو ورثے میں ملی تھی اور ان کو اپنے شعری خاندان پر ناز تھا۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے 2½ لاکھ شعر کہے مگر اُن کا کلام صرف پانچ ہی جلدوں میں چھپ سکا۔ کہنے والے انیس کو ہندوستان کا شیکسپیئر، خدائے سخن، نظمِ اردو کا ہومر، ورجل اور بالمیک تک کہتے ہیں۔

واجد علی شاہ کے عہد میں انیس لکھنؤ سے باہر نہیں نکلے مگر لکھنؤ کی تباہی کے بعد (1859ء سے) باہر نکلنا شروع کیا۔ پٹنا حیدر آباد، الہ آباد اور بنارس گئے اور مجلسیں پڑھیں۔ انیس ورزش کے شائق تھے اور فنِ سپہ گری سے بھی واقف تھے۔ وضع دار تھے لباس کی وضع کو بھی آخری دم تک نبھایا۔ وقتِ معینہ پر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے یہاں تک کہ اُن کے گھر والے بھی اطلاع کے بغیر اُن کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ اردو زبان کی تاریخ میں مرثیہ گوئی میں اُن کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا اور مرثیہ خوانی میں بھی وہ بے نظیر تھے۔ 1874ء میں وفات پائی اور اپنے ہی مکان (کوچہ میر انیس، لکھنؤ) میں دفن ہوئے۔

اورنگ زیب

اورنگ زیب عالم گیر 24 اکتوبر 1618ء کو مالوا اور گجرات کی سرحد پر قصبہ دوہد میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی میں بڑا بہادر اور جری تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں اُس نے ایک بگڑے ہاتھی کو قابو میں کرکے شاہ جہاں سے انعام پایا تھا۔ بڑے ہو کر اورنگ زیب نے اپنے بیمار باپ شاہ جہاں کو قید کر لیا اور اپنے تینوں بھائیوں کو قتل کروا دیا اور حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ اس نے اپنی فتوحات کے ذریعے اپنی سلطنت کو کابل سے چاٹ گام تک اور تبت سے راس کماری تک وسیع کر لیا۔ وہ کٹر مسلمان تھا اس نے اکبر اور جہاں گیر کے قائم کئے ہوئے سیکولر طریقوں کو بدل کر اسلامی طرزِ حکومت کی بنیاد رکھی اس تبدیلی سے ہندو چونک پڑے شیعہ ناراض ہو گئے اور راجپوت بددل ہو گئے اور مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو گیا۔

اورنگ زیب نے فقہ اسلامی کے احکام 'فتاوائے عالم گیری' کے نام سے مرتب کروائے۔ وہ خود بھی فارسی زبان کا ادیب تھا۔ 'رقعاتِ عالم گیری' اس کی مشہور کتاب ہے۔ وہ شاعر بھی تھا اور عزت تخلص کرتا تھا۔ اس کا حافظہ بلا کا قوی تھا وہ اپنی فوج کے سپاہیوں کی حاضری زبانی (رجسٹر کے بغیر) لیتا تھا۔ وہ اپنا ذاتی خرچ قرآن شریف لکھ کر اور گوٹے کی ٹوپیاں کاڑھ کر پورا کرتا تھا۔ مرنے کے بعد اُس کی وصیت کے مطابق اس کی جمع شدہ رقم 309 روپے 2 آنے میں سے 4 روپے 2 آنے کھدر کے کفن پر خرچ کئے گئے اور 305 روپے خیرات کر دیے گئے۔

مگر یہ زاہد خشک انسان بھی 35 برس کی عمر میں اپنی خالہ کی کنیز زین آبادی پر بُری طرح فریفتہ ہوا، ایک عرصے تک اپنے شب و روز زین آبادی کے ساتھ عیش و نشاط نغمہ و طرب میں گزارے مگر جب وہ مرض دق میں مبتلا ہو کر مر گئی تو یہ عشق کی پہلی اور آخری کہانی بھی ختم ہو گئی۔ اورنگ زیب نے 90 برس کی عمر پائی اور 1707ء میں وفات پائی وہ مغلیہ خاندان کا ایک جلیل القدر بادشاہ تھا مگر ناکام ترین۔ اس لئے کہ وہی مغلیہ حکومت کے زوال کا باعث بنا۔

بابر

عمر شیخ مرزا اور قتلق نگار بیگم کا بیٹا محمد ظہیر الدین بابر 14 فروری 1483ء کو پیدا ہوا۔ نانا یونس خان لفظ 'محمد' کا درست تلفظ ادا نہ کر سکا اُس کی زبان سے 'محمد' کے بجائے 'بابر' نکلتا تھا۔ چنانچہ ظہیر الدین کو سب بابر ہی کہنے لگے۔ 12 برس کی عمر میں (5 رمضان 899ھ) وہ فرغانہ کا بادشاہ بنا اور 18 برس کی عمر میں چچا کی لڑکی عائشہ سلطان بیگم سے اُس کی شادی ہوئی۔ 19 برس کی عمر میں اُس نے اپنے چچا زاد بھائی سے سمرقند چھین کر اس پر قبضہ کر لیا۔ 1526ء میں جب بابر ہندوستان میں داخل ہوا تو پانی پت کے میدان میں اس کا مقابلہ ابراہیم لودھی سے ہوا۔ لودھی کی فوج 5 لاکھ سپاہیوں اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل تھی بابر کی فوج صرف 12 ہزار تھی مگر لودھی کو شکست ہوئی اور بابر نے آگرے میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بابر نے ریاضی، نجوم، تاریخ اور مذہب اسلام کی تعلیم حاصل کی۔ ترکی اور فارسی میں وہ شعر کہتا تھا۔ فنِ سپہ گری میں بھی اُس کو مہارت حاصل تھی۔ وہ ہر وقت ایک سپاہی کی سی زندگی گزارتا تھا۔ امن کے دنوں میں بھی وہ زرہ پہن کر سوتا تھا۔ ایک ایک آدمی کو اپنی دونوں بغلوں میں دبا کر قلعے کی فصیل پر دوڑ لگاتا تھا اور وہ اکثر ننگے پاؤں چلنے کی مشق کرتا تھا تاکہ وہ اتنے سخت ہو جائیں کہ وقت پڑنے پر کنکر پتھر کی سختی محسوس نہ ہو۔ دریا یا نہر خواہ یخ بستہ ہو جہاں پانی دیکھتا وہ غسل کرتا تھا۔ اُس کی عمر کے پہلے 30 برس میں 18 برس جنگ کرنے ہی میں گزر گئے۔

27 اپریل 1522ء (15 ویں رجب 932ھ) کو جمعہ کے دن اُس نے اپنے 'بادشاہِ کابل و دلی' ہونے کا اعلان کیا۔

بابر کی بیگم ماہم سے ہمایوں اور گل بدن پیدا ہوئے اور بابر کی اولاد میں انہی دونوں نے زیادہ نام پیدا کیا۔ بابر کو تصنیف سے بھی لگاؤ تھا اور علم موسیقی سے بھی۔ اس نے کئی راگنیاں نکالیں۔ اُس نے اپنے نام پر ایک رسم خط (بابری رسم خط) بھی ایجاد کیا۔ وہ شراب، بھنگ اور افیون استعمال کرنے کا عادی تھا اور امرد پرست بھی تھا مگر رانا سانگا سے جنگ کے وقت اُس نے شراب نوشی سے توبہ کر لی تھی۔ بابر نے اپنی تزک میں ہندوستان کے شہروں کو غلیظ لکھا ہے۔ اُس کو اپنے رشتے داروں اور اپنے آبا و اجداد سے بھی شکوہ تھا وہ اُن کو مغل نہیں 'مغول' کہا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اگر مغول فرشتے کی نسل سے بھی ہو تب بھی وہ بُرا ہے۔ مغول کا نام آبِ زر سے لکھا جائے تب بھی وہ بُرا ہے۔ 22 دسمبر 1530ء کو بابر کا انتقال ہوا۔ اُس کی لاش کو کابل لے جا کر دفن کیا گیا۔

یہ تاریخ کا مقدس جھوٹ ہے کہ بابر نے اپنی دعا سے اپنی بقیہ عمر اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کو بخش دی اور پھر اُس کی موت واقع ہو گئی۔ دراصل بابر کی موت اُسی زہر کی بنا پر ہوئی جو کبھی ابراہیم لودی کی ماں نے باورچی کے ذریعے بابر کو دلوایا تھا اور کئی برس گزرنے کے بعد بھی جس کا اثر باقی تھا۔ بابر کا علاج کرنے والے طبیبوں کی بھی یہی تشخیص تھی۔

بدرالدین طیب جی

10 اکتوبر 1844ء کو وہ سلیمانی بوہرہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پہلے ہندوستانی بیرسٹر تھے جن کو بمبئی کی ہائی کورٹ نے تسلیم کیا۔ شہر بمبئی کے سدھار کے لئے انھوں نے کئی تحریکیں چلائیں۔ بمبئی کی انجمن اسلام کی بنیاد رکھنے والوں میں وہ بھی تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے اجلاس (مدراس، 1887ء) میں وہ کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے۔

بدرالدین طیب جی کو جنوبی ہند کا سر سیّد سمجھا گیا ہے وہ بھی مسلمانوں کے سارے دکھوں کا مداوا تعلیم ہی کو سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں اپنے غیر مسلم دوستوں سے بھی مشورہ لیتے تھے۔ وہ مسلم فرقے کے مسائل کو دوسرے فرقوں کے مسائل سے الگ نہیں سمجھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے آخری دنوں میں عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور جج کا عہدہ

سنبھال کر ایک کامیاب جج ثابت ہوئے تھے مگر وہ اپنے آخری دم تک قوم پرست ہندستانی ہی بنے رہے ـــــ 1906ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

بی اماں

نام آبادی بیگم تھا مگر وہ علی برادران کی ماں تھیں اور بی اماں کے محترم نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ امروہے کے ایک معزز خان دان میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے چھے اولادیں تھیں پہلی اولاد ایک بیٹی تھی جو پانچ تھی اور جو تیرا چودا برس کی عمر میں مر گئی۔ باقی پانچ بیٹے تھے جن میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے نام پیدا کیا۔ بی اماں کے جب شوہر کا انتقال ہوا تو وہ 32 برس کے تھے اور بی اماں کی عمر صرف 27 برس تھی اور اس وقت مولانا محمد علی سب سے چھوٹے تھے اور اُن کی عمر صرف 2 برس تھی۔ مرحوم نے جو اثاثہ چھوڑا وہ 35 ہزار روپے کا قرض تھا۔ بیوہ ہونے کے بعد بی اماں نے خود بھی انگریزی پڑھی اور اپنے بچوں کو بھی اعلا تعلیم دلوائی۔ جیٹھ، بھتیجوں کی انگریزی تعلیم سے ناخوش تھے۔ اس لیے انھوں نے مالی مدد بالکل نہیں کی۔ بی اماں نے ایک ہندو عورت کو راز دار بنا کر اپنے سارے زیور بیچ ڈالے اور بیٹوں کی انگریزی تعلیم جاری رکھی۔

1921ء میں وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خلافت تحریک میں خود بھی شریک ہوئیں۔ ابتدا میں وہ برقع پہن کر بیٹوں کے ساتھ دورہ کرتی تھیں بعد میں برقع پہننا ترک کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنی ممتا پر جبر کر کے اپنے بیٹوں کو انگریزوں کے ظلم و ستم کے آگے بڑھا دیا تھا وہ اس حد تک انگریز دشمن بن چکی تھیں کہ بیٹوں کو انھوں نے وارننگ دی تھی کہ اگر انھوں نے انگریزوں سے کبھی کوئی صلح کی تو وہ اُن کا گلا گھونٹ دیں گی۔ ایک بار مولانا شوکت علی نے لکھنؤ کے اپنے ایک دوست کو ایک فوٹو بھیجا تھا۔ فوٹو میں بی اماں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور دونوں بیٹے کرسی کے پیچھے مودب انداز میں کھڑے تھے۔ فوٹو کے نیچے مولانا شوکت علی نے لکھا تھا: Lioness and her cubs یعنی شیرنی اور اُس کے بچے!

علامہ تاجور نجیب آبادی

احسان اللہ خاں نام، تاجور تخلص [illegible]ء میں نجیب آباد (ضلع بجنور، اتر پردیش) کے ایک یوسف زئی پٹھان خان دان میں پیدا ہوئے۔ دیوبند کے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور وہاں مولانا انور شاہ کے شاگرد رہے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے پہلے مولوی فاضل اور پھر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ ملازمت کی ابتدا لاہور کے دیال سنگھ ہائی اسکول سے ہوئی جہاں وہ علوم شرقیہ کے استاد تھے۔ پھر دیال سنگھ کالج میں شعبہ اردو، عربی و فارسی کے پروفیسر اور صدر ہو گئے۔ شاعری میں حضرت رسا رام پوری کے شاگرد تھے۔ 1915ء سے قلمی زندگی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے لاہور کے رسالہ 'مخزن' کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ تنخواہ صرف 15/- روپے ماہوار ملتی تھی۔ پانچ برس 'مخزن' کی اڈیٹری کرنے کے بعد 'ہمایوں' کے اڈیٹر بن گئے یہاں بھی پانچ برس گزار اور پھر 1929ء میں اپنا رسالہ 'ادبی دنیا' جاری کیا۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیوی کا زیور بیچ کر یہ خطرہ مول لیا تھا۔ یہ رسالہ اتنا زیادہ مقبول ہوا کہ دنیا کے ہر اس خطے میں پہنچنے لگا جہاں تھوڑے سے بھی اردو داں موجود تھے اور اشاعت بھی اتنی بڑھی کہ علامہ تاجور کو اُس کے ایک شمارے کے لیے 13 من کاغذ خریدنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اُن کو جتنی کامیابی حاصل ہوتی تھی ان کے حاسدوں کی تعداد اتنی ہی بڑھ جاتی تھی۔ 'ادبی دنیا' کی کامیابی کے بعد اکثر رسالوں کے نام میں 'دنیا' کا لفظ شامل ہونے لگا۔ آخر بے انتظامی اور بد انتظامی کی بنا پر مارچ 1933ء میں 'ادبی دنیا' بند ہو گیا۔ دو برس بعد مئی 1935ء میں علامہ تاجور نے 'شاہکار' جاری کیا۔

علامہ کا خیال تھا کہ پنجاب میں اُردو کی ترقی تب ہی ممکن ہے کہ جب ہندو اور سکھ بھائیوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ وہ بھی اچھی اردو نثر لکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو اردو کی جانب راغب کیا اور اُن میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا کیا اور شاعر و ادیب بنا دیا۔ کرپال سنگھ بیدار، سردار اودے سنگھ شائق اور سی ایل رکا ذوقی اُن کے عزیز چہیتے شاگرد رہے ہیں۔ پنڈت میلا رام

کے لگ بھگ پیدا ہوئی۔ باپ کی نگرانی میں اس نے عربی، فارسی اور
ریاضی کی تعلیم حاصل کی اور وہ ستار بجانا بھی سیکھ گئی۔ دس
ہی برس کی تھی کہ بیجاپور کے حاکم علی عادل شاہ سے اس کی شادی
ہو گئی۔ شوہر نے اس کی بڑی قدر کی۔ امورِ سلطنت میں بھی وہ بیوی
سے مشورے لینے لگا۔ بیجاپور میں رہ کر اس نے کنڑی زبان بھی سیکھ
لی۔ مگر شادی کے 16 برس بعد وہ بیوہ ہو گئی۔ چونکہ وہ لاولد تھی
اس لیے اس نے مرحوم شوہر کے کم سن بھتیجے کو تخت پر بٹھا کر حکومت
کا کام خود سنبھال لیا۔ باپ کے انتقال کے بعد اس کا بھائی برہان الملک
احمد نگر کے تخت پر بیٹھا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد اس کا انتقال
ہو گیا اور پھر احمد نگر میں بدامنی پیدا ہو گئی۔ کئی امیر تخت کے دعوے
دار بنے اور جب بات زیادہ بڑھی تو وہ دلّی کے بادشاہ اکبر سے
رجوع ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی چاند بی بی نے بیجاپور اپنے دیور ابراہیم عادل
شاہ کے سپرد کیا اور خود احمد نگر آ کر امیروں اور سرداروں کو وطن
کی خاطر متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

اکبر بادشاہ کے حکم سے شاہزادہ مراد، مرزا عبدالرحیم خان خاناں
کی سرپرستی میں احمد نگر پر حملہ آور ہوا اور اس نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ایک
عرصے تک ناکام رہنے پر مغل فوج نے سرنگ لگا کر قلعہ کی دیوار کا ایک
حصہ بارود سے اڑا دیا۔ چاند بی بی نے بڑی جواں مردی سے ڈٹ کر
مغل فوج کا مقابلہ کیا۔ خود اپنے ہاتھ سے بندوقیں بھر بھر کر اپنے
سپاہیوں کو دیں۔ اور مغل فوج کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ رات ہوئی
اور وہ تلوار سونت کر برج پر آئی۔ راج مزدوروں اور سرداروں کو
کچھ دھمکایا اور کچھ للچایا اور مٹھیاں بھر بھر کر اشرفیاں ان کو بانٹیں۔ وہ
رات میں مشعل لیے کھڑی رہی اور راج مزدور، چونے، اینٹ، پتھر،
ملبہ، لکڑی حد یہ کہ انسانی لاشیں جو ہاتھ آیا چنتے گئے۔ صبح ہوتے
ہی فصیل پر توپیں چڑھا کر چاند بی بی نے مغل فوج پر اولوں کی
طرح گولے برسائے۔ ہزاروں مغل سپاہی ہلاک ہوئے۔ قلعے میں
جب کچھ نہ رہا تو چاند بی بی نے سونے چاندی کے گولے ڈھال
کر مغل فوج پر مارنا شروع کئے۔ آخر جب احمد نگر کے قلعہ میں غلہ کا
توڑا بھی ختم ہو گیا تو چاند بی بی نے صلح کی پیش کش کی۔ مغل فوج کے
لیے بھی رسد اور بنجارے کی راہ بند ہو چکی تھی اور شاہزادہ مراد

کو یہ خبر مل چکی تھی کہ چاند بی بی کے دیور ابراہیم عادل شاہ نے اپنے
ایک باتدبیر خواجہ سرا امیر سہیل خاں کو 25 ہزار فوج دے کر
چاند بی بی کی مدد کے لیے روانہ کر دیا ہے اور دکن سے آہنگ خاں حبشی
بھی 7 ہزار سوار لے کر قلعہ احمد نگر کی حفاظت کے لئے چل پڑا ہے
تو خان خاناں کی مخالفت کے باوجود اس نے چاند بی بی کی صلح کی
پیش کش کو قبول کر لیا۔ صلح کے نتیجے میں چاند بی بی نے برہان الملک
کے پوتے کو احمد نگر کے تخت کا وارث قرار دلوایا۔ اور مغل فوج نے
محاصرہ اٹھا لیا۔ احمد نگر کے امراء نے چاند بی بی کی جواں مردی اور
حکمت عملی سے خوش ہو کر اسے احمد نگر کے تخت پر بٹھایا۔ اور
"نادرۃ الزمانی" کا خطاب دیا۔ اور اس دن سے وہ چاند سلطان
بیگم کہی جانے لگی۔

چار برس بعد 1597ء میں مغل فوج پھر حملہ آور ہوئی۔ احمد نگر
کی جانب سے امیر سہیل خاں نے مقابلہ کیا مگر اس کی ہار ہوئی۔ اپنی کمزوری
اور آپس کے نفاق کو مدنظر رکھتے ہوئے چاند بی بی نے چاہا کہ قلعہ مغل فوج
کے حوالے کر دیا جائے مگر اس کے امیروں اور سرداروں نے کہا کہ چاند بی
بی مغل فوج سے ساز باز کئے ہوئے ہے اور اسی شبہے میں انھوں نے چاند
بی بی کو قتل کر دیا۔ چاند بی بی عقل و تدبیر، سخاوت اور شجاعت کی حامل
تھی اور رباب بجانے میں ماہر تھی۔

جوش ملیح آبادی

خان دانی نام شبیر احمد خاں، بعد کا نام شبیر حسن خاں۔
تخلص شبیر بعد میں جوش۔ والد کا نام بشیر احمد خاں، تخلص بشیر۔ دادا کا نام
محمد احمد خاں۔ ذات آفریدی پٹھان۔ سگڑ دادا درۂ خیبر سے آ کر فرخ
آباد آئے۔ دادا نے ملیح آباد میں سکونت اختیار کی۔ 5 دسمبر 1898ء
کو صبح کے چار بجے ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج میں جوش پیدا ہوئے۔ باپ
دادا دونوں شاعر تھے۔ دادی بھی شعر و ادب کا ذوق رکھتی تھیں۔ شیعہ
تھیں۔ (1907ء میں جوش بھی شیعہ ہو گئے) عربی اور فارسی جوش نے
گھر پر پڑھی مزید تعلیم سیتا پور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرے میں سینئر
کیمبرج تک ہوئی۔ شانتی نکیتن میں بھی چھ مہینے تک رہے۔ نو برس کی
عمر میں پہلا شعر کہا۔ عزیز لکھنوی کو استاد بنایا، حافظ، نظیری، خیام

تیس نظیر اکبرآبادی، غالب، اقبال اور شیلو رسے متاثر ہوئے پہلی بار 1911ء میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ 1916ء میں اشرف جہاں بیگم سے شادی ہوئی۔ 1925ء میں نظام حیدرآباد کے دارترجمہ میں ملازم ہوئے۔ ناظر ادب بھی رہے۔ 1934ء میں حیدرآباد چھوڑ دیا۔ 1935ء میں دہلی سے ماہ نامہ 'کلیم' جاری کیا۔ 1939ء میں 'کلیم' کے بند ہونے پر 1940ء میں ماہ نامہ 'نیا ادب' کے مدیر اعلیٰ بنے مگر ایک ہی برس بعد 'نیا ادب' سے بھی علاحدہ ہو گئے۔ 1943ء سے 1948ء تک پونے میں فلم ساز و ہدایت کار ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی فلم کمپنی شالی مار پکچرز میں ایک گیت کار اور مکالمہ نویس کی حیثیت سے ملازم رہے۔ 'من کی جیت' اُن کی بہترین فلم ہے جس کے دو گانے (نگری مری کب تک یونہی برباد رہے گی' اور 'میرے جُبنا کا دیکھو اُبھار') غیر معمولی طور پر مقبول ہوئے۔ 1948ء سے 1955ء تک وہ حکومت ہند کے ماہ نامے 'آج کل' کے اڈیٹر رہے۔ 1955ء میں وہ کراچی (پاکستان) چلے گئے جہاں ایک ادبی مشیر کی حیثیت سے ترقی اردو بورڈ میں ملازم ہو گئے۔

جوش کا پہلا مجموعہ نظم و نثر 'روحِ ادب' 1920ء میں شائع ہوا اور اب تک اُن کی دو درجن تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ 'یادوں کی بارات' اُن کی خود نوشت سوانح ہے۔ ماہ نامہ 'زمانہ' کے اڈیٹر منشی دیا نرائن نگم نے جوش کو 'شاعرِ اعظم' لکھا اور 1930ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے جوش کو 'شاعرِ انقلاب' کا لقب دیا۔ ہندستان کی قومی حکومت نے اُن کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز بخشا۔ 9 برس کی عمر سے 63 برس کی عمر تک جوش نے ایک لاکھ سے زائد اشعار کہے۔ 70 ہزار اشعار اُن کے مجموعوں میں موجود ہیں۔ وہ طویل ترین نظم جو انھوں نے 1941ء میں شروع کی تھی 40 ہزار اشعار پر مشتمل ہوگی۔ دُنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی زندہ یا مرحوم شاعر کا اتنا سرمایۂ ادب موجود نہیں جتنا جوش نے تعدادِ اشعار، ذخیرۂ الفاظ اور متنوع موضوعات کے اعتبار سے اردو زبان کو بخشا ہے۔ ہند و پاک کی ساری علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُن کا کلام فارسی، انگریزی، روسی، چینی، یوگوسلاوی اور چیک زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔

جوش مجموعۂ اضداد ہیں، صورت و سیرت میں پٹھانیت کی جھلک موجود ہے۔ کردار کے اعتبار سے غالب سے ملتے جلتے ہیں۔ مے نوشی ہی اُن کا محبوب شغل ہے۔ زندگی میں 18 عشق کر چکے ہیں اور انھوں نے اپنی جوانی کو اُس کے سارے شرپر تقاضوں کے ساتھ گزارا ہے۔ وہ اِس صدی کے چند قوم پرست شاعروں میں سے ہیں۔ تنگ دستی کے باوجود انھوں نے کسی بھی وار فنڈ (دوسری بڑی جنگ کے دوران میں) کے مشاعرے میں کبھی شرکت نہیں کی۔

وہ ہندو پاک کے سب سے بڑے اردو شاعر ہیں۔

حالی

الطاف حسین نام، حالی تخلص، شمس العلما خطاب اُن کے بزرگ ہرات سے ہندستان آئے۔ حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ سُنی اور ماں شیعہ تھیں۔ نو برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اپنی کوشش سے تعلیم حاصل کی۔ 17 برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ غدر کے بعد لاہور میں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ پھر دہلی کے عربک اسکول میں مدرس رہے۔ علی گڑھ جب پہنچے تو ریاست حیدرآباد کی جانب سے ان کو 75 روپے وظیفہ ملنے لگا جو بعد میں 100/- روپے ہو گیا شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد بنے۔ نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے حسن کو فضول گوئی سے پاک کیا۔ 1904ء میں اُن کو 'شمس العلما' کا خطاب ملا۔ 1907ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر بنے۔ اُن کی تصانیف میں 'حیاتِ سعدی'، 'مسدس حالی'، (جو سر سید کی فرمائش پر لکھی گئی)، 'یادگارِ غالب'، 'حیاتِ جاوید' اور 'دیوان حالی' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا حالی حافظ قرآن تھے، سر سید کے بے حد مداح تھے اچھے انسان تھے، دردمند مسلمان تھے، مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ حالی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین آج کے مشہور قلم کار خواجہ احمد عباس کے نانا تھے۔

حسرت موہانی

اخبارات کا پلندہ بغل میں دبائے، ٹوٹی کمانی کی عینک لگائے، موٹے دیسی کپڑے کی ملگجی شیروانی اور پاجامہ پہنے، پسینا پھندنے کی سُرخ میل آلود ترکی ٹوپی اوڑھے اور ایک پرانی سی چھتری ہات میں لیے پیدل ہی اسمبلی ہاؤس جانے والے صاحب حسرت موہانی تھے۔ اُن کا نام سید فضل الحسن تھا والد کا نام سید اظہر حسن اور ماں کا نام شہر بانو تھا۔ وہ ضلع اناؤ (اترپردیش) قصبہ موہان میں 1875ء میں پیدا ہوئے۔ قرآن شریف اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے قصبے ہی میں حاصل کی اور جب اردو مڈل پاس کیا تو سارے صوبے میں اول آئے اور وظیفہ پایا اور اسی طرح فتح پور ہسوا کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے امتیازی نمبروں سے انٹرنس پاس کر کے بھی وظیفہ حاصل کیا۔ 1903ء میں علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ 1904ء سے سیاست میں آئے اور کانگریس کے ڈیلی گیٹ بن کر کانگریس کے بمبئی کے اجلاس میں شامل ہوئے۔ حسرت وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے کی تلقین کی۔ وہ حسرت ہی تھے کہ جنھوں نے سب سے پہلے بلا شرط مکمل آزادی کا ریزولیشن (احمدآباد میں کانگریس کے اجلاس 1921ء میں) پیش کیا اور جس کو کانگریس 1929ء سے قبل منظور نہ کرسکی۔ ترک موالات (Non - Co - ope - ration) جیسی اصطلاح کے حسرت ہی موجد ہیں۔ حسرت کانگریسی بھی رہے، مسلم لیگی بھی، کمیونسٹ بھی اور ٹریڈ یونینوں سے بھی وابستہ رہے مگر کوئی بھی جماعت اُن کے انتہائی شدید اور تیز رو خلوص کا ساتھ نہ دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب کانگریس نے ملک کی تقسیم کو مان لیا اور مسلم لیگ نے اپنا مطالبۂ پاکستان منوا لیا تو حسرت نے یوپی اسمبلی میں جھنجلا کر نعرہ لگایا! 'ہندوستان مردہ باد، پاکستان مردہ باد' در اصل حسرت سیاست داں نہیں تھے بلکہ انتہائی مخلص، محبِ وطن اور جوشیلے مسلمان تھے انھوں نے جنگ آزادی کے ایک جاں باز سپاہی کی حیثیت سے علی گڑھ، الہ آباد، فیض آباد، میرٹھ، بڑودا، للت پور اور سابرمتی کی جیلوں میں اپنی جوانی سے بڑھاپے کے کئی دور گزار دیے۔ قید کے دنوں میں اگر رمضان آگئے تو وہ روزے بھی رکھتے اور چکی بھی پیستے اور شاعری بھی کرتے۔

شاعری طالب علمی ہی کے زمانے سے کرتے تھے علی گڑھ میں انھوں نے اردوئے معلّیٰ کے نام سے ایک اردو مجلس بھی قائم کی تھی۔ چوں کہ پرانی وضع کا لباس پہنتے تھے اور ساتھ میں ایک بڑا سا پان دان بھی رکھتے تھے اِس لیے اُن کے ہم جماعت اُن کو خالہ جان کہہ کر پکارتے تھے حسرت کا شمار اردو غزل کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے جگر، اصغر اور فانی حسرت ہی کے تخیلِ شاعری کی شاخیں تھیں۔ وہ حنفی مسلمان تھے اور کرشن جی کے پرستار بھی، وہ غزل بھی کہتے تھے اور کرشن بھکتی میں ڈوبی ہوئی کویتا بھی۔

حب وطنی، انسان دوستی، حق گوئی، بے باکی، استغنا اور فقر حسرت کے نمایاں اوصاف تھے۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر کی حیثیت سے انھوں نے نہ صرف خود -/75 روپے یومیہ الاؤنس لینے سے انکار کر دیا تھا بل کہ وہ اِس بات پر بھی مُصر تھے کہ دوسرے ممبروں کو بھی ہندوستان جیسے غریب ملک کے خزانے سے اتنی بڑی رقم نہ لینا چاہیئے۔ اس طرح ایک پروگرام کے خاتمے پر انھوں نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے صرف تین ہی آنے لیے اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ کان پور سے لکھنؤ تک پہنچنے میں اُن کے صرف تین ہی آنے خرچ ہوئے ہیں۔ اپنے رسالے 'اردو معلّٰی' کا سارا کام وہ خود ہی کرتے تھے۔ بنڈل بناتے، کندھے پر رکھتے اور پوسٹ بھی خود ہی کرآتے۔ ذاتی لائبریری بنائے رکھنے کا اُن کو بڑا شوق تھا۔ ایک بار ایک سیاسی مقدمے کے نتیجے میں عدالت سے اُن پر جرمانہ ہوا تو وہ جرمانہ ادا نہ کرسکے۔ گھر کا سامان قرق ہو گیا، گھر میں کتابوں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ساڑھے چار ہزار روپے کی کتابیں پولس نے ردّی بنا کر -/60 روپے میں بیچ ڈالیں۔

حسرت کی بیگم نشاطُ النسا حقیقی معانی میں اُن کی شریکِ حیات تھیں۔ انھوں نے اُن کے ساتھ نمک کے پانی سے روٹی کھائی۔ اُجرت پر کپڑے سیے اور چکی پیس کر بھی گزر کی۔ اگرچہ حسرت کی یہ

محبت کی شادی تھی مگر پھر بھی انھوں نے اپنی زندگی میں جہاں ایک درجن حج کئے وہاں نصف درجن عشق بھی. قوالی سننے کے شوقین تھے مگر سینما بینی کے مخالف. درزی کا سلا ہوا کپڑا کبھی نہیں پہنا، بیوی نے جو سی دیا وہی پہن لیا. بچپن میں پتنگ بازی کا بہت شوق تھا، پھلوں میں شریفے بہت رغبت سے کھاتے تھے.

13 مئی 1951ء کو اُن کا انتقال ہوا.

خواجہ حسن نظامی

2 محرم 1296ھ کو بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی میں پیدا ہوئے. 11 ذی الحج 1374ھ 31 جولائی 1955ء کو وفات پائی.

صوفی بزرگ، عالم باعمل، قوم کے مصلح، کامیاب تاجر، مشہور اخبار نویس، بہترین مقرر، بسیار نویس اور صاحب طرز انشا پرداز. ہمہ صفت موصوف!

چھوٹی عمر میں ... دلیر ہو گئے تھے، اپنی کوشش اور محنت سے ترقی کی. تصوف کو نئے تقاضوں کے موافق لکھا، بیان کیا اور برت کر دکھایا. خانقاہوں میں اصلاحی تحریک جاری کی اور دنیا کو بتا دیا کہ تصوف جمود اور قنوطیت کا نام نہیں بلکہ حرکت، برکت، خدمت اور امید کا نام ہے.

اردو زبان کے بے مثل ادیب اور صحافی تھے. چھوٹی بڑی کتابوں کا شمار پانچ سو تک کیا جاتا ہے. انھوں نے زبان و ادب کی "برہمنیت" اور "ذات پات" کو ختم کیا یعنی ایسے عنوانات اور موضوعات پر قلم اٹھایا اور لکھا جن کو حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا تھا اور کوئی اُن کی طرف توجہ نہ کرتا تھا. "گلاب" کے مقابلے میں "کیکر" کو لائے. "دیا سلائی" اور "مچھر" "مکھی" تک پر لکھا اور ایسا لکھا کہ حق ادا کر دیا.

درجنوں اخبار اور رسالے جاری کئے، قوم کے بہت سے ہونہار افراد اُن کی تربیت کا فیض پاکر ادب و صحافت اور قلم کاری کی بلندیوں تک پہنچے. اردو زبان کو عام فہم آسان اور دل نشیں بنایا. مولانا آزاد مرحوم کو ان کی مشکل پسندی کی وجہ سے خواجہ صاحب برملا اردو کا قاتل کہا کرتے تھے. جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھنے کی مہم بھی خواجہ صاحب نے چلائی.

میل ملاپ پیدا کرنے کے لئے انھوں نے مختلف مذاہب کا لٹریچر اردو میں شائع کیا. پیغمبر اسلامؐ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، شری کرشن جی، گورو نانک صاحب کے سوانح حیات بڑے والہانہ انداز میں لکھے. آج سے پچاس برس پہلے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا. ہندو سادھوؤں کے لباس میں تمام ہندو تیرتھوں کی یاترا کی اور فلسفہ ویدانت پڑھا. کئی بار ڈیڑھ ڈیڑھ سو مولویوں کے دستخطوں سے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ نکلا. آریہ سماجیوں کے نزدیک وہ اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تھے اور سوامی شردھانند "شدھی تحریک" میں اُن کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے. انگریزوں کی پولس نے ان کی برسوں نگرانی رکھی، گرفتار کیا، جیل بھیجا مگر جب انگریز ہندوستان چھوڑنے لگے تو چلتے چلتے 1946ء میں شمس العلماء کا خطاب بھی دے گئے.

خواجہ صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؒ کے خواہر زادے بھی ہوتے تھے اور ان کے جد اعلیٰ حضرت خواجہ سید محمد امامؒ کو جو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے نواسے تھے حضرت محبوب الٰہی نے فرزند معنوی بنا کر خلافت اور جانشینی سے بھی سرفراز کیا تھا. خواجہ صاحب پیرزادے تھے لیکن انھوں نے نذر و نیاز کی آمدنی پر محنت کی روزی کو ترجیح دی، وہ پیشہ ور مانگنے والوں کے سخت خلاف تھے اور کہتے تھے کہ ان کو خیرات دینا قوم کو اپاہج بنانا ہے. خیرات کا صحیح مصرف ان کے نزدیک یہ تھا کہ اگر چار دن کھیت دہ محنتی مزدوروں کو اس کی اجرت سے زیادہ معاوضہ دے دیا جائے. وہ خود روزانہ (بڑھاپے تک) اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے. اور مریدوں سے کہتے تھے کہ کوئی پیر نمازیں اور وظیفے بہت پڑھتا ہے کوئی لنگر بہت بانٹتا ہے مگر میری خصوصیت محنت اور اکل حلال ہے اور میرے جس مرید میں یہ صفتیں ہوں سمجھ لے کہ وہ میرا سچا مرید ہے. وہ ساٹھ پینسٹھ ہزار مریدوں کے پیر تھے. انھوں نے اپنے وصیت نامے میں لکھا تھا کہ میرے ورثا، جو رقم سوئم اور چہلم وغیرہ کی رسموں میں خرچ کرنا چاہتے ہوں اس رقم سے مترجم قرآن مجید ناداروں میں تقسیم کر دیئے جائیں اور رسم کوئی نہ کی جائے. ان کے اسی وصیت نامے میں یہ بھی درج ہے کہ عقل مندوں کے ساتھ رہنا جنت ہے اور بے وقوفوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دوزخ ہے.

(حسن ثانی نظامی)

مولانا حسین احمد مدنی

۶ اکتوبر 1879ء کو سہ شنبے کی شب میں گیارہ بجے ضلع اناؤ (اترپردیش) کے قصبہ بانگر مئو میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن موضع الہ داد پور (تحصیل ٹانڈا ضلع فیض آباد، اترپردیش) تھا۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا۔ مدینے میں کچھ عرصے رہنے کی بنا پر مدنی کہلائے ذات سے حسینی سید تھے۔ مولانا کے والد سید حبیب اللہ ایک اردو مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے مولانا 12 برس کے تھے تو اُن کو مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا جہاں وہ شیخ ہند مولانا محمود حسن کے شاگرد بنے۔ سات برس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہو گئے مگر تھوڑے ہی دن بعد اپنے والد کے ساتھ وہ مدینے چلے گئے اور وہاں ایک استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور رہنے کے لئے مکان بھی مل گیا لیکن ملازمت کا یہ سلسلہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ ملازمت چھوٹی ہی مکان بھی خالی کرنا پڑا، بہت دنوں تک سارا خاندان بے گھر رہا اور فاقے کرتا رہا۔ آخر حرم اطہر میں درس دینے لگے اور قدرے روزی کا انتظام ہوا اسی اثنا میں مولانا عبدالحق (جو بعد میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد میں صدر مہتمم بنے) کو بھی درس دیتے رہے۔ نتیجے میں حالات اتنے ضرور سدھر گئے کہ گھر کے مردوں، عورتوں اور بچوں نے مل کر اپنے ہاتوں سے ایک کچا پکا مکان بنا لیا۔ شیخ ہند مولانا محمود حسن چوں کہ ترکوں کی خلافت کے حق میں تھے اس لیے جب وہ اپنی دنوں حج کی غرض سے مکہ پہنچے تو شریف مکہ نے انھیں اور ساتھ میں مولانا حسین احمد کو بھی پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے دونوں کو مالٹا میں اسیر کر دیا۔ جب رہا ہو کر ہندستان واپس ہوئے تو اس اثنا میں والد ماجد، والدہ، اہلیہ اور ایک بیٹے کا انتقال ہو چکا تھا۔ فوجی بھرتی اور پولیس کی ملازمت کے سلسلے میں کراچی کے سلسلے میں جو فتوے دیے گئے اس کی بنا پر دو برس کی جیل ہو گئی۔ جیل میں مولانا محمد علی بھی ساتھ میں تھے انھوں نے مولانا مدنی سے قرآن کا ترجمہ پڑھا۔ 6 برس تک سلہٹ (بنگال) کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ حدیث کے فرائض انجام دیتے رہے اور تبلیغ کا کام بھی انجام دیا جہاں ہزاروں اشخاص نے آپ کے ہات پہ بیعت کی۔ سلہٹ سے واپسی پر دارالعلوم دیوبند میں شیخ حدیث مقرر ہوئے۔ مالٹا سے واپسی پر ہی انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر بن گئے تھے اور جمعیت علماء ہند کے بھی ممبر تھے جہاں 3 1923ء میں کوکناڈا کے اجلاس میں جمعیت علماء کے صدر منتخب ہوئے پھر 1942ء میں صدر منتخب کئے گئے۔ 5 دسمبر 1957ء (جمعرات) کو وفات پائی۔ 1954ء میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے اُن کو 'پدم بھوشن' کا اعزاز بخشا گیا مگر اُنھوں نے یہ کہہ کر یہ اُن کے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اُس کو قبول کرنے سے معذرت چاہ لی۔

دارالعلوم (دیوبند) نے 94 برس میں 6630 عالم پیدا کئے اُن میں 3356 حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد تھے مولانا نے انتقال کے وقت 167 خلفاء چھوڑے۔ جمعیت علماء کے موجودہ صدر مولانا اسعد مدنی مولانا مدنی مرحوم کے صاحب زادے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمان

مولانا حفظ الرحمان 3 جنوری 1901ء کو ضلع بجنور (اترپردیش) کے ایک قصبے سیوہارے میں پیدا ہوئے۔ مولانا کا اصلی نام معز الدین تھا۔ اُن کے والد شمس الدین صدیقی زمین دار تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم سیوہارے ہی کے ایک مکتب میں ہوئی اور مزید تعلیم انھوں نے مرادآباد کے شاہی مسجد کے مدرسے میں اور دیوبند کے دارالعلوم میں حاصل کی۔ وہ حضرت انور شاہ کشمیری کے بہت عزیز شاگرد رہے۔ دیوبند کے قیام میں مولانا نے شیخ ہند محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی کی قومی تحریک کے مابعد اثرات قبول کئے اور طالب علمی ہی کے دنوں میں سیاست میں عملی حصہ لینے لگے۔ 1920ء میں تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جیل گئے اور رہا ہونے کے بعد تعلیم بھی جاری رکھی اور خلافت، کانگریس اور جمعیت علماء کے تحت مختلف سیاسی تحریکوں میں شامل رہے۔ تعلیم کے خاتمے پر وہ دارالعلوم ہی میں استاد مقرر ہوئے مگر سیاسی سرگرمیاں پھر بھی جاری رہیں۔ جامعہ ڈابھیل میں بھی کئی برس استاد رہے۔

1919ء میں وہ جمعیت علماء کے رکن منتخب ہوئے اور 1942ء میں جنرل سکریٹری بنے، کئی برس تک کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ دہلی میں جب ندوۃ المصنفین (1938ء) قائم ہوا تب سے مولانا مستقل طور پر دہلی ہی میں رہنے لگے۔ تصنیف و تالیف کا کام، جمعیت علماء اور کانگریس کی تحریکوں میں حصہ لینا ہی اُن کی زندگی کا مشن تھا۔ 1947ء کے فسادات میں مولانا نے دہلی کے مسلمانوں کو بچانے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اسی بنا پر مولانا شاہ عبدالقادر نے کہا تھا: 'دہلی میں فسادات کے زمانے میں مسلمانوں کو بچانے کے سلسلے میں مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں میں اُن کے بدلے میں اپنی پوری زندگی کے اذکار و اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں'۔ مولانا دو بار پارلیامنٹ کے ممبر رہے مگر کانگریسی اور جمعیت علمائی ہونے کے باوجود وہ برملا کہتے تھے 'وہ حکومت مٹ جانے کے لائق ہے جہاں کے عوام بھوکے ہوں!'

مولانا حفظ الرحمان مخلص سیاست داں تھے، مثالی مقرر تھے اور اپنی صف میں وہ واحد مولوی تھے جو باعمل تھے اور درحقیقت مجاہد ملت تھے۔ مصنف کی حیثیت سے 'فلسفۂ اخلاق'، 'قصص قرآن' اور 'رسول کریم' اُن کی قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ مولانا کو کھانے میں اُڑد بہت مرغوب تھے اور کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھانا پسند فرماتے تھے۔ پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا ہوئے اور 2 اگست 1962ء کو وفات پائی۔

دلیپ کمار

فلمی نام دلیپ کمار، اصلی نام یوسف خان۔ 11 دسمبر 1922ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم پائی۔ روزگار کی ابتدا پونا میں کینٹین سے ہوئی۔ پہلی بار 1944ء میں دیوکا رانی کے توسط سے بامبے ٹاکیز کی فلم 'جوار بھاٹا' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ فلم 'ملن' سے شہرت حاصل ہوئی اور فلم 'جگنو' سے وہ اسٹار بنے۔ دلیپ کمار کی مشہور فلموں میں 'شہید'، 'انداز'، 'جوگن'، 'دیدار'، 'میلا'، 'بابل'، 'آن'، 'دیوداس'، 'مغل اعظم' اور 'گنگا جمنا' کے نام قابل ذکر ہیں۔ وہ اب تک تقریباً 50 فلموں میں کام کر چکے ہیں۔

1966ء میں دلیپ کمار نے فلم ایکٹریس سائرہ بانو سے شادی کی۔ فرصت کا محبوب شغل بیڈمنٹن کھیلنا ہے۔ اُن کا شمار ہندوستان کے صفِ اول کے اداکاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ذاکر صاحب کے والد فدا حسین خاں قائم گنج (ضلع فرخ آباد، اُتر پردیش) کے رہنے والے تھے مگر حیدرآباد دکن میں وکالت کرتے تھے، وہیں فروری 1897ء میں ذاکر صاحب پیدا ہوئے۔ اٹاوے، لکھنؤ، علی گڑھ اور برلن (جرمنی) میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں تک تعلیمی اعتبار سے ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ تھے۔ 1920ء میں ترکِ موالات کے تحت علی گڑھ یونی ورسٹی کو خیرباد کہہ کر جامعہ ملیہ میں آگئے اور اس کی تعمیر اور فروغ میں لگ گئے۔ 1926ء سے 1953ء تک وہ جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر رہے۔ جامعہ ملیہ میں ایک استاد کی حیثیت سے اُن کا تقرر -/300 روپے ماہوار پر ہوا تھا مگر انھوں نے صرف -/200 روپے ماہوار تنخواہ لینا منظور کی تھی۔ کچھ عرصے بعد وہ -/150 روپے ماہوار لینے لگے اور جب اس ادارے کو انھوں نے خیرباد کہا اُن دنوں وہ تنخواہ کی صورت میں صرف -/95 روپے ماہوار لے رہے تھے۔ کئی برس تک ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے صدر رہے۔ 1948ء سے 1956ء تک مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ دو بار راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔ 1957ء میں بہار کے گورنر بنا دیے گئے اور پھر 1962ء میں نائب صدر جمہوریہ بنے اور مئی 1967ء میں صدر جمہوریہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1969ء میں اُن کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین آزاد ہندستان کے پہلے مسلمان تھے جو صدرِ جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1963ء میں اُن کو بھارت رتن کا اعزاز ملا۔ وہ صفِ اوّل کے ماہرِ تعلیم تھے۔ اُن کی ایک آنکھ بینائی سے محروم تھی۔ پھلواری لگانے اور طرح طرح کے خوش نما پتھر جمع کرنے کا اُن کو بہت شوق تھا۔ انھوں نے جامعہ کے ماہ نامے 'پیامِ تعلیم' میں ایک عرصے تک اپنی بیٹی رقیہ ریحانہ (جس کا پانچ ہی برس کی عمر میں انتقال ہوگیا تھا) کے نام سے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ انھوں نے کئی اہم انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی سال گرہ کبھی نہیں منائی صدرِ جمہوریہ بننے پر بھی انھوں نے اس بدعت کو نہیں اپنایا۔

سلطان رضیہ

دلی کے سلطان شمس الدین التمش نے اپنے بیٹوں کی نالائقی کی بنا پر اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ 26 برس حکومت کرنے کے بعد التمش کا انتقال ہوا اور رضیہ تخت پر بیٹھی دربار کے امیروں نے عورت کی حکم رانی کو مردوں کی توہین جان کر رضیہ کی مخالفت کی اور اُس کے چھوٹے بھائی رکن الدین (فیروز شاہ) کو تخت پر بٹھا دیا مگر وہ نااہل ثابت ہوا کر 28 ہی دن کے بعد وہ قید میں ڈال دیا گیا اور وہ قید خانہ ہی میں مر گیا۔ 634ھ میں امیروں ہی کی حمایت پر رضیہ تخت پر پھر بیٹھی۔ وزیر اور چند دوسرے امیروں نے پھر بھی بغاوت کی مگر رضیہ نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور اپنے ہر مخالف کو شکست دی۔

رضیہ نے اپنے دربار کے ایک حبشی امیر آخور یاقوت کو امیر الامراء بنا دیا۔ رضیہ کی نظرِ کرم سے وہ بے تکلف ہوگیا جب وہ گھوڑے پر سوار ہوتی تو وہ اُس کی بغل میں ہات دے کر اُسے سہارا دیتا۔ اِس سے بدنامی ہوئی اور مختلف علاقوں کے صوبیداروں نے رضیہ کے خلاف پروپیگنڈا کرکے بغاوت کردی۔ دراصل بغاوت ہی کی نیت سے امیروں نے رضیہ اور یاقوت کے تعلق کو افسانوی رنگ دیا تھا۔ ایک بغاوت کو فرو کرنے میں یاقوت مارا گیا اور رضیہ گرفتار کرلی گئی۔ اور امیروں نے رضیہ کے ایک بھائی بہرام شاہ کو بادشاہ بنا دیا۔ بھٹنڈا کا حاکم ملک التونیہ نے جب رضیہ کو قید سے چھڑایا تو رضیہ نے اُس سے شادی کرلی۔ دونوں نے فوج بنا کر دہلی پر حملہ کیا مگر ہار ہوئی اور بہرام شاہ نے 14 اکتوبر 1240ء کو رضیہ اور ملک دونوں کو قتل کردیا۔ قطب مینار سے گیارہ میل کے فاصلے پر رجی سجی کی جو قبر کہلاتی ہے وہ رضیہ ہی کی قبر ہے۔ رضیہ حافظِ قرآن تھی۔ فنِ سپہ گری میں ماہر تھی۔ مردانہ لباس پہن کر تخت پر بیٹھتی تھی۔ اُس نے 3½ برس حکومت کی۔

رفیع احمد قدوائی

رفیع صاحب 18 فروری 1894ء کو مسولی (ضلع بارابنکی، اتر پردیش) کے ایک زمین دار خاندان میں پیدا ہوئے باپ زمین دار بھی تھے اور تحصیل دار بھی، چچا وکیل تھے۔ رفیع صاحب نے علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج میں تعلیم پائی لیکن پڑھ رہے تھے کہ 1921ء میں ترکِ موالات کے تحت تعلیم ترک کردی۔ پنڈت موتی لال نہرو کے سکریٹری رہے اور اُنہی کی رہنمائی میں میدانِ سیاست میں آئے۔ 1922ء سے 1926ء تک کانگریس کمیٹی کے سکریٹری رہے اُنہی دنوں انھیں ایک برس کی جیل ہوگئی۔ سوراج پارٹی کے بھی ممبر اور وہپ بنے۔ 1937ء سے 1939ء تک یو۔پی کی وزارت میں ہوم منسٹر رہے۔ 1942ء میں 'ہندستان چھوڑو' تحریک کے سلسلے میں جیل چلے گئے۔ حصولِ آزادی کے بعد 1947ء میں یو۔پی کی وزارت میں پھر وزیر بنے اور اسمبلی میں زمین داری کے خاتمے کا بل انھیں کے ہاتھوں پیش ہوا جب مرکزی حکومت میں شامل ہوئے تو وزیرِ رسل و رسائل اور بعد میں وزیرِ غذا رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اندرونِ ملک میں ڈاک بذریعے ہوائی جہاز پہنچانے اور محکمۂ ڈاک کے لئے اتوار کی چھٹی کی ابتدا کی غیر متوقع سرکاری دورہ بھی اُنہی کی ایجاد ہے۔

رفیع صاحب اعلا قسم کے ایڈمنسٹریٹر تھے وہ جس وزارت میں گئے اُس کو سدھار دیا۔ وزارتِ غذا کے سلسلے میں صرف وہی کامیاب رہے۔ وزیر کی حیثیت سے کانگریس کی پالیسیوں پر جس طرح انھوں نے عمل کیا اور کرایا اُس کی مثال دوسرا کوئی وزیر آج تک نہیں پیش کرسکا۔ وہ اپنے زمانے میں

ایک ہی مسلمان کانگریسی تھے جن کے حامیوں میں مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم تھے۔ انھوں نے ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندوستان کے لیے اتنا کیا کہ وہ اپنی دلیش بھگتی کے کارن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی آبرو اور اُن کے کردار کی ضمانت بن گئے۔ 21 اکتوبر 1954ء کو جب رفیع صاحب کا انتقال ہوا تو وہ ایک لاکھ روپے کے مقروض تھے اور یہ قرض اپنے لیے نہیں بلکہ بیواؤں، یتیموں اور نادار طالب علموں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لیا گیا تھا۔

سلطان زین آل عابدین

سلطان سکندر کا بیٹا زین آل عابدین 1420ء میں کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ سلطان سکندر کے ظلم و ستم اور تعصب سے تنگ آکر جو پنڈت اور دوسرے ہندو کشمیر چھوڑ نے پر مجبور ہوئے تھے وہ زین آل عابدین کی انصاف پسندی، رواداری، بے تعصبی، خلوص و محبت کی بنا پر اپنے وطن کشمیر واپس آ گئے۔ سلطان عابدین نے براہمنوں اور ہندوؤں کو نئے دربار میں بڑے بڑے عہدے دیے۔ ہندو، مسلمان، بدھ، جین غرضے کہ ہر مذہب کے عالموں کی اس نے قدر کی۔ اس نے سنسکرت زبان میں تاریخ کشمیر لکھوائی۔ اپنے ایک درباری ملا احمد سے (جو سنسکرت اور فارسی کا بڑا عالم تھا) مہابھارت اور راج ترنگی کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ سلطان خود بھی اپنی مادری زبان کشمیری کے ساتھ ساتھ سنسکرت، فارسی اور تبتی زبان بھی جانتا تھا۔ وہ شاعر تھا اور مصنف بھی۔ ہر ملک سے نایاب کتابیں منگوا کر اس نے ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی تعلیم پر خاص توجہ دی تھی اور کئی بڑے بڑے مدرسے کھول رکھے تھے۔ عابدین کے باپ سکندر نے اپنے عہد میں گانے بجانے کی ممانعت کر دی تھی مگر عابدین نے موسیقی کو پھر سے رواج دیا۔ اس کے دربار میں کئی بڑے موسیقار موجود تھے۔ اس کے ایک درباری موسیقار نے علم موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی۔ سری نگر کے قریب نوشہرا اس کا دار حکومت تھا جہاں اس نے لکڑی کا ایک خوبصورت بارا منزلہ محل بنوایا تھا۔

سلطان عابدین نے اپنے ملک میں دست کاری، ریشمی کپڑے کی صنعت، کشیدہ کاری، شال بافی، کاغذ سازی اور جلد سازی کے ہنر کو بھی فروغ دیا۔ اپنی جنتا کا حال جاننے کے لیے وہ راتوں کو بھیس بدل کر گھومتا تھا۔ وہ اپنے انصاف کے سلسلے میں بہت مشہور تھا۔ اس نے اپنے ایک عزیز دوست (جو اپنی بیوی کا قاتل تھا) کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ وہ اپنے فرمان پیتل کے پتروں پر کندہ کرا کے اونچے مقامات پر جڑوا دیتا تھا۔ اس نے بازار کی ہر جنس کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ اس کی جانب سے ہر فرقے کو اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت تھی۔ وہ خود بھی سب کے تیوہاروں میں شریک ہوتا تھا۔ بدھ مت کا ایک عالم تو اُس کا مشیر خاص تھا۔ سلطان سکندر نے وہ کیا جو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے کیا اور سلطان عابدین نے چھوٹے پیمانے پر وہ کام انجام دیے جو ہندوستان گیر سطح پر اکبر بادشاہ نے انجام دیے۔ عابدین اپنی جنتا کا محبوب تھا۔ آج بھی اس کو پیار سے 'بڈشاہ' کہہ کر کشمیری یاد کرتے ہیں۔

سمیع آرٹسٹ

عبدالسمیع جو سمیع آرٹسٹ کے نام سے مشہور ہوئے ہوشنگ آباد (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے مگر اُن کا اصلی وطن امروہہ ہے۔ بمبئی کے جے جے اسکول آف آرٹ سے انھوں نے سات برس کے کورس کا ڈپلوما لیا۔ بمبئی کے مشہور انگریزی روزنامے 'بامبے کرانیکل' سے کچھ عرصہ وابستہ رہنے کے بعد مولانا محمد علی جوہر کے اخبار 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' میں کارٹونسٹ رہے۔ اُن کے بنائے ہوئے کارٹون اور اسکیچ 'ہندوستان ٹائمز'، 'نیشنل کال'، 'ہندو'، 'ریاست'، 'تیج' اور 'ڈان' وغیرہ میں اکثر شائع ہوئے۔ انھوں نے کئی ہندی، اردو، انگریزی کتابوں کے ٹائیٹل اور رسالوں کے سرورق اور ڈیزائن بنائے۔ وہ متعدد میڈل اور انعامات پا چکے ہیں۔ 29 برس دہلی میں رہنے کے بعد وہ 1948ء میں کراچی (پاکستان) منتقل ہو گئے۔

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی ضلع اعظم گڑھ (اترپردیش) کے گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ گاؤں کے مکتب سے تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ پھر اعظم گڑھ کے مدرسہ عربیہ میں درس لیا پھر جون پور کے ایک عربی مدرسے میں داخل ہوئے

مگر مولانا کی اصلی تعلیم تب شروع ہوئی جب غازی پور آ کر مولانا فاروق چڑیا کوٹی کے شاگرد بنے۔ بعد میں رام پور چلے گئے وہاں حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی اور پھر دیوبند آ گئے اور وہاں کے دار العلوم میں بھی چند برس زیرِ تعلیم رہے۔ لاہور پہنچ کر اورنٹیل کالج کے پروفیسر مولانا فیض الحسن سے عربی کی مزید تعلیم حاصل کی۔ جب اپنے والد کے ساتھ حج کو گئے تو مدینے کے سارے کتب خانوں کی سیر کی۔ حج سے واپسی کے بعد وکالت پڑھی، ملازمت کی، تجارت کی، زمین داری سنبھالی اور کچہری میں نقل نویس رہے اور قرق امین بھی مگر علم و ادب سے تعلق پھر بھی برقرار رہا اور آخر علی گڑھ کالج میں مشرقی زبانوں کے استاد مقرر ہو گئے وہاں پروفیسر آرنلڈ کو عربی بھی پڑھائی اور خود اُن سے فرانسیسی زبان پڑھی۔ جون 1883ء میں اعظم گڑھ میں شبلی نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی جو اب ایک ڈگری کالج بن چکا ہے۔ 1892ء میں وہ مصر، ترکی، شام اور بیروت کی سیاحت کو گئے۔ جنوری 1894ء میں حکومت کی جانب سے اُن کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا۔ 1896ء سے نظام حیدرآباد کی جانب سے اُنھیں 100/ روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوا۔ چار برس تک حیدرآباد میں سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ 1913ء میں انھوں نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین کے نام سے ایک علمی، ادبی اور تحقیقی ادارہ قائم کیا۔

مولانا شبلی ہمہ صفت انسان تھے۔ وہ مورخ تھے، شاعر، نثر نگار، نقاد اور سوانح نگار بھی تھے۔ وہ اپنے معاصر حالی، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ اردو کے عناصرِ اربعہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ترقی پسند مولانا تھے، قدامت پسند اور تنگ نظر ملّاؤں کے زبردست مخالف تھے۔ اُن کی درجنوں تصانیف میں 'المامون'، 'الفاروق'، 'الغزالی'، 'سوانح رومی'، 'علم الکلام'، 'شعر العجم'، 'سیرت نبی'، 'سیرت النعمان'، 'اورنگ زیب پر ایک نظر'، 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'، 'موازنۂ انیس و دبیر'، 'کتب خانۂ اسکندریہ'، 'مقالات'، 'مکاتیب' اور 'مجموعۂ کلامِ شبلی' اہم ہیں۔

بندوق چل جانے کے حادثے میں شدید طور پر زخمی ہو گئے تھے، ایک ٹانگ کٹوانا پڑی، مصنوعی ٹانگ کی مدد سے چلا کرتے تھے۔ جنجیرہ والی عطیہ فیضی سے اُن کی خط و کتابت بہت مشہور ہے۔ عطیہ پر اس حد تک ریشہ خطمی ہوئے کہ اپنے علمی مرتبے کو بھی فراموش کر بیٹھے۔ خوش خوراک اور خوش گزران تھے، لطیف غذاؤں کے عادی تھے، میٹھا زیادہ کھاتے تھے، پندرہ بیس روپے ماہوار کا باورچی رکھتے تھے۔ 18 نومبر 1914ء کو وفات پائی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی

مولانا شبیر احمد عثمانی 1887ء میں بجنور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور پھر وہیں ایک استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور 18 برس تک وہاں درس دیتے رہے پھر دہلی کے مدرسہ فتح پوری میں 2 برس تک استاد رہے۔ ڈابھیل (سورت) کے دار العلوم میں بھی 12 برس تک ہیڈ ٹیچر رہے۔ دار العلوم دیوبند میں سپرانٹنڈنٹ کے عہدے پر بھی 6 برس تک فائز رہے۔ جنگِ بلقان کے دنوں میں ہلال احمر (ریڈ کراس) کے لیے کافی چندہ جمع کیا۔ 1922ء سے 1946ء تک جمعیت علمائے ہند کی مجلسِ عاملہ کے ممبر رہے مگر جب 1946ء میں جمعیت علماء سے اختلاف پیدا ہوا تو انھوں نے جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی جس نے مسلم لیگ کی پالیسی کی حمایت کی۔ 1947ء میں پاکستان چلے گئے اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بنے۔ 1949ء میں بہاول پور (پاکستان) میں وفات پائی۔

اُن کی تصانیف میں 'فتح المسلم' (تین جلدیں)، 'تفسیر فوائد القرآن'، اور 'اعجاز القرآن' اہم ہیں۔ ماہنامہ 'تجلی' کے اڈیٹر جناب عامر عثمانی مولانا شبیر احمد عثمانی کے بھتیجے ہیں۔

سیدنا ملّا طاہر سیف الدین

سیدنا حضرت ملّاجی طاہر سیف الدین بوہرہ شیعہ مسلم برادری کے داعی 5 اگست 1885ء کو سورت میں پیدا ہوئے۔ 1915ء میں داعی قرار دیے گئے۔ 1950ء میں اُن کے عہد کی سلور جوبلی منائی گئی۔ تعلیم، صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے انھوں نے صیغۂ علمیہ کی بنیاد رکھی، جس کے تحت بہت سے مدرسے، اسکول اور ہوسٹل قائم کیے گئے۔ ملّاجی نے اپنے فرقے کو فضول خرچی سے بچائے رکھنے کے لیے 'اجتماعی نکاح خوانی' کی رسم کا بھی اجرا کیا۔ اس رسم کو 'رسمِ سیفی' کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کے ایک جید عالم تھے اور اسلامی کل چیز سے متعلق اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ 19 رجب 1385ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

سر ظفر اللہ خاں

6 فروری 1893ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ بیدار لسا بیگم مسٹر ایس اے خان کی صاحب زادی تھیں اور بڑی دین دار اور نیک خاتون تھیں۔ ظفر اللہ نے پندرہ ہی برس کی عمر میں احمدیہ فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کی اور وہ سلسلۂ احمدیہ سے وابستہ ہو گئے۔ وہ تعلیمی اعتبار سے بی۔ اے (آنرز) ایل۔ ایل۔ بی (آنرز) لندن، ایل ایل۔ ڈی (کینٹب) بار ایٹ لا (لنکنس اِن) ہیں۔ سیالکوٹ میں انھوں نے اپنے پیشہ وکالت کی ابتدا کی اور پھر لاہور پہنچ کر بیرسٹری کا سلسلہ شروع کیا۔ 35-1926ء میں وہ پنجاب لیجس لیٹو کانسل کے ممبر رہے، 31-1930ء میں انھوں نے انڈین راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ایک نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی، 1931ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے، 1933ء میں جوائنٹ سیلکٹ کمیٹی آف پارلیامنٹ آن انڈین ریفارمس میں ایک نمائندے کی حیثیت سے شریک رہے، 41-1935ء میں گورنر جنرل کی ایگزی کیٹیو کونسل کے ممبر رہے، 1942ء میں حکومتِ ہند کی جانب سے چین میں ایجنٹ مقرر ہوئے۔ 47-1941ء تک فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج رہے، 1947ء میں جب کہ وہ نواب بھوپال کے قانونی مشیر تھے، پاکستان بن جانے پر انھوں نے یو۔ این۔ او میں فلسطین کے مسئلے پر پاکستانی وفد کی قیادت کی، اور اسی طرح 1948ء میں انھوں نے مسئلۂ کشمیر کے سلسلے میں یو۔ این۔ او میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ اِن دنوں وہ عالمی کورٹ میں جج ہیں۔

چودھری محمد ظفر اللہ خان نے سیاست میں ہمیشہ اسی گروہ کا ساتھ دیا جو برطانوی حکومت کا پرجوش حامی رہا۔ اُن کو برطانوی عہد میں سر اور کے۔ سی۔ ایس۔ آئی کے خطابات ملے۔ وہ 32-1916ء میں قانون کے ایک مشہور رسالے "انڈین کیسیز" کے اڈیٹر رہے اور وہ کئی بلند پایہ قانونی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور اُن کو اردو زبان سے بھی کافی لگاؤ ہے اور یہ بھی کہ انھوں نے شہید بھگت سنگھ کے مقدمے میں سرکاری وکیل بن کر بھگت سنگھ کے خلاف وکالت کی تھی۔ سر ظفر اللہ ہی کے عہد (1931ء) میں مسلم لیگ قطعی طور پر رجعت پسند اور فرقہ پرست مسلمانوں کی جماعت بنی۔

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں 1870ء میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں کوٹ مہرتھ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سراج الدین ریاست کشمیر میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ ظفر علی خاں بھی 1892ء میں علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد اسی محکمۂ ڈاک و تار میں ملازم ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد اپنے ایک افسر سے جھگڑا کر بیٹھے۔ اس کی ہجو لکھ ڈالی۔ ملازمت سے الگ کر دیے گئے۔ علی گڑھ واپس آئے اور فرسٹ ڈویژن میں بی۔ اے کیا اور پھر نواب محسن الملک کے سیکریٹری ہو گئے۔ محسن الملک کی سفارش پر ریاست حیدرآباد کی فوج میں ملازمت مل گئی اور پھر فوجی دار الترجمہ کو منتقل ہو گئے۔ کچھ دن ریاست کے اسسٹنٹ رجسٹرار رہنے کے بعد میر عثمان علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر اسسٹنٹ ہوم سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ ہوم سیکریٹری نواب سربلند جنگ چڑچڑے مزاج کے انسان تھے۔ ظفر علی خاں نے اُن کی بھی ہجو لکھ ڈالی، ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ بمبئی میں اپنے ایک دوست کے ساتھ اورینٹل کمرشل کمپنی کے نام سے امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کیا، جاپان سے ریشم منگوایا اور افریقہ سے ہاتھی دانت مگر بات نہ بنی۔ جب اُن کے ایک دوست حیدرآباد میں ہوم سیکریٹری مقرر ہوئے تو اُن کی سفارش سے ظفر علی خاں کو حیدرآباد کی لیجس لیٹو اسمبلی کا رجسٹرار بنا دیا گیا۔ یہاں انھوں نے لارڈ کرزن کی خیابان فارسی کا اردو میں اس حد تک اچھا ترجمہ کیا کہ پنجاب یونی ورسٹی نے 500 روپے اور نظام نے 3 ہزار روپے انعام دیا۔ داغ دہلوی اُن دنوں نظام میر محبوب علی کے استاد تھے انھوں نے بھی مولانا ظفر کی زبان کی تعریف کی۔ "سیر ظلمات"۔ "فسانۂ لندن"۔ "سنہری گھونگا" وغیرہ ترجموں کے بعد مولانا ظفر نے موسا ندی کی تباہ کن طغیانی پر ایک ایسی نظم کہی کہ جس نے سب کو متاثر کیا اور اس طرح انھوں نے اردو شعر و نظم میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ اور پھر انھوں نے حیدرآباد سے "دکن ریویو" نام کا ایک جریدہ جاری کیا۔ اُنہی دنوں کی بات ہے کہ حیدرآباد میں ایک یورپین تھیٹریکل کمپنی آئی۔ اُس نے نیم برہنہ ایکٹریسوں کے رقص پیش کیے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس پر سخت تنقید کی۔ مولانا کی تنقید انگریز ریذی ڈنٹ سر مائیکل کو ناگوار گزری۔ نتیجے میں مولانا ریاست بدر کر دیے گئے

جب مائیکل پنجاب کے گورنر بنا دیے گئے تو مولانا کو حیدرآباد جانے
کا پھر موقع ملا مگر کہتے ہیں کہ خواجہ حسن نظامی کی شکایت پر دو برس بعد
حیدرآباد سے پھر نکال دیے گئے اور پنشن بھی ضبط ہو گئی۔

اخبار 'زمین دار' مولانا ظفر علی خاں کے والد نے جاری کیا
تھا۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے اخبار کے کام کو سنبھالا اور اخبار کو
وزیرآباد سے لاہور لے آئے مگر پالیسی کے اعتبار سے بزم کو رزم سے
بدل دیا۔ وہ جنگِ بلقان کا زمانہ تھا اخبار چند ہی دن میں مقبول ہو گیا
قابلِ اعتراض پالیسی کی بنا پر گورنر پنجاب (سر مائیکل) نے اخبار سے ضمانت
طلب کی اور مولانا ظفر کو نظربند کر دیا۔ رہا ہوئے تو انھوں نے پھر اخبار جاری
کیا۔ غرضیکہ مولانا کی بے باکی اور انگریز حکومت کے عتاب کا سلسلہ
جاری رہا۔ اور کہتے ہیں کہ اخبار کی ضمانتوں کی صورت میں مولانا نے مجموعی
طور پر جو روپیہ سرکار کو ادا کیا وہ کم و بیش ۳ لاکھ ہوتا ہے انھوں
نے ہر سیاسی تحریک میں بھی عملی حصہ لیا اور جیل گئے اُن کی قید کی
مجموعی مدت ۱۲ برس ہوتی ہے۔ وہ کانگریسی بھی رہے، مسلم
لیگی بھی، خلافتی بھی اور احراری بھی، ہر کوچے میں قدم رکھا مگر
ٹھہرے کہیں نہیں، دراصل وہ سراپا ہنگامہ تھے۔ ایک بار مولانا
آزاد نے اُن کے بارے میں کہا تھا:-

'ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کے بجائے ہفتوں میں
چلانا ہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ
دو۔ وہ بسرعت تمام یہ قلعہ بنا ڈالیں گے لیکن
جب قلعہ بن جائے تو اُن کو فوراً باہر نکال دو
کیونکہ وہ پھر اُس قلعے کو ڈھا دیں گے'

یقیناً اُن کا مزاج مولانا شوکت علی سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کے
سلسلے میں یہ بات مشہور رہی ہے کہ جب انھیں اپنے خرچ کے لیے
روپے کی ضرورت ہوتی تو اپنے اخبار 'زمین دار' میں حکومت کے
خلاف اداریہ لکھتے، نتیجے میں حکومت ضمانت طلب کرتی اور پھر یہ
قوم سے چندے کے لیے اپیل کر دیتے، اتنا مل جاتا کہ دونوں کام
انجام پا جاتے۔ ضمانت بھی ادا ہو جاتی اور اپنی ضرورت بھی پوری ہو جاتی
۔ مگر 'زمین دار' کا ادارہ درحقیقت ایک انسٹی ٹیوشن تھا جس میں
وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید
سالک، چراغ حسن حسرت، نصر اللہ خاں عزیز، حاجی لق لق اور
حفیظ جالندھری جیسے حضرات نے تربیت پائی۔

مولانا ظفر علی خاں کی نثر کی تعریف کرتے ہوئے اقبال نے کہا
تھا: 'ظفر علی خاں کا قلم مصطفیٰ کمال کی تلوار ہے۔' مولانا کو نعت
کہنے میں بھی کمال حاصل تھا اسی لئے مخالف ہونے کے باوجود خواجہ حسن
نظامی نے اُن کی اس خوبی کو یہ کہہ کر سراہا تھا: 'قیامت کے روز وہ
اپنی نعتوں کے باعث بخشے جائیں گے۔' مگر وہ سیاست میں ہجو کے
بھی بانی تھے۔ اُن کے شعری مجموعوں کے نام 'بہارستان'، 'نگارستان'،
'چمنستان'، 'ارمغانِ قادیان'، 'حبسیات' اور 'روحِ معانی'
ہیں۔ اُن کا کلام دراصل سیاسی واقعات کی تاریخ ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کی نثر میں علم کی کمی تھی، شاعری میں فکر
کی اور سیاست میں خلوص کی۔ اس لیے اُن کا تاثر زیادہ دقت
تک قائم نہیں رہتا تھا۔

اُن کی شادی ۱۲ برس کی عمر میں کر دی گئی تھی اس لیے
وہ بہت دنوں تک اپنی بیوی کو اپنے گھر والوں کی مہمان ہی سمجھتے
رہے۔ سفر میں بھی وہ اپنے ملازم اور حقّے کو ساتھ رکھتے تھے،
اُن کا کہنا تھا:-

زندگی کے لطف دو ہی تو ہیں
صبح کی چائے، شام کا حقّہ

کالج کے لڑکے آتے شعر کی فرمائش کرتے، پہلے تکلّف
کرتے، پھر فی کس ایک تازہ شعر فرماتے، طبیعت کی آمادگی کا یہ
عالم رہتا تھا کہ بعض اوقات ایک ہی نشست میں دس دس نظمیں
موزوں ہو جاتی تھیں۔

مولانا ظفر علی خاں نے اپنی زندگی میں ترکی اور افغانستان کا
بھی دورہ کیا وہ اپنے وفد کے امیر کی حیثیت سے سلطان ترکی اور جنرل
نادر خاں سے بھی ملے۔

وہ پہلے اردو شاعر تھے جنھوں نے طنز کو عملی سیاست میں تیر
و نشتر کی حیثیت سے استعمال کیا۔ اگر سیاسی اردو صحافت سے اُن
کی قلمی ہنگامہ آرائیوں کو خارج کر دیا جائے تو اردو صحافت کی تاریخ
قطعی طور پر غیر اہم ہو کر رہ جائے۔

شیخ عبداللہ

شیخ صاحب 29 جنوری 1903ء کو موضع سورہ (سری نگر، کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے دو ہفتے قبل ہی اُن کے والد محمد ابراہیم کا انتقال ہو گیا۔ والد پشمینے کے تاجر تھے والدہ نے اپنے قریبی رشتے داروں کی مدد سے اِس تجارت کو جاری رکھا اور بیٹے کی پرورش کرتی رہیں۔ شیخ صاحب دس ویں ہی درجے تک پہنچ پائے تھے کہ والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ بمشکل تمام الف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد شیخ صاحب نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد علی گڑھ چلے گئے۔ انھوں نے وہاں سے ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ لاہور کے قیام میں جب شیخ صاحب موسم سرما میں کشمیری لوگوں کو محنت مزدوری کرتے ہوئے دیکھتے اور پھر اُن کی کسمپرسی کا موازنہ زندہ دل پنجابیوں سے کرتے تو اُن کو شدید طور پر دُکھ ہوتا۔ انھوں نے تعلیم ختم کرنے کے بعد کشمیریوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی مگر اُن کا حوصلہ بڑھانے والا کوئی نہ تھا اس لئے مجبور ہو کر انھوں نے کشمیر ہی میں ملازمت کر لی۔ یعنی وہ -/60 روپے ماہ وار پر سائنس ٹیچر ہو گئے۔ آخر کشمیریوں کو سر بلندی دینے کی خاطر وہ 1931ء سے میدانِ سیاست میں آ گئے۔ اور انھوں نے کشمیر میں جمہوری حکومت کے قیام کے لئے تحریک چلائی اور مسلم کانفرنس قائم کی جو 1939ء میں نیشنل کانفرنس میں بدل گئی۔ 1946ء میں انھوں نے 'کشمیر چھوڑ دو' تحریک شروع کی اور جیل گئے۔ وہ آل انڈیا اسٹیٹس پیوپلز کے صدر بھی رہے۔ 1947ء میں جب کہ وہ کشمیر کے وزیرِ اعلا تھے انھوں نے پاکستانی حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1953ء میں اُن کے اور حکومتِ ہند کے درمیان بدظنی، بدگمانی یا کچھ ایسی بے اعتباری پیدا ہوئی کہ 9 اگست کو وہ گرفتار کر لیے گئے اور 1958ء تک نظر بند رہے پھر 1958ء سے 1964ء تک اور پھر 1965ء سے 1967ء تک نظر بند رکھے گئے۔

اگرچہ شیخ صاحب کو مطالعے کا شوق نہیں ہے مگر قرآن پاک قرأت سے پڑھنا اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنا اُن کو پسند ہے وہ اچھا کھانے، اچھا پہننے اور آرام دہ زندگی گزارنے کی بھی خواہش رکھتے ہیں۔

[illegible]

بابائے اُردو مولوی عبدُالحق

مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء کو ہاپڑ (ضلع میرٹھ، اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ مولوی صاحب کے آبا و اجداد ہندو (کائستھ) تھے، شاہ جہاں کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ مولوی صاحب نے میٹرک تک فیروز پور (پنجاب) میں اپنے ماموں کے پاس تعلیم پائی۔ بی۔ اے (1897ء میں) علی گڑھ سے کیا۔ علی گڑھ ہی میں سر سید اور حالی کی صحبت حاصل ہوئی اور سر سید کے مشہور جریدے 'تہذیب الاخلاق' سے اُن کی مضمون نویسی شروع ہوئی۔ سر سید کی ایما پر اور محسن الملک کی سفارش پر وہ نظام حیدرآباد میں آصفیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل بھی رہے اور پھر عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے ہیڈ مقرر ہوئے حکومتِ نظام میں انھوں نے صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ اورنگ آباد میں ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری رہے اور 1935ء میں انجمن کا دفتر دہلی لے آئے۔ 1947ء کے فسادات میں انجمن کا دفتر لٹ گیا۔ چوں کہ مسلم لیگی نظریات کے حامل تھے اِس لیے مولانا ابو کلام سے اختلاف پیدا ہو گیا اور آخر دہلی سے کراچی چلے گئے اور وہاں از سرِ نو انجمن ترقیٔ اُردو کی بنیاد رکھی۔ مولوی صاحب کی تصانیف میں 'سر سید احمد خاں'، 'انگریزی اردو لغت'، 'اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'، 'قواعد اُردو' اور 'چند ہم عصر' اہم ہیں۔ مقدمات جو انھوں نے دوسرے مصنفوں کی تصانیف کے لیے لکھے اور وہ خطبات بھی جو انھوں نے مختلف ادبی کانفرنسوں میں دیے قابلِ ذکر ہیں۔ 16 اگست 1961ء کو کراچی میں وفات پائی۔

کم و بیش نصف صدی تک مولوی عبدالحق نے خلوصِ دل سے اردو زبان کی خدمت کی اِسی لئے بابائے اُردو کہلائے۔ کہتے ہیں کہ وہ زندگی بھر مجرّد رہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی عمر میں اُن کی شادی ہوئی تھی مگر دو تین ہی رات گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ وہ اچھا کھانا کھانے کے شوقین تھے۔ وہ آزاد مشرب انسان تھے۔

عبدُالرّحمان چغتائی

محمد عبدُالرّحمان چغتائی لگ بھگ 1900ء میں لاہور کے محلہ

چابک سواراں کے ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے۔ وہ ایرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے فن کا سب سے بڑا کارنامہ 'مرقع چغتائی' (دیوانِ غالب کے اکثر شعروں کی رنگین تشریحی تصاویر) ہے جس کی طباعت 1930ء میں برلن (جرمنی) میں ہوئی تھی۔ اِس مثالی مرقع کی بنا پر اُن کو بین اقوامی شہرت حاصل ہوئی اور انگریز حکومت نے اُن کو خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ صدر ایوب کے عہد میں چغتائی نے کلیاتِ اقبال' (مصوّر) پیش کی۔ اس کے صلے میں حکومتِ پاکستان نے اُن کو 2 لاکھ روپے انعام دیا۔ اُس 'کلیاتِ اقبال' کی قیمت 16 سو روپے ہے۔

اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ چغتائی انڈو ایرانین یا انڈو مسلم آرٹ کے احیا کرنے والوں میں سے ہیں مگر دراصل وہ خلّاق ہیں اور منفرد آرٹسٹ ہیں اسی لئے اُن کے فن کو چغتائی آرٹ کہا جاتا ہے اور اُن کا ہر شاہ کار ایک جمالیاتی کارنامہ ہوتا ہے ؎

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہات باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

غالب کے اس شعر کی تشریح چغتائی نے اِس طرح کی ہے کہ کنول میں جلتا ہوا چراغ دریا میں بہتا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں دوسرا کوئی مصوّر اس شعر کی اِس سے بہتر تشریح نہیں کرسکا۔ چغتائی با قاعدہ طور پر کسی کے شاگرد نہیں بنے انھوں نے جو کچھ سیکھا اپنی لگن اور کاوش ہی سے سیکھا۔ نفاست، نزاکت، موضوع اور رنگوں کا حسین امتزاج اُن کے فن کی خصوصیات ہیں۔

وہ دراز قد ہیں اور اُن کا سر بھی معمول سے بڑا ہے اور اُن کی شخصیت پُروقار ہے۔ پنڈت نہرو اُن کے بڑے مداح تھے اور چاہتے تھے کہ دہلی یا کلکتے میں چغتائی کی تصویروں کی نمائش ہو۔ چغتائی دُنیا کے بڑے مصوّروں میں سے ہیں اور آج کل اپنی بنوائی ہوئی ایک شان دار کوٹھی (واقع بیرمکی، راوی روڈ، لاہور ۲) میں رہتے ہیں۔

(تاریخِ وفات: 17 جنوری 1975ء) (لطیف آرٹسٹ)

عبدالرحیم خان خاناں

اکبر جن دنوں دہلی میں تھا اپنے اتالیق بیرم خاں سے ناراض ہو گیا۔ بیرم خاں افسردہ اور مایوس ہو کر حج کے لئے روانہ ہوا مگر راہ میں گجرات پٹن کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا اس وقت بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم صرف تین برس کا تھا۔ ماں کے ساتھ اکبر کی خدمت میں پہنچا اور آخر اکبر ہی کی نگرانی میں پرورش ہوئی۔ بچپن ہی سے ذہین تھا، عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کی تعلیم پائی اور بڑا ہو کر ہندی اور فارسی کا ایک مستند شاعر بنا۔ اُس نے سیکڑوں دوہے کہے جو 'رحیم ست سئی' کہے جاتے ہیں۔ رحیمؔ اس کا تخلص تھا۔ اس نے 'تزکِ بابری' کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ وہ فنِ سپہ گری میں بھی ماہر تھا۔ اکبر نے اس کو ہفت ہزاری کا منصب دے کر سپہ سالار بنا دیا اور اس کو شاہ زادہ سلیم کا اتالیق بھی بنا دیا۔ اکبر رشتے میں خان خاناں کا خالو بھی ہوتا تھا

خان خاناں جوانی میں نہایت حسین تھا رستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ 1697ء میں انتقال ہوا۔

خان عبدالغفار خاں

ہشت نگر (صوبہ سرحد) کے اُت مان زئی گاؤں میں 1890ء میں پیدا ہوئے۔ باپ بہرام خاں، دادا سیف اللہ خاں اور پردادا کا نام عبیداللہ خاں تھا۔ گاؤں کے مکتب میں قرآن پڑھا، پشاور کے میونسپل اسکول میں تعلیم پانے کے بعد پشاور کے مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ باپ بہت خوش حال تھے اور ماں بہت فیاض تھیں روزانہ ایک ہانڈی زیادہ سالن محلے کے غریب گھروں کے لیے پکاتی تھیں گاؤں میں آیا ہوا وہ مہمان جو کسی کا رشتے دار نہ ہوتا اُس کو بہرام خان اپنا مہمان بناتے۔

میٹرک کرنے کے بعد بادشاہ خان نے فوج میں نوکری کرلی مگر انگریز کی چاکری نہ کرسکے۔ نوکری چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1901ء میں جب انگریزوں نے صوبہ سرحد کو پنجاب سے الگ کیا تو بادشاہ خان میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ 1910ء میں انھوں نے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قائم کیا جو 1915ء تک جاری رہ سکا۔ اُنھی دنوں انھوں نے اپنے صوبے کے سارے 3 ہزار گاؤں کا دورہ کیا اور اپنے عوام سے ملے۔ اسی دورے میں اُن کے عوام نے اُن کو اپنا بادشاہ خان مان لیا۔ 1914ء میں شیخ ہند مولانا محمود الحسن کی ہدایت پر دیوبند پہنچ کر اُن

سے ملے اور پھر بعد میں ان کی تحریک (ریشمی خطوط) میں اُن کے معاون ثابت ہوئے۔ 6 اپریل 1919ء کو رولٹ ایکٹ کے ردِ عمل میں وہ باقاعدہ میدانِ سیاست میں آئے اور نتیجے میں اُن کو تین برس کی جیل ہوگئی۔ 1924ء میں اُن کے عوام نے اُن کو 'فخرِ افغان' قرار دیا۔ 1926ء میں وہ حج کو گئے۔ 1928ء میں انھوں نے اخبار 'پختون' جاری کیا جو اُن کے اپنے سیاسی نظریے کا ترجمان تھا مگر بعد میں انگریز حکومت نے اُسے بند کر دیا۔ آزادی کے بعد اُسے پھر جاری رکھنے کی کوشش کی گئی مگر حکومتِ پاکستان نے بھی اُسے نہ چلنے دیا۔ 1928ء میں لکھنؤ میں کانگریس کے اجلاس میں بادشاہ خان کی ملاقات گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے ہوئی اور انہی دنوں وہ علی برادران سے بھی ملے۔ گاندھی جی کے عدم تشدد سے وہ بے حد متاثر ہوئے اور علی برادران کی جذباتی سیاست سے وہ سخت مایوس ہوئے

1929ء میں بادشاہ خان نے 'خدائی خدمت گار' جماعت بنائی جو دراصل افغان جرگے کو منظم کر کے بنائی گئی تھی۔ اس جماعت کو 'سرخ پوش والنٹیر کور' بھی کہا گیا۔ یہ جماعت عدم تشدد کی حامی تھی۔ اس کے والنٹیر کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ انگریز حکومت نے اس جماعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بادشاہ خان کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ہمیشہ ممبر رہے اور کانگریس کی ہر تحریک میں حصہ لیا اور بار بار جیل گئے اور گاندھی جی کے پیرو کار ہونے کی بنا پر اُن کو سرحدی گاندھی کہا گیا۔

1947ء میں وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ممبر رہے مگر تھوڑے ہی دن بعد اُن پر ملک کا وفادار نہ ہونے کا الزام لگایا گیا اور جون 1948ء میں حکومت پاکستان نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ایک طویل مدت کے بعد 30 جنوری 1964ء کو رہا ہو کر وہ بغرض علاج پاکستان سے لندن چلے گئے اور پھر وہاں سے کابل پہنچ گئے۔ گاندھی جی کی 100 ویں برس گرہ کے دنوں میں بادشاہ خان کو کابل سے ہندوستان مدعو کیا گیا اور وہ 1969ء میں 'خان عبدالغفار خان برس گرہ سمتی' کی دعوت پر ہندوستان کے دورے پر آئے۔

بادشاہ خان نے دو شادیاں کیں۔ پہلی 1912ء میں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد 1920ء میں دوسری شادی کی

دوسری بیوی حج کے دوران میں بیتِ مقدس میں سیڑھیوں سے گر کر انتقال کر گئیں۔ بادشاہ خان کا قد 6 فٹ اور 3 انچ ہے وہ استغنا و درویشی کی ایک مثالی زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کا سارا ساز و سامان صرف دو جوڑے کپڑوں پر مشتمل ہوتا ہے، ایک جوڑا پہنے ہوتے ہیں اور دوسرا چادر میں تہہ کیا ہوا بغل میں دبائے رکھتے ہیں۔ لیڈر ہو کر دولت کی نالوکی انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے باوجود کبھی ریل کا کرایہ تک نہیں لیا۔ بادشاہ خان نے 15 برس انگریزی حکومت کے جیلوں میں گزارے اور 15 برس پاکستانی جیلوں میں۔ گاندھی جی کی خواہش کے باوجود انھوں نے کانگریس کی صدارت کبھی قبول نہیں کی۔

عبدالقیوم انصاری

پہلی جولائی 1905ء کو ڈیری آن سون (بہار) میں پیدا ہوئے علی گڑھ، کلکتہ اور الہ آباد میں تعلیم پائی۔ 21-1920ء میں خلافت تحریک اور ترکِ موالات میں حصہ لیا اور جیل گئے۔ 'الاصلاح' اور 'مساوات' نام کے اردو جریدوں کے مدیر رہے۔ 1924ء میں بہار انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری اور 1930ء سے 1937ء تک بہار سیرت کمیٹی کے سیکریٹری رہے۔ 1938ء میں مومن تحریک کی ابتدا کی اور بہار صوبائی جمعیتِ مومنین کے صدر اور آل انڈیا مومن کانفرنس کے نائب صدر بنے اور ہینڈلوم انڈسٹری کے تحفظ کے لئے بہت سے کام کئے۔ آل انڈیا آزاد مسلم کانفرنس کی ایگزیکیٹو کے ممبر بنائے گئے۔ ریاست بہار کی وزارت (1947ء) میں وہ پبلک ورکس اور کاٹیج انڈسٹری کے وزیر تھے۔

عبدالقیوم انصاری پٹنہ یونیورسٹی کے فیلو بھی رہے، 19 جنوری 1973ء کو اُن کا انتقال ہوا۔

مولانا عبیداللہ سندھی

10 مارچ 1872ء کو ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیان والی میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام رام سنگھ تھا اور دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے مختار کار تھے۔ پیدائش سے چار مہینے پہلے باپ کا انتقال ہوا اور دو برس بعد دادا کا۔ ددھیال ہندو تھی اور ننھیال

سکھ، ایک مسلمان ہم جماعت کے توسط سے اسلام کے موضوع پر دینی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ گھر سے چل پڑے اور 1887ء میں سکھ سے مسلمان ہوگئے۔ سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر محمد عظیم خاں کی لڑکی سے شادی ہوگئی۔ مولانا عبید اللہ نے دیوبند، گنگوہ اور دہلی میں مذہبی تعلیم حاصل کی اور وہ اپنی ذہانت اور اسلام دوست ہونے کی بنا پر شیخ ہند مولانا محمود حسن کے شاگرد رشید بن گئے اور اپنے استاد کی ہدایت پر جمعیت انصار کے تحت ریشمی خطوط کی تحریک کے سلسلے میں کابل چلے گئے۔ جنگی نقشوں کی ترتیب کا کام اُن کے سپرد تھا۔ اِسی سلسلے میں انھوں نے روس، ترکی اور مکّے کا بھی سفر کیا مگر نتیجے میں اُن کو امیر افغانستان حبیب اللہ سے یہی مشورہ ملا کہ ہندستان کو آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔
شیخ ہند مالٹا سے رہا ہو کر جب ہندستان پہنچے تو کانگریس میں شامل ہوگئے۔ مولانا عبید اللہ نے بھی اپنے استاد کی تقلید میں کابل میں کانگریس قائم کی اور اس کے صدر بن گئے۔ 24 برس کی جلاوطنی کے بعد 7 مارچ 1939ء کو مولانا عبید اللہ ہندستان (کراچی) واپس آئے۔ سندھ کے سرمایہ داروں نے چاہا کہ وہ اُن کی جماعت کے قائد بن جائیں مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے بعد وہ اپنے تجربے کی بنا پر کہا کرتے تھے: "مسلمانو! جب تک تم ہندستانی نہ بنو گے نہ تمھاری اپنے ملک میں عزت ہوگی اور نہ اسلامی ملکوں میں تمھیں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔" مولانا عبید اللہ نے مولوی ملاؤں پر بھی سخت نکتہ چینی کی کہ ان کے کردار اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔
اس پر مسلم سماج نے مولانا کو کافر قرار دیا۔ مولانا نے اپنی زندگی کے آخری ایام جامعہ ملیہ میں گزارے اور 22 اگست 1944ء کو اُن کا انتقال ہوا۔

عزیز النسا بیگم

سر سید احمد خاں کی والدہ عزیز النسا بیگم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد کی سب سے بڑی بیٹی تھیں میر متقی سے اُن کی شادی ہوئی تھی۔ اُن کے تین اولادیں ہوئیں۔ سید محمد خاں، سید محمد احمد خاں اور صفیہ ۔۔ اگرچہ انھوں نے صرف قرآن شریف پڑھا تھا اور فارسی کی چند ابتدائی کتابیں مگر وہ اولاد کو تربیت دینے کے فن سے خوب واقف تھیں۔ سر سید نے "گلستان" کے سبق اُنھی سے پڑھے۔
انھوں نے اپنے بیٹے سر سید کو یہ تعلیم دی تھی کہ انتقام لینے کی بہ نسبت معاف کر دینا زیادہ عمدہ کام ہے۔ نوکروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ دوستی نبھانے کے لیے ہوتی ہے توڑنے کے لیے نہیں دوسرا اپنا فرض ادا کرے یا نہ کرے تم اپنا فرض انجام دیئے جاؤ۔ کسی کے نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اور ایسی عادت اختیار کرو جو ہر حالت میں نباہ سکو۔ سر سید کی والدہ بہت اچھی منتظم، لائق، فرض شناس، رحم دل اور ممتا بھری خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ نادار، مسکین اور بیمار عورتوں کے رہنے سہنے اور علاج کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ اوہام پرست بالکل نہیں تھیں۔ منّت، نیاز، تعویذ، گنڈا، شبھ گھڑی یا ساعتِ بد، سعادت یا نحو پر وہ بالکل یقین نہیں رکھتی تھیں۔ دلّی سے میرٹھ منتقل ہونے کے ایک برس بعد یعنی 1858ء میں میرٹھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ اُن کی وصیّت تھی کہ اُن کو کچی قبر میں دفن کیا جائے۔ اُن کی نہ کوئی نماز قضا ہے نہ روزہ، صرف بیماری کے دنوں میں نمازیں قضا ہوئی ہیں اُس کے کفارے میں اسی حساب سے غریبوں میں گیہوں بانٹ دیا جائے۔ سعادت مند بیٹے سر سید احمد خاں نے ماں کی یہ دونوں وصیتیں پوری کردیں۔

عصمت چغتائی

عصمت 1915ء میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آبائی وطن آگرہ تھا بعد میں والدین علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ علی گڑھ ہی سے عصمت نے بی اے کیا۔ اپنے بھائی اردو زبان کے مشہور مزاح نگار مرزا عظیم بیگ چغتائی نے انھیں قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھائی۔ اور انھوں ہی نے عصمت کو مطالعے کی طرف راغب کیا اور پھر انھی کے نقشِ قدم پر چل کر وہ افسانہ نگار بن گئیں اُن کا پہلا افسانہ "فسادی" تھا جن دنوں شاہد لطیف ایک فلم رائٹر کی حیثیت سے بامبے ٹاکیز میں ملازم تھے عصمت کی اُن سے شادی ہوئی بمبئی آکر وہ بھی فلم رائٹر بن گئیں لیکن اُن کی پہلی فلمی کہانی "شکایت" تھی اور اُن

کی فنی کہانیوں میں 'ضدی'، 'بزدل'، 'سونے کی چڑیا'، اور 'کم ہوا' قابل ذکر ہیں۔

وہ اپنی زندگی میں اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی اور ڈاکٹر رشید جہاں سے زیادہ متاثر ہیں۔ وہ ہند و پاک کی خواتین افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ مقبول ہیں اور ان کی تحریروں نے مسلمان لڑکیوں کو طلسم کے گنبد سے باہر آنے میں مدد دی ہے۔ وہ پان کھانے اور تاش کھیلنے کی شوقین ہیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاری

عطاء اللہ شاہ بخاری 1891ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا و اجداد بنی راسے سری نگر (کشمیر) میں آکر بسے۔ بچپن ہی میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ والد گجرات چلے گئے۔ نانا نانی نے شاہ صاحب کو پالا پوسا۔ نانا علم دوست انسان تھے انہی کی صحبت میں شاہ صاحب کو بھی ادبی ذوق پیدا ہوا۔ نانی کے انتقال کے بعد گھر چھوڑ دیا۔ امرتسر میں حدیث، قرآن اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، نوکریاں کرتے تھے اور تحصیل علم جاری رکھتے تھے۔ بنارس میں کچھ دن چاندی کے ورق کوٹ کر بھی اپنا پیٹ بھرا۔ تحریک خلافت سے سیاست میں آئے اور 1922ء میں جیل ہو گئی۔ بعد میں بھی کئی بار جیل جانا پڑا۔ 1931ء میں جماعت احرار کے بھی رکن رہے۔ میدان سیاست میں اپنی مثالی خطابت کی بنا پر وہ تھوڑے ہی دنوں میں کافی مشہور ہو گئے۔

1961ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کی سبھی علاقائی زبانوں پر اُن کو عبور حاصل تھا۔ جہاں تک عوامی خطابت کا تعلق ہے اردو زبان میں شاہ صاحب سے بڑا خطیب دوسرا کوئی نہیں ہوا۔ خطابت اُن کی کرامت تھی۔ وہ کہا کرتے تھے 'میں دنیا میں سے صرف ایک چیز سے محبت کرتا ہوں وہ ہے قرآن، ایک چیز سے نفرت کرتا ہوں وہ ہے انگریز۔ انگریزوں کو مارنے کے لئے میں سوروں سے بھی اتحاد کرنے میں گریز نہ کروں۔' شاہ صاحب کی عمر کا زیادہ حصہ ریل و جیل میں گزرا۔ اُن کا کہنا تھا کہ میرے لیے جیل خانہ صرف نقل مکانی ہے مگر اُن کو سیاحت کا کوئی شوق نہیں تھا مگر ضرورت ہی نے اُن کو بہت سے سفر کرنے پڑے۔ عمارتی حسن سے بھی اُن کو لگاؤ نہیں تھا تاج محل

کہ وہ مزدوروں کی بے گاری کی یادگار سمجھتے تھے۔

علاء الدین صابر

شیخ علاء الدین صابر چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ شیخ فرید گنج شکر کے بھانجے تھے۔ ننھیال سے اُن کو یہ خلافت ملی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ کلیر (رڑکی ضلع سہارن پور۔ اتر پردیش) اُن کی بددعا سے ویرانے میں بدل گیا تھا اور اُن کی قبر کا پتا ایک برہمن نے لگایا تھا۔ شیخ صاحب کا مزار کلیر میں ہے اور حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ کے بعد کلیر کی درگاہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سر سید علی امام

سید علی امام 11 فروری 1869ء کو اپنے ننھیال نیورا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ 1887ء میں انھوں نے ضلع آرہ سے امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا اور پھر فوراً ہی انگلستان چلے گئے جہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور واپس آکر پٹنا میں پریکٹس شروع کی۔ سید صاحب کی ذہنی صلاحیت سے حکومت ہند اتنی متاثر ہوئی کہ حکومت نے اُن کو اسٹینڈنگ کاؤنسل مقرر کیا اور پھر تھوڑے ہی دن بعد وہ لا ممبر بنا دیے گئے۔ وائس رائے کی کاؤنسل کے نائب صدر بھی بنائے گئے۔ وائس رائے لارڈ ہارڈنگ کو سید صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ بہار کو بنگال سے الگ کرتے وقت اُس نے اُن سے مشورہ کیا تھا اور سید صاحب ہی کے مشورے پر بہار میں ہائی کورٹ قائم ہوئی اور یونیورسٹی قائم کی گئی۔ وہ بعد میں اس ہائی کورٹ کے جج بھی بنے اور وائس رائے کی مجلس عاملہ کے ممبر بھی مقرر ہوئے۔ 1918ء میں وہ نظام حیدرآباد کی دعوت پر حکومت ہند سے اجازت لے کر حیدرآباد چلے گئے جہاں اُن کو صدر اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا۔ 1909ء سے سید صاحب کی سیاسی زندگی شروع ہوئی جب کہ انھوں نے امرتسر میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی۔ لیگ آف نیشنز (جنیوا) کے پہلے اجلاس میں انھوں نے ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی اور لندن میں آخری گول میز کانفرنس میں بھی وہ شریک ہوئے۔

سید علی امام کو اپنی زندگی میں کئی خطابات اور اعزازات ملے

حکومت ہند کی جانب سے "سر" اور "کے سی آئی" کا خطاب ملا اور "ستارۂ ہند" کا میڈل بھی عطا ہوا۔ نظام حیدرآباد کی طرف سے اُن کو "مولاالملک" کا خطاب بخشا گیا۔ سید صاحب انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبان سے خوب خوب واقف تھے اور ان کو فرانسیسی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے شہرت بھی پائی اور دولت بھی اور وہ کثیر پرور بھی تھے۔ 69 برس کی عمر میں رانچی میں اُن کا انتقال ہوا۔
(مناظر عاشق ہرگانوی)

علامہ عنایت اللہ مشرقی

عنایت اللہ مشرقی 25 اگست 1888ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی اعتبار سے وہ ایم۔ اے (کینٹب)، بی۔ ایس سی، بی۔ ای۔، ایل۔ او۔ ایل، ایف۔ آر۔ ایس۔ (آرٹس)، ایف۔ اے۔ ایس (پیرس) تھے۔ 1913ء سے 1915ء تک وہ پشاور کے اسماعیلیہ کالج کے پرنسپل رہے پھر انسپکٹر آف ہائی اسکولز اور ڈپارٹمنٹل ایگزامینیشن کے رجسٹرار بھی بنے۔ بعد میں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلیسٹ کے بھی ممبر رہے۔ 1930ء میں سرکاری ملازمت ترک کرکے خاکسار جماعت قائم کی، اس وقت ان کی تنخواہ 200 2 ہزار روپے ماہوار تھی۔ اپنی تحریک ہی کے سلسلے میں چار بار جیل گئے۔ 1940ء میں جب ان کی جماعت کا تصادم حکومت پنجاب (اُن دنوں پنجاب پر سر سکندر حیات خاں وزیر اعلا تھے) سے ہوا تو خاکسار اور ان کی جماعت زیر عتاب آگئی تھی۔ پولس کی گولیوں سے بہت سے خاکسار مارے گئے اور علامہ مشرقی گرفتار ہوگئے۔

علامہ مشرقی کی تصانیف میں "تذکرہ" (اردو و عربی میں) "آزاد ہندوستان کا دستور"، "اشارات" اور "قول فیصل" اہم ہیں۔ انھوں نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کے بعد دوسری شادی کی تھی۔

مرزا غالب

نام مرزا اسداللہ خاں، عرفیت مرزا نوشہ، تخلص اسد، بعد میں غالب۔ مرزا غالب 1797ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ وہ تورانی نسل سے تھے ان کے آبا و اجداد ترک قوم کے ایک قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ سمرقند میں کاشتکاری اور سپہ گری ان کا پیشہ تھا۔ غالب اپنا سلسلۂ نسب افراسیاب سے ملاتے تھے۔ وہ پانچ ہی برس کے تھے کہ ان کے والد عبداللہ خاں ریاست الور میں مارے گئے۔ چچا نے پرورش کی۔ آٹھ برس کے ہوئے تو چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرزا کے دادا سلجوقی ترک تھے۔ تیرا برس کی عمر میں نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے مرزا کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ آگرے سے دلّی آگئے۔ غالب فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اردو اور فارسی کے دیوان کے ساتھ ساتھ "اردوئے معلّا" اور "عود ہندی" کے نام سے اُن کے خطوط بھی مرتب کئے گئے۔ ذوق کے انتقال کے بعد مرزا غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کے بھی استاد رہے۔ مرزا غالب نے اپنی زندگی میں کلکتے، لکھنؤ، رام پور، مراد آباد، بنارس، بھوپال، میرٹھ، مرادنگر، شاہ جہان پور، بریلی اور ہاپوڑ کا سفر کیا۔ لینے دینے کے معاملے کے جرم میں تین مہینے جیل میں بھی رہے۔ اُن کو پنشن بھی ملتی تھی اور وظیفے بھی مگر خرچ زیادہ تھا اس لئے زندگی بھر حاجت مند ہی رہے۔ کئی بچوں کے باپ بنے مگر کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔

غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور نثر میں سادہ اور بے تکلف اسلوب کے موجد ہیں مگر شاعری میں انھوں نے مشکل پسندی کی ابتدا کی اور اُن کی اس بدعت کو اقبال نے اپنایا اور پھر یہ بات جوش ملیح آبادی تک پہنچی اور نثر میں مولانا آزاد نے غالب کی پیروی کی اور اس طرح غالب کی مشکل پسندی نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر اور آغا شورش کشمیری تک جا پہنچی۔

غالب اپنے فن کے اعتبار سے بہترین فن کار ہیں مگر کردار کے اعتبار سے اچھے انسان نہیں۔ وہ کھانے میں آب گوشت، قند اور شیرۂ بادام مقشر صبح، دوپہر میں گوشت کا پانی، شام میں تلے ہوئے چار کباب اور سونے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر عرق گلاب۔ کاسٹیلن، اولڈ ٹام اور ولسکور نام کی انگریزی شرابیں ان کو زیادہ مرغوب تھیں۔ آخری عمر میں بصارت و سماعت جاتی رہی تھی۔ 72 برس کی عمر میں 15 فروری 1869ء کو غالب کا انتقال ہوا۔ دہلی میں نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس دفن ہوئے۔

غالب نثر لکھنے میں انگریزی زبان کے اُسلوب نثر سے متاثر ہوئے تھے خیال ہے کہ کلکتے کے قیام میں انھوں نے چند انگریزی ناول سے اور ان کے ترجمے پڑھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی

بانیٔ جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کے آبا و اجداد بابر کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور کے قریب بس گئے، ذات کے مغل تھے، مغلیہ دربار میں رسائی ہوئی۔ عہدے اور جاگیریں ملیں۔ مرزا غلام احمد 13 فروری 1836ء کو پیدا ہوئے، ولادت توام صورت میں ہوئی۔ قرآن پڑھا، فارسی، عربی، منطق اور طب کی تعلیم پائی۔ حرمت بی بی سے شادی ہوئی بعد میں اُن کو طلاق دے دی۔ 1864ء میں سرکاری ملازمت کرلی۔ 1868ء میں والدہ اور 1876ء میں والد مرزا غلام مرتضیٰ کا انتقال ہوگیا۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغ جب اپنے شباب پر تھی تو مرزا غلام احمد نے متعدد بار عیسائی پادریوں سے مناظرے میں حصہ لیا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے 1876ء میں 'براہین احمدیہ' لکھی اپنی اس تصنیف کے کچھ عرصے بعد انھوں نے چودھویں صدی ہجری کے مجدد ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا اعلان کیا۔ 22 مارچ 1889ء میں انھوں نے لدھیانے (پنجاب) میں پہلی بیعت لی، یعنی اسی دن جماعت احمدیہ کی بنیاد پڑی۔ بعد میں احمدیہ فرقے نے اپنا ایک الگ جھنڈا بھی بنالیا۔ مرزا جی نے اپنی زندگی میں بہت سے اشتہارات کے ساتھ ساتھ 84 کتابیں تصنیف کیں جن میں بعض کتابیں تو کئی کئی سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ 26 مئی 1908ء کو اُن کا انتقال ہوا اور قادیان (ضلع گورداس پور، پنجاب) میں دفن ہوئے۔ حکیم مولوی نور الدین ان کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

بتایا جاتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں احمدیہ فرقے کے افراد کی تعداد ایک لاکھ اور دنیا میں ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔

فیض احمد فیض

مکمل نام فیض احمد خاں، تخلص فیض۔ 13 فروری 1911ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کالا قادر ضلع سیالکوٹ ہے۔ خاندانی پیشہ زراعت تھا مگر فیض کے والد چودھری سلطان محمد خاں نے خاصی تعلیم حاصل کی اور افغانستان سرکار کی پیشکش پر کابل چلے گئے جہاں وہ شہزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے، بعد میں چیف سکریٹری بھی رہے اور پھر انگلستان میں افغانستان کے سفیر بھی۔ وہیں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ سیالکوٹ واپس آکر بیرسٹری شروع کردی۔ انھوں نے تین شادیاں کیں۔ وہ انگریزی اور اردو کے مصنف بھی تھے 1931ء میں اُن کا انتقال ہوا۔ چنانچہ خاصے ادبی ماحول میں فیض نے پرورش پائی۔

1915ء سے جب کہ فیض کی عمر چار برس کی تھی حفظ قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ سیالکوٹ میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد وہ لاہور آگئے اور یہاں انھوں نے ڈبل ایم اے (عربی اور انگریزی میں) تک تعلیم پائی۔ 1935ء میں وہ امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ دوسری بڑی جنگ کے دوران میں (1942ء) وہ کیپٹن کی حیثیت سے فوج میں ملازم ہوئے، ایک برس بعد میجر اور پھر ایک برس بعد لفٹننٹ کرنل بنادیے گئے۔ 1946ء میں فوجی ملازمت سے مستعفی ہوکر لاہور آگئے۔ 1959ء سے 1962ء تک وہ پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سیکریٹری رہے۔ 1964ء میں کراچی کے عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل و نگراں بنادیے گئے۔

فیض نے 1928ء سے شاعری شروع کی اور سیالکوٹ کے ایک کالج کے ایک طرحی مشاعرے میں اپنی پہلی غزل پڑھی اور اُن کی پہلی نظم 'میرے معصوم قاتل' 1929ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج کے میگزین 'راوی' میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'نقش فریادی' 1941ء میں اور ان کا پہلا نثری مجموعہ 'میزان' 1962ء میں شائع ہوا۔ 1938ء سے 1939ء تک وہ ماہنامہ 'ادب لطیف' کے اڈیٹر رہے۔ 1947ء سے 1958ء تک انھوں نے روزنامہ 'پاکستان ٹائمز'، روزنامہ 'امروز' اور ہفت روزہ 'لیل و نہار' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1938ء اور 1939ء کے دوران میں کئی ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے اور انھوں نے دو فلموں ('جاگو ہوا سویرا' اور 'دور ہے سکھ کا گاؤں') کے لیے مکالمے اور گانے بھی لکھے ہیں۔

9 مارچ 1951ء کو 'راولپنڈی سازش' کے الزام میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور چار برس جیل میں رہے۔ 1958ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت پھر گرفتار ہوئے اور تقریباً چار مہینے جیل

ککس کاتب تمنائی ملتان ۔ بر

میں رہے۔ فیض نے دنیا کے اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے۔ 1936ء میں انھوں نے لاہور میں ترقی پسند مصنفین کے قیام میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور وہ ٹریڈ یونین کے نائب صدر بھی رہے ہیں۔ سان فرانسسکو اور جنیوا کے آئی۔ ایل۔ او۔ کے اجلاس میں وہ مزدوروں کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔

فیض کی بیوی ایلس جارج لندن نژاد خاتون ہیں۔ ان کا نکاح 1941ء میں اسلامی شرع کے مطابق شیخ عبداللہ نے پڑھایا تھا۔ ایلس کا اسلامی نام کلثوم ہے۔ فیض کی تصانیف میں 'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا'، 'زنداں نامہ'، 'دستِ تہِ سنگ'، اور 'میزان' قابلِ ذکر ہیں۔ فوجی ملازمت کے دوران میں اُن کو ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا تھا اور 1962ء میں انھیں دنیا کا مشہور 'لینن امن انعام' حاصل ہوا۔ ان کا کلام دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے اور وہ اپنے عہد کے صفِ اول کے کمیونسٹ شعرا میں سے ہیں۔ فیض کم سخن اور خاموش طبع واقع ہوئے ہیں۔

فیضی

شیخ مبارک کے بیٹے، ابوالفضل کے بڑے بھائی فیضی 1547ء میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ پہلے 'مشہور' تھے، 'فیاضی' بنے اور آخر 'فیضی' تخلص رکھ لیا۔ عربی و فارسی اور سنسکرت کے زبردست عالم تھے۔ فنِ طب میں اتنے ماہر ہوئے کہ حکیم فیضی کہے جانے لگے۔ 20 برس کی عمر میں اکبر کے دربار میں پہنچے، تھوڑے ہی دن بعد دربار سے چہار صدی کا منصب ملا اور 1577ء میں اکبر نے ان کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا۔ شاہزادہ سلیم، دانیال اور مراد کے خاص استاد مقرر کیے گئے۔ کچھ عرصہ انھوں نے سفارتی خدمات بھی انجام دیں۔ فیضی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ 'سواطع الالہام' ہے یعنی قرآن کی اس عربی تفسیر میں کوئی ایسا حرف استعمال نہیں کیا گیا کہ جس پر نقطہ ہو اور یہ جلد 7 جز پر مشتمل ہے۔ 'طباشیر الصبح' اُن کے دیوان کا نام ہے جو 9 ہزار بیت پر مشتمل ہے۔ اُن کی مثنوی 'نل دمن' بھی کافی مقبول ہوئی۔ غرضیکہ انھوں نے غزلوں، قصیدوں، رباعیوں، قطعوں وغیرہ کی صورت میں 50 ہزار اشعار کہے۔ کہتے ہیں کہ فارسی شاعری کے 6 سو برس میں ہندوستان میں صرف دو قابلِ ذکر شاعر پیدا ہوئے، خسرو اور فیضی ___ 'آبِ حیات' کے مصنف محمد حسین آزاد کا کہنا تھا: 'انشا پردازی فیضی کے قلم کو سجدہ کرتی ہے!' فیضی کا کلام چونکہ عام فہم ہوتا تھا اور وہ دل لگتی اور من بھاتی باتیں بیان کرتے تھے اس لیے اُن کی باتیں اکبر کو بہت بھاتی تھیں مگر فیضی ہمیشہ اپنے متعلق یہی کہتے تھے: 'مجھے کیا آتا ہے!'

ملا بدایونی ہمیشہ دونوں بھائیوں کے حق میں دلِ ہی بنے رہے اور اُن کو سدا ملحد، زندیق اور مرتد ہی کہا لیکن جب ملا بدایونی پر اکبر کا عتاب نازل ہوا تو فیضی ہی نے ملا کے علمی و ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ملا کے حق میں سفارش کی۔ فیضی آزاد مشرب انسان تھے اور مجتہد تھے۔ خوش طبع، شوخ اور شگفتہ مزاج تھے۔ سخی اور مہمان نواز تھے اور ان کا دیوان خانہ اہلِ کمال کا ہوٹل تھا۔ دمے کے مرض میں مبتلا ہوئے اور 1594ء میں وفات پائی۔ اکبر فیضی کو ادب سے 'شیخ جیو' کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔

کبیر صاحب

1398ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ایک مسلمان جولاہے نورو اور اس کی بیوی نیما نے انھیں پالا۔ یہ سکندر لودی کا زمانہ تھا۔ دنیا داری میں کبیر کا من نہ لگا۔ وہ نہ اسلام کی روایتی باتوں سے مطمئن ہوئے اور نہ ہندو سماج سے۔ آخر کچھ دن اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ رامانند کے، جو کہ بھگتی کے مبلغ رامانند کے چیلے بن گئے۔ کبیر نے اپنی عوامی شاعری کو اپنی تبلیغ کا میڈیم بنایا۔ ہندوؤانہ وضع قطع اپنا لی۔ مسلمان ملاؤں نے بادشاہ سے کبیر کی شکایت کی۔ بادشاہ نے کبیر کو ہاتھی سے کچلوا دینا چاہا۔ کہتے ہیں کہ 52 مرتبہ ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا مگر ہاتھی کبیر کے جسم پر اپنا پاؤں رکھنے کے لیے تیار نہ ہوا اور ہر بار پیچھے ہٹ ہٹ گیا۔ آخر بادشاہ نے کبیر سے معافی چاہ لی۔ مگر کٹر پرانے ہندو اور قدامت پرست ملاؤں نے کبیر کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہی نہیں۔ مگر کبیر کی آزاد خیالی کی بنا پر کبیر کی ماں نیما اور بیوی لوئی بھی کبیر کو ایک اچھا مسلمان خیال نہ کرتی تھیں اور پھر کبیر بھی اپنے بیٹے کمال سے بیزار تھے جو ہر لمحے دولت کمانے میں لگا رہتا تھا۔ کبیر نے 120 برس کی عمر میں 1518ء میں وفات پائی۔ مگہر نام کے گاؤں (ضلع بستی، اتر پردیش) سے ایک میل کے فاصلے پر آمی دریا کے کنارے کبیر کے دو مقبرے واقع ہیں۔ ایک کی بناوٹ مسجد کی سی اور دوسرے کی مندر کی سی ہے یعنی ایک مقبرہ

ہے اور ایک سمادھی۔ دونوں کی نگرانی کبیر پنتھی سادھو کرتے ہیں۔ ہر برس موسم گرما میں کبیر کا عرس ہوتا ہے۔

کبیر نے اسلام اور ہندومت دونوں کی ظاہری پابندیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اور انسانوں کو انسانیت اور بھائی چارے کا درس دیا۔ وہ سیکولرزم کے بھی مبلغ تھے۔

محمد بن قاسم

محمد بن قاسم 695ء میں عرب میں پیدا ہوا۔ عرب کے اُموی خلیفہ عبدالملک کی خلافت کے زمانے میں عرب تاجر سمندر کے راستے سے آتے جاتے تھے۔ ایک بار عربوں کا ایک تجارتی جہاز لنکا سے بصرے جا رہا تھا جس میں سامان تجارت بھی تھا اور بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی تھے۔ راہ میں سندھ کے بحری ڈاکوؤں نے عربوں کے اُس جہاز کو لوٹ لیا اور مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں کو بھی پکڑ کر لے گئے۔ خلیفہ عبدالملک کی ہدایت پر گورنر حجاج بن یوسف نے سندھ کے راجا داہر کو آگاہ کیا کہ ان ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے مسلمان قیدیوں کو ان سے چھڑا کر بھیج دے اور جو سامان انھوں نے لوٹا ہے وہ بھی اُن سے واپس لے کر ہم کو روانہ کر دے مگر راجا داہر نے جواب دیا کہ ڈاکو میرے بس سے باہر ہیں۔ چنانچہ گورنر حجاج بن یوسف نے اپنے 17 سالہ بھتیجے (جو ان کا داماد بھی تھا) محمد بن قاسم کی کمان میں 6 ہزار سپاہی دے کر سندھ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اُس کا مقابلہ راجا داہر کی 60 ہزار فوج سے ہوا مگر راجا داہر مارا گیا۔ 20 جون 712ء کو محمد نے سارے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے سپہ سالار اور ایک بادشاہ کی حیثیت سے سندھ پر سات برس حکومت کی۔ حجاج بن یوسف کی موت کے بعد خلیفہ عبدالملک نے اس کو واپس طلب کیا۔ راہ میں حجاج کے خاندانی دشمن عراق کے گورنر نے اس کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ وہیں محمد بن قاسم کی 720ء میں موت ہوئی۔

محمد بن قاسم کو ہندوستان کا پہلا مسلمان فاتح کہا جاتا ہے مگر یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ تبلیغ اسلام کی غرض سے ہندوستان میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ ملک گیری کے جذبے اور تجارتی مفاد نے اس کو ہندوستان کی راہ دکھائی تھی۔

محمد بن قاسم نے اپنی ہندو رعایا سب کو اپنے طریقے پر عبادت کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔

[illegible]

شیخ مجیب

شیخ مجیب الرحمان 17 مارچ 1920ء کو ضلع فریدپور (بنگال) کے قصبے گوپال گنج میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ سیاست میں حصہ لینے لگے اور اسٹوڈنٹ یونین کے صدر رہے۔ اسی بنا پر وہ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے باوجود وکالت نہ کر سکے۔ ابتدا میں وہ گاندھی جی سے متاثر ہوئے اور کچھ دن ان کے ساتھ کام بھی کیا اور پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد جب اُن کے خیال میں مشرقی پاکستان کے دُکھ درد دور نہ ہوئے تو انھوں نے مسلم لیگ سے علاحدگی اختیار کر لی اور 1948ء میں جب انھوں نے ڈھاکے میں مسٹر جناح کے ایک جلسے میں اُن کے خلاف نعرے لگائے اور اردو زبان اور اردو تہذیب کے خلاف احتجاج کیا تو ان کو سات دن کی سزا ہو گئی۔ جیل سے رہا ہوتے ہی انھوں نے حسین شہید سہروردی کی قیادت میں عوامی لیگ کی بنیاد رکھی۔ شیخ مجیب دراصل اس وقت چھائے جب 1966ء میں انھوں نے پاکستان کے صدر ایوب خان کے سامنے اپنا چھ نکاتی مطالبہ پیش کیا جس کے معانی تھے پاکستانی بنگالیوں کی ایک آزاد مملکت۔ مگر نتیجے میں شیخ صاحب کو جیل ہو گئی۔ یحییٰ خان کے عہد میں جب پاکستان میں عام انتخابات ہوئے تو شیخ مجیب کی عوامی لیگ کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی مگر یحییٰ خان اُن کو اختیارات منتقل کرنے میں جب متامل ثابت ہوئے تو شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان کو بنگلا دیش نام دے کر اس کی آزادی کے لیے عوامی جنگ شروع کر دی اور 9 مہینے زبردست خوں ریزی کے بعد ہندوستانی فوج کی مدد سے شیخ مجیب کے عوام نے 16 دسمبر 1971ء کو اپنا بنگلا دیش آزاد کرا لیا اور پاکستان کی 93 ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔ جنگ آزادی کے دوران میں مجیب پاکستان کے قیدی رہے۔ مجیب بنگلا دیش کے پہلے پرائم منسٹر ہیں۔ وہ کٹر بنگالی ہیں۔

مجیب جمہوریت، سیکولرزم اور اشتراکیت کے حامی ہیں۔ پائپ نوش ہیں اور ماچھ بھات (مچھلی اور چاول) اُن کی مرغوب غذا ہے اور مچھلیوں میں بھی اُن کو 'لوٹی' (ایک قسم کی تلی ہوئی مچھلی) زیادہ پسند ہے۔ اُن کو گانے کا بھی شوق ہے۔

سیّد محمد جون پوری

مہدویہ جماعت کے بانی سیّد محمد 847ھ میں جون پور میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم کے بعد تربیتِ باطن اور تزکیۂ قلب کی طرف متوجہ ہوئے اور سات برس تک مسلسل روزے رکھے اور گوشہ نشین رہے۔ اسی اثناء میں اُن کے کہنے کے مطابق اُن پر وحی نازل ہوئی اور انھوں نے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر تبلیغ شروع کی۔ سیّد صاحب نے جن احکام کی تلقین کی اُن میں تین اہم ہیں۔ ہجرت یعنی گھر بار چھوڑ کر قیدِ وطن سے آزاد رہنا، دولت کی تقسیم یعنی مال کو سیّد صاحب نے کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں مانا، اس لیے جس کے پاس جو کچھ ہو وہ اپنے رفیقانِ طریقت میں بانٹ دے اور ہر وقت راہِ حق میں سر بکف رہنا۔ جب سیّد صاحب کی مخالفت زیادہ بڑھی اور ان کو کافر قرار دے کر اُن کی موت کو جائز قرار دے دیا گیا تو وہ گجرات چلے گئے۔ وہاں کا حاکم سلطان محمود کلاں اُن کا عقیدت مند بن گیا۔ سیّد صاحب گجرات سے عرب اور پھر ایران چلے گئے۔ وہاں کے عوام سیّد صاحب کی تعلیمات کی طرف اتنے زیادہ متوجہ ہوئے کہ شاہ ایران کو سیّد صاحب کی ذات سے خطرہ پیدا ہونے لگا اور اس نے اُن کو ایران سے نکل جانے کا حکم دیا۔ سیّد صاحب جب ایران سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو 911ھ میں فراہ کے مقام پر انھوں نے وفات پائی۔

'اُم اُل عقائد' مہدویہ جماعت کی مذہبی کتاب ہے جو سیّد صاحب کے مریدوں نے ترتیب دی تھی۔

محمد حسین آزاد

مولانا محمد اکبر جیسے مجتہد دادا کے پوتے اور مولانا محمد باقر کے بیٹے مولانا محمد حسین آزاد 1827ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم باپ دادا سے، شعر و شاعری استاد ذوق سے اور اپنے باپ کے ایک انگریز دوست سے انگریزی زبان حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے اپنے باپ کے اخبار اور پریس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ 1857ء کے دنوں میں قابلِ اعتراض تحریروں کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اخبار ممنوع قرار دے دیا۔ جب غدر پڑا تو مولانا کے والد کے انگریز دوست مسٹر ٹیلر نے مولانا کے گھر میں پناہ لی مگر باہر نکلتے ہی باغیوں نے ٹیلر کو مار ڈالا۔ جواب میں انگریزوں کا عتاب مولانا کے خاندان پر بھی نازل ہوا اور مولانا کے والد کو انگریزی سپاہیوں نے گولی مار دی۔ مولانا آزاد روزگار کی تلاش میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے۔ چھ مہینے تک ایک ملازمت کرنے کے بعد ممبئی آ گئے۔ یہاں چند پارسیوں کے تعاون سے فارسی زبان میں کچھ تحقیقی کام کیا۔ ممبئی سے مانوہ پہنچے اور رنوچ داری میں محافظِ دفتر کی حیثیت سے چند مہینے کام کرنے کے بعد لدھیانے آ گئے۔ 1861ء میں جب وہ لاہور میں پوسٹ آفس میں ملازم تھے تب انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور 'آئینۂ صحت' تصنیف کرنے کے بعد 1864ء میں انھوں نے عربی کی گرامر کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا اور پھر علمِ منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ 1864ء ہی میں جب انجمن پنجاب قائم ہوئی تو مولانا اس کے سرگرم رکن بنے اور اس انجمن کی جانب سے جو رسالہ جاری ہوا وہ اس کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اُنہی کی کوشش سے اس انجمن نے کئی مدرسے قائم کیے جن میں مشرقی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، امتحانات ہوتے تھے اور سند دی جاتی تھی۔ 1867ء سے 1869ء تک وہ بچوں کے درسی کتب لکھنے میں مصروف رہے اور اسی زمانے میں وہ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی زبان کے پروفیسر مقرر کیے گئے اور پھر 1885ء میں ایران کی سیاحت کو چلے گئے۔

بیٹی کی موت کا غم برداشت نہ کر سکے اور دماغی توازن کھو بیٹھے، ملازمت چھوٹی، انجمن سے تعلق ٹوٹا اور شہر در شہر گھومنے پھرنے لگے۔ آخر 22 جنوری 1910ء کو لاہور میں وفات پائی۔ مولانا محمد حسین آزاد کی معرکہ آرا تصنیف 'آبِ حیات' ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

ڈاکٹر مختار احمد انصاری 25 دسمبر 1880ء کو ضلع غازی پور کے یوسف پور گاؤں کے ایک قاضی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر انصاری کے والد حاجی عبدالرحمان بہت دین دار انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب ہی میں ہوئی اس کے بعد انھوں نے بنارس سے مڈل اور الٰہ آباد سے میٹرک اور ایف۔ اے۔ سی پاس کیا۔ حیدرآباد (عثمانیہ کالج) میں بھی تعلیم پائی، مدراس سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد لندن چلے گئے اور وہاں سے ایم۔ آر۔ سی۔ ایس اور ایل۔ آر۔ سی۔ پی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایڈنبرگ کی یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی اور

پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لیں۔ اُن کی اچھی ذہانت کی بنا پر نظام حیدر آباد کی حکومت نے اُن کو وظیفہ دیا۔ اور جب انھوں نے ایم۔ ڈی۔ بھی کر لیا تو وہ لندن میں چیرنگ کراس ہسپتال میں ہاؤس سرجن مقرر کیے گئے اور پھر لندن کے لاک ہسپتال کے ریذیڈنٹ میڈیکل افسر بھی بن گئے۔

1910ء میں ڈاکٹر انصاری ہندستان واپس آئے اور دہلی میں پریکٹس شروع کردی۔ یہاں راجاؤں، نوابوں اور جاگیرداروں نے اُن کی بڑی قدر کی۔ جنگِ بلقان کے دنوں میں وہ ایک میڈیکل مشن (ہلال احمر) لے کر ترکی گئے۔ ترکی کے سلطان نے اُن کی خدمات کے صلے میں اپنے ملک کے سب سے بڑے اعزاز "آرڈر آف میڈکیہ" سے اُن کو نوازا۔ 1917ء سے وہ عملی طور پر میدانِ سیاست میں آگئے۔ 1920ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بنے اور 1927ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے ٹرسٹی بھی رہے اور جامعہ ملیہ کی بنیاد کو مستحکم بنانے کے لیے بھی بڑا کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدا ہی سے گاندھی جی کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے کے لیے شملا میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے مختلف خیال ممبروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی اور 1922ء کی سول نافرمانی کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور ترکِ موالات میں بھی پیش پیش رہے اور کانگریس کی تحریکوں ہی کے سلسلے میں دو بار جیل بھی گئے۔ 1935ء میں ترکی سے جب خالدہ ادیب خانم ہندستان آئیں تو وہ ڈاکٹر صاحب ہی کی مہمان رہیں۔ 10 مئی 1936ء کو دہرہ دون ایکسپریس میں سفر کرتے ہوئے حرکتِ قلب بند ہو جانے کی بنا پر اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی موت کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بہت سے بے سہارا گھرانوں کو بڑی خاموشی سے ماہوار وظیفہ دیتے تھے۔

محمد رفیع

محمد رفیع 24 دسمبر 1924ء کو کوٹلا سلطان سنگھ (ضلع امرتسر، پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ بڑے بھائی نے گانے کی طرف رجحان دیکھ کر استاد حمید خاں کی شاگردی میں دے دیا۔ اُن سے رفیع نے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور تیرا برس کی عمر میں ریڈیو سنگر بن گئے۔ پہلی بار 1940ء میں لاہور کی پنجابی فلم "گل بلوچ" میں پلے بیک گانا گایا۔ 1943ء میں جب وہ بمبئی آئے تو یہاں کورس میں شامل ہو کر پلے بیک فلمی گانے [illegible]

گانے گائے جس فلم میں پہلی بار تنہا گانے کا موقع ملا وہ "گاؤں کی گوری" تھی۔ فلم "جگنو" کے گانوں سے اُن کو شہرت ملی۔ رفیع اب تک چودہ پندرہ زبانوں میں تقریباً 23 ہزار گانے گا چکے ہیں۔ ان زبانوں میں انگریزی، عربی اور جنوبی امریکا کی بھی ایک زبان شامل ہے۔ انھوں نے بہت سے غیر فلمی گانے بھی گائے ہیں جن میں "سنو سنو بالو کی امر کہانی" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ رفیع حج کر چکے ہیں اور ان کو پدم شری کا اعزاز بھی مل چکا ہے وہ اپنے گانوں کے پروگراموں کے سلسلے میں 25 بار غیر ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔

مسٹر محمد علی جناح

محمد علی نام، جناح عرف۔ مگر مکمل نام محمد علی بھائی جناح بھائی لکھو جانی۔ کہتے ہیں کہ مسٹر جناح کے آبا و اجداد پنجابی مسلم راج پوت تھے اور دراصل منٹگمری کے رہنے والے تھے۔ کوئی بزرگ کاٹھیاواڑ آ گئے تھے اور یہاں انھوں نے کسی خوجا خاتون سے شادی کرلی تھی تب سے اُن کا شمار خوجوں میں ہونے لگا۔ مسٹر جناح کے والد پونجا راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) میں رہتے تھے مگر کراچی میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ مسٹر جناح 25 دسمبر 1876ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ پہلے کراچی کے ایک مکتب میں تعلیم حاصل کی، پھر بمبئی کے گوکل داس پرائمری اسکول میں، پھر کراچی چلے گئے جہاں 16 برس کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔ پھر لندن بھیج دیے گئے اور 1896ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے کراچی آ گئے اور بمبئی میں پریکٹس شروع کی۔ لندن کے قیام میں ان کی ملاقات دادا بھائی نوروجی سے ہوئی اور مسٹر جناح اُن سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ جن دنوں (1906ء) ہندوستان میں نوروجی انڈین نیشنل کانگریس کے صدر تھے مسٹر جناح ان کے سکریٹری ہو گئے اور انھی کے توسط سے جناح کانگریس میں شامل ہو گئے۔ 1900ء میں وہ بمبئی میں پریسیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ 1910ء میں وہ سپریم امپیریل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1914ء میں کانگریس کے وفد میں شامل ہو کر مسٹر گوکھلے کی قیادت میں لندن گئے اور وہاں لندن انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1916ء میں مسلم لیگ کے صدر بنے۔ 1919ء میں ہوم رول لیگ کے بھی صدر منتخب ہوئے۔ 1920ء اور 1924ء میں بھی مسلم لیگ کے صدر رہے اور پھر 1935ء میں مسلم لیگ کے تاحیات صدر منتخب کیے گئے۔ 30-1929ء میں انھوں نے لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ 1920ء میں جب

گاندھی جی کی قیادت میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی اور کانگریسی جیل جانے لگے تو مسٹر جناح کانگریس کی رکنیت سے علاحدہ ہوگئے۔ 1940ء میں مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں مسٹر جناح کی صدارت میں قیام پاکستان کی تجویز منظور کی۔ 14 اگست 1947ء کو جب پاکستان بنا تو وہ پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

مسٹر جناح نے سر دِنشا پٹیٹ کی 18 سالہ بیٹی رتن بائی کو مسلمان بنا کر 1918ء میں اس سے شادی کی۔ اس وقت مسٹر جناح کی عمر 42 برس تھی۔ اگرچہ یہ محبت کی شادی تھی مگر رفتہ رفتہ دونوں میں اختلافات پیدا ہوتے گئے اور آخر جنوری 1928ء میں رتنا نے جناح سے طلاق لے لی۔ 20 فروری 1929ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ رتنا سے صرف ایک لڑکی پیدا ہوئی دینا۔ جو پارسی ہی رہی اور جس نے پارسی سیٹھ نول ٹاٹا سے شادی کی۔ مسٹر جناح نے دینا کو مسلمان بنے رہنے پر زور دیا مگر وہ نہ مانی اور آخر جناح نے اس کو عاق کر دیا۔

11 ستمبر 1948ء کو کراچی میں مسٹر جناح کا انتقال ہوا۔ ایرانی اور ترکی قالین جمع کرنے، بلیرڈ کھیلنے، قیمتی لباس اور بٹلر شو پہننے کا اُن کو شوق تھا۔ پچھلے ایک ہزار برس میں مسٹر جناح وہ واحد مسلمان ہیں جنھوں نے سیاسی اعتبار سے ہندستانی مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا اس حیثیت سے ہندستان کی کسی دوسری مسلم شخصیت کو اُن کے ہم پلہ نہیں کہا جا سکتا۔

مولانا محمد علی جوہر

1878ء میں رام پور (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ (بی اماں) نے تربیت دی اور تعلیم دلوائی ابتدائی تعلیم بریلی میں ہوئی اور جب علی گڑھ سے بی۔ اے کیا تو سارے صوبے میں اول آئے۔ مزید تعلیم لندن کی آکسفورڈ یونی ورسٹی میں پائی ریاست رام پور اور ریاست بڑودہ میں اعلا ملازمتوں پر فائز رہے۔ 1910ء میں ملازمت کا سلسلہ ترک کر کے کلکتے سے "کامریڈ" نام کا ایک انگریزی ہفت روزہ جاری کیا، پھر دہلی منتقل ہو کر وہاں سے اردو روزنامہ "ہم درد" نکالا۔ دوسری بڑی جنگ کے زمانے میں ہم درد کی تحریریں انگریز حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ثابت ہوئیں اس لیے مولانا نظر بند کر دیے گئے۔ 1919ء میں رہا ہوئے تو خلافت تحریک کے سر گرم رکن بن گئے۔ دو بار (1924ء اور 1928ء میں) خلافت کے صدر بھی رہے۔ خلافت ہی کے ایک نمائندے کی حیثیت سے سارے یورپ کا دورہ کیا اور اس سلسلے میں پاپائے روم سے بھی ملاقات کی۔ خلافت تحریک کے خاتمے پر کانگریس میں شامل ہوگئے اور 1923ء میں کانگریس کے بھی صدر رہے اور پھر کچھ عرصے بعد کانگریس کو خیرباد کہہ دیا۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے وہاں ایک پُرجوش، ہنگامہ خیز اور یادگار تقریر کی اور کہا: "آزادی لے کر ہی جاؤں گا یا مر جاؤں گا!"۔ اتفاق سے وہیں 4 جنوری 1931ء کو انتقال ہوگیا۔ بیت المقدس میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ اردو اور انگریزی کے اچھے صحافی تھے اور اردو زبان کے شاعر تھے جوہر تخلص تھا۔ پُرجوش اور جذباتی مقرر تھے۔ قوت برداشت کم تھی۔ اُن کی سیاست پُرجوش زیادہ باہوش کم تھی۔ مولانا پہلے مسلمان تھے جنھوں نے قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔

شیخ ہند مولانا محمود الحسن

وہ 1851ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی دارالعلوم دیوبند کی سب سے پہلی مجلس شورا کے رکن تھے۔ مولانا محمود نے دیوبند ہی کے دارالعلوم میں تعلیم پائی اور پھر فارغ ہو کر وہیں ایک استاد کی حیثیت سے ملازم ہوگئے اور پھر شیخ حدیث کے ممتاز منصب پر فائز ہوئے اور شیخ ہند کا لقب پایا۔

انگریزوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے سلسلے میں ہندستان میں جو تحریکیں شروع ہوئیں مولانا ان تحریکوں کے بانیوں میں سے رہے۔ 1919ء میں انھوں نے خود جمعیت الانصار قائم کی۔ اس کے تحت ریشمی خطوط جیسی انقلابی تحریک شروع کی گئی۔ کہتے ہیں کہ ہندستان کی آزادی کے سلسلے میں یہ سب سے پہلی تحریک تھی۔ جنگِ بلقان کے دنوں میں جب مولانا حج کے لیے مکّہ پہنچے تو انگریزوں کے دوست شریف مکّہ نے اُن سے یہ فتوا لینا چاہا کہ علماء اسلام کی ہم دردیاں انگریزوں کے ساتھ ہیں مگر مولانا نے فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ 1917ء میں گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے گئے جہاں مارچ 1920ء تک قید رہے۔ مئی 1920ء میں وہ جب ہندستان واپس

ہوئے تو انھوں نے مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیا کہ کانگریس میں شریک ہو کر ملک کو آزاد کرائیں۔ کہتے ہیں کہ شیخ ہند نے اپنی چار اہم خوبیاں اپنے چار بڑے شاگردوں میں بانٹ دی تھیں۔ حدیث کا علم علامہ انور شاہ کو ملا تھا، قرآن کی سمجھ مولانا شبیر احمد عثمانی کو ملی تھی، سیاست کی سوجھ بوجھ مولانا عبیداللہ سندھی کے حصے میں آئی تھی اور مولانا حسین احمد مدنی ان کے جانشین بنے تھے۔ شیخ ہند کی کئی تصانیف قابلِ ذکر ہیں اور قرآن پاک کا اردو ترجمہ تو ان کی ذکاوت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ جامعہ ملیہ کا سنگِ بنیاد شیخ ہند ہی نے رکھا تھا۔ 30 نومبر 1920ء کو ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر سیّد محمود

سید محمود 1889ء میں ضلع غازی پور (بہار) کے قصبے سید پور بھتری میں پیدا ہوئے۔ "بھتری" بھیم اور تری سے مرکب ہے، کہتے ہیں کہ یہ بھیم کی جائے پیدائش ہے۔ سید محمود نے علی گڑھ، لندن اور جرمنی میں تعلیم پائی۔ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے اور بیرسٹر بھی۔ پٹنہ میں ان کی وکالت کا زمانہ 1913ء سے 1921ء تک رہا۔ 1923ء میں خلافت کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی وہ سیکریٹری رہے۔ ان کو کانگریس کے جنرل سیکریٹری بننے کا بھی موقع ملا۔ 1937ء میں جب بہار میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تو وہ وزیرِ تعلیم بنائے گئے۔ 1946ء سے 1952ء تک وہ پھر بہار کی حکومت میں صحت، حرفت، تجارت اور زراعت کے وزیر رہے۔ 1952ء سے 1956ء تک ان کو مرکزی حکومت میں وزارت کا عہدہ حاصل رہا۔ وہ جنگِ آزادی کے سلسلے میں کئی بار جیل گئے۔ بہار کے عوام میں تعلیم پھیلانے کے لیے انھوں نے کئی کام کیے۔ فسادات کے تدارک کے لیے انھوں نے 1964ء میں مجلسِ مشاورت قائم کی۔ ان کی تصانیف میں ان کا مشہور رسالہ 'خلافت' اور 'انگلستان' قابلِ ذکر ہیں۔ 'دیوانِ غالب' کے ابتدائی ایڈیشن کو انھوں ہی نے مرتب کیا تھا۔ اپنی عمر کے آخری دن انھوں نے بہار کے شہر چھپرا میں گزارے اور ان کا وہیں انتقال ہوا۔

مولانا مودودی

مولانا کے بزرگ سکندر لودھی کے عہد میں ہندوستان آئے۔ والد سید احمد حسن علی گڑھ کے ابتدائی طالب علموں میں سے تھے۔ ان کا پیشہ وکالت تھا بعد میں تارکِ دنیا ہو گئے۔ مولانا مودودی 25 ستمبر 1903ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد نے مذہبی تعلیم دلائی۔ انگریزی تعلیم سے ہمیشہ دور رکھا یہی نہیں بلکہ محلے کے عام بچوں کے ساتھ کھیلنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور ان کو مذہبی قصے سنائے گئے۔ 1914ء میں مولانا نے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ 1918ء سے اپنے بھائی کے ساتھ اخبار 'مدینہ' سے اخبار نویسی کی ابتدا کی۔ 1922ء سے 1923ء تک جمعیت علماء کے اخبار 'مسلم' کے اڈیٹر رہے اور پھر 1924ء سے 1928ء تک جمعیتِ علماء کے دوسرے اخبار 'الجمعیت' میں ادارت کے فرائض انجام دیے۔ 1928ء سے 1930ء تک مولانا کا قیام حیدرآباد میں رہا۔ صحافتی زندگی کے ساتھ ساتھ مولانا کی سیاسی زندگی بھی 1919ء سے شروع ہو چکی تھی جب کہ انھوں نے انجمن اعانتِ نظربندانِ اسلام کے تحت کام کرنا شروع کیا تھا اور انھوں نے خلافت اور کانگریس کی تحریکوں میں بھی عملی طور پر حصہ لیا تھا مگر وہ 1947ء میں پاکستان جانے سے قبل قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔

مولانا مودودی کئی اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں 'الجہاد فی الاسلام' اور 'پردہ' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مولانا 'جماعتِ اسلامی' کے بانی ہیں۔ ان کی تحریر و تحریک مسلمانوں کے (تعلیم اور معاشی حالت کے اعتبار سے) متوسط طبقے کو متاثر کرتی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی

خواجہ چشتی 1161ء کے لگ بھگ سجستان میں پیدا ہوئے۔ اصل وطن خراسان (ایران) تھا۔ اُن کے والد غیاث الدین حسن تھے۔ پن چکی اور ایک باغ اُن کے روزگار کا ذریعہ تھے۔ خواجہ چشتی پندرہ ہی برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ابراہیم قندوزی نام کے ایک مجذوب سے متاثر ہوئے اور اپنی ساری جائداد اور گھر کا سارا ساز و سامان دان کر کے تحصیلِ علم کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ سمرقند اور بخارا کے علمی مرکزوں پر پہنچے اور قرآن پاک حفظ کیا پھر نیشاپور کے قصبے ہرون میں پہنچ کر خواجہ عثمان کو اپنا مرشد مان لیا۔ دن رات اور برسوں اپنے مرشد کی خدمت کی اور مرشد ہی کی ہدایت پر سمرقند، بخارا، بغداد، تبریز، اوش، اصفہان

سبزوار، مہنہ، جرجان اور استرآباد کے عالموں اور صوفیوں کی صحبت میں رہ کر اور اُن کے فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہندستان میں داخل ہوئے اُن دنوں دہلی پر شہاب الدّین غوری کی حکومت تھی۔ دہلی سے اجمیر گئے جو پرتھوی راج کی سلطنت کا صدر مقام تھا۔ خواجہ چشتی نے اجمیر میں رہ کر سب کو محبّت کا پیغام سنایا۔ 53 برس انھوں نے اجمیر میں گزارے۔ اُن کی کُل عمر 97 برس کی ہوئی۔ 16 مارچ 1235ء کو انھوں نے وفات پائی۔

خواجہ اجمیری اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں پھٹی ہوئی دوہتی میں لپٹے ہوئے بیٹھے رہتے تھے۔ دوہتی اگر پھٹ جاتی تو کسی بھی کپڑے کا جو ٹکڑا ملتا اُس کا پیوند لگا لیتے۔ روزہ روز رکھتے مگر افطار میں مشکل سے دو تین ہی تولے وزن کی روٹی کھاتے تھے اُن کا خیال تھا کہ انسانی سماج میں خوشی اور خوش حالی اِس بات پر منحصر ہے کہ انسان برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی ہمّت اور طاقت پیدا کرے۔ انسانوں نے اپنے درمیان رنگ نسل، زبان اور عقیدے کی جو دیواریں کھینچی ہیں وہ بے حقیقت ہیں انسان کا پہلا رشتہ تو انسانیت کا رشتہ ہے۔

خواجہ اجمیری سے چشتی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اُن کے نامور مریدوں میں خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی بھی تھے۔ انگریز مورخ آرنلڈ نے لکھا ہے کہ خواجہ اجمیری کے اثر سے کئی لاکھ انسان مسلمان ہوئے

نذرُل اِسلام

نذر الاسلام

قاضی نذرُل اسلام آسن سول (ضلع بردوان، بنگال) کے گاؤں چورلیا میں 24 مئی 1899ء کو پیدا ہوئے۔ آٹھ ہی برس کے تھے کہ والد فقیر احمد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بھوک اور فاقوں کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلی بڑی جنگ کے دوران میں (1917ء) جب کہ وہ صرف اُنیس ہی برس کے تھے فوج (بنگال رجمنٹ) میں بھرتی ہو گئے۔ اگرچہ گیارہ ہی برس کی عمر سے اُن کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری، ناول نویسی اور شاعری سے ہو چکا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ شاعری پر زیادہ توجہ دینے لگے اور جب فوجی ملازمت کے دوران میں اُن کو فارسی کے مشہور شاعر حافظ کی شاعری کے مطالعے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنی شاعری کو بھی فارسی زبان کی شیرینی بخش دی۔ ان کی پہلی نظم 'مکتی' 1918ء میں بنگلا مسلم ساہتیہ کے رسالے میں شائع ہوئی۔ 1919ء میں جنگ کے خاتمے پر انھوں نے فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔ 1944ء میں اُن کی بیوی پرمیلا نذرل (جو ہندو تھیں اور کبھی طوائف نہ تھیں) کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے بعد وہ مستقل طور پر بیمار رہنے لگے اُن کے قدردانوں نے اُن کے لیے چندہ جمع کیا اور 1952ء میں ان کو علاج کے لیے لندن بھیجا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ واپس ہوئے تو تنگ دستی نے اور زیادہ بیمار بنا دیا۔ البتہ بنگلا دیش بن جانے کے بعد اُن کے حالات قدرے سُدھر گئے۔

نذرؔل انقلابی شاعر ہیں وہ اپنی شاہ کار نظم 'باغی' کی بنا پر باغی شاعر کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے بنگلا شاعری کو مساوات سے آشنا کیا ہے اور اِس کو عوامی مزاج بخشا ہے۔ ٹیگور کے بعد نذرُؔل بنگلا زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

خواجہ سیّد نظام الدّین اولیا

آپ کے اجداد بخارا سے ہندستان آئے اور بدایوں میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے والد سیّد احمد صاحب بدایوں کے قاضی تھے اور دادا خواجہ معین الدّین چشتی اجمیری تھے۔ حضرت نظام الدّین 11 ربیع اول 652ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے پانچ ہی برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ماں بی بی زلیخا نے تربیت دی۔ 25 برس کی عمر میں والدہ کو لے کر دہلی آ گئے تنگ دستی تھی اکثر فاقے بھی ہوتے تھے۔ دہلی میں تصوّف کی تعلیم پانے کے بعد پٹن شریف چلے گئے اور بابا فرید الدّین گنج شکر کے مرید ہو گئے۔ بعد میں بابا کے خلیفہ بنے۔ جنگلوں میں بہت عرصے تک عبادت و ریاضت کرنے کے بعد غیاث پورہ دہلی میں آ کر سکونت اختیار کی۔

یہ سلطان علاء الدّین خلجی کا زمانہ تھا اُس نے آپ کو ملنے کی دعوت دی مگر آپ نے اُس کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے خدا کر دیدار کرنا چاہے آپ نے اِس بات کی بھی اس کو اجازت نہ دی۔ 18 ربیع ثانی 725ھ کو 94 برس کی عمر میں وفات پائی۔

نورجہاں

تہران سے ہندستان آتے ہوئے قندھار کے قریب سنہ 982ھ میں (دور

ان) مرزا غیاث بیگ کے گھر میں مہرالنسا پیدا ہوئی۔ آگرہ پہنچ کر مرزا کو اکبر کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ سترہ برس کی عمر میں مہر کی شادی ایک نوجوان عہدے دار علی قلی بیگ سے ہوئی۔ جہانگیر کے عہد میں علی قلی بیگ بعد میں شیر افگن کے لقب سے بھی مشہور رہا، بردوان کا حاکم تھا۔ جب اس نے بغاوت کی تو جہانگیر نے ۱۶۰۷ء میں اس کی سرکوبی کے لیے مرزا قطب الدین کوکا کو بھیجا۔ شیر افگن نے اس کو دھوکے سے قتل کر دیا۔ اس کے جواب میں کوکا کے آدمیوں نے شیر افگن کو مار ڈالا۔ چار برس بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں مہر جہانگیر کے عقد میں آ گئی۔ اس وقت اس کی عمر تیس برس اور جہانگیر کی ۴۲ برس تھی۔ جہانگیر نے اس کو مہرالنسا سے نورجہاں بنا دیا۔

نورجہاں دربار میں مسند نشین رہی اور میدانِ جنگ میں بھی جہانگیر کے ساتھ رہتی تھی۔ امورِ سلطنت میں بھی کافی دخل تھا۔ سکے پر اس کی ضرب اور فرمانوں پر اس کی مہر لگتی تھی۔ نظامِ سلطنت کو سمجھتی تھی اور سیاست کی پیچیدگیوں کو سلجھانا جانتی تھی۔ مگر چال بازی، سنگ دلی اور حیلہ بازی میں ایک عام عورت تھی یعنی ملکہ تھی مگر جوڑ توڑ بادشاہ تھی۔ نورجہاں نے کئی عمدہ لباس اور زیورات ایجاد کیے اور آج کل کی مشہور مٹھائیاں بھی اسی کی ایجاد ہیں اور عطرِ گلاب بھی اسی کی ایجاد ہے۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر بیس گھنٹے میں سو پیالے (سرآتشہ) شراب پیتا تھا مگر نورجہاں کے کہنے پر رفتہ رفتہ اس نے شراب نوشی کم کر دی، یہاں تک کہ دن بھر میں صرف تین ہی پیالے شراب پینے لگا۔ ۱۰۳۹ھ میں نورجہاں کا انتقال ہوا۔ اس کا مقبرہ لاہور میں ہے۔ جہانگیر سے اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی البتہ شیر افگن سے اس کے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام لاڈلی بیگم تھا۔

نیاز فتح پوری

نام لیاقت علی خاں، نیاز تخلص، ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ باپ پہلے محکمۂ پولس میں ملازم تھے۔ پولس کی ملازمت ترک کر کے ۱۸۹۸ء میں رام پور آ گئے اور یہاں وکالت کرنے لگے۔ مکتب اور مدرسے سے نیاز کی تعلیم کی ابتدا ہوئی مگر انگریزی زبان انھوں نے خود سیکھی اور فارسی ترکی زبان بھی سیکھی۔ البتہ رام پور میں وزیر محمد خاں سے انھوں نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ نیاز کے روزگار کی ابتدا بھی محکمۂ پولس ہی سے ہوئی۔

جن دنوں وہ بھوپال میں پولس کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے ڈاکٹر بجنوری بھوپال ریاست کے چیف سیکریٹری تھے۔ اُن کی سفارش پر نیاز کی ادبی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا اور ریاست کی جانب سے ان کو وظیفہ ملنے لگا۔ نیاز کی قلمی زندگی کا آغاز ۱۹۱۱ء میں لاہور کے اخبار 'زمیندار' سے ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ دہلی آ گئے۔ ریاست بھوپال سے مالی امداد ملنے پر انھوں نے ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ سے ماہ نامہ 'نگار' جاری کیا۔ ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ ٹاکیز کے نام سے ایک لمیٹڈ فلم کمپنی کی بنیاد رکھی مگر کام شروع ہونے سے پہلے ہی وہ بند ہو گئی۔ ۱۹۶۲ء میں نیاز کراچی (پاکستان) چلے گئے اور 'نگار' کو بھی لکھنؤ سے کراچی منتقل کر دیا۔ ۱۹۶۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

نیاز اردو شعرا میں میر اور اقبال اور نثر نگاروں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں سے متاثر تھے۔ اُن کی زیادہ تر تصانیف دراصل دوسری زبانوں سے ترجمے کا نتیجہ ہیں جن میں سے اکثر انھی کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ ٹیگور کی 'گیتانجلی' کا اردو ترجمہ 'عرضِ نغمہ' ان کا شاہ کار ہے۔ نیاز اپنی جوانی کے دنوں میں انگریزی زبان کی فلمیں دیکھنے کے بہت شوقین تھے اور ان کے افسانے بھی دراصل انگریزی فلمی کہانیوں ہی کے اُدھار پر لکھے جاتے تھے۔

نیاز کی چند اہم تصانیف 'انتقادیات'، 'جمالستان'، 'من و یزداں'، 'نگارستان' اور 'مکتوباتِ نیاز' ہیں۔

نیاز کے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی کہ مذہبی عالم اور دینی مکتبوں کے ملا سخت گیر اور سنگ دل ہیں۔ سبق بھول لینے پر وہ بچوں کو سزا دیتے ہیں تو اُن کے سر دیوار سے دے دے مارتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مولویوں کے اندازِ گفتگو میں فرعونیت ہے اور مزاج میں رعونت ہے اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو عقل سے کوئی لگاؤ نہیں ہونا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نیاز کے دل سے مذہبی علما کا احترام اٹھ گیا اور انھوں نے مذہب کو محض عقیدے کی بنیاد پر ماننے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر مذہبی حلقوں نے ان کی ہمیشہ لعنت کی۔ چنانچہ نیاز کی طبیعت میں بھی کھرا پن اور کھردرا پن پیدا ہو گیا اور پھر انھوں نے بھی اپنے باغیانہ نقطۂ نظر کی بنا پر اپنے کسی مخالف کو معاف نہیں کیا۔ نیاز کا 'نگار' اردو زبان کی تاریخ میں وہ واحد جریدہ ہے جس نے واضح طور پر ایک نئے مکتبِ خیال کو جنم دیا اور پڑھے لکھے لوگوں کو بے

...متاثر کیا۔ مشہور گلوکار استاد نیازی نیاز کے داماد ہیں۔

واجد علی شاہ

نواب اودھ امجد علی شاہ کے بیٹے واجد علی شاہ 1822ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ ہی برس کی عمر میں اُن کو جنسی تجربوں سے واسطہ پڑا۔ پندرہ برس کی عمر میں نواب علی نقی خاں کی بیٹی سے شادی ہوگئی۔ بعد میں خسری کو اپنا وزیر بنا لیا۔ موتی خانم نام کی ایک باندی کے عشق میں شاعری شروع کردی، اختر تخلص رکھا، دو دیوان اور تین مثنویاں نظم کیں۔ قطب علی خاں سے ستار بجانا سیکھا۔ ایک پری خانہ بنوایا جس میں رقص و سرود اور عیش و نشاط کا جملہ سامان موجود تھا۔ واجد علی شاہ اپنی داشتہ کو پری کہتے تھے۔ اُن گنت پریاں تھیں اور اُن پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے تھے انھوں نے حسین عورتوں اور خواجہ سراؤں کی ایک فوج بھی بنائی۔ واجد علی شاہ کے روز افزوں عیش و نشاط کی بنا پر جب بدامنی بڑھنے لگی تو ریذی ڈنٹ نے کئی بار تنبیہ کی مگر نواب نے کوئی اثر نہ لیا آخر انگریزی فوج آئی اور حکم سنایا گیا: "آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ میں شامل کرلیا گیا ہے آپ کے لیے 12 لاکھ روپے سالانہ اور آپ کے جلوس لشکر کے لیے 3 لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کی گئی ہے!" نواب نے جب مزاحمت کی تو اُن کو گرفتار کرکے 1856ء میں کلکتے لے جاکر مٹیا برج میں نظر بند کردیا بعد میں وہ فورٹ ولیم میں منتقل کردیئے گئے۔ ماں، بھائی اور ولی عہد کو لندن بھیجا تاکہ انگریز سرکار سے اپنا تخت واپس لیں، اسی اثنا میں 1857ء کا غدر شروع ہوا، تنگ دستی کی بنا پر لندن میں جو مقدمہ دائر کیا تھا واپس لے لیا اور کمپنی کی مجوزہ پنشن کو قبول کرلیا اور انگریزوں کی اس نظر بندی میں واجد علی شاہ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ رنج و ملال کیا ہوتا ہے۔

واجد علی شاہ کو عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ لکھنؤ کا قیصر باغ انھی نے تعمیر کرایا تھا جس کی تعمیر پر 80 لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ قیصر باغ کے ان محلات میں ان کی بیگمات، لونڈیاں اور داشتائیں رہتی تھیں۔ کلکتے کے قیام میں بھی انھوں نے بہت سی عمارتیں بنوائیں اور مٹیا برج میں بھی حسین عورتوں کو جمع کرنے اور ناچ رنگ کی محفلیں منعقد کرنے کا سلسلہ دن رات جاری رہا مگر بے شمار عورتوں سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ خود یہ لکھنے پر مجبور رہے: "ایک نے بھی میرا دامن نہ پکڑا، سب کی طرف سے میرا دل کھٹا ہوگیا، میں نے کان اینٹھے کہ اب کسی سے بھی محبت نہ کروں گا اور اب عورتوں کی طرف سے اتنا بدظن ہوگیا ہوں کہ اگر کوئی عورت مر جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ قبر میں بھی فریب کرنے گئی ہے، جب تک جہلم نہ ہوئے مجھ یقین نہیں آتا!"

نواب واجد علی شاہ کی رنگین مزاجی اور اُن کے ذوق شوق نے اُن کی رعایا کے مذاق کو اس حد تک متاثر کیا کہ آج بھی خطۂ اودھ میں اس رنگین تہذیب کے اثرات موجود ہیں۔ 1887ء میں نواب واجد علی شاہ کا کلکتے ہی میں انتقال ہوا۔

شاہ ولی اللہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی 1114ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام عظیم الدین رکھا گیا۔ دادا شیخ وجیہ الدین اور والد شیخ عبدالرحیم اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ شاہ صاحب نے سات ہی برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا اور عربی و فارسی کی مروجہ نصاب کی تعلیم اپنے والد سے لینا شروع کی اور فارغ تحصیل ہوکر پندرہ ہی برس کی عمر میں اپنے والد سے سلسلۂ نقش بندی بیعت کی۔ 1143ء میں حج کے لیے گئے۔ عرب کے علما سے بھی استفادہ کیا۔ واپسی پر شاہ صاحب نے یہ بات شدت سے محسوس کی کہ قرآن پڑھا تو جاتا ہے مگر پڑھنے والے اس کو دل سے سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی ذرا بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور اسی طرح حدیث کو نہ سمجھتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرتے ہیں بل کہ اکثر مسلمان بدعت اور شرک میں مبتلا ہیں اور قرآن کو محض فال نکالنے اور حلف اٹھانے کی چیز سمجھتے ہیں چنانچہ انھوں نے قرآن کی آسان زبان میں تفسیر لکھی کہ مسلمان پڑھیں اور سمجھیں اور اپنی اصلاح آپ کریں اور یہی صورت انھوں نے حدیث کے لیے کی۔ عربی مدرسوں کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی اور قدیم طرز میں اصلاح کرکے تقلید کی عادت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ بھی کیا۔ اقتصادیات کے موضوع پر بھی انھوں نے ایک کتاب تصنیف کی۔

ہندستان کے مسلم علما میں شاہ ولی اللہ کا مرتبہ مجدد اعظم کا ہے اور اُن کی حکیمانہ بصیرت کو سب ہی نے مانا ہے۔ شاہ صاحب کے چار فرزند تھے اُن میں مولانا شاہ عبدالعزیز نے کافی شہرت پائی۔ شاہ صاحب کی تصانیف میں 'فتح الرحمان' (قرآن کا فارسی ترجمہ)، 'الفوز الکبیر'، 'المسوا شرح موطا'، 'القول الجمیل'، 'فیوض الحرمین'، 'عقد الجید'، 'انفاس العارفین' اور 'البدور البازغہ' اہم ہیں۔ شاہ صاحب نے 63 برس کی عمر میں (1762ء) وفات پائی۔

ولی دکھنی

نام سید محمد فیاض تخلص ولی۔ 1668ء میں (اورنگ زیب کے عہد میں) اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ دلی وطن تھا۔ سات گر، گرٹیا اور احمد آباد میں زندگی کے دن گزرے۔ ابتدائی تعلیم اگرچہ اورنگ آباد میں پائی تھی مگر احمد آباد آکر شاہ وجیہ الدین علوی کے مدرسے میں تعلیم مکمل ہوئی۔ دو بار دہلی بھی آئے۔ پہلی بار اورنگ زیب کے عہد میں دوسری بار 1722ء میں محمد شاہ کے دورِ حکومت میں۔ ولی کا کلام سب اصنافِ سخن میں موجود ہے انھوں نے غزل بھی کہی، قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترجیع بند اور مستزاد بھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

ولی کو ریختہ کا موجد کہا جاتا ہے۔ ولی ہی وہ شاعر ہیں جن سے اردو شاعری کی بنیاد پڑی اور ولی دکنی کا کلام شمالی ہند کے شاعروں کے لیے نمونہ ثابت ہوا۔ 1749ء میں احمد آباد میں اُن کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

فخرالدین علی احمد

فخرالدین علی احمد 13 مئی 1905ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ذوالنور علی احمد فوج میں کرنل (ڈاکٹر) تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے 1870ء میں انڈین میڈیکل سروس کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ بیٹے کو بھی آئی۔ سی۔ ایس بنانا چاہتے تھے۔ فخرالدین علی احمد نے ابتدائی تعلیم گونڈا اور دہلی میں پائی اور مزید تعلیم انگلینڈ میں حاصل کی اور وہیں وہ بار ایٹ لا بھی ہوئے۔ انگلینڈ سے واپسی کے بعد کچھ دن انھوں نے کلکتے میں وکالت بھی کی۔ حکیم اجمل خاں کی حُبِ وطنی سے متاثر ہوئے اور سیاست سے لگاؤ پیدا ہوا، اور 1931ء میں وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو گئے۔ آسام کی پہلی وزارت (1938-39ء) میں وہ وزیر مالیات رہے۔ 1946ء میں وہ آسام کے ایڈوکیٹ جنرل بنے۔ آسام کی دوسری وزارت میں بھی وہ وزیر رہے۔ 29 جنوری 1966ء کو وہ مرکز میں وزیر آب پاشی بنا دیئے گئے۔ اور بعد میں وہ وزیر تعلیم اور وزیر زراعت بھی رہے۔ 1963ء [illegible] وہ آسام پردیش کانگریس کمیٹی [illegible] ہندوستانی [illegible]

ورکنگ کمیٹی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور پھر وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن رہے ہیں ان کو مرکزی کابینہ کی سیاسی امور کمیٹی کے سینیئر ممبر ہونے کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ وہ یو۔ این۔ او۔ اور ایف۔ اے۔ او۔ (آسٹریلیا) میں بھی ہندستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے کی بنا پر وہ متعدد بار قید ہوئے اور 1945ء سے قبل تو وہ مسلسل 3½ برس قید میں رہے۔ اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے سیکولرزم کا سبق رفیع احمد قدوائی سے لیا اور اپنے نظریے سے وفاداری کا ثبوت دینا پنڈت نہرو سے سیکھا۔

فخرالدین علی احمد کے طالب علمی کے دن بڑے آسودہ گزرے۔ اُن کو اپنے والد کی جانب سے 500 روپے ماہوار خرچ ملتا تھا اور وہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانے میں صاحبِ موٹر کار تھے۔ وہ کھیل کود میں بڑی دل چسپی لیتے ہیں۔ وہ کئی برس تک آسام کی فٹ بال ایسوسی ایشن، کرکٹ ایسوسی ایشن اور آل انڈیا لان ٹینس ایسوسی ایشن کے صدر اور آسام اسپورٹس کانسل کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ برج اور گھوڑدوڑ سے بھی اُن کو کافی شوق رہا ہے۔ ایک بار انھوں نے شاعر بھی بننا چاہا تھا اور اپنی ایک غزل پر سائل دہلوی سے اصلاح لینا چاہی تھی مگر سائل نے یہ مشورہ دیا تھا کہ شاعری زندگی کو تباہ کر دینے والا شوق ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اس شوق سے باز رہے۔ 1945ء میں انھوں نے شادی کی۔ ان کی بیگم عابدہ مرحوم افسانہ نگار حیدر جوش کی بیٹی ہیں اور علی گڑھ یونیورسٹی سے گریجویٹ ہیں۔

مرزا غالب کی بیوی کے بھانجے عارف کی پوتی رقیہ بیگم فخرالدین علی احمد کی والدہ تھیں۔ حمیدہ سلطان اُن کی بہن ہیں۔ فخرالدین علی احمد کم گو ہیں اور اُن کی ذات قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ہے۔ وہ ہندستان کے 5 ویں صدر جمہوریہ ہیں۔ ہندستان جیسے عظیم ملک کا سربراہ ہونا ایک ہندستانی کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔

کیا کاوشِ نور و ظلمت ہے کیا قید ہے کیا آزادی ہے
انسان کی تڑپتی فطرت کا مفہوم سمجھ میں آنے لگا

جوش ملیح آبادی

بزرگِ قوم

سید احمد خاں 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کا سلسلۂ نسب 36 واسطوں سے حضرت محمدؐ تک پہنچتا ہے اُن کی ننہیال خواجہ میر درد کے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اُن کے والد سید متقی مغل شاہ اکبر شاہ ثانی کے دوست تھے اور مغل دربار سے وظیفہ پاتے تھے۔ سید احمد کی عمر 22 برس ہی کی تھی کہ (1838ء میں) باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیوہ ماں عزیز النسا بیگم نے بیٹے کی ایسی تربیت کی کہ یہ ثابت کر دیا کہ ایک اچھی ماں ہزاروں استادوں سے بہتر ہے باپ کے انتقال کے بعد چوں کہ آمدنی کا ذریعہ ختم ہو گیا تھا اس لیے سید احمد نے انگریز سرکار میں ملازمت کر لی۔ کچہری میں سررشتہ دار ہوئے۔ پھر منصف بنا دیے گئے۔ جن دنوں وہ بجنور میں منصف تھے اُسی زمانے میں پہلی جنگِ آزادی کی ابتدا ہوئی جس کو غدر کا نام دیا گیا۔ 10 مئی 1857ء کو میرٹھ میں بغاوت ہوئی۔ 12 مئی کو یہ خبر بجنور پہنچی سید احمد نے 20 انگریز عورتوں اور بچوں کو اپنے مکان میں پناہ دی اور پھر بحفاظت ان کو رُڑکی پہنچوا دیا مگر اسی اثنا میں دہلی میں اُن کا اپنا گھر بار لُٹ گیا اور انھوں نے اپنی والدہ اور خالہ کو جو دہلی کے مکان کی ایک کوٹھری میں بند تھیں باہر نکال کر بمشکل تمام میرٹھ پہنچایا۔ انگریز خواتین کو بچانے کے صلے میں انگریز سرکار نے سید احمد کو ایک خلعت، ایک ہزار روپے نقد، دو سو روپے ماہانہ دو نسلوں تک پولیٹیکل پینشن عطا کی۔ 1858ء میں میرٹھ میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔

سوا دو برس بجنور میں رہنے کے بعد 1859ء میں سید احمد خاں صدر جج کی حیثیت سے مراد آباد منتقل ہو گئے۔ وہاں اُن دنوں ایک قحط پڑا۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑا کام کیا۔ مراد آباد میں انھوں نے ایک فارسی مدرسہ بھی قائم کیا۔ 1864ء میں وہ غازی پور میں تھے تو انھوں نے وہاں بھی ہندو مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ اسکول قائم کیا۔ 1869ء میں وہ اپنے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر انگلینڈ گئے۔ 11 مارچ 1870ء کو ملکہ وکٹوریا اور پرنس آف ویلز کی خدمت میں باریابی ہوئی۔ سید احمد پہلے مسلمان تھے جو انگلستان گئے اور جن کو شاہی دربار میں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی۔ سید احمد کو دربار سے سی۔ آئی۔ ای کا تمغہ ملا۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کی مدد سے انگلستان کی یونی ورسٹیوں کا بغور مطالعہ کیا۔ لندن میں اسٹیل اور ایڈیسن کے رسالوں کو بھی انھوں نے بڑی دل چسپی سے دیکھا اور ہندستان واپس ہونے پر انھی رسالوں کی طرز پر 24 دسمبر 1870ء کو رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس سے اصلاحِ معاشرت مقصود تھی۔ وہ سید احمد ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اردو زبان کو صاف اور سلیس بنانے کی کوشش کی۔

سید احمد خاں کی زندگی اور ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سید احمد نے 23 مئی 1875ء کو مسلمانوں کے لیے علی گڑھ میں ایک انگریزی کالج (ایم۔ اے۔ او کالج) قائم کیا جو جنوری 1921ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں منتقل ہو گیا۔

سید احمد نے اپنے غازی پور کے قیام میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی جو بعد میں علی گڑھ منتقل ہو گئی۔ اس سوسائٹی کے تحت انگریزی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا جاتا تھا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے ناکام ہو جانے پر مسلمانوں کی جانب سے انگریزوں کے دلوں میں جو رنجش پیدا ہو گئی تھی سید احمد نے اپنی تحریروں سے اُسے دور کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے اپنی کتابوں، رسالوں، خطوں، تقریروں اور اشتہاروں کے ذریعے اپنے فرقے کے شعور کو بیدار کیا اور انگریز حاکموں اور اسلام کے مخالفوں کے شبہات کو بہت حد تک دور کیا۔ اُن کی تصانیف میں 'خطباتِ احمدیہ' (اسلام دنیاوی ترقی کا مخالف نہیں بل کہ معاون ہے) 'آثار الصنادید' 'تصحیح آئینِ اکبری'۔ 'تاریخِ بجنور'۔ 'اسباب بغاوتِ ہند'۔ 'تبیین الکلام' (توریت اور انجیل کی تفسیر مقصد یہ تھا کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اُن کو دُور کیا جائے) 'احکام طعام اہلِ کتاب' (احادیث اور آیاتِ قرآنی سے سید احمد نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کا انگریزوں کے یہاں کھانا جائز ہے بشرطے کہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو) اور 'تفسیر قرآن مجید' اہم ہیں۔ انھوں نے سیرتِ نبوی پر خطبات بھی دیے اور وہابیوں کی حمایت میں چند مضامین بھی لکھے۔ انھوں نے شیعہ سنی کے اختلافات کو بھی اس طرح ختم کیا کہ دونوں کو اپنی تعلیمی تحریک میں شامل کر لیا۔

چوں کہ مسلمان زمانۂ جدید کی جدوجہد سے نابلد تھے اور سید احمد ہر طرح کی یورش کو ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے اس لیے

انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت سے روکا۔ ان کے خلاف مولویوں کی جانب سے فتووں کا ایک مجموعہ "نصرت الابرار" شائع ہوا جس کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا اور کانگریس میں شامل ہونا جائز ہے۔ اُن دنوں سید احمد کا مسلمانوں کو سیاست سے علاحدہ رکھنا تو درست تھا مگر علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر بیک سے سید احمد بہت زیادہ متاثر تھے اس لیے یہ برا ہوا کہ مسٹر بیک کی حکمت عملی سے سید احمد ہندو دوست ذہنی طور پر دُور ہو گئے۔

سید احمد خاں کی انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب سے متعلق تحریک کی مخالفت میں قدامت پرست مسلمانوں اور مولوی ملّاؤں کی جانب سے کئی اخبارات اور رسالے جاری ہوئے۔ سید احمد کو کافر، ملحد، نیچری اور کرسٹان کہا گیا اور ان کے ساتھیوں کو بھی بدنام کیا گیا۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مخالفت میں کوئی خالی نہ کوئی ڈفالی، اکبر الٰہ آبادی تو زندگی بھر دشمن بنے رہے۔ اکثر مولویوں نے سید احمد کے خلاف فتوے دیے۔ علی بخش نام کے ایک مولوی نے تو علمائے دین سے فتوے لانے کے لیے سفرِ حج کا قصد کیا اور مکّے سے سید احمد کے خلاف فتوائے کفر لے آئے۔

مگر آج تاریخ یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ سر سید احمد خاں سے زیادہ ہوش مند، دردمند، دُور اندیش، عملی اور صاحبِ بصیرت مسلمان آج تک ہندستان میں پیدا نہیں ہوا۔ آج ہندستان میں مسلمانوں کو جو عزت حاصل ہے وہ اُنہی کی دلائی ہوئی ہے۔ مولانا آزاد اُن کو مجدّدِ اعظم کہا کرتے تھے۔

سرکاری ملازمت کی پابندیوں کے باوجود اُن کے ہاتھوں عظیم الشان کام انجام پائے اور خوبی یہ تھی کہ سرکار اور رعایا دونوں پر اُن کی عظمت کا ایک سِکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کی غیر معمولی عقل کی اتنی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ ان کی زندگی میں یہ افواہ عام تھی کہ سرکار نے ان کا سر خرید لیا ہے اور اُن کے انتقال کے بعد عملِ جراحی سے اُن کی عقل مندی کی وجہ معلوم کی جائے گی۔

سید احمد خاں تیراکی اور تیر اندازی سے واقف تھے۔ نثر نگار تھے مگر آسی تخلص تھا۔

کالج میں ایک لاکھ 70 ہزار روپے کے غبن اور اپنے بیٹے محمود سے اختلاف کے نتیجے میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر بے گھر ہو جانے کے صدمے سے سید احمد کا پیشاب بند ہو گیا اور آخر 28 مارچ 1898ء کی شب میں نو بجے انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کے لیے ان کے ملازم کے پاس چند روپے بھی نہ تھے۔ نواب محسن الملک نے یہ کہہ کر کفن کے لئے 50/ روپے دیے: "یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کب چندہ مانگنے آئیں گے!"

سر سید محض ایک انسان نہیں تھے، ایک تحریک تھے۔ انھوں نے کالج ہی نہیں بنایا بلکہ ایک قوم بنائی۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ مذہب کا رواجی تصور مسلمانوں کو نئے زمانے اور نئے تقاضے سے ہم آہنگ ہونے سے روکتا ہے اس لیے انھوں نے عقیدے کی خامیوں اور عقل کی خوبیوں کو واضح کیا۔ انھوں نے تعلیم، زبان، علم و ادب، صحافت، مذہب و سیاست بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو جدید نظر سے دیکھا۔ وہ مذہب اور دنیاوی معاملات کو دو الگ الگ چیزیں تصور کرتے تھے۔ اُن کو مکّے و دیوبندی فتووں کی رو سے ملّت کا سب سے بڑا ملحد، کافر، زندیق اور نیچری کہا گیا اور ایک فتوے کے ذریعے تو یہ کہہ دیا گیا: "اے مسلمانو! اس نیچری کے بنائے ہوئے ادارے کو مسمار کر دو!" مگر جواب میں سر سید نے کہا: "دوستو! میں نے مانا کہ میں کافر ہوں لیکن کیا تم ایک کافر کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کرے؟" دراصل مسلمانوں کا درد اُن کی سرشت میں اس طرح جاگزیں تھا جس طرح فولاد میں جوہر۔ اور اُن کے مخالف بزدل و پست ہمت، تنگ دل و تنگ نظر تھے۔ سر سید کسی مولوی یا کسی اکبر الٰہ آبادی کی سمجھ میں آنے والی چیز ہی نہ تھے۔ انھوں نے مخالفت، طعن و تشنیع، لعنت ملامت، بہتان، الزام، بدنامی و رسوائی برداشت کی اور استقلال اور عالی حوصلگی کے ساتھ اپنے نیک خیال و عمل پر جمے رہے اور جو سوچا تھا وہ کر دکھایا۔ یہ اُن کے قلب کی وسعت تھی کہ انھوں نے اپنے مخالف مسلمانوں کو معاف کر دیا۔ وہ پہلو دار شخصیت کے حامل تھے۔ زبردست عزم، استقلال، بے لوث خدمت، انہماک، ایثار، خلوص، ضبط و تحمل، اخلاقی جرأت، کام کی لگن، فرض شناسی، صداقت، دیانت داری، رواداری، انصاف پسندی وہمدردی ان کے اوصافِ حمیدہ تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ذاتی غرض پر قومی مفاد کو ترجیح دی۔ وہ غیر متعصب تھے اُن کا کہنا تھا: "میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں!"

سرسید نے 65 کتابیں تالیف، ترتیب اور تصنیف کیں۔ اگرچہ وہ تعلیم کے زبردست حامی تھے مگر تعلیم پر تربیت کو ترجیح دیتے تھے انھوں نے جو کچھ کہا اور کیا وہ اُن کے اپنے دور کے لیے تھا مگر آج کے حالات میں اُن کے پیام کی اہمیت اور ضرورت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے۔

ایک جوئے کہستاں کی موجِ رواں

17 اکتوبر 1817ء دہلی میں سرسید کی پیدائش۔ تعلیم و تربیت والدہ، نانا خواجہ فریدالدین اور شاہ غلام علی کی نگرانی میں ہوئی۔

1838ء دہلی کی عدالت میں ملازم ہوئے۔

1839ء آگرے میں نائب منشی کے عہدے پر تقرر ہوا۔

1841ء مین پوری میں منصف مقرر ہوئے۔

1842ء فتح پور سیکری تبادلہ ہوا۔ اسی برس دہلی کے بادشاہ نے جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔

1855ء بجنور میں صدر امین مقرر ہوئے۔

1858ء مرادآباد میں صدر صدور مقرر ہوئے۔

1859ء غدر میں انگریزوں کے خلاف حصہ لینے والوں کی جائیداد منضبط کے کمیشن میں ممبر نامزد ہوئے۔ مرادآباد میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔

1862ء غازی پور تبادلہ ہوا۔

1864ء غازی پور میں سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ ایک انگریزی اسکول کی بنیاد رکھی۔ علی گڑھ تبادلہ ہوا۔ برطانیہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی ممبر منتخب ہوئے۔

1866ء برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اخبار 'سائنٹی فک سوسائٹی' کا علی گڑھ سے اجرا کیا۔

1867ء علی گڑھ سے بنارس تبادلہ ہوا۔ بنارس میں ہومیوپیتھک ڈسپنسری قائم کی اور ہومیوپیتھک کے طریق علاج کی ترقی کے لیے ایک کمیٹی قائم کی۔

1869ء بنارس سے انگلستان گئے۔

1870ء لندن سے واپسی، رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا، 'کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان' کی تشکیل کی۔

1872ء 'کمیٹی خزینۃ البضاعۃ' کی تشکیل۔

1873ء علی گڑھ کالج کے قیام کی اسکیم پیش کی۔

1875ء علی گڑھ کالج (ایم۔ اے۔ او۔ کالج) کا قیام۔

1876ء ملازمت سے پنشن لے لی۔

1877ء علی گڑھ میں لارڈ لٹن سے ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔

1878ء وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر نامزد ہوئے۔

1879ء چیچک کا قانون پاس کروایا۔

1883ء محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی۔

1886ء مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

1887ء سول سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔

1888ء پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب ملا۔

1892ء ایڈنبرا یونی ورسٹی سے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔

1898ء 19 مارچ کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اردو کی حمایت میں اداریہ لکھا۔ اردو کی وکالت میں یہ اُن کی آخری تحریر تھی۔

27 مارچ کو وفات پائی اور علی گڑھ میں دفن ہوئے۔

نسب نامہ سر سیّد احمد خاں مرحوم
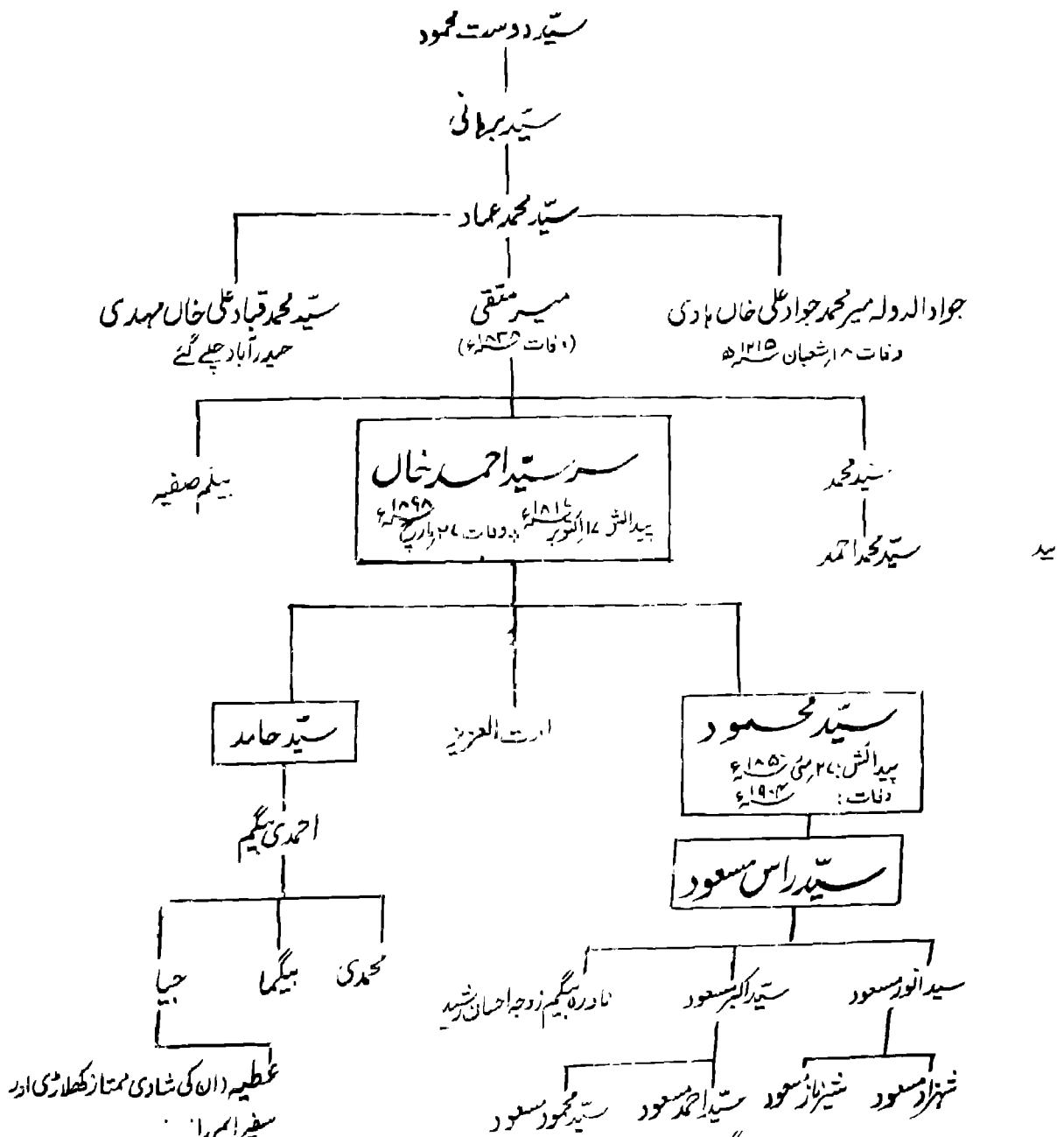
جب سر سید پیدا ہوئے اور دادا نے گود میں لے کر اپنے لیے ترسے گئے پوتے کو پہلی بار دیکھا تو خوشی سے بولے: "لو آج سیّدوں کے گد
درحقیقت سر سیّد کی شخصیت میں جاٹوں کی بہت سی اصفات تھیں۔ بھاری بھرکم ڈیل ڈول، بات دار آواز،
لہجہ، قول کے سچے، کام کے پکے، مقاصد کے حصول کے لیے وہ متیت عزم جسے دھن و لگن کہا جاتا ہے، کھرے انسان ہ

نشانِ راہ

ہر جواب چراغِ راہ ہے منزل نہیں

۔جیوتی۔

گگن کا سند ستانی سمن نمبر
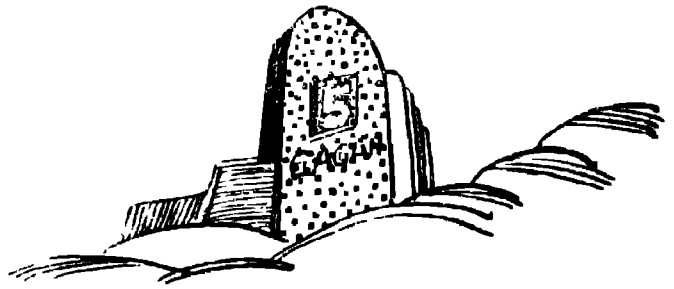
ہندستانی مسلمان ہمارے ہی جسم کا ایک حصّہ ہیں

اُن کی سلامتی ہماری فلاح ہے

ہمیشہ

میری نیک تمنائیں اُن کے ساتھ ہیں

رامانند ساگر

فلم ساز، ہدایت کار و مصنّف

○ موپلا قوم نے جو جی بلوے کئے تھے اُس کے اسباب بتائیے؟

پہلی بات تو یہ کہ 9 ویں صدی عیسوی میں ملابار کے علاقے میں جو مسلمان عرب آکر بسے وہ موپلا کہلائے۔ یہ ابتدا ہی سے تجارت پیشہ اور زراعت پیشہ ہیں۔ جب خلافت کی تحریک شروع ہوئی تو موپلوں نے اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اِس سلسلے میں کانگریسی ہندو بھی اُن کے ساتھ تھے۔ انگریز حکومت نے اِس تحریک کو دبانے کے لئے دفعہ 144 کا استعمال کیا۔ تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ تحریک کے خلاف عام موپلا رضاکاروں نے مظاہرہ کیا۔ پولس نے اُنھیں زدوکوب کیا۔ موپلوں کے دوسرے سیاسی لیڈر اور اُن کے مذہبی پیشوا اَنگل کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ جیل میں بھی قیدیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا گیا۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر جب موپلوں نے ایک جلوس کی صورت میں اپنے لیڈروں کی رہائی پر زور دیا تو فوج نے ان پر گولی چلادی جس کے نتیجے میں چارسو موپلے مارے گئے۔ اُنھوں نے [illegible] لیے تار گورنر کو بھیجنا چاہی تو تار بابو نے تار دینے سے انکار کر دیا۔ اِس پر موپلے مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے تار کاٹ ڈالے، پٹریاں اُکھاڑ دیں، کئی سرکاری افسروں کو قتل کر دیا، جیلوں سے اپنے بہت سے قیدی چھڑا لئے، بازار جلا ڈالے، سرکاری دفتروں کو کافی نقصان پہنچایا۔ اِس ہنگامے نے [illegible] رنگ بھی اختیار کر لیا۔ ہندوؤں کی املاک کو بھی نقصان [illegible] مارشل لا قائم کر دیا۔ حکومت کی جانب سے خوب خوب ظلم ڈھایا گیا۔ ہزاروں موپلوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور ہزاروں پر مقدمات قائم کر دیے گئے۔ [illegible] سلسلے میں ایک بار ایک سو اشخاص کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں ٹھونس کر ایک [illegible] سے دوسری جیل منتقل کیا گیا تو راستے میں 70 اشخاص کا دم گھٹ گیا اور وہ مر گئے۔ غرضے کہ یہ ہنگامے بہت دن چلے اور ان ہنگاموں کو ختم کرنے میں انگریز حکومت کے 15 لاکھ روپے صرف ہوئے۔

○ کتاب "رنگیلا رسول" کا مصنّف کون تھا اور اِس کتاب کو کیوں ممنوع قرار دیا گیا تھا؟

اِس کتاب کو ایک پنجابی نوجوان راج پال نے شائع کیا تھا اور شاید وہی اِس کا مصنّف تھا۔ راج پال ہندی ہفت روزہ 'دھرم یگ' کے ایک سابق ایڈیٹر ستیہ پال کا داماد تھا۔ دراصل اِس کتاب میں قصداً حضرت محمد صاحب کی توہین کی گئی تھی۔ مگر گاندھی جی وہ پہلے شخص تھے کہ جنھوں نے اپنے اخبار 'ینگ انڈیا' کے ذریعے اِس کتاب کو ایک بُری اور قابلِ ممنوع کتاب قرار دیا۔ اُنہی کی تحریر پر حکومت نے راج پال کے خلاف مقدمہ چلایا۔ عدالت سے اُسے سزا ہوئی مگر اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی اور وہ بری ہو گیا۔ اِس پر مسلمان بہت مشتعل ہوئے اور آخر علیم الدین نام کے ایک مسلمان نے راج پال کو قتل کر دیا۔ علیم الدین کو غازی کہا گیا۔ حکومت کی جانب سے علیم الدین پر قتل کا مقدمہ دائر ہوا۔ مسٹر جناح نے عدالت میں علیم الدین کی (محنتانہ لے کر) وکالت کی مگر علیم الدین مقدمہ ہار گیا اور اُس کو پھانسی ہو گئی اور پھر اُس کو 'غازی علیم الدین شہید' کے نام سے یاد کیا گیا۔

○ مغل بادشاہ اکبر کا دراصل مذہب کیا تھا؟

اکبر کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ مولوی مُلّاؤں کی دنیاداری، جاہ پرستی اور ریاکاری کی بنا پر اُن سے انتہائی طور پر بدظن ہو چکا تھا اور وہ مُلّاؤں کی [illegible] یہ بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ 'صرف اسلام ہی ذریعۂ نجات ہے'۔ اکبر اِس حقیقت پر یقین رکھتا تھا کہ سارے مذہبوں کے بانیوں نے لوگوں کو نیک راہ پر لانا چاہا ہے۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق نیکی، اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے اُصول بنائے اور اپنے وقت کے انسانوں کو اُن پر چلنے کی تلقین کی۔ اکبر خدا کو سارے عالم کا ربّ مانتا تھا۔ اسی لئے اُس کا کہنا تھا کہ اگر دنیا کی ساری سچائی ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتی اور وہی خدا کو پسند ہوتی تو وہ اسی مذہب کو دنیا میں باقی رکھتا اور باقی دوسرے سارے مذہبوں کو مٹا ڈالتا

مگر ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے اُس کا ایک مذہب نہیں بن کہ سارے مذہب اُسی کے ہیں۔ اسی لیے اکبر نے یہ خواہش کبھی نہیں کی کہ دنیا کے سب انسان مسلمان ہو جائیں۔ چوں کہ اُس نے شر پسند مولوی ملاؤں کو نہ خود منہ لگایا اور نہ اُن کو اپنی رعایا سے زیادہ میل جول بڑھانے دیا اس لیے مولوی ملّا اکبر کو آج تک بدنام کرتے ہیں سب سے زیادہ حاسد اور متعصب اکبر کا درباری ملّا بدایونی تھا جس نے اپنی رقابت کی بنا پر ابوالفضل اور فیضی کو بدنام کیا اور اُن کے ساتھ اکبر کو بھی۔

○ لاڈلی بیگم کون تھیں؟

شیخ مبارک (ابوالفضل اور فیضی کے باپ) کے آٹھ بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ چوتھی بیٹی لاڈلی بیگم تھیں۔ شیخ سلیم چشتی کے پوتے اسلام خاں سے بیاہی تھیں۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اُس نے اسلام خاں کو پنج ہزاری کا منصب دے کر بہار کا صوبے دار بنا دیا۔

○ مسٹر محمد علی جناح کے نام میں جو یہ لفظ جناح ہے اِس کے کیا معانی ہیں؟

دراصل لفظ 'جناح' تو بے معانی لفظ ہے۔ ویسے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس لفظ کو اُن کے نام سے کیا تعلق تھا۔ اس سلسلے میں آغا شورش کاشمیری کا کہنا یہ ہے کہ 'جینا' گجراتی زبان میں دُبلے پتلے کو کہتے ہیں۔ نحیف اور کم زور ہونے کی بنا پر مسٹر محمد علی کو بچپن میں 'جینا' کہا گیا جو کچھ دن بعد بگڑ کر 'جناح' بن گیا۔ مگر خواجہ حسن نظامی نے ایک بار لکھا تھا کہ 'ذوالجناح' (حضرت امام حسین کے گھوڑے کی مورت) کی مَنّت ماننے پر مسٹر محمد علی پیدا ہوئے تھے اس لیے اُن کے نام کے ساتھ لفظ 'جناح' لگا دیا گیا۔ چناں چہ 'جناح' نہ لقب ہے، نہ کنیت، نہ کوئی ذاتی اٹک نہ اَل بس ایک مرادی نام ہے۔

○ اگرچہ "والدین" جمع کا صیغہ ہے مگر علی گڑھ یونی ورسٹی میں عموماً واحد کے مفہوم میں بولتے ہیں ـــ وجہ؟

ترکِ موالات تحریک کے دنوں میں، قومی لیڈروں کے کہنے پر جب علی گڑھ کالج کے طلبا کالج چھوڑنے لگے تو کالج کے استادوں نے اُن کو روکنے کی خاطر اُن کے والدین کو اطلاع دی۔ یہ خبر سارے کالج میں پھیل گئی کہ کالج کی جانب سے والدین کو بلایا جا رہا ہے اور جب کسی طالب علم کے والد یا کوئی سرپرست علی گڑھ پہنچتے تو طالب علم آپس میں ذکر کرتے کہ فلاں طالب علم کے والدین آئے ہیں۔ مغلوں کے شاہی خاندان میں کبھی بادشاہ اور ولی عہد کے سوا جو بھی بھائی بند ہوتے تھے ان کو 'سلاطین' کہا جاتا تھا۔ اور حد یہ کہ خاندان کے ایک فرد کو بھی (سلطان نہیں) سلاطین ہی کہتے تھے۔

○ کیا جذبۂ وطنیت کا ہونا بہت ضروری ہے؟

یقیناً بہت ضروری ہے ـــ اور ہندستانیوں میں یہی جذبہ بہت کم پایا جاتا ہے۔ دراصل ہندستانیوں کو اپنے ہندستانی ہونے کا احساس ہی بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانیوں نے اپنوں سے اکثر غداری کی ہے اور باہر سے آنے والوں کا ساتھ دیا ہے اور اُن کے غلام بن گئے ہیں۔ اپنے ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وطنیت کا جذبہ اہلِ وطن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ اِس کا ثبوت تب ملتا ہے جب کہ ایک فرد اپنے مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کر دے۔ بات کو سمجھنے کے لیے پڑوسی ملک افغانستان کا نام لیا جا سکتا ہے۔ انگریز کئی بار اُس پر حملہ آور ہوئے، دو بار اُس پر قبضہ بھی کر لیا مگر پٹھانوں کی غیرت اور جذبۂ وطنیت نے جوش مارا اور دونوں بار انگریز کو نکال باہر کیا۔ ہندستانیوں کے لیے جذبۂ وطنیت اور متحدہ قومیت ہی وہ فارمولا ہے جس کو اپنا کر وہ ایک خوش حال قوم بن سکتی ہے اور اُن کی آزادی ہمیشہ برقرار رہ سکتی ہے۔

○ لفظ 'طفیلی' لفظ ہے یا اصطلاح؟ اِس کی اصل کیا ہے؟

لغوی اعتبار سے تو 'طفیل' کے معانی ذریعہ۔ وسیلہ، بدولت

گڑھ کا ہندستانی مسلمان بھی

کہے ہیں۔ اسی اعتبار سے دوسرے کے طفیل میں گزارہ کرنے والے کو 'طفیلی' یا طفیلیا کہتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ کوفے میں ایک شخص تھا جس کا نام طفیل تھا۔ وہ شادی بیاہ کی تقریبوں میں اور کھانے پینے کی دعوتوں میں بلائے بغیر ہی پہنچ جاتا تھا۔ چونکہ عربی زبان میں 'عرس' شادی یا خوشی کے مجمع کو کہتے ہیں۔ اس لئے طفیل اپنے شہر کے لوگوں میں 'طفیل آل عرائس' کے لقب سے مشہور ہو گیا اور یہ بات اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ جو شخص مدعو نہ ہونے پر بھی دعوت میں پہنچ جاتا ہے اُس کو طفیلی کہتے ہیں۔

○ غالب اور اقبال کا کلام سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے، اُنھوں نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کی شرح کیوں نہ شائع کی؟

ڈاکٹر ذاکر حسین جب جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر تھے اور اُن دنوں اقبال بھی زندہ تھے تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک بار اقبال سے درخواست کی تھی کہ وہ چند دن کے لئے جامعہ آئیں اور جامعہ کے طالب علموں کو اپنی مثنوی کا درس دیں اور اپنی مثنوی کے ذریعے اُنھوں نے قوم کے لیے جو پیغام دیا ہے وہ سمجھائیں۔ اقبال نے جواب میں لکھا کہ اس طرح ان کی مثنوی کے معانی و مطلب ایک طے شدہ صورت اور نہ بدلنے والی شکل اختیار کرلیں گے اور اُن کے کلام کے سلسلے میں یہ بات مناسب نہیں۔

○ سرسیّد احمد خاں کے ساتھی 'محسن الملک' کا اصلی نام کیا تھا؟

مہدی علی۔ وہ سرسیّد کے بڑے گہرے اور اولین رفیقوں میں سے تھے۔ سرسیّد کے انتقال کے بعد وہی علی گڑھ کالج کے سیکریٹری بنے۔ 9 دسمبر 1837ء کو اٹاوے میں پیدا ہوئے اور 16 اکتوبر 1907ء کو شملا میں اُن کا انتقال ہوا۔

○ جمہوریت اور اشتراکیت کا فرق بتائیے اور جمہوریت اشتراکیت میں کب بدلتی ہے یہ بھی بتائیے؟

جمہوریت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے واسطے اور عوام ہی کے ذریعے۔ جمہوریت میں ہر فرد کو آزادی اور مساوات حاصل ہوتی ہے اور بالغوں کے ووٹ سے چُنے ہوئے نمائندے حکومت کا کام سنبھالتے ہیں۔ اگرچہ جمہوری نظام میں مساوات کا حق تو ملا ہوتا ہے مگر عموماً ہر فرد کو مساوی موقعے میسر نہیں آپاتے۔ نتیجے میں تھوڑے سے لوگوں کے پاس زیادہ دولت پہنچ جاتی ہے اور بہت سے لوگوں کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو پاتیں۔ انسان کی وہ خود غرضی جو جمہوری نظام کو ناکام بناتی ہے اُس کے توڑنے کے لئے اشتراکیت پیدا ہو جاتی ہے جو محنت کشوں کے حقوق کی قانونی طور پر حفاظت کرتی ہے۔ اشتراکیت میں انفرادی مفاد پر اجتماعی مفاد کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر جمہوری حکومتوں اور مذہبی پیشواؤں نے سامراجی پالیسی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت اختیار نہ کی ہوتی اور انسانیت کا احترام کیا ہوتا تو اشتراکیت جنم نہ لیتی۔

○ کیا شاعر کے لیے بدحواس یا مجنون ہونا لازمی ہے؟

اُردو شاعر کے لیے بدحواس ہونا ضروری یا لازم تو نہیں مگر شعرا کی وارفتگی کوئی نئی بات بھی نہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ذوق پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ صرف تہہ بند پہنے ہوئے ننگے بدن گھومتے گھومتے شاہی قلعے تک پہنچ گئے۔ دربان نے ٹوکا تو چونکے مگر کسی نہ کسی طرح بادشاہ کو خبر ہو گئی اُنھوں نے اُسی حالت میں ذوق کو طلب کرلیا، اشعار سنے اور پھر خلعتِ فاخرہ عطا فرما کر رخصت کیا۔ مومن بھی جب گھر سے باہر قدم رکھتے تو ایک آدھ شاگرد ساتھ ہوتا۔ مومن کو جھومتے ہوئے چلنے کی عادت تھی، شاگرد احتیاط رکھتا کہ استاد کسی گاڑی کی زد میں نہ آجائیں۔ غالب اپنے نئے شعر کے کیف میں بے اختیار ہو کر اپنے بالا خانے سے دیوان خانے میں اُتر آتے تھے جہاں محلے بھر کے لے فکرے چوسر کھیلتے رہتے تھے غالب اُن کو اپنے چند نئے شعر سناتے، داد لیتے، خوش ہو کر مٹھائی پان اور حُقّے سے ان کی تواضع کرتے۔ بعض اوقات ایسا بھی

ہوتا کہ دیوان خانے میں کوئی نہ ہوتا مگر غالب زینے سے نیچے آکر کہتے، "لو بھئی سنو! کیا مضمون ہاتھ آیا ہے!" اور پھر شعر پڑھتے، مطمئن ہوتے اور واپس اپنے بالا خانے پر چلے جاتے۔

○ مغل بادشاہوں میں کون کون امرد پرست تھا؟

مغل بادشاہوں میں بابر مکمل طور پر امرد پرست تھا جس لڑکے پر وہ عاشق تھا اُس کی خدمت میں اُس نے بہت سے شعر لکھ رکھے تھے اور اُس لڑکے ہی کی بنا پر بابر کی پہلی بیوی نے بابر سے علاحدگی حاصل کر لی تھی۔ ایک واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ جہانگیر بھی اس مذاق کا انسان تھا جن دنوں جہانگیر ولی عہد تھا شاہی واقعہ نویس ایک خوب رو لڑکے کو لے کر بھاگ گیا جہانگیر کی ہدایت سے درباریوں نے اندازہ کیا کہ وہ لڑکا جہانگیر کا بھی سامانِ نظر تھا۔ چنانچہ جہانگیر نے حکم دیا کہ دونوں کو پکڑ کر لایا جائے کئی منزل دور سے دونوں کو گرفتار کر کے حاضر کیا گیا۔ جہانگیر نے اپنی نظروں کے سامنے دونوں کی زندہ حالت میں کھال کھنچوا دی۔ جب اکبر کو یہ خبر ملی تو تڑپ گیا اور کہنے لگا: "اللہ! اللہ! شیخو جی، ہم تو بکری کی بھی کھال اُترتے نہیں دیکھ سکتے، تم نے یہ سنگ دلی کہاں سے سیکھی!" — اورنگ زیب کے بعد کے اکثر بادشاہ امرد پرستی کا رجحان رکھتے تھے

○ مسٹر جناح قائدِ اعظم کیسے بنے؟

یہ بات یقین کے ساتھ تو نہیں بتائی جا سکتی کہ وہ "قائدِ اعظم" کیسے بنے مگر اس سلسلے میں مسز سروجنی نائیڈو کی کہی ہوئی یہ بات زیادہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے گاندھی جی نے اپنے ایک خط میں مسٹر جناح کو "قائدِ اعظم" لکھ کر مخاطب کیا تھا، لیکن یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ فیروز الدین احمد نام کا ایک جوشیلا پنجابی نوجوان تھا جس نے پٹنہ کے مسلم لیگ کے اجلاس میں سب سے پہلے "قائدِ اعظم محمد علی جناح زندہ باد" کا نعرہ لگایا تھا۔

○ 1857ء کے غدر میں جو لوگ انگریزوں کے خلاف لڑے اُن کو تلنگے اور انگریز فوجیوں کو خاکی کیوں کہا گیا؟

خیال یہ ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں حصّہ لینے والے انقلابیوں کا سردار تلنگانہ (دکن) کا رہنے والا تھا، ویسے سارے انقلابی اودھ اور روہیل کھنڈ (اُتر پردیش) سے تعلق رکھتے تھے۔ اودھ کے رہنے والوں کو پوربیہ بھی کہتے تھے۔ انگریز فوجیوں کو خاکی اس لئے کہا جاتا تھا کہ اُن کی وردی کا رنگ خاکی ہوتا تھا۔

○ دکن میں مسلم بادشاہت کی بنیاد کب پڑی؟

سب سے پہلا مسلم حملہ 1296ء میں دیوگری پر ہوا۔ جو علاء الدین خلجی کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس حملے میں یادو راجا کی لے نت دولت خلجی نے لوٹی لیکن دکن میں مسلم بادشاہت کی بنیاد 1347ء میں پڑی اور ظفر خان علاء الدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا اور بہمنی خاندان کا بانی کہلایا۔

○ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ڈاک بھیجنے کا کیا طریقہ تھا؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے چار پانچ سو برس پہلے عوام زیادہ باخبر رہنا ضروری نہ سمجھتے تھے آپس کے رشتے دار قریب ہی قریب کی بستیوں میں رہتے تھے۔ بڑے لوگوں یا شاہی عہدے داروں کی خبر رسانی کے اپنے ذرائع تھے — پھر بھی شیر شاہ سوری کے عہد سے ڈاک کا سلسلہ شروع ہوا جو مغلوں کے زمانے میں کافی ترقی پا گیا۔ ڈاک دو طرح کی تھی۔ گھوڑے کی ڈاک جو "الاق" کہلاتی تھی یہ شاہی ڈاک تھی۔ ہر چار میل کے فاصلے پر گھوڑے بدل دیے جاتے تھے۔ عوام کی ڈاک "پیدل" بھیجی جاتی تھی۔ ایک میل میں تین چوکیاں ہوتی تھیں۔ ہر چوکی پر ہرکارے کمر کسے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ ڈاک لے کر دوڑنے والے ہرکارے کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈنڈا ہوتا تھا جس کی موٹھ پر گھونگرو بندھے ہوتے تھے۔ جیسے ہی آنے والے ہرکارے کے گھونگروؤں کی آواز

آتی چوکی پر بیٹھا ہوا ہرکارہ مستعد ہو جاتا اور آنے والے ہرکارے سے ڈاک کا تھیلا لے کر آگے کی سمت میں دوڑتے ہوئے روانہ ہو جاتا اور اسی طرح ڈاک کا تھیلا ایک ہرکارے سے دوسرے تک پہنچتا اور آخر ڈاک اپنی منزل پر پہنچ جاتی۔ بتایا جاتا ہے کہ احمد آباد سے دہلی تک ڈاک کے پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ 12 دن اور کم سے کم ایک ہفتہ لگتا تھا۔ اگر ڈاک دیر سے پہنچتی تو ہرکاروں سے جواب طلب ہوتا اور ان کا جُرم ثابت ہونے پر اُن کی تنخواہ کا کچھ حصہ کاٹ لیا جاتا۔

○ شکرانہ کس قسم کے کھانے کو کہتے ہیں؟

شُکرانہ کے معانی تو احسان یا شکریے کے ہیں یا کسی کام کے بدلے میں کچھ دینے کو شُکرانہ کہتے ہیں۔ آپ کی مُراد دراصل 'شکرانے' سے ہے۔ خُشکے (اُبلے ہوئے پھیکے چاول) پر شکّر اور گھی ڈال کر جو کھانا کھایا جاتا ہے اس کو 'شکرانا' کہتے ہیں۔ گاؤں میں رہنے والے لوگ شادی بیاہ کے موقعے پر جب برادری کو کھانے کی دعوت دیتے تھے تو کھانے میں شکرانا ہی ہوتا تھا۔ اب تو حالات نے بات کو بدل دیا ہے مگر پہلے یہ شکرانا میزبان کے لیے اکثر تباہ کُن ثابت ہوتا تھا یعنی مہمانوں کے سامنے رکھی ہوئی ڈھوبریوں (مٹی کی رکابیاں) میں پہلے خُشکہ ڈالا جاتا، اس پر شکّر یا کھانڈ چھڑکی جاتی اور پھر مٹی کے ٹونٹی دار لوٹوں سے دیسی گھی ڈالتے اور تب تک ڈالتے رہتے جب تک کہ مہمان منع نہ کر دیتا۔ بعض حاسد مہمان برادری میں میزبان کی بے عزتی کرنے کی غرض سے اپنی ڈھوبریوں میں سُوراخ کر لیتے، میزبان لوٹے کی ٹونٹی سے گھی ڈالے جاتا مگر نہ ڈھوبری بھرتی اور نہ مہمان انکار کرتا۔ میزبان اپنی آن کی خاطر اپنا ہات نہ روکتا اور نتیجے میں گھی کے کنستر کے کنستر بہا دیئے جاتے۔ دراصل یہ جاگیردارانہ نظام ہی کا کھوٹ تھا جو انسانوں کو کم تری کے احساس میں مبتلا کرتا تھا اور جھوٹی شان سے رہنا سکھاتا تھا۔

○ کارل مارکس نے کیا پیش گوئی کی تھی۔ کیا وہ سچ ثابت ہوئی؟

مارکس نے جمہوریت کا انتہائی عالمانہ و مفکرانہ تجزیہ کرنے کے بعد جمہوریت کے نقائص دور کرنے کی کوشش کی۔ اُس کی کوشش کا جو موثر نتیجہ نکلا وہ سوشلزم کا نظریہ تھا۔ مارکس نے اپنی مشہور تصنیف کیپٹل (capital) کے ذریعے جو پیش گوئی کی وہ یہ ہے کہ مشینوں کے عام استعمال سے انسانی سماج میں دو طبقے پیدا ہوں گے۔ ایک مزدور کا دوسرا سرمایہ دار کا۔ مزدوروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر سرمایہ دار زیادہ اہلِ سرمایہ اور زیادہ طاقت ور اور بارسوخ بنتے جائیں گے۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دن تک قائم نہیں رہے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت کش طبقہ متحد ہو کر سرمایہ دار طبقے کے ہات سے دولت چھین لے گا اور اس دولت کو سماج کی ملکیت قرار دے دے گا۔ کارل مارکس اقتصادیات کا پیغمبر تھا اُس کی پیش گوئی روز بروز صحیح ثابت ہوتی جا رہی ہے۔ ابھی صرف نصف صدی گزری ہے اور ایک تہائی دنیا پر محنت کشوں کا راج قائم ہو چکا ہے وہ دن دُور نہیں جب ساری دنیا محنت کشوں ہی کی ہوگی۔

○ مغل بیگمات میں سلیمہ بیگم کون تھیں؟

ہمایوں کی سگی بہن گل رخ بیگم کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم تھیں یعنی یہ ہمایوں کی بھانجی اور اکبر کی پھوپی زاد بہن ہوئیں۔ ہمایوں کی تجویز پر اکبر نے سلیمہ بیگم کی شادی بیرم خان سے کر دی۔ شادی کے وقت سلیمہ بیگم کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ دراصل اِس شادی سے بیرم خاں کا مغلیہ سلطنت سے رشتہ مضبوط کرنا مقصود تھا۔ سلیمہ بیگم پڑھی لکھی تھیں، مطالعے کا شوق تھا، سخن فہم تھیں اور سخن شناس بھی۔ فارسی میں شعر بھی کہتی تھیں۔ خاندان کے مسائل حل کرنے میں اُن سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اکبر کی پھوپی گل بدن بیگم کے ہمراہ حج کو گئی تھیں اور حج کرنے کے بعد واپس ہوئی تھیں 60 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

○ دہائی کی تشریح کیجئے؟

دراصل یہ بہت حد تک مذہبی اور کسی حد تک سماجی اصلاحی تحریک ہے جو کبھی عرب کے علاقے نجد میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نام کے ایک عالم نے شروع کی تھی۔ شیخ محمد مدینے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہم سبق بھی تھے۔ انھوں نے عرب میں بدعتوں اور مشرکانہ رسموں کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں وہ مقابل حکومتوں میں سے انھوں نے سعودی حکومت کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ عسکری تعاون کی بنا پر اس تحریک میں خاصی طاقت پیدا ہو گئی۔ شیخ محمد کے انتقال کے بعد سعودی حکمرانوں نے اس تحریک کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ آگے بڑھایا۔ حجاز جو ترکی کے تحت تھا جب سعودی حکومت کے قبضے میں آیا تو سعودی حکومت نے اپنی اسی تحریک کے تحت قرآن و سنت کی روشنی میں پختہ مزاروں اور روضوں کو مسمار کر دیا اور ترکی رسموں کو بھی ختم کر دیا۔ اس سعودی اقدام میں شدت ضرور تھی مگر قرآن و حدیث کی رو سے یہ اقدام غلط نہیں تھا۔ چوں کہ مصر کا محمد علی خود مختار بننا چاہتا تھا اس لئے وہ ترکی کا ہم نوا و معاون بن گیا۔ ترکی حجاز پر دوبارہ قبضہ کرنا چاہتا تھا اور انگریز ہندستان کے ساتھ ساتھ ابصرہ اور بحرین کے علاقے بھی اپنے تحت رکھنا چاہتے تھے۔ غرض تو سیاسی تھی مگر ان تینوں قوتوں نے مل کر دنیا میں وہابی تحریک کو بدنام کیا اور سعودی فوج پر چڑھائی کر کے حجاز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ یعنی سیاسی مقصد براری کے لئے 'وہابیوں' پر جھوٹے الزام لگائے گئے۔ اُن کو بزرگوں کا دشمن اور رسول کا مخالف مشہور کرنے کی کوشش کی گئی۔ جب کہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ پھول، فاتحہ، چادر، قوالی، صندل، عرس، نیاز، نذر، میلاد اور ایسے ہی دوسرے رسم و رواج کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، یہ رسوم عجمی ہو سکتے ہیں یا ہندستانی۔ ہندستان میں جو مسلمان علماء ان رسوم کو اسلامی عقیدے کے تحت انجام دیتے ہیں اور دلواتے ہیں۔ وہ کتاب و سنت پر عمل کرنے والوں کو وہابی، نجدی، کافر، بے دین اور ملحد وغیرہ کہتے ہیں۔ ہندستان کا اوہام پرست اور بدعتی مولوی اپنے روایاتی رسوم اپنی دکان داری کے تحت برقرار رکھے ہوئے ہے اور ترکی، مصر اور انگریز اپنی سیاست اور جذبۂ ملک گیری کی خاطر ان بدعتی رسوم کی وکالت کرتے تھے۔

○ چند پرانے اور اچھے شعر سنایئے؟

یہ شعر سنیے اور یہ بھی سنیے کہ یہ شعر اکبر الہ آبادی کے استاد وحید الہ آبادی کا ہے ؎

پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں
ہم اور خاک میں مل جائیں گے اٹھانے سے

ایک بہت پرانا شعر ہے جو نواب امداد امام اثر کا ہے ؎

آنکھ والا ترے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

یہ شعر بھی پرانا ہے اور مشہور ہے اور جلیل کی غزل کا شعر ہے ؎

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

خواجہ مجذوب کی غزل کا یہ مقطع پرانا بھی ہے اور اچھا بھی ؎

قدر مجذوب کی خاصانِ خدا سے پوچھو
شہرتِ عام تو اک طرح کی رسوائی ہے

پچاس برس پہلے جگر مراد آبادی کی نعت کا یہ شعر بھی بہت مقبول ہوا تھا ؎

میرے مولا بلا لو مدینے مجھے
غم ہجر تو جینے نہ دے گا مجھے

لطیف بدایونی کا یہ شعر بھی پرانے شعروں میں سے ہے اور ابھی تک زندہ ہے ؎

تو وہ مہِ خوبی ہے اے جلوۂ جانانہ
ہر گل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ

لاہری پرشاد بسمل شہید (جن کو کاکوری ڈکیتی کیس میں پھانسی دی گئی) کی غزل کے یہ دو شعر تو غیر فانی ہیں ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے دے دکھا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے

اگرچہ یہ نظم (بولیں اماں محمد علی کی) بہت ہی مشہور و مقبول رہی ہے مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس نظم کے خالق مرزا طاہر مراد آبادی تھے۔

○ کیا ہندی ہندستان کی اکثریت کی زبان ہے؟

ہندی اکثریت کی زبان تو نہیں ہے مگر 40 فی صدی ہندستانی عوام کی مادری زبان ضرور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ 35 فی صدی لوگ ہندی بول سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں چنانچہ بقیہ چودہ زبانیں 60 فی صدی لوگوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کو قومی زبان قرار دینا حق بجانب سمجھا گیا۔

○ کیا آپ یہ حقیقت تسلیم نہیں کریں گے کہ مسلمانوں ہی نے دنیا کو پہننا اوڑھنا، اٹھنا بیٹھنا اور زندگی گزارنے کے اچھے طریقے سکھائے ہیں؟

جی یہ بات میں بالکل تسلیم نہیں کروں گا بلکہ آپ کی خدمت میں یہ عرض کروں گا کہ ہم سب دنیا والے ایک دوسرے کو بہت کچھ سکھاتے ہیں اور ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتے بھی ہیں۔ ابھی تک آپ نے اپنے فرقہ پرست اور متعصب اخبارات و رسائل میں تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا ہے آئیے میں آپ کو اس تصویر کا دوسرا رُخ دکھاؤں۔ بانیٔ اسلام حضرت محمد نے جنگ کے دنوں میں خندق کھودنا (سلمان فارسی کے توسط سے) ایران سے سیکھا۔ پاجامہ بھی ایران ہی سے عرب میں پہنچا، عربی لفظ 'سروال' 'شلوار' ہی سے بنا ہے۔ حضرت عمر نے چاہا تھا کہ پاجامے کے ذریعے ایرانی تہذیب کو عرب میں نہ آنے دیں مگر جو چیز رواج پا چکی تھی وہ اُس کو نہ روک سکے حد یہ ہے کہ وہ لمبی ٹوپی (برُنس) جو عیسائی پہنتے تھے حضرت عمر کو اچھی معلوم ہوئی اور وہ خود پہننے لگے۔ عرب میں تابوت کا رواج نہیں تھا مگر حضرت زینب کے انتقال کے وقت حضرت عمر نے اپنی اِس فکر کا اظہار کیا کہ جنازے کے سلسلے میں (خصوصی طور پر عورت کے جنازے کے سلسلے میں) مکمل پردہ کیسے ہو۔ اسماء نے ملک حبش کا حوالہ دیتے ہوئے تابوت کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ اسماء کے بتائے ہوئے نمونے پر حضرت عمر نے تابوت تیار کرایا ایران، روم اور یونان میں جب مسلمان پہنچے تو اُن کے پہننے اوڑھنے اٹھنے بیٹھنے غرضیکہ زندگی گزارنے کے بہت سے طریقوں میں تبدیلی آگئی۔ اُن ملکوں کی عورتوں سے مسلمانوں نے جب شادیاں کیں تو انھوں نے اُن ملکوں کے مخصوص کھانے بھی کھانا شروع کر دیے۔ حضرت محمد سے حضرت ابوبکر تک مسلمان دفتری نظام

یا بیت مال کے حساب کتاب سے بالکل ناواقف تھے حضرت عمر جب خلیفہ ہوئے تو انھیں معاملات کی ترتیب و تدوین میں دِقت پیش آئی۔ وہ صحابہ جو روم میں فوج سے متعلق دفتری نظام دیکھ آئے تھے اُنھوں نے حضرت عمر سے اپنا مشاہدہ بیان کیا۔ چنانچہ اُن صحابہ ہی کے مشورے پر روم کے دفتروں کے نمونے پر حضرت عمر نے بھی اپنا حساب کتاب رکھنا شروع کیا ایران اور یونان ہی کی دیکھا دیکھی مسلمان خلیفاؤں نے پولس کو رواج دیا، عدالتیں قائم کیں اور اپنی حدود سلطنت کو صوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کیا۔ طب کی ابتدا بھی (قبل مسیح) یونان ہی میں ہوئی تھی جس کو بعد میں مسلمانوں نے اپنایا اور ایسی بہت سی باتیں۔

○ پرانی کتابوں میں 'ساداتِ بارہہ' کا ذکر اکثر آیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

ریاست اُتر پردیش کے ضلع مظفر نگر میں ایک علاقہ ہے جو بارہ گاؤں پر مشتمل ہے۔ اِن میں سادات کی آبادی ہے۔ اِس آبادی کے سید اپنی بہادری اور اپنے نسب کے صحیح ہونے کی بنا پر ہمیشہ مشہور رہے ہیں۔ مغلوں کی فوج میں رہ کر انھوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں اور بلند مرتبے اور منصب پائے ہیں۔ سید محمود کو اکبر نے چار ہزاری منصب عطا کیا تھا۔ سید ہاشم بارہہ، سید عبدالمطلب بارہہ اور سید عبداللہ خاں بارہہ میدان جنگ میں ایسی بے جگری اور دلیری سے لڑتے تھے کہ اُن کی بہادری ضرب المثل بن گئی تھی۔

○ شمالی ہند کی اکثر بستیوں میں 'چھڑیوں کا میلہ' لگتا ہے۔ چھڑیوں کو بعض ہندوانی میلہ کہتے ہیں اور بعض مسلم تیوہار — حقیقت کیا ہے؟

اِس سلسلے میں ایک بار حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کی ایک تحریر نظر سے گزری تھی۔ اُس سے اندازہ ہوا تھا کہ اس بات کی ابتدا تو ہندوؤں ہی نے کی تھی بعد میں اِس کو مسلمانوں نے بھی اپنا لیا۔ دراصل ہندستان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی کسی پر تر

استھان کی یاترا کو جاتا تو ہاتھ میں ایک جھنڈی لے کر گھر سے نکل پڑتا۔ وہ جھنڈی اس بات کی علامت ہوتی کہ وہ یاترا کو جا رہا ہے جو ہم سفر و ہم منزل بننا چاہے وہ ساتھ ہو لے۔ لوگ آتے ساتھ ہو جاتے اور اس طرح ایک قافلہ بن جاتا۔ یاتریوں کا یہ قافلہ جس بستی سے گزرتا اُس بستی کے لوگ اُن کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ ایک بستی کے لوگ دوسری بستی کے لوگوں کی خیریت سے بھی واقف ہو جاتے اور دوسری بستی والوں کو اپنے حال چال سے بھی باخبر کر دیتے۔ سفر کی تکلیفیں اُن دنوں اگرچہ کافی تھیں مگر سب یاتری مل جل کر اُن تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے اور آخر اپنے استھان پر پہنچ جاتے۔ زیارت کو جانے والے مسلمانوں نے بھی اسی طریقے کو اپنا لیا۔ اُن کی سب سے بڑی زیارت گاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی تھی۔ مسلمان زائرین جب اجمیر جاتے تو اپنی اپنی بستی سے ہاتھ میں چھوٹا سا جھنڈا لے کر نکلتے اور دراصل اس جھنڈے ہی کو 'خواجہ کی چھڑی' کہتے تھے۔ ایک مقررہ دن ساری بستیوں کی 'چھڑیاں' دلی میں جمع ہو جاتیں اور پھر خواجہ اجمیری کے جانشین قطب صاحب کے مزار پر میلہ لگتا اور میلے کے بعد ساری چھڑیاں ایک بڑے جھنڈے کی 'قیادت' میں اجمیر کے سفر پر روانہ ہو جاتیں۔

○ مولانا شوکت علی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

● نہ صرف میری رائے بلکہ کسی بھی معقول انسان نے اُن کے بارے میں اچھی رائے نہیں دی۔ بمبئی کے روزنامہ 'اجمل' کے اڈیٹر جناب معین الدین حارث نے مولانا شوکت علی کی مخالفت میں اکثر لکھا ہے۔ حافظ علی بہادر خاں تو اپنے اخبار 'ہلال' کے ذریعے بڑے سوقیانہ انداز میں اُن کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ 'ال ہلال' کے اڈیٹر احسن مراد آبادی ہمیشہ مولانا شوکت علی کی بناسپتی لیڈری کا مذاق اُڑاتے رہے۔ انگریزی روزنامے 'بامبے کرانیکل' کے بااصول اڈیٹر سید عبداللہ بریلوی نے مولانا شوکت علی کے سیاسی نظریے کو کبھی پسند نہیں کیا۔ 'کرانیکل' کے مزاحیہ کالم میں مسٹر ...... مولانا شوکت علی کا اکثر مذاق بنایا کرتے تھے۔

لاہور کے 'زمیندار' اخبار میں تو مولانا ظفر علی، شوکت علی کی لیڈری پر طنز آمیز نظمیں لکھا کرتے تھے۔ لاہور کے روزنامے 'انقلاب' میں سالک اور مہر اپنے اداریوں میں ان پر زبردست حملے کرتے تھے۔ روزنامہ 'سیاست' (لاہور) کے اڈیٹر سید حبیب بھی شوکت صاحب پر اکثر نشانے بازی کرتے تھے۔ لکھنؤ کے روزنامے 'ہمدم' (جس کے مدیر عبداللہ خاں کمندوی تھے) نے بھی مولانا شوکت علی کے متعلق کبھی اچھی رائے نہیں دی۔ کلکتے کے روزنامہ 'ہند' کے اڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی مجلس خلافت اور مولانا شوکت علی پر سخت تنقید کرتے تھے۔ دہلی کا روزنامہ 'الجمعیت' (اُن دنوں جس کے اڈیٹر ہلال احمد زبیری تھے) بھی ان کی غلط بات پر نکتہ چینی کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی بھی مولانا شوکت علی کی خوب خوب خبر لیتے تھے۔ قاضی عبدالغفار خاں نے اپنے اخبار 'پیام' (حیدر آباد) کے مزاحیہ کالم 'سر راہے' میں بڑے دلچسپ انداز میں اُن کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ 'تیج'، 'ملاپ' اور 'پرتاپ' تو واضح طور پر مولانا شوکت علی کے مخالف تھے حد یہ کہ صلح کل منش اور شیریں صفت اللسان سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں بھی اپنی 'آپ بیتی' میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا "شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر اُن کا محمد علی پر بڑا اثر تھا وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے" اگر مولانا شوکت علی کو کسی نے اچھا کہا ہے تو صرف جناب رئیس احمد جعفری نے۔ دراصل جعفری صاحب نے اُن کو اچھا نہیں کہا بلکہ حقِ نمک ادا کیا ہے۔ جعفری صاحب بھی 'خلافت' اخبار کے اڈیٹر تھے ___ مولانا شوکت علی کی اس ہندوستان گیر مخالفت کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک انتہائی غیر مخلص، جذباتی، جوشیلے، غیر سیاست داں اور ابن الوقت قسم کے مسلم لیگی ذہنیت کے لیڈر تھے۔ قوم کے نام پر تھوڑے وقت میں بہت زیادہ چندہ جمع کر کے اس کو ہضم کر لینے میں اُن کو کمال حاصل تھا! آغا خاں، مہاراجا کشمیر اور بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھ سر سلیمان قاسم مٹھا اُن کی پرورش فرماتے

تھے۔ انتہا یہ کہ جن دنوں شاہ افغانستان بمبئی کی راہ سے یورپ جا رہے تھے مولانا شوکت علی نے اُن کی شان میں سپاس نامہ پیش کر کے اور انھیں خوش کر کے ایک خاصی رقم اُن سے بھی اینٹھ لی ـــــ مولانا شوکت علی چندہ وصول کرنے کے سلسلے میں انسانیت سے اس حد تک گر جاتے تھے کہ ایک بار انھوں نے 'دوشنبہ فنڈ' شروع کیا اور اس کا پروپیگنڈا خصوصی طور پر تعلیمی اداروں میں کیا گیا۔ اسکیم یہ تھی کہ ہم دردانِ خلافت ہر دوشنبے کو گوشت وغیرہ کے بجائے صرف دال روٹی کھائیں۔ اس طرح جو پیسے بچیں وہ جمع کر کے خلافت فنڈ کے نام بھیج دیے جائیں، دوسرے مکتبوں سے اور لکھنؤ کے ندوے سے بھی سو سوا سو روپے ماہ وار آنے لگا یعنی مولانا شوکت علی نے اپنے مرغ مسلّم کی خاطر قوم کو دال کھانے پر مجبور کر دیا۔

○ قصہ خوانی بازار کس واقعہ کی بنا پر مشہور ہے؟

بادشاہ خاں اور اُن کے خدائی خدمت گار ساتھی جنگِ آزادی کے سلسلے میں، جب ایک بار گرفتار ہوئے تو پشاور کے قصہ خوانی بازار میں عوام نے اظہارِ ناراضگی کی صورت میں ایک جلوس نکالا۔ عوام کے جذبات کو دبانے کے لیے سرکاری افسروں نے فوج کی آرمرڈ کاروں سے نہتے لوگوں کا مقابلہ کیا۔ اس پر ہندو، سکھ اور پٹھان ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملا کر آرمرڈ کاروں کے سامنے ایک دیوار بن گئے مگر ظالم انگریز کی آرمرڈ کاریں سرفروشانِ آزادی کی دیوار کو ڈھاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں، کتنے ہی ہندوستانی کچلے گئے۔ اپنے ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر ایک نوجوان سے نہ رہا گیا اور اس نے بڑھ کر ایک آرمرڈ کار کو آگ لگا دی جس سے چار گورے جل کر مر گئے۔ فوج نے غضب ناک ہو کر اندھا دھند گولی باری شروع کر دی۔ بہت سے لوگ مارے گئے۔ اسی دن پشاور کی چوک یادگار پر مظاہرین پر گڑھوالی فوج کو گولی چلانے کا حکم دیا گیا تو اس نے گولی چلانے سے انکار کر کے اپنی حبِ وطنی کا ثبوت دیا۔ یہ خوں چکاں واقعہ 23 اپریل 1930ء کو ہوا تھا۔

○ مولانا محمد علی جوہر کے جس شعر کا یہ مصرع ہے 'بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد' وہ شعر لکھیے؟

[illegible]

جس شعر کا یہ مصرع ہے وہ مولانا جوہر کا نہیں بلکہ مولانا حالی کا ہے ؎

تعزیرِ عشق جرم ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

مولانا جوہر کا شعر یہ ہے (یہ غزل جیل میں کہی گئی تھی) ؎

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ۔ آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

○ مرزا غالب کی گرفتاری کا سبب کیا تھا؟

مرزا غالب دراصل دو بار گرفتار ہوئے۔ وہ اپنے یہاں جوا کھلواتے تھے۔ شاید نعل کی رقم بھی اُن کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ گرفتار ہوئے۔ ضمانت پر رہا ہوئے اور پھر اُن پر مقدمہ چلا۔ دوسری بار غدر (1857ء) کے دنوں میں چند گوروں نے اُن کے گھر میں گھس کر کسی شبہ کی بنا پر ان کو گرفتار کر لیا اور کرنل برن کے سامنے اُن کو پیش کیا۔ اتفاق سے مرزا کے ایک دوست اُس وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے سفارش کی اور مرزا کو رہائی ملی۔

○ دکن میں کوئی عورت ہو گزری ہے جو مصنوعی پھول پتے بنانے میں ماہر تھی وہ کون تھی؟

وہ عبدالرحیم خان خاناں کی بیٹی جانا بیگم تھی۔ وہ کم عمری ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شوہر کی موت کا غم اُس نے اِس طرح منایا کہ اُس نے دہکتے ہوئے انگاروں سے اپنے بدن کو کئی جگہ سے داغ لیا۔ بیوہ ہونے کی صورت میں وہ آخیر دم تک گاڑھے کے کپڑے پہنتی رہی ـــــ جہاں گیر جب دکن کے دورے پر گیا تو جانا بیگم نے اُس کو اور اُس کے درباریوں اور اس کے لشکریوں کو ایک پُر تکلف دعوتِ طعام دی۔ اتفاق سے وہ موسم خزاں تھا۔ جانا بیگم نے مصوروں اور پھول پتی بنانے والوں کی مدد سے درختوں کو کاغذ اور کپڑے کے پتوں اور پھولوں سے سجا دیا۔ موم اور لکڑی کے پھل بنوا کر اُن میں ٹانگ دیے اور رنگ و روغن سے اس طرح کام لیا کہ نقل پر اصل کا گمان ہونے لگا۔ چنانچہ کھانے کے بعد جب جہاں گیر چہل قدمی کرنے لگا تو اس نے ہر پیڑ کو سرسبز اور پھول پھلوں سے لدا ہوا دیکھا، بڑا حیران ہوا۔ روش پر چلتے ہوئے جب ایک پھل توڑنے

کی کوشش کی تو پتا چلا کہ یہ سب تو کاری گری ہے، بہت سینما اور خوش ہوں

○ مولانا آزاد اور سرسید کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

میری رائے سے زیادہ مولانا آزاد کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی کی رائے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ مولانا آزاد سے کہا کرتے تھے "تمہارا ذہن تو دماغ عجائب روزگار میں سے ہے، انہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔" اسی طرح لاہور کے شیخ غلام محمد (مالک اخبار وکیل) کا سرسید کے متعلق کہنا تھا "اگر نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو اُن کا دماغ تو نبوت کا دماغ تھا۔" دراصل مولانا آزاد اور سرسید کی اتنی بڑھی ہوئی ذہانت ہی کی بنا پر مولوی ملا اُن سے رقابت محسوس کرتے تھے اور اپنے حسد کی بنا پر مختلف حیلوں سے آزاد اور سرسید کو بدنام کرتے تھے۔

○ پہلا اردو اخبار کون سا تھا جو ٹائپ میں چھپا؟

مولانا محمد علی کا "ہمدرد" پہلا اردو روزنامہ تھا جو ٹائپ میں چھپا۔

○ انسان کی عمر پہلے زیادہ ہوتی تھی یا آج زیادہ ہوتی ہے؟

مذہبی کتابوں کی رو سے پچھلے زمانے میں انسان کی عمر زیادہ ہوتی تھی، وہ ہزار ہزار برس تک زندہ رہتا تھا۔ مگر سائنس دانوں کا اپنے سائنٹفک اندازے کے تحت کہنا ہے کہ پہلے انسانی عمر کا اوسط صرف ۲۵ برس تھا، چونکہ اس وقت کا انسان قدرتی آفات کا براہ راست مقابلہ کرتا تھا اور اس کے اپنے تحفظ کے لیے آج کے سے ذرائع اُس کے پاس موجود نہ تھے اس لیے اُس کی جسمانی قوت کا کوٹا جلد ختم ہو جاتا تھا۔ اور پھر وہ اُن دنوں بیماریوں کے علاج سے بھی ناواقف تھا۔ آج بعض ممالک میں تو انسانی عمر کا اوسط ستر برس ہے، مگر انسان اس سے بھی زیادہ زندہ رہ سکتا ہے یعنی اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل میں انسانی عمر کا اوسط ڈیڑھ سو برس ہو۔ زیادہ عمر پانے کے لیے

[illegible] کا صحت مندانہ [illegible]

انسان کا گہری اور پرسکون نیند لیتے رہنا بہت ضروری ہے۔

○ نجیب الدولہ کا روہیل کھنڈ سے کیا تعلق تھا؟

مغلیہ حکومت کے زوال کے دنوں میں جو علاقے خودمختار ہو چلے تھے اُن میں روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی تھا۔ نجیب الدولہ حاکم تھے اور قصبہ نجیب آباد جو انہی کے نام پر آباد ہوا تھا اُن کا دارِ حکومت تھا۔ اُن دنوں شمالی ہند کے نوابین میں نجیب الدولہ کو سیاسی اور دینی اعتبار سے ایک ممتاز مقام حاصل تھا اور وہ شاہ ولی اللہ سے بھی سلسلہ رکھتے تھے اور انہی کے اشارے پر انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی تاکہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت ایک دم ٹوٹ جائے (اور یہ اُن کی غلطی تھی)

○ علی برادران میں کوئی ایک احمدیہ فرقے سے تعلق رکھتے تھے یعنی قادیانی تھے؟

علی برادران سے مراد مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی لی جاتی ہے اور دونوں میں تو قادیانی کوئی نہیں تھا البتہ اِن کے تیسرے بھائی جو غالباً اِن دونوں سے بڑے تھے وہ قادیانی ضرور تھے۔

○ مراد مانگنے یا منت ماننے اور اس کے پورا ہونے کی نفسیات کیا ہے؟

یہ بات بڑی دلچسپ ہے اور سمجھنے والی ہے، دھیان سے سنئے۔ مراد مانگنا یا منت کا ماننا عوام کے اعتقاد سے تعلق رکھتا ہے اور عوام کے ذہن کو دلیل یا منطق سے چڑ ہوتی ہے۔ عوام جو کامیابی یا شاید اتفاقی فوری شہرت دے دیتے ہیں کہ اُسی سلسلے کی بہت سی ناکام مثالیں اُن چند کامیاب مثالوں پر غالب نہیں آ پاتیں۔ اس بات کو واضح طور پر اس طرح سمجھئے کہ ہندوستان کی فلمی دنیا میں ہر برس کم و بیش ایک ہزار فلموں کا مہورت (پنڈتوں کے ہاتھوں نکلوایا ہوا) بڑے لوازمات کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر فلم ساز اپنی فلم کی کامیابی کے لیے اپنے طور پر بھی کسی مندر میں یا کسی درگاہ پر یا کسی پیر بابا کی خانقاہ پر جا کر مراد مانگتا ہے یا منت مانتا ہے۔ ایک ہزار فلموں میں سے [illegible] چار سو فلمیں مکمل ہو پاتی ہیں اور

چار سو فلمیں جب ریلیز ہوتی ہیں تو ان میں مشکل سے پندرہ بیس ہی فلمیں مالی طور پر کامیاب ثابت ہوتی ہیں اور بقیہ فلموں میں سے ہر ایک اپنے پروڈیوسر کی تباہی کا باعث ثابت ہوتی ہے یا اپنے ڈسٹری بیوٹر کا بیڑا غرق کر جاتی ہے لیکن چند فلموں کی کامیابی کو مراد یا منت کا معجزہ سمجھا جاتا ہے اور بہت سی فلموں کی ناکامی کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اگر فلم کا مہورت نہ کبھی کیا جائے اور مراد یا منت نہ کبھی مانی جائے تب بھی کامیاب اور ناکام فلموں کا تناسب وہی رہے گا۔ قطع نظر اس حقیقت کے بات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کم زور دل و دماغ ہی کے لوگ پیروں، سادھوؤں یا جیوتشیوں سے رجوع ہوتے ہیں۔ وہ بڑے قوی اور یقینی جذبہ اعتقاد کے ساتھ اپنا کام بن جانے کے لیے 'صاحبِ کرامات' سے التجا کرتے ہیں اور 'صاحبِ کرامات' کے ہاں کہہ دینے پر (لفسیاتی طور پر) اُن کے اندر ایک انتہائی قوی عزم اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے جذبے اور عزم کے نتیجے میں مہم کا سر ہو جانا یقینی ہے چنانچہ اپنی کامیابی کو وہ اپنی کوشش کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اُس کو اُس بزرگ کی کرامت سمجھتے ہیں جس سے وہ رجوع ہوئے تھے۔ ضعیف قلب و ضعیف ذہن کے ایسے لوگوں کے لیے درگاہیں اور آشرم دارِ شفا ثابت ہوتے ہیں۔ اگر وہ وہاں نہ جائیں تو اپنے دل و دماغ کی کم زوری کی بنا پر اُن کو اُس کام میں کامیابی حاصل نہ ہو جو وہ انجام دینا چاہتے ہیں۔ ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے ضعیف اعتقاد لوگوں کو جب کوئی بزرگ کوئی مشورہ دیتا ہے یا نصیحت کرتا ہے یا کوئی ہدایت دیتا ہے تو یہ خوش اعتقاد لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اس نصیحت پر عمل کیا تو نصیحت کرنے والے کی کرامت سے ہمیں فتح و کامرانی نصیب ہوگی۔ پھر قدرتی طور پر اُن میں ایک زوردار قوتِ عمل پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اُن کو کامیابی کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ لیکن ناکام ہونے پر وہ اپنی ناکامی کی توجیہہ کر کے خود مطمئن ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی مراد یا منت۔ یا 'صاحبِ کرامت' کی شہرت قطعی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اسی سلسلے میں ایک بار مولانا آزاد نے ایک مثال دے کر بات کو یوں سمجھایا تھا: 'اگر سو بیمار یہ عہد کرلیں کہ روانہ کریں گے اور صرف ایک درخت کے نیچے بیٹھے رہیں گے تو قدرتی طور پر یہی ہوگا کہ پچاس تو مر جائیں گے اور پچاس خود بخود اچھے ہو جائیں گے۔ لیکن کوئی اس کا تجربہ نہیں کرتا۔ اب اگر ارادت و اعتقاد کے ساتھ سو آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھیں اور اس بات کو شہرت دی جائے تو وہی پچاس فی صدی کا نتیجہ ایک غیر معمولی معجزہ بن جائے گا۔ اور کامیاب ہونے والے نصف حصے کے سامنے ناکام حصے کا کوئی ذکر نہ کرے گا۔' اس ساری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ مرادوں اور منتوں پر اعتقاد رکھنے کے لیے انسان کے لیے کم زور دل و دماغ کا ہونا ضروری ہے۔

○ اسماعیل شہید کا شاہ ولی اللہ سے کیا رشتہ تھا؟

مولانا اسماعیل شہید حضرت شاہ عبدالغنی کے بیٹے تھے اور شاہ عبدالغنی شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے یعنی مولانا اسماعیل شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے۔ اُن میں اسلام کی تبلیغ کا بڑا جوش تھا۔ انھوں نے شرک اور بدعت کے خلاف کئی کتابیں لکھیں۔ مولانا اسماعیل 1779ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مولانا سید احمد بریلوی کی قیادت میں سکھوں کے خلاف جہاد کرتے ہوئے مئی 1831ء میں شہید ہوئے۔

○ قطب مینار کس نے بنوائی تھی؟

کہتے ہیں جب سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی فتح کرلی تو اظہارِ تشکر کے طور پر 'مسجد قوتِ اسلام' اور قطب مینار کی تعمیر شروع کی۔ قطب الدین کے عہد میں مینار کے صرف نیچے کے دو درجے بن پائے۔ سلطان التمش نے اوپر کی باقی منزلیں مکمل کرائیں اور مسجد میں بھی تین دروازوں کا اضافہ کیا۔ سرسید نے اپنی تصنیف 'آثار الصنادید' میں لکھا ہے کہ جسے قطب صاحب کی لاٹ کہتے ہیں وہ مسجد قوتِ اسلام ہی کا ایک مینار ہے مگر بعض مورخوں کا خیال ہے کہ قطب الدین نے یہ لاٹ الگ تعمیر کیا اور اس کے اپنے نام پر اس کا نام قطب مینار یا قطب صاحب کی لاٹ پڑا۔ نام کے سلسلے میں بعض کا خیال ہے کہ قطب الدین نے یہ مینار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی یاد میں بنوایا تھا

اس لئے اس مینار کو قطب مینار کہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سلطان اَل تمش کو خواجہ بختیار کاکی سے عقیدت تھی اور قطب الدین کے ۔۔۔ مگر اس سلسلے میں ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس مقام کو قطب آخیر یا کوتا ... کہا گیا تھا اس لئے اس رعایت سے اس مینار کا نام قطب کہلایا۔ دراصل پرانے زمانے میں مینار بنوانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ شہر کا پہرہ دار مینار پر چڑھ کر آتے ہوئے دشمن کو پہلے سے دیکھ لے اور اپنی فوج کو پہلے سے ہوشیار کر دے۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کا خوبصورت ترین مینار ہے اور اپنے نقش و نگار اور بناوٹ کے اعتبار سے اٹلی کے مینار ' پیسا ' سے بھی بہتر ہے اور اونچا ہے اور اب اس کا شمار دنیا کے مشہور آثار قدیمہ میں ہوتا ہے۔

( ) مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی ' کا پس منظر کیا ہے ؟

بات تو طویل ہے مگر مختصر طور پر عرض ہے کہ مولوی مدن کا مکمل نام سیّد شاہ مدن تھا۔ وہ صحیح النسب سیّد تھے۔ ہردوئی (ضلع شاہ آباد۔ اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ وہ اودھ کے وزیر صفدر جنگ کے مشیر رہ چکے تھے، بنگال کے دردی خاں اور لکھنؤ کے شجاع الدولہ کے بھی وہ صلاح کار رہے۔ اگرچہ پانی پت کی تیسری لڑائی (1761ء) میں مرہٹے شکست کھا چکے تھے مگر 1772ء تک اُن میں پھر جان آ گئی تھی چھوٹی موٹی جھڑپوں اور لڑائیوں کے بعد جب مرہٹوں نے نجیب آباد (ضلع بجنور، اتر پردیش) کے نواب ضابطہ خاں اور اُن کے بال بچوں کو قید کر لیا تو مرہٹوں کی شرط کے مطابق نواب شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ کے نواب حافظ رحمت خاں کی ضمانت پر چالیس لاکھ روپے کی ہُنڈی لکھ کر مرہٹوں کے حوالے کر دی اور ضابطہ خاں کو رہائی دلوا دی۔ لارڈ ہیسٹنگز کے اشارے پر مرہٹوں اور ضابطہ خاں نے شجاع الدولہ کو زیر کرنے کی سازش کی۔ چالیس لاکھ روپے کی وہ ہُنڈی رحمت خاں کو دے دینے کا وعدہ کیا اور اس وعدے پر رحمت خاں کو بھی اپنے ساتھ ملا لینا چاہا۔ رحمت خاں نے شجاع الدولہ کو پیغام بھیجا کہ اگر آپ مجھے اُس ہنڈی کے ضمانتی بوجھ سے سبک دوش کر دیں تو میں آپ کی حمایت کروں۔ شجاع الدولہ نے مولوی مدن کو اپنا قاصد بنا کر رحمت خاں کے پاس بھیجا اور رحمت خاں کی شرط مان کر اُس سے مدد چاہی۔ اِدھر شجاع الدولہ نے ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے ماہ وار کے معاوضے پر انگریزوں سے فوجی امداد حاصل کی اُدھر رحمت خاں شجاع الدولہ کی حمایت میں مرہٹوں کے مقابلے پر میدانِ جنگ میں آ گیا اور نتیجے میں مرہٹوں کو لوٹنا پڑا۔ شرط کے بموجب رحمت خاں نے تمسک کی واپسی کے لئے خان محمد خاں اور عبیداللہ کشمیری کو سفیر بنا کر شجاع الدولہ کے دربار میں بھیجا۔ اسی اثنا میں شجاع الدولہ انگریزوں سے مل کر روہیل کھنڈ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنانے لگا اور اس نے یہ افواہ پھیلا دی کہ روہیلے اور مرہٹے تو پہلے ہی سے سازباز کر چکے تھے۔ چنانچہ شجاع الدولہ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ رحمت خاں کے سفیروں نے کہا: ' وہ جو کہہ دیں گے ہم مان لیں گے! ' چنانچہ شجاع الدولہ نے اپنے بھرے دربار میں مولوی مدن کو رحمت خاں کے سفیروں کے سامنے طلب کیا اور آنکھ مار کر مولوی مدن سے دریافت کیا: ' کیوں شاہ صاحب! ہنڈی کے بارے میں آپ نے حافظ رحمت خاں سے کیا قول کیا تھا؟ ' قربان جائیے مولوی مدن کی بلند کرداری انصاف پسندی حق گوئی اور جرأت کے کہ انھوں نے واضح الفاظ میں فرمایا: ' میں نے آپ کے ارشاد کے بموجب نواب رحمت خاں سے پکا وعدہ کر لیا تھا کہ ہنڈی انھیں واپس کر دی جائے گی! ' شجاع الدولہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور غضب ناک ہو کر بولا: ' تم نے سازش کی ہے میں نے ایسا وعدہ ہرگز نہیں کیا! ' مگر مردِ حق مولوی مدن نے تین بار یہی کہا: ' حضور نے ہنڈی کی واپسی کا اقرار واثق کیا تھا '۔ شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ پر انگریزوں سے مل کر حملہ کیا۔ کٹرہ میران پور کے میدان میں نواب رحمت خاں شہید ہو گئے۔ سلطان خاں نامی ایک فوجی سردار نے جب رحمت خاں کا سر شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا تو وہ ایک جاگیر سے نوازا گیا۔ نواب ضابطہ خاں کو بھی وہ سر دکھایا گیا۔ سر دیکھ کر اُس نے کہا ' واقعی یہ سر حافظ رحمت خاں کا ہے کسی دوسرے کا نہیں '

عکس [illegible]

جاع اُلدولہ کے ایک نمک خوار نواب شاطر جنگ نے سر دیکھ کر کہا:
یں رئیش فیش جناب عالی سے لڑنے کو آمادہ ہوئے تھے!' اور پھر
ت خاں کا یہ سر مولوی مدن کو دکھایا گیا وہ سر دیکھتے ہی رو پڑے
رو تے ہوئے کہنے لگے: 'ہاں! یہ اُسی مسلمان کا سر ہے!'
ری مدن کو اپنی حق گوئی، بے باکی اور سچ بات کہنے کی سزا یہ ملی
شجاع اُلدولہ نے اُن کی ساری جائے داد، مکان اور سارا سازو
امان ضبط کرلیا اور اُن کو قید میں ڈال دیا، جہاں وہ محنت مشقت
یلتے جھیلتے اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے!

○ انگریزوں کے زمانے میں کان پور کی مسجد کی ہادت کا کیا واقعہ رونما ہوا تھا؟

۱۹۰۵ء میں یوپی کی انگریز حکومت نے یہ تجویز منظور کی کہ دوسرے
ے شہروں کی سڑکوں کو چوڑا کرنے کے ساتھ ساتھ کان پور شہر
سڑکوں کو بھی وسیع کیا جائے۔ کان پور میں مچھلی بازار کی مسجد سڑک
چوڑا کرنے میں مانع آئی۔ کان پور کے ضلع مجسٹریٹ نے چاہا کہ مسجد
ایک حصہ منہدم کردیا جائے۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ حکومت
تجویز واپس لینے کے لیے تیار نہ تھی اور مسلمان مسجد کے تحفظ پر
بستہ تھے یہ کشمکش کئی برس تک جاری رہی۔ گورنر سے بھی استدعا
گئی۔ ضلع مجسٹریٹ جب ایک بار مسجد کے معائنے کے لیے تشریف
ے تو وہ مسجد میں جوتے پہنے ہوئے داخل ہو گئے۔ اس پر مسلمان
زیادہ ناراض ہوئے۔ بہرنوع احتجاج کی نوبت وائسرائے تک
پہنچی مگر نتیجہ لاحاصل رہا۔ اور پہلی جولائی ۱۹۱۳ء کو مسجد کا وہ مشرقی
صہ جو وضوخانے پر مشتمل تھا حکومت یوپی نے منہدم کرادیا۔ سارے
ک کے مسلمانوں نے غم منایا۔ 3 ر اگست کو مسلمانوں نے ایک احتجاجی
لوس نکالا جس نے بلوے کی صورت اختیار کرلی، پولیس نے گولی چلائی
ہت سے مسلمان ہلاک ہوئے اور بہت سے گرفتار کیے گئے۔ سارے
ک میں جلسے ہوئے، ہلاک ہونے والوں کے پس ماندگان اور مقدموں
ں جو ماخوذ تھے اُن کی قانونی پیروی کے لیے چندے ہوئے۔ بالآخر
سلمانوں نے اس میں حصہ لیا۔ اور آخر سرکار نے مقدمے واپس
ے لیے اور وہ ۱۰۶ ملزمین جو سیشن سپرد تھے رہا کر دیے گئے۔

○ کلکتہ میں جہاں واجد علی شاہ کو نظر بند رکھا گیا اُسے مٹیا برج کیوں کہا گیا؟

وہ مقام پہلے ہی سے مٹیا برج کہلاتا تھا۔ کلکتہ شہر سے چند
میل کے فاصلے پر دریائے ہُگلی کے کنارے ایک علاقہ تھا جس
کو گارڈن ریچ کہتے تھے۔ وہاں ایک مٹی کا تودہ سا تھا لوگ اس کو
مٹیا برج کہنے لگے۔ یہاں کئی بڑی اور شان دار کوٹھیاں واقع
تھیں۔ جب نواب واجد علی شاہ معزول ہو کر لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے
تو انگریز حکومت نے دو کوٹھیاں نواب واجد علی شاہ کو دیں،
ایک نواب خاص محل کے رہنے کے لیے دی اور ایک نواب کے
خسر علی نقی خاں کو بخش دی گئی۔ تقریباً سات میل کا ایک بڑا قطعہ
نواب کے ملازمین کے رہنے کے لیے دیا گیا۔ جو دو کوٹھیاں نواب
کو دی گئی تھیں نواب نے اُن کے نام سلطانہ خانہ اور اسد منزل
رکھے اور نواب خاص محل کی کوٹھی کا نام مرصع منزل رکھا گیا۔
چنانچہ وہ سارا علاقہ جس میں واجد علی شاہ، اُن کے ملازمین
اور اُن کے رشتے داروں نے سکونت اختیار کی وہ مٹیا برج
ہی کہلایا۔

○ کیا یہ سچ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے مولانا آزاد کو کبھی پسند نہیں کیا؟

مولانا دریاآبادی کی حیثیت ہی کیا ہے کہ وہ مولانا آزاد کو پسند
کریں یا نہ کریں ــــ بات دراصل یہ ہے کہ مولانا آزاد ایک ماڈرن
قسم کے روشن خیال مولانا تھے۔ اُن کا ذہن کئی نہیں بل کہ کئی
سو ذہنوں کا نچوڑ تھا وہ محض ایک سیاسی شخصیت نہ تھے بل کہ
اُن کی ایک ذات میں کئی شخصیتیں جمع تھیں۔ چنانچہ بسم اللہ
کے گنبد میں بند رہنے والے اکثر مولوی ملّا مولانا آزاد کے سلسلے
میں حسد و رقابت کا شکار رہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کو ہلکا
کرنے والوں میں مولانا دریاآبادی ہمیشہ نمایاں رہے ہیں اُنھیں جب
بھی موقع ملا ہے انھوں نے چٹکی لی ہے مگر وہ مولانا آزاد کی زندگی
میں کچھ نہ کہہ سکے اُن کی موت کے بعد انھوں نے اُن کا کفن میلا
کرنا شروع کیا اور مولانا آزاد کی اُجلی شخصیت پر اپنے نفس کا
گرد و غبار ڈالنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد
پاکستان کے پبلیشروں نے اُن کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن

شائع کیے اور جلدبازی میں کتابت وطباعت کے سلسلے میں انھوں نے کوئی احتیاط نہیں برتی، نہ پروف ریڈنگ ہوئی اور نہ تصحیح کرائی گئی چنانچہ ایسے ایڈیشنوں میں ہر صفحے پر زبان دانی کی ایک دو غلطی پائی گئی۔ مسلم لیگی ذہن کے ادیبوں اور صحافیوں کو مولانا آزاد کے ' املاءِ انشا' کو غلط ٹھہرانے اور اُس کو دُرست کرنے کا خوب خوب موقع ملا اور یہ مولانا دریاآبادی کے لیے سنہری موقع تھا کہ انھوں نے پاکستانی قلم کاروں کی ایسی تنقیدوں کو خوب اُبھارا۔ 1951ء میں مولانا دریاآبادی نے مرزا یاس یگانہ چنگیزی جیسے عالم، باصلاحیت انسان اور صفِ اوّل کے شاعر کی اہلِ لکھنؤ سے جو دُرگت بنوائی اُسی سے اُن کی شر پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بڑا اتفاق تھا کہ مولانا آزاد ایک قدرناشناس فرقے میں پیدا ہوئے اُن کو خود بھی آخری دم تک یہ قلق رہا کہ وہ اِس عہدِ دمحل کے آدمی نہ تھے لیکن اِس عہدِ دمحل میں پیدا کر دیے گئے تھے۔

○ کیا یہ دُرست ہے کہ ہندُستان کے کسی بھی فرقے کی بہ نسبت مسلمانوں میں ظرافت و مزاح (Sence of Humour) کا مادہ زیادہ ہے اور اسی طرح اُردو زبان میں کسی بھی علاقائی زبان کی بہ نسبت مزاح کا عنصر نمایاں ہے؟

زیادہ ہے کہ مسلمانوں میں ہنسی، چُہل، دل لگی، ٹھٹھول اور مسخرہ پن اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ سب کچھ ایک ' قومی خصلت' بن گیا ہے اور یہ ' خوبی' یا ' خامی' اتنی عام ہوگئی ہے کہ اب اس پر کوئی غور بھی نہیں کرتا۔ ذرا آپ تو غور کیجیے کہ

ضلع جھگڑ لو لینے والے اور پھبتیاں کسنے والے مسلم فرقے ہی میں پیدا ہوتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ گالیاں مسلم شریف زادے ہی کو یاد ہوتی ہیں۔

اخبارات و رسائل میں جو مزاحیہ جریدے ہیں وہ اردو زبان ہی سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے اڈیٹر مسلمان ہی ہیں۔

مسلمان امیروں کے دیوان خانوں میں سب سے زیادہ ' دل خوش کرنے والے' مسخرے پائے جاتے ہیں۔

دوسرے مذہب کے واعظوں کی بہ نسبت مسلمان واعظ زیادہ لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔

تھیٹر اور فلم کے مزاحیہ ایکٹروں میں بھی مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

فحش کتابوں کے مصنفوں میں بھی مسلمان مصنف زیادہ ہیں۔

اُردو شاعری میں مزاح (ہاجی، ہزل، ریختی، ہجو، پھبتی، دھول دھپا وغیرہ) کا جتنا زیادہ عنصر پایا جاتا ہے شاید دنیا کی کسی دوسری زبان کی شاعری میں نہیں۔

وہ علاقے جہاں کبھی مسلمانوں کی حکومت رہی آج بھی ہندُستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت مزاح کے سلسلے میں زیادہ ' زرخیز' واقع ہوئے ہیں جیسے حیدرآباد۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ' فصاحت، فضیلت اور خوبی' (یا یہ کمینہ خصلت) مسلمانوں ہی کے حصے میں کیوں آئی؟ ایک سلسلے میں سرسید نے کہا تھا کہ زوال آنے پر ہر قوم یا ہر فرقے کے فضائل رذائل میں بدل جاتے ہیں اور زوال پذیر فرقے کے عوام و خواص میں رفتہ رفتہ ساری سفلہ عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سرسید نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا وہ درست ہے۔ اسلام سے قبل عرب میں بھی پھکڑپن اپنی انتہا پر تھا۔ عرب عورتیں تک ایک دوسرے سے تمسخر کرتی تھیں۔ وہ سب ایک دوسرے کو بُرے اور توہین آمیز ناموں سے مخاطب کرتے تھے (اُن کے اکثر اشعار ہجو آمیز ہوتے تھے۔ آخر حضرت محمد کی تعلیم نے ان خرابیوں کو دُور کیا۔ ہندُستان میں بھی مغلوں کی حکومت پر جیسے جیسے زوال آتا گیا مغل حکمرانوں کے درباروں میں مسخرہ پن بڑھتا گیا۔ محمد شاہ جو خاندانِ مغلیہ کے دورِ زوال سے تعلق رکھتا ہے ہر لمحہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا اور درباریوں کے مسخرے پن سے دل بہلاتا۔ اپنے بادشاہ کی خوشنودی کے لیے اُس وقت کے اُمرا بھی اسی کے رنگ میں رنگے گئے اور وہ بھی نوک جھونک ہی میں مزا لینے لگے، محمد شاہ کے درباریوں میں ایک امیر خاں تھا جو بڑوں بڑوں کا مذاق اڑانے کی ہمت رکھتا تھا اور انتہائی بے باک اور حاضر جواب تھا اور حد یہ کہ بادشاہ محمد شاہ کے ساتھ بھی گستاخی سے پیش آنے لگا اور آخر بادشاہ ہی کے اشارے پر اُسے

قتل کردیا گیا۔ اسی طرح نور بائی نام کی ایک طوائف بھی محمد شاہ کے دربار سے تعلق رکھتی تھی اور پھبتی کسنے میں مشہور تھی۔ غرضیکہ نحوست اتنی بڑھی کہ نادر شاہ جیسے افغان گڈریے نے خاندان تیموریہ کے حکمران محمد شاہ کے دارحکومت دہلی پر حملہ کیا ــــ

دراصل جب قوم پر زوال آتا ہے تو اخلاق بگڑجاتا ہے، اچھی عادتیں بُری عادتوں میں اور اچھی خصلتیں بُری خصلتوں سے بدل جاتی ہیں اور مزاح یا ظرافت کو بُری ہی خصلت لیا جائے گا۔ اس بات سے اب یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ کسی قوم پر زوال کیوں آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسان کی ہر نسل کی یہ خاصیت رہی ہے کہ جب کوئی دولت، سلطنت یا کسی قسم کی جائیداد محنت، مشقت اور کوشش کے بغیر اُسے ہاتھ آتی ہے اور اپنی بزرگ نسل کی نگرانی و سرپرستی اسے حاصل نہیں رہی ہے تو اس نے کبھی اُس عطیے کی قدر نہیں کی اور جب سرمائے کی نگہداشت نہیں ہوگی تو وہ ضائع ہونے لگے گا۔ سرمائے کی نگرانی اور حفاظت کرنے کی صورت میں سرمائے کے مالک کو مصروف رہنا پڑتا ہے اور نگرانی نہ کرنے کی حالت میں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے اور فرصت میں دل بہلاوے کے لئے ٹھٹول سوجھتا ہے۔ پھر نتیجہ ظاہر ہے کہ جرأت بے شرمی میں بدل جاتی ہے بہادری بے رحمی کا روپ دھار لیتی ہے، خواہش ہوس بن جاتی ہے اور جو طبیعتیں پہلے پند و حکمت سے آسودہ ہوا کرتی تھیں وہ ہزل اور فحش گوئی [illegible] لگتی ہیں۔ اب اسی سے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر [illegible] عنصر مسلم عوام میں کیسے پیدا ہوا ــــ؟ حکمران طبقے کا مزاج و مذاق عوام کو بھی متاثر کرتا ہے اور خصوصی طور پر وہ فرقہ زیادہ متاثر ہوتا ہے کہ جس فرقے سے حکمران طبقہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ بادشاہ کے ہم مذہب فرقے ہی کو بادشاہ کی زیادہ قربت حاصل ہوتی ہے اُسی کو درباداری اور مصاحبت کے زیادہ موقعے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسلم حکمرانوں کے گھٹیا مذاق سے بہ نسبت دوسروں کے مسلمان ہی زیادہ متاثر ہوئے اور اپنے مسلم حکمرانوں کی خوشنودی (انعام و اکرام کی طمع میں) کے لئے انھوں نے بھی گانے بجانے، ناچنے کودنے واسوخت، مثنوی، قصیدہ، ہزل اور ہجو لکھنے، بھانڈپن اور

[illegible]

مسخرہ پن میں کمال حاصل کیا۔ کسی قوم یا کسی فرقے پر ایک دن میں زوال نہیں آیا کرتا بلکہ مکمل تنزلی کے لیے ایک زمانہ درکار ہوتا ہے اورنگ زیب کے عہد سے مسلم حکمرانی کا زوال شروع ہوا ــــ اور محمد شاہ رنگیلے کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے واجد علی شاہ پر جاکر ختم ہوا چنانچہ اُس بےہودگی کی ابتدا جسے انگریزی میں ہیومر (Humour) کہتے ہیں نعمت خان شیرازی عالی سے ہوئی جو اورنگ زیب کا داروغہ مطبخ بھی تھا اور صرف خاص کا دیوان بھی اور درباری ظریف بھی۔ محمد شاہ کا دربار تو مسخروں اور اوباش عورتوں سے بھرا ہوا تھا جن میں امیر خاں جیسے گستاخ اور نور بائی جیسی طوائف کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور لکھنو کے نوابین کا تو سارا مذاق بھانڈوں، نقالوں، رنڈیوں اور ڈومنیوں ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ رنڈیوں میں پیارو اور بھانڈوں میں تجن، قائم۔ دائم، رحیمی، نوشاہ اور لی قدر کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چنانچہ جسے آپ اور ہم مزاح کہتے ہیں وہ زوال پذیر معاشرہ میں جنم لیتا ہے اور اس کا 'وجود' معاشرے کے لیے اور زیادہ زوال کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت محمد نے ہر وقت کے مزاح کو پسند نہیں فرمایا اور مسلمانوں کو طعن کرنے، فحش بکنے، استہزا کرنے اور کسی کی ایسی نقل اتارنے سے کہ جس پر لوگ ہنسیں منع فرمایا ہے ــ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں بھی لوگ صاحب ہیبت اور صاحبِ وقار ہوتے تھے اور پسندیدہ و جائز مزاح کو بھی پسند نہ فرماتے تھے چنانچہ حضرت عمر فاروق یہ کہہ کر حضرت علی پر معترض ہوئے تھے: "اُن کے مزاج میں مزاح بہت ہے!" ۔ خلفائے امویہ کے عہد تک عرب میں مزاح و ظرافت بہت ہی کم رہی۔ اُس وقت کے ماں باپ اپنی اولاد کو مزاح سے اسی طرح روکتے تھے جس طرح دوسری برائیوں سے روکا جاتا ہے ــــ۔ اب ظاہر ہے کہ اردو زبان پر مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے اور پھر اُردو نے مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں جنم لیا ہے اس لئے اس زبان میں پھکڑپن کا پایا جانا لازمی بات ہے۔ معترضہ طور پر یہ بھی عرض ہے کہ جو قومیں اپنے مذہب سے پہچانی جاتی ہیں جیسے ہندو، مسلمان، پارسی، یہودی اور عیسائی وغیرہ اُن میں جو اچھی یا بُری

خصلت ہوگی اُس کو عام خیال کے مطابق اُن کی مذہبی تعلیم ہی کا نتیجہ سمجھا جائے گا۔ کسی قوم کی نیک خصلت اُس قوم کے مذہب کو بھی نیک نام بنا دیتی ہے اور بُری خصلت سے قوم بھی بدنام ہوتی ہے اور مذہب بھی رسوا ہوتا ہے۔ معترضہ طور پر ایک بات اور سُنئے۔ بہت دن ہوئے کہ جب ایک انگریز نے اردو زبان کی ایک لُغت انگریزی میں تیار کی۔ انگریزی زبان کے نقادوں نے اُس لُغت پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ اس سے پہلے فوربس اور شیکسپیئر نام کی جو اردو ڈکشنریاں انگریزی میں تیار کی گئی تھیں یہ ڈکشنری اُن سے صرف اتنی بدلی ہوئی ہے کہ اس میں مرتب نے ہزاروں گالیوں اور فحش محاوروں کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب ڈکشنری کے مرتب نے یہ دیا: "فوربس اور شیکسپیئر کی وہ ڈکشنریاں صرف اردو کی لغتیں ہیں اور میری یہ کتاب لغت بھی ہے اور اردو بولنے اور لکھنے والوں کی طبیعت کا آئینہ بھی ہے اس کتاب کے توسط سے میں نے اردو داں فرقے کے اخلاق و خصائل و جذبات کی پوری پوری ترجمانی کی ہے!" یہ جواب دے کر اُس مرتب نے دراصل مسلمانوں کی بول چال اور عادات و خصلات کی طرف اشارہ کیا تھا۔——

ان حقائق کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ جب جاگیردارانہ نظام کے تحت کسی معاشرے کی حالت ابتر ہو جاتی ہے تو اس معاشرے کے لوگ سفلی مذاق اور دل لگی کی راہ سے فرار اختیار کرنے لگتے ہیں۔

○ لکھنؤ شہر کب اور کیسے آباد ہوا اور یہ نام کیسے پڑا ؟

روایت اور قیاس سے کہا جاتا ہے کہ جب شری رام چندر جی اپنا بن باس پورا کرنے اور لنکا فتح کرنے کے بعد اجودھیا واپس ہوئے تو انھوں نے یہ سرزمین اپنے رفیق دم بدم ہمدم ہمدرد بھائی لچھمن جی کو جاگیر کے طور پر عطا کر دی۔ انھوں نے گومتی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ایک بستی بسائی اور ظاہر ہے کہ اُس بستی کا نام لچھمن پور یا لکشمن پور مشہور ہو گیا۔ اِس سرزمین پر مسلمان گیارہویں صدی عیسوی سے آباد ہونا شروع ہوئے۔ ۱۵۴۰ء میں جب ہمایوں، شیر شاہ سوری سے جون پور کے مقام پر شکست کھا کر بھاگا تو اس نے تازہ دم ہونے کے لیے لچھمن پور

ہی میں صرف چار گھنٹے قیام کیا۔ اتنے مختصر عرصے میں اِس بستی کے لوگوں نے میزبانی کا اس طرح ثبوت دیا کہ ۱۰ ہزار روپے اور ۵۰ گھوڑے اُس کی نذر کیے۔ ۱۵۹۰ء میں مغل شاہنشاہ اکبر نے جب سارے ملک کو ۱۲ صوبوں میں تقسیم کیا تو اودھ کی اسی سرزمین کو ایک صوبہ بنا کر شیخ عبدالرحیم کو اس کا صوبے دار مقرر کر دیا۔ شیخ صاحب ضلع بجنور (روہیل کھنڈ) کے رہنے والے تھے، تلاشِ روزگار میں آگرے پہنچے تھے، اپنی صلاحیت کی بنا پر اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے تھے اور پھر قابلِ اعتماد ثابت ہونے پر اکبر نے انھیں اودھ کا صوبے دار بنا دیا۔ شیخ عبدالرحیم ہی کے عہد میں صوبے کے اِس مرکزی مقام لچھمن پور کا نام لکھنؤ میں بدل گیا۔ لکھنؤ میں شیخ صاحب کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے۔

○ آپ کے خیال میں ۱۸۵۷ء کے غدر (یا پہلی جنگِ آزادی) کے اسباب کیا ہیں اور ہندستانیوں کو ناکامی اور انگریزوں کو کامیابی کیوں ہوئی ؟

اِس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نہ تو غدر تھا اور نہ جنگِ آزادی بلکہ اپنا اپنا اقتدار واپس لانے کی ایک ناکام کوشش تھی۔ جس طرح بہادر شاہ محض اپنے تخت کی سلامتی چاہتے تھے۔ اِسی طرح اُن کے بیشتر عزیزوں اور رشتے داروں کی اکثریت اپنی عافیت کی خاطر انگریزوں سے ملی ہوئی تھی اور حد یہ کہ ملکہ زینت محل اپنے بیٹے جواں بخت کا مستقبل بنانے کے لیے [illegible] لنکا ڈھا رہی تھیں۔ غدر کے بعد ولی عہد جواں بخت نے انگریزوں کے سامنے اِس امر کا ثبوت فراہم کیا کہ بغاوت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ اِدھر جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو صرف اپنی ہی ریاست کی بقا سے مطلب تھا۔ ایسی تحریریں ملی ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رانی کو بقیہ ہندستان کی آزادی یا غلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ تو کسی بھی شرط پر اپنی ریاست کو اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتی تھی۔

کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ غدر کا سبب یہ ہے کہ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) سے غدر (۱۸۵۷ء) تک سو برس کے عرصے میں انگریز نے تاجر بن کر ہندستان کو لوٹا اور ہندستان کی صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کو نقصان پہنچایا اور حاکم بن کر دیسی حکمرانوں،

نوابوں، راجاؤں، جاگیرداروں اور امیروں پر ظلم بھی کئے اور اُن کے ساتھ ناانصافی اور بددیانتی سے بھی پیش آیا جس کے نتیجے میں انتقام کی آگ بھڑک کر غدر کی صورت میں ظاہر ہوئی اور جن پر ظلم ہوا تھا انھوں نے اپنے آپ کو غیر ملکی انگریزوں کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کی۔
اس معمولی سی حقیقت کے قطع نظر اہم حقیقت یہ ہے کہ آخری دَور کے مغل حکمراں نکمّے اور ناکارہ تھے، ہر گھڑی ناچ و رنگ میں مشغول رہتے تھے۔ اُن کے محل قحبہ خانوں سے کم نہ تھے۔ رنڈیوں کو بیگمات کے رتبے دے دیے گئے تھے، بھڑوے دربار میں سج کر صلاح کار، مشیر و وزیر بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ زیادہ وقت نشے میں پڑے رہتے تھے۔ جب ہوش میں آتے تھے تو غزل کہتے تھے یا درباری شاعروں سے قصیدہ سنتے تھے۔ شاہزادے برائے نام پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ بعض تو قطعی طور پر جاہل ہوتے تھے۔ وہ سب تیر و کمان یا غلیل سے چڑیوں کا شکار کرنا ہی بڑا معرکہ سمجھتے تھے۔ خلقت پریشان تھی، لوٹ مار ہر طرف جاری تھی اور شاہی ملازمین کو چھ چھ مہینے تک تنخواہ نہ ملتی تھی ــ جن دنوں بہادر شاہ کے شہزادے غلیل کے غلّوں سے آتے ہوئے وقت کو اور واجد علی شاہ کے درباری زنخے "تالیاں بجاؤ موئے بھاگ جائیں گے" جیسے گانوں سے انگریز کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کی بچکانہ اور زنانہ کوشش کر رہے تھے، یورپ میں (1750ء) صنعتی انقلاب آچکا تھا اور جیمس ہارگریوز کی بنائی ہوئی Spinning Jenny مشین پر صرف ایک آدمی بیک وقت گیارہ دھاگے کاتنے لگا تھا، رچرڈ آرکرائٹ کی بنائی ہوئی واٹر فریم مشین محض پانی کے زور پر چل رہی تھی۔ سموئیل کرامپٹن کی ایجاد کی ہوئی اسپننگ میول مشین پر تھوڑے سے وقت میں بہت بڑھیا ململ تیار ہونے لگا تھا۔ جیمس واٹ نے بھاپ کا انجن بنا کر کپڑے کی صنعتی رفتار کو اور تیز کر دیا تھا، رچرڈ ٹریوتھک (1830ء - 1801ء) نے اسٹیم انجن، جارج اسٹیفن سن نے اسٹیم ریلوے انجن اور امریکی نوجوان رابرٹ فلٹن نے اسٹیم بوٹ بنا کر تیز رفتار مال لانے اور لیجانے میں بڑی سہولت پیدا کر دی تھی اور پھر (1876ء - 1837ء) بجلی کی طاقت سے پیغام رسانی کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا اور مارکونی کی لاسلکی نے تو دنیا کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب لے آن کا تھا۔ ہندستان مسلمان

کر دیا ــ چنانچہ 1857ء میں انگریز اور بہادر شاہ کے درمیان جنگ نہیں ہوئی بلکہ یورپ کے انڈسٹریلزم (Industrialism) ۔ اور ہندستان کے امپیریلزم (Imperialism) کے بیچ جنگ لڑی گئی۔ وقت کا تقاضا تھا کہ فتح انڈسٹریلزم کی ہوتی اور ایسا ہی ہوا ــ 1857ء کے غدر میں صرف دو طبقو نے حصہ لیا، حکمراں طبقے نے، اپنی حکومت کو بچانے کے لئے۔ دوسرا طبقہ اس بھیڑ کی مخلوق کا تھا جس نے لوٹ کر اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اس بغاوت کو اپنے لیے ایک سنہری موقع سمجھا۔ متوسط طبقے (جو اُن دنوں شرفا کہے جاتے تھے) کے لوگ چھپ کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہے یا بعض گھر چھوڑ کر محفوظ مقام پر چلے گئے اور جیسے جیسے انگریز کے قدم جمتے گئے وہ اس کی اطاعت قبول کرتے گئے ــ انگریز اور بہادر شاہ کے اس ذکر پر ایک بات اور یاد آگئی کہ بہادر شاہ ظفر کا تکیہ کلام "بھئی اللہ" تھا۔

○ بھٹو کے حالات زندگی بیان کیجئے اور یہ بھی بتایئے کہ اندرا گاندھی اور بھٹو میں کون بڑا سیاست داں ہے؟

5 جنوری 1928ء کو سر شاہنواز خان کی بیگم خورشید کے بطن سے لڑکانہ (سندھ) میں ذوالفقار علی بھٹو پیدا ہوئے۔ (1934ء ــ سے 1953ء تک) بمبئی کیتھڈرل ہائی اسکول، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکیلے، کرائسٹ چرچ، آکسفورڈ میں تعلیم پائی اور لنکن اِن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ (1953ء سے 1958ء تک) وہ وکالت بھی کرتے رہے اور انھوں نے یو۔ این جنرل اسمبلی میں پاکستانی وفد کی قیادت بھی کی۔ اکتوبر 1958ء میں جنرل ایوب خان نے اپنی وزارت میں اُن کو وزیر تجارت بنا دیا۔ 1963ء میں وہ وزیر خارجہ بنا دیے گئے اور انھوں نے پاکستان کو امریکا سے زیادہ چین کا دوست بنا دیا۔ 10 جنوری 1966ء کو ستمبر 1965ء کی ہند پاک جنگ کے خاتمے پر جو تاشقند معاہدہ ہوا بھٹو اس سے متفق نہیں ہوئے اور صدر ایوب سے اختلاف پیدا ہو گیا اور آخیر وہ صدر ایوب کی وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ 1967ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1968ء میں وہ گرفتار کر لیے گئے۔

اور فروری 1969ء میں وہ رہا کر دیے گئے۔ یحییٰ خاں کے دور میں دسمبر 1970ء میں پاکستان میں جو عام انتخابات ہوئے اُس میں بھٹو کی پارٹی نے مغربی پاکستان کی 150 نشستوں میں سے 80 نشستیں حاصل کر لیں۔ انھوں نے ایک بار اپنی پارٹی کی پالیسی اس طرح بیان کی تھی: "اسلام ہمارا عقیدہ ہے، جمہوریت ہماری پالیسی ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور سارے اختیارات عوام کے ہاتھ میں ہیں!" 25 مارچ 1971ء کو بھٹو نے شیخ مجیب اور اُن کی عوامی لیگ سے متفق ہونے سے انکار کر دیا اور پاکستانی فوج نے یحییٰ خاں کے حکم سے مشرقی پاکستان پر چڑھائی کر دی۔ 20 دسمبر 1971ء کو بھٹو صدر پاکستان کی حیثیت سے برسر اقتدار آ گئے۔ آج کل وہ وزیر اعظم ہیں ـــ اندرا گاندھی سے بھٹو کے موازنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھٹو سب کچھ ہیں مگر سیاست داں ہی نہیں ہیں ـــ اور اگر وہ سیاست داں ہیں تو اندرا گاندھی کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ بھٹو نے اپنی نادانی سے پاکستان کا بہت کچھ کھویا ہے جب کہ اندرا گاندھی نے اپنی سیاست سے اپنے ملک کی حدود میں اضافہ کیا ہے۔ اگر اندرا گاندھی نے غریبی دُور کر کے اپنے عوام کو مطمئن کر دیا ہوتا تو وہ نہ صرف ایشیا کی بل کہ دُنیا کی قابل ترین اور سب سے بڑی سیاست داں ہوتیں۔

○ اکبر بادشاہ نے اولاد کے لئے جو منّت مانی تھی وہ شیخ سلیم چشتی کے مزار (واقع فتح پور سیکری) پر مانی تھی یا خاجہ معین الدین چشتی اجمیری کی درگاہ پر؟

اس سلسلے میں اکثر لکھنے والوں نے بات کو گھلا ملا دیا ہے اور نتیجے میں بات واضح نہیں ہو پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کی اس منّت کا تعلق اِن دونوں بزرگ شخصیتوں سے تھا۔ اکبر کے یہاں کئی بچے پیدا ہوئے مگر کم سنی ہی میں مر گئے۔ 28 برس کی عمر تک جب اکبر لاولد ہی رہا تو اس کو یہ غم کھانے لگا۔ آگرے سے گیارہ کوس سیکری نام کا ایک گاؤں واقع تھا۔ اُس گاؤں میں شیخ سلیم چشتی رہتے تھے جو سلسلۂ چشتیہ سے تھے۔ اکبر اُن کے اوصاف سن کر خود سیکری گیا اور ان سے التجا کی کہ وہ دعا کریں اور منّت مانی کہ آپ کی دعا
[illegible]

سے اگر بیٹا پیدا ہوا تو اس کو آپ ہی کے دامن تربیت میں ڈال دیا جائے گا۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ ملکہ جودھا بائی اُمید سے ہے۔ چناں چہ جودھا بائی کو شیخ سلیم ہی کے زنان خانے میں بھیج دیا اور اکبر خود بھی ایک ملازم کی حیثیت سے کئی دن تک شیخ سلیم کی خدمت میں رہا۔ اسی عقیدت اور خوشی کے تحت سیکری میں ایک شان دار حرم سرا تعمیر کروائی اور گاؤں کو شہر کی طرح آباد کروایا اور سیکری کو فتح پور کا نام دیا۔ آخر جودھا بائی کے لڑکا پیدا ہوا۔ شیخ سلیم نے برکت کی نیت سے اپنی بیٹی سے دودھ پلوایا۔ اکبر کو انتہائی خوشی ہوئی کہ باج گذار ملکوں کے جتنے قیدی تھے سب کو رہا کر دیا گیا۔ چوں کہ شیخ سلیم، حضرت خاجہ اجمیری ہی کے مُرید تھے اس لئے اسی رشتے سے اکبر آگرے سے اجمیر تک 120 میل شکرانے کے لئے پیدل چل کر گیا۔ بیٹے کا نام شیخ کے نام پر سلیم ہی رکھا گیا اور اکبر ہمیشہ کچھ ادب اور کچھ پیار سے سلیم کو شیخو جی کہتا تھا۔ سلیم کئی برس تک شیخ سلیم چشتی ہی کے گھر میں پلا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شیخ سلیم چشتی کی دعا تو کارگر ثابت ہوئی مگر اُن کی تربیت مغل شہزادے کو ایک نیک انسان نہ بنا سکی۔ جہاں گیر ہی مغلیہ خان دان کا وہ پہلا بادشاہ ہے جس سے اس خان دان میں عیاشی کی ابتدا ہوئی۔ اپنی مراد پوری ہونے کی بنا پر اکبر کو اجمیر کی درگاہ سے آخر دم تک عقیدت رہی۔ اس نے آگرے سے اجمیر تک جگہ جگہ باغ لگوائے، کنویں کھدوائے، سرائے بنوائیں اور مینار تعمیر کروائے۔ کبھی اجمیر ایک معمولی سی بستی تھی اکبر نے اسے شہر بنا دیا۔ دو بڑی دیگیں جو وہاں رکھی ہوئی ہیں ایک اکبر نے نذر کی تھی جس میں [illegible] پک جاتے ہیں۔ دوسری دیگ جہاں گیر کی چڑھائی ہوئی ہے۔ جہاں گیر بھی جب اجمیر جاتا تھا تو کوس بھر پہلے سے گھوڑے سے اُتر پڑتا اور پھر پیدل درگاہ تک جاتا۔ شاہ جہاں کو بھی خاجہ اجمیری سے عقیدت تھی۔ درگاہ کے پاس سنگِ مرمر کی جامع مسجد اسی کی بنوائی ہوئی ہے۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا تو مزار کے ارد گرد اپنی پلکوں سے جھاڑو دیتی تھی۔ اور حد یہ ہے کہ ہر شرک اور بدعت سے دُور رہنے والا اورنگ زیب بھی چار بار اجمیر گیا اور ہر بار پیدل سفر کیا۔

○ کیا مسلمانوں کے بہادر ہونے کی وجہ اُن کا گوشت خور ہونا نہیں اور خصوصی طور پر گائے کا گوشت؟

اِس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ غذا انسان کی طبیعت اور مزاج کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا کام کرتی ہے یعنی حیوان کے کھانے سے حیوانیت آتی ہے۔ اسی لیے حضرت علی نے فرمایا تھا: "شکم کو حیوانات کا گورستان مت بناؤ"۔ جہاں تک گائے کے گوشت کا تعلق ہے یہ دیر ہضم ہوتا ہے۔ ناقص قسم کا خون پیدا کرتا ہے۔ سوداوی امراض میں بہت ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ عام حالت میں بھی بخارات کا رُخ دماغ کی طرف کیے رہتا ہے۔ مسوڑھوں اور ہونٹوں پر ورم لاتا ہے اور کند ذہن بناتا ہے۔ غذاؤں میں گائے کا گوشت اتنی ہی ناقص غذا ہے جتنی علم موسیقی میں قوالی کی صنف ۔۔۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ دونوں چیزیں مرغوب ہیں۔

○ آج کل لفظ انفلیشن بہت بولا اور لکھا جاتا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

د اِن فلے شن (Inflation) دراصل اقتصادیات کی ایک اصطلاح ہے اور اس کے معانی ہیں اضافۂ زر۔ اصطلاح میں ایسی صورتِ حال کو کہتے ہیں کہ جب مصنوعی ذرائع سے دولت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو دولت کی فراوانی کی بنا پر قوتِ خرید بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت عموماً کسی بڑی جنگ کے بعد پیدا ہوتی ہے یعنی جب جنگ کے نتیجے میں کارخانوں کی پیداوار متاثر ہوتی ہے اور حسبِ ضرورت مال تیار نہیں ہو پاتا اور لوگوں کے پاس دولت زیادہ ہونے کی بنا پر مال کی مانگ بڑھ جاتی ہے اور یہ ڈیمانڈ مہنگائی کو راہ دکھاتی ہے۔ اگر مال کی بائر ایکسپورٹ اور امپورٹ بڑھ جائے گی تب بھی عام لوگ، دولت مند بن جائیں گے اور ان کی بڑھی ہوئی دولت بھی ضروریاتِ زندگی کو مہنگا بنادے گی۔ یعنی سمگلنگ بھی اِن فلے شن کا باعث بنتا ہے۔ اگر کسی ملک میں اِن فلے شن زیادہ دن تک رہے تو وہ ملک اقتصادی اعتبار سے دیوالیہ ہو جائے گا۔

○ کیا کسی ملک کے اچھے یا بُرے جغرافی حالات اُس کے باشندوں کو اوہام پرست یا روشن خیال، ڈرپوک یا بہادر اور پست ہمت یا باہمت بناتے ہیں؟

[illegible]

جی ہاں! جہاں قدرتی حادثات اور خطرات بار بار ظہور میں آتے ہیں وہاں کے لوگ اوہام پرست، کم ہمت اور دیر سے ترقی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جیسے طوفانی بارش جس کی زد سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے سیلاب جو سب کچھ بہالے جاتا ہے، زلزلہ جس کے آنے پر انسان نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ کھڑا ہی رہ سکتا ہے، پہاڑوں سے نکلتے ہوئے دریا جن کی دھار کے رُخ کو پلٹ دینا آسان نہیں، گھنے جنگل جن سے گزرنا موت کو دعوت دینا ہے، ریگ زار جہاں انسان راہ بھول جائے تو بتلانے والا کوئی نہیں، سمندر جس کی طوفانی ہوائیں سب کچھ اڑائے جاتی ہیں، وبائی بیماریاں جو بستے گھروں کو رونے پر مجبور کر دیتی ہیں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ قدرت کے ایسے مظاہر کو انسان نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ اُن سے بچ سکتا ہے بس لرز جاتا ہے، سہم جاتا ہے اور اپنے آپ کو ایک مجبور، بے بس، عاجز اور لاچار انسان سمجھنے لگتا ہے۔ نا سمجھی یا ناواقفیت انسان کو اوہام پرست اور بے بسی و مجبوری کم ہمت بنادیتی ہے۔ دراصل جب کسی بات کا سبب سمجھ میں نہیں آتا تو پھر وہم پیدا ہو جاتا ہے اور جب رفتہ رفتہ وہم کا غلبہ بڑھ جاتا ہے تو عقل مغلوب ہو جاتی ہے۔ گرم ملکوں میں قدرتی حادثات زیادہ رونما ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر گرم ممالک کے باشندے اوہام پرست اور کم ہمت ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھی ایک گرم ملک ہے اور یہاں کی اوہام پرستی واضح ہے۔ اسی طرح ملک پیرو جو ہمیشہ زلزلوں کی زد میں رہتا ہے ایک اوہام پرست ملک ہے اور وہاں کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور وہ نیچر کے زور کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ پیرو اور ہندوستان کے برخلاف چھوٹا سا ملک یونان ایک تنگ سے سمندر میں واقع ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے، زلزلے کم آتے ہیں، طوفان اور بگولے بھی کم اٹھتے ہیں۔ یونان کا اونچے سے اونچا پہاڑ بھی ہمالیہ کے مقابلے میں پہاڑی معلوم ہوتا ہے، دریا برائے نام ہی ہیں۔ چند چشمے ہیں جو پایاب ہیں، گھنے جنگل نہیں اس لیے درندے یا موذی جانور بہت ہی کم ہیں، غرضکہ وہاں نیچر کے مظاہر خائف کرنے والے نہیں بلکہ ہمت اور دلیری پیدا کرنے والے ہیں۔ اسی لیے اُس ملک میں رہنے والوں کے دل پر خوف

غالب نہیں اسی لئے وہ خیال پرست کم ہیں اور انسان کی قوت ، اختیار و اقتدار سے واقف ہیں۔ ہندستان میں اوہام کا جو غلبہ موجود ہے اُس کی وجہ مذہب نہیں ہے بل کہ قدرتی حادثات ہی کی بنا پر مذہب میں اوہام داخل ہوئے اور کسی ملک کی نیچر ہی اُس ملک کا مذہب بناتی ہے۔ اوہام انسانی زندگی میں سب سے بڑی خرابی یہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ انسان کے دل میں مجبوری کے بیج بو دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کی گاڑی میں ہمیشہ کے لیے بریک لگ جاتا ہے اور انسان کسی بڑے یا قابل ذکر کام کے لیے قدم نہیں اٹھا پاتا اور ترقی رک جاتی ہے۔ نیچر کی پیدا کی ہوئی توہم پرستی کیسے دور ہو؟ تعلیم اور سائنسی تعلیم ہی کے ذریعے نہ صرف قدرتی حادثات کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے بل کہ اُن کو زیر بھی کیا جاسکتا ہے اور جب اسی کے نتیجے میں انسان اپنی مجبوری کے خیال کو اپنے دل سے نکال دے گا تو اس کے وہم پر اس کی عقل غالب آجائے گی۔

○ اکثر دیکھا گیا ہے (خصوصی طور پر ملی میں) کہ بعض لوگ (نوجوان) کسی چھوٹے موٹے جلوس کے نکلنے پر یا کسی تنگ سڑک پر ٹریفک جام ہو جانے پر خود بخود ایک ٹریفک پولس مین کی طرح بڑی سنجیدگی سے ہاتھ پھینک پھینک کر جلوس یا ٹریفک کو کنٹرول کرنے لگتے ہیں، نفسیات کی رو سے آپ ایسے لوگوں کو کیا کہیں گے؟

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خود صبح و شام بڑے اور با اختیار لوگوں کے ذریعے ڈانٹے اور ڈپٹے جاتے ہیں۔ چناں چہ اُن کی طبیعت کا یہ شدید تقاضا ہوتا ہے کہ وہ حاکم بنیں اور حکم چلائیں اس لیے جب بھی کوئی ایسا جھوٹا یا سچا موقع اُن کو ہاتھ آتا ہے وہ حکم چلانے کا کھیل کھیلنے لگتے ہیں۔ 1947ء سے قبل یو۔پی۔ کے ہر زمیندار یہ چاہتا تھا کہ اُس کا بیٹا تحصیل دار یا تھانے دار ضرور رہے۔ چوں کہ زمیں دار کو مال گزاری ادا کرنے اور اپنے علاقے کے چھوٹے موٹے تنازعوں کے سلسلے میں زندگی بھر تحصیل دار یا تھانے دار کے احکامات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لیے وہ بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر سے بھی احکام جاری ہوا کریں۔ مہاراشٹر کے دیہات میں رہنے والے بہ نسبت دوسروں کے قانون کے جنگل میں زیادہ پھنستے ہیں اس لیے اُن میں جب کوئی پڑھ لکھ جاتا ہے تو وہ عموماً وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور چوں کہ گجرات کے علاقے میں رہنے والوں کی صحت زیادہ اچھی نہیں ہوتی اس لیے گجراتیوں میں ڈاکٹری کا پیشہ عام ہے۔ دراصل اس انسانی نفسیات کا تعلق عمل اور ردِ عمل سے ہے۔

○ فقیر اِپی کا نام تو سنا ہے مگر حال نہیں معلوم اُن کے بارے میں کچھ بتائیے؟

فقیر اِپی کو انگریزی میں Faqir of Ipi کہتے تھے۔ وہ صوبہ سرحد کے علاقے وزیرستان کے مذہبی پیشوا بھی تھے اور حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کرنے کی بنا پر مجاہد بھی۔ وہ حاجی تھے اور اپنی عبادت و ریاضت کی بنا پر فقیر کے نام سے مشہور تھے پشاور کے بازار قصہ خوانی میں جب انگریز فوج نے فائرنگ کر کے بہت سے سرخ پوشوں کو ہلاک کر دیا تھا تو فقیر اِپی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کر دیا تھا اور جب انگریز حکومت نے اُن سے صلح چاہی تھی تو انھوں نے گاندھی جی اور خان عبدل غفار کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ فقیر اِپی کانگریس کے حامی تھے اور آزاد پٹھانستان چاہتے تھے۔ 1936ء میں انگریز سرکار نے اُن کے اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف سخت کارروائی شروع کی تھی اور اُن کے مکان تک کو آگ لگا دی تھی مگر انھوں نے بھی وادیٔ شورہ میں چھپ کر انگریزی فوج پر پے در پے اتنے چھاپے مارے کہ اُس کو پسپا ہونا پڑا۔ فقیر اِپی ہر اُس شخص کے دوست تھے جو انگریزوں کا دشمن تھا۔ اسی لئے وہ مسلم لیگ کے مخالف تھے۔

○ فرقہ پرستی کی تعریف بیان کیجیے؟

وہ فرقہ جو اپنے آپ کو دوسرے سارے فرقوں سے بہتر سمجھتا ہے یا وہ شخص جو صرف اپنے ہی مذہب کو ذریعۂ نجات سمجھتا ہے وہ فرقہ پرست ہے۔ ایک بار پنڈت نہرو نے فرقہ پرستی کی برائی کو یہ کہہ کر واضح کیا تھا، "فرقہ پرستی اتنی بری چیز ہے کہ فرقہ پرست بھی اپنے آپ کو فرقہ پرست کہنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔"

○ کشمیر کب سے اِس سرزمین پر واقع ہے اور کس کس نے اِس پر حکومت کی ؟

کسی تاریخی حوالے سے تو کشمیر کی 'عمر' نہیں بتائی جا سکتی ۔ البتہ دیومالائی روایت یہ کہ پہلے کشمیر ایک بہت بڑی جھیل کی صورت میں تھا اور جھیل کا نام ستی سار تھا ۔ اسی علاقے میں چند وحشی قبیلے رہتے تھے جن کا سردار جل دلو تھا ۔ وہ بڑا ظالم تھا ایک سادھو نے اپنی تپسیا کے زور پر شاری کا نام کی دیوی سے پرارتھنا کی کہ وہ اُس کے ظلم سے نجات دلائے ۔ شاری کا اپال کی صورت میں اپنی چونچ میں ایک سنگ ریزہ لے کر اُڑی اور اس کو جل دلو کے سر پر گرا دیا ۔ وہ مر گیا اور ستی سار جھیل کا پانی بھی سوکھ گیا اور پھر یہ علاقہ 'کیشپ مار' کے نام سے مشہور ہو گیا اور پھر کچھ عرصے بعد 'کیشپ مار' کو لوگ کشمیر کہنے لگے ۔ اندازہ یہ ہے کہ پانچ چھے ہزار برس سے کشمیر ایک جانا پہچانا علاقہ ہے ۔ 250 قبل مسیح میں اشوک نے کشمیر کو فتح کر لیا تھا اور اس نے بدھ مت اور بدھ تہذیب کو وہاں خوب پھیلایا مگر اشوک کے قبضے سے نکلتے ہی بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا ۔ 14ویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے کشمیر میں قدم رکھا ۔ مسلم حکمرانی کا ابتدائی دور قابلِ ذکر نہیں مگر 1423ء میں جب زین العابدین کشمیر کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے اپنے اچھے انتظام سے کشمیر اور کشمیریوں کی کایا پلٹ دی ۔ ڈیڑھ سو برس بعد مغلوں (شاہنشاہ اکبر) کی حکومت شروع ہوئی اُنھی کے عہد میں نشاط اور شالیمار وغیرہ باغات لگائے گئے ۔ 1753ء سے کشمیر پٹھانوں کے قبضے میں آ گیا ۔ مگر جلد ہی کشمیریوں نے مہاراجا رنجیت سنگھ کو دعوت دے کر پٹھانوں کو کشمیر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ۔ جب سکھوں اور انگریزوں کی جنگ ہوئی تو کشمیر سکھوں کے ہات سے نکل کر انگریزوں کی ملکیت بن گیا اور پھر 6 مارچ 1846ء کے معاہدۂ امرتسر کی رو سے انگریزوں نے علاقہ کشمیر کو 75 لاکھ روپے میں ڈوگرا خاندان کے راجا گلاب سنگھ کے ہات فروخت کر دیا ۔ ہندوستان کے آزاد ہونے تک (1947ء) یہی ڈوگرا خاندان کشمیر کا حکمران رہا ۔ مہاراجا ہری سنگھ کشمیر کے آخری حکمراں تھے —

وہ خطہ جسے وادیٔ کشمیر کہتے ہیں قدرتی مناظر اور صحت افزا آب و ہوا کی بنا پر دنیا کے چند منتخب شدہ پُرفضا مقامات میں سے ہے ۔

○ پرانے لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ عالموں کی اولاد اکثر جاہل ہی رہا کرتی ہے یہ کہاں تک درست ہے ؟

جب مال و دولت اور علم ورثے میں ملتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ورثہ پانے والوں نے اُن نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے خود کوئی محنت نہیں کی اور جو شے محنت کے بغیر مل جائے اس کی قدر بھی نہیں کی جاتی ۔ جب کہ علم زندہ رہنے کے لیے مستقل غور پر ریاض چاہتا ہے ۔ مفت خور وارث نہ مزید دولت پیدا کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں اور نہ تحصیلِ علم کی خاطر مشقت ۔ اسی سلسلے میں ابنِ خلدون بھی کہہ چکا ہے : 'ہر زمانے میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دولت اور علم پرانوں خاندانوں سے چھنتے اور نئے خاندانوں میں آتے رہتے ہیں !'

○ ففتھ کالم کا مطلب کیا ہوتا ہے ؟

اِس کے لفظی معانی ہیں فوج کا پیرا (fifth Colum) مگر اصطلاح میں ان عناصر کو کہتے ہیں جو اپنے وطن میں رہ کر بیرونی دشمن کے لیے دانستہ کسی بھی طرح مددگار ثابت ہوتے ہیں اُن کی مدد سیاسی ہو یا فوجی ، روپے پیسے کی امداد ہو یا روپے پیسے کے عوض ، دشمن کو اپنے ملک کے کم زور پہلوؤں سے باخبر کرنا ۔ ہسپانیہ میں (1936ء سے 1939ء تک) جب خانہ جنگی جاری تھی تو انہی دنوں جنرل فرانکو نے میڈرڈ پر چار فوجوں سے حملہ کیا ۔ حملے کے دوران میں میڈرڈ کے جن لوگوں نے فرانکو کی مدد کی فرانکو کے ساتھیوں نے اُن کو 'پانچواں دستہ' قرار دیا ، تب سے یہ اصطلاح جاری ہے ۔

○ آپ 'گگن' میں اکثر مولوی ملّاؤں کی دنیا پرستی ، نذرانوں ، تحفوں اور عطیوں کی وصولی اور اُن کی طمع کا ذکر کرتے ہیں آخر وجہ کیا ہے کہ وہ عالم ہونے اور دین و دنیا کو خوب سمجھنے کے باوجود اتنے لالچی ہوتے ہیں ؟

نفسیات کا یہ فارمولا یاد رکھیئے اور اپنے ارد گرد کی بزرگ شخصیتوں
کے ماضی کا جائزہ لے کر پھر اس فارمولے کو استعمال کر کے دیکھئے
یہ فارمولا سو فی صدی درست ثابت ہوگا ـــــ جن لوگوں کی
غریبی میں آنکھ کھلتی ہے اور غریبی ہی میں زندگی (خصوصی طور
پر بچپن) بسر ہوتی ہے وہ موقع پاتے ہی دولت کمانے یا دولت
قبول کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ اس کے برخلاف جن کا بچپن
خوش حالی میں گزرتا ہے، کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے، کھیلنے
کودنے اور گھومنے پھرنے سے تعلق رکھنے والی ساری خواہشات
اپنی عمر میں پوری ہو جاتی ہیں تو اپنی بقیہ زندگی میں وہ دولت
کے پیچھے نہیں دوڑتے اور اُن کی خواہشات اُن کے مقصد
(کوئی بڑا کام انجام دینے میں) کے پورا ہونے میں مانع نہیں
آتیں۔ چنانچہ مثالیں ملاحظہ ہوں ـــ حضرت مولانا اشرف
علی تھانوی کا بچپن اس حد تک عیش و آرام میں گزرا کہ انھوں نے
جب بھی کسی چیز کی فرمائش کی اُن کے شفیق باپ نے پوری کی۔ بیٹے
کو مٹھائی کھانے کا شوق تھا، باپ خوب خوب مٹھائی کھلاتے
ایک دن کہنے لگے: "بیٹا! مٹھائی سے تمہارا پیٹ تو بھر جاتا
ہے، نیت بھی بھر جانا چاہئے"۔ چنانچہ حلوائی کو بلوایا اور
سامنے سامان اور لوازمات کے ساتھ بٹھوا کر حکم
دیا جو اور جتنی مٹھائی بیٹا مانگے، بناتے جاؤ اور اسے کھلاتے
جاؤ۔ ظاہر ہے بیٹے کا پیٹ تو کئی بار بھر چکا تھا اس بار نیت
بھی بھر گئی اور کوئی حسرت باقی نہ رہی ـــ اس کا خوشگوار نتیجہ
یہ ہوا کہ مولانا کے اکثر معتقد مولانا کے جوتوں میں روپے بھر دیتے مگر
مولانا جب جوتے پہننے کے لیے کھڑے ہوتے تو جوتوں کو جھاڑ
کر روپیوں سے اس طرح خالی کر دیتے جیسے جوتوں پر سے گرد جھاڑ
ہو اور جوتے پہن کر خالی ہاتھ چل دیتے۔ معتقد کبھی اپنے نذرانے
کو دیکھتا اور کبھی دولت سے بے نیاز ہو کر جانے والے مولانا کو
ـــ دراصل نو سو ننانوے فی ہزار مولوی ملا غریب گھرانوں
سے آتے ہیں اسی لیے وہ دولت مند لوگوں کے دسترخوان کی
مکھیاں ثابت ہوتے ہیں ـــ نفسیات کا یہ نکتہ مولوی ملاؤں ہی
سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ سیاسی لیڈروں پر بھی صادق آتا ہے

جو لوگ خان عبدل خاں کے خاندانی حالات سے واقف ہیں
ان کو بادشاہ خان کے فقر صفت اور ایک اصول پرست انسان ہونے
پر تعجب نہیں ہوگا۔ بستی میں جب کوئی ایسا مہمان آتا جو کسی کا رشتہ
دار نہ ہوتا تو وہ بادشاہ خان کے مہمان نواز باپ ہی کا مہمان ہوتا۔
بادشاہ خان کی ماں روزانہ ایک زائد ہنڈیا پکایا کرتی تھیں تاکہ
محلے کے غریب گھروں میں سالن بھیجا جا سکے۔ بادشاہ خان
کے گھر میں قدرت کا دیا سب کچھ تھا اس لئے انھوں نے لیڈری
دولت کمانے کی ہوس میں نہیں بلکہ حُبِ وطن کے بے انتہا
بڑھے ہوئے جذبے سے مجبور ہو کر شروع کی تھی ـــ ہندستان
کی سیاسی تاریخ میں حسرت موہانی اپنے فقر و استغنا ہی کی وجہ
سے مشہور رہیں۔ دراصل ان کی ضرورتیں اُن کو تکلیف نہیں پہنچاتی
تھیں اس لیے کہ وہ اپنی ساری ضرورتیں اپنے لڑکپن ہی میں پوری کر
چکے تھے حسرت کے والد (سید اظہر حسن) جاگیردار تھے مگر حسرت نانی
کے گھر میں پلے، نانی کی حویلی اتنی بڑی تھی کہ بستی والے اُسے بارہ دری کہتے
تھے۔ نانی ناشتے میں اُن کو ہمیشہ دودھ جلیبی اور شکر کھلاتی تھیں
ماں بھی اُن پر جان چھڑکتی تھیں۔ حسرت جب کبھی کوئی کتاب پڑھنے میں
محو ہو جاتے تو کھانے پینے تک کا ہوش نہ رہتا تب اُن کی والدہ
نوالے بنا بنا کر اُن کے منہ میں دیتی رہتیں اور وہ کتاب پڑھتے رہتے۔
کھیل کود میں پتنگ بازی اور تیراکی سے اُن کو بہت شوق تھا اور وہ
یہ دونوں شوق خوب خوب پورا کرتے اور چوں کہ ان کا مزاج لڑکپن
سے عاشقانہ تھا اس لیے جوان ہوتے ہوتے ڈٹ کر دو چار عشق
بھی کر ڈالے۔ چنانچہ جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکنے کے بعد ایک نیک
مقصد (آزادیٔ وطن) کی خاطر فقر و استغنا سے کام لینا اُن
کے لیے مشکل نہ رہا ـــ سجاد ظہیر کے والد "سر" وزیر حسن تھے اور
والدہ "لیڈی" وزیر حسن کہی جاتی تھیں، کوٹھی میں بچپن گزرا اور
ولایت میں تعلیم پائی یعنی ابتدا ہی سے عزت بھی ملی اور دولت بھی
دیکھی۔ چنانچہ ایک اصول کی خاطر (کمیونسٹ بن کر) جب محل سے
جھونپڑی میں پہنچے تو جو چیزیں (زندگی کی راحتیں) خوب خوب
برت لینے کے بعد وہ چھوڑ آئے تھے انھیں دوبارہ حاصل کرنے کا سوال
ہی پیدا نہ ہوا ـــ دراصل ہر کسی کے لئے راحت و آرام کا ایک

کو ٹا مقرر ہوتا ہے۔ وہ آخیر دم تک اُسے حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ جو اپنی زندگی کے نصف اول میں اُس کوٹے کو حاصل کر لیتا ہے اُس کی زندگی کا نصف دوئم بڑے اطمینان سے گزر جاتا ہے وہ کسی نیک کام کے لیے اپنی غریبی کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر جاتا ہے مگر جو ابتدائی عمر میں آسودہ حال نہیں رہا وہ اپنی بقیہ زندگی میں دوسرے کاموں پر اپنی خواہشات کی تکمیل کو ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جو لیڈر، وزیر یا علمائے کرام خوش حال گھرانوں سے آئے ہیں وہ محبِ وطن، عوامی خدمت گار اور جنتا پرور ثابت ہوتے ہیں ورنہ جو جنم جنم کا بھوکا ہے وہ سیاسی لیڈر ہو یا دین کا ملاّ، دولت دیکھتے ہی اپنا ایمان کھو بیٹھتا ہے، ظاہر ہے جس گھر میں دھندلے چراغ جلتے ہوں وہاں اگر سورج نکل آئے تو اُس گھر کے ہر فرد کے لیے سورج کی پرستش کرنا لازمی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی جتنا ہم سمجھتے ہیں اتنا وہ انسان کے کردار کو متاثر نہیں کرتی بل کہ روٹی انسانی کردار کو بناتی ہے اور اس کے نہ ہونے سے کردار بگڑتا ہے۔

○ ہلال احمر کے بارے میں کچھ بتایئے؟

پہلی جنگ عظیم سے پہلے یعنی 1913ء میں یورپ کے کئی ملک ترکوں کے خلاف ہوگئے چنانچہ بلقانی ریاستوں نے ترکی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور اسی اثنا میں انگریزوں کے اشارے پر یونان نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ بے شمار ترک سپاہی مارے گئے مگر ترکی نے پھر بھی جنگ جاری رکھی۔ اس وقت مولانا محمد علی نے اپنے اخبار 'کامریڈ' میں اس جنگ کے موضوع پر اور ترکوں کی ہم دردی میں کئی مضامین شائع کئے۔ ترکی کے زخمی سپاہیوں کی تیمارداری کے لئے ایک میڈی کل مشن بھیجنے کی تجویز پیش کی اور اُس مشن کے خرچ کے لئے چندے کی بھی اپیل کی۔ آخر ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں یہ طبّی جماعت جو چودھری خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمان صدیقی، عبدالعزیز انصاری اور عبدالرحمان پشاوری پر مشتمل تھی ترکی روانہ ہوئی اور چند مہینے وہاں رہ کر اور اپنا کام پورا کر کے واپس آئی۔ یہ طبّی جماعت چوں کہ 'ریڈ کراس' کی جیسی تھی اس لیے سرخ چاند کو نشان بنا کر اس کا نام 'ہلالِ احمر عثمانی' رکھا گیا ویسے 'ہلالِ احمر' کو آل انڈیا ٹرکش

[illegible] کا ہندوستانی مسلمان پر

میڈی کل مشن' کا نام بھی دیا گیا ہے۔

○ صنعتی انقلاب سے کیا فائدہ ہوا اور کیا نقصان؟

یورپ کے صنعتی انقلاب سے تو یہ فائدہ ہوا کہ مشینوں کے ذریعے تھوڑے وقت میں زیادہ اور اچھا مال تیار ہونے لگا۔ مگر نقصان بھی کافی ہوا۔ وہ اس طرح کہ اس صنعتی انقلاب نے سماج میں تین طبقے پیدا کر دیے۔ سرمایہ داروں کا طبقہ، متوسط طبقہ اور مزدور طبقہ۔ سرمایہ دار طبقہ کارخانہ داروں اور زمین داروں پر مشتمل تھا۔ متوسط طبقے میں دُکان دار اور ملازمت پیشہ لوگ شامل تھے اور تیسرا طبقہ، کسانوں اور کاری گروں کا مجموعہ تھا۔ پہلے صنعت و حرفت اور تجارت کے معاملات حکومت طے کیا کرتی تھی لیکن صنعتی دور آنے پر سرمایہ داروں نے دولت کے زور پر تجارت کی پالیسی کو اپنے ہات میں لے لیا۔ ایڈم اسمتھ نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت تجارتی معاملات میں دخل نہ دے۔ چنانچہ کارخانہ داروں اور تاجروں کا دولت مند طبقہ انگلینڈ کی پارلیامنٹ پر چھا گیا اور سرمایہ داروں نے مزدور کی حالت کو قابلِ رحم بنا دیا۔ صنعتی دور میں جو ملک (افریقا اور ایشیا کے ممالک) پس ماندہ تھے مغربی ممالک اپنے کارخانوں کے لئے اُن سے کچا مال لینے لگے اور پھر اُنہی کے بازاروں میں اپنا بنایا ہوا مال بیچنے لگے اور ایشیا کے بازاروں پر سامراجی طاقتوں نے قبضہ کر لیا۔ مگر جب مزدور کو احساس ہوا کہ سیٹھ ساہوکار اُنہی کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی سے اونچے اونچے مکانوں میں رہتے ہیں اور دن رات عیش کرتے ہیں اور بھوکے ننگے مزدوروں کے جائز حق کو بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تو مزدوروں نے اعلان کیا کہ دولت مزدور پیدا کرتے ہیں ملوں کے مالک نہیں چنانچہ اس اعلان کے نتیجے میں انھوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کیا۔ اور اس طرح باقاعدہ مزدوروں کی ایک تحریک (Labour Movement) شروع ہوگئی۔ مزدوروں کے جاگنے پر سرمایہ دار طبقہ چونک پڑا۔ اُس نے مزدوروں کی تحریک کو دبانے کے لیے سخت قوانین بنائے۔ قانونی دباؤ کی بنا پر مزدوروں کی تحریک کا زور کم تو ہوا مگر وہ فنا نہیں

ہوئی۔ آخر 1825ء میں سرکاری پابندیاں جب قدرے کم ہوئی تو مزدوروں کی انجمنیں بننے لگیں۔ مزدوروں کی اصلاح کے سلسلے میں رابرٹ اوون نام کے ایک انگریز نے بڑا کام کیا۔ اسی شخص کی زبان پر سب سے پہلے لفظ "سوشلزم" آیا۔ دوسرے مطالبات کے ساتھ مزدوروں کے دو مطالبات بہت ہی انقلابی طرز کے تھے کہ انھیں بونس دیا جائے اور کارخانوں کے انتظامی معاملات میں انھیں بھی شریک کیا جائے۔ انگلینڈ کے مزدور طبقے میں جو انقلاب آ رہا تھا اُس نے یورپ کے صنعتی ممالک کو بھی متاثر کیا اور اسی اثنا میں اقتصادیات کے دلدادہ کارل مارکس نے اپنا اشتراکی منشور (Communist Manifesto) تیار کر کے شائع کیا جس سے مزدوروں کی تحریک کو کافی تقویت ملی۔

○ "یلدرم" کے کیا معنی ہیں؟ سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں کچھ بتایئے؟

"یلدرم" ترکی زبان کا لفظ ہے اور برق کو کہتے ہیں۔ "یلدرم" سجاد حیدر کا تخلص تھا۔ سجاد حیدر یلدرم قرۃ العین حیدر کے والد تھے اور ضلع بجنور (اترپردیش) کے قصبہ نہٹور کے رہنے والے تھے۔ سرسید احمد خاں قصبہ نہٹور کو بڑا مردم خیز خطہ سمجھتے تھے اس لیے وہ نہٹور کے لوگوں کو "عقل مندان نہٹور" کہتے تھے۔ سجاد حیدر قسطنطنیہ میں پولیٹیکل ایجنٹ تھے۔ وہیں انھوں نے ترکی زبان سیکھی اور پھر بہت سے ترکی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ اردو زبان کے شاعر بھی تھے۔ جزائر نکوبار و انڈمان (کالے پانی) میں ریونیو کمشنر بھی رہے۔ ہندستان آنے پر علی گڑھ یونیورسٹی کے رجسٹرار بنے اور پھر یوپی سول سروس میں منتقل ہو گئے۔ یلدرم کا نظریہ انتہائی طور پر سائنٹفک تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسائل ہوں یا ہندی اردو کا تنازعہ وہ وقت قریب ہے کہ جب مذہب کے قطع نظر جغرافی اور علاقائی بنیاد پران مسائل کو حل کیا جائے گا۔ رسم خط کے سلسلے میں ان کا خیال تھا کہ جذباتی بن کر معاملا طے کرنا نقصان دہ ہوگا۔ ہندستان کے صرف شمال مغربی حصّے میں عربی رسم خط زندہ رہ سکتا ہے بقیہ سارے ہندستان

گگن ناتھ ... سنائی ... [illegible]

میں لامحالہ دیوناگری اسکرپٹ رائج ہو جائے گا۔ جن دنوں اکبر الہ آبادی جیسے عاقبت نااندیش "حرف پڑھا کر ٹائپ کا" کہہ کہہ کر ٹائپ کی مٹی پلید کر رہے تھے یلدرم اردو ٹائپ کو مقبول بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جب تک اردو والے "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے اپنا رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت مسدود ہی رہے گی۔ وہ ساری عمر تعلیم نسواں اور اردو ٹائپ کے حق میں پروپیگنڈا کرتے رہے۔

○ کیا انسان اپنے احساسات وجذبات پر قابو پا سکتا ہے؟

اگرچہ یہ بات مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تیمور کی پیٹھ میں ایک برس تک سخت خارش رہی مگر اس نے ایک بار بھی اپنی پیٹھ نہیں کھجلائی، دراصل اس قسم کے ضبط کا تعلق قوتِ ارادی سے ہے۔

○ کیا یہ درست ہے کہ اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے؟

نہیں نہیں! جب انسان اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اکثر لوگ اُس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آتے ہیں، کبھی کبھی کامیاب انسان کو اپنا دستِ نگر بنا کر وہ اپنے جذبۂ حسد کو تسکین پہنچاتے ہیں اور دنیا کے سامنے اپنے اس عمل کو شرافت قرار دیتے ہیں اور جب کوئی انسان نیچے سے اوپر چڑھتا ہے تو یہی لوگ اس کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹنے لگتے ہیں۔

○ کمیون اور کمیون ازم کی تعریف بیان کیجیے اور کمیونزم اور سوشلزم کا فرق بتایئے؟

دراصل کمیون ازم خود کمیون سے مشتق ہے اور کمیون کمیونٹی کے مترادف ہے۔ یعنی اس کے تحت وہ تمام چیزیں آ جاتی ہیں جو کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کمیون ازم یا اشتراکیت اُس اقتصادی نظام کو کہتے ہیں جس میں محنت، پیداوار، ملکیت اور انتظام مشترک ہو۔ دراصل اقتصادی نظام کا یہ نظریہ سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا۔ 1847ء میں جب کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع کیا تو کمیون ازم کے

معانی سوشل ازم ہی سمجھے گئے مگر 1918ء میں لینن اور اُس کے ساتھی روس کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی سے الگ ہو گئے۔
اس کے بعد اُن کی تحریک کو کمیونسٹ تحریک کہا گیا۔ اگرچہ سوشل ازم اور کمیون ازم بنیادی طور پر ایک ہی تحریک کے دو نام ہیں پھر بھی دونوں میں یہ فرق ہے کہ کمیون ازم ہر شخص سے اُس کی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق لے کر ہر شخص کو اُس کی ضرورت کے مطابق دینا چاہتا ہے، اور سوشل ازم ہر شخص سے اس کی حیثیت اور صلاحیت کے مطابق لے کر ہر شخص کو اُس کے کام کے اعتبار سے دینا چاہتا ہے
دراصل تحریک کی صورت میں کمیون ازم سرمایہ داری کی ضد ہے اور ایسے معاشرے کے قیام کی ترغیب دیتا ہے کہ جس میں طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے اور ہر شخص رضاکارانہ طور پر مشترکہ، پُرامن اور پُرسکون زندگی بسر کر سکے۔
تاریخ کے ہر دور میں معاشی پیداوار اور تبادلے کا جو طریقہ رائج رہا ہے اور اس سے جو سماجی ڈھانچا بنا ہے وہی اس دور کی سیاسی اور ذہنی تاریخ کی ترتیب کی بنیاد بھی رہا ہے۔ اور اسی بنیاد سے اُس دور کی تاریخ کی تشریح بھی کی جا سکتی ہے۔ دراصل آج تک جتنے سماجوں نے جنم لیا ہے اُن سب کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے یعنی آقا اور غلام، شرفا اور رذیل، جاگیردار اور کاشت کار، کارخانےدار اور کاری گر غرضے کہ ظالم و مظلوم کبھی درپردہ یا کبھی کھلے طور پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے ہیں اور آپس کی اس جنگ کا انجام یہی ہوا ہے کہ یا تو نیا سماج تشکیل پا گیا یا پھر لڑنے والے طبقے تباہ ہو گئے۔ آج کا سرمایہ دارانہ معاشرہ چوں کہ جاگیردارانہ معاشرے کے کھنڈروں پر کھڑا ہے اس لئے وہ طبقاتی اختلافات کو دور نہیں کر پایا، بس شکلیں بدل گئی ہیں اور اب ہمارا سماج دو بڑی مخالف صفوں، دو بڑے طبقوں یعنی سرمایہ دار اور مزدور طبقوں میں بٹ کر رہ گیا ہے۔
کمیونسٹ مینی فیسٹو کی رو سے کمیون ازم کا مقصد ذاتی ملکیت کو ختم کرنا نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ ملکیت کو مٹانا اُس کا نظریہ ہے۔ سماج کی پیداوار کو اپنے تصرف میں لانے کے حق سے کمیون ازم کسی انسان کو محروم نہیں کرتا البتہ وہ انسان کو اس تصرف کے ذریعے دوسروں کی محنت پر دسترس حاصل کرنے کا اختیار نہیں دیتا۔ مختصر یہ کہ آج کے سرمایہ دارانہ سماج میں حال پر ماضی کی حکومت ہے جب کہ کمیونسٹ سماج میں ماضی پر حال کی حکومت ہوتی ہے۔ جسے ہم سیاسی اقتدار کہتے ہیں وہ دراصل ایک طبقے پر ظلم کرنے کے لیے دوسرے طبقے کے منظم اقتدار کا نام ہے۔ کمیونسٹ سماج میں سارے طبقاتی امتیازات مٹ جاتے ہیں اور ساری پیداوار ایک قوم کے ہاتوں میں جمع ہو جاتی ہے اور نتیجے میں اقتدارِ عامہ کی سیاسی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

○ ہزلیہ کسے کہتے ہیں ؟

مرثیہ کے وزن پر ہزلیہ۔ مگر نظم کی اس فحش صنف کو کہتے ہیں جو تبرے کی صورت میں حضرت عمر، ابوبکر اور عثمان کی شان میں کہی جاتی ہے۔ یہ صنف مشیر لکھنوی کی ایجاد ہے۔ اسی سے ملتا جلتا 'ہرزہ' ہے جس کے معانی ہیں 'نامعقول'، 'لغو' یا 'بے ہودہ'!

○ مہندی مسلمانی سنگار ہے یا ہندوستانی ؟

مسلمان ہی مہندی کو اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے جوان عورتیں اپنے ہات پاؤں سُرخ رنگ سے ضرور رنگتی تھیں مگر وہ رنگ لاکھ کا ایک مرکب ہوتا تھا جس کو 'مہاور' کہتے تھے۔ پوربی ہندوستان میں اسے 'جاوک' کہتے تھے۔

○ شخصیت صورت سے پہچانی جاتی ہے یا سیرت سے ؟

شخصیت نہ صورت ہے نہ سیرت، نہ حرکات و سکنات نہ شکل و شباہت اور نہ محض کردار ہی ـــــ دراصل شخصیت کئی باتوں سے مل کر بنتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں جبلّت کو بھی دخل حاصل ہے اور ماحول کو بھی، واقعات، حالات اور اُن کے اثرات بھی شخصیت کو بنانے یا بگاڑنے میں بڑا کام انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شخصیت انسان کا باطنی مزاج ہے جو مختلف قسم کی اخلاقی کیفیتوں سے بنتا ہے۔ انگریزی زبان کے ماہر نفسیات اور نقاد اسپنگارن نے اس سلسلے میں کہا تھا: 'ہم اپنے دوست سے محبت کرتے ہیں، اس کی اچھی سیرت، حق

کوئی، دیانت داری، ذہانت، اچھی صورت، خوش مزاجی، تن درستی اور اُس کے اچھے ادبی ذوق کے گرویدہ ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو دراصل ہم اس کی شخصیت سے محبت کرتے ہیں جو ان جملہ خوبیوں سے مل کر بنی ہے اور پھر بھی وہ ان صفات سے آزاد ہے۔ مختصر یہ کہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی جبلت کا پورا پورا اثر لیے ہوتا ہے۔ بڑا ہو کر جتنا اُسے شعور حاصل ہوتا جاتا ہے جبلّی اثرات اتنے ہی کم ہوتے جاتے ہیں اور ماحول کے اثرات اپنا رنگ جماتے جاتے ہیں اور اُنہی مختلف رنگوں کے امتزاج سے شخصیت بنتی ہے۔

○ ایک شاعر تھے مرزا چپاتی — چپاتی اُن کا تخلص تھا یا لقب؟

جی وہ دلّی کے ایک بگڑے ہوئے رئیس خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نام اُن کا فخرالدین تھا اور تخلص فخر۔ بڑے ارمانوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی ماں نے منت مانی تھی کہ بیٹا ہوگا تو اُسی کے ہاتھ سے قطب صاحب کی درگاہ پر حلوہ اور چپاتیاں بٹواؤں گی۔ چنانچہ وہ پیدا ہوئے اور جب اُن کو بارہواں برس لگا تو اُن کے ہاتھ سے چپاتیاں بٹوائی گئیں، لینے والوں نے "مرزا چپاتی"، "مرزا چپاتی" کہہ کر اُن سے چپاتیاں مانگیں۔ اُسی دن سے وہ مرزا چپاتی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ وہ بلا کے تو تلے تھے۔ ت کو ٹ بولتے تھے۔ اُن کا ایک شعر اُنہی کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

بنالی ثوٹ میں شدّاد نے پر یہ نہیں سمجھا :
نہ میں جنّٹ کے ٹابل ہوں نہ جنّٹ میرے ٹابل ہے

آخری عمر میں مرزا چپاتی کو غریبی نے آگھیرا تھا، مانجھا اور پتنگوں کی ایک چھوٹی سی دکان کرلی تھی بس اسی ذریعے سے پیٹ پالتے تھے۔

○ اسلامی تہذیب ایرانی تہذیب سے کس حد تک متاثر ہوئی؟

اِس سلسلے کی پہلی بات تو یہ ہے (جو آپ گرہ میں باندھ لیں) کہ مذہب انسان کی زندگی میں کوئی اہم رول ادا نہیں کرتا۔ مذہب محض ایک نعرہ ہے جو تھوڑے سے چالاک لوگ لگاتے [illegible]

ہیں اور بہت سے معصوم انسانوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ دراصل کسی خطے کی آب و ہوا وہاں کے رہنے والوں کا مزاج بناتی ہے، وہ مخصوص مزاج رسم و رواج کو جنم دیتا ہے اور پھر اس خطے کے رہنے والوں کے معاشی حالات اُن رسموں اور رواجوں کو تہذیب و تمدن کا رنگ دے دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دولت، قدریں بدل دیتی ہے اور وقت اور فاصلہ حقائق کو بھی بدل دیتا ہے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ ہر تحریک یا ہر مذہب کی ابتدا میں بے انتہا شدّت ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نرمی اور لچک آنے لگتی ہے۔ اب اپنی بات کا جواب سنیے:-

ابتدا میں اسلامی تہذیب و تمدن قطعی طور پر اسلامی تھے جب اُمویوں نے مدینے سے نکل کر دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا یعنی اپنا مقام بدلا تو نوّے سالہ اموی دور میں شامی تہذیب نے عربی تہذیب کو خاصا متاثر کیا۔ اُمیّہ خاندان کے بعد عباسیہ خاندان نے بغداد کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اِس خاندان کے مامون اور ہارون جیسے مشہور خلیفاؤں کے عہد میں بہت سی فتوحات ہوئیں اور بہت سے ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے، نتیجے میں دولت کی بہتات ہو گئی۔ چنانچہ مسلمان خلیفاؤں کی سادگی شان و شوکت میں اور روحانیت مادّیت میں بدل گئی۔ عرب کے ریگ زار میں جھلستی ہوئی زندگی گزارنے والوں نے جب اپنے مفتوح ملک ایران کا موسم بہار دیکھا، باغ دیکھا، ساقی دیکھا اور جام و مینا دیکھا اور ایرانی قصر کا عیش و آرام دیکھا تو اسلامی قدروں کو بھلاتے ہوئے ایران کی ہر شے اور ہر اچھی بری قدر کو اپنا لیا — ایرانی تفریحات، آداب مجلس، ملبوسات، وضع قطع، سیر و شکار، جلوس و جشن، رقص و سرود، شعر و شاعری، شراب و کباب، فنِ تعمیر، فنونِ لطیفہ غرضے کہ زندگی سے متعلق سارے ایرانی لوازمات عرب کے مسلمانوں نے قبول کر لیے حد یہ کہ 'اپنے اللہ اور رسول کی زبان' عربی کو ترک کر کے وہ ایران کی زبان فارسی بولنے اور لکھنے لگے دراصل اسلام کے ابتدائی (صرف) 29 برس قبائلی نظام کے تحت گزرے اور پھر فوراً ہی اسلام جاگیرداری عہد

میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ جب مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوا تو اس کے ساتھ جاگیرداری شاہنشاہیت کا تصور تھا جس میں محمود و ایاز کا نہیں بل کہ حاکم و محکوم کا فرق نمایاں تھا حسب نسب کا بڑا پن بھی اس کے ساتھ تھا اور بہر غیر اسلامی قدر کو وہ اپنائے ہوئے تھا، اسلام کا بس نام ہی اس کے ساتھ تھا یعنی وہ برائے نام ہی اسلامی تھا۔

○ یہ کس کا شعر ہے ؎

اِک زرا آپ کو زحمت ہوگی
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

یہ سراج لکھنوی کا شعر ہے۔

○ نفسیات کی رو سے انا کی وضاحت کیجئے کیا یہ بُری چیز ہے؟

انگریزی میں انا کو ego کہتے ہیں اُردو میں اِس کا ترجمہ 'الغو' بھی کرتے ہیں نفسیات میں انانیت کی بہت سی قسمیں بتائی گئی ہیں جن میں ایک خود پرستی بھی ہے جو دراصل انانیت کی ایک بڑھی ہوئی صورت ہے۔ انانیت ایک برائی ضرور ہے مگر فن کاروں کے لیے یہ ایک ضروری برائی بنی رہی ہے۔ ہمارے ادب کی بعض شخصیتیں تو خود پرستی کی حد تک انائی (Egoist) تھیں۔ جیسے مرزا غالب اور مولانا ابوال کلام آزاد۔

○ 'مدینہ' اخبار کی پیشانی پر جو یہ شعر لکھا ہوتا ہے اُس کے معنی کیا ہیں؟

معجزہ شق اُل قمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

یہ شعر عزیز لکھنوی کا ہے اور اردو شاعری کی کاری گری کا ایک اعلا نمونہ ہے۔ وہ کاری گری یہ ہے کہ 'مدینہ' کی میم ایک طرف اور ہ دوسری طرف اور پھر درمیان میں صرف 'دین' رہ گیا یعنی م + ہ = مہ۔ جب مہ (یعنی قمر) شق (دو ٹکڑے) ہو گئے، جو پیغمبر دین کے ایک معجزہ کی جانب اشارہ ہے) ہو گیا تو ظاہر ہے بیچ میں 'دین' ہی رہ گیا۔

○ کیا تخلص کا شاعر یا ادیب کی شخصیت، کردار یا اس کی عام زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے؟

دراصل تخلص دلی صداقت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ادیب یا شاعر اپنا ادبی نام یا تخلص رکھتے وقت ارادی یا غیر ارادی طور پر اپنی فطری کیفیت یا اپنی (ناآسودہ) خواہش کو نمایاں کرتا ہے یعنی بعض شاعر اپنے تخلص کے توسط سے وہ بتاتے ہیں جو وہ ہیں جیسے شوکت علی خاں فانی۔ اُن کی ذات میں شان و شوکت بلکل نہیں تھی بل کہ وہ نیستی، ہلاکت اور موت کی زندہ تصویر تھے یا میر تقی میر، زندگی بھر پچھڑے ہوئے رہے مگر اکڑ یہ بتاتی تھی کہ وہ دوسروں سے نمایاں ہونا یا آگے نکلنا چاہتے تھے اس ناآسودہ خواہش کا نتیجہ تخلص میر (معنی سردار، سالار، چودھری مقدم، ہادی، رہنما، پیشوا، سید یعنی اعلا ذات) تھا۔

○ 'ادھیڑ' اور 'معمر' انسان کی عمر کا کون سا حصّہ ہوتا ہے؟

چند برس پہلے جب عالمی ادارۂ صحت کے تحت ماسکو میں ایک سیمی نار منعقد ہوا تھا۔ اس میں جوانی کے بعد کی عمر کو چار حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا:۔

1۔ ادھیڑ عمر: 45 برس سے 59 برس تک
2۔ معمر : 60 " 74 " "
3۔ بڑھاپا : 75 " 90 " "
4۔ بہت بڑھاپا: 90 برس سے بعد کی عمر

اسی سیمینار کی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو لوگ اپنے آپ کو 'قبل از وقت بڑھاپے' سے بچائے رکھنا چاہتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ وہ چلتے پھرتے رہیں اور کام کرتے رہیں، اچھی خوراک کھائیں اور تمباکو اور شراب نوشی سے دور رہیں۔

○ مغل حکمراں کسی کو عہدہ دار بناتے وقت پنج ہزاری یا ہفت ہزاری کا منصب دیتے تھے مگر کیا وہ عالموں کو بھی کوئی خطاب دیتے تھے؟

مغلیہ دورِ حکومت میں عالموں کے لئے چار بڑے خطاب تھے:۔

(1) ملک اُل علماء: یہ خطاب سب سے بڑے عالم کے لیے تھا۔

دگر کا مستانی مسلمان میں

(2) نقیب آل اولیا: صاحب طریقت صوفی کو یہ خطاب دیا جاتا تھا۔

(3) ملک آل اطبا: شاہی طبیب کو اس خطاب سے نوازا جاتا تھا۔

(4) رئیس آل مدرس: ایک ایسا عالم استاد کہ جس نے بڑے بڑوں کو ملک بھر میں مان لیا گیا ہو اور جس کے زیادہ سے زیادہ شاگرد ہوں یہ خطاب پاتا تھا۔

○ عالمی سطح پر اسلامی معاشرہ کے زوال کی کیا وجہ ہے؟

جب اسلام آٹھویں صدی میں پہنچا تو اسلامی معاشرے میں عقلیت پسندی اور ذہن کی آزادی (لبرل ازم) کا رجحان پیدا ہوا۔ مسلمان یونانی علوم کا مطالعہ بڑے ذوق شوق سے کرنے لگے۔ ان کی تعلیم "روایتی اسلامی" نہ رہ گئی بلکہ اس میں وسعت پیدا ہوگئی اور اس میں آفاقیت آگئی چنانچہ مسلمانوں نے ذہنی، سماجی، تہذیبی و تمدنی اور اقتصادی طور پر خوب خوب ترقی کی۔ اسی لئے عباسی دور کو اسلامی تاریخ کا سنہری عہد کہتے ہیں۔ مگر دسویں صدی سے اسلامی معاشرے پر زوال آنے لگا۔ زوال کی وجہ یہ ہوئی کہ امام غزالی نے جہاں تصوف اور اسلامی شریعت میں ایک امتزاج پیدا کرکے اچھا کام کیا وہاں اسلامی شریعت کو محض چند بندھے ٹکے اصولوں کا مرکب بنا کر بھول بھی کی۔ انھوں نے یونانی علوم پر اسلامی علوم کو ترجیح دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فکر محدود ہوکر رہ گئی، سوچنے، اڑنے بدلنے، سوال اٹھائے جانے یا انقلاب پیدا ہونے کے سارے امکانات ختم ہوگئے اور مذہبیت جامد و ساکت بن کر رہ گئی۔ تازہ علم کے در بند ہوگئے تحقیق کا جذبہ فنا ہوگیا اور مسلمانوں میں کٹرپن پیدا ہوگیا۔ سائنس اور دوسرے علوم کا زبردست ارتقا اور پھیلاؤ بند ہوا بلکہ تازہ علمی ہوا کو اپنے دریچے بند کرکے آنے ہی سے روک دیا گیا۔ نتیجے میں ذہنی ترقی رک گئی اور اس رکاوٹ نے لوگوں کے مادی اور معاشی [illegible] حکومت [illegible] لیا۔ اس سلسلے میں البیرونی کا کہنا تھا کہ بدقسمتی علما کی مخالفت علمی جرأت [illegible]

[illegible]

کی بنا پر تھی بلکہ کچھ پس پردہ مقاصد بھی تھے۔ وہ اُن لوگوں کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے جو غیر ملکی علوم کا مطالعہ کرتے تھے یعنی پیشے کی رقابت ۔۔ دراصل ہر زمانے کے مولوی ملا اپنے ذاتی اور وقتی فائدے کی خاطر آئندہ کی کئی نسلوں کو نقصان پہنچانے سے کبھی نہیں چوکے۔

○ اپنی احساس کم تری کو چھپانے کا طریقہ کیا ہے؟

سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہے کہ اپنی کسی ایک خوبی کو ملحوظ رکھئے اور خوش ہوکر قدرت کا شکر ادا کیجیے اور اپنی خامی کو دور کرنے یا نظرانداز کرنے کی کوشش کیجیے ۔۔ ورنہ ایک طریقہ یہ بھی ہے جو برنارڈ شا نے اختیار کیا تھا۔ برنارڈ شا کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے وہ چونکہ خود دوسروں پر تنقید کرتا تھا اس لئے وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے چہرے پر ناقدانہ نظر ڈالے اس لئے اس نے داڑھی رکھ لی تھی یعنی اس نے اپنی کم تری کے اس احساس کو داڑھی کے پردے میں چھپانے کی بھول کی تھی۔

○ حسد کیوں پیدا ہوتا ہے؟

زوال یافتہ یا پس ماندہ فرد یا قوم کی یہی پہچان ہے کہ اس میں حسد اور جلن کا مادہ بے حد بڑھ جاتا ہے۔ وہ کسی کو اچھا کھاتے ہوئے اچھا پہنتے ہوئے یا خوش حال اور اونچے مرتبے پر نہیں دیکھ سکتے کوئی نیک کام انجام دینے کے صلے میں اگر آپ کو نیک نامی حاصل ہوتی ہے چاہے وہ نیک کام دوسروں ہی کے فائدے کا کیوں نہ ہو وہ تب بھی آپ کی نیک نامی سے جلیں گے جو شخص آپ سے حسد کرتا ہے تو وہ اپنے حسد سے یہ واضح کرتا ہے کہ وہ آپ سے کسی نہ کسی صورت میں کم ہے۔

○ مسلم لیگی ذہنیت کی پہچان کیا ہے؟

سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں میں سب سے زیادہ لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کرکے بحث کرنے کا شوق کمیونسٹوں کو ہوتا ہے اور کوئی بات جانے بغیر بات پر اڑنا مسلم لیگیوں کو آتا ہے۔ دوسری جماعتوں کے لوگوں کی یہ کوشش زیادہ نہیں ہوتی کہ سارا جہان انہی کا ہم نوا بن جائے مگر مسلم لیگی بہر صورت۔ (بزور قوت)

بھی) یہ چاہتا ہے کہ سب اُسی جیسے ہو جائیں۔ دراصل مسلم لیگی کی یہ ذہنیت وہ 'مسلمان ذہنیت' ہوتی ہے جس کے متعلق شوکت تھانوی نے ایک بار کہا تھا: 'اگر اللہ میاں کبھی زمین پر اتر آئیں تو مسلمان اُن سے بھی بعد سلام کے یہی کہے گا، 'اللہ میاں! مسلمان ہو جاؤ'!' — غرضے کہ مسلم لیگی ذہنیت بہت ہی Typical (امتیازی) ہوتی ہے۔

○ جس قوم کا اخلاق اچھا ہوتا ہے وہ ترقی کرتی ہے اور بُرے اخلاق کی قوم کو زوال سے واسطہ پڑتا ہے کیا یہ بات درست ہے؟

ضروری نہیں۔ جن ترکوں نے ہندستان پر حملہ کیا تھا اور ہندستان کو فتح کیا تھا وہ اُن راج پوتوں کی بہ نسبت زیادہ با اخلاق نہیں تھے جو مفتوح بنے۔ دراصل ترکوں کی فتح یابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ باہمت تھے اور فنِ جنگ میں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ نسل کی فوقیت اور مہذب ہونے کے احساس نے اُن کو باہمت بنایا تھا اور ظاہر ہے کہ با اخلاق اور نیک بندوں میں یہ احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح جنگ کا ترقی یافتہ فن بھی انھوں نے اپنے مذہب یا اخلاق سے نہیں سیکھا تھا بل کہ اُن کی خانہ بدوش زندگی اُن کو جنگ کا ہر نیا طریقہ سکھاتی رہتی تھی۔ آج کے دنوں میں یہ سامنے کی بات ہے کہ امریکا انگلستان سے زیادہ طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک ہے جب کہ انگریز امریکیوں سے زیادہ با اخلاق ہوتے ہیں۔

○ بھیک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جی ہاں خیرات، زکات اور دان کو ہر مذہب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام میں تو زکات کو پانچ ارکان میں ایک رکن قرار دیا گیا ہے اسی طرح ہندو مت کی رو سے انسان کی زندگی میں دان کو بڑی اہمیت اور دانی کو بڑا مرتبہ ملا ہوا ہے اور عیسائیت میں بھی چیریٹی کو معاشرے کے سُدھار کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ مذہب اور مذہبی معاشرے اقتصادی مسائل کو مکمل طور پر حل نہیں کر پائے اسی لیے ہر مذہبی معاشرے میں بھیک، دان، چیریٹی، خیرات یا زکات کی گنجائش موجود ہے مگر کمیونسٹ معاشرے میں بھیک یا بھکاری جیسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی کیوں کہ اس میں معاشی مسئلے کا مکمل حل موجود ہے۔

○ سگریٹ پینے کی عادت کس طرح چھوڑی جائے؟

تمباکو نوشی ترک کر دینا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ صرف قوت ارادی کے سادے عمل سے آپ سگریٹ نوشی ترک کر سکتے ہیں۔ تمباکو نوشی چھوڑنے کے لیے سب سے زیادہ نیک اور شبھ دن بیماری یا بیماری کے فوراً بعد کے دن ہوتے ہیں۔ بیماری سے مراد قدرتاً نزلے کوئی بڑی یا طویل بیماری نہیں، چند دن کا بخار بھی ہو سکتا ہے۔ بہر نوع! بیماری کے دنوں میں یا بیماری کے فوراً بعد کے دو تین دن میں تمباکو نوشی کی خواہش بھی کم ہوتی ہے اور پینے پر بد مزگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے انہی دنوں قوت ارادی سے کام لے کر سگریٹ نوشی ترک کر دیجیے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ رفتہ رفتہ (کم کرتے کرتے) تمباکو نوشی ترک نہیں ہوتی، بل کہ ایک بار میں ہمیشہ کے لیے آپ کو سگریٹ چھوڑ دینا ہوگی۔ میں نے اپنی بائیس سالہ پرانی تمباکو نوشی (پائپ نوشی) ایک ہی لمحے میں ترک کر دی — تمباکو نوشی جہاں صحت کے لیے مضر ہے وہاں خون پسینے کی حلال کمائی کا بڑا مضحکہ خیز مصرف ہے

○ پہلا اُردو اخبار کون سا تھا؟

'جامِ جہاں نما' (ہندستانی) اردو کا پہلا (ہفت روزہ) اخبار جو کلکتے سے 28 ویں مارچ 1822ء کو شائع ہوا۔ فورٹ ولیم کے خزانے میں کام کرنے والے ہری ہر دت نے یہ اخبار جاری کیا تھا اور لالا سدا سوک نے اس اخبار کو ایڈیٹ کیا تھا۔

○ 18 ویں صدی میں ہندستان کے اخلاقی اور معاشرتی زوال کے اسباب کیا تھے؟

کوئی بھی سبب اخلاقی یا مذہبی نہیں تھا۔ اُن دنوں ایک مخصوص طبقہ حکومت کر رہا تھا یعنی محنت دوسرے کرتے اور محنت کے حاصل کو وہ حکم راں طبقہ سیاسی، انتظامی اور فوجی ضرورتیں بتا کر مختلف ٹیکسوں کے بہانے یا زبردستی اپنے قبضے میں کر لیتا۔

تھا کسان غلہ پیدا کرتا مگر غلہ یا غلے کی قیمت شاہی افسران، جاگیردار، زمین دار اور ان کے چیلے چانٹے وصول کر لیتے اور کسان کے پاس بس اتنا چھوڑتے کہ وہ بمشکل تمام کاشت کاری کے تسلسل کو برقرار رکھ پاتا۔ صنعت پیشہ لوگوں کو بھی خام مال حاصل کرنے سے چیزیں بنا کر فروخت کرنے تک بہت سے ٹیکس دینا پڑتے۔ بڑے لوگ اچھے کاری گروں کو اکثر اپنے قبضے میں رکھتے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے مال تیار کرواتے اور اپنی مرضی ہی سے وہ مال فروخت کرتے۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود ہوتے تھے اور اس کی سیاست کی تلوار ننگی ہوتی تھی معیشت کے اس نظام کو ہندوستان میں 'جاگیری' کہا گیا اور یورپ میں 'فیوڈل' ـــ چنانچہ جب رعایا قطعی طور پر بادشاہ اور امراء کی دست نگر ہو گئی اور بادشاہ اور امراء، مہاجنوں اور تاجروں سے مل کر مجبور رعایا کو ایکس پلائٹ (Exploit) کرنے لگے تو قومی اخلاق پر بھی زوال آیا تو معیشت پر بھی۔

○ انگریزی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کس نے کیا؟

مولانا محمد علی ہندوستان کے وہ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

○ مغل سلطنت کے زوال کا سبب؟

اورنگ زیب کی ریاکاری ـــ اورنگ زیب میں ملک گیری (اس کا 'عالمگیر' لقب اختیار کرنا بھی اس کی ملک گیری کی انتہائی بڑھی ہوئی خواہش کو واضح کرتا ہے) کی ہوس بہت تھی جب کہ وہ سیاست سے واقف نہیں تھا اور اپنی اس ناواقفیت پر اس نے اسلامی شریعت کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ حالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا، نتیجے میں وہ ہمیشہ سیاسی گتھیاں سلجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا۔ اور یہ سیاسی الجھاؤ اس کو ہمیشہ جنگ جاری رکھنے پر مجبور کرتا تھا چنانچہ اس کے امراء اس سے عاجز آ چکے تھے اور اس کا خزانہ خالی ہو چکا تھا اور پھر اورنگ زیب نے ایسا کوئی وارث پیدا نہیں کیا جو اس کے بعد اس ملک کو سنبھال سکتا جس میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔

○ کیا آپ یہ اعتراف کریں گے کہ عام مسلمان پاکستان نواز ہے؟

جی ہاں ہر خاص و عام ہیں کہ ۹۹۹ فی ہزار مسلمان پاکستان نواز ہیں اور اکثر معاملات میں ہندوستان پر پاکستان کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جب کرکٹ میچ ہوتا ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ پاکستانی ٹیم کی فتح ہو کسی پاکستانی کھلاڑی کے اچھا کھیلنے پر ہندوستان کے مسلمان نوجوان اپنے گلی کوچوں میں اس کی تصویر کو پھول ہار پہناتے ہیں بنگلا دیش کے وجود کو دنیا کے ہر ملک نے تسلیم کر لیا ہے، یو این او نے اس کو اپنا ممبر بنا لیا ہے اور حد یہ ہے کہ پاکستان اس کو مان کر اپنی شکست کا اعلان کر چکا ہے مگر مدعی سست گواہ چست کے مصداق ہندوستان کے مسلمان نے پاکستان کی ہمدردی میں بنگلا دیش کی حقیقت کو آج تک نہیں مانا۔ بنگلا دیش میں جب کبھی کوئی سیلاب یا سمندری طوفان آتا ہے تو ہندوستان کے اردو اخبارات اس کی خبر سب سے پہلے دیتے ہیں اور پہلے صفحے پر دیتے ہیں اور مسلم قارئین ایسی خبریں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ نہ صرف پاکستان کو بلکہ ہندوستان کا مسلمان ہر مسلم ملک کو ہندوستان سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں ایران کا بادشاہ عوام کے نمائندے صدر جمہوریہ ہند سے بہتر ہے۔ ہر اردو اخبار سعودی عرب کی بادشاہت کی تعریف و توصیف میں مبالغے کی انتہا کر دیتا ہے مگر یہ کوئی نئی بات نہیں، ہندوستانی مسلمان کا مزاج ہمیشہ ہی ایسا رہا ہے۔ جب پاکستان نہیں بنا تھا تب بھی وہ 'میرے مولا بلا لو مدینے مجھے' گا گا کر اپنے وطن سے بے زاری کا اعلان کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے وطن ہندوستان کی آزادی کے لئے قربانی دینا ضروری نہیں سمجھا مگر ترکی میں اس خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جس کو خود ترکوں نے ختم کر دیا۔ اگرچہ خلافت کی 'شہادت' کو نصف صدی گزر گئی مگر ہندوستان میں آج بھی خلافت کمیٹی موجود ہے اور خلافت ہاؤس واقع ہے۔
مگر اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمان صرف پچاس فی

صدری قصوروار ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر متوسط گھرانے میں ایک آدھ فرد ایسا ضرور ہوتا ہے جو ذہنی طور پر گھر کے دوسرے افراد سے میل نہیں کھاتا۔ اور وہ گھر میں کم باہر زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ گھر کے افراد بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں ان ناخوش گوار تعلقات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گھر والوں کے مقابلے میں باہر والوں کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ مگر اس ترجیح کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ اس کو اپنے گھر والوں کے مقابلے میں باہر والوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا غیروں سے دوستی اُس کے لیے منافع بخش ثابت ہوتی ہے بلکہ وہ یہ سب کچھ اپنوں کو Tease (دق کرنے، جلانے یا ستانے) کرنے کے لیے کرتا ہے۔ گھر والے جس کو اپنا دوست سمجھیں گے وہ ضد کے طور پر اُس کو اپنا دشمن قرار دے گا۔ اور جس پڑوسی یا محلے دار سے گھر والے نہ ملنا چاہیں گے اُن سے وہ ضرور ملے گا۔ دراصل کسی فرد کی مخاصمت کا یہ انداز اُس کے ذہن کے ناپختہ د نابالغ ہونے کی دلیل ہے۔ اگر گھر والوں کے تعاون سے اور دوستانہ فضا میں صحیح طور پر اس کا ذہن نشوونما پائے اور اس کو درست تعلیم و تربیت ملے تو وہ بھی گھر کے دوسرے افراد کی طرح ایک ذمے دار فرد بن سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ہندوستانی فرقوں کے تعاون سے اگر ہندوستانی مسلمان کے ذہن کو تعلیم و تربیت سے روشن کر دیا جائے تو اس کو اپنے وطن ہی میں وہ خوبیاں نظر آنے لگیں گی جو وہ دوسروں کی سرزمین میں تلاش کرتا پھرتا ہے۔ جس طرح صالح غذا سے انسان کا جسم نشوونما پاتا ہے بالکل اسی طرح انسانی ذہن کو پختہ، بالغ اور باشعور بننے کے لیے صالح تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ بے چارے مسلمان کے جسم کو گائے کے گوشت جیسی ناقص غذا اور ذہن کو مسخ شدہ مذہب کا لٹریچر میسّر آتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان کے اعمال تو بُرے ہیں مگر اس کا دل بُرا نہیں۔

○ کیا پہلے کے مقابلے میں آج کا اردو املا کچھ بدلا ہوا ہے؟

نہ صرف کچھ بلکہ بہت زیادہ بدل چکا ہے۔ پہلے بھول کو بہول، کبھی کو کبہی، جائز کو جایز، امتحان کو استہان، پھٹ کو پہٹ، گاؤں کو گانوں، چارپائی کو چرپائی، پنچی کو پھونچی، نواں لواں (دونوں غنہ استعمال میں نہیں تھا)، اسحاق کو اسحٰق، مولانا کو مولینا، اسماعیل کو اسمٰعیل، بارے میں کو بارہ میں، مغفرت کو مغفرۃ، حضرت کو حضرۃ، سیرت کو سیرۃ، زکات کو زکوٰۃ، قوت کو قوۃ، اُنھیں کو اونھیں، اُن کو اون، اُس کو اوس، رسم خط کو رسم الخط، بین اقوامی کو بین الاقوامی، اُلّو کو اولو، اچھا کو اچہا، تیار کو طیار، تپش کو طپش، توتا کو طوطا، امریکا کو امریکہ، راجا کو راجہ، کل کو کلھ، وہ کو دے، ہے کو ہی، ہاتھ کو ہاتھ، ٹ کو ٹ، ی کو ي، یہ کو یہہ اور ایسے درجنوں لفظوں کا املا بدل چکا ہے اور اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو املے کو زیادہ سے زیادہ صوتی اور سائنٹی فک بنایا جائے۔ یعنی اردو اگر واقعی ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے تو اس کو اردو رسم خط میں لکھا جائے نہ کہ عربی رسم خط میں۔

○ مرزا الٰہی بخش کون تھے؟

انھوں نے مخبرین کر بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کرایا تھا۔ انگریز مصنف باسورتھ اسمتھ نے الٰہی بخش کو 'ٹریٹر آف دلّی' کہا ہے۔ پرساندرس کا بھی مرزا کے بارے میں کہنا تھا کہ وہ فاتحوں کی ادنا خوش نودی کے لیے اپنے باپ کو بھی پکڑوا سکتا ہے۔

○ 'خانہ ساز آشنا' کسے کہتے ہیں؟

لکھنؤ میں حسن بازار کی اصطلاح میں 'خانہ ساز آشنا' اس مرد کو کہتے ہیں جسے طوائف اپنے جی کے اٹکاؤ کے لیے لگا رکھتی ہے۔ اگرچہ ایسا مرد شوہر کا نعم البدل ہوتا ہے مگر وہ خود اس کو پالتی ہے وہ خود اپنے آشنا کے خرچ پر نہیں پلتی۔

○

تلاش و تمنّا میں لذّت وہ پائی
دعا کر رہا ہوں کہ منزل نہ آئے

○

پیغامِ محبت
پیغامِ مسرت

ہر ہندستانی کے لئے

سلیم اور جاوید

کی جانب سے

جاتا ہے تھوڑی دُور ہر ایک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہے ابھی راہ بر کو وہ

بے راہ اور مسحور لوگوں کے ہجوم کو نہیں
بلکہ ہوش مند اور راہ شناس انسانوں کی تنظیم کو
انجمن کہتے ہیں

پیغام امن و آشتی

سب کے لئے

شانتی ساگر

(”درار“، ”پریم پربت“، اور ”آخری ڈاکو“ کے فلم ساز)

کی جانب سے

وشنو تیشوفی سبھا کلکتہ

یہ مسلم جماعت تو نہیں تھی مگر یہ ہندستان کی پہلی سیاسی جماعت تھی جو 26 ستمبر 1841ء کو کلکتے میں قائم ہوئی۔ بابو کمل بوس کے مکان پر چند سربرآوردہ شرفا اور امرا جمع ہوئے اور بنگلا زبان میں تقریریں ہوئیں اور پھر یہ تجویز پاس ہوئی کہ مذہب و ملت اور رنگ و نسل کے فرق کے بغیر اس انجمن کا ہر کوئی ممبر بن سکتا ہے۔ اس سبھا کی پہلی ہی میٹنگ میں یہ بھی طے ہوا کہ ملکۂ انگلستان کی خدمت میں ایک عرضی بھیجی جائے اور اپنی غریبادوں کی دادرسی کی جائے اور ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا جائے تاکہ اس کے ذریعے ہندستانیوں کے حقوق کا ذکر کیا جائے۔

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن علی گڑھ

1893ء میں بمبئی میں ہندو مسلم فساد ہوا جس کے نتیجے میں شری بال گنگادھر تلک نے ستمبر 1893ء سے پونا میں ہر برس دس دن کا گنپتی کا ایک میلا جاری کیا جس کے جلوسوں میں مسلمانوں اور انگریزوں کے خلاف گیت گائے جاتے تھے۔ سرسید کے ساتھ علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر بیک جو ہندو مسلم نفاق کو ہوا دینے سے کبھی نہ چوکتے تھے 30 ستمبر 1893ء کو محمڈن اینگلو اورنٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف انڈیا کے نام سے مسلمانوں کی ایک انجمن بنائی۔ مقصد یہ بیان کیا گیا کہ انگریز حکومت کے سامنے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے فریاد کرنا، مسلمانوں میں سیاسی شورش پھیلنے سے روکنا اور اُن تدابیر میں مدد دینا جو حکومتِ برطانیا کے استحکام میں معاون ثابت ہوں۔

تحریک ریشمی خطوط دیوبند

دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس مولانا محمود حسن (جو بعد میں شیخ ہند کے نام سے مشہور ہوئے) انگریزوں کے سخت دشمن اور ہندستان میں انگریزی حکومت کے انتہائی مخالف تھے اور سلطنتِ عثمانیہ کے پُرجوش حامی تھے۔ 1895ء سے انھوں نے ہندستان کو آزاد کرانے کی کوشش شروع کی اور اس سلسلے میں انھوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے بعض سربراہوں سے اور حکومتِ افغانستان سے مدد چاہی۔ 1905ء میں انھوں نے آزادی کے لیے ایک خفیہ محاذ قائم کیا۔ دیوبند میں بابو محبوب کی کوٹھی کا بیرونی شمالی کمرہ اس محاذ کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ پلان یہ تھا کہ محاذ کے دو حصے ہوں، ایک ملک کے باہر اور دوسرا ملک کے اندر۔ بیرونِ ملک کا محاذ ایک آزاد ہند حکومت قائم کرے جس کے تحت ایک فوج تیار ہو، جس کو روس، جرمنی، ترکی، ایران وغیرہ کی فوجی مدد حاصل ہو اور وہ باہر سے ہندستان پر حملہ کرے اور اسی وقت ملک کے اندر کے محاذ سے خان عبدالغفار، مولانا سیف الرحمان، پیر غلام مجدد اور پیر پگاڑو کی رہنمائی میں بغاوت ہو جائے۔ شیخ ہند کی اس تحریک میں مولانا عبیداللہ سندھی (جو شیخ ہند کے شاگردِ رشید تھے)، راجا مہندر پرتاپ سنگھ (غدر پارٹی کے رکن) مولانا محمد میاں انصاری (بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کے نواسے، ناظم دینیات علی گڑھ کالج مولانا عبداللہ انصاری کے بیٹے محدث مولانا خلیل احمد سہارن پوری کے بھتیجے تھے اور مولانا حامد الانصاری غازی کے والد محترم تھے۔ منصور انصاری اُن کا انقلابی خفیہ نام تھا)، ڈاکٹر متھرا داس، سردار ایشور سنگھ، مولانا حسین احمد مدنی، جرمن فوج کے ایک افسر (مقیم کابل)، سان فرانسسکو (امریکا) اور شنگھائی (چین) کے چند انقلابی، کابل سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عبدالرزاق، کپتان ظفر بے (جو 1947ء کی جنگ میں ایک بڑی جنگی توپ کے گولنداز تھے)، شیخ سنوسی (طرابلس)، انور پاشا (ترکی کے وزیرِ جنگ)، جمال پاشا (ترکی کے سالارِ اعظم) غالب پاشا (مدینے کے ترکی گورنر) اور لاہور کالج کے چند انقلابی نوجوان شامل تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی کو شیخ ہند کی جانب سے باہر جانے کا حکم ہوا۔ اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی شیخ عبدالرحیم کی بیوی نے اپنا سارا زیور بیچ کر مولانا سندھی کے اس سفر کے لیے خرچ فراہم کیا۔ وہ ہندستان کی سرحد (یاغستان) سے گزر کر 15 اگست 1905ء کو کابل پہنچ گئے۔ کابل میں راجا مہندر پرتاپ نے ایک آزاد مملکت جمہوریہ ہند قائم کر لی تھی اور وہ ہی اس کے صدر تھے۔ 1915ء میں شیخ ہند مولانا منصور انصاری کو

ساتھ نے کر مدینہ گئے وہاں انھوں نے ترکی کے سربراہوں سے ایران افغانستان، امرا افغانستان اور قبائلی سرداروں کے نام خفیہ خطوط اور دستاویزات لے کر مولانا منصور لے تو لے گئے۔ وہ بڑی احتیاط سے ہندوستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے اور تب ہی دیوبند کے ایک طالب علم کے ذریعے ہندوستان کی انگریزی حکومت کو اس سازش کا علم ہوا شریف مکّہ کی مدد سے شیخ ہند مولانا محمود حسن اور اُن کے ساتھ مولانا حسین احمد مدنی، حکیم نصرت حسین، سیّد ہاشم، مولانا عزیز گل سرحدی، مولوی وحید یوسفی گرفتار کر لیا گیا، چار چار برس کی سزا ہوئی اور مالٹا میں اسیر کر دیا گیا۔ اسی تحریک کے ایک مجاہد شیخ محمد ابراہیم کو روسی سرحد پر ایک انگریز ایجنٹ نے قتل کر دیا، ایک دوسرے مجاہد ڈاکٹر متھرا سنگھ کو حکومت روس نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ اُن کو ایک بم کیس کے نتیجے میں پھانسی کا دے دی گئی مگر راجا مہندر پرتاپ بچ گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا منصور جلا وطن ہونے پر 30 برس تک افغانستان، روس، ترکی، آذربائی جان اور ترکستان کے پہاڑوں میں بے حال پھرتے رہے اور آخر مولانا منصور جنوری 1946ء میں کابل میں انتقال فرما گئے اور راجا مہندر پرتاپ اور مولانا عبیداللہ سندھی ہندوستان واپس آگئے۔

کہتے ہیں کہ آزادیِ ہند کی یہ تحریک ریشمی رومال یا ریشمی خطوط کے نام سے اس لئے مشہور ہوئی کہ ریشمی کپڑے کے بنے ہوئے دستی رومال پر ایک قسم کی کیمیکل سیاہی سے پیغام لکھا جاتا تھا مگر پڑھنے کے لئے اُس کو آگ کی گرمی پہنچانے سے حروف نمایاں ہوتے تھے اور پڑھے جا سکتے تھے۔ اِس سلسلے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ریشمی کپڑے کے یہ رومال ایک مخصوص رسم خط میں کاڑھے جاتے تھے۔ وہ رسم خط دیکھنے میں پھول پتے معلوم ہوتا تھا مگر جاننے والے اس کو پڑھ سکتے تھے قطع نظر ان دونوں باتوں کے ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ وہ خطوط لکڑی کے صندوقوں میں رکھ کر بھیجے گئے، صندوقوں میں اوپر نیچے ریشم کے تھان بھر دیئے گئے تھے اور بیچ میں خط رکھ دیئے گئے تھے۔

محمڈن پولی ٹیکل آرگنائزیشن لکھنوٴ

نواب وقارالملک نے 21، 22 اکتوبر 1901ء کو لکھنوٴ میں حامد علی خاں ملیگ بیرسٹر کی کوٹھی پر ایک جلسہ منعقد کیا جس کے صدر پٹنے کے بیرسٹر سید محمد شرف الدین تھے۔ اس جلسے میں محمڈن پولی ٹیکل آرگنائزیشن کا اعلان ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے رسم و رواج میں اصلاح کریں، اس عقیدے کو عام کریں کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کو دوام حاصل ہو۔ مسلمان اپنی فریاد ادب سے انگریز کے سامنے پیش کیا کریں۔ اس تنظیم کا یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے سے روکا جائے۔ یہ تنظیم صرف 5 برس چل سکی۔

آل انڈیا مسلم لیگ علی گڑھ

انگریز ہندوستانیوں کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ یہاں یہ سوچا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنی ایک الگ جماعت ہو۔ نواب سلیم اللہ خاں، نواب ڈھاکہ نے 9 نومبر 1906ء کو ایک تحریر جاری کی جس کے ذریعے یہ صلاح دی گئی کہ آل انڈیا مسلم کنفڈریسی کے نام سے ایک جماعت قائم کی جائے بزرگانِ قوم کے سامنے جماعت کے اغراض و مقاصد اور دستور کا مواد کا خاکہ بھی پیش کر دیا گیا۔ دسمبر 1906ء میں مسلم فرقے کے نمائندے ڈھاکے میں جمع ہوئے اور 30 دسمبر کو نواب وقارالملک کی صدارت میں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے جنم لیا۔ مقاصد یہ تھے (1) مسلمانانِ ہند کے دل میں برٹش گورنمنٹ کی نسبت وفادارانہ خیالات کو ترقی دینا اور کسی کاروائی کے متعلق اُن میں جو غلط فہمی پیدا ہو اُسے دور کرنا (2) مسلمانانِ ہند کے پولی ٹیکل حقوق و فوائد کی نگہداشت کرنا اور ان کی ضروریات اور خواہشات کو مود بانہ طریقے سے گورنمنٹ میں پیش کرنا اور (3) لیگ کے دیگر مقاصد کو نقصان پہنچائے بغیر مسلمانانِ ہند میں ایسے خیالات پیدا نہ ہونے دینا جو دوسرے فرقوں کی نسبت معاندانہ ہوں۔ مسلم لیگ کے قائم ہونے کی خبر جب انگلستان پہنچی تو وہاں کے اخبار ٹائمز نے بقول سر رضا علی "اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ مسلمانوں کی ایک مضبوط سیاسی جماعت قائم ہو جانے سے اب ہندوستانیوں میں اتحاد برقرار نہ رہے گا" بدلتی ہوئی سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر سید وزیر حسن نے (جو ان دنوں مسلم لیگ کے جنرل سیکریٹری تھے)

مسلم اکابرین کی رائے سے ایک یادداشت مرتب کی اور پھر دسمبر 1917ء میں سر آغا خاں کی صدارت میں لیگ کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں سید وزیر حسن کی سفارشات کے تحت مسلم لیگ کا نصب العین برطانوی حکومت کے زیر سایہ ہندستان کے لیے ایک ایسی خود مختار حکومت کا مطالبہ قرار پایا جو آئینی اصلاحات کے ذریعے سے حاصل کیا جائے اور جس کے حصول میں ہندستان کی دوسری قوموں کے ساتھ اشتراک عمل کیا جائے۔ ابتدا میں مسلم لیگ کا صدر دفتر علی گڑھ میں تھا مگر جنوری 1910ء میں سر آغا خاں کی ہدایت پر منتقل ہو کر لکھنؤ آگیا ــــ 1930ء کے مسلم لیگ کے الہ آباد کے اجلاس میں ڈاکٹر اقبال نے ہندستان کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ اکثریت کے صوبوں (پاکستان) کا نظریہ پیش کیا مگر مسٹر جناح نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ 1940ء میں (22 تا 24 مارچ) لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا اس میں مسٹر جناح نے ہندو اور مسلمان کو دو جداگانہ قوم قرار دیتے ہوئے پاکستان کی تجویز کو منظور کیا۔

1906ء سے 1947ء تک جو ممتاز مسلمان مسلم لیگ کے صدر بنے اُن میں سر آغا خاں، سر ابراہیم رحمت اللہ، فضل اُلحق، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، حسرت موہانی، ڈاکٹر اقبال، سر ظفر اللہ خاں، سر وزیر حسن اور مسٹر جناح کے نام اہم ہیں۔ مسٹر جناح 1916ء اور 1924ء میں صدر رہے اور پھر 1937ء سے اپنے آخری دم تک (1948ء) بھی صدر رہے۔ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا الحاق ہمیشہ آل انڈیا مسلم لیگ سے رہا وہ ہندستان کی مسلم ریاستوں کی نمائندہ مسلم لیگ تھی۔ چوں کہ ریاستوں میں جماعتی تنظیم ممکن نہیں تھی اس لیے آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے پنڈالوں ہی میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جنوبی ہند کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کو پھر قائم کیا اور اس کے پہلے صدر مدراس کے مسٹر اسماعیل بنے۔ آج کل آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سلیمان سیٹھ ہیں۔

1937ء سے 1947ء تک ہندستانی مسلمانوں میں مسلم لیگ ہی وہ سیاسی جماعت تھی جو سب سے زیادہ مقبول رہی، اُس کو 99 فی صدی ہندستانی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی اور وہ ہندستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی۔

انجمن خدام کعبہ لکھنؤ

لکھنؤ کے فرنگی محل میں مولانا عبدل باری کے مکان پر حکیم عبدل ولی لکھنوی، مولانا شوکت علی، مولانا احمد اشرف کچھوچھوی اور مولانا باری نے 1912ء میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے صدر کو صدر نہیں بل کہ خادم اُل خُدّام کہا گیا۔ چناں چہ پہلے خادم اُل خدام مولانا عبدل باری منتخب ہوئے۔ اور مولانا شوکت علی اور شیخ مشیر حسن قدوائی کو سیکریٹری بنایا گیا۔ مجلس عاملہ میں حکیم عبدل ولی (لکھنؤ) مولوی غلام محی الدین وکیل (قصور)، نواب وقار اُل ملک بہادر (امروہہ)، مولوی غلام محمد فاضل (ہوشیارپور)، مشیر حسن قدوائی بیرسٹر (لکھنؤ) اور ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر (لکھنؤ) شامل ہوئے۔ انجمن کے بعض خدام (جیسے اقبال شیدائی اور ایوب احمد امیر) ایسے بھی تھے جنھوں نے زندگی بھر کعبے کی خدمت کرنے کا عہد کیا تھا۔ خدام کعبہ وہ پہلی مسلم انجمن تھی جس نے ممالکِ اسلامیہ کی جانب ہندستان کے مسلمانوں کو متوجہ کیا، خلافت تحریک کے لیے فضا ہموار کی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی کوشش کی۔

آل انڈیا مومن کانفرنس پٹنا

مسلم لیگ کے قیام کے آٹھ برس بعد 1914ء میں مومن تحریک شروع ہوئی۔ چونکہ مسلم لیگ قدیم جاگیردارانہ نظام کی حمایت میں صرف سرمایہ دار اور اونچے طبقے کے مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتی تھی اور مسلم عوام کے مفاد کو نظرانداز کیے ہوئے تھی اس لیے مومن برادری اور دوسری پس ماندہ مسلم برادریوں کی فلاح و بہبودی کے لیے آل انڈیا مومن کانفرنس قائم کی گئی۔ یہ کانفرنس ابتدا ہی سے انڈین نیشنل کانگریس کی ہم نوا رہی ہے۔ متحدہ ہندستان میں آل انڈیا مومن کانفرنس کی نوعیت سماجی بھی تھی اور سیاسی بھی مگر آزادی کے بعد یہ خالص ایک سماجی و اقتصادی

تحریک کی شکل میں زندہ ہے۔

خلافت کمیٹی دہلی

پہلی بڑی جنگ میں (1914ء) ترکی جرمنی کی طرف سے اتحادیوں (برطانیہ وغیرہ) کے خلاف جنگ میں شریک ہوا مگر جرمنی کے ساتھ 1918ء میں وہ بھی ہار گیا۔ اتحادیوں نے ترکی کو تقسیم کر دیا، اس سے ہندوستان کے مسلمان ناراض ہوئے۔ دسمبر 1919ء میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں امرت سر میں ایک جلسہ ہوا اور نتیجہ میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ مقصد یہ تھا کہ انگریز مسلم خلافت کو نہ توڑیں۔ خلافت تحریک میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مصطفےٰ کمال اتاترک نے 23 اپریل 1920ء کو انگورا میں گرینڈ نیشنل اسمبلی قائم کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تو 22 نومبر 1922ء کو ترکوں کی اس قومی اسمبلی نے یہ طے کیا کہ حکومت اور خلافت کو الگ الگ کر دیا جائے۔ چنانچہ کمال اتاترک نے 1924ء میں خلافت کے سلسلے کو، خلیفہ اور شیخ الاسلام کے عہدے کو ختم کر دیا۔ ہندوستان کے وہ مسلمان جو خلافت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں [illegible] جان قربان کرنے میں لگے ہوئے تھے 10 مارچ 1924ء کو خلافت کے ٹوٹنے کی خبر سن کر رنج سے بلبلا پڑے۔ ہندوستان اور مصر کے چند مذہبی لیڈروں نے کمال اتاترک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ خود خلیفہ بن جائیں۔ جواب میں اتاترک نے کہا کہ 20 ویں صدی میں خلافت ایک بے معنی سی چیز ہے اور وہ خلافت کے نام نہاد اور فضول سے عہدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگرچہ خلافت ہاؤس اور اس کا برائے نام ٹرسٹ بمبئی میں اب تک موجود ہے مگر دراصل خلافت کمیٹی تو 1933ء ہی تک زندہ رہی۔ آخری جلسہ لکھنؤ میں ہوا اور آخری صدر سید [illegible] مرتضیٰ بہادر تھے۔

جمعیتِ علماءِ ہند دہلی

23 نومبر 1919ء کو خلافت کمیٹی کے دہلی کے اجلاس میں جب مسلمان علماء نے شرکت کی تو انھوں نے جمعیت علماء قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ 28 دسمبر 1919ء کو امرت سر میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں جمعیت علماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ مفتی کفایت اللہ جمعیتِ علماء کے صدر منتخب کیے گئے۔ علماء کی اس جمعیت کے قیام کا مقصد یہ بیان کیا گیا:۔

> "1857ء میں علماء حق کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا اور جس بے دردی کے ساتھ علماء ہند کو پھانسی اور جلاوطنی کی وحشیانہ سزائیں دی گئی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ علماء کو مجبوراً گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ چوں کہ مسلمانوں کی سیاست نے اب 1919ء میں پھر پلٹا کھایا ہے تو علماء امت نے دوبارہ سیاسی میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے۔ علماء کا مقصد ہے کہ غیر مسلم برادران کے ساتھ ہم دردی اور اتفاق، مذہبی حقوق کی نگہداشت اور مسلمانوں کی راہ نمائی ..."

جمعیتِ علماء نے اپنے 7 ویں اجلاس میں جو 14 مارچ 1926ء کو کلکتے میں منعقد ہوا آزادیٔ ہند کی تجویز منظور کی اور اس نے اپنے 9 ویں اجلاس میں کانگریس سے اشتراکِ عمل کرنے کی تجویز کو قبول کر لیا۔ جمعیت علماء ہمیشہ متحدہ ہندوستان کی حامی رہی اور تقسیمِ ہند کی مخالف۔ ابتدا میں اس میں صرف مذہبی علماء ہی شامل ہو سکتے تھے مگر بعد میں اس کے دروازے ہر مسلمان کے لیے کھل گئے۔ 1948ء سے علماء کی اس جمعیت نے سیاست سے دست کش رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

جو علماء اس جمعیت کے صدر رہے اُن میں مولانا محمود حسن، مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے نام اہم ہیں۔ دراصل ہندوستان کے تمام بڑے اکابر علمائے اسلام جمعیت علماء سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں۔

○ جو اپنے ملک سے محبت نہیں کرتا وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ بائرن

خدائی خدمت گار پشاور

1929ء میں خان عبدالغفار خاں نے پشاور میں خدائی خدمت گار جماعت کی بنیاد رکھی چونکہ پٹھانوں میں تشدد زیادہ تھا، وہ اپنوں ہی پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے، اُن میں پھوٹ تھی، انتقام کا جذبہ تھا، اخلاق اور نیک عادتوں سے وہ محروم تھے اور اپنی روزی کے سلسلے میں مخلص رہنا اُن کے لیے عام بات تھی اس لئے اس جماعت کے نام میں خدائی حوالہ شامل کیا گیا۔ خدائی خدمت گار کا ممبر بننے کے لیے قسمیہ طور پر یہ عہد کرنا پڑتا ہے۔

"میں خدائی خدمت گار ہوں اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ میں خلقِ خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب، صرف خدا کے واسطے کروں گا۔ میں تشدد سے کام نہیں لوں گا، نہ کسی سے بدلہ یا انتقام لوں گا۔ مجھ پر چاہے کوئی کتنا ہی ظلم و زیادتی کرے میں اُسے معاف کردوں گا۔ میں باہمی پھوٹ، گروہ بندی، دشمنی، خانہ جنگی سے دور رہوں گا۔ ہر ایک پختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا، نیک کار رہوں گا۔ برائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور میں بے کاری کی زندگی بسر نہیں کروں گا۔ اور اپنی وردی اپنی کمائی کے پیسوں سے بناؤں گا۔"

ہر خدائی خدمت گار کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر 24 گھنٹے میں 2 گھنٹے جسمانی مشقت ضرور کرے۔ اس جماعت کی وردی سرخ رنگ کی ہوتی ہے اس لیے اس جماعت کو سُرخ پوش جماعت بھی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس جماعت کے دروازے ہر کسی کے لیے کھلے رہے ہیں مگر غیر مسلموں کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ جماعت مسلمانوں ہی پر مشتمل ہو کر رہ گئی ہے۔

1929ء تا خدائی خدمت گار جماعت آل انڈیا نیشنل کانگریس سے وابستہ ہو گئی۔ مسلم اکثریت کے علاقے (صوبہ سرحد) سے متعلق ہونے کے باوجود یہ جماعت پاکستان کے قیام کی ہمیشہ مخالف اور متحدہ ہندوستان کی حامی رہی۔ پاکستان میں یہ جماعت آج بھی نہ صرف حزبِ مخالف کی حیثیت سے بل کہ ایک دشمن جماعت کے روپ میں پہچانی جاتی ہے۔

خدائی خدمت گار پٹھانوں کی ایک سیاسی و اصلاحی جماعت ہے۔ بادشاہ خان کی قیادت اور تربیت نے ایسا معجزہ کر دکھایا کہ جنگجو پٹھانوں میں پیار و محبت، بھائی چارے کا جذبہ اور قوم پروری کا احساس پیدا ہوا اور وہ پٹھان جو اپنی غرض کے لیے اپنوں ہی کو قربان کر ڈالتے تھے وہ ملک و قوم کی خاطر جنگِ آزادی میں شریک ہو کر بڑی سے بڑی قربانی سے نہیں چوکے۔

تبلیغی جماعت دہلی

مولانا محمد اسماعیل جھن جھانوی (ضلع مظفر نگر) کے صاحب زادے مولانا الیاس نے تبلیغی جماعت قائم کی۔ دہلی کی بستی نظام الدین کی ایک مسجد میں میواتی مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے سے بات کی ابتدا ہوئی۔ 1926ء سے انھوں نے باقاعدہ تبلیغی گشت (سفر) شروع کیا۔ مندرجہ ذیل 6 باتوں کو اپنا مقصد بنا کر یہ جماعت اپنا کام انجام دیتی ہے:

(1) کلمۂ طیبہ کی تبلیغ اور تصحیح (2) نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح (3) تینوں وقتوں میں (صبح، شام اور رات کا کچھ حصّہ) اپنی حیثیت کے مناسب اپنے آپ کو تحصیلِ علم و ذکر میں مشغول رکھنا (4) ان چیزوں کے پھیلانے کے لئے اصل فریضۂ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بہ ملک رواج دینا (5) اس پھرنے میں خلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا (6) اور تصحیح نیت یعنی موت کے بعد والی زندگی

کی درستی کی کوشش کرنا۔

بانی جماعت مولانا الیاس کا قول تھا کہ دین کے لیے دنیا کا نفع (کھیتی باڑی کا نقصان اور کاروبار کا حرج برداشت کرنا) قربان کرنا بہتر سمجھو اور دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ رکھو۔ ان کا ارشاد تھا: "جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا مقصود اور خلاصہ ہے!"

تبلیغی جماعت کی تنظیم دوسری عام جماعتوں کے برخلاف بہت سادہ اور واضح ہے۔ جماعت کا صدر نہیں بلکہ "امیر" ہوتا ہے۔ جماعت کا نہ کوئی چندہ ہے، سفر میں ہر کوئی اپنا خرچ خود ہی برداشت کرتا ہے۔ جو تبلیغی گشت کرتا ہے اُسے دستولی کلام کہتے ہیں۔ 13 جولائی 1944ء کو مولانا الیاس کے انتقال کے بعد اُن کے صاحب زادے مولوی یوسف جانشین مقرر ہوئے۔

مجلس احرار اسلام لاہور

1928ء میں جب مولانا شوکت علی نے ذاتی ناراضگی کی بنا پر پنجاب خلافت کمیٹی کو غیر آئینی قرار دے دیا تو مولانا ظفر علی خان، خواجہ عبدالرحمان غازی، چودھری افضل حق، مولانا عطا اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی وغیرہ نے پنجاب کے مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے 1929ء میں لاہور میں مجلس احرار اسلام قائم کی۔ احرار کا پہلا اجلاس 29 دسمبر 1929ء کو مولانا افضل حق کی صدارت میں لاہور میں منعقد ہوا۔ عطا اللہ شاہ بخاری مجلس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ مجلس احرار کا مقصد یہ تھا کہ ملک آزاد ہو اور غریب آسودہ ہوں، ہندوستان میں سرمایہ داروں کی حکومت کے بجائے غریبوں کی حکومت ہو۔ مجلس احرار نے غریب مسلمانوں کے حالات کو سدھارنے اور خصوصی طور پر کشمیر اور کپورتھلا کے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے بڑی جانی و مالی قربانیاں دیں۔ ان ریاستوں میں 50 ہزار احراری جیلوں میں چلے گئے۔ مجلس احرار نے ہمیشہ کانگریس کی تائید کی اور مسلم لیگ کی مخالفت کی اور ستمبر 1939ء میں میرٹھ کے اجلاس میں احرار نے واضح طور پر دوسری بڑی جنگ کے سلسلے میں انگریزی فوج میں بھرتی ہونے کے خلاف تجویز منظور کی۔ مگر پاکستان بن جانے کے بعد مجلس احرار نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی کوشش کی تو لیاقت علی خان نے احراریوں کی سخت مذمت کی اور تذلیل کے بعد مجلس احرار کو مسلم لیگ سے باہر نکال دیا۔

مسلم نیشنلسٹ پارٹی الہ آباد

اس پارٹی کا پہلا اجلاس 27 جولائی 1929ء کو الہ آباد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں حب وطنی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ فرقہ پرستی سے دور رہیں۔ بعد میں اس پارٹی کے سالانہ اجلاس لکھنؤ، میرٹھ اور دوسرے مرکزی شہروں میں بھی ہوئے۔ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کو ڈاکٹر سید محمود، خان عبدالغفار، سید امام، ڈاکٹر انصاری، ورنصرت احمد خان شیروانی جیسے ممتاز اور قوم پرست مسلمانوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ اس پارٹی نے تعلیم یافتہ طبقے کے خیالات میں تبدیلی ضرور پیدا کی مگر یہ پارٹی زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی اور جو کچھ اس نے کام کیا تھا اس پر بھی پانی پھر گیا۔

جماعت خاکسار لاہور

خدائی خدمت گار جماعت کی کامیابی اور مقبولیت نے انگریز کو اپنی حمایت میں ایک نئی جماعت قائم کرنے پر مجبور کیا چنانچہ حکومت نے علامہ عنایت اللہ مشرقی کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ نتیجے میں علامہ مشرقی نے اپریل 1931ء میں جماعت خاکسار قائم کی۔ اس جماعت کی بنیاد جمہوریت کے بجائے آمریت پر رکھی گئی۔ خاکسار کو لازم تھا کہ وہ نماز مغرب کے بعد اپنے محلے میں کم سے کم دس آدمیوں کو جمع کرے، اُن کو بیدار کرتے رہتے، اُن کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ان کے کندھوں پر بیلچہ دے دے اور انھیں فوجی قواعد کرائے۔ اللہ اور اسلام کی راہ میں ہر وقت اپنی جان و مال یہاں تک کہ اپنی اولاد بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ روئے زمین

اور اسلام کا اجتماعی غلبہ پیشِ نظر ہے۔ آپس میں اخوت ہو، سالار کا حکم بلا حجت مانے اور مسلمان سے مذہبی اور سیاسی عقیدوں کے متعلق بحث

امہ مشرقی نے کانگریس، خلافت، احرار اور خدائی خدمت گار جیسی قوم پرست جماعتوں اور گاندھی جی جیسے قومی لیڈروں کی ہمیشہ مذمت کی اور انگریز
ی بڑی جنگ میں انگریز حکومت کو ۵ ہزار خاکسار جوانوں کی خدمت کی غیر مشروط پیشکش کی۔ خاکسار جماعت نے جب لکھنؤ میں سول نافرمانی کی
ار ہوئے اور پھر وہ معافی چاہ کر رہا ہوئے تو خاکسار جماعت کی ساکھ گرگئی۔ ۱۹ مارچ 1940ء کو خاکسار جماعت نے لاہور میں سر سکندر حیات خاں
خلاف سول نافرمانی کی تو پولس نے گولی چلادی جس سے ۵۰ خاکسار مارے گئے اور علامہ مشرقی گرفتار کرلیے گئے۔ اور آخر اس جماعت

شیعہ پولی ٹی کل کانفرنس لکھنؤ

ل انڈیا شیعہ پولی ٹی کل کانفرنس 1929ء میں لکھنؤ میں قائم ہوئی مگر اس کا پہلا اجلاس (راجا نواب علی خاں کی صدارت میں) 1930ء میں لکھنؤ
ر اس کانفرنس کے وجود میں آنے کی وجہ یہ تھی کہ رائے دہندگان کے حلقے وسیع ہو جانے کی بنا پر عام انتخابات کے سلسلے میں جب شیعہ امید
ن مذہبی پروپیگنڈا ہوتا تو شیعہ امیدوار محض شیعہ ہونے کی بنا پر ناکام ہو جاتے۔ چناں چہ شیعوں میں جداگانہ طریق انتخاب کی خامیوں کا
ہوا اور انھوں نے مخلوط انتخاب کی حمایت کرنا شروع کی تاکہ دوسرے فرقوں کی مدد سے وہ الیکشن میں کامیاب ہوسکیں۔ اس ضرورت نے شیعوں
ہ سیاسی جماعت بنانے پر مجبور کیا۔

جماعتِ اسلامی ہند دہلی.

ولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت پر ۷۵ مسلمانوں کے مشورے سے 26 اگست 1941ء کو لاہور میں جماعتِ اسلامی قائم ہوئی۔ مولانا مودودی
بر منتخب کیے گئے۔ امیر جماعت نے مجلسِ شوریٰ کا انتخاب کیا۔ شوریٰ کے اجلاس میں جماعت کا لائحہ عمل وضع کیا گیا اور جماعت کے کام کو متعدد شعبوں میں
جماعتِ اسلامی کا پہلا کل ہند اجتماع اپریل 1945ء میں پٹھان کوٹ میں منعقد ہوا۔ تقسیمِ ملک کے بعد جماعت بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ آزاد
جماعت کا پہلا اجتماع اپریل 1948ء میں الٰہ آباد میں ہوا جس میں جماعتِ اسلامی ہند کے امیر مولانا ابواللیث کو منتخب کیا گیا۔ مگر کل ہند اجتماع
ء میں رام پور میں منعقد ہوا۔ ابتدا میں ہندستان کی جماعتِ اسلامی کا مرکزی دفتر ملیح آباد میں قائم ہوا تھا مگر 1949ء میں رام پور منتقل ہوگیا اور
ء سے دہلی میں ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل جماعتِ اسلامی کے ارکان کی تعداد 625 تھی، بعد میں ہندستان کی جماعتِ اسلامی کے ارکان کی تعداد 240
دنوں یہ تعداد 2064 ہے۔ ابتدا میں جماعتِ اسلامی کا نصب العین حکومتِ الٰہیہ تھا۔ اب اس کی مترادف اصطلاح 'اقامتِ دین'
باقی ہے۔ یعنی مقصدِ حقیقی رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا حصول ہے۔ جماعت کے صدر کو امیر اور جنرل سیکریٹری کو قیّم کہتے ہیں۔
لک کو 15 حلقوں میں بانٹ دیا ہے۔ اور ہر حلقے کا سربراہ امیرِ حلقہ کہا جاتا ہے۔ جو افراد جماعت کے عقیدے اور نصب العین کو مانتے
اہر جماعت کے نظم میں شریک نہیں ہوسکتے وہ جماعت کے ہم درد کہے جاتے ہیں اور جو جماعت کے مقصد سے حُسنِ ظن رکھتے ہیں ان کی تعداد کئی

جماعت کی جانب سے تصنیف و تالیف کا بھی ایک شعبہ قائم ہے جو جماعت کے لیے لٹریچر تیار کرتا ہے۔ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں
ن کے لیے لٹریچر کی طباعت و اشاعت کے لیے علاحدہ دارالاشاعت قائم کیے گئے ہیں۔ اردو روزنامہ و سہ روزہ 'دعوت' (دہلی)، اردو
ندگی' (رام پور) ہندی ماہ نامہ 'کانتی' (رام پور) اور ملیالم ہفت روزہ و ماہ نامہ 'پربودھم' (کالی کٹ) جماعت کے ارگن ہیں۔ انگریزی

ہفت روزہ 'ریڈئینس' (دہلی)، انگریزی سہ ماہی 'اسلامک تھاٹ' (علی گڑھ)، اردو سہ روزہ 'الحسنات' (رام پور)، ہندی ماہنامہ 'ہادی' (رام پور) اور اردو سہ روزہ 'نور' (رام پور) بھی جماعت اسلامی کے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند اگرچہ کہنے کو سیاسی جماعت نہیں ہے مگر اس کی کشمیر کی شاخ پچھلے کئی برس سے واضح اور عملاً طور پر سیاست میں حصہ لے رہی ہے۔ اپنے کل ہند 5 ویں اجتماع (دہلی، 1974ء) میں جماعت نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ وہ پنچایت الیکشن میں حصہ لے گی۔ موجودہ امیر جماعت محمد یوسف میں اور قیم (جنرل سکریٹری) مولانا حامد حسن صاحب۔

مسلم مجلس بنگال کلکتہ

مسٹر جناح نے جب کانگریس سے سمجھوتا کرنے میں پس و پیش کیا تو کلکتے میں چند ممتاز قوم پرور مسلمانوں نے 1943ء میں 'مسلم مجلس بنگال' کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس کے صدر شیخ جان محمد ممبر کونسل تھے۔ اس مسلم مجلس کا مقصد یہ بیان کیا گیا کہ ہندوستان کے لیے سیاسی و اقتصادی آزادی حاصل ہو۔ سب صوبوں کو مکمل آزادی حاصل ہو مگر متفقہ طور پر جو اختیارات صوبے مرکزی حکومت کو دیں مرکز ان کا استعمال فلاح عامہ کے لیے کرے۔ مسلم مجلس تقسیم ہند کی مخالف تھی۔

آل انڈیا مجلس تعمیر ملت حیدرآباد

1948ء کے بعد حیدرآباد کے مسلمانوں میں جب بے کسی، نا امیدی، بے حسی اور جمود کی کیفیت پیدا ہوئی اور مسلم نوجوان طبقہ اشتراکیت کی جانب رجوع ہوا تو اس کو حوصلہ بخشنے اور اسے آستانۂ اسلام کرنے کے لیے 15 رجون 1950ء کو حیدرآباد میں تعمیر ملت وجود میں آئی۔ پہلے صدر سید خلیل اللہ حسینی ایم اے، ایل ایل بی بنے اور نائب صدر سلیمان سکندر۔ اس مجلس کا مقصد ہے اسلامی تعلیمات کی اشاعت، مسلمانانِ ہند کی تعمیر و ترقی کے لیے منظم جد و جہد، ملک کی مختلف تہذیبی وحدتوں اور قومیتوں کے مابین روابط کو انصاف کی بنیاد پر استوار کرنا اور ان کے جائز حقوق کے لیے جد و جہد کرنا اور ملک کی مشترکہ زبان کی حیثیت سے اردو کا تحفظ کرنا اور اس کو فروغ دینا۔

اس مجلس کی جانب سے جو سالانہ تقریب بڑی اہمیت کے ساتھ منائی جاتی ہے وہ 'یوم رحمت اللعالمین' ہے۔ تعمیر ملت اگرچہ ایک غیر سیاسی جماعت ہے مگر اس کی بستی کی ضرورت کے پیش نظر اپنے مرکز کی اجازت سے سیاسی کاموں میں حصہ لے سکتی ہے۔ مجلس کی مختلف شاخیں غریبوں کے لیے مفت طبی امداد کا بھی انتظام کئے ہوئے ہیں اور کئی بستیوں میں چھوٹے پیمانے پر بیت المال بھی قائم کئے ہوئے ہیں۔

مسلم مجلس مشاورت لکھنؤ

کلکتہ، جمشید پور، رورکیلا اور رائے پور وغیرہ میں جب بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور جن سے لاکھوں مسلمان متاثر ہوئے تو مختلف مسلم جماعتوں اور اداروں کے سربراہوں نے اگست 1964ء میں لکھنؤ میں ایک مسلم کنونشن منعقد کیا جس کے نتیجے میں مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس کے سربراہ ڈاکٹر سید محمود تھے اور ان کے معاون تھے ملا جان محمد اور مولانا علی میاں وغیرہ۔ مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کی جائے۔

مسلم مجلس لکھنؤ

1947ء کے بعد سے چونکہ جمعیت علماء ایک غیر سیاسی جماعت ہے اس لیے عام انتخابات (1967ء) کے سلسلے میں مجلس مشاورت نے جو پالیسی بنائی جمعیت علماء کو اس سے اختلاف پیدا ہوا اور وہ مجلس مشاورت سے الگ ہو گئی۔ عام انتخابات کے سلسلے میں ڈاکٹر سید محمود

کانگریس کے حق میں تھے اور ڈاکٹر فریدی کانگریس کے مخالف، جماعتِ اسلامی کو بھی مجلسِ مشاورت کے بنائے ہوئے انتخابی منشور سے اختلاف ہوا چنانچہ ڈاکٹر جلیل فریدی نے مجلسِ مشاورت سے الگ ہو کر 1967ء میں مسلم مجلس قائم کرلی۔

بوہرہ یوتھ ایسوسی ایشن اودے پور

مسلمانوں کی بوہرہ برادری کے ترقی پسند و تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کی یہ جماعت 1964ء میں اودے پور (راجستھان) میں قائم ہوئی۔ ابتدا میں اس جماعت کا مقصد یہی تھا کہ بوہرہ برادری میں تعلیم عام کی جائے، برادری کے پیشوا سیدنا کی جانب سے مستحق طالب علموں کو وظیفے دیے جائیں، درسی کتابیں فراہم کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر پچھلے عام انتخابات میں (1970ء) نوجوانوں کو نمائندگی کا حق نہ ملنے پر اس ایسوسی ایشن نے اپنے مقاصد کا رخ بدل دیا اب اپنی برادری کے دینی راہ نما ملا جی سے نوجوانوں کا مطالبہ ہے کہ سماجی اصلاحات کی جائیں، معاشی سدھار پر توجہ دی جائے اور سب سے اہم مطالبہ یہ ہے کہ بوہرہ فرد کے نجی معاملات میں ملا جی کا دخل نہ ہو۔ ہر بوہرہ فرد کو تقریر و تحریر کی آزادی ہو اور ملا جی کی جانب سے بے جا گرفت اور جبر کا خاتمہ ہو اور یہ بھی کہ بوہرہ برادری کا نظام جمہوری ہو یعنی ملا جی کے نامزد کردہ نمائندے نہ ہوں بلکہ وہ برادری کے انتخاب کردہ ہوں۔ بوہرہ یوتھ ایسوسی ایشن کے صدر صالح محمد نائب ہیں اور عابد علی ادیب جنرل سیکریٹری ہیں۔ اب یہ ایسوسی ایشن ایک آل انڈیا جماعت بن چکی ہے۔ بمبئی میں اس کی شاخ قائم کرنے والوں میں ناظم، اسماعیل عطر والے اور عباس علی صاحبان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس تنظیم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ انتہائی تعلیم یافتہ، باشعور اور ترقی پسند (لیکچرر، وکیل، انجینئر، ریسرچ اسکالر) نوجوان لڑکے لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ بوہرہ برادری کے 85 فی صدی نوجوان اس ایسوسی ایشن سے تعلق رکھتے ہیں۔

جمعیت اہلِ حدیث ممبئی

گیارہویں صدی ہجری میں شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی مجدد الف ثانی نے توحید و سنت کی اس تحریک کو ایک تنظیمی شکل دی۔ بارہویں صدی ہجری میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس تحریک کا صحیح معانی میں عملی جامہ پیش کیا جس کی تکمیل اُن کے بھتیجے مولانا اسماعیل شہید نے فرمائی۔ دراصل یہ ہندوستان میں یہ پہلی اسلامی تحریک تھی، جمعیت کی دعوت چار بنیادی اصولوں پر مبنی ہے (1) توحید باری تعالیٰ (2) اتباع سنتِ رسول اللہ (3) تعلق بی اللہ اور (4) ایثار فی سبیل اللہ ـــ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے نتیجے میں جب شمالی ہند کے پوربی مسلمان ترکِ وطن کر کے (احمد آباد، دھولیا برہان پور، مالے گاؤں بھیونڈی اور) بمبئی وارد ہوئے تو انھوں نے مومن پورہ اور گھیلا بائی اسٹریٹ میں ایک ایک مسجد (اہلِ حدیث) قائم کی اور اس تحریک کو چلانے کا سہرا مولانا ابوجعفر کے سر رہا۔ حاجی سیٹھ سلیمان عبدل واحد اور مولانا اشرف الدین اَلکتبی نے اس تحریک کو کافی فروغ دیا۔ مگر بمبئی میں جمعیت اہل حدیث کی واضح طور پر تشکیل 11 جون 1939ء کو ہوئی اور مولانا محی الدین قصوری صدر قرار پائے۔ مارچ 1961ء میں جمعیت کے تنظیمی ڈھانچے کو از سرِ نو بدل دیا گیا اور 9 ستمبر 1964ء کو بمبئی کے دس مختلف علاقوں میں جمعیت کی شاخیں قائم کر کے جمعیت کو پھر ایک بار نئے طور پر تشکیل دیا گیا۔ جمعیت کے دفتر میں دینی کتب سے متعلق ایک لائبریری بھی ہے اور جمعیت کے تحت ایک دینی دار العلوم اور ایک ہائی اسکول بھی جاری ہے۔ جمعیت اصلاحی و تبلیغی کاموں کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق اور رفاہی کاموں میں بھی حصہ لیتی ہے۔ جمعیت اہلِ حدیث کا آل انڈیا مرکز بنارس ہے۔

مجلس اتحاد المسلمین حیدر آباد

کہتے ہیں کہ نواب بہادر یار جنگ اردو زبان کے 'جادو بیان' مقرر تھے۔ وہ اپنی پاکیزہ شخصیت اور بلند کردار کی وجہ سے حیدر آباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ پہلے لیڈر تھے جنھوں نے حیدر آباد کے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا اور اُن کو یہ نعرہ دیا کہ نظام سے ہم نہیں ہیں بلکہ ہمارے دم سے نظام

کا اقتدار قائم ہے۔ اسی بنا پر وہ معتوب دربار ہوئے۔ 1947ء کے لگ بھگ انھوں نے حیدرآباد میں مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ (1) حیدرآباد کے مسلمانوں کو منظم کیا جائے اور (2) ریاست نظام حیدرآباد کی حفاظت کی جائے۔ اس مجلس کے پہلے صدر نواب یار جنگ، دوسرے ابوالحسن، تیسرے سید مظہر علی کامل اور چوتھے صدر سید قاسم رضوی تھے۔ 1947ء کے دنوں میں جب ریاست حیدرآباد کی حکومت میں عوام کو نمائندگی ملی تو اتحاد المسلمین کے چھے نمائندے وزیر بنائے گئے۔ حصول آزادی کے بعد جب حیدرآباد کا ہندستان سے الحاق ہونے لگا تو اتحاد المسلمین مانع آئی اور اس کے مسلح رضاکاروں نے ریاست کا نظم ونسق سنبھال لینے کی کوشش کی، حکومت ہند کی جانب سے جب پولس ایکشن ہوا تو رضاکاروں نے مزاحمت کی، نتیجے میں بہت سے رضاکار مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اتحاد المسلمین کے صدر و رضاکار دل کے لیڈر قاسم رضوی روپوش ہوئے اور آخر گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا، چوں کہ خود فوج داری کے وکیل تھے اس لئے انھوں نے اپنے مقدمے کی پیروی خود ہی کی، دس برس کی سزا ہوئی۔ 1959ء میں جیل سے رہا ہوئے تو پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں وکالت کرنے لگے اور چند برس بعد وہیں انتقال ہوا۔

اس ناکامی کے باوجود مجلس اتحاد المسلمین تحلیل نہیں ہوئی۔ وہ زور شور تو نہیں رہا مگر حیدرآباد میں وہ آج بھی قائم ہے اور میونسپل الیکشن میں اس کے اکثر امیدواروں کو کامیابی ہو جاتی ہے۔ قاسم رضوی کے بعد کئی برس تک صلاح الدین اویسی اتحاد المسلمین کے صدر رہے۔

مسلم ستیہ شودھک منڈل بمبئی

مارچ 1970ء میں پونے کے سات نوجوانوں نے جناب حمید دلوائی کی قیادت میں مسلم ستیہ شودھک منڈل کی بنیاد رکھی۔ اس منڈل کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ مسلم سماج میں اصلاح کی جائے، عورتوں کو ماڈرن تعلیم کی طرف راغب کیا جائے، مسلمانوں کو علاقائی زبان اپنانے کے لئے مشورہ دیا جائے، خدا اور قانون کے تحت مرد اور عورت کو مساوات حاصل ہو، انسانیت کی سطح پر مسلمان غیر مسلموں سے بھی برابر کا تعلق پیدا کریں۔ مسلم ستیہ شودھک منڈل کے تحت اب تک کئی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ 18، 19 دسمبر 1971ء کو جناب حمید دلوائی کی صدارت میں فاروڈ لکنگ مسلم کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاح پروفیسر مقبول احمد نے کیا۔ اس میں 300 نمائندوں نے شرکت کی جن میں 50 مہاراشٹر سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری کانفرنس جو مسلم عورتوں سے تعلق رکھتی تھی پونا میں منعقد ہوئی۔ اس کا افتتاح جناب آصف فیضی نے کیا۔ 200 عورتوں نے نمائندہ بن کر شرکت کی اور انھوں نے یک ساں سول کوڈ کے حق میں آواز اٹھائی۔ تیسری کانفرنس "مسلم پولیٹی کل" کے عنوان سے بمبئی میں منعقد ہوئی جس کا افتتاح پروفیسر متین شاکر نے کیا۔ صدارت جناب حمید دلوائی نے کی۔ جناب آصف فیضی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ نمائندوں کی تعداد 300 تھی۔ دسمبر 1973ء میں کولھاپور میں جو مہاراشٹر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی وہ اس منڈل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں 800 نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں پروفیسر اے۔ بی۔ شاہ کی صدارت میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ اسکولوں میں مراٹھی مسلمانوں کے لیے مراٹھی میڈیم ہو اور مہاراشٹر کا مسلمان اردو کو محض ایک زبان کی حیثیت سے پڑھے۔ مسلمان عورتوں کی اصلاح منڈل کے پیش نظر زیادہ ہے۔ منڈل کی جانب سے کولھاپور میں مسلمان عورتوں کے لیے ایک کوآپریٹیو سوسائٹی اور ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ہے۔ ان دنوں منڈل کے ممبران کی تعداد 700 ہے اور سات شاخیں (بمبئی، پونا، کولھاپور، ستارا، جلگاؤں، شولاپور، اور علی باغ) ہیں۔

آل انڈیا سنّی جمعیت علماء، بمبئی

1957ء میں قائم ہوئی۔ مولانا سید محمد اشرفی جیلانی اور مولانا حشمت علی خاں کی تائید و سرپرستی اس جماعت کو حاصل رہی۔ مرحوم مولانا اسد آل مصطفیٰ ابتدا سے اپنے آخری دم تک (74-1957ء) صدر رہے۔ ان دنوں مولانا مشتاق احمد نظامی قائم مقام صدر ہیں۔ سنّی جمعیت علماء کی غرض وغایت یہ ہے کہ بہ ہر صورت اسلام و مسلمان کا تحفظ کیا جائے۔ آفات سماوی و ارضی کا شکار ہونے والے مصیبت زدہ و مظلوم مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ سنّی جمعیت علماء کی سارے ملک میں 50 شاخیں ہیں۔ یہ جماعت دیوبندی مسلک کے بالکل خلاف ہے اور جماعت کا کردار خالص مذہبی ہے۔

مسلم رفاہی سوسائٹی اتر پردیش لکھنؤ

1974ء میں لکھنؤ میں مسلم رفاہی سوسائٹی اتر پردیش رجسٹرڈ قائم ہوئی۔ یہ سوسائٹی اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے چار شعبوں پر مشتمل ہے (1) شعبۂ اصلاح و تربیت: اس کے تحت کوچنگ سنٹرز، ملت ہاسٹل، یونٹ کے تعلیمی میلے، مختلف تحریری و تقریری مقابلوں کے جلسوں کا قیام (2) شعبۂ امانت، بچت و قرض: اس شعبے کے ذمے امانتوں اور پس انداز رقومات کو محفوظ رکھنا، وقتِ ضرورت اُن کو واپس کرنا اور قرض دینا (3) شعبۂ تجارت و صنعت و حرفت: مسلمانوں کو جدید ترین صنعتی و تجارتی معلومات فراہم کرنا اور صنعتی و تجارتی اداروں کے قیام میں مدد دینا اور (4) شعبۂ بیت المال: زکاۃ و عشر وغیرہ کی تحصیل اور پھر اُسے مستحقین میں تقسیم کرنا ——— یہ سوسائٹی ایک سیکریٹری کے زیرِ انتظام ہے۔

بہادر ترک

ترکی ہی ایک ایسی اسلامی قوم باقی ہے جو حکومت اور آزادی کے سبب ہمارے مقصدِ آفرینش کی تکمیل یعنی حفاظت حرمین شریفین کر سکتے ہیں۔ عرب یا افغان مقابلتاً ترکوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ افغانوں سے تو ہم کو رات دن سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، ان کی حالت جیسی خراب ہے اس کا اندازہ ہم کو اچھی طرح ہے۔ عربوں کی حالت میں آگے کسی خاص مضمون میں لکھتے وقت اپنی وہ وجوہ بھی بیان کروں گا جس کی بنا پر میں عربوں پر ترکوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک قصہ مجھے یاد آیا۔ اس سے کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کے شاہد شاید میرے ساتھی بھی ہیں جو ادرنہ کی تسخیر کے بعد میرے ہمراہ شہر مذکور میں گئے تھے ایسے شاندار معرکے میں جس کے کفرستان اور عالمِ اسلام دونوں کو حیرت ہو گئی۔ ہمارے چند پنجابی مسلمان بھی شریک تھے۔ چنانچہ یہ لوگ ہندوستان چھوڑ کر جہاد کرنے کے لئے ترکی پہنچے تھے۔ سات کروڑ مسلمانوں میں سے یوں چند اشخاص کا عملاً جہاد میں شریک ہو جانا ہی اُن کی بہادری کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔ یہ لوگ انور بک کے ہمراہ ادرنہ کو بلغاریوں سے واپس لینے کی غرض سے گئے تھے اور خدا کے فضل سے نہایت تزک اور احتشام کے ساتھ چھوٹی موٹی معرکہ آرائیاں کرتے ہوئے اپنے شجاع ترک بھائیوں کے ساتھ ادرنہ میں داخل ہوئے۔ ادرنہ ترکی میں ایڈریانوپل کو کہتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر خوش قسمتی سے انور بک و عادل بک وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اسی اثنا میں مجھے اپنی جماعت سے بھی زیادہ خوش قسمت جماعت یعنی انھیں چند پنجابی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لوگ مجھے بلدیہ یعنی عمارت میونسپلٹی کے سامنے جبکہ ولی عہدِ خلافت ادرنہ سے قرق کلیسہ جانے والے تھے تماشائیوں اور سپاہیوں کے مجمع میں نظر پڑے۔ میں نے اُن سے مختصراً دریافت کیا کہ مارچ کرتے وقت انھوں نے کیا کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی میرا رشک بڑھنے لگا گو میں نے کتنا ہی چھپایا۔ مگر میری باتوں سے فوراً ظاہر ہو گیا اور وہ لوگ ہنسنے لگے۔ جواب دیتے ہوئے مجھ سے من و عن کیفیت بیان کی میرے اس سوال پر کہ تم خود بھی کسی کو مارا؟ نہایت شرم سے جواب دیا۔ "ہم ہندوستانی ہیں۔ اکثر چھوٹے پیمانے پر لڑائیاں ہوئیں۔ ترک لوگ بڑھ بڑھ کر دشمنوں کی گردنیں اڑائیں۔ لیکن ہم پیچھے ہی رہتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ افسران ہم کو روکتے تھے بلکہ اس لئے کہ ہم نے کبھی تلوار اور بندوق نہیں اٹھائی تھی۔ ہم کو خود بخود ایک رکاوٹ سی ہوتی تھی اور جیسے ایک قاتل قتل کرتے وقت مرعوب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم پر بھی رعب طاری ہو جاتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کیسے ہیں۔ افسوس کہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر موقع پڑے تو جان بھی بچا سکیں۔ چہ جائیکہ جنگ میں مرنا اور مارنا۔" میں نے یہ قصہ اس لئے پیش کیا ہے کہ ہم کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ ترکوں میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ مسلمانوں میں حاکم آزاد بہادر اگر کوئی قوم صفحۂ ہستی پر ہے تو وہ ترک ہے۔"

منظور محمود دگلو کا (طلعت محمود کے والد) ترکی سے ایک خط - ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۳ء

جنگ کا ہندوستانی مسلمان نمبر

قارئینِ گگن

کے لئے

نیک دعائیں

"ہر فن مولا"

کے فلم ساز

ایس ایم ساگر

کی جانب سے
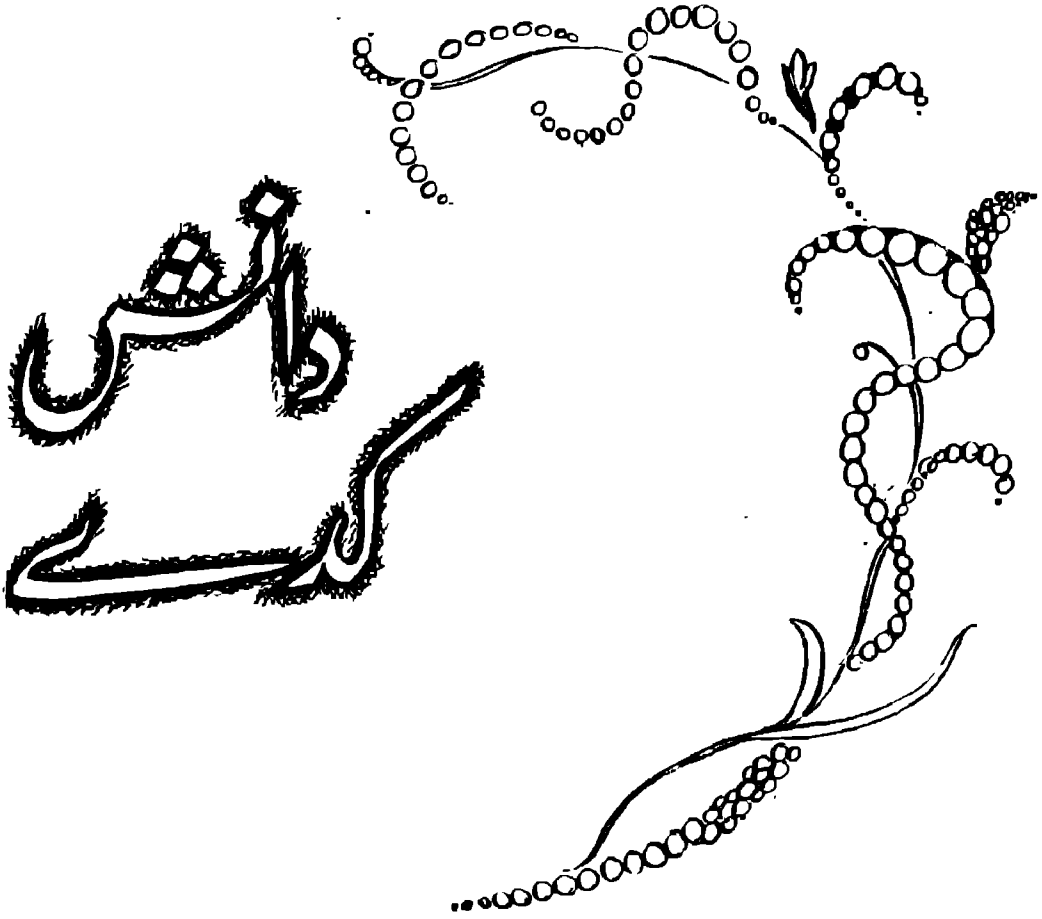
جہاں قیاس کا اندھیرا کم
یقین کا اجالا زیادہ ہوتا ہے!

ہمارا

پیغامِ خلوص و مسرّت

ہندستانی مسلمانوں کے لئے

کسم پکچرس

B۔ 40۔ نیو سروتم سوسائٹی، ارلا برج، اندھیری (ویسٹ) بمبئی-58

پروڈکشن آفس: موہن اسٹوڈیوز، کرلا روڈ، اندھیری (ایسٹ) بمبئی 69

مُسلم تعلیم

محمد بن قاسم کی آمد سے ـــــ آج تک

ابتدا ہی سے ہندستان کا ہر مسئلہ نزاعی مسئلہ رہا ہے یعنی ہندستان اختلافی عناصر کا گھر ہے اور اس سلسلے میں دنیا کا کوئی دوسرا ملک یا کسی دوسرے ملک کا کوئی معاشرہ ہندستان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اسی لیے دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کا طریق تعلیم ہندستان کے حالات پر پورا اترتا ہے اور نہ ہندستانیوں کے مزاج کو پورے طور پر بھاتا ہے۔ قومی زبان، علاقائی بولیاں، نسل، قومیت، مذہب، علاقائی تہذیب و تمدن اور ہر علاقے کی بدلی ہوئی آب و ہوا ہندستانیوں کی وہ مخصوص مشکلات ہیں جن کو حل کرنے کے لیے ایک مخصوص طریق علاج کی ضرورت ہے۔

ہندستان میں جو بھی فاتح بن کے آیا اپنی زبان اپنے ساتھ لایا اور اس نے ہندستانی زبانوں کے ساتھ اپنی زبان کو بھی رائج کردیا اور ظاہر ہے کہ سرکاری سرپرستی اسی زبان کو حاصل ہوئی جو حکمراں کی مادری زبان تھی۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں عربی، فارسی اور ترکی جیسی غیر ملکی زبانوں کو ہندستان میں خاصا بڑھاوا ملا۔ اُن دنوں بھی مقامی زبانوں کا چلن باقی رہا مگر عزت کی نظر سے عربی، فارسی اور ترکی ہی کو دیکھا گیا جب یورپ کے حکمراں فاتح بن کر ہندستان میں داخل ہوئے تو اُن کے ساتھ فرانسیسی بھی آئی، پرتگیز بھی اور انگریزی بھی۔ اور چونکہ فرانسیسی اور پرتگالیوں نے بہت تھوڑی عمر پائی اس لیے اُن کی زبانیں بھی ہندستان کی سرزمین پر زیادہ عرصے زندہ نہ رہ سکیں۔ مگر انگریزوں کے ساتھ اُن کی انگریزی نے بھی ہندستان میں قدم جما لیے۔

7 ویں صدی عیسوی سے مسلمان عربوں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ تعلیم کی ابتدا قرآن شریف سے ہوئی اور حدیث کا جاننا تعلیم کے لیے دوسرا قدم سمجھا گیا۔ چنانچہ عرب کی سرزمین پر مسلمانوں کا پہلا اسکول (مدرسہ) 670 عیسوی میں قائم ہوا۔ اور پھر دنیا میں جہاں جہاں مسلمان پہنچے وہاں وہاں انھوں نے مدرسے قائم کیے۔ ابتدائی دور کے مسلم حکمرانوں میں قرآن کی تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے مدرسوں کی بنیاد رکھنے اور مسجدیں تعمیر کرنے کا شدید جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ہندستان سے پہلا اسلامی رابطہ وہ تھا جو 711ء میں محمد بن قاسم کے آنے پر سندھ اور ملتان میں پیدا ہوا مگر یہ رابطہ زیادہ بااثر ثابت نہیں ہوا۔

اس لحاظ سے محمود غزنوی وہ پہلا مسلمان فاتح ہے کہ اُس کے متعدد حملوں کے نتیجے میں اسلامی تعلیم، تہذیب و تمدن نے گہرے اثرات ہندستان پر چھوڑے اور جب اُس نے 1026ء میں پنجاب کے علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور غیر ملکی مسلمان مستقل طور پر پنجاب میں بس گئے تو اسلامی علم و ادب کے نقوش بھی گہرے ہونے لگے۔ محمود کو علم و ادب سے کافی لگاؤ تھا۔ اُس کے دربار میں اس وقت کی دنیا کے مانے ہوئے اسکالر موجود تھے۔ محمود کے بیٹے (40-1030ء) مسعود نے بھی بہت حد تک اپنے باپ کی علمی و ادبی روایات کو برقرار رکھا۔ اُس نے اپنی حدود سلطنت میں عوام کے لیے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے۔ عربی اور فارسی کے علمی ذخیرے کو بڑھانے کی خاطر اس کے عہد میں سنسکرت اور یونانی زبان سے بھی خاصا کام لیا گیا۔

غزنوی خاندان دو سو برس تک حکمراں رہا اور جب غزنوی حکمرانوں نے اپنی مرکزیت کو غزنی سے لاہور منتقل کردیا تو پھر اسلامی تعلیم کے پودے نے ہندستان کی سرزمین میں جڑ پکڑ لی۔ لاہور اسلامی کلچر کا مرکز بن گیا۔ غوری خاندان کے حکمرانوں کا بہت تھوڑے عرصے (1210-1206ء) ہندستان سے تعلق رہا اور اس خاندان کا صرف یہ کارنامہ قابل ذکر ہے کہ محمد غوری نے اسلامی تعلیم کا ایک بڑا مدرسہ اجمیر میں قائم کیا۔ غلام خاندان کا بانی قطب الدین ایبک ایک [illegible] پہلا حکمراں تھا۔ اس نے دہلی اور دہلی کے قرب و جوار میں بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں اور ہر مسجد میں ایک مکتب قائم کیا جہاں قرآن پاک پڑھایا

جاتا تھا۔ قطب الدین کے عہد میں لاہور کے بعد دلی بھی اسلامی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ سلطان التمش (1211ء۔1236ء) نے بھی بدایوں میں مدرسہ معزی کے نام سے اسلامی تعلیم کا ایک بہت بڑا مرکز قائم کیا۔ سلطان ناصر الدین (1246ء۔1266ء) خود قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور قرآن لکھنے ہاتھ سے کتابت کرنے کا بڑا ذوق رکھتا تھا۔ اُس نے بھی دہلی میں مدرسہ ناصریہ قائم کیا اور جالندھر میں بھی ایک اسلامی مکتب کی بنیاد رکھی۔ مسلم حکمرانوں میں شاید بلبن وہ پہلا حکمراں ہے جس نے سب سے پہلے مختلف علوم کی سرپرستی کی۔ وہ عالموں کی بھی انتہائی قدر کرتا تھا۔ اُن سے ملنے کے لیے خود اُن کے گھر جاتا تھا۔ اُس نے جو مدرسے قائم کیے تھے اُن میں گرامر، ادب، منطق، شریعت، فقہ اور تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بلبن کے عہد میں دینی تعلیم کا جو نصاب تیار ہوا وہ دو سو برس تک (15ویں صدی کے اختتام تک) ہندستان میں قائم رہا۔ خلجی خاندان میں علاء الدین خلجی کی بہ نسبت سلطان جلال الدین خلجی زیادہ علم نواز حکمراں تھا۔ تغلق عہد میں اگرچہ غیاث الدین تغلق نے عالموں کو کافی نوازا مگر محمد تغلق خود ایک بہت بڑا اسکالر تھا۔ وہ کلاسیکی فارسی، تاریخ اسلام، فلسفہ، ریاضی اور نجوم کا مستند عالم تھا اور اپنے وقت کا ایک مانا ہوا شاعر تھا اور اس کے ادبی ذوق کی بنا پر دوسرے ممالک کے اسکالر بھی اس کے دربار میں حاضر ہوکر انعامات پاتے تھے۔ مورخ فرشتہ نے فیروز شاہ کی علم نوازی کی بڑی تعریف کی ہے۔ اُس نے پرانے مدرسوں کی مرمت کرائی اور نئے مدرسے تعمیر کرائے۔ اُس نے تقریباً 50 مسجدوں میں مکتب قائم کیے۔ اُس نے نئے مدرسوں کے لیے زمین وقف کی۔ مالی امداد جاری کی۔ طالب علموں اور استادوں کو اُس نے وظیفے بھی دیے اور رہنے کے لیے مکانات تعمیر کرنے کی سہولت بھی عطا کی۔ شہر جون پور کو اس نے تعلیم کا ایک بڑا مرکز بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ 'تغلق عہد' میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے۔

تیمور کے حملے نے ان تعلیمی اداروں کو بُری طرح متاثر کیا اور بہت سے مدرسوں میں کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کچھ دن بعد شاید حفظ ماتقدم کے تحت دہلی کے کئی تعلیمی ادارے دوسرے صوبوں کے مرکزی شہروں میں منتقل ہو گئے اور اس طرح بیجاپور، گول کنڈا، مالوہ، خاندیش، جون پور، ملتان اور بنگال میں بھی تعلیمی مرکز قائم ہو گئے۔ تیمور کے حملے کے نتیجے میں تعلیم کو جو نقصان پہنچا تھا سکندر لودی کے عہد میں اُس کی تلافی ہونے لگی۔ بہت حد تک دینی تعلیم کے نصاب میں بھی تبدیلی ہوئی۔ مدرسوں اور مکتبوں کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اپنے مکانوں پر تعلیم دینے لگے جو شوقیہ طور پر علم و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ چند طالب علم اُن سے رجوع ہوتے اور وہ اپنے دیوان خانے میں اکثر و بیشتر درس دیتے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن دنوں عربی ایک اہم زبان مانی جاتی تھی اور کلاسیکی علوم کے حصول کے لیے عربی زبان ہی ذریعہ تعلیم (میڈیم) تھی مگر فارسی زبان بھی ترقی کرنے لگی تھی اور عربی کے ساتھ ساتھ وہ بھی میڈیم کا کام دے رہی تھی۔ محمد تغلق کو تو فارسی کے بہت سے اشعار حفظ تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں فارسی کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا اور سکندر لودی کے زمانے میں ہندو فرقے کے شرفاء فارسی کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور انھوں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کی اور اس سلسلے میں سکندر لودی کے زمانے کی یہ خصوصیت ہے کہ اس زمانے میں کئی ہندستانی زبانیں فارسی رسم خط میں لکھی جانے لگیں اور اسی زمانے میں باقاعدہ فارسی ادب کا نصاب تیار کیا گیا۔ اور علم موسیقی کی تعلیم بھی کورس میں شامل ہو گئی۔ علم موسیقی کو شاہی دربار کی سرپرستی حاصل ہونے لگی اور صوبائی حکمرانوں نے بھی موسیقی کی تعلیم جاری کی۔ دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان طالب علم کے لیے طب کا مضمون لینا بھی لازمی تھا۔ اسی زمانے میں مباحثوں، مناظروں اور تبادلۂ خیالات کے لیے اجتماعوں کی بنیاد پڑی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اُن دنوں اگرچہ تعلیم مفت تھی مگر استاد بننے کے لیے شاہی دربار سے اجازت نامہ لینا پڑتا تھا۔ دہلی کے سلطانوں کے عہد میں مکتبوں اور مدرسوں کی تعلیم کافی ترقی کر چکی تھی۔ ہر مسجد اور ہر خانقاہ میں ایک مکتب موجود تھا اور ان مکتبوں کے ساتھ ساتھ صرف شہر دہلی میں بھی 2 ہزار مدرسے قائم تھے یعنی دہلی میں کئی ہزار مدرسے موجود تھے۔

مُغل عہد میں

جب مغل حکمراں ہندستان میں وارد ہوئے تو ہندستان میں بہت سے مسلم مکتب اور مدرسے موجود تھے اور تعلیم جاری تھی۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ مغل جو ہندستان کے ابتدائی مسلم حکمرانوں کی بہ نسبت ذہنی طور پر زیادہ ترقی پسند اور روشن خیال تھے مسلمانوں (یا عام رعایا) کی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ پرائمری اور سیکنڈری سطح کے جو مکتب و مدرسے جس طرح چل رہے تھے وہ اسی طرح جاری رہے۔ مغل بادشاہوں نے ان کو کوئی ترقی نہیں دی اور

نہ اپنے شاہی خزانے ہی سے اِن تعلیمی اداروں کے لیے کوئی رقم مخصوص کی۔ البتہ ایسے مسلمان عالم جو مغل دربار سے وابستہ تھے کبھی کبھی کسی مکتب یا مدرسے کو ذاتی طور پر مالی امداد دے دیتے تھے۔

مغلوں کے عہد میں فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور عربی صرف مکتب و منبر تک محدود ہو کر رہ گئی اور صرف مذہبی تقریبوں ہی میں عربی کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ عہدِ مغلیہ میں دو طرح کے تعلیمی ادارے ہوتے تھے یعنی مکتب اور مدرسہ جیسے آج کل اسکول اور کالج۔ ہر بڑے شہر کے ہر مسلمان محلے میں ایک مکتب ضرور ہوتا تھا جو محلے کی مسجد سے ملحق ہوتا تھا۔ مسجد کے مکتب کے استاد کی ماہانہ تنخواہ مقرر ہوتی تھی جو مسجد کے خرچ کے لیے اہلِ محلہ جو فنڈ قائم کرتے تھے اُس سے ادا کی جاتی تھی یا پھر مکتب میں تعلیم پانے والے بچّوں کے والدین نذرانے کی صورت میں مکتب کے استاد کو وقتاً فوقتاً پیش کرتے تھے وہی اُس کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا تھا۔ محلے کا بعض مسلمان رئیس بھی اپنے مکان پر مکتب قائم کرتا تھا جس میں محلے کے اونچے طبقے کے شرفا کے بچے تعلیم پاتے تھے۔ ایسے مکتب میں بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی مکتب کا خرچ بانیٔ مکتب ہی کے ذمّے ہوتا تھا۔ مسجد یا کسی رئیس کے مکان سے تعلق رکھنے والے ایسے مکتبوں میں قرآن شریف (حفظ و ناظرہ) پڑھایا جاتا تھا، فارسی کی ابتدائی ایک دو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور تختی لکھنا سکھائی جاتی تھی۔ اخلاق و آداب اور آدابِ مجلسی سکھانے پر بھی زور دیا جاتا تھا اور ہر طالب علم کو صوم و صلوٰۃ کا پابند بنایا جاتا تھا۔ مکتب کے جس طالب علم کو مزید تعلیم حاصل کرنی ہوتی تھی وہ مدرسے میں داخلہ لیتا تھا۔ مدرسے کا نصاب عموماً اخلاقیات، دینیات، ریاضی، طب، منطق، تاریخ، تفسیر، عربی و فارسی کی نظم و نثر پر مشتمل ہوتا تھا۔ بعض اوقات کسی مخصوص علم یا فن کے استاد سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو شہر در شہر بھٹکنا پڑتا تھا۔

بابر جب ہندستان میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا تو اُن دنوں ہندستان میں کئی تعلیمی مرکز موجود تھے اور ہر مسجد میں ایک مکتب جاری تھا اور رئیس لوگوں کے گھر میں اپنے مکتب تھے۔ بابر تعلیم یافتہ تھا، فارسی اور ترکی زبان کا شاعر تھا اُس کے کئی مصاحب بھی پڑھے لکھے تھے مگر بابر کو اپنی جنگی مصروفیات سے اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ وہ اپنی رعایا کی تعلیم کے لیے کوئی توجہ دے پاتا۔ بابر کا بیٹا ہمایوں بھی ایک اسکالر تھا۔ عربی، فارسی، ریاضی، نجوم اور جغرافیے کی تعلیم پائے ہوئے تھا اُس نے اپنے عہد میں دہلی میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا جو عالموں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ آگرے میں بھی چند امرا نے ہمایوں کی اجازت سے ایک مدرسہ کھولا اور ہمایوں کے انتقال کے بعد بھی دہلی میں اس کے مقبرے میں ایک مدرسہ قائم ہوا جو بہت دنوں تک جاری رہا۔ شیر شاہ بھی عالم تھا اور اس کو تاریخ اور شعری کتب کے مطالعے کا کافی شوق تھا۔ اس کے عہد میں (1520ء) بھی نارنول میں (بہار اور جون پور کے درمیان) ایک بڑا مدرسہ قائم کیا گیا۔ اگرچہ اکبر خود پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اُس نے دوسروں کی تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس کے حکم سے آگرے کی شاہی لائبریری کے لیے قدیم سنسکرت ادب کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ خطاطی کے فن کو بھی اُس کے عہد میں فروغ حاصل ہوا اور اس کی زندگی ہی میں آگرے کی شاہی لائبریری تقریباً ڈھائی ہزار مخطوطات پر مشتمل ہو گئی۔ اُسی کی ایما پر اُس کے وزیر مالیات راجا ٹوڈرمل نے فارسی کو دفتری زبان قرار دیا۔ اکبر کے عہد میں مدرسوں کا نصاب عموماً دینیات، ریاضی، جیومیٹری، زراعت، نجوم، قیافہ، اقتصادیات، سوکس، منطق اور طب پر مشتمل ہوتا تھا۔ تاریخ بھی ایک اہم مضمون تھا۔ سنسکرت کے طالب علم کو سنسکرت کی گرامر (دیا کرن)، فلسفہ (ویدانت) اور لوگ ازم (پاتن جلی) کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندو طالب علموں کے لیے الگ مدرسے نہیں تھے اُن کو انہی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی۔ جہاں گیر مطالعے کا بڑا شوقین تھا سفر پر جب روانہ ہوتا تھا تو اپنی مخصوص لائبریری اپنے ساتھ رکھتا تھا ترکی زبان سے وہ خوب واقف تھا، ترکی ہی میں اس نے (بیشتر وردو موزخوں کی مدد سے) اپنی تزک لکھی تھی لیکن بعد میں اس نے فارسی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ جہاں گیر نے نباتیات اور حیوانیات کے علم سے بھی خود کافی دلچسپی لی۔ مگر اس نے دوسروں کی تعلیم کے لیے کوئی اہم قدم نہیں اٹھایا بس اتنا کیا کہ اپنے ایک فرمان کے ذریعے اُن جائے دادوں پر قبضہ کر لیا کہ جن کا کوئی وارث پیدا نہیں ہوا اُن جائے دادوں کی آمدنی سے اُن شکستہ و خستہ مکتبوں و مدرسوں کی مرمت کرا دی گئی جو پچھلے پچیس تیس برس سے بُری حالت میں برائے نام جاری تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مغل بادشاہوں میں اورنگ زیب سب سے زیادہ 'تعلیم یافتہ' تھا۔ وہ ترکی زبان جانتا تھا اور فارسی اور عربی کا عالم تھا۔ حافظِ قرآن تھا اور بہت اچھا خوش نویس تھا مگر متعصب تھا اس لیے اس نے دوسروں کو بھی اسلامی نظریے ہی کے تحت اسلامی تعلیم دینے کی کوشش کی۔ اُس نے اسلامی مکتبوں کی زیادہ ہمت افزائی کی اور خود بھی بہت سے مکتب اور مدرسے قائم

کیے۔ لکھنؤ میں جب ایک فرانسیسی تاجر کی کوٹھی ایک مسلمان عالم کو اورنگ زیب نے بخشی، تو یہ بات ملحوظ رکھی گئی تھی کہ وہ عالم ایک دینی مدرسہ قائم کریں گے اور در حقیقت بعد میں وہ کوٹھی (فرنگی محل) دینی علوم کا ایک مرکز ثابت ہوئی۔ دینی علوم کے ماہرین اور اساتذہ کو اُن کی اعلا کارکردگی اور خدمات کے صلے میں اورنگ زیب کی جانب سے اکثر انعام و اکرام ملتے تھے۔ بہت سے مدرسوں کو جاگیریں بخش دی گئی تھیں۔ گجرات میں اس نے بوہرہ برادری کی تعلیم کے سلسلے میں بھی کافی دل چسپی لی اور پھر سیال کوٹ کو اسلامی تعلیم کا مرکز بنایا۔ اورنگ زیب کے بعد تعلیم کا بھی زوال شروع ہو گیا۔

جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ترک اور افغان حکم رانوں کا عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں کیا رویہ رہا۔ البتہ مغلوں کے عہد میں تعلیم نسواں کا مطلب یہی تھا کہ لڑکی قرآن پڑھ لے اور امور خانداری سے واقف ہو جائے۔ شاہی خواتین یا امرا کی لڑکیاں کبھی کبھی مزید تعلیم حاصل کرتی تھیں، ظاہر ہے مکتب یا مدرسے میں نہیں بل کہ گھر ہی میں پردے میں اور ٹیوشن کی صورت میں ــ مگر عام طور پر نچلے، متوسط اور اونچے طبقے کی مسلمان عورتوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا۔

ہندستان میں مسلمان حکم رانوں کی 12 سو سالہ (حضرت عمرؓ کے عہد یعنی 15 ہجری سے 1274 ہجری تک مطابق 636ء سے 1857ء تک) دور میں طریقِ تعلیم برہمنوں کے دور سے تو ضرور بہتر رہا مگر پھر بھی مسلمان بادشاہوں نے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی اتنی کوشش نہیں کی جتنا کہ اسلام کا تقاضا تھا۔ اور نہ مسلمان بادشاہوں کا اختیار کیا ہوا تعلیمی سسٹم ہی ایسا تھا جو تعلیم پانے والے کو عملی انسان بننے میں مدد دیتا۔ دراصل مسلم حاکموں نے تعلیم کے سلسلے میں اپنی پسند اور ضرورت کو ملحوظ رکھا۔ ہندستانی رعایا کے مزاج اور اس کی روایات کی کوئی پروا نہیں کی۔ وجہ یہ ہے کہ ہندستان کے کسی بھی مسلم حاکم نے خلیفہ بن کر حکومت نہیں کی بل کہ ہر ایک نے مطلق العنان حکم ران بن کر بادشاہت کی۔ اسلامی معاشرے میں جتنی مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے بادشاہی نظام میں اتنا ہی ادنا و اعلا کا فرق لازمی ہے۔ بادشاہت کے لیے معاشرے کو مختلف طبقوں میں بٹا رہنا انتہائی ضروری ہے۔ چناں چہ پہلا مسلم فاتح محمد بن قاسم ہی جب ہندستان میں آیا تو اپنے ساتھ (غیر اسلامی) اونچ نیچ کا فرق بھی لایا۔ چناں چہ مسلم حکومت کے ہر عہد میں شیخ، سید، مغل، پٹھان اعلا ذاتیں سمجھی گئیں اور نائی، جلاہا، دھوبی اور بہشتی کو نیچ ذات یا کمین کہہ کر پکارا گیا۔ چناں چہ ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب 'فتوا جہاں داری' میں یہ واضح کیا ہے:

'ان کم ذات اور دوسرے طبقوں سے تعلق رکھنے والے غیر مسلمانوں کے لیے سیکولر اور اعلا مذہبی تعلیم کا دروازہ بند تھا۔ صرف ابتدائی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔' حد یہ ہے کہ اس سلسلے میں اکبر جیسے سیکولر مزاج کے بادشاہ کا بھی غیر سیکولر نظریہ تھا۔ ابو الفضل نے 'دربار اکبری' میں اکبر کے قول کا اس طرح ذکر کیا ہے: 'عام طبقوں میں تعلیم کی توسیع و اشاعت سماج اور ملک کے لیے باعثِ فساد اور نقضِ امن ہے۔' ذات کی ادنا اور اعلا تفریق اُلتمش اور بلبن کے عہد میں بھی عملی طور پر موجود تھی۔ انتہا یہ کہ اُس وقت کے سید اشرف جہاں گیر نام کے ایک صوفی نے ایک سلسلے میں بلبن کو ایک خط لکھا اور اپنے اُس خط میں انھوں نے بادشاہ کے اس عمل کو خوب سراہا کہ بادشاہ معاشرے کے طبقوں میں اونچ نیچ کو ملحوظ رکھتا ہے یہی نہیں بل کہ اس بدعت کو برقرار رکھنے کے حق میں مولوی ملّا اونچے طبقے کی وکالت کرتے ہوئے قرآن کی آیات دلیل بھی پیش کیا کرتے تھے اور فتوے دیا کرتے تھے۔ چناں چہ کبیر جو جلاہے تھے اُسی مسلم معاشرے کے خلاف بطور احتجاج کھڑے ہوئے تھے جس میں اونچ نیچ کا نمایاں فرق موجود تھا۔ چوں کہ پنڈت اور ملّا، دونوں اپنے اپنے فرقے کے 'اونچے طبقے' سے تعلق رکھتے تھے اس لیے دونوں نے کبیر کو اپنا دشمن سمجھا۔ وہ کبیر کو مصلحتاً معاشرے میں اصلاح چاہنے والا تو نہ کہہ سکے البتہ انھوں نے کبیر کو اسلام اور ہندو دھرم کا مخالف کہہ کر بدنام کیا۔ پنڈتوں نے انھیں مسلمان کہہ کر ہندوؤں کو اُن کا مخالف بنایا اور ملّاؤں نے انھیں ہندو کہہ کر مسلمانوں کو اُن کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی اور اس طرح راجا اور رعایا دونوں کو کبیر کا دشمن بنا دیا تا کہ سماج میں طبقے واری اونچ نیچ برقرار رہے۔ کبیر نے مسلمانوں کے غیر اسلامی معاشرے اور جاگیردارانہ نظام پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی مگر افسوس کہ ہندو پنڈتوں اور مسلمان ملّاؤں کی سازش سے کبیر کی تحریک ناکام ہو گئی۔

غرض کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں عوام کو تعلیم کے بہتر مواقع حاصل نہیں تھے۔ اُن کی رسائی صرف مسجد کے مکتبوں تک تھی۔ جاگیرداروں، منصب داروں اور شرفا کے قائم کیے ہوئے مدرسوں میں اُن کا داخلہ ممکن نہ تھا۔ تاریخ میں جن کتب خانوں اور لائبریریوں کا ذکر آتا

ہے ۔ اُن سے صرف امراء ہی استفادہ حاصل کرسکتے تھے عوام نہیں ۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں

مسلمان بادشاہوں نے اپنے خزانے سے عموماً اسی زبان یا علم کی سرپرستی کی جو اُن کی مادری زبان تھی یا جو زبان و علم وہ اپنے ساتھ لائے ۔ مگر اس سلسلے میں مسلمانوں کے برخلاف انگریزوں نے زیادہ فراخ دلی، روشن خیالی، دُوربینی اور سیر چشمی کا ثبوت دیا ۔ انگریزوں نے ہندستان کی ساری رائج وقت زبانوں کو بیک وقت پنپنے کا موقع دیا اور ساتھ میں اپنی انگریزی زبان کو بھی ۔

اگرچہ 1600ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوزیشن مستحکم ہوچکی تھی مگر اُس نے آئندہ ایک صدی تک ہندستان میں تعلیم کے سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں لی ۔ اس نے ہندستان کے تعلیمی نظام کو اُس کی اپنی حالت میں رہنے دیا ۔ 1698ء کے چارٹر کی رو سے کمپنی کو اپنے یورپی ملازمین کے بچوں کی تعلیم کی ذمّے داری لینا پڑی ۔ 1813ء کے چارٹر ایکٹ کے زور دینے پر آخر کمپنی نے ہندستانیوں کی تعلیم کا انتظام بھی اپنے ذمے لینا قبول کرلیا اور عیسائی مشنریوں کو بھی علم کی روشنی پھیلانے کی اجازت دے دی ۔ ہندستان میں برٹش راج کے تحت تعلیم کی یہ ابتدا تھی ۔ 18ویں صدی میں جو سیاسی تبدیلیاں ہندستان میں رونما ہوئیں اُن سے ہندستان کے اسلامی مکتب اور مدرسے بری طرح متاثر ہوئے ۔ چونکہ ان تعلیمی اداروں کے بانی یا سرپرست اپنے اختیارات کھو چکے تھے اس لیے وہ اس پوزیشن میں نہیں رہے تھے کہ وہ اِن اداروں کے اخراجات برداشت کرسکیں ۔ لیکن اس سلسلے میں وارن ہیسٹنگز وہ پہلا انگریز حاکم تھا جو ہندستانیوں کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور بحیثیت ایک حاکم اُس نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا ۔ ایک انگریز عیسائی ہونے کے باوجود وارن ہیسٹنگز نے 1781ء میں مسلمانوں کے لیے کلکتے میں ایک بہت بڑا مدرسہ قائم کیا ۔ اپنی جیب سے 5 ہزار 691 روپے خرچ کرکے اس نے مدرسے کے لیے زمین بھی خریدی اور ایک برس تک اس نے مدرسے کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کیے ۔ وارن ہیسٹنگز عربی اور اسلامی قانون کی تعلیم جاری رکھنا چاہتا تھا تاکہ مسلمان سرکاری دفتروں اور عدالتوں کا کام سنبھالے رہیں ۔ دوسرے دور میں تعلیم کے سلسلے میں دو نظریے پیدا ہو گئے ۔ میکالے کے خیال میں ہندستانیوں کے لیے نہ صرف انگریزی زبان بلکہ مغربی تہذیب بھی بہت ضروری تھی تاکہ "ہندستانی چاہے اپنے رنگ و خون سے ہندستانی رہے مگر اپنے نظریے، اپنے مذاق اور اپنی سوجھ بوجھ سے وہ انگریز بن جائے !" میکالے جہاں انگریزی زبان و تہذیب کے ذریعے ہندستان میں عیسائیت کی تبلیغ چاہتا تھا وہاں اس کو اپنے دفتروں کے لیے بابوؤں کی بھی ضرورت تھی ۔ مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جو پرانے کارکن تھے اس سلسلے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہندستانیوں کے لیے اب نہ صرف خالص مشرقی کلچر موزوں رہے گا اور نہ قطعی طور پر مغربی کلچر ۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے تعلیم کا نصاب تیار کیا جائے ۔ لارڈ ہیسٹنگز فارسی زبان کا طرف دار تھا اُس نے مشنریوں کو چھوٹے چھوٹے اسکول کھولنے میں مدد دی اور اُن اسکولوں میں فارسی کے چلن کو برقرار رکھا ۔ 1822ء کے دنوں میں منرو نے بھی تعلیم کی طرف توجہ دی اور کافی خرچ برداشت کیا ۔ اَل فنسٹن نے ورناکیولر تعلیم کے لیے ایک کمیٹی قائم کی اور تعلیم کے فروغ کے لیے کئی کام کیے ۔ 1835ء میں انگریزوں کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ فارسی ہی کو ذریعۂ تعلیم رکھا جائے یا انگریزی زبان کو میڈیم بنایا جائے ۔ میکالے نے اپنی فروری 1835ء کی تجویز میں انگریزی کے حق میں اپنا فیصلہ دیا اور پھر 7 مارچ 1835ء سے انگریزی سرکاری اور ادبی زبان قرار دی گئی ۔ میکالے کے ساتھ ساتھ بنٹنک اور مٹکاف بھی انگریزی زبان کی حمایت میں بولے ۔ 1837ء تک فارسی صوبوں کی بھی سرکاری زبان نہ رہی بلکہ فارسی کی جگہ صوبائی زبانوں میں دفتروں میں کام ہونے لگا ۔

1854ء سے سر چارلس وُوڈ کی کوشش سے تعلیمی نظام مغربی رنگ میں رنگا جانے لگا ۔ اوپر کے درجوں میں ادب، فلسفہ اور تاریخ وغیرہ جیسے مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جانے لگے ۔ سر چارلس نے ہر ایک پریسی ڈنسی میں ایک ایک یونی ورسٹی قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کی ۔ اس نے بڑی تعداد میں اسکول، کالج، ٹیکنی کل اسکول، سیکنڈری اور پرائمری اسکول کھولنے پر زور دیا اور ان اسکولوں کے لیے اُس نے ورناکیولر میڈیم تجویز کیا ۔ سر چارلس کی یہ بھی تجویز تھی کہ ہر پریسی ڈنسی میں لفٹی نینٹ گورنر کے تحت ایک محکمۂ تعلیم الگ ہو ۔ وہ مسلمانوں کے لئے اور خصوصی طور پر مسلمان عورتوں

کے لیے تعلیم کا بڑا خواہاں تھا وہ چاہتا تھا کہ تعلیم کے سلسلے میں مذہبی تعصب کو درمیان میں نہ لایا جائے بلکہ غیر جانبدار رہا جائے۔ لارڈ ڈل ہوزی نے سرچارلس کی تعلیمی تجویزوں کو بہت حد تک عملی جامہ پہنایا اور 1857ء تک کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونی ورسٹیاں بھی قائم ہو گئیں۔
لارڈ مایو جو 1869ء میں وائسرائے مقرر ہوا تعلیم سے بڑا شغف رکھتا تھا مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ تعلیم کا خواہاں تھا اس نے صوبائی حکومتوں کو زور دیا تھا کہ مسلمان چونکہ تعلیم میں دوسروں سے پچھڑ گئے ہیں اس لیے اُن کو تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ 1882ء میں لارڈ رپن نے ایک کمیشن مقرر کیا [illegible] کے صدر ولیم ہنٹر تھے۔ اس کمیشن نے 200 صفحات پر سفارشات پیش کیں۔ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے تحت پرائمری تعلیم تعلیم نسواں اور مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو سفارشات تھیں وہ بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ ہنٹر کمیشن کے نتیجے میں صرف 20 برس (1880-1900ء) کے عرصے میں پرائیوٹ اسکولوں اور کالجوں کی صورت میں تعلیم نے بڑی ترقی کی اور مغربی تعلیم ہندوستان میں خاصی مقبول ہونے لگی۔
انگریز حاکموں کی حوصلہ افزائی سے اپنے پڑوسیوں سے پچھڑے ہوئے مسلمانوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سلسلے میں نواب عبداللطیف، سید امیر علی، بدرالدین طیب جی، مولوی چراغ علی (نواب اعظم یار جنگ) اور سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی راہ نمائی کی۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ اتنا زیادہ اور واضح ہے کہ اُس کے تعارف کی یہاں ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کی انجمن پنجاب اور انجمن حمایت اسلام کے تحت پنجاب میں، محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے بنگال میں اور انجمن اسلام کے تحت بمبئی میں جدید تعلیم کی کافی اشاعت ہوئی۔ انہی تعلیمی انجمنوں سے تحریک پاکر پشاور اور کلکتے میں اسلامیہ کالج، مدراس میں محمڈن کالج، دہلی میں اینگلو عربک کالج اور امرت سر میں ایم اے او کالج قائم ہوا۔ غرض کہ 19 صدی کے وسط تک پنجاب، یوپی، وسط ہند، برار، اجمیر اور بلوچستان میں مسلم اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال سا پھیل گیا۔ 1901ء میں شملہ میں لارڈ کرزن نے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کی کانفرنس طلب کی۔ اس کانفرنس کے نتیجے میں تعلیم کا شعبہ وزراء کے سپرد کر دیا گیا۔ 1902ء میں یونی ورسٹی کمیشن قائم ہوا۔ 1904ء میں انڈین یونی ورسٹیز ایکٹ بن گیا۔ 1913ء میں اس ایکٹ میں ترمیم ہوئی۔ اس سے اسکولوں اور کالجوں پر یونی ورسٹیوں کا کنٹرول بڑھ گیا۔ یونی ورسٹی تعلیم و نظام میں مزید اصلاح کی غرض سے 1917ء میں ڈاکٹر سیڈلر کے تحت ایک اور کمیشن مقرر کیا گیا۔ یونی ورسٹی تعلیم و نظام کی طرف بار بار توجہ دینے کا نتیجہ خاصا خوش گوار رہا۔ 1857ء میں صرف تین یونی ورسٹیاں (کلکتہ، بمبئی اور مدراس) قائم ہوئی تھیں۔ 1857ء سے 1915ء تک صرف دو ہی یونی ورسٹیاں (پنجاب اور الٰہ آباد) قائم ہو پائیں۔ مگر 1916ء سے 1929ء تک یعنی صرف 13 برس کی قلیل مدت میں مزید 13 یونی ورسٹیاں وجود میں آ گئیں۔
مسلم بادشاہوں کے عہد میں مسلمان عورتوں کی تعلیم پر کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ کسی ملّا یا ملّانی کے ذریعے مسلمان لڑکیوں کے لیے صرف قرآن ہی کی تعلیم (ناظرہ) کافی سمجھی گئی۔ مسلمان عورتوں کو بھی تعلیم کی ترغیب انگریزوں ہی نے دی۔ شیخ عبداللہ اور اُن کی بیگم نے مسلم لڑکیوں کے لیے علی گڑھ میں 1906ء میں ایک کالج کی بنیاد رکھی اور جب اس مسلم ویمنس کالج کا ہوسٹل تیار ہونے لگا تو رجعت پسند مسلمان مردوں نے اس کی زبردست مخالفت کی مگر یوپی کے گورنر نے کالج اور ہوسٹل کی تعمیر میں ذاتی طور پر دل چسپی لی اور اپنی جیب سے بلڈنگ فنڈ میں ایک بڑی رقم چندے کے طور پر دی اور ہوسٹل کی تعمیر میں بھی مدد دی۔ بنگال میں سب سے پہلے بیگم سخاوت حسین نے مسلمان لڑکیوں کے لیے 1913ء میں ایک ہائی اسکول قائم کیا۔ دوسرا گرلس اسکول 1913ء میں خجستہ اختر بانو سہروردی بیگم نے کلکتے میں کھولا۔ اودھ کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے والی شمسیہ بیگم نے بھی انہی دنوں مٹیا برج میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔
ہندوستان کے اکثر قومی راہ نماؤں نے انگریزی تعلیم کو ہندوستانیوں کے لیے ناقص، بے میل، بے جوڑ، غیر فطری اور مہلک قرار دیا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر فاتح قوم کی طرح (جیسا کہ مسلمان فاتحوں نے کیا تھا سنسکرت و ہندی کے دیش پر ترکی عربی فارسی جیسی بدیشی زبانیں مسلط کیں) انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اپنے مقصد کے لیے انگریزی رائج کی مگر اس زبان نے ہندوستانیوں کو بے پناہ فائدہ پہنچایا۔ انگریزی اور انگریزی تہذیب ہی نے ہندوستانیوں کو آزادی اور جمہوریت کا تصور عطا کیا۔ ہندوستان کی کسی بھی زبان (باہر سے آئی ہوئی ترکی، عربی، فارسی وغیرہ بھی) کا مزاج جمہوری یا سیکولر کبھی نہیں رہا۔ اردو تو قطعی طور پر غیر سیکولر، غیر جمہوری اور جاگیردارانہ مزاج کی حامل زبان ہے۔ غیر انگریزی داں طبقے نے ایک عرصے تک آتی ہوئی آزادی کو روکا ہے۔ ترقی پسند رجحان پر پابندی لگائی ہے اور نئے علوم کے لیے اپنے دروازے بند رکھے ہیں جب کہ سائنس، حکمت، صنعت

چیز

وحرفت اور مغرب کے دیگر جدید علوم انگریزی زبان ہی کے ذریعے ہندستان میں آئے۔ قدیم علوم کی مدد سے ہندستان کی بقاء ممکن نہ تھی۔ فی الحقیقت عورت کو انسانیت کا مرتبہ نہیں دیا۔ تب کہ انگریز نے اپنی زبان انگریزی ہی کی قوت پر ہندستانی عورت کو اور خصوصی طور پر مسلمان عورت کو انسان ہونے کا احساس دلایا۔ آج بھی مسلمانوں کا جو طبقہ شریعت کے نام پر عورت کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے، وہ بیشتر انگریزی کے خلاف ہی ہے۔ "قومی درد کا پورا کی تربیت کا اثر" کے عنوان سے ایک بار مسز اینی بیسنٹ نے اعتراف کیا تھا: "گزشتہ صدی کے آخری ایام کے ہندستانی بچوں اور لڑکوں کی یہ کیفیت تھی کہ وہ نہایت خاموش، اطاعت شعار اور کھیلوں سے تنفر تھے۔ لیکن مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور سنٹرل ہندو کالج بنارس میں ایسے نمونے تیار کئے گئے جو صاف گو، دلیر، شجاع، مہذب، ملک سے محبت اور اس پر ناز کرنے والے ہیں۔ علی گڑھ اور بنارس کے لڑکوں پر ہر کسی کو ناز ہونا چاہیے۔ یہ ملک کی امید و قوت ہیں۔ وہ بہادر ہیں بلا خلل کہ طاقت ور ہیں بلا گستاخی کے، مذہبی ہیں بلا تعصب کے، اور خلیق ہیں بلا غلامی کے"۔ البتہ انگریزوں نے ہندستانیوں کو انگریزی پڑھا کر اپنا نوکر ضرور بنایا اگر انھوں نے انگریزی تعلیم نہ دی ہوتی تو وہ آج بھی ہندستان کے آقا ہوتے۔

مدرسے

ہندستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں مدرسوں کی ابتدا ہوئی۔ مدرسوں میں دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور دنیاوی بھی۔ ان مدرسوں میں جو عام کورس کے بعد دینیات و فقہ وغیرہ کا کورس بھی کر لیتے وہ عالم کہلاتے۔ فارغ التحصیل ہو جانے پر حکومت کی جانب سے اُن کو کوئی مذہبی عہدہ دے دیا جاتا یا وہ قاضی بنا دیے جاتے۔ ورنہ وہ پھر کسی مکتب یا مدرسے ہی میں ملازم ہو کر درس دینے لگتے۔ مسلم دور حکومت کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی آمد پر جب مشنری اسکول قائم ہونے لگے تب بھی مسلمانوں کے یہ مدرسے متاثر نہیں ہوئے۔ البتہ 1857ء کے بعد چند برس تک مدرسوں کے وجود کو ضرور خطرہ لاحق رہا مگر انگریزوں کی نفرت میں مسلمانوں کا مذہبی جذبہ جب اور زیادہ بیدار ہوا تو مدرسوں کی مقبولیت پھر بڑھنے لگی یہاں تک کہ دیوبند میں دار العلوم (1865ء) قائم ہونے کے بعد کے صرف 34 برس میں اتر پردیش اور بہار میں 30 مدرسے قائم ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انگریزی حکومت اِن مدرسوں کے کھلنے پھولنے میں رکاوٹ نہیں بنی۔ حصول آزادی کے بعد کے عہد کو اگرچہ مولوی مُلّا "بے دین کا عہد" کہہ کر بدنام کرتے ہیں مگر اسی عہد کے ان ابتدائی 28 برسوں میں اِن مدرسوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اپنے (مسلم) دورِ حکومت میں بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس وقت سارے ہندستان میں مکتبوں اور مدرسوں کا جال سا پھیلا ہوا ہے۔ ہندستان میں مکتبوں اور مدرسوں کی کل تعداد کتنی ہے؟ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف دو ریاستوں (اتر پردیش اور بہار) میں ان دنوں 500 مدرسے جاری ہیں۔

ہندستان کے مسلمان مختلف مذہبی مسلکوں سے تعلق رکھتے ہیں اسی طرح اُن کے دینی مدرسوں کا نظام و نصاب بھی مختلف مسلکوں پر مبنی ہے لیکن بیشتر حنفی مسلک کے ماننے والے ہیں۔ ان مدرسوں کی دو اہم قسمیں ہیں۔ ایک مدارس عربیہ تقلیدیہ۔ اس قسم کے مدرسوں کا تعلق مدرسۂ نظامیہ (فرنگی محل لکھنؤ) سے ہے۔ اِن مدرسوں میں علوم عقلیہ کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ رام پور کا مدرسہ عالیہ بھی فرنگی محل ہی کا پیروکار ہے۔ دوسری قسم غیر تقلیدی مدرسوں کی ہے۔ اِن مدرسوں میں دیوبند کے دار العلوم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سہارن پور کا مظاہر علوم اور رانڈیر کا دار العلوم اشرفیہ بھی اسی نظریے سے تعلق رکھتا ہے مگر سرائے میر کے مدرسے اصلاح اور مونگیر کے جامعہ رحمانیہ پر لکھنؤ کے ندوے کا اثر نمایاں ہے اور بریلی کے منظر اسلام اور مظہر اسلام کا تعلق تو بریلوی ہی عقائد سے ہے۔ بنارس اہل حدیث کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ بنارس کے چند دولت مند مسلمانوں نے کئی لاکھ روپے سے چند برس ہوئے ایک بڑے اسلامی جامعہ کی بنیاد رکھی ہے اور اپنے اس عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ آزاد ہندستان میں ہر فرقے کو ہر بات کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اہل تشیع کے دینی و علمی مرکز لکھنؤ اور بنارس سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں ان کے مدرسوں میں مدرسۂ سلطان المدارس، مدرسۂ ناظمیہ اور شیعہ عربی کالج اہم ہیں۔ بنارس کے مدرسۂ ایمانیہ اور مدرسۂ جوادیہ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ جوادیہ نے حصولِ آزادی کے بعد بڑی ترقی کی ہے۔ مدرسے کو ہر اعتبار سے وسعت دی گئی ہے۔ کورس میں فلسفۂ جدید کا اضافہ کیا گیا ہے۔ داؤدی بوہرہ برادری اگرچہ اسماعیلی عقیدے سے تعلق رکھتی ہے مگر اسے شیعوں ہی میں شمار کیا جاتا ہے۔ بوہرہ برادری کا سب سے بڑا مدرسہ سیفیہ ہے جو سورت میں واقع ہے۔ عربی مدرسوں میں اس مدرسے کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے ان دینی مدرسوں کی یہ بات بھی بہت تعجب خیز اور افسوسناک ہے کہ ان کا نصاب عموماً وہی ہے جو اورنگ زیب کے عہد میں تیار ہوا تھا یعنی ملّا نظام الدین (1679ء - 1748ء) کا ترتیب دیا ہوا درسِ نظامیہ ۔ زمین کا انسان چاند تک پہنچ چکا ہے اور انسانی نقطۂ نظر بالکل بدل چکا ہے مگر درسِ نظامیہ وہیں کا وہیں ہے۔ اگرچہ دیوبند کے دارالعلوم نے اپنے نصاب میں تھوڑی سی تبدیلی کی ہے اور تاریخِ اسلام، سیرتِ نبی، عربی ادب، طبِ یونانی اور علم مناظرہ جیسے مضامین کا اضافہ کیا ہے مگر یہ تبدیلی بھی درسِ نظامیہ کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ ندوے کے دارالعلوم (لکھنؤ) نے ابتدا ہی سے یہ کوشش کی کہ نظریات میں انتہا پسندی نہ اپنائے اور دو مختلف نصاب میں امتزاج پیدا کر کے میانہ روی سے کام لے مگر اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ادارے میں بھی تنگ نظری نمایاں ہے۔ ان مدرسوں کے نصاب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق لانے کی کوشش مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کی تھی۔ 1914ء میں انھوں نے کلکتے میں دارالارشاد کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ قرآن شریف کو مستند حدیثوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے، کسی ایک عالم کی مخصوص رائے کے تحت قرآن کی تعلیم کا سلسلہ بند کیا جائے مگر اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ہم عصر علمار نے مولانا سے تعاون نہیں کیا۔ چند برس بعد مولانا نے کلکتے ہی میں مدرسۂ اسلامیہ قائم کر کے دینی نصاب میں پھر اصلاح کی کوشش کی مگر اس بار بھی انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ 1937ء میں کانگریس کی وزارت آنے پر اور پھر 1947ء کے بعد وزیرِ تعلیم ہو جانے پر مولانا آزاد نے چاہا کہ دارالعلوم ندوۃ العلمار (لکھنؤ) اپنے نصاب کو جدید بنانے کا تجربہ کرے اور اس سلسلے میں حکومت اخراجات کی کفیل ہو مگر ندوے کے قدامت پرست علمار نے مولانا آزاد جیسے عالم کی رائے کو بھی ٹھکرا دیا۔ چنانچہ صورتِ حال یہ ہے کہ ان مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا آج کی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ ان مدرسوں کا کوئی طالب علم اردو کی کوئی ایسی غیر درسی کتاب نہیں پڑھ سکتا جو مدرسے کے درس سے حاصل کی ہوئی کسی بات میں شبہ پیدا کر دے۔ دراصل ان دیسی علمار کے تنگ نظر اور کوپ منڈوک بنے رہنے کا سبب ہی یہ ہے کہ یہ بدیسی مستشرقین کی علمی تحقیقوں سے ناواقف ہیں۔

اگرچہ سنٹرل وقف کونسل کے ایک سوال کے جواب میں ہندستان کے چند مدرسوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فارغ شدہ طلبا کے معاش کا سب سے بڑا ذریعہ مذہبی خدمات جیسے درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، امامت، خطابت، تصنیف و تالیف ہوتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں طب کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، خوش نویسی اور ایک دو قسم کی دست کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ فارغ تحصیل طلبا سیکھے ہوئے کسی بھی ایک فن کو اپنا ذریعہ معاش بنا سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں سہارن پور کے مظاہرِ علوم کی جانب سے جو جواب ملا وہ یہ ہے: "دینی تعلیم سے معاش کا حاصل کرنا مقصود نہیں ہے"۔ ـــــ مگر اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ ان اسلامی مدرسوں سے تعلیم پانے کے بعد (بیس پچیس برس کی عمر میں) جب کوئی مسلمان نوجوان باہر آتا ہے تو وہ کسی اسلامی درسے میں مدرس (تنخواہ زیادہ سے زیادہ سو روپے ماہوار) بنتا ہے یا کسی مسجد میں موذن (بانگی) یا امام بن جاتا ہے یا اپنی ہی بستی میں کوئی مکتب قائم کر کے ملّا بن جاتا ہے یا محرم اور عید میلاد کے دنوں میں معاوضہ لے کر بستی بستی جا کر وعظ کرتا ہے۔ کسی اسلامی مدرسے کے فارغ تحصیل نوجوان کی یہ معراج ہوتی ہے (جو ظاہر ہے شاذ و نادر ہی ہوتی ہے) کہ وہ ایک اچھا مصنف یا مؤلف بن جائے۔ ایک دو مثالیں ایسی بھی ہیں کہ بعض فارغ شدہ طالب علم محکمۂ ریڈیو میں عربی کے اناؤنسر بن گئے یا کسی سفارت خانے میں ترجمان مقرر ہوئے مگر یہ سب کچھ کبھی کبھی ہوتا ہے۔ کوئی مولوی ملّا کسی جائز، حلال یا محنت و مشقت سے تعلق رکھنے والے پیشے میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ ہزاروں مولوی ملّا مانگنے کھانے کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں۔ اپنی مسجدوں، اپنے مکتبوں، مدرسوں اور یتیم خانوں کے لیے دولت مند اور تاجر مسلمانوں (شرعی اعتبار سے جن کی دولت کو جائز و حلال نہیں کہا جا سکتا) سے چندے و عطیے (جو خیرات و زکات کی صورت میں دیے جاتے ہیں) لینا اور چندے کی رقم میں سے کمیشن وصول کرنا۔ جاہل مسلمان مرد عورتوں کے ہاتھ تعویز گنڈے فروخت کرنا، دولت مند مسلمانوں کو مرید بنا کر ان سے بیش قیمت نذرانے حاصل کرنا، کرائے پر وعظ کرنا اور معقول معاوضے پر مذہبی مناظروں میں شرکت کرنا مولوی ملّاؤں کا عام پیشہ ہے۔

ہندستان کے مولوی نے اپنے لئے خیرات و زکات کو اس لیے جائز و حلال بنا رکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بھول سے یہ وصیت فرمائی تھی: "کارکنانِ مدرسہ کی ہمیشہ تکثیرِ چندہ پر نظر رہے"۔ یہ بڑا اتفاق ہوا کہ وصیت کرتے وقت حضرت نانوتوی یہ حدیث

بھول گئے "زکات کھانے والے کا قلب سیاہ ہو جاتا ہے!" اور علم نفسیات کے اس نکتے کو بھی وہ فراموش کر گئے کہ دوسروں کی کمائی پر پلنے والے انسان کا کردار مسخ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وصیت نے آج کے مولوی کو اتنا بے حس بنا دیا ہے کہ وہ اپنے مدرسے کی رپورٹ پیش کرتے وقت بڑے فخر سے لکھتا ہے: "الحمدللہ! اس ادارے کا خرچ اہلِ خیر کی دی ہوئی خیرات و زکات سے چلتا ہے!" ــــ دراصل اس سلسلے میں بات ابتدا ہی سے بگڑ جاتی ہے۔ یہ دینی مدرسے اپنے طالب علموں کے قیام و طعام، درسی کتب، علاج، نہانے دھونے اور حجامت وغیرہ کے اخراجات خود برداشت کرتے ہیں۔ جو طالب علم دارِ اقامہ (بورڈنگ ہاؤس) میں جگہ حاصل نہیں کر پاتے وہ بستی کی مسجدوں کے حجروں میں رہنے لگتے ہیں اور مسلمان محلوں کے متمول گھرانوں سے اُن کو دونوں وقت کھانا ملنے لگتا ہے۔ جب بچپن اور جوانی کا کچھ حصہ اس طرح گزر جاتا ہے تو شرم و حیا اور جھجک ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہ طالب علم مولوی بن کر بڑے اطمینان سے خیرات و زکات کی آمدنی پر اپنی ساری زندگی گزار دیتا ہے۔

اِن اسلامی مدرسوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ اپنے فارغ التحصیل طالب علموں کے لیے بے روزگاری کا کوئی حل پیش نہیں کرتے۔ ان مدرسوں کی دی ہوئی عالم و فاضل جیسی کوئی سند ہندستان کی کوئی یونی ورسٹی تسلیم نہیں کرتی۔ دراصل ہندستان کا ہر مدرسہ اپنے بنیادی ہی مقصد میں ناکام ہے۔ وہ اپنے طالب علم کو دنیا گزارنے کا سلیقہ نہیں سکھا پاتا۔ اِن مدرسوں کے سربراہ اس موٹی سی بات کو آج تک نہیں سمجھ سکے کہ پس ماندہ قوم کو ترقی کرنے کے لیے مبلغوں، واعظوں، مصنفوں، اماموں اور سائنگیوں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی ضرورت کہ دست کاروں، صنعت کاروں اور ماہرینِ اقتصادیات کی ہوتی ہے۔ ان مدرسوں سے ہٹ کر دہلی کا جامعہ ملیہ بھی ایک ایسا اسلامی تعلیمی ادارہ ہے کہ جس کا مقصد ہی آج تک واضح نہیں ہو پایا۔ کسی نے کہا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا پڑھا ہوا نوجوان محض دنیادار بن کر رہ جاتا ہے دین سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا اور دارالعلوم دیوبند کا فاضل صرف دین سے تعلق رکھتا ہے اور دنیا کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوتا ہے مگر جامعہ ملیہ کا سند یافتہ ادین کا نہ دنیا کا ــ یہ واقعہ ہے کہ جامعہ میں تعلیم پایا ہوا نوجوان زندگی بھر "الّذی نہ الّذی" بنا رہتا ہے اور جامعہ کے سلسلے میں یہ دوسری بڑی حقیقت ہے کہ جامعہ نے آج تک کوئی قابلِ ذکر مسلمان پیدا نہیں کیا ــــ جب کہ سرسید کے ادارے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اس احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا کہ اُس نے ہر میدان میں مثالی اور کام یاب مسلمان پیدا کیے۔ علی گڑھ کا یہ تعلیمی ادارہ اپنے مقصد میں سب سے زیادہ کام یاب رہا۔ شاہ جہاں نے تاج محل بنا کر اتنا بڑا کام نہیں کیا کہ جتنا بڑا کارنامہ سرسید نے علی گڑھ کالج بنا کر انجام دیا۔

فرقہ پرستی کے مرکز

یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندستان کا ہر اسلامی مدرسہ فرقہ پرستی کا اڈا ہے۔ اِن مدرسوں میں 1947ء سے پہلے بھی فرقہ پرستی عام تھی اور آج بھی موجود ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں یہ بات مشہور رہی ہے کہ اُس نے جنگِ آزادی میں واضح طور پر حصہ لیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کے چند ساتھیوں نے اور ان کے بعد مولانا حسین احمد مدنی اور اُن کے محدود حلقے نے جنگِ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا اور آج بھی مدنی فیملی ہی قوم پرست ہے ورنہ دارالعلوم کا ہر رکن تقسیمِ ہند سے پہلے مسلم لیگی تھا اور آج بھی مسلم لیگی ذہنیت کا حامل ہے اور پاکستان نواز ہے۔ اسی سلسلے میں لکھنؤ کا ندوۃ العلماء بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ ادارہ ابتدا ہی سے اپنے مقصد میں ناکام رہا ہے۔ یہ ادارہ مختلف نظریات کے علماء کے درمیان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے قائم ہوا تھا مگر مولانا شبلی ندوے سے اسی لیے علاحدہ ہوئے کہ اُن کو ندوے کے سربراہوں سے اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ یہ نہ عالموں کی اصلاح کر سکا اور نہ اپنے طالب علموں کو دین و دنیا کے لیے موزوں انسان ثابت کر سکا۔ ان حقائق کے قطع نظر آج ندوۃ العلماء جماعتِ اسلامی کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ اس کے سربراہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سیکولرازم اور سوشلزم کی مذمت میں اور سعودی عرب کی بادشاہت کی تعریف و توصیف میں اپنی پوری قوت صرف کیے ہوئے ہیں ــــ دراصل اپنی فرقہ پرستی کے باوجود ہندستان کے اسلامی مدرسوں کا نصاب ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے ہی ماننے والوں کو درست مانتا ہے دوسروں کو گُم راہ یعنی "میں اور مجھ جیسے مومن، تُو اور تجھ جیسے سارے مشرک یا کافر۔ نتیجہ یہ کہ میں اور مجھ جیسے جنتی تُو اور تجھ جیسے سارے جہنمی ــ" بس یہی تصور فرقہ پرستی کے جذبے کو جنم دیتا ہے۔ اِن مدرسوں کا نصاب اورنگ زیب کے عہد میں ترتیب دیا گیا تھا

وہ اسی عہد کے لیے مناسب تھا، بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ (جیسا کہ مولانا آزاد کی خواہش تھی) اب اسے کچھ بدل جانا چاہیئے۔ دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرسہ الٰہیات صالحات وغیرہ نے سینٹرل وقف کونسل کے سوالات کے جواب میں یہ بھی کہا تھا کہ ملک تقسیم ہو جانے اور بدلے ہوئے حالات کے باوجود طلباء کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہے اس کے معانی یہ ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں فرقہ پرستی بڑھی ہے کم نہیں ہوئی۔ اور مسلمانوں کی فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے والے ہیں یہ مدرسے۔

شریف زادہ

ہر اُس بات کو جو نئی ہو مسلمان اُسے ہمیشہ دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا رہا ہے۔ اُس کے نزدیک انگریزوں سے ملنا جلنا، کھانا پینا اور انگریزی پڑھنا کفر سے کم نہ تھا جو لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرتے اُن کے نام بگاڑ کر رکھے جاتے تھے کوئی انھیں کرسٹان کہتا اور کوئی فرنگی۔ عام طور سے مشہور تھا کہ جس نے انگریزی پڑھی اُس نے اپنا مذہب چھوڑا۔ غرضیکہ کوئی شریف زادہ انگریزی کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔

رام پور کے ایک گھرانے میں تار پہنچا، تار عام طور پر گھبراہٹ ہی کا باعث بنتا ہے۔ اِس لئے پہلے تو گھر کے لوگ خوب روئے پیٹے پھر کسی ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو انگریزی داں ہو، تاکہ اُس سے وہ تار پڑھوایا جا سکے۔ کسی نے اُنہی کے کسی رشتے دار کا نام بتایا کہ اُن کا فلاں بیٹا انگریزی پڑھا ہے وہ ضرور تار پڑھ دے گا۔

یہ سُن کر گھر والوں میں سے کسی بزرگ نے بڑے دُرشت لہجے میں فرمایا: 'استغفراللہ! آپ کیا بات کرتے ہیں وہ شریف زادہ ہے!'

تعلیمی انجمنیں

سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ

سرسید کا کہنا تھا کہ جدید تعلیم اور نئے خیالات کی روشنی ہی سے تنگ نظری اور اوہام پرستی کا کہرا چھٹ سکتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر سرسید نے غازی پور میں 1864ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس سوسائٹی کے سلسلے میں سرسید نے مقصد اس طرح بیان کیا تھا: "اس مجمع کو علمی سوسائٹی کہا جائے گا اور اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اُن علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب کتابوں کی تلاش کرکر بہم پہنچانا اور چھاپنا۔ سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔" 1864ء میں سرسید جب غازی پور سے علی گڑھ آئے تو یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی اور 1866ء میں از سرِ نو اس کی بنیاد صوبے کے گورنر کے ہاتھوں رکھی گئی۔ 30 ہزار روپے کی لاگت سے سوسائٹی کے لیے ایک عمارت تیار کی گئی۔ سوسائٹی کا عملہ مترجموں، مولویوں، پریس مین، چپراسی، مالی وغیرہ پر مشتمل تھا جس کی تنخواہوں کا خرچ 5 سو روپے ماہوار تھا۔ اس سوسائٹی نے بہت سی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔ جدید علوم اور نئے موضوعات پر لیکچر دلوائے گئے۔ نیچرل سائنس پر بھی ہر مہینے ایک لیکچر دلوایا جاتا تھا اور آلات سے تجربے کرکے دکھائے جاتے تھے۔ 1866ء میں سرسید نے اس سوسائٹی کی جانب سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ہفت روزہ اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" جاری کیا جو بعد میں ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار سرسید کے آخری دم تک جاری رہا اور اس کے زیادہ تر اداریے انھوں نے لکھے۔ اس اخبار میں علمی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی یہ خصوصیت رہی کہ وہ 72 برس جاری رہا اور ہمیشہ اپنی مقررہ تاریخ پر شائع ہوا اور دوسرے اس اخبار کی کوئی تحریر کبھی کسی قوم، فرقے یا فرد کے لیے دل آزاری کا باعث نہیں بنی۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی جھگڑوں سے بھی وہ ہمیشہ بے تعلق رہا۔ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبران میں انگریز، ہندو، مسلمان سبھی فرقوں کے لوگ موجود تھے۔ ہندستان میں یہ سوسائٹی اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی۔ اس نے مغربی علوم و نظریات سے ہندستانی مسلمانوں کی بیگانگی کو دور کیا اور ایک ایسی فضا تیار کی جس میں سائنس اور جدید علوم کے فکری اور عملی کارناموں کو سمجھنے اور حالات کے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مدد ملی اور اس سوسائٹی نے سرسید کی تعلیمی مہم کے لیے ہراول کا کام انجام دیا۔

انجمن اسلام بمبئی

1875ء میں سر بدرالدین طیب جی، محمود رو گھے، قمرالدین طیب جی، غلام محمد اور غلام محی الدین صاحبان نے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی خاطر بمبئی میں انجمن اسلام کی بنیاد رکھی۔ 1880ء کے شروع میں بمبئی کے گوکل داس تیج پال اسکول میں انجمن کی جانب سے مسلمان بچوں کے لیے ایک کلاس جاری کی گئی۔ 20 ستمبر 1880ء کو عمرکھاڑی کے علاقے میں انجمن نے ایک اسکول کی بنیاد رکھی اور پھر 27 فروری 1893ء کو انجمن نے اسکول کی اپنی عمارت کی تعمیر شروع کی۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے الٰہ آباد سیشن میں اپنا نمائندہ بھیجنے کے بحث طلب مسئلے پر انجمن دو گروپ میں بٹ گئی۔ آخر اختلاف اس فیصلے پر ختم ہوا کہ انجمن سیاست میں دل چسپی نہ لے۔ 20 نومبر 1949ء سے انجمن اسلام انڈین کمپنی ایکٹ کے تحت ایک رجسٹرڈ ایسوسی ایشن ہے۔

تقریباً ایک صدی کے اس عرصے میں 15 اوقاف اور رفاہِ عام ادارے انجمن کے زیر انتظام آچکے ہیں جن میں انجمن اسلام چیریٹیز (بمبئی)، محمد حاجی صدیق انسٹی ٹیوشن (بمبئی)، عبدل قادر کریم برادرز چیریٹی ٹرسٹ (بمبئی)، عبداللہ داؤد باؤلا زنانہ یتیم خانہ ٹرسٹ (بمبئی)، ولی محمد دوست محمد پیر محمد گرلز یتیم خانہ ٹرسٹ (پونا)، دارالعلوم ٹرسٹ (پنج گنی)، انجمن ایجوکیشن ٹرسٹ (بمبئی)، انجمن اسلام چیریٹیز (برائے تعلیمی و سماجی ترقی خواتین و اطفال) اور مہاراشٹر ایجوکیشن سوسائٹی قابلِ تذکرہ ہیں۔

انجمن کے تحت 6 تعلیمی ادارے جاری ہیں جن میں ایک کامرس و اکنامکس کالج، ایک علمی و تحقیقی ادارہ، انجینئرنگ میں سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورس پر مشتمل ایک پالی ٹیکنک، ایک جونیئر ڈپلوما کالج آف ایجوکیشن (برائے خواتین)، تین جونیئر ہائی اسکول، ایک ٹیکنیکل ہائی اسکول، پنج گنی میں ایک اقامتی

اسکول، پونا میں ایک لڑکیوں کا اسکول، لڑکیوں کے لیے پرائمری اور ایک ہائی اسکول اور بالغوں کے لیے ایک اسکول شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ انجمن لڑکیوں کے دو یتیم خانے، چھوٹے بچوں کا ایک یتیم خانہ، ایک کالج ہوسٹل، ایک پبلک لائبریری، ایک پرنٹنگ پریس اور ایک اشاعتی مرکز کا بھی انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔

انجمن حمایتِ اسلام لاہور

انجمن حمایتِ اسلام 1884ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ یہ پنجاب کی پہلی اور ہندوستان کی ابتدائی تعلیمی تنظیموں میں سے ایک ہے۔ ابتدا میں اس انجمن کے تحت لاہور میں لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول اور یتیم خانہ قائم کیا گیا۔ بعد میں یہ انجمن ایک تعلیمی مرکز بن گئی اور اس کے زیرِ انتظام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ڈگری کالج، کئی ہائی اسکول، پرائمری اسکول اور ٹریننگ کالج کھولے گئے۔ لڑکیوں کے لیے ایک انڈسٹریل اسکول بھی کھولا گیا۔ ایک طبیہ کالج، یونانی دواخانہ اور ایک ڈسپنسری کا قیام بھی عمل میں آیا۔ انجمن نے اپنے طے کیے ہوئے نصاب کے تحت درسی اور غیر درسی کتابوں کے لئے اپنا ایک پریس بھی قائم کیا اور رسالوں کی فراہمی کے لیے اپنی بک ڈپو کی بھی بنیاد ڈالی۔ ہفت روزہ "حمایتِ اسلام"، انجمن کا آرگن تھا جو عرصے تک جاری رہا ہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس کے سالانہ جلسوں میں مولانا حالی، شبلی، اقبال اور مولانا آزاد جیسے ممتاز عالموں نے شرکت کی ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

دسمبر 1886ء میں سرسید احمد خاں نے علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس قائم کی۔ بعد میں کانگریس کی جگہ کانفرنس، محمڈن کی جگہ مسلم لفظ رکھ کر آل انڈیا لفظوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد تھا کہ مسلمانوں کو تعلیمی مسائل سے دلچسپی پیدا کرائی جائے اور انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ مغرب کے دیگر علوم حاصل کرنے پر زور دیا جائے۔ اس کانفرنس کے پہلے اجلاس کے صدر مولوی حاجی محمد سمیع اللہ خاں سی ایم جی تھے جو سرسید کے دستِ راست تھے۔ بعد میں مولوی ... خان بہادر سردار محمد حیات خاں سی آئی ای، نواب محسن الملک، سر آغا خاں، جسٹس بدرالدین طیب جی، مہاراجا محمود آباد، خان بہادر میاں سر محمد شفیع (جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کانسل میں وزیرِ تعلیم تھے اور انہی کے عہد میں علی گڑھ کالج کو مسلم یونی ورسٹی کا چارٹر ملا تھا)، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، خان بہادر شیخ عبدل قادر، سر راس مسعود، سر سید رضا علی، نواب سر محمد مزمل خاں، ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد، صاحب زادہ لیاقت علی خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے عالم و ممتاز اصحاب صدر رہے۔ اس کانفرنس کے ذریعے ملک کے ہر حصے کے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کی گئی۔ یہاں تک اس کانفرنس کی آواز پہنچی۔ دور دور کے نوجوان طلبِ علم کے لیے علی گڑھ کھنچ کر آئے۔ مسلم یونی ورسٹی کی تکمیل دراصل اسی کانفرنس کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں جو تقریریں ہوئیں، نظمیں پڑھی گئیں اور خطبات پڑھے گئے وہ بجائے خود علمی، دینی، سماجی اور سیاسی ادب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں بچوں کے لیے کانفرنس کی جانب سے مدرسے بھی کھولے گئے۔ ذہین و ہونہار طالب علموں کو وظیفے بھی دیے گئے۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں کو اتنی ہمت بھی دلائی کہ وہ اپنے اپنے صوبے کی حکومت سے تعلیمی مشکلات کو دور کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس کانفرنس کی جانب سے بہت سی اچھی اور گراں قدر کتابیں بھی شائع کی گئیں اور کانفرنس نے اپنا بک ڈپو بھی قائم کیا۔ "کانفرنس گزٹ" آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ہفت روزہ آرگن تھا جو 1929ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔

انجمن ترقی اردو ہند دہلی

اردو ہندی کا تنازع ملک میں بڑھا تو مسلمان اردو زبان کی حفاظت کے لیے رجوع ہوئے۔ چنانچہ جنوری 1903ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس کا ... [illegible]

کان فرنس (منعقدہ دہلی) کے اجلاس میں ایک شعبہ 'ترقی اردو' کے نام سے قائم ہوا۔ دراصل جب برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد سرسید نے رکھی تھی تب ہی اردو کے فروغ کے لیے ایک شعبہ قائم کردیا تھا اسی شعبے نے مسلم ایجوکیشنل کے تحت انجمن ترقی اردو کا روپ اختیار کرلیا۔ انجمن کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی مقرر ہوئے۔ اُن کی ترغیب پر ابتدا ہی میں انجمن کے ممبران کی تعداد تقریباً چار سو ہوگئی اور شبلی نے دو ہی برس میں کئی بڑی اور اہم کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اپنی علالت کی بنا پر شبلی نے انجمن کو خیرباد کہا تو مولانا حبیب الرحمان خاں شیروانی سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1905ء میں مولوی عزیز مرزا سکریٹری بنے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی دی ہوئی 500 روپے سالانہ کی امداد اور ڈیوٹی بک ڈپو کی آمدنی سے انجمن کے اخراجات کسی نہ کسی طرح پورے ہوتے رہے مگر 1912ء میں لکھنؤ کے مسلم ایجوکیشنل کان فرنس کے اجلاس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔ مولوی عبدالحق کی کوشش سے انجمن ایک نئے دور میں داخل ہوئی صرف دو ہی برس کی مدت میں انھوں نے 7½ ہزار روپے چندوں کے ذریعہ جمع کیا، بیگم بھوپال سے 3 ہزار روپے سالانہ امداد دینے کا وعدہ لیا اور نظام حیدرآباد کی سرپرستی حاصل کرلی۔ (مولوی عبدالحق اور نظام کے اسی تعلق ہی نے حیدرآباد کے عظیم و مثالی دارالترجمہ اور عثمانیہ یونی ورسٹی قائم کرنے کے خیال کو جنم دیا) 1920ء تک انجمن 'شعبۂ ترقی اردو' کے نام سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کان فرنس ہی سے ملحق رہی لیکن مولوی عبدالحق کی اچھی کارگزاری کی بنا پر اس نے 'انجمن ترقی اردو' کی ایک آزاد شکل اختیار کرلی۔ اور پھر اورنگ آباد میں اس کا صدر دفتر قائم ہوا۔ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں انجمن نے نثر و نظم، تنقید، ادب، سوانح، تاریخ و سائنس، فلسفہ و سیاست، گرامر اقتصادیات و نفسیات، قانون، تعلیم و مذہب کے موضوع پر بہت سی اردو کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ انجمن کی جانب سے ایک انگریزی اردو لغت شائع کیا گیا اور سائنس کی انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں شائع ہوا۔ انجمن نے تین اردو جریدے بھی جاری کئے "اردو سہ ماہی"، "ہماری زبان" پندرہ روزہ، ماہ نامہ "سائنس" اور ماہ نامہ "معاشیات"۔ سہ ماہی 'اردو' اور 'ہماری زبان' ایک ہفت روزہ کی صورت میں ابھی تک جاری ہیں۔ صوتی املے کی ابتدا بھی بابائے اردو ہی نے کی۔ انجمن ترقی اردو ہند کو نظام حیدرآباد، نواب سالار جنگ بہادر، سر فضل بھائی کریم بھائی، راجا پرتاب گیرجی، نرسنگھ گیرجی بہادر اور سر تیج بہادر سپرو جیسی ممتاز اشخاص کی سرپرستی حاصل رہی ہے مولوی عبدالحق نے اس انجمن کے لیے اتنا کچھ کیا کہ وہ صحیح معانی میں بابائے اردو بن گئے۔ اُن کو اپنے بیمہ فنڈ کے سلسلے میں انشورنس کمپنی سے 56 ہزار روپے کی جو رقم ملی تھی وہ بھی انھوں نے انجمن ہی کی نذر کر دی تھی۔ بابائے اردو ہی انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی لے آئے۔ 1947ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں انجمن کا گراں قدر کتب خانہ جل گیا۔ پاکستان بننے پر مولوی صاحب کراچی چلے گئے۔ ان کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری قاضی عبدالغفار مقرر ہوئے اور دفتر علی گڑھ منتقل ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد پروفیسر آل احمد سرور نے یہ عہدہ سنبھالا اور اب 1974ء سے ڈاکٹر خلیق انجم اس عہدے پر فائز ہیں۔ دفتر علی گڑھ سے پھر دہلی منتقل ہوچکا ہے۔ بابائے اردو کے پاکستان چلے جانے کے بعد سے آج تک اس انجمن نے اردو خدمت کے سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہیں دیا۔ انجمن ترقی اردو ہند کو حکومتِ ہند سے کم و بیش 50 ہزار روپے سالانہ امداد ملتی ہے۔

شعبۂ تعلیم نسواں علی گڑھ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کان فرنس کے دوسرے اہم شعبوں (شعبۂ تعلیم، شعبۂ تصنیف و تالیف، شعبۂ اصلاح و معاشرت، شعبۂ ترقی اردو وغیرہ) میں تعلیم نسواں کے لئے بھی ایک شعبہ تھا۔ اس شعبے کا مقصد تھا کہ مسلمان عورتوں میں تعلیم کی اشاعت ان کی ضرورت اور بحیثیت اسلامی روایات کے مطابق ہو۔ اگرچہ یہ شعبہ سرسید کی زندگی ہی میں (1896ء) قائم ہوچکا تھا مگر نصاب اور طریقِ تعلیم کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوسکنے کی بنا پر یہ شعبہ کوئی کام انجام نہ دے سکا تھا۔ 1902ء میں شعبہ تعلیم نسواں از سرِ نو قائم ہوا۔ شیخ عبداللہ (جن کو سرسید نے پال پوس کر اعلا تعلیم دلائی تھی) اس شعبے کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس شعبے کا سب سے بڑا اور قابلِ قدر کارنامہ علی گڑھ کے مسلم گرلز کالج کا قیام ہے۔

○ ○

عورتیں مردوں کی بہ نسبت زیادہ عقل مند ہوتی ہیں، اس لئے کہ وہ کم جانتی ہیں اور زیادہ سمجھتی ہیں۔' جیمس اسٹیفنس

407

انجمن تعلیماتِ دین، بستی

1947ء میں جب حکومت اتر پردیش نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دے دیا اور یوپی کے مسلمانوں نے درسی کتابوں میں ہندو مذہب کی روایات کو پسند نہیں کیا تو 1950ء میں اودھ کے کچھ مسلمانوں نے بستی میں انجمن تعلیماتِ دین کی بنیاد رکھی۔ یہ کہہ کر مقصد کی اشاعت کی گئی کہ مسلمانوں کی نسل نو کے ایمان کو محفوظ رکھنے کے لئے آزاد مکتب کھولے جائیں، اپنی پسند کی کتابیں پڑھائی جائیں، حکومت سے امداد نہ لی جائے اور نہ کسی دوسرے تعلیمی ادارے سے الحاق کیا جائے۔ اس بنیاد پر مکتب کھلنے لگے۔ انجمن کو جب اس سلسلے میں کامیابی حاصل ہوئی تو دسمبر 1959ء میں ایک صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی جس سے انجمن کے مقصد کی اور زیادہ اشاعت ہوئی۔ اتر پردیش کے 46 اضلاع میں انجمن تعلیماتِ دین کی شاخیں قائم ہوئیں اور نتیجے میں تقریباً ہر گاؤں میں ایک مکتب قائم ہو گیا اور ان دنوں انجمن کے 5 ہزار مکتبوں میں 6 لاکھ بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ ہر شاخ کی ایک کمیٹی ہے اور اس کا ریزرو فنڈ ہے۔ اس انجمن تعلیمات کے تحت جونیئر ہائی اسکول بھی کھولے گئے ہیں۔ بستی کی اس انجمن تعلیماتِ دین اور دینی تعلیمی کونسل (لکھنؤ) کو مولانا عبدالشکور رحمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا شاہد فاخری، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا عبدالقیوم علی گڑھی، صوفی شاہ سلیم قادری، مولانا محمد ہاشم فرنگی محلی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی کی سرپرستی حاصل ہے۔

گرفتاری مرزا نوشہ

"سنا گیا کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے۔ مثل ہاشم علی خان وغیرہ کے جو سابق بڑی علتوں تک سپرد ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا لیکن باسبب رعب اور کثرت مردان کے یا کسی طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے جمعداری میں بھی بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے۔ بہت بے طمع ہے۔ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس رئیسوں کی سعی اور سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے اور اگر ادا نہ کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن ان تھانیدار کی خدا خیر کرے دیانت کو تو کام فرمایا انھوں نے۔ لیکن اس علاقہ میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ پیٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانیدار کو چاہئے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے۔"

دہلی اردو اخبار

۲۲ اگست ۱۸۴۱ء

انجمن خیر آل اسلام بمبئی

بمبئی کے محنت کشوں کے گنجان علاقے مدن پورے میں اچانک چار بچوں کے یتیم ہو جانے پر مرحوم پیر محمد اور مرحوم حاجی ملتی محمد کھیانے اُن کی پرورش کا ذمہ لیا اس طرح 1927ء میں خیر ال اسلام نام کی ایک انجمن اور اس کے یتیم خانے کی بنیاد پڑی۔ 1960ء میں اس انجمن نے بمبئی (مدن پورہ) میں ایک ہائی اسکول کی بنیاد رکھی۔ آج کل اس انجمن کے تحت 60 بچوں کا ایک یتیم خانہ، 200 بچے بچیوں کے لیے ایک مدرسہ، تعطیلات میں 200 بچوں کے لیے دست کاری کا ایک اسکول، 12 اُردو ہائی اسکول، ایک کے جی۔ اسکول، آرٹس، سائنس اور کامرس کے دو کالج، ایرکنڈیشنگ اینڈ ریفریجریشن ٹیکنالوجی کا ایک انسٹی ٹیوٹ، الیکٹرک وائرمین کورس کا ایک مرکز اور ایک ٹیچرز ٹریننگ اسکول جاری ہے۔ بمبئی کے اس طبیہ کالج کو جو بند ہونے کے قریب تھا انجمن خیر آل اسلام نے مہاراشٹر حکومت کے وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا اور دہلی کے ہمدرد دواخانہ کے سربراہ جناب حکیم عبدل حمید کے تعاون سے اپنے انتظام میں لے لیا اور بمبئی کے مشہور سماجی راہ نما ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا نے پرنسپل بن کر اس ادارے کو ایک اچھے طبی کالج اور ایک مکمل ہسپتال میں بدل دیا۔ اس طرح انجمن خیر آل اسلام بمبئی 7 ہزار بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کو تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ خرچ کرنا ہوتے ہیں اور اس خرچ کا انحصار فطرہ، زکات، چرم قربانی اور عطیات پر ہے۔

انجمن اسلام مروڈ

1903ء میں جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا 19واں اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا تو مروڈ (ریاست جزیرہ، مہاراشٹر) کے چند اصحاب نے بھی اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس سے متاثر ہو کر انھوں نے جو کیا اس کے نتیجے میں انھوں نے 11 اپریل 1907ء کو اپنی ریاست کے صدر مقام مروڈ میں انجمن اسلام قائم کی۔ مقصد یہی تھا کہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی علمی، ذہنی جسمانی اور مذہبی ترقی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کر کے ان کی طرز معاشرت، تہذیب، اخلاق، تمدن کی اصلاح کی جائے۔ شہر مروڈ میں جو ہائی اسکول تھا اس کے لیے اس انجمن نے پہلے ہی برس ایک ہوسٹل قائم کیا۔ انجمن نے مذہبی تعلیم کو اہمیت دیتے ہوئے دینیات کا نصاب بھی مرتب کیا۔ ہوسٹل میں بھی دینی کلاس قائم کیا گیا اور نماز روزہ لازمی کر دیا گیا۔ 1946ء میں جنجیرہ کی جمعیت مسلمین کے اشتراک سے مروڈ کی انجمن اسلام نے اپنے ہی احاطے میں ایک مدرسہ بنام محمدیہ قائم کیا جس میں تین برس تک ابتدائی دینی تعلیم دے کر طلبا کو مزید دینی تعلیم کے لیے ہندستان کی بڑی بڑی دینی درس گاہوں میں بھیجا جاتا ہے۔ کارکنانِ انجمن تقریروں، تحریروں، مباحثوں اور قراردادوں کے ذریعے بے ہودہ رسومات کی کورانہ تقلید سے پیدا ہونے والے نقصانات اور شادی و غمی کے موقعوں پر ہونے والے فضول اخراجات کے مہلک نتائج سے بھی مسلم فرقے کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

سنٹرل مسلم ایسوسی ایشن بنگلور

ریاست کرناٹک کے مسلمانوں کی یہ انجمن (صدر انجمن) 1907ء میں نواب غلام احمد کلامی، خان بہادر عباس خاں اور میر حمزہ حسین جیسے دردمند مسلمانوں نے بنگلور میں قائم کی۔ یہ ایک تعلیمی، سماجی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ صدر انجمن کے تحت عیدگاہ جدید میسور روڈ بنگلور سٹی، عیدگاہ سر قاضی صاحب چام راج پیٹ بنگلور سٹی، مسجد سر قاضی صاحب سلطان پیٹ بنگلور سٹی، قبرستان قدیم چام راج پیٹ بنگلور سٹی، قبرستان جدید و مسجد میسور روڈ بنگلور سٹی، قبرستان قدیم (جالی محلہ) میسور روڈ بنگلور سٹی، عاشور خانہ میسور روڈ بنگلور سٹی اور محمود شریف ایجوکیشنل ٹرسٹ لیسونٹ پور بنگلور جیسے اوقات جاری ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ انجمن سی۔ ایم۔ اے ہائی اسکول، سی۔ ایم۔ اے ہائر ایلیمنٹری اسکول، سی۔ ایم۔ اے نرسری اسکول، سی۔ ایم۔ اے ہاسٹل اور سی۔ ایم۔ اے لائبریری و ریڈنگ روم کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ ان دنوں

پہلا باب ۔ ۳۳۷ کتابوں پر مشتمل ہے ۔ اکثر فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں انجمن نے اپنے فنڈ سے مظلومین کو (بلا لحاظ مذہب و ملت) مالی امداد بھی دی ہے ۔ فساد زدہ علاقوں میں امن کمیٹیاں قائم کرانے میں حکومت سے تعاون کیا ہے اور مظلومین کو دوبارہ بسنے میں مدد دی ہے ۔ ریاستی حکومت سے مسلمانوں کے لیے تعلیمی سہولتیں اور مراعات حاصل کرنے کے لیے انجمن نے ایک خصوصی کمیٹی بھی تشکیل دے رکھی ہے ۔ انجمن ہی کی کوشش سے بنگلور یونی ورسٹی میں اردو شعبہ قائم ہو چکا ہے ۔ حکومت کرناٹک کی ریاستی حج کمیٹی میں انجمن کا بھی ایک نمائندہ موجود ہے ۔

انجمن حامی مسلمین بھٹکل

خلافت اور ترک موالات جیسی سیاسی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپریل ۱۹۱۹ء میں الف ۔ اے ۔ محمد حسن صاحب اور ایم ایم صدیق صاحب نے ایک انجمن قائم کی تاکہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم کو بھی فروغ دیا جائے ۔ انجمن نے ایک مدرسہ قائم کیا جو ۱۹۴۲ء میں ہائی اسکول بن گیا ۔ اس انجمن کو اسماعیل صدیقی صاحب کی بھی صدارت حاصل رہی جو علاقہ دارواڑ کے پہلے گریجویٹ مسلمان تھے ۔ انجمن کو اپنی جائداد سے آمدنی ہوتی ہے چندے اور عطیات بھی آمدنی کا ذریعہ ہیں ۔ انجمن کے تحت تعلیمی ادارے جاری ہیں ان کی عمارتیں ایم ۔ ایچ ۔ اسماعیل ۔ ایس ایم سید محمد اور مولانا کمپنی والے ایم ۔ ایچ ۔ قادر نے بنوائی ہیں ۔ اس انجمن کا فیض محض بھٹکل ہی تک محدود نہیں بلکہ کرناٹک کے دوسرے اضلاع کے مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

جامعۂ اُردو علی گڑھ

آگرے میں ۱۲ مئی ۱۹۳۸ء کو جب بزم اقبال قائم ہوئی تو اس کے تحت اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا بھی ارادہ کیا گیا اور پھر ۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو جامعۂ اُردو کے نام سے ایک مستقل تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی گئی ۔ جامعہ کے ذریعے نومبر ۱۹۳۹ء سے تین امتحانات شروع کئے گئے ۔ جامعہ کا نظام ملک کی اہم یونی ورسٹیوں کے آئین و اسلوب پر ترتیب دیا گیا اور پہلے رجسٹرار محمد طاہر فاروقی مقرر ہوئے ۔ جامعہ ایک آزاد اور غیر سرکاری ادارہ ہے ۔ اتر پردیش کی تمام یونی ورسٹیوں کے اُردو شعبوں کے صدر، جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ، انجمن ترقی اُردو ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ہندوستانی اکاڈمی (الہ آباد) دارالمصنفین (اعظم گڑھ) وغیرہ کے نمائندے جامعۂ اردو کی مجلس عاملہ کے ممبر ہوتے ہیں ۔ جامعہ کو نواب چھتاری، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، سر شانتی سروپ بھٹناگر، سر تیج بہادر سپرو، شری کنزرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی مقتدر شخصیات کی سرپرستی حاصل رہی ہے ۔ جامعۂ اردو کے امتحانات ہر برس ماہ نومبر میں ہوتے ہیں ۔ جامعہ کا کورس ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل پر مشتمل ہے ۔ جامعۂ اردو کے امتحانات کا یہ فائدہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں (ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد) صرف انگریزی میں امتحان دے کر میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور گریجویٹ ہو سکتے ہیں اور بعد میں وہ ایم اے میں داخلہ لے سکتے ہیں اور پی ۔ ایچ ۔ ڈی ۔ بھی کر سکتے ہیں ۔ جامعہ کے امتحانات ملک کے ڈیڑھ سو سے زیادہ مرکزوں پر منعقد ہوتے ہیں اور اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ ممتحن مقرر کئے جاتے ہیں ۔ کل اخراجات امیدواروں کی فیسوں کی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں ۔

۲ اسکول کالج یونی ورسٹی

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی

غدر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی بربادی سے متاثر ہو کر ان کی بہبودی کی خاطر سرسید احمد خاں نے دو اصول مستحکم طور پر قائم کئے، ایک تعلیم دوسرا انگریزوں سے اتحاد ــــ چنانچہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو، جو وکٹوریا ملکۂ انگلستان کی برس گرہ کا دن تھا علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر مولوی محمد کریم کی صدارت میں اور علی گڑھ کے سب جج مولوی سمیع اللہ خاں کے انتظام کے تحت ایک انگریزی اسکول کا افتتاح کیا گیا ۔ ان دنوں سرسید بنارس میں سب جج تھے اور اسی مقصد سے بنارس سے علی گڑھ آئے تھے ۔ پہلی جون ۱۸۷۵ء سے چھاؤنی کے پرانے بنگلوں میں تعلیم شروع ہوئی ۔ ابتدا میں یہ ادارہ مدرسۃ العلوم کہلایا، کالج

[illegible]

بننے پر مکمل نام ایم۔ اے۔ او۔ کالج (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) رکھا گیا۔ مگر علی گڑھ کالج کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ 1878ء میں جب یہ اسکول سیکنڈ گریڈ کالج بن گیا تو اس کا الحاق کلکتہ یونی ورسٹی سے ہو گیا اور ڈگری کالج بن گیا۔ ابتدا میں سارے مضامین انگریزی میں پڑھائے گئے اور عربی، فارسی اور سنسکرت کو دوسری زبان کا درجہ دیا گیا۔ مگر بعد میں تاریخ، جغرافیہ اور حساب وغیرہ اردو میڈیم سے پڑھائے جانے لگے اور انگریزی کو دوسرا درجہ دے دیا گیا۔ علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل مسٹر سڈنس تھے مگر کالج کے استادوں میں مسٹر تھیوڈور بیک نے اپنی محنت، لگن اور طلبا سے اپنے مشفقانہ برتاؤ کی وجہ سے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ جن دنوں (1920ء) نواب وقار الملک علی گڑھ کالج کی کمیٹی کے سکریٹری تھے سر آغا خاں نے کالج کو یونی ورسٹی بنانے کی کوشش شروع کی اور چندہ فراہم کرنے کا آغاز کیا۔ جنوری 1921ء میں ایم۔ اے۔ او کالج یونی ورسٹی بن گیا۔ راجا محمد علی خاں آف محمود آباد پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال چانسلر تھیں۔ اس یونی ورسٹی سے جو صاحب سب سے پہلے گریجوایٹ ہوئے وہ منشی ایشوری پرشاد تھے اور یونی ورسٹی کی جانب سے پہلا سپاس نامہ مہاراجا آف پٹیالا کو پیش کیا گیا۔ ان دنوں یونی ورسٹی میں اساتذہ کی تعداد تقریباً 8 سو ہے اور یونی ورسٹی کی عمارتیں 1858 ایکڑ اراضی رقبہ پر واقع ہیں۔ طالب علموں کی تعداد 9 ہزار ہے جن میں 30 فی صدی ہندو طلبا ہیں۔ یونی ورسٹی کے سالانہ اخراجات کم و بیش 1½ کروڑ روپے ہوتے ہیں۔ لائبریری کے سالانہ اخراجات تقریباً 9 لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ لائبریری تقریباً 4 لاکھ کتابوں پر مشتمل ہے۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کی وہ واحد درس گاہ ہے جس نے مسلمانوں کے جدید ذہنی اور قومی مزاج و سیاست کی تشکیل میں اہم ترین حصہ لیا ہے۔ ہندوستانی متحدہ قومیت کی تحریک بھی یہیں سے شروع ہوئی اور دو قومی نظریے نے بھی یہیں جنم لیا۔ اس درس گاہ سے جو ذہن تربیت پا کر نکلے اُن میں ایشوری پرشاد، راجا مہندر پرتاپ، حسرت موہانی، سیف الدین کچلو، ظفر علی خان، سردار جعفری، عصمت چغتائی، مجاز لکھنوی، مولانا محمد علی، خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمان بجنوری، خواجہ عبدالمجید، تصدق شیروانی، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محمود، قاسم رضوی، خواجہ احمد عباس، انصار ہروانی، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر رشید جہاں، رینو کا دیوی، ڈاکٹر احمد، سبط حسن، سید محمد ٹونکی، ڈاکٹر علیم، نواب زادہ لیاقت علی خاں، شیخ عبداللہ، شمیم احمد شمیم، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبدالغفار خاں، منشی پالی وال، سردار پانی کر، رفیع احمد قدوائی، یاسین نوری، علی ظہیر، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر محیب، سجاد حیدر یلدرم اور ڈاکٹر اقبال کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد

نظام حیدرآباد میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد یہ فرمان جاری کیا: "ہماری تخت نشینی کی خوشی میں ایک جامعہ قائم کیا جائے گا جس کا نام جامعہ عثمانیہ ہوگا۔ اُس کی تعلیم مغربی اور مشرقی علوم کے امتزاج کے ساتھ اردو زبان میں ہوگی"۔ 1917ء میں سر اکبر حیدری نے نظام کے فرمان کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کیا چنانچہ ان کی ایما پر سر سید راس مسعود نے 28 ستمبر 1918ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی قائم کی۔ اسی سلسلے میں ادبی و نصابی کتابوں کی فراہمی کے لیے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا جہاں علوم و فنون کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ 1949ء میں علاقے کی دوسری زبانوں کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے قومی حکومت نے یونی ورسٹی میں اردو میڈیم کو ختم کر کے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جب خلافت کمیٹی کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اختلاف پیدا ہوا تو اس نے علی گڑھ ہی میں مسلم یونی ورسٹی کے مقابلے میں 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک آزاد، ملی و قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے بانیوں میں مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا آزاد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سنگِ بنیاد شیخ ہند مولانا محمود حسن نے رکھا۔ شیخ ہند کی علالت کی بنا پر اُن کی افتتاحی تقریر مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھی۔ شیخ ہند کے الفاظ یہ تھے:

"اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) کے غمخوار مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں، دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا"۔

حکیم اجمل خان پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے اور مولانا محمد علی وائس چانسلر۔ درس کی ابتدا ڈیروں اور خیموں میں ہوئی اور خواجہ عبدالحمید نے کئی استادوں اور طالب علموں کو اپنی کوٹھی میں رہنے کے لئے جگہ دی۔ ابتدائی چند برسوں میں جامعہ کے اخراجات (تقریباً 10 ہزار روپے سالانہ) خلافت کمیٹی نے برداشت کئے مگر خلافت تحریک کا سیاسی جوش و خروش کم ہوا تو جامعہ کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ گاندھی جی نے حوصلہ بخشا اور حکیم اجمل خان اس ادارے کو جولائی 1925ء میں علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ یہاں محمد حبیب، سیٹھ کی مالی امداد نے اور ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا اسلم جیراج پوری، شفیق الرحمان قدوائی، مرحوم باتا، سید نور اللہ اور خواجہ عبدالحمید جیسے اساتذہ کی رضاکارانہ تعلیمی خدمت نے جامعہ کو حیات نو بخش دی۔ ان اساتذہ نے یہ عہد کیا تھا کہ -/150 روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ طلب نہیں کریں گے۔ جب کہ عملی ہوا یہ کہ -/150 روپے ماہوار سے زیادہ کبھی کسی کو نہیں ملے۔

اگرچہ جامعہ سیاسی تحریکوں کے جلو میں قائم ہوا اور ابتدا میں روبہ بھی مخالفانہ رہا مگر اس کا بنیادی مقصد ہمیشہ یہی رہا کہ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے کہ جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندستانی قومیت کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ جامعہ کی بنیاد اس عقیدے پر رکھی گئی کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندستان کی آزادی و ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی۔ جامعہ ایک ادارے سے زیادہ ایک تعلیمی و تہذیبی تحریک رہی ہے۔ جامعہ نے نائٹ اسکول اور تعلیم بالغان کے مرکز بھی قائم کیے ہیں۔ واردھا اسکیم کے مطابق بیسک ایجوکیشن کے لیے اردو زبان کے استادوں کے ٹریننگ اسکول بھی جامعہ نے قائم کئے۔ جامعہ کی جانب سے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن بھی قائم کیا گیا۔ 1962ء سے جامعہ ملیہ کو یونی ورسٹی کی حیثیت کا ادارہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جامعہ کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مسلمان طالب علموں کے لئے نماز روزے کی ادائیگی لازمی ہے۔ طلبا کو بدیشی کپڑا پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ ذریعہ تعلیم اردو ہے۔

مسلم گرلز کالج علی گڑھ

سرسید احمد خان کے تعلیم و تربیت دیئے ہوئے لڑکوں میں خان بہادر شیخ محمد عبداللہ (بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی) نے 1904ء میں ایک ماہنامہ بنام "خاتون" جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال نے 1200 روپے سالانہ امداد دے کر تائید فرمائی۔ 1907ء میں یو۔ پی کے گورنر لاٹوش کی ایما پر علی گڑھ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا گیا۔ اسکول کے لیے بمشکل تمام ایک استانی مل سکی۔ مجبور ہو کر استانیوں کی کمی کو بیگم عبداللہ اور ان کی دو بہنوں نے پورا کیا۔ وہ اپنا سارا وقت اسکول کی لڑکیوں کو پڑھانے میں صرف کرتی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں مدرسے نے کافی ترقی کر لی۔ اسکول کی اچھی رپورٹ سے خوش ہو کر گورنر نے 7 ہزار روپے نقد دیے اور 2½ ہزار روپے ماہوار کی امداد دینا شروع کر دی۔ اسکول کی عمارت کے لیے جب زمین خریدی گئی تو شمالی ہند کے ذمہ دار مسلمانوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی کھل کر مخالفت کی۔ مخالفت کے باوجود لیڈی گورنر نے علی گڑھ میں 1914ء میں اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کی بنیاد رکھی۔ جب بورڈنگ ہاؤس بن کر تیار ہوا تو اس میں رہنے کے لئے کوئی طالب علم نہ آئی۔ تب بیگم عبداللہ خود اپنی اور اپنے عزیزوں کی لڑکیوں کو لے کر بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگیں اور بورڈنگ ہاؤس آباد ہونے لگا۔ 1918ء میں یہ مدرسہ ہائی اسکول ہوا۔ 1929ء میں انٹرمیڈیٹ کلاسیں کھول دی گئیں اور اس کا الحاق مسلم یونی ورسٹی سے ہو گیا۔ 1937ء میں یہ ڈگری کالج بنا اور 1939ء میں کالج میں بی ٹی کورس کی ابتدا ہوئی۔ یو۔ پی میں سب سے پہلے بیگم عبداللہ ہی کی لڑکیوں نے اعلیٰ مغربی تعلیم پائی۔ بڑی لڑکی رشید جہاں، ڈاکٹر بنیں (اور شاید ہندستان کی پہلی ترقی پسند قلم کار اور کمیونسٹ مسلم خاتون بھی وہی تھیں)، دوسری لڑکی خاتون عبداللہ نے ایم اے کیا اور مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلی گئیں۔ تیسری خورشید عبداللہ نے گریجویٹ ہو کر شادی کے بعد رینو کا دیوی کے نام سے چند فلموں میں کام کیا اور چوتھی لڑکی ہر جیسی بعد میں

مسلم گرلز کالج کی پرنسپل بنیں ۔

مولانا آزاد کالج اورنگ آباد

جن دنوں ریاست مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ وائی ۔ بی ۔ چوہان تھے حکومت مہاراشٹر کے وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا نے اورنگ آباد میں مولانا آزاد کالج کی داغ بیل ڈالی ۔ جون 1963ء میں 200 طالب علموں سے کالج کی ابتدا ہوئی ۔ اورنگ آباد کا روضہ باغ جو اورنگ زیب کے استاد میر اسماعیل کا مقبرہ بھی ہے اور جو مغلوں کے عہد میں ایک سرائے بھی رہ چکا ہے اور مکتب بھی اور نظام کے دور میں یہ روضہ جیل کی شکل میں بدلا آج کل یہی مولانا آزاد کالج ہے ۔ اس شاہی عمارت کے 42 کمرے ہیں جن میں 38 کمرے کالج کے استعمال میں ہیں ۔ اس کالج میں کیرلا، کرناٹک، تامل ناڈو اور اترپردیش تک کے لڑکے تعلیم پا رہے ہیں ۔ طالب علموں میں مسلمان بھی ہیں، ہندو بھی اور بودھ بھی ۔ کالج کے احاطے میں وہ عید بھی مناتے ہیں، گنیش اتسو بھی اور بودھ جینتی بھی ۔ یہ تعلیمی ادارہ مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کے تحت جاری ہے اور اس کا انتظام آزاد تعلیمی سنگھ کے سپرد ہے ۔ اس کالج سے ایک سہ ماہی اردو رسالہ "غبار خاطر" بھی شائع ہوتا ہے ۔ مولانا آزاد کالج ڈاکٹر رفیق زکریا کی سماجی زندگی کا ایک عظیم اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے ۔

سیفیہ کالج بھوپال

1935ء میں مرحوم ملا سجاد حسین نے مدھیہ پردیش کے مقام سرونج میں جیبیہ پرائمری اسکول قائم کیا ۔ ملا صاحب ہی کی نگرانی میں یہ اسکول ترقی کرتے کرتے مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا کالج بن گیا اور اب یہ سیفیہ کالج کہلاتا ہے ۔ ابتدا میں یہ صرف آرٹس کالج تھا 1960ء سے اس میں سائنس کا شعبہ بھی قائم ہوگیا ۔ پھر اس کالج میں کامرس کی بھی ابتدا ہوئی اور قانون کی کلاسیں بھی کھول دی گئیں اور بی ۔ ایڈ اور پوسٹ گریجویٹ کلاس بھی جاری کر دیے گئے ۔ چنانچہ سیفیہ کالج ایک مکمل کالج ہے ۔ سیفیہ کالج سے ایک لڑکیوں کا اور ایک لڑکوں کا سکنڈری اسکول اور ایک ہومیوپیتھک کالج بھی منسلک ہے ۔ کھیل کود کے میدان میں بھی سیفیہ کالج کے طلبا خاصی شہرت رکھتے ہیں ۔ کالج کے منتظم ملا فخرالدین (بانیٔ ادارہ کے صاحب زادے) ہیں جو اپنی جیب سے ہزاروں روپے سالانہ مستحق طلبا کو امداد اور وظیفوں کی صورت میں دیتے ہیں ۔

محمد حاجی صابو صدیق پالی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی

بمبئی کی انجمن اسلام کا یہ تعلیمی ادارہ ہر اعتبار اہمیت کا حامل ہے ۔ یہ تعلیمی و صنعتی درس گاہ بمبئی کے ایک مشہور مخیر تاجر مرحوم محمد حاجی صابو صدیق کے وقف کردہ سرمائے سے انجمن اسلام کے زیر انتظام جاری ہے ۔ اس صنعتی اسکول کی بنیاد 1936ء میں بمبئی کے گورنر لارڈ بریبورن کے ہاتوں رکھوائی گئی تھی ۔ اس ادارے کا مقصد معمولی پڑھے لکھے لڑکوں کو ابتدائی صنعتی تربیت دینا ہے ۔ 1944ء سے چند نئے ٹریڈ و سرٹی فکٹ کورس کا بھی اضافہ کیا گیا ہے ۔ 1945ء میں حاجی صابو صدیق کی بیوہ حبیبا بائی کے ایک لاکھ روپے کے عطیے سے ٹیکنیکل ہائی اسکول کا ایک شعبہ قائم کیا گیا جو اپنی نوعیت کا واحد شعبہ ہے ۔ 1958ء سے اس انسٹی ٹیوٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے یعنی سول انجینئرنگ اور الیکٹریکل و میکانیکل شعبہ ۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری ٹیکنیکل اور دیگر موضوعات سے متعلق ۱۰ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے ۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے احاطے میں ایک کھلی اسٹیج بھی ہے جو غیر سیاسی جلسوں اور مشاعروں کے سلسلے میں کام آتی ہے ۔ اسی طرح المالطیفی ہال بھی بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے ۔ یہ ہال مرحوم ڈاکٹر المالطیفی کے ایک لاکھ روپے کے عطیے سے تعمیر ہوا تھا ۔ سابق پرنسپل سید شہاب الدین دسنوی کے عہد میں اس انسٹی ٹیوٹ نے خاصی ترقی کی اور آج کے پرنسپل جناب قادر حسین بھی جدید رجحان کے حامل ہیں اور ملک و قوم کی ترقی سے دل چسپی رکھتے ہیں ۔

دینی درس گاہیں

دارالعلوم دیوبند

حاجی حافظ سید عابد حسین اور مولانا مہتاب علی نے ایک مکتب قائم کرنے کی تحریک کی۔ حاجی عابد حسین نے رومال پھیلایا اور خود ہی سب سے پہلے چندہ دیا۔ 1866ء میں، دیوبند کی ایک مسجد چھتہ کے صحن میں انار کے درخت کے سائے میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔ پہلے استاد ملا محمود تھے اور پہلے شاگرد بھی محمود ہی تھے (جنھوں نے بعد میں شیخ الہند کا مرتبہ پایا) بعد میں یہ مدرسہ قاضی کی مسجد میں آگیا اور پھر کرایے کے ایک مکان میں منتقل ہوگیا۔ اس معمولی مکتب کو دارالعلوم بنانے والے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ 30 مئی 1867ء کو رئیس دیوبند شیخ نہال احمد کی دی ہوئی زمین پر میاں جی منے شاہ صاحب نے دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نانوتوی نے خواب دیکھا تھا: "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔" دراصل اس ادارے کے قائم کرنے کا مقصد مغربی تہذیب و تمدن اور نظریات کو رد کرنا تھا۔ اسی لئے بانی دارالعلوم مولانا نانوتوی کی ہدایت تھی "تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ سرکار اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔" دارالعلوم کے نصاب میں 22 علوم و فنون داخل ہیں یعنی قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم عقائد و کلام، علم الاحسان (تصوف)، علم اُلفرائض و اُل مواریث، صرف، نحو، معانی و بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض و قوافی، مناظرہ، ہیئت، ہندسہ، حساب، طب تجوید و قرأت۔ پچھلے چند برس سے درجات عربیہ میں جغرافیہ، تاریخ، مبادی سائنس اور معلومات عامہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حال ہی میں انگریزی، اور ہندی پڑھانے اور دست کاری کے کلاس بھی شروع کئے گئے ہیں۔ درجات عربیہ کا کورس گیارہ برس کا ہے۔ تعلیم مفت دی جاتی ہے یعنی قیام و طعام، نصاب کی کتابیں اور دوسری چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی دارالعلوم ہی کی جانب سے پوری کی جاتی ہیں۔ لباس، تیل، صابن اور بستر وغیرہ بھی۔ طالب علموں کی تعداد (بشمول بیرون ہند) ہر سال کم و بیش ڈیڑھ ہزار رہتی ہے۔ پچھلے ایک سو برس میں تقریباً 70 ہزار لڑکوں نے تعلیم پائی ہے ان میں سے 500 نے معلمین، 275 نے مصنفین 165 نے مفتی، 115 نے مناظر، 110 نے صحافی، 290 نے خطیب و مبلغ اور 165 نے اطبا کی حیثیت سے اعلا درجے کا مقام پایا۔ ان دنوں دارالعلوم کا اسٹاف 175 افراد پر مشتمل ہے۔ ادارے کا نقد سرمایہ بینک میں جمع نہیں کیا جاتا۔ دارالعلوم کا اپنا سیلف ڈپارٹ اور خزانہ ہے۔ ہر برس تقریباً 10 ہزار فتوا چاہنے والوں کو جواب دیا جاتا ہے۔ دارالعلوم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ابتدا ہی سے چند ایسے قوم پرستوں کا گہوارہ رہا ہے جنھوں نے آزادی ہند کی جد و جہد میں ناقابل بیان مصائب برداشت کئے ہیں اور جان و مال کی قربانی دی ہے۔ دارالعلوم کی لائبریری میں عربی زبان سے تامل تک تقریباً 80 ہزار کتابیں موجود ہیں۔ خصوصی قلمی نسخوں میں قرآن شریف کے چند نادر و بیش قیمت نسخے بھی موجود ہیں۔ انتظام کی خاطر لائبریری کو 9 مختلف شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دارالعلوم کا سالانہ بجٹ کم و بیش 9 لاکھ روپے ہوتا ہے۔ 1941ء سے ایک ماہ نامہ بنام "دارالعلوم" جاری ہے جو اس ادارے کا آرگن ہے۔

مظاہر علوم سہارن پور

فقہ کے استاد مولانا سعادت علی نے 1866ء میں سہارن پور میں مظاہر علوم کی بنیاد رکھی۔ مولانا کے شاگرد ہی اس مدرسے کے پہلے طالب علم بنے۔ مولانا سعادت علی پہلے مدرس مقرر ہوئے۔ ابتدا میں یہ مکتب مدرسہ سہارن پور کے نام سے مشہور تھا۔ مدرسہ قدیمہ کی عمارت میں منتقل ہونے پر اس کا نام مظاہر علوم رکھا گیا۔ مظاہر علوم کی کئی اقامت گاہیں ہیں اور ہر ایک میں مسجد ہے۔ مظاہر علوم کا اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جو 30 ہزار کتابوں پر مشتمل ہے مدرسے میں طالب علموں کی تعداد کم و بیش 8 سو ہے جن میں زیادہ طلبا کے کل اخراجات (قیام، طعام، لباس، بستر بچھونا، علاج، کتابیں وغیرہ) کی کفالت مدرسہ ہی کرتا ہے۔ مدرسے کا بجٹ اہل خیر ہی کی امداد و اعانت سے پورا ہوتا ہے۔ اس ادارے کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ ہند مولانا محمود حسن اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسی مقتدر ہستیاں اس ادارے کی سرپرستی فرما چکی ہیں اور مولانا اشرف علی نے اس مدرسے [illegible]

میں تعلیم بھی پائی تھی۔ اصول و عقائد کے لحاظ سے یہ ادارہ دارالعلوم دیوبند ہی کا ہم مسلک ہے۔

جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد

تقریباً ایک صدی پہلے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مراد آباد میں اس دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ کہتے ہیں کہ جب چندے کی اپیل کی گئی تو جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ ایک بہشتی تھا اور اس نے چندے کے طور پر صرف ایک پیسہ دیا۔ مدرسے کے پاس اپنا کوئی فنڈ نہیں ہے۔ ساٹھ ستر ہزار روپے سال میں خرچ ہوتے ہیں۔ چندوں پر مدرسے کی آمدنی منحصر ہے۔ یہ مدرسہ اس لئے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اکثر مدرسین اور طلبا تحریکِ خلافت اور جنگِ آزادی میں حصہ لے چکے ہیں۔

جامعہ اسلامیہ عربیہ امروہہ

تقریباً سو برس پہلے بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا نانوتوی کے ایما پر امروہے کے چند مسلمانوں نے مدرسہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ مولانا نانوتوی کے شاگرد مولانا سید احمد حسن نے اس مدرسے کے نظام کو باقاعدہ اور باضابطہ بنایا اور علم حدیث و تفسیر، علم فقہ و تصوف اور معقولات و منقولات میں سے ہر فن کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا احمد حسن مدرسے کے ناظم بھی تھے اور مدرس اعلا بھی۔ مولانا حافظ عبدالرحمان سیوہاروی کے زمانے میں اس مدرسے نے اور زیادہ ترقی کی۔ اس مدرسے میں شعبۂ درس و تدریس کے ساتھ شعبۂ تبلیغ بھی ہے اس شعبے میں مستقل مبلغین کے ساتھ ساتھ طلبا و مدرسین تبلیغ کے لیے باہر جاتے ہیں۔ مدرسے میں شعبۂ افتا بھی قائم ہے عربی، فارسی، اردو، ریاضی، حفظ و ناظرہ قرآن شریف کی تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد تقریباً پانچ سو رہتی ہے۔ علوم عربیہ کے طلبا کے لیے مدرسے کا ایک دارالاقامہ بھی ہے۔ جامع مسجد کا جملہ انتظام بھی اس مدرسے ہی کے تحت ہے۔ مدرسے کا اپنا کتب خانہ ہے جو پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل ہے درسی کتب کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ، تفسیر و تاریخ، سیرت، تصوف، سلوک، ادب، لغت، طب و معالجہ، مناظرہ اور علم کلام کی اچھی کتابیں موجود ہیں۔ اس مدرسے کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہاں سے تعلیم پانے کے بعد بہت سے اصحاب نے عالم، مبلغ، مفتی، مدرس اور طبیب کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا ہے اور اس مدرسے میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی جیسی نامور ہستیوں نے درس دیا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دیوبندی مولویوں کے کٹرپن اور علی گڑھ کی انتہائی دنیاداری سے ہٹ کر اور درسِ نظامیہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شبلی، حبیب الرحمان شیروانی، شاہ سلیمان پھلواری، اظہر علی کاکوروی، احتشام علی کاکوروی، ابراہیم آروی، قاضی سلیمان منصور پوری، ثناء اللہ امرتسری، سر رحیم بخش، مسیح الزماں خاں، خلیل الرحمان سہارن پوری، نواب سید علی حسن خاں، حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا آزاد جیسے مختلف خیال علماء نے قدیم و جدید کا جامع علمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا 1892ء میں جب کہ کانپور میں مدرسہ فیضِ عام کا جلسہ تھا ڈپٹی کلکٹر مولوی عبدالغفور نے سنجیدگی سے یہ تحریک شروع کی اور آخر 1894ء میں مولوی سید محمد علی کانپوری نے لکھنؤ میں ندوے کی بنیاد رکھی۔ مولوی عبدالحق محدث دہلوی اور مولانا شبلی نے اغراض و مقاصد ترتیب دیئے:-

> "علما کے باہمی نزاع کا دفع و اخلاقی مسائل کے ردّ و قدح کا پورا پورا انسداد۔ دینی امور میں فتوے دینے کے لئے محکمۂ افتا، کا ہونا جس میں بڑے بڑے عالم و مفتی ہوں گے عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اُس کی تدابیر مگر سیاسی و ملکی معاملات اس سے علاحدہ ہیں ایک عظیم شان دارِ علوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے سوا عملِ صنائع کی تعلیم ہو۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح اور علومِ دین کی ترقی اور تہذیبِ اخلاق اور شائستگی و اطوار ـــــ"

ان مقاصد کو سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک اور وقار الملک نے بھی پسند کیا۔ شبلی کی تجویز پر ہی 1898ء میں دارالعلوم قائم کیا گیا جس کا نصاب قدیم و جدید علوم کے میل کی بنیاد پر رکھا گیا۔ 1899ء میں شاہجہان پور کے چند رؤسا نے ندوے کے نام ایک معقول جائداد وقف کردی جس کی آمدنی سے ایک بڑے کتب خانے کی بنیاد پڑی۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ کسی غلط فہمی کی بنا پر یو پی کے گورنر میک ڈونل ندوے کے مخالف ہو گئے۔ حیدرآباد سے آکر مولانا شبلی نے ندوے کا انتظام سنبھالا اور ادارے اور حکومت کے بیچ جو بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اس کو دور کیا۔ مسلم ریاستوں (رام پور، بھوپال، بھاول پور وغیرہ) کا دورہ کرکے ندوے کے لیے خاص سرمایہ فراہم کیا۔ حکومت یو۔پی سے کوشش کرکے ایک قطعہ اراضی لے کر گورنر سر جان ہیوٹ کے ہاتھوں 28 نومبر 1908ء کو دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ ندوۃ العلماء، علماء کے باہمی نزاع کے دفع کے لیے قائم کیا گیا تھا مگر 1913ء میں شبلی اس ادارے سے اسی بنا پر الگ ہو گئے کہ علماء کا باہمی نزاع اُن کے لیے ناقابل برداشت بن چکا تھا۔

ندوے کے سربراہوں کا کہنا ہے کہ ندوہ قدیم صالح و جدید نافع دونوں سے استفادے کا قائل ہے چنانچہ ندوے میں قرآن اور اس کی تفسیر، حدیث شریف، اور فقہ اسلامی نیز عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب کے ساتھ حساب، ہندسہ، طبیعات، علم سیاسیات و اقتصادیات، سوشل اسٹڈیز، انگریزی و ہندی زبان کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ ندوے کے علمی معیار کو مصر، شام، دمشق، سعودی عربیہ کی یونی ورسٹیوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ندوے میں طالب علموں کی تعداد کم و بیش ایک ہزار ہے جن میں اکثر طلباء کے قیام و طعام اور تعلیمی اخراجات ندوہ ہی برداشت کرتا ہے۔ مدرسین اور اسٹاف کی مجموعی تعداد ایک سو ہے ندوہ کا بجٹ 6 لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ ہوتا ہے یہ ایک آزاد تعلیمی ادارہ ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں کلکتے کے چند ممتاز مسلمانوں کی درخواست پر گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے کلکتے میں اکتوبر 1780ء میں ایک اسلامی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ مولانا مجید الدین اور مولانا امین کو مدرسے کا نگراں مقرر کیا گیا۔ ابتدا میں مدرسے کا بجٹ 625 روپے ماہانہ تھا جو گورنر جنرل خود برداشت کرتے تھے مدرسہ جب ترقی کر گیا تو خرچ بھی بڑھ گیا چنانچہ سرکار کی جانب سے 24 پرگنہ کی کچھ جائداد دے کر مدرسہ بورڈ آف ریونیو کے تحت دے دیا گیا اور یہ بورڈ اس جائداد کی آمدنی سے مدرسے کا خرچ برداشت کرنے لگا۔ سرکار نے شہر کلکتہ ہی میں مدرسے کی عمارت کے لیے زمین بھی دی اور 15 ہزار روپے سے عمارت بھی تعمیر کروادی اور مزید 12 سو روپے ماہانہ اخراجات کے لیے سرکار سے مدرسے کو ملنے لگے۔ ابتدا میں مدرسے عربی و فارسی ہی کی تعلیم ہوتی تھی اسی لیے فوج کے وہ اعلا افسر جو عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے عموماً وہی مدرسے کے پرنسپل بنائے جاتے تھے اُن دنوں عدالتی کام بھی فارسی میں ہوتا تھا اس لیے اس مدرسے کے پڑھے ہوئے نوجوانوں کو منصفی و قاضی عدالت یعنی ڈپٹی مجسٹریٹ کا عہدہ بڑی آسانی سے مل جاتا تھا۔ کلکتے کی آبادی جب جنوب کی طرف بڑھنے لگی تو مدرسے کی موجودہ عمارت تعمیر کی گئی جس پر 1½ لاکھ روپے خرچ ہوئے اور 1827ء میں مدرسہ نئی عمارت میں منتقل ہو گیا 1857ء میں مدرسے میں اینگلو پرشین شعبہ قایم کیا گیا جس کے نتیجے میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی شروع کی گئی اور ہائی اسکول کا مکمل کورس مدرسے کے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ 1870ء میں نصاب میں پھر تبدیلی کی گئی اور گورنر کیمپ بل کی کمیٹی نے مدرسے کے نصاب میں کافی اصلاح کی۔ جمعہ کو آدھے دن کی اور اتوار کو مکمل دن کی چھٹی ہونے لگی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ بنگلا زبان بھی پڑھائی جانے لگی۔ 1927ء میں پہلی بار ایک مسلمان (مولانا کمال الدین) کو مدرسے کا پرنسپل بنایا گیا۔ اس مدرسے کا تعلق محض کلکتا شہر ہی سے نہیں رہا بلکہ صوبہ بنگال کے دوسرے شہروں کے کئی تعلیمی ادارے اس سے ملحق رہے ہیں مگر 1947ء میں صوبہ بنگال کی تقسیم کی بنا پر اس مدرسے کا عربی شعبہ ڈھاکا منتقل ہو گیا اور اس کے دوسرے ملحق مدرسے بھی اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے تقسیم ہو گئے لیکن جمعیتِ علماء کی کوشش سے 1949ء سے اس مدرسے میں عربی کی تعلیم پھر شروع کردی گئی۔ مدرسہ عالیہ کے نصاب میں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ اسلام، عربی زبان و ادب، فارسی زبان و ادب، اردو زبان و ادب، منطق و فلسفہ اور انگریزی، بنگلا، ہندی، حساب، جغرافیہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ یہ مدرسہ ملک کا وہ تعلیمی ادارہ ہے جو انگریزوں نے سب سے پہلے قائم کیا۔

مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فتح پوری دہلی

1857ء میں مغلیہ دورِ حکومت ختم ہونے پر دہلی کی فتح پوری مسجد مسلمانوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دی گئی جس نے مسجد کی مرمت اور توسیع کا کام شروع کیا۔ مسجد کے چاروں اطراف میں دکانیں بھی تعمیر کرائی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسجد کے جملہ اخراجات سے آمدنی بڑھ گئی۔ چنانچہ مسجد کے متصل عربی مدرسہ قائم کر دیا گیا۔ 1947ء سے قبل اس مدرسے میں درسِ نظامیہ کے ساتھ ساتھ پنجاب یونی ورسٹی کے اورنٹیل امتحانات کی بھی تیاری کرائی جاتی تھی اور عربی تعلیم کی خاطر صوبہ سرحد، آزاد قبائل اور افغانستان سے بھی طالب علم آتے تھے مگر تقسیم ملک کے بعد نوعیت بدل گئی اور مدرسے میں صرف درسِ نظامیہ ہی کی تعلیم باقی رہ گئی لہٰذا پرائمری دینی کلاس شروع کر دی گئیں۔ طلبا کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو رہتی ہے۔ اساتذہ پانچ ہیں ویسے اس مدرسے سے کبھی مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبدالحق حقانی دہلوی جیسے فاضل و عالم لوگ وابستہ رہے ہیں۔ فتح پوری مسجد کا یہ مدرسہ چندوں سے نہیں بلکہ اوقاف کی آمدنی سے چل رہا ہے۔ ... سے کا نصاب وہی ہے جو دارالعلوم دیوبند کا ہے۔ (سجاد حسین صدر مدرس)

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

حاجی سید نور الہدیٰ 1911ء تک سیشن جج رہے، ریٹائر ہونے پر انھوں نے اپنے والد کے نام پر 1912ء میں یہ دینی مدرسہ قائم کیا۔ 1920ء میں اس مدرسے کو انھوں نے صوبائی حکومت کے انتظام میں دے دیا اور 25 ہزار روپے سالانہ کی جائیداد اس مدرسے کے نام وقف کر دی۔ آج ریاست بہار کا محکمہ تعلیم اس مدرسے کو چلا رہا ہے۔ طلبا کے قیام و طعام کا انتظام وقف کی آمدنی سے ہوتا ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ مدرسے میں قدیم و جدید دونوں طرح کی تعلیم ہوتی ہے۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

شعبان 1326ھ میں چند لوگوں نے ڈابھیل (ضلع سورت، گجرات) میں تعلیم الدین کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ یہ مدرسہ ایک دینی مکتب کی صورت میں 1350ھ تک چلتا رہا۔ اس مکتب کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر نے بڑی دلچسپی لی۔ وہ ان دنوں مہاراجا بڑودا کی جانب سے تعلقہ نوساری کے منتظم تھے۔ انہی کی کوشش سے 1350ھ کے بعد یہ مکتب ایک بڑا دارالعلوم بن گیا اور دارالعلوم دیوبند کے مولانا شاہ محمد انور کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے مثالی استادوں نے اس درس گاہ کو نوازا۔ متعدد درس گاہیں، دارالاقامہ، کتب خانہ اور مسجد کے بن جانے کے بعد اس مدرسے کا نام جامعہ اسلامیہ رکھا گیا۔ ڈابھیل کے اس جامعہ کا کتب خانہ ہندستان کے چند بڑے اسلامی کتب خانوں میں سے ایک ہے۔

جامعہ سیفیہ سورت

سورت (گجرات) کا یہ تعلیمی ادارہ بوہرہ برادری کے پیشوا مولانا سیدنا طاہر سیف الدین مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے۔ یہاں قرآن، تفسیر، تاویل، فقہ، تاریخ (تاریخ اسلامی، تاریخ فاطمی اور تاریخ ہند)، ادب عربی اور ادب فاطمی کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ ریاضی، علوم عامہ، کامرس، اکنامکس، سیاسیات اور دستورِ ہند کا بھی درس دیا جاتا ہے۔ اس ادارے میں اس بات پر بڑی توجہ دی جاتی ہے کہ اسلامی تعلیم پایا ہوا نوجوان اپنے سماج پر بوجھ نہ بنے بلکہ اس میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اسی لیے اس ادارے میں مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ فارغ التحصیل طلبا کو مدرسے کی جانب سے حج و زیارت کے لیے بھی بھیجا جاتا ہے۔

○ ○

• علم بلا کسب و طلب نہیں ملتا۔ ابن شہاب کا مقولہ ہے کہ طبیعت تربیت سے بنتی ہے اور علم تلاش سے ملتا ہے۔

جامعہ رحمانی مونگیر

مولانا محمد علی مونگیری نے 1927ء میں مونگیر (بہار) میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔ مقصد یہ تھا کہ مدارسِ اسلامیہ کے نصابِ تعلیم میں بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں کی رعایت بھی جائے مگر 1934ء کے زلزلے کے بعد یہ مدرسہ بند ہوگیا۔ مونگیر کی خانقاہ رحمانی کے سجادے امیر شریعت سید منت اللہ صاحب رحمانی نے 1942ء میں اس مدرسے کی از سر نو بنیاد رکھی۔ مدرسے میں تعلیم کی ابتدا عربی کی عالمیت و فضیلت کے درجات سے ہوئی۔ 1954ء میں مولانا منت اللہ کی دعوت پر مدرسے کے لیے دینی علوم کے ماہرین نے ایک نیا نصاب ترتیب دیا یعنی قدیم نصاب میں جدید کتب داخل کر کے مدرسے میں نصابِ جدید رائج کر دیا گیا۔ یہ چند سالہ نصاب قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، نحو و صرف، بلاغت و بیان، منطق و فلسفہ، سائنس، جغرافیہ، تاریخ، حساب، ہندی اور انگریزی پر مشتمل ہے۔ 9 فروری 1966ء سے دورۂ حدیث سے متعلق فضیلت کا درجہ بھی کھول دیا گیا۔ جامعہ کی جانب سے دو سندیں ہیں ایک عالمیت کی دوسری فضیلت کی۔ ایک آٹھ سالہ عربی نصاب کی تکمیل کے بعد دی جاتی ہے اور دوسری نو سالہ نصاب کے مکمل ہو جانے پر۔ جامعہ کے طلبا مرحوم سید محمد علی مونگیری کے ذاتی 'کتب خانہ رحمانیہ' سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ کتب خانہ عربی، فارسی اور اردو کی تیرا ہزار کتابوں پر مشتمل ہے۔ جامعہ کی تعلیم گاہ اور دارالاقامہ کی نئی سہ منزلہ عمارت حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے جس پر تین لاکھ روپے سے زائد خرچ آیا ہے۔ خانقاہ رحمانی کی مسجد جو کبھی 1901ء میں تعمیر ہوئی تھی جامعہ رحمانی کے طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر از سر نو بنوائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے حاجی عبادت حسین پورینا والوں نے 50 ہزار روپے دیے تھے۔

مفتاح العلوم بھیمڑی تھانا

1371ھ میں بھیمڑی (جس کا اسلامی نام اسلام آباد ہے) میں قاضی اطہر مبارک پوری نے مفتاح العلوم کے نام سے ایک مدرسۂ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ حاجی ولی اللہ صاحب نے مدرسے کے لیے اپنا مکان وقف کر دیا اور مدرسین کے قیام و طعام کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی۔ عثمان غنی رحیم اللہ اور محمد بن عبدالغفور نے پچیس پچیس روپے کی رقم تنخواہ کے لیے دینا منظور کی۔ اس طرح 20 طالب علموں اور ایک استاد سے اس مدرسے کی ابتدا ہوئی۔ بعد میں مدرسے نے ترقی کی اور مدرسہ مکان سے ہندوستانی مسجد میں منتقل ہو گیا۔ آخر 11 اکتوبر 1954ء کو مدرسے کے لیے ایک مستقل عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ ان دنوں اس مدرسے میں طالب علموں کی تعداد تقریباً تین سو ہے جن میں پچاس کے قریب پردیسی ہیں جن کے قیام و طعام کا انتظام مدرسے ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اساتذہ کی تعداد آٹھ ہے۔ نحو و صرف، لغت، ادب، معانی و بیان، فقہ، اصول فقہ، منطق، آمدنامہ، گلزار دبستان، گلستاں، بوستاں، چہل سبق، حفظ و ناظرہ و تجوید اور اردو، ہندی اور مراٹھی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدرسے کا اپنا کتب خانہ ہے جس میں فقہ، حدیث، سوانح، تاریخ، ادب اور قرآن کے مختلف نسخے موجود ہیں اور سعودی عرب کی حکومت بھی اکثر اپنی جانب سے کتابیں دیتی رہتی ہے۔ جمعیت الطلبا کے نام سے طلبا کی اپنی ایک انجمن بھی ہے۔ (ضیا بانی)

دارالعلوم دیوان شاہ بھیمڑی تھانا

'دارالعلوم دیوان شاہ' بھیمڑی (عرف اسلام آباد) کے ایک بزرگ سیدنا شاہ حسین قادری عرف دیوان شاہ کے نام سے منسوب ہے۔ اس دینی مدرسے کی بنیاد 31 مارچ 1969ء کو مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی نے بھیمڑی میں رکھی۔ مئی 1969ء سے مدرسے کی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ دارالعلوم کا تعلیمی پروگرام یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے عربی و فارسی ڈپلوما کورس کی تعلیم دینا، انگریزی تعلیم کے شعبے کھولنا، صنعت و حرفت اور حفظانِ صحت اور اسپورٹس وغیرہ کی تعلیم دینا اور مستحق طلبا کے قیام و طعام، لباس وغیرہ کا انتظام کرنا۔ دارالعلوم کا اپنا ایک اردو رسالہ 'دارالعلوم میگزین' بھی ہے جو برس میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔
(ضیا بانی)

مندرجہ بالا دینی اور اسلامی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ قدیم نہج کے دینی مدرسے ملک میں بے شمار ہیں جن میں (دہلی) مدرسہ امینیہ کشمیری گیٹ، مدرسہ

کاشف العلوم بستی، نظام الدین (اتر پردیش) جامعہ احیاء العلوم مبارک پور، مفتاح العلوم مئو۔ مدرسہ جعفریہ ہدایت العلوم بستی۔ جامعہ مسعودیہ نور العلوم بہرائچ، جامعہ مظہر العلوم بنارس۔ حشمتیہ رحمت غازی پور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، منظر اسلام بریلی، مظہر الاسلام بریلی۔ مدرسہ رضویہ بنارس۔ جامعہ جوادیہ بنارس، کلیۃ ایمانیہ بنارس۔ جامعہ ناظمیہ لکھنؤ، سلطان المدارس لکھنؤ۔ مدرسہ عالیہ رام پور۔ (بہار) مدرسہ اصلاح المسلمین پٹنہ۔ مدرسہ اشرفیہ نیا بھوج پور۔ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف۔ مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور۔ مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے۔ مدرسہ سعیدیہ لہریا سرائے (آندھرا پردیش) مدرسہ انوار العلوم رایاتسوتی۔ مدرسہ اسلامیہ کرنول۔ مدرسہ انوار العلوم حیدرآباد۔ مدرسہ مدینۃ العلوم کرنول۔ جامعہ نظامیہ حیدرآباد (بنگال، آسام، اڑیسہ) مدرسہ دار الحدیث بدرپور۔ المدرسۃ السلطانیہ کٹک۔ مدرسۂ عالیہ کلکتہ۔ (گجرات و مہاراشٹر) مدرسہ دار العلوم اشرفیہ ناندیڑ۔ جامعہ حسینیہ راندیر۔ مدرسہ تعلیم اسلام بمبئی۔ (جنوبی ہند) مدرسۃ العلوم لبلی کال۔ کلیہ عربیہ کوڈی کوڈ۔ مدرسہ باب الاسلام کالی کٹ۔ مدرسہ بیت المجاہدین کالی کٹ۔ مدرسہ معدن العلوم کنا نور۔ مدرسہ اشاعت العلوم بیا جام پیٹ۔ جامعہ لطیفیہ ویلور۔ مدرسہ باقیات الصالحات ویلور۔ جامعہ دار الاسلام عمرآباد۔ روضۃ العلوم مالابار۔ مدرسہ معدن العلوم وانم باڑی شمالی ارکاٹ۔ مدرسہ اشاعت الحسنات بیادم پیٹ۔ مدرسہ منبع العلوم لال پیٹ۔ مدرسہ حقانیہ بنگلور۔ جامعہ محمدیہ رائے ڈرگ۔ مدرسہ محمدیہ مدراس۔ اور مدرسہ معینیہ اجمیر اور دار العلوم خالدیہ ٹونک کے نام اہم ہیں۔

تصنیفی تالیفی واشاعتی ادارے

دارِ مصنفین اعظم گڑھ

1914ء میں مولانا شبلی نے اپنے چند ہم قلموں کے تعاون سے اعظم گڑھ میں تصنیف و تالیف کا یہ ادارہ قائم کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی ذاتی جائے داد یعنی اپنا مکان اور باغ اور کتب خانہ بھی وقف کر دیا۔ مولانا سلیمان ندوی اس ادارے کے سرپرست رہے۔ دارِ مصنفین میں ایک پریس کا بھی شعبہ قائم ہے۔ 'سیرت النبی'، 'الفاروق' و 'المامون' جیسی اہم اسلامی کتابوں نے علوم اسلامی میں اہم اضافے کیے ہیں۔ 1965ء میں اس ادارے کی گولڈن جوبلی بڑی شان سے منائی گئی تھی۔ اس موقع پر مرحوم صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں حکومت ہند نے 25000 روپے عطیہ دیا تھا۔ 1915ء میں یہ ادارہ دو شعبوں میں بٹ گیا۔ ایک کا نام شبلی اکاڈمی رکھا گیا اور ایک دارِ مصنفین ہی رہا۔ ماہ نامہ 'معارف' اسی ادارے سے شائع ہوتا ہے۔

ندوۃ المصنفین دہلی

یہ ادارہ، تصنیف و تالیف اور اشاعت جس کا مقصد ہے 1938ء میں قائم ہوا۔ اب تک کم و بیش سو کتابیں اس ادارے نے شائع کی ہیں جن میں 'فاروق اعظم کے سرکاری خطوط'، 'حضرت ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط'، 'حضرت عثمان غنی کے سرکاری خطوط' اور 'تفسیر مظہری' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ترتیب و تدوین تصنیف و تالیف میں ادارہ اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اس ادارے کو مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے عالموں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ آج کل مولانا عتیق الرحمان عثمانی دیوبندی اس ادارے کے سربراہ ہیں۔ 'برہان' ادارے کا آرگن ہے۔

دار الترجمہ حیدرآباد

حیدرآباد کی عثمانیہ یونی ورسٹی نے جب اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا تو 1917ء میں دار الترجمہ کی بنیاد پڑی۔ اس ادارے نے یونی ورسٹی کے مکمل کورس کی کتابیں تیار کیں اور تاریخ، جغرافیا، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات، ریاضیات، طبعیات، حیاتیات، قانون، فلسفہ، کیمسٹری اور انجینیرنگ کی 358 کتابیں ترجمہ کیں۔ اردو میں سائنٹی فک الفاظ کے مترادف قائم کرنے، وضع الفاظ اور اصطلاحاتِ علمیہ کا بڑا کام انجام دیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا عبداللہ عمادی، مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی عنایت اللہ دہلوی، مولوی مسعود علی محوی جیسے علما اس ادارے سے

منسلک رہے ہیں۔ اس ادارے کا 26 لاکھ روپے سالانہ خرچ نظام حکومت برداشت کرتی تھی۔ 1948ء میں ریاست کے ختم ہونے پر یہ ادارہ بند کردیا گیا اور اس کے کتب خانے میں آگ بھی لگ گئی جس سے کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔

دائرت اُل معارف حیدرآباد

1888ء میں سید حسین بلگرامی ملا عبدالقیوم اور مولانا انوار اللہ خاں کی تحریک پر یہ علمی ادارہ قائم کیا گیا۔ تاریخ، فلسفہ، ریاضیات، حدیث اور اسلامی علوم کی ایسی نادر کتابیں جو ... ان کو شائع کرنا اس ادارے کا مقصد ہے۔ اب تک یہ ادارہ کئی سو کتابیں شائع کرچکا ہے۔

ایوانِ اردو حیدرآباد

25 فروری 1931ء کو ادارہ ادبیاتِ اردو قائم ہوا تھا۔ حسن نظامی نے ادارے کی عمارت کا نام ایوانِ اردو رکھا۔ عمارت ہی کی تعمیر پر سوا چار لاکھ روپے صرف ہوئے۔ 2 جنوری 1955ء اس ادارے کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اس ادارے کی ابتدا حکومتِ ہند، حکومت کشمیر، نظام چیریٹی ٹرسٹ، سالار جنگ اسٹیٹ، نظام شوگر فیکٹری، سنگارینی کالریز اور عوام کے چندوں اور عطیوں سے ہوئی تھی۔ (انور مسعود)

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

یہ ادارہ 1947ء میں قائم ہوا۔ اس کا انتظام انجمن اسلام بمبئی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے تحت ہے اور یہ بمبئی کی یونی ورسٹی سے تسلیم شدہ ہے اور اس کو سرکاری امداد بھی حاصل ہے۔ اس ادارے کا مقصد اردو زبان و ادب کو فروغ دینا ہے اور یہ ادارہ اردو ادب کے طالب علموں کو ایم۔ اے کی سطح پر پی ایچ۔ ڈی کے لیے ریسرچ میں مدد بھی دیتا ہے۔ اس ادارے کی کریمی لائبریری 15 ہزار اردو، فارسی اور عربی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ادارے کا آرگن سہ ماہی اردو 'نوائے ادب' ہے۔

مکتبِ جامعہ لمیٹیڈ دہلی

مکتبِ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی کا ایک شعبہ ہے جو اردو کتابوں کی اشاعت اور فروخت سے تعلق رکھتا ہے یعنی یہ پبلشنگ ہاؤس بھی ہے اور بک ڈپو بھی۔ یہ ادارہ بچوں کے لیے کتابیں شائع کرنے میں بہت مشہور ہے۔ بہت عرصے سے اس ادارے سے بچوں کے لیے 'پیامِ تعلیم' نام کا ایک ماہ نامہ بھی شائع ہوتا ہے۔ جامعہ ملیہ کا آرگن 'جامعہ' مکتبِ جامعہ ہی سے شائع ہوتا ہے اور مکتبہ جامعہ کا آرگن 'کتاب نما' ہے۔

مندرجہ بالا مرکزی اداروں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے سلسلے میں یہ ادارے بھی اپنے کام کی بنا پر اپنا خاص مقام رکھتے ہیں: مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد۔ ادارہ اسلام و عصرِ جدید جامعہ نگر نئی دہلی۔ انڈو مڈل ایسٹ اسلامک انسٹی ٹیوٹ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ، شعبہ تصنیف و تالیف ندوت اُل علما، مکتبہ دار اُل فرقان آستانہ دہلی، دار اُل تصنیف مدینۃ الواعظین لکھنؤ، امامیہ مشن لکھنؤ، پرشین اینڈ عربک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکاڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگویجز سری نگر، ادارہ اشاعت دینیات بستی نظام الدین نئی دہلی، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز حیدرآباد، اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ، ادارۂ تحریکِ سیرتِ نبی حیدرآباد، وغیرہ وغیرہ۔

○

'سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم سکھایا، اُس کو پھیلایا
اور پھر اُس کی اشاعت کی۔'
حدیث

تصنیفی، تالیفی، اشاعتی و مذہبی اداروں کے رسائل

معارف (اعظم گڑھ)، برہان (دہلی)، البلاغ (بمبئی)، اَلفرقان (لکھنؤ)، اَلحضرت (بریلی)، الحسنات (رام پور) منادی، (دہلی) آستانہ (دہلی) زندگی (رام پور) تجلی (دیوبند)، دارالعلوم (دیوبند)، الجواد (بنارس)، انوار اَل اسلام (بنارس)، اَلواعظ (لکھنؤ)، المجیب (پھلواری شریف)، اَلحق (حیدرآباد)، ہما (لکھنؤ) شیرازہ (سری نگر)، اردو اکاڈمی جنرل (لکھنؤ)، کتاب نما (دہلی) شمع ملت (حیدرآباد)، ہماری زبان (دہلی) وغیرہ وغیرہ۔

لائبریریاں

خدا بخش لائبریری پٹنہ

خان بہادر خدا بخش کے آباد اجداد اکبر کے عہد میں عرب سے ہندستان آئے اور الٰہی پور (ضلع سارن بہار) میں سکونت اختیار کی۔ مغلیہ فوج اور عدالت سے اُن کا روزگار وابستہ رہا۔ اورنگ زیب نے جب فنونِ لطیفہ سے منہ موڑ لیا تو خدا بخش کے بزرگوں کو ادب و فن کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا ــــــــــ خدا بخش کے والد محمد بخش نے مرتے وقت 2 ہزار نادر مخطوطات محمد بخش کے حوالے کیں اور وصیت کی کہ وہ عوام کے لیے ایک لائبریری قائم کرے۔ خدا بخش نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق 1891ء میں ایک لائبریری کی بنیاد رکھی اور اس زمانے میں لائبریری کی عمارت پر 80 ہزار روپے صرف کیا۔ لائبریری کے قیام کے وقت کتابوں کی تعداد صرف 3 ہزار تھی اور ایک اندازے کے مطابق اُن کتابوں کی قیمت اس وقت ڈھائی لاکھ روپے ہوتی تھی۔ نادر کتابوں کی فراہمی کے لیے خدا بخش نے ایک عرب شخص کی خدمات حاصل کیں، وہ 50 روپے ماہانہ تنخواہ اور سفر خرچ لے کر مشرق وسطیٰ کے ممالک کا دورہ کرتا اور برس میں ایک بار واپس آتا اور نادر و کم یاب کتابوں کا ڈھیر لگا دیتا۔

اس لائبریری میں متعدد ایسے مخطوطات موجود ہیں جو انتہائی بیش قیمت بلکہ انمول ہیں جیسے حضرت علی کے خط کا ایک حصہ جو خط کوفی میں جھلی پر لکھا ہوا ہے قرآن کا ایک نسخہ جو خط کوفی میں جھلی کاغذ پر دوسری صدی ہجری میں لکھا گیا۔ ایک طبی کتاب جو جڑی بوٹیوں اور کیڑے مکوڑوں سے متعلق ہے۔ یہ کتاب ایک یونانی طبیب نے لکھی تھی۔ خلیفہ مامون کے عہد میں اس کا ترجمہ عربی میں ہوا اور پھر اس کا ایک نسخہ شیروان کے حکیم جلال الدین کے خیراتی ہسپتال میں سو برس تک پڑا رہا۔ آخر یہی نسخہ خدا بخش لائبریری تک پہنچا۔ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران کا دیوان جس پر کئی مغل بادشاہوں کے دستخط اور مہریں ثبت ہیں۔ اس دیوان کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو اس لائبریری میں موجود ہے۔ جامی کا لکھا ہوا 'یوسف زلیخا' کا وہ نسخہ جو اورنگ زیب نے 20 ہزار روپے میں خریدا تھا۔ فردوسی کا وہ مصور 'شاہ نامہ' جو کبھی کشمیر کے گورنر علی مردان نے شاہ جہاں کو پیش کیا تھا۔ دیوان حافظ کا وہ نسخہ جس سے کبھی ہمایوں فال نکالا کرتا تھا 'تاریخ خاندان تیموریہ' کا وہ نسخہ جو اکبر کے عہد میں لکھا گیا اور جس پر شاہ جہاں کے دست خط موجود ہیں۔ اس لائبریری میں فرانسیسی، جرمن اور انگریزی زبان کی بھی بہت سی نایاب کتابیں موجود ہیں جیسے 'لائف آف نپولین' جو نپولین کے سیکریٹری نے لکھی تھی اور نپولین سوئم کی ملکیت تھی۔

1905ء میں لندن کے برٹش میوزیم نے لارڈ کرزن کے توسط سے خدا بخش لائبریری کی ساری کتابیں خرید لینا چاہا تھا اور 5 لاکھ پونڈ کی پیش کش کی تھی مگر خدا بخش نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ یہ کتب خانہ عوام کا ہے۔ خدا بخش ابتدا (1891ء) ہی میں اپنی لائبریری اور اس کی عمارت کو حکومت ہند کی سرپرستی میں دے چکے تھے اور اُس وقت اس لائبریری کا نام 'اورنٹیل پبلک لائبریری' رکھا گیا تھا۔ اس وقت لائبریری میں عربی، فارسی اور اردو کے 12 ہزار مخطوطات (متعدد ایسے مخطوطات بھی ہیں جو کبھی قسطنطنیہ، دمشق، یمن اور بغداد کے کتب خانوں سے تعلق رکھتے تھے) کے ساتھ ساتھ تقریباً 50 ہزار طبع شدہ کتابیں موجود ہیں۔ بہت سے کم یاب اور قدیم رسائل کے فائل، قدیم سکے اور گراں قدر کلاسیکی تصاویر بھی ہیں۔ ان دنوں لائبریری کا عملہ 37 افراد پر مشتمل ہے 50 ہزار روپے سالانہ سرکار سے امداد ملتی ہے۔ پنج سالہ منصوبے کے تحت بھی لائبریری کی مزید ترقی کے لیے حکومت کی جانب

کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

ادارہ ادبیاتِ اردو 1931ء میں قائم ہوا اور اس کا یہ کتب خانہ 1936ء میں قائم کیا گیا۔ اس کتب خانے کی بیشتر کتابیں ڈاکٹر زور کا عطیہ ہیں۔ اس کتب خانے میں بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں جو نوادرات کا درجہ رکھتی ہیں خصوصی طور پر قدیم اخبارات و رسائل کے مکمل فائل اس کتب خانے کا بیش قیمت سرمایہ ہیں جیسے دہلی اردو اخبار 1851ء، جامع الاخبار مدراس 1852ء، فوائد الناظرین دہلی 1845ء، اودھ پنچ لکھنؤ 1878ء وغیرہ۔ 1814ء میں ہنری مارٹن اور مرزا فطرت نے انجیل مقدس کا جو ترجمہ 'عہد جدید' کے نام سے کیا تھا وہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ مخطوطات میں حضرت خواجہ بندہ نواز کا 'حق نامہ' مکتوب 822ھ، مکاتیب خواجہ بندہ نواز مکتوبہ 1100ھ اور شیخ اشرف کی 'نوسرہار' بھی موجود ہے جو 909ھ کی تصنیف ہے۔ یہ دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو اس کتب خانے میں موجود ہے۔ میر امن کی 'باغ و بہار' کا وہ نسخہ بھی یہاں موجود ہے جو کبھی ناصر الدولہ آصف جاہ نے بطور خاص نقل کروایا تھا (انور مسعود)

مولانا آزاد سنٹرل لائبریری بھوپال

اس لائبریری کی شاندار عمارت نواب سلطان جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے بنوائی تھی اور 1931ء میں جب یہ لائبریری قائم کی گئی تو بھوپال کے آخری نواب محمد حمید اللہ خاں کے نام پر اس لائبریری کا نام 'حمیدیہ لائبریری' رکھا گیا۔ 1947ء کے بعد یہ نام 'مولانا آزاد سنٹرل لائبریری' سے بدل گیا۔ یہ لائبریری اپنے 400 مخطوطات کی بنا پر مشہور رہی ہے جو اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد 25 ہزار ہے۔

رضا لائبریری رام پور

یہ ہندوستان کی چند قدیم ترین لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس کی بنیاد رام پور کے پہلے نواب سید فیض اللہ خاں نے رکھی تھی مگر اس لائبریری نے صحیح معانی میں ترقی تب کی جب 1840ء میں نواب سید محمد سعید خاں تخت پر بیٹھے۔ نواب سعید خاں نے توشک خانے کا ایک کمرہ لائبریری کے لیے دے دیا اور کتابوں کو ترتیب وار الماریوں میں رکھنے کا حکم دیا۔ 1857ء کے غدر میں جہاں بہت سے عالموں نے رام پور کے نواب سید یوسف علی خاں کے دربار میں پناہ لی وہاں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کے نادر مخطوطات اور کتب بھی ریاست رام پور میں لاکر نواب یوسف علی خاں کی حفاظت میں دے دی گئیں۔ نواب یوسف علی خاں نے یہ سارا ادبی ذخیرہ خرید کر اپنی ریاست کی لائبریری میں شامل کر لیا۔ 1865ء میں سید کلب علی خاں کے نواب بننے پر ریاست کی اس لائبریری میں انگریزی زبان کی کتابیں آنا شروع ہوئیں۔ 1887ء میں نواب سید مشتاق علی خاں نے لائبریری کے لیے باقاعدہ ایک عمارت کا سنگ بنیاد رکھا اور ریاست کے سالانہ بجٹ میں لائبریری کے خرچ کے لیے بھی گنجائش رکھی۔ 31 مارچ 1892ء کو نواب سید حامد علی خاں نے لائبریری کی نئی عمارت کا افتتاح کیا اور اپنے شاہی (فیملی حکیم) حکیم اجمل خاں کو اس لائبریری کا انچارج مقرر کیا۔ حکیم صاحب کی ذہانت اور ادبی ذوق سے اس لائبریری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنے ذرائع سے شام، عراق، مصر، ایران اور یورپی ممالک سے بہت سی معیاری کتابیں منگوا کر اس لائبریری کو ملک کی ایک اچھی اور بڑی لائبریری بنا دیا۔

ریاست کے ہر نواب نے اس لائبریری کی ترقی میں ہمیشہ دلچسپی لی۔ ایک بار کلکتے کی امپیریل لائبریری کے لائبریرین مسٹر جے۔ اے۔ چیپ مین کو بلا کر رام پور کی اس لائبریری کا نگراں مقرر کیا گیا تھا۔ 1935ء سے ایک اشاعتی شعبہ قائم کر دیا گیا تاکہ نادر مخطوطات کو شائع کیا جا سکے۔ ابتدا میں اس لائبریری کا نام اسٹیٹ لائبریری تھا، 1947ء کے بعد (آخری نواب سید رضا علی خاں کے نام پر) نام بدل کر رضا لائبریری کر دیا گیا۔ اس لائبریری میں عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ترکی، پشتو، گجراتی، تامل اور تیلگو کے بہت سے نایاب اور انمول مخطوطات موجود ہیں۔ نادر طغرے بھی ہیں اور ایرانی، راجپوتی، انڈو مغل اور منگولی طرز کے مصوری کے چند شاہکار بھی یہاں موجود ہیں۔ علم نجوم سے متعلق قدیم آلات بھی یہاں رکھے ہوئے ہیں۔ قلمی نسخوں کی تعداد گیارہ ہزار سے زیادہ ہے۔

[illegible]

عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد

1918ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد ہی یونیورسٹی کی یہ لائبریری قائم ہوئی۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ہر شعبے کی اپنی ایک الگ لائبریری ہے مگر عثمانیہ یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری بہر اعتبار ہر شعبے کی ضرورت پوری کرتی ہے اور ملک کی چند بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس لائبریری کے عربی و فارسی سیکشن پر ہمیشہ بڑی توجہ دی گئی ہے۔ قلمی نسخوں کی تعداد کئی ہزار ہے۔ بھوج پتر پر لکھے ہوئے سنسکرت، مراٹھی، تیلگو اور کنڑی کے قلمی نسخے تو بہت ہی بیش قیمت ہیں۔ کتابوں کی مجموعی تعداد 50 ہزار سے زیادہ ہے۔

عوامی ادارہ بمبئی

بمبئی کا مدن پورا مسلمان محنت کش طبقے کا علاقہ ہے اور عوامی ادارہ اُن کی اپنی ایک باشعور تنظیم کی علامت ہے۔ نومبر 1952ء میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور 1959ء میں لائبریری اور جلسوں کے لیے ایک ہال تعمیر کیا گیا۔ لائبریری اردو کی تقریباً 4 ہزار کتابوں پر مشتمل ہے اور اردو، مراٹھی اور انگریزی کے بہت سے ادبی اور سیاسی تازہ رسالے اور اخبار روزانہ لائبریری میں موجود رہتے ہیں۔ اس ادارے میں ایک ٹی بی سینٹر بھی ہے جس کے ذریعے غریب مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ ادارے کے تحت محنت کش خواتین کے لیے ایک ٹیلرنگ کلاس بھی جاری ہے جہاں ایک سند یافتہ تجربہ کار لیڈی ٹیچر ٹیلرنگ سکھاتی ہے۔ عوامی ادارے کو خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، ظ۔ انصاری، کامریڈ جبار اور سورگیہ بل راج ساہنی کا تعاون ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ یہ ادارہ پبلک ٹرسٹ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے۔

گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ

1937ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں جب صوبہ بہار میں کانگریس کی وزارت قائم ہوئی تو ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بنائے گئے۔ انھوں نے اپنی وزارت کے تحت اعلان کیا کہ پورے صوبہ بہار میں تعلیم بالغان کی ایک تحریک چلائی اور اسی سلسلے میں انھوں نے ہندی پرلشید لائبریری اور اردو لائبریری کے نام سے دو ادارے قائم کئے۔ اردو لائبریری 1938ء میں پٹنہ میں قائم ہوئی۔ ان دنوں اس لائبریری میں اردو فارسی کی تقریباً 20 ہزار کتابیں موجود ہیں اور بہت سے اخبار اور رسالے اس لائبریری کے نام جاری ہیں۔ (مناظر ہرگانوی)

جمعیت لائبریری بھیونڈی

15 نومبر 1920ء کو بھیونڈی (ضلع تھانا، مہاراشٹر) میں کرگھا مسجد کے سامنے کے حصے میں یہ لائبریری قائم کی گئی۔ بعد میں لائبریری کی اپنی ایک چھوٹی سی عمارت کی تعمیر ہوگی اور مرحوم حاجی عبدالرزاق فقیہ نے افتتاح فرمایا۔ بستی کے متعدد علم دوست حضرات نے اپنی اپنی جانب سے اس لائبریری کو کتابیں اور لائبریری کے فنڈ سے بھی بہت سی کتابیں باہر سے منگوائی گئیں۔ 1943ء میں جب حاجی صدیق احمد فقیہ اس لائبریری کے سرپرست بنے تو انھوں نے 5 ہزار روپے چندہ کرکے لائبریری کے لیے اور زیادہ کتابیں خریدیں۔ جمعیت لائبریری حکومت مہاراشٹر سے رجسٹرڈ ہے اور بھیونڈی میونسپل کانفرنس سے اس کو 500 روپے سالانہ امداد حاصل ہے۔ (ضیا پانی)

اترپردیش اُردو اکاڈمی لکھنو

اترپردیش اردو اکاڈمی کی ابتدا لکھنؤ میں 30 جنوری 1972ء سے ہوئی۔ یہ سرکاری اکاڈمی ہے اس کے لیے پہلے برس 5 لاکھ روپے بجٹ

گیا۔ اس میں ایک لاکھ روپے اردو کتب خانوں اور لائبریریوں کے لیے اردو کتابیں، رسائل اور اخبارات خریدنے کے لیے مخصوص کر دیئے گئے۔ ایک لاکھ روپے اردو کتابوں پر انعامات کی صورت میں دیے گئے اور ڈھائی لاکھ روپے اکاڈمی کے تحت اردو کتابوں کی اشاعت، اردو کے معمر اور مالی حیثیت سے پریشان ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دینے، اردو ریسرچ کے لیے اسکالروں کو مالی اعانت دینے، اُردو مسودات کی طباعت میں جزوی مالی امداد دینے، اردو کے سلسلے میں سمینار منعقد کرانے اور ممتاز شخصیتوں کے لکچر کرانے اور دفتر کے اخراجات کے لیے رکھا گیا۔ پہلے برس 74 کتب خانوں اور لائبریریوں کو اکاڈمی سے امداد ملی۔ اکاڈمی معیاری اور مفید مسودوں کی طباعت میں اخراجات کے 50 فی صدی تک مالی امداد دیتی ہے۔ اکاڈمی کے اغراض و مقاصد میں ایک نہایت اہم مقصد اکاڈمی کے زیر انتظام مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرانا، دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرا کے کتابیں شائع کرانا، بچوں سے متعلق کتابیں شائع کرانا اور نایاب و اہم کتابوں کو دوبارہ شائع کرانا بھی شامل ہے۔ اکاڈمی کے مختلف شعبوں کا انتظام 9 اسب کمیٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

محمڈن اسپورٹنگ کلب کلکتہ

پچھلی پون صدی سے کھیل کود کا یہ ادارہ قائم ہے۔ فٹ بال، کرکٹ، ہاکی اور دوسرے کھیلوں کا یہ ایک بہت بڑا کلب ہے۔ ابتدا میں اس کا نام جوبلی کلب تھا۔ کلکتے کا یہ محمڈن کلب ہندستان کی تمام بڑی ٹرافیاں جیت چکا ہے۔ اس کلب کا سالانہ بجٹ 2 لاکھ روپے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کلب کے موجودہ جنرل سیکرٹری حاجی اللہ بخش سہگل ہیں۔ (اے۔ رحمان)

اَوْقَاف

طور بیت المال حیدرآباد

یہ 1966ء میں قائم ہوا۔ اس بیت المال کو ماہانہ زر اعانت ادا کرنے والے مسلمان 8 ہزار ہیں جو کم سے کم ایک روپیا اور زیادہ سے زیادہ حسب استطاعت اعانت کرتے ہیں۔ اس اعانت کے نتیجے میں جمع شدہ سرمایہ 3 لاکھ روپے ہے اور عام عطیوں کی صورت میں جمع شدہ رقم ایک لاکھ روپے ہے۔ دینی مدرسوں کے بچوں کے قیام و طعام کے سلسلے میں مالی امداد دینا، نادار اور یتیم لڑکیوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں مالی مدد دینا، لاوارث مردوں کی تجہیز و تکفین کا خرچ برداشت کرنا، عبادت گاہوں کی مرمت و تعمیر و توسیع پر خرچ کرنا، مستحق طلبا کو مزید تعلیم کے لیے مالی سہولت بہم پہنچانا، اتفاقی و قدرتی حادثوں کا شکار ہونے والے افراد کی امداد کرنا، شخصی ضمانت پر قرض دینا وغیرہ وغیرہ اس ادارے کے اغراض و مقاصد ہیں۔ پرنس مکرم جاہ نے اٹھارہ سو مربع گز کا پلاٹ عطا کیا تاکہ اس پر بیت المال کی عمارت تعمیر ہو سکے۔ عمارت کی تعمیر کا بجٹ 3 لاکھ روپے ہے۔ نقشہ تیار ہے اور تعمیر کی ابتدا ہونے والی ہے۔ (انور مسعود)

داؤد بھائی فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ بمبئی

داؤد بھائی فاضل بھائی خوجہ اثنا عشری جماعت بمبئی کے ایک معزز فرد تھے۔ ان کا انتقال 13 جون 1919ء کو ہوا۔ انھوں نے اپنے وصیت نامے کی رو سے 3.50 لاکھ روپے کی جائداد مسلمانوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی تھی۔ جنوری 1927ء سے اس ٹرسٹ نے اپنا کام شروع کیا۔ ٹرسٹ کی جانب سے مسلم طلبا و طالبات کو اعلا تعلیم کے حصول کے لیے وظیفے دیے جاتے ہیں اور متعدد تعلیمی ادارے بھی جاری ہیں جن میں داؤد بھائی فاضل بھائی ہائی اسکول، داؤد بھائی فاضل بھائی پرائمری اسکول اور داؤد بھائی فاضل بھائی نرسری اسکول قابل ذکر ہیں۔ ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور طلبا و طالبات کے لیے مخلوط ہے۔ اس ادارے کی جانب سے صرف لڑکیوں کے لیے جو اسکول جاری ہیں وہ داؤد بھائی فاضل بھائی ہوم سائنس انسٹی ٹیوٹ، داؤد بھائی فاضل بھائی گرانٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج اور داؤد بھائی فاضل بھائی ہینڈی کرافٹ انسٹی ٹیوٹ ہیں اور ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم مخلوط ہے۔ یہ ٹرسٹ اب تک 8 ہزار سے زیادہ طلبا کو مجموعی طور پر 60 لاکھ روپے سے زیادہ کے وظائف اور قرضے دے چکا ہے۔ اس ٹرسٹ کی جانب سے اردو زبان میں تعلیم بالغان کی ایک کلاس بھی جاری

ہے۔ یہ ٹرسٹ اپنی گولڈن جوبلی منا چکا ہے۔ ٹرسٹ ہی کی بلڈنگ میں تعلیمی و ادبی جلسوں کے لیے ایک ہال بھی ہے جو ٹرسٹ کے بانی کے نام سے موسوم ہے یعنی "داؤد بھائی فاضل بھائی آڈیٹوریم"۔ جناب سلطان حسن ذوسل (سالیسٹر) داؤد بھائی فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے منیجنگ ٹرسٹی ہیں۔

علم و ادب و صحافت کے گہوارے

اردو زبان کی تاریخ میں چند ایسے اخبار بھی شائع ہوئے جو مکمل اخبار ہونے کے باوجود علم و ادب، سیاست و صحافت اور قیادت کا گہوارہ بھی تھے۔ سیکڑوں صحافی اُن کے ہاں سے پل کر اور ڈھل کر نکلے۔ اُن اخبارات کا ہر اداریہ لیڈر بھی ثابت ہوا اور اُس کی رائے سے سارے سیاسی حلقوں نے ہمیشہ اثر بھی لیا۔

اخبار "کوہ نور" لاہور

اردو کا یہ اخبار عدرت سے پہلے جنوری 1950ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس کے مالک ہرسکھ رائے تھے جو دہلوی تھے اور ذات کے کائستھ تھے۔ اخبار کوہ نور اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا حامی تھا مگر اس اخبار کا ذہن اس قدر صاف تھا کہ مالک اخبار کے ہندو ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ اس میں مرثیے بھی شائع ہوتے تھے اور نعتیں بھی اور غزلیں بھی۔ اس اخبار نے ایک مشاعرے کی بھی (1885ء میں) داغ بیل ڈالی تھی۔ یہ اخبار بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو، مسلمان اور عیسائی اڈیٹروں کے ہاتھ میں رہا۔ اس اخبار کے ادارے میں جنھوں نے قلمی تربیت پا کر نام پیدا کیا اُن میں نادر علی شاہ سیفی، تاج الدین، منشی نول کشور، مرزا موحد، نثار علی شہرت، منشی لال سنگھ، مولوی عبداللہ، مولوی محمد دین ذوق، منشی محرم علی چشتی اور مولوی سیف الحق ادیب وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ادیب نے تو "کوہ نور" کے ادارے میں رہ کر قابلِ رشک قابلیت و صلاحیت پیدا کی۔ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ بڑے بڑے اہلِ قلم سے اُن کی قلمی معرکہ آرائی رہی اور اس ادبی شہرت ہی کی بنا پر اُن کو نظام حیدرآباد سے [illegible] 9 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

اخبار "زمیندار" لاہور

یہ اخبار مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد خان نے جاری کیا تھا۔ 1909ء میں [illegible] کی موت کے بعد مولانا ظفر علی خان نے اس اخبار کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ مولانا کے کہنے کے مطابق "زمیندار" اخبار کی پالیسی یہ تھی کہ زمینداروں کے فائدے کے لیے [illegible] مسلمانوں کو [illegible] میں حصہ لینے پر مجبور کیا جائے مگر اُن کی اپنی تلوّن مزاجی نے اخبار کو کبھی زیادہ عرصے تک ایک راہ پر چلنے نہ دیا۔ اس کے باوجود [illegible] سیاسی و سماجی [illegible] سیاست پر چھایا رہا اور حریتِ قلم کا ایک مستقل اسکول بنا رہا۔ اردو کے درجنوں اہلِ قلم کا اس اخبار کی ٹکسال میں ڈھل کر سکۂ رائج الوقت بنے۔ جیسے مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، علامہ سیاب رتنج پوری، آغا میر تقی احمد خاں میکش، چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالباقی، سید ابن حسن فکر، سید اسماعیل چشتی آرزو، مولانا صدیق حبیب بہاری، قاضی احسن اللہ سوسری، مولانا اطہر امرتسری، سید دلبر حسن مسعود، مولانا اظہر حسن زاہدی، غلام احمد مضطر ہاشمی، میم حسن لطیفی، مولانا غلام حسن ربانی لودھی، چودھری غلام حیدر خاں، مولانا اختر علی خان، غلام میر حسن قیصر کاشمیری، ممتاز ملک، مولانا عبدالوحید صدیقی، حفیظ جالندھری، سید ظہور احمد چشتی، ابوالعلا چشتی، حاجی لق لق، [illegible] وجاہت حسین جھنجھانوی، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی وغیرہ۔ 1956ء میں مولانا ظفر علی خان کے انتقال کے بعد اُن کے لڑکے مولانا اختر علی خان نے اخبار سنبھالا۔ 1947ء کے بعد وہ بھی انتقال کر گئے اور پھر ان کے دونوں بیٹے منصور علی خاں اور مسعود علی خاں اخبار کو جاری رکھ سکے۔

اخبار "مدینہ" بجنور

حاجی مولوی مجید حسن مرحوم نے پہلی مئی 1912ء سے یہ اخبار بجنور سے جاری کیا۔ پالیسی یہ تھی کہ تحریک آزادی کی تائید کی جائے، آزادی حاصل

جماعتوں کی حمایت کی جائے اور اسلامی روایات کی حفاظت کی جائے۔ یہ اخبار ہمیشہ اسی پالیسی پر قائم رہا۔ اس کے نتیجے میں انگریز حکومت کی جانب سے اکثر عتاب بھی نازل ہوا۔ متعدد بار کئی کئی ہزار روپے کی ضمانتیں طلب کی گئیں۔ ایک زمانے میں سارے پنجاب میں 'مدینے' کا داخلہ بند رہا۔ اور حد یہ ہے کہ مسلم ریاست بھوپال نے بھی کافی عرصے تک اس کے داخلے کو اپنے یہاں ممنوع رکھا۔ آج بھی 'مدینہ' اپنی پالیسی کے اعتبار سے ایک قوم پرست اخبار ہے۔ ابتدائی چار برس میں یہ ہفت روزہ رہا مگر پہلی جنوری 1917ء سے یہ سہ روزہ (ہفتے میں دو بار) ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ 'مدینے' کے چند ہی پرچے شائع ہوئے تھے کہ اخبار کے مالک مولوی مجید حسن صاحب نے خواب میں آسمان پر چودھویں رات کا چمکتا ہوا چاند اور دفتر مدینہ کے ایک طاق میں ٹمٹماتا ہوا ایک چراغ دیکھا۔ خواب ہی کی حالت میں مولوی نور حسن ذہین نے جو اُن دنوں 'مدینے' کے اڈیٹر تھے، مولوی مجید حسن کو بتایا کہ یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ اخبار 'مدینہ' کی موجودہ حالت ہے اور بدر کامل اس کی ترقی یافتہ شکل ——

'مدینہ' اخبار کا ادارہ بھی بہت سے لکھنے والوں کے لیے ایک اچھی تربیت گاہ ثابت ہوا ہے جیسے حافظ نور حسن ذہین۔ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی، مولانا مظہر الدین شیرکوٹی، مولانا امین احسن اصلاحی، قاضی بدر الحسن بدر جلالی، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، مولانا حامد الانصاری غازی، ابو سعید بزمی دیوبندی، ابو اللیث ندوی اصلاحی، شمشیر بیگ بریلوی، مولانا عثمان فارقلیط، مولانا محمد اصلح الحسینی دیوبندی، مولانا محمد وارث کامل، ضیاء الحسن فاروقی، حمید حسن نگر، قدوس صہبائی، ماہر القادری، آغا رفیق بلند شہری، مولوی نصیر الحق دہلوی، حافظ علی بہادر مراد آبادی، شاہ خلیل الرحمان بہاری، قاضی محمد عدیل عباسی، مولوی شبیر الحسن چاندپوری، مولوی نور الرحمان بصیر الوفی وغیرہ۔ آج کل بانی اخبار مولوی مجید حسن مرحوم کے صاحب زادے جناب سعید اختر اخبار 'مدینہ' کے اڈیٹر ہیں۔

فرنگی محل لکھنؤ

مولوی عبدالحلیم شرر نے فرنگی محل کو ایک 'اعلامیہ یونی ورسٹی' اور 'علماء کا مرکز' کہا ہے۔ یقیناً لکھنؤ کی اس حویلی کی حیثیت ایک علمی ادارے کی سی ہے۔ فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے آج کے خاندان کے بانی ملا قطب الدین تھے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ پانچ پشتوں سے ضلع بارابنکی کے قصبہ سہالی میں رہتے تھے۔ اورنگ زیب ملا قطب کی بزرگی سے غائبانہ طور پر واقف تھا اور اُن کا بڑا احترام کرتا تھا۔ کئی بار اس نے اُن سے ملنا چاہا مگر وہ اس سے ملنے نہیں گئے۔ مارچ 1692ء میں کسی حملے کے نتیجے میں ملا قطب شہید ہو گئے۔ اُن دنوں ملا قطب کے بڑے لڑکے محمد اسعد دکن میں اورنگ زیب کے پاس مقیم تھے۔ باپ کی موت کے بعد چھوٹے بیٹے محمد سعید نے سہالی اور بارابنکی کے معزز لوگوں کے دستخطوں سے ایک محضر نامہ تیار کیا اور دکن پہنچ کر اورنگ زیب کے سامنے فریادی بنا۔ اورنگ زیب کو ملا صاحب کے خون ناحق کا حال جان کر سخت اشتعال ہوا اور اس نے عمال کے نام فرمان جاری کیا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اور ان کا جان و مال برباد کر دیا جائے۔ چوں کہ ملا صاحب کے گھر والے ان دنوں بے گھر تھے اس لیے اورنگ زیب نے اپنے فرمان (مئی 1694ء) کے بموجب ملا صاحب کے ورثا کو لکھنؤ میں رہنے کے لیے ایک سرکاری حویلی دے دی۔ یہ حویلی کبھی ایک فرانسیسی تاجر کی کوٹھی تھی جو تیل یا گھوڑوں کا سوداگر تھا۔ اس نے اپنی کوٹھی کے لیے زمین سرکار (حکومت مغلیہ) سے ٹھیکے پر لی تھی۔ ٹھیکے کی مدت ختم ہونے پر زمین کے ساتھ اس پر بنی ہوئی کوٹھی بھی نزول شاہی ہو گئی۔ چوں کہ یہ حویلی ایک فرنگی کی کوٹھی تھی اس لیے بعد میں فرنگی محل کے نام سے مشہور ہو گئی۔ مولانا قطب کے چار بیٹے تھے جن میں مولوی نظام الدین سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ انھوں ہی نے عربی تعلیم کا ایک مکمل نظام مرتب کیا تھا جو درس نظامی کہلاتا ہے اور آج تک عربی مدرسوں میں رائج ہے۔ مولوی نظام الدین ہی نے مدرسہ عالیہ نظامیہ بھی قائم کیا تھا۔ ان کے ایک صاحب زادے مولانا سید عبدالعلی تھے جنھوں نے اپنی علمی تصانیف اور درس و تدریس کی بنا پر بڑی شہرت پائی۔ مولوی عبدالحی بھی فرنگی محل ہی سے تعلق رکھتے تھے جنھوں نے صرف 39 برس کی عمر میں 104 اعلا معیاری کتابیں تصنیف کی تھیں۔ غرضے کہ فرنگی محل ایک علمی و دینی ادارے کی صورت میں پچھلی ڈیڑھ صدی سے نہ صرف ہندوستان میں بل کہ بخارا، سمرقند، شیراز اور اصفہان تک مشہور رہے۔

'فرنگی محل' نام کی نسبت سے معترضانہ طور پر یہ بھی سننے کہ جب لکھنؤ میں ندوۃ العلماء (جدید دارالعلوم) کا سنگ بنیاد صوبے کے انگریز (فرنگی) گورنر کے ہاتوں رکھا گیا تو قدامت پرست اکبر الہ آبادی نے اس اتفاق سے شاعرانہ کام لے کر علماء کی ترقی پسندی پر یہ کہہ کر طنز کیا ؎

رکھی بنائے ندوہ جو آنر نے آ کے حضور — سچ پوچھیے اگر تو 'فرنگی محل' یہ ہے

تکملہ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کالی کٹ !

کہا جاتا ہے کہ یہ ہندستان کی مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق سب سے بڑی تنظیم ہے۔ اس تنظیم کا کسی بھی قسم کی سیاست یا سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں البتہ اس کا مزاج اسلامی ہے۔ اس سوسائٹی کے تحت بہت سے کالج جاری ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر تعلیمی ادارے میں اسلامی مطالعے اور عربی زبان کا ایک شعبہ ہو اور ایک مسجد ہو۔ سوسائٹی کی جانب سے مسلمانوں کے غریب طبقوں کے لئے مختلف شہروں میں 14 ہسپتال بھی جاری ہیں۔ ہندستان کی دوسری 20 تعلیمی انجمنیں اور دیگر 11 کالج اس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی سے الحاق رکھتے ہیں۔ آج کل اس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر پی۔ کے عبدالغفور اور آنریری سیکرٹری ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ہیں اور اس سوسائٹی کی پانچویں آل انڈیا کانفرنس فروری 1975ء میں کالی کٹ میں منعقد ہوئی تھی۔

دیگر علمی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی اردو انجمنیں

اردو اکاڈمی (لکھنؤ) حلقۂ احباب فروغ اردو لکھنؤ۔ ہندی اردو سنگم لکھنؤ۔ ہم عصر علی گڑھ۔ ہم راہی علی گڑھ۔ دائرۂ ادب پٹنا۔ حلقۂ ادب پٹنا۔ اردو مجلس پٹنا۔ بزم شعرا بمبئی۔ اردو سرکل بمبئی۔ ادبی سنگم بمبئی۔ ہم قلم بمبئی۔ حلقۂ ارباب ادب بھوپال۔ شمع ادب بھوپال۔ بزم فن کار بھوپال۔ بزم سخن بھوپال۔ ادارۂ فروغ اردو بھوپال۔ انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش حیدرآباد۔ مجلس عمل طلبہ برائے اردو حیدرآباد۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد۔ زندہ دلان حیدرآباد حیدرآباد۔ انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد۔ ادارۂ مصنفین حیدرآباد۔ مجلس ادب بنگلور۔ انجمن اشاعت اردو میسور۔ انجمن امامیہ بنگلور۔ انجمن احباب کلکتہ۔ اردو رائٹرز ایسوسی ایشن کلکتہ۔ سخن زار کلکتہ۔ بزم لوح و قلم کلکتہ۔ ادارہ فروغ اردو شب پور ہوڑہ۔ اردو اکاڈمی کلکتہ۔ اردو لٹریری سوسائٹی لنخفرپور۔ رائٹرس ایسوسی ایشن ہوڑہ۔ مجلس مصنفین اردو مدراس۔ حلقۂ ارباب ذوق مدراس۔ اردو اکیڈمی تامل ناڈو مدراس۔ اردو ایسوسی ایشن مدراس۔ اردو انجمن مدراس۔ بزم شگوفہ مدراس۔ تمل ناڈو پبلی کیشن مدراس۔ فردوس ادب مدراس۔ حلقۂ ادب مدراس۔ محفل ادب مدراس۔ کریسنٹ سوسائٹی مدراس۔ انجمن شعرائے اہل بیت مدراس۔ انجمن نوادب جے پور۔ انجمن کالعلان نکرجے پور۔ انجمن تعمیر اردو ٹونک۔ بزم ادب انبالہ۔ حلقۂ ارباب اردو گوڑگاؤں۔ اردو پریشد چنڈی گڑھ۔ اردو کلب روہتک۔ کشمیر کلچرل آرگنائزیشن سری نگر۔ کل ہند بزم شعرا سری نگر۔ تلاش ادب سری نگر۔ انجمن تعمیر اردو دہلی۔ علمی مجلس دہلی۔ انجمن فروغ ادب دہلی۔ اردو رائٹرز ایسوسی ایشن دہلی۔ وغیرہ

دیگر اردو لائبریریاں

گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنا۔ یہ لائبریری ڈاکٹر سید محمود کی وزارت تعلیم کے زمانے میں (1939ء) قائم کی گئی تھی۔ اس میں کتابوں کی مجموعی تعداد 13218 ہے۔ مسلم لائبریری، ناگ پور۔ انجمن ظل اسلام لائبریری، کامٹی۔ مسلم لائبریری، بھنڈارا۔ مولانا آزاد لائبریری، ملکاپور۔ مسلم لائبریری، جن باڑہ۔ اردو لائبریری، ایولا۔ اردو لائبریری مالے گاؤں۔ اسرار لائبریری، مالے گاؤں۔ انصار لائبریری، مالے گاؤں۔ کتب خانہ نقش بندیہ، بالاپور۔ کریمی لائبریری، بجا

جامع مسجد لائب ریری، بمبئی۔ انجمنِ اسلام ریسرچ سینٹر، بمبئی۔ (اس ادارے میں اردو کے کتب، ورسائل کی تعداد 15 ہزار ہے) مہاتما گاندھی لائب ریری، بمبئی (20 ہزار اردو کتابیں) سوبانی ریڈنگ روم، بمبئی (9 ہزار اردو کتابیں)۔ کھتری میمن میونسپل فری ریڈنگ روم، بمبئی (8 ہزار اردو کتابیں)۔ کتاب گھر، بھوپال۔ اقبال لائب ریری، بھوپال (اردو کتب ورسائل کی تعداد 5183 ہے) انیس لائب ریری، بھوپال۔ میونسپل دارِ مطالعہ، بھوپال (2½ ہزار اردو کتابیں) حمیدیہ کالج لائب ریری، بھوپال (5 ہزار اردو کتابیں) سیفیہ کالج، بھوپال (4½ ہزار اردو کتابیں) اسٹیٹ سنٹرل لائب ریری، حیدرآباد (اس لائب ریری کی 2 لاکھ کتابوں میں 30 ہزار اردو کتابیں اور 13 ہزار اردو مخطوطات ہیں) سالار جنگ میوزیم لائب ریری حیدرآباد (10 ہزار اردو مطبوعات اور ایک ہزار مخطوطات)۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو لائب ریری، حیدرآباد (25 ہزار اردو مطبوعات اور 5 ہزار مخطوطات اور بہت سے قدیم اردو اخبارات ورسائل کے فائل)۔ بھارت گن وردھک سمیتی، حیدرآباد (اس میں دنیا کی 42 زبانوں کے 1180 لغات کا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو کا ہر لغت اس میں موجود ہے)۔ اسٹیٹ آرکائیوز لائب ریری، حیدرآباد (اردو فارسی کے 4 ہزار مخطوطات اور 25 ہزار مطبوعات محفوظ ہیں)۔ کتب خانہ سعیدیہ، حیدرآباد۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔ کتب خانہ خواتین دکن، حیدرآباد۔ حیدری گشتی کتب خانہ، حیدرآباد۔ لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لائب ریری، حیدرآباد۔ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتا۔ نیشنل لائب ریری، کلکتا (اس لائب ریری کا بوہار سیکشن اردو شعبہ ہے)۔ شاہی کتب خانہ، مرشدآباد محمد علی لائب ریری، کلکتا۔ مولانا آزاد کالج، کلکتا (اس کالج کی لائب ریری کا شعبۂ اردو)۔ ہگلی محسن کالج، کلکتا (اس کالج کی لائب ریری کا شعبۂ اردو) امانتی لائب ریری، مدراس (تقریباً 30 ہزار اردو کتابوں میں 15 ہزار مخطوطات ہیں)۔ مدرسہ جامعۂ دارسلام، عمرآباد، مدرسۂ باقیاتِ صالحات، ویلور۔ مدرسۂ لطیفیہ، ویلور اور مدرسۂ مظہر علوم ہائی اسکول، آمبور کے کتب خانوں میں اردو فارسی کی کئی کئی ہزار کتب موجود ہیں۔ کتب خانۂ عام اہلِ اسلام، مدراس (30 ہزار اردو، فارسی اور عربی کتب موجود ہیں۔ کتب خانہ عام اہلِ اسلام، مدراس (30 ہزار اردو فارسی اور عربی کتب)۔ فلاحِ ملت فیڈریشن، آمبور (اس انجمن کا کتب خانہ بھی قابلِ ذکر ہے) اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک (4 ہزار اردو، فارسی اور عربی کے مخطوطات موجود ہیں) کتب خانہ محکمۂ اوقاف جامع مسجد بھرت پور۔ کتب خانہ، فتح پور۔ مہاراجا پبلک لائب ریری جے پور۔ کتب خانہ شاغل، جے پور۔ کتب خانہ مولانا عمران جے پور۔ کتب خانہ فضل مبین، اجمیر۔ مہاراجا جے سنگھ اردو ریڈنگ روم، جے پور۔ مولانا آزاد لائب ریری، ٹکرانا۔ مولانا آزاد لائب ریری جودھ پور۔ میجر اقبال لائب ریری، بھورنگا۔ پبلک لائب ریری، احمدآباد۔ سری پرتاپ پبلک لائب ریری، سری نگر (15 ہزار اردو کتب)۔ کشمیر یونی ورسٹی لائب ریری، سری نگر (15 ہزار اردو کتب) محکمۂ تحقیقات علیہ کتب خانہ، سری نگر۔ جامعۂ مدینۃ العلوم، حضرت بل۔ کتب خانہ سری نگر۔ دہلی۔ پبلک لائب ریری، دہلی۔ ہارڈنگ لائب ریری، دہلی اور نذیریہ لائب ریری، دہلی وغیرہ

ہندستان کے اردو اخبارات

قدیم اہم اردو اخبار ورسالے: کہتے ہیں کہ اردو زبان کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" تھا جو 1822ء میں کلکتے سے شائع ہوتا تھا۔ دوسرے قدیم اردو اخباروں میں مولانا محمد باقر (آبِ حیات کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد کے والد) کے ہفتہ وار اخبار دہلی اردو اخبار" ماسٹر رام چندر کے ماہانہ و پندرہ روزہ" فوائد الناظرین" "خیر خواہ ہند" کالن پور۔ "اسعد الاخبار" آگرہ۔ منشی نول کشور کے "اودھ اخبار" لکھنؤ۔ منشی سجاد حسین کے مزاحیہ اخبار "اودھ پنچ" لکھنؤ۔ منشی نوبت رائے نظر کے "خدنگِ نظر" لکھنؤ

منشی دیانارائن نگم کے "زمانہ" کان پور۔ نیاز فتح پوری کے "نگار" لکھنؤ۔ "نئی زندگی" الٰہ آباد۔ سبط حسن کے "نیا ادب" لکھنؤ۔ حسرت موہانی کے "اردوئے معلّیٰ" کان پور۔ "نور الانوار" آرہ، بہار۔ "پٹنہ ہرکارہ" پٹنا۔ "اخبار بہار" پٹنا۔ "ویکلی رپورٹ" گیا۔ "چشمۂ علم" پٹنا۔ ماہانہ "انجمن مذاکرہ علمیہ" پٹنا۔ ہفت روزہ "لطیف الاخبار" بمبئی۔ "کشف الاخبار" بمبئی۔ "اخبار جام جہاں نما" بمبئی۔ "اخبار خادم ہند" بمبئی۔ بھوپال کے "عمدۃ الاخبار"۔ "مونس ربدا" ہوشنگ آباد۔ "مہر منیر"۔ "ظل السلطان"۔ "نگار"۔ "محل ال ملک"۔ "جادہ"۔ "ال حجاب"۔ "صبح وطن"۔ "بھوپال پنچ"۔ "ستارہ کار"۔ "افکار"۔ "نیا بھوپال"۔ "منزل"۔ "ترجمان"۔ "نیا ساتھی"۔ "اخلاق" گوالیار۔ "آفتابِ مالوہ" اجین۔ **میسور:** "فوجی اخبار"۔ "قاسم الاخبار"۔ "احسن الاخبار"۔ "بادِ صبا" بنگلور۔ "ایڈور ڈ گزٹ"۔ "منشور محمدی"۔ "میسور الاخبار"۔ "سلطان الاخبار"۔ "محافظ بنگلور" بنگلور۔ "تیر اعظم"۔ "بنگلور اخبار" بنگلور۔ "تعلیم اخبار مصلح"۔ "دل سوز"۔ "ترغیب"۔ "نصرت"۔ "صبح بہار"۔ "نگارستانِ خیال"۔ "جارج گزٹ"۔ "شاہراہِ ترقی"۔ "رسالۃ النسواں"۔ "دلدار"۔ "مستقبل"۔ "ہلال"۔ "علم و عمل"۔ "پیکرِ خیال"۔ "مذاق"۔ "عروض"۔ "ترانہ"۔ "آفتاب"۔ "قول"۔ "درخشاں"۔ "کوثر"۔ "جلوۂ سخن"۔ "روزی روزگار"۔ "درِ یتیم"۔ "مطلع اردو" بھرت پور، راجستھان۔ "البیان" سجے پور۔ "نئی روشنی" سجے پور۔ "پیغام" احمد آباد۔ "آزاد" احمد آباد۔ "گل دستہ" پالن پور۔ "شملہ اخبار" (شملہ)۔ "چشمۂ فیض" سیال کوٹ۔ **لاہور:** "کوہ نور"۔ "دریائے نور"۔ "لاہور گزٹ"۔ "ریاض نور"۔ "پیسہ اخبار"۔ "ملاپ"۔ "پرتاپ"۔ "زمین دار"۔ "امروز"۔ "احسان"۔ "نوائے وقت"۔ "شہباز"۔ "سچ بند"۔ "منشور"۔ "رنجیت"۔ "بندے ماترم"۔ "اجیت"۔ "پربھات"۔ "آزاد"۔ "ویر بھارت"۔ "شمس" (ملتان)۔ "الفضل" (قادیان)۔ "ادبی دنیا"۔ "ادبِ لطیف"۔ "ہمایوں"۔ "کہکشاں"۔ "عالم گیر"۔ "ادکار"۔ "کارواں"۔ "ادکار"۔ "گرو گھنٹال"۔ "مست قلندر"۔ "پریت لڑی"۔ "تہذیبِ نسواں"۔ "رہنمائے تعلیم"۔ "بیسویں صدی"۔ "لطفِ شباب"۔ "نرالا"۔ "پارس"۔ "مستانہ جوگی"۔ "رفتار" (جالندھر)۔ "نقوش" (جالندھر)۔ "پگ ڈنڈی" (امرت سر)۔ "نگارش" (امرت سر)۔ "جان نثار" (امرت سر)۔ "ہند پاپلاس" (امرت سر) "لائل پور" جموں کے نام اہم ہیں۔

آج کے مشہور اردو اخبار و رسالے:

دھلی: روزنامے۔ "الجمعیت"۔ "وطن"۔ "ملاپ"۔ "پرتاپ"۔ "دعوت"۔ "ملک و ملت"۔ "تیج" اور "سویرا" وغیرہ۔ ہفت روزہ۔ "اتالیق"۔ "شیر پنجاب"۔ "الجمعیت"۔ "دی فارمر"۔ "ایشیا"۔ "پیام مشرق"۔ "حیات"۔ "پرچم ہند"۔ "ہماری زبان"۔ "چترا"۔ "سینک سماچار"۔ "اپنا دیش"۔ "نئی دنیا" اور "مستقیم" وغیرہ۔ پندرہ روزہ۔ "آواز"۔ "ہم درد"۔ "ندائے اتحاد" اور "ہند کرنیٹ" وغیرہ۔ ماہ نامے۔ "شمع"۔ "بانو"۔ "مجرم"۔ "کھلونا"۔ "شبستان"۔ "ہما"۔ "محراب"۔ "مدینہ"۔ "واقعات"۔ "روبی"۔ "پاکیزہ"۔ "بیسویں صدی"۔ "تحریک"۔ "شانِ ہند"۔ "عالمستان"۔ "خاتونِ مشرق"۔ "آج کل"۔ "پیامِ تعلیم"۔ "خاندانی منصوبہ بندی"۔ "جامعہ"۔ "آستانہ"۔ "دلوی"۔ "منادی"۔ ادم۔ اور سہ ماہی "تحریر" اور "اردوئے معلّیٰ" وغیرہ۔ **سری نگر:** روزنامے۔ "آفتاب"۔ "سری نگر ٹائمز"۔ "ہم درد"۔ "خدمت"۔ "زمین دار"۔ "چنار"۔ "نوجوان"۔ "ستسار"۔ وغیرہ۔ ہفت روزہ۔ "رختار"۔ "آئینہ"۔ "چاند"۔ "اذان"۔ اور دو ماہی "شیرازہ" اور سہ ماہی "علم و دانش"۔ وغیرہ۔ **جالندھر:** روزنامے۔ "ہند سماچار"۔ "پرتاپ"۔ "ملاپ"۔ "پردیپ"۔ "پربھات"۔ "ملاپ جالندھر ریڈر"۔ "صداقت" (لدھیانہ) اور "فلائنگ میل" (امرت سر) وغیرہ۔ پندرہ روزہ۔ "آریہ گزٹ"۔ "ہندو"۔ "سناتن دھرم پرچارک" اور "بجرنگ" وغیرہ۔ **ھریانہ:** ہفت روزہ۔ "جاٹ گزٹ"۔ "امرت سر گرنال" انبالہ۔ "سنڈیش" (انبالہ)۔ "انبالہ ٹائمز" (انبالہ)۔ "ارمان ہریانہ"۔ "بھارت پتر"۔ "دیپ سندیش"۔ "درست گفتار"۔ "ہریانہ تلک"۔ "جنم بھومی"۔ "جگت پتر"۔

، موگزٹ ،،۔ "پیغام"، "تعمیر ہریانہ" (سونی پت) "پبلک اوپینین"۔ "روشن شعلہ"۔ "تحقیقات"۔ اور "تلقین" وغیرہ۔ چندرہ روزہ "نگر پالیکا"۔ "لوہ زنیا"۔ "پرچار تکی گزٹ"۔ "وائس آف ایمپلائز"۔ "بے فکر"۔ "آریہ"۔ "سست بال"۔ "سماج واد"۔ ماہنامے۔ "امر ہریانہ"۔ "دولت کی بارش"۔ "ادبی خوش دل"۔ "رالا جوگی"۔ "ترجمان پنجاب"۔ "نظارے"۔ "قوم پرست"۔ اور "شہید" وغیرہ۔ ہماچل پردیش: ہفت روزہ "دوگر مندیش"۔ "کیلاش"۔ "ہماہماچل" "کالکا سماچار"۔ "للکار"۔ "لوک راج"۔ پندرہ روزہ۔ "ہماچل سپر بھات"۔ "پیارٹی دنیا"۔ ماہ نامہ "بہن ہماچل"۔ وغیرہ۔ جے پور: پندرہ روزہ "بشارت" ہفت روزہ "بدلا ہوا زمانہ"۔ "ندیم"۔ ماہ نامہ۔ "سلطان الہند"۔ اور "گلزار جمیل" (کشن گنج) وغیرہ۔ مدراس: روزنامے "مسلمان"۔ اور "اتحاد" ہفت روزہ "معین"۔ "تمل ناڈو ٹائمز"۔ "رفیق ملت"۔ "مسلم رپورٹ" اور "آزاد نوجوان" وغیرہ۔ ماہ نامے "جل ترنگ"۔ "آب و تاب" اور "شادن" وغیرہ کلکتہ: روزنامے "آزاد ہند"۔ "عصر جدید"۔ "آبشار"۔ "غازی"۔ "امروز" وغیرہ۔ ہفت روزہ "آرزو"۔ "وسے ہند"۔ "کسان مزدور"۔ "اجالا"۔ "تجلیات" "قلم ونگی" اور "عکاس" وغیرہ۔ پندرہ روزہ "تحریک ملت"۔ اور "نئی بنگال" وغیرہ۔ ماہ نامے "حسن و صحت" اور "اسپورٹس ٹوڈے"۔ وغیرہ بنگلور: روزنامے "ال کلام"۔ "آزاد"۔ "پاسبان" اور "سالار" وغیرہ ہفت روزہ "نشیمن"۔ "کاروان" اور "کوثر" وغیرہ اور سہ ماہی "سوغات"۔ حیدرآباد: روزنامے "سیاست" "رہنمائے دکن"۔ "ملاپ"۔ "انگارے"۔ "منصف دکن" اور "پیام" وغیرہ۔ ہفت روزہ "برگ آوارہ" اور "نیا آدم" وغیرہ۔ ماہ نامے "سب رس"۔ "شگوفہ" "آندھرا پردیش"۔ "شعر و حکمت"۔ "ال حق"۔ "خاتون دکن"۔ اور "معمار" (آسر) وغیرہ۔ بھوپال: روزنامے "رہبر وطن"۔ "ندیم"۔ "افکار"۔ اور "ال حمرا" ماہ نامے "آذر" اور "تشکیل" وغیرہ۔ ہفت روزہ "شیشہ و سنگ"۔ اور "ایاز" وغیرہ۔ بمبئی: روزنامے "انقلاب"۔ "اردو ٹائمز"۔ "آج"۔ "ہندوستان" "اردو رپورٹر"۔ "جمہوریت" وغیرہ۔ ہفت روزہ "عندلیب"۔ "بلٹز"۔ "تنویر" اور "زریاب" وغیرہ۔ پندرہ روزہ "کاروان حیات"۔ "آسمان صحافت"۔ "شکیلا" اور "نوا کرط" اور "کہکشاں" وغیرہ۔ ماہ نامے۔ "البلاغ"۔ "قلم سنار"۔ "شاعر"۔ "صبح امید"۔ "کلاس"۔ شب رنگ"۔ "آپ ہم"۔ "فلم اسٹیرک میگزین" اور "گلشن" وغیرہ اور سہ ماہی "نوائے ادب"۔ پٹنہ: روزنامے "صدائے عام"۔ "سنگم"۔ "ساتھی"۔ "صداقت"۔ "پیغام نہرو" اور "راہ رو" وغیرہ۔ ہفت روزہ۔ "روشنی"۔ "آدرش" (گیا)۔ "آغاز"۔ "ہمارا نعرہ"۔ "امروز ہند"۔ "مشعل"۔ "مظیم ایکسپریس"۔ "سورج" (گیا) وغیرہ۔ ماہ نامے "صبح نو"۔ "سہیل" (گیا)۔ "مسرت"۔ "زیور"۔ اور "ال مجیب" (پھلواری) وغیرہ۔ اترپردیش: روزنامے "قومی آواز" (لکھنؤ) "پیغام" (کان پور)۔ "قومی جنگ" (رام پور)۔ "سیاست جدید" (کان پور)۔ "آزاد" (بنارس)۔ "جدت" (مرادآباد)۔ "ناظم" (رام پور) اور "صبح و شام" (رام پور) وغیرہ (سہ روزہ اخبار "مدینہ" (بجنور) جو 1912ء سے جاری تھا اب بند ہو چکا ہے) ہفت روزے "مخبر عالم" (مرادآباد)۔ "ترجمان ال قرآن" (بدایوں)۔ "انصاری دنیا" (مرادآباد) "صدق جدید" (لکھنؤ)۔ "ندائے ملت" (لکھنؤ) اور "نئی دنیا" (بجنور) وغیرہ۔ ماہ نامے "ال واعظ" (لکھنؤ) "معارف" (اعظم گڑھ)۔ "نیا دور" (لکھنؤ)۔ "کتاب" (لکھنؤ)۔ "تہذیب الاخلاق" (الہ آباد)۔ "تجلی" (دیوبند)۔ "زندگی" (رام پور)۔ "ال حسنات" (رام پور) "دارالعلوم" (دیوبند) "ال فرقان" (لکھنؤ)۔ "انوار ال اسلام" (بنارس)۔ "شاہکار" (بنارس)۔ "کلیان" (لکھنؤ)۔ "نور" (رام پور)۔ "ثانی" (لکھنؤ)۔ "حریم" (لکھنؤ) "رضوان" (لکھنؤ)۔ "نکہت" (الہ آباد)۔ "تاریخی دنیا" (الہ آباد)۔ "رومانی دنیا" (الہ آباد)۔ "فلمی دنیا" (الہ آباد) اور "جاسوسی دنیا" (الہ آباد) وغیرہ۔

ایک خبر

"قحط پڑا ہے، کھیتی کم ہوئی ہے، عرض ہوئی کہ شہر میں غلہ بہت گراں ہو گیا۔ تیرہ سیر گیہوں، بارہ سیر چاول ناکارہ بڑی خرابی سے ایک روپے کو میسر آتے ہیں۔"

لکھنؤ کی ایک خبر

اخبار جام جہاں نما اردو ضمیمہ (کلکتہ) یکم فروری ۱۸۲۶ء

نیک آرزوئیں اور شبھ کامنائیں

ہندستانی مسلمانت نمبر

پڑھنے والوں کے لئے

کوہ نور

کے فلم ساز

رام دیال

کی جانب سے

مکل انٹر پرائیزیز، رنجیت اسٹوڈیوز، دادر، بمبئی 14

یادیں

وہ صدائیں

خاص خاص
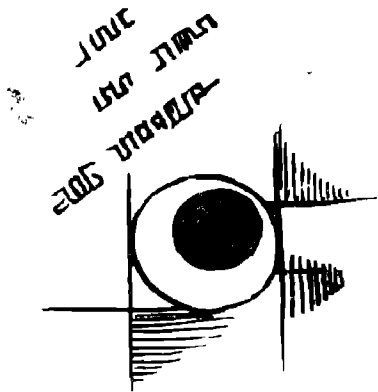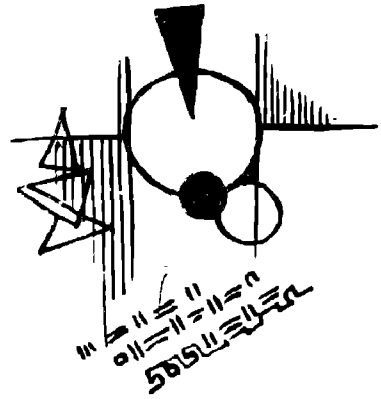
اگر تم چاہتے ہو کہ مرنے کے بعد زندہ رہو
تو کوئی ایسی چیز لکھو
جو قابلِ مطالعہ ہو۔
یا کوئی ایسا کام انجام دو
جو لکھنے کے لائق ہو !

فلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی

کی جانب سے

سلیم اور جاوید

گگن کے

ہندستانی مسلمان نمبر

کی اشاعت پر

مبارکباد پیش کرتے ہیں

کے متعلق ہو یہ لیکن اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تمدن کے اعتبار سے پردہ اچھا ہے یا برا، یا جس طرح بعض لوگ مذہبی مسائل کا مفہوم لیتے ہیں آن کے اجتہاد کے بالکل مطابق ہے یا نہیں، ایک بحث طلب بات ہو سکتی ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ ہماری عورتوں کو صحت اور ان کے جسم پر پردہ کا برا اثر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

سائنس یہ کوئی بات دوسری بات سے زیادہ روشن ہے تو وہ یہ ہے کہ انسانی جسم کو پاک ہوا اور مفید ورزش کی ضرورت ہے۔ اگر پردہ کا موجودہ طریقہ قائم رکھا جائے تو یہ ضرورتیں کس طرح پوری ہو سکتی ہیں؟ ہماری عورتوں کو کیوں کر اور کہاں سے مفید ورزش میسر آ سکتی ہے؟ اس سے ہماری عورتوں کے جسموں پر پاک ہوا اور ورزش کے نہ میسر آنے کا خیال کرو۔ ان کے جسم اور قوموں کی عورتوں کے جسم سے مقابلہ کرو۔ جو پردے کے دباؤ سے آزاد ہو کر کھلے میدانوں میں جاتی اور آزادی سے پھرتی ہیں، اور اپنے جسم کے مختلف حصوں کو ورزش کراتی ہیں۔ ہماری عورتوں کی صحت کا دوسری قوم کی عورتوں کی صحت سے مقابلہ کرو۔ اعداد کو دیکھو اور ہماری عورتوں کی بڑی تعداد کو دیکھو جو ناپاک ہوا اور ورزش نہ ملنے کی وجہ سے دق کے مرض میں مر جاتی ہیں۔

حضرات! ہم کبھی تندرست، مضبوط اور توانا عورتوں کی امید نہیں کر سکتے جب تک ہم اُن کو اسی طرح قید میں بند رکھیں گے جس طرح ہم نے سالہا سال سے رکھا ہے اور مضبوط، تندرست اور توانا بچوں کی امید نہیں کر سکتے جب تک ہماری عورتیں کمزور، بیمار اور نحیف جسم کی رہیں گی۔"

خطبۂ صدارت: محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بمبئی
بدرالدین طیب جی

عورت اور مرد سے قوم بنتی ہے

'پیاری بہنو!

ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ سچے رہیں اور اپنے عقیدوں پر مضبوط و استوار۔ وہ شخص جو خدا کے ساتھ وفادار نہ ہو کبھی بھی کسی گورنمنٹ کے ساتھ جسے انسان نے قائم کیا ہو وفادار نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے مابین اتحاد و اتفاق پیدا کریں، تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہمارے اس ملک میں جو مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے اور جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد و اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پرامن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں تاریخ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتے تھے لیکن جس وقت برطانوی تجار ہندوستان میں اپنی تجارتی مہم پر آئے، اس وقت انھوں نے یہ معلوم کیا کہ اُن کی کامیابی کا انحصار ہماری پھوٹ اور تفریق پر ہے۔ چنانچہ جس وقت سے بیرونی حکومت یہاں قائم ہوئی ہے ہماری قوم نہایت تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو دوسروں نے ہمارے لئے مہیا کی ہیں اور ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بری عادتیں سیکھی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ہم خداوندی قوانین اور اپنے ملکی مطالبات سے بہت جلد لاپرواہ ہو گئے۔ خدائے قادر و توانا جسے زندہ رکھنا چاہے اُسے خواہ کتنا ہی زہر دیا جائے لیکن وہ مر نہیں سکتا۔ جس روز گورنمنٹ نے ہندوستان کو رولٹ ایکٹ، پنجاب کی خوں ریزی اور خلافت کی تقسیم کا تجزیہ کر کے دیا تھا وہی دن بیداری اور ہندوستان کی بحالی کا تھا ہندوستان کو یہ معلوم ہو گیا اس کا علاج غیر ہمدرد برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے بلکہ خود اس کے پاس ہے اور اب ہم خود ہی جد و جہد کر کے اس کی کوششیں کر رہے ہیں جن مختلف امراض کا ہم شکار ہو رہے ہیں آپ اپنے کو نجات دلائیں۔

بہنو! خداوندی قانون مردوں اور عورتوں پر یکساں اثر ڈالتے ہیں قومیں مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہوتی ہیں اور جو فرائض مردوں پر عائد ہوتے ہیں اُن سے عورتیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہندوستان کی یہ انتہائی بدنصیبی کہ اس کی عورتیں عیش پسندی اور آرام طلبی کی زیادہ عادی ہو گئی ہیں اور انھوں نے اپنے آپ کو کل حب الوطنی کے فرائض سے علیحدہ کر لیا ہے۔ زمانۂ موجود کے تاریخ پڑھنے والے کو اس بارے میں بہت زیادہ شک و شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا نور جہاں، چاند بی بی، رانی لکشمی بائی آف جھانسی، زیب النساء، اہلیا بائی، پاربتی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھیں لیکن خداوند عالم کا ہزار ہزار شکر و احسان

تزکیۂ نفس اور ذہنی سکون کے لئے
مذہبی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے
فضل بُک ڈپو
قرآن مجید اور ہر اقسام کی دینی کتابیں
یہاں دستیاب ہیں
نزد تاج کمپنی، سندر بلڈنگ، 30 محمد علی روڈ، بمبئی۔400003
اعادۂ شباب
اگر آپ شباب یعنی جوانی کی تجدید کی دلی
خواہش رکھتے ہیں تو آج ہی مردوں اور عورتوں
کے پوشیدہ امراض کے خصوصی ماہر
حکیم ڈاکٹر اے اے دہلوی
سے مشورہ کریں
خواتین کے لئے نرس کا انتظام ہے
۹½ صبح سے ۱ دوپہر
۴ شام سے ۸ شب
فون
321363
پارس ہیلتھ کلینک
B-38 محمد علی روڈ۔ بالمقابل مینارہ مسجد بمبئی۔3
اعلانِ ملکیت و تفصیلات
ماہ نامہ گگن بمبئی
مقام اشاعت : 5 واں فلور، سوب پیلس،
132۔ کاما جی کراس اسٹریٹ، بمبئی 3،
وقفۂ اشاعت : ماہ نامہ
پرنٹر
پبلشر
مالک
اڈیٹر
شمس کنول
قومیت : ہندستانی
پتا : 5 واں فلور، سوب پیلس،
132۔ کاما جی کراس اسٹریٹ۔ بمبئی 3،
میں شمس کنول اس کی تصدیق کرتا ہوں کہ میرے
علم و آگہی کے مطابق مندرجہ بالا تفصیلات صحیح ہیں
دستخط پبلشر
شمس کنول
5 ویں مارچ 1975ء

کہ اس نسل میں مسز گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، امسیا بائی، سرلا دیوی، چودھرانی بیگم، بیگم محمد علی، بیگم انصاری، بیگم خواجہ، بیگم حسرت موہانی، بیگم کچلو ہم ایسی خواتین موجود ہیں جو اپنی ہمت و جذبات حب الوطنی اور عزم و استقلال میں شہرۂ آفاق ہیں اور جنہوں نے سچائی اور ملک کے لئے حیرت انگیز قربانیاں کی ہیں اور مجھے اس کا پورا اطمینان ہے کہ ہندوستان کا آئندہ مورخ مہاتما گاندھی اور دیگر لیڈران کے ساتھ ان خواتین کا نام لکھنا نہ بھولے گا جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ پیاری بہنو! تمہارے درمیان میں سیتا اور زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا تو شہید کر دیئے گئے ہیں یا قید خانوں میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ تمہارے درمیان میں حضرت بی بی فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا اور کنتا کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے پیارے بچوں نے اپنے کو دھرم اور ملک کی قربان گاہ پر خوشی خوشی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اپنے کو والنٹیروں کی حیثیت سے بھرتی کرانے کے متعلق میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے کہ وہ ہر مرد اور عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے اسے اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہئے۔ ہم ہندوستانیوں میں کا ہر مرد اور عورت والنٹیر ہے خواہ مصلحت اور یقین کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے تم معاہدہ پر دستخط نہ کر سکو۔

میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اسی کے ساتھ اپنے کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہوتے دو۔ ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہے۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اسی کے ساتھ اپنی مذہبی اور سوشل زندگیوں کی ذمہ داریوں کو بھی فراموش نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کروں گی کہ جذبات کو مشتعل کر کے اپنی گرفتاری کا سبب پیدا نہ کرو لیکن اسی کے ساتھ جب وہ پیش آئے تو بھاگو بھی نہیں۔ وہ تمہاری جرأت اور بے خوفی کے ایک قدرتی نتیجہ کے طور پر وقوع میں آئے گی۔ تمہیں قرآن پاک اور شاستر کے احکامات کا پابند رہنا چاہئے۔ یاد رکھو جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کے پھریرے کو اڑتے ہوئے دیکھ لو گے۔"

بی اماں — خطبہ صدارت آل انڈیا لیڈیز کانفرنس احمد آباد ۳۰ دسمبر ۱۹۲۱ء

پستی کا سبب ملّاگری

"ہم سب سے پہلے بلغاریہ کے مفتی صاحب سے ملنے کے لئے اسلامی مذہبی عدالت میں گئے اور ہمیں پہلے ہی دفتر میں اندر بلا لیا گیا۔ مفتی صاحب جو ایک بزرگ صورت شخص ہیں سبز لباس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی اور عمامہ بندھا ہوا تھا۔ اُن کے اسسٹنٹ (نائب) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، دو سررشتہ دار بھی دائیں بائیں تھے۔ گفتگو قدرتی طور پر اسلامی دنیا کی موجودہ پست حالی پر ہوئی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ "جناب اب کیا کرنا چاہئے؟" بلغاریہ کے مفتی اور دوسرے باا ثر بزرگ نے جواب دیا۔ "سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ بوسیدہ اسلامی طریقہ تعلیم میں جو تمام دنیا میں رائج ہے آزادانہ طور پر نمایاں اصلاح کی جائے۔ ایشیا، یورپ، افریقہ کی پرانی مذہبی درسگاہیں جو طالب علم کو ملاّ گری کے علاوہ اور کسی کام کا نہیں رکھتیں (اور یہ امر اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے) دنیا میں ہمارے ادبار اور پستی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ مولوی جس کو اسلام کا ایک باکار ممبر ہونا چاہئے نہ کہ خوشامد سے اپنے حلوے مانڈے کا خیال رکھنے والا ہو۔"

عبدالرحمان بجنوری — بلغاریہ میں اسلام، ۲۲ جون ۱۹۱۳ء

جھوٹا، مکّار، بے ہودہ ہندی مسلمان

"وہاں جو ہندوستانی اہل سنت و جماعت کے عالم ہیں وہ دو گروہ ہیں۔ ایک بدعتی دوسرے وہابی۔ جو بدعتی ہیں وہ وہابیوں کو کافر کہتے ہیں جو وہابی ہیں وہ بدعتیوں کو برا کہتے ہیں۔ جب بدعتیوں کا دار چل جاتا ہے وہابیوں کو نکلوا دیتے ہیں جب وہابی غالب ہوتے ہیں تو بدعتی چھپ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں بدعتیوں کا دار چل رہا ہے۔ خود شریف مکہ صاحب کو لوگ وہابی کہتے ہیں مگر یہ سب جھگڑا بدعتی وہابی کا ہندی صاحبوں کی

میں ہے اور ایسے ایسے فسادات سے ہندی لوگ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں نہایت ذلیل ہیں کہ عرب والوں نے ہندیوں کو ہندی لطال کا خطاب دے رکھا ہے اور ذلیل ہونے کی بات یہ ہے کہ دونوں طرف مولانا صاحب ہی مولانا صاحب ہیں مگر ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں اور ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ جس طرح ہو سکے دوسرے کو نکلوا دیں ۔"

حافظ محمد　　　　رسالہ تہذیب الاخلاق، یکم رمضان ۱۲۹۱ھ

مسلمانوں کے دشمن مولوی ملّا!

"یعنی خود تو دنیا کے بندے ہیں اور کسی مرید یا معتقد کی نذر تک نہیں چھوڑتے مگر زبان سے دنیا کی بے ثباتی اور ہیچ ہونا کہتے ہیں، اپنی جیب میں دنیا بھرتے ہیں اور دوسروں کو اس کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے ہیں، جو کام مسلمانوں کی بھلائی و بہتری اور ترقی کا سوچا جاتا ہے یا کیا جاتا ہے یہی عقل کے دشمن، رسول کے دشمن، مسلمانوں کے دشمن ایک نہایت مسکین سی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں "ہاں دنیا چند روز ہے۔ دولت مند ہوئے تو کیا، غریب ہوئے تو کیا، محل میں بھی گزر جاتی ہے درخت کے سائے میں بھی گزر جاتی ہے، موٹے کپڑے سے بھی بدن ڈھک جاتا ہے، مہین بھی پھٹ جاتا ہے۔ اچھا کھانے سے بھی پیٹ بھر جاتا ہے اور موٹا کھانے سے بھی بھرتا ہے۔ ایسی بات کرو جو وہاں کام آئے، دنیا تو گزر ہی جاتی ہے ہاں جتنی دنیا ہوگی اتنا ہی حساب دینا ہوگا۔ تقدیر پر شاکر رہو۔ انسان کو خدا بھوکا اٹھاتا ہے پر بھوکا سلاتا نہیں، یہ لوگ حقیقت میں اس آیت کے مصداق ہیں اور وہ ٹھیک ٹھیک وہی وعدہ کرتے ہیں جس کا اس آیت میں ذکر ہے"

سید احمد خاں　　　　رسالہ تہذیب الاخلاق، ۱۵ر شوال ۱۲۹۱ھ

کھانے فرعونی طریقہ مسنونی

" ہاتھ سے کھانا سنت موکدہ نہیں ہے جس کے ترک میں گناہ ہو۔ آپ ہزاروں کام سنت موکدہ کے خلاف کرتے ہیں اور کچھ خیال بھی نہیں کرتے مگر ہاتھ سے کھانے کی سنت آپ کو یاد ہے، جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں چالیس چالیس روز تک چھوارہ اور پانی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا جو کے بغیر چھنے آٹے کی روٹی تو اکثر نوش فرماتے تھے مگر آپ روزمرہ قورمہ اور پلاؤ اور متنجن، بریانی، زعفرانی وغیرہ مرغن سے مرغن کھانے نوش فرماتے ہیں۔ کبھی مسنونی کھانا کھانے کا خیال نہیں آتا مگر کھانے کے مسنونی طریقے پر بحث ہوتی ہے اور وہی ٹھیک مثل آپ پر صادق آتی ہے جو حامی اسلام سید احمد خاں نے کہی ہے کہ کھانے فرعونی اور طریقہ مسنونی۔ ایک طرف دس انگریز اور ایک طرف دس مسلمان اور ایک طرف دس ہندو کھانا کھانے بٹھا دو کہ اپنے اپنے طریقے پر کھاویں اور تمہارے دل میں جو باتیں سمائی ہوئی ہیں ان کو تھوڑی دیر کے واسطے علیحدہ طاق میں رکھ دو اور موزخوں کی آنکھ سے بلا تعصب دیکھو کہ تینوں قوموں میں سے کس کے طریقے میں نفاست اور صفائی ہے۔

میرے تین دوست ایک انگریز کے ہاں مہمان ہوئے۔ اُن میں سے ایک سر گھٹے ہوئے مولوی صاحب بھی تھے۔ انگریز اپنی میز کرسی پر، یہ تینوں اس کے سامنے فرش پر بیٹھے اور کھانا کھانا شروع کیا۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں پر شوربا بہنے لگا اور وہ بار بار چاٹنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ انگریز پہلے تو ہنسا آخر اس کو اس قدر گھن آئی کہ کھانا چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ جیسا کہ آپ ہندوؤں کو ننگے بدن چوکے میں بیٹھا دیکھ کر اُن کی طرز خورش پر حقارت سے ہنستے ہیں ایسا ہی انگریز ہم لوگوں کے کھانے کے طریقے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اس پر ہنستے ہیں اور کھانے والوں کو گنوار کہتے ہیں جب کئی مسلمان باہم کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو ان میں سے بعضے ایسے بھدے پن سے کھاتے ہیں جس کو دیکھ کر نفرت آتی ہے۔ انگلیاں شوربہ میں بھرتی جاتی ہیں اور وہ چاٹتے جاتے ہیں۔ پلاؤ میں شوربہ ہاتھ سے ملاتے ہیں اور اسی لتھڑے ہوئے ہاتھ سے اس کو کھاتے ہیں۔ چاروں انگلیوں سے قرنی کے سرے پے بھرتے ہیں؛

فارقلیط اللہ　　　　رسالہ "تہذیب الاخلاق" علی گڑھ، یکم ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ

ضرورت ہے روشن خیال علما کی

"ہماری ساری کوشش ظاہری سامان پر صرف ہوتی ہے بلکہ ہم نے ظاہری پابندیوں ہی کا نام مذہب رکھ لیا ہے میں نہیں کہتا کہ ظاہری پابندیاں ضروری نہیں ہیں اور ہر شخص کو فنا فی اللہ کا درجہ آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مست ہو کر ساری قیود ظاہری سے آزاد ہو جائے اور مثل رسول شاہیوں کے چار ابرو کا صفایا کرلے اور دنیا بھر کے منہیات اس کے لئے مباح ہوں میرا اعتراض صرف یہ ہے کہ اس زمانے کے عالم اپنے لئے نیز دوسروں کے لئے باطنی خوبیوں پر اس قدر زور کیوں نہیں دیتے جس قدر وہ ظاہر پر لے بڑھاتے ہیں یعنی کسی شخص کو جھوٹ بولتے ہوئے، رشوت لیتے ہوئے، مقدمہ بازی سے دوسروں کا حق چھینتے ہوئے، بے ایمانی سے دوسروں کا مال مارتے ہوئے دیکھ کر اس قدر طیش کیوں نہیں آتا جتنا کہ ایک شخص کی داڑھی منڈی ہوئی لبیں بڑھی ہوئی، ازار ٹخنے سے نیچی دیکھنے سے غصہ آتا ہے ان کے نزدیک ایک سب انسپکٹر پولیس جو پنج گانہ نماز پڑھتا ہو، ماہِ صیام میں روزہ رکھتا ہو، بعد نماز کچھ دیر وظیفہ پڑھ لیتا ہے پکا مسلمان ہے، خواہ وہ کتنا ہی ظالم ہو، رشوت خور ہو، بے ایمان کیوں نہ ہو، غرض کہ اب ظاہری تقشف اور پابندیوں کا نام مذہب رکھا گیا ہے اسی لئے لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر کچھ نہیں ہوتا لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علما کا معیار قابلیت اب پیشتر سے کچھ بڑھ کر ہونا چاہئے تاکہ موجودہ زمانے میں وہ باوقعت ہوں۔ اور ان کی تلقین ہم پر مؤثر اثر پیدا کرے اور ان کے ذریعہ سے مذہب اسلام پھر دنیا میں سرسبز و شاداب اور کامیاب ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہر زمانے میں اپنے ہم عصروں کی نظروں میں وقعت حاصل کرنے کے لئے ان سے ان امور میں گو سبقت لے جانا ضروری ہے جن کا ان میں چرچا ہے۔ اسی بنا پر مصریوں کی ہدایت کے لئے حضرت موسیٰؑ کو بھیجا گیا تو چونکہ ان دنوں سحر و ساحری کا لوگوں میں زیادہ رواج تھا خدا نے حضرت موسیٰ کو ید بیضا اور لکڑی کو سانپ بنا دینے کا معجزہ عنایت فرمایا اور آنحضرتؐ کے زمانے میں چونکہ عرب میں فصاحت و بلاغت کی بڑی قدر تھی اس لئے بطور معجزہ کے آنحضرتؐ کو کلام پاک ایسا فصیح و بلیغ عطا ہوا کہ آج تک زبان عرب میں اس کا مثل نہ ہو سکا پس ہمارے علمائے مذہب کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایسے قابل اشخاص ہوں کہ جو علوم مذہبی کے علاوہ آج کے علوم دنیاوی سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں، نہایت روشن خیال ہوں اور امور معاش و معاد دونوں کی ان میں عقل ہو، پاکیزہ دل اور پاکیزہ خیالات ہوں اور ان کے اعمال و افعال میں اس پاکیزگی کی جھلک ہو۔ صرف اسی قسم کے علما اس زمانے کے تعلیم یافتہ گروہ میں وقعت و عزت پائیں گے اور وہ عوام و خواص دونوں قسم کے لوگوں میں امور معاش و معاد میں رہنمائی کر سکیں گے اور وہ لوگ ان کی دل سے وقعت کر سکیں گے اور تقلید کریں گے اور وہ عمدہ رستہ پر چلائیں گے اور مذہب جیسا کہ اب تک لوگوں کے لئے باعث خیر و برکت رہا ہے آئندہ بھی رہے گا۔"

سید [illegible] حسین

آپ بیتی

تمہارے یہ مولوی ملّا

"یہ کیا مسخرا پن ہے کہ تم رسولؐ خدا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو دین و ایمان کا جز سمجھتے ہو لیکن ان کی چوبیس گھنٹے کی سپاہیانہ زندگی، ان کی درویشی کھو دیتے وقت عملی مستعدی کو شیرِ مادر کی طرح بے ڈکار ہضم کر جاتے ہو اور تمہاری شیطانی لغات میں رسولؐ کے ان اقوال کا نشان تک موجود نہیں۔ رسولِ خدا سے تمہاری جھوٹی محبت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب کوئی شخص تمہیں اس سپاہیانہ زندگی اسی محبت و اخوت اسی حرکت و عمل والی زندگی کی طرف بلاتا ہے تو تمہارے آرام پرست جسم اور غفلت زدہ نفس پکار اٹھتے ہیں کہ یہ شخص نبی بننا چاہتا ہے۔ تمہارے ارادے صاف ہیں تم عمل سے بھاگنا چاہتے ہو، اس غریب کو بدنام کر کے اپنا آرام مانگتے ہو اپنی حلوہ خوری کی دوکان کی حفاظت چاہتے ہو اور رسولِ خدا کے مشکل کاموں سے منہ موڑتے ہو۔ کیا ایک معمولی سے ملا سے تمہاری دوستی اس لئے نہیں ہے کہ ایک مسواک، ایک ڈھیلے اور داڑھی کے بدلے تم کو جنت کا حق دار بنا دیتا ہے وہ تم سے ڈر کر قرآن کی آیات چھپاتا ہے تمہارے ٹکڑے کھا کر تمہارے عیبوں کی پردہ پوشی کرتا ہے اور ذلیلوں کی طرح تمہارے حکم کا بندہ بنا ہوا ہے۔ وقت بے وقت جیسی چاہے نماز پڑھا دیتا ہے طلاق چاہو تو طلاق کا فتویٰ دے دیتا ہے، رجوع چاہو تو رجوع کرا دیتا ہے، نکاح پڑھانا چاہو تو پڑھا دیتا ہے۔ جہاد و قتال کو تمہارے لئے ممنوع قرار دیتا ہے وہ

تمہارے مطلب کا آدمی ہے تمہیں اسلام کا کوئی تکلیف دہ حکم نہیں سناتا۔ تمہاری غفلتوں کی تاویلیں کرتا ہے گناہوں کے لیے حیلے ڈھونڈتا ہے تمہاری چور بازاری کو چھپاتا ہے تاکہ تمہارے محلوں کا آرام اسے ملتا رہے۔ یہ ہے تمہارا مولانا، مولوی، لیڈر، مرشد، دین کا عالم لیکن جو شخص سرور کائنات ﷺ کے چوبیس گھنٹے کی باعمل، بامشقت، سچی اور صالح زندگی کی طرف تمہیں بلائے وہ دجال، وہ کافر اور مدعی نبوت۔"

عنایت اللہ مشرقی — "قول فیصل"

اہلِ تشیع اور علی گڑھ کالج

"مدرسۃ العلوم کی حالت عنایتِ الٰہی سے اب بہت اچھی ہے۔ روز بروز اس کے چندے کو ترقی ہوتی جاتی ہے اکتیسویں مارچ تک اس کا چندہ ایک لاکھ ساٹھ ہزار آٹھ سو سترہ روپے آٹھ آنے ہو چکا ہے۔ نہایت نیک اور صلاح پرست باشرع متقی عالم لوگوں نے بھی چندہ دیا ہے اور کمیٹی کی ممبری بھی قبول کی ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے شیعہ بھائی بھی اس مدرسہ کا قائم ہونا دل سے چاہتے ہیں ہم کو جناب مجتہد العصر سید علی محمد صاحب سے بہت کچھ اس معاملہ میں امداد کی توقع ہوئی ہے۔ حضور عالی حاجی حرمین شریفین نواب محمد کلب علی خاں بہادر والی رامپور فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ کمیٹی مدرسۃ العلوم کے پیٹرن یعنی مربی و سرپرست ہوئے ہیں اور پندرہ ہزار روپے نقد اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر (قطعی) یعنی تیس ہزار روپے کی بطور سرمایہ مدرسہ مرحمت فرمائی ہے اور فونڈیشن کے اخراجات جو پانچ ہزار روپے سے کم نہ ہوں گے اپنے ذمہ قبول فرمائے ہیں اور اس عطیہ کی میزان کل پچاس ہزار روپے کی ہوتی ہے۔

گورنمنٹ اضلاع شمال و مغرب نے ایک نہایت عمدہ اور وسیع قطعہ زمین تعدادی لیونے دو سو بیگھہ پختہ کے واسطے تعمیر مکان مدرسہ اور باغ متعلق مدرسہ کے مرحمت فرمایا ہے۔

کمیٹی نے فی الفور باغ کی درستی کی تدبیریں شروع کی ہیں اور بنظر ان عنایات امداد کے جو حضور سر ولیم میور صاحب بہادر ایل۔ ایل۔ ڈی۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمال و مغرب نے فرمائی ہے اس باغ کا نام "دی میور پارک" رکھنا تجویز ہوا ہے۔ اب ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے عرض کرتے ہیں کہ جو جو لوگ اس خیال سے ہمت ہارے ہوئے تھے کہ اتنا بڑا کام کیوں کر انجام ہوگا ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ کام ہوتا جاتا ہے اب ہمت ہارنی نہیں چاہئے اور مستعد ہو کر اس کام کے انجام کی کوشش کرنی ضرور ہے۔ "ہمت مرداں مدد خدا" مشہور مقولہ ہے ہمت کرو اور جس قدر بڑا کام اور جس قدر زیادہ مشکل ہو اتنی ہی زیادہ کوشش کرو خدا سب مشکلوں کا آسان کرنے والا ہے۔

ہیچ مشکل نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

سید احمد خاں — رسالہ تہذیب الاخلاق یکم ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ

لائق سید کا نالائق محمود

"آخر میں سید محمود کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ جو چاہتے سید صاحب کو اس کے کرنے پر مجبور کرتے، چنانچہ ٹرسٹیوں کی جو جگہیں خالی تھیں، ان کو سید محمود کے اصرار سے باختیار خود پُر کر دیا۔

آخر میں سید صاحب کو اپنی کوٹھی میں رہنے میں اتنی ناگواری پیش آئی کہ انھوں نے مجھ کو بلا کر فرمایا کہ "میرے واسطے بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا بنگلہ خالی کرا دو"۔ میں نے کہا بہت اچھا جس بنگلہ میں مولانا حالی آکر مقیم ہوئے تھے وہ بنگلہ خالی ہے اس کو صاف کرا دوں گا۔ آپ اس میں تشریف لے آئیے۔ سید صاحب ۱۸۹۷ء میں اس بنگلہ میں اپنی کوٹھی چھوڑ کر تشریف لے آئے۔

میں نے بیگ صاحب سے کہا کہ سید صاحب پر لوگ الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے بیٹے کی محبت سے ان کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین کرا دیا اور بھتیجے

گیٹ کے جواب میں ہوگا۔ اس کے بعد وہ اپنی کوٹھی چلے گئے اور میں حاجی اسمٰعیل صاحب کی کوٹھی گیا وہاں میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب تو سید صاحب کے جنازہ کے پاس قرآن مجید پڑھ رہے ہیں اور ان کے عزیز سو رہے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر میں بھی بورڈنگ ہاؤس چلا آیا اور سو رہا۔ دوسرے دن علی الصبح میں اٹھا اور قبر کے لئے مزدور لینے کی غرض سے منشی ناصر خاں کے پاس گیا اور ان سے قبر کھودنے کے لئے مزدور مانگے۔ منشی ناصر نے کہا کہ رات میں سید محمود آئے تھے انھوں نے مسجد میں سید صاحب کی قبر کھدوائی ہے یہ سن کر میں واپس چلا آیا اس روز ہمارے اسکول میں سالانہ امتحان کا نتیجہ سنانے کو تھا صبح سے اسکول کا نتیجہ مرتب کرتا رہا۔ نتیجہ مرتب کرنے کے بعد اسکول کا کام ختم ہوگیا اور میں نے کمرہ پر آکر کھانا کھایا اور سو رہا۔ دو تین بجے کے درمیان میں نے سید عبدالباقی سے کہا کہ کچھ رقم اپنی جیب میں لیے چلو اگر تجہیز و تکفین کا کچھ بندوبست نہ ہوا ہو تو ہم کر دیں گے۔ میں اور سید عبدالباقی اس وقت ظہور حسین وارڈ میں رہتے تھے سید صاحب کے جنازہ پر جانے کے لئے نکلے ہی تھے کہ مولوی زین العابدین صاحب ملے انھوں نے مجھ سے کہا کہ سید صاحب کا نوکر عظیم ابھی میرے پاس آیا تھا اور سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے لئے کچھ روپے مانگتا تھا میرے پاس تو کچھ تھا نہیں۔ میں نے اس کو نواب محسن الملک کے پاس بھیج دیا ہے۔ تم وہاں جاؤ اور اگر نواب محسن الملک کے ہاں سے عظیم کو کچھ مل گیا ہو تو خیر ورنہ تم کچھ بندوبست کر دینا۔ ہم دونوں نواب محسن الملک کی کوٹھی پر گئے وہاں دلی سے آئے ہوئے مولوی ذکاء اللہ صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب موجود تھے۔ نواب محسن الملک ہم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا کہ سید صاحب کا نوکر عظیم کہتا ہے کہ محمد احمد کے ملازم سے دس روپیہ قرض لے کر وہ سامان لینے آیا ہے مگر محمد احمد اپنے نوکر پر خفا ہوئے۔ میں نے کہا جناب ہم تو یوں چپ تھے کہ سید صاحب کے عزیز اور دوست سب موجود ہیں اگر ہم اُن کی تجہیز و تکفین کے بارے میں پیش قدمی کریں گے، تو آپ لوگ ناخوش ہوں گے ورنہ آرنلڈ جو ہمارا ہم مذہب اور ہمارا ہم وطن نہیں ہے صرف چند سال اس نے ہمارے ساتھ اس کالج میں کام کیا تھا اس کو جب وہ کالج چھوڑ کر جانے لگا تو اس کی رخصت کے لئے ہم نے کئی سو روپے چندہ جمع کرکے اس کو رخصت کیا۔ سید تو ہمارے اور ہم سید صاحب کے، سید صاحب کی تجہیز و تکفین کے واسطے روپیہ جمع کرنا کونسا مشکل کام ہے اگر آپ اجازت دیں تو ہم اُن کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں گے۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں تم کو انتظام کرنے کی ضرورت نہیں ہے عظیم سے دریافت کیا کہ کس قدر روپیہ کی ضرورت ہوگی عظیم نے پچاس روپے بتائے اور نواب صاحب نے فرمایا کہ "یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے، پھر کب چندہ مانگنے آویں گے؟" اور پچاس روپے عظیم کو دے دیئے اس کے بعد سید صاحب کی تجہیز و تکفین ہوگئی۔

دوسرے دن تیسرے پہر کالج گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور مسجد کے شمال میں سید صاحب دفن کئے گئے۔ ہزارہا آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہر مذہب اور قوم کے لوگ اور ضلع علی گڑھ کے تمام عمائدین و رؤسا اور حکام گورنمنٹ شریک جنازہ تھے۔"

میر ولایت حسین

'آپ بیتی'

کامل آزادی کی پہلی تجویز

"جنابِ صدر و حاضرین!

میں اس وقت آپ کے روبرو جس ریزولیشن کو پیش کروں گا وہ نہایت درجہ اہم ہے۔ اس لئے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس کو معمولی ریزولیشن کی طرح قبول نہ کیجئے گا بلکہ نہایت غور و خوض کے ساتھ رائے قائم کیجئے گا۔ ریزولیشن یہ ہے پہلے میں اس کو انگریزی میں پڑھ کر سناتا ہوں (انگریزی) اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تک جو ریزولیشن کانگریس کریڈ کا ہے اس کی رو سے ہندوستان کا مقصد نیشنل کانگریس کا مقصد صرف سوراج کا حاصل کرنا ہے اس میں لفظ سوراج کی تشریح نہیں کی گئی ہے اب میں یہ ریزولیشن پیش کرتا ہوں کہ سوراج سے ہمارا مطلب کامل آزادی کا ہے۔ میں اس ریزولیشن کو پیش کرنے کے قبل آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ایک سال قبل کی طرف نظر دوڑایئے آپ کو یاد ہوگا کہ جب ناگپور کانگریس میں یہ ریزولیشن پیش کیا گیا تھا اور سوراج کا لفظ داخل کیا گیا تھا تو کہہ دیا گیا تھا کہ ہم یہ لفظ مبہم شکل میں اس لئے رکھتے ہیں کہ لوگوں کو موقع رہے کہ جو معنی چاہیں قرار دے سکیں جو لوگ سوراج کے معنی وِد اِن دی برٹش امپائر (with in The British Empire) لیتے ہیں تو کبھی فیصلہ ہمارے موافق ہو جائے گا۔ پھر ہم باہر جانے

ہے کہ ہندوؤں کو مسلم تسلط کا خطرہ ہے اور مسلمانوں کو ہندو حاکمیت کا۔۔۔ 'ڈیلی ہیرلڈ' نے لکھا ہے کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کر دیا ہے۔ میرا اپنا کچھ ہے نظامِ حیات ہے اور اپنا فلسفہ سیاست ہے یعنی میرا مطلب اسلام سے ہے۔ خدا کے حکم سے میں پہلے مسلمان ہوں بعد میں بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ میں اپنا یہ عقیدہ بدل دوں تو میں ایسا نہیں کروں گا ۔۔۔ البتہ میں شیطان کے ساتھ بھی کام کر سکتا ہوں بشرطیکہ وہ اللہ کا کام ہو ۔۔۔ سب کام اچھے ہو جائیں گے اگر آپ کے انگلستان میں ایک بھی شخص ایسا نکل آئے جو حقیقی معنوں میں انسان ہو۔ میرا سب سے اعلیٰ بادشاہ خدا ہے اور خدا نے مجھ کو ویسا ہی آزاد پیدا کیا ہے جیسا کہ جارج پنجم کو۔"

مولانا محمد علی کی زندگی کی آخری تقریر — دوسری گول میز کانفرنس ۔ لندن ۔ ۱۹۳۰ء

کمیونزم ایک عوامی تحریک ہے

"کمیونزم کی تحریک کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمیونزم اور خونریزی (یا) دہشت لازم و ملزوم ہیں، حالانکہ اس کی حقیقت سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم لوگ عدم تشدد کو صرف ضرورت و مصلحت کی بنا پر جائز سمجھتے ہیں اور مہاتما گاندھی کی طرح اس کو ہر حالت میں بطور اصول لازمی قرار نہیں دیتے ۔۔۔ ذاتی چیزوں میں گھڑی، چھتری، لوٹا، مکان، کپڑے آتے ہیں، مشترکہ میں زمین، کارخانے وغیرہ اور کمیونسٹ اصول کا عمل ذاتی جائداد پر نہیں ہوتا صرف شخصی پر ہوتا ہے ۔۔۔ (۱) آزادی کامل کا کل جائز ذریعوں سے قائم کرنا۔ سوراج کی ہیئت متحدہ ری پبلک کی ہو جہاں کمیونزم کے اصولوں پر عمل کیا جائے۔ (۲) سوراج کے قائم ہونے تک کاشتکاروں اور مزدوروں کی فلاح و آزادی کی ہر ممکن کوشش کرنا اور اس ضمن میں ہندوستان کی ہر سیاسی جماعت کے ساتھ اس حد تک اشتراک عمل کو جائز رکھنا جس حد تک وہ جماعت ہمارے مذکورہ بالا اغراض کی تائید کرے۔ (۳) کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت کا سامان کرنا اور جمہور کو اپنا ہم خیال بنانا تاکہ سوراج کے قیام کے ساتھ فوراً ان پر عمل شروع ہو سکے۔"

خطبۂ صدارت مولانا حسرت موہانی — پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس، کانپور ۱۹۲۶ء

مسلم لیگ کی بنیادی پالیسی

"ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوم کے ہندوستان میں ایک خمس ہے۔ اب اگر ہندوستان میں خدانخواستہ انگریزی حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا اور اگر کوئی تدبیر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تبھی ہو سکتی ہے جبکہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمربستہ رہیں۔ ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم و ملزوم ہے ۔۔۔ انگریزوں کے بغیر ہم اس عزت و آسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے ۔۔۔ اگر مسلمان دل سے انگریزوں کے ساتھ ہیں تو ہندوستان سے ان کو کوئی نکال نہیں سکتا ۔۔۔ اُن کو اُس عمدہ خیال کی تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے تئیں مثل ایک انگریزی فوج کے تصور کریں اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کرنے اور اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہیں اور گورنمنٹ سے اپنے حقوق نہایت ادب اور متانت کے ساتھ طلب کریں کہ اس طریقے پر ہمارے دیگر ابنائے وطن کا عمل ہے اور اس سے میری مراد ایجی ٹیشن کے طریقے سے ہے۔ پس تمہارے دل میں یہی ایک خیال موجزن رہنا چاہیے کہ اس سلطنت کی حمایت کرنا تمہارا قومی فرض ہے ۔۔۔ تم اپنے تئیں انگریزی فوج کے سولجر خیال کرو، تم تصور کرو کہ انگریزی پرچم تمہارے سر پر لہرا رہا ہے، تم یقین کرو کہ تمہاری یہ دوڑ دھوپ اسی لیے ہے کہ تم ایک دن تاج برطانیہ پر (اگر اس کی ضرورت ہو) اپنی جانیں نثار کرو اور انگریزی سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس سلطنت کے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ کلہ بکلہ لڑو۔ اگر تم نے یہ خیال دل نشین رکھا تو مجھ کو امید ہے کہ تم اپنی قوم کے لیے باعث فخر ہو گے اور آئندہ نسلیں تمہاری شکرگزار ہوں گی اور تمہارا نام ہندوستان کی انگریزی حکومت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔"

نواب وقار الملک سیکریٹری مسلم لیگ، کی ایک تقریر۔ علی گڑھ فروری ۱۹۰۸ء

تقسیم ہند کی سب سے پہلی اسکیم

"مسلمانوں سے ہندوؤں کی مخالفت کی بنا صرف گاؤکشی ہی نہیں ہے بلکہ اردو، ہندی کے جھگڑے، انتظام سلطنت میں ہمارے حقوق کی مزاحمت، انتخاب جداگانہ سے انکار، سرکاری ملازمت کی کشمکش وغیرہ وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اتحاد کے موانع ہیں اس لئے یہ اصول تسلیم کر لینے کے بعد کہ مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ رکھا جائے اور جانبین کے معتقدات سے تعرض نہ کیا جائے، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ایک زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندو مسلمانوں کی مستقل اسکیم کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کر دے۔

۱۔ ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بنا پر اس طرح کی جائے کہ ہر قوم کے لئے بڑے سے بڑا حصہ —— اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقۂ اثر قرار دیا جائے مثلاً مسلمانوں کے لئے حسب ذیل تین صوبہ جات بنائے جا سکتے ہیں :۔

الف : صوبہ سرحدی و مغربی پنجاب کے دس اضلاع، راولپنڈی، اٹک، جہلم، گجرات، شاہ پور، میانوالی، جھنگ، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور ملتان یکجا کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔

ب : بنگال میں بوگرا، رنگ پور، دیناج پور، جلپائی گوری، ندیا، فرید پور، ڈھاکہ، راج شاہی، میمن سنگھ، باقر گنج، نواکھالی، پٹرا، چٹاگانگ کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

ج : سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے جدا کر کے تیسرا صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ یہ بات اصولاً طے کر دی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر حصۂ ملک کا نظم و نسق اس کے کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لئے کیا جائے گا۔

۳۔ قلیل التعداد اقوام کی حفاظت دادائے مراسم مذہبی و حقوق ملازمت وغیرہ کے لئے قواعد مرتب کئے جائیں اور ان کے قومی سیاسی اہمیت کی بنا پر حسب ضرورت دارالامن قائم کئے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک با اثر قوم ہے لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی کے ہندو یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے، جو اس کا حلقۂ اثر بنایا جا سکے اس لئے قومی و پولیٹیکل اہمیت کی بنا پر ان کے لئے ایک دارالامن قائم کیا جائے۔ لدھیانہ و امرتسر اس کے لئے بہت موزوں ہیں ان مقامات کا نظام حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔ سیالکوٹ عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیا جائے اور ان کو وہاں وہی حقوق دئے جائیں جو سکھوں کو لدھیانہ و امرتسر میں۔ اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کی ضرورت ہوگی۔

۴۔ تبادلۂ آبادی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں تاکہ قلیل التعداد اقوام کے افراد جو کسی وجہ سے ترک وطن کر کے خود اپنی قوم کے حلقۂ اثر میں جانا چاہیں وہ بغیر زیادہ نقصان کے تبدیل سکونت کر سکیں۔

۵۔ کمیشن مجوزہ کا فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبے کے عمل درآمد کے لئے پیش کیا جائے۔

۶۔ جس وقت تک اس طرح کا معاہدہ نہ ہو جائے :۔

الف : مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کی مخالفت نہ کی جائے۔

ب : پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب آبادی کی بنا پر قرار دیا جائے جو تناسب نمائندگی کانگریس لیگ اسکیم نے قرار دیا ہے اس کی رو سے جن صوبوں میں مسلمان بلحاظ آبادی زیادہ ہیں وہاں بھی اُن کی میجارٹی نہیں رہی اور جہاں جہاں قلت تھی وہ بدستور قائم ہے یہ سراسر ناانصافی ہے۔

ج : مذہبی مناقشات کے انسداد کے لئے قومی پنچایتیں قائم کی جائیں جن میں ہندو مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہو اور ہر قوم کی پنچایت

کے لئے وہی لوگ منتخب کئے جائیں جو درحقیقت معتمد علیہ ہوں۔

مہاتما جی! اب میں اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں اور متوقع ہوں کہ جس دل سوزی سے میں نے اس کو لکھا ہے آپ اس کی قدر کریں گے اور اس کو نہایت غور و تامل کے ساتھ اول سے آخر تک پڑھ کر اپنے خیالات سے اہلِ ملک کو مطلع فرمائیں گے تاکہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ جس پر ملک کی آئندہ ترقی و بہبودی کا دارومدار ہے، ہمارے جاہ پسند لیڈروں اور آپ کی قوم کے متعصب افراد کی دست برد سے محفوظ رہے۔ اس وقت ملک پر آپ کا اثر ہے اور آپ سے یہ امید کرنا بے جا نہیں ہے کہ آپ اسے اہلِ ہند کے مناقشات کے دور کرنے میں استعمال فرمائیں گے۔ وما علینا الا البلاغ

محمد عبدالقدیر کا کھلا خط گاندھی جی کے نام — علی گڑھ ۱۹۲۵ء

علی گڑھ پاکستان اسکیم

اس اسکیم کے مصنف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور افضل حسین قادری ہیں۔ یہ اسکیم سارے ہندوستان کو متعدد حصوں میں بانٹتی ہے جس کا ہر حصہ مکمل طور پر ایک سلطنت ہوگا اور تمام معاملات میں آزاد و خود مختار ہوگا۔

1۔ پاکستان:۔ اس میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے برطانوی صوبے ہوں گے اور کشمیر مع جموں، منڈی، چمبا، سکیت، سمین، فرید کوٹ، نابھہ، جھند، پٹیالہ، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، چترال، دیر، قلات، لومارو، بلاس پور، بہاولپور اور شملہ کی پہاڑی ریاستیں ہوں گی۔

مجموعی آبادی 3 کروڑ 92 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 60 فیصدی

2۔ بنگال:۔ اس میں صوبہ بنگال (ہاوڑا اور مدنا پور کے اضلاع کے ماسوا) ہوگا اور آسام کا سلہٹ ضلع اور بہار کا پورنیہ ضلع ہوگا۔

مجموعی آبادی 5 کروڑ 25 لاکھ، مسلمان 3 کروڑ 1 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 57 فیصدی

3۔ ہندوستان:۔ اس میں ہندوستان کے تمام بقیہ حصے اور ریاستیں (حیدرآباد، پاکستان، بنگال اور بنگال کی ریاستوں کے ماسوا) شامل ہوں گے۔

مجموعی آبادی 21 کروڑ 60 لاکھ، مسلمان 2 کروڑ 9 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 9 فی صدی

4۔ حیدرآباد:۔ اس سلطنت میں ریاست حیدرآباد، صوبہ برار اور کرناٹک (جس کے کچھ اضلاع مدراس سے لئے جائیں گے اور کچھ اڑیسہ سے) شامل ہوگا۔ مجموعی آبادی 2 کروڑ 50 لاکھ، مسلمان 21 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 7 فی صدی

5۔ دہلی:۔ اس میں صوبہ دہلی اور صوبہ متحدہ کا میرٹھ اور روہیل کھنڈ ڈویژن اور علی گڑھ کا ضلع ہوگا۔

مجموعی آبادی 1 کروڑ 26 لاکھ، مسلمان 35 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 28 فی صدی

6۔ مالابار:۔ اس سلطنت میں مالابار کا صوبہ اور جنوبی کنارا ہوگا۔

مجموعی آبادی 49 لاکھ، مسلمان 14 لاکھ، مسلمانوں کا تناسب 27 فی صدی

7۔ آزاد شہر:۔ ہندوستان میں جتنے شہر 50 ہزار یا اس سے زیادہ آبادی رکھنے والے ہوں گے انھیں آزاد شہر (Free City) کا درجہ دیا جائے اور وہ خود بطور ایک سلطنت کی مانند آزاد ہوں۔

سکندر پاکستان اسکیم

یہ اسکیم سر سکندر حیات مرحوم نے مسلمانوں اور دیسی حکمرانوں کو مطمئن کرنے کے نقطۂ نظر سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو ترمیم کے لئے پیش کی۔ اسکیم میں ہندوستان کے لئے وفاق (Federation) کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور اس میں ہندوستان کو مندرجہ ذیل سات متجانس (Homogenous) منطقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ہندوستانی منطقے

1۔ اس میں آسام اور بنگال (ایک یا دو مغربی اضلاع کے ماسوا) کے صوبے، بنگال کی ریاستیں اور سکم شامل ہوگا۔

2۔ بہار اڑلیہ کے صوبے جن میں بنگال کے دو اضلاع بھی شامل کیے جائیں گے۔

3۔ صوبہ متحدہ اور اس کی تمام ریاستیں۔

4۔ صوبہ مدراس اور مدراس کی تمام ریاستیں۔

5۔ اس میں بمبئی، حیدرآباد، مغربی ہند کی ریاستیں، صوبہ بمبئی کی ریاستیں، میسور اور صوبۂ متوسط کی دیسی ریاستیں شامل ہوں گی۔

6۔ راجپوتانہ کی ریاستیں (بیکانیر اور جیسلمیر کے ماسوا) گوالیار، وسط ہند کی ریاستیں اور صوبہ بہار و اڑلیہ کی ریاستیں اور صوبہ متوسط اور برار

7۔ صوبۂ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، کشمیر، بلوچستان، صوبہ پنجاب کی ریاستیں اور بیکانیر اور جیسلمیر کی ریاستیں۔

مولانا محمد علی پاکستان اسکیم

بستر مرگ سے مولانا محمد علی جوہر نے انگلستان کے وزیر اعظم کو ایک خط لکھا اور اس میں یہ واضح کر دیا: "ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں ان کو مکمل اختیارات ملیں، وہ صوبے چھوٹے ہوں یا بڑے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کو تحفظ ملے یہی رعایت اور اختیارات کی خصوصیت ہندوؤں کو حاصل ہو۔" یہ 1930ء کی بات ہے کہ جب مولانا گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن گئے ہوئے تھے۔

اسد اللہ پاکستان اسکیم

یہ اسکیم بہت ہی سہل اور مختصر ہے یعنی شمالی ہندوستان مسلمانوں کو دے دیا جائے اور ست پوڑا اور وندھیاچل پہاڑوں کے دکھن کا حصہ ہندوؤں کو۔ اسکیم میں بہت بڑے پیمانے پر تبادلۂ آبادی کا بھی مشورہ دیا گیا ہے اور ہندوؤں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں چلے جائیں اور جنوبی ہند کے کل مسلمان شمالی ہند میں آ بسیں۔

پنجابی پاکستان اسکیم

اس اسکیم کے ذریعہ ہندوستان کو مندرجہ ذیل پانچ وفاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو ایک کل ہند اتحادیہ (All India Federation) میں شامل ہوں گے۔

1۔ سندھستان فیڈریشن:۔ صوبۂ پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر کی ریاست

رقبہ 3 لاکھ 9 ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی 3 کروڑ 3 لاکھ، مسلمان 83 فیصدی، ہندو 8 فی صدی، سکھ 6 فی صدی

2۔ ہندوستان فیڈریشن:۔ صوبے متحدہ، متوسط، بہار و اڑلیہ، آسام، مدراس، بمبئی، بنگال کے مغربی اضلاع اور ہندوستان کی تمام ریاستیں (راجستھان اور دکن فیڈریشن کی ریاستوں کے علاوہ) شامل ہوں گی۔

رقبہ 7 لاکھ 42 ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی 21 کروڑ 6 لاکھ ہندو 83 فی صدی مسلمان 11 فی صدی

3۔ راجستھان فیڈریشن:۔ راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی تمام ریاستیں

رقبہ 1 لاکھ 80 ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی 1 کروڑ 78 لاکھ، ہندو 86 فی صدی مسلمان 8 فی صدی

4۔ دکن فیڈریشن:۔ اس فیڈریشن میں ریاست حیدرآباد، میسور اور باستور کی ریاستیں

رقبہ 1 لاکھ 25 ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی 3 کروڑ 51 لاکھ ہندو 85 فی صدی مسلمان 8 فی صدی

5۔ بنگلہ فیڈریشن: مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی اضلاع اور صوبۂ آسام کے سلہٹ اور گوالپارہ اضلاع
رقبہ 59 ہزار مربع میل۔ مجموعی آبادی 3 کروڑ 6 لاکھ۔ مسلمان 66 فی صدی ہندو 33 فی صدی

ج۔ الطیف پاکستان اسکیم

اس اسکیم میں ہندوستان کو چار مسلم اور گیارہ ہندو ثقافتی حلقوں (Cultural Zones) میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مسلم حلقے: ۱۔ شمال مغربی حلقہ: اس خطے میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کے برطانوی صوبے ہوں گے اور خیرپور اور بہاولپور کی ریاستیں شامل ہوں گی۔

۲۔ شمال مشرقی حلقہ: اس میں مشرقی بنگال اور آسام کا صوبہ ہوگا۔

۳۔ دہلی لکھنؤ حلقہ: یہ حلقہ ریاست پٹیالہ کی مشرقی سرحد سے لے کر رام پور کو احاطہ کرتا ہوا لکھنؤ تک جائے گا اور اس میں آگرہ، دہلی، کانپور اور لکھنؤ کے شہر ہوں گے۔ ریاست صرف ایک رام پور ہی ہوگی۔

۴۔ دکنی حلقہ: اس میں ریاست حیدرآباد اور برار کا صوبہ ہوگا۔ مزید برآں اس حلقے میں کرنول، کڈاپا، چتوڑ، شمالی ارکاٹ اور چنگل پٹ کے برطانوی اضلاع (جو فی الحال صوبۂ مدراس میں ہیں) شامل کر دیئے جائیں گے تاکہ اس حلقہ کو سمندری کنارہ بھی مل جائے۔

ہندو حلقے: ۱۔ اس حلقے میں مغربی بنگال کے وہ اضلاع جو مسلم حلقے سے بچ رہے ہوں اور بہار کے وہ اضلاع جن میں بنگلہ زبان بولی جاتی ہے، ہوں گے۔

۲۔ اڑیسہ: جس میں تمام اڑیہ بولنے والے اضلاع شامل ہوں گے۔

۳۔ بہار اور یوپی کا حلقہ: جس کی وسعت لکھنؤ اور دہلی کے مسلم حلقے کی سرحد تک ہوگی اور وہ کوہ ہمالیہ اور سندھیاچل کے درمیان واقع ہوگا۔ اس میں وسط ہند کی چند ریاستیں بھی شامل ہوں گی۔

۴۔ راجپوتانہ کی راجپوت ریاستیں مل کر ایک خطہ بنائیں گی۔

۵۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ۔ ۶۔ مہاراشٹر ۷۔ کنارا ۸۔ آندھرا ۹۔ تامل ناڈ ۱۰۔ مالابار اور

۱۱۔ شمالی و مغربی ہند میں ایک ہندو سکھ بلاک جس میں کشمیر کے بھی کچھ حصے شامل ہوں گے۔

تبادلۂ آبادی: مصنف اسکیم نے ان مسلمانوں کو جو ہندو علاقے میں رہتے ہیں رائے دی ہے کہ وہ اپنے قریبی مسلم علاقے میں منتقل ہو جائیں اور اسی طرح جو ہندو مسلم علاقے میں ہیں وہ ہندو علاقے میں چلے جائیں۔ ہر رکنیوں کے تبادلے کا سوال ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہندو یا [illegible] علاقے جس میں وہ رہنا پسند کریں چلے جائیں۔ لیکن یہ تبادلۂ آبادی فوری طور پر نہ ہو بلکہ [illegible] سال کی مدت میں مکمل ہو تاکہ انتظام میں سہولت ہو۔

مرکز: اس اسکیم کا مقصد کلچر اور تمدن کی بنیاد پر متجانس ریاستوں (Culturally Homogenous States) کی ایک اتحاد (Confederacy) قائم کرنا ہے۔ لیکن فی الحال یہ اسکیم ان تمدنی منطقوں کا ایک کل ہند وفاق قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی رائے ہے کہ وفاق کی تمام وحدتوں (units) کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے اور صرف ناگزیر معاملات، جیسے دفاع، خارجی حکمت عملی، تجارت، رسل و رسائل وغیرہ وفاق کے سپرد کئے جائیں۔ اس دستور میں دیسی ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کے حقوق کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تسلیم کر لیا گیا۔

صوبہ یا مرکز کی منتظمہ (Executive) اکثریت مرتب نہ کرے گی، جیسا کہ انگلستان کی پارلیمنٹ کا قاعدہ ہے، بلکہ ایسی منتظمہ ہوگی جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو ملا کر بنائی جائے گی۔ اگرچہ یہ مجلس منتظمہ مجلس مقننہ ہی منتخب کرے گی لیکن یہ مجلس مقننہ کی گرفت سے آزاد ہوگی اور بقول مصنف (Stable Executive Independent of Legislature) ہوگی۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو کوئی نہ نکال سکے گی۔

ڈاکٹر عبداللطیف صاحب لکھتے ہیں "منتخبہ وزیر اعظم صرف مجلس مقننہ کی میعاد تک برسر خدمت رہے گا مگر مقننہ کو اس کی علیحدگی کا اختیار نہ ہوگا"

(متبادل دستور ہند صفحہ 17)

نمائندگی کا طریقہ جداگانہ انتخاب ہوگا اور تمام صوبوں میں مسلمانوں کی موجودہ تعداد صوبائی اسمبلیوں میں بھی قائم رہے گی۔

اقبال کی پاکستان اسکیم

ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ایک ترکیب نکالی اور اس کا تذکرہ الہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دسمبر 1930ء میں اپنے خطبۂ صدارت میں کیا۔ اس میں علامہ موصوف نے فرمایا تھا، "میری تمنا ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان کو ملا کر ایک سلطنت کے قیام کی کوشش کی جائے حکومت خود اختیاری خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ملے یا اس سے باہر، ہندی مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا متحدہ سلطنت کی تعمیر مسلمانوں کا مقصد اعلیٰ ہونا چاہیے۔ اس تجویز کو نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس پر عمل کرنے سے ایک ناقابل انتظام سلطنت ظہور پذیر ہوگی۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کی بعض موجودہ صوبوں سے کم تر ہوگی لیکن اگر انبالہ ڈویژن اور بعض دیگر غیر اسلامی اضلاع کو الگ کر دیا جائے تو اس کی وسعت بھی کم ہو جائے گی اور مسلم آبادی کا عنصر اور بھی بڑھ جائے گا اور اس طرح غیر مسلم اقلیتوں کو مزید موثر سیاسی مراعات دینے کا موقع بھی میسر ہوگا۔"

رحمت علی پاکستان اسکیم

ڈاکٹر اقبال کے دو قومی نظریے کے تحت اُنہی کی تجویز پاکستان کو کیمبرج یونیورسٹی (لندن) کے طالب چودھری رحمت علی (اور ان کے ساتھی محمد اسلم خاں، محمد صادق اور عنایت اللہ خاں) نے جنوری 1933ء میں ایک گشتی اشتہار کے ذریعہ ایک نئی صورت میں پیش کیا۔ اُن دنوں لندن میں تیسری گول میز کانفرنس جاری تھی۔ اشتہار میں کہا گیا تھا کہ سر اقبال نے آل انڈیا فیڈریشن کے اندر مسلم اکثریت کے صوبوں کی ایک ریاست کی جو تجویز پیش کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ ان صوبوں کی اپنی ایک الگ ہی فیڈریشن ہو۔ ہندوستان کی سرزمین پر امن و سکون کی فضا اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ مسلمان اپنے کام آپ انجام دینے کا مجاز نہ رکھتے ہوں اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ جب وہ ہندو اکثریت کے دباؤ سے اپنے آپ کو نکال لیں۔ جولائی 1935ء میں رحمت علی نے اپنے آپ کو پاکستان نیشنل تحریک کا بانی قرار دیا اور کراچی کے ایک جلسہ میں انھوں نے سارے شمال مغربی علاقے کو مملکت پاکستان کا نام دے دیا اور انھوں نے مسلم بنگال اور مسلم آسام کو بھی اپنی مجوزہ مملکت میں شامل کر لیا اور بعد میں حیدرآباد کو بھی عثمانستان کا نام دے کر مملکت پاکستان کا ایک صوبہ قرار دیا۔ رحمت علی ہوشیار پور پنجاب کے رہنے والے تھے۔

مسٹر جناح کا دو قومی نظریہ

"قومیت کی کسی قسم کی تعریف کی رو سے ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ ہم ایک ارب کی تعداد میں ہیں اور اس سے بھی قطع نظر ہم ایک علاحدہ تہذیب اور کلچر، زبان اور ادب، تناسب اور وزن میں، قانون اور اخلاق میں، رسم و رواج میں، تاریخ اور روایت میں، نظریہ اور خواہشات میں ایک بالکل مختلف قوم ہیں۔ مختصراً ہم زندگی کے متعلق اور زندگی پر ایک بالکل الگ نظریے کی حامل قوم ہیں کسی بھی بین الاقوامی قانون کی رو سے ہم ایک قوم ہیں۔

اگر مسلمان ایک الگ قوم ہیں، پھر انھیں ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں خود مختار رہنے کا حق ہے وہ علاقے جو اُن کے وطن کی طرح ہیں مثلاً پنجاب، شمال مغربی سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام۔ ان علاقوں میں وہ ایک مسلم ریاست کی تشکیل کر سکتے ہیں جو بین الاقوامی طور پر آزاد ہوگی اور خاص طور پر ہندو ہندوستان ہے۔

مسٹر گاندھی اور مسٹر ایمری وزیر ہند دونوں متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں۔ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔"

ہندو مسلمان دو قومیں

"اِس باب میں مجھے کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک و شبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ یہ ایک ہی ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے، سیاست ہے یا عمرانی اصلاح ہے تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے . . . (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی کا ایک ہنگامہ پرور دی بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں۔"

مسٹر جناح کا ایک خط گاندھی جی کے نام — جنوری ۱۹۴۰ء

پاکستان کے لئے باضابطہ تجویز

"مسلم لیگ کا ستائیسواں اجلاس 22۔23۔24 مارچ 1940ء کو مسٹر محمد علی جناح مستقل صدر کی صدارت میں بمقام لاہور منعقد ہوا مسٹر جناح تیسری بار سالانہ اجلاس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ اس سال کے خطبۂ صدارت میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ہندو مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں اس لئے ملک کو دو جداگانہ حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور دوسرے حصے میں ہندوؤں کی۔ یہ دونوں ریاستیں بالکل خودمختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوں اور ہندوستان میں کوئی وفاقی اور مرکزی حکومت نہ ہو!"

سید طفیل احمد — روشن مستقبل صد 433

مسٹر جناح بہت پچھتائے

"1937ء سے لے کر اس وقت تک جتنے واقعات ظہور پذیر ہوئے جب اُن کی صحیح اور مکمل تاریخ لکھی جائے گی تو دنیا کو معلوم ہوگا کہ مسٹر جناح نے کتنے اچھے اور سنہرے مواقع ہاتھ سے کھوئے ہیں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو کانگریس کو معصوم سمجھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کانگریس نے بھی اس بارہ میں غلطیاں کی ہیں لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ مسٹر جناح نے بعض بہترین مواقع کیوں کھوئے؟ یہاں پر میں صرف آخری واقعہ کا ذکر کروں گا۔ چونکہ اس میں میرا بھی بڑا حصہ تھا اس لئے میں شروع سے آخر تک اس سے خوب واقف ہوں۔ نومبر 44ء سے جون 45ء تک میں زیادہ تر گاندھی جی کے ساتھ رہا۔ میں نے جس درجہ ان کو ہندو مسلم مفاہمت کے لیے بیقرار اور مضطرب پایا اس کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ گاندھی جناح گفتگو کی ناکامی کے بعد بھی وہ مایوس نہ تھے اور ہر ممکن کوشش کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بارہا اصرار کیا کہ میں مسٹر جناح سے مل کر گفتگو کروں۔ مگر میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح مجھ سے ملنا ہرگز پسند نہ کریں گے اس لیے میں انکار کرتا رہا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ مسٹر جناح ایک شریف اور ایماندار شخص ہیں وہ تم سے ضرور ملیں گے۔ لیکن میں راضی نہ ہوا۔ بہرحال جو کوششیں اس زمانے میں ہوئیں اُن کے اظہار کا یہ موقع نہیں ہے اس وقت صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ ایک وقت میں تو 'بھولا بھائی لیاقت علی فارمولا' یا عارضی مفاہمت یا پیکٹ (اسے جس نام سے بھی چاہے یاد کیجئے) سے مسٹر جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب نے انکار کیا اور پھر وہی چیز (یعنی کانگریس لیگ پیریٹی (Parity)) شملہ میں طلب کرتے رہے۔"

اگر وہ چیز اچھی تھی تو پہلے اس سے انکار کیوں ہوا اور اگر بری تھی تو پھر شملہ میں اس کی مانگ کیوں ہوئی اور اس پر زور کیوں دیا گیا۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس سنہرے موقع کو کھو کر مسٹر جناح نے بعد کو بہت دیر میں اپنی غلطی محسوس کی مگر موقع ہاتھ سے جا چکا تھا۔ اس کے بعد سے میں بالکل مایوس ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ مسٹر جناح کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتے بلکہ وہ انگریزوں ہی سے کوئی بے معنی شے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا نام چاہے پاکستان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ مسلمانوں کے درد کا علاج نہ ہوگی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی آزادی کو سخت نقصان پہونچائے گی۔ کمیونل اوارڈ کے وقت میں بھی مسٹر جناح نے بارہا یہ کہا تھا کہ اس کے حاصل ہو جانے کے بعد مسلمان مضبوط ہو جائیں گے اور پھر ان کو اکثریت کا کوئی خوف نہ رہے گا۔ کمیونل اوارڈ ملا لیکن وقت اور تجربے نے ثابت کر دیا کہ وہ نہ تو مسلمانوں کے درد کا علاج تھا اور نہ ہے، نہ اُن کی حفاظت اکثریت کے سچے یا جھوٹے مظالم سے کر سکتا ہے۔ اسی طرح مسٹر جناح کا بتایا ہوا پاکستانی علاج بھی نہ صرف بے کار ثابت ہوگا بلکہ مسلمانوں کے لئے زہر ہلاہل کا کام دے گا۔ پاکستان حاصل ہونے پر ہندوستان میں تو ہندو راج بلاشک و شبہ قائم ہو جائے گا لیکن پنجاب و بنگال میں مسلم راج کسی طرح بھی نہ ہوگا اس لئے کہ 7 فیصدی اور ۱۴ فیصدی اقلیت میں اور 45 فیصدی اقلیت میں بڑا فرق ہے۔ موخر الذکر کو اقلیت نہیں کہا جا سکتا اور اول الذکر صحیح معنوں میں اقلیت ہے۔"

ڈاکٹر سید محمود

'نئی زندگی پاکستان نمبر' 1946ء

مسٹر جناح کی بے نیازی

"میں نے ایک بار جناح صاحب سے دریافت کیا کہ آپ مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے تو جدوجہد کر رہے ہیں لیکن ان مسلمانوں کا کیا ہوگا جو یوپی کی طرح دوسرے صوبوں میں انتہائی اقلیت میں ہیں؟ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھا اور پھر جواب دیا کہ وہ لوگ اپنی دیکھ بھال خود کر لیں گے، مجھے اُن کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

کریم چھاگلا

'خود نوشت سوانح'

فساد پسند مسلم لیگ

" 1946ء میں ہندوستان میں جو فسادات شروع ہوئے تھے اُن کی ابتدا مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے ڈائرکٹ ایکشن سے کی تھی۔ کلکتہ کے فسادات میں شروع میں تو ہندوؤں کے کچھ آدمی مارے گئے تھے لیکن جب ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ کے مانند تشدد کا اقدام کیا تو پھر اس جگہ کے مسلمانوں کا ناقابلِ تلافی اور ناقابلِ بیان مالی و جانی نقصان ہوا۔ مسلم لیگ نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی غرض سے نواکھلی میں کلکتہ کا بدلہ لینے کے بہانے سے ہندوؤں پر زمین و آسمان ایک کر دیا اور ایسے مظالم توڑے اور بے حیائی سے بھرے کام کئے کہ انسانیت نے شرم کے مارے اپنا منہ چھپا لیا۔ فرنگی اپنی پالیسی 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کے مطابق ہندوؤں کو بھی اپنے جال میں لے آئے اور انھوں نے بھی نواکھلی کا بدلہ لینے کے بہانے سے بہار میں مسلمانوں اور غریبوں پر چنگیز اور ہلاکو کے جور و جفا کی یادیں تازہ کر دیں۔ مسلم لیگیوں کے دل کی مراد سرسبز ہو گئی۔ وہ خدا سے یہ دن مانگتے تھے۔

اس طرح کے مکروہ اور ناپاک ارادوں کے ساتھ وہ (مسلم لیگی) یا تو برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے اور یا پھر ملک کے ٹکڑے کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے لئے انھوں نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان بھر میں فسادات کی آگ لگا دی اور اپنے ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے۔ انگریز لیگیوں کی ان حرکتوں پر بڑے خوش تھے کیونکہ ہندوستان کی ان خرمستیوں سے انگریز نوکر شاہی انگلستان کی مزدور پارٹی کی حکومت پر یہ بات واضح طور پر ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ درندوں کی مانند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے کا گوشت پوست اُدھیڑنے کے درپے ہیں اور یہ کہ انسانوں کی طرح رہنے کے شعور کا ان میں بالکل فقدان ہے لہٰذا اُن کے سروں پر انگریز کی حکومت کا تسلط ضروری ہے اور اگر ایسا نہیں

ہوگا تو یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

مسلم لیگ انگریز کی اپنی پیداوار تھی۔ اس لئے انھوں نے بھی صورتِ حال کا ناجائز فائدہ اٹھانا پسند کیا اور ملک کا امن و سلامتی مٹانے کے لئے انگریز مسلم لیگیوں کی پشت و پناہ بن گئے۔

خان عبدالغفار خان

'آپ بیتی' ص 182

تم ہندو ہو!

"پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال جیل خانوں میں رکھا گیا ہے اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے آمین! ــــ اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدمت گار موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ قید و بند میں مبتلا کئے گئے۔ اور ان کے ساتھ ایسے ناروا سلوک ہوئے ہیں اور ان پر ایسے مظالم توڑے گئے ہیں جنھیں انسانیت برداشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی اس آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور اُن سے کہا تھا کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہئے۔ نیز اگر ہندوؤں نے ہماری یہ بات مان لی تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے۔ اور اگر انھوں نے ہماری یہ بات نہیں مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا ہونے کی تجویزیں منظور کر لیں گے۔ یہ حق ہمیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں۔ اور کہ ہمارا صوبہ ایک خود مختار ریاست بن جائے۔ لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بات پر غور و فکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور کبھی تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ "تم ہندو ہو!""

خان عبدالغفار خان

'آپ بیتی' ص 168

مسلم لیگ کی غلط قیادت کا بدیہی نتیجہ

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو آج تمہیں داغِ جدائی دے گئی ہے اُس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجھوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج اُنہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا ــــ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کی حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں، تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں وہ تقدیر جو تمہاری دماغی لغت میں منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی تمہارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بُت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے حالانکہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور انہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:۔

جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر

تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل
کا مورخ لکھے گا : تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار
کیا جو صفحہ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوا ہوا کرتا ہے ۔

اور آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے ——— ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے ۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں ۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا ۔ یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو ۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے ۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو ؟ اور کیوں جا رہے ہو ؟ یہ دیکھو ! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے ——— تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے ۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلیوں کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو کہ جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے ——— آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے ۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا ۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لئے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے ، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا ، بجلیاں آئیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے ۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبان کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا ——— آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے اور ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے رہیں گے ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تقریر ——— مقام : جامع مسجد دہلی ، اکتوبر 1947ء

فرقہ پرستی کا دروازہ مسلم لیگ

" مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے ۔ کسی ایک گوشے کی فرقہ پرستی نہیں کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں ، فرقہ پرستی ان بربادیوں سے جو ۱۵ اگست کے بعد ہوتی رہی ہیں ۔ لیکن اب ہندوستان جس کی آزادی کا ہم 5 برس سے خواب دیکھ رہے تھے برباد نہ ہو اور بربادی کے کسی نئے دروازے میں نہ جائے ۔ تو ہمارا فرض ہے جس دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اس دروازے کو بند کر دیں اور اس کو ختم کر دیں ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس فرقہ پرستی کا بہت بڑا دروازہ مسلم لیگ کا دروازہ ہے کھلا ہے میں نام نہ لیتا اگر حالات اور واقعات سے یہ ظاہر نہ ہوتا ۔ اب اگر وہ دروازہ بند نہ کیا گیا تو اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ مشکلات کے حل کی بہت بڑی ذمہ داری مسلمانوں کے کندھوں پر باقی رہتی ہے ۔ نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے کم مسلمانوں کی فلاح کی کوئی امید باقی نہیں رکھی جا سکتی ۔ بہرحال جو چیز اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فرقہ پرستی کو روک کر اپنی قومی زندگی کو بچائیں ، فرقہ پرستی کسی دروازے سے بھی آئی ہو ، اس کو بند کرنا ہوگا ۔ ایک دروازہ جو مسلمانوں کے ذریعہ سے کھولا گیا تھا وہ مسلم لیگ کا تھا ۔ اب اگر وہ بند نہیں کیا جاتا تو بہت بڑی ذمہ داری آپ پر رہ جائے گی ۔ اس وقت ہمیں سوچنا یہ ہے کہ وہ فرقہ

دارانہ انجمنوں سے بڑھ کر ملک کے سیاسی میدان کی زندگی میں کوئی چیز مہلک نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف دو ٹوک فیصلہ کریں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس، کوئی مسلم نظام سیاسی میدان میں فرقہ وارانہ بنیاد پر قائم نہ کریں گے۔ اور کسی مجلس کے مقصد پر فرقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہئے کیونکہ ایسا ہونا ملک کے لئے زہر قاتل ہے۔ تب آپ کو صاف صاف فیصلہ کرنا چاہئے کہ جہاں تک ہندستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے وہ نہیں چاہتے ہیں کہ ہندستان کے آسمان کے نیچے کوئی فرقہ وارانہ نظام باقی رہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مشورہ دینے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عام مسلمان جو کل تک مسلم لیگ میں تھے اب سوائے کانگریس کے کسی دوسری غیر فرقہ وارانہ جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اصلی چیز فرقہ پرستی کو سیاست کے میدان سے ہٹانا ہے اس کے بعد جو کچھ کیا جاتا ہے اس کی نوعیت ایک مشورے کی ہے اور وہ مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ نیشنل کانگریس میں شریک ہوں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد — خطبۂ صدارت: آزاد کانفرنس لکھنؤ 1947ء

فسادات کا ذمہ دار کون ؟

"سچ کہا ہے کسی شاعر نے ؎

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے — وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

سارا قصور جو ہے وہ مسلمان بیچارے کا ہے اس ہندستان میں جب سے پارٹیشن ہوا ہے مسلمان سے زیادہ غنڈہ، مسلمان سے زیادہ بے ایمان اور غیر وفادار اور کوئی ہے ہی نہیں۔ یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے کہ اس میں ہماری ہوم منسٹری کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے اقلیتوں کو خاص طور پر مسلمان اقلیتوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہم بھی اس ملک کے برابر کے باشندے ہیں۔ ہم سیکولر اسٹیٹ کو مانتے ہیں۔ ہم نے اپنی جانیں دی ہیں آج کسی فرقہ پرست کو کیسے اس ملک سے محبت ہو سکتی ہے۔ جب انگریز کی گولیاں چل رہی تھیں تو یہ سب کنڈی اور کواڑ بند کئے بیٹھے تھے آج ہو سکتا ہے کہ ان کو اپنے ملک سے محبت نہ ہو لیکن جنھوں نے 1923ء میں چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مسٹر علی سپرنٹنڈنٹ سے کہا تھا کہ گولی مار سکے تو مار مگر آزادی کا عہد نامہ پڑھا جائے گا۔ اور جو لوگ ملک کی خاطر جیلوں میں سڑ سکتے ہیں ان سے زیادہ ملک کا دوست کون ہو سکتا ہے مگر آج وہ سارے فرقہ پرست ہیں ان کے اخبار فرقہ پرست ہیں اور وہ لوگ جو کانگریس یا نیشنلسٹ جماعتوں کے صدقے میں اس آزاد ملک میں بیٹھے ہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستی برتتے رہتے ہیں وہ الٹے دوسروں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ سب کیوں ہے۔ مجھے ان سے شکایت نہیں مجھے ہوم منسٹری سے شکایت ہے مجھے اس کی شکایت ہے کہ اسٹیٹوں کے اندر جو ہوم منسٹر آپ مقرر کرتے ہیں۔ ان کے کام کو دیکھا نہیں جاتا۔ اسٹیٹ کے اندر اگر آپ لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی کو دیں تو آپ کو چیک کرنا ہوگا کہ وہ صحیح طور پر عمل کر رہا ہے یا نہیں۔ ساری ذمہ داری آپ کے اوپر ہے اسٹیٹ کے اوپر نہیں اگر اسٹیٹ گورنمنٹیں اس طرح کرتی ہیں تو وہاں کانگریس کی گورنمنٹیں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی طور پر وہاں سے مستعفی ہوں اور اگر استعفیٰ نہ دیں تو آپ ان کو اس کرسی سے ہٹا کر کہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ یہ ذمہ داری لے سکیں۔

ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں اگر ہندستان سے باہر کا کوئی ملک آنکھ بدل کر ہندستان کو دیکھے۔ گولیوں کے سامنے ہم سینہ تانے رہیں گے لیکن اس کے برعکس ہم اس طریقے سے مسلمان اقلیتوں کو برباد اور تباہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا۔ صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا اور مجھ جیسے بولنے والے کو یہ کہہ کر چپ نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی باتیں کرنا فرقہ پرستی ہے اگر مجھ پر ہزاروں فرقہ پرستیوں کا لیبل بھی لگا دیا جائے تو وہ میری قوم پرستی کو خاک میں نہیں ملا سکتی بلکہ میری قوم پرستی کی آگ میں خود ہی بھسم ہو جائے گی۔"

مولانا حفظ الرحمان — لوک سبھا 29 مارچ 1961ء

فارسی موقوف

"ہندستان کے عوام و خواص میں فارسی زبان مقبول نہیں ہے اس لئے یکم اکتوبر 1833ء سے کچہری و دفتر میں یہ زبان موقوف کی جاتی ہے آئندہ

روبکاری وغیرہ کاغذات علاقہ کچہری و کلکٹری ہندستان بزبان سلیس اردو ہندی حروف فارسی زبان میں لکھے جائیں لیکن علاقہ بندیل کھنڈ اور اس ضلع کی طرف ان جگہ دیوناگری جاری ہو۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا فرمان — اخبار جام جہاں نما 29 اکتوبر 1837ء

ہندی اردو تنازع

1868ء اور 1869ء میں اردو ہندی کی بحث میں شدت شروع ہوئی۔ الٰہ آباد میں ہندی کی حمایت میں ایک صدر مجلس قائم ہوئی اور مختلف مقامات میں اس کی شاخیں بنائی گئیں۔ اس صدر مجلس کے سیکریٹری (بابو سردا پرشاد سنڈیال) اور سرسید میں اسی تنازع کے متعلق مراسلت ہوئی۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، بنارس گزٹ، رسالہ تہذیب، (لکھنؤ) نورالابصار وغیرہ میں دونوں طرف سے بڑے گرم مضامین نکلے۔ ادھر یہ بحث ہو رہی تھی کہ بہار میں حکومت بنگال نے زبردستی اردو کی جگہ ہندی رائج کردی۔ الغرض 1873ء میں جب سرسید کو یہ معلوم ہوا کہ مدرسوں اور دفتروں میں دیوناگری جاری کرنے کے لئے ایک درخواست ہندوؤں کے دستخطوں کے لئے گشت کرائی جا رہی ہے تو انھوں نے 9 دسمبر 1873ء کو الٰہ آباد میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا اور اردو کی حفاظت کے لئے ایک صدر مجلس الٰہ آباد میں قائم کی جس کے سیکریٹری سرسید قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں۔ سرسید نے ایک پرزور اور مدلل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو مفصل طور پر بیان کیا جو اس تبدیلی سے پہنچیں گے۔ 1882ء میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایجوکیشن کمیشن کا دورہ بغرض تحقیقات ملک ... ہوا تو یہ جنون پھر شدت سے اچھلا اور اضلاع شمال و مغرب اور پنجاب کے ہندوؤں نے بڑی زور شور سے اردو کی مخالفت کی۔ دونوں صوبوں کی بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے، ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ کے اڈریس کے جواب میں کہا۔ "روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بے شمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں میموریل وصول ہو رہے ہیں ... صرف ایک درخواست پر جو کل ہی وصول ہوئی تین ہزار دو سو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں۔

یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مارچ 1898ء میں یکایک بھڑک اٹھی اور اشتعال کا باعث سر انٹنی میکڈانل ہوئے جو اس صوبے میں لیفٹیننٹ گورنر ہو کر آئے تھے اس سے پہلے صوبہ بہار میں کلکٹر تھے وہاں ہی اس آگ ... ان کے آنے سے ہندی کے طرفداروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ معزز اور سربرآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل لیفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا مولانا حالی لکھتے ہیں کہ سرسید پر اگرچہ اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتے کا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو 15 مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الٰہ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیئے تھے۔ اسی سال ہندی والوں کا ایک ڈیپوٹیشن لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا جس کو جواب دیتے ہوئے "ہز آنر نے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کرکے جس کے افسران گورنمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ ہو سکتا ہے۔" چنانچہ گورنمنٹ کے ریزولیوشن مورخہ 18 اپریل 1900ء میں ناگری حروف جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ وائسرائے کرزن نے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان بنا دیا۔ وہ جو ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا تھا ظالم نے وہ بھی کاٹ کر رکھ دیا۔

اس پر مسلمانوں میں بڑا ہیجان ہوا۔ نواب محسن الملک بہادر نے اس ناانصافی کی طرف گورنمنٹ کو توجہ دلانے کی غرض سے ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے کی تیاری شروع کی اور ملک کے سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ اصحاب کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ 17، 18 اگست 1900ء کو بمقام لکھنؤ بارہ دری قیصر باغ میں بڑی دھوم دھام سے اور جوش و خروش سے ہوا (لیکن نواب محسن الملک کو ایسی سخت دھمکی دی گئی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک

چھوڑتے نبی اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا) واقعی بہت حیرت انگیز ہے یہ اردو کی بہت بڑی شامت ہوئی۔

اس وقت سے یہ زبان جسے ہندی کہا جاتا ہے ترقی کرتی چلی گئی۔ پنڈت مالویہ جی نے جب شدھی اور سنگھٹن دنگل قائم کئے تو امر کا زور اور بڑھا اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ راج پوتانہ اور سنٹرل کی ہندو ریاستوں میں دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی وہاں دفعۃً کھینچ کھینچ کر اردو کو اکھاڑا اور ہندی کو جمایا۔ ایک جودھ پور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نے مرن برت رکھا۔ یہ مرن برت نہیں دھمکی برت ہے اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں وائسرائے دھمکی میں آگئے تھے اسی طرح جودھ پور کے وزیر اعظم بھی دھمکی میں آگئے۔ سر اینٹنی میکڈانل کو دیوناگری جاری کرنے میں دو سال لگ گئے تھے مگر جودھ پور کے وزیر با تدبیر نے چند ہی روز میں حکم ناطق جاری کر دیا اور بے گناہ اردو کے قتل کا فتویٰ سر مرزا اسماعیل کے دستِ مبارک سے لکھا گیا ــــ

آپ کو معلوم ہے کہ نومبر 1837ء میں حکومت نے ایک بجٹ پاس کیا جس کی رو سے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی کے بجائے اردو کر دی گئی۔ جب تک فارسی رہی کسی نے زبان کی شکایت نہ کی جب اردو ہوئی تب بھی کوئی شکایت نہ ہوئی۔ ہندی۔ اردو کی نزاع 1868ء سے شروع ہوئی جب بنارس کے بعض معزز ہندوؤں نے (بابو فتح نرائن سنگھ کی سرکردگی میں) تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے اور ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی (مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے کوشش کرنا محال ہے۔

1857ء کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہوئی۔ انگریزی راج آیا۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ جدید قانون نافذ ہوئے، ریل اور تار کی حیرت انگیز اختراع۔ کالجوں کی تعلیم، آزادی اور حب وطن تقریروں اور تحریروں، انگریزی انصاف پسندی کے اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو ادر ابھارا۔ خاص کر ہندو اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی نیا جوش پیدا کیا جسے میکس مولر نے ابھارا اور جس سے بعد میں اینی بزانٹ نے خوب کام لیا لیکن سب سے زیادہ مستحکم طور پر یہ خیال سوامی دیانند سرسوتی نے دلوں میں جمایا۔ گروکل قائم ہوئے جس میں سنسکرت پڑھنا اور سنسکرت بولنا لازمی تھا۔ ویدک زمانے کی معاشرت کی نقل کی جانے لگی ننگے پاؤں پھرنا اور ایک بے سلی چادر اوڑھنا لپیٹنا، جنگلوں میں رہنا، زیرِ سما سونا وغیرہ قومی شعار قرار پایا۔ سب سے زیادہ نزلہ اردو زبان پر گرا ؎

علی گڑھ کانفرنس 14 فروری 1941ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق

پاکستان کی سرکاری زبان اُردو

"میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی۔ اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے۔"

تقریر: 9 مارچ 1948ء ڈھاکہ

مسٹر جناح

ٹائپ کا ذوق

"سرسید کی تصنیفات سے مجھے ٹائپ کے چھاپے سے ایک ذوق پیدا ہو گیا، اور چونکہ سرسید کی کتابیں پہلے ٹائپ میں چھپی ہیں اور بعض بعض پھر لیتھو میں بھی نقل ہو گئیں۔ اس لئے میری کوشش یہ رہی کہ ہر کتاب کا ٹائپ ہی کا ایڈیشن حاصل کروں۔ تفسیر اور مجموعۂ تصنیفات احمدیہ کے علاوہ، جن میں تبیین الکلام اور خطبات احمدیہ ہیں میں نے تہذیب الاخلاق کی تینوں اشاعتوں کی مکمل فائلیں بھی منگوائیں۔ پہلی اشاعت سات سال تک رہی ہے اس کی بعض جلدیں ڈیوٹی شاپ میں نہیں تھیں۔ میں نے کوشش کر کے اور فی جلد پچیس روپے قیمت دے کر اسی کے توسط سے حاصل کیں۔

پھر خیال ہوا کہ اُن کے بہت سے مضامین علی گڑھ گزٹ اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں بھی جو اُن کے سفرِ یورپ کے بعد تک جاری رہا، نکلے ہوں گے نہایت گراں قیمت دے کر ان کی فائلیں بھی حاصل کیں اور سرسید کے انتقال تک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی جتنی فائلیں مل سکیں، وہ بھی منگوائیں۔

ابوالکلام آزاد　　　آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی　　صـ 253

اُردو کا ناقص رسمِ خط

"اردو طریقۂ تحریر ایک قسم کی مختصر نویسی ہے جس کے سیکھنے میں تو دیر لگتی ہے مگر سیکھ جانے کے بعد اُس کے لکھنے اور پڑھنے میں بمقابلہ ہندی اور انگریزی کے کم وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے موزوں ہے۔ برخلاف اس کے ہندی اور ناگری میں چونکہ اعراب کی جگہ حروف ہیں اور ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے اس لئے اُس کا سیکھنا اور پڑھنا بہت جلد آجاتا ہے اس کی وجہ سے بچے اور پوری عمر کے لوگ اسے بہت جلد سیکھ جاتے ہیں اور تھوڑے وقت میں کتابیں اور اخبارات پڑھنے لگتے ہیں۔ اس سے ہندوؤں میں خواندوں کی تعداد بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس کے مقابلے میں مسلمان بچے اور پوری عمر کے لوگ برسوں میں بھی اردو کتابیں اور اخبارات پڑھنے کے قابل نہیں ہوتے اور اگر لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری نہ رہے تو جلد بھول جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اب ہر پیشہ میں خواندہ ہونے کی ضرورت ہے پس جو قوم خواندوں کی تعداد بڑھانے میں پیچھے رہے گی وہ دماغی نشوونما اور تہذیب و تمدن میں بھی لازمی طور پر پسماندہ رہ جائے گی اور قومی کشاکش میں شکست کھائے گی۔ اسی ضرورت کو دیکھ کر جدید ترکی نے اپنے قومی حروف کو چھوڑ کر یورپ کا رومن طریقۂ تحریر اختیار کرلیا۔ بدقسمتی سے اس وقت قومی کشاکش اور منافرت کی وجہ سے کوئی صورت ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ ہندستان کے مسلمان اردو کے موجودہ حروف چھوڑ کر رومن یا ناگری حروف اختیار کریں۔ اس لئے بجز اس کے چارہ نہیں کہ اردو ہی کو اس حالت میں لے آئیں کہ اس کے اعراب کی جگہ حروف ہوں اور ہر حرف جدا جدا لکھا جائے تاکہ وہ بھی تھوڑے وقت میں اپنی قوم میں زیادہ سے زیادہ خواندہ لوگ تیار کرسکیں جس پر تمام مادی اور روحانی ترقی اور دماغی نشوونما کا انحصار ہے۔ سالہا سال سے ہماری قوم کے قابل اصحاب اردو رسم الخط کو سہل بنانے میں لگے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اہم مسئلہ کو حل کرلیا ہے مگر وہ حقیقت سے بہت دور ہیں اور اندیشہ ہے کہ اس بارہ میں کوئی صحیح راستہ جلد سے جلد اختیار نہ کیا گیا تو وسیع پیمانہ پر دماغی ترقی کے کام میں شکست کھا کر مسلمان خدانخواستہ اس ملک میں اپنے مرتبہ پر قائم نہ رہ سکیں گے اور پھر کوئی بہادری اور کسی قسم کی تنظیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاقی صفات انہیں قومی کشاکش میں کامیاب نہ بنا سکے گی۔ ان حالات میں بجز اس کے چارہ نہیں کہ جب تک اردو رسم الخط سہل بنایا جائے اس وقت تک تمام صوبوں کے مسلمانوں کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ لازمی طور پر اردو ہی پڑھیں بلکہ انھیں موقعہ دیا جائے کہ وہ مثل زمانہ سابق کے اپنے اپنے صوبوں کے مروجہ حروف میں ابتدائی تعلیم حاصل کریں۔"

سید طفیل احمد منگلوری　　　"مسلمانوں کا روشن مستقبل" صـ 549

رومن رسمِ خط

"اگر لوگ معاملہ کو اونچی سطح سے دیکھ سکیں تو میری رائے یہ ہے کہ رومن رسم الخط کو تسلیم کرلینا چاہیئے۔ کوئی رسم الخط مکمل نہیں ہے لیکن رومن رسم الخط سب میں سہل اور آج زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، اسے تسلیم کرلیا جائے اور اگر تسلیم نہ کیا جائے تو ہندی اردو رسم الخط رکھے جائیں لیکن جہاں ہندسوں پر اتنا اختلاف ہے وہاں رومن رسم الخط کو کیوں کر منظور کیا جاسکتا ہے، تاہم مجھے یقین ہے کہ ایک دن آئے گا جب ہمیں تجویز کرنا پڑے گا کہ ہمیں ایسا رسم الخط اختیار کرنا چاہیئے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کرسکے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

پارلیامنٹ میں ایک تقریر

مسلمان آزادیٔ ہند کی راہ میں کوہ گراں

"یہ بدیہی امر ہے کہ 1858ء سے لے کر اب تک جب انگریزوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اختیارات منتقل ہونے کا مطالبہ کیا جاتا تو ہر موقع پر رجعت پسند مسلمان آڑے آتے تھے اور نت نئے مطالبات پیش کر کے حکام وقت کی امداد کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ اُن مطالبات کی تعداد سترہ تک پہنچا دی گئی تھی جن میں سے اتنے زیادہ مطالبات پیش ہو چکے تھے کہ اُن پر زور دینے کا موقع باقی نہ رہا تھا کانگریس کے ساتھ 1937ء کی بدمزگی کے وقت کچھ مطالبات کے ترکش میں کوئی بہتر تیر باقی نہ رہا تو بالآخر مسٹر جناح نے بھی چودھری رحمت علی کے مجوزہ پاکستان کا مطالبہ اختیار کر کے اسے مارچ 1940ء کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ لاہور میں پاس کر دیا اور اس طرح آزادیٔ ہند کی راہ میں سنگ گراں نہیں بلکہ شل کوہ گراں کے لا ڈالا۔"

مولانا سید طفیل احمد

نئی زندگی پاکستان نمبر 1946ء

ہندی مسلمان نام کے ہندستانی

"میرا خیال یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف جو ایجی ٹیشن چلایا جا رہا ہے وہ خود ایکٹ میں درج باتوں کے خلاف کسی اعتراض سے زیادہ ذہنی مایوسی کا اظہار ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ کسی شخص کو بھی ایسی کوئی بات کرنے کا حق حاصل نہیں ہے جسے وہ کسی بھی وجہ سے پسند نہیں کرتے۔ یہ ناقابل برداشت صورت حال ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اب اقلیتی ادارہ نہیں ہے سپریم کورٹ بھی یہی فیصلہ دے چکی ہے۔ مسلمانوں کا جو طبقہ آج اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ یہ سوچتا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو بھی بدل سکتا ہے۔ موجودہ ایکٹ کسی طرح بھی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات میں مداخلت نہیں کرتا۔ ایکٹ کے ذریعہ صرف کچھ انتظامی تبدیلی کی گئی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کا جو طبقہ اس ایکٹ کے خلاف تحریک چلا رہا ہے وہ اپنے عمل سے پروفیسر بلراج مدھوک کی اس تصویری کی تصدیق کرتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے بھارتیہ کرن کی ضرورت ہے یہ لوگ صرف نام کے ہندستانی ہیں۔ ان کا سارا رخ، نظریہ اور اقدار فرقہ دارانہ ہیں وہ اس بنیادی اور ابتدائی حقیقت کو سمجھنے سے منکر ہیں کہ کوئی بھی مذہبی اقلیت نہیں ہوتی۔ جب تک مسلمانوں کا یہ طبقہ یہ کہتا رہے گا کہ وہ پہلے مسلمان پھر ہندستانی ہیں اس وقت تک ٹکراؤ ناگزیر ہے۔"

کے۔ نریندر۔ ایڈیٹر روزنامہ پرتاب۔ دہلی

تیج جولائی 1972ء

ایک تلخ حقیقت

"ہندو مذہب کے برخلاف اِسلام میں ایک تو وحی کا تصور ہے اور دوسرے اس بات پر اصرار ہے کہ محمد (صلعم) آخری رسول تھے ان دونوں باتوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کی سماجی اور روحانی ترقیوں کے بارے میں قرآن کو فیصلہ کن اور حتمی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو میری بات خواہ کتنی ہی تکلیف دہ معلوم ہو لیکن درحقیقت مذکورہ بالا خیال بے بلکل ہی مہمل۔ چونکہ مسلمانوں پر اثر رکھنے والے لوگ اپنی مصلحتوں کی وجہ سے کھلم کھلا اس بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ اس لئے کسی دوسرے ہی کو یہ بات کہنی پڑے گی کہ کسی بھی مذہب کا کوئی صحیفہ خواہ اسے خدا نے وحی کے ذریعے انسانوں تک بھیجا ہو یا وہ کسی رشی منی کے کانوں میں گونجا ہو، زندگی کے کسی بھی میدان میں قطعیت کا درجہ نہیں رکھ سکتا۔"

گگن گواھندستانی مسلمان نمبر

اے۔ بی۔ شاہ۔ "چیلنجیز ٹو سیکولرزم"

ایک نیک مشورہ

'علما کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ابھی تک ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے وہی اکیلے نگراں رہے ہیں۔ لیکن ممکن ہے اس میں بھی تبدیلی ہو جائے۔ اگرچہ ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل کے دلوں میں ابھی تک علمار کے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے، لیکن نئی نسل تبدیلیوں کی دل سے مخالف نہیں ہے۔ یہ لوگ ابھی تک اپنے اگلے قدم کے بارے میں یقینی طور سے کچھ طے نہیں کر پائے ہیں، لیکن جوں جوں انھیں سیکولر اور ماڈرن تعلیم ملتی جائے گی، اِس بات کا پورا امکان ہے کہ علما سے ان کا تعلق آہستہ آہستہ ختم ہوتا جائے گا۔ خود مذہبی مدارس کے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی ایک ذہنی بے چینی پائی جاتی ہے اور ان کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنی روایتی تعلیم سے غیر مطمئن ہو کر دوبارا سیکولر تعلیم گاہوں میں داخلہ لیتی ہے۔ اِن لوگوں کا جب جدید مسائل سے واسطہ پڑتا ہے تو چوں کہ ان کی اکثریت اپنے مذہبی پس منظر کی وجہ سے مذہب کو بالکلیہ پس پشت نہیں ڈال سکتی، اِس لئے مسائل کا کوئی ایسا تشفی بخش حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتی ہے جو علماء کی نظروں میں قابل قبول ہو یا نہ ہو، لیکن اس کے اپنے خیال میں 'جامِ شریعت' اور 'سندانِ عشق' دونوں تقاضوں کو پورا کر دیتا ہو۔ اگر مدارس کے فارغ التحصیل لوگوں کی نئی اور پرانی نسل کا یہ فرق روز بروز بڑھتا رہا اور ہمارے موجودہ علمار نے اپنے موقف پر سنجیدگی سے نظر ثانی نہ کی تو اس بات کا امکان ہے کہ دیر سویر ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی قیادت کی ذمہ داری کا بوجھ ان 'نئے علماء' کے کاندھوں پر آپڑے۔'

مشیر الحق "مسلمان اور سیکولر ہندوستان"

ہم کو کہے گی خلقِ خدا غائبانہ کیا!

میں نہایت ادب کے ساتھ آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آج جو مورخ گذشتہ دو سو سال کی دنیا کے واقعات اور حالات لکھنا چاہے تو وہ ہماری قوم کی نسبت دنیا کی تاریخ میں کیا درج کرے گا۔ سوائے اس کے کہ وہ صفحہ جو ہماری قوم کے لئے مخصوص ہے وہ خالی رہے یا سیاہ کاریوں اور ناکامیوں کے دھبوں سے بقیہ صفحات کی رونق اور شان کو خراب کرے۔ اور کیا ہوگا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ جن کے اسلاف کے کارناموں سے آج تک دنیا کی تاریخ کے صفحات مزین ہوں ان کے اخلاف کے گذشتہ دو سو برس کے حالات نوع انسانی کی تاریخ پر دھبہ لگانے کے قابل ہو جائیں۔ یہ حالت تو آج ہماری ہے۔ لیکن اب میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ مہربانی فرما کر موجودہ زمانے کو چھوڑ کر اپنے خیال میں آئندہ دو سو برس کے بعد جو حالت ہوگی اس کا تصور کیجیے اور سوچیے کہ دنیا کا مورخ اس وقت جو ہماری قوم کے متعلق حالات اور واقعات لکھے گا تو اس کے سامنے ہمارے کیا کارنامے ہوں گے؟ کیا ہماری قومی ناموس اور امت محمدیؐ کی شان کے لئے یہ کافی ہے کہ مورخ صرف یہ لکھے کہ اس زمانے میں اس قوم میں اس قدر ڈپٹی کلکٹر ہوئے، اس قدر جج ہوئے، اس قدر مال گزار تھے اور اتنے انکم ٹیکس دینے والے تھے، اس قدر تعداد میں مثل اور جانوروں کے زندہ رہ کر دنیا سے چل بسے۔ جبکہ انگلستان کے صفحہ پر یہ درج ہوگا کہ اس محدود تعداد کے انسانوں نے نہ صرف اپنی ہر ایک قسم کی ترقی اور بہبودی کے لئے ہر ایک قسم کے سامان اپنی آزاد پسند طبیعت، قومی اتفاق، جواں مردی، جفاکشی، جاں نثاری اور دماغی اور اخلاقی قوت کے زور سے مہیا کئے۔ بلکہ ان بیش بہا عالی صفات کا خزانہ خدا کی اس محبوب قوم کے پاس اس قدر تھا کہ اس نے دور دراز ممالک کی پس ماندہ اور مردہ قوموں کو زندہ کر دکھایا اور اپنے دماغ اور اخلاق کے وہ جوہر دنیا کی اور قوموں کے مقابلے میں دکھائے جس سے نوع انسانی کے شرف میں اضافہ ہو گیا جبکہ جرمنی کے صفحے پر یہ لکھا جائے گا کہ یہ قوم اپنی منتشر طاقت کو جمع کر کے محنت اور دماغ سوزی اور قوت انتظامیہ کے زور سے علوم قدیمہ و جدیدہ کے میدان میں سب پر سبقت لے گئی اور علم کے زور سے نہ صرف اپنے ملک کی جنگی قوت کو حیرت انگیز ترقی دی بلکہ دنیا کی آسائش کے سامان،

پیدا کئے۔ اور دور دراز ملکوں کی دولت اپنے ملک کی طرف کھینچ لی۔ جبکہ امریکہ کی نسبت یہ تحریر ہوگا کہ اس کے باشندوں نے سو برس سے کم عرصے میں جنگل کو منگل کر دکھایا ایک نئے اور وحشی ملک کو تہذیب اور ترقی کے میدان میں ان ممالک کے مدمقابل کر دکھایا جو تاریخی مرکز تہذیب اور شائستگی کا مرکز رہے ہیں۔ اس ملک نے اپنی ایجادات اور ذہانت اور جمہوری سعی کے ذریعے سے کائنات الٰہی سے انسان کے ہر قسم کی آسائش اور ضرورت اور تفریح کے سامان پیدا کر کے دنیا بھر کی جیبیں خالی کرالیں اور دولت اور جدید ترقی کے میدان میں سب پر سبقت لے گیا۔

جب کہ جاپان کے اعمالنامہ میں یہ مذکور ہوگا کہ انھوں نے قومی ایثار اور ملکی خدمت میں دنیا کی کامیاب قوموں کو سبق سکھایا اور چند روز میں کس مپرسی کی حالت سے نکل کر دنیا کی اول درجہ کی قوموں میں شمار ہونے لگے تو میں سوال کرتا ہوں کہ ایسے پرشوکت اور پرجلال کارناموں کے مقابلے میں ہمارے قومی حالات کس شمار میں ہوں گے۔ اس لئے اس وقت سے ہم کو یہ خیال ہونا چاہیے کہ دو سو سال کے بعد جب ہماری قوم کے حالات تحریر ہوں تو اس وقت ہماری آئندہ نسلوں کو شرمانا نہ پڑے جس طرح آج ہم گذشتہ دو سو سال کے واقعات پر دنیا کے سامنے ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ پس یہی ہمارا نصب العین کا معیار ہے کہ آج سے ہم اس ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھیں کہ اب تک جو ہوا سو ہوا، اب ہماری کوشش اور تندہی کا پیمانہ وہ ہو جو ایک بیدار قوم کا ہونا چاہیے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (بیرسٹر ایٹ لاء) — تقریر مجوزہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کانوں کے عیّاش

اُتنا بڑا مجمع! کہ تھالی اُچھال دوں تو شاید ایک فرلانگ تک وہ تھالی سروں ہی پر اچھلتی تیرتی رہے مگر میں سننے والوں کی اِس بھیڑ سے کچھ خوش نہیں ہوں۔ تُم لوگ کانوں کے عیاش ہو، تُم تقریر کے چٹخاروں کی خاطر یہاں آئے ہو، دوسرے کیمپ والوں کا جلسہ ہوتا ہے تو وہاں بھی تُم اِسی ذوق و شوق کے ساتھ جاتے ہو۔

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک تقریر سے اقتباس
دہلی ۱۹۴۶ء

فلمی گیتوں کے علاوہ
پرائیویٹ گیت، غزل، نعت، قرات
اور دوسرے اسلامی گراموفون ریکارڈ
(ہر اسپیڈ کے)
سمفونی
دست یاب ہیں آپ
B68-69 ۔ نیومارکیٹ، کلکتہ 13
18/A جی ٹی روڈ، ہوڑہ میدان
سے طلب فرمائیں
فون : 24-7509
فون : 67-4646
الکٹرک کا سارا سامان
اور
باورچی خانہ میں استعمال کی چھوٹی بڑی تمام چیزیں
اے لطیف
B.62/64 نیومارکیٹ سے خرید فرمائیں
کلکتہ 13

سورج بھی تماشائی
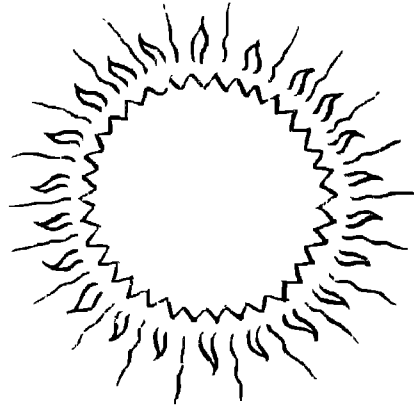
مَیں بات وہاں سے شروع کرتا ہوں
جہاں سے دوسرے تبصرہ نگاروں نے چھوڑی ہے
—— فلک پیما

Enjoy daily & in all Festivals!
Delicious & Nutritious!
Prepared from 100% Wheat
ELEPHANT VERMICELLI
HATHI CHHAP SEV UTPADAK
301-A, Dhanraj Industrial Estate, Sun Mill Lane, Lower Parel, Bombay-13
ہاتھی چھاپ سیویاں
نرالے ذائقہ والی، لذیذ اور لب چسپ
گھر کے چھوٹے بڑے ہر فرد کے لئے پروٹین وٹامن
اور دوسرے صحت بخش اجزا سے بھرپور سیویاں،
پکانے کے بعد جن کا تار تار الگ ہو جاتا ہے۔
ہر بنڈلوں میں ہر جگہ ملتی ہیں
ہاتھی چھاپ سیو اتپادک
A-301 دھن راج انڈسٹریل اسٹیٹ، سن مل لین، لوور پریل، بمبئی 400013
صباحت
(ٹمبر مرچنٹس)
مال کی اچھی کوالٹی اور دیانت دارانہ سودے کے ضامن
تعمیر کے مقصد کے لئے جملہ قسم کی اور اعلیٰ کوالٹی کی لکڑی
گاہک کی تسکین وتسلی کے لئے دلی تعاون
مالکان
روپے برادرس اینڈ کمپنی
کالی مسجد، کلیان (تھانہ مہاراشٹر)

گرم ہوا

ہندوستان کی پہلی مسلم سیاسی فلم

فلم ساز و ہدایت کار ایم۔ ایس۔ ستھیو میسور کے رہنے والے ہیں۔ وہ کبھی نیائے شرما کی فلم "انجلی" میں چیتن آنند کے اسسٹنٹ تھے۔ دہلی کے انڈین نیشنل تھیٹر میں آرٹ ڈائرکٹر بھی رہے اور "دیکھ تری بمبئی" اور "ڈسکوری آف انڈیا" جیسے ناٹکوں کے سیٹ تیار کئے۔ کچھ عرصے انگریزی جرائد "لنک" اور "پیٹریاٹ" میں لے آؤٹ آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد وہ بمبئی آکر فلم "حقیقت" میں چیتن آنند کے اسسٹنٹ بن گئے۔ ستھیو نے اپنے دوسرے دو ساتھیوں (ابو سیوانی اور ایشان آریہ) کے ساتھ "گرم ہوا" کہانی کے مسودے پر فلم فائی نینس کارپوریشن سے ½2 لاکھ روپے قرض لیا اور 6 لاکھ روپے اپنے ذرائع سے فراہم کئے۔ کہانی "گرم ہوا" کی مصنف عصمت چغتائی ہیں۔ دو ہزار روپے میں سودا طے ہوا مگر صرف 5 سو ہی روپے دے کر عصمت سے کہانی حاصل کرلی گئی۔ چوں کہ کہانی کا موضوع نزاعی تھا اس لئے فلم کی تکمیل کے دوران ہی میں فلم سازوں کو یہ خطرہ لاحق رہا کہ حکومت فلم کو قابلِ نمائش قرار نہیں دے گی۔ وہی ہوا کہ جب فلم سنسر کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے ری لیز کے لئے سارٹی فکٹ دینے سے انکار کر دیا مگر سنسر کی ری ویژن کمیٹی نے کسی کٹ کے بغیر پاس کر دیا مگر فلم کے سیاسی مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے فلم سازوں کو سارٹی فکٹ حاصل کرنے کے لیے مرکزی حکومت سے رجوع ہونے کی ہدایت کر دی گئی۔ تب یہ فلم انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹری کی جانب سے چند مرکزی وزراء، پارلیامنٹ کے چند اہم ممبران، چند ذمہ دار شہریوں اور چند صحافیوں کو دکھائی گئی اور خصوصی طور پر وزیر اعظم اندرا گاندھی کو بھی مدعو کیا گیا۔ فلم کو سب نے پسند کیا۔ اندرا جی نے فلم کو سراہا بھی اور تنقید بھی کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ تاج محل کے پس منظر کو فلم میں غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے اور لڑکا لڑکی کے درمیان جو محبت دکھائی گئی ہے وہ بہت سطحی ہے۔ بعد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں بھی یہ فلم دکھائی گئی ــــ شمع زیدی، ستھیو کی بیوی اور بیگم قدسیہ زیدی (جو دہلی میں ہندوستانی تھیٹر کی سرپرست تھیں) کی بیٹی ہیں اور اسٹیج کرافٹ کی تربیت جرمنی اور فرانس میں حاصل کر چکی ہیں۔ چونکہ ہدایت کار ستھیو جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں اس لئے شمع نے فلم میں شمالی ہند کی فضا پیدا کرنے میں اپنے ہدایت کار شوہر کا کافی ہاتھ بٹایا ہے۔

"گرم ہوا" کو مرکزی حکومت سے قومی یکجہتی ایوارڈ مل چکا ہے اور کہانی کار عصمت کو ۱۰ ہزار روپے نقد ــــــــــ ستے کے

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ایک بار لکھا تھا "تقسیم کے بعد ہمارے نزدیک مسلمانوں کی پوزیشن اُس شخص کی سی تھی جس نے کسی حق یا مطالبے کے لیے اپنے بھائی کے خلاف عدالت میں مقدمہ لڑا ہو اور اُس میں کامیاب ہو گیا ہو۔ چوں کہ یہ شخص مقدمہ جیت گیا ہے اس بنا پر اس کا مطالبہ تو اسے ضرور ملے گا لیکن اس کے بعد اگر اس شخص کو اپنے بھائی کے ساتھ رہنا سہنا ہے اور خوش گوار تعلقات رکھنا ہیں تو اب لامحالہ اس کو اپنے رویّے میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اُس میں یک گونہ انفعال اور اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اُس کا مطالبہ صحیح تھا یا غلط بہرحال اس کو عدالت کے ذریعے حاصل کر کے اُس نے اپنے بھائی کے دل میں کدورت اور برادرانہ جذبات ... کئے ہیں اور دوسری طرف سے اس کے دل میں ... ہے اس بنا پر اگر اسے کوئی طعنہ دے یا کڑوی کسیلی کوئی بات کہے بھی تو وہ سہی لو

آنے نہ کرے اور بیٹے کو جواب ترکی بہ ترکی دینے کی کوشش نہ کرے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی محبت اور اپنے عمل حسنِ انسانی کے صابون سے اُس زنگ اور میل کچیل کو دور کرنے کی کوشش کرے جو لاتعداد مار سہنے کے بعد اس کے بھائی کے قلب و دماغ پر جم گیا ہے!"

ہندوستان میں مسٹر جناح کے چھوڑے ہوئے مسلمانوں کے لئے بہتر سے بہتر لائحۂ عمل وہی ہو سکتا تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اُس پر نہ کبھی عمل کیا اور نہ آج وہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔

آئیے اب فلم "گرم ہوا" کی بات کریں

"گرم ہوا" ضرور دیکھئے۔

یہ جسم کو گرماتی بھی ہے اور قوتِ شفا کی بھی حامل ہے!

"گرم ہوا" ہندوستان کی پہلی مسلم پولیٹکل فیچر فلم ہے۔

"گرم ہوا" کی کہانی عصمت نے اپنے اُن دو افسانوں ("جڑیں" اور "چوتھی کا جوڑا") کو ملا کر لکھی ہے جو بہت پہلے اردو رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور کتابی صورت میں عصمت کے افسانوی مجموعوں میں بھی شامل ہیں۔ کہانی کا رومانی حصہ راجندر سنگھ بیدی کے ایک افسانے "ببل" سے لیا گیا ہے۔ فلم کا منظرنامہ کیفی اعظمی اور شمع نے مل کر لکھا ہے، مکالمے اور ایک قوالی تنہا کیفی ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

بات آگرہ شہر کی ہے اور زمانہ اکتوبر 1947ء کا ہے۔

اس کہانی کی جو خوبی سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کہانی کے سارے ہی کردار اور واقعات جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں۔ ابتدا سے اختتام تک اس موڈ کو برقرار رکھا گیا ہے جو متوسط طبقے کے بورژوائی مسلمان کنبوں میں رچا بسا ہے۔ اگرچہ سارے کردار ایک ہی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں مگر عمر اور تعلیم کی بنا پر اُن کے نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سلیم مرزا کے بڑے بھائی حلیم مرزا اور بہنوئی فخرالدین مسخ شدہ مسلم مذہبی و سیاسی ماحول کے پلے ہوئے کٹھ ملا قبیل کے ہیں۔ یہ دو انسان ہیں، مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں اور خود پاکستان فرار ہو جاتے ہیں۔ ونا رجعو۔ چھوٹے بھائی سلیم مرزا اپنی محنت، دیانت داری اور اپنے خدا پر اعتماد رکھتے ہیں، اور پُر امید رہتے ہیں کہ حالات سدھر جائیں گے مگر پھر بھی زمانے کا زیادہ ساتھ نہیں دے پاتے۔ نہ اپنے کارخانے کو ماڈرن بنانے کے لئے تیار رہیں۔ اور نہ اپنے مطالبات کی خاطر اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ساتھ ہڑتال کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور نہ ہڑتال کے جلوس میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر بڑا بیٹا باقر مرزا قدرے ترقی پسند ہے وہ کارخانے کو جدید ڈھنگ کا بنا دینے کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہے مگر باپ مانع آتے ہیں اور آخر وہ بھی حالات سے گھبرا کر پاکستان چلا جاتا ہے۔ نوعمر سکندر مرزا جو گریجوایٹ ہے اور کھلے ذہن کا نوجوان ہے تھوڑی ہی سی جدوجہد کے بعد اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ روزگار کا مسئلہ فرقہ وارانہ کم، اقتصادی زیادہ ہے اور بے روزگاری کسی مخصوص فرقے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک طبقے داری پرابلم ہے اور اس کو ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب ہی کے ساتھ مل کر حل کیا جا سکتا ہے۔ سکندر مرزا ہی کا ترقی پسند کردار اندھیرے میں روشنی دکھاتا ہے یہاں تک کہ غم زدہ باپ جو بھٹک چلا تھا وہ اپنے اس چھوٹے بیٹے ہی کی دکھائی ہوئی روشنی میں راہِ حیات طے کرنے لگتا ہے۔ نسلِ نو زندہ باد!

کہانی میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ حقیقت کے اتنے قریب ہیں کہ وہ ہم کو اپنی ہی زندگی کے دکھ اور سکھ معلوم ہوتے ہیں۔ گھر کا ہر فرد حویلی خالی کر کے باہر آ جاتا ہے مگر دادی اماں اپنی حویلی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ڈھونڈنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ گھر کے ایک کونے میں چھپی بیٹھی ہیں۔ [illegible] اُن کو پالکی میں لٹا کر نئے گھر سے پرانی حویلی میں لایا جاتا ہے تو انھیں وہ دن یاد آتے ہیں جب وہ ایک کم سن دلہن کی صورت میں ڈولے میں بیٹھ کر اس حویلی میں آئی تھیں۔ کہانی کے یہ وہ ٹکڑے ہیں جو دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔

شاید اردو افسانہ نگاروں میں عصمت وہ واحد افسانہ نگار ہیں جو مسلم گھریلو رشتوں کے عادات و اخلاق و مزاج کو سب سے زیادہ سمجھتی ہیں۔ دادی اماں دو بہوؤں کی ساس ہیں اور یہ بُرا اتفاق ہے کہ اونچا سنتی ہیں چنانچہ جب بہوئیں اور پوتیاں آپس میں باتیں کرتی ہیں اور اُن کے ہلتے ہوئے لبوں پر دادی اماں کی نظر پڑتی ہے تو وہ فوراً کہہ بیٹھتی ہیں: "یہ کیا چپکے چپکے میری برائیاں ہو رہی ہیں!" یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ پاکستانی مہمان اکثر اپنے چھوٹے پن کا ثبوت دیتے ہیں۔ چنانچہ جب سلیم مرزا کی بہن پاکستان سے آتی ہے تو اپنے اور اپنے پاکستانی رشتے داروں کے لئے کپڑا تو ہندوستان ہی کے بازار سے خریدتی ہے مگر کہتی یہی ہے: "ارے وہاں کیا بڑا بڑا چاول ہے پک کر یہ لمبا ہو جاتا ہے!" مسلم معاشرے میں وہ ملا ہی ہے جو روٹی کی اہمیت سے انکار کرتا ہے، دنیا پر دین کو ترجیح دیتا ہے مگر کون نہیں جانتا کہ وہ اپنی روٹی ہی

لے لئے مسلم معاشرے میں انتشار کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً مولوی فہیم مرزا اپنی دھواں دھار تقریر میں فرماتے ہیں کہ کھانے پر کتنے لڑا کرتے ہیں، کٹ کٹ کرکے کیمرہ دسترخوان پر آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ مولوی فہیم مرزا اپنے دونوں ہاتھوں میں مرغ کی ٹانگ لئے ہوئے 'مستر زوری' فرما رہے ہیں اور اس 'مستر زوری' کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں کہ اُن کا پاکستان چلا جانا ہی بہتر ہے۔ یہ ایک انتہائی حقیقت آمیز طنز ہے۔

یو۔پی کے پرانے گھرانوں میں یہ شگون عام ہے کہ مکان بدلتے وقت جو مکان چھوڑتے ہیں اس کا چولہا توڑ دیتے ہیں تاکہ اپنی روزی اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہاں بھی سلیم مرزا کی بیوی اپنی حویلی کو خیرباد کہتے وقت پاؤں مار کر چولہا توڑ دیتی ہے۔ مایوس کن حالات کی بنا پر جب سلیم مرزا افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں تو کھانا نہیں کھاتے اور کمرے میں جا لیٹتے ہیں اور بیوی کے منانے پر بھی نہیں مانتے۔ تب بیٹی اوڑھنی کے پلو میں چھپا کر کھانا لے کر جاتی ہے اور بتاتی ہے: "چھپا کر لائی ہوں کھا لو" تو سلیم مرزا کمرے کی کنڈی لگوا کر فوراً کھانا کھانے لگتے ہیں۔ یو۔پی کے متوسط درجے کے گھروں میں فرسٹریشن کی ماری جو زندگی پائی جاتی ہے یہ بات اس کے بہت ہی قریب ہے۔

اگرچہ کہانی مختلف مزاج کے کرداروں پر مشتمل ہے مگر کرداروں کا وزن یکساں ہے۔ اگر ایک شر پسند ہندو مسلمان کے کارخانے کو آگ لگا دیتا ہے تو سندھی سیٹھ ہندو اور شرنارتھی ہونے کے باوجود آخر وقت تک مسلمان سلیم مرزا کا ہمدرد ثابت ہوتا ہے۔ سلیم مرزا کے کارخانے کا ایک ملازم افواہیں پھیلاتا ہے اور اپنے دوغلے پن کا ثبوت دیتا ہے دوسرا ملازم جو منیم ہے وہ کارخانہ جل جانے کے بعد بھی سلیم مرزا کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، جبکہ یہ دونوں ملازم ہندو ہیں۔ اسی طرح ایک کردار جلیبی والے کا ہے جو جنگِ آزادی میں حصہ لے چکا ہے اور اپنی ایک ٹانگ حصولِ آزادی کی نذر کر چکا ہے وہ نوجوانوں کا دوست ہے اور زندگی کی نبرد آزمائی میں اُن کا ساتھ دیتا ہے جو نوجوان اُس سے مدد حاصل کرتے ہیں اُن میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی اور سکھ بھی —— جب کہ وہ خود مسلمان ہے۔

لیکن متوسط طبقے کے ایک تقلید پسند مسلم گھرانے کی کنواری لڑکی کا اپنے منگیتر کے ساتھ اپنے ہی شہر میں گھومنا پھرنا اور جنسی اختلاط کا مرتکب ہو کر اپنا کنوارپن گنوا دینا کہانی کا نہ صرف ناقابلِ یقین ٹکڑا ہے بلکہ کہانی کے مزاج کا بھی ساتھ نہیں دیتا۔ ہدایت کار نے جس طرح لڑکا لڑکی کا شہر کے کسی ہوٹل میں کمرہ تلاش کرنے کے سین کو موزوں نہ سمجھتے ہوئے کاٹ دینا بہتر خیال کیا اسی طرح ضروری تھا کہ جنسی اختلاط سے متعلق کہانی کے اس سطر کو بھی ڈیلیٹ کر دیا جاتا۔ اور اگر ہیروئن کے لئے خودکشی کرنا ضروری تھا تو اس کے لئے کوئی اور جواز پیدا کیا جا سکتا تھا۔

البتہ کہانی کا یہ اشارہ تو بہت ہی اصلاحی، مفید اور معنی خیز ہے کہ سلیم مرزا ہڑتال اور جلوس کے سلسلے میں اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں کا ساتھ نہیں دیتے، بیٹا نماز کا بہانہ کر دیتا ہے اور باپ روزوں کا —— اور جب ہڑتال کے نتیجے میں مراعات حاصل ہوتی ہیں اور اُن سے سلیم مرزا کو محروم رکھا جاتا ہے تو پھر سلیم مرزا پچھتاتے ہیں۔ [1]

کہانی کا انجام علامتی ہے۔ نوجوانوں کے جلوس کا لال جھنڈا یہ اشارہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی مشکلات کا حل یہی ہے کہ وہ اشتراکیت کو قبول کر لیں اور یہ بھی کہ سُرخ انقلاب ہی مسلمانوں کو فرقہ پرستی کی زد سے بچا سکتا ہے۔ اور کیفی کی کہی ہوئی یہ بات بھی کہ 'دھارے میں مل جاؤ تو بن جاؤ گے دھارا' واضح کرتی ہے کہ ہندوستان جیسے سوشلسٹ اور سیکولر ملک میں کسی اقلیتی فرقے کا قومی سماج کے عام دھارے سے کٹ کر رہنا اکثریتی فرقے سے زیادہ اس کے اپنے لئے نقصان کار ہے اور یہ بھی کہ اقلیتی فرقہ خوف زدہ رہ کر زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا، غلط فہمی خوف پیدا کرتی ہے اور مل جل کر رہنے ہی سے غلط فہمی دور ہو سکتی ہے۔

---

[1] ٹی۔وی کے ایک انٹرویو میں کیفی اعظمی سے یہ کہا گیا تھا کہ اُن کی یہ فلم اپنے مواد کے اعتبار سے آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے۔ جواب میں کیفی نے کہا تھا کہ حالات تو آج بھی ایسے ہی ہیں۔ نہ جانے کیفی صاحب کے خیال میں حالات نہ سدھرنے کا ذمہ دار کون سا فرقہ ہے، مگر یہ سامنے کی بات ہے کہ مسجد اقصیٰ کے جیسے غیر ملکی مسئلے پر ہندوستان کے ڈھائی لاکھ مسلمان کفن سر سے باندھ کر جلوس نکال سکتے ہیں اور اپنے غیض و غضب، جوش اور ولولے کا ثبوت دے سکتے ہیں مگر وہ آج بھی اپنے ملک کے کسی قومی مسئلے پر کسی غیر مسلم کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر جلوس میں شامل ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ ہڑتال یا بازار بند کے سلسلے میں شہر کا ہر بازار بند ملے گا مگر مسلمان محلوں کی دکانیں ہمیشہ کھلی ہی رہیں گی —— جو ہندوستانی مسلمان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ قومی دھارا کیا ہے اور قومی دھارے کے ساتھ چلنا چلنا کیسے کہتے ہیں اُن کو فلم 'گرم ہوا' کے ہڑتال والے اس منظر سے جواب مل سکتا ہے —————— ش۔ک۔

روایتی ڈگر سے ہٹ کر چلنے میں کچھ لغزشیں بھی ہوتی ہیں۔ چوں کہ 'گرم ہوا' ایک تجرباتی فلم ہے۔ اس لئے اس میں بھی ایک دو جگہ جھول موجود ہے۔ کہانی ۱۵ اگست 1947ء کے فوراً بعد کا زمانہ پیش کرتی ہے۔ اس زمانے میں پاکستان جانے کے لیے نہ پرمٹ کی ابتدا ہوئی تھی، نہ پاس پورٹ کی اور نہ ویزا ہی کا سوال پیدا ہوتا تھا۔ جانے والے اپنی جائے داد بیچتے تھے اور بڑی بڑی رقمیں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اُن دنوں حکومتِ پاکستان نے اپنی کرنسی بھی جاری نہیں کی تھی۔ اس لئے حلیم مرزا کی حویلی کا کسٹوڈین میں جانے اور آمنہ کے منگیتر کاظم کے پاس پورٹ کے بغیر آنے اور گرفتار ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح حلیم مرزا کے کمرے میں مسلم لیگی لیڈروں کی جو تصویریں دکھائی گئی ہیں اُن میں لیاقت علی خاں کی وہ تصویر بھی ہے جس میں وہ مُکّا تانے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیاقت علی خاں کی یہ تصویر بھی بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یعنی ۱۶ اکتوبر 1951ء کو کراچی میں یوم استقلال کے موقع پر لیاقت علی خاں نے تقریر کرتے ہوئے اپنا مکّا تان کر ہندوستان کا ذکر کیا تھا۔

مکالموں میں مغربی یوپی کی زبان اور محاوروں کو ملحوظ رکھا گیا ہے بقدرِ ضرورت طنز و مزاح بھی ہے — "یہ اخبار کہاں کا ہے؟ دلّی کا! اسے کیا پتا دلّی میں کیا ہو رہا ہے، لو یہ لاہور کا اخبار پڑھو!"[1] "جب آزادی ملی تو کتّے بالائی کھانے لگے!"[2] "ہوا بڑی گرم ہے جو اُکھڑے گا نہیں وہ ٹوٹ جائے گا!" "نئی نئی آزادی ملی ہے سب اپنا اپنا مطلب نکال رہے ہیں!" "ساون کی ہریالی دیکھنے کے بعد سوکھا بھی دیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیے!" اور کسٹوڈین کے ایک افسر کے آنے کی کھٹک جب دادی اماں کے کان میں پڑتی ہے تو وہ کہتی ہیں: "میں نے تو دو ہی بیٹے جنے تھے یہ تیسرا کون آگیا؟" غرضے کہ فلم کے اکثر مکالموں میں کافی معنویت ہے۔

اداکاروں میں صرف جلال آغا ہی کو قطعی طور پر فلمی اداکار کہا جا سکتا ہے باقی سب اداکار انڈین پیوپلز تھیٹر ایسوسی ایشن، ہندوستان تھیٹر (دہلی)، پرتھوی تھیٹرز اور دہلی کے ٹی۔ وی۔ اسٹیشن سے تعلق رکھتے ہیں۔

اداکاری کے اعتبار سے فلم 'گرم ہوا' بلراج ساہنی کا وداعی کارنامہ ہے اس فلم میں اس نے اپنے فن کا وہی اعلیٰ معیار پیش کیا ہے جو 'ہم لوگ'، 'دو بیگھے زمین' اور 'ہیرا موتی' جیسی فلموں میں پیش کیا تھا۔ اس فلم میں وہ سندھی سیٹھ سے مال سپلائی کرنے کے سلسلے میں جس خوشامدانہ انداز سے مہلت چاہتا ہے اُس سے اس کا فنِ اداکاری اپنے معراج پر پہنچ جاتا ہے۔ گیتا جو اب تک دیو بالی کے نام سے ڈراموں میں کام کرتی رہی ہے۔ یہاں آمنہ بنی ہے اس نے اپنے ہر منظر میں اپنی بے چارگی، بے بسی و مجبوری اور محبت کا اظہار بڑے ہی معصوم انداز میں پیش کیا ہے۔ آمنہ کے روپ میں اُسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ لڑکی ہندو ہے اور اردو نہیں جانتی۔ سلیم مرزا کی بیوی کی صورت میں شوکت کیفی کی اداکاری بھی متاثر کرتی ہے۔ شوکت نے اپنے رول کے وقار کو بھی برقرار رکھا ہے۔ دہلی ٹی۔ وی کے دینا ناتھ زُتشی نے حلیم مرزا کے رول میں نقل کو اصل کر دکھایا ہے۔ البتہ فخرالدین کے رول میں یونس پرویز کی اداکاری تصنع آمیز ہے مگر باقر مرزا کے روپ میں ابوسیوانی پاکستان جاتے جاتے اپنی اچھی اداکاری کا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ جلال آغا (شمشاد)، جمال ہاشمی (کاظم) اور فاروق شیخ (سکندر) میں فاروق زیادہ کامیاب رہا ہے۔ وہ اپنی چھب اور اپنے ڈھب سے نئی نسل کا موزوں ترین نمائندہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بُرا اتفاق ہوا کہ اے۔ کے ہنگل جیسا اچھا آرٹسٹ یہاں غلط رول کے لیے انتخاب کیا گیا وہ کردار کے تقاضے کے مطابق سندھی لب و لہجہ صحیح طور پر پیش نہیں کر سکا۔ تانگے والے کے رول میں وکاس اور ہندو منیم کی حیثیت سے راج ورما بُرے نہیں رہے۔ شمشاد کی ماں کی صورت

---

[1] آج بھی ہندوستان کے اکثر مسلمان آل انڈیا ریڈیو کی خبروں پر کم پاکستان ریڈیو اور بی بی سی سے نشر ہونے والی خبروں پر زیادہ یقین کرتے ہیں ____ ش۔ک

[2] جی ہاں 1947ء سے قبل جو مسلم لیگی اور سڑے ہوئے فرقہ پرست تھے وہ آج اتنے زور سے قومی یکجہتی کا نعرہ لگا رہے ہیں کہ جو صحیح معانی میں قوم پرست رہے ہیں اُن کی شریفانہ آواز دب کر رہ گئی ہے ____ ش۔ک

[1] دراصل کہانی کا یہ کردار تقسیمِ ملک سے قبل کے مشہور مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں کا چربہ ہے جنہوں نے اسمبلی میں ہندوستان کا وفادار رہنے کا حلف اُٹھایا تھا مگر جب حکومتِ ہند کی جانب سے خیرسگالی وفد لے کر وہ پاکستان گئے تو پھر پاکستان ہی کو پیارے ہو گئے۔ اسی طرح دہلی کے پھاٹک حبش خاں کی مسجد میں مولوی یونس نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور قرآن کی ایک آیت کے حوالے سے مسلمان نمازیوں کو اپنے ملک کا وفادار رہنے کی نصیحت کی۔ اور خود سنیچر کی صبح کو پاکستان فرار ہو گئے۔

____ ش۔ک

میں راما ہیرلیس [1] نے اپنا چھوٹا سا رول خاصے اچھے انداز میں نبھا دیا ہے مگر اس فلم کی ساری کاسٹ میں ناقابلِ فراموش وجود بدر بیگم [2] کا ہے جو دادی اماں بنی ہیں حیرت ہے کہ انھوں نے کیمرے کی موجودگی قطعی محسوس نہیں کی۔

ہدایت کار ستھیو نے فلم کے ہر پہلو پر نظر رکھی ہے اور اُسے بہت حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ہدایت کار کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے مصلحت سے کام نہیں لیا۔ حقیقت کو ہر پہلو سے پردے پر پیش کر دیا ہے اُس نے نہ اپنے اداکاروں کو گلیمر بخشا ہے اور نہ در و دیوار کو سجایا ہے۔ اس فلم کا تقریباً سارا حصہ آگرے کے ایک محلے میں فلمایا گیا ہے جہاں چیدہ تنگ گلیاں دروازے کیواڑ، کنڈی، آنگن، دالان، کوٹھے، زینے، چھجے، چق، ٹونٹی دار لوٹے پانی کی موری مسلمان گھرانوں کا روایتی گنداپن، کہیں چھت اور چھت سے لگی ہوئی جالی دار دیوار اور دیوار کے پیچھے پتنگ اڑانے کے بہانے کسی کا ظم کا اپنی آمنہ سے چھپ چھپ کر باتیں کرنا۔ کہانی کے تقاضے کے اس حد تک مطابق ہے کہ دیکھنے والا بھی اپنے آپ کو اسی محلے کا ایک فرد سمجھنے لگتا ہے۔

ہدایت کار کی یہ جدت بھی پسند کے لائق ہے کہ اس نے کردار کی نمائندگی آواز سے بھی کرائی ہے۔ سیٹی دیتے ہوئے ریل کے انجن کا تھوڑا سا حصہ دکھا کر وہ یہ خوب واضح کر دیتا ہے کہ آج ایک اور مسلمان پاکستان کو سدھارا ہوا، اسی طرح دفتر میں بیٹھنے والے ضرورت مند کو تو دکھایا جاتا ہے مگر صاحبِ دفتر کو نہیں،

---

[1] راما ہیرلیس آئی۔ ایس۔ جوہر کی سابق بیوی ہے۔ اس نے دوسری شادی ہیرلیس ساب ٹوک سے کی جو کبھی نیائے شرما کی نامکمل فلم 'پہلے پریت کا لے چو' میں نمی کے مقابل ہیرو تھا۔ انیکا جو ہر راما ہی کی بیٹی ہے۔ راما آج کل بمبئی کے تاج محل ہوٹل کے ہیلتھ کلب کی اِن چارج ہے ______ ش۔ ک

[2] 75 سالہ بدر بیگم دراصل آگرے کی اُنہی گلیوں کی دریافت ہیں کہ جن گلیوں میں 'گرم ہوا' کی شوٹنگ ہوئی تھی ______ ش۔ ک

فون پر ہونے والی ایک ہی طرف کی بات سے دونوں طرف کی بات سمجھ میں آ جاتی ہے ___ مگر تاج محل اور فتح پور سیکری کے طویل مناظر دیکھنے والے پر یہ تاثر چھوڑتے ہیں کہ وہ کوئی فیچر فلم نہیں بلکہ ایک دستاویزی فلم دیکھ رہا ہے۔ البتہ فوٹو گرافی اچھی ہے تاج محل کے سامنے کی روش ہو یا شہر کی تنگ و تاریک گلی، کیمرا مین الیشان آریا نے دلچسپی اور ذمے داری کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دیا ہے۔ لیکن صدا بندی درست نہیں، خصوصی طور پر مکالمے کی ڈبنگ انتہائی ناقص ہے اسی بنا پر وہ قوالی جو درگاہ پر پیش کی گئی ہے ناقابلِ سماعت ثابت ہوئی ہے۔ بیک گراؤنڈ میوزک بھی سب جگہ یکساں نہیں ہے۔ حویلی چھوڑتے وقت جب دادی اماں چھپی بیٹھی ہیں اور گھر کے سب افراد اُن کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ موثر بیک گراؤنڈ میوزک کی ضرورت تھی۔ جب کہ یہ سین بغیر کسی آواز کے پیش کیا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری بات مضحکہ خیز بن گئی ہے جب کہ اس بات کو رقت آمیز ہونا چاہیے تھا۔

اس فلم کی تیاری کے سلسلے میں شمع زیدی، رباب احمد ستارہ جعفری کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے یوپی کے مسلم گھرانوں کی تہذیب، ذوق و شوق اور فیشن کو ملحوظ رکھتے ہوئے فلم کے مختلف کرداروں کے لئے مختلف وضع و تراش کے لباس تیار کئے ہیں جو فلم کی سچائی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

اپنی جرأت مندانہ کوشش کی بنا پر اس فلم کے بنانے والے داد کے مستحق ہیں۔ انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ منسٹری بھی تعریف کے لائق ہے کہ جس نے اس فلم کو قابلِ نمائش سمجھا مگر سب سے زیادہ وہ ہندو سماج داد و ستائش کا حق دار ہے کہ جس نے اس فلم کی نمائش کو برداشت کیا۔

اطلاع کے طور پر عرض ہے

ارادہ تو صرف 400 صفحوں کا تھا مگر بات بڑھتے بڑھتے 600 صفحات تک جا پہنچی۔ پھر بھی ادارے کی کئی تخلیقات پر ان بزرگ و محترم قلم کاروں کی تخلیقات کو ترجیح دی گئی کہ جن سے فرمائش کی گئی تھی۔ اسی لئے اس نمبر میں جوش کی کتاب 'یادوں کی بارات' پر طویل تبصرہ شامل نہیں کیا جا سکا۔ قدرت نے چاہا تو 'یادوں کی بارات'، 'میرے لہو کی آگ'، 'غالب شناسی' اور 'گناہ کا رشتہ' اور 'طوطیانِ ہند' پر آئندہ شماروں میں سیر حاصل تبصرے شائع ہوں گے۔ ___ ف۔ پ

BUILD YOUR BODY Healthy
Shahi
BEST TONIC FOR GENERAL DEBILITY
شاہی
طیبی دواخانہ کی مایۂ ناز پیش کش
حیاتین اور کیلشیم سے بھرپور۔ صحتِ دماغ و اعصاب کے لئے مفید۔ افزائشِ خون کے لئے عمدہ
دل و دماغ کو قوت بخشنے والی، نظامِ معدہ درست رکھنے والی۔ تندرستی قائم رکھتے ہوئے قوت
اور مدافعت بڑھاتی ہے۔ امراض سے محفوظ رکھتے ہوئے حوصلہ و امنگ پیدا کرتی ہے اور کام کی طرف
رغبت پیدا کرتی ہے۔ ضعفِ دماغ کے مریض عموماً نسیان میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ دل و دماغ کو قوت
خیالات کی پراگندگی دور کرتی ہے۔
طیبی دواخانہ (اندور) پرائیویٹ لمیٹڈ
فون 3334
51 بوہرا بازار۔ اندور
17۔ محمد علی روڈ بمبئی 3
فون 324883
شادی بیاہ
اور خوشی کی ہر تقریب پر
لذیذ، لطیف
اور راحت بخش
آئس کریم کے لئے
گے آئس کریم کو
یاد رکھئے
گے آئس کریم
GAY ICE CREAM
بڑے آرڈر پر خصوصی رعایت
پتا
A-52 مرزا غالب مارگ، نزد دائرس کمپنی بمبئی 8
فون: 376713
379247
گلبن کا ہندوستانی مسلمان نمبر
562
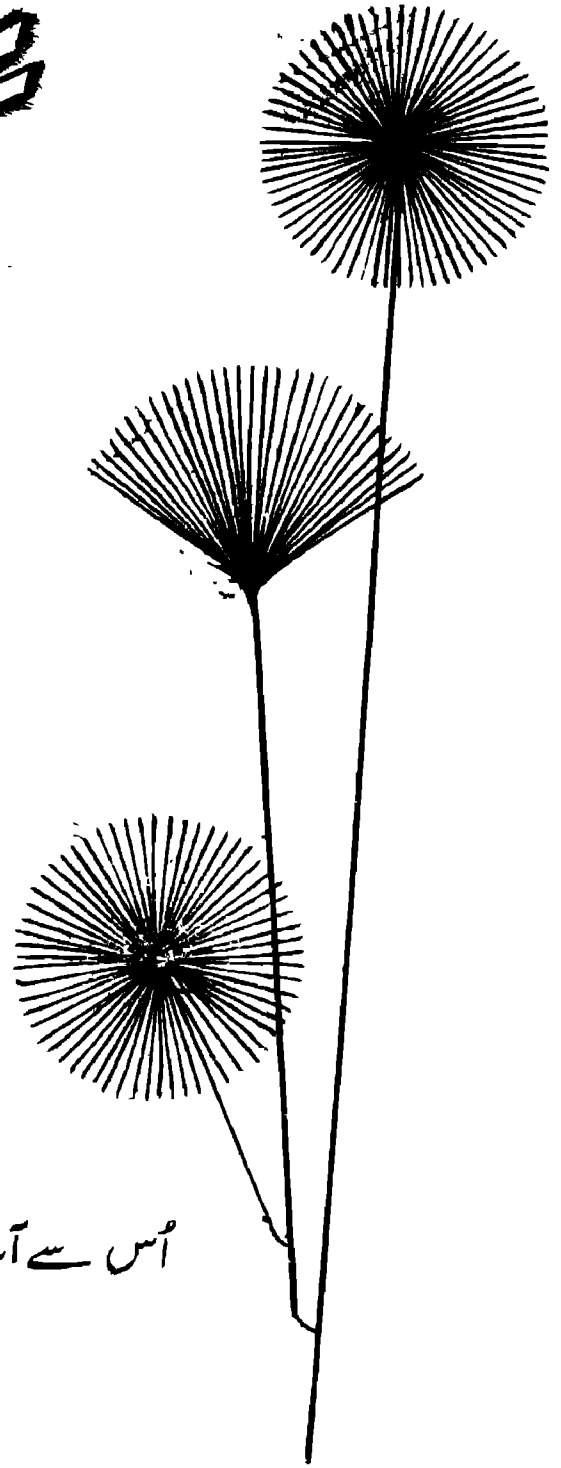
جس نے جو کچھ کہا ہے،

اُس سے آپ اختلاف کرنے کا حق رکھتے ہیں

۔عبدالغفار

اگربتیوں کی دُنیا میں انقلاب
بندھن کے پھول اگربتی — اپولو جولن بتی نمبر ا
اور
کل ہند نمائش میں پہلا انعام پانیوالی
سگندھ مالا اگربتی
ہندستان کے چپے چپے کو معطر کر رہی ہیں آپ بھی آزمائیے
تیار کردہ: اے۔ ون اگربتی کمپنی
103۔ سینٹ جانس چرچ روڈ، بنگلور۔ 560005 فون: 52325
دھلی میں مسلمانوں کے ٹھہرنے
کی سب سے اچھی جگہ
آزاد ھند ہوٹل
اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
فون: 26128

گگن فروری 1963ء سے جون 1974ء تک ایک نظر میں

صفحات	3988 عدد
شمارے	64 عدد
نمودِ سحر (اداریے)	64 عدد
افق تا افق (شذرات)	کُل 330 عدد 150 متفرق مسائل پر۔ اہم شذرات کی ایک جامع فہرست اشاریے میں شامل ہے۔
مضامین	گگن کے $11\frac{1}{2}$ برس کے زمانۂ اشاعت میں کل 500 مضامین شائع ہوئے، اشاریے میں منتخب اہم مضامین کی فہرست شامل ہے، ساتھ ہی نفسِ مضمون کی مختصر تشریح بھی کردی گئی ہے۔
نشانِ راہ (استفسارات کے جواب)	اِس مستقل عنوان کے تحت 407 عدد استفسارات کے جواب دیے گئے، کل استفسارات کی موضوع وار تقسیم کرکے صفحہ نمبر اور ماہ و سالِ اشاعت کے اندراج کے ساتھ فہرست تیار کی گئی ہے۔
سورج بھی تماشائی (تبصرے)	کل 264 عدد تبصرے، کتابوں، جریدوں، مشاعروں فلموں، ڈراموں اور متفرق پروگراموں پر کئے گئے تبصروں کی مکمل فہرست صفحہ نمبر اور ماہ و سالِ اشاعت کے اندراج کے التزام کے ساتھ درج ہے۔

اُفق تا اُفق

پیشۂ صحافت، آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس، مولانا قارقلیط اور "نئی دنیا"، اردو اخبارات کی فرقہ پرستی، ریڈینس، اعجاز صدیقی، ہماری زبان اردو نامہ، نقاش اور فیضی نظام پوری، اردو جرائد کے مسائل، انجمن ترقی اردو علی گڑھ، انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی، ٹائمز آف انڈیا پبلی کیشن کی تعصب پرستی اردو کمیٹی بمبئی کے سرخ سوار، مولانا عبدل ماجد دریابادی، جعفری برانڈ دیوان غالب و دیوان میر، جاسوسی ناول، غالب کی صد سالہ برسی، اندرا کی غالب شناسی، سرخوں کی اردو دشمنی، جشن کرشن چندر، روس کی غلو نوازی، فیض احمد فیض، عبدل حمید انصاری اور انقلاب، مکتبۂ جامعہ کی کمیونسٹ نوازی، مدیر ہماری زبان آل احمد سرور، ڈاکٹر صفدر آہ، مکتبۂ جامعہ کا اردو قاعدہ، شہاب الدین دسنوی، مشاعرے اور مے نوش شعراء، معتوں کی سٹہ بازی اور لوٹ مار، ظلو انصاری اور "آئینہ"، خواجہ احمد عباس کی فلمی صحافت، جوش کی تبدیلیٔ وطن، مشاعرہ بازیاں، اردو قلم کار اور زبان کی غلطیاں، ساہتیہ اکاڈمی کی بے انصافیاں، بے ازم ادیب، صحافی اور شاعر راجندر سنگھ بیدی

نہرو فیملی اور کیو فیملی، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ کی فرقہ پرستی، کانگریسی نیتا، پنڈت نہرو، آصف علی میموریل فنڈ، مسلم پرسنل لاء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سرمایہ دارانہ نظام، کمیونسٹی، احمد آباد، جل گاؤں کے فسادات، جمہوریت اور جنادی شیو سینا کی ہنگامہ آرائیاں، بین الاقوامی اسلامی کانفرنس، مسلم پرسنل لا خواتین کانفرنس، پاکستان کی جارحیت، بنگلہ دیش کی کامیابی، فاطمہ جناح، شیخ عبداللہ اور کشمیر، ہندستانی اقلیتیں، فرقہ وارانہ فسادات، بھیونڈی میں مناظرے بازیاں، بادشاہ خاں، جے پرکاش نارائن، عورتیں جنھوں نے پاکستان تباہ کیا، کانگریسی ٹکس اور غریب جنتا، غریبی ہٹاؤ اور سوشلزم، ایوب خاں کی شکست، مسلم ووٹر، بلوچستان اور بنگلہ پناہ گزیں، کانگریسی ایڈمنسٹریشن، اترپردیش کے پچھڑنے کے اسباب، وزرا کے دورے، الیکشن پاکستان، ڈاکٹر رفیق زکریا، اندرا گاندھی کی کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت، سیلاب اور خشک سالی، سرحدی تنازعے، سرکاری اعزازات، مسلمان کانگریسی لیڈر و کارول، ڈاکٹر ذاکر حسین، اندرا گاندھی، الیکشن اور سیاسی پارٹیاں، کانگریسیوں کی اوہام پرستی، پنج سالہ منصوبہ بندیاں، اسلامی کانفرنس لاہور

شیعہ سنی فساد، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور "دعوت"، مولوی، مذہب اور عقیدہ، سائنس اور مذہب، ہندومت، البدر، پاکستان کے مذہبی اور سیاسی راہ نما، تاجروں کی مذہب پرستی، مسلمانوں کی فرقہ بندیاں، علم نجوم، مسلمان اور اسلام، مسلمانوں کی ماضی پرستی اور حال سے بے خبری، طائفیت، مسلم فرقے کی برائیاں، مسلم تاجر، اسلامی حکومت۔

شکیل بدایونی بی اے، شنکر جے کشن، ایس ایم ساگر، جشن شکیل، چیتن آنند کی "حقیقت"، فلم سازوں کی انجمن "امپا"، مینا کماری، نمی، فلم نگری، فلم سازوں کی فضول خرچیاں، نیائے شرما کی داستانِ زندگی، فلم رائٹرز ایسوسی ایشن، چیتن آنند۔

محکمۂ ڈاک کی بدانتظامیاں، ہمدرد دواخانے کی بے ضابطگیاں، ڈاکٹر اسحاق جم خانے والا، سعیر تبنور ودتی، محمد ابراہیم انصاری بی کام شبیر احمد راہی، نام نہاد عوامی انجمنوں کی بدانتظامیاں، یوسف دہلوی۔

مضامین

زبان و ادب

عنوان	مصنف	خلاصہ	صفحہ	تاریخ
اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اسے ناگری لپی میں لکھو	اچاریہ ونوبا بھاوے	مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ اکثریتی فرقے کے نظریات اور خواہشات کا ترجمان ہے۔	15	مئی 67ء
لغت مؤنث نہیں ہے	خالد احمد	'ہماری زبان' میں کسی انجم آرا انجم کا مضمون شائع ہوا تھا جس میں لغت کو مؤنث ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ خالد صاحب نے نہایت مدلل مفصل اور محققانہ جواب تحریر کیا ہے۔	18	فروری 68ء
سرخے اور گل سرے	گگن	ترقی پسند شاعری اور ترقی پسند شاعروں کا تنقیدی جائزہ۔	19	جولائی 68ء
انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	شمس کنول	مضمون نگار نے انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا ہے اس کا کہنا ہے کہ انجمن ترقی اردو، اردو زبان کا مذبح ہے اور اس کا ہر رکن الو لو لو۔	15	ستمبر 68ء
نزخیں اچھلے دو قدم اور قیامت اٹھا دی	ماہر القادری	شعر و ادب کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ لغزشیں و خطا سے بڑے بڑے شاعر نہیں بچے۔	13	جنوری 69ء
بہار بے خزاں	جون ایلیا	شیخ سعدی اپنے شاہکاروں کی بنا پر دنیا کے ایک عظیم انشا پرداز اور شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم معلم اخلاق بھی تسلیم کئے جاتے ہیں۔	15	"
سیماب علامہ تھے / جی ہاں وہ علامہ تھے	یعقوب راہی، شمس کنول	شمس صاحب نے ثابت کیا ہے کہ سیماب علامہ نہیں تھے اور ان کا اردو شاعری میں کوئی مقام نہیں۔	19	جنوری 69ء
قابو میں رکھ زبان	-	سیماب صاحب کی دل آزار کتاب 'سرود غم' کے جواب میں اردو جرائد کے مدیران کی تحریریں۔	19	اکتوبر 69ء
ہمارے دانش ور، سوئیٹ لینڈ اور ڈالرائیڈ کے پروردا	حمید پٹھان	ہمارے دانش ور مفاد پرست، قوم فروش اور سوئیٹ لینڈ اور ڈالرائیڈ کے پروردا ہیں۔ آج ہمیں ان کی نہیں بلکہ چشتی، نانک، کبیر، تلسی، گاندھی کی ضرورت ہے	28	اکتوبر 70ء
صحافت تلخ نوائی مری گوارا کر	طارق غازی	اردو صحافت پر بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔	20	دسمبر 70ء
اقبال اور غالب	شمس کنول	اس سوانحے کا حاصل یہ ہے کہ اقبال ایک مسلم لیگی لیڈر تھے اور غالب کے لئے قدرت نے شعر کہے۔	19	مئی 71ء
دیوناگری لپی	ایم وائی بخاری	مضمون نگار کا کہنا ہے کہ دیوناگری لپی اردو زبان سے زیادہ مسلم فرقے کی بقا کے لئے ضروری ہے۔	18	اگست 71ء
علامہ، بد وضع اور چالاک عورت کو کہتے ہیں۔	ناطق گلاٹھوی	ناطق صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لفظ 'علامہ' پر بحث کی ہے۔	29	نومبر 71ء
آگرا اسکول	ابر احسنی گنوری	آگرا اسکول فرضی نام ہے سیماب صاحب اور ان کے چند شاگردوں کا۔	84	ستمبر 72ء
میر و غالب	شمس کنول	ایک کا نظریۂ حیات ترقی پسند، دوسرے کا غیر صحت مند۔ ایک تقابلی مطالعہ۔	23	دسمبر 72ء
اردو املا	رشید حسن خاں	تغیر املا، صحت املا اور اصلاح املا کا فرق واضح کیا گیا ہے اور چند تجاویز پیش کی گئی ہیں	27	"
اردو املا اور انجمن ترقی اردو	انجمن ترقی اردو	انجمن ترقی اردو ہند کی اردو املا میں اصلاحات کی تجاویز کا خلاصہ۔	30	"

عنوان	مصنف	خلاصہ	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
مشترکہ رسمِ خط، لسانی تنازعات کا واحد حل	وسنت سوریا	ہندستان میں لسانیاتی مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ رومن رسمِ خط اختیار کیا جائے۔	22	ستمبر 73ء
تلمیحات	محمود نیازی	مضمون نگار کا کہنا ہے کہ ہمارا ادب تلمیحات سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔	33	نومبر 73ء
دلّی، چمن کا جلوا باعث ہے مری رنگین نوائی کا	شمس کنول	شمس صاحب کا سفرنامۂ دلّی	3	جنوری 74ء

سیاست

عنوان	مصنف	خلاصہ	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
جناح، جیسا کہ میں جانتا ہوں۔	فرینک مارس	جناح نے اقبال کے نظریۂ پاکستان کو ایک شاعر کا خواب کہا تھا لیکن 1937ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کی شکست، کانگریسیوں کے عدم اشتراک اور ان کی مہاسبھائی ذہنیت نے قائدِاعظم کو خالقِ پاکستان بنا دیا۔	9	اپریل 63ء
باپو کی بیوہ، 1947ء کے بعد اس پر کیا گزری	بی۔ آر پٹیل	کانگریس محض ایک سیاسی جماعت کا نام نہ تھا بلکہ باپو اس کے ذریعے ہندستان میں ظاہری اور باطنی انقلاب لانا چاہتے تھے، باپو کی موت کے بعد نہرو نے اس کی ریڑھ مار کر رکھ دی۔	11	فروری 64ء
شیرِ اسلام	شریف الدین پیرزادا	نپولین کا دل، برک کی زبان، میکالے کا قلم یعنی تحریکِ خلافت کے بانی مولانا محمد علی پر ایک عمدہ مضمون	17	"
جناح اُسے دل و جان سے پیار کرتے تھے۔	کام دلیو	ہمالا کی حسین وادی دارجلنگ میں جناح اور رتن بائی کے پیار کا جنم ہوا اور زمانے کی مخالفتوں کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی زندگی کے ساتھی بن گئے	19	"
جناح بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔	کام دلیو	یہ ایک بے جوڑ شادی تھی اس لئے رفتہ رفتہ نظریاتی اختلاف بڑھتا گیا اور نوبت طلاق تک جا پہنچی لیکن جب رتی کا انتقال ہوا تو جناح بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔	9	اپریل 64ء
قومی نشان	خالد عرفان	قومی پرچموں کی تاریخ پر ایک سیر حاصل مضمون	27	اگست 64ء
عورتوں اور شیروں کے عظیم الشان شکاری	کام دلیو	راجاؤں اور نوابوں کی عیش پرستی، اُن کے شوقِ شکار اور اُن کی ستم رانیوں کی داستان، وقت نے جنھیں پولو اور پالٹکس میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا۔	44	"
مردِ غیب، وہ سیاسی زخموں کے لئے ایک نسخۂ مرہم ساتھ لایا	شمس کنول	انقلابِ مصر کا حال، جس نے شاہ فاروق اور مصر کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، دنیائے سیاست کے مشہور دوراندیش سیاست دان عبدل جمال ناصر پر ایک اہم مضمون۔	50	"
شیرِ کشمیر	گگن	اِس مضمون میں شیخ عبداللہ کا سیاسی مزاج سمجھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔	22	جنوری 65ء
اَن داتا، جو ہر مشین میں فٹ ہو گیا۔	گگن	انڈین کانگریس اپنی 80 سالہ تاریخ سے ایسا کوئی نام پیش نہیں کر سکتی جو ایڈمنسٹریشن میں مرحوم رفیع احمد قدوائی کا مقابلہ کر سکے۔	32	مارچ 65ء
اعلیٰ حضرت انتقال فرما گئے	گگن	عیاشی، بدچلنی، بدکرداری اور حیا سوزی کا کوئی ذرا ایسا نہ تھا جو اعلیٰ حضرت پر نہ کھلا ہو، اعلیٰ حضرت شاہ فاروق، جو انقلابِ مصر کا باعث بنے۔	21	مئی 65ء

عنوان	مصنف	خلاصہ	صفحہ	شمارہ
پیکر خلوص	گگن	مولانا حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر ایک اہم مضمون	21	اکتوبر 65ء
بولیں اماں محمد علی کی "میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گی"	گگن	بی اماں جنھوں نے علی برادران جیسے سورماؤں کو جنم دیا اور انھیں آزادیٔ وطن کی راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلنا سکھایا۔ مضمون نگار نے ان کی جناب میں خراج عقیدت پیش کیا ہے	27	"
جب کمیونسٹ انگریزوں کے مخبر بن گئے۔	جے۔ بی۔ کرپلانی	جب 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے مخالف کمیونسٹوں نے انگریزوں کی مخبری کر کے سیاسی ورکروں کو گرفتار کرایا۔	16	ستمبر 67ء
وہ ہمارے لئے قربان ہو گئے	گگن	انقلاب کی اس خونیں تاریخ کا مختصر سا جائزہ جس پر عدم تشدد کے سنہری پردے پڑے ہوئے ہیں۔	20	"
اداس رکے تارے عرف قید کی تحریریں۔	خالد عرفان	تاریخ عالم کی مشہور شخصیتوں کی ان کتابوں کا تذکرہ جو زمانہ قید و بند میں لکھی گئیں	28	"
جوگی جے نارائن جی، پاکستان کے بانی آپ ہیں۔	-	اس مضمون میں سربر آوردہ سیاسی ہستیوں کی تحریروں سے ثابت کیا گیا ہے کہ تقسیم ہند کی ذمے دار کانگریس ہے۔	31	فروری 68ء
انڈین نیشنل کانگریس	گگن	کانگریس کے لئے مسلمانوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا مگر حصول آزادی کے بعد کانگریس کی قدر ناشناسی، احسان فراموشی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار مسلم اقلیت ہوئی۔	14	جولائی 68ء
کیا گاندھی جی مہاتما تھے؟	جمنا داس دوارکا داس	مضمون نگار نے ہندو دھرم اور ہندو فلسفے کی رو سے یہ ثابت کیا ہے کہ گاندھی جی اگرچہ نیک، خدا ترس اور انسان دوست ضرور تھے مگر روحانی طور پر وہ مہاتما کے مرتبے پر نہیں پہنچ پائے تھے۔	32	جولائی 69ء
کیا گاندھی جی سیاست دان تھے؟	-	سبھاش چندر بوس، ایم این رائے، گوکھلے اور لوکمانیہ تلک جیسے صف اول کے سیاست دانوں کا کہنا ہے کہ گاندھی جی سیاست میں کوئی اہم مقام نہیں رکھتے	30	اکتوبر 69ء
مجیب سوبنا سو بنگالی	گگن	بنگالی کلچر کے تحفظ کے سب سے بڑے علم بردار مجیب الرحمان کی سیاسی زندگی پر ایک مختصر مضمون	25	مئی 71ء
مولانا آزاد....	گگن	مولانا آزاد بنگلا دیش کے قیام کی 25 برس پہلے پیش گوئی فرما چکے تھے	29	مارچ 72ء
سونار بنگلا	گگن	بنگلا دیش کی جنگ آزادی پر ایک سیر حاصل مضمون	35	"
جنگ	ابوالکلام آزاد	تمدن نے ہمیشہ جنگ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے اپنے موضوع پر ایک شاہکار مضمون	40	"
مانک شا	گگن	سیکولرزم اور سرحد کے قابل اعتماد محافظ، ہندستانی سپہ سالار جنرل مانک شا کے حالات زندگی۔	52	"
غداران وطن	شمس کنول	سلطان ٹیپو کے دور حکومت کے غداروں پر ایک معلوماتی مضمون	55	"
مسلم لیگ قائم ہوئی تو انگریزوں نے خوشی سے بغلیں بجائیں	محمد مبین الدین	برطانوی امپریل ازم کی ایک چال تھی جس نے مسلم لیگ کو جنم دیا۔ اس سے انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ایک مضبوط سیاسی جماعت بن جائے	20	ستمبر 72ء

تاریخ واساطیر

6 گھنٹے میں ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا قتل	گگن	نادر شاہ دلی سے اتنا کچھ لوٹ کر لے گیا کہ 3 سال تک اس نے اپنی ایرانی رعایا پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا	26	ستمبر 68ء
وادیٔ فرغانا کا شیر	گگن	مغل شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے مفصل حالاتِ زندگی۔	46	جنوری 69ء
ایک دین دار خاتون	گگن	بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن، اکبر کی پھوپھی گل بدن بیگم پر ایک مضمون	47	اکتوبر 69ء
سلطان جس کی پوجا کی گئی	گگن	وہی ہندو رعایا جس نے ہمایوں کے ساتھ رفاقت کا ثبوت نہ دے کر اسے ہندوستان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا، اُسی ہندو رعایا نے اس کے بیٹے اکبر کو مہابلی اوتار مان کر پرستش کے قابل سمجھا۔	24	دسمبر 67ء
پانی پت جس کی زمین 70 برس تک روتی رہی۔	گگن	ابراہیم لودھی اور بابر کی جنگ کا حال اور بابر کی جنگی صلاحیتوں پر ایک مضمون	31	مئی 71ء

مذہب و عقیدہ، رسم و رواج

			صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
اُتر پایہ کا گا بولے....	نیلوفر	ایک مختصر مضمون اوہام پرستی اور اوہام پرستوں کی نفسیات پر۔	15	اپریل 63ء
کنہیا، سیاست دانِ عالم	شمس کنول	کرشن جی کے فلسفۂ زندگی پر بحث کی گئی ہے اور انھیں ترقی پسند ثابت کیا گیا ہے۔	19	ستمبر 63ء
عورت اور مسلمان	سید عباس علی	مضمون نگار نے بڑی جرأت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ عورت کو ذلت و پستی کے گڑھے سے نکال کر عزت و توقیر کا مقام بخشنے کی دستارِ فضیلت اسلام کے سر نہیں باندھی جا سکتی اور مسلمانوں نے عورت سے صرف ہوس رانی کا کام لیا ہے۔	21	,,
قسم لیجیے ورنہ چھ ماہ قید یا ایک ہزار روپے جرمانہ	شبیر احمد تاثیر	قسم پر مذہبی، قانونی، تاریخی اور سیاسی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک بے حد دلچسپ، انوکھا اور پُر از معلومات مضمون	34	اگست 64ء
دلوں کی جیت جلاؤ تو کوئی بات بنے	خالد عرفان	دیوالی کے تہوار پر لکھا گیا ایک مضمون جو کسی انسائیکلوپیڈیا کا باب معلوم ہوتا ہے	22	دسمبر 64ء
ہلالِ عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے	شمس کنول	ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مسائل پر ایک درس آموز مضمون	15	مارچ 65ء
1956 ملین برس پہلے...	گگن	'یوم سالِ نو' پر ایک مضمون، دراصل برس کا پہلا دن مذہبی عقائد، سورج کی گردش، موسم کی تبدیلی، مذہبی ہستیوں کے یوم پیدائش، علاقائی عقیدے اور علاقائی زبان کے جذبے پر مبنی ہوتا ہے۔	50	"
آپ تین چوتھائی سے بھی زیادہ ہندو ہیں۔	کماری اُرون	اسلام کی اپنی کوئی تہذیب، کوئی کلچر نہیں، اسلام جہاں جہاں گیا اپنی فطری لچک کی بنا پر مقامی رنگ میں رنگ گیا۔ ایک قابل مطالعہ مضمون	22	اپریل 66ء
اسلام صحیح کیا ہے	شمس کنول	اسلام کی ابتدا کیسے ہوئی، اسلام کا اسلامی طریقہ اور بدعات، مختلف فرقوں میں اسلام کے مختلف طریقے۔	18	مئی 67ء
انگشتِ شہادت خوش بختی کی ترجمان ہے	زیڈ اے خاور	انگشتِ شہادت کے خطوط و نشانات کی منجمانہ تشریح کی گئی ہے، دست شناسی یا فراستِ ید پر ایک مضمون	26	اپریل 68ء
[illegible]	گگن	دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی حد تک توہم پرست ہوتا ہے۔ آخر توہم پرستی کا سبب کیا ہے	"	جولائی 68ء

عنوان	مصنف	تفصیل	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
		اس مضمون میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے ۔		
ذات پات	حیدر پٹھان	ذات پات کا مسئلہ ہندستان میں بنیادی طور پر Ethnic مسئلہ ہے! ذات پات پر ایک مختصر مضمون	20	جولائی 69ء
پیکرِ انقلاب، اسلامی دنیا کا درد مند۔	گگن	سید جمال الدین افغانی جنھوں نے مغربی نظریات اور مغربی معاشرے کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کیا اور دنیا کے سارے اسلامی ممالک کو ایک مرکز پر لانے کے لئے "پان اسلام ازم" تحریک کی بنیاد ڈالی ۔	39	اکتوبر 69ء
خون کے سوداگر، جنھوں نے مومنوں کو کافر جانا	شمس کنول	اسلام کے تیرا سو سال کے عرصے میں ہزاروں حق پرستوں کا خون فقہاء کے فتووں کا دامن گیر ہے، اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ کے خوں چکاں ابواب کو صفحۂ قرطاس پر پیش کیا گیا ہے	15	اکتوبر ۷٥ء
سرسید کا اسلام	شہناز کنول	سرسید کی مذہبی اور قومی اصلاحات کے موضوع پر ایک عمدہ مضمون	24	اگست 71ء
مذہب، عقل جس کو تسلیم نہیں کرتی	انور علی بی اے	سائنسی اصولوں پر مذہب کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے ۔	57	ستمبر 72ء
ایک فکر انگیز مکتوب جو ملاؤں کو پسند نہیں آئے گا۔	عابد غازی	عابد صاحب نے مولانا قاری طیب صاحب کے مکتوب پر تبصرہ کیا اور مغرب کے جنس زدہ معاشرے پر اور مسلم معاشرے میں عورت کی اہمیت پر فکر انگیز بحث کی ہے۔	17	دسمبر 72ء
عقیدہ ہمیشہ عقل پر غالب رہا ہے۔	نظیر صدیقی	نظیر صاحب نے مزاح ہی مزاح میں بہت ہی اہم اور بنیادی مسائل پر کام کی باتیں کی ہیں۔	33	״
سکھ	خشونت سنگھ	جنگ جو سپاہی، محنت کش کسان اور ہوشیار دست کار سکھ قوم پر ایک معلوماتی مضمون ۔	43	״

طب و صحت اور نفسیات

عنوان	مصنف	تفصیل	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
اِن سے زندہ رہنے کا سبق ملتا ہے۔	طاہر صدیقی	مصنف نے حکیم عبدالحمید کو جیسا اس طرح جانا پہچانا، دیکھا اور سمجھا ہے کہ ان کی مثالی شخصیت کھلی کتاب کی طرح سامنے آگئی ہے ۔	13	اپریل 64ء
مسلم نیشنل ڈش	گگن	اسلامی کھانوں اور مسلم رکابداروں کے متعلق دلچسپ معلومات اور پلاؤ پر سائنٹیفک اور طبی ریسرچ ۔	26	اپریل 66ء
مصافحے سے ذہنی اور جسمانی امراض کا پتا چل سکتا ہے	گگن	ڈاکٹر ایس۔ ایل۔ انڈل مین نے بڑی دلچسپ بات بتائی ہے کہ انسان کے ہات کی گرفت سے اس کی جسمانی اور ذہنی صحت کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے	20	نومبر 67ء
فنگی دوست بھی، دشمن بھی	مرنور	مرنور صاحب نے فنگی کے فوائد اور نقصانات پر ایک بڑا ہی معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے	58	فروری 68ء
فرزندِ خاک	لقمان حکیم	مٹی سے دوستی کیجئے، دنیا کی اس حقیر ترین چیز سے دنیا کی ساری بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے ۔	45	ستمبر 68ء
سب سے سستی دوا اور ضرورت بھی	لقمان حکیم	بہت سی بیماریاں صرف اس لئے پیدا ہوتی ہیں کہ جسم کو مناسب مقدار میں پانی نہیں ملتا	39	نومبر 68ء

عنوان	مصنف	خلاصہ	صفحہ	شمارہ
سوجا سوجا راج کماری	مہ نور	نیند میں سیکھنا عمل آسان ہے، دراصل دوران نیند میں سیکھنے کی بنیاد اس امر پر ہے کہ "سوتا ہوا دماغ کام کرتا رہتا ہے اور سونے والا باہر کی دنیا سے پیغام حاصل کر سکتا ہے۔	56	جنوری 69ء
بواسیر	لقمان حکیم	بواسیر، جگر کی خرابی کا ایک مرض ہے، جو خشک خوری اور زہریلی ایلوپیتھک دواؤں سے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کے علاج اور مستوں کے تدارک کی تدبیروں پر ایک مضمون	42	اپریل 69ء
ماں کی گود سے آرسے ملک کالونی تک	لقمان حکیم	دودھ، انسان کی مکمل ترین مشروب غذا ہے۔ دودھ کے فوائد پر ایک مفید مضمون۔	66	اکتوبر 69ء
آٹومیشن جسمانی کانگرس کی سنڈی کیٹ اور انڈی کیٹ	جمال خیر گل	آپ اپنے شرمانے، کھانسنے، چھینکنے، جماہی لینے، ڈرنے، گھبرانے وغیرہ پر کسی قسم کا تردد نہ کریں کیوں کہ یہ اس امر کی نشانیاں ہیں کہ آپ کا جسم اپنی بھلائی کے لئے اپنی خود کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا ہے	40	فروری 70ء
لیمو، بیماری کو کھٹائی میں ڈال دینے والا۔	لقمان حکیم	ترش چیزیں عام طور پر مضر صحت ہیں، لیکن ترش لیمو صحت کی ضمانت ہے	59	"
فاقہ، کھانا زندگی کے لئے یا زندگی کھانے کے لئے	لقمان حکیم	فاقہ روحانیت اور صحت دونوں کے لئے ایک عظیم نعمت ہے	31	جون 70ء
معجزے، جو بیمار جسم دکھاتا ہے۔	جمال خیر گل	ہمارے جسم میں ایسی قوت پوشیدہ ہے جو اپنی حکمت کی بنا پر جسم کو صحت یاب رکھنے کی سعی مسلسل کرتی رہتی ہے اور مختلف امراض میں حیرت انگیز طریقے سے جسمانی دفاع کرتی ہے۔	33	مئی 71ء
پیاز، غذا بھی اور دوا بھی	لقمان حکیم	پیاز ہر اچھے کھانے کی تیاری میں بھی ضروری ہے اور بحیثیت دوا بڑی اہم چیز ہے	40	اگست 71ء
لہسن	لقمان حکیم	لہسن کی دریافت صحت انسانی کی تاریخ میں اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ پنسلین کی دریافت	27	نومبر 71ء
آلو، دنیا کے مہذب لوگوں کی خوراک ہے۔	لقمان حکیم	ساری دنیا کی ترکاریوں میں سب سے زیادہ پیداوار آلو کی ہوتی ہے۔	76	مارچ 72ء
درد، خطرے کا پہلا سگنل	جمال خیر گل	درد کا احساس جسم کو اپنے دفع پر تیار کرتا ہے۔ اس لئے احساس درد بھی ایک بیش قیمت عطیہ الٰہی ہے۔	47	دسمبر 72ء
کیا آپ الرجی میں مبتلا ہیں؟	گگن	جو چیز ہمارا جسم یا مزاج برداشت نہیں کرتا وہ ہمارے لئے الرجی کا باعث بنتی ہے	17	اپریل 63ء
شادی کیجئے گا مگر شادی کیسے کہتے ہیں؟	شمیم اختر	مضمون میں بتایا گیا ہے کہ علم جنسیات کی روشنی میں ایک خوش گوار شادی کے لئے عورت اور مرد کا جنسی اعتبار سے ایک طبیعت اور ہم مزاج ہونا ضروری ہے	22	اگست 63ء
خودکشی	ابن عطارد	اگر آپ اپنا خودکشی کا ارادہ ترک کرنا نہیں چاہتے ہیں تو یہ مضمون نہ پڑھیں ایک قابل مطالعہ مضمون	"	اکتوبر 63ء
یہ مضمون صرف آپ کے لئے لکھا گیا ہے۔	شمس کنول	دردمندی، مردم بیزاری، عبادت گزاری، خوف گناہ، نمائش پسندی، عاجزی، نیازمندی، احساس بزرگی، کنبہ پروری، ظاہرداری، عیب بینی،	41	اکتوبر 65ء

فلم

عنوان	مصنف	کیفیت	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
گیت، ہا، گالیب	گگن	عالمی نے خونِ دل صرف کر کے اشعار تخلیق کئے اور تماشے والوں نے ان پر ہات صاف کیا	50	جولائی 69ء
راج، قدیم یونان کا دیو مالائی دیوتا	ادا شناس	راج کپور کی فلمی زندگی پر ایک مختصر مگر جامع مضمون اور راج کی فلموں کی فہرست۔	75	دسمبر 70ء
مینا ماری کی بارمری اور آخرام ہو گئی	سی ایل کاوش	کاوش صاحب کی طرح دوسرا کوئی قلم کار مینا کی زندگی کا اتنا درست اور مکمل نفسیاتی اور فلسفیانا تجزیا پیش نہیں کر سکا، یہ شمس صاحب کا کہنا ہے	61	ستمبر 72ء
ہماری فلمیں، ادھاری ہوئی حقیقتیں	انیکا سیٹھی	اُن ہندستانی فلموں کا تذکرہ جن میں غیر ملکی فلموں کی نقالی کی گئی ہے۔	17	جون 74ء

کھیل کود

عنوان	مصنف	کیفیت	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
نِل ہاروے گیند کا ازلی دشمن	مسعود اختر	مشہور بیٹسمین نِل ہاروے اتنے انہماک سے کھیلا کرتا تھا جتنے انہماک سے لوگ عبادت کرتے ہیں۔	13	اپریل 63ء
بیل تن آہنی انسان	شمس کنول	فن پہلوانی اور رستم زماں احمد بخش کا ماکی زندگی پر ایک معلوماتی مضمون	21	اپریل 64ء
'کا مزباد'	گگن	پتنگ اور پتنگ بازی پر ایک معلومات افزا مضمون	36	اپریل 66ء
مسکراتی گیندیں اور ہنستے بلے	خالد عرفان	کرکٹ سے متعلق پُر لطف اور ہنسی آمیز چٹکلے	64	فروری 68ء
سائیکل دوڑاتے دوڑاتے وہ کروڑپتی بن گیا	گگن	سائیکل کی ایجاد اور اس کے تدریجی ارتقا کی معلومات، ساتھ ہی سائیکل دوڑ کے مقابلوں کا حال۔	55	اکتوبر 69ء

سیر و سیاحت

عنوان	مصنف	کیفیت	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
شہر نگاراں جو ایک دن میں نہیں بنا	بنت مہر ماہ	روم جس کی ہر اینٹ تاریخی ہے اور ہر عمارت آثارِ قدیما سے تعلق رکھتی ہے	8	فروری 63ء
کتے بلیوں کا شہر	شبیر اے تاثیر	نیو یارک، جسے 24 ڈالر کے کپڑوں کے عوض ریڈ انڈینوں نے انگریز نو آباد کاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور آج وہاں کے بڑے بڑے بزنس مین فی منٹ کے حساب سے اپنی آمدنی کا حساب لگاتے ہیں۔	18	جون 63ء
ترش رو مولوی شہر	بیگم اختر ریاض	خاتون مضمون نگار کی رائے ہے کہ بحیثیت مجموعی ماسکو ایک خشک، سخت گیر متشرع زاہد کی طرح ہے۔	16	اکتوبر 63ء
ہائے انارکلی مر گئی	شبنم رومانی	لاہور دراصل پانچ چیزوں کا نام ہے، سبزہ، سرخی، کمالی مقبرے اور گھوڑے کی لید۔ ایک بڑا ہی پُر لطف مضمون۔	20	دسمبر 63ء
شہرِ شعورِ نو	شاہد احمد دہلوی	کراچی پاکستان کا سب سے متمول شہر ہے، جو جدید پاکستانی ثقافت کی آماجگاہ بھی ہے	23	اکتوبر 64ء
چین، جہاں سب کچھ ہر اللہ کے سوا	شمس کنول	حال کا چین ماضی کے چین سے بالکل بدلا ہوا ہے، آج کے چین پر معلوماتی مضمون	52	ستمبر 72ء

حیوانات

مضمون	مصنف	تعارف	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
ایک بھاری بھرکم شے	شبیر احمد تاثیر	گینڈے کے بارے میں دل چسپ معلومات، مضمون میں گینڈے کی سینگوں کے استعمال، اُس سے متعلق اعتقادات اور اس کے خریدنے کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔	20	اگست 63ء
جنت کی چڑیا۔ ہمارا قومی نشان	شمس کنول	مور پر ایک معلوماتی مضمون	26	ستمبر 63ء
چلتے پھرتے پہاڑ	خالد عرفان	ہاتھی پر ایک مضمون جس میں اس پر دلچسپ کہانیوں کی تفصیل، اس کی تجارت پر معلومات، اس کی عام زندگی اور نفسیات کا حال اور بادشاہوں کے ہاتھیوں کو لڑانے کے مشغلے کا ذکر ہے۔	21	جون 64ء
اچانک اس کے پاؤں تلے کی برف پھسل گئی	جمال خیر گل	روئے زمین پر اپنی تمام تر خوبیوں، خداداد ذہانت، رفتار، جسامت اور طاقت کے لحاظ سے "ادسی نس اورکا" (وہیل) خطرناک ترین جانور ہے	26	جنوری 65ء

سماج ومعاشرا

مضمون	مصنف	تعارف	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
بات کرنا سیکھئے	ابن عطارد	گفتگو کرنا بھی ایک فن ہے۔ فن گفتگو پر ایک مختصر اور دل چسپ مضمون۔	10	فروری 63ء
4 بیویاں	ابن عطارد	اُس عہد کا ذکر ہے جب عورتوں کا گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا، دختر کشی، کثرتِ ازدواج، قبل از بلوغت شادی اور ستی کی رسمیں رائج تھیں۔ بیوہ کو شادی کی اجازت نہ تھی اور عورتوں کو صرف سامانِ تعیش سمجھا جاتا تھا۔	64	اگست 64ء
رمضان کے ابا۔ ہاں جی!	شمس کنول	ہیجڑوں کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت، پر ایک دل چسپ مضمون	43	دسمبر 64ء
وہ ہنسا ہنسا نا کیا جانیں	نسرین زماں	عورتیں یا تو غلط وقت پر ہنستی ہیں یا غلط مذاق پر یا پھر ہنستی ہی نہیں ہیں۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ عورتوں میں حِسِ مزاح کا فقدان ہوتا ہے۔	21	جولائی 67ء
وہ اپنے شوہر کے بستر کی تنہا مالک ہے۔	مسلم بیگم	سوتاپے اور کثرتِ ازدواج کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں پر فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے، ضمناً علم اور سائنس کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ مذہب اور حیل، زمانے کے لئے کس حد تک ناقابل قبول ہیں۔	33	ستمبر 67ء
ایک اکیس اسٹوڈنٹ کے قلم سے	ـ	ناقص نظام تعلیم اور نااہل معلمین پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔	37	ـ
یہ سدا بہار کنوارے، بزدل کہیں کے۔	ایک شادی شدہ خاتون کے قلم سے	ازدواجی زندگی کا بوجھ ڈرپن کر مرد کے دل و دماغ پر طاری رہتا ہے اگر یہ ڈر دور ہو جائے تو وہ سدا بہار کنوارے بنے رہنے کا عزم فوراً توڑ ڈالیں۔	65	جنوری 69ء
باپ	گگن	باپ سردارِ خاندان ہوتا ہے، اس کی کم نگاہی، بے توجہی، غیر ذمے دارانہ اطوار اپنوں سے بے گانگی اور اغیار نوازی، اولاد کو بدتہذیب، بدکردار، غیر ذمے دار دنیاوی اعتبار سے ناکام بناتی ہے۔	42	جولائی 69ء

عنوان	مصنف	تفصیل	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
... ملنگ سے فارس روڈ تک	گگن	بُردہ فروشی کے کاروبار پر ایک مضمون	14	نومبر 71ء
اور بیشک اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے	محمد طیب	مولانا نے لندن سے لکھے ہوئے اپنے اس خط میں انگریزوں کی معاشرت کی تصویر کھینچی ہے۔ ان کے رہن سہن، تعلیم و تہذیب، بچوں کی تربیت، کاروبار، اقتصادیات، مثلاً انتظامات اور ان کی تمدنی سلیقہ مندیوں پر دلکش پیرائے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔	20	مارچ 72ء
انگریز جیسے سور، شراب، کباب، جوا اور عورت مرغوب ہے	محمد طیب	مولانا نے اپنے اس مکتوب میں تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا ہے یعنی مغربی تہذیب کی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔	16	جون 72ء
خانہ بربادی	گگن	ازدواجی زندگی میں تعطل پیدا ہونے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور سدباب کا طریقہ بتایا گیا ہے۔	77	ستمبر 72ء
... سوئی نہیں داستاں	گگن	انسان جب تک بھوک کی فضا میں سانس لیتا رہے گا اور معاشی طور پر آسودہ نہیں ہوگا، مرد اپنی غیرت بیچتا رہے گا اور عورت اپنی عصمت فروخت کرتی رہے گی۔ ایک مضمون بُردہ فروشی پر۔	36	دسمبر 72ء
... جو شادی نہیں کرپائی	گگن	ازدواجی زندگی سے گریز کرنے والی عورتوں کی نفسیات پر ایک مضمون	44	ستمبر 73ء
...	گگن	شجرے کی تاریخ بیان کی گئی ہے، مضمون نگار کا کہنا ہے کہ کم زور اور نااہل انسان اپنے بزرگوں کے نام کا سہارا لیا کرتا ہے	29	نومبر 73ء
ہم جنسی معاشرت	اشوک راؤ کوی	ہم جنس زدوں کے طبقے کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف مکتبِ خیال لوگوں کی آرا پیش کی گئی ہیں۔	40	"

متفرق

عنوان	مصنف	تفصیل	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
شیطانی گھوڑا	یونس اگاسکر	سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دہلی کے جائزے کی روشنی میں اسکوٹر ایک تباہ کن سواری ہے۔	15	نومبر 67ء
نی بیٹ کی بربادی	گگن	موٹر کی ایجاد پر پُراز معلومات مضمون	40	اپریل 69ء
کٹورا چلے پانی کا ۔ ذکر ایک قوالن کا	حیدر پٹھان	اس مضمون کی شانِ نزول ہے السٹریٹڈ ویکلی میں قوالی اور شکیلا بانو بھوپالی پر جسونت سنگھ کے ایک مضمون کا شائع ہونا۔ فاضل قلم کار نے جسونت سنگھ کی قوالی فہمی کا جائزہ لیا ہے اور شکیلا نوازی پر کڑی تنقید کی ہے۔	42	اکتوبر 69ء
خودی کو کر بلند اتنا...	حیدر پٹھان	وینس کی عدالت میں مشہور مصور پاؤلو کے شاہکار 'آخری دسترخوان' کے 'لیوی کے گھر میزبانی' میں بدلنے کی کہانی۔	17	اکتوبر 66ء
طفلِ بہار	شمس کنول	مضمون میں آم کے موضوع پر اتنی ساری باتوں کا احاطہ کیا گیا ہے کہ مضمون نگار کی تحقیق و تلاش پر حیرت ہوتی ہے۔	37	جولائی 69ء
رس گُلا۔ خستہ، بزرگی اور لطافت ذوق کا نمونہ	گگن	رس گلّے کی ایجاد کی کہانی	33	اپریل 69ء

عنوان	مصنف	تفصیل	صفحہ	تاریخ
بھوک	گگن	اضافۂ آبادی، غذا کی کمی اور اس کا ناقص طریقہ تقسیم جیسے مسائل پر ماضی، حال اور مستقبل کی روشنی میں فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے اور مصر، روم، یورپ، ہالینڈ، یونان، ندرلینڈ، روس، چین اور ہندستان کے تاریخی قحطوں کا ذکر کیا گیا ہے۔	22	اگست 64ء
اُن دنوں جب کتے کی دم سیدھی ہوتی تھی۔	یونس اگاسکر	بمبئی پے درشن (کوالف بمبئی) نامی کتاب سے اقتباس دیا گیا ہے جس میں 'کتا مار مہم' اور کتوں کے خلاف عدالتی قانون پاس ہونے کا ذکر ہے۔	29	مارچ 65ء
یہ رات پھر نہ آئے گی	یونس اگاسکر	سائنس دانوں کا خیال ہے کہ چند برسوں میں رات کے تاریک دبیز آسمان کو ایک روشن و محدود حد نگاہ میں بدل دیا جائے گا	59	اکتوبر 66ء
بجلی، زحمت ہی نہیں رحمت بھی ہے۔	گگن	فطرت کی طاقت کا ظہور طوفان برق و باراں سے بھی ہوتا ہے اس مضمون میں بجلی کی زد سے بچنے کے طریقے اور بجلی کے فوائد بتائے گئے ہیں	59	اکتوبر 69ء
21 دن کا اکتوبر	کاہن	کیلنڈر کے بتدریج ارتقائی منازل طے کرنے کی تاریخ، کیلنڈر میں کی گئی تبدیلیوں اور اصلاحوں کا مجمل حال	29	فروری 69ء
دھواں دھار	گگن	حقے کے انوکھے اور اچھوتے موضوع پر ایک انوکھا مضمون	37	دسمبر 64ء
اُسے برف کی گرمی پسند تھی	سعید اختر	عظیم فلاسفر ہنری ڈیوڈ تھورو کا شمار امریکا کے جینیس میں ہوتا ہے۔ تھورو کے عجیب و غریب نظریات پر ایک عمدہ مضمون	18	جولائی 67ء
ہندستان کے چمکتے سورج کے تلے۔	حیدر پٹھان	ایک مضمون فن مصوری پر۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ فن میں اپنے ماحول اور وقت کا مزاج جھلکتا ہے اس لئے فن کار کا اپنے گرد و پیش کے ماحول اور روایات سے پرے اپنے مقدر کے متعلق سوچنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔	17	اکتوبر 65ء
معمے جو محض تجارت نہیں	طارق غازی	معمے کی ایجاد اور ارتقا کی تاریخ	28	مئی 71ء
نوبل پرائز	اندرجیت لال	دنیا کے سب سے بڑے انعام کی ابتدا اور اس کے طریقہ تقسیم پر معلومات افزا مضمون	17	مارچ 74ء
ہنری ڈونانٹ	سلمان غازی	دنیا کے عظیم ادارے 'ریڈ کراس'، کے خالق ہنری ڈونانٹ کو جب نوبل پرائز ملا تو وہ پاگل ہو چکا تھا۔	13	جون 74ء

سورج بھی تماشائی

ادب

	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
'دو ہاتھ'، عصمت چغتائی	36	فروری 63ء
ہفت روزہ 'طلوع' کا بین الاقوامی سیاست نمبر	"	"
'پریم چند'، ہنس راج رہبر	38	مارچ 63ء
'کچھ پرانے خط'، پنڈت جواہر لال نہرو کے نام	37	اپریل 63ء
ماہنامہ 'نقاش'، مدیر فیضی نظام پوری	38	"
'کچھ پرانے خط' حصہ دوم	37	جون 63ء

	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
'جامعہ' مولانا ابوالکلام آزاد نمبر	37	جون 63ء
'افکار عبدالحق' مرتبہ آمنہ صدیقی	36	اگست 63ء
ماہنامہ 'فیض الاسلام' کا فاروق اعظم نمبر	37	"
اُردو ادب کا پہلا ماہانہ اخبار 'ادبی گزٹ'	38	ستمبر 63ء
سید احمد دہلوی کی ایک عظیم کلاسیکی کتاب 'رسوم دہلی'	"	اکتوبر 63ء
جلے کٹے قلم کاروں کی مشترکہ تخلیق 'فتنہ'	"	"

عنوان	صفحہ	شمارہ
پچھلی نصف صدی کی مثالی کتاب 'ہمارا ڈراما' صفدر آہ	45	نومبر 63ء
'روحانیت' کا رحمت اللعالمین نمبر	46	"
'غزلیں، دوہے، گیت' جمیل الدین عالی	45	دسمبر 63ء
سالنامہ 'خاتونِ دکن' مدیرہ صالحہ الطاف	46	"
شخصیت پرستی کا اعلیٰ نمونہ 'نگار' کا نیاز نمبر	38	جنوری 64ء
ایک باشعور، باغی شاعر کی سچی رباعیات 'رمزیا'	46	فروری 64ء
مہمل اور بے مقصد افسانے 'دانہ و دام' راجندر سنگھ بیدی	47	"
'ندائے ملت' کا صدیق حسن نمبر	48	"
بحرِ علم و فن و ادب کا 'سیپ' مدیر نسیم درانی	49	"
ایک منفرد شاعر کی تین انوکھی کتابیں، عبدالعزیز خالد	44	اپریل 64ء
ضرورت ہے خضر کو ایک راہ بر کی۔ ماہنامہ 'شاہراہ'	95	"
مخلصانِ وطن کی ایک دستاویز 'سوز وطن' مرتبہ جبار جمیل	38	مئی 64ء
ایثار اور ادب دوستی کا عملی ثبوت 'سالنامہ نقاش'	"	"
'ابوالکلام' مدیر اختر آزاد	39	"
ایک گمراہ کن منظم سازش 'دورِ حیات' کا سالگرہ نمبر	40	"
ایک مفکر اور دانشور شاعر کا آفاق گیر کلام 'الف'	41	جون 64ء
سلیقے سے پیش کیا ہوا 'افکار' کا افسانہ نمبر	42	"
بچوں کا پہلا اردو ماہنامہ 'پیامِ تعلیم'	99	اگست 64ء
اردو زبان کا پہلا کلاسیکی مزاحیہ ناول 'حاجی بغلول'	52	اکتوبر 64ء
فلسفیانہ الجھنوں کا ایک حل 'نقدِ اقبال' مے کش اکبرآبادی	60	دسمبر 64
ایک نیک خدمت 'فیض الاسلام' کا عثمان غنی نمبر	61	"
ایک ترنم آمیز شعری مجموعہ 'لہر لہر ندیا گہری' زبیر رضوی	46	جنوری 65ء
'مضراب غم' یحییٰ بھائی جسدن والا	70	مارچ 65ء
نظموں کا ایک سرسبز مجموعہ 'وادیٔ گل' رفعت سروش	71	"
'ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں' عابد حسین	30	مئی 65ء
'دلیپ راج نیلو کارٹون' شہاب	33	"
سوویت دیس کا بھارتیہ ایڈیشن دس روزہ 'آئینہ'	34	"
ذہن روشن کرنے والی کتاب 'جگ مگ' نور بجنوری	80	اکتوبر 65ء
صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھائیے 'شعری شعور'	82	"
'زمین پیاسی ہے' لیش سروج	84	"
کاروباری رسائل سے زیادہ بہتر میگزین 'کاروانِ ادب'	"	"
'پیامِ تعلیم'	85	اپریل 66ء
'ہندوستانی ادب' مدیر جی ایم خان	"	"
'بانو' کا سالنامہ	86	"
'امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر' صفدر آہ	33	جولائی 66ء
'دیوانِ ناشاد' این، بی سین ناشاد	93	اکتوبر 66ء
'ماتم نہرو'، 'میرے گزشتہ شب و روز' جگن ناتھ آزاد	94	"
'کوچے وادا'	"	"
'کاروانِ فکر' ڈاکٹر یوسف حسین خان	36	دسمبر 66ء
'فانوس' ڈائجسٹ	37	"
'مضراب' فیضی نظام پوری	40	مئی 67ء
سالنامہ 'بانو' برائے 1967ء	43	"
سالنامہ 'پیامِ تعلیم' برائے 1967ء	44	"
'کیف و کم' یوسف ناظم	35	جولائی 67ء
'جب لوہا پگھلتا ہے' ہربنس دوست	36	"
'روپے کی موت' نور پرکار	37	"
'کتاب' کا سالنامہ 'صبا' کا مخدوم نمبر	39	"
'یادگار شخصیتیں' پنڈت جواہر لال نہرو	87	ستمبر 67ء
'انتخابِ کلامِ وجد'	88	"
کالے کاغذ کی نظمیں، باقر مہدی	89	"
'اردو ادب میں تنقید کی اہمیت' عبدالقیوم صادق	50	نومبر 67ء

[illegible]

عنوان	صفحہ	تاریخ
'سب رس' کا ادارا نمبر	51	نومبر 67ء
بزنس معلومات کی مفصل ڈائرکٹری، ایم امین بیگ	91	فروری 68ء
ڈاکٹر ذاکر حسین، مرتبہ عبدل لطیف اعظمی	54	اپریل 68ء
سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ' مترجم گوپال متل	"	"
'محن صریر' عبدل عزیز خالد	55	"
'فیض ال اسلام' کا قرآن نمبر	"	"
سال نامہ 'نیرنگ خیال' مدیر حکیم یوسف حسن	56	"
سال نامہ 'افکار' صہبا لکھنوی	"	"
'یاس یگانا چنگیزی' راہی معصوم رضا	58	جولائی 68ء
'جلتے کنول' شمس فرخ آبادی	60	"
'شراب کہنا' رشید نعمانی	61	"
'اردو زبان کا مذہبی ورثا' قیوم صادق احمد لوری	90	ستمبر 68ء
ماہ نامہ 'کتاب' کا مراٹھی کہانی نمبر	91	"
'اردو شاعری کی ہندوستانی روح' زرینا ثانی	58	اپریل 69ء
'شعلہ خاموش' کالی داس گپتا رضا	59	"
'نغمہ فردوس' محوی صدیقی	61	"
سال نامہ 'پیام تعلیم' برائے 1969ء	62	"
سال نامہ 'ادب لطیف' مدیر ناصر زیدی	"	"
'شبستان' غالب نمبر	69	"
'امجد نمبر'	68	جولائی 69ء
'وقت بازار' خواجہ عبدل غفور (تبصرہ نگار ف۔م۔)	73	"
'شاعر' کا کرشن چندر نمبر	46	جون 70ء
'صحرائی اذان' گوپال متل	66	اکتوبر 70ء
'پیاسی بیل' گوپال کرشن مانک ٹالا	67	"
'پس غبار' رئیس امروہوی	56	دسمبر 70ء
'تبسم' ادیب مالے گانوی	52	اگست 71ء
ماہ نامہ 'روبی'	53	"
'لاہور کا جو ذکر کیا' گوپال متل	31	نومبر 71ء
'ضمیر اور ضمیریات' صفدر آہ	45	جون 72ء
'وٹ اینڈ وزڈم آف اندرا گاندھی'	35	اپریل 73ء
'ہفت رنگ' انتخاب کلام شعرائے بجنور	36	"
اندر جیت لال کی تین کتابیں	28	مئی 73ء
'بانو' کا سال نامہ 73ء	29	"
'دیوان ناشاد' این۔ بی۔ سین، ناشاد	24	جون 73ء
'نجات کے بعد' یوسف ندیم	27	جولائی 73ء
'اسٹوڈنٹ ٹائمز'	28	"
'لفظوں کا سفر' جمیل کلیمی	28	اگست 73ء
'صنعت و حرفت'	30	"
'آئینہ' کا سال نامہ 1973ء	77	ستمبر 73ء
'آپ ہم'	78	"
'آج کل' کا اردو نمبر	16	اکتوبر 73ء
'آج کل' کا ضمیما اردو نمبر	59	نومبر 73ء
'مغربی بنگال میں اردو' شانتی رنجن بھٹاچاریا	21	جنوری 74ء
'نامے جو میرے نام آئے'	"	"
سال نامہ 'بانو' 74ء	19	مارچ 74ء
'سائنس اور ہندوستان' اندر جیت لال	14	مئی 74ء
'قومی راج'	[illegible]	"

مشاعرے

مشاعرہ	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
'ہند و پاک مشاعرہ' خواجہ اسٹوڈنٹ لیگ کے زیر اہتمام	37	فروری 63ء
'آل انڈیا لیڈیز اینڈ جینٹس مشاعرہ'	38	اپریل 63ء
'آل مہاراشٹر مشاعرہ'	39	"
'انڈو پاک مشاعرہ' سرسنگار سمسد کی جانب سے	38	جون 63ء
'وذیا دان مشاعرہ' بخشی تعلیم کمیٹی کی جانب سے	"	"
'مردا [illegible] پیسے پہلے کا ایک مشاعرہ'	37	اگست 63ء
'سرسنگار سمسد کا آل انڈیا مشاعرہ'	42	مئی 64ء
'سرسنگار سمسد کا 5 واں آل انڈیا مشاعرہ'	34	جولائی 66ء
'صبح ایجوکیشنل سوسائٹی کا تیسرا آل انڈیا مشاعرہ'	38	"

خاموش بابا کے آستانے پر ایک 'مشاعرا'	41	جولائی 66ء
'بزم مولانا آزاد دہلی' کا دوسرا آل انڈیا مشاعرا	42	"
'دادری لوہارا ویلفیئر سوسائٹی' کا مشاعرا	45	مئی 67ء
'صبر حد ایجوکیشنل سوسائٹی' کا چوتھا کل ہند مشاعرا'	47	"
'سر سنگار سمسد کی جانب سے انڈو پاک مشاعرا'	52	نومبر 67ء
'انٹرنیشنل ٹورسٹ نمائش' کا آل انڈیا مشاعرا'	92	فروری 68ء
'غالب یادگار کمیٹی بمبئی' کی جانب سے مشاعرا'	12	ستمبر 68ء
'ساجن بھائی گرلز ہائی اسکول کا مشاعرا'	88	جنوری 69ء
'سر سنگار سمسد کا انڈو پاک مشاعرا'	91	"
'سر سنگار سمسد کا 7 واں آل انڈیا مشاعرا'	78	فروری 70ء
'جشن مظفر' کا آل انڈیا مشاعرا	70	اکتوبر 70ء
'دار العلوم دیوان شاہ کا آل انڈیا مشاعرا'	61	مئی 71ء
'آل انڈیا مشاعرا'	54	اگست 71ء
'مہاراشٹر کالج کا آل انڈیا مشاعرا'	35	نومبر 71ء
چند ابرائے اخبار عرف آل انڈیا مشاعرا'	86	مارچ 72ء
'سر سنگار سمسد کا 10 واں آل انڈیا مشاعرا'	56	دسمبر 72ء
'بیوپلیز ویلفیئر سوسائٹی کا آل انڈیا مشاعرا'	30	مئی 73ء
'آل انڈیا گنگا جمنی مشاعرا'	27	جون 73ء
'سر سنگار سمسد کا آل انڈیا مشاعرا'	64	نومبر 73ء
'مہاراشٹر کالج کی لائبریری کے لئے آل انڈیا مشاعرا'	21	جنوری 74ء

فلمیں ڈرامے

	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
'سن آف انڈیا'	38	فروری 63ء
'پریم پتر'	39	"
'اتنا بھی کیا ستم'، 'شبنم تو روئی روئی' گراموفون ریکارڈ	40	"
'ابھی جان'، ستیہ جیت رے کی مہا یاترا	38	مارچ 63ء
'خواجہ احمد عباس اور سردار جعفری کی گیارہ ہزار لڑکیاں'	39	"
'چوتھے آسمان پر'، 'غالب صاحب' ڈراما سوسائٹی کی جانب سے	40	اپریل 63ء
جے منی کی 'گرہستی'	40	اپریل 63ء
'سہرا' شانتارام کی پیش کش	39	جون 63ء
'بندنی' بمل رائے کی دین	"	"
'گمراہ' بلدیو راج کی تازہ فلم	38	اگست 63ء
گزری ہوئی کل کی ایک فلم 'آج اور کل'	39	ستمبر 63ء
ایک زہر آمیز فلم 'ناگ رانی'	40	"
جنتا کے لئے ایک پرانی فلم 'کون اپنا کون پرایا'	"	"
ایک دھواں آلود فلم 'مجھے جینے دو'	39	اکتوبر 63ء
'ہلف ماسٹر' 'رستم و سہراب' 'اکیلی مت جیئو'	40	"
بے وقت کی کہانی، مدراسی 'بہو رانی'	47	نومبر 63ء
تیری اردو نوازی کے ہم نثار 'میرے محبوب'	"	دسمبر 63ء
طوفان بدتمیزی کے ساتھ 'پھر وہی دل لایا ہوں'	44	جنوری 64ء
'دولہا دلہن'	50	فروری 64ء
سیمسن	"	"
ہنستی، بولتی، ناچتی، گاتی، رام آنند ساگر کی 'زندگی'	47	اپریل 64ء
ایک رنگین اسٹنٹ فلم 'راہزن' 'لیڈر'	46	مئی 64ء
اردو فلم کار احمد عباس کی ہندی فلم 'چھوٹا شہر اور چھوٹا سپنا'	44	جون 64ء
ایک اچھی فلم جو فلم بین طبقے کی توجہ سے محروم رہی 'بے نظیر'	95	اگست 64ء
'کلوپیٹرا'	96	"
بمبئی کے فلم سازوں کے لئے ایک سبق آموز فلم 'چارولتا'	53	اکتوبر 64ء
کیدار شرما کی جھوٹی 'فریاد'	54	"
ایک مسلم دل آزار فلم 'جہاں آرا'	61	دسمبر 64ء
کشور کمار کا تیر جنم 'دور گگن کی چھاؤں میں'	63	"
پنڈت کیدار شرما کا فلمی کوک شاستر 'چتر لیکھا'	73	مارچ 65ء
چین کی مسکراتی گاتی تصویر 'آؤ پیار کریں'	76	"
جیسی روح ویسے فرشتے 'چا چا چا!!'	77	"
ہے دل ہی دل بھرا ہوا سینے میں شیر کے، 'ویر بھیم سین'	79	"

فلم	صفحہ	تاریخ اشاعت
اردو زبان کی ایک فلم 'غزل'	38	مئی 65ء
ایک مقصدی کہانی جو لفر کی فلم زیادا پنے پالیا	89	اکتوبر 65ء
کی گود میں'		〃
مرد کی نفسیات کے تین پہلو 'تین دلویاں'	90	〃
سنسنی آمیز، حسین اور رنگین 'میرے صنم'	92	〃
وطن پرستی کے ایمان کو تازہ کرنے والی فلم 'حقیقت'	93	〃
'آرزو'	88	اپریل 66ء
'وقت'	90	〃
'ساز اور آواز'	92	〃
'آکاش دیپ'	94	〃
'رشتے ناطے'	〃	〃
'کاجل'	95	〃
'یہ رات پھر نہ آئے گی'	〃	〃
'بھیگی رات'	〃	〃
'اونچے لوگ'	〃	〃
'ممتا'	43	جولائی 66ء
'گائیڈ'	〃	〃
'ایک لڑکی سہیادری کی'	〃	〃
'دل لگی'	〃	〃
'دل دیا درد لیا'	45	〃
'برادری'	96	اکتوبر 66ء
'بیوی اور مکان'	39	دسمبر 66ء
'نئی عمر کی نئی فصل'	46	جولائی 67ء
'پالکی' تبصرہ نگار (سید عابد علی رہنما)	47	〃
'امن'	92	ستمبر 67ء
'بہو بیگم'	93	〃
'اپکار'	56	دسمبر 67ء
'رام اور شیام' اور 'آدمی'	57	اپریل 68ء
'بوند جو بن گئی موتی'	61	〃
'نور جہاں'	63	〃
'بہاروں کی منزل'	61	جولائی 68ء
'گوری'	92	ستمبر 68ء
'آنکھیں'	61	نومبر 68ء
'میرے حضور'	63	اپریل 69ء
'ستیہ کام'	61	جون 69ء
'بھون سوم'	73	اکتوبر 70ء
'گوپی گائن باگھا بائن'	58	دسمبر 70ء
'گیت'	59	〃
'ہیر رانجھا'	62	اگست 71ء
'آنند'	66	〃
'چیتنا'	41	نومبر 71ء
'کل آج اور کل'	85	مارچ 72ء
'پاکیزہ' 93 جنوری تا مارچ 72	49	جون 72ء
'اپہار'	48	〃
'تاش کے پتے'	51	〃
'ایک ادھوری کہانی'	61	دسمبر 72ء
'پریچے'	37	اپریل 73ء
'داغ'	32	جون 73ء
'پکار'	30	جولائی 73ء
'انگی رکھیا'	32	〃
'بستی اور بازار'	81	ستمبر 73ء
'نردوش'	74	نومبر 73ء
'نمک حرام'	26	جنوری 74ء
'منورنجن'	15	مارچ 74ء
'نیا دن نئی رات'	16	مئی 74ء

متفرق

	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
'ایک شام خمار بارہ بنکوی کے ساتھ'	37	فروری 63ء
'یوم ظفر' زیر اہتمام انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی	38	〃
'جشن صبا' 27 سالہ ادبی خدمات	39	اپریل 63ء

عنوان	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
رفاہی فنڈ کے لئے سہ روزہ کل چرل پروگرام	40	جون 63ء
ایک مفر تیک تک 'جلسۂ ولادت رسول'	38	ستمبر 63ء
چندو لال شاہ کا مینا بازار 'انڈین فلم ایکزی بیشن'	46	جنوری 64ء
مجلسِ تعمیر ادب کا نیک اقدام 'شام وقار'	49	فروری 64ء
'صبح امید' کا 25 واں جشنِ سالگرہ مالی اعتبار سے کامیاب رہا	45	اپریل 64ء
ایجوکیشنل اَپ لفٹ سوسائٹی کا ناکام ڈرامٹی پروگرام	47	"
ایک شعری، ادبی اور رنگین نشست 'شام ناصر'	44	مئی 64ء
اردو فرینڈس سرکل کی جانب سے 'شام شاہد کبوری'	48	جنوری 65ء
قومی یکجہتی اور اردو کی زندگی کے لئے 'یوم غالب'	71	مارچ 65ء
انجمن ترقی اردو، ہند کی شاخ کلیان	37	مئی 65ء
جیون جوت سدا جلے 'جشنِ انقلاب'	86	اکتوبر 65ء
انجمن ترقی اردو شاخ کلیان کی انتخابی میٹنگ	87	"
گم شدہ جنت کی از سر نو دریافت اردو یک نمبر	95	"
ایک مخصوص شعری نشست	87	اپریل 66ء
'یوم اکبر'	95	اکتوبر 66ء
ایک نشست اردو زبان میں تلفظ کا مسئلہ	38	دسمبر 66ء
جلسہ تقسیم انعامات، انقلاب تلم کار سوسائٹی	40	جولائی 67ء
بزم شعر و نغما کی جانب سے 'جشن سحر'	41	جولائی 67ء
'لوبیا'	92	فروری 68ء
'جشن غالب' عرف 'دربار زکریا'	66	اپریل 69ء
'عطر مجموعہ 69' اور 'عطر نسیم'	70	"
'عزم' کی رسم اجرا	87	اکتوبر 69ء
'آل انڈیا اردو کنونشن'	83	فروری 70ء
'غالب یادگار کمیٹی کی جانب سے غالب صدی کا اختتامی جلسا	86	"
فلم رائٹرز کی جانب سے سالانہ کل چرل پروگرام	62	جون 70ء
'جشن جالب'	57	مئی 71ء
'نیشنل ویلفیئر گروپ کا امدادی پروگرام	26	جون 73ء
'شب زدہ رت' جعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوٹل	32	اگست 73ء
بھیونڈی کالج میں 'یوم اقبال'	79	ستمبر 73ء
'عوامی کوآپریٹو بینک	83	"
'اسلام اور کمیونسٹ روس'	23	اکتوبر 73ء
بمبئی کا طبیہ کالج اور اس کا اسپتال	25	"
تعلیمی سماجی مجلس کی جانب سے 'عید ملن'	72	نومبر 73ء
'رتنا گیری مرکنٹائل کوآپریٹو بینک	25	جنوری 74ء

نشانِ راہ

زبان و ادب
استفسار

عنوان	صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت
اکثر خاموش طبع بزرگ کسی کو 'بڑا خفتش' کہہ کر پکارتے ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟	13	اگست 63ء
'گرگ باراں دیدہ، تجربا کار اور آزمودہ کار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن کیوں؟ جب کہ اس کے لفظی معنی دوسرے ہیں؟	"	"
'گپ' درست ہے یا 'غپ'، 'غنڈا' درست ہے یا 'گنڈا'؟	12	اکتوبر 63ء
'بیڑا پار کرنا' یا 'بیڑا اٹھانا' اِن میں سے کون سی بات درست ہے؟	19	دسمبر 63ء
کہتے ہیں 'STYLE' یونانی لفظ ہے؟	32	اکتوبر 64ء
موسیقی کی اصطلاح میں 'ناٹک' کسے کہتے ہیں؟	43	مارچ 65ء
یہ نظم سے بولی اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دے دو، کس نے کہی تھی؟	33	اکتوبر 66ء

سوال	صفحہ	تاریخ
دانش ور، صحافی، عالم، ڈاکٹر رفیق زکریا کی تازہ تصنیف 'رضیا' کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟	22	دسمبر 66ء
؎ خاک ساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں ۔ اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے ، یہ شعر کس کا ہے؟	"	"
'مرحوم' اور 'آں جہانی' کے استعمال کا محل کیا ہے ؟	"	مئی 67ء
یہ شعر کس کا ہے ؎ اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں گر پڑے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے ؟	"	"
انگریزی لفظ SALOON آج کل بہت سے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ویسے اِس لفظ کے درست معنی کیا ہیں ؟	59	ستمبر 67ء
حالات کی تبدیلی پر کوئی شعر سنائیے ؟	60	"
کیا لفظ 'بیگ' اور 'بک' میں فرق ہے؟	62	فروری 68ء
آپ نے ایک جگہ 'بحث' کی جمع 'مباحث' کو جمع بنا کر 'مباحثوں' لکھا ہے جو کہ غلط ہے ؟	30	اپریل 68ء
علامہ اقبال کی ایک نظم کے ایک بند کا مطلب تو سمجھائیے .... ؟	49	ستمبر 68ء
ایک شعر کا مصرع ہے ع 'کوئی اس کو دکھا دے دل ہمارا' دوسرا مصرع کیا ہے اور یہ شعر کس کا ہے ؟	35	جولائی 69ء
گاد، گاوِ زمیں، گاوِ سامری، گاوِ عنبر اور گاوِ فلک کے معنی بتلائیے ؟	36	"
کیا پہلوی زبان اب بھی زندہ ہے ؟ نہیں، تو ختم ہونے کا سبب ؟	51	اکتوبر 69ء
'شیر آبی' یا 'دریائی شیر' سے کیا مطلب لیا جاتا ہے ؟	52	"
کیا یہ سچ ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، خوب رو لڑکوں کو اپنی صحبت میں رکھنا پسند فرماتے تھے ؟	50	فروری 70ء
مخدوم کے انتقال پر گگن میں کوئی ذکر نہیں کیا گیا، آپ کے خیال میں اُن کا کیا مقام ہے ؟	"	"
بمبئی میں کانگریس کے اجلاس میں ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا گیت پیش کیا گیا، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟	52	"
ٹیکسی کو ٹیکسی کیوں کہا جاتا ہے ؟	30	دسمبر 70ء
مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی ؟	"	"
'میں معافی مانگتا ہوں' یا 'میں معافی چاہتا ہوں' کون سا جملہ درست ہے ؟	32	"
کیا مندرجہ ..... جملے درست ہیں ؟ اگر نہیں تو اصلاح فرمائیے ...... ؟	41	مئی 71ء
مثل مشہور ہے 'کمبل نہیں چھوڑتا' یا 'کمبل نے پکڑ لیا ہے' مطلب تو معلوم ہے، مگر وہ بات کیا تھی کہ جس سے یہ مثل بنی؟	42	اگست 71ء
اتفاقاتِ زمانہ پر ایک دو شعر سنائیے ؟	43	"
جناب سلامت علی مہدی صاحب کے بارے میں کچھ تفصیل سے جاننا چاہتا ہوں، اور کہاں تک انھوں نے تعلیم پائی ہے ؟	44	"
نام یا تخلص پر جو علامت (ـــ) لگائی جاتی ہے، اُسے کیا کہتے ہیں اور ع، عہ، ہاں علامتوں کو کیا کہتے ہیں ؟	21	نومبر 71ء
جوش ملیح آبادی کو اتنی مقبولیت حاصل کیوں نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہئے تھی ؟	23	"
آپ کے خیال میں اردو زبان (نثر) کی وہ عام غلطیاں کیا ہیں، لکھنے والے جن کے اکثر مرتکب ہوتے ہیں ؟	81	مارچ 72ء
علامہ اقبال کے متعلق گگن میں بہت کچھ پڑھا، مگر آپ اُن کے کسی شعر کو غلط ثابت نہیں کر سکے ؟	"	"
نیاز فتح پوری 'تیار' کو 'طیار' اور 'تیاری' کو 'طیاری' کیوں لکھتے تھے ؟	37	جون 72ء
کیا مولانا آزاد مے نوشی فرماتے تھے ؟	50	دسمبر 72ء
کیا یہ درست ہے کہ فارسی اور بنگالی سب انڈو یورپین زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟	"	"

اردو شاعری میں زلف، کاکل اور گیسو کے الگ الگ کیا معنی لئے جاتے ہیں؟	51	دسمبر 72ء
جعفر پور کے مایۂ ناز شاعر اور اُستاد حضرت (علامہ) رضی ناطقی کا یہ شعر کیا ادب میں اضافہ نہیں ہے ؎ لے دے کے کچھ بچے تھے ہمارے بھی درسگاہ — وہ بھی تو چھن گئے ہیں یہ قسمت کی بات ہے	52	"
بابائے اردو مولوی عبدالحق کیا 'مولوی' بھی تھے؟	32	اپریل 73ء
کیا آپ اردو زبان میں عربی، فارسی الفاظ کو برقرار رکھنے کے حق میں ہیں؟	25	مئی 73ء
اقبال نے پرندوں میں شاہین ہی کو کیوں پسند کیا؟	22	جون 73ء
'خط و خال' درست ہے یا 'خدّ و خال'؟	23	"
محترم جناب مولانا حامد الانصاری غازی کے بارے میں مختصر طور پر بتائیے کہ اُن کو 'غازی' کا لقب کیسے ملا؟	25	جولائی 73ء
آج کا ادب، شاعری اور خاص طور سے فلمی گیت، عریانیت اور فحاشی کو اتنا فروغ دے رہے ہیں کہ ہمارا شعر و ادب اتنا گندہ کبھی نہیں تھا؟	25 /	اگست 73ء
'شامتِ اعمال ما، صورتِ نادر گرفت' کا کیا مطلب ہے؟	69	ستمبر 73ء
اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کے مقابلے کا کوئی شعر سنائیے ؎ شیخ اپنی رگ کو کیا کریں، ریشے کو کیا کریں — مذہب کے جھگڑے چھوڑ دیں تو پیتے کو کیا کریں	70	"
مولانا رومؔ جن کے علم سے اقبالؔ نے بھی استفادہ کیا ہے، اُن کا کوئی دیوان بھی ہے؟	53	نومبر 73ء
جب ہم کسی کی موت پر تعزیت کرتے ہیں تو مرنے والے کے عزیزوں سے کہتے ہیں 'خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے'۔ 'صبرِ جمیل' سے آخر کیا مراد ہے؟	54	"
'رجعت' یا 'رجعت پسندی' کے دراصل معنی کیا ہیں؟	53	"
انگریزی حروف میں 'محمدؐ' کی دُرست ہجّے کیا ہے؟	57	"
ذرا یہ تو بتلائیے کہ اسکول، اسٹال اور اسٹیشن، ان انگریزی الفاظ کو مذکر استعمال کرنا چاہیے یا مؤنث؟	"	"
کسی شعر کا یہ مشہور مصرع ہے کہ 'خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو'۔ اس کا پہلا یا دوسرا مصرع کیا ہے؟	13	مئی 74ء

سیاست

کیا سیاسی بحث میں ایک دوسرے کو قائل کیا جاسکتا ہے؟	19	اپریل 63ء
جن کے نام کے ساتھ 'گاندھی' لگتا ہے ایسے تو بہت ہیں لیکن 'نہرو' بہت کم، کیا 'نہرو' ذات کے لوگ ہندستان میں کم ہیں؟	12	اکتوبر 63ء
گاندھی جی نے عمر بھر ٹوپی کبھی نہیں پہنی، پھر 'گاندھی کیپ' اُن کے نام سے کیوں مشہور ہوئی؟	59	اگست 64ء
'مکر میلن' کہاں ہے؟	43	مارچ 65ء
'چند برس پہلے انگلینڈ کی رانی ہندستان آئی تھی' حصول آزادی سے پہلے حکومت انگلستان کے کون کون سے سربراہ 'حکمران' ہمارے مہمان بنے؟	40	اکتوبر 65ء
پروفیسر آل احمد سرور نے 'ہماری زبان' میں مولانا آزاد اور مولوی عبدالحق کے اختلافات کی نوعیت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ "... وہ ناگ پور میں ہندی ہندستانی کے قضیے کے بعد سے گاندھی جی، کانگریس اور تمام قوم پرست راہ نماؤں سے	39	اکتوبر 66ء

مدظلہ ہو گئے تھے۔" دریافت طلب بات یہ ہے کہ کیا مولوی عبدالحق کا قوم پرستوں سے بدظن ہونا درست تھا؟

ہندستان کے لئے امریکی غذائی امداد کے سلسلے میں اکثر 'پی ایل 480' لفظ اخبارات میں استعمال کیا جاتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟	21	دسمبر 66ء
کہتے ہیں 'سنت فتح سنگھ' کبھی مسلمان تھے؟	23	مئی 67ء
آپ کا مرحوم مسلم لیڈروں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں کے متعلق کیا خیال ہے؟	22	نومبر 67ء
ہمارے سیاسی لیڈروں میں فلم بینی کا شوق کس کس کو ہے؟	30	اپریل 68ء
مہاتما گاندھی جس زبان کو ہندستانی کہتے تھے، وہ کون سی زبان تھی؟	42	جنوری 69
ہر ملک جنگ کے تباہ کن اثرات سے واقف ہے مگر ہر ایک امن سے زیادہ جنگ کی بات کرتا ہے؟	36	اپریل 68ء
یہ 'سی۔ آئی۔ اے' کیا چیز ہے؟	82	مارچ 72ء
علی برادران کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟	23	نومبر 71ء
کچھ شیخ عبداللہ کے بارے میں بتائیے، کیا وہ فرقہ پرست ہیں؟	81	مارچ 72
'جینوا کن ونشن' کسے کہتے ہیں؟	83	"
کیا صرف مذہب سے انگریز نوجوانوں کی بیزاری ہی کی بنا پر (آپ کے بقول) یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگلینڈ میں کمیونزم کی آمد ہے؟	38	جون 72ء
اپنا وظیفہ ختم ہونے پر اب راجا نواب کیا کریں گے؟	39	"
مہاتما گاندھی اور اندرا گاندھی میں فرق کیا ہے؟	37	"
آخر اندرا گاندھی عوام کی اتنی زیادہ غریبی سے متاثر کیوں نہیں ہوتیں؟	90	ستمبر 72
گریٹ برٹن کو 'یو۔ کے' کیوں کہتے ہیں؟	91	"
'غدر پارٹی' کے بانی کون تھے؟ کچھ اُن کے بارے میں بتائیے؟	"	"
مولانا بھاشانی کس مزاج کے آدمی ہیں؟	94	"
'شملا کانفرنس' میں معاہدے پر دستخط کرتے وقت بھٹو بند گلے کا جو کوٹ پہنے ہوئے تھے، وہ کس فیشن کا تھا؟	"	"
'مسلم پرسنل لا' اور 'مسلم یونی ورسٹی' کے خلاف ایجی ٹیشن کی حقیقت کیا ہے؟	"	"
شیخ مجیب پاکستانیوں کو معاف کر کے بھٹو سے ملاقات کیوں نہیں کرتے؟	51	دسمبر 72ء
'یوگنڈا' سے جو ایشیائیوں کو نکالا جا رہا ہے، اس کا اصل سبب کیا ہے؟	52	"
علامہ مشرقی کے بارے میں کچھ بتائیے؟	54	"
آخر پاکستان میں اُن مسلمانوں پر کیا گزرے گی جو 1947ء کے بعد ہندستان سے پاکستان پہنچے ہیں؟	32	اپریل 73
سال بھر سے زیادہ گزر گیا اور ہندستان کی امداد بھی جاری ہے مگر بنگلا دیش کے حالات ابھی تک بہتر نہیں ہو پائے، آخر یہ کیا بات ہے؟	33	"
'پریس ایشیا انٹرنیشنل' کیا چیز ہے؟	24	مئی 73ء
سکم کے عوام راجا کے خلاف کیوں ہوئے؟	25	"
مسلم لیگ نے جو تشدد آمیز فرقہ پرستی شروع کی ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟	26	"
کیا آپ کے خیال میں 'علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی' کے اقلیتی کردار کو نہ بدلنا چاہئے؟	"	"

سوال	شمارہ	تاریخ
[illegible] بچے والے دل سلیمن کس کر دو دیتے ہیں ؟	23	جون 73ء
مولانا بھاشانی کے جہاد کے متعلق اعلان کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے ؟	"	جولائی 73ء
اسرائیل کی فتح کا سبب یہ ہے کہ اس کو بے حد غیر ملکی امداد حاصل ہے ، اپنی رائے دیجئے	"	"
یہ 'واٹر گیٹ' کیا بلا ہے ؟	25	اگست 73ء
ریٹائر ہونے کے بعد فیلڈ مارشل 'مانک شا' ہندوستانی پر کیوں مجبور ہو گئے ؟	26	"
پاکستان کے سیاسی لیڈر اور صحافی حضرات کا قائد اعظم محمد علی جناح کو 'رحمت اللہ علیہ' لکھنا کہاں تک جائز اور درست ہے ؟	68	ستمبر 73ء
سنا ہے ایسے مے نوش کانگریسی بھی گزرے ہیں ، جنھوں نے جیل میں بھی اپنے اس شغل کو جاری رکھا ؟	"	"
مصر کے فوجی حکمرانوں نے 'الاخوان المسلمون' کے مولویوں پر جو ظلم ڈھائے ، اُن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟	11	اکتوبر 73ء
پاکستان کے نئے صدر فضل الٰہی کے بارے میں کچھ بتائیے ؟	57	نومبر 73ء
روس کے بنائے ہوئے ناقابلِ تسخیر سام میزائیل کا ہمارے سابق فیلڈ مارشل کے نام 'سام' سے کیا تعلق ہے ؟	17	جنوری 74ء
انڈونیشیا کے صدر 'سوکارنو' کو مرے ہوئے اگرچہ کافی دن ہو چکے ہیں مگر آج بھی اس کا ذکر اچھائی میں آتا ہے اور کبھی برائی میں ، آپ اُس کے کردار کو واضح کیجئے ؟	15	"
[illegible] مارگ کی تحریک کا مقصد کچھ بتائیے ؟	"	"
گاندھی ٹوپی جو کانگریسیوں کا لباس [illegible] ہے ، گاندھی جی نے تو کبھی نہیں پہنی ، آخر اس کی شروعات کیسے ہوئی ؟	10	مارچ 74ء
ہندو مسلم اتحاد کے لئے آخر کس فارمولے پر عمل کیا جائے ؟	11	"
[illegible] علی جوہری لوہیا کے خلاف الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے ، کیا نتیجہ رہا ؟	12	"
علامہ اقبال نے ایک بار مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق 'ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبی ست' کہا تھا ، کس واقعے کی بنا پر وہ ایسا کہنے پر مجبور ہوئے تھے ؟	11	مئی 74ء
آخر آپ کے یہاں فرقہ پرست کی تعریف کیا ہے ؟	12	"

نفسیات

سوال	شمارہ	تاریخ
کیا ایک بیوی کسی غیر مرد میں بھی دلچسپی لے سکتی ہے ؟	23	مارچ 63ء
کیا کچھ لوگ کڑھتے رہنے میں لذت محسوس کرتے ہیں ؟	"	"
کیا بیوی کو چاہئے کہ وہ شوہر کی انا کو برقرار رکھے ؟	"	"
کیا بیوی کو شوہر کے نظریات سے اتفاق کرنا چاہئے ؟	"	"
کیا زیادہ دولت کمانے کی صلاحیت ہمیشہ قابلِ تعریف ہوتی ہے ؟	19	اپریل 63ء
کیا بوڑھے لوگ زیادہ باتونی ہوتے ہیں ؟	"	"
کیا آسان ذرائع سے پیدا کی ہوئی دولت قابلِ تعریف ہے ؟	"	"
کیا آپ پہلے سے یہ اندازہ لگا سکتے (سکتی) ہیں کہ آپ کا (کی) ہونے والا (والی) ساتھی موزوں ہوگا (گی) ؟	"	"
کیا غصہ ور انسان مغرور ہوتا ہے ؟	22	جون 63ء
کانگرس کا ہندوستانی مسلمان [illegible]	"	"

کیا بار بار کھانے والے ہر بار بھوک محسوس کرتے ہیں ؟	22	جون 63ء
کیا آپ جوانوں کے ساتھ مل جل کر اپنے بڑھاپے کو بھلا سکتے ہیں ؟	"	"
کیا اپنی بری عادت چھوڑنے کا اعلان آپ کو اپنے دوستوں کے سامنے کر دینا چاہیئے ؟	25	اگست 63ء
کیا بدھو نوجوان اچھے محبت کرنے والے ثابت ہو سکتے ہیں ؟	"	"
کیا زیادہ حساس یا نازک دماغ ہونا، کاروبار میں ایک رکاوٹ ہے ؟	"	"
کیا انسان محض اپنا حسین ماضی ہی یاد کرنا چاہتا ہے ؟	24	اکتوبر 63ء
کیا شوہر کو اپنی بیوی کے لئے کچھ قربانیاں دینا چاہیئے ؟	"	"
کیا خوش فہمی ایک اچھی چیز ہے ؟	"	"
کیا زیادہ تر آدمی درست نکتہ چینی قبول کر لیتا ہے ؟	27	دسمبر 63ء
کیا بغیر ثبوت حاصل کئے آپ کو اپنے دوست سے ناراض ہو جانا چاہیئے ؟	"	"
کیا کینہ پرور شخص پر بھروسا کیا جا سکتا ہے ؟	"	"
کیا دودھ پیتے بچوں کی بھی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے ؟	"	"
کیا آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنے بچوں کو مجبور کریں کہ وہ ایک ہی کھلونے سے مل کر کھیلیں ؟	24	جنوری 64ء
کیا قیمتوں میں بھاری رعایت کا بورڈ لگا کر دکان دار، امیر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے ہیں ؟	"	"
کیا نچلے طبقے کے لوگ اپنی زندگی میں زیادہ مطمئن رہتے ہیں ؟	"	"
لیڈر پیدائشی ہوتا ہے یا بنا جا سکتا ہے ؟	31	جون 64ء
کیا اکثر عورتیں روٹی، کپڑے اور اپنے تحفظ کے لئے شادی کرتی ہیں ؟	"	"
کیا آپ کو اپنے بچے کا استاد بننا چاہیئے ؟	"	"
کیا زیادہ جوشیلا ہونا جذباتی طور پر تن درست ہونے کی دلیل ہے ؟	"	"
کیا لڑکیاں لڑکوں کی بہ نسبت جلدی بالغ ہو جاتی ہیں ؟	68	اگست 64ء
کیا اکثر لوگ کسی سے مشورا لینے میں پُر خلوص ہوتے ہیں ؟	"	"
کیا ہر کوئی اکثر اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے ؟	"	"
کیا فن کار دنیا کے لوگوں سے میل نہیں کھاتا ؟	"	"
کیا پابندی کے ساتھ مندر یا مسجد میں جا کر عبادت کرنے والے مکار ہوتے ہیں ؟	38	اکتوبر 64ء
کیا آپ کا اپنے بچوں سے، یہ امید رکھنا کہ وہ آپ کو اپنے لئے ایک نمونا سمجھیں، درست ہے ؟		"
کیا آپ کو اپنی خود غرضی پر شرمندا ہونا چاہیئے ؟		"
کیا ایسے لوگ ہیں جو بیمار ہونے کے باوجود ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے شرماتے ہیں ؟		"
بعض لوگوں کو پالتو جان وروں سے بہت لگاؤ ہوتا ہے، آخر کیوں ؟	29	جنوری 65ء
کیا مجرمانہ ذہنیت کے انسان پستہ قد ہوتے ہیں ؟	"	"
کیا اکثر لڑکے شرمیلی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے ؟	39	اکتوبر 65ء

[illegible]

انسان جرم کا مرتکب کیوں ہوتا ہے ؟	40	اکتوبر 65ء
بیٹا اپنا کردار بنانے میں باپ سے زیادہ متاثر ہوتا ہے یا ماں سے ؟	33	اکتوبر 66ء
کیا یہ درست ہے کہ آج کل کی لڑکیاں بہت جلد بالغ ہو جاتی ہیں ؟	21	دسمبر 66ء
اپنے شاگرد یا اپنے تحت کام کرنے والوں کے کام کی تعریف کرنا زیادہ مناسب ہے یا تنقید کرنا ؟	22	"
کس قسم کے لوگ زیادہ خوش رہتے ہیں ؟	"	مئی 67ء
کیا رکھ چڑھے اور سنک مزاج لوگ کم عقل ہوتے ہیں ؟	60	ستمبر 67ء
کیا شادی حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہے ؟	22	نومبر 67ء
کیا زیادہ تر انسان احسان ماننے والے ہوتے ہیں ؟	61	فروری 68ء
کیا اولاد کی خواہش فطری جذبہ ہے ؟	29	اپریل 68ء
گھر سے باہر کسی مرد اور عورت کو ساتھ ساتھ دیکھ کر یہ کیسے سمجھا جائے کہ وہ میاں بیوی ہیں ؟	30	جولائی 68ء
دولت بڑی ہے یا عزت ؟	32	نومبر 68ء
کیا زن مرید شوہر اپنی ازدواجی زندگی میں خوش رہتا ہے ؟	"	"
کیا طوائف کے وجود کو ختم کرنے کے لئے یہ علاج درست نہیں کہ روشن خیال مرد طوائف سے شادی کر لے ؟	41	جنوری 69ء
کیا دوسری شادی ایک جوا ہے ؟	42	"
کیا کسی لڑکی کا گھریلو ہونا اچھی بات ہے ؟	"	"
کیا پہلوٹی کا بچہ اپنے دوسرے بھائی بہنوں سے زندگی میں زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے ؟	35	اپریل 69ء
علم لفیات کی روشنی میں شیخی مارنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ؟	"	جولائی 69ء
کیا کچھ لوگ پیدائشی طور پر بخیل ہوتے ہیں ، کنجوسی کے اسباب کیا ہیں ؟	36	"
کیا زیادہ عمر کی عورت سے شادی کرنا مرد کے روزگار میں مددگار ثابت ہوتا ہے ؟	51	اکتوبر 69ء
شادی کے لئے لڑکی کی عمر ؟	52	"
محبت کیا ہے ؟	50	فروری 70ء
کیا جنسی لذت سے بڑی کوئی لذت ہے ؟	51	"
انسان کی مہربانی اور فراخ دلی کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے ؟	52	"
ہر مرد اپنی عورت کو 'پتی ورتا' دیکھنا چاہتا ہے مگر خود 'پتنی ورتا' بننے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا کیوں ؟	30	دسمبر 70ء
کیا شادی کے بعد میاں بیوی کے تعلقات ہمیشہ خوش گوار رہ سکتے ہیں ؟	31	"
کیا بڑے سر والا انسان زیادہ عقل مند ہوتا ہے ؟	32	"
کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے شوہر اور بیوی کا ہم خیال ہونا ضروری ہے یا ہم مذہب ہونا ؟	"	"
کیا دوسروں کو دکھ میں مبتلا دیکھ کر اپنا دکھ محسوس ہونے لگتا ہے ؟	40	مئی 71ء
آپ سب کچھ بتاتے ہیں ، ذرا دولت پیدا کرنے کا کوئی جائز طریقہ تو بتائیں ؟	41	"
شادی سے پہلے بیوی کے اخلاق و مزاج کا کیسے پتا لگے ؟	"	"

گھر کا ہندستانی مسلمان

غریب کام چور کیوں ہوتے ہیں؟	42	مئی 71ء
ٹوٹے ہوئے دل کو جڑنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟	43	اگست 71ء
ماہانا اخراجات اور ڈیوٹی کے انجام دینے کے سلسلے میں شادی شدہ مرد زیادا ذمّے دار ہوتا ہے یا کنوارا مرد؟	"	"
کیا یہ ضروری ہے کہ ایک انسان کے فیصلے یا نظریے سے دوسرا بھی اتفاق کرے؟	"	"
کیا عورت اپنے پیٹ کی خاطر شادی کرتی ہے؟	44	"
کیا عالم کے لئے خانا نشین ہونا اچھا ہے؟	"	"
پیشاور لوگوں میں کون کم اور کون زیادہ عمر پاتے ہیں؟	22	نومبر 71ء
دو مردوں کا باضابطا آپس میں شادی کرلینا اور دو لڑکیوں کا قانونی طور پر میاں بیوی بن جانا آخر یہ کیا تماشا ہے؟	24	"
کیا ہم کو صرف آج ہی کے لئے زندا رہنا چاہئے؟	82	مارچ 72ء
کیا اس دنیا میں جن یا بھوت کا وجود ہے؟	83	"
'حاجی طنگ سے فارس روڈ تک' پڑھنے کے بعد نتیجا یہی نکلتا ہے کہ ردّی اور کباڑئے کی ضرورت، عورت کو طوائف بننے پر مجبور کرتی ہے، کیا کوئی اور وجہ بھی ہے؟	37	جون 72ء
کیا ناول اور افسانے عام ذہن ہی کو متوجہ کرتے ہیں؟	53	دسمبر 72ء
ایک نوجوان ہپّی کیوں بنتا ہے؟	25	مئی 73ء
کیا دو بھائی ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو حسد کے اس جذبے کو کس طرح دور کیا جائے؟	26	"
کیا بچوں کو جیب خرچ دینا مناسب ہے؟	21	جون 73ء
بعض بچوں اور گھر کی بعض خواتین سے بھی گھر کی چیزیں بہت ٹوٹتی ہیں، اس کی وجہ؟	26	جولائی 73ء
ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے اکثر لوگ اپنے سامنے رکھی ہوئی چیزوں کو ایک ہاتھ سے ادھر ادھر کرتے ہیں، کیوں؟	24	اگست 73ء
جب چھوٹے بچے آپس میں جھگڑنے لگیں، تو ان کو جھگڑنے سے کیسے روکا جائے؟	"	"
کیا کوئی دوسری ذات ہماری شخصیت کو بدل سکتی ہے؟	26	"
کیا زن مرید شوہر کی ازدواجی زندگی خوش گوار گزرتی ہے؟	"	"
مسلمان کاروبار میں اتنا کامیاب کیوں نہیں جتنے دوسرے فرقے کامیاب ہیں، جب کہ مسلمانوں کے پیغمبر نے مسلمان کو کاروباری کرنے پر زیادا زور دیا ہے؟	67	ستمبر 73ء
کیا دولت غیر محفوظ زندگی کی حفاظت کرسکتی ہے؟	68	"
کیا انسان کا زیادہ جوشیلا ہونا اس کے صحت مند ذہن کی دلیل ہے؟	69	"
کیا یہ ممکن ہے کہ عمل ہمدردی کا ہو مگر نیت میں خلوص نہ ہو؟	53	نومبر 73ء
کیا انسان محض اپنا حسین ماضی ہی یاد کرنا چاہتا ہے؟	55	"
کیا بیوی کی طبیعت یا مزاج میں تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے؟	57	"
یہ جانتے ہوئے بھی کہ شوہر بے وفا ہے، مگر بعض اس سے چمٹی رہتی ہے؟ کیوں؟	17	جنوری 74ء
کیا آج کی لڑکیاں، لڑکوں کی بہ نسبت شادی کرنے کی زیادا خاہش مند رہتی ہیں؟	18	"

قدیم شعراء [illegible] 'الہٰ' کا ذکر آیا ہے، اس ترکیب لفظ سے کیا مراد ہے؟	13	اگست 63ء
کیا 'شکنتلا' واقعی تاریخی کردار ہے؟	"	"
مان بائی کو شہنشاہ جہانگیر کی پہلی بیوی بتایا جاتا ہے، لیکن ملکہ نورجہاں کے زمانے کی تاریخ میں ان بائی کا کوئی ذکر نہیں ملتا؟	19	دسمبر 63ء
مصری مجسمہ 'ابوالہول' کون سی تہذیبی یا تاریخی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے؟	"	"
پرانی کتابوں میں 'مانی' کا ذکر مصوّر کی حیثیت سے بھی آتا ہے اور پیغامبر کی حیثیت سے بھی، اُن کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟	"	"
'OLYMPUS' کے کیا معنی ہیں۔ کیا اس لفظ کا کوئی تاریخی پس منظر ہے؟	"	جنوری 64ء
صحیح طور پر 'برہم چاری' انسان کو کب کہا جا سکتا ہے؟	"	"
عورت کو 'BETTER HALF' کیوں کہا جاتا ہے؟ 42۔ جون تا اگست 67ء	"	"
دیو جانس کلبی کو کچھ لوگوں نے سگ پرست لکھا ہے، کیا وہ کتّے کی پرستش کرتا تھا؟	59	اگست 64ء
'گلِ بہشت' کوئی تاریخی کردار ہے؟	"	"
'باکل' نام کا درخت کیسا ہوتا ہے اور کہاں پایا جاتا ہے؟	"	"
'لیلیٰ مجنوں' کس حد تک تاریخی کردار ہیں اور کس حد تک افسانوی؟	32	اکتوبر 64ء
'ٹریفالگر اسکوائر' کی تاریخ کیا ہے؟	"	"
'وَطّاما' لفظ اکثر عورتیں استعمال کرتی ہیں، معنی کیا ہیں؟	"	"
'میر صادق' جیسے تاریخی کردار پر کچھ روشنی ڈالیے، اقبال نے اس کو ننگِ وطن کیوں کہا ہے؟	29	جنوری 65ء
یہ سامری کون تھا، کیا یہ سچ ہے کہ اس نے ایک بیل پیدا کیا تھا جو بولتا تھا؟	43	مارچ 65ء
اورنگ زیب کا کردار کس حد تک مذمت کے لائق ہے اور کس حد تک تعریف کے؟	"	"
آسمان کے بارہ برجوں کا مفہوم جو شکلوں سے پیش کیا جاتا ہے، یہ شکلیں کس طرح دیکھی گئیں؟	44	"
'ہنوز دلی دور است' محاورے کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟	39	اکتوبر 65ء
گوتم نے جب راج محل چھوڑا تو وہ رتھ پر سوار تھے یا گھوڑے پر، کیا اُن کے رتھبان کا نام کنتھک تھا؟	40	"
بہادر شاہ ظفر کی ماں کا نام کیا تھا؟	33	اکتوبر 66ء
وہ نورجہاں کے حکیم تھے یا جہاں آرا کے، جن کو مغلیہ دربار سے ایک حویلی انعام میں ملی تھی؟	29	اپریل 66ء
کیا یہ درست ہے کہ قدیم بھارت میں گائے کا گوشت کھایا جاتا تھا؟	30	جولائی [illegible]
نگار کی ایک اشاعت میں ایک لفظ 'الوتُو' استعمال کیا گیا ہے، اس کے کیا معنی ہیں	42	جنوری 69ء
مانی کی مصوری کی کیا خصوصیت تھی؟	35	اپریل 63ء
کیا عاقل خاں اور مغل شہزادی کے معاشقے کی بات درست ہے؟	36	"
'مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی' مولوی مدن کی سی بات کا پس منظر کیا ہے؟	49	فروری 70ء
ویدک شاستروں میں آیا ہے کہ انسان کے جسم میں نو سوراخ ہوتے ہیں، وہ کون کون سے ہیں؟	51	"
ایک کہاوت ہے 'کمائیں خانِ خاناں اور لٹائیں میاں نہیم' یہ کس واقعے سے متعلق ہے؟	[illegible]	[illegible] 70ء
کیا قرۃ العین کوئی تاریخی ہستی گزری ہے؟	40	[illegible]

بیربل کا حسب نسب اور حال بیان کیجئے ؟	42	مئی 71ء
کرشن جی نے کہا تھا کہ جب سنسار میں برائی زیادہ بڑھ جائے گی، میں سچائی کا روپ دھارن کر کے آجاؤں گا، آج جتنی برائی ہے اس سے زیادہ کیا ہوگی، پھر کرشن جی کہاں ہیں؟	42	اگست 71ء
ایک بزرگ سالار غازی ہوئے تھے، ان کے متعلق کچھ تفصیل سے بتایئے ؟	43	"
پطرس کے کیا معنی ہیں ؟	"	"
کیا بادشاہ تغلق واقعی پاگل تھا ؟	21	نومبر 71ء
شو کی مورتی کن حقائق کی مظہر ہے ؟	23	"
کچھ مانی کے بارے میں بتایئے ؟	80	مارچ 72ء
ایک برف پوش بوڑھے کو 'سینٹا کلاز' کہنے کی وجہ تسمیہ ؟	82	"
بابر کا چنگیز خان اور تیمور سے کیا رشتہ تھا ؟	93	ستمبر 72ء
'عمرو عیار' محض ایک افسانوی کردار ہے، یا اس نام کا واقعی کوئی شخص تھا؟	31	اپریل 73ء
اکبر کی رانیوں میں بھی 'جودھا بائی' کا نام آتا ہے اور شاید جہانگیر کی بھی ایک رانی جودھا بائی تھی، کیا یہ درست ہے؟ اور کیا نور جہاں ہی کے زمانے میں جودھا بائی بھی جہانگیر کے حرم میں داخل تھی ؟	21	جون 73ء
مغلیہ خاندان میں کل کتنے بادشاہ ہوئے ؟	24	جولائی 73ء
اکبر بادشاہ کے نورتن کون کون تھے ؟	26	اگست 73ء
کہتے ہیں شہر حیدرآباد کسی طوائف نے بسایا تھا ؟	53	نومبر 73ء
محبت کے دیوتا کیوپڈ کو اندھا کیوں بتایا جاتا ہے ؟	54	"
آپ نے شاید ایک بار لکھا تھا کہ شاہ جہاں نے ملکہ نور جہاں کے آخری دنوں میں اس کو نظر بند کر دیا تھا، شاہ جہاں اور نور جہاں کی دشمنی کا سبب کیا تھا، اور ممتاز محل کی موت سے کیا کوئی واقعہ مشہور ہے ؟	55	"
ہندستان کا سب سے پرانا شہر کون سا ہے ؟	56	"
'عوج بن عوق' کس کا نام تھا ؟	57	"
بمبئی میں جو یہ 'گیٹ آف انڈیا' ہے، یہ کب اور کس مقصد کے لئے بنایا گیا تھا ؟	17	جنوری 74ء
کیا یہ درست ہے کہ دمشق دنیا کے پرانے شہروں میں سے ایک ہے ؟	"	"
'البیرونی' تاریخ میں کس حیثیت سے مشہور ہے ؟	19	"
نوشیروانِ عادل کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے ؟	10	مارچ 74ء
دہلی میں پھول والوں کی سیر کا جو میلا ہوتا ہے، اس کی ابتدا کیسے ہوئی ؟	11	"
عشق کیا ہے ؟	12	مئی 74ء

مذہب و عقیدہ

'آواگون' کے مسئلے پر روشنی ڈالیے	12	اکتوبر 63ء

سوال	صفحہ	شمارہ
کیا گوتم بدھ کو اوتار یا پیغامبر کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟	44	مارچ 65ء
ہماری بستی کے 'فخر' نے جو مقرر شخص سمجھے جاتے ہیں "مسلم پرسنل لا" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "وقف کا طریقہ کسی دوسری قوم یا مذہب میں نہیں ہے، سوائے اسلام کے، اور ہم اپنے پیغامبر اور مذہبی بزرگوں کو اسٹیج یا پردہ اسکرین پر پیش نہیں کرتے، کیا یہ درست ہے؟	23	مئی 67ء
اکثر چند برسوں کے وقفے سے موسمی حالات غضبناک ہو جاتے ہیں، سیلاب آتے ہیں، کال پڑتا ہے، زلزلے آتے ہیں، سمندری طوفان آتے ہیں، کیا اس کو انسان کے گناہ کا ردِّ عمل اور اللہ کا عذاب کہا جائے؟	22	نومبر 67ء
کیا مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تلوار ضروری ہے؟	61	فروری 68ء
کیا یہ درست ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی میں سات برس تکلیف میں گزارنے پڑتے ہیں؟	62	"
کیا سنیچر واقعی منحوس دن ہے؟	30	اپریل 68ء
کیا ابتدائی اسلام پر ایرانی اثرات مفید ثابت ہوئے اور یہ 'آلِ برمک' کون تھے؟	51	اکتوبر 69ء
قسمت کے متعلق کیا رائے ہے؟	52	"
کیا جیوتش کی رو سے یہ درست ہے کہ جنوری یا فروری میں پیدا ہونے والا بچہ خوش قسمت نہیں ہوتا؟	53	"
کیا مذہبی لوگ واقعی بُرے لوگ ہوتے ہیں؟	50	فروری 70ء
کیا مذہب انسان کے لئے ضروری ہے؟	51	"
جماعتِ اسلامی کی مختصر تعریف؟	31	دسمبر 70ء
صوفی ازم کی ابتدا کیسے ہوئی؟	40	مئی 71ء
سائنس اور مذہب میں کیا فرق ہے؟	43	اگست 71ء
کیا یہ سچ ہے کہ چاند یا سورج گرہن کے وقت حاملہ عورت کا اُن کے سائے میں آنا اس کے ہونے والے بچے کی صحت کو متاثر کرتا ہے؟	22	نومبر 71ء
بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں مذہبی علما اور دینی مرکزوں کے سربراہ اکثر دورے کرتے رہتے ہیں، وہ گاؤں کھیڑوں میں کیوں نہیں جاتے؟	80	مارچ 72ء
ہندستان میں ہندو زیادہ مذہبی ہے یا مسلمان؟	38	جون 72ء
پچھلے دنوں اردو اخبارات میں ایک پیشین گوئی کا بڑا چرچا رہا، اس پیشین گوئی کے معقول یا نامعقول ہونے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟	39	"
گگن کے پچھلے شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ دعا کے قائل نہیں، آخر کیوں؟	90	ستمبر 72ء
آپ جماعتِ اسلامی کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟	93	"
پچھلے شمارے سے معلوم ہوا کہ آپ دعا کے قائل نہیں، کیا قسمت کے بھی قائل نہیں؟	52	دسمبر 72ء
جماعتِ اسلامی والے کہتے ہیں کہ جس خدا نے دنیا بنائی، اس نے دنیا کے ساتھ نظامِ زندگی بھی دیا، کیا یہ بات درست ہے؟	51	"
جناب انور علی اپنے مضمون 'مذہب' میں فرماتے ہیں "مذہب پرست معاشرے اس وقت جہاں جہاں کہیں ہیں پس ماندہ نظر آتے ہیں"، کیا یہ بات درست ہے؟	54	"
کیا علمِ نجوم کی مدد سے زندگی کی الجھنوں کو سلجھایا جا سکتا ہے؟	32	اپریل 73
آپ نے پچھلے گگن میں .... کے جواب میں ہندو کو مشرک قرار نہیں دیا، یہ بات حقیقت کے خلاف ہے، ہندو تو کئی خدا کو مانتا ہے	"	"

سوال	صفحہ	شمارہ
گلشن نندہ کس گھاٹ کے پتھر ہیں؟	79	مارچ 72ء
پاکستان کے چند مشہور پلے بیک سنگروں کے نام لکھیے؟	80	"
کیا "شرارت" نام کی فلم پہلے بھی بن چکی ہے؟	90	ستمبر 72ء
اچھے خاصے نام ور فلم سٹاروں اور ہدایت کاروں کی بعض فلمیں انتہائی فلاپ (آمدنی کے اعتبار سے) ثابت ہوئی ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟	92	"
ساحر کے اس شعر کا مطلب کیا ہے "نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے ۔۔ ترا وجود ہے اب صرف داستاں کے لیے"؟	94	"
فلم "پکار" کی کہانی اوندھکر نے لکھی تھی یا کمال صاحب نے؟	51	دسمبر 72ء
"پاکیزہ" کے اس گانے "یوں ہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے" کا بہت چرچا ہے۔ آپ کا اس گیت کے متعلق کیا خیال ہے؟	53	اپریل 73ء
ایسی کامیاب فلم ہیروئنوں کے نام بتائیے، جو اپنے بچپن میں بھی فلموں میں کامیاب رہیں؟	74	مئی 73ء
ہندستان میں غیر ملکی اشتراک سے جو فلمیں بنی ہیں ان میں کوئی کامیاب بھی ہوئی؟	22	جون 73ء
پہلی بولنے والی فلم "عالم آرا" کا میوزک ڈائرکٹر کون تھا؟ اور اس فلم میں کس کس نے کام کیا تھا؟	23	جولائی 73ء
فلم کی دنیا میں NEW WAVE سے کیا مراد ہے؟	24	اگست 73ء
آپ نے فلم "پکار" پر اتنا اچھا تبصرہ دیا ہے کہ میں نے آج تک کسی فلمی رسالے میں اتنا اچھا تبصرہ کسی فلم پر نہیں پڑھا، آپ کوئی فلمی رسالہ کیوں نہیں نکال لیتے؟	67	ستمبر 73ء
ہندستان کا سب سے بڑا فلم ڈائرکٹر کون ہے؟	11	اکتوبر 73ء
سوشیلا کامت نام کی ایک خاتون، فلم ڈائرکٹر بنی ہیں، کیا پہلے بھی کوئی عورت فلم ڈائرکٹر رہی ہے؟	54	نومبر 73ء
ہندستان کی پہلی فلم کون سی تھی؟	17	جنوری 74ء
لتا کی پہلی فلم کون سی تھی، اور سب سے زیادہ معروف پلے بیک سنگر کون ہے لتا یا آشا؟ (11 مئی 74ء)	10	مارچ 74ء
انڈین میوزک پرانا ہے یا ویسٹرن؟	12	مئی 74ء

متفرق

سوال	صفحہ	شمارہ
کیا آپ قلم گھسنے کے سوا دوسرا کوئی دھندا نہیں کر سکتے تھے؟	60	ستمبر 67ء
آپ نے کیا کبھی کوئی گناہ کیا ہے؟	32	نومبر 68ء
آپ کے استاد کون تھے؟	41	جنوری 69ء
آپ نے گگن کے پچھلے شمارے میں اپنے آپ کو پروفیسر آل احمد سرور کا شاگرد بتایا ہے، مگر آپ تو اپنے استاد کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں،	33	اپریل 69ء
جو گگن کی پالیسی یا آپ کی ذات کی مذمت کرے کسی مالی منفعت کی خاطر، اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟	11	مارچ 7[illegible]ء
کیا بڑھتی ہوئی عمر اچھی موٹر ڈرائیونگ میں رکاوٹ ثابت ہونے لگتی ہے؟	33	اکتوبر 66ء
کس عمر کا انسان کتنے وقت میں موٹر ڈرائیونگ سیکھ سکتا ہے؟	21	دسمبر 66ء
برطانیہ میں ہیلمٹ پہننے پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟	56	نومبر 73ء
ہیرے کو اتنی وزنی اور سخت شے کیوں سمجھا جاتا ہے؟	23	مئی 67ء
کیا یہ درست ہے کہ ہیرے اور کوئلے میں زیادہ فرق نہیں ہوتا؟	41	مئی 71ء

'کرگس گوشت' کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟	12	مئی 74ء
لباس کے سلسلے میں بدلتے ہوئے فیشن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟	48	ستمبر 68ء
کیا آپ چست پتلون پہننا پسند کرتے ہیں، نہیں، تو اس جدید فیشن سے احتراز کیوں؟	36	جولائی 69ء
حضرت یہ ہپیوں کی بڑھتی ہوئی فوج ظفر موج کہاں سے آ رہی ہے؟ زندگی گزارنے کا یہ مضحکہ خیز ڈھنگ انھوں نے کہاں سے سیکھا؟	35	〃
برطانیہ کے مشہور مفکر برٹرانڈ رسل کے متعلق مختصر طور پر کچھ بتائیے؟	30	دسمبر 70ء
ارشمیدس کون تھا؟	31	〃
کچھ لارنس آف عربیا کے بارے میں مختصر طور پر بتائیے؟	42	اگست 71ء
نوبل پرائز کس کی جانب سے دیا جاتا ہے؟	26	جولائی 73ء
مرد مار آمیزن عورتوں کی تاریخ بیان کیجئے؟	12	اکتوبر 63ء
علاقائی تعصب کا سبب کیا ہے؟ کیا واقعی ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ طبیعت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہیں؟	23	نومبر 67ء
کچھ کوکنی فرقے کے متعلق بتائیے؟	29	جولائی 68ء
ہونولولو شہر کا نام اکثر اخباروں میں پڑھا ہے۔ یہ شہر کس بنا پر مشہور ہے؟	42	جنوری 69ء
آسام کے میزو لوگوں کے بارے میں بتائیے؟	51	دسمبر 72ء
کیا گلاب کی کاشت سب سے پہلے ہندستان میں ہوئی؟	53	اکتوبر 69ء
ایک نوری سال کی طویل مدت یا دوری کا کیا مطلب ہے؟	29	اپریل 68ء
ریڈیم کیا چیز ہے، ذرا اس پر روشنی ڈالیے؟	34	جولائی 69ء
ستارا اور سیارہ میں کیا فرق ہے؟ اور کتنے سیارے ہیں؟	30	دسمبر 70ء
دنیا میں بھوک، بیماری اور جہالت عام ہے، امریکا اس طرف توجہ دے کر چاند ماری پر اتنی دولت کیوں لٹا رہا ہے؟	22	نومبر 71ء
یہ امیری، غریبی کا فرق کیسے دور ہو سکتا ہے؟ جب سے دنیا بنی ہے تب ہی سے امیر غریب موجود ہیں؟	24	اگست 73ء
دراصل آپ اندھا، بہرا، گونگا اور عزیز الانسان کسے کہیں گے؟	11	مئی 74ء
باسکٹ بال کا کھیل ہندستانی ہے یا غیر ملکی؟	91	ستمبر 72ء
ٹرانز سسٹر کس ملک میں ایجاد ہوا؟	51	دسمبر 72ء
'احتو بحتو' کسے کہتے ہیں؟	68	ستمبر 73ء
پی سی سرکار کے مقابلے کا ایک جادوگر گوگیا پاشا تھا، کیا وہ زندہ ہے؟ اس کے بارے میں کچھ بتائیے؟	69	〃
ہر برس 26 جنوری کو سرکار کی جانب سے جو خطابات ملتے ہیں، اُن میں سب سے بڑا 'پدم بھوشن' ہے یا 'پدم وبھوشن'؟	49	ستمبر 68ء
آج کے طالب علموں کی بدنظمی اور بے چینی کے اسباب؟	53	اکتوبر 69ء
کیا فرماں برداری اور حب الوطنی میں فرق ہے؟	52	〃
برلا کی کاروباری وسعت کتنی ہے؟	44	مارچ 65ء
کیا جدن بائی سے زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ طوائف کوئی اور بھی ہوئی ہے؟	52	فروری 70ء

سوال	صفحہ	شمارہ
جبریا زنا کے تحت یا دورانِ جنگ میں عورتوں پر جو ظلم و ستم ہوتا ہے، اُس کے نتیجے میں، مرد، عورت کی مرضی سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے آپ اُسے ناجائز (حرامی) مانتے ہیں ؟	24	مئی 73ء
مُجرے اور کیبرے میں کیا فرق ہے ؟	56	نومبر 73ء
عورت کے سولا سنگار مشہور ہیں، مگر وہ کون کون سے ہیں ؟	11	مئی 79ء
جہازراں کمپنی مغل لائن سرکاری ہے یا پرائیویٹ ؟	10	مارچ 74ء
نیوٹرل اور حق کی طرف داری میں کیا فرق ہے ؟	12	مئی 74ء
کیا سچی محبت آج بھی پائی جاتی ہے ؟	54	نومبر 73ء
اگر محبوب بے وفا ثابت ہو تو کیا محبت کے دنوں میں دیئے ہوئے تحفے اس سے واپس لئے جا سکتے ہیں ؟	53	اکتوبر 69ء
کیا داڑھی سے چہرے کی حفاظت ہوتی ہے ؟	31	دسمبر 70ء
نیکی کا پھل کہاں ملتا ہے ؟	34	جولائی 69ء
میرے ایک دوست میرے خط کا جواب نہیں دیتے، آخر انھیں کیا لکھا جائے کہ وہ جواب دیں ؟	62	فروری 68ء
میں بہت دنوں سے دولت کمانے کی کوشش میں ہوں، مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی ؟	51	فروری 70ء
یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ خطرے میں گھر کر ایک کمزور انسان بھی اپنے آپ کو طاقت ور سمجھنے لگتا ہے ؟ یہ کیوں ؟	21	نومبر 71ء
جس سے سب خوش ہوں اور جو سب کا دوست ہو، اُس کو آپ کیا کہیں گے ؟	12	مئی 74ء
وہ کون سی جگہ ہے جہاں رہنا مناسب نہیں ؟	"	"
دنیا میں جہنم کی سی تکلیف کس بات میں ہے ؟	"	"
دنیا کی خوب صورت ترین چیز ؟	53	اکتوبر 69ء

صاحبِ ذوق اور معیاری افراد کی پسند
یادگارِ پنجاب ہوٹل
کے لذیذ اور صحت بخش کھانے
ساتھ میں چائے، لسی اور دیگر ٹھنڈے مشروبات
فون
339179
201۔ بجت الاختر
فاک لینڈ روڈ۔ بمبئی نمبر 4
نیک خواہشات
ہفت روزہ
ذریاب
کی جانب سے
12A۔ مستری بنگلہ، عرب گلی، بمبئی نمبر 8

گگن کا ہندوستانی مسلمان نمبر

مجھے عجائب گھروں میں کھ دو کہ وقت بے حرمتی کریگا
مرے وجود و عدم پہ یار و خدا کا کلمہ لکھا ہوا ہے
آنسر جمشید کی بیس سالہ شاعری کا انتخاب
قیمت: دس روپے
گروپ آف پبلی کیشنز 15 انصاری روڈ، دریا گنج، دہلی
رسالہ فن و شخصیت کی پہلی پیشکش
مہندر ناتھ یادگار نمبر
نگراں
کرشن چندر
ہندو پاک کے نامور قلم کاروں کی تخلیقات
مہندر ناتھ کے شاہکار افسانے، یادگار تصاویر
اور کرشن چندر کی لکھی ہوئی مہندر ناتھ کی سوانح
مدیران
سی۔ ایل کاوش
صابر دت
قیمت
25 روپے
تین مورتی پبلیکیشنز

چشم ما روشن و دل ما شاد
پرتکلف، لذیذ، بہترین مصالحوں سے بنے ہوئے شاہانہ مغلائی
کھانے اور پھر انفرادی خدمت کا حسین انداز
آپ کو دہلی دربار میں ملے گا
بریانی، تندوری، وائٹ چکن، ڈبہ گوشت، بھیجا، شامی کباب (فیملی کیلئے ایئر کنڈیشنڈ روم)
دہلی دربار ہوٹل، روبرو روشن ٹاکیز، کارنر آف گرانٹ روڈ، بمبئی ۷
(کیٹرنگ اور ہوم ڈیلیوری سروس کیلئے فون : 336673)
CIPLA
INDIA'S TRULY NATIONAL PHARMACEUTICAL CONCERN
CIPLA REMEDIES ARE AMONG THE WORLD'S BEST.
CHEMICAL, INDUSTRIAL & PHARMACEUTICAL LABORATORIES, LTD.
289, BELLASIS ROAD, BYCULLA, BOMBAY-8.
CIPLA The Chemical, Industrial and Pharmaceutical Laboratories—is among the foremost pharmaceutical manufacturing institutions in India.
CIPLA has contributed to the raising of the Indian Pharmaceutical Industry to its present high level.
CIPLA has established a tradition for Quality, Purity & Dependability.
CIPLA products, as a result of scrupulous care and attention at all stages of manufacture, analytical control, biological testing and standardization, rank among the world's best and have thus gained the approval and the fullest confidence of the medical profession in India and abroad.
CIPLA is always at the service of the Medical Profession and the Nation.

بھارت

کے مسلمانوں کے لئے

"روٹی، کپڑا اور مکان"

کے خالق

بھارت

کی جانب سے

نیک تمنّائیں اور شُبھ کامنائیں

زندگی کو خوشحال بنانے کیلئے
گیمبز لیباریٹریز

H. H. KHAN

A Popular Social Worker

A Renowned Publicits &

A Welknown Speaker

— PARTNER —

KHAN'S ADVERTISING CORPORATION

(Founders of Cine Publicity in Urdu)

REMEMBER
AKRAMI PUBLICITY
SHOW BUSINESS, PAPER & OUTDOOR
PUBLICITY EXPERT
SHANKAR BUILDING.
4-MASTAN TANK CROSS LANE.
BOMBAY-400 008.

With best compliments from :
CORONATION
WAFER CO.
MAZEDAAR AUR KURKURE WAFER
o Proprietor o
HAKHAMANESHI & CO.
MANCHER MANZIL, FORAS ROAD,
BOMBAY-400 008.
With best compliments from :
SHAMA
FURNITURE
Manufacturers of :
All Types of Modern Wooden
Furniture
— Partners —
MOHD. ISHAQ & SARDAR HUSAIN
5/80-E, Chikkal Pada,
R. S. Nimkar Marg,
Foras Road,
BOMBAY-400 008
With best compliments from :
★
BHAGYODAYA
ENGINENRING WORKS
Forging & Manufacturers of :
Hardware Items, Mill and Railway
Requisites
Specialists in :
Nickel Plating
Proprietor :
HATIM DOHADWALA
Phone c/o 893214
80-E. Chikal Pada,
Foras Road,
BOMBAY-400 008.

लिम्का
नींबू जल-सा मज़ेदार पेय

THE BOMBAY MERCANTILE CO-OPERATIVE BANK LTD.
ENCOURAGES YOU IN RAISING YOUR STANDARD OF LIVING AND HELPS IN ACQUIRING ON CONVENIENT TERMS THE FOLLOWING
DOMESTIC ARTICLES
ACQUIRE ON EASY TERMS
WASHING MACHINES
STEEL CUPBOARDS
REFRIGERATORS
CEILING FANS
RADIOS
WINDOW TYPE AIR CONDITIONERS
SEWING MACHINES
TABLE FANS
ALL KINDS OF BANKING BUSINESS TRANSACTED
K. B. MOHAMEDALLY ALLABUX
CHAIRMAN
ZAIN G RANGOONWALA
MANAGING DIRECTOR
Phone: 325961 (5 Lines) Grams: 'KHAZANCHI' (Mandvi) Bombay
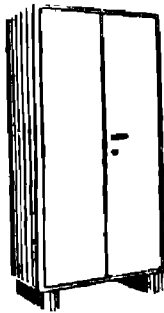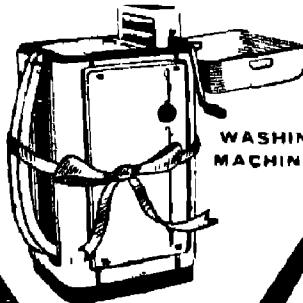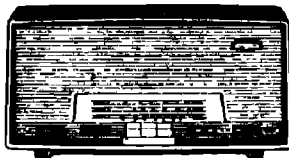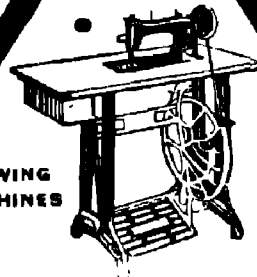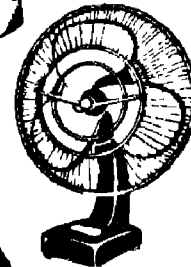
GAGAN
KA
HINDUSTANI MUSALMAAN NUMBER

Gagan the first and the only cultural and rational magazine in Urdu is impartial not necessarily neutral
TITLE PRINTED AT RAINBOW ART PRINTERS, BOMBAY-400 009.